

جامعہ

جامعہ ملیہ کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ

نمبر ۲ | بابت ماہ فروری ۱۹۳۳ء | جلد ۲۰

مطبع جامعہ ملیہ اسلامیہ دھلی

A.H. Faruqi 1927.

جامعہ

زیر ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری — ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے پی ایچ ڈی

جلد ۲۰ | بابتہ ماہ فروری سنہ ۱۹۳۴ء | نمبر ۲

فہرست مضامین

(محمد مجیب بی اے (آکسن) پرنٹر و پبلشر نے جید برقی پریس دہلی میں چھپوایا)

عقیدہ اعجاز قرآن کی تاریخ

۲

۵۔ لفظ اعجاز اور اُس کا مفہوم۔

اب آگے بڑھنے سے پہلے ہمیں یہ بحث چھیڑنی چاہیئے کہ لفظ اعجاز کا مفہوم کیا ہے۔ اِس کے لغوی معنی تو مجبور کرنا، عاجز کرنا ہیں اور اسی سے لفظ معجزہ مشتق ہوا ہے جس سے علم کلام کی اصطلاح میں وہ فعل مراد ہے جو کسی نبی سے اپنی صداقت کے ثبوت میں سرزد ہوتا ہے۔ اس لفظ میں جو تصور مضمر ہے اور جس کو سمجھنا کچھ مشکل بھی نہیں وہ یہ ہے کہ بجز نبی کے اور ہر شخص ایسے افعال سے مجبور یا عاجز ہے۔ قرآن میں نہ تو کہیں لفظ معجزہ آیا ہے اور نہ اس مادے کا کوئی دوسرا مشتق۔ بخلاف اس کے وہاں آیہ اور برھان عام طور پر مستعمل ہیں۔ ان الفاظ کے پیچھے اک ذرا مختلف تصوّر کارفرما معلوم ہوتا ہے۔ یہ الفاظ صرف یہ ظاہر کرنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ ایک مخصوص مشاہدہ کسی نبی کی نشانی یا اس کی صداقت کا ثبوت ہے اب اس کے بعد لفظ معجزہ کی حد شروع ہوتی ہے جو وصفی معنی اپنے اندر پوشیدہ رکھتا ہے اور یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ یہ فعل صرف نبی کی ذات سے مخصوص ہے۔

یہ متعین کرنا آسان نہیں ہے کہ یہ لفظ اپنے اصطلاحی معنی میں سب سے پہلے کب استعمال کیا گیا مسائل نبوت سے بحث پہلی صدی ہجری میں شروع ہو چکی تھی مگر اس میں شک کی بہت گنجائش ہے کہ یہ لفظ بھی اتنا ہی قدیم ہے۔ بخلاف اس کے ہم دیکھتے ہیں کہ علی بن ربّن طبری جس نے اپنی کتاب سنہ ۲۳۲ ہجری اور سنہ ۲۴۷ ہجری کے درمیان لکھی تھی برابر الفاظ آیہ اور برھان استعمال کرتا ہے اور ایک جگہ بھی نہ لفظ معجزہ استعمال کرتا ہے اور نہ کوئی دوسرا ہم اشتقاق لفظ۔ اس خفیف سی شہادت پر ہم یہ فیصلہ تو ہرگز نہیں کر سکتے کہ اس وقت تک لفظ معجزہ اپنے اصطلاحی معنی میں

کبھی استعمال ہی نہیں ہوا تھا مگر یہ کہنا حقیقت سے دور نہ ہوگا کہ اس وقت تک یہ لفظ اتنا غالب نہیں ہوا تھا کہ اپنے سے متقدم الفاظ آیہ اور برھان کو خارج کر دیتا جیسا کہ اس نے بعد کو کیا اس دعوی کی ایک دلیل یہ ہے کہ امام احمد بن حنبل اپنی تصانیف میں لفظ معجزہ نہ صرف انبیا کیلئے استعمال کرتے ہیں بلکہ اولیا، و اصفیا کے لئے بھی۔ بعد میں اس معنی میں لفظ کرامت استعمال ہونے لگا ہم معلوم کر چکے ہیں کہ پہلی کتاب جس کا نام اعجاز القرآن تھا تیسری صدی ہجری کے نصف آخر میں لکھی گئی تھی۔ اس زمانے میں اور اس کے بعد نبوت کی بحثوں میں الفاظ آیہ اور برھان کا استعمال رفتہ رفتہ کم ہوتا گیا اور ان کی جگہ الفاظ اعجاز اور معجزہ نے لے لی۔

بلاشبہ اس رفتار کا پتہ لگانا جس سے ایک لفظ کوئی مخصوص معنی حاصل کر لیتا ہے بہت ہی دلچسپ کام ہے۔ مگر ساتھ ساتھ یہ کام بہت مشکل بھی ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ اصطلاحی معنی کسی نہ کسی طرح لغوی معنی سے متعلق ضرور ہوتے ہیں۔ دشواری صرف تعلق کے متعین کرنے میں ہوتی ہے۔ یہ معلوم ہے کہ محمد کی نبوت کا مسئلہ شام کے دینی حلقوں میں نبوت کے عام مسائل سے بہت پہلے زیر بحث آچکا تھا اور ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ سب سے بڑی دلیل ان کی صداقت کی یہی پیش کی جاتی تھی کہ وہ صاحب وحی ہیں اور وہ وحی قرآن ہے۔ خود قرآن کا یہ دعوی ہے کہ اس کا مثیل کلام پیش کرنا جن و انس کے بس سے باہر ہے۔ جو فقرہ اس موقعے پر آیا ہے وہ "لایاتون بمثلہ" ہے ان الفاظ کو واضح کرنا چاہیں تو "یعجزون عنہ"[1] کہہ سکتے ہیں۔ ابن جریر نے اپنی تفسیر میں یہی الفاظ استعمال بھی کئے[2] ہیں۔ اب اگر قرآن کو فاعل ٹھیرایا جائے تو فعل متعدی اَعجَز استعمال کرنا پڑے گا جس سے یہ ظاہر ہوگا کہ قرآن نے لوگوں کو عاجز کر دیا ہے۔ گفتگو میں ایسا مجاز عام طور پر رائج ہے اب اس مجاز کو

Tor Andrae: Die Person Muhammad in Lehre und Glauben seiner Gemeinde (Upsala 1917 p. 101) ملاحظہ ہو۔

(۲) ج ۱ ص ۱۲۶ - ۱۲۹

اگر مختصر الفاظ میں بیان کرنا ہو تو بجائے فعل کے مصدر یا حاصل مصدر (جو عربی میں ایک ہی چیز ہے) استعمال کریں گے۔ اس طرح ترکیب "اعجاز القرآن" وجود میں آئی ہوگی۔ کچھ دنوں بعد جب بحث علم مسائل نبوت سے شروع ہوئی ہوگی تو ایک عام لفظ کی ضرورت بھی محسوس ہوئی ہوگی۔ اب لفظ معجزہ نہ صرف قرآن کے لئے بلکہ دوسرے انبیا کے خوارق عادات کے لئے بھی استعمال کیا گیا ہوگا اس عام معنی کے لئے ۃ کا اضافہ کرکے ایک اسم صفت بنا لینا بالکل فطری بات تھی۔ اس طرح لفظ معجزہ ظہور پذیر ہوا ہوگا۔

معجزے کی جو تعریف علم کلام کی کتابوں میں عام ہے وہ یہ ہے: "امر خارق للعادۃ مقرون بالتحدی سالم عن المعارضۃ"[1] ان کتابوں میں صفحے کے صفحے اس تعریف کی توضیح و تشریح میں سیاہ کئے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک جامع تشریح پیش کی جاتی ہے۔ محمد بن احمد القرطبی نے اپنی تفسیر "الجامع لاحکام القرآن" میں پانچ شرائط بیان کئے ہیں جن کے بغیر کوئی فعل معجزہ نہیں کہا جا سکتا۔ (۱) یہ فعل صرف خدا کے اختیار میں ہو (۲) خارق عادت ہو (۳) مدعی نبوت پہلے سے اعلان کر چکا ہو کہ ایسا ہونے والا ہے۔ (۴) واقعہ بتمام و کمال اعلان کے مطابق ہو اور (۵) کوئی اور شخص ویسا ہی عمل نہ کر سکے یہ ہے مختصر الفاظ میں وہ مطلب جو متکلم کا اس وقت ہوتا ہے جب وہ لفظ معجزہ استعمال کرتا ہے۔ اس موقع پر زیادہ[2] تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لئے کہ ہمیں تو اس وقت صرف ایک مخصوص معجزے سے بحث کرنی ہے۔ اب ہمیں چاہئے کہ ان دلیلوں کو بیان کریں جو قرآن کے معجز ہونے کے ثبوت میں پیش کی گئی ہیں۔

۲۔ دلائل اعجاز۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ قرآن میں اپنے معجز ہونے کا دعویٰ ان لوگوں کے جواب میں کیا گیا ہے جو محمد کی نبوت کے منکر تھے۔ متکلم بھی دلائل کو اسی جگہ سے شروع کرتا ہے چنانچہ پہلی بحث یہی ہوتی

---

[1] اتقان ج ۲ ص ۱۱۶ [2] زیادہ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو Tor Andrae ص ۱۰۰-۱۰۳

ہے کہ محمد کی نبوت کا معجزہ قرآن ہی ہے۔ باقلانی کا قول ہے[1]: "قرآن کے اعجاز کے سمجھنے کے لئے سب سے زیادہ توجہ اس نکتے پر دینی چاہیئے کہ ہمارے نبی صلعم کی نبوت کی بنیاد اسی معجزے پر رکھی گئی ہے اور اگرچہ دوسرے بہت سے معجزات سے بھی ان کی تائید کی گئی لیکن وہ معجزے خاص اوقات خاص حالات اور خاص اشخاص کے پابند تھے۔۔۔۔۔۔۔۔ بخلاف ان کے قرآن ایسے معجزے پر دلالت کرتا ہے جو جن وانس پر یکساں عام ہے اور جو ہر زمانے میں باقی رہنے والا ہے۔ اور جس کی حجت اس کے ظہور کے وقت سے لے کر روز قیامت تک ایک طرح قائم رہے گی"۔ باقلانی نے اس بیان کی تصدیق کے لئے قرآن کی کئی آیتیں نقل کی ہیں جن میں سے ایک یہ ہے" وقالوا لولا اُنزل علیہ آیات من ربہ قل انما الایات عند اللہ وانما انا نذیر مبین۔ اولم یکفھم انا انزلنا علیک الکتاب تتلی علیھم[2]" کہتے ہیں اس پر اس کے رب کی طرف سے نشانیاں کیوں نہ نازل ہوئیں۔ کہدو کہ نشانیاں تو صرف خدا کے پاس ہیں اور میں تو ایک سیدھا سادا سمجھانے بجھانے والا ہوں۔ کیا یہ ان کے لئے کافی نہیں ہے کہ ہم نے تم پر ایسی کتاب نازل کی جو ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہے، پھر باقلانی کہتا ہے"یوں خدا نے خبر دی ہے کہ یہ کتاب اس کی نشانیوں میں سے ایک خاص نشانی ہے اور دلالت کے لئے بالکل کافی ہے اور اس کی بھی وہی حیثیت ہے جو دوسرے انبیا کے معجزات اور آیات کی ہے" اسی سلسلے کی ایک کڑی وہ حدیث بھی ہے جو پہلے بیان کی جا چکی ہے اور جس میں رسول نے یہ کہا ہے کہ قرآن ہی وہ نشانی ہے جو ان کو ملی ہے۔

بعد کے متکلم اس سے بھی آگے جاتے ہیں اور پانچ مقدمات قائم کرتے ہیں:- (۱) یہ کہ محمد موجود تھے (۲) یہ کہ انھوں نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا (۳) یہ کہ انھوں نے معجزہ دکھایا (یعنی قرآن پیش کیا) (۴) یہ کہ انھوں نے دوسروں کو مقابلے کی دعوت دی اور (۵) یہ کہ کوئی شخص قرآن کا مثل کلام نہ پیش کر سکا۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر یہ پانچ مقدمات تسلیم کر لئے جائیں تو نتیجہ لازمی یہ نکلتا ہے کہ محمد نبی،

---

[1] ص ۱۲ [2] قرآن ۲۹: ۵۰-۵۱

صادق تھے پہلے دو مقدمات تو بالکل مسلم ہیں اس لئے کہ کوئی بھی محمد کے وجود سے اور ان کے دعوائے نبوت سے انکار نہیں کرتا۔[1] اب رہا تیسرا مقدمہ تو یہی سب سے زیادہ اہم ہے اس لئے کہ اس میں یہ ثابت کرنا ہے کہ قرآن معجزہ ہے۔ بیشتر متکلم تو چوتھے اور پانچویں مقدمات کو تیسرے کی دلیل کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔ یہ تو واقعہ ہے کہ محمد نے لوگوں کو مقابلے کی دعوت دی اس لئے کہ خود قرآن کی کئی آیات اس کی شاہد ہیں۔[2] یہ بھی یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ کسی نے مقابلہ میں کوئی معقول چیز پیش نہیں کی کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو جاہلی اشعار اور خطب کی طرح اس کا نمونہ بھی ہم تک پہنچتا۔ کوئی وجہ اس کے پوشیدہ رہنے یا ضائع جانے کی نہیں ہو سکتی اس لئے کہ مشرکین اور متشککین پوری کوشش اس کے محفوظ رکھنے کی کرتے۔ مومنین بھی اسے نظر انداز نہیں کرسکتے تھے اس لئے کہ قرآن کے مقابلے کی کوشش کا کامیاب ہو جانا ان کے دین کی بنیادیں متزلزل کر دیتا یہ حقیقت کہ صدیوں تک بے شمار انسان قرآن کے اعجاز کے قائل رہے اس کا کافی ثبوت ہے کہ مقابلے کی کوشش کامیاب نہیں ہوئی۔ مسیلمہ اور دوسرے مدعیان نبوت کے کلام کے جو نمونے ملتے ہیں وہ اس قدر کم مرتبہ ہیں کہ کوئی بھی سنجیدگی سے انھیں قرآن کے مقابلے میں نہیں پیش کر سکتا۔ یہ بھی بالکل ظاہر ہے کہ محمد کے دعوائے نبوت کو رد کرنے کی آسان ترین صورت یہی تھی کہ دوسرے لوگ قرآن کا مثل کلام پیش کرتے اور یوں ثابت کر دیتے کہ قرآن معجز نہیں ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ عرب تمام دوسری صورتیں اختیار کرتے ہیں مگر یہی نہیں کرتے۔ وہ جنگ کے لئے تیار ہو جاتے ہیں اور یوں ہر قسم کے مصائب برداشت کرتے ہیں۔ اگر واقعی قرآن کا جواب ان کے بس کی بات ہوتی تو کیا یہ قرین قیاس نہ تھا کہ وہ تمام مصائب پر اس کو ترجیح دیتے۔ ایسی صورت میں بجز اس کے اور کیا نتیجہ نکل سکتا ہے کہ باوجود صاحبان فصاحت و بلاغت ہونے کے قرآن کا جواب ان کے بس میں نہ تھا۔[4]

---

[1] آمدی، یحییٰ بن حسن زیدی، قطب راوندی [2] باقلانی ۱۸، ۲۰۔ ۲۲ [3] مواقف، مفتاح التحقیق
[4] باقلانی ص ۲۵۔

یہ تو تھی عام دلیل۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ محل اعجاز کیا ہے۔ بالکل ابتدا ہی سے اس کے دو جواب دئے گئے ہیں۔ اس عقیدے کی نشو و نما کے ساتھ ساتھ یہ مسئلہ بھی اٹھا کہ قرآن کا نظم معجز ہے یا اس کے معانی اور مطالب۔ آخر میں اجماع تو اسی پر ہوا کہ دونوں معجز ہیں۔ مگر ایسے بھی لوگ گذرے ہیں جنھوں نے ایک سے انکار کیا ہے اور دوسرے کو مانا ہے۔ شروع ہی میں نظّام نے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ قرآن کے نظم میں کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ اور اگر عرب کو اختیار دیا جاتا تو وہ ایسا کلام پیش کر سکتے تھے۔ مگر اللہ نے اُن کو ایسا کرنے سے روک دیا اور یہی دراصل قرآن کا اعجاز ہے۔ اس دلیل کو علم کلام کی اصطلاح میں "دلیل الصرفہ" کہتے ہیں نظّام کے نزدیک دوسرا عنصر جو قرآن میں معجز ہے وہ "اخبار بالغیب" ہے۔ بہ خلاف اس کے جاحظ نے نظم پر زیادہ زور دیا اور اپنی کتاب نظم القرآن میں اپنے دعویٰ کو ثابت کرنے کی کوشش کی۔ علی بن ربّن کی متعیدی الفاظ سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ نظم کے معجز ہونے کا مسئلہ اختلافی تھا۔ وہ لکھتا ہے "جب میں نصرانی تھا تو میرا اور میرے ایک چچا کا جو صاحب فصاحت و بلاغت تھا یہ خیال تھا کہ بلاغت نبوت کی نشانی نہیں ہو سکتی اس لئے کہ وہ تمام قوموں میں مشترک ہے لیکن جب میں نے تقلید کو چھوڑ کر اور عادت اور تربیت کے اثرات کو خیرباد کہہ کر قرآن کے معانی پر غور کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ قرآن کا واقعی وہی درجہ ہے جو اس کے ماننے والے کہتے ہیں واقعہ یہ ہے کہ میں نے کسی زمانے کی کوئی کتاب خواہ وہ عربی ہو یا عجمی ہندی ہو یا رومی ایسی نہیں دیکھی جس میں توحید و تہلیل، خدا کی ثنا اور انبیاء و رسل کی تصدیق، نہ مٹنے والے اعمال صالح کی ترغیب، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، جنت کا شوق اور دوزخ کا ڈر اس طرح جمع ہوں جس طرح قرآن میں ہیں۔ تو اگر کوئی ایسی کتاب پیش کرے جس میں یہ یہ صفات ہوں اور جس کے لئے قلوب میں ایسی عظمت اور حلاوت ہو اور جس کے دم سے ایسی کامرانی اور نصرت ہو اور باایں ہمہ جس پر وہ نازل ہوئی ہے وہ امی ہو جس نے نہ کتابت سیکھی ہو اور نہ بلاغت تو بلاشبہ وہ کتاب اس شخص کی نبوت کی نشانی ہے" یہاں ایک تیسری دلیل بھی ملی۔ قرآن کے نظم اور اس کے

معانی اور مطالب کے علاوہ یہ بھی ایک دلیل اعجاز کی ہے کہ محمد امیّ تھے یعنی نوشت و خواند سے ناآشنا۔

اب رمّانی کی باری آتی ہے۔ وہ کہتا ہے "اعجاز قرآن کے وجوہ یہ ہیں:۔ (۱) باوجود سخت ضرورت اور اسباب اور دعوت عام کے کسی نے اس کا مقابلہ نہیں کیا (۲) صرفہ (۳) بلاغت (۴) پیشین گوئیاں (۵) نقض عادت اور (۶) دوسرے معجزات سے اس کی مشابہت۔ نقض عادت سے یہ مراد ہے کہ کلام کی جو مروجہ اقسام ہیں مثلاً شعر، سجع، خطب، رسائل اور نثر جو گفتگو میں مستعمل ہے، قرآن کا طرز ان سب سے نرالا اور سب سے بلند ہے حتیٰ کہ کلام موزوں سے بھی جو بہترین سمجھا جاتا ہے۔ اب رہی دوسرے معجزات سے مشابہت تو اس کی بھی وہی حیثیت ہے جو سمندر کے پھٹ جانے اور عصا کے سانپ بن جانے یا دوسرے ایسے ہی واقعات کی ہے۔ اس لئے کہ یہ بھی اسی طرح عادت مستمرہ سے خارج ہے اور لوگ اسی طرح اس کے مقابلے سے بھی عاجز ہیں" یہ بات قابل لحاظ ہے کہ رمّانی دلیل نظم اور دلیل صرفہ کو جو ابتداً ایک دوسرے کے خلاف پیش کی گئی تھیں ایک ساتھ پیش کر رہا ہے۔ زمانہ بعض اوقات وجہ مخالفت کو مٹا دیتا ہے اور دو مخالف دلیلیں ایک ساتھ پیش کی جانے لگتی ہیں۔

اب نظم کے سلسلے میں یہ مسئلہ پیش آیا کہ آخر معیار کیا ہے اور کیسے یہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ نظم کم مرتبہ ہے اور یہ عالی مرتبہ۔ پہلا جواب تو یہ ملا کہ صرف ذوق سلیم رکھنے والے یہ فیصلہ کر سکتے ہیں۔ غیر زبان والے یا بے ذوق اہل زبان یقینی طور پر اس نتیجے پر نہیں پہنچ سکتے ہیں اور انھیں اہل ذوق کی رائے کا محتاج رہنا پڑے گا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ قمیؔ نے بہت شد و مد سے یہ دعویٰ کیا ہے کہ قرآن کا اعجاز بیان نہیں کیا جا سکتا بلکہ صرف ذوق اس کا ادراک کر سکتا ہے بالکل اسی طرح جس طرح اچھا شعر یا حسن ملیح کہ اس کی پسندیدگی کے وجوہ بیان نہیں کئے جا سکتے۔ اور اگر کوئی کہتا ہے کہ قرآن کے اعجاز کی وجہ صرفہ ہے یا اس کے اسلوب کا دوسرے اسالیب سے مختلف ہونا یا تناقض سے بری ہونا یا اخبار عن الغیب یا از ین قبیل کچھ اور تو اس کی خالہ کا بھانجا جھوٹا ہے فقد کذب

ابن اخت خالتہ)

خطابی نے اس خیال کی مخالفت کی ہے وہ کہتا ہے "علماء نظر میں سے بیشتر کا یہ خیال تو ہے کہ قرآن کے اعجاز کی وجہ اس کی بلاغت ہے لیکن اس کی تفصیل انھیں دشوار معلوم ہوتی ہے اور وہ مجبوراً ذوق کو حکم بنانا چاہتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ کلام کی مختلف قسمیں ہیں اور ان کے رتبے بھی مختلف ہیں........ قرآن کی بلاغت میں یہ تمام اقسام شامل ہیں اور ان سب کے مجموعے سے کچھ ایسا ڈھنگ قائم ہوگیا ہے کہ اس میں شان و شکوہ اور شیرینی دونوں ایک ہوگئی ہیں باوجودیکہ الگ الگ یہ دونوں صفتیں ایک دوسری کی مخالف ہیں.... یہ فضیلت صرف قرآن کو ملی ہے تاکہ وہ نبی کے لئے ایک کھلی نشانی کا کام دے سکے" خطابی نے ایک اور دلیل پیش کی ہے جس کے خیال میں اس سے پہلے کسی اور نے نہیں پیش کیا تھا اور وہ یہ ہے "کوئی دوسرے الفاظ منظوم ہوں یا منثور قلب انسانی پر کبھی حلاوت اور کبھی رعب کی وہ کیفیت پیدا نہیں کرسکتے جو قرآن کے الفاظ پیدا کرتے ہیں"۔

اب باقلانی کا زمانہ آتا ہے۔ باقلانی نے ان تمام دلائل کو جو اس سے پہلے پیش کئے گئے تھے جمع کردیا ہے اور ان کے علاوہ کچھ نئے دلائل بھی پیش کئے ہیں۔ ہم اس کی کتاب کا ایک مختصر خاکہ پیش کرچکے ہیں۔ دوسرے باب میں اس نے تفصیل سے یہ بحث کی ہے کہ قرآن کو معجز کیوں کہتے ہیں۔ اس کا خلاصہ بھی ہم عام دلائل کے سلسلے میں پیش کرچکے ہیں۔ وہ دلیل صرفہ کا سخت مخالف ہے۔ تیسرے باب کے شروع میں وہ تین دلیلیں پیش کرتا ہے:۔ (۱) قرآن میں آئندہ واقعات کی پیشین گوئیاں ہیں جو انسان کے بس سے باہر ہیں (۲) یہ معلوم ہے کہ محمد امی تھے نہ لکھ سکتے تھے نہ اچھی طرح پڑھنا جانتے تھے۔ یہ بھی معلوم ہے کہ وہ امم سابقہ کی کتابوں سے ناآشنا اور ان کے حالات و واقعات سے ناواقف تھے۔ باایں ہمہ انھوں نے خلق آدم سے لیکر اپنے زمانے تک کے اہم واقعات کو بیان کیا ہے۔ ایسی حالت میں بجز اس کے اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ یہ علم ان کو براہ راست خدا سے بذریعہ وحی حاصل ہوا تھا۔ (۳) قرآن کا طرز ، اس کا نظم اور اس کی بلاغت اس حد تک پہنچی ہوئی ہے کہ جہاں انسان

کی رسائی ممکن نہیں۔ یہ وہ دلائل ہیں جو پہلے بھی لوگ پیش کر چکے تھے۔ باقلانی کا کام اُن کی توضیح و تشریح ہے۔ چنانچہ وہ تیسری دلیل کی توضیح کے لئے دس نکتے بیان کرتا ہے۔

۱۔ قرآن کا نظم باوجود انداز بیان کی گوناگونی کے عرب کے تمام اصناف کلام سے مختلف اور صرف قرآن سے مخصوص ہے۔

۲۔ ادب عربی میں کوئی ایسا نمونہ نہیں مل سکتا جو قرآن کا سا طویل ہو اور پھر بھی فصاحت اور بلاغت کے اس درجے پر فائز ہو۔

۳۔ قرآن کے نظم کی خوبی اور تالیف کا حسن باوجود مضامین کے اختلاف کے کبھی کم نہیں ہوتا۔ تشریح اس کی یہ ہے کہ قرآن میں قصص بھی ہیں اور مواعظ بھی۔ دلائل بھی ہیں اور احکام بھی، وعدہ بھی ہے اور وعید بھی۔ اوصاف کا بیان بھی ہے اور تعلیم اخلاق بھی لیکن ہر صنف میں فصاحت و بلاغت کا وہی عالم ہے۔ بخلاف اس کے بہترین شاعر اور خطیب کے کلام میں بھی مضمون کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ بیان کی خوبی میں کمی ہو جاتی ہے اور ایک شخص صرف ایک ہی صنف میں کمال رکھتا ہے

۴۔ فصحاء کے کلام میں فصل اور وصل، علو اور نزول، تقریب اور تبعید وغیرہ میں کھلا ہوا تفاوت نظر آتا ہے۔ خصوصاً اس وقت جب وہ مختلف مطالب کو یکجا کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن قرآن میں جہاں کہیں ایسی صورت پیش آئی ہے وہاں اس خوبی سے جوڑ ملایا گیا ہے کہ مختلف مؤتلف معلوم ہوتا ہے اور متباین متناسب۔ یہ ایسی خوبی ہے کہ انسان کے کلام میں اس کا پایا جانا محالات سے ہے۔

۵۔ قرآن کا نظم نہ صرف انسان کے بس سے باہر ہے۔ بلکہ جن کے بھی۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ دعویٰ محتاج ثبوت ہے اور اس کا یقینی ثبوت ملنا ممکن ہی نہیں مگر یہ تو معلوم ہے کہ عربوں کے پاس کچھ ایسا کلام محفوظ ہے جسے وہ اجنہ سے منسوب کرتے ہیں اس کا مقابلہ اگر قرآن سے کیا جائے تو اس دعوی کی صداقت صاف ظاہر ہو جاتی ہے۔

۶۔ کلام عرب کے تمام اصناف مثلاً بسط اور اختصار، جمع اور تفریق، استعارہ اور تصریح۔ تجوّز

اور تحقیق وغیرہ وغیرہ قرآن میں موجود ہیں اور ایسی خوبی سے موجود ہیں کہ عام کلام میں اس کی مثال مل ہی نہیں سکتی۔

۷۔ یہ واقعہ ہے کہ مروجہ خیالات کے لئے الفاظ کا انتخاب اتنا مشکل نہیں جتنا بالکل نئے خیالات کے لئے۔ اس حقیقت کو پیش نظر رکھ کر اگر دیکھا جائے کہ ان مطالب کے ادا کرنے کے لئے جو عرب میں ناپید تھے اور شریعت یا اصول دین سے متعلق ہیں قرآن میں کس قدر مناسب اور سڈول الفاظ استعمال کئے گئے ہیں تو یہ نکتہ اور واضح ہو جائے گا کہ قرآن بشر کا کلام نہیں ہے

۸۔ کسی کلام کی فصاحت اور فضیلت کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ اس میں سے کوئی خاص لفظ لیکر کسی دوسرے کلام میں استعمال کیا جائے اور وہ لفظ ذہن کو اپنی طرف کھینچ لے۔ یہ خوبی قرآن میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ قرآن کا کوئی مخصوص لفظ کسی جملے یا شعر میں اسی طرح چمکتا ہے جیسے کسی معمولی ہار میں یاقوت یا موتی۔

۹۔ عربی میں حروف تہجی کی تعداد ۲۹ ہے۔ قرآن کی ان سورتوں کی تعداد جن کی ابتدا حروف سے ہوئی ہے ۲۸ ہے۔ وہ حروف جو اس طرح استعمال کئے گئے ہیں اس تعداد کے نصف یعنی ۱۴ ہیں اس سے یہ دکھانا مقصود ہے کہ قرآن کی بنا بھی انھیں حروف پر ہے جن پر عرب کے کلام کی۔ پھر حروف کی مختلف تقسیمیں کی گئی ہیں مثلاً حروف مہموسہ و مجہورہ، حروف حلق و غیر حلق، حروف شدیدہ و غیر شدیدہ، حروف مطبقہ و منفتحہ۔ کمال یہ ہے کہ ہر قسم کے حروف میں سے پورے نصف سورتوں کے شروع میں آئے ہیں۔ یہ تقسیمیں نزول قرآن کے بہت بعد کی گئی ہیں اور یہ حقیقت کہ ہر قسم سے پورے نصف حروف لئے گئے ہیں علم غیب پر دلالت کرتی ہے اور یہ سوا خدا کے اور کسی کے اختیار میں نہیں۔

۱۰۔ قرآن کے الفاظ سادے اور اس کے معانی عام فہم ہیں، وحشی الفاظ اور غریب ترکیبوں کا استعمال اس میں کہیں نہیں ہے لیکن باوجود اس سادگی کے اس کا مثیل کلام پیش کرنا ممکن نہیں، اب اسے معجزہ نہ کہیں تو اور کیا کہیں۔

یہ ہیں باقلانی کے دس نکتے۔ کتاب کا باقی حصہ انھیں نکات کی توضیح اور تشریح کے لئے

وقف ہے۔ ان نکات کو کماحقہ سمجھنے کے لئے پوری کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔ اس سے زیادہ تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔ باقلانی کی کتاب اس سلسلے میں گویا بیچ کی کڑی ہے۔ اعجاز قرآن کے وہ تمام دلائل جو اس سے پہلے پیش کئے گئے تھے یہاں آکر جمع ہوئے اور پھر یہاں سے نکل کر بعد کی تصانیف میں جاگزیں ہوتے ہیں۔ اب ہم چوتھی صدی ہجری کے آخر تک پہنچ گئے ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جب بیشتر اسلامی عقائد ایک خاص قسم کی سختی اختیار کر چکے تھے۔ یہ کیفیت ان میں کم و بیش اس وقت تک قائم ہے۔ چوتھی صدی میں کلام کی عمارت مکمل ہو گئی، اب صرف آرائش اور زیبائش کا کام باقی رہ گیا تھا۔ جو بعد کے متکلمین کو ملا۔

دلیل صرفہ کے سب سے بڑے حامی سید شریف مرتضیٰ تھے۔ یہ غالباً آخری شخص تھے جو اعجاز قرآن کی صرف یہی ایک قطعی دلیل قرار دیتے تھے۔ افسوس کہ ان کی کتاب جس میں انھوں نے تفصیلی بحث کی تھی نہیں ملتی لیکن جیسا کہ انھوں نے خود اپنے ایک خط میں بیان کیا ہے سب سے زیادہ اہم نکتہ یہ تھا کہ ہم قرآن کے بعض ٹکڑوں اور عرب کے فصیح ترین کلام میں بغیر بحث و استدلال صرف پہلی نظر میں فرق نہیں کر سکتے حالانکہ عرب کے فصیح تر اور کم فصیح کلام میں ایسا فرق ممکن ہے ایسی حالت میں صرف یہی ایک قطعی دلیل ہو سکتی ہے کہ عرب اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہ پیش کر سکے یا بہ الفاظ دیگر معجزہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عرب کو قرآن کا مقابلہ کرنے سے روک[1] دیا۔

اب دلائل سے متعلق کچھ زیادہ نہیں کہنا ہے۔ اس عہد کے بعد متکلمین کی کوشش نئے دلائل کی تلاش میں نہیں صرف ہوتی تھی بلکہ پرانے دلائل کو نئے انداز سے بیان کرتے ہیں۔ اس کا صحیح اندازہ صرف ان کی تصانیف کے مطالعے سے ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر ماوردی[2] کو لے لیجئے۔ وہ اعجاز کے ثبوت میں بیس دلیلوں کے پیش کرنے کا فخر حاصل کرنا چاہتا ہے لیکن صرف ایک دلیل

---

[1] دلیل صرفہ درحقیقت شیعہ متکلمین کے یہاں متکلمین اہل سنت سے زیادہ ملتی ہے۔ اس سے ضمناً یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ شیعوں کے علم کلام کو تعلق معتزلہ سے بہت گہرا ہے اور خصوصاً متقدمین معتزلہ سے۔ [2] اعلام النبوۃ ص ۵۳۔۵۰

نئی معلوم ہوتی ہے اور وہ یہ ہے کہ قرآن کا حفظ کرنا بہت آسان ہے اور نہ صرف عرب اس کے
حافظ ہیں بلکہ ایرانی اور قبطی بھی۔ دوسری خصوصیت بعد کے متکلمین کی یہ ہے کہ وہ دلائل کو
بہت پھیلا کر بیان کرتے ہیں مثالاً۔ قاضی عیاض۔ علی الآمدی اور شہرستانی کو لے لیجئے کہ وہ
ایک دلیل کو واضح کرنے کے لئے کئی صفحے لکھتے چلے جاتے ہیں۔ آمدی کی ایک نرالی خصوصیت
یہ بھی ہے کہ وہ ان تمام شبہات کو بیان کرتا ہے جو کسی کو پیدا ہو سکتے ہیں اور پھر ان کا جواب
دیتا ہے۔ لیکن قابل لحاظ امر یہ ہے کہ شبہات کے بیان کرنے میں جس قدر تفصیل سے کام لیتا ہے
ان کے جوابات میں اسی قدر اختصار سے۔ اس سلسلے میں دو نام اور اہمیت رکھتے ہیں۔ ایک تو
راغب اصفہانی کا کہ ان کی تحریر میں ایک خاص شگفتگی اور بحث کی ابتدا کے انداز میں
ایک خاص جدت نظر آتی ہے اور دوسرے ابن حزم کا۔ ان کے یہاں دلائل کی جو کمی ہے وہ
لعنت ملامت اور دشنام سے پوری کی گئی ہے۔ یہ شرف ان کو بخشا جاتا ہے جو ابن حزم سے
اختلاف رائے کی جرات رکھتے ہیں۔

۷۔ منکرین اعجاز اور معارضین قرآن۔

پہلے باب میں ہم ان اقوال کا ذکر کر چکے ہیں جو قرآن سے متعلق کفار مکہ سے خود قرآن میں
منقول ہیں۔ رسول کی حیات میں ہی کچھ لوگ ایسے پیدا ہو گئے تھے جو یا تو نبوت کے مدعی تھے یا
قرآن کے مقابلے میں اپنا کلام پیش کرتے تھے۔ انھیں میں سے نضر بن حارث بھی تھا جو نواح مکہ
میں رہتا تھا۔ اس نے نبوت کا دعویٰ تو نہیں کیا لیکن وہ شاہان عجم کے قصے بیان کیا کرتا تھا
اور اس طرح بزعم خود ان قصص کا مقابلہ کرتا تھا جو قرآن میں انبیاء و اقوام سلف کے مذکور ہیں
نضر غالباً ان لوگوں کا نمائندہ تھا جو کہتے تھے کہ محمد محض ایک قصہ گو ہیں اور قرآن کی حیثیت
داستان پارینہ سے زیادہ نہیں۔ اس کے قصوں کا کوئی حصہ بھی کسی نے نقل نہیں کیا ہے۔ کہ کچھ

اندازہ ہو سکتا ہے[1]

مدعیان نبوت میں سب سے زیادہ مشہور مسیلمہ بن حبیب تھا جو بنی حنیفہ یمامہ کا سردار تھا اس نے رسول کی زندگی کے آخری ایام میں ہی اس دعویٰ کا اظہار کر دیا تھا اور کہا جاتا ہے کہ ایک خط بھی مدینہ روانہ کیا تھا جس کے چند الفاظ یہ ہیں۔ "میں اس دنیا میں تمھارا شریک بنایا گیا ہوں۔ آدھا ملک ہمارا اور آدھا قریش کا۔ مگر قریش ایک سرکش جماعت ہے[2]....." رسول کی وفات کے بعد مسیلمہ نے بہت زور پکڑا اور اس کے متبعین کی تعداد اتنی زیادہ ہوگئی کہ ابوبکر کو ایک بہت بڑی فوج اس کے مقابلے کے لئے روانہ کرنی پڑی۔ اس جنگ میں مسیلمہ مارا گیا۔ اس کے بعض اقوال ہم تک پہنچے ہیں مگر وہ سب کے سب قرآن کی نقل ہیں اور کسی قسم کی ادبی خوبی سے بالکل عاری ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ بعد والوں نے ان کو گھڑ کر اس کے نام سے محض اس کا خاکہ اڑانے کیلئے منسوب کر دیا ہو[3]۔ دوسرے مدعی (۱) عبھلہ بن کعب (الاسود العنسی ذوالخمار) (۲) سجاح بنت الحارث (از بنی تمیم) اور (۳) طلیحہ بن خویلد (از بنی اسد) تھے۔ ان کے اقوال میں سے صرف دو دو ایک ایک فقرے منقول ہیں اور ان کے بارے میں کسی قسم کی رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔

دوسری صدی ہجری کے وسط میں جب آزاد خیالی کی ایک لہر دوڑ گئی تھی بعض لوگ

---

[1] ابن ہشام، سیرت مطبوعہ گوٹنگن ۱۸۶۰ء ج ۱ ص ۱۹۱-۲۱، طبری، تاریخ مطبوعہ لائڈن ۱۸۸۱ء ج ۱ ص ۱۷۴۸-۱۷۵۰۔

[2] (۲) مسیلمہ کے حالات کیلئے ملاحظہ ہو تاریخ طبری ج ۱ ص ۱۷۳۷-۴۸، ۱۷۹۵-۹۸، ۱۹۱۵-۲۰، ۱۹۲۹-۴۹، اور سیرت ابن ہشام ۹۴۵-۴۶، ۹۶۳-۶۴ (۳) تاریخ طبری۔ ج ۱ ص ۱۷۹۵-۹۸، ۱۸۵۳-۵۸، ۱۸۷۰-۷۱، ۱۹۹۷-۲۰۰۱ اور ابن ہشام ص ۹۶۴ (۵) تاریخ طبری ج ۱ ص ۱۹۰۰، ۱۹۱۱-۲۱، ۱۹۲۰، (۶) تاریخ طبری ج ۱ ص ۱۸۸۵-۸۸، ۱۸۹۰-۹۳، ۲۲۵۸-۶۵، ۲۳۲۷-۲۹ اور ابن ہشام ص ۵۲۴۔ اس کا نام غالباً طلحہ بن خالد ہوگا اور اسی طرح مسلمۃ کا مسلمہ۔۔ بعد والوں نے تحقیر کے لئے تصغیر کر دی ہوگی۔

اس سلسلے میں بہت مشہور ہوئے۔ ان میں سے زیادہ مشہور ابن المقفع[1]، بشار بن برد[2]، صالح بن عبد القدوس[3] اور عبد الحمید کاتب[4] تھے۔ ان میں سے ہر ایک باکمال اہل قلم یا شاعر تھا۔ کہا یہ جاتا ہے کہ یہ لوگ اپنی مجلس میں قرآن پر اعتراضات اور اس کے معارضے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ ابن المقفع سے متعلق یہ روایت بہت عام ہے۔ عربی ادب کی تاریخ میں یہ کیفیت بہت دلچسپ ہے کہ ابتدائی زمانے کے بہترین نثر نگار اور بعض شعراء پر معارضۂ قرآن کا الزام لگایا گیا ہے۔ لیکن یہ تمام روایتیں ختم ایک ہی نکتے پر ہوتی ہیں اور وہ یہ ہے کہ باوجود عرصۂ دراز کی کوشش کے ان میں سے ہر ایک کو ہار ماننی پڑی اور کوئی چیز جواب میں نہ پیش کر سکے۔ اسی سلسلے میں ابو الطیب المتنبی[5] (م ۳۵۴ھ) قابوس بن وشمگیر[6] (م ۴۰۳ھ) اور ابو العلاء المعری[7] (م ۴۴۹ھ) کا نام بھی لیا جاتا ہے۔ متنبی[8] کا تو لقب ہی اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ اس پر ادّعائے نبوت کا الزام عائد ہوتا ہے۔ یہ قصے بظاہر قرین قیاس معلوم ہوتے ہیں اول تو یہ کہ ان تمام افراد کے بارے میں یقینی طور پر یہ معلوم ہے کہ یہ راسخ العقیدہ نہ تھے۔ پھر اس پر طرہ یہ کہ۔ اور غالباً یہی اصلی وجہ اس الزام کی ہے۔ ان میں

---

[1] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام۔ ابن المقفع، اور شرح حال عبد اللہ بن المقفع فارسی از عباس اقبال آشتیانی مطبوعہ برلن ۱۹۲۶ء (۲) انسائیکلوپیڈیا آف اسلام بشار، اور بشار بن برد لمنصور حسین، مطبوعہ مصر (۳) (۱) Goldziher

S. B. A. W. Und das Zindiqtum (Transactions of the 9th Orientalists Congress, London Vol II pp 104-129 (2) Nicholson's Lit. Hist p. 374

(۴) ابن خلکان ج ۲ ص ۱۷۳ (دی سلان) اور مروج الذہب للمسعودی ج ۶ ص ۸۱ (۵) نکلسن ۳۰۴ تا ۳۱۲ بروکلمان ج ۱ ص ۸۶-۸۸ (۶) قابوس وشمگیر (مطبوعات ایرانشہر برلن ۱۹۲۰) (۲) یتیمۃ الدہر للثعلبی ج ۳ (۳) الآثار الباقیہ (مقدمہ) للبیرونی (۴) تاریخ طبرستان لابن اسفندیار۔ (۷) انسائیکلوپیڈیا۔ ابو العلاء (۲) طٰہٰ حسین: ذکری ابی العلاء مطبوعہ مصر (۳) عبد العزیز میمن راجکوٹی۔ ابو العلاء ماله وما علیه۔ مطبوعہ مصر

سے بڑا[1] ایک صاحب طرز نثر نگار یا شاعر تھا تخیل عامہ ہر زمانے میں بلند پرواز رہی ہے اور یہ امر بھی مسلّم ہے کہ مرور زمانہ افواہ کو تاریخی واقعات اور افسانے کو حقیقت بنا دیتا ہے۔ خصوصاً اعتقادات عامہ کے مخالفین کے فرد قرارداد جرم میں تو دنیا کی ہر گردش ایک نئے جرم کا اضافہ کر دیتی ہے۔ اس مسئلے میں شہادت کا جہاں تک تعلق ہے وہ اس کے لئے کفایت نہیں کرتی کہ ہم ان ادبا پر اتنا بڑا الزام لگا دیں۔ پھر اس کا بھی لحاظ رہے کہ ابن المقفع اور اس کے دوسرے احباب کا زمانہ وہ زمانہ تھا جب اسلامی عقائد کی تشکیل شروع ہی ہوئی تھی اور ہر مسئلے میں شدید اختلافات کا ہونا لازمی تھا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ تقریباً اسی زمانے میں اعجاز قرآن کے مسئلے سے پہلی دفعہ بحث کی گئی تھی۔ اس زمانے میں صاحبان عقل و ہوش کا ایک حلقہ عوام سے الگ قائم تھا اور یہی لوگ اس کے ارکان تھے۔ اس لئے لازمی طور پر ان لوگون کے خیالات عوام کے عقائد سے مختلف رہے ہوں گے۔ رائے عامہ ہمیشہ متشدد ہوتی ہے اور اس کی عدالت میں جو شخص پورا مومن نہیں وہ پورا کافر قرار پاتا ہے۔ اگر کوئی شخص ایک چیز پر ایمان نہیں رکھتا تو زیادہ امکان اسی کا سمجھا جاتا ہے کہ وہ کسی چیز پر ایمان نہیں رکھتا۔ عوام کی منطق یہی ہے اور اسی سے وہ دنیا اس کی قسمت کا فیصلہ کرتے ہیں۔ پھر ابن المقفع اور اس کے ساتھیوں کو مستثنیٰ کیوں کیا جاتا۔

ابن المقفع پر ایک الزام اور ہے جو اس سے زیادہ سنگین ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے ایک کتاب اسلام کے خلاف لکھی تھی اور اس میں خاص طور پر قرآن پر اعتراضات کئے تھے۔ اس الزام کے ثبوت میں صرف ایک شہادت ملتی ہے۔ القاسم بن ابراہیم الرسّی (م ۲۴۶ھ) بانی حکومت زیدیہ یمن کی تصانیف میں ایک رسالہ موجود ہے جس کا نام ہے "کتاب الرّد علی الزندیق اللعین ابن المقفع"[2]، اس میں انھوں نے ابن المقفع کی کتاب کے جملے نقل کرکے اس کا تفصیلی جواب دیا ہے۔ اس

---

(1) S. Lanepool. Moh. Dynasties, London 1894 p. 102

(۲) مرتبہ و شائع کردہ گویدی۔ روما ۱۹۲۷ء

مسئلے پر تو کافی بحث ہو چکی ہے اور اب اس میں شبہے کی گنجائش بھی نہیں کہ یہ رسالہ قاسم بن ابراہیم کی تصنیف ہے۔[1] لیکن یہ امر بہت مشتبہ ہے اور اس سے ابھی تک کسی نے بحث بھی نہیں کی ہے کہ آیا وہ کتاب جس کی تردید قاسم نے کی واقعی ابن المقفع کی تصنیف تھی۔ اس کے خلاف خارجی اور داخلی دونوں قسم کی شہادتیں موجود ہیں۔ اول تو یہ کہ اور کسی ذریعہ سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ ابن المقفع نے کوئی ایسی کتاب لکھی ہو۔ اس کی تصانیف کی فہرست عام طور پر منقول ہے اور اس میں اس قسم کی کوئی تصنیف نہیں۔ اس کے علاوہ اس کے حالات اور اطوار کا جہاں تک علم کتابوں سے ہوتا ہے اس سے بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ اس قسم کے مباحث سے دور رہنے والا انسان تھا داخلی شہادت اس کے خلاف یہ ہے کہ کتاب کے جو فقرے قاسم نے نقل کئے ہیں وہ نہ تو مصنف کی اعلیٰ ذہنی قابلیت پر دلالت کرتے ہیں اور نہ ان میں طرز تحریر کی کوئی خوبی ہے۔ خود قاسم کی رائے میں بھی وہ کتاب "المجمع البیان" تھی حالانکہ اس میں شک اور شبہے کی مطلق گنجائش نہیں کہ ابن المقفع نہ صرف عربی طرز تحریر کا مالک تھا بلکہ ذہنی صلاحیت میں بھی ممتاز حیثیت رکھتا تھا۔ ہمیں اس میں شک کرنے کی تو کوئی وجہ نہیں کہ قاسم بن ابراہیم کو ایک کتاب ایسی ملی تھی جس میں اسلام اور قرآن پر اعتراضات تھے اور اس کا مصنف فرقہ ثنویہ سے تعلق رکھتا تھا اور کچھ ایسے اسباب بھی تھے جن کی بنا پر قاسم نے یہ خیال کیا کہ وہ کتاب ابن المقفع کی تصنیف تھی۔ لیکن قاسم بن ابراہیم کا زمانہ ابن المقفع سے تقریباً ایک صدی بعد کا ہے اور وہ مرکز خلافت سے دور یمن میں رہتے تھے۔ اس زمانے میں ثنویہ کی تصانیف پھیل رہی تھیں اور بیشتر گمنام تھیں۔ مصنفین کے بارے میں عام طور پر قیاس آرائیاں بھی ضرور ہوتی ہوں گی اس لئے کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ان کتابوں میں سے ایک ابن المقفع سے

---

1 (1) Nyberg in O.L.Z. 1929 p 425 ff. (2) Bergsträsser in Islamica, 1930 p 294 ff (3) کتاب الرد ص ۸۔

منسوب کردی گئی کیونکہ وہ ایک مشہور اہل قلم تھا، زندیق ہونے کا الزام اس پر لگایا جا چکا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس نے پہلوی سے بعض مذہبی رسائل کا ترجمہ بھی کیا تھا۔ قاسم نے جو سرتاپا ایک پر جوش مبلغ تھے اس نسبت کو بے چون وچرا تسلیم کرلیا اور لگے اس کی تردید کرنے۔ ان کے لئے فطرتاً یہ مسئلہ بالکل ثانوی حیثیت رکھتا تھا کہ واقعی اس کتاب کا مصنف کون تھا۔ اصل حقیقت ان کیلئے یہ تھی کہ جو بھی اس کا مصنف تھا وہ زندیق اور لعین تھا۔ مصنف کی تحقیق کی نہ انھیں فرصت تھی اور نہ ضرورت۔

مامون کے عہد میں (۱۹۸ تا ۲۱۸ھ) جب روشن خیالی کی نہ صرف تلقین ہوتی تھی بلکہ لوگوں کو بجبر روشن خیال بنایا جاتا تھا سب سے بڑا مسئلہ خلق قرآن کا تھا۔ اعجاز قرآن کا مسئلہ یا تو بالکل ٹال دیا گیا ہوگا یا اسے ضمنی حیثیت دے دی گئی ہوگی لیکن اس زمانے کا ایک واقعہ بہت قابل لحاظ ہے۔ مامون کے ایک درباری نے جس کا خلیفہ سے کوئی رشتہ بھی تھا اور جس کا نام عبداللہ بن اسمٰعیل الہاشمی کہا جاتا ہے اپنے ایک دوست کو جو کسی زمانے میں مامون کا درباری رہ چکا تھا لیکن راسخ عیسائی تھا اور جس کا نام عبدالمسیح بن اسحاق الکندی بتایا جاتا ہے ایک طویل خط لکھا جس میں اسے دین اسلام قبول کرنے کی دعوت دی اور عیسائیت پر اسلام کی فضیلت ثابت کرنے کی کوشش کی۔ عبداللہ الہاشمی نے محمد کی رسالت کے ثبوت میں ایک دلیل۔ قدرتی طور پر۔ اعجاز قرآن کی بھی پیش کی تھی۔ کندی نے اس خط کے جواب میں ایک طویل تر خط لکھا جس میں ہاشمی کے تمام دلائل کا ایک ایک کرکے جواب دیا اور خصوصاً قرآن سے متعلق جو دلائل تھے ان کی بہت تفصیلی تردید کی۔ اس سلسلے میں اس نے قرآن کی جمع وترتیب پر اس کی زبان، طرز ادا اور مضامین پر بہت سے اعتراضات وارد کئے ہیں۔ مختصر یہ ہے کہ ہر ممکن ذریعے سے اس نے اعجاز قرآن کے اسلامی عقیدے کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں اس لئے کہ ان معدودے چند رسائل میں سے جو اسلام کے ابتدائی عہد میں اس کے خلاف لکھے گئے تھے غالباً یہی ایک اب تک دستیاب ہوتا ہے۔ (نوٹ اگلے صفحے پر دیکھئے)

اس کے تھوڑے ہی دنوں بعد ایک شخص نمودار ہوا جس کا نام ابوالحسین احمد بن یحییٰ تھا لیکن جو ابن الراوندی کے نام سے مشہور ہے (م ۲۵۰ھ) آخری عمر میں اس شخص کا خاص مشغلہ عقائد اسلام اور خصوصاً قرآن پر اعتراضات تراشنا ہی رہ گیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے کئی کتابیں اس موضوع پر لکھی تھیں۔ ایک کا نام جس میں اس نے صرف قرآن پر اعتراضات کئے تھے 'الدامغ' تھا۔ یہ کتاب غالباً اس نے بعض یہودیوں کی فرمائش پر لکھی تھی جن کے یہاں وہ حکومت وقت کے خوف سے روپوش تھا۔ اس کی مثال غالباً ہمارے زمانے کے بعض ان صحافیوں کی سی ہے جو بلا پس و پیش ایک ہی مسئلے کی موافقت اور مخالفت میں یکساں طمطراق کے ساتھ معاوضہ حاصل کرنے کے لئے مضامین لکھنے پر تیار نظر آتے ہیں۔ اس کی بیشمار تصانیف میں سے صرف جستہ جستہ ٹکڑے ملتے ہیں اور وہ عام طور پر ان کتابوں میں جو اس کی تردید میں لکھی گئی تھیں۔[2]

وہ اعتراضات جو عہد بہ عہد قرآن پر وارد کئے گئے ہیں اور مسلمانوں نے ان کے جوابات

---

[1] یہ دونوں خط مصر میں طبع ہو چکے ہیں۔ رسالۃ الھاشمی الی الکندی و رسالۃ الکندی الی الھاشمی مصر ۱۸۹۵ء اس سے پہلے ان خطوط کا خلاصہ سر ولیم میور نے ایک انگریزی مضمون میں کیا تھا جو لندن میں ۱۸۸۰ء میں طبع ہوا ہے۔ ان خطوط کے دونوں کاتبوں کے نام فرضی معلوم ہوتے ہیں۔ عبداللہ اور عبدالمسیح۔ ابن اسمٰعیل اور ابن اسحاق، ہاشمی اور کندی میں ایسا کھلا ہوا تقابل ہے کہ اسے اتفاق پر مبنی سمجھنا مشکل ہے غالباً اصلی نام مصلحتاً پوشیدہ رکھے گئے تھے لیکن اس میں شک کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ یہ خطوط مامون کے عہد سے متعلق اور اس کے درباریوں ہی کے ہیں۔ ایک تو انکی زبان بہت قدیم معلوم ہوتی ہے اور طرز استدلال بھی قدیم ہے دوسرے اگر ہم اس نکتے پر غور کریں کہ خلیفہ متوکل نے علی بن ربّن سے ایک کتاب نبوت محمدی کے ثبوت میں لکھوائی تھی تو یہ مسئلہ بالکل حل ہو جاتا ہے۔ متوکل نے مامون کے طرز عمل کی اپنے زمانے میں ہر حیثیت سے مخالفت کی اور اس کی روشن خیالی کے مقابلے میں ہر طرح راسخ الاعتقادی کا ثبوت دیا اس لئے بہت قرین قیاس ہے کہ کتاب الدین والدولۃ کا محرک بھی مامون کے ان اثرات کو محو کرنے کا جذبہ رہا ہو جن کی جھلک ان خطوط میں نظر آتی ہے۔ وہاں ایک عیسائی الکندی اسلام پر اعتراضات

(باقی اگلے صفحے پر)

دئے ہیں۔ ایک مستقل تصنیف کے محتاج ہیں۔ یہ موضوع بہت وسیع ہے اور اس کا مسالہ علم کلام کی کتابوں میں بھرا پڑا ہے۔ بلا استثنا ہر متکلم اعجاز قرآن کی بحث کے بعد ان اعتراضات کا جواب دینا شروع کرتا ہے جو قرآن پر وارد کئے جاتے ہیں، ابو الحسن عبد الجبار ہمدانی اسدآبادی (م ۴۱۵ھ) نے تو ایک مستقل تصنیف ہی اس موضوع کے لئے وقف کر دی ہے۔ اس کتاب کا نام تنزیہ القرآن عن المطاعن ہے۔ اسلام کی دینی تاریخ اور عرب کی لسانی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے بہت مفید ہوگا اگر ان تمام اعتراضات اور ان کے جوابات کو جمع کیا جائے اور اُن کو اچھی طرح مرتب کر کے شائع کیا جائے۔

وارد کرتا ہے اور یہاں ایک سابق عیسائی علی بن ربّن اسلام کی حقانیت پر کتاب لکھتا ہے[۲] ملاحظہ ہو مقدمہ کتاب الانتصار، لعبد الرحیم الخیاط مرتبہ نیبرگ (Nyberg) مطبوعہ مصر سنہ ۱۳۴۴ھ اور رٹر (Ritter) کا مضمون رسالہ Der Islam ج ۱۹ سنہ ۱۹۳۱ء ص۔ [۳] مطبوعہ مصر سنہ ۱۳۲۹ھ

رُوح تہذیب[1]

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گرد شہر   کازدام و دد ملولم و انسانم آرزوست

زیں ہمرہان سست عناصر دلم گرفت   شیر خدا و رستم دستانم آرزوست

گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما

گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

ایک رات عالم خواب میں جب تخیل عقل اور مصلحت کی بندشوں سے آزاد ہوجاتا ہے میرا اور ان شیخ کا ساتھ ہو گیا جو حیوانوں اور چوپاؤں سے بیزار تھے اور ایک انسان کی تلاش میں عمر گذار چکے تھے لیکن انھیں اپنے مقصد میں کامیابی نہ ہوئی تھی انھوں نے اپنی جستجوئے ناکام کا افسانہ مجھے سنایا کہ کس طرح انھوں نے ہر ملک اور ہر قوم کے لوگوں میں ایک ایسے انسان کی جستجو کی جس میں وہ تمام صفات موجود ہوں جنھیں وہ انسانیت کے لئے ضروری سمجھتے ہیں لیکن ان کو پے درپے مایوسی کا شکار رہونا پڑا اور ہمیشہ شریف اور مشہور اور نیک نام انسانوں کی شکل میں ریاکاری، جھوٹ اور نفسانیت کے مجسمے ملے۔ میں ان ستم ظریف حضرت کی طبیعت سے واقف نہ تھا۔ بظاہر نہایت سیدھے سادے مرد معقول معلوم ہوتے تھے۔ میں نے بغیر انجام کو سوچے ہوئے ان سے یہ کہا کہ شاید

---

[1] یہ اس مقالے کا پہلا حصہ ہے جو خواجہ غلام السیّدین صاحب نے اکتوبر ۳۲ء میں اردو اکادمی کے ماہانہ جلسے میں پڑھا۔ اس میں تمہید کے طور پر خواجہ صاحب نے ہماری موجودہ تہذیب کی وہ کیفیت دکھائی ہے جسے خواب پریشاں کہا جا سکتا ہے۔ غالباً اسی رعایت سے شیخ سے ملاقات بھی خواب میں ہوئی اس حصے کو پڑھ کر یہ اندازہ ہوگا کہ ہمیں تہذیب کے صحیح مفہوم پر غور کرنے کی کتنی ضرورت ہے دوسرے حصے میں اسی صحیح مفہوم کی تشریح کی گئی ہے

(مدیر)

آپ کو بدقسمتی سے صرف بُرے لوگوں سے سابقہ پڑا ہوگا۔ میں نے مانا کہ واقعی معنوں میں انسان بہت کم ہیں لیکن بالکل ناپید بھی نہیں۔ میں آپ کو ایسے ایک انسان سے نہیں کئی انسانوں سے ملا دوں گا جن میں وہ صفات موجود ہیں جن کا احترام کرنا سب پر لازم ہے۔ وہ مسکرائے اور راضی ہوگئے اور میں نے یہ حماقت کی کہ ان کی رہنمائی کا فرض اپنے ذمہ لے لیا۔

میں نے سوچا کہ سب سے پہلے ان کی ملاقات اپنے ایک نوجوان دوست سے کراؤں جو بہت مہذب اور تربیت یافتہ ہیں اور میرے خیال میں ایک قابلِ رشک زندگی بسر کرتے ہیں۔ انھوں نے ہندوستان کے علاوہ مغرب میں رہ کر اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے۔ گھر سے خوش حال ہیں۔ خاندانی جائداد کی معقول آمدنی ہے اس لئے نوکری یا کوئی اور کام نہیں کرتے ایک شاندار اور خوبصورت کوٹھی میں رہتے ہیں اور مختلف ادبی اور تہذیبی مشاغل میں اپنا وقت گذارتے ہیں۔ قدرت کی طرف سے بہت صاف ستھرا اور شائستہ مذاق پایا ہے۔ انگریزی اردو اور فارسی ادب میں بہت اچھی نظر ہے۔ ادب لطیف کی طرز کے مضامین لکھتے ہیں جن میں ایک خاص چاشنی ہوتی ہے۔ شعر بھی کہہ لیتے ہیں۔ موسیقی سے بہت دلچسپی ہے اور مشرقی اور مغربی موسیقی کو خوب سمجھتے اور اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ انگلستان میں رہ کر اور یورپ کی سیاحت کے دوران میں انھیں مغربی مصوری کے شاہکاروں کو مطالعہ کرنے کا اچھا موقع ملا ہے۔ اس لئے تصویروں کے حسن و قبح پر بہت قابلیت کے ساتھ رائے دیتے ہیں۔ گفتگو بہت معقولیت اور شائستگی سے کرتے ہیں اور چونکہ اپنی فرصت میں اکثر موجودہ زمانے کے ادب اور جدید تصانیف کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں اس لئے زمانہ حال کے رجحانات اور تحریکوں سے باخبر ہیں۔ مختصر یہ کہ خوش نصیبی اور ذاتی قابلیت کی بدولت اپنی زندگی بہت عمدگی اور خوش اسلوبی سے بسر کرتے ہیں اور ہر شخص کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان کی زندگی میں تہذیب اور شائستگی کے تمام لوازم اور تمام قدریں موجود ہیں۔ خیر، میں ان نئے ملاقاتی کو اپنے دوست سے ملانے لے گیا۔ جب ہم لوگ ان کے یہاں پہنچے تو وہ چند دوستوں کے ساتھ بیٹھے گراموفون بجا رہے تھے۔ ہمارے پہنچتے ہی بولے "اس ریکارڈ کو غور سے سنئیے

یہ ایک بہت مشہور روسی گیت ہے" "وا لگا کے کشتیبان کا گیت" جس کو جرمنی کے مشہور استاد کرائسلر نے ستار پر بجایا ہے۔ انھوں نے اس کی تمام خوبیاں اور نکات ہم کو سمجھائے اور واقعہ یہ ہے کہ ان کی با مذاق تحسین کی مدد سے ہم نے اس نغمے سے بہت لطف اٹھایا۔ پھر انھوں نے چند ہندستانی ریکارڈ بجائے، ان کی راگنیوں کی تشریح کی، گانے والوں کی خصوصیات بتائیں، مشرقی اور مغربی موسیقی کا فرق مثالیں دے کر سمجھایا۔ اس کے بعد وہ کچھ دیر تک اردو اور انگریزی ادب کے متعلق گفتگو کرتے رہے۔ اس کے بعد موجودہ رجحانات پر اظہار رائے کیا۔ بہت سی جدید تصانیف ہمیں دکھائیں جو ان کے روز افزوں کتب خانے کی زینت ہیں۔ کہنے لگے "میں شاعری میں قدیم کلاسیکی انداز کا قائل ہوں۔ خواہ آپ مجھے قدامت پسند ہی کیوں نہ سمجھیں۔ مجھے نہ موجودہ اردو شعراء کے نئے اور بھونڈے تجربے پسند ہیں نہ انگریزی شعراء کی وزن اور قافیہ سے آزاد شاعری جس میں نہ توازن ہے نہ ہم آہنگی۔ بات یہ ہے کہ شعر اور موسیقی میں بہت قریبی تعلق ہے جس شعر میں موسیقیت نہ ہو وہ میرے نزدیک شعر ہی نہیں ......" کچھ دیر تک اس موضوع پر گفتگو رہی۔ اس کے بعد کچھ ذکر سینما کا چھڑ گیا۔ انھیں سینما کے متعلق غضب کی واقفیت ہے۔ انھیں یہ معلوم ہے کہ ہر مشہور ایکٹر اور ایکٹرس نے کن فلموں میں کام کیا ہے ان کی تنخواہیں کس قدر ہیں۔ ان کی عمر کیا ہے۔ آنکھوں اور بالوں کا رنگ کیسا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کی کتنی مرتبہ شادی ہوئی ہے اور کتنی مرتبہ طلاق؟ اُن کے پاس ایک نہایت خوبصورت چمڑے کی جلد کی نوٹ بک ہے جس میں انھوں نے بترتیب حروف تہجی ان تمام فلموں کی فہرست لکھی ہے جو انھوں نے دیکھے ہیں اور دوسری نوٹ بک میں تمام مشہور ایکٹروں کے حالات درج ہیں۔ انھوں نے اپنے شوق سے ان کی تصویروں کے بہت سے البم جمع کیے ہیں جن میں سے متعدد تصویروں پر صاحبانِ تصویر کے دستخط موجود ہیں! وہ سینما کو محض تفریحاً نہیں دیکھتے بلکہ اس کو ذہنی اور اخلاقی تعلیم کا ایک زبردست آلہ سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ہندوستانیوں کی سیاسی تربیت میں بھی اس کو بڑا دخل ہے۔ کیونکہ مغربی تہذیب کا پردہ ان کی نظروں میں اسی

سے قاصر کیا ہے.... وہ اس گفتگو میں منہمک تھے کہ شیخ صاحب نے ایک بالکل غیر متعلق بات چھیڑ دی۔ کہنے لگے کیوں صاحب۔ آپ تو بہت بڑے زمیندار ہیں۔ آپ کے بہت سے گاؤں ہوں گے۔ کبھی آپ کو وہاں جانے کا اتفاق بھی ہوتا ہے؟" انھوں نے کہا "جی ہاں ابھی کچھ عرصہ ہوا میں اپنے گاؤں گیا تھا اور کچھ روز وہاں ٹھیرا تھا" پوچھا "فرمائیے آپ کے گاؤں سے اور گاؤں والوں سے بھی کچھ دلچسپی اور تعلق ہے یا نہیں" انھوں نے کہا "جی ہاں، مجھے گاؤں سے اور اس کی سادہ زندگی سے بہت دلچسپی ہے، برسات ختم ہونے کے بعد، اکتوبر کے مہینہ میں، جب زمین زمردین سبزے اور شفاف پانی سے ڈھکی ہوتی ہے اور میلوں تک ہرے بھرے کھیت لہلہاتے نظر آتے ہیں، میں اکثر ایک آدھ ہفتہ دیہات میں بسر کرتا ہوں۔ شہروں کی زندگی میں بہت تصنع اور تکلف ہے۔ کبھی کبھی خود بخود جی چاہتا ہے کہ انسان اس سے بھاگ کر چند روز فطرت کے سادہ اور خوشگوار مناظر کا لطف اٹھائے۔ میں جب کبھی چند روز اپنے گاؤں کے مکان میں بسر کرتا ہوں تو ہمیشہ تازہ دم ہو کر لوٹتا ہوں۔ اور ایک خاص اطمینان اور سکون قلب محسوس کرتا ہوں اگر انسان وہاں گندگی اور غلاظت سے محفوظ رہ سکے اور اس کے ساتھ چند کتابیں اور گراموفون وغیرہ ہوں تو تبدیل آب وہوا اور تبدیل مقام کے لئے گاؤں سے بہتر اور کون سی جگہ ہو سکتی ہے! مزدور اور کاشتکار سب اپنی رعایا ہیں۔ کام کے لئے ہر قسم کی سہولت شکار کا انتظام بہت عمدہ ہو سکتا ہے۔

شیخ صاحب نے کہا "جی ہاں۔ یہ تو میں سمجھا لیکن میں نے یہ دریافت کیا تھا کہ آپ کو گاؤں کے لوگوں سے بھی کچھ دلچسپی ہے یا نہیں جو اسی گندگی اور غلاظت میں بستے ہیں جس سے آپ بھاگتے ہیں اور جن کے پاس نہ گراموفون ہے نہ کتابیں۔ وہ آپ کی رعایا ہیں نہ؟ ان سے آپ کے تعلقات اور مراسم کیسے ہیں؟" انھوں نے جواب دیا "سنئے، شیخ صاحب، میرا عقیدہ یہ ہے کہ زمیندار کو ہمیشہ کاشتکاروں کے ساتھ خوشگوار تعلقات رکھنے چاہئیں۔ میرا اصول یہ ہے کہ میں سال میں ایک مرتبہ اپنے دیہات میں ضرور جاتا ہوں۔ اپنے کسانوں اور کاشتکاروں

سے ملتا ہوں۔ مسکرا کر) نذرانہ وصول کرتا ہوں فصل کے حالات دریافت کرتا ہوں۔ ان سے پوچھتا ہوں
کہ انھیں کسی بات کی شکایت تو نہیں ہے۔ جو کچھ انتظام یا رعایت وہ کرانا چاہتے ہیں اس کا وعدہ
کر لیتا ہوں لیکن (دوبارہ مسکرا کر) یہ تو آپ جانتے ہیں کہ وعدہ آسان ہے، وعدہ کی وفا مشکل ہے۔ میرا
اصول ہے کہ زمیندار کو اپنی رعایا کے ساتھ خود نرمی اور مہربانی سے پیش آنا چاہیئے تاکہ جب وہ اس
سے ملیں تو اسے اپنا محسن اور دوست سمجھیں۔ لگان کی وصولی وغیرہ میں جو کچھ سختی کرنی ضروری
ہو اسے کارندوں پر چھوڑ دینا چاہیئے۔ میں نے مانا کہ سختی کے بغیر کام نہیں چلتا لیکن آپ جانتے
ہیں کہ آج کل زمانہ نازک ہے، سختی اور نرمی کو ملا کر کام نکالنا چاہیئے اور بہترین تقسیم عمل یہی ہے
کہ زمیندار خود نرمی سے کام لے اور اس کے کارندے سختی سے! کہئے کیا رائے ہے"؟

شیخ صاحب کو یہ سن کر یارائے ضبط نہ رہا۔ بولے "خدا کا شکر ہے کہ ابھی تک ہندوستان
میں آپ جیسے زمیندار موجود ہیں کیونکہ غریب کسانوں اور کاشتکاروں کی اصلاح اور
بہبود کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ خدا زمینداروں کی عقل کو بالکل سلب اور معطل
کردے اور ان کے انسانی جذبات مفقود ہو جائیں۔ اس وقت انشاء اللہ یہ نظام، جو ظلم اور ناانصافی
کی بنیاد پر قائم ہے، خود اپنی تباہی کا باعث ہو جائے گا۔ آپ ان جفاکش اور جفا نصیب
کسانوں کی محنت میں سے اپنا حصہ "سختی اور نرمی کو ملا کر" وصول کر لیتے ہیں اور اس کے برتے پر
عیش و آرام کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ گراموفون بجاتے ہیں۔ شعر و شاعری کا لطف اٹھاتے ہیں،
سینما دیکھتے ہیں، خوبصورت تصویروں سے دلچسپی رکھتے ہیں اور اپنے دل میں سمجھتے ہیں کہ آپ
ایک مہذب انسان ہیں! اور آپ کی طبیعت میں ماشاء اللہ نفاست اس قدر ہے کہ جب آپ
گاؤں میں جا کر تفریح کرتے ہیں تو اس بات کا التزام رکھتے ہیں کہ وہاں کی غلاظت سے محفوظ
رہیں۔ کبھی آپ نے یہ بھی غور کیا ہے کہ یہ لوگ جو بے زبان جانوروں کی طرح آپ کی خاطر اپنا
پسینہ بہاتے ہیں سال میں ۳۶۵ دن اسی گندگی اور غلاظت میں رہتے ہیں۔ کبھی ان کے لئے
بھی آپ نے صفائی یا حفظان صحت یا تعلیم کا کوئی بندوبست کیا؟ نہیں! آپ کو اپنے تہذیب اور

تفریح کے مشاغل سے اتنی فرصت کہاں کہ آپ یہ درد سری مول لیں! آپ نے کبھی اپنے ہاتھوں کو کسی کام یا مزدوری یا محنت سے آلودہ نہیں کیا، آپ کو ان کی زندگی اور قسمت کے لکھے کا کیوں اندازہ ہونے لگا؟

عاشق نہ شدی محنت ہجراں نہ کشیدی کس پیش تو غم نامہ ہجراں چہ سراید؟

مگر تہذیب اسے کہتے ہیں کہ شیخ صاحب کی غضب آلود تقریر سن کر بھی میرے دوست کی پیشانی پر بل نہیں آیا۔ اسی اطمینان قلب اور شائستگی سے فرمانے لگے "شیخ صاحب۔ اس میں ناراض ہونے کی کیا بات ہے! یہ اپنی اپنی رائے ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ ہر شخص کو صرف ایک ہی زندگی ملتی ہے، اسے بار بار تو دنیا میں آنا نہیں ہے۔ اسی زندگی کو غنیمت جان کر اسے چاہیئے کہ اس قلیل مدت میں یہاں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائے۔ علم حاصل کرے، دولت اور قوت حاصل کرے، اپنی ذہنی اور ذوقی قوتوں کی تربیت کرے، فطرت کے مناظر اور فنون لطیفہ کے شاہکاروں سے لطف اٹھائے۔ مختصر یہ کہ اپنی زندگی کو خوش باش طریقہ پر بسر کرے۔ اگر اسے تمام دنیا کی فکر پڑی رہے گی تو اس سے دنیا کو کچھ فائدہ نہ پہنچیگا اور وہ خود ہر طرح کی تہذیب اور تربیت سے محروم رہ جائے گا۔ دنیا میں واقعی ضرورت انفرادیت کو مستحکم کرنے کی ہے اگر ہر شخص اپنی اپنی فکر رکھے تو یہ نہ صرف اس کے لئے مفید ہے بلکہ سوسائٹی کو بھی اس سے فائدہ پہنچیگا۔ آج کل لوگ جذبات کی تنگی اور دل کی کمزوری سے بے بس ہو کر بجائے اپنی ترقی اور اصلاح کی کوشش کرنے کے تمام دنیا کی اصلاح کا بیڑا اٹھا لیتے ہیں لیکن اس جذبات نوازی سے کچھ فائدہ نہیں پہنچتا۔ معاف کیجئے گا آپ کو میری باتیں شاید ناگوار گذریں۔ آپ غالباً خودغرضی کو برا سمجھتے ہیں۔ مگر میری رائے یہ ہے کہ خودغرضی ہی پر عالم کا نظام قائم ہے اور صحیح طور پر قائم ہے۔ اگر میں بھی جا کر گاؤں میں رہنے لگوں اور ان لوگوں کی طرح ہل چلاؤں اور بیلوں کی رکھوالی کروں تو دنیا میں ایک غلیظ جاہل، بدمذاق کسان کا اضافہ ہو جائے گا اور (معاف کیجئے گا) ایک اچھے خاصے تعلیم یافتہ، خوش مذاق، باتہذیب انسان کی کمی! ممکن ہے آپ اس تبدیلی کے لئے تیار ہوں لیکن میں اس کو

کسی طرح اچھا نہیں سمجھتا۔"

جب ہم لوگ وہاں سے نکلے تو شیخ صاحب کا چہرہ بہت غضب آلود تھا۔ دروازہ سے باہر قدم ہی رکھا تھا کہ بہت زور سے کہا۔ "لاحول ولا قوۃ الا باللہ! ارے بھئی، تم نے مجھے کس نقلی انسان سے ملا دیا۔ یہ شخص زیادہ سے زیادہ ایک بہروپیا ہے یا ایک نمائش پسند حیوان۔ کیا تم سنجیدگی سے یہ خیال کرتے ہو کہ اس شخص کو جو فنون لطیفہ سے سطحی دلچسپی رکھتا ہے اور خود غرضی کے فلسفہ کی تلقین کرتا ہے تہذیب سے کوئی سروکار ہے؟ بے شک تہذیب نفس کی تکمیل کے لئے ذوق سلیم ایک نہایت ضروری چیز ہے لیکن اتنا ہی جتنا کسی عمارت کے لئے خوبصورت اور موزوں ہونا۔ اگر عمارت ہی نہ ہو تو کس چیز کو خوبصورت بناؤ گے! اس کا خیال ہے کہ وہ فنون لطیفہ میں بہت دستگاہ رکھتا ہے۔ یہ سراسر غلط فہمی ہے۔ جس شخص کو خدا کے بیشمار بندوں کے کام کاج اور محنت مزدوری سے کوئی سابقہ نہیں پڑا، جس کو کبھی دکھ اور مصیبت اور افلاس کی خلش محسوس نہیں ہوئی، جس نے کبھی انسانوں کے مشترک اغراض و مقاصد میں حصہ نہیں لیا اس کو فنون لطیفہ سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت بھی نصیب نہیں ہوسکتی۔ وہ اپنے خیالات اور نظریوں کی بنیاد الفاظ پر قائم رکھتا ہے جن کی حیثیت محض اتنی ہے کہ وہ ہوا میں تموج پیدا کرتے ہیں اور بس۔ ان کی پشت پناہی کے لئے کوئی شدید اور پرخلوص ذاتی تجربہ نہیں ہوتا۔ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ایک شاعر جو اپنی لافانی نظم سے دنیا کو مالا مال کرتا ہے محض خوبصورت الفاظ کے ساتھ کھیلتا ہے؟ نہیں! اس میں اس کے تلخ اور شیریں تجربات کا عطر ہوتا ہے اس کا خون جگر شامل ہوتا ہے۔ اس کے دل کے تار تمام انسانوں کے دکھ درد کے لئے لرزتے ہیں اور اُن کے ارتعاش کی وجہ سے اس کے الفاظ ہر شخص کے دل میں اتر جاتے ہیں۔ جو شاعر ان تجربات کی دولت سے محروم ہے، جس کو خود غرضی نے تنگ حدود میں قید کر دیا ہے وہ ممکن ہے ایسے شعر کہہ دے جو کانوں کو بھلے معلوم ہوں اور عارضی طور پر دل کو لبھائیں لیکن وہ ہرگز کسی قدر مستقل کے حامی نہیں ہوسکتے۔ اور یاد رکھو کہ شاعری سے حقیقی طور پر لطف اندوز ہونے کے بھی وہی شرائط ہیں جو اچھا شعر کہنے کے، اور یہی حال تمام فنون لطیفہ کا ہے۔ ان سب کی

بنیاد وہی محنت اور مزدوری اور دستکاری ہے جس کو آپ کا شاعر دوست حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اور مجھے اس پر صرف یہی اعتراض نہیں کہ وہ فنون لطیفہ کی اہمیت کا غلط اندازہ کرتا ہے اور ان کا مفہوم نہیں سمجھتا۔ یہ تو ضمنی بات ہے۔ مجھے تو اس کے تمام فلسفہ حیات پر اعتراض اور اس سے اختلاف ہے۔ عزیزمن۔ آج کل ہندوستان میں خاصی تعداد ایسے خوش پوش ذہین اور بظاہر خوش نصیب نوجوانوں کی ہے جن کو قدرت نے سوء اتفاق سے ہر قسم کے مواقع دئے ہیں، آسودگی دی ہے، دماغ اچھا دیا ہے، ان کی تعلیم مروجہ نظام کے مطابق بہت اعلیٰ پیمانہ پر ہوئی ہے۔ مگر وہ ہر لحاظ سے بالکل بیکار بلکہ باعث ضرر ہیں۔ بے کار اس لئے کہ وہ کسی مفید تعمیری کام میں حصہ نہیں لیتے اپنے چھوٹے چھوٹے اغراض و مقاصد میں، اپنی ذاتی دلچسپیوں میں محصور رہنے کو مقصد حیات سمجھتے ہیں کسی عظیم الشان اور سنجیدہ مقصد کے ساتھ خود کو وابستہ نہیں کرتے جس کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی انفرادی قوتوں کی نشو و نما بھی نہیں ہو پاتی کیونکہ کوئی شخص اسوقت تک خود یابی کی منزل پر نہیں پہنچ سکتا جب تک وہ خود کو کسی اہم مقصد کے اندر گم نہ کر دے۔ وہ مضر اس لئے ہیں کہ دوسروں کے لئے ایک غلط لیکن کشش رکھنے والی مثال قائم کرتے ہیں۔ وہ خود تہذیب کا مفہوم غلط سمجھتے ہیں لیکن چونکہ ان کی جماعتی حیثیت اچھی ہوتی ہے اس لئے ان کے خیالات کی اشاعت ہوتی جاتی ہے اور قوم میں غلط قدروں اور غلط معیاروں کا رواج ہوتا جاتا ہے۔ لوگ نمائشی اور سطحی چیزوں کو مستقل اہمیت رکھنے والی چیزوں پر ترجیح دیتے ہیں اور چھوٹے اور بڑے مفلس اور آسودہ حال، تعلیم یافتہ اور جاہل ہر قسم کے لوگ جھوٹے بتوں کی پرستش کرنے لگتے ہیں۔ میں اس قسم کے آدمیوں کو انسان نہیں سمجھتا۔ مجھے کسی انسان کے پاس لے چلو اور اپنا وعدہ پورا کرو۔

ان کی یہ تمام باتیں سن کر میں بہت گھبرایا۔ مگر میں نے سوچا کہ شاید اس قسم کی تہذیب کی وہ قرار واقعی قدر نہیں کر سکتے ممکن ہے خود ان کی تربیت بہت سخت مذہبی اور اخلاقی ماحول میں ہوئی ہو اس لئے اس مرتبہ ان کے سفید بالوں اور متبرک صورت کا خیال کر کے میں انھیں ایک نہایت معزز اور خدا رسیدہ عالم کے پاس لے گیا جن کے تقدس کی بہت دھوم تھی اور جن کے بارے میں لوگوں کا یہ خیال

تھا کہ محض اُن کے پاس بیٹھنے سے دل کی سیاہی کافور ہو جاتی ہے اور ایمان چمک اٹھتا ہے۔ یہ بزرگ عبا و قبا میں ملفوف ایک عالمانہ دستار سر پر باندھے ایک تخت پر متمکن تھے۔ ان کے گرد کچھ فاصلے پر چند طلبہ اور ملاقاتی مودب دو زانو بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے نصیحت آمیز کلام پر سر تحسین ہلا ہلا کر بجا و درست کہ رہے تھے۔ ہم نے بھی با ادب سلام کیا اور ایک طرف بیٹھ گئے۔ مولانا اس وقت دور حاضرہ کی بے دینی اور دہریت پر گفتگو فرما رہے تھے جس کا ماحصل یہ تھا کہ مغربی تعلیم کی وجہ سے نوجوانوں کے دماغ میں آزادی کی مسموم ہوا سرایت کر گئی ہے۔ وہ مذہب اور اس کے عقائد و عبادات کی طرف سے بالکل غافل ہو گئے ہیں، علمارِ دین کا قرار واقعی احترام نہیں کرتے اور اگر یہی حالت قائم رہی تو کیا عجب ہے کہ پروردگار عالم ان پر اپنا قہر و غضب نازل فرمائے جیسا کہ اس نے امم سابقہ پر کیا تھا اس خوفناک تہدید پر حاضرین نے مختلف انداز میں عبرت اور تاسف کا اظہار کیا اور ایک طالب حق نے یہ سوال کیا کہ "قبلہ و کعبہ اس عذاب الٰہی سے بچنے کا بھی کوئی طریقہ ہے یا نہیں۔ سرکار اپنی زبان مبارک سے کوئی ایسا عمل یا اسم تلقین فرمائیں جو حرزِ ایمان ہو اور ہم لوگوں کے خیالات کو راہ راست سے بھٹکنے نہ دے" قبلہ و کعبہ نے ارشاد فرمایا کہ جو لوگ مذہب سے توسل رکھتے ہیں ان کو چاہیئے کہ وہ ہر معاملہ میں عالمان دین سے استصواب کریں اور ان کے ارشاد کے مطابق عمل کریں اور اپنی کوتاہ عقل کو ہر جگہ دخل نہ دیں میں تمہیں ایک دعا بھی لکھ کر دوں گا لیکن یہ نہایت ضروری ہے کہ لوگ خلوص سے عبادت گذاری کریں اور خوف خدا ہر وقت اپنے دل میں رکھیں۔ لیکن یہاں پہنچ کر ان کی آواز میں رعب اور جلال کی شان پیدا ہو گئی) وہ عاقبت نا شناس لوگ جنھوں نے اپنے دلوں میں شکوک کو جگہ دیدی ہے جو خدا اور محافظین شریعت کے احکام پر بے چون و چرا عمل نہیں کرتے اور ہر بات کی وجہ دریافت کرنا چاہتے ہیں ان کے لئے نجات کی کوئی صورت نہیں ان کے لئے حکم الٰہی بالکل صریح ہے "فجزاء ھم جہنم خالدین فیہا" بخدائے عز و جل اگر دنیا میں علمائے دین کا وجود نہ ہوتا جن کی مثال انبیائے بنی اسرائیل کی ہے تو یقیناً اس امت ناہنجار پر قہر الٰہی نازل ہو چکا ہوتا

اس ارشاد کو سن کر تمام حاضرین پر بالکل سناٹا طاری ہو گیا۔ ان کو اس وقت صریحاً یہ محسوس ہو رہا تھا کہ اگر خدانخواستہ ان کے درمیان سے یہ چند بابرکت ذاتیں اٹھ جائیں تو دنیا کا بالکل خاتمہ ہو جائے۔ اس خموشی کو میرے ساتھی نے نہایت دھیمے اور مودب لہجے میں یہ کہہ کر توڑا "مولانا! جناب نے یہ تو بالکل درست ارشاد کیا کہ آج کل لوگوں میں بے دینی کا رواج بڑھتا جا رہا ہے لیکن اپنی زبان معجز بیان سے اتنا اور ارشاد فرما دیجئے کہ بے دینی کی اس روز افزوں اشاعت کی وجہ کیا ہے اور علمائے دین کی مقتدر جماعت ہوتے ہوئے اس کا تدارک کیوں نہیں ہو سکتا" مولانا نے ذرا چونک کر ان کی طرف دیکھا کیونکہ ان کو ایسے لوگوں سے بالعموم سابقہ نہ پڑتا تھا جو اس قسم کے سوالات ان سے کریں۔ انھوں نے کہا "حضرت میں نے ابھی تو بیان کیا تھا کہ مروجہ بے دینی کی وجہ یہ ہے کہ مغربی تعلیم نے ان کے خیالات کو خراب کر دیا ہے۔ تشکک کی لعنت ان کے دلوں میں پیدا ہو گئی ہے۔ وہ علمائے دین کی عزت اور ان کے مرتبے کو نہیں پہچانتے اس لئے وہ ان کی طرف رجوع نہیں کرتے اور جہالت و ضلالت کے سمندر میں ڈوبتے چلے جاتے ہیں ایسی حالت میں ہم ان کی اصلاح کیسے کر سکتے ہیں؟ جب خداوند تبارک و تعالیٰ اپنی حکمت کاملہ اور مصلحت عالیہ سے ان کے دلوں کو حق کی جانب پھیر دے گا اور وہ ہماری طرف رجوع کریں گے اس وقت انشاء اللہ المستعان ہم ان کی ہدایت کا انتظام کر سکیں گے۔ یہ بات سن کر بجائے خاموش ہو جانے کے شیخ صاحب کج بحثی پر اتر آئے اور بولے "مولانا! معاف کیجئے گا یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ اگر خداوند عالم از خود اپنی حکمت کاملہ سے ان نوجوانوں کے دلوں کو حق کی طرف پھیر دے گا تو اس وقت آپ کی ہدایت کی کیا ضرورت رہے گی۔ کیا ہدایت الٰہی کے بعد بھی کسی انسانی ہدایت کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟ میری رائے ناقص میں تو یہ بات آتی ہے کہ خدائے تعالیٰ اپنی مصلحتوں کو پورا کرنے کے لئے مختلف وسیلوں اور واسطوں سے کام لیتا ہے اور خود جناب نے ابھی ارشاد فرمایا تھا کہ امت کی ہدایت اور نجات کا وسیلہ علمائے دین کی جماعت ہے اس لحاظ سے تو جناب پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ لوگوں کی اصلاح کے لئے جد و جہد کریں اور ان کو راہ راست پر لانے کی تدابیر سوچیں وغیرہ

محض ہادی ہونے کا دعویٰ کرنا کافی نہیں؟" مولانا کو شیخ کی یہ گستاخی اور آزادیٔ رائے ناگوار گذری لیکن انھوں نے تحمل سے کام لے کر فرمایا۔ حضرت میں آپ کو نصیحت کرتا ہوں کہ "لاتجسسوا فی امور اللّٰہ" جن معاملات کو انسان نہیں سمجھ سکتا ان میں اسے اپنی عقل نہیں لڑانی چاہیئے۔ کیا آپ یہ نہیں جانتے کہ خدائے عزوجل کے احکام اور مصلحت کو سمجھنا ہر شخص کا کام نہیں۔ ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم احکام الٰہی اور ان کے مفہوم و معانی کو آپ تک پہنچائیں اور آپ کا فرض ہے کہ آپ ہماری تعمیل کریں اور ہدایت و ضلالت کے مسئلہ پر رائے زنی نہ کریں وہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔ جسے چاہتا ہے ضلالت کی طرف لے جاتا ہے" یہ حکم قاطع سن کر ہمارے شیخ صاحب کا تحمل ختم ہو گیا اور انھوں نے اپنے مودب لہجہ اور دھیمی آواز کو خیرباد کہکر ایک پرزور تقریر کر ڈالی۔ فرمانے لگے:۔

"جناب! آپ لوگوں کی عادت ہے کہ بغیر سوچے سمجھے ہر مسئلہ پر ایک حکم قطعی لگا دیتے ہیں اور اس کی تائید میں کوئی غیر متعلق آیت اور اگر آیت دستیاب نہ ہو تو کوئی عربی جملہ سنا دیتے ہیں اور اس طرح آزادیٔ رائے اور اظہار خیال کا سد باب کر دیتے ہیں۔ آپ سمجھتے ہیں مذہب پر ایمان رکھنے کے معنی ہیں آنکھیں بند کر لینا۔ میں سمجھتا ہوں اس کی سب سے بڑی تعلیم یہ ہے کہ عقل کی آنکھیں کھول ڈالو اور ضرور ہر معاملہ میں تلاش، جستجو، طلب حق کرو۔ ختم رسل کے بعد وحی و الہام کا دروازہ بند ہو جانے کا مطلب یہ تھا کہ اب انسان اپنی عقل اور فکر کے دروازے کھول ڈالے لیکن آپ اس کی اجازت نہیں دیتے۔ واقعہ یہ ہے کہ آپ نے جس قدر باتیں بیان فرمائیں سب غلط ہیں (اس پر ادھر ادھر کے لوگوں نے کچھ اظہار ملامت کرنا چاہا لیکن وہ شیخ صاحب کی تقریر کے دھارے کو روک نہ سکے) اسلام نے کبھی یہ تعلیم نہیں دی کہ انسان اپنی عقل اور رائے کو معطل کر دے اور اپنے تمام شکوک و شبہات کا گلہ گھونٹ دے۔ آزادیٔ رائے انسان کا سب سے زیادہ قابل قدر حق ہے اور عقل خدا کی سب سے بڑی نعمت! جب انسان ان سے دستبردار ہو گیا تو اس کے پاس رہ کیا جائے گا؟ رہا شکوک کا پیدا ہونا سو یہ مقتضائے فطرت ہے۔ اگر ان کی تشفی نہ کی جائے بلکہ عذاب الٰہی اور اس سے بھی کہیں زیادہ علمائے دین کے غیظ و غضب سے ڈرا کر انھیں دبا دیا جائے تو اس کا نتیجہ

ہمیشہ روحانی ہلاکت ہوتا ہے۔ ایک سچے اور فطرت شناس عالم کا تو یہ فرض ہے کہ وہ نوجوانوں کے شکوک کی پذیرائی کرے، ان کو کرید کرید کر معلوم کرے اور اپنے زیادہ گہرے اور ہمہ گیر علم کی مدد سے ان کی تشفی کرے۔ آپ کہتے ہیں کہ چونکہ ان کے دل میں شکوک پیدا ہو گئے ہیں اس لئے وہ مذہب اور علمائے دین کی طرف سے بے اعتنائی اور روگردانی کرتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ واقعہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ چونکہ آپ ان کے شکوک کی تشفی نہیں کرتے یا نہیں کر سکتے اس لئے وہ آپ کی طرف سے بدظن ہیں آپ نے مذہب کو بالکل ایک طلسم یا بھول بھلیاں بنا رکھا ہے اور اس میں چاروں طرف نہایت خوفناک اوامر و نواہی کھڑے کر دئے ہیں تاکہ کسی شخص کو جو شروع ہی سے ہر معاملہ میں پوری طرح ہار نہ مان لے اس کے قریب پھٹکنے کی ہمت نہ ہو۔ آپ صرف ان لوگوں کے ساتھ سروکار رکھنا چاہتے ہیں جو ہر بات میں ہاتھ باندھ کر بجا و درست کہیں اور کبھی اختلاف رائے کی جرأت نہ کریں۔ پھر آپ کو دوسرے لوگوں سے یہ شکایت کیوں ہے کہ وہ آپ کی طرف متوجہ نہیں ہوتے آپ نے کبھی اُن کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی، کبھی ان کی مشکلات کے ساتھ ہمدردی نہیں کی۔ کبھی دورِ حاضرہ کے تمدنی مسائل پر غور کر کے اصول و قوانین کو ان پر منطبق نہیں کیا۔ آپ نے تمام تمدنی انقلابات کی طرف سے آنکھیں بند کر کے، تمام جدید مطالبات حیات کی طرف سے روگردانی کر کے چند الفاظ اور علامات، اور لوگوں کو ڈرانے دھمکانے پر قناعت کی۔ آپ مذہب کی خدمت کے معنی یہ سمجھتے ہیں کہ اپنے مکان پر عزت اور آرام اور کم و بیش آسودگی کی زندگی بسر کریں، کبھی کبھی نماز پڑھا دیا کریں، آپ سے جو مسئلہ پوچھا جائے اس کے متعلق اپنا فتویٰ دیدیں اور اگر کوئی شخص آپ سے اختلاف کرے تو اس کو کافر قرار دیں۔ اگر کوئی جدید تحریک شروع ہوتی ہو جس میں پہلے سے آپ کی رائے نہ لی جائے اور جس کا افتتاح آپ کے متبرک ہاتھوں سے نہ ہو تو آپ اس کو ناکامیاب بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ آپ خود دنیاوی جاہ و عزت اور آسائشوں سے کنارہ کش نہیں ہوئے لیکن آپ کی زبانی تلقین و تعلیم یہی ہے کہ دین اور دنیا دو مختلف چیزیں ہیں اور دنیاوی مفاد کے لئے جد و جہد کرنا گناہ ہے۔ اگر کوئی شخص مذہب کے ظاہری ارکان کو پورا کرتا ہو

لیکن معاملات میں بد دیانتی و ناانصافی ہو تو اس کی گرفت کرنا آپ اپنا فرض نہیں سمجھتے۔ انسانوں کی زندگی نوے فی صدی بلکہ اس سے بھی زیادہ دنیوی معاملات اور کاروبار کی زندگی ہے۔ اس کی اصلاح کرنا اس کو اصول عدالت کے ماتحت منظم کرنا آپ کا اصلی فرض تھا۔ لیکن آپ ان کی زندگی کے دس فیصدی حصے پر قانع ہوگئے ہیں اور اس میں بھی آپ نے مذہب کو، جو ابتدا میں ترقی اور ہمت اور حوصلہ کا ضامن تھا، جمود اور قدامت پرستی کا مرادف بنا دیا ہے۔ آپ سے یہ کبھی نہیں ہوتا کہ اپنے مقام معزز کو چھوڑ کر اٹھیں، خدا کی دنیا اور خدا کے بندوں میں گھومیں پھریں۔ ان سے ملیں جلیں، افلاس جہالت توہم پرستی، بیماری اور ظلم و ناانصافی کے دردناک مناظر کو دیکھیں اور انھیں دور کرنے کے لئے اپنا پسینہ بہائیں لباس، انداز، گفتگو اور "شان علم" میں عزت نہیں، عزت تو خدمت میں ہے۔ لیکن خدمت سے آپ کو کوئی واسطہ نہیں۔ کیا آپ کے اور ہمارے ہادی اور سردار سرکار محمد مصطفےٰ نے اشاعت دین اور اعلائے کلمۃ الحق کا فرض اسی طرح انجام دیا تھا جس طرح آپ انجام دیتے ہیں یعنی کیا وہ اپنی جگہ آرام سے بیٹھے رہتے تھے اور جب کسی کو فقہ اور شریعت کے مسائل دریافت کرنے ہوتے وہ خود حاضر خدمت ہوتا اور مسئلہ پوچھ کر چلا جاتا تھا؟ اگر انھوں نے ایسا کیا ہوتا تو کیا انھیں وہ عظیم الشان کامیابی ہوسکتی تھی جو ہوئی؟ ہرگز نہیں انھوں نے چالیس برس کی عمر تک بے غرضی اور بے نفسی کے ساتھ لوگوں کی خدمت کی۔ غریبوں، مظلوموں، بیماروں، محتاجوں، بیکسوں، اور کمزوروں کی دادرسی کی ان کی خاطر مزدوروں کی طرح کام کیا اور اپنی شان امانت کا سکہ دوست دشمن سب کے دلوں پر نقش کر دیا اس کے بعد انھوں نے ہر طرح کے خطروں اور آزمائشوں کو جھیل کر خدا کا پیغام ہر جگہ سنایا اور اس فرض کی ادائیگی میں جس قدر تکلیفیں اور مصیبتیں اٹھانی پڑیں انھیں خندہ پیشانی سے برداشت کیا جب کوئی شخص اخلاق محمدی کا خفیف سا پرتو اپنی ذات میں پیدا کرے جب وہ اپنے نفس کو زیر کرکے دوسروں کے رنج و راحت کو اپنی ذاتی آسائش اور آرام پر ترجیح دینے لگے، جب وہ سچ کی خاطر ہر قسم کی تحریص و ترغیب کو ٹھکرا دے، جب وہ سردار بننے کی بجائے خادم بننے کی کوشش کرے اس وقت "علماء امتی" میں سے ہونے کا دعویٰ کرے ورنہ ایک وضع خاص بنا کر "شان علم" پیدا کرلینے

کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ جناب مولانائے محترم! آپ میری گستاخی کو معاف کر دیجئے مگر میرے الفاظ پر غور کیجئے۔ یہ نہ دیکھئے کہ کون شخص یہ باتیں کہہ رہا ہے بلکہ یہ سوچئے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے، اپنی شان تقدس، اپنے ادعائے بزرگی کو خدا حافظ کہیئے۔ خداوند عزوجل کی بارگاہ میں انسانوں کا ایک دوسرے پر تفوق جتانا اور خود کو ما فوق البشر سمجھنا نہایت مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے۔ اگر آپ کو واقعتاً دین کی حمایت مقصود ہے اور آپ بے دینی کے سیلاب کو روکنا چاہتے ہیں تو دوسرے انسانوں کی طرح انسان بن جائیے اور ان میں مل جل کر ان کے درمیان رہ کر ان کی خدمت کیجئے۔ آزاد خیالی اور مغربی تہذیب وتمدن پر الزام رکھنے سے کام نہیں چلے گا۔ اگر آپ کو دعوائے اجتہاد ہے تو اسلام کی تعلیم کو ایسے انداز میں پیش کیجئے کہ وہ موجودہ تہذیب وتمدن کو کلیتہً مسترد نہ کرے بلکہ اس کے بہترین عناصر کو اپنے اندر ضم کر لے اور لوگوں کے فلاح دارین کا باعث ہو یعنی ان کے دین اور دنیا دونوں کو سدھارے۔ اگر آپ ایسا نہ کریں گے تو آپ سے عیسائی مشنری بہتر ہیں جو مدرسے کھولتے ہیں، دواخانے جاری کرتے ہیں، لوگوں کو صفائی اور حفظان صحت کے اصول سکھاتے ہیں، غریبوں سے ملتے جلتے ہیں۔ ان کو حقارت کی نظر سے نہیں دیکھتے۔ ان کی خدمت کرتے ہیں۔ ان کی مذہبی تلقین غلط سہی ممکن ہے ان کی نیت مشکوک ہو لیکن ان کی معاشرتی خدمات سے کوئی شخص بھی انکار نہیں کر سکتا...... یہ کہہ کر انھوں نے میرا بازو پکڑا اور مجھے ساتھ لے کر بہت تیزی کے ساتھ مکان سے باہر نکل گئے قبل اس کے کہ مولانا ان کو عذاب الیم کی بشارت دیں اور حاضرین مجلس جن پر حیرت اور غصہ دونوں طاری تھے ان کی قرار واقعی خبر لیں۔

...... جب میرے ہوش وحواس ذرا ٹھکانے ہوئے تو میں نے ان سے کہا کہ حضرت آپ برائے خدا اس قسم کی حرکتیں نہ کیجئے ورنہ آپ کے ساتھ میری بھی شامت آجائے گی۔ انھوں نے کہا کہ تم ان ذرا ذرا سی باتوں کا خیال نہ کرو۔ ایسے مواقع تو مجھے آئے دن پیش آتے رہتے ہیں۔ انسان کی تلاش جان جوکھوں کا کام ہے پھولوں کی سیج نہیں۔ میں نے دبی زبان سے کہا "جی ہاں خصوصاً ایسی حالت میں جب اس میں بت شکنی کا مرض بھی شامل ہو۔ مگر یہ تو فرمائیے کہ آپ

کو ان صاحب سے کہاں کی دشمنی تھی کہ آپ نے ان کی اس بری طرح لے دے کر ڈالی اور ان کی بزرگی اور مرتبہ کا ذرا بھی خیال نہ کیا۔ ان مولوی صاحب کی علمی معلومات بہت وسیع ہیں وہ ہر شخص سے اخلاق اور مروت سے پیش آتے ہیں۔ عبادت گذار ہیں بہت پاک زندگی بسر کرتے ہیں۔ سوائے اس قلیل نذرانے کے جو ان کے بعض معتقد از خود پیش کر دیتے ہیں۔ اور وہ بھی اس زمانے میں بہت کم ہو گیا ہے ان کا اور کوئی وسیلہ معاش نہیں لیکن وہ اسی پر قانع ہیں۔ اگر علمیت اور اخلاق، عبادت اور قناعت، نیک نفسی اور مرنجان مرنجی تہذیب اور انسانیت کے اجزاء نہیں ہیں تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ انسانیت سے کیا مراد لیتے ہیں۔

انھوں نے کہا "عزیز من تمھاری نظر سطحی خوبیوں سے خیرہ ہو جاتی ہے۔ اول تو تم نے جس قدر صفات گنائی ہیں ان کا مفہوم میرے نزدیک وہ نہیں جو تم سمجھتے ہو۔ دوسرے ان صفات کو تہذیب و انسانیت سے کوئی لازمی تعلق نہیں۔ مجھے جس انسان کی تلاش ہے اس کے لئے عالم ہونا لوگوں سے اخلاق اور مروت برتنا اور عبادت گذاری کرنا لازم نہیں۔ میں تو عالم دین بھی ایسا چاہتا ہوں جس کو یہ اندیشہ نہ ہو کہ اس کا دامن تقدس عوام کے ساتھ ملنے جلنے اور ان کے دکھ درد، ان کے مشاغل میں شرکت کرنے سے آلودہ ہو جائے گا، جو انسانوں میں انسان بن کر رہے خود کو حیوانوں میں فرشتہ نہ سمجھے، جو محض "گلیم خویش" کو بچا لے جانے کی فکر نہ کرے بلکہ دوسرے ڈوبتوں کو نکالنے کے لئے جد و جہد کرنا اپنا فرض منصبی سمجھتا ہو۔ مجھے خاص کر کے ان مولوی صاحب کے متعلق نہ کوئی علم ہے نہ ان سے کوئی ذاتی پرخاش یا شکایت، ممکن ہے وہ اپنی ذات سے بہت اچھے اور نیک آدمی ہوں اس معنی میں جو اچھے، اور نیک، کے عرف عام میں سمجھے جاتے ہیں لیکن ان کی مختصر سی گفتگو سے مجھے یہ اندازہ ضرور ہو گیا کہ انھوں نے ابھی مذہب کی الف بے کو بھی نہیں سمجھا۔ میں اس طبقہ علماء کے بہت سے افراد کو جانتا ہوں جنھوں نے اپنی علمیت اور تقدس کو گویا ایک لبادہ بنا کر اپنے گرد لپیٹ لیا ہے اور دنیا کی جد و جہد اور تگ و دو، اس کی تکلیفوں اور تحریصوں سے کنارہ کشی اختیار کر لی ہے۔ ان کی عبا و قبا کو اس علیحدگی کی علامت سمجھنا چاہئیے۔ یاد رکھو مذہب کو زیادہ نقصان

ان لوگوں سے پہنچتا ہے جو بظاہر اس کے محافظ اور حامل ہیں لیکن روح مذہب تک نہیں پہنچے ہیں اور نیک نیتی کے ساتھ لوگوں کو گمراہ یا بد دل کرتے ہیں، لوگ ان کو اپنا راہنما مانتے ہیں۔ ان کے افعال واقوال کو اپنے لئے سند بنا لیتے ہیں اور اس طرح رہبر اور راہرو دونوں نہایت نیک نیتی کے ساتھ اس راستے پر پڑ لیتے ہیں جو ان کو منزل مقصود سے بالکل مخالف سمت میں لے جاتا ہے!

ترسم نہ رسی بکعبہ اے اعرابی　　　کیں رہ کہ تو می روی بہ ترکستان ست

ان کی گفتگو سے مجھے یہ اندازہ ہوا کہ شاید ان کو مذہبی لوگوں سے بھی کوئی دلچسپی نہیں بلکہ وہ طبعاً ان کے مخالف ہیں۔ اس لئے میں نے یہ سوچا کہ انھیں ایک ایسے صاحب سے ملاؤں جن میں نہ صرف وہ خوبیاں ہیں جو بقول شیخ صاحب نظر کو خیرہ کرتی ہیں بلکہ وہ صفات بھی ہیں جن کے وہ خود قائل معلوم ہوتے ہیں۔ چنانچہ میں انھیں اس مرتبہ ایک نہایت مشہور اور ممتاز بیرسٹر صاحب کے پاس لے گیا۔ جنھوں نے تعلیم جدید کے اعلیٰ ترین منازل کی تکمیل کی ہے ان کی علمی اور انتظامی قابلیت، ان کی ایمانداری، ان کی اقبال مندی کا تمام ملک میں شہرہ ہے قوم اور حکومت دونوں کی نظر میں ان کی بہت قدر اور عزت ہے ان کی رائے ہر معاملہ میں نہایت وقیع اور ذمہ دارانہ سمجھی جاتی ہے وہ اکثر قومی تحریکوں کے رکن بلکہ سرگروہ ہیں، پبلک جلسوں تعلیمی اور سوشل انجمنوں کے صدر منتخب ہوتے ہیں اور اپنے فرائض کو ایسی قابلیت اور خوش اسلوبی سے انجام دیتے ہیں کہ محض ان کی موجودگی سے جلسہ کو چار چاند لگ جاتے ہیں اور ان کی صدارت سے اس کی اہمیت دوبالا ہو جاتی ہے۔ ان کو خدا نے دولت علم کے ساتھ دولت دنیا کی نعمت بھی دی ہے جس میں سے ایک کافی حصہ وہ نہایت فیاضی کے ساتھ قومی تحریکوں اور طلبہ کی امداد پر صرف کرتے ہیں۔ بہر حال بحیثیت مجموعی وہ قوم کے ایک نہایت مفید، معزز اور سرگرم رکن ہیں۔ بیرسٹر صاحب ہم لوگوں سے بہت تپاک سے ملے اور تھوڑی سی تمہیدی گفتگو کے بعد انھوں نے پوچھا کہ فرمائیے آپ کو ملک کے موجودہ سیاسی معاملات سے بھی کوئی دلچسپی ہے یا نہیں۔ میں نے کہا "جی ہاں اخبار تو دیکھتا رہتا ہوں لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ گتھی کیسے سلجھے گی"۔ کہنے لگے "اب تو معاملات بالکل سلجھ گئے ہیں۔ ہندوستان کا سیاسی مستقبل

روز روشن کی طرح واضح ہے ہمیں بہت جلد فیڈرل حکومت مل جائے گی۔ اسمبلی اور کونسلیں اپنی ہوں گی آپ لوگوں کو جو نوجوان اور تعلیم یافتہ ہیں (میں نے دل میں سوچا کہ میرے ساتھی کو تو دونوں باتوں سے انکار ہے وہ نہ نوجوان ہیں نہ تعلیم یافتہ!) چاہیئے کہ ان جدید مواقع سے فائدہ اٹھائیں اور کونسلوں میں جاکر قومی خدمت کریں اور اپنے مفاد کا تحفظ کریں۔ آج کل سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ کہیں کونسلوں پر فدوویوں کا' اچھوتوں کا' کانگریس وغیرہ کا قبضہ نہ ہو جائے۔ یہ لوگ یا تو اعتدال کی حدود سے تجاوز کر گئے ہیں یا ان میں قدرتاً یہ صلاحیت نہیں کہ وہ سیاسی ذمہ داری کا بوجھ اٹھا سکیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ تمام زمیندار سرمایہ دار اور معقول خیالات کے تعلیم یافتہ لوگ مل جل کر ایک ایسا مکمل نظام قائم کریں کہ ملک کی حکومت ان کے ہاتھوں میں آجائے اور انھیں کے ہاتھوں میں رہے ورنہ بہت بدامنی اور نقصان کا اندیشہ ہے"

بیرسٹر صاحب کے لہجہ اور انداز گفتگو میں تیقن اور اطمینان کی ایسی شان پائی جاتی تھی کہ اگر کوئی شک یا شبہ کسی کج فہم کے ذہن میں پیدا بھی ہوتا تو وہ شرم کے مارے فوراً دور ہو جاتا۔ لیکن شیخ صاحب عجیب آدمی نکلے کہنے لگے "جناب آپ کو یہ فکر کیوں لگی ہوئی ہے کہ حکومت دولت مندوں اور زمینداروں کے ہاتھ میں رہے۔ میرا خیال تو یہ تھا کہ جمہوری حکومت یا ذمہ دارانہ حکومت کا مفہوم یہ ہے کہ حکومت میں سب لوگوں کا حصہ ہو۔ سب اس میں شریک ہوں اور اس کا نظام ایسا قائم کریں کہ سب کے مفاد کی حفاظت ہو ....." وہ اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ بیرسٹر صاحب بیچ میں بول اٹھے ان کی ذہنی تیزی اور جودت کی ایک علامت بلکہ ایک ثبوت یہ ہے کہ وہ دوسروں کی بہت کم سنتے ہیں اور اپنے خیال کو بہت سرعت کے ساتھ الفاظ کا جامہ پہنا کر پیش کر دیتے ہیں۔ کہنے لگے" اور ان کے لہجہ میں بے انتہا فوقیت تھا کچھ تمسخر کی چاشنی تھی اور کچھ وہ رحم اور ہمدردی جو ہر جاننے والے کو بیوقوفوں یا جاہلوں کی باتوں پر ہوتی ہے) جی ہاں میں نے بھی کتابوں میں اس قسم کی باتیں پڑھی ہیں اور پلیٹ فارم پر تقریر کرنے والے بھی اس قسم کے دلفریب خیالات ظاہر کر کے لوگوں کو دھوکا دیا کرتے ہیں لیکن ہم آپ جو تعلیم یافتہ اور سمجھ دار ہیں اور جن پر سوشلزم وغیرہ کے خراب اور خطرناک خیالات کا اثر نہیں ہوا اچھی طرح جانتے ہیں

کہ دنیا میں نہ کبھی ایسا ہوا ہے نہ ہو سکتا ہے۔ ملک میں زمینداروں اور سرمایہ داروں کی بے انتہا دولت لگی ہوئی ہے زراعت، تجارت، صنعت و حرفت، کا نظام انہیں کی وجہ سے قائم ہے اگر وہ اپنے حقوق اور مفاد کی حفاظت نہیں کریں گے تو اس بات کا اندیشہ ہے کہ غیر ذمہ دار لوگ اور جماعتیں ملک کے بنے بنائے نظام کو درہم برہم کر دیں گے اور ایسے قوانین بنائیں گے کہ ہم لوگوں کی پوزیشن اور حقوق خطرے میں پڑ جائیں گے کیا آپ اس خوفناک انجام کی پذیرائی کرنے کے لئے تیار ہیں؟ جناب عقل کا تقاضا یہ ہے کہ انسان عملی دنیا میں عملی قوانین کی پابندی کرے، خیالی اور ہوائی باتوں پر اپنے قلعہ کی بنیاد نہ رکھے!" شیخ صاحب کو پھر تردید کے مرض نے مجبور کیا اور بولے "جی ہاں! میں تو بہت خوشی سے اس خوفناک انجام کا استقبال کرنے کے لئے تیار ہوں جس سے آپ خود ڈرتے ہیں اور دوسروں کو ڈرانا چاہتے ہیں۔ ڈر انہیں پر طاری ہوتا ہے جن کے دل میں چور ہوتا ہے اور ان تمام جماعتوں کے دل میں چور ہے جن کی آپ نیابت کرتے ہیں۔ آخر سرمایہ داروں کے پاس سرمایہ کہاں سے آیا؟ انہیں غریبوں اور مزدوروں کے گاڑھے پسینے کی کمائی ہے نہ جن کو آپ ہر قسم کے سیاسی حقوق سے محروم کرنا چاہتے ہیں؟ آپ لوگوں نے کونسلوں اور حکومت کے نظام پر قبضہ کر کے ایسے قوانین بنا دئے ہیں جن کا مقصد صرف اتنا ہی ہے کہ وہ آپ کے غصب کردہ حقوق اور آسائشوں کی حفاظت کریں اور خدا کے بے شمار بندوں کو اقل ترین انسانی حقوق سے محروم رکھیں۔ یہ کہاں کی تہذیب اور کہاں کا انصاف ہے کہ کچھ لوگ تو دنیا کی تمام نعمتوں پر قابض ہو کر بیٹھ جائیں اور عیش و فرصت کی زندگی بسر کریں اور باقی تمام نوع انسان کے حصہ میں محنت اور مصیبت آئے نہ انہیں پیٹ بھر کھانا نصیب ہو نہ تن ڈھانک کپڑا! آپ کو یہ اندیشہ ہے کہ ہندوستان کی جدید حکومت کہیں ایسے قوانین نہ بنائے جن سے آپکے مفاد کو نقصان پہنچنے کا امکان ہو میں کہتا ہوں کہ دیر یا سویر ایسا ہونا اٹل ہے، آپ سیلاب کی یورش کو کچی مٹی کے گھروندوں سے نہیں روک سکتے۔ آج کل تمام دنیا کا یہی رجحان ہے کہ قانون سازی سوشلزم کے اصولوں پر کی جائے۔ میں خود سوشلزم کا زیادہ قائل نہیں۔ مجھے اس کی بعض باتوں سے اختلاف ہے لیکن آپ کو اس سے کسی طرح مفر نہیں ملے گا۔

خود انگلستان میں جو سب سے زیادہ قدامت پسند ملک ہے اور جس کو آپ ہر معاملے میں اپنا نمونہ اور منتہائے نظر سمجھتے ہیں۔ پارلیمنٹ برابر ایسے ہی قوانین بنا رہی ہے جو دولت اور سیاسی قوت کی تقسیم انصاف اور مساوات کے اصولوں پر کریں۔ عام اس سے کہ حکومت قدامت پسندوں کی ہو یا مزدوروں کی وہ ایسا کرنے پر مجبور ہے۔ آپ کب تک اپنے ملک میں شیشے کے گھر بنا کر رہنا چاہتے ہیں؟ اور شیشہ بھی ایسا نازک کہ اگر کوئی ذراسی کنکری بھی اٹھا کر پھینکے تو سارا مکان چکنا چور ہو جائے اور رہے آپکے زمیندار اور ان کی تنظیم، سو اس کا خدا کے فضل سے کوئی اندیشہ ہی نہیں! کبھی آپنے آج تک یہ دیکھا ہے کہ مردہ گھوڑے چابک کی مار سے دوڑے ہوں؟ آخر ان کے سامنے کونسا ایسا ولولہ پیدا کرنے والا نصب العین ہے، کونسا مطمح نظر ہے جو ان میں نئی روح پھونکے گا؟ روپے کی تھیلیوں کی حفاظت! ایک طرف تو غلط یا صحیح، عوام الناس کے سامنے ایک نئی زمین اور نیا آسمان بنانے کا منتہائے نظر پیش کیا جا رہا ہے جو انھیں ایثار اور قربانی کا جوش دلاتا ہے اور دوسری طرف آپ ان مردہ ڈھانچوں کو ہدایت کرتے ہیں کہ وہ اپنی چوری کے مال کی حفاظت کریں! بیرسٹر صاحب آپ تو ایک ایسی لڑائی لڑ رہے ہیں جس میں آپ کی شکست یقینی ہے ....."

بیرسٹر صاحب اس تقریر کے دوران میں بہت پیچ و تاب کھا رہے تھے اور انھوں نے کئی مرتبہ شیخ صاحب کی بات کاٹنا چاہی لیکن یہ چوکنے ہو چکے تھے اور اُن کو اس کا موقع نہیں ملا اب جو وہ تبقاضائے عمر سانس لینے کے لئے رکے تو بیرسٹر صاحب نے اس مہلت کو غنیمت جانا اور فوراً میدان جنگ میں کود پڑے۔ "جناب مجھے نہیں معلوم تھا کہ بایں سن و سال آپکے خیالات اسقدر مہمل اور خراب ہیں اور آپکے دماغ پر روس مسلط ہے آپ کو کچھ معلوم بھی ہے کہ آپکے اُس پسندیدہ ملک میں لوگوں کی حالت کیا ہے (میں یہ سن کر تعجب سے ان کا منہ دیکھنے لگا کیونکہ شیخ صاحب نے تو روس کا نام تک نہیں لیا تھا) وہاں نہ مذہب باقی رہا ہے، نہ اخلاق نہ آزادی، نہ حیا نہ غیرت، انسان مشین کے غلام بن گئے ہیں۔ کسی کو اپنی انفرادیت، اپنی مخصوص قابلیت کو تربیت کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ ان کا مقصد زندگی صرف اتنا ہی ہے کہ وہ کم سے کم قیمت پر زیادہ سے زیادہ چیزیں پیدا

کریں اور دنیا کے بازاروں میں ان کا ڈھیر لگا دیں اور اپنے فاسد خیالات کی اشاعت دنیا کے گوشے گوشے میں کریں ان کی حماقت کا یہ حال ہے کہ وہ انسانوں میں مساوات قائم کرنا چاہتے ہیں جو فطرت انسانی اور مصلحت الٰہی دونوں کے خلاف ہے۔ جب دنیا میں تمام لوگ ایک دوسرے سے مختلف ہیں، جب دو آدمی بھی ایسے دستیاب نہیں ہو سکتے جن کی دماغی قابلیتیں ایک سی ہوں تو یہ کیسے ممکن ہے کہ ان میں زبردستی مساوات قائم کر دی جائے یا سب کی مالی حیثیت ایک سی ہو۔ بھلا کیا کسی سلیم العقل انسان کی سمجھ میں یہ بات آسکتی ہے کہ ایک جج یا وزیر کو وہی مشاہرہ دیا جائے جو ایک خاکروب یا مالی کو ملتا ہے؟ اگر ایسا ہو تو لوگوں کو کام کرنے کی، محنت کرنے کی کیا تحریص رہے گی، انھیں کام سے دلچسپی کیوں ہوگی؟ یہ تو انسانی فطرت کے سراسر خلاف ہے۔ ممکن ہے آپ جیسے چند لوگ ایسے نکل آئیں جن میں روحانیت اس درجہ بھری ہوئی ہو کہ وہ اس مضحکہ خیز صورت حال پر قانع ہو جائیں لیکن عام لوگ جن سے آئے دن ہمیں سابقہ پڑتا رہتا ہے کبھی اس پر راضی نہیں ہو سکتے۔ ان باتوں سے آپ یہ مطلب نہ نکالئے گا کہ میں غریبوں کے ساتھ ہمدردی نہیں رکھتا یا ان کی مدد نہیں کرنا چاہتا۔ مجھے ان کے ساتھ بہت ہمدردی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ مزدوروں کو اپنی محنت کا مناسب معاوضہ ملے اور فقیروں محتاجوں بے وسیلہ لوگوں کے ساتھ مناسب سلوک کیا جائے۔ ہمارے مذہب نے خیرات کرنے کا حکم دیا ہے اس کو پورا کرنا چاہیے، زمینداروں کو کاشتکاروں اور مزدوروں کے ساتھ مہربانی اور رعایت کا برتاؤ کرنا چاہیئے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم خدا کے بنائے ہوئے امتیازات کو پس پشت ڈال دیں۔ اور عقل و مصلحت کو فراموش کر کے ایک ناممکن العمل "آئیڈیل" کے پیچھے سرگرداں رہیں ..... اچھا معاف کیجئے گا۔ مجھے اس وقت ایک جلسہ میں جانا ہے۔ خدا حافظ۔ پھر ملاقات ہوگی بیرسٹر صاحب مقدمہ جیت کر رخصت ہوئے اور مجھے شیخ صاحب کے طوفان تکلم میں گرفتار چھوڑ گئے۔ کچھ تو خیالات کا ہجوم کچھ اس زک کی خفگی کہ انھیں بیرسٹر صاحب کو قائل کرنے کا زیادہ موقع نہیں ملا باہر نکلتے ہی مجھ پر برس پڑے:-

"کیوں صاحب آپ کو انھیں حضرت کی ذات اور صفات پر ناز تھا؟ انھیں کو آپ انسان کامل سمجھتے ہیں؟ آخر آپ کس چیز سے اس قدر مرعوب اور متاثر ہیں؟ شہرت سے؟ وہ تو ہر قسم کے لوگوں کے حصے میں آتی ہے اور اس کو حاصل کرنے کے لئے اکثر ایسی تدبیریں اور وسیلے اختیار کرنے پڑتے ہیں جن کی طرف واقعی ایک شریف آدمی آنکھ اٹھا کر دیکھنے کا روادار نہ ہوگا دولت سے؟ میں دولت کوفی نفسہٖ برا نہیں سمجھتا لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ دولت کی طمع میں لوگ جس قدر ذلیل حرکات اور ظلم کرتے ہیں اتنا اور کسی وجہ سے نہیں کرتے اور میں نے ایک بہت بڑے بزرگ کا یہ قول بھی سنا ہے کہ کوئی امیر آدمی اس وقت تک آسمانی حکومت میں داخل نہیں ہو سکتا جب تک اونٹ سوئی کے ناکے میں سے نہ گذر جائے۔ دماغی قابلیت سے؟ بے شک عقل اور ذہانت خدا کا بہت بڑا عطیہ ہے لیکن جو شخص اس کو محض اپنے مفاد کے لئے استعمال کرے اور اس کے ذریعے بندگان خدا کی خدمت نہ کرے وہ مجرم ہے اور کفرانِ نعمت کا مرتکب۔ عزیز من تم نہیں جانتے کہ بعض اوقات لوگ باوجود ہر قسم کی قابلیت اور مواقع میسر ہونے کے دنیا میں کوئی مفید اور دیرپا کام نہیں کر سکتے اور باوجود بہت بڑے آدمی ہونے کے درحقیقت بہت چھوٹے آدمی ہوتے ہیں۔ جانتے ہو اس کا سبب کیا ہے؟ اس کا سبب یہ ہے کہ ان لوگوں کے جن میں تمھارے ممدوح کا شمار بھی ہے، دل اور دماغ دونوں بہت چھوٹے ہوتے ہیں اور آدمی میں یہ سب سے بڑی المناک کمی ہے۔ انسانیت وسعت چاہتی ہے۔ دل کی وسعت، دماغ کی وسعت، نظر کی وسعت، ایسا دل جس میں علاوہ اپنے دکھ درد کے دوسروں کا دکھ درد بھی سما سکے، ایسا دماغ جس میں اپنی مخصوص دلچسپیوں اور مشاغل کے علاوہ دوسروں کے نقطۂ نظر اور اختلافات کو سمجھنے کی صلاحیت ہو، جو دوسروں کی رائے اور خیالات کا خندہ پیشانی سے استقبال کرے۔ ایسی نظر جس پر گھوڑے کی طرح اندھیریاں نہ لگی ہوں، جو دائیں بائیں آگے پیچھے ہر طرف دیکھ سکے۔ جس کو نہ صرف اپنے گردوپیش کی چیزیں اور اپنی فوری ضروریات اصلی معلوم ہوں بلکہ مستقبل کے امکانات بھی اس کے لئے ایسی ہی اہمیت رکھتے ہوں جو ہر نصب العین کو محض اس وجہ سے مسترد نہ کردے کہ وہ اس کو نظر نہیں آتا ہر قسم کی تنگی اور تنگ نظری تہذیب اور انسانیت

کے منافی ہے لیکن ان لوگوں کے نہ دل میں وسعت ہے نہ دماغ میں نہ نظر میں ان میں نہ رواداری ہے نہ دوسروں کا نقطۂ نظر سمجھنے کی صلاحیت۔ جو خیال ایک دفعہ ان کے ذہن میں آجاتا ہے اسی کو صحیح سمجھتے ہیں خواہ دوسرے لوگ کچھ بھی کہیں ان کے دماغ میں کبھی یہ تکلیف دہ مگر حیوان کو انسان بنانے والا خیال نہیں گذرتا کہ ممکن ہے وہ کسی معاملہ میں غلطی پر ہوں تم نے فطرت انسانی کے متعلق اس بڑے آدمی کے خیالات کو سنا اور لطف یہ ہے کہ اگر میں کئی روز تک مسلسل اس شخص سے اس مسئلہ پر گفتگو کرتا جب بھی اس کے خیالات میں کوئی فرق نہ آتا بلکہ وہ مجھے مجنوں سمجھ کر چھوڑ دیتا اور اپنے خیالات میں اور پختہ ہو جاتا۔ ہر معاملہ میں اس کے خیالات بالکل سطحی ہیں۔ افلاس کے مسئلہ پر ارشاد ہوا تھا کہ میں اس بات کے لئے آمادہ ہوں کہ ہم خیرات کے طور پر اپنے دسترخوان کے ٹکڑے غریبوں کے سامنے جھاڑ دیں لیکن وہ اس خیال کو جنون کی علامت سمجھتا ہے کہ افلاس کو دور کرنے اور دولت کی بہتر تقسیم کرنے کے لئے مناسب ذرائع اختیار کئے جائیں اس کا فلسفہ یہ ہے کہ غلاظت کو جہاں تک ہو سکے چھپانے کی کوشش کرو، دور کرنے کی فکر نہ کرو کپڑا پھٹے تو اس کو بدلو نہیں پیوند پر پیوند لگاتے جاؤ۔ کیونکہ اس "مفکر اعظم" کے خیال میں ہر قسم کی بنیادی اور دور رس تبدیلی انقلاب ہے اور انقلاب مصلحت الٰہی کی مخالفت! اس کے نزدیک قانون اور انصاف بالکل ایک ہی چیز ہیں اور اگر کوئی شخص انصاف کی حمایت میں قانون کو بدلنا چاہے یا اس کی مخالفت کرے تو اخلاقی اور قانونی مجرم ہے۔ وہ ان محتاط لوگوں کے طبقہ سے تعلق رکھتا ہے جس نے دو ہزار برس ہوئے حضرت عیسٰی کو اس لئے پھانسی دی تھی کہ ان کی تعلیم مروجہ خیالات اور عقائد کے خلاف تھی، جو چودہ سو برس ہوئے پیغمبر اسلام کی مخالفت پر اس لئے کمربستہ تھے کہ وہ عدل اور مساوات اور اخوت کا انقلاب آفریں اور خطرناک پیغام دنیا کو پہنچا رہے تھے۔ بھائی، ان حیوانوں سے جو انسان ہونے کا دعوی کرتے ہیں بالکل عاجز آچکا ہوں۔ مجھے کسی انسان کے پاس لے چلو"

اب تو میں بہت چکرایا کیونکہ میرے ترکش میں جو سب سے زیادہ کارگر تیر تھے ان کو میں یکے بعد دیگرے چھوڑ چکا تھا لیکن اس مرد شریف نے نہایت آسانی سے ہر ایک کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے پھینک دیا تھا۔ میں اسی کشمکش و پیچ میں تھا کہ اس مصیبت سے کس طرح جلد نجات حاصل کروں کہ امداد

غیبی آواز سے آئی یعنی دفعتاً میری آنکھ کھل گئی اور میں نے خود کو بستر پر پڑا پایا۔ اس وقت مجھے یہ خیال پیدا ہوا کہ ہمیں دراصل اس مسئلہ پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ تہذیب کے اصلی اور حقیقی عناصر کیا ہیں اور ہم کن صفات رکھنے والے آدمی کو مہذب کہہ سکتے ہیں :

(باقی)

غزل

اس طرح جس کی سزا دی جائے
وہ خطا بھی تو بتا دی جائے

ہاں، وفا میری اسی قابل تھی
سر بسر دل سے بھلا دی جائے

میرے ہر صبر و سکوں پر ہنس کر
ایک بجلی سی گرا دی جائے

چارہ سازی کے عوض سینے میں
اور بھی آگ لگا دی جائے

ہو عنایت کی نظر غیروں پر
خانہ زادوں کو سزا دی جائے

اگلے وقتوں کی وہ اگلی باتیں
بات بگڑے تو بنا دی جائے

اب تو یہ ہے کہ خوشی کے بدلے
خبر مرگ سنا دی جائے

کام آئے گا کسی کے کوئی
یہ توقع ہی اٹھا دی جائے۔

غم الفت ہی وہ شے ہے حیرت
زندگی جس میں گھلا دی جائے

کلام بیدل عظیم آبادی[1]

میں نے بیدل کا نام سب سے پہلے زمانۂ طالب علمی میں حضرت[2] استاد حکیم طغرائی مرحوم کی زبان فیض ترجمان سے سنا اور اس کی اہمیت کا اندازہ انھیں کی صحبت میں لگایا آپ نے شوکت میرٹھی مرحوم کے پیش کردہ اشعار بیدل کا حل اپنے رسالہ مسیحا میں شائع کر کے اپنی بےنظیر ذہانت کا ثبوت دیا تھا اور اس امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کی تھی، یہ زمانہ میرے ان کے تعلقات سے پہلے کا ہے، جب آپ کی عنایت اور توجہ سے مجھ میں کچھ ذوق شعر پیدا ہوا تو میں نے مسیحا کے پرانے پرچے مہیا کر کے اس حل کا مطالعہ کیا، اور سیرابی شوق کا سامان پایا، آپ کی خدمت میں بیدل کو سبقاً پڑھنے کی درخواست کی، آپ نے فرمایا پہلے فارسی کی تکمیل کرلو پھر بیدل کو ہاتھ لگانا، میں اس تشنگی کو سینے میں لئے رہا، یہاں تک کہ نصاب فارسی کی آخری کتابیں دیکھ لیں، پھر آپ سے ایفائے عہد کے متعلق عرض کیا، مجھے آپ کی صداقت اور نیک دلی کبھی نہ بھولے گی، جب آپ نے فرمایا، اس وقت تک تم شاگرد اور ہم استاد تھے لیکن آج سے ہم دونوں برابر ہیں۔ دونوں شاگرد ہیں اور مرزا بیدل استاد آؤ مل کر ان کے کلام پر غور کریں، چنانچہ حسب ارشاد پہلے غزلیات کا مطالعہ شروع کیا، آپ بڑی کاوش فرماتے اور اکثر اشعار کے متعدد مطالب بیان کر کے ایک کو ترجیح دیتے، یہ سفر بہ قدر شوق طے نہ ہو سکا تھا

---

[1] یہ مضمون ۱۹۳۱ء کے وسط میں بعض احباب کے ارشاد و اصرار سے لکھنا شروع کیا تھا، صرف غزل بیدل سے متعلق لکھ سکا، دیگر اصناف کلام پر لکھنے کی نوبت نہیں آئی، ممکن ہے کہ کسی آئندہ فرصت میں یہ کمی پوری کرسکوں۔ انشاءاللہ

[2] آپ کا کلیات (نظم فارسی و اردو) مع سوانح و مقدمہ (از پروفیسر تاثیر ایم اے) پروفیسر تبسم ایم اے کی نگرانی میں کتب خانہ طغرائی امرتسر کی طرف سے مارچ ۱۹۳۲ء میں شائع ہو جائے گا انشاءاللہ۔

کہ تقدیر نے اس صحبت کو منتشر کر دیا، حضرت مرحوم کو ترک وطن پر مجبور ہونا پڑا لیکن میں بیدل کو فراموش نہ کر سکا۔ بعض اساتذہ امرتسر کی خدمت میں بغرض استفادہ حاضر ہوا انھوں نے اس کو ذخیرۂ مہملات کہہ کر نجات حاصل کی، آخر کچھ عرصہ میں نے بطور خود اس کا بے قاعدہ مطالعہ کیا، یہ عجیب دن تھے، شب و روز اس میں گم رہتا تھا، کبھی کوئی شعر کہتا تھا تو اسی رنگ میں، اگر اس زمانے کی کوئی غزل ہاتھ آ گئی تو ممکن ہے کہ کبھی ناظرین کی نظر کر سکوں، آخر اپنے آپ کو اس وادی کا تنہا مسافر دیکھ کر اس سفر لذیذ کو ختم کیا اور اس آتشکدۂ عشق کو قلب کی گہرائیوں میں ہمیشہ کے لئے محو خواب کر دیا۔ میرے نزدیک بیدل کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ طالب علم اپنے فکر و اعمال کو بیدل میں گم کر دے، اور یہ نہیں ہو سکتا جب تک کوئی ممتاز علمی ادارہ یا کوئی محب علم حکومت اس کام کو اپنے ذمے نہ لے، میں نے اس کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ سطحی کوشش اور نہایت قلیل فرصت کا نتیجہ ہے اس کا مقصد محض کلام بیدل سے تعارف ہے۔ میں نے نہایت واضح اشعار چننے کی کوشش کی ہے۔ (عرشی)

مرزا غالب نے کہا تھا۔

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ ــــ شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک شاعر کے کلام کا منظرِ عام پر آجانا اس کے افشائے مافی الضمیر کا مرادف ہے، اسی طرح شیخ کا ارشاد ہے۔

تا مرد سخن نہ گفتہ باشد ــــ عیب و ہنرش نہفتہ باشد

یہ دونوں شعر ایک ہی مقصد کی طرف رہنمائی کرتے ہیں، اور ایک قاعدہ کلیہ کی طرح تسلیم کئے جاتے ہیں۔ لیکن مرزا عبدالقادر بیدل عظیم آبادی اس میں استثنا کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کا کلام نظم و نثر کافی مقدار میں تقریباً دو سو سال سے ہمارے پاس موجود ہے، لیکن اب تک نہ تو وہ رسوا ہوئے اور نہ ان کے عیب و ہنر عالم "نہفتن" سے چہرہ کشا ہوئے۔ اُن کا دیوان، نکات، مثنوی و عناصر وغیرہ بالکل ایک راز سربستہ ہیں۔ ایک سخنِ ناشنیدہ و حرف ناگفتہ، کوئی تمہید نہ مقدمہ، کوئی قابل ذکر حل نہ ترجمہ

اگر کسی نے کبھی سمجھنے کی کوشش بھی کی تو جلد ہی تھک کر وہاں پہنچ گیا، جہاں خواجہ حافظ نے کہا تھا: کہ کس نہ کشود و نکشاید بحکمت ایں معما را

حق تو یہ ہے کہ غالب کا مصرع ذیل بھی صحیح طور پر بیدل ہی پر چسپاں ہو سکتا ہے کہ

مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا۔

خصوصیات کلام بیدل | بیدل کے کلام میں بعض ایسی خصوصیات ہیں جو اس کو تمام کائنات شعر سے الگ کر دیتی ہیں، وہ اپنی طرز کا موجد تھا اور خاتم بھی، اس میں نہ صرف معانی کی ندرت علو و عمق ہے، بلکہ اس کو مخصوص مطالب بیان کرنے کے لئے زبان بھی نئی ایجاد کرنی پڑی،

ہر شاعر کے کلام میں ابتدا، وسط، اور انتہائے عمر کا اثر اور فرق ضرور نمایاں معلوم ہوتا ہے غالب کے ابتدائی مغلق کلام کو دیکھئے، پھر ان کی پختہ مشقی اور سلاست بیان پر نظر کیجیے، زمین و آسمان کا بعد نظر آئے گا، ایسا ہی دوسرے شعراء کا حال ہے، لیکن بیدل کا کلیات سامنے ہے جس میں رباعی، غزل، قطعہ، نکتہ، رقعہ، نثر وغیرہ سب موجود ہے، سب میں ایک ہی انداز بیان، ایک ہی روح حقیقت واضح ہے، بیدل کی روح و قلب پر تمام عمر ایک ناقابل تغیر کیفیت کا استیلا رہا ہے جسے ہم "فلسفۂ تصوف" کہتے ہیں "نکات" و "عناصر" کا تو موضوع ہی تصوف ہے عجب یہ ہے کہ غزل لکھنے بیٹھتے ہیں، تو وہ بھی ایک خاص تعلیم تصوف ہو کر رہ جاتی ہے، اس سے زیادہ حیرت یہ ہے، کہ کسی دوست کو رقعہ لکھتے ہیں تو وہ بھی انھیں سرمستیوں سے لبریز ہوتا ہے۔

مرزا نے تصوف کو قدیم روش سے الگ ہو کر نئے اسلوب میں پیش کیا ہے۔ اور اپنی طبعی مشکل پسندی و دور رسی کے سبب عمان فطرت کی ان گہرائیوں سے لآلی آبدار نکالے جہاں عام اساتذہ کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ اس لئے آپ کو اس مظروف نادر کے لئے ظرف جدید کی ضرورت پڑی، مروجہ زبان ان معانی نازک کو چھو نہیں سکتی تھی اس لئے نئی نئی ترکیبیں ایجاد کی گئیں۔

مرزا کے غواص طبع نے مروجہ بحور کی وسعت کو اپنی شناوری کے لئے ناکافی پاکر ایجاد

وابداع سے کام لیا، اور وہ مترنم اور حال کیفیات بحریں استعمال کیں جو اس سے بیشتر فارسی میں نظر نہیں آتی تھیں۔ آپ کے بعد بعض لوگوں نے فارسی میں کم اور اردو میں زیادہ آپ کی تقلید کی۔

ردیف وقافیہ میں بھی آپ کی فطری جدت نوازی و مشکل پسندی بروئے کار آجاتی ہے اور قدما سے الگ اپنے لئے جادہ و منزل تلاش کر لیتے ہیں کٹھن سے کٹھن زمینوں میں اپنے خیالات کی تخم ریزی نہایت آسانی سے کر جاتے ہیں۔ یہ کہیں معلوم نہیں ہوتا کہ "بیت برائے قافیہ" ہے، بلکہ قافیہ و ردیف مضمونِ بیت کے خادم و معاون نظر آتے ہیں۔

مرزا کا اثر عالم ادب کی پہنائیوں پر مسلط ہو گیا، بڑے بڑے اساتذہ نے آپ کی پیروی کرنی چاہی اور بعض نے تو اپنی نارسائی کا اقرار بھی کر لیا۔

ط۔ طرزِ بیدل میں ریختہ لکھنا　　　　اسد اللہ خاں قیامت ہے

اس شعر سے بالخصوص اور غالب کے عام کلام سے بالعموم ثابت ہوتا ہے کہ وہ کلام بیدل سے کافی طور پر مسحور و متاثر ہو چکے تھے، اور میرے نزدیک اُن کو بیدل کا ایک حد تک مبلغ اعظم کہا جا سکتا ہے، کیونکہ انھیں کی وساطت سے بیدل کا طرز اردو شعراء نے قبول کیا، آج جو شخص غالب کی پیروی پر نازاں نظر آتا ہے، وہ بالواسطہ بیدل کا پیرو ہے، کیونکہ غالب کا منبع بیدل ہے سراج الدین علی خاں آرزو، امام بخش صہبائی وغیرہ نے بھی اس دشوار راہ میں چلنے کی سعی کی لیکن منزل پر پہنچنا سب کی قسمت میں نہیں ہوتا

میرے سامنے اس وقت بیدل کے دو مطبوعہ نسخوں کے سوا کوئی معاون و مددگار نہیں ایک نسخہ نولکشوری مطبوعہ ۱۸۷۵ء ہے۔ دوسرا مطبع صفدری بمبئی کا مطبوعہ ۱۳۰۲ھ دونوں کافی اغلاط کے حامل ہیں، انھیں پر قناعت کرنے پر مجبور ہوں۔

اپنے انوکھے انداز میں حمد کرتے ہوئے فرماتے ہیں،

اے کردہ نگاپوئے سراغ تو نشانہا　　　　وا ماندۂ اندیشۂ راہ تو مکانہا

درکنہ تو آگاہی و غفلت ہمہ معذور　　　　دریا ز میاں غافل و ساحل ز کرانہا

بس دیدہ کہ شد خاک و نشد محرم اسرار　　آئینۂ ما نیز غبار یست ازانہا

سالک کا دنیائے گذشتنی سے استغنا اور عالم آخرت سے وابستگی قلب۔

دریں وادی کہ می باید گزشت از ہر چہ پیش آید　　خوش آں رہرو کہ در داماں فے پیچید پیر دارا

ہستی کم فرصت محل اقامت نہیں محض تہمت زدہ اقامت ہے، اس سے اتنا ہی تعلق رکھنا چاہیئے، جتنا عکس کو آئینہ سے،

اقامت تہمتی در محفل کم فرصت ہستی　　چو عکس از خانۂ آئینہ بیرو گرم کن جا را

عالم تجرد میں غیر سے ادنیٰ تعلق کی تہمت بھی ایک دھبہ، سالک کا پیراہن بھی نگاہ کیطرح تار غیر کا شرمندۂ احساں نہیں

در تجرد تہمت دیگر بدر دے میزنم　　غیر من تا ے ندارد چوں نگہ پیراہنم

وحدت طالب و مطلوب کا بدیع اسلوب،

با کہ گویم گر بگویم کیست تا باور کند　　آں پری رُوئے کہ من دیوانۂ اویم منم

اس نشیمن کی فکرنے جو نہ کبھی تھا اور نہ اس وقت ہے ہمکو یکسر اضطراب و التہاب بنا رکھا ہے۔ ردیف کی جدت بھی قابل غور ہے۔

فغاں کہ بست بہ بالم ہزار شعلہ طپیدن　　نشیمنے کہ نبود آشیانہ کہ ندارم

مایوسی سے کوئی شعلۂ آہ نہیں اٹھ سکتا، دانۂ معدوم سے ریشہ کیا نکلے گا،

ز یاس بیدل ما گل نہ کرد شعلۂ آہے　　نفس چہ ریشہ دواند ز دانۂ کہ ندارم

آنکھ بند کرنے سے نگاہ فانوس خیال کی شمع بن کر اندرونی دنیا کا معائنہ شروع کر دیتی ہے، عاشق کا شوق دیدار مرمٹنے کے بعد بھی زائل نہیں ہو سکتا، تشبیہہ یکسر اجتہاد ہے،

نگہ شد شمع فانوس خیال از چشم پوشیدن　　فنا مشکل کہ از عاشق برد شوق تماشا را

وجود اعتباری کے نشان اسمائے محض کے سوا کچھ حقیقت نہیں رکھتے ابن جہاں مرئی کو نقش بال عنقا سمجھو،

نشانہانیست غیراز نام آنہم نا تواں پیدا   جہانِ دیدۂ نشمارنقش بال عنقارا

عالم کائنات ایک پیکر واحد کا حکم رکھتا ہے۔ کاروانِ امواج کی روانی پر نظر کرو، ہر موج خود ہی راہ ہے، ندرت تشبیہ ملاحظہ ہو،

دریں دریا بسے فرش است اجزائے وجود من   ہر جا می روم چوں موج برخودمی نہم مارا

اسرار ہستی کا منتہائے ادراک یہ ہے، کہ اس عظیم و وسیع کل کا کوئی پرزہ غلط کار نہیں، کل شئی خلقہ احسن، ہر حرکت، ہر قوت اور ہر جز اپنے اپنے مقام پر لاریب مناسب اور احسن ہے

بفہم نسخۂ ہستی چرا نہ ناز کنم   کہ لفظ بشک و ریب انتخاب میگردد

اگر کہیں کوئی نقص نظر آتا ہے، وہ یقیناً انسان کی نارسائی فہم کا ثبوت ہے،

نبود نقطۂ از علم ایں کتاب غلط   کہ فہم ناقص ما کردہ انتخاب غلط

آرام کا مطلب یہ نہیں کہ ہم کوئی کام ختم کر چکے ہیں، بلکہ یہ ناتمامی و نارسائی کا دوسرا نام ہے، قوت باصرہ کا تھک جانا ہی نیند بن جاتا ہے۔

کمند گردن آرام نارسائیہاست   شکستہ پائی نظارہ خواب میگردد

عشرت غرور کی حد تک پہنچ جائے تو سمجھ لو کہ شکست و فنا کا وقت آگیا۔ قطرے کا بڑھ کر حباب بن جانا اس کی زندگی کا آخری سانس ہے

غرور عشرت ما با شکست نزدیک است   دمیکہ قطرہ ببالد حباب می گردد

گردن فرازی کا لازمی نتیجہ پائمالی ہے، نیستاں کی سربلندیوں کو دیکھو اور بورئیے کی صورت میں اس سے درس عبرت حاصل کرو،

مکن گردن فرازی تا نسازد دہر پامالت   کہ نے آخر بجرم سرکشی ہا بوریا گردد

تبدیل بخت کے لئے فانی آستانوں پر جبیں سائی لغو محض ہے۔ سایہ ہر دروازے پر سجدہ ریزی کرتا ہے، لیکن اس کی تاریکی کے نصیب میں روشنی نہیں۔

چو سایہ چند بہر خاک جبہہ سودنہا   کہ زنگِ بخت نگردد کم از زدودنہا

عجزِ انسانی کا تعلق بارگاہ غنائے مطلق سے کتنے پیارے انداز میں بیان کیا ہے،

عجز را گرد در جناب سرفراز بیہا برِ است   اینقدر ہا بس کہ در کوشش رسد فریاد ما

اسی غزل کا مطلع ہے۔

دائم از سودائے خام غفلت وہم رسا   او سپہر و من کف خاک او کجا و من کجا

کہیں بھولے سے عشق و محبت کا بیان آجاتا ہے تو اس میں قیامت برپا کر دیتے ہیں۔

ہر کرا الفت شہید چشم مخمورت کند   نشہ انگیزد ز خاکش گرد تا روز جزا

اسی غزل کا اور شعر سنئے، تمام دنیا میں ایک دل کے تزکیہ کے سامان کا حصول بھی محال ہے۔

نیست در بنیاد آتش خانۂ نیرنگ دہر   آں قدر خاکسترے کائینۂ گیرد جلا

زندگی بقدر "دو جہاں آرزو" کے وہم کا بار اٹھائے پھرتی ہے، ہر سانس میں سو قافلوں کی بانگ درا کا شور ہے۔

زندگی محمل کش وہم دو عالم آرزوست   مے تپد در ہر نفس صد کارواں بانگ درا

ہر چیز سو طرح کی جستجو کے لئے پریشان ہے، نقش پا بھی زبان حال سے کہہ رہا ہے کہ اس کا رہرو سرگرداں تلاش میں گھوم رہا ہے،

ہر چہ می بینم طپش آمادۂ صد جستجو است   زیں بیاباں نقش پا ہم نیست بے آواز پا

اسی بحر و قافیہ میں ایک غزل اور لکھی ہے، جس کے مضمون میں تسلسل اور رنگ میں تغزل کا لحاظ کیا گیا ہے جذبات نہایت پاکیزہ، خیالات نہایت بلند، الفاظ بکیر انتخاب اور معنی سراپا نزاکت ہیں، چند شعر سنئے،

اے خیالِ قامت آہ ضعیفاں را عصا   بر رخت نظارہ ہا را لغزش از جوش صفا

نشۂ صد خم شراب از چشم مستت غمزۂ   خونبہائے صد چمن از جلوہ ہایت یک ادا

قامت، آہ اور عصا کی صورت، جوش صفائے رخسار سے لغزش نظر کا مفہوم چشم مست کے غمزے میں صد خم شراب کا نشہ سو چمن کے خون کی قیمت ایک ادائے جلوہ، یہ الہامات بیدل کے سوا کس کے

داغ و قلب پر نازل ہو سکتے ہیں،

ہمچو آئینہ ہزاراں چشم حیراں رو بہ ہ | ہمچو کاکل یک جہاں جمع پریشاں در قفا
تیغ مژگانت آب ناز دامن میکشد | چشم مخمورت بخون تاک می بندد حنا
بستہ بر بال اسیرت نامۂ پرواز ناز | خفتہ در خون شہیدت جوش گلزار بقا

مصرع آخر پر بالخصوص شہید ہو جانیکو جی چاہتا ہے۔

از صفائے عارضت جاں میچکد گاہ عرق | وز شکست طرہ ات دل میدمد جائے صدا

دونوں مصرعے عالم بالا سے نئی اتری ہوئی دو روحیں معلوم ہوتی ہیں۔

از نگاہت نشہ ہا بالیدہ ہر مژگاں زدن | وز خرامت فتنہ ہا جوشیدہ از ہر نقش پا
ہر کجا ذوق تماشایت بر اندازد نقاب | کیست گردیک قطرہ بر ہم زدن صبر آزما
گر جلالت عام سازد رخصت نظارہ را | مردمک از دیدہ ہا پیش از نگہ گیرد ہوا

دوسرے مصرع میں غوطہ لگائیے اور ایک دوسری دنیا کی سیر کیجئے۔ یہ ہیں وہ اشعار جن کے معانی بیان کرنا ان کی روحانیت کو مجروح کرنا ہے۔

ساز محشر گشت آفاق از نگاہ حسرتم | دمبدم مژگاں چہ فریاد است محزون ترا

ساز۔ نے۔ فریاد۔ نگاہ۔ مژگاں حسرت و محزوں کی بے تکلفانہ مناسبت اور مضمون کی درد انگیزی اور حسرت خیزی نے شعر کو تیر و نشتر بنا دیا ہے۔

ہر چہ می بینم خیالے از سراغت میدہد | ہر دو عالم یک سر زانوست مجنون ترا

بات تو وہی ہے جو کسی بزرگ نے فرمائی تھی۔

وفی کل شیٔ لہٗ شاہدٌ | یدل علی انہ واحدٌ

لیکن اسلوب کتنا بدیع ہے۔

کیست از ما تو چوں خاشاک دارد مرا | شعلہ جاروبی کند تا پاک بر دارد مرا
ہستیم عہدے بہ نقش سجدۂ او بستہ است | خاک خواہم شد اگر از خاک بر دارد مرا

طالب و مطلوب میں طالب کے پندار وجود کے سوا کوئی چیز حائل نہیں، ؎ تو خود حجاب خودی حافظ از میاں برخیز
پس کون ہے، جو مجھ کو تیری راہ سے خاشاک کی طرح اٹھا دے، خاشاک سے ہمیشہ کے لئے نجات جاروب
شعلہ کے سوا نہیں ہو سکتی، یہاں "جاروب شعلہ" اور مصرع ثانی میں "خاک خواہم شد" کس بلا کا تخیل ہے. کوئی
نطق و بیان ہے جو اس کی تعریف کر سکے؟

اختراع ترکیب سے یوں تو تمام شعر معمور ہیں، چند مثالیں خصوصیت سے سن لیجئے:

دریں مزرع چہ لازم خرمن آرائے ہوس باشی ۔ دلے باید بدست آری ہمیں تخم است و حاصلہا

مزرع عالم میں ہوس کی خرمن آرائی فضول ہے. صاحبدل بننے کی سعی کرو، یہی بیج ہے اور یہی حاصل،

عاشقاں بسمل بہ آہنگت مہیا کردہ اند ۔ جبہۂ شوقے کہ دانند آستاں شمشیر را

"عاشقان بسمل آہنگ" کی جبین شوق کا شمشیر کو آستاں سمجھ لینا کتنی موثر بانگ رجز اور تحریص جہاد ہے

ہر کجا شمع تماشائے تو روشن می شود ۔ از زمیں تا آسماں آئینہ خرمن می شود

شمع جمال کی روشنی سے زمین سے آسمان تک آئینے ہی آئینے بن جاتے ہیں. جن کو خرمن آئینہ سے تعبیر کیا ہے

عاجزم چنداں کہ از عرض ضعیفی ہائے من ۔ نالہ گر بالد نگاہ ناتوانی می شود

عجز اظہار ضعیفی دیکھئے کہ فریاد اگر بہت ترقی کرے تو ایک نگاہ ناتواں بن جاتی ہے.

اوج عرفاں را کہ بر تر از کمند گفتگو است ۔ ہر کہ بر می آید از خود نرد بانے می شود

جو شخص قید ہستی سے نجات پائے اوج عرفاں تک پہنچنے کے لئے خود ہی اپنی سیڑھی بن جاتا ہے، کیونکہ
اس مقام تک کمند گفتگو (محض باتیں بنانا) کی رسائی نہیں، ان اشعار میں خرمن آرائی ہوس، بسمل
آہنگ، خرمن آئینہ، بالیدن نالہ، اور کمند گفتگو، مرزا کی خلاقی طبع کا ثبوت ہیں اور ایسی ہزاروں مثالیں
ان کے کلام میں موجود ہیں۔

غرابت ردیف دیکھئے۔

سایہ انداز د اگر بخت سیاہ من در آب ۔ فلس ماہی دیدۂ آہو کند خرمن در آب

پانی میں بخت سیاہ کے سایہ سے فلس ماہی خرمن چشم آہو بن جاتے ہیں؛ در آب کتنا بے تکلف سما گیا

من کہ نتوانم فرو بردن سر سوزن در آب　　کے توانم در دلِ سنگینِ خوباں جا کنم

مصرعِ ثانی میں "عجز فرو بردن" اور "در آب" کی روانی دیکھیے،

غالباً استاد ذوق مرحوم کی مشہور غزل "شیر سیدھا تیرتا ہے وقت رفتن آب میں" اسی کی تتبع میں لکھی گئی ہے۔

اے جذبہ ہمتے کہ قدم بیشتر زنیم　　یعنی رسانده‌ایم پے خویش تا نفت آب

از دو باشتیٔ ادب محرمی مپرس　　با غیر جلوہ ساز دو با آشنا نفت آب

تا زند فال گہر بے تاب آہنگ است آب　　نعل در آتش بحست و جوئے ایں رنگ است آب

محمل ما عاجزاں بر دوش لغزش بستہ اند　　صد قدم از موج اگر پیدا کند لنگ است آب

آبرو نتواں بہ پیش ناکساں چوں شمع ریخت　　اے طمع شرمے کہ اینجا شعلہ در چنگ است آب

اتنی مشکل ردیف، ایسے عالی خیالات، تمام غزل حکمت و دانش سے معمور ہے، ردیف و قافیہ مضمون کے خادم و محکوم نظر آتے ہیں۔

جوہر تجرید قطع الفت خویش است و بس　　بر سر خود میتواں کرد امتحاں شمشیر را

زائل از زینت نگردد جوہر مردانگی　　قبضۂ زر از برش مانع نداں شمشیر را

بر شجاعت پیشہ ننگ است از شجاعت ماندن　　حرف جوہر بر نیاید بر زباں شمشیر را

اے فغاں بگذر ز چرخ و لامکاں تا خیر باش　　چند در زیر سپر کردن نہاں شمشیر را

کون کہہ سکتا ہے کہ یہاں شمشیر کو باندھنے کے لئے ذرا بھی تکلف کرنا پڑا ہے، ایک میدان جنگ ہے، جہاں فطری جذبہ مردانگی کے زیر اثر شمشیر چل رہی ہے۔

بے مغزی و داری ہمین سوختہ جاں بحث　　اے پنبہ مکن ہرزہ با آتش نفساں بحث

جمعیت گوہر نکشد زحمت امواج　　بیدل بخموشاں نکند اہل زباں بحث

سکون و قرار گوہر کو خموشی سے اور موج کو زباں سے کتنی بلیغ مناسبت ہے شاعر نے بیحد بلند نتیجہ پیدا کیا ہے

نداشت دیدهٔ من بے تو تاب خندهٔ صبح ۔ زاشک داده چو شبنم جواب خندهٔ صبح

زندگی محروم تکرار است و بس ۔ چوں شرر ایں جلوه یک بار است و بس

ہر کجا کردم بیاده سجده ات سازِ رکوع ۔ چوں مہِ نو بر فلک رفتم بہ پروازِ رکوع
پیچ و تاب موج یکسر گوہر گردیدن است ۔ سجده انجام است ہر جا دیدم آغازِ رکوع
گر منافق از تواضع صاحبِ دیں می شود ۔ تیغ ہم خواہد نمازی شد بہ پروازِ رکوع

ما شہیداں را وضوے داده انداز آب تیغ ۔ سجده آموز سرِ ما نیست جز محراب تیغ
خون ما در پرده بلبلے ریزد ما را چہ سود ۔ شوخی ایں نغمه موقوف است بر مضراب تیغ

غالب کا شعر اسی بیت بیدل سے مستفاد ہے۔

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل ۔ جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

گرم نوید کیست سروش شکست رنگ ۔ کز خویش رفته ایم بدوش شکست رنگ
مانند دود شمع دریں عشرت انجمن ۔ بالیده ایم لیک ز جوش شکست رنگ

کہاں تک لکھتا جاؤں، عجیب و غریب ردیفوں کی کوئی حد و انتہا نہیں۔ اب ذرا جدت وزن و بحر کا نمونہ بھی ملاحظہ فرمایئے،

گہرِ محیط تقدسی مکن آبروئے حیا سبک ۔ چو حباب حیف اگر شوی ز غرور سر ہوا سبک

اگر بہ گلشن ز ناز گردد قد بلند تو جلوه فرما ۔ ز پیکرِ سرو موج خجلت شود نمایاں چو مے ز مینا

عمریست چوں گل می روم زیں باغ حرماں در بغل   اندر رنگ و امن بر کر وز بو گریباں در بغل

جیسا کہ پیشتر عرض کر چکا ہوں، یہ چند صفحات باحمل سطحی نظر اور کم التفاتی سے اوقات پریشاں میں سپرد قلم کئے گئے ہیں، ان سے محض تغزل تبدیل سے ابتدائی رسم تعارف ادا ہو سکی ہوگی میں محسوس کرتا ہوں کہ ابھی اس جمال کی ننانوے فیصدی تجلیات زیر نقاب ہیں جس کے لئے میں نے تمہید میں اہل بزم کو دعوت نظارہ دی تھی۔ سچ پوچھئے تو میں ایک شعر کے متعلق بھی دل کھول کر اظہار تاثرات نہیں کر سکا، حالانکہ یہ وہ اشعار ہیں، جن کی روح کو سمجھنے کے لئے ایک طویل و بسیط تشریح بھی کافی نہیں ہو سکتی، یہ وہ پھول ہیں جن سے رنگ و بو کا انتزاع ناممکن ہے۔ یہ وہ بوسے ہیں جو پیام سے نہیں پہنچائے جا سکتے، یہ ایک مائدہ وجد و سرور ہے، خاصان دقیقہ فہم کے لئے ایک جلوہ عمیق ہے۔ صاحب نظران نکتہ بیں کے لئے،

بر سماع راست ہر کس چیر نیست   طعمۂ ہر مرغکے انجیر نیست

ان تمام کمالات و معانی کے باوجود مرزا البشر تھے، ان کے کلام میں عیوب بھی ہیں، اکثر مقامات نثر و نظم میں اغلاق و اشکال اعتدال سے تجاوز کر گیا ہے، معنی شعر در بطن شاعر ہو کر رہ گئے ہیں، ایجاد مضامین و اجتہاد فن میں "المجتہد قد یخطی" کے فطری قانون سے آزاد نہیں ہو سکے، یہ مبحث ایک الگ فرصت کا متقاضی ہے،

اندھی

اجنبی۔ تجھے ڈر نہیں لگتا اس کے ذکر سے؟
اندھی۔ نہیں۔
اسے اب زمانہ ہوا۔ وہ کوئی اور ہی تھا۔
جس کے اس زمانہ میں آنکھیں تھیں، جو دیکھتی بولتی خوش و خرم جیتی تھی،
وہ مر گئی۔
اجنبی۔ اور بڑی سخت تھی بیچاری کی موت؟
اندھی۔ نہ جاننے والوں کے لئے موت انتہائی خوفناک ہے۔
بڑا مضبوط دل چاہئے اس کی برداشت کے لئے، وہ کسی غیر ہی کی موت کیوں نہ ہو
اجنبی۔ وہ تیرے لئے غیر تھی؟
اندھی۔ یا غیر ہو گئی۔
موت تو ماں سے بچے تک کو غیر کر دیتی ہے۔۔

لیکن پہلے کچھ دن بڑے ہی سخت تھے،
میری جان بھر جیسے زخموں سے چور تھی، اور دنیا،
جو باہر پھولتی پھلتی ہے،
(ایسا معلوم ہوتا تھا)

جیسے کسی نے جڑوں سمیت میرے دل سے کھینچ لی ہو،
اور میں کھدی کھدائی زمین کی طرح خالی پڑی رہ گئی تھی۔
اور اپنے ٹھنڈے آنسوؤں کا منہہ پیتی تھی
جن کی مردہ آنکھوں سے ایسی جھڑ لگی تھی
جیسے بادلوں کا بادشاہ مرگیا ہو اور بادل
اُجڑے ہوئے آسمانوں سے گر رہے ہوں۔
اور میرے کان بہت تیز ہو گئے تھے اور ہر آواز کے لئے تیار،
میں وہ چیزیں سن لیتی تھی جو سنی نہیں جا سکیں،
زمانے کے اپنے سر پر سے گذرنے کی آواز
اور وہ خاموشی تک جو کاغذی شیشوں میں لرزاں تھی،
اور محسوس کر لیتی تھی کہ ابھی میرے ہاتھوں کے پاس سے
کسی بڑے سے سفید گلاب کے پھول کی مہک گذر گئی۔
بار بار یہ ہی خیال آتا تھا، رات اور پھر رات،
اور کبھی جیسے ایک سفیدی کی جھلک سی نظر آتی تھی
جو میں یہ سمجھتی تھی کہ اب بڑھتے بڑھتے دن ہو جائے گا۔
اور خیال کرتی تھی کہ اب صبح ہونے والی ہو گی۔
اور صبح تھی کہ مدت سے میرے ہاتھوں پر پڑی جگ رہی تھی۔
ایک رات یکایک میری نیند میرے شب آلود جسم سے ایک پتھر کی طرح لڑھک کر گر پڑی۔
اور میں نے اپنی غریب ماں کو سوتے سے جگا دیا!
اماں! میں چلائی:
دیکھو تو اماں! روشنی تو کرو اماں!

اور گونج بر آواز ہو گئی؛
دیر تک، بڑی دیر تک ایک سناٹا رہا
اور میرے سر کے نیچے میرا تکیہ
جیسے پتھر کی چٹان ہوا جا رہا تھا،
اور پھر ایسا معلوم ہوا جیسے میں نے ایک چمک سی دیکھی
اور یہ چمک میری ماں کے دل جلے آنسوؤں کی چمک تھی
جن کا اب پھر نئے سرے سے خیال کرنے کو جی نہیں چاہتا۔
اکثر میں خواب میں چیخ اٹھتی تھی: روشنی! روشنی!
ارے روشنی کرو! روشنی!
آسمان گر پڑا،
اس کو اٹھا لو کوئی،

اوپر اور اوپر،
اور پھر ستاروں تک پہنچا دو!
یہ پہاڑ سا آسمان لئے
کوئی کیسے جئے ......
ارے ماں! یہ میں تجھ سے باتیں کر رہی ہوں؟
اور تجھ سے نہیں
تو پھر دنیا میں کس سے؟
یہ پیچھے کون کھڑا ہے؟
پردے کے پیچھے؟ خزاں؟
ماں: آندھی آ رہی ہے!

ماں : رات آ رہی ہے؟
بتلاؤ ؟

یا : دن ہے؟........دن!
بھلا میرے بغیر دن کیسے ہو سکتا ہے؟
کیا میری کہیں بھی ضرورت نہیں؟
کیا مجھے کوئی نہیں پوچھتا؟
کیا ہمیں سب کے سب بھول گئے؟

ہیں؟......
لیکن تم تو ابھی ہو وہاں،
تمھارے لئے تو ابھی سب کچھ ہے،

ہے نہ ماں؟
تیرے چہرے کے ارد گرد
ابھی ہر چیز کو نشاں ہے
کہ تیسے لذت یاب کرے
جب تیری آنکھیں آرام کرتی ہیں،
وہ کتنی ہی تھکی کیوں نہ ہوں،
پھر سے اٹھ کھڑی ہوتی ہیں۔
......میری جیب میں۔
میرے پھولوں کے رنگ کھو گئے
میرا آئینہ پتھر ہو گیا
میری کتابوں کی سطریں کبڑی ہو گئیں

اور میری ساتھ کھیلی چڑیاں
کہیں غیر جگہوں میں غیر گھروں کی کھڑکیوں سے
سر ٹکرا ٹکرا کر
لہو لہان ہو رہی ہوں گی۔
اب مجھ سے کسی سے رشتہ باقی نہیں،
میں سب سے چھٹ گئی،
میں ایک اجڑا جزیرہ ہوں۔
اجنبی۔ اور میں سمندر پار کر کے آیا ہوں۔
اندھی میرے جزیرے تک؟ ..... کیسے؟
اجنبی میں ابھی کشتی ہی میں ہوں
اور یہ کشتی ابھی آہستہ سے ٹکا دی ہے۔
تجھ سے۔ اور وہ ابھی ہل ہی رہی ہے،
اس کے جھنڈے سے خشکی کا عزم ظاہر ہے۔
اندھی میں ایک جزیرہ ہوں اور تنہا .....
میں غنی ہوں۔۔
پہلے پہلے جب پرانی راہیں میری رگ و پے میں
موجود تھیں اور انکی یاد ابھی بالکل تازہ، ہاں
وہ مصیبت کے دن تھے۔
ہر چیز میرے دل سے نکلی بھاگتی تھی
مجھے نہ معلوم ہوتا تھا کہاں؟۔
میرے سارے جذبات میری ساری ہستی

بند آنکھوں کے حلقوں کے پاس، غول کے غول جمع ہو کر
چیختے تھے اور شور مچاتے تھے،
اور آنکھوں کو حرکت نہ ہوتی۔

میرے فریب خوردہ جذبات ....
مجھے معلوم نہیں کہ وہ برسوں یوں ہی رہے،
لیکن وہ ہفتے مجھے ابھی یاد ہیں،
جن کے بعد وہ ہزیمت خوردہ واپس ہوئے۔
اور ان کو پھر کسی چیز کی خبر نہ رہی۔

اس کے بعد آنکھوں تک ایک راہ بن گئی۔
اب وہ مجھ کو یاد نہیں۔
اب تو ہر چیز میرے لئے اندر ہی اندر
چکر لگاتی ہے بے فکر اور مطمئن۔
اب میرے جذبات
میرے سینے کے تاریک مکان میں
مزے سے چلتے پھرتے ہیں اور خوش ہیں۔
ان میں سے اب بھی بعض میں
یادِ ماضی کم و بیش مستور ہے،

لیکن ان میں سے نئوں کی نظر
صرف مستقبل کی طرف ہے،
وہ صرف باہر کی طرف دیکھتے ہیں،
کیونکہ میرے جسم کے ہر کونے میں
ان کے لئے شیشہ کے روزن ہیں
جن سے وہ سب کچھ دیکھ سکتے ہیں۔
میری پیشانی دیکھتی ہے،
میرا ہاتھ دوسرے ہاتھوں کے حسن سے چشم سیر ہوتا ہے،
میرا پیر جس پتھر پر پڑتا ہے اس سے ہمکلام ہوتا ہے،
اور پرندوں میں سے ہر ہر پرند
میرا ہمنوا ہے۔
اب مجھے کسی چیز کی کمی نہیں،
آواز و بو رنگوں کے ترجمان ہوگئے ہیں
اور رنگ سروں میں بے انتہا بھلے معلوم ہوتے ہیں۔
مجھے کتابوں سے کیا کام:
ہوا درختوں کی صفحہ گردانی کر رہی ہے
اور اس سے جو لفظ بچ بچ کر نکلتے ہیں
وہ سب مجھے معلوم ہیں:
اور کبھی میں ان کو آہستہ سے دہراتی بھی ہوں:
اور موت، جو آنکھوں کو پھولوں کی طرح توڑ لیتی ہے،
اسے میری آنکھیں نہیں ملتیں ......

اجنبی۔ (بہت آہستہ سے) ہاں مجھے معلوم ہے۔

نالۂ وحشت

"رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے"

دوش پر سیلاب کے یا گود میں گرداب کے ہو
ہے غرض محروم ساحل موج دریا آشنا

جس کو وحشت سے بھی وحشت ہو قرار اسکو کہاں
آہوئے صحرا تو اِک حد تک ہے صحرا آشنا

ہو گماں بیگانگی کا جس پہ ایسا التفات
کس قدر نا آشنا صورت ہے اپنا آشنا

جوشِ وحشت جب تصور تک نہ بندھنے دے کبھی
ہے ستم کہیئے اگر مجنوں کو لیلیٰ آشنا

عمر کٹتی ہی مگر اس طرح اے آرام جاں
زندگی ناساز، تو نایاب، اجل نا آشنا

خون گردش میں نفس بےچین، نبضیں مضطرب
ہر بنِ مو سوز پیہم سے سکوں نا آشنا

روتے روتے تھک گئیں اور بوجھ سے جھک گئیں
نیند سے لیکن نہ ان آنکھوں کو دیکھا آشنا

قلب مضطر، دم خفا، خاطر پریشاں بھی اداس
غیر کیا اپنوں میں بھی کوئی نہ نکلا آشنا

اہل دنیا ہیں فقط صورت شناس روز عیش
شام غم کی تیرگی میں کون کس کا آشنا

"میں ہوں اور آفت کا ٹکڑا وہ دل وحشی کہ ہے
عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا"

ع۔ ح

دارُالمصنّفین

اس کی گذشتہ تاریخ اور اس کا تخیّل

دارالمصنّفین، اعظم گڈھ کی طرف سے ایک رسالہ بغرض اشاعت ہمیں موصول ہوا ہے، جس کا نام ہے "دارالمصنّفین اس کا تخیل اور اس کی گذشتہ تاریخ" ہم اس رسالہ کے جستہ جستہ اقتباسات اس عنوان سے شائع کرتے ہیں "دارالمصنّفین" اس کی گذشتہ تاریخ اور اس کا تخیل"۔ تقدیم و تاخیر کی اس ترمیم سے ہمارا منشا جہاں اہل ملک میں دارالمصنّفین کے علمی و ادبی کارناموں کی اشاعت ہے وہاں ارباب دارالمصنّفین کے سامنے اس حقیقت کو لانا بھی ہے کہ ادارہ مذکورہ کے گذشتہ کارنامے خواہ کتنے ہی مغتنم اور قابل قدر کیوں نہ ہوں، لیکن ابھی اسے اپنے اصل تخیل تک پہنچنے کے لئے بہت سی منزلیں طے کرنی ہیں۔ امید ہے کہ ارباب دارالمصنّفین ہمارے اس مخلصانہ مشورہ کی طرف توجہ فرمائیں گے اور اس حق گوئی پر ہمیں معاف کریں گے

سب سے پہلے ہم تاسیس دارالمصنّفین اور اس کے علمی اور کاروباری صیغوں کا ذکر کرتے ہیں جس سے اس کی گذشتہ تاریخ اور موجودہ حالت کا اندازہ ہو سکے گا۔ پھر بعد میں ان تخیلات کا ذکر کریں گے جو اس ادارہ کے تاسیس کے محرک ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ

تاسیس دارالمصنّفین

"یہی وہ تخیلات[1] تھے جو سب سے پہلے علامہ شبلی مرحوم کے پیش نگاہ آئے اور انھوں نے ایک علمی مجلس دارالمصنّفین کے نام سے قائم کرنے کا قصد کیا لیکن ندوہ اور سیرت نبوی کی مصروفیت سے اسس

---

[1] ان تخیلات کا ذکر بعد میں آئے گا۔

تخیل کو عملی قالب میں لانیکا موقع نہ مل سکا۔ یہاں تک کہ جب ۱۹۱۳ء میں مولانا نے ندوہ کی خدمات سے سبکدوشی حاصل کی تو ان تخیلات کے عملی قالب میں آنے کا وقت آپہنچا، اور ۱۹۱۴ء میں الہلال کے ذریعہ سے اس تجویز کو مستقل طور پر سب سے پہلی مرتبہ ملک کے سامنے پیش کیا،

اس کے بعد مولانا شبلی نے اپنے وطن اعظم گڑھ میں سب سے پہلے اپنا ایک وسیع باغ اور کچے بنگلے وقف کئے اپنی اور اپنے بعض اعزہ کی ذاتی کتابیں اور سیرت کی کتابیں دار المصنّفین کے نام منتقل کردیں، ان مراتب کے طے ہوجانے کے بعد چند قواعد ترتیب دیئے، اور اپنے تلامذۂ خاص کو خطوط بھیجے کہ وہ رخت سفر باندھنے کے لئے تیار ہوجائیں، لیکن یہ سروسامان ابھی ہو ہی رہے تھے کہ خود مولانا نے ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء کو ہمیشہ کے لئے اپنا رخت سفر باندھ لیا، اور دار المصنفین کی تحریک صرف اسی حد تک انجام کو پہنچ سکی کہ ان کی یہ پیشین گوئی پوری ہوجائے کہ "شاید وہی میرا مدفن بھی ہو" مولانا کی وفات کے بعد دار المصنّفین کے تخیل کا عملی قالب جن اجزا کی شکل میں موجود تھا، ان کا مجموعہ ایک باغ، دو کچے بنگلے اور چند الماری کتابوں سے جن کی تعداد چند سو تھی، زیادہ نہ تھا۔

اس کے بعد مولانا کے تلامذہ اور متوسلین کی کوششوں کا دور شروع ہوا اور ۲۱ نومبر ۱۹۱۴ء کو یعنی مولانا کی وفات کے تیسرے دن، مولانا حمید الدّین صاحب مرحوم کی دعوت پر مولانائے مرحوم کے علمی کاموں کی تکمیل کے لئے ایک عارضی مجلس "اخوان الصفا" کے نام سے قائم کی گئی، جس کے علمًا صدر مولانا حمید الدین صاحب ناظم مولانا سید سلیمان صاحب ندوی، اور مولانا مسعود علی صاحب ندوی مہتمم امور تھے،

اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ اس مجلس کا سب سے پہلا کام سیرت نبویؐ کی تکمیل ہے، چنانچہ اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر مولانا حمید الدین مرحوم اور مولانا سید سلیمان ندوی کا ایک وفد سرکار عالیہ جنت منزل مرحومہ بھوپال کی خدمت میں حاضر ہوا، اور سرکار عالیہ نے بدستور سیرت نبوی کا ماہوار وظیفہ جاری رکھا، مولانا کے باغ و بنگلہ کا وقف ناتمام رہ گیا تھا۔ ۴ ۲ نومبر ۱۹۱۵ء کو اعیان شہر کی ایک مجلس مدعو کی گئی اور وقف کے بقیہ مراحل طے کئے گئے، اور مولانا کے احباب خاص میں مرزا محمد سلیم مرحوم و مرزا محمد نعیم مرحوم کا باغ بھی جو اسی باغ سے ملحق تھا، دار المصنفین پر وقف کیا گیا، لیکن خاص دار المصنفین کے لئے نہ اب تک کوئی سرمایہ

تھا۔ نہ اس کی کوئی باضابطہ جماعت تھی، نہ اس کے لئے کوئی کارروائی شروع ہوئی تھی، اور نہ اس کے مقاصد اور دستورالعمل کا خاکہ تیار ہوا تھا،

مولانا مسعود علی صاحب نے اعظم گڈھ میں قیام منظور کیا، مولانا سید سلیمان صاحب نے اخبارات میں مضامین لکھ کر دارالمصنفین کے قیام کی اطلاع شائع کی، اور ملک کے مشاہیر اور اکابر سے خط وکتابت کرکے ان کو اس کی تاسیس کی طرف متوجہ کیا،

مولانا حمید الدین صاحب نے حیدرآباد پہنچکر دارالمصنفین کے لئے مولانا شبلی مرحوم کی ماہوار رقم منتقل ہوجانے کی کوشش فرمائی، نواب عماد الملک بہادر اور سر اکبر حیدری معتمد عدالت وامور عامہ سرکار عالی یعنی نواب سر حیدر نواز جنگ کی سفارش سے حضور نظام خلد اللہ ملکہ نے اپنی مشہور شاہانہ فیاضی وعلم دوستی کے ساتھ مولانائے مرحوم کے منصب سہ صد ماہوار کو دارالمصنفین کیلئے منتقل کرنا منظور فرمالیا۔

بعد ازیں دارالمصنفین کے مقاصد اور قواعد کا خاکہ تیار کیا گیا اور ارکان کی جماعت نے منتخب ہوکر ان کی تصدیق وتوثیق کی،

مقاصد دارالمصنفین | دارالمصنفین کے حسب ذیل مقاصد قرار پائے۔

۱۔ ملک میں اعلیٰ مصنفین اور اہل قلم کی جماعت پیدا کرنا۔

۲۔ بلند پایہ کتابوں کی تصنیف وتالیف وترجمہ،

۳۔ ان کی اور دیگر علمی کتابوں کی طبع واشاعت کا سامان کرنا،

ترتیب | سرکار نظام، نے اجرائے وظیفہ کے لئے دارالمصنفین کی باقاعدہ سرکاری رجسٹری ضروری قرار دی تھی؟ اور ملک کے اعتماد کے لئے بھی اس کے رجسٹرڈ ہوجانے کی ضرورت تھی، اس لئے ۱۴ جون ۱۹۱۵ء کو لکھنؤ میں شبلی اکاڈمی اور دارالمصنفین کے نام سے باقاعدہ اس کی رجسٹری کرائی گئی اور اسی کے ساتھ دارالمصنفین کا کام بھی باقاعدہ طور پر شروع ہوگیا، سب سے پہلے ایک مجلس انتظامیہ کی تشکیل ہوئی جو ملک کے سربرآوردہ اہل قلم پر مشتمل تھی، مجلس انتظامیہ کی صدارت نواب عماد الملک بہادر نے قبول

فرمائی اور اپنے قیمتی مشوروں اور وقیع عطیات سے دارالمصنفین کی امداد فرمائی اور جسٹس سید کرامت حسین مرحوم نے نائب صدر ہونا قبول فرمایا، موصوف نے بھی اپنے قیمتی مشورے خصوصاً علوم جدیدہ کی ترتیب و تالیف کے اصول پیش کرکے دارالمصنفین کی رہنمائی فرمائی اور اسی مجلس انتظامیہ میں سے ایک مجلس عاملہ بنائی گئی، اور مولانا حمیدالدین صاحب مرحوم کو صدارت تفویض ہوئی اور ان کا وجود تمام عمر دارالمصنفین کے لئے سرمایہ اعتماد اور سہارا بنا رہا، اور مولانا سید سلیمان ندوی اس مجلس کے ناظم مقرر ہوئے اور مولانا مسعود علی ندوی کو اہتمام کے فرائض سپرد ہوئے اور پندرہ ارکان کی مجلس انتظامی بنائی گئی اور ۵ ارکان کی مجلس عاملہ منتخب ہوئی، جس کے ہاتھ میں دارالمصنفین کا تمام کاروبار اور انتظام ہے۔

صیغہائے دارالمصنفین

قیام دارالمصنفین کے بعد دو سال کی مسلسل جد و جہد سے اس کے متعدد صیغے الگ الگ قائم ہوگئے، اور وہ اس وقت بھی اسی شکل میں ہیں یعنی صیغۂ سیرت نبوی (۲) صیغۂ دارالتالیف (۳) صیغۂ دارالطباعہ (۴) صیغۂ دارالاشاعت (۵) صیغۂ رسالہ معارف (۶) صیغۂ دارالکتب (کتب خانہ) (۷) صیغۂ تعمیرات اور آج تک ہر صیغہ اپنی تدریجی ترقی کے بعد جس منزل تک پہنچ چکا ہے اس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) صیغۂ سیرت نبوی۔ اس کی تمام تر ذمہ داری ناظم دارالمصنفین مولانا سید سلیمان ندوی کے سر عائد ہوئی، مولانائے مرحوم نے سیرت کا صرف ایک حصہ لکھا تھا، جو نامکمل تھا، ان کے جانشین نے اس کو پوری تکمیل کے ساتھ شائع کیا، پھر تیسری جلد معجزات کی تفصیلی بحث پر شائع ہوئی۔

اس کے بعد سیرت کا سب سے اہم حصہ وہ ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے بحیثیت پیغمبر کے بحث کی گئی ہے، مولانائے مرحوم نے اس حصے کے چند نا تمام اجزا لکھے تھے۔ اب بفضل خدا یہ جلد بھی شائع ہوکر مقبول ہوچکی ہے، اس کے بعد سیرت کی پانچویں جلد "سیرت اور مستشرقین یورپ" کے عنوان پر ہوگی۔

۲ صیغۂ دارالتالیف، یہ صیغہ سیرت کے علاوہ دیگر اہم تالیفات کیلئے جداگانہ قائم کیا گیا ہے

اس میں اولاً ایسے متعدد رفقار اور مصنفین ہیں جو مستقلاً دارالمصنفین سے وابستہ ہیں۔ ان کے علاوہ باہر سے جو مصنفین و مترجمین اپنی کتابیں شائع کرنے کے لئے بھیجتے ہیں وہ بشرط پسندیدگی یہاں منتخب کیجاتی ہیں،

اوّل اوّل جب دارالمصنفین قائم ہوا تو مصنفین میں مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالسلام ندوی کے سوا اور کوئی نہ تھا، مولانا سید سلیمان ندوی دکن کالج پونا کی پروفیسری کو خیرباد کہہ کر تشریف لائے تھے، اور مولانا عبدالسلام ندوی الہلال کلکتہ کے صیغۂ ادارت سے، اس کے بعد مختلف اہل علم وقتاً فوقتاً دارالمصنفین کی رفاقت سے وابستہ ہوتے گئے چنانچہ اب تک حسب ذیل اہل قلم کی خدمات اس کو حاصل ہوئیں۔

۱. مولانا عبدالباری ندوی حال پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد

۲. مولوی سعید صاحب انصاری مصنف سیرانصار وصحابیات،

۳. مولوی حاجی معین الدین صاحب مصنف مہاجرین، حال کٹیلاگر پٹنہ اورنٹیل لائبریری۔

۴. مولوی ابوالحسنات صاحب ندوی مرحوم

۵. جناب سید نجیب اشرف صاحب ندوی ایم اے، حال پروفیسر اسمٰعیل کالج بمبئی،

۶. مولوی ابوالجلال صاحب ندوی سابق پرنسپل عربک جمالیہ کالج مدراس،

ان میں سے مولوی ابوالحسنات ندوی کو دست اجل نے ہم سے چھین لیا، بقیہ حضرات نے اپنی اپنی مدت رفاقت ختم کرنے کے بعد دیگر مشاغل علمی اختیار کرلئے جو ان کے انتساب بالا سے ظاہر ہیں اوراس وقت حسب ذیل حضرات دارالمصنفین سے وابستہ ہیں، جو دارالمصنفین میں قیام رکھتے ہوئے اپنی اپنی علمی خدمات انجام دے رہے ہیں، اور دارالتصنیف کا شعبہ انھی لوگوں پر مشتمل ہے،

۱. مولانا سید سلیمان ندوی،

۲. مولانا عبدالسلام ندوی،

۳. مولانا سعید انصاری،

۴. مولانا سید ریاست علی ندوی،

۵. مولوی شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی،

۶۔ جناب محمد عزیر صاحب ایم اے ایل ایل بی،

ان وابستگانِ دار المصنفین کے علاوہ بعض بیرونی اہل قلم نے بھی اس کو اپنی خدمات کا مرکز بنایا اور ان کی مستقل تصنیفات و تراجم دار المصنفین سے شائع ہوئے،

اس تفصیل سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ ملک کی برگزیدہ علمی جماعت دار المصنفین سے دلچسپی رکھتی ہے اور عربی داں اور انگریزی خواں دونوں قسم کے لوگ دار التصنیف کی ہیئت ترکیبی کے جزو ہیں،

اب تک دار المصنفین میں مخصوص رفقائے دار المصنفین اور اس کے رفقائے اعزازی نے جو کتابیں تالیف و ترجمہ کیں ان کی تعداد چالیس سے زیادہ ہے جن میں سے ہر ایک کی اوسط ضخامت ساڑھے تین سو سمجھنا چاہئیے، ہم دار المصنفین کی تالیف و تراجم کو موضوع کے اعتبار سے حسب ذیل عنوانوں پر تقسیم کرسکتے ہیں۔

سیرت۔ سیرۃ نبوی کی چار جلدوں کے علاوہ جن کا تذکرہ شعبہ سیرت میں گزر چکا ہے، سیر الصحابہ کی ترتیب و تدوین کا کام ابتدا ہی سے شروع ہوا تا کہ ہندی مسلمانوں کو اسلامی تمدن اور اس عہد اوّل کی اصلی تصویر نظر آجائے، مختلف رفقاء و مصنفین نے اس کتاب کے مختلف حصے لکھے، یہ ایک نہایت وسیع اور عظیم الشان کام تھا اور اب پندرہ سولہ سال کی مسلسل محنت کے بعد تکمیل کو پہنچا ہے، یہ سلسلہ مجموعاً دس جلدوں میں اسوۂ صحابہ، اسوۂ صحابیات، سیر الصحابیات، سیر انصار، در دو جلد، خلفائے راشدین، مہاجرین، در دو جلد، اور سیر الصحابہ یعنی صحابہ بعد فتح مکہ وغیرہ پر مشتمل ہے، یہ سب کی سب نہایت اہم ہیں، اب تک اردو زبان میں صحابہ کے حالات میں اس قدر جامع و مکمل تالیف موجود نہ تھی، اس میں صحابہ کے اخلاق اور عملی زندگی کے واقعات زیادہ نمایاں طور سے دکھائے گئے ہیں،

سوانح سیر الصحابہ کے اس وسیع سلسلہ کے علاوہ متعدد کتابیں بزرگانِ اسلام کے سوانح میں شائع ہوئیں، جن میں سے اوّلاً حیات مالک، سیرت عائشہ، و سیرۃ عمر بن عبد العزیز ہیں، ان میں ان بزرگوں کے عام حالات کے علاوہ یورپ کے جدید طریق سوانح نگاری کے اصول پر ان کے سوانح حیات کے مختلف ابواب پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اسی سلسلہ میں عالمگیر کے تاریخی رقعات کی ترتیب نہایت اہم ہے جس کی ابھی تک

صرف ایک جلد مع ایک وسیع مقدمہ کے شائع ہو چکی ہے، چند جلدیں ابھی باقی ہیں، یہ سلسلہ حقیقت میں اس عظیم الشان بادشاہ کی اصلی تاریخ کا کام دے گا،

تاریخ علوم وفنون: اسلامی علوم وفنون کی تاریخ بھی نہایت اہم کام ہے، اس سلسلہ میں ارض القرآن در دو جلد، تاریخ فقہ اسلامی، اور طبقات الامم شائع ہو چکی ہیں، اسی طرح مسلمانوں کے علم تاریخ کی سرگذشت تاریخ التاریخ کے نام سے ترتیب پا رہی ہے،

تاریخ ممالک: مسلمانوں نے سسلی پر ڈھائی سو برس تک حکومت کی اور اسپین کی طرح اس کو بھی اسلامی خیر و برکت کا سرچشمہ بنا دیا تھا، مگر کس قدر افسوس کی بات تھی کہ اس کی تاریخ اردو فارسی تو کیا عربی میں بھی موجود نہ تھی، چار پانچ برس کی محنت اور تلاش وتحقیق کے بعد دو ضخیم جلدوں میں اس کی تاریخ مرتب کیگئی ہے پہلی جلد سسلی کی اسلامی سیاسی تاریخ پر مشتمل ہے، اور دوسری جلد یہاں کے اسلامی تہذیب و تمدن اور علوم وآداب کا مرقع ہے، اسی طرح اگرچہ اردو میں اسلام کی بہت سی تاریخیں لکھی گئی ہیں، لیکن ابھی تک اس موضوع پر مستند اور وسیع سلسلہ کی جگہ خالی تھی، دار المصنفین نے تاریخ اسلام کے اس وسیع سلسلہ کو بھی چھیڑ دیا ہے، نیز اس سے الگ آئندہ ہندوستان کی ایک مکمل تاریخ کی تدوین بھی پیش نظر ہے،

فلسفہ تاریخ کے عنوان میں ابھی تک صرف ایک کتاب کا ترجمہ انقلاب الامم کے نام سے شائع ہوا ہے، اور آجکل تاریخ اخلاق اسلام کے نام سے ایک وسیع سلسلہ زیر تالیف ہے،

حدیث: اردو میں اب تک حدیث کا کوئی ایسا مستند مجموعہ مرتب نہیں ہوا، جس کی ہر حدیث اپنی صحت کے لحاظ سے بلا جرح و تعدیل قبول کر لینے کے قابل ہو، دار المصنفین نے اس ضرورت کا احساس کیا، چنانچہ اس وقت اسی قسم کا ایک مجموعۂ حدیث زیر ترتیب ہے، جس میں صحت کے لئے یہ التزام رکھا گیا ہے کہ صرف وہی حدیثیں انتخاب کی جائیں جو صحیح بخاری و مسلم دونوں میں موجود ہوں، اور دونوں کے نزدیک وہ متفق ہوں، یہ مجموعۂ حدیث ایک بسیط مقدمہ کے ساتھ عنقریب شائع ہو جائے گا، اور یہ اردو زبان میں نہایت قیمتی اور مقدس کارنامہ انجام پائے گا،

فقہ، میں اب تک دو کتابیں نکلی ہیں، القضاء فی الاسلام، اور اسلامی قانون فوجداری،
جدید علم کلام کے عنوان میں الجہاد فی الاسلام پر اسی نام سے ایک ضخیم کتاب شائع ہوگئی ہے،
فلسفۂ جدید کے موضوع پر اب تک چند کتابیں برکلے، مکالمات برکلے، نطشے، مقالۂ روسو، ابن
رشد، مبادی علم انسانی، روح الاجتماع اور نفسیات ترغیب شائع ہوئی ہیں، ان کی اشاعت میں خاص
طور پر یہ لحاظ رکھا گیا کہ فلسفہ کی صرف وہی کتابیں شائع کیجائیں جن کی حیثیت کلاسیکل ہے،
ادبیات، اس سلسلہ میں اردو شاعری کی تاریخ اور شعرائے اردو کے حالات میں تین مبسوط کتابیں
شعرالہند در دو جلد اور گل رعنا شائع ہوئی ہیں،
لغت، اسیطرح ایک مستند عربی اردو لغت کی شدید ضرورت محسوس کیجارہی تھی، دارالمصنفین
نے اس ضرورت کو بھی پورا کیا، ایک اوسط قسم کی جامع لغت ترتیب پاچکی ہے، جو ہنوز مسودہ ہے،
ان ضخیم مختلف النوع تصنیفات کے علاوہ رفقائے دارالمصنفین نے مختلف علمی عنوانوں پر جو رسالے
لکھے ہیں، وہ ان کے علاوہ ہیں، اور ان کی بھی ایک خاص تعداد ہے،
نیز شعبۂ دارالتصنیف ایک اہم علمی خدمت یہ بھی انجام دیتا ہے، کہ اسلامی علوم و تاریخ و عقائد و مسائل
وغیرہ کے متعلق اطراف ملک سے استفسار کے طور پر سیکڑوں سوالات آیا کرتے ہیں اور ان کے جوابات یہاں
سے تحقیق اور استقصار کے ساتھ لکھ کر بھیجے جاتے ہیں اس مشغلہ میں رفقائے دارالمصنفین کا کافی وقت صرف
ہوتا ہے، اور شاید اس لحاظ سے یہ ادارہ اسلامی ہند میں منفرد ہو، ولا فخر،
علاوہ ازیں دارالمصنفین کے شعبۂ دارالتصنیف نے اردو زبان کی ان کتابوں کے علاوہ عربی زبان
میں بھی تصنیفات شائع کئے، اس سلسلہ میں ابومسلم اصفہانی کے تفسیری اجزا، نظام القرآن کے مختلف
اجزاء، مولانا سید عبدالحی مرحوم کی ایک مبسوط تاریخ ہند، مولانا فیض الحسن مرحوم سہارنپوری کا عربی دیوان
ابوالعلاء معری کے سوانح حیات اور اس کے کلام اور مختلف فیہ احسنہ اسوانح پر ایک وقیع تنقید اور اسیطرح
ابتدائی عربی رسائل وغیرہ کی اشاعت اس کا قابل ذکر کارنامہ ہے،
۳۔ صیغۂ دارالطباعۃ، دارالمصنفین کی تمام اردو تصنیفات اسی مطبع معارف میں طبع ہوئیں

و مسرت ہے کہ اس کے اہتمام حسن طبع اور حسن مذاق کی کافی حوصلہ افزائی ہوئی ہے، ابتداءً اس صیغہ میں لیتھو کا ایک پریس تھا، بعد میں ایک اور پریس کا اضافہ ہوا اور پھر دو مشینیں اور آگئیں اور پھر ایک ٹائپ انجن کا اضافہ ہوا، اس صیغہ کے عملہ کی مجموعی تعداد اس وقت ۳۲ ہے۔

۴۔ صیغۂ دار الاشاعت: اس صیغہ میں زیادہ تر مولانائے مرحوم اور رفقاء مصنفین دار المصنفین کی تصنیفات ہیں، اور نیز انجمن ترقی اردو، اور مکتبہ جامعہ ملیہ کی کتابیں بھی داخل ہیں، علاوہ ازیں ملک کے دیگر مشاہیر کی کتابیں بھی جمع کی گئی ہیں، گویا اردو کا مستند علمی ذخیرہ اس میں جمع کر لیا گیا ہے، اس دار الاشاعت سے صرف وہی کتابیں شائع کی جاتی ہیں جو متین، سنجیدہ، اور مستند ہوں، ابتدا میں کتابوں کی شکل میں دار المصنفین کا سرمایہ چار یا پانچ ہزار سے زیادہ نہ تھا، لیکن اب تقریباً ڈیڑھ دو لاکھ روپیہ کی کتابیں موجود ہیں،

۵۔ صیغۂ رسالۂ معارف: قیام دار المصنفین کے تقریباً دو سال بعد ماہ جولائی ۱۹۱۶ء میں معارف کا پہلا پرچہ شائع ہوا، اور بفضلہ تعالیٰ وہ اپنی خصوصیات کے ساتھ ابھی تک جاری ہے، ابتداءً اس کی ضخامت ۶۰ صفحے تھی، اور زیادہ تر مضامین دار المصنفین کے رفقاء وارکان کے ہوتے تھے لیکن دو ہی سال کے بعد یہ ۸۰ صفحوں پر یعنی سالانہ ۹۶۰ صفحے کا شائع ہونے لگا، اور اس کے قلمی معاونین کا دائرہ بھی وسیع ہوتا گیا اور ملک کے سنجیدہ، مشہور اور مستند اہل قلم کا ایک مخصوص مرکز بن گیا، یہ ہندوستان کے علمی رسالوں میں جس وقعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، اس کے متعلق ہم خود اپنی زبان سے کچھ کہنا نہیں چاہتے،

صیغۂ دار الکتب: مولانائے مرحوم اپنا ذاتی کتب خانہ تو ندوہ پر وقف کر چکے تھے، لیکن ندوہ سے علحدگی کے بعد کچھ کتابیں سیرت نبوی کی تدوین کے سلسلہ میں جمع ہو گئیں، پھر جب اعظم گڑھ میں مستقل سکونت اختیار کی تو چند اعزہ نے بھی اپنی اپنی کتابیں مولانا کو دے دیں لیکن کتابوں کا یہ کل سرمایہ پانچ الماریوں سے زیادہ نہ تھا، جو دار المصنفین کی وسیع ضروریات کے لئے ناکافی تھیں۔ اس لئے دار المصنفین کے ابتدائے قیام ہی سے کتبخانہ کی توسیع و تکمیل کی طرف توجہ کی گئی، اور ہر سال کتابوں کے خریدنے کیلئے ایک معقول رقم معین کر دی گئی اسی کے ساتھ ناظم دار المصنفین، مولانا سید سلیمان ندوی کے سفر یورپ سے دار المصنفین کے کتب خانہ کو بہت

بڑی مدد ملی، وہ یورپ کی عام مطبوعہ مشرقی کتب کا ذخیرہ اپنے ساتھ لیتے آئے علاوہ ازیں وہاں کے ممتاز کتب فروشوں سے مستقل تعلقات قائم کر لئے گئے چنانچہ اس کے بعد جو بہترین کتابیں یورپ میں مشرقی علوم کی طبع ہوتی ہیں، ان کا ایک نسخہ دار المصنفین کے کتب خانہ میں ہدیۃً یا بالقیمت ضرور آتا ہے،

اسی کے ساتھ ملک کے اہل علم رؤسا نے بھی توجہ فرمائی، جنہیں خصوصیت کیساتھ اس قیمتی عطیہ کا تذکرہ کرنا ہے، جو ہمیں خود ہمارے ضلع کے بعض رؤسا کی طرف سے کتب خانہ کو حاصل ہوا یعنی مولوی محمد اکرم خانصاحب رئیس محمد آباد (ضلع اعظم گڈھ) نے اپنا پورا کتبخانہ عنایت فرمایا، جنمیں قیمتی قلمی کتابوں کا بھی معتد بہ حصہ ہے۔

اس طور پر دار المصنفین کے کتب خانہ نے ایک مستقل کتب خانہ کی صورت اختیار کرلی ہے، اور اب ۱۴۱ الماریاں مختلف علوم و فنون کی کتابوں سے لبریز ہیں، اور سالانہ ایک ہزار روپیہ کتابوں کی خریداری پر صرف کیا جاتا ہے، خریداری کے متعلق یہ خاص اہتمام ہے کہ وہی کتابیں خریدی جائیں جو تصنیفی ضروریات کے مطابق ہوں اور خاص طور سے ہر فن کی اہم ترین کتابیں جمع کیجائیں، قدماء کی تصانیف کا خاص خیال رکھا جائے، اسلئے مصر و شام اور یورپ کے مختلف دار الاشاعتوں سے مستقل تعلقات قائم کر لئے گئے ہیں، اور جو کتابیں وہاں اسلامی تاریخ، مذہب، عقائد اور فلسفہ کے متعلق شائع ہوتی ہیں، وہ یہاں آجاتی ہیں،

اس لئے دار المصنفین کے اس کتب خانہ میں جہاں برابر تازہ مطبوعات اور جدید کتابوں کا اضافہ ہوتا رہتا ہے، یورپ کی اکثر مطبوعات موجود ہیں بعض علمی نوادر بھی ہیں، قدامت کے لحاظ سے چھٹی صدی ہجری کی کتاب بھی اس کتب خانہ میں ہے، بعض شاہی کتب خانوں کی کتابیں بھی اس میں ہیں لیکن افسوس ہے کہ انگریزی کتب خانہ مختصر ہے، گو اس کے فلسفہ کا حصہ خاصہ ہے، اور مستند انگریزی رسائل کا ذخیرہ کافی ہے، سیرت کے متعلق کتابیں بھی اکثر موجود ہیں، تاہم یہ حصہ ہماری ضروریات کے لحاظ سے بہت کم ہے،

صیغۂ تعمیرات ابتداء میں مولانائے مرحوم نے دار المصنفین کے لئے دو خام بنگلے وقف کئے تھے، ان کے سوا دار المصنفین کے پاس تعمیرات کے سلسلہ میں کچھ نہ تھا لیکن یہ دونوں خام اور بوسیدہ بنگلے دار المصنفین کی ضروریات کیلئے بالکل ناکافی تھے، اس لئے ابتداء ہی میں رفقاء و مصنفین کے لئے پانچ چھ پختہ کمرے بنوائے گئے، اس کے بعد دفتر کیلئے تین پختہ وسیع کمرے تعمیر ہوئے پھر پریس کے لئے الگ مکان تعمیر کیا گیا

لیکن اب تک کتبخانہ اور تصنیف و تالیف کے لئے کوئی مستقل عمارت موجود نہ تھی، کتب خانہ مولانائے مرحوم کے وقف کردہ ذاتی بنگلہ میں تھا اور رفقاء مصنفین اپنے اپنے کمروں میں کام کرتے تھے، اسلئے اس بنگلہ کو منہدم کرکے کتب خانہ اور تصنیف و تالیف کیلئے ایک وسیع و شاندار عمارت بارہ پندرہ ہزار کے صرف سے تعمیر کیگئی اور اب اسی کا نام دار المصنفین ہے، وسط میں دو بڑے ہال، پھر ان کے بعد دو بغلی کمرے، اور چاروں گوشوں پر ایک ایک چھوٹا کمرہ اور سامنے کے برآمدے پر ایک شاندار پورٹیکو ہے، اور اسکی وجہ سے دار المصنفین کی شان عظمت مادّی حیثیت سے بھی نمایاں ہوگئی ہے، ہمارے لئے تعمیر کتب خانہ کے ضمن میں ان محسنوں کا ذکر بھی ضروری ہے جنھوں نے بیس روپیہ سالانہ کے ارکان بناکر کتبخانہ کی تعمیر کی مالی دقتوں کا حل کیا، ان میں سے جناب مولوی سید حسن امام صاحب وارثی رئیس گیا، جناب نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خان شروانی اور جناب پروفیسر عبد الباری صاحب ندوی، اور مولوی سیّد ہاشم صاحب ندوی کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں،

اسی کے ساتھ نواب سر مزمل اللہ خان رئیس بھیکن پور کے عطیۂ خاص سے ایک خوبصورت مسجد تعمیر ہوگئی ہے، دار المصنفین میں مستقل قیام پذیر لوگوں کے لئے ایک ایک مکان کی تعمیر زیر تجویز ہے جنمیں سے دو مکانات امسال بنکر تیار ہوئے ہیں،

دار المصنفین کے بھی چند شعبے تقسیم کار کے اصول پر برابر خوش اسلوبی سے کام کر رہے ہیں، اس وقت ملازمین و وابستگان دار المصنفین کی مجموعی تعداد ۲۵ ہے جن پر تقریبًا بارہ تیرہ سو روپے ماہوار بطور تنخواہ و وظائف کے خرچ ہوتے ہیں، اور دار المصنفین کا سالانہ بجٹ تقریبًا چالیس پنتالیس ہزار روپیہ کا کم و بیش ہوتا ہے اور بارہ پندرہ ہزار سرمایہ محفوظ ہے"۔

یہ ہے اس ادارہ کا مختصر خاکہ جس کی بنیاد آج سے تقریبًا بیس سال قبل مولانا شبلی نے ڈالی تھی لیکن سوال یہ ہے کہ وہ کیا تخیلات تھے جو اس ادارے کی تاسیس و بنا کے محرک ہوئے، اس کا جواب خود صاحب رسالہ کے الفاظ میں سنئے "انھوں نے دیکھا کہ دور حاضرہ کی مثال تقریبًا عہد عباسیہ سے ملتی جلتی ہے یعنی اس عہد میں جب نئی ضرورتیں پیدا ہوئیں تو اسلامی علوم و آداب میں بھی انقلاب پیدا کیا گیا

"ایک گروہ نے علوم و فنون کے ترجمے سے عربی زبان کو مالا مال کیا، ایک دوسرے گروہ نے اسلامی علوم و آداب کی سادہ دیواروں پر میناکاریاں اور نقش آرائیاں کیں، عقائد نے علم کلام کی صورت اختیار کی، اصول فقہ میں منطقی استدلال پیدا ہوئے، تفسیر میں فلسفہ کی آمیزش ہوئی، فرائض میں علم حساب کے دقیق مسائل شامل ہوئے، علوم یونان و ہند میں جہاں غلطیاں دیکھیں ان کی اصلاح کی اور جہاں جہاں خامیاں نظر آئیں انھیں پورا کیا"

بعینہٖ "اس دور جدید میں بھی فلسفہ نے ایک نئی صورت اختیار کرلی ہے، منطق میں نئے برگ و بار پیدا ہوگئے ہیں، معانی و بلاغت کا اسلوب بدل گیا ہے، تاریخ ایک قسم کا فلسفہ بن گئی ہے اور اس طرح ان مستشرقین یورپ کے زہر کا تریاق پیدا کرنے کے لئے اسلامی علوم و آداب خصوصاً علوم دینیہ میں صدہا قسم کے جدید ابواب مختلف ضرورتوں سے پیدا ہوگئے ہیں" چنانچہ ان حالات کے مدنظر انھوں نے چند تلامذہ اور احباب خاص سے ایک جماعت مرتب کی" اور ان کے سامنے تصنیف و تالیف کا ایک مخصوص لائحہ عمل پیش کیا، جسمیں تصنیف و تالیف کے لئے مختلف عنوان قائم کئے گئے، مثلاً فلسفۂ جدیدکو ملکی زبان میں منتقل کرنا، فلسفۂ جدید کے مسائل پر جدید علم کلام کے رنگ میں روشنی ڈالنا، مختلف علوم اسلامی تاریخ، اسماء الرجال، معانی و بلاغت، اور تحقیقات مذاہب اور علوم جدیدہ کے اسی رنگ کی تالیفات کو سامنے رکھتے ہوئے، دونوں کا موازنہ کرنا، اور پھر اسلامی خصوصیات کو قائم رکھتے ہوئے انہی عنوانوں پر جدید تالیفات تیار کرنا، مخصوص علوم دینیہ تفسیر، حدیث، اصول، فقہ، تصوف، اور کلام کو نئے رنگ میں پیش کرنا، پھر ان علوم اسلامیہ کی تدریجی ترقیوں پر تبصرہ، ان کے غلط و صحیح حصوں پر تنقید و اصلاح، فارسی، عربی، اور اردو ادبیات کی تاریخ اسلامی تہذیب و تمدن پر مورخانہ صحیح تنقید، اور پھر تہذیب اسلامی، اور تمدن جدید کے تعلقات کی تشریح و تفصیل کرنا"

تاریخ و تخیل کا فرق آپ نے ملاحظہ فرمالیا ہوگا، لیکن ہر ادارہ کو اپنے تخیل کی تکمیل میں کچھ نہ کچھ خارجی مشکلات اور دشواریاں بھی پیش آتی ہیں، اور یہ چیزیں ایک حد تک دار المصنفین کی راہ میں بھی پیش آئیں، جس کی وجہ سے وہ مجبور ہوکر آج بیس سال کے عرصہ میں پہلی بار اپنی ضروریات کو ملک و قوم

کے سامنے پیش کر رہا ہے۔ ان ضروریات ہنگامہ کی تفصیل رسالہ مذکور میں یوں درج ہے۔

ہماری ضروریات

"۱۔ موجودہ رفقاء مصنفین کیلئے سکونتی مکانوں کی ضرورت ہے کیونکہ اس وقت مکانوں کی قلت کی وجہ سے بعض رفقاء مصنفین دار المصنفین کی فضا سے باہر شہر کی پر آشوب آب وہوا میں بہ مجبوری سکونت پذیر ہیں، جس کی وجہ سے دار المصنفین کے اس بنیادی تخیل کو شدید صدمہ پہنچ رہا ہے، جو اس کے بانی کے پیش نظر تھا، اسلئے ہمیں سر دست دو مکانوں کی تعمیر ایسا ضروری ہے جس کے لئے دس ہزار روپے کی فوری ضرورت ہے،

۲۔ ہمارے رفقاء کے موجودہ ماہانہ وظائف ان کی ضروریات کی کفالت نہیں کرتے، اسلئے ضرورت ہے کہ ہماری ماہانہ آمدنی میں کسی مستقل سرمایہ کا اضافہ ہو کہ ہمارے رفقاء سکون و طمانیت سے اپنے خدمات انجام دے سکیں،

۳۔ موجودہ رفقاء مصنفین کی تعداد ہماری تصنیفی ضروریات کے لئے ناکافی ہے، دار المصنفین کے اصل تخیل کی تکمیل کے لئے کم از کم دس رفقاء کے مزید اضافہ کی ضرورت ہے، جن کے لئے دو امور ضروری ہیں، الف۔ ایک ہزار ماہوار کی مستقل آمدنی کا سامان۔

ب۔ ان رفقاء کے سکونتی مکانات کی تعمیر کے لئے سرمایہ،

۴۔ موجودہ رفقاء مصنفین کے ہاتھ بٹانے کے علاوہ ایسے رفقا کی بھی ضرورت ہے، جو یورپ کی ان اعلیٰ کتابوں کو جو غیر زبانوں میں اسلامی علوم وفنون پر تالیف ہو رہی ہیں اردو میں منتقل کریں، اسلئے ان رفقاء میں ایسے اشخاص کی ضرورت ہوگی جو یورپ کی ان زبانوں سے آگاہ ہوں، اور اس کیلئے ہمیں مزید سرمایہ کی ضرورت ہوگی،

۵۔ ہمارے یہاں کتابوں کا ذخیرہ روز بروز بڑھتا جاتا ہے جسکی وجہ سے ہمارے موجودہ کتب خانہ کی عمارت ناکافی ہوتی جاتی ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ ایک عمارت خاص کتبخانہ کی جدید ترتیب پر اسی نوع

کی تعمیر کی جائے۔ اس کے لئے ہمیں پچیس ہزار روپیہ سرمایہ کی ضرورت ہے، تاکہ دار المصنّفین کے شایان شان اور اس کی ضروریات کے مطابق کتب خانہ کی ایک خاص عمارت تعمیر کریں،

۶۔ ہمارے موجودہ کتب خانہ میں جو کتابیں فراہم ہوگئی ہیں وہ ہماری موجودہ ضروریات کیلئے بھی کافی نہیں ہیں، کیونکہ ہم اپنے موجودہ بجٹ کے لحاظ سے کتابوں کی خریداری پر صرف ایک ہزار روپئے سالانہ کی قلیل رقم صرف کرتے ہیں، اور اسی لئے ابھی تک صرف عربی کتابوں کا ذخیرہ کسی قدر فراہم ہو سکا ہے حالانکہ ہمیں انگریزی و دیگر یورپی زبانوں کی اعلیٰ پایہ کتابوں کے جمع کرنے کی شدید ضرورت ہے کیونکہ تحقیقی معیار کی بلند پایہ تصنیف و تالیف کے لئے ایک بلند پایہ کتب خانہ قطعی ناگزیر ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ

الف۔ کتابوں کی فراہمی کے لئے مستقل سرمایے اور عطیے حاصل ہوں،

ب، اور قدیم خاندانوں میں کتابوں کا جو قدیم قلمی ذخیرہ ہو یا جو شائقین علم یورپ کی اعلیٰ تالیفات کو خرید کر اور اس کو بار بار پڑھ کر سیر ہو چکے ہوں، وہ سب دار المصنّفین میں منتقل کردیا جائیں، تاکہ ان کا فیض ہمیشہ جاری رہے،

۷۔ ہمیں دار المصنّفین کے دار الاشاعت کو ترقی دینے کی شدید ضرورت ہے، تاکہ دار المصنّفین کے تخیل کے مطابق ایک اعلیٰ پیمانہ کا دار الاشاعت ملک و ملت اور زبان اردو کی حقیقی خدمات انجام دے سکے، اس سلسلہ میں ہمیں حسب ذیل ضرورتیں ہیں،

الف۔ ہمارا موجودہ پریس محض معمولی ضروریات کا کفیل ہو سکتا ہے، اسلئے اسمیں اضافہ کیا جائے،

ب، ملک میں ٹائپ کی طرف عام رجحان ہوتا جاتا ہے، اور وہ زمانہ قریب ہے کہ ہماری تالیفات لیتھو پریس کی مصیبتوں سے نجات پا جائیں، اس لئے مطبع دار المصنّفین میں ٹائپ کا بھی اضافہ ہو جائے، تاکہ ہم بھی اس طرف تدریجی قدم بڑھا سکیں،

ج۔ عربی کتابوں کی اشاعت ہمارا خاص مطمح نظر ہے، اس لئے ہمارے مطبع کو عربی ٹائپ کی بھی شدید ضرورت ہے،

د۔ آجکل ہمارے دار الاشاعت میں جلد سازی کا انتظام نہایت ناقص ہے، ضرورت ہے کہ

اعلیٰ پیمانہ پر اس کو ترقی دی جائے تاکہ ہم التزام کے ساتھ مجلد کتابیں شائع کرسکیں،

دارالاشاعت کی ترقی میں دس ہزار روپیے سرمایہ کی ضرورت ہے، اس کی ترقی میں یہ امر خاص طور پر قابل لحاظ ہے کہ اس کی ترقی سے ہمیں اقتصادی ترقیاں بھی حاصل ہونگی، جیسے کہ ابھی تک وہ ہماری مالی حالت کو سنبھالے رہا ہے،

اس لئے درحقیقت ہمارے دارالاشاعت کی ترقی میں ہماری مالی مشکلات کا حل بھی کسیقدر مضمر ہے،

یہ ہیں وہ ہماری کل سات ضروریات جنکی تکمیل کے بعد دارالمصنّفین کا اصل مطمح نظر پورا ہوتا ہے"!

اس کے بعد واقعی اگر ہم دل سے متمنی ہیں کہ دارالمصنّفین اپنے اس تخیل کو اصل مطمح نظر کو پورا کرے تو ہمیں چاہیئے کہ اس کی ان ضروریات کی تکمیل میں مدد دیں،



تنقید و تبصرہ

انگارے۔ دس مختصر کہانیوں کا مجموعہ از سید سجاد ظہیر، احمد علی، رشید جہاں، محمود الظفر،
ملنے کا پتہ۔ مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی۔

سالنامہ کاروان۔ مرتبہ پروفیسر تاثیر ایم اے۔ مقام اشاعت، لاہور سال میں صرف ایک دفعہ شائع ہوگا،
قیمت عہ ملنے کا پتہ۔ چابک سواران لاہور،

<u>انگارے</u> یورپ میں اکثر دیکھا جاتا ہے کہ اچھی صورت والی عورتیں جب سیر کو نکلتی ہیں تو ایک یا دو معمولی یا بھدی صورت والیوں کو اپنے ہمراہ رکھتی ہیں۔ اس میں دونوں کا فائدہ رہتا ہے۔ اچھی صورت والی کا حسن نکھر آتا ہے، بھدی صورت والی کو ایک سہارا مل جاتا ہے، اور لوگوں کو خواہ مخواہ یہ غلط فہمی ہوجاتی ہے کہ اس میں کوئی نہ کوئی صفت ضرور ہے ورنہ ایسی حسین عورت اسے کیوں اپنے ساتھ رکھتی۔ عورتوں کا ایسی چالیں چلنا تو سمجھ میں آسکتا ہے۔ لیکن ہم کو یہ نہیں معلوم تھا کہ افسانہ نویس بھی باہمی امداد کے ایسے طریقے اختیار کرسکتے ہیں "انگارے" اس کوشش کی پہلی مثال ہے جو ہماری نظر سے گذری، اور اسی کو دیکھ کر ہمارا خیال ہوگیا ہے کہ اچھے افسانہ نویسوں کے لئے یہ طریقہ مناسب نہیں۔ ان کا حسن تو نکھر آتا ہے لیکن پڑھنے والے کی طبیعت بدمزہ ہوجاتی ہے۔

سجاد ظہیر صاحب کے اوصاف ان کے پہلے دو افسانوں میں ظاہر ہوگئے تھے جو انھوں نے رسالہ جامعہ میں شائع کئے؛ اُن کے "ہمراہیوں" سے ابھی تک ہمارا تعارف نہیں ہوا تھا۔ شاید ان کا تعارف ہی کرانے کے لئے ان کے افسانے بھی اس مجموعے میں شامل کردئے گئے۔ انسانی ہمدردی ہر شکل میں تعریف کی مستحق ہوتی ہے، لیکن ہمارا دل یہی کہتا ہے کہ سجاد ظہیر صاحب نے اس مجموعے میں صرف اپنے تخیل کے کارنامے پیش کئے ہوتے تو بہت بہتر ہوتا "انگارے" واقعی "انگارے ہیں" محض افسانے نہیں۔ ان میں صرف زندگی نہیں دکھائی گئی ہے بلکہ ایک خاص قسم کی زندگی، اور ان کا مقصد یہ ہے کہ دل پر ایک خاص قسم کا اثر ہو۔ ہمارے معاشرے میں آگ لگ جائے۔ مسلمانوں کی موجودہ معاشرت، خیالات، عقائد، سب پر وار کیا گیا ہے۔ کہیں ان کی ہنسی اڑائی گئی ہے، کہیں عیب ظاہر کئے گئے ہیں، ساتھ ساتھ غریبی، بیکسی، مظلومیت، اور جہالت کی درد انگیز تصویریں بھی ہیں، اور معاشرے کے خوشحال آزاد طبقے جو ظلم کرتے ہیں ان کی شکایت بھی کی گئی ہے۔ ہم کو اپنی زندگی اور معاشرت کے مصور پر یہ اعتراض نہ کرنا چاہیئے کہ اس کو ہمارے عقیدے اور تعصب سے اتفاق یا ہمدردی نہیں، اور جن چیزوں کا ہم احترام کرتے ہیں

ان کی وہ عزت اور قدر نہیں کرتا۔ تنقید کی آزادی نہ ہو تو اصلاح کی گنجائش نہیں رہتی، اور وہ نخوت اور تکبر جو تنقید کو توہین اختلاف کو عداوت اور خیالات کے بے تکلف اظہار کو بدتمیزی قرار دے خلوص اور سچی عقیدت کا سب سے کٹر دشمن ہے۔ لیکن اس پر غور کرنا زندگی کے ہر مصور کا فرض ہے کہ تنقید اور نکتہ چینی کا اس نے جو انداز اختیار کیا ہے وہ اس کے مطلب کو پورا کرتا ہے یا نہیں۔ گالی دینا بھی خیالات اور جذبات ظاہر کرنے کا ایک طریقہ ہے اور جسے خدا نے زبان دی ہے اس سے ہم گالی دینے کا حق نہیں چھین سکتے۔ مگر یہ سب جانتے ہیں کہ گالیاں دینے سے مطلب کہاں تک نکلتا ہے ہنسی اڑانے کے بھی بہت سے طریقے ہیں بعض بات کو اس طرح ذہن نشین کر دیتے ہیں کہ کوئی ناصحانہ انداز ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ بعض آدمی کو اتنا خفا کر دیتے ہیں کہ وہ پھر اور کوئی بات سننا گوارا نہیں کرتا۔ یہ ایک موٹی سی بات ہے، مگر افسوس ہے "انگارے" کے مصنفوں کو اس کا خیال نہیں رہا۔

سجاد ظہیر صاحب کے افسانوں میں سے ایک 'دلاری' اس زمانہ کی تصنیف ہے جب وہ آرٹسٹ تھے کسی نئے فلسفۂ حیات کے مبلغ نہیں تھے کوئی نئی ذہنیت پیدا کرنے کی فکر میں نہیں پڑے تھے۔ اس افسانے کا موضوع بالکل معاشرتی ہے اور اس میں ایک آبرودار خاندان کی بے حیائی، بد اخلاقی اور سنگدلی دکھائی گئی ہے۔ زبان، افعال، انداز ہر لحاظ سے یہ تصویر مکمل اور دلکش ہے اور آخری منظر کا دل پر بہت اثر ہوتا ہے "گرمیوں کی ایک رات" میں امین آباد پارک کا نقشہ کھینچا گیا ہے، اور ایک منشی برکت علی کی جمن چپراسی سے پیچھا چھڑانے اور قرض دینے سے بچنے کی کوشش کا قصہ نہایت ظرافت آمیز طریقے سے سنایا گیا ہے۔ منشی جی کو جمن نے دیکھا سلام کیا اور ان کے پیچھے لگ گیا۔ منشی جی سوچنے لگے کہ اس کا سبب آخر کیا ہے۔ انھوں نے جمن سے حال، احوال پوچھا تو اس نے اپنا دکھڑا رونا شروع کر دیا۔ منشی جی اس کا مطلب تاڑ گئے، اور اس ارادے سے کہ روپیہ مانگنے کا موقعہ ہی نہ ملے وہ جمن سے مذہب پر گفتگو کرنے لگے؛ اور بنی اسرائیل پر جو مصیبتیں نازل ہوئیں ان کا ذکر کیا۔ جمن کو یہ نہیں معلوم تھا کہ "آخر یہ بنی اسرائیل بیچارے کون تھے۔" اس پر منشی جی کو بہت حیرت ہوئی۔ انھوں نے جمن کو بہت لعنت ملامت کر کے پوچھا:

"حضرت موسیٰ کلیم اللہ کا نام بھی تم نے سنا ہے؟"

"جی کیا فرمایا آپ نے؟ کلیم اللہ؟"

"ارے بھئی حضرت موسیٰ۔ مو...... سا!"

"موسیٰ...... وہی تو نہیں جن پر بجلی گری تھی؟"

منشی جی ٹھٹھا مار کر ہنسے؛ مگر مذہبی گفتگو کا سلسلہ کہاں تک بڑھایا جا سکتا تھا۔ انھوں نے سنیما کے قریب پیچھا چھڑانے کی کوشش کی مگر جمن کو واقعی روپے کی ضرورت تھی، وہ کب انھیں جانے دیتا۔ آخر میں وہ تانگہ ہی میں بیٹھا اور

منشی جی کو انکار کرنا پڑا۔ ان کی جیب میں اس وقت ایک روپیہ تو تھا۔ مگر وہ اسے دینا نہیں چاہتے تھے۔ جمن اصرار کرنے لگا اور منشی جی بہت گھبرا گئے۔ اتفاق سے سینما ختم ہوا، تماشائیوں میں منشی جی کے ایک پرانے یار بھی تھے۔ انھوں نے منشی جی کو ناچ دکھانے کا وعدہ کر کے موٹر پر بٹھا لیا۔

"پرانا دوست، موٹر کی سواری، گانا، ناچ، جنت نگاہ، فردوس گوش، منشی جی لپک کر موٹر میں سوار ہوئے۔ جمن کی طرف ان کا خیال بھی نہ گیا۔ جب موٹر چلنے لگی تو انھوں نے دیکھا کہ وہ وہاں اسی طرح چپ کھڑا ہے۔"

"دلاری" اور "گرمیوں کی ایک رات" اس مجموعے کے بہترین افسانے ہیں۔ "جنت کی بشارت" میں شوخی بہت ہے، اور شرعی پارسائی کی قلعی کھولی گئی ہے۔ ایک مسن مولوی صاحب ہیں جنھوں نے عمر کا خیال کئے بغیر اور آٹھ بچوں کے باپ ہونے کے باوجود دوسری شادی کی ہے ان نئی مدد کی وجہ سے مولانا کی جان ضیق میں تھی ... گو کہ مولانا انھیں یقین دلایا کرتے تھے کہ ان کی داڑھی کے چند بال بلغم کی وجہ سے سفید ہو گئے ہیں لیکن ان کی جوان بیوی فوراً دوسرے ثبوت پیش کرتیں اور مولانا کو چپ ہو جانا پڑتا"

شب قدر کو مولانا مسجد میں گئے؛ عشاء کے بعد ڈیڑھ دو بجے رات تک اکتساب ثواب کا سلسلہ رہا، اس کے بعد سحر گہی کی حاضر لذت سے جسم نے نمو پائی، اور مولانا گھر واپس پہنچے۔ گھر میں اندھیرا تھا، مولانا کو دیا سلائی نہیں ملی صحن کے ایک کونے میں ان کی بیوی کا پلنگ تھا۔ مولانا دبے قدم ڈرتے ڈرتے ادھر بڑھے، اور آہستہ سے بیوی کا شانہ ہلایا .... مولوی صاحب کی جوان بیوی گہری نیند سو رہی تھیں۔ آخر کار انھوں نے کروٹ بدلی اور آدھے جاگتے آدھے سوتے ہوئے دھیمی آواز سے پوچھا: "اے کیا ہے؟"

مولانا اس نرم آواز کے سننے کے عادی نہ تھے۔ ہمت کر کے ایک لفظ بولے: "دیا سلائی"

مگر مولوی صاحب کی بیوی کے شباب پر رات کی تاریکی، ستاروں کی جگمگاہٹ، اور ہوا کی خنکی نے اپنا طلسم کر دیا تھا" دیا سلائی کی درخواست کا انھوں نے جو جواب دیا اس سے مولانا کو "حوا کی آرزو، آدم کا پہلا گناہ

زلیخا کا عشق، یوسف کی چاک دامانی، غرض عورت کے گناہوں کی تمام فہرست یاد آ گئی .... مولانا فوراً اپنی بیوی کے ہاتھ سے نکل کر اٹھ کھڑے ہوئے اور تیکھی آواز سے پھر پوچھا: "دیا سلائی کہاں ہے؟"

مولانا کو دیا سلائی مل گئی، اگرچہ نوجوان بیوی کی زہر سے بجھی ہوئی زبان نے ان کا دل بہت دکھایا، اور وہ ایک تخت پر جا نماز بچھا کر قرآن خوانی میں مشغول ہو گئے۔ لیکن سورہ رحمٰن پڑھتے پڑھتے نیند کا ایسا غلبہ ہوا کہ وہ سو گئے۔ خواب میں وہ جنت پہنچے، وہ ایک کمرے میں تھے جس کی دیواروں پر قد آدم کھڑکیاں تھیں، ہر کھڑکی کے سامنے ایک دریچہ جس میں ایک برہنہ حور کھڑی تھی۔ مولوی صاحب پہلے تو شرمائے پھر اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرا اور مسکراتے ہوئے ایک کھڑکی کی طرف بڑھے .... لیکن انسان ایک عجیب

چیز سے بھلا کب سیر ہوتا ہے۔ مولانا کے قدم اٹھے اور وہ دوسرے در کی طرف بڑھے۔ اسی طرح وہ ہر در پر جا کر تھوڑی تھوڑی دیر رکتے...... اور مسکرا کر درود پڑھتے ہوئے آگے بڑھ جاتے ..... "لیکن ایک نازک وقت پر پیچھے سے قہقہے کی آواز آئی اس بے موقعہ ہنسی پر مولانا کے غصہ کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ان کی آنکھ کھل گئی۔ سورج نکل آیا تھا۔ مولانا جانماز پر پیٹ کے بل پڑے ہوئے قرآن کریم کو سینے سے لگائے تھے۔ ان کی بیوی پہلو میں کھڑی ہنس رہی تھیں۔

"نیند نہیں آتی" اور "پھر یہ ہنگامہ" ہیں ذہن کی ایک سرسامی کیفیت دکھاتے ہیں۔ یورپ کی افسانہ نویسی کا سب سے جدید طریقہ یہی ہے لیکن ہمارا مذاق ایسی بے سوپا باتوں کو شاید ہی گوارا کر سکے۔ امجد علی صاحب کے دونوں افسانے اسی رنگ کے ہیں۔ ایک بہت فحش ہے دوسرا بہت پر درد ہو سکتا تھا، مگر انداز بیان نے اس کے اثر کو بہت کچھ زائل کر دیا ہے۔

رشید جہاں صاحبہ کا ایک افسانہ ہے اور ایک ڈراما۔ افسانہ کیا ہے ایک پردہ نشین عورت اور اس کے بے پروا شوہر کا ایک بے لطف قصہ ہے۔ شوہر اپنی بیوی کو دہلی کی سیر کرانے لایا ہے۔ مگر اسے اسٹیشن پر چھوڑ کر غائب ہو جاتا ہے، اور اسٹیشن کے ہنگامے سے وہ ایسی پریشان ہوتی ہے کہ شوہر کے واپس ہوتے ہی وہ التجا کرتی ہے کہ مجھے گاڑی میں بٹھا کر گھر پہنچا دو۔ ڈراما میں ایک پردہ نشین عورت کے دل اور اس کے گھر کا حال سنایا گیا ہے۔ بیویوں کو اپنے شوہروں سے طرح طرح کی شکایتیں ہوتی ہیں، لیکن ہمیں اس ڈرامہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ ماں کو اس کے بچے بھی دوبھر ہو جاتے ہیں۔ اگر ان کی تعداد بہت بڑھ جائے اور بچوں کی کثرت سے ماں کی صحت کو بہت نقصان پہنچتا ہے۔ آخری افسانہ 'جوانمردی' مسلمانوں کی ذہنیت کے ایک خاص عیب کی طرف اشارہ ہے۔ ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ یہ عیب موجود ہے اور اسے دور کرنے کی جتنی بھی کوشش کی جائے وہ کم ہے۔ مگر یہ افسانہ بے رس ہے۔

"م"

سالنامہ کارواں لاہور کی سرزمین بہت رسالہ خیز واقع ہوئی ہے اور کوئی سال نہیں جاتا کہ وہاں سے چند نئے رسالے نہ نکلتے ہوں لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ شاذ و نادر ہی کوئی رسالہ ایسا نظر سے گذرتا ہے جس کے معایب اس کے محاسن سے زیادہ نہ ہوں۔ ایسی حالت میں نہایت خوشی کا مقام ہے کہ آخر کار ایک رسالہ تو اس سرزمین سے ایسا بھی نکلا جسے سخت سے سخت تنقید نگار بھی اچھا کہے بغیر نہیں رہ سکتا پروفیسر تاثیر قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے اس پرچے کو نکال کر ادب اردو کے رہوار کی باگ اب صحیح راستے کی طرف موڑ دی ہے۔ اکثر لاہوری رسائل کے مدیروں میں نہ تو ہمت کی کمی ہے اور نہ اپج کی لیکن یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ خوش مذاقی بہت کم پائی جاتی ہے۔ اب اس رسالے کو دیکھ کر یہ معلوم ہوا کہ یہ جنس بھی اس علاقہ میں موجود ہے

دوسرے ان مقامات پر جہاں سے اردو رسائل نکلتے ہیں ہمت عنقا کا حکم رکھتی ہے اور ابیج کا نام بھی کوئی نہیں جانتا اگر خوش مذاقی تھوڑی بہت ہے بھی تو اس کے اظہار کی نوبت ہی نہیں آتی اردو کی پیدائش خواہ کہیں بھی ہوئی ہو اور اسے پروان چاہے کسی نے چڑھایا ہو لیکن اس سے انکار کی گنجائش نہیں کہ اس یتیم بچے کی تربیت اور تہذیب کا فخر اہل لاہور کو حاصل ہونے والا ہے۔ جوش عمل کے نتائج ابتدا میں خامیوں سے پر ہوتے ہیں اور اسی لئے لاہور کے رسائل میں بھی خامیاں نظر آتی ہیں لیکن اگر ہمت بلند ہو اور عمل پیہم تو کوئی ایسی خامی نہیں جو پختہ کاری سے تبدیل نہ ہوسکے۔ ہمیں یقین ہے اور خوشی بھی کہ رسالہ کارواں اس پختہ کاری اور خوش مذاقی کا پہلا ثبوت ہے۔

سب سے زیادہ قابل لحاظ خصوصیت اس رسالے کی یہ ہے کہ بخلاف اپنے تمام معاصرین کے اس میں جتنی تصاویر شائع ہوئی ہیں وہ بلا استثنا خوش مذاقی پر دلالت کرتی ہیں، دوسرے رسائل بھی کبھی کبھار اچھی تصویریں شائع کرتے ہیں لیکن اسی کے پہلو بہ پہلو ایسی لپست اور عامیانہ تصاویر بھی لگا دیتے ہیں جنھیں دیکھ کر اچھی تصاویر کی قسمت پر رونا آتا ہے۔ اگر کارواں نے اپنے اس معیار کو قائم رکھا تو یہ اردو داں طبقے کی بہت بڑی خدمت ہوگی۔ فنون لطیفہ سے بیگانگی کا اثر قومی سیرت پر اتنا خراب نہیں پڑتا جتنا بد مذاقی کا اور افسوس ہے کہ مصور رسائل بجائے بد مذاقی کا علاج کرنے کے آئے دن اس کو اور ترقی دیتے جا رہے ہیں۔

مضامین کے تنوع کا مدیر کارواں نے لحاظ تو رکھا ہے لیکن مضامین بیشتر ادبی ہیں اور افسانوں کی تعداد غیر متناسب طور پر زیادہ ہے۔ غالباً یہ کیفیت ارادی ہے اور اتفاق کو اس میں دخل نہیں ہے۔ ابھی تک اردو کے بیشتر اہل قلم اپنی توجہ صرف ادبی مضامین کی طرف مبذول رکھتے ہیں اور علمی مضامین لکھنے سے گھبراتے ہیں۔ اس کی ذمہ داری غالباً ہماری شاعری پر ہے۔ جس شخص کو افیون کی چاٹ لگ جاتی ہے اسے پھر نافع صحت غذا بالکل پسند نہیں آتی۔ یہی حال ہمارے مذاق کا ہے ہمیں علمی مضامین پھیکے اور بے رنگ معلوم ہوتے ہیں۔ اس مذاق عامہ کا اثر اہل قلم پر بھی پڑتا ہے اور رسائل کے مدیروں پر بھی نتیجہ یہ ہے کہ جنھیں قبول عام کی تلاش ہے وہ تو ارادی طور پر اور اصلاح پسند غیر شعوری طور پر ادبی مضامین پر ہی قلم اٹھاتے ہیں۔ یہ لوگ گویا ننگے کو بنارسی پٹکے کا تھان اور بھوکے کو مربے کے اچار کا ایک مرتبان پیش کرنا چاہتے ہیں حالانکہ نہ اس سے ستر پوشی ممکن ہے اور نہ اس سے شکم پُری غالباً مدیر کارواں اس اعتراض کو خارج از بحث تصور کرینگے اور یہ جواب دیں گے کہ انھوں نے اپنا دائرہ صرف ادبی خدمت تک محدود کر لیا ہے۔ یہ بذاتہ کوئی قابل اعتراض بات نہیں لیکن عرض یہ ہے کہ اولوالعزمی اور خوش مذاقی کمیاب اجناس ہیں اور جسے یہ دولت ودیعت ہوئی ہے اس کا فرض ہے کہ اس دولت کو پہلے ضروریات پر صرف کرے اور پھر تعیشات پر۔ ہمیں امید ہے کہ

۱۹۴۳ء کے کاروان میں علوم اور فنون مفیدہ پر بھی اتنی ہی توجہ کی جائے گی جتنی اس دفعہ فنون لطیفہ پر کی گئی ہے اب ایک بات اور رہ گئی ہے۔ اور وہ ہے بھی ذرا ٹیڑھی بات۔ پنجاب کے رسائل میں جہاں اور بہت سی خامیاں ہوتی ہیں وہاں سب سے بڑی خامی زبان کی ہوتی ہے۔ یوں تو یہ مرض اردو کے اہل قلم میں (الا ماشاءاللہ) عام ہے کہ الفاظ کا استعمال غلط یا غیر متعین معانی کے لئے کرتے ہیں اور مطالب کی ترتیب اور تہذیب کا خیال نہیں رکھتے لیکن روزمرہ اور محاورے کی غلطیاں جتنی پنجاب کے رسائل میں نظر سے گذرتی ہیں اتنی اور کہیں نہیں ملتیں ''کاروان'' کے مضامین اس حیثیت سے بھی دوسرے رسائل کے مضامین سے بہت بہتر ہیں لیکن پھر بھی اصلاح کی ابھی کافی گنجائش ہے۔ صرف سرسری ورق گردانی سے جو غلطیاں نظر آئیں یہاں درج کی جاتی ہیں۔ استیعاب بالکل نہیں کیا گیا ہے۔

ص - ۴ شاعر کا مسالا الفاظ ہیں اور وہ ہر کوئی استعمال کرتا ہے (انھیں یا ان کو یا اسے یا اس کو)
" " کئی لکھنے والے — بہت سے
" ۵ قریباً — تقریباً
" ۶ اردو میں آپ نے دیر سے نہیں لکھا — عرصے سے یا بہت دنوں سے
" ۷ کئی جرس ہی کی آواز پرست ہوتے ہیں — کتنے
" ۲۱۴ منزلگاہ — یہ ترکیب صحیح نہیں غالباً قافیہ سے مجبوری تھی۔
" ۶۴ باپ نے اپنا شیرانہ سر اٹھایا۔ — غالباً مراد ہے شیر کے شکل یا مانند
" ۱۵۵ اگر رکھتا ہیں اس پانی کی تھوڑی سی خبرداری — اول تو خبرداری رکھنا غلط ہے، دوسرے حفاظت کرنا یا بچا رکھنا اس معنی میں استعمال ہوتا ہے۔
" ۲۱۷ تفصیل میں گھسنا منظور نہیں — پڑنا
" ۲۷۱ اس بات کی سمجھ نہیں آئی — یہ بات سمجھ میں نہیں آئی
" " مجھے سمجھ نہ آتا تھا — میری سمجھ میں نہ آتا تھا
" ۳۰۱ کچھ لکھنے کی دلچسپی دلائی — شوق پیدا کیا۔

اس رسالے کی نظموں کا معیار بھی نسبتاً بلند ہے لیکن اتنا نہیں جتنا نثر کا ہے۔ اس میں مدیر کا قصور نہیں، جو ہماری شاعری کا معیار ہے اسی کی جھلک رسالے کے صفحات میں نظر آسکتی ہے۔

آخر میں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ جو کچھ اعتراضات اس رسالے پر عموماً پنجابی رسائل پر کئے گئے ہیں ان سے تنقیص مقصود نہیں بلکہ اصلاح مدنظر ہے۔

ع۔ ع

دنیا کی رفتار

ممالک اسلامی

مسلمانان چین ۱۹۳۶ء میں

چینی مسلمانوں کے حالات سے باہر کے لوگ کم واقف ہیں۔ بعض لوگ تو یہ سمجھتے ہیں کہ چینی مسلمان بالکل مردہ بے جان ہیں۔ لیکن حقیقت یہ نہیں ہے۔ اس سے قبل ہم نے جون ۱۹۳۶ء کے رسالہ جامعہ میں چینی مسلمانوں کے متعلق لکھا تھا۔ آج پھر ان کے متعلق لکھ رہے ہیں۔ ہم اس موقع پر ان واقعات کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جو ۱۹۳۶ء میں پیش آئے ہیں۔ تین اہم واقعات پیش آئے، ایک مسلمانان چین اور حکومت چین سے، دوسرا مسلمانوں اور غیر مسلمانوں سے اور تیسرا مسلمانان چین اور برادران ممالک اسلام سے متعلق۔ ہم ان کو یکے بعد دیگرے پیش کرتے ہیں۔

چینی مسلمانوں کے مشہور رہنما ما فو ہیانگ جن کو حکومت چین بھی بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھتی تھی، ۱۹ اگست ۱۹۳۲ء کو انتقال کر گئے۔ یہ حکومت نانکنگ کے ایک لائف ممبر اور منگولی اور تبتی کمیشن کے صدر تھے۔ نانکنگ سے پکن کو جا رہے تھے کہ دفعتاً گاڑی میں بیمار ہو گئے اور پکن کے اسپتال میں پہنچ کر چند ہی دن میں اس دار فانی سے تشریف لے گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

جنرل ما فو ہیانگ صوبہ کانسو کے باشندے تھے۔ پاؤٹینگ کی فوجی اکادمی میں تعلیم پائی تھی ایک عرصہ تک وہ کوکو نور کے حاکم رہے۔ پھر صوبہ صدی یوان کے منصب گورنری پر مقرر ہوئے۔ تین سال کے بعد بندر تسن تاؤ (Poot Tsing - tao) کے ہائی کمشنر بنائے گئے۔ اس کے بعد وہ منگولی و تبتی کمیشن کے صدر مقرر ہوئے اور مرتے دم تک اس منصب پر رہے۔

جب کہ چین کا دار السلطنت پکن سے نانکنگ کو منتقل ہوا ۱۹۲۸ء تو جمہوریت چین نے ملک کی تشکیل نو کے لئے مختلف کمیشن مقرر کئے۔ تعمیری کاموں میں شمالی اور مغربی چین کی اصلاح بھی شامل تھی شمالی اور مغربی چین میں منگولیا، چینی ترکستان، تبت، کانسو، ننگ ہیا اور چنگ ہائی شامل ہیں۔ ان مقامات میں مسلمانوں کی تعداد بہت کافی ہے لیکن تعلیم کی کمی کی وجہ سے وہ جمہوریت چین کا بیکار جزو سمجھے جاتے ہیں۔ وہاں کے باشندے اتنے ترقی یافتہ نہیں جتنے وسطی یا جنوبی چین کے لوگ ہیں۔ ان کے حالات درست کرنے کے لئے حکومت چین نے منگولی اور تبتی کمیشن مقرر کیا۔ اور اصلاحی کام جنرل ما فو ہیانگ کے سپرد کر دیا۔ ان صوبوں کی تعلیمی معاشی

اور اجتماعی حالات درست کرنے کے علاوہ ان لوگوں کا دفاعی استحکام بھی ان کے ذمے تھا حکومت چین کے نزدیک شمالی اور مغربی چین کے مسئلے کو اتنی ہی اہمیت حاصل ہے جتنی منچوریا کے مسئلے کو۔ منچوریا کے حالات تو آج کل سب کو معلوم ہیں۔ شمالی اور مغربی چین کے متعلق ہم یہاں کچھ لکھتے ہیں، تاکہ قارئین جنرل ما فو ہیانگ کی خدمت کی اہمیت سمجھ سکیں اور اس بات سے آگاہ ہوں کہ شمالی اور مغربی چین کے مسلمان اور حکومت چین کے باہمی تعلقات کیسے ہیں۔

باہر کے لوگوں کو صرف یہ معلوم ہے کہ جاپان منچوریا پر اپنا اقتدار جمانا چاہتا ہے، اور اس بات سے بالکل بے خبر ہیں کہ جاپان کے علاوہ اور بہت سے حکومتیں چین کی گردن دبانے کے مشتاق ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ امریکہ کو چین میں ارضی خواہش نہیں ہے اس کو صرف منڈی کی ضرورت ہے اور اس بنا پر وہ کھلے دروازے، کا بڑا حامی ہے۔ لیکن جاپان روس، فرانس اور انگلستان کا رویہ یہ نہیں ہے۔ جاپان نے تو فوجی قوت سے منچوریا کو اپنے قبضہ میں کر ہی لیا۔ روس عنقریب بیرونی منگولیا اور چینی ترکستان پر قبضہ کرے گا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اب روس اور جاپان کے درمیان زبردست جنگ ہوگی لیکن یہ خیال زیادہ صحیح نہیں، روس اور جاپان میں خفیہ سمجھوتا ہے۔ روس نے منچوریا میں جاپان کا اقتدار تسلیم کر لیا ہے اس احسان کے بدلے جاپان نے روس کو ماہی گیری حقوق عطا کئے ہیں اور یہ بھی وعدہ کیا ہے کہ وہ بیرونی منگولیا میں روس کا اقتدار تسلیم کرے گا۔ اس سمجھوتے کی وجہ سے روس نے اپنی فوج کو سرحد سیبریا سے[لہ] ہٹا لیا ہے

جس طرح جاپان شمالی چین کے ایک حصہ پر قبضہ کرنا چاہتا تھا اور اب قبضہ کر بھی لیا۔ اس طرح فرانس کا عرصے سے ارادہ ہے کہ جنوبی چین کے ایک حصہ پر قبضہ کر بیٹھے اس نے اس ارادے کو پورا کرنے کے لئے جاپان سے دوستی کر لی ہے۔ اور یہ بھی وعدہ کیا ہے کہ اگر جاپان کو مالی امداد کی ضرورت ہوگی تو وہ ضرور مدد کرے گا فرانس دل سے چاہتا ہے کہ کوئی قوت چین کو ستانا شروع کرے تاکہ اس کو بھی انام کی طرف سے چین پر حملہ کرنے کا موقع ملے چنانچہ برابر یہ خبر سننے میں آتی ہیں کہ سرحد انام پر شورش موجود ہے اور دیسی باشندوں نے حکومت انام کے خلاف علم بغاوت اٹھایا ہے۔ زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ وہاں سے عام بے چینی اور بلوے کی خبر آئی تھی۔ حکومت فرانس نے اس کا منبع چین کو قرار دیا اور چینی باشندوں پر یہ الزام لگایا کہ انھوں نے انامیوں کو حکومت کے خلاف آمادہ کر دیا ہے۔ یہ الزام بالکل اس قسم کا ہے جو منچوریا کی طرف قدم اٹھانے سے پہلے، جاپان نے ان چینی باشندوں پر لگایا تھا جو کوریا میں مقیم ہیں۔

[لہ] یہ مضمون نگار کا قیاس ہے، روس اور جاپان میں اس قسم کا معاہدہ ذرا مشکل سے ہو سکتا ہے۔ قرین قیاس تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ روس اپنے اندرونی تعمیری کاموں کی وجہ سے کسی سے بھی لڑائی مول نہیں لینا چاہتا۔ (مدیر)

اب رہا تبت کا سوال۔ یہ بھی عرصہ سے نہایت تشویشناک حالت میں ہے، تبت کے لاماؤں نے اگرچہ یہ عہد کیا تھا کہ وہ حکومت چین کے ساتھ اتحاد کرے گا۔ مگر ادھر دو تین سال سے کسی بیرونی قوت نے لاما کو چین کے خلاف آمادہ کر دیا ہے حال میں چین اور تبت کے درمیان جو جنگ چھڑ گئی تھی اخباروں کے ذریعے سے پتا چلتا ہے کہ اس میں ایک قوت ثالثہ کا دخل ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ اگرچہ تبت میں مادی دولت بہت ہے لیکن معاشی لحاظ سے یہ ملک بہت مفلس ہے۔ بغیر بیرونی امداد کے، لاما چین کے خلاف بغاوت کا قدم نہیں اٹھا سکتا تھا

چین کے عام حالات کی تشریح کرنے کے بعد اب ہم چینی مسلم زعیم اور قائد ملت ما فوھیانگ کی طرف پلٹتے ہیں اور یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ انھوں نے حکومت چین اور مسلمانان چین کی کیا خدمت کی۔ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ ان کا کام ایک طرف اندرونی اصلاح تھا اور دوسری طرف بیرونی مدافعت۔ اندرونی اصلاحات میں سب سے اہم کام تعلیم ہے۔ منگولیوں اور تبتیوں کو تعلیم دلانے کے لئے انھوں نے ہر بڑے شہر کی یونیورسٹی میں ایک شعبہ خاص کا اضافہ کرایا اس شعبہ میں صرف منگولی اور تبتی طلبا تعلیم پاتے ہیں جن کا نصاب عام چینیوں سے ذرا مختلف ہے۔ جو ان کی ضروریات کے مطابق رکھا گیا ہے، کانسو اور شمالی مغربی چین کے مسلمانوں کی تعلیم کے لئے انھوں نے پیکن میں ایک ثانوی مدرسہ کھلوایا جو سرکاری اخراجات سے چلتا ہے۔ چینی ثانوی مدرسہ کی تعلیم صرف پڑھانے اور لکھانے تک محدود نہیں بلکہ اس میں فوجی اور فنی تعلیم بھی شامل ہے۔

جب سے ما فوھیانگ کو منگولی اور تبتی کمیشن کا صدر بنا دیا گیا۔ انھوں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ تعلیمی کاموں میں صرف کیا۔ اخبارات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ غیر مسلمانوں میں عموماً اور مسلمانوں میں خصوصاً بہر دل عزیز تھے، شمالی مغربی چین میں یہ ہی ایک شخص تھا جس نے مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کے دل اپنے اثر اور شخصیت سے جوڑ دیئے۔

شمالی مغربی چین میں عرصہ سے مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کے باہمی تعلقات اچھے نہ تھے۔ کچھ تو سیاسی اسباب سے اور کچھ جہالت کی وجہ سے شمالی مغربی چین میں تعداد کی زیادتی کی وجہ سے مسلمانوں کو سیاست میں کافی دخل ہے تین چار سال سے اس علاقے میں حکام بھی مسلمان ہی مقرر کئے جا رہے ہیں اس وجہ سے اب وہاں بہت زیادہ امن ہے اور اندرونی شورش بہت ہی کم سنائی دیتی ہے۔ اندرونی امن کی وجہ سے دفاعی استحکام کے کاموں میں زیادہ آسانی ہو گئی ہے۔ اسی سلسلہ میں آمد و رفت کی سہولت کے لئے موٹر کی سڑکیں تیار کی جا رہی ہیں اور لانچاؤ سے اورومچی اور کاشغر تک ہوائی جہاز سے آمد و رفت بھی ممکن ہے۔ ریلوے کی تعمیر کے لئے اگرچہ خاکہ تیار ہے، لیکن حکومت چین کی مالی مشکلات اس پر عمل کرنے کی اجازت نہیں دیتیں حال میں تبت کی سرحد پر جو شورش ہوئی تھی وہ مسلمانوں ہی کی کوشش سے دور ہوئی تا آنکہ آخر کار شان

جو دارالعلوم اسلامی پکین کے صدر اور ما فوھیانگ کے دست بازو تھے، حکومت نانکینگ کے حکم سے تبت کی سرحد پہ گئے اور اس نزاع کو جو حاکم سی کانگ اور تبت کے لاما کے درمیان رونما ہوئی تھی طے کر کے اب پکین واپس آ گئے۔ مقامی حکومت اور تعلیمی ادارات نے ان کا نہایت شاندار استقبال کیا۔ مندرجہ بالا امور سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ شمالی مغربی چین میں امن و امان قائم کرنے کی ذمہ داری کا اکثر حصہ، مسلمانوں کے کاندھوں پر ہے۔ اور وہاں کی اصلاح بغیر مسلمانوں کی کوشش کے ناممکن ہے لیکن ما فوھیانگ کی قسمت میں یہ بات نہیں لکھی تھی کہ وہ حکومت چین اور مسلمانان چین کو زیادہ عرصہ تک فائدہ پہنچا سکیں۔ ان کے انتقال سے نہ صرف شمالی مغرب چین کی ایک زبردست شخصیت اٹھ گئی بلکہ حکومت چین کا ایک مفید بازو ٹوٹ گیا۔ حکومت نانکینگ نے ان کے انتقال پر بے حد افسوس ظاہر کیا اور بہت تزک و احتشام سے ان کی تجہیز و تکفین کی لیکن مسلمانان چین ان کی موت پر اب تک روتے ہیں اور ان کی دردانگیز آوازیں، اخبارات کے ذریعے سے ہمارے کانوں میں بھی پہنچتی ہیں۔

۲۔ مذہبی فتنہ۔

ہندوستانیوں کے لئے یہ تو ایک معمولی سی بات ہے لیکن چین کی تاریخ میں یہ پہلا واقعہ ہے جس کو "مذہبی فتنہ" کہا جا سکے ہم اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ ماضی عہد میں مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کے درمیان کئی مرتبہ کشمکش ہوئی لیکن وہ سیاسی کشمکش تھی، اور مذہب سے اس کو کوئی واسطہ نہ تھا ہاں ۱۹۳۲ء کے ستمبر میں مسلمان چین اور غیر مسلمان چین کے درمیان جو واقعہ پیش آیا، وہ مذہب سے تعلق رکھتا تھا۔ مسلمانان چین احکام شرعی کی پابندی کرتے ہیں اور خصوصاً کھانے پینے کے معاملات میں بہت محتاط ہیں عام چینی مسلمانوں کے سور سے پرہیز کرنے پر بہت تعجب کرتے ہیں چنانچہ بعض اخبارات و رسائل میں ایک دفعہ یہ بحث چھڑی کہ مسلمان سور کا گوشت کیوں نہیں کھاتے؟ بعض لوگوں نے بائبل اور قرآن کی رو سے اس پر بحث کی اور بعض لوگوں نے اسے رسم و رواج قرار دیا لکھنے والوں میں ایک شخص لوی ٹز چیانگ نامی تھا اس نے اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے ایک عجیب مضمون لکھا جس میں سوائے انسانیت سوز جملے اور فحش گالی کے اور کچھ نہ تھا اس نے ایک قصہ صیون جونگ کے سفرنامہ سے اخذ کیا ہے اور اس قصہ کی رو سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ مسلمان نہ تو اس لئے سور کے گوشت سے پرہیز کرتے ہیں کہ وہ ناپاک ہے اور نہ اس لئے کہ ان کے مذہب میں اسکی ممانعت کی گئی ہے، اور نہ اس لئے کہ ان کے رسم و رواج میں یہ بات چلی آتی ہے بلکہ اس لئے نہیں کھاتے کہ وہ "سور کی اولاد" ہیں۔ اصلی مضمون شنگھائی کے ایک ادبی رسالہ میں جو "نان ہوا" کے نام سے موسوم تھا بعنوان "مسلمان سور کا گوشت کیوں نہیں کھاتے" شائع کیا گیا اس رسالہ کا مدیر محکمہ ریلوے کا ایک اعلیٰ

افسر تھا جس کا کام یہ نہیں کہ لوگوں میں فتنہ اور مذہبی احساس ابھارے، بلکہ یہ کہ تعصب اور فرقہ وارانہ جذبے کو لوگوں کے دل سے دور کرے اس مضمون کی وجہ سے سارے مسلمانوں میں جوش اور ہیجان پھیل گیا۔

لیکن قبل اس کے کہ وہ کوئی سخت کارروائی کریں انھوں نے یہ ضروری سمجھا کہ اس معاملہ کو حکومت کے سامنے پیش کریں اور دیکھیں کہ حکومت اس کی بابت کیا فیصلہ کرتی ہے چنانچہ مسلمانان چین نے ۵ اکتوبر ۱۹۳۲ء کو جامع پکن میں ایک عام جلسہ کیا جس میں شمالی چین کے آٹھ صوبوں کے نمائندے شریک تھے۔ اس جلسہ کا صدر مالین ای کو بنایا گیا، مالین ای وہ جلیل القدر شخص ہیں جو کسی زمانہ میں حکومت پکن کے وزیر تعلیم رہ چکے ہیں اور بالفعل حکومت نانکنگ کے ایک سرگرم رکن ہیں انھوں نے اپنی تقریر کے دوران میں ان شرائط کا ذکر کیا جو مسلمانان شنگھائی اور رسالہ 'نان ہوا' کے ذمہ دار اشخاص کے درمیان اس معاملہ کا فیصلہ کرنے کے لئے طے پاچکے تھے۔ اس کی نوعیت یہ تھی کہ شنگھائی کے مسلمانوں نے جب اس مضمون کو دیکھا تو وہ فوراً رسالہ نان ہوا کے دفتر میں پہنچے۔ مدیر مسئول موجود نہ تھا، اس کے رفقاء نے اپنی غلطی کا اعتراف کرکے چار شرائط پر مسلمانان شنگھائی سے صلح کرنے کی کوشش کی۔ شرائط یہ تھے۔

۱۔ مضمون کی تردید کی جائے۔

۲۔ مسلمانوں سے معافی مانگ لی جائے۔

۳۔ اس بات کی ضمانت کیجائے کہ آئندہ اس قسم کی انسانیت سوز اور مسلم آزار مضمون نہ شائع کریں گے۔

۴۔ بقیہ کاپیاں جو دفتر میں موجود ہیں نذر آتش کردی جائیں۔

مسلمانان شنگھائی ان شرائط پر صلح کرنے کو تیار تھے۔ لیکن جب یہ خبر پکن پہنچی تو وہاں کے مسلمان اس سے مطمئن نہ ہوئے انھوں نے ایک جلسہ کرکے "انجمن تحفظ دین" کے نام سے ایک انجمن قائم کی ہزاروں ڈالر چندہ ہوگیا اور صدر جلسہ نے اپنی تقریر میں کہا کہ چونکہ یہ ایک غیر معمولی توہین ہے اس لئے ہمارے مطالبات بھی غیر معمولی ہونے چاہئیں۔ شنگھائی کے مسلمان جن شرائط پر صلح کرنے کو تیار ہیں وہ ناکافی ہیں ان سے مسلمانوں کا دل ٹھنڈا نہیں ہوسکتا اور نہ ان سے فرزندان توحید کی تامین ہوسکتی ہے۔ چنانچہ شرائط مذکور مسترد کردئے گئے اور انجمن تحفظ دین نے مندرجہ ذیل تین ضروری مطالبات حکومت نانکنگ کے سامنے پیش کئے

۱۔ چین ٹسون سنگ کو جو وزیر محکمہ ریلوے ہے، اپنے منصب سے برطرف کردیا جائے، کیونکہ وہ رسالے کا مدیر ہے۔

۲۔ مضمون نگار لوی تسز چیانگ کو گرفتار کرکے سخت سزا دی جائے۔

۳۔ رسالہ نان ہوا کی اشاعت ہمیشہ کے لئے بند کردی جائے۔

پیکن کے مسلمانوں نے اخبارات کو بیان دیتے ہوئے کہا کہ اگر حکومت نے ان مطالبات کو منظور نہ کیا تو اپنے مذہب کی حفاظت کیلئے وہ ہر قسم کی قربانی کریں گے. جلسہ کے عام فیصلہ کے مطابق "انجمن تحفظ دین" نے چار نمائندے دارالحکومت نانکنگ کے پاس بھیجے. یہ لوگ ۲۲ اکتوبر کو پیکن سے نانکنگ روانہ ہوئے اور تیسرے دن وہاں پہنچے. روانہ ہوتے وقت ایک نمائندے نے اپنی انگلی کے خون سے چینی زبان میں یہ الفاظ لکھے۔ "شمع اسلام کو روشن رکھو" سب نمائندوں نے حلف اٹھایا کہ جب تک حکومت سے ان معقول مطالبات کو نہ منوالیں گے واپس نہ آئیں گے.

ادھر یہ کارروائی ہو رہی تھی کہ شنگھائی کی انجمن اسلامیہ سے پھر خبر آئی کہ اسی مضمون کو دارالاشاعت "پہ شین" (Pe h. - Shin) نے کتاب کی صورت میں دوبارہ شائع کرایا ہے جب یہ خبر مشہور ہوئی تو مسلمانان شنگھائی. پہ شین کمپنی کے پاس گئے اور مالکان کمپنی سے انھوں نے مطالبہ کیا کہ کتاب مذکور کی تمام جلدیں جلا دی جائیں. عین گفتگو کے وقت باہر سے تیس چالیس بدمعاش دوکان میں گھس آئے اور اس کے سامان خراب کرنے لگے.

پہلے تو ایک معاملہ تھا. اب دو معاملے بن گئے. کمپنی کا بیان تھا کہ وہ لوگ مسلمان تھے جو دوکان لوٹنے کے لئے آئے تھے امام مسجد شنگھائی کا بیان تھا کہ کمپنی نہ اپنے پہلے سے ان بدمعاشوں کو جمع کر کے رکھا تھا اور ان کو ہدایت کی تھی کہ موقع پا کر دوکان میں گھس آئیں اور گڑبڑی کریں آخر یہ معاملہ ہائی کورٹ میں پہنچا.

سب سے آخری اطلاع جو ۲۷ دسمبر ۳۲ء کو ملی ہے یہ ہے کہ چینی مسلمانوں نے مقدمہ جیت لیا اور حکومت نانکنگ نے بھی مسلمانوں کے مطالبات منظور کر لئے. ۱۸ نومبر کو حکومت نانکنگ نے اس معاملہ کو مجلس عاملہ کے سامنے پیش کیا، بہت غور و خوض کے بعد تمام اراکین اسی فیصلہ پر متفق ہوئے کہ اس فتنہ کو روکنے کے لئے مسلمانوں کے مطالبات منظور کرنے چاہئیں. چنانچہ دوسرے دن مجلس عاملہ کی طرف سے یہ اعلان صادر ہوا.

"مساوات اور مذہبی آزادی حکومت کی آئینی بنیاد ہیں اس اصول کے مطابق حکومت کا فرض ہے کہ ہر مذہب و ملت کے لوگوں کی حفاظت کرے. مسلمان، چینی قوم کے اہم جز ہیں انھوں نے حکومت کے کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں عرصہ سے اہل ملک ان کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے چلے آئے ہیں ان دنوں میں معلوم ہوا کہ پہ شین بک کمپنی اور رسالہ نان ہوا وغیرہ نے ایسے مضامین شائع کئے ہیں جن سے مسلمانوں کی توہین ہوتی ہے اور بد امنی پیدا ہونے کا اندیشہ ہے اس لئے ذمہ دار اشخاص کو سخت سزا دینے کے علاوہ شنگھائی کے صدر بلدیہ (Mayor) کو ہدایت کر دی گئی ہے کہ رسالہ نان ہوا اور پہ شین بک کمپنی کو ہمیشہ کے لئے بند کر دیں. اور تمام اخبارات و رسائل کو تنبیہ

کیا جاتا ہے کہ اس کے بعد ہرگز مسلم آزاری اور توہین دین کے مضامین شائع نہ کریں ورنہ قانون کی رو سے سخت گرفت ہو گی۔ عوام جمہوریت کو آگاہ کیا جاتا ہے کہ ہر ملت و مذہب کے لوگوں کے ساتھ محبت سے پیش آئیں اور ایک دوسرے کو بھائی سمجھیں۔ کیونکہ بیرونی دباؤ کے زمانہ میں اندرونی اتحاد سخت ضروری ہے۔ بغیر اس کے جدید چین کی تعمیر نہیں ہو سکتی یہ بھی تاکید کی جاتی ہے کہ کوئی شخص ایسی روش اختیار نہ کرے جس سے فتنہ فساد کا امکان ہو۔"

اس اعلان کے مطابق حکومت نانکنگ نے کئی تار دئے۔ ایک صدر بلدیہ شنگھائی کو کہ رسالہ نان ہوا اور پرشین بک کمپنی کو بند کردیں دوسرا حاکم ھانگ چاؤ کو کہ لوی ٹنز چیانگ کو گرفتار کرکے سخت سزا دے۔ تیسرا مسلمانان شنگھائی اور پکین کو کہ فیصلہ اس طرح ہوا، چین ٹنتون سنیگ کو اگرچہ اپنے عہدے سے برطرف نہیں کیا گیا لیکن اخبارات کے ذریعہ سے اس نے مسلمانوں سے معافی مانگ لی۔ اس طریقے سے اس مذہبی فتنہ کا انسداد ہوا۔

۳۔ مدیر نضارۃ الھلال اور امام جامع پکین کی سیاحت ممالک اسلامیہ میں۔

ایسی حالت میں کہ تمام چین میں سیاسی اضطراب، معاشی بے چینی، اور اجتماعی تخریب و تعمیر کا دور دورہ ہے مسلمانان چین ان ہنگاموں سے غیر متاثر نہیں رہ سکتے تھے۔ زمانہ حاضر کی تیز رو بجلی کی طرح ان لوگوں میں دوڑ رہی ہے۔ اور عہد جدید کے خیالات دریائے متلاطم کی طرح ان کے دلوں میں موجزن ہیں وہ اپنے فضائے محدود میں اس طرح بے چین ہیں جس طرح بلبل قفس میں۔ باد بہار کے قاصد نے نئی زندگی کا پیام لاکر ان کو اس قدر حوصلہ مند کر دیا ہے کہ اب وہ اپنی پستی پر قانع نہیں رہ سکتے وہ ایک نئے ماحول کی تلاش اور جدید فضا کی فکر میں ہیں۔ وہ جامد تھے لیکن اب حرکت کر رہے ہیں وہ بے جان تھے لیکن اب ان میں زندگی پیدا ہو گئی ہے۔ مسلمانان چین کو اپنی پستی کا احساس اور بلندی کی آرزو ہے۔ زمانہ ان کو مجبور کر رہا ہے کہ گوشہ نشینی چھوڑیں، اور محدود فضا سے نکل کر کھلی ہوا کی سیر کریں۔ پہلے وہ "سیروا فی الارض فانظروا" کا مطلب نہیں سمجھتے تھے، آج وہ اس آیہ کریمہ پر عمل کر رہے ہیں۔ چینی مسلمانوں کی موجودہ بیداری کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ۱۹۳۱ء کے آخر میں طلبہ کی ایک جماعت اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے جامع ازہر میں بھیجی گئی تھی اور ۱۹۳۲ء کے دسمبر میں پھر پانچ طلبہ جو چینگ دا دارالعلوم کے فارغ التحصیل تھے ازہر میں داخل ہو گئے۔

اس سے زیادہ اہم خبر یہ ہے کہ دو چینی علماء آج کل ممالک اسلامیہ کی سیر کر رہے ہیں۔ ان میں سے ایک کا نام عبدالرحیم ماسون ٹینگ۔ اور دوسرے کا نام عبداللہ الصدیق جو ین ہے۔ اول الذکر جامع پکین کے امام، چینگ دا دارالعلوم کے ڈائرکٹر، اور انجمن ترقی اسلام کے صدر ہیں، موخر الذکر شعبہ اشاعت متعلق دارالعلوم کے صدر اور نضارۃ الھلال پکین کے ایڈیٹر ہیں۔

۲۸ نومبر ۱۹۳۲ء کو یہ لوگ پکین سے روانہ ہوئے آج کل یہ لوگ مصر میں ہوں گے۔ وہاں دو مہینے تک مقیم

رہیں گے اور بڑے بڑے علما سے مل کر تبادلۂ خیالات کریں گے وہ اپنے پروگرام کے مطابق حج سے پہلے ترکی جائیں گے استنبول اور انگورہ سے شام اور فلسطین ہوتے ہوئے حجاز تشریف جائیں گے حج کے بعد مدینہ منورہ اور وہاں سے بغداد آئیں گے پھر ایران و افغانستان ہوتے ہوئے ہندوستان کی سیاحت کریں گے۔ یہ لوگ غالباً اپریل کے آخر یا مئی کے شروع میں دہلی پہنچیں گے۔ اس کے بعد لنکا، جزائر شرق الہند اور جاوا کا ارادہ کریں گے اس بڑے چکر کے بعد پھر وطن واپس جائیں گے۔

ان کی اس سیاحت کی غرض و غایت مسلمانوں کے تعلیمی، معاشی اور اجتماعی حالات کا مطالعہ کرنا، اور برادران اسلام سے ربط اور تعلق پیدا کرنا ہے۔ انھوں نے اپنی طرف سے ایک اعلان بھی شائع کیا ہے جو چینی اور انگریزی دونوں زبانوں میں ہے۔ اس اعلان میں موجودہ چینی مسلمانوں کے حالات پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس لئے اس کا ترجمہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔

"آنحضرت کی وفات کے بعد ہی، اسلام کا جھنڈا چین میں داخل ہو چکا تھا۔ اس وقت سے لے کر آج تک چین میں کوئی ایسا گوشہ نہیں ہے جہاں مسلمانوں کا نشان نہ ہو۔ اس زمانہ میں چینی مسلمانوں کی تعداد پانچ کروڑ بھی جاتی ہے اور اسلام ہر صوبہ میں پھیل گیا ہے، چین کے دیہات اور قصبے بھی خانہ خدا سے خالی نہیں مساجد ہزاروں میں تقریباً ہر جگہ پائی جاتی ہیں چینی مسلمانوں کا جذبہ دینی، دوسرے ممالک کے فرزندان توحید سے کم نہیں لیکن یہ ضرور ہے کہ جہالت اور بے نظمی کی وجہ سے، وہ ایسے نمایاں رتبے پر نہیں پہنچے جس پر ان کو پہنچنا چاہیئے تھا۔ اس گری ہوئی حالت کو مد نظر رکھتے ہوئے، ہم مندرجہ ذیل دو کام زیادہ اہم اور ضروری سمجھتے ہیں (۱) اسلامی تعلیم کی اشاعت کرنا ۲۔ مسلمانوں کی تنظیم کرنا۔ ان دو کاموں پر عمل کرنے کے لئے ہم نے اپنے آپ کو وقف کر دیا ہے ہم نے مسلمانوں کی حالت درست کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ہماری تحریک ناکام ثابت ہوئی۔ وجہ یہ تھی کہ ہمارا تبلیغی طریقہ بہت خراب تھا۔ اور خود ہم باہر کی اسلامی برادری سے بے تعلق تھے۔

ہماری تعلیمی حالت یہ ہے کہ دینی طلبہ تقریباً اپنی ساری عمر قرآن شریف کی قرأت کرنے میں صرف کر دیتے ہیں، وہ دوسرے علوم و فنون کی طرف مطلقاً متوجہ نہیں ہوتے۔ ان کو یہ خبر نہیں کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ ان کی عجز اور تنگ دلی سے ہیں کیا کارآمد عمل کی توقع ہو سکتی ہے۔ ان کی تعلیم بالکل زمانہ کے خلاف اور ان کا وجود سوسائٹی کے لئے بیکا ہے، جاہل مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ قدامت پسند جو کچھ کہتے اور کرتے ہیں بالکل شرعی اور اسلامی ہے اور اندھوں کی طرح ان کی پیروی کرتے ہیں۔

اب دیکھئے ان کا نصاب چینی مسلمان اب تک وہی پرانی کتابیں استعمال کرتے ہیں جو کسی زمانہ میں چین میں آئی تھیں۔ ان کے مضامین کے پڑھنے میں بے حد محنت اور بے حساب وقت صرف کرتے ہیں۔ لیکن پڑھنے والے

ایک لفظ بھی نہیں سمجھتے۔ مزید براں ہمارا یہ کہنا کوئی مبالغہ نہیں ہے کہ کتابوں کی کمی اور نایابی کی وجہ سے مسلمان بچوں کو کتاب پڑھنے کے لئے بھی نہیں ملتی۔ ان حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کیا تعجب کی بات ہو کہ مسلمانان چین اب تک قعر تنزل میں گرے ہوئے ہیں۔ خرابی یہ ہے کہ اکثر مسلمان قدیم روش کے لوگ ہیں، وہ جدید اصلاحات کے قبول کرنے کے لئے بہت کم تیار ہوتے ہیں۔ زمانہ گذشتہ میں ہم نے جو اصلاحی تحریکیں جاری کیں ان میں سے کوئی بھی اچھا پھل نہیں لائی ذیل میں ان کاموں کی مختصر کیفیت ہے جس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ کیا مشکلات ہمارے سامنے ہیں، اور کہاں تک ہم اپنی کوشش میں کامیاب ہوئے ہیں۔

۱. تنظیم:۔ اسلام کی اشاعت اور مسلمانوں کی ترقی کی غرض سے عبدالرحمٰن وانگ ہاؤژن کے ارشادات پر ۲۰ سال سے چین میں ایک انجمن "انجمن ترقی اسلام" کے نام سے قائم ہے۔ بیچ بیچ میں اگرچہ یہ انجمن نہایت خراب حالت میں رہی۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ اس کی شاخیں تمام چین میں پھیلی ہوئی ہیں اور صوبہ یون نان اور سی چان کی شاخیں نہایت سرگرمی کے ساتھ کام کر رہی ہیں۔ نتیجہ کے اعتبار سے بھی زیادہ خراب نہیں ہے لیکن مالی کمزوری نے ترقی نہ ہونے دی۔ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ یہ انجمن بیس سال سے ہے لیکن کوئی نمایاں کام نہیں کر سکی۔ جو کام ذکر کے قابل ہے، وہ قرآن شریف کا ترجمہ ہے۔ اس کام کے انجام دینے میں، ترجمہ تصحیح اور نظر ثانی کرنے میں تین سال صرف ہو چکے ہیں لیکن اب تک اس کی اشاعت نہ ہو سکی۔

۲. تعلیم:۔ ہر مسجد میں ایک مکتب ہوتا ہے بڑے شہر اور قصبوں میں مکتب کے علاوہ بڑے پیمانے کے ابتدائی اور ثانوی اسکول ہیں، ان میں سے مشہور پیکن کا چینگ دا نارمل اسکول، شمالی مغربی پبلک اسکول، یون نان کا منگ ڈا اسلامیہ اسکول، ہونان کا خیہ جن اسلامیہ اسکول، شنگھائی کا اسلامیہ اسکول اور سی چوان کے اسلامیہ اسکول ہیں ان ثانوی مدارس میں دینی تعلیم اور انتظامات کے لحاظ سے اول الذکر تحسین کا مستحق ہے۔ اس کی بنیاد ۱۹۲۵ء میں اس غرض سے پڑی تھی کہ تعلیمی اصلاح کے سلسلہ میں اس سے تجربہ حاصل کیا جائے۔ آٹھ سال کی ان تھک کوشش کے بعد آج ہمیں یہ فخر حاصل ہوا کہ اس وقت ہم اپنے فارغ التحصیل طلبہ میں سے ایسے پانچ طلبہ منتخب کر سکے جو اعلیٰ تعلیم کے واسطے جامع ازہر میں بھیجے جائیں۔ ہمارا خیال ہے کہ جب تک چین کی اسلامی تعلیم میں اصلاح نہ کی جائے۔ اس کی ترقی کی بہت کم امید ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کس طرح اصلاح کی جائے؟ معلمین طرز تعلیم، تعلیمی انتظامات اور نظام ہمارے پاس کچھ بھی نہیں ایسی حالت میں ہم کیا ترقی کر سکتے ہیں۔

۳. تبلیغ:۔ چین کے شمال و جنوب میں اس وقت اسلامی رسالے اور اخبارات دس سے زیادہ پائے جاتے ہیں یہ سب چینی مسلمانوں کے لئے ہیں۔ صرف ایک رسالہ نضارۃ الاسلام چین کے باہر جاتا ہے یہ چینی مسلمانوں کا سب سے بہتر رسالہ سمجھا جاتا ہے لیکن اس میں بہت سے نقائص ہیں۔ عربی ٹائپ نہ ہونے سے، ہم عربی میں کچھ نہیں

چھاپ سکتے۔ مضامین، سائز، کاغذ، اور ضخامت کے لحاظ سے یہ ہرگز ممالک اسلامیہ کے اخبارات کا مقابلہ نہیں کرسکتا اپنا مطبع نہ ہونے سے ہم دوسرے کے محتاج ہیں چار سال سے اس کی اشاعت ہو رہی ہے، اندرونی مسلمان اس کو پسند کرنے لگے ہیں بیرونی چندہ دینے والے سو سے زیادہ ہیں لیکن اس کی اشاعت اب تک دس ہزار تک نہیں پہنچی یہ ہمارے نقائص ہیں جن کو ہم بیحد محسوس کرتے ہیں۔

چین میں اسلامی تعلیم پھیلانے اور مسلمانوں کو ایک نظام کے ماتحت منسلک کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ کام کرنے والے ہوں، قوت اور ہمت ہو سرمایہ ہو اور برادران اسلام کی اعانت و ہمدردی ہو ان کے بغیر ہم منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہم ممالک اسلامیہ کی سیاحت اور برادران اسلام کی زیارت کرنا چاہتے ہیں تاکہ ان کی دوستی اور ہمدردی حاصل کریں۔ دنیائے اسلام کا شیرازہ خواہ مادی ہو، خواہ روحانی صرف تعاون اور ہمدردی سے مربوط ہو سکتا ہے۔ اسی سے گوشہ تاریک اور جسم بے جان کو روشنی اور زندگی مل سکتی ہے چینی مسلمانوں کی اصلاحی تحریک کے عہد طفلی میں، اگر عالم اسلام ہمارے ساتھ ہمدردی کرے اور حتی الامکان مدد دے تو اسلام سرزمین چین میں ضرور اچھی طرح پھیلیگا اور توحید کی آواز ضرور فضائے مشرق میں گونجے گی یہ ٹمٹماتا ہوا چراغ سحر ضرور پھر روشن ہوگا اور مسلمانان چین ضرور اس قابل ہوں گے کہ برادران اسلام کے ساتھ دوش بدوش ترقی اور اتحاد کے شاہ راہ پر چل سکیں۔ پھر ہم پیچھے نہ رہیں گے اور نہ آپ ہمیں پیچھے چھوڑ سکیں گے۔ آپ جدھر جائیں گے ہم آپ کے پیچھے پیچھے ہولیں گے۔ اسلام کی رو جس طرف بہے گی اس کی کشتی میں ہم بھی بیٹھیں گے، اسلام کی گود میں زندگی بسر کریں گے اور آخر اسی کی آغوش میں مریں گے۔ والسلامؒ

یہ تین واقعات ایک ہی سال کے اندر بلکہ چند ہی مہینے کے اندر چینی مسلمانوں میں ظہور پذیر ہوئے ما فوھیانگ کی موت کی وجہ سے خطرہ ہے کہ وہ اصلاحی کام جو شمالی مغربی چین میں شروع کیا گیا تھا اور وہ دفاعی استحکام جو بیرونی اثرات کو روکنے کے لئے ان کے ذمے تھا قائم نہ رہ سکے۔

مذہبی فتنہ کا انسداد کرنے کے لئے، جمہوریت چین نے جو تدبیر اختیار کی ہے وہ اس بات کی شاہد ہے کہ جدید چین کی تعمیر مسلمانوں کے ساتھ اتحاد و اتفاق کے بغیر نہیں ہو سکتی اب حکومت نے مذہب اور مسلمانوں کی حفاظت اپنے سر پر لی ہے اور اس طرح مسلمانوں کو مطمئن کر دیا ہے

مسلمانان چین کی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ آج دو چینی علماء ممالک اسلامیہ کی زیارت کو نکلے ہیں برادران اسلام کو یہ شکایت تھی کہ وہ مشرق اقصیٰ کے ایک گوشہ میں چپ چاپ بیٹھے رہتے ہیں، اور باہر نکلنے کی ہمت نہیں کرتے لیکن امام جامع پیکن اور ایڈیٹر نظارۃ الھلال اس رسم کو توڑ رہے ہیں تاکہ اسلام کی وسیع برادری سے روشناس ہوں۔

ممالک غیر

بین الاقوامی قرضے دنیا کے اکثر ممالک میں پچھلے چند سال کے اندر جو سیاسی تغیرات پیدا ہوتے رہے ان کے وجوہ متعدد ہیں لیکن سب سے اہم وجہ ان ممالک کی مالی اور معاشی پریشانیاں ہیں۔ انگلستان میں قومی حکومت کا برسر اقتدار آنا، امریکہ میں صدر ہوور کا منتخب نہ ہو سکنا، جرمنی میں ایک سال کے اندر اندر پانچ مرتبہ عام انتخابات کا ہونا اور کسی مضبوط وزارت کا نہ بن سکنا فرانس میں بار بار حکومت کا بدلنا یہ سب بہت کچھ اسی مالی اور معاشی انتشار کے سبب سے ہوا، اور اس مالی انتشار کے سب سے موثر اسباب میں سے بین الاقوامی قرضوں کا مسئلہ ہے، اس وقت امریکہ اور انگلستان کے درمیان ان قرضوں کے متعلق جو گفتگو ہو رہی ہے۔ ساری دنیا کی معاشی کانفرنس میں اس مسئلہ پر جو فیصلہ کن بحث ہونے والی ہے ان کی وجہ سے ان قرضوں کی مختصر سی تشریح غالباً مفید ثابت ہوگی۔

جنگ عظیم سے جو تغیرات دنیا میں رونما ہوئے ان میں شاید روسی انقلاب سے بھی زیادہ اہم یہ تغیر ہے کہ امریکہ ایک قرضدار ملک سے دنیا کا سب سے بڑا قرض خواہ ملک ہو گیا۔ امریکہ کے جنگ میں شریک ہونے سے پہلے بھی جرمنی کے حریفوں نے آپس میں کچھ قرضے لئے تھے جن کی مجموعی مقدار کوئی اٹھارہ ارب ڈالر تھی۔ اس میں سے چھ ارب ڈالر انگلستان نے اوروں کو قرض دئے تھے۔ امریکہ نے شریک ہوتے ہی نہایت فراخدلی سے اپنے حلیفوں کو قرض دینا شروع کیا یہاں تک کہ جنگ کے بعد تک کوئی سوا دس ارب ڈالر قرض دے ڈالے۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ امریکہ نے یہ قرض کچھ نقد کی شکل میں نہیں دیا بلکہ قرض چاہنے والوں کا کھاتہ اپنے بنکوں میں کھول دیا اور ان ملکوں نے امریکہ سے مال خریدنا شروع کر دیا۔ اس طرح امریکہ نے جتنی رقم قرض دی اتنے کا مال قرضداروں نے امریکہ سے خریدا اور ساری رقم امریکہ ہی میں کام آئی۔

جنگ کے بعد ۱۹۲۲ء میں امریکہ نے ان قرضوں کی واپسی کے لئے ایک کمیشن مقرر کر دیا۔ اور اسے ہدایت کی کہ ۲۵ برس میں سب قرض واپس وصول کرے اور ۴½ فیصدی سالانہ سود لگائے۔ انگلستان نے سب سے پہلے احتجاج کیا کہ واپسی کے لئے یہ مدت بہت کم ہے اور شرح سود بہت زیادہ ہے کمیشن نے انگلستان کے اعتراض کو تسلیم کیا اور طے کیا کہ انگلستان پر جو ۴ ارب ڈالر قرض ہیں وہ ۶۲ برس میں ادا کئے جا سکتے ہیں اور سود کا اوسط کوئی سوا تین فیصدی قرار پایا جس سے اصل اور سود کی مجموعی مقدار کوئی ۱۱ ارب ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد کوئی بیس قرضدار ممالک سے کم و بیش اسی طرح معاملہ ہوا۔ سب میں یہ قرار پایا کہ اصل پورا ادا ہو، اور سود قرضدار کی استعداد دیکھ کر مقرر کیا جائے برطانیہ، پولینڈ، رومانیا، چکوسلوواکیا سے تقریباً سوا تین فیصدی سود مقرر ہوا، فرانس کے لئے تقریباً پونے دو فیصدی اور اٹلی کے لئے نصف فی صدی سے بھی کم۔ یوں دس ارب ڈالر کا قرضہ اصل اور سود مل کر ۲۲ ارب ہوتا ہے۔

اس ۲۲ ارب میں سے یکم جنوری ۱۹۳۲ء تک امریکہ کو کل دو ارب ۶۰ کروڑ ڈالر واپس ملے تھے اس میں سے

۳۰ فیصدی کے قریب انگلستان نے ادا کیا تھا (یعنی ایک ارب ۹۰ کروڑ ڈالر) باقی فرانس نے کوئی ۴۰ کروڑ اور اٹلی نے دس کروڑ سے کچھ کم۔

قرضدار حکومتوں کے میزانیوں میں اگر ایک طرف امریکہ کو رقم دادنی تھی تو دوسری طرف جرمنی سے تاوان جنگ کی رقمیں یافتنی تھیں۔ اس تاوان پر بھی بڑے بڑے جھگڑے جرمنی سے رہے روہر کے علاقہ پر قبضہ کیا گیا سرکاری جرمن بنک پر جنرل ڈاز کی تجویز کے بموجب پردیسیوں کی نگرانی شروع ہوئی۔ پھر اس سرکاری بنک کی جگہ ایک نیا بین الاقوامی بنک اس کام کے لئے قایم ہوا۔ ۱۹۲۱ء میں تاوان کی رقم ۳۲ ارب ڈالر مقرر ہوئی تھی اور اندازاً سوا پانچ ارب ڈالر جرمنی ادا بھی کر چکا تھا۔

۱۹۳۰ء میں عام کساد بازاری کا اثر جرمنی پر ایسا ہوا کہ تاوان کی ادائیگی ناممکن ہوگئی۔ ڈر تھا کہ تاوان کی رقم نہ ملی اور امریکہ کا قرضہ ادا کرنا پڑا تو نہ جانے کتنی حکومتوں کا دیوالہ نکل جائے گا۔ چنانچہ جون ۱۹۳۱ء میں امریکہ کے صدر ہوور نے یہ تجویز کی کہ امریکہ اپنے قرض کی قسط ملتوی کردے اور یورپی حکومتیں جرمنی سے تاوان کی قسط ملتوی کردیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اسی التوا کے زمانہ میں اس بین الاقوامی بنک نے جو تاوان کی رقموں کی ادائیگی کے لئے قایم ہوا تھا جرمنی کی درخواست پر ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کی جس نے تمام حکومتوں کو معاملات کی نزاکت کی طرف متوجہ کیا اور جتلایا کہ جرمنی کا مسئلہ تنہا ایک ملک کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ تمام دنیا کی مالی تباہی کا بڑا سبب ہے۔ چنانچہ جون ۱۹۳۲ء میں لوزان کانفرنس شروع ہوئی۔ کانفرنس نے فوراً واجب الادا قسطوں کے التوا کا فیصلہ کیا اور ۳۲ ارب ڈالر کا تاوان جو ۱۹۲۱ء میں مقرر ہوا تھا گھٹا کر کل ۷۱ کروڑ ڈالر رکھا گیا! لیکن اس سارے تصفیہ کے ساتھ یہ شرط لگی ہوئی تھی کہ تاوان معاف کرنے والے ممالک پر امریکہ کا جو قرض ہے اس کا بھی مناسب تصفیہ ہو جائے۔

چنانچہ اب اسی تصفیہ کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ انگلستان اور فرانس دونوں نے گذشتہ نومبر میں امریکہ سے درخواست کی کہ قرضہ کے مسئلہ پر نظر ثانی کی جائے اور فیصلہ تک قسطیں ملتوی رکھی جائیں۔ امریکہ نے التوا کی تجویز منظور نہ کی سو انگلستان نے قسط ادا کردی۔ لیکن فرانس اور کئی دوسرے ملک واجب الادا قسط ادا نہ کرسکے۔ عنقریب انگلستان اور امریکہ میں اس اہم مسئلہ پر گفت و شنید شروع ہونے والی ہے۔

امریکہ کے لئے دو ہی راستے ہیں۔ یا تو اصرار کرے کہ قرض پائی پائی چکایا جائے یا قرض معاف کرے یا کم۔ پہلی صورت تقریباً ناممکن ہے۔ سابقہ ایسے قرضداروں سے ہے کہ اگر وہ ادا نہ کریں تو جنگ کرکے ان سے وصول نہیں کیا جاسکتا۔ دیکھنا صرف یہ ہے کہ قرضدار یہ قرض کہاں تک اور کس طرح ادا کرسکتے ہیں اور اس پر اصرار کرنا خود امریکہ کے لئے بھی مفید ہے یا نہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ قرضداروں میں سے سوا دو ایک کے باقی قرض ادا نہیں کرسکتے۔ قرض کی ادائیگی پر اصرار کرنا ان ملکوں کو صاف انکار پر مجبور کرنا ہے جس سے ان ممالک کا اعتبار دنیا

ہیں اٹھ جائے گا اور خود امریکہ سے تجارتی تعلقات ختم ہو جائینگے جو امریکی تجارت کیلئے سخت مضر ہوگا۔

دوسری بات یاد رکھنے کی یہ ہے کہ قرضدار ملک اگر اپنا قرضہ ادا کر سکتے ہیں تو اجناس اور اسباب تجارت کی شکل ہی میں ادا کر سکتے ہیں اس لئے کہ دنیا میں جتنا سونا ہے اس سے تو قرضۂ جنگ کا بس ضعف ادا ہو سکتا ہے۔ قرضہ مع سود کوئی ۲۲ ارب ڈالر کا ہے اور دنیا کے ۴۵ اہم ممالک کے بنکوں میں سونا کل گیارہ ارب ڈالر کا ہے اور اس میں سے چار ارب کا سونا خود امریکہ میں ہے! اگر قرضہ اسباب تجارت کی شکل میں ادا کیا جائے تو امریکہ کو اپنی سیاست تجارتی کا رخ بالکل بدلنا ہوگا۔ قرض جب ہی ادا ہو سکے گا کہ امریکہ میں دوسرے ممالک سے درآمد زیادہ ہو اور خود امریکہ سے کم مال باہر جائے اس پر امریکی صنعت جس نے پچھلے دنوں محاصل درآمد کو بڑھوا کر اپنے ملک کی منڈی کو اپنے لئے محفوظ کر لیا ہے کب رضامند ہوگی اور اگر سیاست کو یکایک بدلا تو غالباً صنعت، تجارت، زراعت سب کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ جائے گا۔ غرض قرض وصول کرنے کی خواہش اور وصولیابی کی تنہا امکانی شکل میں خود اپنی معاشی تباہی کا اندیشہ امریکی مدبرین و معاشیئین کے لئے ایک "دوگونہ عذاب" ہے جس سے نکلنے کی شاید یہی صورت ممکن ہے کہ قرض سے ہاتھ دھو یا جائے اور اس کے عوض کچھ تجارتی رعایتیں حاصل کر لی جائیں۔

جرمنی اور انقلاب | جرمنی میں بالآخر ہٹلر کو صدر اعظم بنا یا ہی گیا! اس واقعہ کی اہمیت کا پورا پورا اندازہ لگانا مشکل ہے اس میں صرف ایک جوشیلے، ارادے کے پکے، چالاک اور لوگوں کی کمزوریوں سے پورا پورا فائدہ اٹھانے والے سیاسی قائد کی کامیابی کا قصہ ہی پوشیدہ نہیں بلکہ جرمنی کی سیاسی اور مالی پریشانیوں، فکر و عمل کے انتشار اور انتہائے مایوسی میں، ہر تدبیر کو آزمانے کی خواہش کی حسرتناک داستان بھی مضمر ہے اور شاید جرمن زندگی میں عنقریب کسی بنیادی تغیر کی پیشین گوئی بھی۔

جرمنی کی مصیبت ہٹلر کی قوت ہے شکست کی تلخی، کسادبازاری کی فلاکت، مزدوروں کی بدحالی، متوسط الحال لوگوں کی تباہی ان سب نے ہٹلر کو جو اصلاً جرمن بھی نہیں ایک عظیم الشان سیاسی تحریک کا علمبردار بنا دیا ہے اس کی جماعت کا نام ہی اس کی کامیابی کی تشریح کر دیتا ہے۔ یہ جس جماعت کا سردار ہے اس کا نام اس نے رکھا ہے "قومی۔ اشتراکی جرمن مزدوروں کی جماعت"، 'قومی' اور 'جرمن' سے یہ ان سب کو اپنی طرف بلاتا ہے جو صلحنامہ ورسائی کو جرمن قوم کی غلامی کا پٹہ جانتے ہیں، 'اشتراکی' اور 'مزدور' سے ان تمام طبقوں کو جو موجودہ نظام معاشی سے غیر مطمئن ہیں۔ اور سیاسی جوڑ توڑ کی عجیب داستان ہے کہ بیزار اور غیر مطمئن لوگوں کی اس روزافزوں جماعت کو کس کس نے مدد دی۔ بڑے بڑے کارخانے والوں نے انھیں ابھارا تا کہ اشتراکی جماعت کو کمزور کریں، قوم پرست زمینداروں نے انھیں سہارا دیا، سب نے اس نیت سے کہ اپنا کام نکالیں اور آخر میں ہوا یہ کہ سب رہ گئے

اور کم سے کم اس وقت تو یہ جماعت برسر اقتدار آ ہی گئی۔ اور فوجی سپہ سالاروں، زمینداروں، اور کارخانہ والوں کی یہ چال کہ ہٹلر کی قوت سے کام لے کر اپنی حکومت قائم کر لیں پوری طرح نہ چل سکی۔ وجہ صاف ہے کہ باوجود مختلف جماعتوں میں انتہائی اختلافات کے یہ بات مشترک ہے کہ ساری جرمن قوم کا کم و بیش ۲/۳ حصہ کسی نہ کسی طرح اشتراکی مسلک کا حامی ہے۔ ہٹلر کی قومی اشتراکی جماعت، اشتراکی جمہوری جماعت، اور کمونسٹ جماعت سب اشتراکی ہیں یہ آپس میں لڑیں جھگڑیں، پارلیمنٹی حکومت ان کے اختلافات کی وجہ سے ناممکن ہی کیوں نہ ہو جائے مگر یہ آسانی سے جنرلوں، زمینداروں اور کارخانے والوں کی حکومت کو گوارا نہیں کر سکتے۔ چنانچہ فان پاپن اور فان شلائشر کی حکومتیں زیادہ دن قایم نہ رہ سکیں اور بالآخر ہٹلر کو صدر اعظم بنا دیا گیا۔

لیکن ابھی جرمنی کی سیاسی گتھی سلجھی نہیں ہے۔ ہٹلر کی جماعت اگر کچھ عرصہ تک برسر اقتدار رہ گئی تو معتبر مبصروں کے نزدیک اس کا پورا پورا اندیشہ ہے کہ وہ اپنے دعووں کو پورا نہ کر سکے گی اور اس کو ناکامی کے بعد جرمنی میں کمونسٹ جماعت کے برسر اقتدار آنے کے امکانات بہت قوی ہو جائیں گے۔ اس وقت گویا اصل مقابلہ ہٹلر اور کمونسٹ جماعت کا ہے۔ چنانچہ قلمدان وزارت پاتے ہی ہٹلر نے کمونسٹ جماعت کو ختم کر دینے کی کارروائیاں شروع کر دی ہیں۔ اگر ہٹلر اس میں کامیاب ہوا، جس کے امکانات بہت قوی تو نہیں، تو جرمنی میں دیا اٹلی کا فاشستی انقلاب ہوگا اور ہٹلر جرمنی کا مسولینی بن جائے گا۔ اگر اس میں ناکامی ہوئی تو کمونسٹ انقلاب کے لئے راستہ صاف ہو جائے گا۔

ہندوستان

تیسری اور آخری گول میز کانفرنس بھی ختم ہو گئی، توقع تھی کہ ہندوستان کے آئندہ دستور اساسی کا مجوزہ خاکہ آخری صورت میں ہمارے سامنے آجائے گا مگر ابھی انتظار کی گھڑیاں باقی ہیں۔ پہلے وھائٹ پیپر کا انتظار پھر جوائنٹ سلکٹ کمیٹی کی رپورٹ کا انتظار اور سب سے آخر میں پارلمنٹ کی منظوری کا انتظار! ان مراحل کو طے کرنے میں کتنی مدت صرف ہوگی؟ اس کا جواب کوئی نہیں دے سکتا۔ اگر ہندوستان کی سیاسی فضا میں سکون پیدا ہو گیا کہ جدید دستور پر سنجیدگی سے غور کر کے شکریہ کے ساتھ اس کو قبول کر لیا جائے تو چند مہینوں میں تمام آئینی مراحل طے ہو جائیں گے، ورنہ جیسے اب تک مناسب موقعہ کی تلاش میں حکومت نے کئی لاکھ روپیہ اور کئی سال صرف کئے ہیں آئندہ بھی اس مسئلے کو تعویق میں ڈالنے کے لئے انگلستان کے مدبرین کوئی نہ کوئی دوسری تدبیر سوچ لیں گے، اور ممکن ہے کہ گول میز کانفرنس کی بجائے صلح کانفرنس کے نام سے تضیع وقت کی کوئی صورت

تکمیل ہوئے۔

گذشتہ تین کانفرنسوں میں تمام مسائل ہند کی چھان بین کر کے حکومت جن نتائج پر پہنچی ہے اس کا کچھ اندازہ کانفرنس کی سب کمیٹیوں کی مختلف رپورٹوں سے کیا جا سکتا ہے اور خیال یہ ہے کہ جدید دستور انہیں کو پیش نظر رکھ کر مرتب کیا جائے گا۔

پہلی گول میز کانفرنس کے اختتام پر تین بنیادی باتیں طے ہو گئی تھیں کہ (۱) صوبجاتی خود مختاری دی جائے۔ (۲) ذمہ دار وفاقی نظام حکومت قائم کیا جائے۔ (۳) اور دستور اساسی میں ایسے تحفظات رکھے جائیں جو ہندوستان کے لئے مفید ہوں۔

جہاں تک صوبجاتی خود مختاری کا تعلق ہے، اتفاق رائے سے یہ مسئلہ پہلے ہی طے ہو گیا تھا لیکن دوسرے اور تیسرے مسئلے کو طے کرنے میں بیشمار دقتیں تھیں، اور ان مسائل پر دوسری اور تیسری کانفرنس میں بحث و مباحثہ اور تبادلۂ خیالات بہت کچھ ہوا، لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ مسائل طے ہو گئے۔ وفاقی حکومت میں ریاستوں کی شرکت کا مسئلہ ابھی تک آخری طور پر طے شدہ نہیں کہا جا سکتا۔ اور وفاقی حکومت کے اختیارات اور تحفظات کے متعلق وزیر ہند نے تیسری کانفرنس میں جو اظہار رائے کیا اور سب کمیٹیوں میں وقتاً فوقتاً جو مباحثے ہوئے ان سب کو پیش نظر رکھ کر کسی طرح یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ مجوزہ تحفظات ذمہ دار حکومت ہندوستان کے مفاد کے لئے تجویز کئے گئے ہیں یا ایک غیر ذمہ دار شخصی حکومت کو قائم کرنے کے لئے۔

تحفظات کے متعلق تجویز یہ ہے کہ حکومت کے تمام اختیارات عاملہ (Executive powers) اصولاً تاج انگلستان کو حاصل ہوں گے اور عملاً بادشاہ کے نمائندے گورنر جنرل کو مرکز میں اور گورنران کو صوبوں میں۔ مرکزی حکومت دو حصوں میں تقسیم ہو گی، ایک کا تعلق براہ راست گورنر جنرل سے ہو گا مثلاً معاملات خارجہ فوج اور کلیسا کا انتظام۔ دوسرا حصہ ذمہ دار وزراء کے متعلق ہو گا لیکن یہاں بھی گورنر جنرل کو خاص اختیارات ہوں گے کہ اگر:۔

۱۔ امن عامہ میں خلل پڑنے کا اندیشہ ہو۔ یا

۲۔ اقلیت کا مفاد خطرے میں ہو یا

۳۔ سرکاری ملازموں کے حقوق پامال کئے جائیں یا

۴۔ دیسی ریاستوں کی خود مختاری اور حقوق کے حفاظت کی ضرورت ہو یا
۵۔ تجارتی معاملات میں غیر ملکیوں کے ساتھ کوئی ناانصافی کی جائے۔
"تو وائسرائے کو حق ہوگا کہ وزرا کے مشورہ کے بغیر اپنے اختیارات تمیزی سے کام لیکر جو کاروائی چاہے کرے"

جہانتک وفاقی مجلس قانون ساز کا تعلق ہے گورنر جنرل کو یہاں بھی خاص اختیارات حاصل ہونگے
۱۔ مجلس کے سامنے پیش ہونیوالے مسودات قانون کو جب چاہے روک سکتا ہے یا اگر منظور ہو چکے ہوں تو ان کو بھی مسترد کر سکتا ہے۔
۲۔ وفاقی مجلس اگر کسی مسئلہ کے خلاف فیصلہ کردے اور گورنر جنرل چاہے تو اسکے علی الرغم ضروری کارروائی کر سکتا ہے،
۳۔ اگر گورنر جنرل چاہے تو کسی مسئلہ پر بحث و مباحثہ کو روک سکتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ
یہ تمام اختیارات ایک شخص کو تفویض کرنے کے بعد کہا جاتا ہے کہ کوئی سمجھدار گورنر جنرل بلا ضرورت ان اختیارات کا استعمال نہیں کرے گا اور گورنر جنرل کو ملک معظم کی طرف سے یہ ہدایت بھی کردی جائے گی کہ ہر معاملہ میں وزرا سے ضرور مشورہ کیا جائے۔ اس قسم کی ہدایات موجودہ دستور کے متعلق بھی کیگئی تھیں اور موجودہ اصلاحات کا منشا بھی یہی بیان کیا گیا تھا کہ گو قانونًا تمام اختیارات گورنراو گورنر جنرل یا مجلس عاملہ کے پاس رہیں گے مگر عملًا وزرا اور مجالس قانون ساز کے مشورہ اور رائے کی پیروی کیجائے گی لیکن گذشتہ دس سال کے تجربہ کے بعد آئندہ کے متعلق اس قسم کے وعدے بے معنی معلوم ہوتے ہیں۔
فوج کے متعلق جو تحفظات تجویز کئے گئے ہیں ان پر نظر ڈالنے سے آئندہ دستور کے متعلق کوئی غلط فہمی باقی نہیں رہتی۔ وزیر فوج کا تقرر گورنر جنرل اپنی رائے سے کیا کرے گا، فوجی مصارف کے متعلق وائسرائے کے مشیر اور وفاقی وزرا کے درمیان میزانیہ پیش ہونے سے قبل مشورہ ہوگا لیکن فوجی مصارف پر وفاقی مجلس کو رائے دینے کا کوئی حق نہ ہوگا۔ ہندوستان کی فوج کو "ہندوستانی" بنانے کے لئے بھی کوئی مدت معین نہیں کی گئی ہے اور نہ یہ مطالبہ تسلیم کیا گیا ہے۔ بغیر وفاقی مجلس کی رائے کے ہندوستانی افواج سے بیرون ہند کام نہ لیا جائے گا۔ گویا فوج پر آئندہ بھی ذمہ دار وفاقی حکومت کو کسی قسم کا اختیار حاصل نہ ہوگا۔
دنیا میں کوئی ذمہ دار نظام حکومت کامیابی سے اس وقت تک نہیں چل سکتا جب تک کہ حکومت کی مالیات مستحکم بنیادوں پر قائم نہ کی جائیں۔ چنانچہ اس حقیقت سے دوچار ہو کر حکومت نے یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ جدید دستور کے نفاذ سے قبل "ریزرو بنک" ہندوستان میں قائم ہونا ضروری ہے لیکن "ریزرو بنک" کے قیام کیلئے مندرجہ ذیل چار شرائط کا پورا ہونا بھی ضروری قرار دیا گیا ہے،

۱۔ مرکزی حکومت کے میزانیہ میں قابل اطمینان توازن قائم ہو جائے۔
۲۔ حکومت ہند کے کم مدت والے تمام قرضہ جات میں معتد بہ کمی ہو جائے۔
۳۔ معقول سرمایہ محفوظ جمع ہو جائے۔
۴۔ ہندوستان کی درآمد اور برآمد کا فرق حسب سابق قائم ہو جائے۔

بحالات موجودہ ان میں سے کوئی ایک شرط بھی قابل اطمینان طریقہ پر پوری نہیں ہو سکتی۔ میزانیہ میں صحیح اور حقیقی توازن قائم کرنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ فوجی مصارف میں معقول تخفیف نہ کیجائے۔ اور حکومت نہ اب اس کے لئے تیار ہے نہ آئندہ فوجی انتظام میں ہندوستان کو دخل دینے کی اجازت دینا چاہتی ہے۔

سونے کی برآمد برابر ملک سے جاری ہے، اور ذخیرہ جمع کرنے کی اسوقت تک کوئی تدبیر نہیں اختیار کی گئی ہے اوٹاوہ کے معاہدے کے بعد ولایتی مال کی درآمد میں برابر اضافہ ہو رہا ہے، اور یہ یقینی نہیں کہ برآمد اور درآمد کا فرق حسب سابق قائم ہو جائے گا۔ صرف ایک شرط البتہ پوری کرنے کی کوشش حکومت نے شروع کی ہے اور وہ دوسری شرط ہے۔ غرض مجموعی حیثیت سے یہ توقع نہیں قائم کی جا سکتی کہ ذرروبنک مستقبل قریب میں قائم ہو جائے گا۔ اور چونکہ ذرروبنک کے قیام پر وفاقی حکومت کا قیام موقوف قرار دیا گیا ہے اس لئے اندیشہ ہے کہ اس کو خدا حافظ کہنا پڑے گا۔ لیکن یہ چکر یہیں ختم نہیں ہوتا۔ ہندوستان کی معتدل سے معتدل جماعتوں نے بھی حکومت پر یہ واضح کر دیا ہے کہ صوبجاتی خود مختاری اور ذمہ دار وفاقی حکومت ساتھ ساتھ قائم ہونا چاہیئے ورنہ وہ جدید دستور سے کوئی تعلق نہ رکھیں گے

کانگریس کے مطالبات ناقابل عمل قرار دے کر ردی کی ٹوکری میں ڈال دئے گئے تھے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ معتدل جماعتوں کے مطالبات کا کیا حشر ہوتا ہے۔

شذرات

رمضان کا مبارک مہینہ گذر گیا اور اس کے خاتمے پر عید کی گھما گھمی بھی زیادہ عرصے قائم نہ رہی، خدا نے جسے توفیق دی اس نے اس مہینے میں اپنی آخرت کا سامان مہیا کیا اور جسے وسعت دی اس نے اس کے خاتمے پر دل کھولکر خوشی منائی۔ جامعہ کے اساتذہ اور طلبا نے بھی اپنی توفیق اور وسعت کے مطابق دونوں قسم کی مصروفیات میں حصّہ لیا اور اپنی سنّت دیرینہ کو قایم رکھا۔ رمضان میں افطار، تراویح اور سحرگہی کی دلچسپیاں رہیں اور عید کے دن باہمی ملاقات اور مبارکبادی۔ پھر دوسرے دن ٹر بھی منائی گئی۔ اسی سلسلے میں روایات قدیمہ کے مطابق ایک دعوت بھی ہوئی جس میں نہ صرف تمام اساتذہ اور طلبہ شریک تھے بلکہ شہر دہلی سے بھی بعض "ہمدردان جامعہ" مدعو کئے گئے تھے۔ اس سال یہ جلسہ پچھلے سالوں سے نسبتاً زیادہ کامیاب رہا اور جو لوگ باہر سے آئے تھے، امید ہے کہ وہ اچھے تاثرات لیکر واپس گئے ہوں گے۔

عید کارڈ بھیجنے کی رسم اب ہندوستان میں کوئی جدت کی بات نہیں رہی ہے اور بیشتر کارڈ تو پستی مذاق کا ایسا تکلف وہ نمونہ ہوتے ہیں کہ خوش مذاق لوگ اس رسم سے ہی بیزار نظر آتے ہیں پھر اس میں نمایش کا جو پہلو ہے اس سے سنجیدہ لوگوں کو اس سے نفرت سی ہوگئی ہے۔ یہ سب کچھ سہی لیکن اگر اس رسم کو خوش مذاقی اور خلوص کے ساتھ ادا کیا جائے تو اس میں نہ صرف طرفین کی فرحت کا سامان ہے بلکہ باہمی تعلقات کی استواری کا بھی۔ اسی نکتے کو مدنظر رکھ کر جامعہ نے اس سال عید کے موقعے پر اپنے 'ہمدردوں' کی خدمت میں ایک عیدی 'پیغام عمل'، کے نام سے بھیجی تھی۔ ایک کارڈ تو ضرور تھا لیکن نہ تو وہ رنگین تھا اور نہ اس میں بہت سے گل بوٹے بنے ہوئے تھے۔ چند اشعار تھے جن میں عمل کی دعوت دی گئی تھی اور اس خوشی کے موقعے پر یہ یاد دلانے کی جرأت کی گئی تھی کہ انسان کی زندگی کا مقصد عمل ہے اور وہ بھی نیک عمل۔ امید ہے کہ یہ 'بدعت' ارباب ذوق کو پسند آئی ہوگی اور انھوں نے اس کارڈ کو 'یک نگاہ غلط انداز' سے زیادہ کا سزاوار پایا ہوگا۔

اس سلسلے میں ہمیں ایک غلطی کا اعتراف اور معذرت کا اظہار بھی کرنا ہے۔ اس کارڈ پر جو اشعار لکھے گئے تھے وہ حضرت محمد میرٹھی کے ہیں۔ ارادتاً نہیں بلکہ سہواً ان کا نام اس پر درج نہ ہوسکا۔ ہمیں اپنی اس غلطی پر سخت ندامت ہے اور ہم امید کرتے ہیں کہ حضرت محمد ہمارے اس جرم کو 'جرم عمد' نہ قرار دیں گے بلکہ سہو سمجھ کر معاف فرمائینگے۔

ہمدردانِ جامعہ کا حلقہ وسیع کرنے کی جو تحریک جامعہ نے چند ماہ سے شروع کی ہے، اس میں بحمد اللہ حسب توقع کامیابی ہو رہی ہے اور ملک کے ہر حصے سے تعلیم سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اس تحریک کا خیر مقدم کر رہے ہیں اگر یہ رفتار قائم رہی تو ہمیں امید ہے کہ بہت جلد ہماری مالی مشکلات ختم ہو جائیں گی اور ہم سکون و اطمینان سے اپنی تعمیری تجاویز کو عملی جامہ پہنانے میں مشغول ہو جائیں گے مگر اس خوش آیند صورت حال کے لئے جو شرط ضروری ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے ہمدرد صرف فوری جوش کی نمائش نہ کریں بلکہ جس رقم کا انھوں نے وعدہ کیا ہے اس کی ادائگی وقت پر اور پابندی سے کرتے رہیں۔ مسلمانوں پر یہ اعتراض عام طور سے کیا جاتا ہے کہ ان میں جم کر کام کرنے کی صلاحیت نہیں۔ غیرت اور حمیت ان میں کافی ہے اور اپنی زبوں حالی کا احساس بھی مگر چاہتے یہ ہیں کہ ان کی تمام خرابیاں ایک آن میں رفع ہو جائیں۔ عمل پیہم سے وہ گھبراتے ہیں اور دیر طلب کاموں کے قریب نہیں جاتے۔ جامعہ نے جس کام کو اپنے ہاتھ میں لیا ہے اس کے نتائج کا اندازہ چند دنوں یا چند مہینوں میں نہیں ہو سکتا اس لئے ہم اپنے ہمدردوں سے درخواست کرتے ہیں کہ اگر انھوں نے اس صبر آزما کام میں ہمارا ہاتھ بٹانے کی زحمت گوارا کی ہے تو ذرا صبر اور استقامت سے بھی کام لیں، اور ہمیں منجدھار میں چھوڑ کر الگ نہ ہو جائیں ہم مشکلات سے اتنا نہیں ڈرتے جتنا ناپائدار کامیابی سے کہ یہ ہمتوں کو پست، اور ارادوں کو متزلزل کر دیتی ہے۔

اس مہینے کے رسالے میں ایک مضمون ' دار المصنفین ' سے متعلق شائع ہو رہا ہے یہ ادارہ تعارف کا محتاج نہیں گذشتہ بیس سال میں دار المصنفین نے جو خدمت علوم اسلامی کی خصوصاً اور اردو زبان کی عموماً کی ہے وہ بھی محتاج تشریح نہیں لیکن ہماری قوم کی علم دوستی کا یہ حال ہے کہ باوجود اتنی خدمات کے بھی یہ ادارہ مالی مشکلات سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ کاؤنسل کی دو ایک نشستوں اور حکومت کی چند ملازمتوں کے لئے طوفان برپا کرنیوالے مسلمان تو آپ کو ہندوستان کے ہر گوشے میں ملجائیں گے مگر علوم اسلامیہ کے زندہ رکھنے کی اس گرانقدر کوشش میں مدد کرنیوالے ڈھونڈھنے سے بھی چند ہی نظر آئیں گے

دیکھئے یہ صورت حالات کب بدلتی ہے اور ہماری ملت کی نگاہیں چمکتے ہوئے سنگریزوں سے ہٹ کر مدہم رنگ والے قیمتی جواہرات پر کب جمتی ہے۔ آخر میں ہم ' دار المصنفین ' کے ارباب حل وعقد کی خدمت میں ایک مخلصانہ مشورہ بھی پیش کئے بغیر نہیں رہ سکتے اور وہ یہ ہے کہ زمانے کی ضروریات آجکل بہت سرعت سے بدلتی جا رہی ہیں اور اگر اس دور میں اصلاح اور تاثیر کی خواہش ہے تو علاج کا طریقہ بھی بدلنا چاہیئے۔

ز خاک تا بہ فلک ہر چہ ہست رہ پیماست
قدم کشائے کہ رفتار کارواں تیز است

مطبوعات

مکتبہ جامعہ دہلی

مذہب

سیرۃ نبوی اور مستشرقین یورپ قیمت عمر
اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر جس شیریں اور مغالطہ زا انداز میں زہر اگلا کرتے ہیں اس سے سمجھدار آدمی بھی دھوکہ کھا جاتے ہیں، اس کتاب میں ایسے مزخرافات کا نہایت ہی مدلل جواب دیا گیا ہے، شروع میں مقدمہ تحقیق وتنقید کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ از مولوی عبدالحلیم احراری بی اے آنرز سجاد

تاریخ القرآن عہ
قرآن حکیم پر نہایت ہی جامع کتاب ہے، طبع دوم، از مولٰینا محمد اسلم صاحب جیراجپوری۔

خلافت کبریٰ للعہ
تفسیر الفرقان فی معارف القرآن کا پہلا حصہ۔ سورۂ بقر کی مکمل ومبسوط تفسیر، از خواجہ عبدالحیٔ صاحب فاروقی۔

بیان عہ
تفسیر الفرقان کے اس حصہ میں سورۂ آل عمران کی محقق تفسیر ہے از خواجہ عبدالحیٔ صاحب فاروقی۔

صراط مستقیم عه
سورۂ انفال وتوبہ کی تفسیر جس میں فلسفہ جنگ وجہاد کی ضرورت، فتح وکامرانی کے قوانین وضوابط پر نہایت ہی محققانہ اور دلکش انداز میں بحث کی گئی ہے۔ از خواجہ عبدالحیٔ صاحب فاروقی۔

عبرت مجلد عہ
احسن القصص یعنی سورۂ یوسف کی تفسیر نہایت ہی خوبی اور لطافت کے ساتھ مولٰینا ممدوح نے بیان فرمائی ہے۔ از خواجہ عبدالحیٔ صاحب فاروقی۔

برہان عہ
تفسیر الفرقان فی معارف القرآن کا یہ سلسلہ ایک اہم سلسلہ ہے جس میں سورۂ نور کی تفسیر کیگئی ہے از خواجہ عبدالحیٔ صاحب فاروقی۔

سبیل الرشاد قیمت ۸؎
سورۂ حجرات کی یہ تفسیر نہایت ہی محققانہ اور دلکش انداز میں لکھی گئی ہے۔ از خواجہ عبدالحیٔ صاحب فاروقی۔

بصائر قیمت ۶؎
اس رسالہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے واقعات قرآن سے لے کر نہایت وضاحت کے ساتھ موثر انداز میں بیان کئے گئے ہیں۔ از خواجہ عبدالحیٔ صاحب فاروقی

مجحوب الارث قیمت ۴؎
اس میں ثابت کیا گیا ہے کہ اولاد مجحوب نہیں ہو سکتی، لوگ اب تک غلط فہمی میں مبتلا ہوتے چلے آئے ہیں۔ از مولانا حافظ محمد سلم صاحب جیراجپوری۔

الوراثۃ فی الاسلام قیمت ۸؎
فن وراثت پر عربی میں یہ ایک محققانہ رسالہ ہے۔ از مولانا محمد اسلم صاحب

ذکریٰ قیمت ۸؎
ولادت نبوی پر یہ ایک معرکۃ الآرا مضمون ہے۔ اسکے ساتھ مولینا کا مضمون ہجر و وصال بھی ضم ہے۔

از مولینا ابو الکلام آزاد مدظلہٗ

بشریٰ قیمت ۱؎
عیسائی مبلغین کو مولینا کا جواب۔ کہ اسلام میں خدا کا تخیل صرف جبّار، قہّار ہی نہیں بلکہ رحمٰن رحیم بھی ہے۔ از علامہ سید سلیمان صاحب ندوی۔

الورد والریحان ۴؎ ۔ ۲؎
اس کتاب میں صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں سے چند قابل حفظ احادیث کا انتخاب کیا گیا ہے تاکہ بچے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس مختصر کلام کو آسانی سے یاد کر سکیں۔ نظم و نثر میں ترجمہ بھی ہے۔ از مولینا فتح محمد صاحب جالندھری

ہمارا دین قیمت ۲؎
اس میں شعائر اسلام سلیس اور عام فہم اردو میں لکھے گئے ہیں۔ از سید نواب علی صاحب بغنوی، ایم

فلسفۂ مذہب قیمت ۸؎
یہ پروفیسر صاحب کا وہ دلچسپ مقالہ ہے۔ جو اردو اکادمی کے پہلے جلسہ میں پڑھا گیا تھا از رشید وحید الدین صاحب ایم اے۔

تاریخ

تاریخ مغربی یورپ — قیمت ۔ ؏
نامور امریکن مورخ ڈاکٹر رابن من کی ہسٹری آف ویسٹرن یورپ کا ترجمہ ہی ۔ مصنف نے شرح وبسط کے ساتھ یورپ کے تمدن، معاشرت، علم وہنر اور سیاسی اداروں کی بتدریج ترقی کو دکھایا ہے ۔ مع متعدد نقشہ ۔ از مولوی محمد یحییٰ صاحب وکیل

تاریخ ہند قدیم — قیمت عہ
جامعہ کے شعبہ تصنیف وتالیف کی درخواست پر پانیکر صاحب نے اس کتاب کو لکھا تھا ۔ قدیم ہندوستان کی تاریخ کا یہ ایک مختصر لیکن جامع خاکہ ہی ۔ از کے ۔ ایم پانیکر، ایم اے

تاریخ الدولتین — قیمت ۔ ؏
مصر کے مشہور اہل قلم جرجی زیدان کی تصنیف ہی، جس میں خلافت بنی اُمیہ اور بنی عباس کے عہد حکومت پر ایک طائرانہ نظر ڈالی گئی ہی ۔ از مولانا نیاز فتحپوری ۔

تاریخ فلسفہ اسلام — قیمت ۔ عاؔ
ایک جرمن تصنیف کا اردو ترجمہ ہی اسلامی فلسفہ کی نشوونما، یونانی علوم، عربی علوم فلسفہ فطرت، یونانی اور اسلامی حکما، پھر مشرق میں فلسفہ کا انحطاط، عرب اور سولاسطی فلسفہ پر ایک اچھی بحث کی گئی ہی ۔ قابل دید ہے ۔ طبع ثانی زیر طبع ، از ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم اے ۔ پی ، ایچ ڈی ۔

تاریخ نجد — قیمت عہ
نجدیوں کے مذہبی عقائد، سیاسی حالات اور طرز معاشرت پر ایک مکمل اور مستند تاریخ ہی ۔ از مولانا محمد اسلم صاحب جیراجپوری ۔

تاریخ الامت — مکمل عـــہ ۱۲
ابتدا سے لیکر خلافت عثمانیہ تک اسلام کی مستند تاریخ

حصہ اول سیرۃ الرسول ۔	؏
حصہ دوم خلافت راشدہ ۔	۱۲
حصہ سوم خلافت بنی امیہ ۔	؏
حصہ چہارم خلافت عباسیہ ۔	؏
حصہ پنجم خلافت عباسیہ بغداد	عاؔ
حصہ ششم خلافت عباسیہ مصر ۔	عاؔ
حصہ ہفتم ۔ خلافت عثمانیہ ۔	عہ

از مولانا محمد اسلم صاحب جیراجپوری ۔

سوانح عمریاں

تلاش حق — قیمت ہر دو حصے ۲؎
مہاتما گاندھی کی آپ بیتی۔ گاندھی جی نے اس میں اپنے اخلاقی، ملی، اور سیاسی تجربات اپنے آپ تحریر فرمائے ہیں۔ متعدد تصاویر۔ از ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم اے، پی، ایچ ڈی

سیرت محمد علی — قیمت ۔۔۔
مولینا مرحوم کی مکمل سوانح حیات، ابتدائی تعلیم علی گڑھ کی سوسائٹی، ہمدرد اور کامریڈ کی دلچسپیاں، سیاسی زندگی کا اتار چڑھاؤ غرضکہ تمام واقعات کی تفصیل آپ سیرت میں ملاحظہ فرمائیں۔ از رئیس احمد جعفری ندوی۔

ٹالسٹائی — قیمت ۔ ۱۲ر
روس کے قائد اعظم، مشرق کے مصلح، انسانیت کے شیدا، روحانیت کے مجسمہ کاؤنٹ لیو۔ ٹالسٹائی کی زندگی کے حالات،

جمال الدین افغانی — قیمت ۔ ۔ر
یعنی مبلغ اعظم جمال الدین، افغانی کی سوانح حیات جس نے ہندوستان، ایران ٹرکی مصر اور فرانس میں ایسے کام کئے۔ جس سے استبداد لرز اٹھا تھا۔

اورنگ زیب عالمگیر — قیمت ۔ عہ ر
ایک خاص مقصد کے ماتحت آج اورنگ زیب پر طرح طرح کے اعتراضات کئے جا رہے ہیں اس کتاب میں ان اعتراضات کے جواب دئے گئے ہیں، اور عالمگیر کی شخصیت کو نمایاں کیا گیا ہے۔ از علامہ شبلی نعمانی۔

حیات حافظ — قیمت ۱۲ر
لسان الغیب حضرت خواجہ حافظ شیرازی کی زندگی کے حالات، اور ان کی شاعری پر مفصل تبصرہ، آخر میں چند مشہور غزلیں بھی دیدی گئی ہیں، از مولینا حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری

حیات جامی — قیمت ۔۸ر
فارسی کے مشہور شاعر مولینا نورالدین عبدالرحمٰن جامی کے مکمل حالات۔ از مولانا محمد اسلم صاحب۔

سیرت عمرو بن العاص — قیمت ۔ عہ ر
مشہور مدبر صحابی اور نامور فاتح مصر حضرت عمرو بن عاص کی یہ سوانحمری دلوں میں جوش اور ولولہ پیدا کر دیتی ہے، از محمد اسلم صاحب۔

خادماتِ خلق
قیمت ۱۰؍

اس کتاب میں یورپ اور امریکہ کی چند پاک سیرت خواتین کے حالات ہیں، جنہوں نے اپنی زندگی دوسروں کے لئے وقف کر دی تھی، یہ مبارک ہستیاں ہر زمانہ اور ہر قوم کے سامنے جیتے جاگتے نمونے ہیں۔ از مرحومہ سیدہ خاتون

ادب

سیر المصنفین
ہر دو حصص ۲؍

مصنف نے اس کتاب میں اردو کے تمام مصنفین اور نثر نگاروں کے حالات دلچسپ انداز میں لکھے ہیں ہر دور پر ایک محققانہ نظر ڈال کر اسے دلنشیں انداز میں بیان کیا ہے۔ نثر اردو کی دلپسند تاریخ ہے۔ حصہ اول عہ؍ حصہ دوم ۱۲؍ از مولوی محمد یحییٰ صاحب تنہا۔ بی۔ اے۔

کیمیاگر
قیمت عہ؍

مختصر افسانوں کا یہ اچھا مجموعہ ہے۔ اخلاقی اور ادبی محاسن کی بنا پر اردو میں ایک نئی چیز ہے، اکثر پڑھنے والوں کو ان افسانوں میں اپنی زندگی کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور نظر آئیگا۔ کیمیاگر اردو کی بہترین کتابوں میں شمار کی جاسکتی ہے، از محمد مجیب صاحب بی اے آکسن،

نیرنگ
قیمت ۱۲؍

یہ کتاب بارہ دلچسپ ادبی مضامین اور ایک ڈرامے پر مشتمل ہے۔ ان مضامین میں ضمیر کی آواز، جستجوئے مسرت خاص طور پر قابل ذکر ہیں آخر میں ایک ڈراما خلافت عباسیہ کے تیسرے تاجدار مہدی سے متعلق ہے۔ از اس آر کے صاحب

مضامین رسالہ جوہر
قیمت عہ؍

یہ ان چیدہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ جو جامعہ کے قلمی رسالہ "جوہر" میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے۔ مولانا مرحوم کا ایک فوٹو بھی ہے۔ از مجلس جوہر۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

لیلۃ القدر
قیمت ۱؍

مولانا ابوالکلام کا ایک بصیرت افروز رسالہ ہے۔ بیان کی دلکشی، الفاظ کی چستی، ایسی کہ پڑھنے والا پڑھتا ہے۔ اور سیر نہیں ہوتا از مولانا ابوالکلام صاحب آزاد۔

دیوان غالب جرمنی
قیمت ۳ عہ

دیوان مکمل ہے جس میں مرزا کا

خود نوشتہ مقدمہ ۔ غزلیات، قصائد اور رباعیات ہیں، آخر میں بیاض کے لئے نفیس حاشیہ دار سادہ اوراق شامل ہیں، جلد کا رنگ سبز، سرخ یا نیلا ۔ سائز ۸×۱۰ خوبصورت ملائم جلد، اس پر سنہری نقش و نگار اور سب سے زیادہ مرزا غالب کی لاثانی عکسی تصویر جو جرمن ہنرمندی اور کمال کا اعلیٰ نمونہ ہیں ۔

اردو کی خوبصورت کتابوں میں سب سے سستی کتاب اور

قیمت میں انتہائی تخفیف

یعنی

قسم اول للعہ کے بجائے عہ، قسم دوم سے کے بجائے عہ

دیوان غالب اردو قیمت ۔ عہ چونکہ دیوان غالب اکثر جگہوں پر داخل نصاب ہے ۔ اس لئے طلبا کی سہولت اور روزانہ استعمال کے لئے یہ اچھا صاف اور خوبصورت کم قیمت اڈیشن شائع کیا گیا ہے ۔

دیوان شیدا جرمنی قیمت عہ، مسیح الملک حکیم اجمل خاں مرحوم کے فارسی اور اردو کے پاکیزہ کلام یہ مجموعہ ہے مسیح الملک مرحوم کی شاعری اپنے احباب کی مجلس تک محدود تھی ۔ کسی مشاعرہ میں آپ نے کبھی اپنا کلام سنانا پسند نہ فرمایا ۔

کلام جوہر قیمت ۔ ۸ر رئیس الاحرار مولینا محمد علی جوہر کے قدیم اور جدید اشعار کا یہ مجموعہ ہے ۔ شروع میں مولانا عبد الماجد دریابادی کا جوہر کی شاعری پر دیباچہ ہے ۔

انتخاب میر قیمت عہ سعدی ہند میر تقی علیہ الرحمتہ کے چھ دواوین سے یہ انتخاب طیار ہوا ہے ۔ از نور الرحمٰن صاحب، بی اے، علیگ،

انتخاب سودا قیمت ۔ عہ مرزا رفیع سودا میر جی کے ہمعصروں میں ہیں، یہ مجموعہ ان کے اچھے کلام سے طیار کیا گیا ہے ۔ شروع میں نواب جعفر علی خان صاحب اثر کا دلچسپ مقدمہ ہے ۔ از جناب ثاقب کانپوری

انتخاب حسرت قیمت ۔ عہ یہ انتخاب ان کے دواوین سے چن کر مرتب کیا گیا ہے ۔ کاغذ نہایت اچھا ۔ سرورق سرخ ۔

رنگین، از جلیل احمد صاحب قدوائی، بی۔ اے

مرقع غالب (جرمنی) قیمت ۔ ۸ر
یہ مرقع دلکشی اور دلفریبی کا بہترین نمونہ ہے۔ آپ کے کمرہ کی زینت اس سے دوبالا ہوجائے گی سہ رنگی فوٹو کے ساتھ دو قسم کے الگ الگ کلام درج ہیں،
"وہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں"
"اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل"

جواہر ملیہ قیمت ۸ر
دس عدد۔ تاریخی اور ملی نظموں کا مجموعہ ہے۔ یہ نظمیں درس میں داخل ہیں، از مولینا محمد اسلم صاحب جیراجپوری۔

ازہار العرب قیمت ۔ ۸ر
مشہور شعرائے عرب کے منتخب اشعار کا ایک گلدستہ ہے۔ اس میں علم و حکمت، ہمت، شجاعت سخاوت و مروت اور اخلاق حمیدہ پر بہترین اشعار جمع کئے گئے ہیں، مولینا محمد یوسف السورتی

نالۂ مشیر قیمت عہ
شیخ مشیر حسین صاحب قدوائی بار ایٹ لا کو اگر آپ حقیقی شاعر کی حیثیت سے جاننا چاہتے ہیں تو انکے کلام کا یہ پہلا حصہ طلب فرمائیں۔

کلام مشیر قیمت عہ
شیخ صاحب کے کلام کا یہ دوسرا حصہ ہے۔ لوازم حسن اور لوازم عشق، کائنات سے سرگوشیاں اور تبسم حبیب چند اچھی نظمیں ہیں۔ از شیخ مشیر حسین صاحب قدوائی، بار ایٹ۔ لا۔

نامۂ مشیر ۸ر
یہ شیخ صاحب کا ایک منظوم خط ہے۔ جسے انہوں نے اپنے ایک دوست کے نام لکھا ہے۔
از شیخ مشیر حسین صاحب قدوائی بار ایٹ لا

مقدمہ شعر و شاعری قیمت
خواجہ الطاف حسین حالی کا شعر و شاعری پر یہ جامع مقدمہ ہے جس میں اس فن پر محققانہ بحث کیگئی ہے (زیر طبع)

مسدس حالی قیمت ۔ ۸ر
حالی کی بلند پایہ نظم "مد و جزر اسلام" ہم نے طلبہ کے لئے خاص طور پر شائع کیا ہے (زیر طبع)

دیوان حالی قیمت
جدید شاعری کے علمبردار حالی مرحوم کا مکمل۔
دیوان ۔ (زیر طبع)

ڈرامے

پردۂ غفلت قیمت ۔عہ۔ یہ ایک اصلاحی ڈراما ہی اس میں اسلامی معاشرت تعلیم نسواں، آزادیٔ نسواں، اور پردہ پر دلچسپ اور ظرافت آمیز انداز میں بحث کی گئی ہے۔ از ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم۔ اے

کھیتی قیمت ۱۲ر یہ ڈراما مجیب صاحب نے مسلمانوں کی موجودہ حالت کو دیکھتے ہوئے لکھا ہے، اِس میں دکھایا گیا ہی کہ مذہب اور اخلاق کس راستے پر چلانا چاہتے ہیں، زمانے کی مصلحتیں، قومی ضروریات۔ سب پر ایک نظر ڈالی گئی ہے۔ مسلمانوں کی ذہنی اور قومی رہنمائی کے لئے ایک دلچسپ ڈراما ہے۔ پروفیسر محمد مجیب صاحب بی اے آکسن

گناہ کی دیوار قیمت ۔۸ر گناہ بری چیز ہے لیکن شقاوت قلب اور تکبر بدتر ہیں۔ گناہ کی دیوار شاید ٹوٹ سکتی ہو، لیکن شقاوت قلب اور تکبر کے بتوں کو توڑنا ذرا دشوار ہے۔ اس ڈرامے میں دکھایا گیا ہی کہ گناہ کی بڑی دیوار کس طرح ٹوٹ جاتی ہی اور دو بچھڑے کیوں کر مل جاتے ہیں۔ از پروفیسر اشتیاق حسین صاحب ایم اے

ہمزاد قیمت ۱۲ر یہ ڈراما اگر دلچسپ اور پر مذاق ہے تو ساتھ ہی ساتھ عبرت آموز اور نتیجہ خیز بھی ہے۔ دیکھو اگر کہیں شوہر صاحب عمر کی کئی منزلیں طے کر چکے ہوں اور بیوی بے چاری کم عمر ہو تو یہ قضیہ کیا صورت اختیار کر لیتا ہی یہ ظرافت کا پہلو لئے ہوئے ایک بہت ہی نتیجہ خیز ڈراما ہی۔ از پروفیسر اشتیاق حسین صاحب ایم اے۔

صیدِ زبوں قیمت ۔۸ر عورتوں کی قابل رحم حالت کا خاکہ کھینچا گیا ہے اور دکھایا گیا ہے کہ "خلع" عورتوں کے لئے کس قدر اہم مسئلہ ہے۔ اور آج کل بھی موجودہ عدالتوں کو حق خلع دیدینا چاہئے۔ از پروفیسر اشتیاق حسین صاحب ایم اے۔

متفرق

نفسیاتِ شباب قیمت ۔/۔ نوجوانوں کی نفسی سیرت، ان کی تخیلی زندگی، عشق، تصورِ کائنات اور اخلاقی نشوونما پر بہترین کتاب ہے۔ از ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم اے پی ایچ ڈی۔

آزادی قیمت ۱۲/ یہ کتاب جان اسٹورٹ مل کی کتاب لبرٹی کا ترجمہ ہے مل انگلستان کے ان چند اربابِ فکر میں سے ہے جن کی دھاک سارے یورپ میں بیٹھی ہوئی ہے۔ یہ کتاب سیاسیات کے درس کا ایک اہم جزو ہے۔ شروع میں پروفیسر محمد مجیب صاحب بی اے (آکسن) کا مقدمہ ہے، از سعید انصاری بی اے۔

نہرو رپورٹ قیمت مع تتمہ ۱۲/ ۱۹۲۸ء کی اس کمیٹی کی رپورٹ جس نے ہندوستان کا دستورِ اساسی مرتب کیا تھا۔

مبادیِ معاشیات قیمت ۔/۔ علم المعیشت پر ایڈون کینن کی مشہور کتاب کا ترجمہ ہے۔ اس فن پر اردو میں بہت کم کتابیں لکھی گئی ہیں، یہ کتاب مبتدیوں کے لئے مفید ثابت ہوگی، ترجمہ سلیس اور واضح ہے۔ از ڈاکٹر ذاکر حسین خان صاحب ایم اے پی ایچ ڈی۔

عربوں کا تمدن قیمت ۱۲/ مشہور مستشرق جوزف ہیل کی کتاب کا ترجمہ ہے۔ یہ کتاب مسلمانوں کے قدیم علمی اور عملی کارناموں کے متعلق ہے۔ چونکہ نوٹ اور حواشی بھی بہت ضروری تھے اس لئے مترجم نے اس کا بہت خیال رکھا ہے۔ اور جگہ بجگہ نوٹ اور حواشی دے دئے ہیں از نذیر نیازی صاحب۔

باغبانی پروجکٹ قیمت ۸/ ایک جدید طریقہ تعلیم کے ماتحت بچوں سے باغیچہ میں کام لیتے ہوئے کس طرح لکھنا پڑھنا سکھایا، کتاب میں امتحانات کا طریقہ اور ایک طالبعلم کے کام کا نمونہ بھی دیا گیا ہے، از عبدالغفار صاحب مدہولی

میلاد النبی پر ڈرامہ قیمت ۔ ۴ر
بچوں سے میلاد النبی کے موقعہ پر کہا گیا کہ وہ بھی اسکول میں جلسہ کریں، چنانچہ انہوں نے تیار ڈرامہ شروع کیا۔ یہ کتاب انھیں بچوں کی محنت کا نتیجہ ہے۔ کتاب اساتذہ کے لئے خاص طور سے مفید ہے (با تصویر) از عبد الغفار صاحب مدھولی۔

قواعد عربی قیمت عـ۸ـ
اردو میں عربی کے قواعد پر مکمل اور جامع کتاب ہے۔ از مولینا محمد بن یوسف السورتی۔

آزادی ہند قیمت ۔ ۳ر
سی، ایف اینڈریوز کا مقالہ جس میں ہندوستان کی آزادی پر محققانہ بحث کیگئی ہے۔ از جناب سہیل صاحب بی اے "علیگ"

مسلمانوں کی تعلیم اور جامعہ قیمت ۔ ۴ر
اس رسالہ میں تعلیم کی غائت اور مسلمانوں کی موجودہ ضروریات پر نہایت ہی دلچسپ اور مفید بحث کیگئی ہے تعلیمی دلچسپی رکھنے والے حضرات اس کا ضرور مطالعہ فرمائیں، از ڈاکٹر عابد حسین صاحب

اسلامی تہذیب قیمت ۔ ۱۰ر
ڈاکٹر سرڈنی سی رائے نے بتقریب جلسہ اسناد یہ خطبہ پڑھا تھا، اس میں موصوف نے مسلمانوں کی تہذیب و تمدن اور ان کی حیرت انگیز علمی ترقی کو دکھایا ہے۔ قیمت صرف ۴ر اصل انگریزی مع مقدمہ خواجہ عبد المجید ۱۰ر۔

قومی تعلیم قیمت ۔ ۸ر
مولینا محمد علیؒ مرحوم مسلمانوں کے جیسے شیدائی تھے آج تک ہندوستان میں کوئی دوسرا نہ پیدا ہوا اور نہ ہوگا، اس رسالہ میں مولینا مرحوم نے مسلمانوں کی قومی اور ملی تعلیم کا ایک خاکہ پیش کیا ہے، مترجمہ جناب خواجہ عبد المجید صاحب، از رئیس الاحرار مولینا محمد علی مرحوم۔

خطبہ شیخ الہند قیمت ۔ ۲ر
یہ خطبہ جناب شیخ الہند مرحوم نے بتقریب افتتاح جامعہ ملیہ اسلامیہ پڑھا تھا۔ یہ ایک تاریخی چیز ہے۔

خطبہ مسیح الملک
یہ خطبہ مسیح الملک حکیم اجمل خاں
قیمت - ۴ر
مرحوم نے جامعہ ملیہ کے سب سے پہلے جلسہ تقسیم اسناد کے موقع پر پڑھا تھا

صلاح کار
اس کتاب میں زن و شوہر کے تعلقات پر مفید سنجیدہ
قیمت - ۸ر
اور کارآمد بحث کیگئی ہے از چودھری محمد علی صاحب تعلقہ دار۔

بچوں کی کتابیں

دنیا کے بسنے والے
دنیا کے عجیب عجیب باشندوں
قیمت - ۴ر
کے متعلق بڑی ہی دلچسپ کتاب ہے۔ تقریباً بچاس تو تصویریں ہیں جنھیں دیکھ کر بڑی ہنسی آتی ہے۔ از سید بشیر حسین زیدی۔

تاریخ ہند کی کہانیاں
سینکڑوں برس پہلے کی ہندوستان
قیمت - ۴ر
کی تاریخی کہانیاں بچوں کے لکھی گئی ہیں،

بچوں کا انصاف (ڈراما)
بچوں نے ایک مقدمہ کا فیصلہ
قیمت - ۴ر
اس خوبی سے کیا کہ خلیفہ ہارون بھی متحیر ہوگیا

محنت (ڈراما)
محنت ایک اچھی چیز ہے اس کا پھل شیریں اور
قیمت ۴ر
لازوال، مسرت کا باعث ہوتا ہے۔ اس ڈراما میں یہ بھی دکھایا گیا ہے۔ کہ محنتی آدمی کیسی چین کی زندگی بسر کرتے اور لوگ انھیں کتنا مانتے ہیں، از عبد الغفار صاحب مدہولی

اسکول کی زندگی (ڈراما)
یہ ڈراما مدرسہ کے بچوں کے لئے لکھا
قیمت - ۴ر
گیا ہے۔ اس میں ہندوستان کے مدرسوں کی عام زندگی بتائی گئی ہے، اور اچھے اور شریر طالب علموں کو دکھایا گیا ہے۔ طباعت و کتابت نہایت اعلی، از عبد الغفار صاحب مدہولی

شریر لڑکا (ڈراما)
دلچسپ پیرایہ میں یہ ایک نتیجہ خیز ڈراما ہے
قیمت - ۴ر
اس میں دکھایا گیا ہے کہ شریر اور نالایق لڑکا بھی اچھا اور نیک طینت ہو سکتا ہے بشرطیکہ تربیت اچھی ہو - یہ ڈراما کھیلا جا چکا ہے۔ بڑی خوشنما کتاب ہے۔ از ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب۔ ایم۔ اے پی ایچ ڈی۔

قوم پرست طالبعلم (ڈراما)
قیمت - ۴ر

اتحاد و اتفاق پر یہ سبق آموز ڈراما ہے۔ اس ڈرامے کو بچوں نے ڈاکٹر انصاری اور ملک کے چند بڑے بڑے لیڈروں کے سامنے کھیلا تھا۔ بہت پسند کیا گیا۔ بچے ضرور پڑھیں، از عبد الغفار۔ صاحب مدہولی

دیانت (ڈراما)
قیمت - ۲ر

دیانت ایک اچھی چیز ہے اور دیانت دار لڑکا ہنر والدین اور اساتذہ میں بہت محبوب ہوتا ہے شیخ الجامعہ صاحب نے یہ ڈراما طلبائے جامعہ کے لئے لکھا ہے، اور اس میں دیانت داری کی خوبیوں کو دلچسپ پیرائے میں دکھایا ہے۔ از ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب۔ ایم اے، پی ایچ ڈی۔

ترکوں کی کہانیاں
قیمت - ۴ر

اس کتاب میں ترک بچوں کی بہادری ہمت اور جرأت کی چند سچی کہانیاں لکھی گئی ہیں

ہمارے رسول
قیمت ۵ر

بچوں کے لئے سیرت پر اچھی کتاب ہے۔ از خواجہ عبد الحی صاحب۔

بچوں کیلئے درسی کتابیں

تاریخ اسلام کا جدید نصاب

علماء اور ماہرین فن تعلیم کے مشورے سے بچوں کے لئے تاریخ اسلام کا یہ سلسلہ مرتب کیا گیا ہے۔

ہمارے نبی	(جماعت دوم)	۴ر
نبیوں کے قصے	(جماعت سوم)	۶ر
سرکار دو عالم	(جماعت چہارم)	۸ر
خلفائے اربعہ	(جماعت پنجم)	۱۰ر
ناموران اسلام	(جماعت ششم)	(زیر ترتیب)

بچوں کا قاعدہ
قیمت - ۴ر

ابتدائی تعلیم میں جو دشواریاں پیش آتی ہیں وہ مدرسین پر روشن ہیں یہ قاعدہ انہیں مشکلات کے پیش نظر لکھا گیا ہے۔ اور دو سال کے تجربے کے بعد اب شائع ہو رہا ہے۔ از عبد الغفار صاحب مدہولی استاد جامعہ۔

نوید

ہفتہ وار — باتصویر

ڈائرکٹران پالیسی

مولانا حسرت موہانی۔ آنریبل شیخ مشیر حسین صاحب قدوائی بارایٹ لا۔ نواب محمد اسمٰعیل خانصاحب بارایٹ لا آنریری ٹریژرر مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

ایڈیٹر سید حسن ریاض (سابق ایڈیٹر ہمت)

نوید ہندوستان کے لئے ایک "نوید" ہے۔ ایک پیغام ہے اور آزاد سیاسی افکار کا ذریعہ اشاعت ہے ذریعہ اشاعت ہر اخبار ہوتا ہے۔ مگر "نوید" براڈکاسٹ کی مشین ہے۔ لاوڈاسپیکر ہے۔ نوید کا ہفتہ وار اڈیشن صرف اس لئے نکالا گیا ہے کہ ہندوستان کے ممتاز ماہرین سیاست کے خیالات اہتمام سے حاصل کرکے وسعت کیساتھ تبادلہ خیالات کا سامان مہیا کردے رائے اور خیال میں یکجہتی اور ربط قائم کردے آزادی کی وکالت کرے نوید پالیسی کے اعتبار سے بالکل آزاد ہوگا

نوید میں :۔ سیاست پر اعلیٰ درجہ کے متین اور سنجیدہ مضامین ہوں گے۔ تحریکات عالم پر نفیس لطیف اور شوخ تنقیدیں ہونگی۔ بالالتزام اولیاء اللہ کے حالات شایع کیے جائیں گے۔ عمدہ نظمیں ہونگی تصاویر ہونگی۔ ہفتہ بھر کی اہم خبریں اس طرح درج ہونگی کہ وہ آیندہ تاریخ بنجائے گی۔ دیہات اور مضافات کے لوگوں کے لیئے جہاں ڈاک دیر میں پہونچتی ہے خبر رسانی کا یہ بہترین ذریعہ ہے ممالک اسلامیہ کے حالات اور خبریں بڑے اہتمام سے شایع کیجائیںگی۔ تقطیع $\frac{20\times 26}{4}$ حجم ۱۶ صفحات۔

عمدہ کاغذ۔ نہایت دلکش طباعت اور کتابت۔ قیمت سالانہ للعہ

دفتر نوید گھسیاری منڈی لکھنؤ

ایجنسی کی کتابیں

سیرۃ النبی (جلد چہارم)

الحمدللہ کہ سیرۃ النبی کی چوتھی جلد چھپ کر شائع ہوچکی ہے اس جلد کا عنوان منصب نبوت ہے اسمیں اولا

نبوت، منصب نبوت اور آثار و لوازم نبوت پر تفصیلی بحث ہے پھر ظہور اسلام کے وقت دنیا کی اخلاقی و مذہبی حالت کا مرقع ہے۔ پھر آنحضرت کے پیغمبرانہ کارناموں پر ایک تبصرہ ہے۔ اور ان کو عقاید، عبادات، اخلاق، اور معاملات کے چار حصوں میں تقسیم کر کے عقاید کے بیان کی تشریح شروع ہوتی ہے۔ خدا، ملائکہ، کتب الہی، انبیاء، جزا و سزا اور قضا و قدر پر مفصل مباحث ہیں۔ کتاب کی ضخامت تقریباً سات سو صفحوں کی ہے قیمت قسم اول ؎ اور قسم دوم ؎
نوٹ: معلوم ہو کہ قسم اول عہ اور قسم دوم ؎ ہوگا جو کتاب کی قیمت سے علیحدہ ہے۔ کتاب فوراً طلب کیجئے ورنہ دوسرے ایڈیشن کا انتظار کرنا پڑے گا۔

یورپ میں دکھنی مخطوطات

ریاست حیدر آباد کی جانب سے مولوی نصیر الدین ہاشمی صاحب ۱۹۲۸ء میں یورپ بھیجے گئے تھے کہ انگلستان اسکاٹ لینڈ اور پیرس کے کتب خانوں میں جو اردو زبان میں دکن کے مصنفین کی قلمی کتابیں ہیں ان کی فہرست تیار کریں چنانچہ واپسی پر جناب ہاشمی نے یہ کتاب ترتیب دی ہے۔ یہ کتابوں کی محض فہرست نہیں بلکہ خلاصہ بھی ہے ... صفحات قیمت صرف للعہ

انگورا اور ترک

مؤلفہ عبد الرب صاحب بی اے۔ اس کتاب میں انگورا کی تینوں لڑائیوں کے مفصل حالات کے ساتھ ساتھ سلطنت عثمانیہ کی تاریخ ترکوں اور روسیوں کی عداوت اور خونریزیوں کا خاکہ کھینچا گیا ہے۔ جنگ بلقان جنگ عظیم مصطفے کمال پاشا اور قیام جمہوریت پر ایسے مضامین ہیں جو ہر حیثیت سے قابل وقعت ہیں
قیمت صرف ۱۲؍

تمدن اسلام

مصنفہ عبد الباسط صاحب ایم اے۔ ایل ٹی۔ بی۔ اس رسالہ میں نظریات تمدن سے مکمل بحث کی گئی ہے اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اسلامی تمدن دنیا کے تمدنوں میں بہترین اور عقل و ضرورت انسانی کے بالکل مطابق ہے تمدن اسلام کے اکثر حصص باقساط معارف کے مختلف نمبروں میں شائع ہو چکے ہیں۔ اسلامی تمدن پر یہ ایک اچھا رسالہ ہے قیمت عہ

ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ قرول باغ دہلی

علی گڑھ میگزین کا عظیم الشان سالنامہ

مرتبہ حضرت سید وحید اکبر آبادی

علی گڑھ میگزین نے اردو زبان و ادب کی جو گراں بہا خدمات انجام دی ہیں، وہ اہل نظر سے مخفی نہیں۔ اس کا عام نمبر دوسرے رسالوں کے خاص نمبروں کے برابر ضخیم ہوتا ہے۔ لہذا اب آپ اس کے سالنامے کی خوبیوں کا اندازہ بآسانی کر سکتے ہیں۔ سالنامہ ڈھائی سو صفحات پر شائع ہوا ہے۔ علمی و ادبی مضامین نظم و نثر کے علاوہ اس میں سر سیدؒ کے اس قلمی خط کا عکس شائع ہوا ہے، جو انہوں نے مولانا حالیؔ کو ان کی مسدس کے متعلق لکھا تھا۔ سالنامہ یقیناً نئے سال کا ایک عجیب و غریب تحفہ ہوگا۔ اس غرض سے کہ ہر شائق اردو اس کا مطالعہ کر سکے۔

اس کی قیمت صرف ایک روپیہ آٹھ آنے (۱۲/۸) (محصول ڈاک چھ آنے) رکھی گئی ہے۔ طلبہ سے محصول ڈاک معاف۔

منیجر "علی گڑھ میگزین" علی گڑھ

ترکی جمہوریہ

یعنی ترکی کی نشاۃ ثانیہ کا تجزیہ

از

مسٹر ضمیر احمد ہاشمی۔ ایم۔ اے۔ پی۔ سی۔ ایس۔ ڈپٹی کلکٹر صوبجات متحدہ

ترکی جمہوریہ، سولہ بابوں پر مشتمل ہے۔ جن میں سلیس اور عام فہم زبان میں یہ دکھایا گیا ہے کہ ترکوں پر مغربیت کا اثر کیونکر ہوا، اور مغربی طرز اختیار کرنے کے لئے ترکی کو کس قدر مراحل طے کرنے پڑے۔ ترکی کا اولین زمانہ، اس کا عروج، بعد ازاں بتدریج زوال اور اس کے اسباب۔ ترکی مغربیت کی طرف کیونکر رجوع ہوئی۔ اور اس سلسلہ میں متعدد انقلابات کیونکر وقوع میں آئے۔ بالآخر جنگ عظیم میں شرکت اور بعد کی حالت۔ اتحاد اسلامی۔ خلافت اور سلطانیت کا تجزیہ۔ اور جمہوریت کا قائم ہونا۔ ترکی کی موجودہ سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی حالت اور ان شعبوں میں نمایاں ترقی، کتاب کی لکھائی و چھپائی نہایت دیدہ زیب ہے۔ اور سفید قیمتی کاغذ پر شائع کی گئی ہے۔ صفحات ۳۲۰، قیمت صرف ایک روپیہ آٹھ آنے۔

ملنے کا پتہ

مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ قرول باغ دہلی

اردو کی سب کتابیں

آپ مکتبہ جامعہ سے طلب فرمائیں

چندہ سالانہ پانچ روپیہ

قیمت فی پرچہ آٹھ آنہ

پرنٹر، پبلشر: محمد مجیب، بی اے (آکسن)

نے

جامعہ برقی پریس دہلی میں چھپوا کر شائع کیا



مطبع جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

جامعہ

زیر ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری — ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے پی ایچ ڈی

جلد ۲	بابتہ ماہ مارچ سنہ ۳۳ء	نمبر ۳

فہرست مضامین

(محمد مجیب بی اے آکسن پرنٹر و پبلشر نے دفتر رسالہ قرولباغ سے شائع کیا)

روحِ تہذیب

تہذیب کا ایک نظریہ وہ ہے جو مذہب اور اخلاق کی تعلیم سے متاثر ہو کر ان لوگوں نے پیش کیا ہے جو انسانی زندگی میں اخلاقی قدروں کو مقدم اہمیت دیتے ہیں اور انسان کی اخلاقی اور مذہبی سیرت کو پختہ اور مستحکم بنانا چاہتے ہیں اس نظریے کے مطابق سیرت انسانی کی تہذیب کیلئے اس قسم کی صفات لازم ہیں جیسے صداقت ایمانداری، عقیدے کی پختگی، ایثار اور خلوص۔ اگر ان کے مطمح نظر کو ایک لفظ میں ادا کیا جا سکے تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ انسان کو مجاہد بنانا چاہتے ہیں۔ جو ایمان اور عقیدے کا پکا ہو شکوک و شبہات سے محفوظ ہو۔ اپنے عقائد پر سختی سے عامل ہو اور ان کی اشاعت و تبلیغ کے لیے ہر قسم کے ایثار اور قربانی کے لئے تیار ہو۔ اس سے یہ مطلب نہیں کہ تمام لوگ جو مذہبی ہونے کا یا مذہبی سرکردگی کا دعویٰ کرتے ہیں وہ ان اوصاف سے متصف ہوتے ہیں یا ان سب کی تائید کرتے ہیں بلکہ یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ دنیا کی تاریخ میں مذہب کی تعلیم کے اثر سے بہت سے ایسے لوگ پیدا ہوئے ہیں جنھوں نے ان صفات کا اظہار کیا ہے اور جریدۂ عالم پر اپنا سکّہ دوام ثبت کر دیا ہے۔

تہذیب کا دوسرا نظریہ ان لوگوں کا ہے جو انسانی زندگی کے اجتماعی اور تمدنی پہلو کو مقدم سمجھتے ہیں اور اس کے معاشرتی تعلقات کی اہمیت پر زور دینا چاہتے ہیں۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کے باہمی میل جول، داد و ستد، مراسم اور تعلقات میں لطف اور خوشگواری پیدا کریں۔ اس معنی میں مہذب شخص وہ کہلاتا ہے جس کو آداب محفل سے بخوبی واقفیت ہو، لوگوں کے ساتھ شائستگی اور مروت سے پیش آئے ان کے جذبات اور احساسات کو ٹھیس نہ لگائے اور کم از کم ظاہراً ان کا احترام کرے۔ اس سے ان کی مراد صرف اتنی ہی نہیں کہ روزمرہ کے میل ملاقات میں ناگواری پیدا نہ ہو بلکہ اصل مقصد یہ ہے کہ بحیثیت ایک معاشرتی فرد کے انسان اپنے حقوق و فرائض کو پہچانے اور اپنے اقوال و اعمال کی حدود سے واقف ہو کر زندگی بسر کرے جو لوگ اس کا خیال نہیں کرتے وہ نہ صرف

دوسروں کو تکلیف پہنچاتے ہیں بلکہ انجام کار خود بھی زک اٹھاتے ہیں۔

تہذیب کا تیسرا مفہوم جو صدیوں تک تعلیم کی بحثوں اور تعلیم کے عمل پر مسلط رہا ہے یہ ہے کہ انسان میں بہت سی قوتیں اور صلاحیتیں ایسی ہیں جو تربیت کی محتاج اور اظہار کے لئے بے چین ہیں۔ ان کی ایک قدر مستقل ہے خصوصاً ان قوتوں کی جن کا تعلق ادب اور فنون لطیفہ کی تحصیل اور تخلیق و تحسین سے ہے۔ تہذیب یافتہ ہونے کے معنی ہیں ان قوتوں کی تربیت اور ابھار۔ انسان کی زندگی محض حیوانی خواہشات تک محدود نہیں بلکہ اس کو تلاش حق اور مشاہدۂ جمال کی کاوش بھی رہتی ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے جو اس کو حیوانوں سے ممتاز کرتی ہے۔ کیٹس کے لئے ہر حسین مرقع مسرت دائمی کا سرمایہ دار تھا۔ اس کی طرح ہر تہذیب یافتہ انسان میں یہ صلاحیت ہونی چاہئیے کہ وہ حسین مناظر اور اشیاء سے لطف اندوز ہو سکے۔ اس میں حسن شناسی کی قابلیت ہو۔ وہ ادب، موسیقی، مصوری اور شاعری کی تخلیق و تحسین کا ذوق رکھتا ہو۔ اس مفہوم کے مطابق آرٹسٹ کے انہاک میں ہمیں تہذیب کی شان نظر آتی ہے اور آرٹ کی نیرنگیوں میں ایک مہذب انسان کے لئے زندگی کا مشغلہ موجود ہے لیکن کام، محنت، مزدوری، دست کاری وغیرہ جس کے ذریعہ عام لوگ اپنی روزی کماتے ہیں بمقابلۃً حقیر اور کم درجے کے مشاغل ہیں جن کو نہ صرف یہ کہ تہذیب سے کوئی واسطہ نہیں بلکہ وہ ان لوگوں کے تہذیب حاصل کرنے میں مانع ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مدت تک بلکہ اب بھی آزاد یا لبرل تعلیم سے دماغی تعلیم یا فنون لطیفہ کی تعلیم مراد لی جاتی ہے اور جسمانی محنت اور مشاغل کو حقیر سمجھا جاتا ہے۔

ان تینوں نظریوں میں سے ہر ایک میں بعض قابل قدر عناصر ایسے ہیں جن کے امتزاج سے تہذیب نفس کی تعمیر و تکمیل ہوتی ہے لیکن ان میں سے کوئی بجائے خود اس کے پورے اور صحیح مفہوم پر حاوی نہیں بلکہ اگر ان میں سے کسی ایک پر بھی شدت اور مبالغہ کے ساتھ عمل کیا جائے تو انسان کی تہذیب و تربیت ناقص رہ جائے گی۔

اگر مجھ سے کہا جائے کہ تم مکمل تہذیب یافتہ انسان کی تصویر پیش کرو تو اس کے خدو خال بنانے میں شاید سب سے پہلے میں رواداری کی صفت کو پیش کروں۔ ممکن ہے آج کل کے زمانے

میں جب ہر جماعت بلکہ ہر فرد اپنے اپنے مخصوص اور بظاہر جداگانہ مفاد کے لئے جد و جہد کر رہا ہے اور جماعتی وفاداری اور تعصب کو تقریباً ہم معنی سمجھ لیا گیا ہے یہ کہنا بے وقت کی راگنی معلوم ہو لیکن میرا پر خلوص عقیدہ یہ ہے کہ افراد اور جماعتوں کے لئے رواداری کی صفت پیدا کئے بغیر تہذیب کی منزل تک پہنچنا ممکن نہیں بہت سے نیک نیت اور نیک نفس لوگوں کی خوبیوں پر محض اس وجہ سے پانی پھر جاتا ہے کہ ان میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی تو وہ اپنی زندگی کو خود اپنے اور دوسروں کے لئے ایک عذاب مستقل بنا لیتے ہیں۔ انھیں یہ خیال نہیں گذرتا کہ حکمت الٰہی اس امر کی مقتضی ہے کہ انسانوں میں اختلافات ہوں اور وہ ان کا احترام کریں۔ سائنس اور جمہوریت کے اس دور میں جب انفرادیت کی تکمیل کے بغیر قومی ترقی ناممکن ہے، تنگ نظری اور تعصب خودکشی کا حکم رکھتا ہے۔ دماغی بیداری اور نشو و نما اسی جماعت میں ممکن ہے جس کے افراد میں ذہنی کشادگی ہو۔ جن کی دلچسپیاں متنوع ہوں جو علاوہ اپنے تنگ اور محدود ذاتی اغراض و مقاصد کے دوسرے اجتماعی مسائل میں بھی دلچسپی کے ساتھ شرکت کریں۔ ہندوستانی تہذیب کی تباہی کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ ہمارے تعلیم یافتہ طبقے میں بھی شدت کے ساتھ تعصب اور تنگ نظری سرایت کر گئی ہے جس کا اظہار مختلف صورتوں میں ہوتا ہے یہاں تک کہ اس بیسویں صدی میں جب کہ ہندو مذہب پانچ ہزار سال پرانا ہو چکا ہے۔ مہاتما گاندھی کو اچھوتوں کی آزادی کے لئے اپنا نقد حیات پیش کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ میرے عقیدے کے مطابق، باوجود ہر قسم کی علمی اور فنی ترقی کے، باوجود ان تمام کارناموں کے جو ہندو تمدن کے امتیاز کا باعث ہیں ایسی سوسائٹی جو اس طرح انسانی حقوق اور رواداری کا خون کرے سراسر نفی تہذیب کرتی ہے یہی حکم ان تمام قدیم تمدنوں اور معاشروں پر عائد ہوتا ہے جنھوں نے مختلف صورتوں میں اپنے بعض افراد کی حق تلفی کی اور خندہ پیشانی کے ساتھ ان پر ظلم کو روا رکھا خواہ وہ غلامی کی رسم ہو یا عورتوں کی حق تلفی ہو یا کمزور اقوام کے حقوق پر دست درازی ہو۔ بے شک اس اصول کو قائم کرنے سے ہمیں افلاطون کے زمانے کی سوسائٹی سے لیکر امریکہ جیسے متمدن اور مہذب ملک تک کی شان میں گستاخی کرنی پڑیگی اور خود ہندوستانیوں کے لباس خودی کو ٹھیس لگے گی لیکن ہم کسی طرح اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ صحیح انسانی تہذیب کا تقاضا یہ ہے

کہ ہم تمام انسانوں سے رواداری اور عدل کا برتاؤ کریں جو فرد یا جماعت اس قاعدہ کی خلاف ورزی کرتی ہے وہ تہذیب سے محروم رہتی ہے خواہ اسکی علمی تہذیب کیسی ہی خیرہ کن کیوں نہ ہو۔

رواداری کے مفہوم میں ایک طرف تو یہ داخل ہے کہ انسان دوسروں کے جذبات اور خیالات کو سمجھے اور انکا احترام کرے اور اپنی ذات میں اس درجہ وسعت پیدا کرے کہ اس میں دوسرونکا دکھ درد بھی سما سکے دوسری طرف اسمیں یہ صفت شامل ہے کہ انسان دوسروں کی غلطیوں اور قصوروں کو فیاضی کیساتھ جانچے اور ایک سخت گیر قاضی کیطرح ان پر حکم لگانے کے بجائے ایک اہل دل انسان کیطرح ان کی وجہ اور علت کو معلوم کرنیکی کوشش کرے یعنی اسے چور کو پکڑنے اور سزا دینے سے زیادہ اس بات کی فکر اور کاوش ہو کہ وہ کیا اسباب تھے جنھوں نے اس شخص کو سیدھے راستے سے ہٹا کر اس راستے پر ڈال دیا۔ جو شخص ہمیشہ دوسروں کیلئے محتسب بنا رہتا ہے ان کی عیب جوئی کرتا رہتا ہے انکی لغزشوں کو معاف کرنیکے لئے تیار نہیں بلکہ ان پر سختی کرنا اور انھیں عذاب الیم کا مزہ چکھانا اپنا فرض سمجھتا ہے وہ ممکن ہے ایک اعلیٰ اخلاق و سیرت کا مالک ہو لیکن وہ تہذیب کے ایک نہایت لازمی اور شیریں عنصر سے محروم ہے اسمیں وہ فراخدلی اور رواداری نہیں ہے جو مجرم اور جرم میں امتیاز کرتی ہے جسکی وجہ سے ہمارے دل میں ایک بدبخت مجرم کو دیکھکر بھی یہ خیال گذرتا ہے کہ اگر توفیق الٰہی شامل حال نہ ہوتی تو کیا عجب ہے کہ آج ہم بھی اسی حالت میں ہوتے یعنی وہ صفت جسکی بدولت عارضی اور اتفاقی فرق کی بنا پر ہم اپنی مشترک انسانیت کا احساس نہیں کھونے پاتے۔ یہ وہ حقیقی انسانی ہمدردی رحم اور انکسار ہے جو بعض لوگوں میں فطرتاً ودیعت ہوتا ہے اور بعض میں بہت سے تجربے اور آزمائشیں اٹھانیکے بعد پیدا ہوتا ہے اور بعض پر اس کا ذرا سا پرتو بھی نہیں پڑتا۔ ایسی ہمدردی اور فراخدلی کی مثالیں ہمیں ادب میں ہی ملتی ہیں اور اگر ہم خوش قسمت ہوں تو عملی زندگی میں بھی کبھی کبھی ایسے انسانوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ جو اس تہذیب حقیقی کے حامل اور شمع بردار ہیں۔ جو باوجود اپنے مواقع کے تنگ اور محدود ہونے کے باوجود جاہل اور ناواقف اور ناتجربہ کار رہنے کے اپنی فطرت کی گہرائیوں میں ایثار، محبت، ہمدردی اور رواداری سمجھنے اور معاف کرنیکے ایسے خزانے رکھتے ہیں جنکے مقابلے میں حقیقت میں نظر و نکے سامنے علم اور تجربے کی بھی کوئی وقعت نہیں بیشک علمی مشاغل اور مذاق کی مناسبت اور اتحاد بہت قابل قدر چیزیں ہیں اور خوش قسمت ہیں وہ لوگ جنکو اپنے دوستوں اور عزیزوں میں یہ نعمت میسر ہو لیکن ان سے زیادہ وقیع ہیں محبت اور ہمدردی کے وہ رشتے جن کو موت بھی نہیں توڑ سکتی کس کام آئینگی آخری ساعت

میں دماغی مناسبت اور اتحاد اور وہ ذہنی رشتے جن کو قائم کرنیکا لوگوں کو شوق ہوتا ہے۔ اسوقت انسان کو یہ چیزیں اپنے اصلی رنگ میں نظر آئینگی یعنی یہ کہ وہ زندگی کی محض بیرونی نمائش ہیں۔ بچہ جب تاریکی کے بھوتوں سے ڈرتا ہے تو وہ یہ نہیں چاہتا کہ دوسرے بھی اس کے خوف میں شریک ہوں یا اس خوف کی نفسی وجہ اس کو سمجھائیں" وہ اس گرم اور محبت بھری آغوش کی تلاش کرتا ہے جس میں پناہ لے کر اپنے ڈر کو بھلا سکے۔ اسے اس شفیق اور تسکین بخش ہاتھ کی تلاش ہوتی ہے جس کو تھام کر وہ اس خوف کا مقابلہ کر سکے۔ بے شک امید، ایمان اور صداقت ضروری ہیں لیکن ضرورت ہے انسانیت کے لئے سب سے زیادہ بعض ہندوستانی ماؤں کی سی محبت کی جس میں انتہائی بے نفسی ہو، صبر ہو، ان تھک تحمل ہو، ایسی محبت جس کو خطائیں اور لغزشیں کم نہ کر سکیں، جو کسی معاوضہ کی طالب نہ ہو، جس میں محبت الٰہی کی جھلک ہو۔ اس کے مقابلے میں اور تمام انسانی تجربے اور جذبات ہیچ اور پوچ ہیں۔

رواداری کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے دو باتوں کو ذہن نشین کرنا ضروری ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ انسان اخلاقی عیوب اور برائیوں کے ساتھ بھی سمجھوتہ کرنے کو تیار ہو جائے اور جرم اور گناہ کے ساتھ رواداری برتے۔ نہیں! اسے جرم اور مجرم میں، گناہ اور گناہ کرنے والے میں تمیز کرنی چاہیئے۔ بحیثیت ایک با اخلاق آدمی کے اس کا فرض ہے کہ وہ جرم کے تدارک کی کوشش کرے اور اس کے خلاف اپنی پوری قوت صرف کرے لیکن بحیثیت ایک انسان کے اسے مجرموں کے ساتھ ہمدردی رکھنی چاہیئے اور انھیں راہ راست پر لانے کی پوری کوشش کرنی چاہیئے۔ جب حضرت عیسیٰ کے ساتھیوں نے جنکو دعوائے تقدس تھا اور اپنے متعلق بہت خوش فہمی تھی، میری میگڈیلین پر لعنت ملامت کی بوچھاڑ کی اور اس کو سنگسار کرنا چاہا تو اس عارف ربانی نے جس کی نظر اوروں سے زیادہ گہری اور دل اوروں سے زیادہ فراخ اور روادار تھا، اپنی آواز بلند کی: "پہلا پتھر وہی شخص پھینکے جس نے خود کبھی کوئی گناہ نہ کیا ہو" نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ہاتھ جو پتھر پھینکنے کے لئے اٹھے تھے اپنی اپنی جگہ پر ٹھٹک کر رہ گئے اور کسی کو ہمت نہ ہوئی کہ دل کے چور کو فراموش کر کے نظر کے سامنے والے چور پر ہاتھ اٹھائے۔ اسی طرح جب رسالتمآب بحیثیت ایک فاتح کے دوبارہ مکہ معظمہ میں داخل ہوئے جہاں انھوں نے اہل مکہ کے

ہاتھوں ہر طرح کی ایذائیں اور بے حرمتی اٹھائی تھی جہاں لوگوں نے اسلام اور پیغمبر اسلام کا خاتمہ کرنے میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کیا تھا۔ تو آپ کی زبان پر یہی اعلان تھا کہ لاتثریب علیکم الیوم اور دل میں یہ دعا تھی کہ بارالٰہا تو میری قوم کی خطاؤں سے درگذر کر کیونکہ وہ لاعلمی اور جہالت میں گرفتار ہیں اسی طرح اس جلیل القدر پیغمبر کے برگزیدہ نواسے نے جو تاریخ عالم کا سب سے بڑا مجاہد تھا خلق اور رواداری کی یہی شان کربلا کے میدان میں دکھائی جب کہ وہ ایسی مصیبتوں اور آزمائشوں میں گھرا ہوا تھا جن کی نظیر دنیا کی تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ اس کی تمام عمر عبادت الٰہی اور خدمت خلق میں بسر ہوئی ہے۔ اس کے مخالف وہ لوگ ہیں جنھوں نے نہ صرف اسلام اور انسانیت کو بالائے طاق رکھ دیا ہے بلکہ شقاوت اور ظلم میں درندوں سے بھی کہیں بدتر ہیں لیکن یہ خدا کا محبوب بندہ باوجود اپنے زبردست تقدس اور عظمت کے اپنی انسانی ہمدردی کو زندہ رکھتا ہے اور قاتل کے خنجر کے نیچے بھی سجدے میں پڑا ہوا ان ظالموں کے لئے دعائے مغفرت کرتا ہے! یہ ہے تہذیب اور انسانیت کا انتہائی کمال جس کی پیروی کرنے کی کوشش اور آرزو ہر انسان کو کرنی چاہیئے خصوصاً ان لوگوں کو جنھیں اسلام سے توسل کا دعویٰ اور اس پر فخر ہے۔ کیونکہ خود پیغمبر اسلام نے اپنی بعثت یہی بتائی تھی کہ بعثت لاتمم مکارم الاخلاق (میں اس لئے بھیجا گیا ہوں کہ مکارم اخلاق کی تکمیل کروں) اور لوگوں کو یہ تعلیم دی تھی کہ تخلقوا باخلاق اللہ (خود کو اخلاق الٰہی سے متصف کرو) اخلاق کا یہ تقاضا نہیں کہ انسان ذراسی نیکی کرکے اوچھے برتن کی طرح چھلک پڑے۔ نہ خطاکاروں کے حالات پر غور کرے۔ نہ ان کی نیت معلوم کرنے کی کوشش کرے بلکہ ایک بلند مقام سے ان پر حکم لگانا شروع کردے۔ خدائے تعالیٰ کی نظر میں عزت اس شخص کی ہے جس کو تقویٰ یعنی خوف خدا ہو۔ ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم۔ اور سب سے بڑا گناہ غرور اور تکبر ہے جس نے ابلیس کو جو فرشتوں کا سردار تھا ہمیشہ کے لئے ذلیل و خوار کردیا۔ جو زاہد اپنے زہد اور اتقا پر نازاں ہے اس کی عبادت گذاری کا پیشکش بھی درگاہ الٰہی میں قبول نہیں لیکن ممکن ہے کہ وہ نکتہ نواز اس رند کو سرفراز کردے جو نیازمندی کی شان سے اس کے سامنے جھکتا ہے۔

زاہد غرور کرد و سلامت نہ برد راہ رند از رہ نیاز بدار السلام رفت!

دراصل تہذیب کا مسئلہ عدل اور توازن کا مسئلہ ہے یعنی ہمیں مختلف قوتوں اور مطالبات کے درمیان

بلکہ مختلف اچھی اور مستحسن صفات کے درمیان ایک خاص تناسب قائم کرنا ہے۔ ہم نے ابھی غرور اور نیازمندی کا ذکر کیا ہے۔ اس ضمن میں بھی تہذیب ہم سے بیک وقت دو ایسی صفات کی طالب ہے جو بظاہر ایک دوسرے کی ضد معلوم ہوتی ہیں ایک طرف اس بات کی ضرورت ہے کہ انسان کو بحیثیت انسان ہونے کے اپنی حقیقی وقعت اور عظمت کا احساس ہو اور وہ یہ جانے کہ وہ بےشمار امکانات کا مالک اور حامل ہے جن کو عمل میں لانا اور ان کے ذریعے عالم فطرت کو تسخیر کرنا اس کا فرض ہے۔ سائنس کی ترقی نے انسان کی عقل کو بڑی حد تک توہمات کی زنجیروں سے آزاد کر دیا ہے اور اسے اس کے فطری ماحول پر بہت بڑی قدرت حاصل ہو گئی ہے جو شخص عاجزانہ تقدیر پرستی کا شکار ہو جائے اور اس دنیا میں جو عالم اسباب ہے ہاتھ باندھ کر بیٹھ رہے وہ کوئی مفید کام انجام نہیں دے سکتا۔ ہمارے نزدیک وہ نہ تہذیب یافتہ ہے نہ بن سکتا ہے کیونکہ ہم تہذیب کے فعالی مفہوم کے قائل ہیں اس کو ایک جامد اور مجہول چیز بنانے کیلئے تیار نہیں جب اس میں اس احساس کی بدولت صحیح عزت نفس پیدا ہوتی ہے تو وہ نظام عالم میں اپنی اہمیت کو پہچانتا ہے اور یہ خود شناسی معرفت الٰہی کا زینہ ہے۔ یہ پاس نفس اسی شخص میں پیدا ہو سکتا ہے جس کے اعمال و افعال کی محرک خود اس کی ذات ہو، دوسروں کی تقلید یا خواہش تحسین یا خوف ملامت اس کا راہبر نہ ہو۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ تنگ نظر یا خود غرض یا نفس پرست ہو بلکہ اس سے ہماری مراد یہ ہے کہ اس کے خیالات اور عقائد اس کے اپنے غور و فکر کا نتیجہ ہوں اور وہ یہ جانے کہ بحیثیت انسان کے اسے ایسی آزادی فکر و عمل حاصل ہے جس سے کوئی قوت اسے محروم نہیں کر سکتی۔ جن لوگوں کے جذبات و خیالات اور اعمال و افعال دوسروں کا عکس ہوتے ہیں وہ محض رسم و رواج یا فیشن کے غلام ہو کر رہ جاتے ہیں اور ان میں نہ حقیقی جرأت پیدا ہوتی ہے نہ عزت نفس۔ ایسے شخص کو ہم اپنے نظریے کے مطابق مہذب کہنے کیلئے تیار نہیں ہیں۔

اس عزت نفس کے ساتھ ساتھ جو انسان سے اس کے امکانات کا احترام کراتی ہے، اسے یہ بھی احساس ہونا چاہیئے کہ عالم کائنات کی بے اندازہ وسعت کے مقابلے میں اس کی ہستی بہت چھوٹی اور کمزور ہے اور باوجود اس کی علمی اور عملی ترقی اور انکشافات کے اس کا علم و قدرت دونوں محدود ہیں۔ یہ خیال اس کے دل میں سچا عجز اور انکسار پیدا کرتا ہے جو غلط اور جھوٹی خاکساری سے بہت مختلف ہے۔ اس کی شناخت یہ ہے کہ اس عجز کی وجہ سے انسان کے قوائے عمل معطل نہیں ہو جاتے بلکہ ان کو جد و جہد کی دعوت ملتی ہے لیکن وہ اپنی کامیابی پر غرور نہیں

کرتا۔ نیوٹن جیسے عالم متبحر کا یہ قول کہ "علم کے بحر ذخار کے سامنے میری واقفیت کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی بچہ سمندر کے کنارے بیٹھا ہوا کنکریوں سے کھیل رہا ہو" تہذیب نفس اور مذہبی جذبے پر دلالت کرتا ہے اور سچے عجز کی نہایت عمدہ مثال ہے۔ دنیا میں جس قدر صحیح معنوں میں بڑے آدمی گذرے ہیں ان سب میں یہ بات مشترک تھی کہ انھوں نے اپنی ذات کے متعلق کبھی غرور یا تکبر نہیں کیا' انھوں نے کبھی دوسرے انسانوں کو ذلیل نہیں سمجھا اور ان کے مقابلے میں اپنی فوقیت نہیں جتائی۔ یہ تہذیب اور شرافت کی بہت بڑی پہچان ہے۔ ہر انسان بحیثیت ایک انسان ہونے کے ایک قدر مستقل کا مالک ہے اس لئے کسی کو اپنے علم یا وجاہت یا پرہیزگاری کی وجہ سے یہ حق حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے کو حقیر سمجھے۔ ایسے لوگ' خواہ وہ جلیل القدر پیغمبر ہوں جیسے حضرت عیسیٰ، آنحضرتؐ' یا معاشرتی اور سیاسی رہنما جیسے مہاتما گاندھی' ہمیشہ انسانوں سے ان جیسے انسان بنکر ملتے ان کے پاس آنے' ان سے ملنے جلنے' اپنا دکھ درد اور اپنی کمی اور کمزوری ان کو بتانے میں معمولی سے معمولی آدمی کو بھی باک نہیں ہوتا۔ وہ یہ نہیں کرتے کہ مثلاً بعض انتخاب کے امیدواروں کی طرح مصنوعی اور جھوٹے انکسار سے کام لے کر اپنی بلندی سے اتر کر دوسروں کی سطح پر آئیں بلکہ وہ قدرتاً اور خود بخود دوسروں کو اپنی سطح تک بلند کر لیتے ہیں کیونکہ ان کی انسانیت مصلحت وقت پر مبنی نہیں ہوتی بلکہ ان کے دلی جذبات اور فطری احساسات کا اظہار ہوتی ہے۔ میں کسی ایسے شخص کو مہذب انسان ماننے کے لئے تیار نہیں جو انسانیت کی حرمت کو نہ پہچانے اور تنگ نظری کی وجہ سے خود کو ہمیشہ دوسروں سے بلند تر اور بزرگ تر سمجھے۔ جو شخص تقدس کا دعویٰ کرتا ہے یا اپنی دولت' علمیت' یا وجاہت نسبی کی بنا پر غریبوں' جاہلوں' کم حیثیت لوگوں پر اپنی فوقیت جتاتا ہے وہ نہ صرف تہذیب سے عاری ہے بلکہ اس میں احساس تناسب اور ذوق ظرافت بھی مفقود ہے کیونکہ وہ یہ نہیں محسوس کرتا کہ خدا کی کائنات کس قدر وسیع ہے اور اس کے مقابلے میں اس کے بلند آہنگ دعاوی کیسے مضحک اور مہمل معلوم ہوتے ہیں۔ مذہب ہمیں سکھاتا ہے کہ اس قادر مطلق کی نظر میں ہر قسم کی خدمت کی وقعت اور اہمیت یکساں ہے بشرطیکہ وہ خلوص سے کی جائے' خواہ وہ کسی ملک کی سیاست کا چلانا ہو یا زمین کا کھودنا' مذہب کی تبلیغ کرنا ہو یا سڑکوں اور مکانوں کی غلاظت کو دور کرکے ان کی صفائی کرنا۔ ہم اس بات کی وجہ اور مصلحت نہیں سمجھ سکتے کہ کیوں ایک شخص کے حصہ میں شہرت اور عزت و افتخار کی زندگی

آتی ہے یا کسی مہتم بالشان مقصد کے لئے شہرت اور ناموری کے ساتھ جان دینا اور دوسرے کے حصّہ میں ایک ایسی زندگی جو شروع سے آخر تک اندھیرے میں ٹٹولنے کے مانند ہو اور جس کا انجام گمنامی اور ذلت ہو ہم یہ نہیں جانتے۔ لیکن ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ جو مفید کام بھی خلوص کے ساتھ کیا جائے وہ مقبول ہے اور اس کی وقعت مسلّم۔

لہٰذا ہم تہذیب کے لئے ایک شرط لازم یہ قرار دیتے ہیں کہ ہر انسان اس مشترک انسانیت کے رشتے کا احترام کرے جو اسے دوسروں سے ملاتا ہے اور کسی خارجی یا نمائشی فرق کی وجہ سے خود کو دوسروں سے برتر اور اعلیٰ تر نہ سمجھے۔ نہ ہی اسے کسی شخص کو اس بنا پر حقیر سمجھنے کا حق حاصل ہے کہ اس کے کام کی نوعیت بہت معمولی ہے یعنی یہ کہ مثلاً وہ چمار یا خاکروب یا کمہار ہے۔ ان کاموں کی ضرورت مستقل ہے اور ان کو تہذیب کا مخالف یا اس سے بے تعلق سمجھنا ہمارے نظریہ تہذیب کی رو سے کسی طرح جائز نہیں بے شک یہ نقطۂ نظر تہذیب کے قدیم اور مستند مفہوم کے بالکل خلاف ہے لیکن موجودہ اخلاقی اور فلسفیانہ تحریکات اور بہترین قدیم تعلیمات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہمیں اس بات کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ محنت، مزدوری اور تہذیب میں کوئی لازمی تناقض نہیں۔ گذشتہ زمانوں میں گو بعض لوگوں نے تہذیب کے مفہوم کو ان چند مشاغل تک محدود کر دیا تھا جن میں وہ اپنے ذاتی شوقوں، مثلاً علم کی تحصیل، عبادت گذاری، فنون لطیفہ کی تخلیق و تحسین کی تشفی کرتے تھے اور اس کو دنیاوی کروہات اور عملی زندگی کی کشمکش سے گریز کرنے کیلئے ایک جائے پناہ سمجھتے تھے لیکن تہذیب کا یہ مفہوم نہایت سطحی، نہایت ناقص اور ادھورا ہے اس میں زندگی کا جوشیلا خون بالکل ندارد ہے۔ یہ ایک قسم کی دماغی اور روحانی خود غرضی کا مرادف ہے اور اصلیت کے بجائے بیرونی جلا اور نمائش پر زور دیتا ہے۔ اس مفہوم کی رو سے تہذیب کا سرچشمہ کتابیں اور درسی علوم ہیں اور اس کا مقصد ہے تنہائی میں انفرادی قوتوں کی تربیت کرنا۔ لیکن ہم تہذیب کو بیکار یا بکار معلومات کا مجموعہ ماننے کیلئے تیار نہیں اور یہ ہرگز ضروری نہیں کہ جو شخص مخزن علوم ہو وہ مہذب انسان بھی ہو بلکہ گمان غالب یہ ہے کہ وہ تہذیب سے بے بہرہ رہیگا کیونکہ اس کی دلچسپیوں کا مرکز اس کی اپنی ذات ہوگی یا کتابیں نہ کہ انسانی زندگی اور اس کے وہ تلخ و شیریں تجربات جن کی چاشنی چکھنے کے بعد آدمی انسان بنتا ہے ہمیں بارہا ایسے

لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے جو باوجود عالم اجل ہونے کے تہذیب سے محروم ہوتے ہیں پروفیسر اشپرنگر نے اپنے نظریہ نفسیات میں انسانوں کی جو قسمیں قرار دی ہیں ان میں ایک قسم Der akademische Mensch یعنی نظری انسان کی بھی ہے جو تلاش حق اور طلب علم کو اپنا مقصد حیات سمجھتا ہے اور اس میں بالکل محو ہو فنا ہو جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس قسم کا آدمی قابل قدر ہے اور اپنے نتیجہ کار کی رو سے خدمت خلق کر رہا ہے۔ لیکن بحیثیت ایک معاشرتی فرد کے اگر اس کو اپنے گرد و پیش کے انسانوں سے کوئی دلچسپی نہ ہو۔ اگر وہ ان کے دکھ درد اور مشاغل میں شریک نہ ہو علاوہ علمی معاملات کے اور تمام معاملات کی طرف سے بے اعتنائی کرے، اس کی قوت عمل معطل ہو جائے، وہ انسانی جذبات کا احترام نہ کرے تو ہم اسکو بحیثیت انسان کے بہت ناقص اور تہذیب سے عاری سمجھیں گے۔ تہذیب کا جدید نظریہ یہ ہے کہ اس کی بنیاد کام اور خدمت اور عملی تجربے پر رکھنی چاہیئے نہ کہ کتاب اور نظری علوم پر وہ تہذیب جو افراد میں حقیقی شرافت اور انسانیت کی روح پیدا کرتی ہے محض مطالعہ یا عبادت گذاری یا آرٹ میں انہماک کا نتیجہ نہیں بلکہ خدمت خلق سے محنت سے، دوسرے انسانوں کے ساتھ دوش بدوش کام کرنے، ان کے جذبات و خیالات کو سمجھنے ان سے ہمدردی اور محبت کرنے اور ان کے رنج و راحت میں شریک ہونے سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ تجربات دل کو نرم اور دماغ کو روشن کرتے ہیں۔ کارلائل کا یہ قول مشہور ہے کہ "کام عبادت ہے۔ ہر کام جو خلوص سے کیا جائے برکت کا باعث ہے جس شخص کو یہ برکت نصیب ہے اسے اور کوئی برکت طلب کرنے کی ضرورت نہیں" خدمت بشرطیکہ وہ خلوص اور دانشمندی کے ساتھ کی جائے رحم کی صفت کی طرح "دو چند متبرک ہے" وہ اس کیلئے بھی برکت ہے جو خدمت کرے اور اس کے لئے بھی جس کی خدمت کیجائے اس خدمت کے طفیل علمی کام کرنے والوں میں وہ برتری کا احساس پیدا نہیں ہونے پاتا جو انھیں محنت مزدوری کرنے والوں سے جدا رکھتا ہے اور بیشمار معاشرتی اور اخلاقی خرابیوں کا باعث ہے۔ اسی وجہ سے ہر وہ تحریک جو "تحریک خاکساراں" کی طرح لوگوں میں محنت اور خدمت کے شوق اور صلاحیت کو بڑھائے تہذیب کی اشاعت میں براہ راست مدد دیتی ہے۔

لیکن یہ خیال رکھنا چاہیئے کہ رواداری کا ایک غلط مفہوم وہ بھی ہے جو آج کل رائج ہو گیا ہے اور جو اسکو تقریباً بے اعتنائی کا مرادف قرار دیتا ہے۔ تعلیم یافتہ گروہ میں ایک طبقہ ایسا پیدا ہو رہا ہے جن کے نزدیک کسی

اصول یا عقیدہ کی کوئی اہمیت نہیں نہ تو خود ان کے کوئی پختہ اصول اور عقائد ہیں نہ وہ دوسروں سے ان کے اصول اور عقائد پر اختلاف یا جھگڑا کرتے ہیں ان کے نزدیک سب برابر ہیں اس لئے وہ سب کی طرف سے یکساں بے پروائی کرتے ہیں سو وہ کہتے ہیں کہ ہم اپنے ابنائے جنس پر محتسب بنا کر نہیں بھیجے گئے۔ ہم اپنے بھائیوں کے رکھوالے نہیں ہیں چنانچہ جن امور کے متعلق ارباب فکر شدت کیساتھ ایک دوسرے سے اختلاف کرتے رہے ہیں مثلاً یہ کہ خدا ہے یا نہیں۔ سیاست میں فلاں مسلک صحیح ہے یا کوئی اور اچھوتوں کو حقوق دئیے جائیں یا نہیں۔ عورتوں کا نظام معاشرت میں کیا مرتبہ ہے، انسان کی زندگی کا منشا جلب منفعت ہے یا خدمت خلق۔ ان سب مسائل کی ان کے نزدیک کوئی خاص وقعت نہیں۔ ان کا اصول یہ ہے کہ ہر شخص کو اپنی زندگی اپنے خیال کے مطابق بسر کرنی چاہیئے دوسروں سے بحث و مباحثہ کرنا مناسب نہیں لیکن یہ حقیقی رواداری نہیں۔ یہ ذہنی رویّہ فلسفہ تشکیک پر مبنی ہے جس کو بعض مفکرین نے بہت وقعت دی ہے۔ مگر اس کو عقلی آزادی اور آزادخیالی سمجھنا بہت بڑی غلطی ہے اس رویے کے اصلی معنی یہ ہیں کہ اس نام نہاد متشکک نے کوئی خاص نظام اقدار، کوئی معیار زندگی قائم نہیں کیا اس کی زندگی کسی زبردست مقصد کے ساتھ وابستہ نہیں۔ ہم جس رواداری کے خواہاں ہیں وہ عقائد کی پختگی کے منافی نہیں۔ اس کیلئے صرف یہی شرط ہے کہ وہ عقائد ہماری ذہنی آزادی اور غور وفکر معطل نہ کریں۔ اس شرط کے ساتھ عقائد کی پختگی تشکیل و تنظیم حیات کے لئے لازم ہے۔ یہی رواداری کی تعریف یہ ہے کہ ہم زندگی کے اہم مسائل کے متعلق اپنے مخصوص خیالات اور عقائد رکھتے ہیں اور خلوص کے ساتھ ان پر کاربند ہیں لیکن عقلاً اور عملاً دوسروں کے اس حق کو تسلیم کرتے ہیں کہ وہ ہم سے بالکل مخالف خیالات اور عقائد رکھتے ہوں ہم اپنی رائے کو جوش اور قوت کے ساتھ دوسروں کے سامنے پیش کرتے اور انھیں اپنا ہم رائے بنانا چاہتے ہیں لیکن اس کے باوجود ہم خندہ پیشانی اور بردباری کے ساتھ ان کی بالکل مخالف رائے کو سننے اور اس پر غور کرنے کے لئے تیار ہیں اور اس اختلاف رائے کی وجہ سے ہمارے باہمی تعلقات میں تلخی یا ناگواری پیدا نہیں ہوتی۔ اس ذہنیت کی تربیت کے لئے یہ لازم ہے کہ ہم افراد میں تجسس کا مادہ اور شوق کی وہ تازگی اور بیداری قائم رکھیں جو بچپن کا خاصہ ہے لیکن ناسازگار ماحول کی وجہ سے ابتدائی عمر میں

دب جاتی ہے اور لوگوں پر قبل از وقت کہولت طاری کر دیتی ہے جس طرح یہ بات تہذیب کے مطالبات
کے خلاف ہے کہ ہم بجبر اپنے خیالات دوسروں پر عائد کریں اسی طرح یہ بھی تہذیب کے منافی ہے کہ ہم اپنے
یا دوسروں کے خیالات اور عقائد کے بوجھ میں دب کر نئے خیالات اور نئے حقائق کا استقبال نہ کر سکیں۔
ہندوستانیوں پر تو خاص کر کے قبل از وقت کہولت طاری ہو جاتی ہے اور دماغی جدت اور جولانی کا
مادہ باقی نہیں رہتا جس طرح نوعمری کی شادی یا ملازمت جسمانی شباب کی موت ہے اسی طرح عقائد اور
خیالات کا اس طرح جامد ہو جانا کہ انسان میں سوچنے اور غور کرنے کا مادہ نہ رہے اور وہ ہر نئی بات سے
گھبرائے ذہنی شباب کا خاتمہ ہے۔ ایمان اور عقیدے کی اہمیت تسلیم۔ لیکن انسان کو کسی طرح یہ مناسب نہیں
کہ وہ آنکھوں پر اندھیریاں لگا کر زندگی بسر کرے، اسے تو شہید جستجو ہونا چاہیئے۔

ہمہ ساز ناتمام ہمہ سوز آرزو یم ۔۔۔۔ بگماں دہم یقیں را کہ شہید جستجو یم

ہم نے تہذیب کا جو مفہوم مندرجہ بالا صفحات میں پیش کیا ہے اس کے ضمن میں ایک دلچسپ
سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا ایک پرجوش اور سرگرم مجاہد تہذیب یافتہ ہو سکتا ہے یا نہیں۔ مجاہد سے
یہاں ہماری مراد وہ شخص ہے جو کسی خاص مقصد کی حمایت یا تحصیل میں اس درجہ منہمک ہو جائے
کہ اس کے لئے اور تمام چیزوں کو قربان کرنے کو تیار ہو اور اسے اس انہماک میں اتنا غلو ہو کہ وہ اور تمام
مفاد اور اغراض کو نظر انداز کر دے۔ اس ذیل میں صرف جنگجو سپاہی ہی شامل نہیں بلکہ وہ تمام لوگ بھی جو
کسی نیک اور مفید کام میں مثلاً علم کی تحصیل یا مذہب کی اشاعت اور حمایت یا سیاسی مقاصد کیلئے اپنا تن من
دھن نثار کر دیتے ہیں۔ اس قسم کے لوگ یقیناً قابل احترام ہیں اور دنیا میں اکثر بڑے بڑے کاموں کو ایسے ہی
لوگوں نے انجام دیا ہے جن کو کسی ایک خیال کی دھن ہو جاتی ہے کسی ایک چیز سے اس درجہ شغف ہو جاتا کہ
وہ جنون کی حد تک پہنچ جائے۔ کامیابی کے لئے اکثر مفید ثابت ہوتا ہے۔ مجاہد کی بعض خوبیاں ایسی ہیں جنکا
ہم اعتراف کرتے ہیں اور ان کو تہذیب کا لازم جزو سمجھتے ہیں اس میں عقیدہ کی پختگی ہوتی ہے۔ جب اسے یہ
یقین ہو جاتا ہے کہ وہ ایک معاملہ میں حق پر ہے تو وہ اس پر ثابت قدم رہتا ہے اور اس کے لئے ہر قسم کا ایثار
کرنے کو تیار رہتا ہے ہم اس کے ایثار اور یکجہتی کی قدر کرتے ہیں۔ اس کے لئے اعلیٰ جرأت درکار ہے جس میں

جسمانی، دماغی اور اخلاقی جرأت تینوں شامل ہیں۔ اس کو تکلیفوں اور مخالفتوں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے اور اکثر سوسائٹی کی ناپسندیدگی اپنے سر لینی پڑتی ہے لیکن وہ اس کی پرواہ نہیں کرتا۔ برخلاف اس کے جو آدمی بزدل اور ڈرپوک ہوتا ہے وہ جسمانی تکلیف یا معاشرتی مخالفت یا ذہنی تنہائی کے خوف سے اپنے مستحکم عقیدے کو ترک کر دیتا ہے۔ اس شخص میں تہذیب کی صفات پیدا ہونی بہت مشکل ہیں۔ لہذا جرأت کو ہم تہذیب کیلئے ایک شرط لازم قرار دیتے ہیں بشرطیکہ اس میں اخلاقی جرأت کی یہ شان بھی ہو کہ جب انسان اپنی کوئی غلطی محسوس کرے یا دوسرا اس کی غلطی محسوس کرائے تو وہ بے کم و کاست اپنی غلطی کا اقرار کرے اور جھوٹی شرم سے مغلوب نہ ہو جائے۔ یہ جرأت کی سب سے اعلیٰ شکل ہے جو گویا انسان کو خود اپنی ذات کے خلاف دکھانی پڑتی ہے۔ اس کے لئے بڑے دل اور جگر کی ضرورت ہے کیونکہ اکثر لوگ عزت نفس کا ایک غلط مفہوم اپنے ذہن میں قائم کر کے اس کے غلام ہو جاتے ہیں اور اپنی جگہ سے ہٹنے یا اپنی غلطی تسلیم کرنے کو کسر شان سمجھتے ہیں خصوصاً ان لوگوں کے لئے یہ بات بہت مشکل ہے جن کو عام طور پر بڑا آدمی سمجھا جاتا ہے اور جنکی تمام حرکات اور افعال عوام کی نظر میں رہتے ہیں۔ بہرحال اس جرأت کا اپنے میں پیدا کرنا، ہر کام کو جوش، خلوص اور انہماک کے ساتھ انجام دینا، مشکلات کے سامنے ہتیار نہ ڈالنا، مجاہد کی صفات ہیں اور ان کی ہمیں دل سے عزت کرنی چاہیئے۔

لیکن یہ مجاہدانہ صفات بجائے خود ایک شخص کو ہمارے خیال میں مہذب نہیں بنا سکتیں تہذیب کا مطالبہ یہ ہے کہ انسان زندگی کے تمام پہلوؤں پر ایک ہمہ گیر نظر ڈال سکے، اس کی طبیعت میں توازن ہو۔ جب اس کے سامنے کوئی معاملہ درپیش ہو تو وہ اس کے تمام رخوں پر غور کرنے اور تمام متعلقہ اشخاص اور واقعات کو جانچنے کے بعد کوئی طریقۂ عمل اختیار کرے۔ حقوق اور مطالبات کے اسی توازن کو مذہب اور فلسفہ نے عدل کے نام سے تعبیر کیا ہے۔ "اعدلوا ھو اقرب للتقویٰ"۔ مجاہد اکثر معاملہ کا ایک ہی رخ دیکھتا ہے اور یہ وہ رخ ہوتا ہے جس سے اس کو بہت گہری ذاتی دلچسپی ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ نظر کی یکجہتی سے اس کی قوت عمل دوچند بلکہ چہار چند ہو جاتی ہے لیکن وہ عقل سلیم سے کام نہیں لیتا اور اکثر انجام کار نقصان اٹھاتا ہے۔ اس کی مثالیں ہمیں اپنے تجربے میں اکثر ملتی رہتی ہیں۔ علم کے مجاہد کا ذکر

ہو جاتا ہے جو طلب علم میں اس درجہ محو ہو جاتا ہے کہ انسانی حقوق کی اس کو شناخت نہیں رہتی اور وہ اپنے معاشرتی فرائض کو ادا نہیں کرتا۔ اسی طرح بعض مذہبی مجاہد ہوتے ہیں جو اپنے خیالات کی تبلیغ اور انکی حمایت میں اس قدر منہمک ہو جاتے ہیں کہ ان میں احساس تناسب باقی نہیں رہتا وہ ہر ہر نقطے اور شوشے کی غلطی کو کفر کا مرادف سمجھتے ہیں کسی قسم کے اختلاف کے روادار نہیں ہوتے جو شخص ان سے اختلاف کرتا ہے اسے عذاب ابدی کا سزاوار قرار دیتے ہیں۔ دوسرے مذاہب اور ان کے پیروؤں کی بے حرمتی اور دل آزاری کرتے ہیں اور اس کو باعث ثواب سمجھتے ہیں ان میں محبت ہمدردی اور رواداری کے سوتے خشک ہو جاتے ہیں۔ ممکن ہے کہ ان میں سے بہت سے لوگ نیک نیتی کے ساتھ یہ سب کچھ کرتے ہوں لیکن اس قدر غلو اور تعصب اور آنکھوں کو تقریباً بند کر لینا نہ صرف تہذیب اور انسانیت کے منافی ہے بلکہ روح مذہب کے بھی خلاف ہے بیشک حق پر ہونا بہت اچھا ہے، اس کی اشاعت نہایت ضروری ہے۔ اس کے لئے ایثار اور قربانی کرنا بہت بڑی قابل تعریف بات ہے لیکن انسان کے دل میں جو خطا اور نسیان کا پتلا ہے کبھی یہ خیال بھی تو آئے کہ ممکن ہے وہ غلطی پر ہو یا اگر غلطی پر نہیں تو ممکن ہے وہ بھی راستی پر ہو اور دوسرے لوگ بھی کیونکہ خدا کی وسیع خدائی میں اکثر ایک ہی منزل مقصود تک پہنچنے کے ایک سے زیادہ راستے ہو سکتے ہیں۔ اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے مکمل تہذیب یافتہ انسان میں مجاہد کا سا عزم اور حوصلہ اور جرأت اور ایثار اور قوت عمل ہو، وہ اپنے مشاغل اور فرائض کو جوش اور انہماک کے ساتھ انجام دے لیکن اپنے احساس تناسب، اپنے توازن کو قائم رکھے اور عقل اور جذبات کے تقاضوں کو عمل کی یورش میں نظرانداز نہ کرے۔ کسی ایک خیال کے اوٹ میں تمام دنیا اس کی نظر سے اوجھل نہ ہو جائے۔ مجاہدوں کے لئے بہترین مثال تاریخ اسلام کے مجاہد اعظم امام حسین علیہ السلام کی ہے جنھوں نے باوجود اپنے شوق شہادت کے، باوجود راہ خدا میں سرفروشی کرنے کے، باوجود انتہائی مظالم اور تکالیف برداشت کرنے کے حقوق العباد کو بھی کماحقہٗ ادا کیا اور عدل و تہذیب اور انسانیت کی ایک ایسی مثال قائم کر دی جو ہمیشہ دنیا کے لئے شمع ہدایت بنی رہے گی۔

یونان قدیم کے مفکرین نے ان صفات کو جو تہذیب کے کمال کے لئے لازمی ہیں ایک لفظ sophrosyne سے ادا کیا ہے۔ اس لفظ کی بالکل ٹھیک تشریح کرنی مشکل ہے "اعتدال" اس کا

ایک جزو ضرور ہے لیکن اس صفت کو پوری طرح ظاہر نہیں کرتا۔" حیا اور خاکساری، جس حد تک بیجا تہور، اور ادعائے خودی اور خودنمائی کو روکتی ہیں اس میں شامل ہیں لیکن اس کے کل مفہوم پر محیط نہیں۔ یہ سکون سے بھی بڑھ کر ہے اگرچہ سکون اس کا ایک جزو ضرور ہے۔ اس میں بے نفسی بھی شامل ہے اور ایک ایسا معیار اقدار جو گھٹیا درجے کی خوشیوں اور فائدوں کو حقیر سمجھے۔ اس میں اعتدال اور ضبط نفس کی جو شان مضمر ہے وہ کسی بیرونی جبر یا دباؤ سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ آزادی اور اس کے صحیح استعمال کا ثمر ہوتی ہے۔ سر آرتھر کوئلر کوچ نے اپنے ایک لکچر میں اس کا ترجمہ "Assured mental grace" کیا ہے۔ ان کی رائے ہے کہ جس شخص میں یہ صفت ہوتی ہے وہ اپنی قابلیت کی حدود سے واقف ہوتا ہے۔ اسے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا ہر قسم کے لوگوں سے مل کر بنتی ہے۔ اس کو اپنی جگہ پر خاموشی اور اطمینان کے ساتھ اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ وہ اپنی علمی تربیت کی بدولت ہر علم دوست حلقے میں شریک ہو کر مستفید ہو سکتا ہے۔ لیکن جب وہ وہاں سے گھر جاتا ہے تو وہ عقل مند ترین لوگوں کے قول کو بھی فیصلہ کے لئے اپنے ضمیر کے سامنے پیش کرتا ہے کیونکہ اس کا ضمیر اور اس کے دل و دماغ اپنے ہیں جن میں صلاحیت اور سمجھ ہے اور وہ جانتا ہے کہ خواہ وہ اپنی صلاحیتوں کو کتنی ہی کسر نفسی کے ساتھ جانچے اس کا فرض ہے کہ وہ معاملات کو خود سمجھے اور ان پر غور کرے۔ اس بیان سے یہ واضح ہو گیا ہوگا کہ تہذیب کے مفہوم میں ہمہ گیری، سکون اور عزت نفس شامل ہیں اور ہر قسم کا اوچھا پن، جھوٹی شیخی اور جھوٹی کسر نفسی تہذیب حقیقی کے منافی ہیں۔ اس مفہوم کی ایک عملی اور شخصی مثال حالی کے لاثانی اور غیر فانی مرثیہ غالب میں مل سکتی ہے۔

بلبل ہند مر گیا ہیہات	جس کی تھی بات بات میں اک بات
نکتہ داں نکتہ سنج نکتہ شناس	پاک دل پاک ذات پاک صفات
شیخ اور بذلہ سنج شوخ مزاج	رند اور مرجع کرام و ثقات
لاکھ مضمون اور اس کا ایک ٹھول	سو تکلف اور اس کی سیدھی بات

خاکساروں سے خاکساری تھی	سربلندوں سے انکسار نہ تھا

لب پہ احباب سے بھی تھا نہ گلہ　　دل میں اعداء سے بھی غبار نہ تھا
بے ریائی تھی زہد کے بدلے　　زہد اس کا اگر شعار نہ تھا
مظہر شان حسن فطرت تھا
معنی لفظ آدمیت تھا

تہذیب یافتہ انسان کی ایک اور امتیازی صفت یہ ہے کہ اس کے لئے ہر نیا تجربہ علم و حکمت کا ایک خزانہ ہوتا ہے جس سے اس کی دانشمندی، اس کی بردباری، اس کی انسانیت میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس کے لئے تجربات کی مثال ایسی نہیں جیسے کسی فائل میں بہت سے کاغذات شامل کر دئے جائیں بلکہ وہ اس کی وسعت پذیر شخصیت میں زیادہ گہرائی اور معنویت پیدا کرتے ہیں وہ ناگوار تجربات پر بھی چیں بجبیں نہیں ہوتا، نظام عالم اور خالق عالم کو الزام نہیں دیتا بلکہ ان سے بھی سبق اور استحکام حاصل کرتا ہے اس کے لئے دکھ سکھ سے زیادہ سبق آموز بن جاتا ہے کیونکہ مصیبت اور رنج کی آزمائش میں پڑ کر اس کی طبیعت میں زیادہ نرمی، زیادہ ہمدردی اور زیادہ سمجھ پیدا ہو جاتی ہے۔

غم جوانی کو جگا دیتا ہے لطف خواب سے　　ساز یہ بیدار ہوتا ہے اسی مضراب سے

اس لئے انسان کی تہذیب اور تربیت میں ہر تجربہ خواہ وہ ناگوار ہو یا خوشگوار معین ہوتا ہے مرغ اور ہد ہد کے قصے میں جس کو اقبال نے نظم کیا ہے اسی طرف اشارہ ہے:

مرغکے ز آشیانہ بسیر چمن پرید　　خارے ز شاخ گل بہ تن نازکش خلید
بدگفت فطرت چمن روزگار را　　ہم سوز خود و ہم ز غم دیگران تپید
گفت اندریں سرا کہ بنایش فتادہ کج　　صبحے کجا کہ چرخ در و شامہا نچید

یہ مرغ تہذیب سے عاری تھا اور یہ نہیں جانتا تھا کہ دکھ درد مصیبت کو کس طرح معین کار بنایا جا سکتا ہے۔ ایک تجربہ کار اور رمز شناس ہد ہد نے اس کی نالہ وزاری کو سن کر اس پر رحم کھایا اور کانٹے کو نکال دیا لیکن اس کے ساتھ ہی یہ زریں نصیحت بھی کی جو غور کے قابل ہے:

گفتا کہ سود خویش ز جیب زیاں بیار　　گل از شگاف سینہ زر ناب آفرید

درماں زود رو ساز اگر خستہ تن شوی　　　خوگر بخار شو کہ سراپا چمن شوی

عام لوگوں کی زندگی تو ذرا ذرا سی آزمائشوں اور تکلیفوں سے تلخ اور بے کیف ہوجاتی ہے لیکن وہ اہل دل اور اہل نظر جن کو قدرت کی طرف سے نفس مطمئنہ ملا ہے اور جنھوں نے اصلی تہذیب کو حاصل کیا ہے انھیں تجربات کی بنا پر بلند سے بلند تر ہوتے جاتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ تہذیب کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو ایک مکان یا زمین کی طرح کسی شخص کی ملکیت ہوسکے۔ وہ تو ایک خاص انداز سے زندگی بسر کرنے کا نام ہے جس کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ انسان اپنے تمام تجربوں کی مسلسل تنظیم و تشکیل کرتا رہے اور ان کی مدد سے پرانی چیزوں سے بھی نیا لطف اور کیف حاصل کرے بقول امریکہ کے معلم اعظم ڈیوی (Dewey) کے تہذیب کے معنی یہ ہیں کہ انسان میں یہ صلاحیت ہمیشہ بڑھتی رہے کہ وہ ہر چیز سے زیادہ وسیع اور زیادہ گہرے معانی حاصل کرسکے یہی وجہ ہے کہ اگر ایک تہذیب یافتہ شخص جس کے ذوق جمال کی تربیت ہوئی ہے تاج محل کو دیکھتا ہے تو اسے اس عمارت میں ایک ایسا جہان حسن و جمال دکھائی دیتا ہے جو ایک ناواقف بچے یا ایک جاہل بالغ کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آسکتا۔ یہی حالت ہر قسم کی تحسین اور لطف اندوزی کی ہے۔ تہذیب خود انسان کی ذات اور اس کے مذاق میں ایسی معنویت پیدا کردیتی ہے کہ بہت سی چیزیں جو دوسروں کو معمولی نظر آتی ہیں اس کے لئے سرمایۂ مسرت و تحسین ہوتی ہیں۔ ورڈسورتھ کا قول ہے کہ ہرے بھرے جنگل کی ہوا کا ایک جھونکا ہمیں انسان اور خیر و شر کے متعلق وہ باتیں سکھا سکتا ہے جو دنیا کے تمام دانشمند مل کر بھی نہیں بتا سکتے۔ لیکن اس جھونکے کے پیغام کو سمجھنا ہر شخص کا کام نہیں اس کے لئے صاحب دل اور صاحب نظر ہونا شرط ہے۔ اس لئے سعدی نے اپنے شعر میں "نظر ہوشیار" کی شرط لگادی ہے

برگ درختاں سبز در نظر ہوشیار　　　ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

لیکن جس طرح یہ تہذیب یافتہ انسان ایک طرف معمولی چیزوں میں معنویت اور دل آویزی ڈھونڈھ نکالتا ہے اسی طرح وہ معیار اقدار کی رو سے بہت سی ان چیزوں کو حقیر سمجھتا ہے جو عوام الناس کے لئے بہت قیمتی ہیں اور جن کے لئے وہ تمام عمر جد و جہد کرتے ہیں اور حق تلفی اور ظلم کے

مرتکب ہوتے رہتے ہیں مثلاً دولت شہرت، اعزاز و خطابات۔ وہ ان کے لئے اپنا سکونِ قلب اور قناعت کھونے کو تیار نہیں ہوتا بلکہ لوگوں کی مجنونانہ جد و جہد پر ہنستا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ وہ دنیاوی قوت اور عزت کے لئے ایک حد تک جد و جہد کرے کیونکہ ہم تہذیب کو ترکِ دنیا کا مرادف نہیں سمجھتے لیکن وہ اس کشمکش میں ہرگز اس درجہ منہمک نہیں ہوتا کہ اپنے احساسِ تناسب اور ذوقِ ظرافت کو کھو بیٹھے اور جن چیزوں کی حیثیت محض ذرائع کی ہے ان کو مقصدِ زندگی بنا لے۔

آخر میں ہمیں اس مسئلہ سے بحث کرنی چاہیئے کہ ہمارے نقطۂ خیال کے مطابق منشائے حیات کیا ہے اور ہمارے نزدیک تہذیب یافتہ انسان کا رویہ اس بارے میں کیا ہونا چاہیئے۔ جن لوگوں کی تمام تر امیدیں اسی دنیا کے ساتھ وابستہ ہیں، جن کا خیال ہے کہ چراغِ حیات گل ہو جانے سے انسان کی روح اور شعور و احساس بھی فنا ہو جاتے ہیں ان کا تو اعتقاد لازماً یہی ہونا چاہیئے کہ مدتِ حیات کو غنیمت جان کر انسان کو جو کچھ لینا، حاصل کرنا اپنے قبضہ اور تصرف میں لانا ہے اس کو لے لے۔ اس لحاظ سے انسان کا فرض اور مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ دنیا کی جس قدر نعمتوں پر قبضہ کر سکے کرے اور کنجوسوں کی طرح جب تک ممکن ہو ان پر قبضہ کئے بیٹھا رہے اور ان کو صرف نہ کرے۔ زندگی کے اس نظریہ کی مختلف مثالیں ہمارے چاروں طرف موجود ہیں۔ معاشی زندگی میں سرمایہ داری کا نظام، سیاست میں ملک گیری اور اقلیم رانی کی ہوس، معاشرتی تعلقات میں تنگ نظری اور خود غرضی یہ سب اس مفروضے پر قائم ہیں کہ انسان بالطبع خود غرض ہے وہ لینا چاہتا ہے، ذخیرہ کرنا چاہتا ہے۔ اس کو دینا، خرچ کرنا ناگوار ہوتا ہے۔ ملکیت اس کی جبلت ہے، خدمت اس کی فطرت کا جزو نہیں اس کے برخلاف دوسرا نظریہ زندگی وہ ہے جو بہترین انسانوں کا ہمیشہ رہا ہے۔ اس کی رو سے زندگی امانتِ الٰہی ہے جس کو خدا کی راہ میں فیاضی کے ساتھ بسر کرنا چاہیئے انسان کو مختلف قوتیں اس لئے دی گئی ہیں کہ وہ انھیں اعلیٰ انسانی مقاصد کی خدمت میں صرف کرے یہ نظریہ نفس پرستی اور عیش پسندی کے بجائے خدمت اور ایثار کی تعلیم دیتا ہے اور لوگوں کو یہ سکھاتا ہے کہ وہ اپنی ذات کو اور اپنی تمام قوتوں کو ایک کنجوس دولتمند کی طرح مقفل کر کے نہ رکھیں بلکہ ان کو بیدریغ رفاہِ عام کے لئے صرف کریں کیونکہ جس طرح علم خرچ کرنے سے کم نہیں ہوتا بلکہ بڑھتا ہے اسی طرح انسان

کی اخلاقی اور روحانی قوتوں کو خدمت کے ذریعے اور زیادہ فروغ حاصل ہوتا ہے جو لوگ اپنے نفس کو رضائے الہی کی خاطر بیچ ڈالتے ہیں وہی اس کی اصلی قیمت حاصل کرتے ہیں کیونکہ بقول حضرت عیسیٰ کے "وہی شخص اپنی روح کو پائے گا جو اسے کھو دینے کے لئے تیار ہو"۔ اس لحاظ سے اسلامی تعلیم قدیم اور جدید مغربی تعلیم اور فلسفہ پر بہت نمایاں فوقیت رکھتی ہے خواجہ غلام الثقلین مرحوم نے عصر جدید میں ایک مضمون "تعلیم کی ظاہری غرض اور انتہائی مقصد" کے عنوان سے لکھا تھا جس میں انھوں نے اس امر سے بحث کی ہے کہ منشائے حیات اور منتہائے تعلیم کے بارے میں مغربی اور اسلامی نقطۂ نظر میں کیا فرق ہے؟ "جدید تعلیم یا مغربی فلسفہ قرار دیتا ہے کہ اعلیٰ خود غرضی اخلاق کی بنیاد ہے۔ اعلیٰ خود غرضی سے مراد یہ ہے کہ عقل دوراندیش اپنی غرض اور مصلحت کو سمجھے۔ یہ نہیں کہ جس بات سے آج آرام و آسائش معلوم ہوتی ہے اور کل کو اپنے لئے اور اپنی اولاد کے لئے اس سے ضرر ہو اس کو انسان اچھا سمجھ کر کرنے لگے۔ یہ تو ادنیٰ غرض ہے اسلامی تعلیم یہ کہتی ہے کہ شخصی اور نوعی غرض بالکل جائز اور بجا ہے مگر وہ ادنیٰ درجہ کی ہے۔ اصلی انسانیت کا معیار یہ ہے کہ ذاتی خواہشوں کو مشیت ایزدی اور قوانین کل کے تابع کر دے۔ یا ایھا الذین آمنوا انفقوا مما رزقنکم من قبل ان یاتی یوم لا بیع فیہ ولا خلۃ ولا شفاعۃ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام یہ چاہتا ہے کہ انسان اپنی کل قوتوں اور دولت کو یہاں خرچ کرے کہ یہ زندگی اسے اس لئے دی گئی ہے کہ وہ اپنے عمل، سعی اور ایثار سے حیات ابدی حاصل کرے۔ جو لوگ اس اصول کو نہیں سمجھتے اور خدا کی دی ہوئی قوتوں اور نعمتوں کا صحیح استعمال نہیں کرتے وہ کافر یعنی ناشکرے اور ظالم ہیں اور تاریکی میں ہیں۔۔۔۔ جدید تعلیم سکھاتی ہے کہ کھاؤ پیو اور خوش رہو کیونکہ کل تم مر جاؤ گے۔

نوروز و نو بہار و مے و دلبرے خوش است — بابر بعیش کوش کہ عالم دو بارہ نیست

اسلامی تعلیم کہتی ہے کہ کھاؤ پیو مگر حالت اعتدال سے نہ نکلو کیونکہ بے اعتدال اور بیجا کام انسانیت کی موت ہے" (عصر جدید جلد ۹) ہم نے جس تہذیب کی تعریف اور تشریح اس مضمون میں کی ہے وہ قطعی طور پر تنگ نظری، خود غرضی اور خود پسندی کے منافی ہے اور انسان سے یہ مطالبہ کرتی ہے کہ وہ اپنی قوتوں کو بہترین اور بلند ترین مقاصد انسانی کے لئے صرف کرے اور ان کی تحصیل کے لئے فرد، دوروں کی

طرح کام کرے۔ ہم تہذیب کو عیش نصیب اور فرصت پسند لوگوں کا مشغلہ تفریح بنانے کے لئے تیار نہیں ہیں ایسے انسانوں کی ضرورت ہے جو عقل سلیم اور سلامت روی کے ساتھ اپنے تمام حقوق و فرائض پر ہمہ گیر نظر ڈال سکیں اور ان کو خلوص اور انہماک کے ساتھ پورا کریں۔

میں اس مضمون کو ختم کر کے اس پر نظر ڈالتا ہوں تو میرے دل میں دو مختلف خیالات پیدا ہوتے ہیں کبھی تو مجھے خیال ہوتا ہے کہ میں نے تہذیب نفس کیلئے جن صفات کو لازم قرار دیا ہے وہ سب متفق علیہ ہیں میں نے کوئی بات ایسی نہیں کہی جس پر کسی قدامت پسند شخص کو بھی اعتراض ہو۔ رواداری، عدل، ذہنی آزادی، دلچسپیوں کی بیداری، زندگی کو امانت الٰہی سمجھنا، کام کو خدا کی نعمت خیال کرنا، اس کو عار نہ سمجھنا، یہ تمام چیزیں ایسی ہیں جنکو کم از کم نظری طور پر ہر زمانہ میں لوگوں نے تسلیم کیا ہے لیکن اسکے ساتھ ہی یہ خیال بھی پیدا ہوتا ہے کہ میں نے تہذیب کے مروجہ مفہوم کا کماحقہٗ احترام نہیں کیا میں نے تہذیب یافتہ لوگوں کی شان میں بہت سی گستاخیاں کی ہیں ان سے کام اور محنت کا مطالبہ کیا ہے ان کے احساس خودی کو ٹھیس لگائی ہے اور انھیں انکے مقام علیین سے اتار کر معمولی جاہل اور ناشائستہ مزدوروں اور کسانوں کی صف میں لاکر کھڑا کر دیا ہے ان کے دل میں یہ شک پیدا کرنیکی کوشش کی ہے کہ وہ بالکل معصوم اور بے خطا نہیں ہیں بلکہ ممکن ہے وہ کسی معاملے میں غلطی پر ہوں۔ میں نے فنون لطیفہ، علمیت، مذہبیت اور شائستگی پر زیادہ زور دینے کے بجائے انسانیت پر زیادہ زور دیا ہے میں نہیں کہہ سکتا کہ اس تمام بیان سے تہذیب یافتہ انسان کی جو تصویر مرتب ہوتی ہے وہ اتنی دلکش اور نظر فریب ہے یا نہیں جیسی اس کی روایتی تصویر۔ لیکن مجھے یہ یقین ہے کہ تہذیب کا یہ مفہوم زیادہ مفید زیادہ پائیدار اور زیادہ عملی ہے۔ اس کے لئے یہ شرط نہیں کہ انسان خاص طور پر خوش نصیب ہو اور اس کے حالات غیر معمولی ہوں بلکہ اس تہذیب کی شان ہر شخص اپنے اندر پیدا کر سکتا ہے۔ جو خلوص اور ہمت کے ساتھ اس پر آمادہ ہو۔

معاہدۂ عمرانی[1]

"انسان آزاد پیدا ہوا ہے مگر جدھر دیکھو وہ پابزنجیر ہے" ان الفاظ کے ساتھ روسو اپنی کتاب "معاہدۂ عمرانی" شروع کرتا ہے۔ آزادی، مساوات، حکومت عوام، ایسے تخیلات نہیں جن سے دنیا روسو سے پہلے آشنا نہ ہو۔ روسو کا کارنامہ یہ ہے کہ اُس نے انھیں انسان کا "حق" ثابت کیا اور کسی چیز کو خیرات کے طور پر مانگنے اور حق کے طور پر طلب کرنے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

روسو کو فرانسیسی انقلاب کا "روحانی باپ" کہا جاتا ہے۔ اگر اس سے مراد یہ ہے کہ یہ انقلاب نتیجہ تھا محض روسو (یا دوسرے فلسفیوں) کے سیاسی نظریوں کا تو اس میں بلا شبہ مبالغے کو دخل ہے۔ اس طرح کے انقلاب کتابوں کے ذریعہ رونما نہیں ہوا کرتے۔ وہ نتیجہ ہوتے ہیں حقیقی آلام و مصائب کا اور اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ فرانس میں انقلاب سے پہلے معاشی اعتبار سے جمہور انتہائی افلاس اور سیاسی نقطۂ نظر سے حد درجہ کی غلامی کا شکار تھے۔ البتہ روسو نے اپنے عہد کی نبض کو خوب پہچانا جو کچھ لوگوں کے دلوں میں تھا وہ روسو کی زبان قلم پر آیا۔ قوم اپنے آپ کو بے بس اور لاچار خیال کرتی تھی۔ روسو نے اُسے یقین دلایا کہ وہ تو خود تمام تر دنیاوی اقتدار کا منبع ہے۔ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ روسو کی تصنیف "معاہدۂ عمرانی" فرانسیسی انقلاب کے علمبرداروں کے لئے آسمانی کتاب بنی اور انھوں نے "حقوق انسانی" کے تخیل سے فرانسیسی بادشاہت مطلقہ اور نظام جاگیرداری کا قلع قمع کرنے میں انمول مدد لی۔

روسو زندگی اور سوسائٹی کو مظلوم، کمزور اور فاقہ کش انسان کی نظر سے دیکھتا ہے۔ سیاسی

---

[1] ڈاکٹر محمود حسین صاحب نے روسو کے Contrat Social کا ترجمہ اردو میں کیا ہے، یہ مضمون اس کا مقدمہ ہے۔ ترجمہ اردو اکادمی سے شائع ہونے والا ہے۔ (مدیر)

عدم مساوات ہی نہیں، معاشرتی عدم مساوات بھی اس کی آنکھ میں کانٹے کی طرح چبھتی ہے۔ اس کے نزدیک ایک بڑا جاگیردار جو لوگوں کا پیٹ کاٹ کر انھیں مفلس بنائے اسی قدر قابل نفرین ہے جتنا ایک مطلق العنان بادشاہ جوان کے گلے میں غلامی کا طوق ڈالے۔

روسو جن حالات اور جس گردوپیش میں پیدا ہوا اور جن جن مصیبتوں، دشواریوں اور ناکامیوں سے اُسے اپنی زندگی میں بچپن ہی سے دوچار ہونا پڑا، ان کا پورا پورا عکس اس کے خیالات میں نظر آتا ہے۔ اور اس وجہ سے خاص طور پر ضروری ہے کہ روسو کے فلسفے پر غور کرنے سے پہلے اس کے سوانح حیات پر ایک نظر ڈال لی جائے۔

زندگی | ژاں ژاک روسو کا تعلق ایک ایسے فرانسیسی خاندان سے تھا جس کے ارکان کو سولھویں صدی کے وسط میں پیرس سے جینوا ہجرت کرنی پڑی۔ وہ اپنے پروٹسٹنٹ مذہب کو خیرباد کہنے کے لئے تیار نہ تھے اور اس صورت میں ان کے لئے یہی مناسب تھا کہ وہ جینوا چلے جائیں جو اس وقت پروٹسٹنٹ تحریک کا بڑا بھاری مرکز تھا۔ سوئیٹان کے اس چھوٹے سے آزاد، جمہوری شہر میں پیدا ہونے اور وہاں بچپن کا زمانہ گذارنے کا روسو پر نمایاں اثر ہوا۔ روسو کے خاندان کے اکثر لوگ گھڑیاں بنا کر روزی کماتے تھے۔ روسو کا باپ بھی گھڑی ساز تھا۔ اس کا تعلق شہر کے پانچ طبقوں میں سے اس بیچ کے طبقے سے تھا جو گو سب سے بلند مرتبہ تو نہ تھا مگر جسے شہری حقوق حاصل تھے۔ اور یہی تھا وہ طبقہ جو اٹھارہویں صدی کے شروع سے بلند ترین سر کو نیچا کر کے اپنے لئے حقوق حاصل کرنا چاہتا تھا۔

روسو کے باپ کے مزاج میں حد سے زیادہ آزادپسندی تھی، اور طبیعت میں جھگڑالوپن۔ سیروسیاحت پر وہ حد درجہ فریفتہ تھا (یہ تمام اوصاف ہیں جو بیٹے میں بھی بدرجہ اتم موجود تھے) شادی کے چند ہی سال بعد بچوں کو خدا پر چھوڑ اس نے قسطنطنیہ کا رخ کیا۔ غالباً یہ سفر اسے مالی مشکلات کی وجہ سے اختیار کرنا پڑا تھا۔ وہ جب وہاں سے واپس آیا تو اس کا منجھلا بیٹا ژان ژاک پیدا ہوا۔ (۲۸ جون ۱۷۱۲ء) ابھی یہ بچہ آٹھ ہی دن کا ہوا تھا کہ ماں اس دنیا سے رخصت ہوگئی اور اس کی پوری تربیت کا بوجھ باپ کے سر پڑا۔

ژاں ژاک کی تربیت میں ڈھب کی ہوئی اس کا یہی تقاضا تھا کہ وہ جذبات و احساسات کا بندہ ہو، اس کے دل میں امنگیں، طبیعت میں بے چینی اور مزاج میں تلون ہو۔ اس کی عمر ابھی کوئی سات آٹھ سال کی ہوگی کہ باپ نے اس کے ساتھ ایسے قصّے کہانیاں اور تاریخی کتابیں پڑھنا شروع کیں جو تو سن خیال کے لئے چابک کا کام دیں۔ باپ اور بیٹا مل کر اس انہماک کے ساتھ کتابیں پڑھتے اور ان پر گفتگو کرتے رہتے تھے کہ بعض اوقات ساری ساری رات بیٹھے ہی گذر جاتی تھی حتیٰ کہ چڑیوں کے چہچہوں سے انہیں یہ پتہ چلتا تھا کہ صبح ہوگئی۔ اور باپ کو بیٹے سے یہ کہنے کا موقع ملتا تھا کہ "لڑکے! مجھ میں تو تجھ سے بھی زیادہ بچپن ہے!"

روسو دس برس کا ہونے پایا تھا کہ اس کے باپ کو ایک جھگڑے کی وجہ سے جینوا چھوڑنا پڑا اب روسو بے ماں باپ کا رہ گیا اور جینوا کے پاس ایک گاؤں میں اپنے ایک عزیز کے ہاں جو پادری تھا رہنے لگا خود روسو کا خیال ہے کہ دنیائے فطرت سے اس کا دلی لگاؤ اسی زمانہ سے شروع ہوا بچپن ہی میں بے انصافی سے نفرت کے جذبے نے اس کے دل میں گہری جگہ کر لی تھی اور یہ جذبہ پیدا کرنے کی فوری وجہ وہ سزائیں تھیں جو بعض اوقات بلا قصور اس کے حصّے میں آتی تھیں۔ دوسری چیز جس کا اس دو برس کے عرصہ میں روسو کو تجربہ ہوا وہ اس میں وقت سے پہلے جذبۂ شہوانی کے آثار تھے۔ زندگی کا یہ وہ پہلو ہے جس کے متعلق عموماً لوگ خاموشی اختیار کرتے ہیں مگر روسو نے اپنے "اعترافات" میں ہر چیز کا اعتراف کر لیا ہے!

روسو دو برس اسی طرح گذار کر پھر جینوا آ گیا۔ اب اس کا قیام اپنے چچا کے ہاں رہتا تھا۔ دو تین برس اس نے یوں کہنا چاہیئے کہ ضائع کئے۔ البتہ اس عرصے میں تھوڑی بہت نقاشی اور اقلیدس سیکھی۔ اب پیشے سے متعلق روسو کے سامنے تین تجویزیں تھیں۔ گھڑی سازی، وکالت اور مذہبی امامت (تنوع قابل داد ہے!) روسو کو جیسا کہ وہ خود کہتا ہے ان میں سے آخری کام سے دلچسپی تھی روسو ان بدقسمت لوگوں میں سے ہے جنھیں بچپن ہی سے اپنی روزی آپ کمانے کی فکر کرنی پڑتی ہے چنانچہ باپ کے جینوا سے رخصت ہونے کے تھوڑے ہی دن بعد جب کہ اس کی عمر مشکل سے

گیارہ برس کی ہوگی اس نے ایک سرکاری وکیل کے ہاں دفتر میں کام شروع کیا مگر وکیل اس کے کام سے ذرا بھی مطمئن نہ تھا۔ وہ روسو کو نہایت کند ذہن اور ناکارہ سمجھتا تھا اور آخر کار اس کو برطرف کر دیا۔ اب روسو ایک کندہ کار کے پاس کام سیکھنے لگا۔ اس مشغلہ سے اسے خاصی دلچسپی تھی مگر سلوک بے چارے کے ساتھ یہاں بھی بہت برا ہوتا تھا۔ یہ آزاد منش انسان اپنے اوپر پابندی تحمل سے عاید کر سکتا تھا اور تھوڑے ہی دنوں میں اس کا جی کام سے اکتا گیا۔ اس دوران میں روسو کی خوشی کا دن اتوار ہوتا تھا جب وہ اپنے دوستوں کے ساتھ شہر سے دور جنگل میں سیر کے لئے جایا کرتا تھا۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ یہ لڑکے سیر سے اتنی دیر میں واپس آتے تھے کہ رات کے وقت شہر کے دروازے بند ہو جاتے تھے۔ دو مرتبہ روسو کو اسی بات پر سخت سزا دی جا چکی تھی۔ ایک مرتبہ (۱۷۲۸ء میں) جب پھر ایسا اتفاق ہوا کہ روسو کو شہر کے دروازے بند ملے تو اس نے فیصلہ کیا کہ اب وہ سزا نہیں بھگتے گا۔ وہ گھر بار چھوڑنے پر آمادہ ہو گیا اور اس نے ایک دوسری سمت کا رخ کیا جو کچھ بھی ہو کیسی ہی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑے لیکن اس نے جی میں ٹھان لی کہ اب وہ ذرا اس دنیا کی ہوا کھائے گا جس کے اب تک وہ محض خواب دیکھا کرتا تھا۔ کیا عجب ہے کہ وہ ہر طرح کی پابندی سے آزاد ہو کر بھی خوش اور خرم زندگی بسر کر سکے۔ اس آوارہ گردی میں روسو کی آنکھوں کے سامنے ایک نئی دنیا آئی، گو اس میں شبہ ہے کہ یہ دنیا وہی تھی جس کی اسے تلاش تھی۔ بہرحال اس واقعے سے یہ پتا ضرور چلتا ہے کہ روسو پر فوری جذبات کس قدر حاوی ہو جاتے تھے۔ کسی ایک ذرا سے واقعہ سے اس کی زندگی کا رخ سرے سے بدل جانا معمولی بات تھی۔

جینوا سے فرار ہو کر روسو سوائے (Savoy) کے حدود میں پہنچا۔ سوائے کے کیتھولک پادریوں اور جینوا کے پروٹسٹنٹ پیشواؤں کی آپس میں خوب چلی ہوئی تھی، روسو ایک کیتھولک پادری کے ہاتھ پڑا۔ اس نے نوجوان لڑکے کی خوب خاطر مدارات کی اور اسے اپنے مذہب میں داخل کر لیا۔ گو اُس نے روسو کو اپنے مذہب کی خوبیاں سمجھانے کی پوری کوشش کی مگر روسو کے لئے اس وقت کیتھولک مذہب کی تائید میں سب سے بڑی دلیل شراب سرخ کا جام تھا جو پادری نے لذیذ کھانوں

کے ساتھ اس کے سامنے پیش کیا!

اب روسو ایک خاتون مدام دے وارین کے پاس بھیج دیا گیا، جس نے ایسے نوجوانوں کی خدمت اپنا پیشہ بنایا تھا جو کیتھولک مذہب میں نئے نئے داخل ہوتے تھے۔ مدام دے وارین کی بھی عجیب شخصیت تھی، روسو کی طرح اس نے بھی اپنا آبائی مذہب چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کیا تھا۔ مگر کیتھولک مذہب قبول کرنے کے بعد بھی مذہبی معاملات میں بہت آزاد خیال اور نوجوانوں کیساتھ تعلقات میں شاید اور بھی آزاد تھی۔ تصوف سے اسے دلچسپی تھی۔ کیمیا بنانے کا اسے شوق تھا اور تجارتی سٹے بازی کا اسے مرض۔ نیک اور بد دونوں قسم کے خیالات اور جذبات اس میں یکجا پائے جاتے تھے۔ روسو کی فطرت بھی اس سے کچھ مختلف نہ تھی۔ اس عورت کی صحبت میں روسو کے بُرے اور بھلے دونوں قسم کے رجحانات کو بڑی تقویت پہنچی۔ مدام دے وارین نے پہلی ہی ملاقات میں اپنے حُسنِ اخلاق سے روسو کا من موہ لیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اسے ایک ایسی ذات ہاتھ آئی ہو جو ماں کی طرح اس کی خبر گیری کرے، معشوقہ کی طرح اس پر جان دے، استاد کی طرح اس کی ذہنی نشوونما میں مدد دے! اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کی مالی پریشانیوں کو دور کرنے کے قابل ہو، مگر روسو کا قیام چند ہی روز وہاں رہ سکا اور وہ تورین بھیج دیا گیا۔

روسو نے تورین تک کا سفر پیدل کیا۔ یہی سفر تھا جس کے بعد سے روسو مناظرِ فطرت اور پاپیادہ سفر پر جان دینے لگا۔ پہاڑ اور وادیاں، سبزہ زار اور چشمے اس کے لئے جاندار، بولتی چالتی چیزیں بن گئیں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ روسو نے بعد میں دنیا کو تمدن سے ہٹ کر فطرت کی طرف پلٹنے کا سبق دیا۔

تورین میں روسو نے پہلے ایک مسیحی خانقاہ میں تعلیم حاصل کرنا شروع کیا، پھر وہ وہاں کے قدیم گرجا میں رہنے لگا۔ کچھ دنوں بعد وہاں سے اسے تھوڑا سا روپیہ دے کر رخصت کر دیا گیا! اب اس نے طرح طرح سے روزی کمانے کی کوشش کی، کچھ دن محرر رہا، کچھ دن معمولی خدمتگار۔ اس زمانہ میں اس کے اخلاق پر بہت برا اثر ہوا اور اسی زمانہ میں وہ واقعہ پیش آیا جس کی یاد ہمیشہ اس کے

لئے سخت تکلیف کا باعث ہوتی تھی، یعنی اس نے اپنے مالک کے ہاں ایک چھوٹی سی چوری کی اور جب اس پر شبہ کیا گیا تو اس نے اپنے اوپر سے الزام ہٹانے کے لئے ایک غریب لڑکی کا نام لے دیا جو اُسی کی طرح گھر میں ملازم تھی بے قصور لڑکی مصیبت میں پڑ گئی۔ اپنی یہ ذلیل حرکت روسو مرتے دم تک نہ بھولا۔

کچھ عرصہ بعد روسو خدمتگاری سے ترقی کر کے سکرٹیری بن گیا۔ گھر والوں کو اب اس کی صلاحیتوں کا اندازہ ہو چلا تھا۔ اور وہ اس فکر میں تھے کہ جلد اسے ترقی دیں۔ مگر آوارہ گردی کا جذبہ روسو میں پھر عود کر آیا وہ پھر پہاڑوں، دریاؤں، سبزہ زاروں اور مادم دے وارین کے خواب دیکھنے لگا، چنانچہ اس نے پھر اس خاتون کے گھر کا رُخ کیا۔ وہاں اس کا بہت اچھی طرح خیر مقدم ہوا۔ روسو نے کچھ دن اطمینان کی زندگی گذاری۔ اسے پیسے کمانے کی فکر سے نجات مل گئی اور اس نے مذہبی تعلیم حاصل کرنا شروع کی، تھوڑے دنوں میں اس تعلیم سے بھی اس کا جی سیر ہو گیا۔ اب اسے موسیقی کا شوق ہوا اور اس نے اسی سلسلہ میں سوئیٹزرلینڈ کے مختلف حصوں کا پیدل سفر کیا۔ سفر کے دوران میں ایک فرانسیسی سفارت خانہ تک اس کی رسائی ہو گئی۔ سفارت خانہ کے بعض اراکین کے مشورہ سے فوج میں داخل ہونے کی غرض سے پیرس گیا مگر وہاں پہنچ کر جب اُس نے دیکھا کہ اسے افسر کی حیثیت سے نہیں بلکہ معمولی سپاہی کے طور پر بھرتی کیا جائے گا تو وہ مدام دے وارین کے پاس واپس آگیا۔ کچھ دنوں ایک دفتر میں کام کیا، مگر ایسا شخص جو تخلیقی دماغ لے کر پیدا ہوا ہو بھلا دفتر کا کام کب تک کر سکتا تھا۔ اُس نے پھر موسیقی کی طرف توجہ کی اور اپنے قصبے کی بعض لڑکیوں کو سبق دینے لگا۔ روسو کا خیال ہے کہ وہ سب کی سب نہایت حسین تھیں فطرتاً روسو کو اس مشغلے سے بڑی دلچسپی پیدا ہو گئی، مگر جب مدام دے وارین نے یہ رنگ ڈھنگ دیکھا تو اس خیال سے کہ کہیں روسو پر کسی اور کا جادو نہ چل جائے خود روسو کے ساتھ سلسلۂ عشق شروع کر دیا! عشق کی یہ کہانی بھی بڑی عجیب ہے۔ جسے وہ اب تک ماں کہکر پکارا کرتا تھا وہ اس کی محبوب نظر بن گئی اور پھر ستم یہ کہ "محبوبہ" کی نظر التفات ایک روسو ہی پر نہیں تھی۔ اس اجمال کی تفصیل چنداں ضروری نہیں۔

ہمارے لئے اس قصے سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اس زمانے میں روسو کی رہ و رسم اپنے طبیب ڈاکٹر سالومون سے بڑھی۔ یہ ایک جید عالم تھا اور دیکارتی[1] مذہب (فلسفہ) سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے روسو کو فلسفہ اور علوم فطریّہ کی طرف توجہ دلائی۔ اسی کے کہنے پر اس نے والتیر[2] کی ایک کتاب کا مطالعہ کیا، اور اسی کے بعد سے فلسفہ سے اسے بڑی رغبت ہوگئی۔ لاک اور نیوٹن کے فلسفہ سے بھی وہ آشنا ہوا۔ روسو پر دیکارت اور لاک دونوں کا گہرا اثر ہے۔ اسے لاک کا بھی شاگرد کہا جا سکتا ہے اور دیکارت کا بھی۔ جب اسے فلسفہ کے مختلف مذاہب میں اختلاف نظر آتا تھا تو اسے خود سوچنے اور غور کرنے کا موقع ملتا تھا۔ فلسفہ کے علاوہ ریاضی، لاطینی، اور تاریخ کے مطالعے سے بھی اسی زمانہ میں روسو کو دلچسپی پیدا ہوئی۔ مگر ان تمام علوم کی تحصیل کا مقصد صرف اپنی دماغی نشوونما نہ تھا بلکہ روسو کے پیش نظر یہ بھی تھا کہ اس طرح ممکن ہے اسے کوئی اعلیٰ خاندان اپنے ہاں استاد یا سکرٹری کے طور پر رکھ لے۔

۱۷۴۱ء تک روسو اسی طرح مدام دے وارین کے پاس رہا۔ کبھی جب کوئی نیا رقیب پیدا ہوجاتا تھا، یا اسے سیر و سیاحت کا شوق چرّاتا تھا تو وہ کچھ دنوں کے لئے کہیں چلا جاتا تھا۔ مگر تھوڑے کے بعد مدام موصوفہ کی کشش اسے پھر وہیں کھینچ لاتی تھی۔ البتہ جب مدام دے وارین کی مالی حالت بہت خراب ہوگئی تو روسو نے فیصلہ کیا کہ وہ پیرس جاکر موسیقی کی تحریریں بیچ بیچ کر اپنی روزی کمائے گا اور اگر ممکن ہوگا تو مصیبت کے وقت اپنی محسنہ کی بھی مدد کرے گا۔ مگر پیرس میں روزی کمانا کچھ بہت آسان نہ تھا۔ البتہ اس سلسلہ میں اس کی ملاقات پیرس کے علمی اور ادبی حلقوں کے مشہور مشہور لوگوں سے ہوگئی۔ انھیں میں سے بعض کی عنایت سے روسو کو چند سال بعد وینس کے فرانسیسی سفیر کے ہاں سکرٹری کا عہدہ مل گیا۔ اس مشہور اور قدیم جمہوریہ میں قیام روسو کے لئے بہت مفید ثابت ہوا۔ یہاں اس کی تاریخی معلومات میں بھی بہت اضافہ ہوا۔ نیز وینس کے قانون دستوری سے اسے بڑی دلچسپی پیدا

---

[1] دیکارت، (Descartes) فرانسیسی فلسفی اور ریاضی کا علامہ (۱۵۹۶ء تا ۱۶۵۰ء)

[2] والتیر، مشہور فرانسیسی فلسفی، ادیب اور مورخ، روسو کا ہمعصر (۱۶۹۴ء تا ۱۷۷۸ء)

ہوگئی۔ اور یہیں دستور پر کتاب لکھنے کا خیال اسے پہلی مرتبہ آیا۔ اطالوی موسیقی اسے بہت پسند آئی اور بعد میں پیرس جا کر فرانسیسی موسیقی کے مقابلہ میں اطالوی موسیقی کو رواج دینے کی اُس نے سرگرم کوشش کی مگر وینس میں اس کا قدم بہت دنوں نہ ٹک سکا۔ وہاں سے جی اکھڑنے کی بڑی وجہ فرانسیسی سفیر کا غرور و تکبر تھا۔

وہ پیرس واپس آ گیا اور ایک اوپرا opera میں کام کرنے لگا۔ اب وہ جس ہوٹل میں رہتا تھا اس میں ایک نوجوان لڑکی بھی ملازم تھی۔ روسو کو رفتہ رفتہ اس سے بڑی محبت ہو گئی۔ اگر اطالیہ اور سویٹزرلینڈ کے اکّے دکّے واقعات سے قطع نظر کر لی جائے جب عارضی طور پر روسو کے قدم ڈگمگا گئے تو روسو کا مدام دے وارین کے بعد یہ دوسرا عشق تھا۔ روسو نے بعد میں کہا ہے کہ اصل میں اسے اُس لڑکی دھریسے واسیور) سے عشق نہ تھا۔ اسے تلاش تھی ایک ہستی کی جو اس سے ہمدردی کرے اور جس کے سامنے وہ اپنے دل کی کہانی سنا سکے۔ اس "بت دہقان" میں اسے ایسی ہستی دستیاب ہو گئی۔ اس لڑکی کے دماغی نشو و نما کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ باوجود روسو کی جانکاہ کوشش کے پڑھنا عمر بھر نہ سیکھ سکی اسے چار اور چار کو صحیح جوڑنا تک نہیں آیا۔ گھڑی دیکھ کر وقت وہ نہیں بتا سکتی تھی۔ مہینوں کے نام سلسلہ وار اسے یاد نہیں تھے ظاہر ہے کہ یہ تعلق جو پچیس برس تک قائم رہا روسو کے لئے بہت خوشگوار نہیں ہو سکتا تھا۔ اسے روسو کے علمی کام سے نہ کوئی دلچسپی تھی نہ ہو سکتی تھی۔ روسو کا روزانہ میلوں ٹہلنا اسے پسند نہ تھا۔ پھر روسو کی پریشانی کی ایک اور وجہ یہ تھی کہ اس کا پورا گھرانا روسو کے سر کھاتا تھا۔ مگر جب روسو کی اس سے اولادیں ہوئیں اور اس نے اپنے پانچوں بچوں کو یتیم خانہ میں بھجوا دیا تو پھر دونوں کے تعلقات بہت کشیدہ رہنے لگے۔ بچوں کا یتیم خانہ میں بھیجنا روسو کے سیاہ ترین اعمال میں سے ہے اور گو اُس نے بعد میں طرح طرح کے عذر اور حیلے تلاش کر لئے مگر اسے اپنے اس فعل کی برائی کا اچھی طرح احساس تھا چنانچہ "ایمیل" میں لکھتا ہے: "جو باپ کے فرائض انجام دینے کے قابل نہ ہو اسے اس کا کوئی حق نہیں کہ باپ بنے۔ نہ غربت، نہ کام کی زیادتی اور نہ لوگوں کا خوف اسے اس فرض سے بری کر سکتے ہیں کہ وہ اپنے بچوں کی پرورش آپ کرے اور خود انھیں تعلیم دے۔ میری کتاب کے پڑھنے والو! میری بات پر یقین کرو۔ میں ہر اس شخص کو بتائے دیتا ہوں

جس کے سینے میں دل ہے۔ اور جو پھر بھی ان مقدس فرائض کو انجام دینے سے قاصر رہتا ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے اس گناہ پر خون کے آنسو روئے گا اور اس کے دل کو کبھی تسلی نہ ہو پائے گی"۔

روسو اور اس کے حامیوں نے اس فعل کی بہت سی توجیہیں کی ہیں مگر ان میں سے ایک بھی ایسی نہیں جو ہماری تشفی کر سکے۔ روسو کی زیادتی ہے جب وہ اپنے اس طرز عمل کو غریب افلاطون کے سر تھوپتا ہے، کہ اس نے اپنی "ریاست" میں اسی کا مشورہ دیا ہے! روسو کا یہ خیال بھی محض بہانہ ہے کہ یتیم خانہ میں بچے گھر سے بہتر تعلیم پا کر نہایت محنتی کاشتکار بنیں گے اور ایمانداری کیساتھ روزی کمانا سیکھینگے واقعہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں ایسے اداروں سے جو بچے پڑھ کر باہر نکلتے تھے وہ جرائم پیشہ اور کسبیوں کے طبقے میں شامل ہوتے تھے۔ روسو کے وکلا کا یہ خیال بھی بے معنی ہے کہ روسو ایسا کرنے میں اس وجہ سے حق بجانب تھا کہ وہ بچے دراصل اس کے تھے ہی نہیں اولاً اگر ایسا ہوتا تو روسو کے "اعترافات" میں جہاں اس نے کچھ بھی نہیں چھپایا ہے، اس کی طرف بھی اشارہ ضرور ہوتا۔ لیکن اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ ایسا ہی تھا تو اس عورت سے قطع تعلق کے لئے یہ معقول اور کافی وجہ ہو سکتی تھی۔ مگر غریب بچوں کا بھلا اس میں کیا قصور تھا؟ مگر روسو بچوں کی ماں کو تو ان تمام واقعات کے بعد بھی اپنے لئے دنیا کی سب سے بڑی نعمت سمجھتا رہا۔

روسو کو پیرس میں پھر ایک ایسا موقع ہاتھ آیا کہ اگر وہ چاہتا تو چین سے زندگی گذار سکتا تھا وہ ایک بڑے عہدہ دار کا سکریٹری ہو گیا۔ مگر اسی زمانہ میں (۱۷۵۰ء) اس کی پہلی تصنیف شائع ہوئی جس کا ہم اس کی تصانیف کے تحت میں مفصل ذکر کریں گے کتاب جس قدر کی نگاہ سے دیکھی گئی اس نے روسو کو اس پر آمادہ کیا کہ وہ اپنے آرام اور اطمینان کو قربان کرے اور اپنا علمی مشغلہ جاری رکھے۔ اس نے اپنی ضروریات زندگی کو بہت محدود کر لیا اور پھر اپنی روزی موسیقی کی تحریریں بیچ بیچ کر کمانے لگا۔

۱۷۵۴ء میں روسو نے تھریسے کے ساتھ اپنے آبائی وطن، جینوا کا سفر کیا۔ اب روسو کوئی آوارہ گرد نہ تھا وہ ادبی دنیا میں کافی نام پیدا کر چکا تھا۔ جینوا میں اس کی بڑی آؤ بھگت ہوئی۔ مگر کیتھولک مذہب اختیار کرنے کی وجہ سے روسو اپنا حق شہریت کھو چکا تھا۔ اس حق کو دوبارہ حاصل کرنے کے لئے روسو پھر پروٹسٹنٹ مذہب میں داخل ہو گیا! اگرچہ وہ عرصہ تک پکا کیتھولک رہا تھا مگر اس مذہب کی ظاہری رسوم

اور پابندیوں پر اس کا اعتقاد ذرا مشکل سے جم سکتا تھا۔ اس نے آسانی سے اپنا آبائی مذہب دوبارہ قبول کر لیا۔ اس کے بعد سے مرتے دم تک اسے جینوا کی شہریت پر بڑا ناز رہا جینوا میں اس دفعہ اس کی ملاقات ایسے لوگوں سے بھی ہوئی جو ریاست کے دستوری مسائل سے بڑی دلچسپی رکھتے تھے۔ اور اسی قیام کے دوران میں اس نے پھر ایک ایسی کتاب تصنیف کرنے کا ارادہ کیا جس کا خیال پہلے پہل اسے وینس میں آیا تھا۔

پیرس واپس آکر جب اس کی ایک اور کتاب "عدم مساوات" پر شائع ہوئی تو اس کی شہرت کو اور بھی چار چاند لگ گئے۔ ایک خاتون کی نوازش سے اسے پیرس کے پاس نہایت خوشنما علاقہ میں ایک آرام دہ مکان رہنے کو مل گیا۔ جہاں وہ کوئی چھ سال رہا۔ علمی اور ادبی کام کے اعتبار سے روسو کی زندگی کا یہ بہترین زمانہ تھا۔

پیرس کے پندرہ سال کے قیام میں وہاں کے بڑے بڑے ادیبوں اور عالموں سے روسو کے گہرے تعلقات ہو گئے تھے مشہور فرانسیسی۔ انسائیکلوپیڈیا[1] کے تیار کرنے والوں۔ دیدرو، گرم[2] اور ادلباک (ہولباخ) سے اس کی اچھی طرح شناسائی ہو گئی۔ انسائیکلوپیڈیا کے لئے روسو نے موسیقی پر مختلف مضامین لکھنے کے علاوہ "معاشیات" پر بھی ایک مقالہ تحریر کیا۔

انسائیکلوپیڈیا والوں سے روسو کی دوستی تو ہو گئی مگر ان میں اختلاف کا پیدا ہونا بھی بالکل قدرتی امر تھا۔ اس گروہ کے خیالات اور روسو کے فلسفے میں بڑا فرق تھا۔ روسو نے اپنے ان تمام احباب اور خصوصاً والیتر[3] سے بہت کچھ سیکھا۔ وہ اپنے خیالات میں شائستگی، اپنی نظر میں وسعت اور اپنے کلام میں ادبی چاشنی کے لئے بڑی حد تک انھیں کا رہین منت ہے یہ سب اس وقت اپنے اپنے فن کے

---

[1] یعنی وہ انسائیکلوپیڈیا جو اٹھارہویں صدی میں تیار ہوئی۔ لاک کے فلسفہ اور جدید علوم نظریہ کی مدد سے پرانے علمی اور مذہبی خیالات پر اس میں سخت نکتہ چینی کی گئی تھی شائع ہوتے ہی خصوصاً مذہبی حلقوں میں اسکے خلاف بہت شورش برپا ہوئی۔

[2] گرم اور ادلباک (دراصل ہولباخ)، دونوں الماتی النسل تھے، مگر پیرس میں عمر گذاری۔

[3] والیتر سے روسو کی ذاتی ملاقات نہ تھی۔ صرف تصانیف کے ذریعہ شناسائی ہوئی۔

مسلم استاد تھے۔ روسو نے ان سے پورا پورا استفادہ کیا۔ انھوں نے بھی کسی طرح مدد سے دریغ نہیں کیا مگر یہ دوستی بھی ہمیشہ قائم نہ رہ سکی۔ قصور وار بھی کچھ تو روسو کی اپنی غیر معاشرتی طبیعت۔ کچھ روسو کا نیا اور ناکام عشق، جس کی یہ لوگ ہنسی اڑاتے تھے اور سب سے بڑھ کر روسو اور اس گروہ کے خیالات میں بنیادی اختلاف۔ روسو کے یہ احباب اس کی غربت پر ترس کھا کر جس قدر اس کی مدد کرتے تھے اُسے ان سے اسی قدر چڑھ ہوتی تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ یہ لوگ اس کی آزادی میں بیجا مخل ہیں۔ روسو کی باتوں پر بعض اوقات وہ ہنستے تھے، اسے ناگوار ہوتا تھا۔ مگر اصل سبب جس کی طرف ابھی اشارہ کیا جا چکا ہے۔ وہ ان کے اور روسو کے فلسفہ زندگی کا فرق تھا۔ روسو اپنے خیالات پر ایک کٹر مذہبی آدمی کی طرح قائم تھا، والیتر سے گو اس کے ذاتی تعلقات نہ تھے مگر ان دونوں کے خیالات کے درمیان ایک زبردست خلیج حائل تھی اور روسو کی جھگڑالو طبیعت کے لئے یہ بہت کافی تھا۔ غرض روسو کی والیتر، دیدرو، گرم اور اولباک سب سے ایسی چلی کہ خدا کی پناہ۔ ایک دوسرے کے خلاف تو تو میں میں پر اتر آئے۔

یہی وہ زمانہ ہے جب روسو نے اپنی دونوں مشہور کتابیں "معاہدہ عمرانی" اور "ایمیل" تیار کیں۔ "ایمیل" کا شائع ہونا تھا (جون ۱۷۶۲ء) کہ کتاب کو نذر آتش کرنے اور اس کے مصنف کو گرفتار کرنے کا حکم حکومت کی طرف سے صادر ہوا۔ روسو کو اپنے دوستوں کے ذریعہ اس کی اطلاع پہلے سے مل گئی تھی اور سپاہیوں کے پہنچنے سے بس ذرا پہلے، رات کی تاریکی میں روسو نے سوئیٹزرلینڈ کا رخ کیا۔ مگر اس آزادی کے گھر میں بھی روسو کو آزادی نصیب نہ ہوئی۔ جینوا میں "معاہدہ عمرانی" اور "ایمیل" دونوں ممنوع قرار دی گئیں اور روسو کے خلاف وارنٹ جاری ہو گیا۔ وہ وہاں سے بھی فرار ہوا۔ چند سال اس نے نیوشاتل میں گذارے جو اس وقت فریڈرک اعظم کے زیر حکومت تھا۔ مگر روسو کے مذہبی خیالات کی وجہ سے جن کا اس نے مباحثوں وغیرہ میں اظہار کیا، وہاں کے دینی پیشواؤں کے غصہ کی آگ بھڑک اٹھی۔ اور اُسے یہ جگہ بھی چھوڑنی پڑی۔ کچھ دنوں اس کا قیام ایک پُر فضا جزیرہ "سین پییر" میں رہا، یہ جگہ اسے بہت پسند تھی، اس جزیرہ پر بھی سوئیٹزرلینڈ کی ریاست برن کی حکومت تھی۔ وہاں سے بھی اسے نکال باہر کیا گیا۔ اب اس نے اپنے جی میں کارسیکا جانے کی ٹھان لی، مگر پیشتر اس کے وہ اپنے اس ارادے پر عمل پیرا ہو سکے

انگریز فلسفی ڈیوڈ ہیوم نے اسے انگلستان آنے کی دعوت دی، اور روسو نے بہت تکلف کے بعد اسے قبول کرلیا ہیوم اور روسو بھی بالکل مختلف طبعیتیں لیکر پیدا ہوئے تھے۔ مگر اس میں شبہ نہیں کہ ہیوم کو روسو کے ساتھ بڑی ہمدردی تھی، وہ اسے انگلستان لے گیا اور جو کچھ اس سے ہوسکتا تھا اس نے روسو کیلئے کیا اس کا وظیفہ بھی مقرر کرادیا۔ کچھ دنوں تعلقات اچھے رہے۔ مگر روسو بھلا ایک مقام پر کب رہ سکتا تھا ادھر اسکی صحت بھی بہت خراب رہنے لگی۔ بیماری کبھی کبھی جنون کی حد تک پہنچ جاتی تھی وہ یکایک انگلستان سے فرانس واپس چلا آیا۔ اب بھی اس کا کوئی مستقل مسکن نہ تھا، ہر شخص سے ہیوم کی بُرائی کرتا۔ اس خیال نے اب اس کے دماغ میں اچھی طرح جگہ کرلی تھی کہ وہ جہاں بھی جاتا ہے اسے نقصان پہنچانیوالے سایہ کی طرح اس کے ساتھ ساتھ لگے رہتے ہیں۔ اسی نیم جنون کی حالت میں اس نے اپنے "اعترافات" اختتام کو پہنچائے۔

زندگی کے آخری دن روسو نے پیرس کے پاس ایک گاؤں میں گذارے اور ۲ جولائی ۱۷۷۸ء کو یکایک اس کی روح عالم بالا کو پرواز کرگئی۔ یہ خیال بعد کی تحقیق سے بے بنیاد ثابت ہوا کہ اس نے خود کشی کرلی تھی جس طرح عمر بھر اسے چین نصیب نہ ہوا تھا۔ اسی طرح موت کے بعد اس کی ہڈیوں کو چین نہ ملا سولہ برس کے بعد ۱۷۹۴ء میں وہ پانتھیوں میں لاکر دفن کی گئیں ۱۸۲۱ء میں انھیں اوپر سے ہٹا کر نیچے تہ خانہ میں گاڑا گیا اور نو سال بعد پھر اوپر لے جائی گئیں مگر یہ تھا سب کچھ اعزاز کے سلسلہ میں!

یہ تھی مختصر سی داستان اس غیر معمولی شخص کی زندگی کی جس کا دل نیک اور جس کے تخیلات اخلاق اور مذہب کی انتہائی بلندیوں تک پہنچنے والے مگر جس کی زندگی کھوٹی اور جس کی سیرت ناقابل اعتبار تھی لیکن اگر جان بوجھ کر ان حالات کو نظر انداز نہ کیا جائے جنہوں نے روسو کو بگاڑنے میں تو بہت مدد دی اور سنوارنے میں ذرا بھی نہیں۔ تو روسو اس کا مستحق نہ معلوم ہوگا کہ اُسے برا کہا جائے، اس پر ترس کھانے کو جی چاہے گا۔

تصانیف[1] | ۱۷۴۹ء میں ایک دن روسو دیدرو سے ملنے کی غرض سے پیرس سے ونسین جا رہا تھا کہ اس

---

[1] روسو کی تصانیف بہت سی ہیں اور اُن کا تعلق کسی ایک علم یا فن سے نہیں۔ موسیقی اور ادب کے علاوہ بہت سے علوم سے ہے یہاں پر روسو کی صرف مشہور اور اہم تصانیف کا ذکر ہے۔

نے اخبار میں دیژون کی اکادمی کی طرف سے ایک تحریری مقابلہ کا اعلان دیکھا جس میں اس سوال کا جواب طلب کیا گیا تھا کہ علوم و فنون کے احیائے اخلاق کو سدھارنے میں مدد دی ہے کہ بگاڑنے میں؟ اس سوال نے روسو کے تخیل کی دنیا میں ہلچل برپا کردی۔ اُسے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ سوتے سے چونک پڑا ہو ابھی منزل مقصود تک پہنچا بھی نہ تھا کہ ایک درخت کے سایہ میں بیٹھ کر اس نے اس سوال کا جواب لکھنا شروع کیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب سائنس کی نئی نئی روشنی سے دنیا کی آنکھیں چکا چوند ہو رہی تھیں نشاۃ ثانیہ کے ادبی کارنامے اور فنون لطیفہ، علوم فطری کی معرکہ آرا ایجادیں اور لاک کا فلسفہ ان سب نے لوگوں کو مسحور کر رکھا تھا۔ خیال تھا کہ اب وہ وقت دور نہیں جب کائنات کے تمام رموز انسان کی آنکھوں کے سامنے آجائیں گے۔ فرانس میں وہ مشہور انسائیکلو پیڈیا تیار ہو رہی تھی جس کا مقصد نہ صرف عالموں بلکہ معمولی پڑھے لکھے لوگوں کو بھی نئی علمی اور ادبی تحریکات سے آشنا کرانا تھا۔ ایسے وقت میں سائنس کی شان میں گستاخی ہمت کا کام تھا۔ جہاں کسی کی زبان پر ایک حرف بھی سائنس کے خلاف آیا اور "علما" نے اس کے خلاف "جہالت" کا فتویٰ دیا۔ مگر روسو ان لوگوں میں سے نہیں تھا جو بہاؤ کے ساتھ بہتے ہیں اس نے اپنے لئے دھارے کے خلاف تیرنا پسند کیا۔

اکادمی کے اس سوال کی وجہ سے روسو کے دماغ میں جو خیال پیدا ہوا اور جس کا شاید اکادمی کو اعلان کرتے وقت گمان بھی نہ ہوگا۔ وہ انسانی فطرت اور تہذیب و تمدن کا تضاد تھا۔ روسو کے نزدیک فطرت کے معنی تھے سادگی، بھلائی، مساوات اور سب سے بڑھ کر آزادی۔ برخلاف اس کے تہذیب و تمدن کے لوازمات تھے۔ تعیش، بداخلاقی، غلامی اور ایمان و یقین کی کمزوری۔

روسو نے اپنی اس پہلی تصنیف میں جس پر اُسے دیژون کی اکادمی کی طرف سے انعام ملا اس خیال کو نہایت اصرار کے ساتھ پیش کیا ہے کہ جس قدر ہمارے علوم و فنون ترقی کرتے جاتے ہیں اسی قدر ہماری روحیں برباد ہوتی جاتی ہیں۔ انسان اس وقت تک بڑی اچھی زندگی گذارتا ہے جب تک اُسے اشیاء کا علم نہیں ہوتا۔ مگر اس لاعلمی کو چھوڑ کر وہ علم حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے

کہ وہ اخلاق کھو بیٹھتا ہے اور غلامی میں گرفتار ہو جاتا ہے اس میں نہ تو ایمان و یقین کی حرارت باقی رہتی ہے اور نہ سچے عشق کا جذبہ اور دہریت کا الگ شکار ہو جاتا ہے۔

اس تصنیف میں روسو اپنے تمام دعوؤں کے لئے کافی دلائل فراہم نہیں کر سکا ہے۔ عبارت آرائی اور لفاظی نے بھی مقالہ کی علیت کو صدمہ پہنچایا ہے مگر باوجود ان باتوں کے اس کے شائع ہوتے ہی فرانس کی علمی دنیا میں ایک ہل چل مچ گئی۔ اور کیوں نہ مچتی۔ عبارت کا ہر لفظ دہکتا ہوا انگارہ ہے مصنف دیکھتے دیکھتے غیر معمولی شہرت کا مالک ہو گیا۔ کتاب کا مقصد لامذہبوں کے علاوہ ارباب انسائیکلوپیڈیا کی مخالفت بھی تھا اور اگرچہ روسو خود انسائیکلوپیڈیا کے مضمون نگاروں میں سے تھا مگر وہ جس نہج پر تیار کی جا رہی تھی اس سے روسو متفق نہ تھا۔ اس مقالہ کے شائع ہوتے ہی انسائیکلوپیڈیا والوں اور خاص طور پر والٹیر اور دالمبر کے کان کھڑے ہو گئے اور آخر میں اس کا جو کچھ نتیجہ ہوا وہ ہم روسو کی زندگی کے حالات میں دیکھ چکے ہیں۔

ڈیژون کی اکادمی کی طرف سے ۱۷۵۴ء میں پھر ایک تحریری مقابلہ کا اعلان ہوا۔ اب کے موضوع مقرر کیا گیا تھا۔ "انسانی عدم مساوات کی ابتداء اور بنیادی اسباب" روسو نے اس موضوع پر بھی ایک مقالہ تیار کیا۔ مگر اس دفعہ وہ انعام حاصل کرنے میں ناکام رہا۔

بغیر کسی شک و شبہ کے یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ روسو کی تصانیف میں یہ مقالہ سب سے زیادہ انتہا پسندانہ ہے مرکزی خیال وہی ہے جو پہلی تصنیف کا تھا۔ روسو فطری زندگی کی وکالت کرتا ہے مگر یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ واقعی کبھی ایسی صورت حال موجود تھی۔ تمام مصائب اور تکالیف جو آج انسانوں کو اٹھانی پڑتی ہیں وہ دراصل ان کا اپنا قصور ہیں۔ انسان نے اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی ماری جب اس نے فطری زندگی کو خیرباد کہا۔ اس زندگی میں انسان کی ضروریات کم تھیں۔ کام کی تقسیم ایسی نہ تھی۔ کہ غلامی اور عدم مساوات ناگزیر ہو۔ عقل کی جگہ انسانی طبیعت اعمال میں رہنمائی کرتی تھی۔ مگر باوجود ان سب خوبیوں کے روسو لوگوں کو جنگلوں میں بسنے اور درندوں کی طرح زندگی گذارنے کا مشورہ نہیں دیتا جیسا کہ بعض لوگ غلط فہمی کی وجہ سے اور بعض طنز کے طور پر کہتے آئے

ہیں۔

روسو کی تیسری اہم تصنیف ایک ناول ہے۔ (Nouvelle Heloise)
اس کتاب میں روسو کا مقصد سچے عشق کی تصویر کھینچنا ہے۔ اور عشق سے روسو کی مراد اس انسان کی بے غرضانہ محبت ہے جو ابھی تہذیب و تمدن سے ناآشنا ہو۔

روسو کی ہیروئن ژولی نہایت ہی نیک نفس لڑکی ہے وہ اپنے دل کی آواز کے سامنے عقل کی بات نہیں سنتی۔ تن، من دھن سب کچھ وہ اپنے منظور نظر پر نثار کرنے کو آمادہ ہے۔ مگر ژولی کے عالی خاندان والدین کو یہ گوارا نہیں ہے کہ ان کی بیٹی ایک معمولی گھرانے کے نوجوان کے ساتھ بیاہی جائے۔ اب ژولی کو دو صورتوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہے۔ یا وہ اپنے والدین کی دل دکھانے والی نافرمانی کرے اور یا اپنے محبوب سے عمر بھر کے لئے ہاتھ دھو بیٹھے۔ ژولی نے دوسری صورت اپنے لئے منتخب کی۔ اس کی شادی والد کی مرضی کے مطابق ایک دوسرے شخص سے ہو جاتی ہے۔ شادی ہو جانے کے بعد فرض کا احساس عشق کے جذبہ کو دبا لیتا ہے۔ روسو کا مقصود عشق کے خلوص اور حق کو جتانا ہی نہ تھا۔ وہ نکاح کے احترام اور میاں بیوی کی باہمی وفاداری پر زور دینا چاہتا تھا۔ اس لئے کہ اس زمانہ میں فرانس کے اچھے تعلیم یافتہ خاندانوں میں نوجوان لڑکیوں کے ساتھ تو سختی برتی جاتی تھی مگر شادی شدہ عورتوں کو بہت آزادی حاصل تھی۔ روسو اس ذہنیت کے خلاف سخت احتجاج کرتا ہے۔ مگر ان دونوں تخیلات یعنی حق محبت اور احترام نکاح کو یکجا پیش کرنا ذرا مشکل ہے۔ اور ژولی کی شخصیت میں گو روسو نے دونوں رجحانات جمع کئے ہیں مگر یہ یکجائی بالکل ظاہری اور بہت سطحی معلوم ہوتی ہے اس لئے کہ ایک موقع پر جسے کتاب کا "بیت الغزل" کہنا چاہئے ژولی کے سینے کی دبی ہوئی آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ اور جب وہ اپنی زندگی کے آخری سانس لے رہی ہے تو کہتی ہے کہ دراصل عشق اُسے اپنے شوہر سے نہیں بلکہ پہلے محبوب ہی سے تھا۔ وہ نوجوانی ہی کے عالم میں اس دنیا سے رخصت ہو جاتی ہے۔ اور اس سوال کا جواب ہمیں اس کتاب سے نہیں ملتا کہ اگر اس کی زندگی وفا کرتی تو کیا پیش آتا!

روسو نے اس ناول میں نہ صرف سچے عشق کی تصویر کھینچی ہے بلکہ اپنے بہت سے معاشرتی تعلیمی اور مذہبی خیالات بھی پیش کئے ہیں اور اس وجہ سے کہیں کہیں "آورد" کا شبہ ہوتا ہے اس زبردست مذہبی کشمکش پر جو روسو کی زندگی میں انسائیکلو پیڈیا والوں اور ان کے مخالفین میں جاری تھی اس نے اپنے خیالات کا اظہار اس ناول میں تفصیل کیساتھ کیا ہے، اور دونوں کے تضاد کو کم حقیقت ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ژولی اور اس کا شوہر دونوں شریف خصلت انسان ہیں۔ مگر ان میں سے ایک "مومن" ہے اور ایک "کافر"۔ البتہ ژولی کی مذہبیت پادریوں والی مذہبیت نہیں خود روسو کی مذہبیت ہے جس میں تصوف کا رنگ اور نکھر آیا ہے۔

۱۷۶۲ء میں دنیا کے سامنے روسو کی وہ معرکتہ الآرا کتاب آئی جس کا ترجمہ اس وقت اردو میں پیش کیا جا رہا ہے۔ "معاہدہ عمرانی" اگرچہ روسو کے خیال میں ایک ناتمام تصنیف ہے اور نظر ثانی کی محتاج۔ لیکن روسو کے تمام سیاسی تخیلات اس میں کامل پختگی کے ساتھ موجود ہیں۔ اس تصنیف میں روسو کے نظریوں کی اساس قانونِ فطرت ہے۔ اور روسو شروع سے آخر تک اس حقیقت پر نہایت سختی کے ساتھ مُصر ہے کہ طاقت کو حق (قانون) نہیں کہا جا سکتا۔ قوت کا ہر استعمال صرف اس صورت میں جائز ٹھہر سکتا ہے جب وہ ارادۂ اجتماعی اور قوم کی مرضی کے مطابق ہو۔ ارادۂ اجتماعی (Volonte generale) سے مراد کسی خاص وقت میں تمام افراد کے ارادوں کا مجموعہ نہیں بلکہ وہ ارادہ مراد ہے جس پر نسلاً بعد نسلٍ قوم کی زندگی کا مدار ہوتا ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ کسی خاص زمانے

۵۔ فرانسیسی زبان میں contrat social کا بہترین ایڈیشن M. Dreyfus - Brisac کا ہے۔ تمام مہذب قوموں کی زبانوں میں اس کے ترجمے موجود ہیں انگریزی میں اس کے متعدد ترجمے ہیں سب سے پہلے ۱۷۶۳ء میں اس کا ایک ترجمہ شائع ہوا تھا۔ بعد میں R. M. Harrington، H. J. Tozer ٹوزر، G. D. H. Cole جی۔ ڈی۔ ایچ کول اور ایکلر D. Eckler نے ترجمے کئے ہیں۔ ٹوزر کی زبان بہت شگفتہ ہے۔ مگر بحیثیت مجموعی غالباً کول کا ترجمہ بہترین ہے۔

کہ لوگ ایک بات طے کر کے دوسرے زمانے کے لوگوں کو اپنے ارادہ کا پابند بناسکیں، پھر زمانوں کی تقسیم بھی تو ناممکن ہے۔ قوموں کی زندگی میں اس کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا کہ کب ایک پیڑھی ختم ہوئی اور دوسری شروع۔

یہ خیال کہ قوم خود اپنے بُرے بھلے کی مختار (Sovereignty of the People) ہونی چاہیئے روسو نے پہلی مرتبہ پیش نہیں کیا عہد وسطیٰ کے آواخر میں اس خیال کے بہت سے حامی تھے مگر عہد جدید میں بلا شبہ روسو اس کا پیغمبر ہے اور اس پر عہد وسطیٰ کے تخیلات کا اتنا اثر نہیں معلوم ہوتا جتنا خود اس کے وطن جینوا[1] کے دستور کا روسو کا کمال خیالات کی ندرت میں نہیں خیالات کو اس طرح پیش کرنے میں مضمر ہے کہ اس کی بات کو لوگ کان لگا کر سنیں ناممکن ہے کہ آپ معاہدۂ عمرانی کو شروع سے آخر تک پڑھیں اور کوئی اثر قبول نہ کریں۔ اس کتاب پر کبھی کبھی یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس میں ایک بات کو بار بار بیان کیا گیا ہے۔ مگر یہ تکرار کتاب کا عیب نہیں ہنر ہے۔ اسلئے کہ روسو کو تو اپنی بات دلنشین کرانا مقصود ہے۔ اور تکرار اس کا بہترین ذریعہ ہے۔

فرانسیسی انقلاب کے زمانے میں روسو کی یہ تصنیف انقلابیوں کی انجیل تھی۔ ان کے لئے دنیا کے تمام سیاسی حقائق اس کے اندر موجود تھے۔ ایسے حقائق جو ہر زمانہ اور ہر ملک میں یکساں طور پر صحیح ہوں۔ اُن کی نظر میں انسانیت کا بھلا اسی میں تھا کہ معاہدۂ عمرانی کے اصول کو عملی جامہ پہنایا جائے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انقلاب کے علمبردار اس تصنیف کو مصنف سے بھی زیادہ اچھی طرح سمجھتے تھے۔ ارد و کے خیال میں تو ایسا دستور ترتیب دینا ناممکنات سے ہے جو ہر ملک کے لئے یکساں طور پر موزوں ہو طرح طرح کی مثالیں دے کر روسو یہ ثابت کرتا ہے کہ ایک دستور جو کسی خاص ریاست کے لئے بہترین ہو بہت ممکن ہے کہ کسی دوسری ریاست میں بدترین ثابت ہو۔ چنانچہ جب روسو کو کارسیکا کا دستور بنانے کی دعوت دی گئی تو اس نے سب سے پہلے معافی ہی چاہی۔ اور بعد میں پولینڈ کا جو دستور اس نے تیار کیا اس میں یہ اچھی طرح

---

[1] معاہدۂ عمرانی کے سرورق پر روسو اپنے نام کے ساتھ خاص طور پر "جینوا کا شہری" لکھتا ہے۔

واضح کر دیا ہے کہ غیر ملکی کبھی بھی کسی ملک کے لئے مناسب قوانین وضع نہیں کر سکتا۔ نیز یہ کہ قوانین کی بنیاد قومی روایات اور رسوم اہمیت رکھتی ہیں۔ اور غیر ملکی انھیں کامل طور پر کبھی نہیں سمجھ سکتا۔

صرف اس صورت میں کہ روسو کی تمام سیاسی تصانیف پیش نظر رکھی جائیں ہمیں اس کے فلسفۂ سیاست کی تدریجی ترقی اور ان تبدیلیوں کا اندازہ ہو سکتا ہے جو روسو کے خیالات میں پیدا ہوتی رہیں۔ مثال کے طور پر اگر "انسانی عدم مساوات" سے "معاہدۂ عمرانی" کا مقابلہ کیا جائے تو یہ پتہ چلیگا کہ روسو کے فطری اور مدنی زندگی کے نظریہ میں کافی تبدیلی واقع ہوئی ہے۔ مگر معاہدۂ عمرانی "فلسفۂ سیاسیات پر روسو کی آخری کتاب ہے۔ اور اس لئے اس میں روسو نے اپنے جن خیالات کا اظہار کیا ہے انھیں کو روسو کے تخیل کا پختہ ثمر سمجھنا چاہیئے۔

روسو کے "معاہدۂ عمرانی" کا جو درجہ فلسفۂ سیاسیات میں ہے۔ وہی رتبہ "ایمیل" کا فلسفۂ تعلیمات میں ہے۔ افلاطون کی "ریاست" کے بعد روسو کے زمانے تک فلسفۂ تعلیم پر کوئی دوسری تصنیف ایسی نہیں جو "ایمیل" سے ٹکر کھا سکے۔

ایمیل تعلیمی تصنیف سے زیادہ ایک فلسفیانہ کتاب ہے۔ انسان فطرتاً نیک واقع ہوا ہے مگر اس کی برائیاں اکثر دیکھنے میں آتی ہیں۔ روسو نے اس کتاب میں اسی کی تشریح کی ہے اور اس کے اسباب بتائے ہیں۔ روسو کا یہ دعویٰ ہے کہ تمام انسانی کمزوریاں اور خرابیاں روشن ہو جاتی ہیں اگر انسانی دل کا غور سے مطالعہ کیا جائے۔

روسو اپنے نظریے تجربہ کی بنیاد پر قائم کرنا چاہتا ہے۔ وہ اپنے تعلیمی نظریوں کو اتنی اہمیت نہیں دیتا جتنی کہ اُن دعووں کو جو اس نے انسان اور خصوصاً بچے کی فطرت اور نفسیاتی کیفیت کے متعلق کئے ہیں۔ زیادہ اہم سبق روسو کی نگاہ میں وہ ہیں جو خود بچے کی فطرت اس کی مختلف صلاحیتوں اور قوتوں کو ابھار کر اسے دیتی ہے۔ بچے کو انسان کا شاگرد نہیں۔ فطرت کا شاگرد بننا چاہیئے۔ زیادہ

لہ معاہدۂ عمرانی کی طرح اس کے بھی انگریزی میں کئی ترجمے ہیں۔ Barbara Foxley کا ترجمہ بہت معتبر ہے۔

سے زیادہ انسان یہ کرسکتا ہے کہ بچے کو بُرے اثرات سے دور رکھے۔ روسو اس بات پر بھی زور دیتا ہے کہ ہر انسان کی فطرت جداگانہ ہوتی ہے یہی نہیں۔ اس کی عمر کا ہر دور ایک مخصوص فطرت رکھتا ہے۔ اور اسی کو پیش نظر رکھ کر ہر فرد کے متعلق الگ الگ فیصلہ کرنا چاہیئے۔

تعلیم کا مقصد ہے سمجھدار انسان پیدا کرنا۔ روسو کے خیال میں سمجھ ابتدا سے انسان میں موجود نہیں ہوتی۔ جب انسان کی دوسری صلاحیتیں نشوونما پا جاتی ہیں تب جا کر کہیں سمجھ پیدا ہونا شروع ہوتی ہے۔ پس اگر معلم متعلم کو سمجھدار سمجھ کر تعلیم دینا شروع کرتا ہے تو گویا وہ اس جگہ سے ابتدا کرتا ہے جو تعلیم کی آخری منزل ہے!

روسو کی آخری تصنیف اس کے "اعترافات" confessions ہیں جو ادبی حیثیت سے فرانسیسی زبان میں ایک انقلاب کا موجب ہوئے۔ خود نوشت سوانح عمریاں بہت سی لکھی گئیں، مگر مشکل سے کبھی کسی نے اپنی زندگی کا ہر پہلو ایسے بے دھڑک طریقے سے بیان کیا ہوگا۔ روسو نے "اعترافات" میں گویا اپنا دل کھول کر رکھ دیا ہے۔ وہ خود کہتا ہے کہ یہ کتاب اس نے شروع سے آخر تک دل کی مدد سے لکھی ہے؛ دوسری تصانیف میں اس کے ذہن کو بھی کہیں کہیں دخل ہے! اس نے اپنی زندگی کی تصویر کا پہلا رُخ ہی نہیں دوسرا رُخ بھی دکھایا ہے جب یہ "اعترافات" روسو کی موت کے چند سال بعد ۱۷۸۲ء میں شائع ہوئے تو روسو کے بہت سے مداح جو اس کی تصانیف کو پڑھ کر اس کے بہت معتقد ہو گئے تھے سخت مایوس ہوئے۔ سچ ہے غریب روسو کی زندگی اس قابل نہ تھی کہ اسے نمونے کے طور پر آنکھوں کے سامنے رکھا جاتا۔

روسو نے "اعترافات" دراصل اس غرض سے لکھنا شروع کئے تھے۔ کہ انسانی خیالات اور اعمال کی صحیح صحیح تصویر کھینچے انسان کا ظاہر اور باطن سب کچھ دکھائے۔ تاکہ فلسفی ایسی نفسیاتی تصنیف سے فائدہ اٹھا سکیں۔ چنانچہ "اعترافات" کے ابتدائی ابواب اسی نقطۂ نظر سے لکھے گئے ہیں مگر اعترافات کو صرف اسی نقطۂ نظر سے نہ دیکھنا چاہیئے۔ روسو کی زندگی اخلاقی مدوجزر کی ایک عجیب مثال ہے اور ان واقعات کا جن پر روسو بجا طور پر شرمندہ تھا اس کے قلب پر اتنا گہرا اثر تھا کہ وہ

اور نہیں تو اپنی شرمندگی ہی کا اظہار کر کے اس بوجھ کو ہلکا کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ "اعترافات" کا ایک حصہ توبہ کے انداز میں لکھا گیا ہے۔ مگر اس انداز میں بھی کتاب ختم ہونے نہ پائی تھی کہ اس کی زندگی کے آخری زمانہ میں والیتر اور دوسرے انسائیکلوپیڈیا والوں سے اس کی لڑائی ہو گئی۔ انھوں نے طرح طرح سے روسو کو بدنام کیا۔ روسو کو ایسا محسوس ہونے لگا کہ وہ کسی زبردست "سازش" کا شکار ہے جس کا مقصد اسے بدنام کرنا اور لوگوں کی نظروں میں ذلیل و رسوا کرنا ہو۔ یہ خیال یوں کہنا چاہیے کہ جنون کی حد تک پہنچ چکا تھا۔ چنانچہ "اعترافات" کے آخری حصے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ روسو اپنے اوپر سے الزام ہٹانے اور اپنے سیاہ اعمال کے معقول عذر پیش کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ روسو کی اس آخری تصنیف کو ان تینوں باتوں کو پیش نظر رکھ کر پڑھنا چاہیے۔

روسو کی تمام تصانیف کو پڑھتے وقت ایک بات کا ہمیشہ لحاظ رکھنا چاہیے۔ وہ یہ کہ اس نے اپنے خیالات شاعرانہ زبان میں ادا کئے ہیں روسو ہی نہیں اس زمانے کے اور مشہور فلسفی مثلاً والیتر بھی ایسا کرنے پر مجبور تھے۔ ان کے لئے اپنے خیالات کو زبان پر لانے کا یہی ایک طریقہ تھا کہ طنز، استعاروں، اور اشاروں سے مدد لی جائے اور اس طرح سرکاری و غیر سرکاری غیظ و غضب سے نجات حاصل کی جائے۔

(باقی)

تصورِ باری کا ارتقا

خدا کیا ہے؟ ۱۔ خدا کیا ہے؟ سوال جس قدر آسان ہے، جواب اتنا ہی مشکل ہے۔ فکرِ انسانی کی تاریخ گواہ ہے کہ خدا کے تعین میں بے حد اختلاف رہا ہے۔ رومی۔ زہرہ۔ اور مشتری کو خدا مانتے تھے یونانی زیئس Zeus اور اپولو کو۔ لات وعزیٰ عربوں کے خدا تھے۔ اہرمن، اور ارمزد ایرانیوں کے اگنی، اندر، وشنو ہندوؤں کے۔ موجودہ زمانہ میں فطرت کے قوانین کو مرتبہ الوہیت دیا گیا ہے، اور دعویٰ کیا جاتا ہے کہ صرف یہی ہماری تعظیم واحترام کے قابل ہیں۔ چنانچہ بہت زمانہ نہیں گذرا کہ ہیکل نے مذہب اور علم (science) میں مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی اور کونیاتی اثیر (Cosmic Ether) کو خدا کا قائم مقام بنا دیا؎۱۔ ان تمام الفاظ سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ ایک ہی خدا کے یہ سارے مختلف نام اور تعینات ہیں بلکہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ذات باری کے تخیل میں نہ صرف بعید اختلاف رہا ہے بلکہ اس میں ترقی بھی ہوتی رہی ہے خدا کے تصور اور اس کے تعین میں جو تدریجی ارتقا عمل میں آیا ہے اس کا سراغ تاریخ مذہب سے لگتا ہے۔ کیونکہ مذہب اور تصور باری میں نہایت گہرا اور ناقابلِ افتراق ربط وتعلق ہے۔

پہچان کے طریقے خدا سے مراد باری تعالیٰ یا کائنِ مطلق کا وہ تصور ہے جو شعور انسانی میں ممکن ہے جس میں کنہہ ذات، صفات ذاتیہ اور اضافات ذات باری داخل ہیں خدا کے اس تصور کے متعلق بیک وقت نفسیاتی (Psychological) اور وجودیاتی (Ontological) سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کا ماخذ، اس کی ماہیت، اور اس کی صحت کے دلائل کیا ہیں۔ نظریات ماخذ دو شقوں پر مشتمل ہیں (الف) شعور کے اعتبار سے، جیسے مشتق (ماخوذ) اور اصلی۔ (ب) طریق فہم کے اعتبار سے جیسے تجربی یا وجدانی، (ان میں مشتق اور تجربی، اصلی اور وجدانی باہم مربوط ہیں) نظریات ماہیت الٰہیاتی

؎۱ Der Monismus, p. 37 (1893)

معتقدات کے تنوع کے لحاظ سے کثیر التعداد ہیں مثلاً الہیت مطلقہ (Henotheism) الہیت لامداخلیہ (Deism)[1] کثرتیت یا بت پرستی (Polytheism) وحدانیت یا توحید (Monotheism) وحدت وجود یا ہمہ اوست Pantheism۔ نظریات صحت کی تقسیم موضوعی (داخلی) اور معروضی (خارجی) میں ہوسکتی ہے۔ پہلی صورت میں تصور باری کی موضوعی صحت مختلف مراتب پر مشتمل ہے۔ اور اس میں معروضی سند کا لحاظ نہیں ہوتا۔ معروضی نظریات اس تصور کی معروضی صحت کے قایل ہیں۔

مذہب کے تاریخی مراحل کو ارتقائے انسانی کے دوسرے تمام عناصر اور اس کے تمام شمولات و مظاہرات کے تعلق سے معروضی طور پر جانچنا کچھ آسان کام نہیں، اور نہ اس پر کوئی قطعی رائے قائم ہوسکتی ہے۔

آغاز مذہب کے مختلف نظریات | خدا کے تصور کی طرح مذہب کی نسبت جتنے اہم سوالات پیدا ہوتے ہیں ان میں یہ بھی ہیں کہ مذہب کی ابتدا کیسے ہوئی۔ اس کی ترقی اور تقسیم مراتب کس طرح عمل میں آئی۔ مذہب کی تحقیق متقابلہ سے کیا مباحث پیدا ہوتے ہیں وغیرہ۔ آغاز مذہب کے موضوع میں یہ نفسیاتی پہلو بھی شامل ہے کہ آیا مذہب فطری ہے یا تزئیدی یعنی اختیار مذہب تقاضائے فطرت ہے یا اکتسابی ہے اور خارج سے ہم پر عائد ہوا ہے اس آخری یعنی معروضی حیثیت سے فطریت[2] اور فوق الفطریت[3] کی بحث پیدا ہوجاتی ہے

[1] خدا کا وہ اعتقاد جس میں خدا کو کائنات سے الگ اور ماورا مانا جاتا ہے۔ گویا خدا کو اس سے اب کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ وہ دور سے اس کا تماشا دیکھ رہا ہے بجز شاذ و نادر صورتوں کے کبھی اس میں دخیل نہیں ہوتا۔ اس اعتقاد کی رو سے وحی کا انکار لازم آتا ہے

[2] وہ نظریہ جو عالم مذہب سے عالم غیب یا ما فوق الفطرت کو خارج کر دیتا ہے اور حقایق مذہب کی توجیہ یا تو فطری عوامل و قوانین سے کرتا ہے یا مقدس ہستی کو کائنات کی فطری ترتیب کا مرادف سمجھتا ہے

[3] وہ نظریہ جو کائنات بشمول انسان کو ایک ایسے وجود سے منسوب کرتا ہے جو اپنی ماہیت و قدرت کے اعتبار سے اس کائنات سے ماورا ہے اور اس کو کائنات کے قوئی اور اعمال کا مرادف نہیں قرار دیتا۔

فوق الفطریت کی مثال ہربرٹ اسپنسر کا نظریۂ خواب ٹائیلر کا نظریہ طیف (Ghost) اور ماکس ملر کا یہ خیال ہے کہ مذہب کی ابتداء ہمارے احساس لا محدودیت سے ہوئی ہے۔

کونت (Comte) شعور مذہب کی ابتدائی صورت یہ بیان کرتا ہے کہ اس تنزل میں انسان تمام خارجی اجسام کو اپنی ہی طرح ذی حیات سمجھتا ہے۔ ہیگل کا خیال ہے کہ انسیاتی anthropological[1] دور سے پہلے عہد سحری[2] سے اس کی ابتداء ہوئی۔ ماکس ملر نے فلسفہ اور خرافیات Mythology[3] کی مدد سے یہ بھی دعویٰ کیا کہ مذہب ان تمام مظاہرات کے ادراک پر مبنی ہے جو انسان کے اخلاقی کردار کو متاثر کرتے ہیں۔ ہربرٹ اسپنسر نے انگلستان میں اور گرانٹ آلن اور لیپارٹ نے جرمنی میں بعض علمائے اسلام کی طرح مذہب کو مردوں کی پرستش سے متخرج کیا ہے۔ جیونز کا خیال ہے کہ مذہب کی ابتداء وہمیت Totemism[4] سے ہوئی۔ فریزر کی رائے میں مذہب عہد سحری کی ایک تزئیدی صورت کا نام ہے اور ونٹ اور بعض علمائے اسلام کی رائے میں روح کے ابتدائی تخیل نے بعد میں ترقی پاکر مذہب کی صورت اختیار کرلی۔ ابن خلدون کے اقوال سے مستنبط ہوتا ہے کہ مذہب کی ابتداء خواب اور اظہار غیبیات سے ہوئی ہے۔ غزالی کے خیال میں مذہب کا آغاز دوام راحت کی خواہش سے ہوا ہے۔ شاہ ولی اللہ کے خیالات[5] سے یہ پایا جاتا ہے کہ مذہب محتاج الیہ کی طرف رجوع

---

[1] انسیاتیت anthropologism اس دینیاتی اصول یا عقیدہ کا نام ہے جو خدا کے ساتھ انسان کے حقیقی اور خدائی علائق سے بحث کرتا ہے یا انسان پر مملکت الٰہی کے موضوع ہونے کی حیثیت سے۔ [2] یعنی وہ زمانہ جس میں ساحری کا بہت رواج تھا اور عقیدہ تھا کہ ارواح (خواہ وہ شخصی نہ ہوں) اور اسی قسم کے اور عوامل کی مدد سے پر اسرار طور پر فطرت کے طریقے بدل دئیے جاسکتے ہیں۔ [3] وہ علم جو دیوتاؤں اور دیویوں کی نسبت مصنوعی کہانیوں کی تفتیش کرتا ہے (دیومالا)۔

[4] یہ وہ عقیدہ ہے جس کی رو سے ایک فطری شے یا ایک حیوان کو کسی مناسبت کی بنیاد پر قبیلہ یا فرد کی علامت خاص قرار دیا جاتا ہے۔

[5] حجۃ اللہ البالغہ۔

کرنے سے پیدا ہوا۔ غرض ان میں سے اکثر نظریات کا ماحصل یہ ہے کہ انسان نے فیٹیشیت[۱] (Fetichism) اور حیاتیت[۲] (Animism) سے ابتدا کر کے تدریج خدا کا تصور حاصل کیا اور اعلیٰ مذاہب پیدا کئے بخلاف اس کے اینڈریو لینگ کا قیاس ہے کہ "سلسلۂ ارتقا میں باری تعالیٰ کا اعتقاد ایک نوبت پر خود بخود پیدا ہو گیا تھا لیکن رفتہ رفتہ عفریت (demons) طیف اور ادنیٰ درجے کے اصنام کی پرستش کی بدولت اس اعتقاد کو نظر انداز کر دیا گیا یہ ساری تحدیدات زیادہ تر آثاری اور تاریخی تحقیقات کا نتیجہ ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ مذہب کی ابتدا ان سے مشخص نہیں ہو سکتی۔ اس کو نفسیاتی نقطۂ نظر سے سمجھنا ضروری ہے جس کی طرف مسلمانوں نے زیادہ توجہ کی ہے۔

ارتقائے مذہب | ارتقائے مذہب سے متعلق یہ بحث پیدا ہوتی ہے کہ آیا تقدیم کثرتیت (بت پرستی) کو حاصل ہے یا وحدانیت بلکہ بہتر الفاظ میں الہیت مطلقہ (Henotheism)[۳] کو ؟ فیٹیشیت کا کیا مقام ہے؟

---

[۱] ۔ ایک غیر ذی روح کی پرستش جس کو اس وجہ سے ایک خاص قدرت اور قوت کا حامل سمجھا جاتا ہے کہ اس میں ایک روح یا دیوتا متمکن ہے وہ اس روح کی علامت یا نشانی ہے اور اس کی ساخت یا اصلیت ایک خاص نوعیت کی ہے۔[۲] علم تقسیم و خصوصیات نسل پرستی (Totemism) اور علم مذاہب کی رو سے حیاتیت کے تین مفہوم ہیں۔ (۱) یہ اعتقاد کہ ساری فطرت ذی حیات ہے اور اس کے عوامل مرئی اجسام سے الگ اپنا جداگانہ وجود نہیں رکھتے۔ (۲) یہ عقیدہ کہ اجسام میں کوئی چیز متمکن ہے لیکن وہ ان اجسام سے ممتاز ہے، ہو سکتا ہے کہ یہ کوئی چیز بہرحال مادی ہو (۳) یہ کہ اجسام میں مردوں کی ارواح آباد ہیں اور اسی وجہ سے وہ ذی حیات ہو گئے ہیں دوسری تعریف ٹائیلر کی ہے اور تیسری اسپنسر کی۔ [۳] اس اصطلاح کو سب سے پہلے میکس مولر نے ۱۸۶۰ء میں وضع کیا تھا۔ اس نے سامی وحدانیت کے عنوان سے اسی سنہ کے ٹائمز (لندن) میں ایک مضمون شائع کیا تھا جس میں وہ اپنا خیال ظاہر کرتا ہے کہ تاریخ مذاہب میں "الہیت مطلقہ" کا درجہ وحدانیت اور کثرتیت سے پہلے ہے خدا کا ابتدائی وجدان بالذات نہ وحدتی تھا نہ کثرتی لیکن دونوں اس سے متخرج ہو سکتے تھے۔ کثرتیت سے پہلے یقیناً ایک درجہ ایسا آیا ہوگا جس میں کم و بیش غیر شعوری احدیت کا تسلط رہا ہوگا کسی زبان میں واحد سے پہلے جمع کا تصور نہیں پیدا ہوا۔ خدا کے ابتدائی وجدان کو صحیح معنی میں وحدتی نہیں کہا جا سکتا کیونکہ ایک خدا کے اعتقاد سے زیادہ کا انکار لازم آتا ہے اور یہ انکار اسی وقت ممکن ہے جبکہ اس کا تخیل

آبائیل کے خیال کے مطابق یہ سمجھا جائے کہ یہ حیاتیت کی ایک ابتدائی صورت ہے یا ماکس مُلر اور اسپنسر کے اس خیال کو ترجیح دی جائے کہ یہ سب مذہب کی متاخر اور تنزلی صورتیں ہیں اُنیستیں Animatism Animism کے مقابل اِک اور مذہب ہے جو اس بات کا قائل ہے کہ انسان میں جبلی اور فطری طور پر خدا کا تصور جاگزیں ہے شعور انسانی جیسے جیسے نشوونما پاتا جاتا ہے خدا کے تخیل اور اُس کے تعین میں بھی توسیع ہونے لگتی ہے! ورارتقائے مذہب کا مفہوم یہ ہے کہ مذہب میں خدا کے تصور کی قابلیت بڑھتی جاتی ہے۔ شاہ ولی اللہ کہتے ہیں کہ خدا حقیقی محتاج الیہ کا نام ہے جس کی تعیین میں وقت بوقت ارتقا ہوتا رہا۔ اور یہ وجدان انسان کی فطرت میں داخل ہے چنانچہ وہ کہتے ہیں۔ اصل مذہب کی بنا اپنی احتیاج اور دوسرے کے محتاج الیہ ہونے پر ہے۔ جیسے جیسے اس کے معلومات وتحقیقات ترقی کرتے جاتے ہیں، وہ پہلے جس کو محتاج الیہ سمجھتا تھا خود اس کو محتاج پاتا ہے تو محتاج کو خیالی خدائی سے معزول کر دیتا ہے۔ اور اس سے بڑے محتاج الیہ کی طرف رجوع کرتا ہے جب اس کا خیال سارے عالم اور اس کے اجزا کے روابط تک جاتا ہے تو آخر کار ایک خدا کو ماننے لگتا ہے؛ اینڈریو لینگ کہتا ہے آیا وحشی، ادنیٰ اور غیر شائستہ مذاہب کی اعلیٰ ترین یا کم سے کم برتر ہستیوں کو خدا کے لفظ سے تعبیر کیا جائے یا نہ کیا جائے یہ اس امر پر منحصر ہے کہ ہم مذہب اور ان ہستیوں کی تعریف کن الفاظ میں کرتے ہیں[۲]۔ ہوویٹ نے قبائل آسٹریلیا کے اعلیٰ وجود کو 'ابونا' All Father کا نام دیا ہے کیونکہ قبائل کے خدا کو عموماً 'ہمارے باپ' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے[۳] اس امر میں لینگ جو ہوویٹ سے متفق ہے کہتا ہے کہ ان ہستیوں پر روح Spirits یا اعلیٰ روح کا لفظ منطبق نہیں ہو سکتا۔ اور یہی حال تمام وحشیانہ اور ادنیٰ درجے کے

(بقیہ صفحہ (۲۶۳) پیدا ہو چکا ہو۔ لھذا مُلر کہتا ہے کہ اس اعتقاد کو ان الفاظ میں ادا کیا جائے کہ تمام بڑی بزرگ (نامعلوم) ایک خدا ہے" (Selected Essays) [۱] علمائے انیسات۔

[۲] Making of Religion (London).

[۳] Native Tribes of South Australia (London) 364

غیر شائستہ مذاہب کا بھی عبرانی صحائف میں اعلیٰ وجود کا بار بار ذکر آیا ہے لیکن ہر موقع پر اس کو روحانی ثابت کرنا آسان نہیں نیز ہندوؤں کے دیوتا اور ہومر کے اولمپیائی دیوتاؤں کا تخیل روحانیت سے معرا ہے۔ روحانی وجود، یا اعلیٰ روحانی وجود کے الفاظ کو 'ابونا' یا اعلیٰ وجودوں پر منطبق کرنے کی کوشش غلطی پر مبنی ہے اس امر کو پیش نظر رکھنا اس لئے ضروری ہے کہ موجودہ انسانیاتی نظریات کی رو سے وحشی اور دوسرے مذاہب کا وجود برتر متصور طیوف یا ارواح کو اعلیٰ ترین قدرت سے منسوب کرنے کی بدولت ظہور میں آیا ہے۔ امتھرن کا خیال ہے کہ اعلیٰ روحانی وجود اور بالآخر اعلیٰ ترین روحانی وجود تدریجی ارتقا کا نتیجہ ہے۔ انسیئین کا موجودہ نظریہ بھی ہے جس پر ہربرٹ اسپنسر، ٹائیلر اور دیگر محققین قائم ہیں۔

تصور باری انسان میں قائم ہے | تہذیب میں باری تعالیٰ کا تصور کچھ حالیہ نہیں ہے اور نہ وہ بادشاہو کا عکس ہے کیونکہ اس کا وجود ان اقطاع عالم میں بھی پایا جاتا ہے جہاں ملوکیت کا نام و نشان تک نہیں ملتا۔ اور یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ آسٹریلیا کا 'ابونا' ایک برگزیدہ طیف ہے۔ کیونکہ وہ خرافیات کی رو سے موت سے پہلے بھی تھا اور کسی وقت دنیا میں آیا تھا۔ لیکن اب آسمان پر زندہ موجود ہے وہاں سے انسان اور اس کے کردار کو دیکھ رہا ہے مگر اس کے معاملات میں شاید ہی کبھی دخیل ہوتا ہو البتہ لا ادراغلیہ (Deism)۔ وسطی آسٹریلیا کا کیتش فرقہ اسی قسم کے خدا کا قائل ہے جس کو ملکی زبان میں 'اتناتو' کہتے ہیں۔ البتہ یہ قائم بالذات ہے۔ اس کے علاوہ 'اتناتو' کسی مردہ انسان کی برگزیدہ روح نہیں۔ خیال ہے کہ یہاں اسپنسر اور ٹائیلر کا نظریۂ طیوف یا نظریہ حیاتیت ٹوٹ جاتا ہے۔

اب تک جو کچھ کہا گیا ہے اس سے ظاہر ہوگا کہ اگر ان وحشی اقوام میں کسی ایسے 'ابونا' کا تخیل پایا جاتا ہے جو خالق بھی ہے اور صانع بھی تو یہ اقوام خدا کے اس تخیل تک روح یا طیف کے توسط کے بغیر ہی پہنچ گئی ہیں جس کو ہمارے خدا کے خام عقیدے سے بہ آسانی متمیز نہیں

ل Making of Religion pp. 202-206.

کیا جاسکتا۔ 'ابونا' کا تصور اعلیٰ ترین مذہبی تخیل کا ایک جزو تو ہے جو اخلاق کی خالقیت سے بھی متصف ہے۔

یہاں شبہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ شاید 'ابونا' کا تصور آسٹریلیا کی وحشی اوام کے جدید ترین افکار کا نتیجہ ہو۔ لیکن یہ قبائل اپنی قدیم طرز معاشرت اور انداز تخیل کے اعتبار سے نوع انسان کے سب سے قدیم نمایندے معلوم ہوتے ہیں لیکن حیاتیت یا طیوف کے قائل نہیں ہیں تاہم بعض قبائل میں مردوں کی پرستش جاری ہے شمالی اور وسطی آسٹریلیا کے قبائل دوسری وحشی اقوام کی طرح ایک ماقبل البشر قادر دلوتانا اور سحر کار نسل کے معتقد ہیں جو آسمان پر رہتی تھے۔ البتہ غور طلب بات یہ ہے کہ جہاں اس قبیل کے دیوتاؤں کو بھینٹ چڑھائی جاتی ہے 'ابونا' کو بالکل نہیں چڑھائی جاتی۔ اور نہ اس سے کوئی دعا کی جاتی ہے۔ برٹش نیوگنی میں باوجود اس کے کہ وہاں کسی اعلیٰ ہستی یا آسمانی اجسام کا تخیل تک نہیں پایا جاتا۔ خالق باری کا تصور ہر شخص کے دل میں جاگزیں تھے جزائر فجی میں بھی کثیر التعداد بتوں کے باوجود ایک خدا کا تصور قائم ہے۔

لنگ اپنی ایک کتاب میں ادنیٰ اقوام کی اعلیٰ ہستیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ان سب میں 'ہمارا باپ' اور خالق ہونے کا تصور موجود ہے لیکن زیادہ ترقی یافتہ اقوام میں غفلت کی وجہ سے اس تصور نے کثرتی اور حیاتیتی مذاہب کی صورت اختیار کرلی۔ ایسے آر براؤن نے جزائر انڈمان کی تحقیقات میں اس امر کا پتہ چلایا کہ وہاں 'پلوگا' کے نام سے ایک غیر مخلوق خالق کو مانا جاتا ہے جو دل کا راز جانتا ہے۔ جنوبی افریقہ کی زولو قوم میں بھی جو طیف کی پرستار ہے ایک

---

(۱) Howith: Natural Tribes. 344, 394

(۲) Seligmann: Melanisians of British New Guinea 646, 651.

(۳) Making of Religion (London) 1898

خالق کا تصور موجود تھا[1] ان شہادتوں سے پتا چلتا ہے کہ ازلی اور غیر فانی خالق کا یہ تصور بلند تر سطح تہذیب کے خیالات کی تعمیم نہیں بلکہ ابتدائی فکر کا ایک مفرد اور مخلوط تصور ہے۔

تصور باری کا ارتقا بہرحال تاریخ مذہب کی مدد سے دیکھنا یہ ہے کہ آیا اس تغیر و تبدل میں کوئی قیام پذیر اور غیر متغیر ذات نظر آسکتی ہے یا نہیں لیکن اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ مذہب کی تاریخی ابتداء میں اس ذات کا سراغ لگایا جائے۔ اگر تمام مذاہب کے تاریخی آغاز کا سراغ ممکن بھی ہو تو ابتدائی تخیلات کی مدد سے کسی وجود کی حقیقی ماہیت کی نسبت بہت زیادہ علم نہیں حاصل ہو سکتا۔ کیونکہ ترقی مذہب کے ساتھ ساتھ تصور باری میں جو قلب ماہیت اور ترتیب جدید عمل میں آتی ہے ان سے ایسی صفات کا پیدا ہونا ممکن ہے جو اس کی ابتدائی حالت میں نہیں پائی جاتیں کسی وجود کی حقیقی ماہیت اس قانون ارتقا پر منحصر ہے جس کے مطابق وہ ابتدائی کیفیت سے ابدی کیفیات میں منتقل ہوتا ہے کوئی توقع نہیں ہے کہ تاریخ اس مسئلہ کے حل میں کبھی کامیاب بھی ہوگی کہ عالم انسان پر آفتاب مذہب کی ضیا پاشی کب سے شروع ہوئی البتہ قرآن سے ثابت ہے کہ نوع انسان میں شروع ہی سے تصور باری موجود ہے۔

فاقم وجہک للدین حنیفا فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیہا۔ لا تبدیل لخلق اللہ ذٰلک الدین القیم و لکن اکثر الناس لا یعلمون۔ ۲۱۔ ۳۰۔ ۴ ترجمہ۔ تو (اے پیغمبر) تم تو ایک خدا کے ہو کر (اس کے) دین کی طرف اپنا رخ کئے رہو۔ (یہ) خدا کی بنائی ہوئی سرشت ہے جس پر خدا نے لوگوں کو پیدا کیا ہے خدا کی بناوٹ میں ردوبدل نہیں ہو سکتا۔ یہی دین کا سیدھا راستہ ہے۔ مگر اکثر لوگ نہیں سمجھتے۔

موجودہ زمانہ کی سب سے وحشی اقوام بھی ارتقا کا ایک طویل سلسلہ ختم کر چکی ہیں۔ کم سے کم اتنا یقینی ہے کہ ہم جس مذہب کو ابتدائی کہتے ہیں وہ بھی لازمی طور پر اصلی مذہب (یعنی وہ جو آغاز سے یکساں طور پر چلا آیا ہو) نہیں ہے۔ ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ تمام مذاہب حقیقت میں فیتیشت ہی سے

---

[1] Lang: Magic of Religion (1901)

نکلے ہیں، خواہ یہ ثابت بھی ہو جائے کہ نوع انسانی کی مذہبی ترقی فتیشیت ہی سے ہوئی ہے لیکن مخالفین مذہب نے بہرحال اسی قسم کے نتائج اخذ کئے ہیں۔ دوسری طرف اکثر حامیان مذہب نے یہ اصول قائم کیا ہے کہ ابتدائے آفرینش میں بنی آدم پر ایک مکمل مذہب وحی کے ذریعہ نازل ہوا تھا، لیکن نوع انسان نے اس سے انحراف کیا اور اس کے بعد جو نئے مذاہب آتے گئے وہ اسی کے قائم مقام تھے یا یہ کہ وحی کے ذریعہ اسی ایک ابتدائی مذہب کا اعادہ ہوتا رہا۔ اس کے مقابلے میں فتیشیت کا نظریہ پیش کیا جاتا ہے اور اسکو زیادہ فطری خیال کیا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ امر زیادہ آسانی کے ساتھ سمجھ میں آتا ہے کہ ایک غیر مکمل مذہب نے تدریجی ترقی کے بعد زیادہ مکمل مذہب کی صورت اختیار کی نہ یہ کہ ایک غیر مکمل مذہب مکمل مذہب کا زائیدہ ہے، یا اس کی ابتدا، ایک مکمل مذہب سے ہوئی ہے۔ اگر کسی مکمل مذہب میں غیر مکمل مذہب کا تخم یا امکان ہو تو اول الذکر کو بھی مکمل نہیں تسلیم کر سکتے لیکن یہ ممکن ہے کہ کوئی مذہب تکمیل پذیری یا قلب ماہیت کی وجہ سے تکمیل کامل کی جانب ترقی کرے۔ ہم جو کچھ پاتے ہیں وہ صرف یہ ہی کہ ادنیٰ اور اعلیٰ مذاہب کا ایک سلسلہ قائم ہے۔ یہ سلسلہ یکساں رفتار سے منازل ارتقا طے نہیں کر سکتا۔ بلکہ ترقی و تنزل، رد و بدل، مد و جزر ہوتا ہی رہتا ہے۔ ہاں اس تمام عروج و زوال اور اتار چڑھاؤ میں ترقی کا ایک عام رجحان ضرور پایا جاتا ہے مذہب کی تقسیم مراتب میں ایک اور اساسی امتیاز فطری اور اخلاقی مذہب کا ہے۔ دوسری شق میں تمام اعلیٰ اور زیادہ روحانی مذاہب داخل ہیں۔

مذہب کا میلان ایک خاص دور ترقی میں ظاہر ہوتا ہے انسان میں مذہب کا احساس اس وقت تک ہونا ناممکن ہے جب تک کہ وہ بھی اپنے ذاتی مشاہدات عالم کو ایک حد تک ترتیب نہ دے لے۔ لیکن اس کے بعد ایک حالت سے دوسری حالت اور ایک منزل سے دوسری منزل میں جو انتقال و ترقی ہوتی ہے اس میں خالص نفسیاتی قوانین عمل کرتے ہیں۔

حیاتیت اس وقت جو اقوام ادنیٰ ترین منازل ارتقا میں ہیں ان کے تخیل عالم کو ٹائیلر کی رائے میں حیاتیت کہا جا سکتا ہے۔ حیاتیت صرف ایک تصور کائنات ہے نہ کہ مذہب۔ مگر فلسفۂ مذہب کے لئے اس میں بہت دلچسپی کا سامان ہے۔ اس لئے کہ یہ دنیا کا سب سے ابتدائی تخیل ہے جس نے مذہب کی

خدمت کی ہے۔ اس کی خصوصیات میں یہ بھی داخل ہے کہ وہ تحریف سے کام لے کر واقعات و حوادث عالم کی توجیہ ارواح یا شخصی ہستیوں سے کرتا ہے۔ اس کا ماخذ غالباً وہ تصورات ہیں جو خواب سے پیدا ہوتے ہیں۔ ایک وحشی انسان خواب میں جن تجربات و مشاہدات سے دوچار ہوتا ہے ان کو عالم بیداری کے تجربات کے برابر صحیح سمجھتا ہے۔ کیونکہ وہ خواب میں آپ کو اور دوسروں کو زمان و مکان اور مادی اضافات میں جتنا آزاد پاتا ہے بیداری میں نہیں پاتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ خوابوں سے (جن کی صداقت و حقانیت میں اسے شبہ نہیں ہوتا) بیداری کی توجیہ کرنے لگتا ہے ہمیشہ اس کے شعور میں یادِ رفتگاں جاگزیں رہتی ہے۔ یہ لوگ جب تک زندہ تھے ہر چیز میں نمایاں حصہ لیتے رہے۔ لہٰذا قدرتی طور پر یہ اعتقاد پیدا ہوتا ہے کہ اب بھی ان کی کشمکش تکمیل کے لئے جاری ہوگی۔ لیکن اس کے مقابلہ میں ابن خلدون اور بعض اور حکمائے اسلام کی رائے ہے کہ انسان اکثر جو خواب دیکھتا ہے اس کے مطابق واقعات رونما ہوتے ہیں تو اس سے اس کو خیال گذرتا ہے کہ ایک عالم ایسا بھی ہے جو اس عالم پر اثر ڈالتا ہے یا یہ کہ وہ اس کے مقابلے میں زیادہ حقیقی ہے۔ اس سے واضح ہوگا کہ انسان کی جبلت ہی میں یہ بات داخل ہے کہ ہر چیز کو ایک شخص قرار دے۔ واقعات و حوادثِ فطری کو اعمال شخصی سے تعبیر کرے ورنہ محض خواب حیاتیت کی بنیاد قائم کرنے کے لئے کافی نہ تھے حیاتیت ترقی کے ادنیٰ درجے میں تمام اقوام عالم میں پائی جاتی ہے یہ انسان کی اولین حکمت ہے۔ حتیٰ کہ اگر ہم غور کریں تو معلوم ہوگا کہ اعلیٰ سے اعلیٰ مذاہب میں بھی، جن میں خدا کا انتہائی تصور قائم ہو چکا ہے یہ تصورات برابر پائے جاتے ہیں۔ اور اب تک یہ بحث جاری ہے کہ ہم خدا کو شخصیت سے تعبیر کرسکتے ہیں یا نہیں۔ اکثریت غالباً اس کی تائید میں ہے[1]۔

نفسیت اور روحیت کا تقابل | حیاتیت کی حدود کے اندر ہم نفسیت اور روحیت (Spiritism)

---

[1] پروفیسر ویب (Webb) نے خدا اور شخصیت پر ایک مستند کتاب لکھی ہے۔
God and Personality.

میں امتیاز قائم کرسکتے ہیں۔ ایک فنیتیشی (قائل فنیتیت) ان جزئی اشیا پر قانع ہوتا ہے جن میں ارواح نے مختصر یا طویل مدت کے لئے عارضی اور موقتی سکونت اختیار کرلی ہے۔ روحیت کے بموجب ارواح کسی شئے میں محدود یا مقید نہیں بلکہ کچھ تو اپنی خواہش و اختیار سے اور کچھ سحرکاری کے اثر سے اپنی صورت اور طریق انکشاف کو بدل سکتی ہیں۔ ہرمان یوسنر نے فنیتیشی کے خدا کو 'ایک آنی خدا' (God of a moment) کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی یہ جزئی شے جو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے یہی اور صرف یہی خدا ہے[1]

ان موقتی بتوں کو پیدا کرنے کا میلان اب تک جاری ہے۔ انسان جب خارجی اشیاء سے کوئی دلچسپ تعلق پاتا ہے تو بچوں کی طرح ان کو اشخاص اور خاص علامات کا حامل تصور کرنے لگتا ہے۔ مثلاً سانپ کو غصہ یا ضرر رسانی کا دیوتا سمجھ کر اس کی پوجا کرنا یا آفتاب کے انعکاس سے چمکنے والے سنگریزوں کو دیوتا سمجھنا۔ اگر ہم اس قسم کے موقتی دیوتاؤں اور صنم سازیوں کا بنظر امعان مطالعہ کریں تو اس بات کی طرف رہنمائی ہوگی کہ ابتدا میں حیاتیت سے مذہبی تصورات کس طرح قائم ہوئے ہوں گے۔

اصنام کی صفات کا تعین و استقلال | تاریخ کی مدد سے ایسے موقتی اصنام کو صرف تخمینی طور پر جانچا جا سکتا ہے۔ کیونکہ جب کبھی کسی نئی شے کو دیوتا تسلیم کرنے کی ضرورت پیش آتی ہوگی تو ایک بت پرست کا ذہن فوراً اس دیوتا کی طرف منتقل ہوتا ہوگا جس نے پہلے کبھی اس کی مدد کی تھی۔ اس لئے ہر موقع پر ایک نیا دیوتا نہیں پیدا ہوتا بلکہ اسی سابق دیوتا کو نئے حالات و واقعات کی مناسبت سے ایک نئی صفت سے متصف کر دیا جاتا ہوگا۔ بس اس طرح ہر دیوتا میں بتدریج مستقل صفات داخل ہوتی جاتی ہیں۔ اور بعض محدود خطوں کا مالک بھی بن جاتا ہے۔ ان مستقل اور بقا پذیر صفات نیز محدود حکومت و فرمانروائی کی وجہ سے ایک انفرادی دیوتا شعور میں زیادہ وضاحت

---

[1] Höffding: The Philosophy of Religion (1914) iii-136

اختیار کرتا جاتا ہے۔ غرض ایک خاص درجہ رکھنے والے دیوتا انھیں موقتی اور عارضی دیوتاؤں کی ترقی یافتہ صورت ہیں لیکن فکر ابھی تک گوناگونی اور تنوعات سے بے نیاز نہیں ہوتی۔ ہر محدود خطے اور دائرہ عمل کے لئے ایک دیوتا معین ہوتا ہے۔ چنانچہ نیوزی لینڈ کے ایک رئیس نے ایک اوروپائی سے دریافت کیا "کیا یہ سچ ہے کہ یورپ میں صرف ایک خدا تمام اشیا کو پیدا کرسکتا ہے؟ لیکن نوع انسان میں تو ایسا کہیں نہیں ہوتا۔ کوئی بڑھئی ہوتا ہے تو کوئی لوہار اور کوئی جہاز ساز[لہ]۔ مذاہب کی ابتدا میں یہی ہوتا ہے' ہندوؤں کا' اور یونانیوں کے زیر اثر آنے سے پہلے رومیوں کا یہی حال تھا۔ ہندوستان میں بعض دیوتاؤں کی صورتیں ایسی بھی نظر آتی ہیں جن کے متعدد سر اور ہاتھ ہیں۔ غالباً یہ اسی ابتدائی تخیل کی ذرا ترقی یافتہ صورت ہے جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ اتنے بہت ہاتھ اور اتنے بہت سر والا دیوتا بیک وقت متعدد اور متنوع کام کرسکتا ہے' اور بڑا صاحب قدرت ہے (مثلاً گنیش' شنکر' وتاتری' سرسوتی' کالی' لکشمی) یہ خاص دیوتا موقتی خداؤں کی طرح شعور مذہب کے احتیاج کے مطابق یہ احساس پیدا کرتے ہیں کہ ایک عظیم الشان قوت ان سے بہت قریب ہے جو ہر ضرورت پر اُن کی اعانت و دستگیری کرسکتی ہے کیونکہ جس طرح خوف مذہب کا اساس ہے اُسی طرح تفاول و رجا بھی ہے بلکہ شاید آخر الذکر کی اہمیت زیادہ ہے

ادنیٰ مذہب اعلیٰ مذہب کا اساس ہے | اعلیٰ مذاہب نے بھی ادنیٰ مذاہب کی بنیاد پر مذہبی جذبات کے بہتر اظہار کی عمارت تعمیر کی ہے جو اُن کی داخلی تحریک کے بالکل مطابق ہے جو خصوصیات ادنیٰ مذاہب میں پائی جاتی ہیں وہی اعلیٰ میں بھی ہوتی ہیں اور ان سب کا سلسلہ نسب انھیں (ادنیٰ مذاہب) سے جا ملتا ہے۔ اعلیٰ مذہب عمل انتخاب اور ارتقا کی بدولت ادنیٰ مذہب سے پیدا ہوتا ہے۔ کچھ عناصر اس کی ترقی میں مزاحم ہوتے ہیں اور کچھ معاون۔ مزاحم عناصر ادنیٰ مذاہب کی تحت مقامی خصوصیات اور تخصیصی میلان کا نتیجہ ہیں کسی محدود خطے یا مخصوص شے سے جو ارواح یا قوتیں منسوب ہوجاتی

لہ Höffding: The Phil of Religion p137

ہیں نہ تو آسانی سے رفع ہو سکتی ہیں اور نہ خود ان میں وسعت پیدا ہو سکتی ہے۔ وجدان قدامت پرست ہے۔ اور جس دیوتا یا ہستی کا احترام ہونے لگتا ہے اس میں انفرادی صفات کا اس درجہ فقدان ہوتا ہے کہ اس قسم کا دیوتا تخصیصی مذاہب منتقل نہیں ہو سکتا یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے بشمار دیوتا ترقی سے محروم ہیں۔ نیز کسی قبیلے کا یہ احساس کہ اس کے دیوتا اسی کے ہیں اس قابل نہیں ہے کہ اعلیٰ مذہب پیدا کر سکے، بلکہ اس کی راہ میں مزاحم ہوتا ہے جب تک کسی مذہب سے یہ احساس دور نہ ہو اس پر اعلیٰ مذہب با وحدانیت کا رنگ چڑھ نہیں سکتا۔ (اسی لئے اسلام میں تبلیغ کی سخت تاکید کی گئی ہے) ہندوستان کے مختلف فرقے مختلف اصنام کے پرستار ہیں۔ اور بعض اپنے دیوتاؤں کو اپنے ہی لئے مخصوص سمجھتے ہیں لیکن آثار و شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ یہ بت پرست اقوام گرد و پیش کے مذاہب اور حالات و واقعات سے متاثر ہونے لگی ہیں۔ اور ان میں ترقی تہذیب کے ساتھ ساتھ ترقی مذہب کا بھی ایک عام رجحان پیدا ہو گیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ پست اقوام اعلیٰ اصنام کی پرستش اور اعلیٰ مذاہب کی طرف مائل ہوتی جا رہی ہیں اور اعلیٰ اقوام وحدانیت کی طرف رجوع ہو رہی ہیں چنانچہ پست اقوام کو اعلیٰ اصنام کی پرستش کے لئے سہولت حاصل کرنے کی فکر دامنگیر ہے' اور اعلیٰ اقوام سکھ مذہب' آریہ سماج' اور برہمو سماج جیسے نئے مذاہب تراش رہی ہیں۔ یہ صحیح نہیں ہے کہ یہ مذاہب قدیم ہندو مذہب کی مجدد صورتیں ہیں بلکہ اُس کی تنزیہی اور ترقی یافتہ شکل ہیں۔ یہ مذاہب اسلام اور عیسائیت سے بیحد متاثر اور بہرہ یاب ہوئے ہیں۔ سکھ مذہب' اور برہمو سماج کی ایک شاخ نے تو اسلام ہی سے خوشہ چینی کی ہے۔ اور آریہ سماج تلاش وحدانیت کی ایک بین مثال ہے۔ غرض جب تک ہندوستان کے دیوتاؤں کے تخصیصی میلانات دور نہ ہوں مختلف فرقوں کی قبائلی تہذیب قومی تہذیب کی صورت نہیں اختیار کر سکتی

مردوں کی پرستش کا مذہب توسیع معاشرت کے ساتھ ساتھ پرستش اجداد میں منتقل ہو کر بہ آسانی وسعت حاصل کئے جاتا ہے۔ آخر الذکر مذہب نے تہذیب کو اہم عناصر سے آراستہ کیا ہے جس کی مثال چین، جاپان اور قدیم اطالوی مذاہب میں ملتی ہے۔ لہٰذا ادنیٰ مذہب میں اعلیٰ امکانات بھی پنہاں ہیں۔ مگر وہ اسی وقت برگ و بار لاتے ہیں جب کہ جدید ضرورتیں اور وسیع تر

ناوئہ نگاہ پیدا ہوجائے

اعلیٰ مذہب۔ اعلیٰ مذاہب اسی وقت عالم وجود میں آتے ہیں جب کہ قومی تہذیب قبائلی تہذیب کی جگہ لے لیتی ہے۔ انسان کی حیات باطنی کے نشوونما کے دوش بدوش معاشرتی تغیرات بھی رونما ہوتے ہیں، اور مذہب بھی انہی تغیرات کے اثر سے اعلیٰ مدارج ترقی حاصل کرتا جاتا ہے حیات شخصی کی تہذیب و آراستگی اس امر کی مقتضی ہو کہ اپنے معبودوں کے تصور اور مذہبی اضافات کی نظر ثانی کرے قدیم روحیت بے شمار اور غیر معین قوتیں، اور متلون مزاج دیوتا انسان کی زیادہ منتظم اور باقاعدہ زندگی، اور اس کی متنوع اور مخصوص اغراض کے مطابق نہیں رہتے۔ سکھ مذہب آریہ سماج اور برہمو سماج اسی عدم تشفی کی ایک مثال ہیں۔ ان کے ظہور کے بظاہر دو اسباب معلوم ہوتے ہیں (۱) یہ کہ ہندو مذہب کی کثیر الاصنامی انکے ترقی یافتہ شعور مذہب کیلئے ناکافی ثابت ہوئی (۲) عیسائیت اور خاص کر اسلام کے اعلیٰ نمونے مدت سے ان کے پیش نظر تھے (یہ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہو کہ جن افراد کا شعور مذہب ترقی کر جاتا ہو وہ ادنیٰ مذہب ترک کر کے اعلیٰ مذہب اختیار کر لیتے ہیں) الحاصل نظام کثیر الاصنام اصل میں انسان کے تصور کائنات کا ایک مظہر ہے اگرچہ عالم کثیر الاصنام نہایت متخالف و متبائن شعبوں میں منقسم ہونیکی وجہ سے ایک وحدت حقیقی سے معرا ہوتا ہے تاہم ترقی یافتہ ضرور ہے کیونکہ وہ دو حیثیتوں سے بے حد مفید ثابت ہوا ہے۔ اس نے مذہب کو خالص مقامی لوازم کے قید و بند سے آزاد کیا اور قدیم عقائد کی سادہ اور غیر موثر قوتوں کی جگہ زیادہ معروف اوصاف یا کم و بیش محدود قدرت والی متعدد مقدس ہستیوں کو لا بٹھایا۔ ایک حامل صفات وجود جو روحیت کی ہستیوں سے متمایز اور اعلیٰ ہو ان اقدار کا جامع ہوتا ہے جو شعور انسانی میں جاگزیں ہیں۔

ارواح spirits اصل میں ایک بنیاد کا کام دیتی ہیں جس پر ترقی یافتہ خدا کا تخیل قائم ہو سکتا ہے قیاس کیا جاتا ہو کہ یونان کے دیوتا ہرمس اور آرطمیس نے اسی طرح ترقی کی تھی لیکن یہ عمل زیادہ عام نہیں ہو اور ایسی مثالیں بھی جن میں ایک توتم (totem) ۱ خدا کا مرتبہ حاصل کرے بہت

۱ دیکھئے وہیت (Totemism) کی تعریف صفحہ (۲۴۱)

کم ملتی ہیں صرف اتنی بات صاف اور واضح ہے کہ مظاہر فطرت کے ساتھ اعلیٰ اور ترقی یافتہ دیوتاؤں کا ایک خاص ربط و تعلق ہے اور ان سے اس تعلق کی علامتیں بھی ظاہر ہوتی ہیں۔ اس طرح مصر کا را، اور بابل کا شمس آفتاب کے دیوتا ہیں۔ یونانیوں کا زفس اور ویدکا وباس آسمان کے دیوتا۔ وید کے گیتوں میں اوشا کا ذکر آیا ہے جو فجر کا دیوتا ہے لیکن بہت سی مثالیں ایسی بھی ملتی ہیں جن میں اس ربط کا ٹھیک طور پر پتہ نہیں چلتا مگر حقیقت نفس الامر غیر مشتبہ ہے۔ اسی طرح مصری دیوتا، اوسیرز (Osiris) کی فطری بنیاد مشتبہ ہے یہی حال وید کے وشنو اور ورونا کا ہے۔ صرف اتنا معلوم ہو سکتا ہے کہ ان کا تعلق بہر حال روشنی اور آسمان سے ہے دیوتاؤں کے ترقی یافتہ اور زیادہ عالی مفہوم کی مدد سے ان کا ماخذ دریافت کرنا سخت دشوار ہے البتہ اس سے ایک دھندلا سا نشان مل جاتا ہے۔ ہندوؤں کی ساری مذہبی کتابیں نظم میں ہیں۔ اس لئے اس امر کا پتہ چلانا مشکل ہو کہ یہ کس حد تک استعارات کی حیثیت سے استعمال ہوئے ہیں اور کس حد تک ہندوؤں کے اصلی معتقدات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ قیاس کہتا ہے کہ ان کو دونوں حیثیتیں حاصل ہیں۔

صفات باری کی توسیع جوں جوں حیات انسانی میں وسعت پیدا ہوتی ہے اس کے اقدار بھی متنوع ہو جاتے ہیں اور مقدس وجودوں کے اظہار و تقمص میں اسی مناسبت سے توسیع بھی ہوتی جاتی ہے۔ اس اعتبار سے یونان کے اپولو نے جتنی مختلف صفات و خدمات اختیار کی ہیں شاید اس کی نظیر دوسری نہیں ہو آفتاب کے ساتھ اس کی مماثلت زیادہ عالیہ ہے لیکن اس کی ابتدائی صورت نہایت مبہم تھی۔ شروع میں وہ گلوں اور ریوڑوں کا مالک تھا۔ بعد میں کہانت اور پیشین گوئی کا دیوتا بنا۔ پھر شفا بخشی کا، پھر طہارت و تزکیہ کا اور پھر شاعری کا۔ اس کے علاوہ بعض اوقات اصنام متضاد و متباین صفات سے بھی منسوب ہوتے ہیں۔

لیکن جہاں مختلف تہذیبوں کے اختلاط و ارتباط کے باعث ایک نیا مذہب صورت پذیر ہوتا ہے تو اس کی تنظیم کی فوری ضرورت بھی لاحق ہوتی ہے اس کی بیّن مثالیں بابلی، ہندی، اور یونانی مذاہب میں ملتی ہیں۔ بابل کے سامی غنیموں نے قدیم ترسمیری مذہب کو جذب کر لیا اور اپنے معبودوں کے حلقے میں سمیری دیوتاؤں کے لئے بھی جگہ نکال لی۔ آریہ ہند جب ہندوستان میں داخل ہوئے

تو ان بے شمار دیوتاؤں سے نا آشنا تھے۔ لیکن ہندوستان کی دراوڑی اور دیگر قدیم اقوام کے ساتھ اُن کا اختلاط اُن کے مذہب پر بھی اثر انداز ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آریوں کا جدید ترکیب یافتہ مذہب اپنی بہت سی خوبیاں کھو چکا۔ اور ہندوستانی دیوتاؤں کو اپنے دیوتاؤں کے زمرے میں شامل کر لیا۔ اور کچھ اقتضائے حال سے نئے نئے دیوتا بھی تراش لئے مثلاً گنگا ماتا کی تقدیس وغیرہ۔ یونانی تہذیب آریہ قوموں کی نسل اور ہلادی نسل کے باہمی اختلاط کا نتیجہ تھی[۱] اور بعض یونانی دیوتا مثلاً ایتھینی، آرطمیس اور افروڈیٹے مایدہ قدیم تہذیب سے مستعار لئے گئے تھے۔ کثرتیت کی مذہبی پیچیدگیوں میں شعوری تنظیم گو ہمیشہ دشوار ہوتی ہے لیکن ناگزیر بھی ہوتی ہے۔ مفتوحہ نسل کے مقامی لوازم نیز ان معبودوں کے ساتھ مذہبی دلچسپی انجذاب میں مزاحمت کا باعث ہوتے ہیں۔ اس مشکل کو اس طرح رفع کیا جاتا ہے کہ ان معبودوں کو بھی فاتحین کے دیوتاؤں کے زمرے میں شامل کر لیا جاتا ہے۔ اور اُن کو اُن کے خاندان میں بیٹیوں اور خادموں کی حیثیت دی جاتی ہے۔ ہومری مذہب بلاشبہ اسی تنظیم کی ایک مثال ہے لیکن یہ تنظیم مصنوعی اور ادبی نوعیت کی تھی۔ اس سے یونانی تہذیب کے اصلی معتقدات اور مذہبی رسوم پر روشنی نہیں پڑتی[۲]

یہ عمل خواہ کتنا ہی ادھورا ہو۔ بت پرستی کے پس پردہ ترتیب و تنظیم کا ایک سلسلہ جاری رہتا ہے۔ حیات معاشرتی کی ترقی کے ساتھ ساتھ، جب کہ اس میں مختلف شعبے اور وظیفے معین و مشخص ہو جائیں، ذہن انسانی عالم اصنام کو عالم انسان کے نمونے پر قیاس کرنے لگتا ہے۔

(باقی)

Höffding: The phil of Religion. at

زندگی

صبح کو چند مہمان آ گئے تھے تمام دن ان کی خاطر مدارات میں صرف ہو گیا۔ عصر کے قریب میں بمشکل مطالعہ کے لئے وقت نکال سکا اور شام تک پڑھتا رہا۔ اسی ضمن میں سہ پہر کی ہوا خوری بھی نہ ہو سکی۔ جب چراغ روشن ہوئے تو کتابوں سے دل برداشتہ ہو کر صحیفہ فطرت کے مطالعہ کے لئے میں مکان کی چار دیواری سے باہر نکلا۔ ابھی دس قدم بھی نہ گیا تھا کہ کسی نے آہستہ سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ مڑ کر دیکھا تو ایک دبلا پتلا چھوٹے قد کا آدمی میلی سی اچکن پہنے کھڑا تھا شام کے دھندلکے میں اسے پہچاننے میں مجھے کچھ دقت ہوئی لیکن جب اس نے مانوس اور خریری آواز میں، اور یقیناً وہ آواز دنیا میں صرف ایک ہی شخص کی ہو سکتی تھی۔ میرا نام لے کر پکارا تو میں حیرت سے "اصغر" کہہ کر بے تحاشا اس سے لپٹ گیا۔ معانقہ ختم ہوا تو سب سے پہلے میں نے اس کی ہیئت ظاہری پر لب کشائی کی جس کی وجہ سے وہ بالکل اجنبی معلوم ہو رہا تھا۔ بے انتہا بے تکلفانہ انداز میں اس کی پیٹھ پر تھپکی دیتے ہوئے میں نے کہا "خیریت تو ہے۔ تم نے یہ کیا حالت بنا رکھی ہے! اگر تم نہ بولتے تو شاید میں تمھیں پہچان بھی سکتا"

اس نے کچھ رکتے رکتے کہا "میں ملتان سے آ رہا ہوں۔ راستے میں میرا کپڑوں کا بکس چوری ہو گیا۔"

ہمدردی کی بجائے میرے منہ سے بے اختیار قہقہہ نکل گیا۔ پھر ہنسی کو ضبط کرتے ہوئے کہا "واللہ قدرت بھی عجب ستم ظریف واقع ہوئی ہے۔ تمھارے کپڑوں کے بکس کا گم ہو جانا اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایسا ہی افسوسناک سانحہ ہے بلکہ اس سے بھی شدید جیسا کسی مصور یا نقاش یا سنگتراش کی اختراعات فائقہ اور عمر بھر کی عرق ریزی سے جمع کئے ہوئے نوادر روزگار کا کھویا جانا۔ یقیناً اس حادثہ سے صنعت اور فنون لطیفہ کی دنیا کو بہت نقصان پہنچے گا۔ کہو یہ واقعہ کیونکر پیش آیا؟

اس نے کہا "بندہ خدا، مذاق پھر کر لینا پہلے یہ تو پوچھو کہ میں آیا کیوں ہوں۔ میرے قیام وطعام کا بندوبست کرو۔ میں تمہارے یہاں ٹھیروں گا"

"بسم اللہ، آیئے" میں سیدھا اسے اپنے بیٹھنے کے کمرے میں لے گیا۔ جب ہم اطمینان سے آرام کرسیوں پہ دراز ہو گئے اور لیمپ کی روشنی اس کے چہرے پر پڑی تو میں نے دیکھا کہ اصغر بہت زرد اور نحیف ہو رہا ہے۔ اگرچہ اس نے مخصوص انداز میں اپنی ترکی ٹوپی کو اتار کر میز پر پھینک دیا اور زیر لب گنگنانے لگا لیکن اس کی ہئیت مجموعی سے صاف پتہ چل رہا تھا کہ وہ بننے کی کوشش کر رہا ہے دراصل آج کا اصغر اس اصغر سے جسے میں جانتا تھا کوئی نسبت نہ رکھتا تھا۔ اداس، منحنی سا چہرہ، معمولی اونٰے درجہ کے لباس میں ملبوس، آنکھوں میں پریشانی کے آثار، اور کہاں وہ چاق چوبند خوش طبع، انگریزی فیشن کا دلدادہ اصغر جو اپنی سحر کار شخصیت اور ندرتِ کلام سے حاضرین کو مبہوت کر دینے کے علاوہ لطیف بذلہ سنجیوں اور فلک شگاف قہقہوں سے بزم کی بزم کو کشت زعفران بنا دیتا تھا۔ اس کا حسن مذاق مسلم اور اس کی رائے خصوصاً پوشاک اور آرائش کے معاملات میں ہمیشہ ہمارے حلقۂ احباب میں سند کے طور پر پیش کی جاتی تھی۔ چند لمحے خاموشی میں گذر گئے تو میں نے کہا "ہاں تو تم نے بتایا نہیں وہ بکس کیسے گم ہو گیا؟"

ارے بھئی کوئی بات ہو تو کہوں سراسر میری ہی غلطی تھی میں ملتان سے چلا تو بہت سراسیمگی اور ذہنی انتشار کے عالم میں تھا۔ یہ اچکن کھونٹی پر لٹک رہی تھی۔ اسی پریشانی میں جلدی سے اتار کر پہن لی اور باقی تمام کپڑے اور چند کتابیں ٹرنک میں بند کر لیں ریل میں بیٹھا تو بھی وہ ادھیڑ بن جاری رہی اور میں اس ڈبے کے باقی مسافروں کا بخوبی جائزہ بھی نہ لے سکا۔ راستہ میں اتفاق سے میری آنکھ لگ گئی اور خانیوال اسٹیشن پہ جاگا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ٹرنک غائب کمرے میں میرے سوا اور کوئی مسافر نہ تھا۔ میں نے گارڈ، اسٹیشن ماسٹر اور پولیس کے افسر کو فوراً اطلاع کی۔ وہ کہنے لگے کہ اپنا سفر منقطع کر کے یہیں ٹھیر جاؤ تاکہ تلاش وتفتیش میں سہولت ہو مگر میں نے سوچا مضیٰ ما مضیٰ، قسمت اچھی ہوئی تو بکس بھی مل جائے گا ورنہ جان تو باقی ہے

اُن کو ضروری ہدایت دے کر میں چلا آیا۔ اگر یہ نقصان بعض اور حالات کے ماتحت ہوتا تو شاید میں بالکل ہی محسوس نہ کرتا۔ مگر جیسا مبہم پروگرام اب میرے پیش نظر ہے اور جس قسم کی غیر مستقل زندگی سے میں دوچار ہونے والا ہوں وہاں لباس ایسی اہم اور ضروری چیز کی عدم موجودگی سے ضرور رنج ہو گا۔

میں نے ایک لمبا سانس لیا اور کہا "اصغر ہم ہندوستان میں کتنی جلدی بوڑھے ہو جاتے ہیں۔ میری مراد جذباتی بڑھاپے سے ہے تم اور ذہنی انتشار کے عالم میں گھر سے چلو، اور پھر تمام سفر ایک ادھیڑبن میں گزار دو خدا کی قسم میں باور نہیں کر سکتا۔ مگر جب دیکھتا ہوں کہ یہ بڑھاپا ہر لحظہ ہم پر شدت سے وار کر رہا ہے اور بہت کم لوگ ہیں جو اپنے اندر قوت مدافعت رکھتے ہیں تو میرے لئے حیرت کی کوئی وجہ نہیں رہتی اور تمھاری گذشتہ زندگی سراسر ایک تعلی معلوم ہوتی ہے"

"تعلی!" اصغر چمک اٹھا "تم دیکھو گے کہ میں نے اپنے اصول سے سرمو انحراف نہیں کیا ہے باقی رہا یہ کہ میں خاص احوال میں کیوں سراسیمہ ہوا تو عرض یہ ہے کہ میں نے اس بات کا تو کبھی دعویٰ نہ کیا تھا کہ میرے اعصاب فولاد اور قلب و دماغ پتھر کے ہیں۔ ہر ذی حیات شعوری یا غیر شعوری طور پر زندگی کی ارتقائی منازل طے کر رہا ہے۔ اسرار حیات کو سمجھ لینے کا دعویٰ تو مجھے نہیں ہاں میں نے ایک ایسا نکتہ ضرور معلوم کر لیا ہے جس سے زندگی کی غایت پر روشنی پڑتی ہے۔ اسی روشنی میں میں نے اپنے لئے چند اصول وضع کر لئے ہیں جو میری رہبری کر رہے ہیں تم ان باتوں پر ہنستے ہو لیکن ایسی ہنسی میں پہلے سینکڑوں مرتبہ دیکھ چکا ہوں۔ تم مجھے نور کو تاریکی اور تاریکی کو نور کہنے پر مجبور نہیں کر سکتے۔ بیشک مجھ میں بہت سی خامیاں ہیں جن کے دفعیہ کے لئے میں ہمہ اوقات مصروف جدوجہد ہوں۔ آخر انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں کہ گردش مدام سے گھبرا نہ جاؤں ہر چند جانتا ہوں کہ یہ گھبراہٹ سراسر بے سود اور تکمیل حیات میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے لیکن میرے عمل کی کوتاہی سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ زریں اصول جن کی حقانیت و صداقت پر میرا اعتقاد ہے اپنے اندر کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔ تم اسے وہم کہتے ہو لیکن خدارا مجھے بتاؤ ہماری زندگی میں کوئی چیز، مادی یا غیر مادی

ایسی ہے جس کی بنیاد وہم پر نہ ہو؟ عزیز دوست! انسان کے تمام اعمال دعیار اعتباری ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے تو کامیابی پر آپے سے باہر ہو جانے اور ناکامی پر گریہ وزاری کرنے کے کیا معنی؟ تم میرے ہی کہنے سے اس اصول کو جسے میں صداقت اور تم وہم سے تعبیر کرتے ہو ایک مرتبہ تو اپنی زندگی میں جاگزیں ہو جانے کا موقع دو اور پھر دیکھو کہ حجابات یک قلم اٹھ جاتے ہیں یا نہیں؟ زندگی پر ایک غیر فانی گرفت تمہیں حاصل ہوتی ہے یا نہیں؟ علت و معلول کی اس دنیا میں جہاں جاندار اور بے جان سبھی ایک غیر مختتم سلسلہ میں منسلک ہیں، میں اسباب و نتائج کی طبعی کڑی سے کیونکر آزاد ہو سکتا ہوں۔ باقی انسانوں کی طرح میں بھی حسب منشا نتائج اخذ کرنے کے لئے، اسباب پر قدرت کاملہ حاصل کرنے کا متمنی ہوں۔ مگر بسا اوقات ناکامی سے واسطہ پڑتا ہے۔ ناکامی ہماری طبائع پر کیونکر اثر انداز ہوتی ہے۔ بس یہیں سے میرے تمہارے راستے الگ الگ ہو جاتے ہیں"۔

ابھی خدا معلوم وہ اس کے بعد کیا کچھ کہہ جاتا کہ میں نے دفعتاً ایک قہقہہ لگا کر اسے خاموش کر دیا۔ میں نے کہا "سبحان اللہ، کیا کہنے ہیں آپ کی لسانی کے۔ آئینہ لاؤں حضور کے سامنے کہ آپ کو اپنے اصول کی حقانیت پر ایمان آجائے۔ ذرا اس چہرہ کو دیکھو جس میں خون زندگی کا قطرہ تک نظر نہیں آتا اپنی شکن در شکن پیشانی دیکھو۔ رخساروں کی زردی اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے دیکھو اپنے ہاتھوں سے اپنے جسم کی ہڈیاں گن لو ایک اچٹتی ہوئی نگاہ اپنے لباس پر بھی ڈال لو کہ یہ اس شخص کا لباس ہے جو زیادہ عرصہ نہیں گذرا ذوق جمال و آرائش لباس کے معاملہ میں مجتہد کا درجہ رکھتا تھا اور پھر مجھے بتاؤ کہ اگر غیر فانی شباب اسی کا نام ہے تو ننگ شباب کی اصطلاح کس پر عائد ہوتی ہے؟"

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اصغر کے پچھلے حالات قدرے تفصیل کے ساتھ بیان کروں کہ یہ گفتگو زیادہ دلچسپ اور واضح ہو سکے۔ یہ کہنا کہ اصغر میرا دوست تھا چنداں قابل التفات بات نہیں کیونکہ طالب علمی کا زمانہ تو ہر شخص پر دوستی کا ملمع چڑھا دیتا ہے۔ اصغر اور میں چار سال ایک ہی کالج اور ایک ہی دار الاقامہ میں رہے جن میں سے ایک سال کے لئے میں اور وہ ہم کمرہ بھی تھے۔ اصغر

کی والدہ انتقال کر چکی تھیں اور اس کے والد نے نکاح ثانی کر لیا تھا۔ اصغر کے حقیقی بھائی بہن کوئی نہ تھا اور والد کے ساتھ بھی اس کے تعلقات اگر کشیدہ نہ تھے تو بہت زیادہ خوشگوار بھی نہ تھے طوعاً و کرہاً وہ اس کے تعلیمی اخراجات کے کفیل ہو رہے تھے۔ ان ہی وجوہ کے باعث اصغر کی تمام تر توجہات اور دلچسپیوں کا مرکز اس کی اپنی ہی زندگی تھی چھٹیوں میں بھی وہ بہت کم مکان پر جاتا تھا۔ کبھی میرے ہاں، کبھی آپ کے، یونہی فرصت کا وقت گذار لیتا یا اگر جیب گرم ہوئی تو ہندوستان کے مختلف شہروں کا چکر لگانا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ حالات کی اس ناسازگاری نے اصغر کی طبیعت میں ایک خاص قسم کی بے نیازی اور ارادہ میں پختگی پیدا کر دی تھی۔

ہیئتِ اجتماعی کا فرد ہونے کی حیثیت سے انسان پر بہت سے فرائض ایسے بھی عائد ہوتے ہیں جن کو اس کے طبعی رجحان اور حقیقی ذوق کے ساتھ چنداں تعلق نہیں ہوتا۔ والدین کی خدمت، دوستوں کی مروت، بیوی بچوں کی محبت، بھائی بہنوں کے تعلقات غرض ایسی سینکڑوں زنجیروں نے ہمیں سوسائٹی کے مختلف شعبوں سے اس طرح باندھ رکھا ہے کہ انفرادی زندگی کا کوئی مفہوم رہا ہی نہیں۔ دراصل انسانی زندگی ان ہی رشتوں اور جذباتی تعلقات کے مجموعہ کا نام ہے۔ ان بندھنوں سے جیتے جی آزاد ہونا محالات سے ہے لیکن ہم ایسی زندگی کا تصور ضرور کر سکتے ہیں، جہاں انسان محض اپنے لئے زندہ رہتا ہے۔ کہتے تو ہیں کہ اکیلا خدا دشمن کو بھی نہ کرے مگر ایسا قائم بالذات شخص جو طعن و تشنیع کے دغدغے سے بے نیاز اپنی ہر ممکن الحصول خواہش کی تکمیل کے لئے آمادہ کار ہو جائے، جس کے لئے کل کائنات سمٹ سمٹا کر اس کی اپنی زندگی میں محدود ہو گئی ہو، جس کی آرزوئیں رسمیات عہد کے دباؤ اور جس کے ارادے خندہ استہزا کے خوف سے یکسر آزاد ہوں بلاشبہ اپنی زندگی میں ایک خاص لذت رکھتا ہے۔ بعض دنیا دار شاید اس حالت کو آوارگی سے تعبیر کریں لیکن سچ پوچھئے تو ہر جذبہ اپنی آخری منزل میں بے عنان ہو کر آوارگی ہی کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ آج سے کئی سال قبل جب میں اول اول اصغر سے ملا تو اس کی ایسی ہی آزادی و بے عنانی نے مجھے بھوچکا سا کر دیا تھا کہاں کالج کا ایک مبتدی اور کہاں یہ باغیانہ طبیعت۔ ذہانت کے لحاظ سے وہ اپنے ہم جماعتوں

میں بہت کم حریف رکھتا تھا۔ لیکن چونکہ اس نے اوقات بہت بے ڈھنگے طریقے سے تقسیم کر رکھے تھے اس لئے بعض دفعہ وہ کئی کئی ہفتے کسی کتاب کو نہ چھوتا پڑھنے پر آتا تو رات کو آنکھ جھپکانا بھی حرام سمجھتا میں کبھی اس کے لاابالی پن پر لب کشا ہوتا تو وہ یہی جواب دیتا کہ "میں طالب علمانہ شہرت حاصل کرنیکا خواہاں نہیں ہوں کہ کتابوں میں سر کھپانا مقصود زندگی قرار دے لوں۔ کتب بینی جو مشاہدہ کی صلاحیت سلب کرلے ایک ذہنی بیماری ہے۔ میرے لئے تو اسی قدر مطالعہ کافی ہے جس سے امتحان میں کامیابی حاصل ہو سکے" اور پھر خوشی میں یہ شعر پڑھ دیتا

مومن بہشت و عشقِ حقیقی تمہیں نصیب ہم کو تو رنج ہو۔ جو غم جاوداں نہ ہو

دو سال بعد جب اتفاق سے میرا اور اس کا قیام ایک ہی کمرے میں ہو گیا تو اس کے حالات و اطوار زیادہ وضاحت کے ساتھ مجھ پر عیاں ہونے لگے۔ اس کا معمول تھا کہ سرِ شام کھانا کھا کے نکل جاتا اور رات کے گیارہ بارہ بجے واپس آتا۔ حالانکہ قواعد کی رو سے کوئی طالب علم ۹ بجے کے بعد اپنے کمرے سے باہر نہیں رہ سکتا تھا۔ خوبی قسمت سے دارالاقامہ کے مہتمم بہت با مذاق اور زندہ دل تھے۔ انھوں نے جب شکایت کی اصغر صاحب نے ہنس کر جواب دیا "حضرت، انسان پر ایک ہی قسم کے قوانین عائد کرنا دانشمندی نہیں بعض کو قدرت مستثنٰی بنا کر پیدا کرتی ہے۔ بندہ بھی انہیں میں سے ہے"

اس کی صحبت یقیناً افزائش مسرت کا موجب تھی۔ مگر جب وہ آدھی رات کو آکر سوتوں کو جگاتا اور دروازہ کھٹکھٹا کر میرے آرام میں بے طرح مخل ہوتا تو طبیعت جھنجھلا اٹھتی تھی، اور پھر ایک روز کی بات ہو تو مضائقہ نہیں، اس کا تو مہینہ میں تیس دن وطیرہ ہی یہی تھا۔ ایک رات وہ خلاف معمول بہت دیر سے آیا۔ شاید دو بجے ہوں گے۔ صبح ہوئی تو میں نے سامان باندھنا شروع کر دیا بڑی بے تابی سے پوچھنے لگا "خیر ہے، کہاں کا ارادہ ہے؟"

میں چلانے لگا "تمھارے ساتھ رہ کر میں اپنی صحت خراب کرنا نہیں چاہتا۔ غضب خدا کا، دن بھر کالج کی بک بک میں صرف ہو جاتا ہے، رات کو آرام کا وقت تم یوں برباد کر دیتے ہو۔ اگر

ایسی ہی آوارگی دماغ میں سما گئی ہے، تو کالج کو خیر باد کہدو۔ تم ایسے جہاں گردوں کے لئے خدا کی زمیں تنگ نہیں ہے "

وہ بستر سے اچھل کر مجھ سے آلپٹا " دوست خفا ہو گئے۔ سچ پوچھو تو تمھارے ہی بھروسے پر یوں بے فکری سے گذر رہی ہے۔ ورنہ مجھ ایسے سیلانی کو ہوسٹل کی قید و بند میں رہنے کا کب سلیقہ تھا۔ یار تم بھی کسی کٹھ ملا سے کم نہیں۔ کئی بار میں نے کہا کہ کتابی کیڑا بننا ہی طالب علمی کی غایت نہیں۔ انسان تو عمر بھر طالب علم رہتا ہے اور حصول علم کی سینکڑوں راہیں دنیا میں کھلی ہیں۔ لیکن تم ہو کہ کالج کے کمرے اور درسی کتابوں کے گنبد سے نکلنا ہی نہیں چاہتے۔ خدا کے لئے کوئیں کے مینڈک نہ بنو۔ ذرا چلو پھرو دنیا جہاں کی سیر کرو۔ زندگی کا مختلف پہلوؤں سے نظارہ کرو۔ حواس کو آزاد چھوڑ دو۔ پھر دیکھو کہ نفسیات کا علم جیمز کی کتاب سے حاصل ہوتا ہے یا تجربات ذاتی سے "

اصغر سخت کثیر الاحباب تھا۔ لیکن دوستی کے متعلق بھی اس کا نظریہ عجیب تھا۔ وہ کہا کرتا تھا۔ " مجھے ان لوگوں پر ہنسی آتی ہے جو دوستی کو بھی لازمہ حیات تصور کرتے ہیں۔ جو دھویں صدی کی شعلہ آشام دوستیاں پانی کے بلبلے سے جلد فنا ہو جاتی ہیں۔ پھر ایسی ناپائیدار چیز کو ہم کیونکر روح کی غذا بنا سکتے ہیں۔ وہ لوگ جو دوستوں کی صحبت کے بغیر زندگی گذارنے کی اہلیت نہیں رکھتے خطرناک فریب نفس میں مبتلا ہیں۔ تم نے بہت سے فریب خوردہ اشخاص کو دیکھا ہوگا جو گذشتہ صحبتوں کی یاد میں آٹھ آٹھ آنسو روتے اور ایام رفتہ کو یاد کر کرکے آہیں بھرنے کے عادی ہیں۔ یہ بچارے اسی قماش کے بزرگ ہیں جو بسر اوقات کے لئے دوستی کو دو وقت کی روٹی کی طرح ضروری سمجھتے ہیں اور اس پر مستزاد یہ کہ اپنی وفا کیشیوں اور جاں سپاریوں کے عوض میں دوسروں سے بھی تسلیم و وفا کی توقع رکھتے ہیں۔ نادان نہیں جانتے کہ اس تغیر پذیر عالم ارضی میں اکثریت ان کی ہے۔ " جو نہیں جانتے وفا کیا ہے "۔ بھائی سچ پوچھو تو میں تو شطرنج اور ٹینس کی طرح دوستی کو بھی وقت فرصت گزارنے کا ایک کھیل سمجھتا ہوں جب کام سے طبیعت اکتائی دو گھڑی کے لئے کسی دوست کو جا پکڑا۔ جس طرح شطرنج نہ کھیلنے کے باوجود تمام عمر خوش رہ سکتا ہوں۔ اسی طرح

دوستوں سے قطع تعلق کر لینے پر بھی میری زندگی میں ملال پیدا نہیں ہو سکتا۔ کسی چیز کا پابند ہو جانا زندگی کی نشوو ارتقار کو غارت کر دیتا ہے۔ رنج و مسرت کی تخلیق تو ہمارے نفس کے سپرد ہے واقعات خارجی کو ہم اپنے رنگ میں رنگ لیتے ہیں ورنہ غم و شادی تو ایک اضافی امر ہے۔

اصغر صرف لباس کے معاملہ میں محتاط تھا۔ کچھ تو مزاج طبعاً خوش پوشی کی طرف راغب تھا اور کچھ اس کا خیال تھا کہ دنیا کو صرف لباس کے ذریعہ سے دھوکا دیا جا سکتا ہے۔ وہ کہتا تھا کہ میں بڑے بڑے جہاں دیدہ لوگوں سے ملا ہوں جو بزعم خود علم و فضل کے مجسمے بنے بیٹھے ہیں اور جن کا خیال ہے کہ انھیں زندگی کے نشیب و فراز اور حیات انسانی کی باریکیوں سے کامل آگاہی حاصل ہے لیکن کوئی ملاقات ایسی نہ تھی جس کے اختتام پر میں نے ان کی سادہ لوحی پر قہقہے نہ لگائے ہوں فیشن کے مطابق شاندار لباس زیب تن ہو، اور واقعات عالم پر فصاحت کے ساتھ گفتگو کرنیکا ڈھنگ بھی آتا ہو تو دنیا کو الو بنا لینا بڑی بات نہیں"۔ ایک دن تو اس نے غضب ہی کر دیا بڑے دن کی تعطیلات سے قبل کالج کا سالانہ ڈنر تھا جس میں پہن کر جانے کے لئے اس نے بڑے ٹھاٹھ کا سوٹ سلوایا تھا۔ ڈنر کے روز جب اس نے اپنے کپڑوں کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ نئے سوٹ کے ساتھ پہننے کو کوئی اچھی نکٹائی نہ تھی۔ اُدھر مہینے کا اخیر تھا اور اس کی جیب خالی ہو چکی تھی۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ فلسفہ کی درسی کتاب (جسے اس نے ابھی چند روز ہوئے خریدا تھا) ایک کتب فروش کے یہاں نصف قیمت پر فروخت کر دی اور بازار سے نئی نکٹائی خرید لایا۔

اپنی خصوصیات کے لحاظ سے اصغر ایک معمہ تھا۔ جن لوگوں کو اس سے زیادہ واقفیت نہ تھی وہ اسے ایک سطحی نگاہ رکھنے والا شخص تصور کرتے تھے وہ چونکہ کسی شے کو اہمیت دینے کا عادی نہ تھا اس لئے بعض سنجیدہ مزاج لوگوں کو بھی اس سے شکایت تھی لیکن دراصل اصغر کو دنیا والوں کی کمزوریاں اور تعلیاں دیکھ دیکھ کر زیر خند ہو جانے کی عادت ہو گئی تھی عیب و ثواب کی کوئی راہ نہ تھی جس پر وہ گامزن نہ رہ چکا ہو، نیکی و بدی کا کوئی کوچہ نہ تھا جس کو اس نے

پامال نہ کیا ہو اور پھر دامن جھاڑ کر یوں نہ نکل آیا ہو کہ

ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں　　جسے غرور ہو آئے کرے شکار مجھے

میں اس کی دقت نظر کا ہمیشہ معترف رہا ہوں۔ لاعلمی اور جہالت کو مسرت کا ضامن قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن وہ ان چند در چند نفوس میں سے تھا جو بقول اسپنسر "سوچتے ہیں اور پھر مسرور رہتے ہیں" اصغر یقیناً ایک رجائی تھا لیکن اس کی امید جہالت پر مبنی نہ تھی۔ اس نے زمانہ کا سرد وگرم چکھا۔ خار دار جھاڑیوں میں الجھ کر دامن کو تار تار کیا۔ پھولوں کے تختوں میں سے نسیم سحری بنکر گذرا اور پھر اسی نتیجہ پر پہنچا کہ جو کام کرتی ہے نظر نام ہے پیمانے کا۔

اپنی نگاہ میں رنگینی پیدا کر لو اور کل کائنات قوس قزح کی طرح نظر فریب ہو جائیگی طبیعت میں استغنا پیدا کر لو تو جھونپڑی میں بھی محلوں کے خواب دیکھو گے۔

ایک روز ہم سب بیٹھے تھے۔ ہمارا دوست وحید بھی تھا۔ وحید تھا تو بہت ذہین لیکن اُس کی ذہانت اس کے لئے وبال بن گئی تھی۔ کچھ شاعر، کچھ وہمی، قدرے مریض اور اس پر طرہ یہ کہ محبت کا زخم خوردہ۔ وہ اکثر عزلت نشینی کو پسند کرتا اور عہد ماضی کی نوحہ خوانی میں مصروف رہتا تھا یا پھر مستقبل کے خواب دیکھ دیکھ کر اپنے حال کو اور زیادہ افسردہ بنا دیتا تھا وہ اصغر کو "ہری چگ" کے نام سے پکارتا تھا اور اصغر صاحب تھے کہ اس لقب کی موزونیت پر لوٹ پوٹ ہو جاتے تھے۔ اصغر نے اس روز وحید کو مخاطب کر کے دیر تک سلسلہ کلام جاری رکھا اور سچ پوچھئے تو ہماری معلومات میں دل خوش کن اضافہ کیا وہ کہنے لگا "دیکھو بھئی وحید! اگر چندے تمھاری یہی حالت رہی تو قیس کی دیوانگی اور فرہاد کی کوہکنی کو دنیا یقیناً فراموش کر دے گی اور تم ان کے جانشین کی حیثیت سے مسند جنون پر رونق افروز ہو گے اگر بقائے دوام کے خواہشمند ہو یا شہیدان عشق کی فہرست میں نام لکھانا چاہتے ہو تو خدا کے لئے اُس "نیک بخت" کو بھلا دو۔ زندہ قوموں کا عشق بھی حیات افروز ہوتا ہے لیکن ہمارے ہاں عشق اور تپ دق ہم معنی الفاظ ہیں اور پھر اس ملک میں رہ کر عاشق بننا تو فطرت کے خلاف جنگ کرنا ہے، میں سنتا ہوں کہ تمھاری محبوبہ

ہندوستان کے جذبات کس طرز انتخاب کے ماتحت کسی اور کے حوالے کر دی گئی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو
تم کیوں پہاڑ سے ٹکرا کر سر کو لہولہان کر رہے ہو۔ محبت تو جذبات کی انتہائی کمزوری کا نام ہے
اور ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ ہر دعوے دار اپنی محبت کو بے لوث ظاہر کرتا ہے خون کا جوش زیادہ ہوا
محبت کے جراثیم پیدا ہونے شروع ہو گئے۔ محبت کا جذبہ بے لوث صرف ماں کے سینے میں فروزاں
ہوتا ہے اور باقی سب باطل۔ اس غلام آباد میں مصائب کیا کم ہیں کہ عشق کا روگ بھی بڑھا
لیا جائے۔ سب سے بڑی مصیبت تو یہ ہے کہ ہم میں زندگی بسر کرنے کی صلاحیت نہیں۔ بات بات پہ
آنکھوں سے آنسو بہانا ہر وقت ٹھنڈی آہیں بھرنا۔ دنیا کو دھوکے کی ٹٹی کہنا
ہر ہنسنے والے کو خدا سے باغی اور قہقہہ لگانے والے کو گنہگار خیال کرنا یہاں دین داری میں
داخل ہے۔ تم گردن جھکا کر آنکھیں بند کیے گزر رہے ہو درآنحالیکہ چھوٹی چھوٹی چیزیں
معمولی معمولی واقعات جن کے اندر مسرت و شادمانی کے لازوال خزانے پوشیدہ ہیں تمھیں
زبان حال سے پکار پکار کر اپنی طرف متوجہ کر رہے ہیں۔ کوئی بستر علالت پر کراہ رہا ہے اور
کوئی عسرت و تنگدستی کے ہاتھوں نالاں ہے۔ کوئی کسی عزیز کی موت پر نالہ کناں ہے اور
کوئی فکر فردا اور غم ماضی میں جان گھلا رہا ہے۔ یہ کیوں؟ اس لئے کہ ہم ابھی تک بحر حیات کی
موجوں کے تھپیڑے کھا رہے ہیں۔ کوئی نہیں جو سطح کے نیچے جا کر دیکھے کہ کیسے کیسے گہر ہائے
نایاب موجود ہیں۔ کامیاب زندگی کا راز یہی ہے کہ زندگی کو اہمیت نہ دو۔ زندگی تو سرد
اور معطر ہوا کا جھونکا ہے جو سن سے گزر جاتا ہے اور تم اس شمیم جاں فزا کو مقید کرنے کی فکر میں ہو
یہ جھونکے اسی طرح آتے اور گزرتے جائیں گے۔ تمہارا فرض بس اتنا ہے کہ ان کی عطر بیزی سے
اپنے دل و دماغ کو معطر کر لو اور چلتے جاؤ۔ کائنات کی وسعت بے پایاں کو دیکھو جس میں اس
دنیا جیسی ہزاروں دنیائیں آباد ہیں اور پھر ان دنیاؤں میں جاندار مخلوق بھری پڑی ہے
اس بے شمار جاندار آبادی کا نقشہ چشم تخیل کے سامنے لاؤ اور سوچو کہ ارض و سما کے درمیان
اور اس پہنائے عظیم کے اندر ایک تمھاری ہستی بھی ہے جو فنا کے غار عمیق کے کنارے کھڑی یاد

مخالف کی تندیوں سے ہر گھڑی کپکپا رہی ہے۔ تمہاری تو حقیقت ہی کچھ نہیں۔ اجل کا ادنیٰ سا اشارہ تمہیں ملیامیٹ کر سکتا ہے۔ سہ روزہ زندگی کی ناپائیداری پر غور کرو کہ کل صبح تمہیں اپنے بستر سے صحیح و سالم اٹھنے کا یقین بھی نہیں اور پھر آلام و تفکرات کے اس لامتناہی سلسلہ پر غور کرو جس نے تم پر خواب و خور حرام کر کے رات کی نیند اور دن کا چین چھین رکھا ہے کیا تمہارے اوہام و ترددات تمہاری کم فہمی کی دلیل نہیں؟ دماغ کو استعمال کرو اور سوچو کہ تمہاری کل پریشانیاں کیا صرف اس نقطہ پر نہیں آ ٹھیرتیں کہ تمہیں پیٹ بھر کھانا اور تن ڈھانکنے کو کپڑا درکار ہے؟ پھر تم کیوں خیالی ہموم و غموم سے مرے جا رہے ہو؟ اگر ریشم کی قمیص نہیں تو نہ سہی گاڑھے کا کرتہ پہن لیں گے۔ ولایتی ساخت کا لیمپ میسر نہیں آتا تو بلا سے دیسی جو اس سے زیادہ مضبوط اور آرام دہ ہے۔ عزیز دوست ذرا غالب معجز بیاں کے اس شعر پر غور کرو۔

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

تم بھی دنیا کو ایک اسٹیج تصور کرو اور ہر مرد و زن کو ایکٹر۔ تفریح و تفنن اور رنج و حرماں کے کل مظاہر درحقیقت کامیڈی اور ٹریجیڈی کے کھیل ہیں جن سے متاثر ہونا قرین دانش نہیں۔ ہر واقعہ کو ایک بے غرض و غیر جانب دار تماشائی کی حیثیت سے ملاحظہ کرو۔ اس عالم متغیر میں جس کی کسی شے کو ثبات نہیں اور جہاں ہر گذرنے والا لمحہ ایک نئی زندگی کی آفرینش کا پیغام دے جاتا ہے۔ زمانہ کی نیرنگیوں اور انقلابات دہر سے اثر پذیر ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ تمہیں اپنے دل و دماغ پر قابو نہیں۔ واقعات عالم کا تماشا کرتے وقت ایک سائنس داں کی طرح اپنے حسیات کو بالکل علیحدہ رکھو ورنہ یہاں گریہ و زاری کی تو یہ کیفیت ہے کہ

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

میں اکثر سوچتا ہوں کہ ہندوستان میں ہم اس قدر جلد کیوں بوڑھے ہو جاتے ہیں۔ میرے خیال میں اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم زندگی کو غیر معمولی اہمیت دینے کے علاوہ اس میں کوئی جدت پیدا نہیں کرتے۔ پیدائش سے موت تک ہم ایک ہی ماحول میں رہتے ہیں۔ وہیں پرورش پائی، وہیں بڑھے

اور وہیں مر گئے۔ کسی چیز سے پوری طرح لذت اندوز ہونے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے مختلف پہلوؤں سے تمام امکانی حظ حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ طالب علم اگر صبح سے شام تک کتابوں میں سر کھپائے اور کھیل کود حرام کرے یا ایک طبیب اگر دنیا کی طرف سے آنکھیں بند کر کے تشخیص امراض و معائنہ مرضیٰ تک ہی اپنے تئیں وقف کر دے تو اس نے زندگی کا صرف ایک پہلو دیکھا اور باقی پہلوؤں کے لئے وہ اندھا ہے۔ ایک ہی قسم کے ذائقہ سے طبیعت جلد سیر ہو جاتی ہے۔ مصروفیتوں میں رد و بدل کرتے رہو گے تو دنیا کی اشیاء زیادہ خوبصورت اور جاذب توجہ ثابت ہوں گی۔ کبھی فقیروں کا بھیس بنا کر "تماشائے اہل کرم" دیکھو تو کبھی اہل کرم بن کر فقیروں کا تماشا دیکھو۔ غالب نے کیا خوب کہا ہے:

بخشے ہے جلوۂ گل ذوق تماشا غالب　　چشم کو چاہیئے ہر رنگ میں وا ہو جانا

بی اے تک ہم ساتھ رہے۔ اس کے بعد میں ایم اے میں آ گیا اور اصغر گھر بے کار بیٹھا رہا۔ میرا خیال تھا۔ اب وہ زندگی کا بے کاری کے نقطۂ نگاہ سے مطالعہ کرے گا۔ لیکن بعد کو معلوم ہوا کہ اسکے والد اسے مزید تعلیم دینے کے حامی نہ تھے۔ اس لئے اصغر کو مجبوراً لاہور کی جاں بخش ہر سگامیوں سے محروم رہنا پڑا ایک سال گذر گیا اور اگلے برس اصغر نے یکا یک لا کالج میں داخل ہو کر سب دوستوں کو حیران کر دیا۔ کہاں اصغر اور کہاں قانون کی کٹھن منزل۔ سال بھر اصغر قانون کی ضخیم اور خشک کتابوں کا پلندا اٹھائے دو میل کا فاصلہ طے کر کے ہر روز آٹھ بجے کالج پہنچتا رہا۔ اس کی باقی زندگی انھیں دیرینہ خصوصیات کی حامل تھی۔ جدت کا وہ اب بھی شائق تھا۔ اور شاید لا کالج میں داخل ہونا بھی جدت پرستی ہی کا کرشمہ تھا۔ مگر اس کی ذہانت قانون کی حریف نہ ہو سکی۔ یہاں تو وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں جنھیں صبح شام بجز کتابوں کے اور کسی چیز سے سروکار نہ ہو۔ امتحان میں ناکامی کی خبر اس کو ایک انگریزی روزنامہ کے ذریعہ سے ملتان میں ملی۔ اس کے والد جو پہلے ہی سے تعلیم کو ایک ناگوار فرض اور غیر ضروری بار سمجھے بیٹھے تھے یہ خبر سنتے ہی برس پڑے صاف صاف انھوں نے کہدیا کہ "میرے مکان سے نکل جاؤ، میں عمر بھر کا اندوختہ تمہاری فضول خرچیوں اور تماشبینیوں پر لٹانا نہیں چاہتا"

اسی گفتگو نے متاثر ہو کر اصغر صاحب گھر سے چل کھڑے ہوئے تھے اور کپڑوں کا بکس کھو کر اداس و مضمحل میرے پاس پہنچے تھے۔ جب ہم کھانا کھا چکے تو میں نے پوچھا "اب کہاں کا ارادہ ہے؟"

"میں بمبئی جا رہا ہوں"

بمبئی؟ وہاں کیا کرو گے؟ میں نے حیرت سے پوچھا

"تم حیران کس بات پر ہوتے ہو! میں تمہاری طرح آئی سی ایس کے خواب تو دیکھ نہیں رہا ہوں کہ اس سے کم کسی چیز سے میری تشفی نہ ہو گی۔ تمہیں معلوم ہے کہ ذاتی وجاہت و حشمت کے قائم کردہ معیار میں میں تمہارا ہم خیال نہیں ہوں۔ میں تو صرف جان و جسم کا رشتہ برقرار رکھنے کے لئے روٹی اور تن ڈھانکنے کو کپڑا ایک انسان کے لئے ضروری سمجھتا ہوں اور یہ وہ چیزیں ہیں جو میں بہرحال اور ہر جگہ اپنے لئے بآسانی پیدا کر سکتا ہوں۔ اس لئے میرے لئے لاہور، کراچی، لکھنؤ، بمبئی یا لندن سب برابر ہیں"

چند روپے ان کے پاس تھے، کچھ مجھ سے لئے اور حضرت دوسرے روز بمبئی روانہ ہو گئے۔ اس واقعہ کو تین سال گذر گئے۔ ہم بظاہر ایک دوسرے کے لئے مر چکے تھے کیونکہ نہ اس نے مجھے کبھی خط لکھا اور نہ مجھے اس کا پتہ معلوم تھا۔ اس دوران میں میرے ہم سبق دوست آدم اسمٰعیل کی شادی کی تقریب آئی۔ آدم اسمٰعیل بمبئی کے رہنے والے تھے اور وہیں ان کا کاروبار تھا۔ ان کے سخت اصرار پر مجھے بھی اس تقریب سعید میں شریک ہونے کے لئے بمبئی جانا پڑا۔ جب برات اور ولیمہ کی گھما گھمی سے فراغت ہو چکی تو آدم صاحب نے اپنے خاص دوستوں کو ایک شام کو تاج محل ہوٹل میں دعوت دینے کا اہتمام کیا۔ تاج محل کی وسیع و شاندار عمارت کے ایک پرتکلف کمرے میں بیٹھے ہم سامان اکل و شرب کا انتظار کر رہے تھے کہ ہوٹل کا ملازم شوربے کی رکابیاں اٹھائے کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے دہلیز کے اس طرف قدم رکھا ہی تھا کہ میری اس کی نظریں چار ہوئیں۔ مجھے اپنی آنکھوں پر شک ہونے لگا۔ میں سمجھا کہ عالم خواب ہے اور جو دیکھ رہا ہوں اس کو حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ آنے والے شخص نے بھی میری طرف دیکھا اور

سوائے ایک خفیف تبسم کے اس کے چہرہ پر حیرت واستعجاب کی کوئی علامت نہ تھی۔ یہ اصغر تھا جو ہوٹل
کے ملازم کی مخصوص وردی پہنے ہمارے لئے میز پر کھانا چن رہا تھا جب وہ دوسری مرتبہ کمرے میں داخل
ہوا تو میں نے بے اختیار اس کا بازو پکڑ لیا اور کہا "اصغر تم کہاں؟" اس نے نہایت تحمل سے جواب
دیا "یہ مصروفیت کا وقت ہے۔ پہلے کھانے سے فارغ ہو لیجئے پھر باتیں کریں گے" میرے ساتھی
حیران تھے کہ کیا معاملہ ہے۔ میں نے انھیں یہ کہہ کر ٹال دیا کہ کھانے کے بعد مفصل گفتگو ہوگی جب ہم
بل ادا کر کے رخصت ہونے لگے تو اصغر چند منٹ کے لئے میرے پاس آیا اور کہنے لگا "ابھی کام ختم
نہیں ہوا ورنہ میں تمہارے ہمراہ چلتا۔ یہ بتاؤ ٹھیرے کہاں ہو؟ میں کل صبح آؤں گا"

میں نے اسے اپنی قیام گاہ کا پتہ دیا اور بمنت درخواست کی کہ خدا کے لئے اپنی اولین فرصت میں
ضرور پہنچنا۔ دوسرے روز میں ابھی ناشتے سے فارغ نہ ہوا تھا کہ اصغر کے آنے کی اطلاع ہوئی۔
ہلکے فاختئی رنگ کا سوٹ، بیش قیمت انگریزی ٹوپی اور نہایت اعلیٰ بوٹ پہنے اصغر صاحب کمرے
میں داخل ہوئے۔ میرے میزبان جو اب تک اصغر کے حالات واطوار سے بے خبر تھے اس قلب ماہیت
کو دیکھ کر حیران ہو گئے۔ اصغر نے اندر قدم رکھتے ہی ایک بلند بانگ قہقہہ لگایا اور آداب مجلس کو
بالائے طاق رکھ کر وحشیوں کی طرح مجھ سے لپٹ گیا۔

میں بار بار اس کے کپڑوں کی طرف دیکھ رہا تھا اور سخت متعجب تھا کہ اس طرفہ معجون آدم زاد کا
خمیر کس مٹی سے ہوا ہے رات ایک ہوٹل کا خدمتگار تھا اور اب ہائیکورٹ کے وکیل سے کم شان کا
مالک نہیں۔ میں نے پوچھا "تم نے بہروپ بھرنے کا پیشہ کب سے اختیار کیا ہے۔ کیا بمبئی میں شروع
سے یہی کام کر رہے ہو؟ کیسی شرمناک بات ہے کہ یونیورسٹی کا گریجوایٹ اور تم سا زیرک اور
خوش فہم شخص یوں ذلیل وخوار ہو"

اس نے کہا "اگر تم نے زجر وتوبیخ کی پرانی عادت ترک نہیں کی تو الحمد للہ میں بھی اپنی دیرینہ عادت
پر بدستور قائم ہوں۔ میں تم سے ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ دنیا ایک اسٹیج ہے اور ہم سب ایکٹر۔ تم میرے قول کو
متانت کے خلاف سمجھ کر ناقابل عمل خیال کرتے تھے۔ اب تو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہو کہ میں کس

امذانہ سے اس اصول کو اپنی عملی زندگی میں جاری وساری کر چکا ہوں۔ بھائی سچ جانو میں تم سے زیادہ مسرور و مطمئن ہوں۔ غم دنیا و فکر عاقبت سے آزاد ہوں۔ اچھا کھانا، اچھا پہننا، بمبئی ایسے شہر میں فطرت انسانی کا مطالعہ اور مجھے کیا چاہیئے؟ آزادی کا یہ عالم ہے کہ ڈھائی سال کی مدت میں بیسیوں پاپڑ بیل چکا ہوں۔ مدرسی اور اخبار نویسی میں نے کی۔ سنگر مشین کا ایجنٹ میں رہا۔ سینا اور تھیٹر کی ملازمت کا مزا میں نے چکھا۔ ٹرام میں نوکری میں نے کی۔ غرض کہ جہاں طبیعت ذرا اکتائی اور حواس پر بڑھاپے کے آثار نمودار ہوئے میں فوراً اپنی مصروفیت کی نوعیت میں تبدیلی پیدا کر لیتا ہوں اور زندگی پھر تر و تازہ ہو جاتی ہے ؎ جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی

تمیری صحت دیکھو، قابل رشک ہے یا نہیں؟" اصغر کی صحت واقعی بے نظیر تھی۔ گوشت اور خون کی کثرت۔ اس پر اس کا ورزشی جسم، پہلوان معلوم ہو رہا تھا۔" آج کل یہ کام ہے کہ دن کو یہاں کے ایک رئیس کے خورد سال بچے کو پڑھاتا ہوں۔ معقول مشاہرہ لینے کے علاوہ رہتا بھی انھیں کے مکان پر ہوں اور شام کو تاج محل ہوٹل۔ پچھلے دنوں جرمنی کی ایک مشہور تجارتی کمپنی کے گماشتے سے میری ملاقات ہو گئی تھی وہ اپنے کاروبار کے سلسلہ میں مجھے جرمنی لے جانے پر رضا مند ہے شرائط ابھی طے نہیں ہوئے ہیں۔ ممکن ہے چند ماہ میں جرمنی چلا جاؤں اور یوں یورپ جانے کی پرانی آرزو بر آئے۔"

مجھے بمبئی سے واپس آئے سال بھر سے زیادہ عرصہ ہو گیا ہے۔ آدم اسمٰعیل اور اصغر کی خاصی دوستی ہو گئی تھی۔ چنانچہ آدم صاحب کے خط سے معلوم ہوا کہ اصغر جرمنی روانہ ہو گیا ہے۔

غزل

حریم ناز میں میری نماز ہو جائے
جبیں شوق سراپا نیاز ہو جائے!

ہر ایک شے میں درخشاں ہو جلوۂ عصمت
مری نگاہ اگر پاکباز ہو جائے

پھر آرزو سے یہ معمور ہو گیا اے حسن!
دیارِ دل پہ پھر اک ترکتاز ہو جائے

یہ میری زیست کا حاصل ہے آپ کا کیا ہے!
اگر نگاہِ محبت نواز ہو جائے

کچھ ایسا نغمۂ بے تاب چھیڑ اے مطرب!
کہ بے قرار مرے دل کا ساز ہو جائے

مری نگاہ میں پھر کیا ہے گردشِ گردوں!
تری نگاہ اگر کارساز ہو جائے

وہی ہے رندِ حقیقت شناس نظروں میں
کہ پیرِ میکدہ سے بے نیاز ہو جائے

تلاشِ خویش میں گم ہوں یہ کیا قیامت ہے
کہ راز آپ ہی جویائے راز ہو جائے

نہ کٹ سکے گی شبِ تارِ زندگانی کی
یہ داستانِ محبت دراز ہو جائے

بہشتِ زیست ہے سوز و گدازِ عشق اخترؔ
خوشا وہ دل! کہ سراپا گداز ہو جائے

تنقید و تبصرہ

کتب۔

باطل شکن۔ الکلام الفصیح فی تحقیق حیات المسیح۔ ترکی جمہوریہ۔ مفتاح العربیہ۔ اصح السیر فی صدی البشر

رسائل۔

یادگار رسالانہ نمبر۔ سالنامہ حقیقت الاسلام۔ ساقی۔ سالانہ نمبر

باطل شکن | مصنفہ مولانا اکبر شاہ خاں صاحب نجیب آبادی۔ تقطیع خورد۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ اوسط۔ حجم ۶۰ صفحات قیمت فی نسخہ ۳۔ ملنے کا پتہ۔ منیجر صاحب مکتبہ عبرت۔ نجیب آباد۔ ضلع بجنور۔

ایک عیسائی پادری نے ایک کتاب تاویل القرآن لکھ کر اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ عیسائی قرآن کی روسے مذہب حق پر ہیں اور اہل اسلام کو ان سے مذہبی امور دریافت کرنے چاہئیں۔ اور ان کو برسر حق تسلیم کرنا چاہیئے۔ مولانا اکبر شاہ خاں نے قرآنی دلائل سے اس کتاب کے دجل و فریب کو نہایت خوبی اور صفائی کے ساتھ واضح کر دیا ہے۔ اور یہ دکھلا دیا ہے کہ قرآن کریم کے ہوتے ہوئے کسی قوم کا مکر و فریب مسلمانوں پر نہیں چل سکتا اور کبھی کے جھوٹ اور کذب کے پھندوں میں وہ آ سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ انھوں نے توریت اور انجیل کی تاریخی اور وجودی حیثیت بھی دکھلا دی ہے کہ یہ دونوں کتابیں دراصل مرفوع ہو چکی ہیں صرف ان کے محرف ترجمے باقی رہ گئے ہیں۔ اور اہل کتاب کے لئے دین حق حاصل کرنے کا اب کوئی راستہ بجز قرآن کریم کے نہیں رہ گیا ہے۔

مولانائے موصوف کی دیگر مختصرات کی طرح یہ کتاب بھی ہم کو بہت پسند آئی۔ معقول، مدلل اور سادہ و سلیس ہے

(ا۔ ج)

الکلام الفصیح فی تحقیق حیات المسیح | فرقہ مرزائیہ کا سب سے اہم مسئلہ جس پر جا بجا وہ بحثیں کرتے ہیں حیات مسیح کا مسئلہ ہے اس کے اوپر متعدد کتابیں اور رسائل بھی فریقین کی طرف سے لکھے جا چکے ہیں۔ حال میں مولانا مفتی قاری سید محمد مکی قادری سنوسی نے مندرجہ بالا نام سے چھوٹی تقطیع پر چار جز کا ایک رسالہ لکھ کر شائع کیا ہے۔ اس میں انھوں نے حیات مسیح کے دلائل لکھے ہیں۔ اور مرزا صاحب کے دعاوی کے خلاف بھی بہت سے براہین پیش کئے ہیں۔ انداز بیان متین۔ سادہ اور صاف ہے۔ رسالہ کی قیمت درج نہیں ہے۔ ملنے کا پتہ۔ جناب حاجی حافظ وزیر محمد

صاحب جنرل مرچنٹ۔ چوک بازار دار جھنگ (ا۔ ج)

ترکی جمہوریہ | از جناب ضمیر احمد ہاشمی صاحب ڈپٹی کلکٹر میرٹھ ضخامت ۴۰۸ صفحات سائز ۳۰×۲۰/۱۶ کتابت و طباعت اچھی۔ کاغذ متوسط۔ قیمت عہ ۔ ملنے کا پتہ۔ مکتبہ جامعہ قرول باغ دہلی یا جامعہ پریس عقب جامع مسجد دہلی یا خود جناب مصنف سے۔

ہندوستان کے مسلمانوں کو آل عثمان کی سلطنت سے شروع سے شغف رہا ہے خصوصاً اس آخری زمانہ میں جب کہ خود ان کی سلطنت پارہ پارہ ہوگئی اور محکومیت کا ادبار ان پر مسلط ہوگیا ان کی عقیدت و توجہ کا مرکز اسی طرف منتقل ہوگیا اسی کا اثر تھا کہ ترکوں کی ذرا سی پریشانی سے ہندوستانی مسلمانوں کے دل پر چوٹ لگتی تھی۔ کریمیا اور بلقان کی جنگوں سے اس امر کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے لیکن جنگ عظیم کے بعد جب ترکی حکومت نے نیا چولا بدلا نئی طرز حکومت کی بنیاد ڈالی گئی تو کچھ مغربی حکومتوں کے پروپیگنڈے کے اثر سے اور کچھ حکومت اور اس کے بعض سر کردہ افراد کے رویہ کی وجہ سے مسلمانوں کی عقیدت روز بروز کم ہوتی گئی اور ترکی حکومت کے خلاف ان کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا ہوگئے خصوصاً جب کہ ترکی حکومت نے خلافت کا جوا اپنی گردن سے اتار پھینکا ادھر کئی سال سے ترکوں کی تاریخ سے متعلق اردو میں اچھا خاصا ذخیرہ فراہم ہوگیا ہے لیکن یہ تمام تر عربی کی جدید تصانیف سے ماخوذ ہے اور محض سطحی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک ایسی تصنیف کی ضرورت اب بھی باقی تھی جو ترکی تاریخ کے گہرے مطالعہ پر مبنی ہوتی اور جس میں ترکی قوم کی ترقی و تنزل اور دوبارہ احیا کے اسباب و وجوہ کا تجزیہ کیا جاتا۔ اس سلسلہ میں پروفیسر گرانوس صدر شعبہ مشرقی بوڈا پسٹ و سابق پروفیسر السنہ مشرقیہ شانتی نکیتن کے وہ مقالات نظر انداز نہیں کئے جا سکتے جو انھوں نے انگریزی زبان میں جامعہ عثمانیہ حیدر آباد میں پڑھے تھے اور جن کا ترجمہ رسالہ اردو میں باقساط شائع ہو رہا ہے۔ پروفیسر گرانوس کو ترکی میں قیام کرنے وہاں کے مشہور ماہرین سیاست سے ملنے جلنے اور ان کے ساتھ مل کر کام کرنے کا موقع ملا ہے پھر ترکی زبان و ادب اور اس کی تاریخ ان کا خاص موضوع ہے۔ زبان و ادب کی تاریخ کے ضمن میں انھوں نے ترکوں کی تاریخ ان کے تدریجی نشو و نما اور پھر ان کے انحطاط و تنزل پر بھی بحث کی ہے

زیر نظر کتاب کا مقصد ترکی جمہوریہ کی نشأۃ الثانیہ کا تجزیہ ہے لیکن مصنف نے اس سلسلہ میں ترکوں کے ابتدائی نشو و نما تدریجی ترقی اور پھر تنزل و انحطاط کے علل و اسباب کا بھی تجزیہ کیا ہے اور نہایت غور و تحقیق سے کام لیا ہے۔

کتاب سولہ ابواب پر منقسم ہے اور ہر باب ایک مستقل بحث پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں ترکی میں یورپ کے نفوذ

پر بحث کی گئی ہے پہلے یورپ کی شاطرانہ چالوں کو عریاں کیا گیا ہے پھر بتایا ہے کہ ترکی کے مرد بیمار نے کس طرح اس حکیم مغرب سے چھٹکارا حاصل کیا اور اس کی ساری امیدوں کو پامال و مجروح کر دیا پھر یہ کہ ترکی مصلحین اپنے طرز حکومت اور اپنے تہذیب و تمدن کو کس طرح مغربی طرز پر ڈھالنا چاہتے ہیں اور انھیں کہاں تک اس میں کامیابی ہوئی ہے۔ پھر یہ بتایا ہے کہ ترکی کے متعلق اہل مغرب کی معلومات کس قدر محدود تھیں اور وہ ترکوں کو کیا سمجھتے تھے اور قدیم ترک اور ترکی تمدن ان کی نظر میں کیا تھا دوسرے باب میں ترکوں کی ابتدائی تاریخ ان کے اناطولیہ میں آباد ہونے۔ ان کے اسلام لانے ان کی فاتحانہ پیش قدمیوں ان کی اور اہل مغرب کی حریفانہ زندگی ان کے نظام حکومت اور اس کی خصوصیات عثمانی بادشاہوں کے عیسائی و دیگر غیر مسلم غلاموں کی تربیت اور نظام سلطنت میں ان کے مراتب و مدارج کا تذکرہ ہے۔ تیسرے باب میں یہ بتایا ہے کہ مغربی و مشرقی عیسائیوں کے باہمی تعلقات کیا تھے اور مشرقی عیسائی یورپ کے عیسائیوں سے کس درجہ متنفر تھے لیکن آہستہ آہستہ یہ نفرت دور ہونے لگی اور ٹوٹے ہوئے رشتے مدتوں کے بعد پھر جڑنے لگے۔ پھر اس صورت حال کے اسباب بتائے گئے ہیں اس کے بعد یہ بتایا گیا ہے کہ ترکی ارکان سلطنت نے اس خطرہ کو بروقت محسوس کر کے کس طور پر اس کے انسداد کی کوشش کی غرض اس ملک پر مغربیت نے کس طرح آہستہ آہستہ اپنا اثر ڈالا اور کس طرح انقلاب کے جراثیم پیدا ہوئے۔ چوتھے باب میں یہ دکھایا گیا ہے کہ کس طرح غیر مسلم رعایا پر سے روز بروز حکومت کا اثر و اقتدار زائل ہو رہا تھا اور اس مصیبت کو دور کرنے کے لئے کیا کیا مراعات دی گئیں پھر سلاطین عثمان کی بدعنوانیوں خصوصاً سلطان عبد الحمید کے استبداد اور ترک قوم پرستوں کی ایک جماعت کے قیام کی تفصیل دی گئی ہے اور ان کی بے شمار قربانیوں کا تذکرہ کیا گیا ہے پھر بتایا گیا ہے کہ ان نوجوانوں کو اپنے مقصد میں کس حد تک کامیابی نصیب ہوئی نیز ان کے بعض غلط اقدامات کی وجہ سے ملک کو کس قدر نقصان پہنچا۔ پانچویں باب میں جنگ عظیم کے بعد کی مفصل تاریخ ہے اور ترکوں کے زوال کی انتہا سلاطین کی بے عنوانیوں پھر ترک قوم پروروں کی جانبازیوں ان کی مسلسل جد و جہد مغربی دول کی شاطرانہ چالوں یونان کی چیرہ دستیوں اور پھر آخر میں ترک قوم پرستوں کی شاندار کامیابیوں اور ان کی کوشش سے ایک نئی جمہوریت کی تاسیس اور ترکی قوم کی حیرت انگیز ترقی کا نہایت تفصیلی تذکرہ ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب عام پبلک کو کے لئے بھی مفید ثابت ہوگی اور ترکوں کے متعلق جو غلط خیالات عام طور پر ان کے دلوں میں قائم ہو گئے ہیں وہ بڑی حد تک دور ہو جائیں گے۔ آخر میں ہم ان غلطیوں کی طرف بھی توجہ دلانا چاہتے ہیں جو یا تو کاتب صاحب کی نوازش یا خود جناب مصنف کی بے توجہی کا نتیجہ ہیں مثلاً صفحہ ۱۰ سطر ایک پر "جان پڑی ہے" یہ فقرہ مہمل ہے جان کے بعد صرف "کچھ" رہ گیا ہے پھر اسی صفحہ پر دوسری سطر میں "چارہ ساز کو کہہ شبھا ہے" لکھا گیا ہے یہاں بجائے "کو" کے "نے" چاہیئے۔ اسی قسم کی اور بہت سی غلطیاں ہیں جن کا احاطہ اس وقت دشوار ہے امید ہے کہ آئندہ اشاعت میں ان

فروگذاشتوں کو دور کردیا جائے گا۔ (ا ح ۔ ح)

مفتاح العربیہ | مصنفہ مولانا احسان سامی حقی پروفیسر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ضخامت ۱۲۰ صفحات سائز ۲۰×۱۴ قیمت ۸؍ ملنے کا پتہ۔ سید محمد نسیم بذریعہ مولوی سید محمد نعیم صاحب ایڈوکیٹ بالائے قلعہ علی گڑھ یوپی

مولانا احسان سامی حقی نے یہ کتاب بچوں کو عربی بول چال سکھانے کے لئے لکھی ہے۔ ہندوستان میں اس مقصد کے لئے بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں لیکن جناب مصنف کے خیال میں نہ صرف یہ کہ یہ کتابیں مفید نہیں ہیں بلکہ مضرت رساں معلوم ہوتی ہیں اور انھوں نے اپنے اس دعوے کے اثبات میں معقول دلائل بھی پیش کئے ہیں تاہم ہمیں ان کے اس دعویٰ میں تھوڑا سا مبالغہ معلوم ہوتا ہے۔ ہم نے ان کی اس کتاب کو بغور دیکھا ہے۔ مگر ہمیں اس میں کوئی ایسی خاص بات نظر نہ آئی جو دوسری کتابوں سے امتیاز رکھتی ہو اور یہ ہو بھی کیسے سکتا تھا۔ جب کہ یہ پوری کتاب محض ایک ہفتہ کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ حالانکہ بچوں کے لئے جو کتاب لکھی جائے اس کو دلچسپ اور آسان تر بنانے کے لئے خاص کوشش و اہتمام کی ضرورت ہے۔ اور غالباً ایک ہفتہ اس قسم کی کوشش کے لئے کافی نہیں پھر بھی ہمیں امید ہے کہ دوسری کتابوں کے مقابلہ میں یہ کتاب بچوں کے لئے مفید ثابت ہوگی۔

اس کی کتابت و طباعت یونیورسٹی پریس کی اور کتابوں کی طرح بہت اچھی ہے۔ اچھا ہوتا اگر کاغذ بھی ذرا اور دبیز لگایا جاتا۔ (ح ۔ ح)

اصح السیر فی ھدی خیر البشر | مصنفہ مولانا حکیم ابو البرکات، عبد الرؤف صاحب قادری داناپوری تقطیع اوسط لکھائی چھپائی اور کاغذ اعلیٰ۔ ضخامت ۶۱۲ صفحات قیمت فی نسخہ غیر مجلد للعہ

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات میں یہ کتاب بلحاظ روایت نہایت تحقیق کے ساتھ لکھی گئی ہے۔ اور باوجود اس کے کہ بنگال میں لکھی گئی ہے اس کی اردو صاف اور صحیح ہے۔ جملہ واقعات اس قدر بسط و تفصیل کے ساتھ لکھے گئے ہیں کہ اس سے زیادہ کی ضرورت نہ تھی۔ علاوہ حالات کے بہت سے مسائل پر ضمناً تحقیقی بحثیں بھی ہیں جو محققانہ انداز میں کی گئی ہیں۔ خود مؤلف نے جہاں اپنی رائیں لکھی ہیں ان میں بہت کچھ بحث کی گنجائش ہے لیکن انھوں نے ائمہ حدیث اور فقہا کے اقوال بھی سامنے رکھ دئے ہیں جن سے فیصلہ میں بہت کچھ آسانی ہو جاتی ہے۔

ہر چند کہ یہ کتاب حصہ اوّل ہے لیکن اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات شروع سے آخر تک مع ازواج مطہرات کے آگئے ہیں۔ اس لئے سیرت کے طالب کو اس حصہ کے بعد کسی مزید انتظار کی ضرورت نہیں رہ جاتی۔

سیرت میں جو کتابیں علمی انداز سے لکھی گئی ہیں ان میں یہ کتاب بہت قدر کے قابل ہے۔ (ا ۔ ح)

یادگار رسالہ نمبر | ایڈیٹر نیئر بی اے حجم ۔۰ ۲ صفحات قیمت عہ چندہ سالانہ ہے مقام اشاعت لاہور

یہ رسالہ پہلے عالمگیر کے دفتر سے نکلتا تھا۔ اب معلوم ہوا ہے کہ جناب ایڈیٹر صاحب عالمگیر نے اسے چند لائق حضرات کے سپرد کر دیا ہے جو اس پر پوری توجہ صرف کر رہے ہیں اور رسالہ قابل اطمینان طریقے پر ترقی کر رہا ہے۔ زیر نظر نمبر ۱۹۳۳ء کا سالگرہ نمبر ہے اور دوسرے رسائل کے سالانہ نمبروں سے کسی طرح گھٹیا نہیں ہے بڑے سائز پر ۱۰۴ صفحات کی ضخامت ہے۔ ڈیڑھ درجن کے قریب اعلیٰ درجہ کی تصاویر ہیں تقریباً ۱۷ مضامین نظم و نثر ہیں۔ مضمون لکھنے والوں میں جناب علی عباس حسینی، جناب تبسم ایم اے، جناب ایم اسلم، جناب محمد حسین ادیب، جناب منصور احمد، جناب عظیم بیگ چغتائی، جناب کاشی پریاگی، اور شعراء میں حضرت جلیل، حضرت جگر، حضرت احسن، جناب حشر کاشمیری، حضرت وحشت، جناب بیخود موہانی، مولانا امجد، مولانا سہا، مولانا محوی اور جناب حفیظ خاص طور سے قابل ذکر ہیں، رسالہ کی کتابت و طباعت بھی اچھی خاصی ہے، کاغذ متوسط درجہ کا ہے۔ ٹائٹل دیدہ زیب ہے اور اس پر مشہور مغربی شاعر بائرن کا فوٹو بلاک ہے (ح۔ح)

سالنامہ حقیقت اسلام | ایڈیٹر سید محمد شاہ صاحب ضخامت ۲۳۶ صفحات کتابت و طباعت نہایت صاف اور پاکیزہ، کاغذ عمدہ۔ چندہ سالانہ ۶؍ اس پرچہ کی قیمت ۱۲

پیکو آرٹ پریس ایک عرصہ سے قرآن اور علوم قرآن سے متعلق بہترین خدمات انجام دے رہا ہے ہندوستان میں یہ پہلا پریس ہے جو اس قدر اہتمام اور نفاست کے ساتھ اعلیٰ قسم کے مضبوط کاغذ پر عکسی بلاکوں کے ذریعے غیر معمولی احتیاط کے ساتھ کلام پاک چھپوا رہا ہے۔ تقریباً ایک سال سے اس مطبع سے ایک مذہبی رسالہ بھی نکل رہا ہے جس میں نہایت صاف و سلیس زبان اور دلچسپ انداز بیان میں مذہبی معلومات پیش کی جاتی ہیں۔ زیر نظر نمبر اسی رسالہ کا سالانہ نمبر ہے اس میں نظم و نثر کے ۲۵ مضامین ہیں جو سب کے سب مفید مذہبی معلومات پر مشتمل ہیں ان مضامین میں مطالب الفرقان (تفسیر مسلسل) اسلامی اخلاقیات کا امتیازی پہلو، اسلام کی خصوصیات، خیر الوریٰ، امیر المومنین عمرؓ، ابو جعفر منصور (مسلسل) عربی زندگی، تجرید الترمذی (مسلسل) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مضمون نگاروں میں جناب مرزا عزیز، شمس الحسن رضوی، رفیق دلاوری، یوسف سلیم، محمد عبداللہ قریشی، اور روشن صدیقی صاحبان نے اس نمبر کو کامیاب بنانے میں خاص حصہ لیا ہے۔ شروع میں عید کارڈ کے نمونہ پر چار رنگ کا ایک خوب صورت بلاک بھی ہے۔ علاوہ اس کے کلام پاک اور پارہ سورہ کا ایک صفحہ نمونہ کے لئے دیا گیا ہے یہ دونوں صفحات اپنی خوشنمائی اور دیدہ زیبی میں اپنی آپ نظیر ہیں۔ ٹائٹل کا بلاک بھی بہت متین و سنجیدہ اور خوب صورت ہے۔ غرض یہ رسالہ خصوصاً یہ خاص نمبر ہر حیثیت سے اس قابل ہے کہ اس کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ (ح۔ح)

ساقی۔ سالانہ نمبر ۳۳ء | ایڈیٹر شاہد احمد صاحب بی اے سائز ۲۲×۲۹ حجم ۲۲۵ صفحات کتابت وطباعت اچھی۔ کاغذ متوسط۔ اس پرچہ کی قیمت عہ سالانہ ہے مقام اشاعت دہلی

اس رسالہ کو دلی سے جاری ہوئے تین سال گزر چکے ہیں تیسرے سال کے اختتام اور چوتھے کی آمد کی مسرت میں یہ خاص نمبر نکالا گیا ہے جو اپنی صوری و معنوی دونوں حیثیتوں سے نہایت کامیاب ہے۔ اس خاص نمبر کے علاوہ سال میں غالباً تین اور خاص نمبر ادارہ کی جانب سے نکالے جاتے ہیں اور ان میں دلی نمبر اور ظریف نمبر اپنے انوکھے پن کی وجہ سے اہم اور امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ زیر نظر سالانہ نمبر کی ضخامت جیسا کہ ہم اوپر بتا چکے ہیں ۲۲۵ صفحات ہے اس سال کے سالانہ نمبروں میں کسی پرچہ کی ضخامت اس قدر نہیں ہے۔ پھر کتابت بہت باریک ہے۔ مضامین نظم و نثر کل چالیس ہیں۔ مضمون نگاروں میں خان بہادر میر ناصر علی۔ محمد حسین ادیب ایم اے عبدالمالک آروی۔ سید حسن برنی۔ سید وزیر حسن دہلوی نصیر الدین ہاشمی، سید مقبول حسین احمد پوری۔ حجاب اسمٰعیل۔ ایم اسلم۔ ڈاکٹر اعظم کریوی، سید بادشاہ حسن، مرزا عظیم بیگ چغتائی خاص طور سے قابل ذکر ہیں مضامین میں شرح نگارستان ہستی، اردو شاعری پر کلاسیت اور رومانیت کی جنگ کے اثر۔ بہار کا ایک گمنام شاعر، دولت خانہ، تاج محل جال دوست، محبت کی ٹھوکر، اللہ میاں کی قواعد۔ اکبر الہ آبادی اور مغربی تعلیم، مقبول ستارہ مجبہ نوری، سلاطین آصفیہ کی اردو شاعری، دولت کا پجاری، اندھی کھلونے والی خاص حیثیت رکھتے ہیں۔ شعرا میں مہاراجہ کشن پرشاد، حضرت جوش۔ اثر صہبائی۔ علی اختر اختر۔ حضرت فانی۔ حضرت رسا ہمدانی۔ حضرت نوح ناروی۔ رونق محفل ہیں تصویریں ۶ ہیں ان سے پہلی تصویر ہندوستانی مصوری کا اچھا نمونہ ہے دوسری تصویر میں مصریوں کے ممی بنانے کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ تیسری اور چوتھی تصویریں چینی آرٹ کا بہترین نمونہ ہیں اور کارکنوں نے خاص ذرائع سے حاصل کی ہوں گی۔ غرض یہ نمبر ہر اعتبار سے علم و ادب کا بہت اچھا مرقع ہے اور شاہد صاحب نے بہت محنت سے مرتب کیا ہے۔ یہ رسالہ جب سے جاری ہوا ہے برابر ترقی کی راہ میں گامزن ہے ہم شاہد صاحب کو اس کامیابی پر مبارکباد دیتے ہیں ان تمام خوبیوں کے مقابلہ میں اس نمبر کی قیمت بہت کم ہے یعنی صرف عہ

(ح۔ ح)

شذرات

غازی رؤف بے کا ورود جامعہ کی تاریخ میں ایک یادگار واقعے کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہم امیر جامعہ ڈاکٹر انصاری صاحب مدظلہ کے بیحد شکر گذار ہیں کہ انھی کی بدولت غازی موصوف کی زیارت ہمیں نصیب ہوئی۔ اسی سلسلے میں یہ خبر بھی مسرت انگیز ہے کہ ترکی اور یورپ کے بعض اور جلیل القدر علماء نے ڈاکٹر صاحب قبلہ سے جامعہ میں تشریف لانے اور اہل جامعہ کو اپنے خیالات سے فائدہ پہنچانے کا وعدہ فرمایا ہے۔

جن لوگوں کو ترکی کی گذشتہ پچیس سال کی تاریخ سے واقفیت ہے۔ ان کے لئے رؤف بے کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ اس عرصے میں ترکی قوم پر جتنے دور گذرے ہیں ان میں سے ہر ایک میں موصوف نے نمایاں حیثیت سے حصہ لیا ہے آپ ۱۸۸۱ء میں استامبول میں پیدا ہوئے اور گیارہ سال کی عمر میں بحری فوجی اکادمی میں داخل ہوئے۔ اٹھارہ برس کے سن میں آپ کی عملی زندگی شروع ہوئی اس وقت سے لے کر ۱۹۲۵ء تک آپ نے جو کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں ان کی تفصیل کے لئے تو ایک مستقل کتاب درکار ہوگی۔ اجمالاً یہاں کچھ عرض کیا جاتا ہے۔

موجودہ صدی کے ابتدائی سالوں میں آبدوز کشتیوں کا استعمال خفیہ طور پر شروع ہوا۔ ترکی حکومت کی طرف سے رؤف بے انگلستان بھیجے گئے کہ وہاں کچھ معلومات حاصل کریں لیکن وہاں انھیں ناکامی ہوئی۔ امریکہ اس زمانے میں ترکی پر مہربان تھا اس لئے وہاں موصوف کا خیر مقدم کیا گیا۔ اور ہر طرح کی معلومات بھی انھیں حاصل ہوئیں۔ اس طرح ترکی بیڑے میں آبدوز کشتیوں کا رواج رؤف بے کے ذریعے سے ہوا۔ ۱۹۰۸ء کے دستوری انقلاب کے سلسلے میں جب بحری فوج کی از سر نو تشکیل ہوئی تو اس میں بھی رؤف بے کا نمایاں حصہ تھا اور اس کے بعد ہی آپ جنگی جہاز "حمیدیہ" کے کپتان

مقرر کئے گئے۔ اس جہاز نے جنگ طرابلس اور جنگ بلقان میں جس طرح غنیم کے بیڑے کو پریشان کیا وہ ایک ایسی عجیب و غریب داستان ہے کہ اگر ہمیں اس کے واقعہ ہونے کا علم نہ ہوتا تو کبھی باور نہ کرتے۔

سنہ ۱۹۱۴ء سے سنہ ۱۹۱۸ء تک جنگ عظیم کے سلسلے میں نہ صرف بحری فوج میں بلکہ بری فوج میں بھی اپنے کمالات دکھاتے رہے۔ پھر جب عزت پاشا وزیر اعظم ہوئے تو رؤف بے 'وزیر البحر' بنائے گئے اور اسی حیثیت سے آپ ہی کی سرکردگی میں وہ وفد گیا تھا جس نے ۳۰ر نومبر سنہ ۱۹۱۸ء کو اتحادیوں سے انقطاع جنگ کا معاہدہ کیا۔ صلح کے بعد سلطان کے غیر دستوری طرز حکومت کی وجہ سے عزت پاشا کو استعفا دینا پڑا اور جب توفیق پاشا نے ترکی پارلیمنٹ کو منسوخ کر دیا تو رؤف بے عثمانی حکومت سے اس قدر بیزار ہوئے کہ انھوں نے ملازمت سے بھی استعفا دے دیا۔

جب یونانی فوجیں سمرنا میں داخل ہوئیں اور انھوں نے اپنی شرمناک سفاکیاں شروع کیں تو رؤف بے بھی اناطولیہ پہنچے اور مصطفی کمال پاشا کے ساتھ آپ نے بھی یونانیوں کا مقابلہ کیا آپ کے سپرد فوج کے لئے اسلحہ اور سامان خورونوش کی فراہمی کا مشکل کام تھا۔ ترکوں نے اس جنگ میں جس بہادری وطن پروری اور ایثار کا ثبوت دیا اس کی مثال تاریخ میں شاذ و نادر ہی ملتی ہے۔ سلطان وحید الدین نے جب قوم فروش وزرا کے مشورے سے اتحادیوں کو قسطنطنیہ میں داخل ہونے دیا اور قوم پرستوں کے مقابلے میں فوج بھیجی اس وقت رؤف بے ہی اپنی جان خطرے میں ڈال کر سلطان کے پاس گئے تھے اور انھیں اس شرمناک طرز عمل سے باز رکھنے کی کوشش کی تھی پھر جب ترکی قوم کی جاں نثاری پھل لائی اور اتحادیوں کو اس قوم کے زندہ ہونے کا یقین ہوا تو لوزان کانفرنس منعقد کی گئی۔ اس کانفرنس میں جو ترکی وفد گیا تھا اس کے سردار بھی رؤف بے ہی منتخب ہوئے اور یہ انھیں کی سیاسی قابلیت کا نتیجہ تھا کہ معاہدہ سیورے منسوخ ہوا اور ترکوں کو وہ حقوق پھر حاصل ہوئے جن کے بغیر کوئی قوم آزاد نہیں کہی جا سکتی۔

حکومت آل عثمان کی تنسیخ اور ملی حکومت کے قیام میں بھی رؤف بے کا حصہ بہت نمایاں تھا آپ کی جو وقعت قوم پرست جماعت کے دلوں میں تھی اس کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ پہلی مجلس ملی کی صدارت کے لئے آپ ہی کا انتخاب ہوا۔ اب جب صحیح معنوں میں تعمیری کام کا وقت آیا اور جب اس کا موقع تھا کہ رؤف بے کی عملی صلاحیتوں سے ترکی قوم کو فائدہ پہنچتا تو کچھ اسباب ایسے پیدا ہو گئے کہ مصطفیٰ کمال پاشا اور رؤف بے ایک ساتھ مل کر کام نہ کر سکے۔ یہ اختلاف ذاتیات سے متعلق نہ تھا بلکہ سراسر طرز حکومت اور سیاسی و تعلیمی نظام سے متعلق تھا۔ رؤف بے کی عظمت اور عالی حوصلگی کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ انھوں نے اس اختلاف کو ذاتی اختلاف نہیں بنایا اور بجائے اس کے کہ ملک میں رہ کر ایک مخالف جماعت قائم کرتے اور اس طرح فساد کا دروازہ کھولتے انھوں نے پسند کیا کہ خود گوشۂ گمنامی میں چلے جائیں اور مصطفیٰ کمال پاشا کی جماعت کو جسے اکثریت حاصل تھی، ملک کا انتظام و انصرام کرنے دیں۔ اب بھی جب کبھی مصطفیٰ کمال پاشا کا ذکر آتا ہے تو رؤف بے اس فراخدلی اور جوش و خروش کے ساتھ ان کی خوبیاں بیان فرماتے ہیں کہ جن لوگوں کو ان دونوں کے اختلافات کا علم ہے انھیں حیرت ہوتی ہے۔ کاش اس بے نفسی اور احساس توازن کی مثالیں سیاسی رہنماؤں میں کثرت سے ملتیں کہ انہی دو صفتوں کے فقدان نے ہر ملک کی سیاسی فضا کو مکدر کر دیا ہے۔

غازی رؤف بے کو ہندوستان آنے اور ہندوستانی مسلمانوں سے ملنے کا عرصے سے شوق تھا خصوصاً جنگ بلقان کے زمانے میں جب وفد ہلال احمر نے جو ڈاکٹر انصاری صاحب کی سرکردگی میں گیا تھا۔ ترکی افواج کی خدمت کی تو آپ کا یہ شوق اور بڑھا۔ اس زمانے میں ڈاکٹر صاحب اور رؤف بے کے درمیان جو دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے تھے انہی کا یہ نتیجہ ہے کہ جب ڈاکٹر صاحب نے اپنے سفر یورپ کے دوران میں آپ سے جامعہ میں تشریف لائے اور ترکی کے موجودہ حالات پر چند مسلسل تقریریں کرنے کی درخواست کی تو آپ نے بلا تکلف اسے منظور کر لیا اور اس طویل سفر کی زحمت برداشت کی

دہلی میں رؤف بے کا خیر مقدم جس شان سے ہوا اور آپ کی تقریروں کے سننے کے لئے شائقین کا جیسا ہجوم برابر رہا اس سے وہ دن یاد آتے تھے جب ہندوستان کے مسلمان ترکوں کو ملت اسلامی کا امین اور حامی سمجھتے تھے اور ان کی ہر کامیابی پر خوش اور ناکامی پر رنجیدہ ہوتے تھے۔

جامعہ میں غازی رؤف بے کی چار تقریریں ہوئیں ان کے موضوع بالترتیب یہ تھے :۔
(۱) آل عثمان کی تاریخ کا خاکہ اور جدید دور کی ابتدا۔ (۲) اتحاد اسلامی ' اتحاد تورانی ' اور قوم پرستی کی کشمکش (۳) ترکی اور جنگ عظیم (۴) ترکی کے موجودہ حالات اور مستقبل کے امکانات۔ یہ تقریریں بہت جلد انگریزی اور اردو میں مکتبہ جامعہ سے شائع ہونے والی ہیں۔ اس لئے ہم ان کا خلاصہ اس وقت پیش نہیں کر رہے ہیں۔ جن لوگوں نے خود مقرر کی زبان سے ان تقریروں کو سنا ہے وہ اسکی شہادت دیں گے کہ مقرر کی شخصیت اور طرز ادا کی دلفریبی کی وجہ سے لوگوں کی دلچسپی برابر قائم رہی اور باوجود اس کے کہ ہر تقریر تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کی تھی کسی کو بھی طول کلامی کی شکایت نہ ہوئی۔ بیشتر واقعات تو غازی موصوف نے وہی بیان کئے جن سے اخبار بین حضرات کم و بیش واقف تھے لیکن بیان کرنے کا طریقہ ایسا تھا کہ گویا وہ واقعات ہمارے سامنے پیش آ رہے تھے اور ایسا کیوں نہ ہوتا جب ان میں سے بیشتر واقعات خود مقرر کے چشم دید تھے اور بعض میں انھوں نے نمایاں حصہ لیا تھا۔ اسی وجہ سے آپ نے بعض واقعات ایسے بھی بیان کئے جو اب تک ظاہر نہیں ہوئے تھے اور سیاسی راز کی حیثیت رکھتے تھے۔ خصوصاً جنگ عظیم میں ترکی کی شرکت کے وجوہ کے سلسلے میں آپ نے بہت سی پوشیدہ باتیں بتائیں جن سے یہ امر اچھی طرح ذہن نشین ہوگیا کہ ترکی کو بجز اس کے اور کوئی چارہ نہ تھا کہ جرمنی کا ساتھ دے۔ اس حیثیت سے یہ تقریریں 'جدید ترکی' کے مورخ کے لئے بہت مفید ثابت ہوں گی۔

اس علمی حیثیت کے علاوہ خود غازی رؤف بے کی شخصیت، ان کی خندہ پیشانی، ان کے اخلاق کریمانہ اور ان کی رواداری سے جو سبق اہل جامعہ کو خصوصاً اور اہل دہلی کو عموماً حاصل ہوا ہے وہ ایسا نہیں ہے کہ اسکا

نقش دلوں سے جلد محو ہو سکے ایسی ہستیاں دنیا میں بہت کم نظر آتی ہیں جن کی ملاقات سے انسان کے دل پر مسرت اور جوش کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے ایسی لہر جس میں مایوسی اور ناکامی کے تمام خطرات خس و خاشاک کی طرح بہہ جاتے ہیں۔

نہایت افسوس ہے کہ جامع برلن کے تاریخ اسلام کے استاد پروفیسر ڈاکٹر کارل بیکر کا انتقال ہو گیا۔ موصوف تاریخ اسلام اور خصوصاً مصر کی اسلامی تاریخ کے ماہر تھے۔ تمدن اسلامی کے مسائل سے آپ کو خاص دلچسپی تھی اور اسلامی ممالک کی جدید ذہنی کشمکش کا مطالعہ بھی بہت شوق سے کرتے رہتے تھے اسی سلسلے میں آپ پچھلے سال جاوا گئے تھے اور ہندوستان آنے کا بھی ارادہ رکھتے تھے اپنے ایک ہندوستانی شاگرد سے آپ نے اس خیال کا اظہار بھی کیا تھا۔ چنانچہ بعض لوگوں کا یہ خیال تھا کہ ان سے ہندوستان تشریف لانے اور مختلف علمی اداروں میں اسلامی تمدن پر تقریر کرنے کی درخواست کی جائے۔ مگر کسے معلوم تھا کہ موت ان کی تاک میں ہے اور ان کا یہ شوق اور ان کے احباب کی یہ آرزو پوری نہ ہو سکے گی۔ مرحوم کی شہرت صرف اسلامی تاریخ کے استاد کی حیثیت سے نہیں تھی بلکہ آپ تقریباً دس سال تک جرمنی کے سب سے بڑے صوبے یعنی پروسیہ (Preussen) کے وزیر تعلیمات بھی رہ چکے تھے۔ آپ کی علم دوستی اور اپنے مضمون سے شغف کی یہ ایک بیّن دلیل ہے کہ وزارت سے علیحدہ ہونے کے بعد آپ نے جامع برلن کی استادی قبول کر لی اور خاموشی کے ساتھ درس دینے لگے آپ کی ذات سے جرمنی میں اسلامیات کے طالب علموں اور نوجوان اساتذہ کو بڑی تقویت تھی۔ آپ کی ادارت میں ایک سہ ماہی رسالہ "اسلام" بھی شائع ہوتا تھا۔ جو امید ہے کہ جاری رہیگا۔ آپ کے علمی مضامین کے مجموعے کی ایک جلد تو بہت عرصہ ہوا Islamstudien کے نام سے شائع ہو چکی ہے اور دوسری جلد بھی پچھلے سال تیار ہو گئی تھی۔ امید ہے کہ وہ عنقریب شائع ہوگی اور مرحوم کے انتقال سے اس میں تعویق نہ ہوگی۔

ترکی جمہوریہ

از

مسٹر ضمیر احمد ہاشمی، ایم اے، پی سی ایس

ترکی جمہوریہ سولہ بابوں پر مشتمل ہے. جس میں سلیس اور عام فہم زبان میں یہ دکھایا گیا ہے کہ ترکوں پر مغربیت کا اثر کیونکر ہوا. اور مغربی طرز اختیار کرنے کے لئے ترکی کو کس قدر مراحل طے کرنے پڑے. ترکی کا اولین زمانہ. اس کا عروج بعد ازاں بتدریج زوال اور اس کے اسباب، بالآخر جنگ عظیم میں شرکت اور بعد کی حالت اتحاد اسلامی، خلافت اور سلطنت کا نسخ اور جمہوریت کا قائم ہونا. ترکی کی موجودہ سیاسی اور اقتصادی و معاشرتی حالت اور ان شعبوں میں نمایاں ترقی کی تفصیل بیان کی گئی ہے.

کتاب کی لکھائی چھپائی نہایت دیدہ زیب ہے اور قیمتی سفید کاغذ پر شائع کی گئی ہے. کل صفحات ۳۰۲، قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

مکتبہ جامعہ دہلی

تاریخ

تاریخ مغربی یورپ قیمت ۔ عہ؁ — امریکن مورخ ۔ ڈاکٹر رابن من کی کتاب ہسٹری آف ویسٹرن یورپ کا ترجمہ جس میں وہاں کی معاشرت علم و ہنر اور سیاسی اداروں کی تدریج ترقی کو دکھایا گیا ہے۔

تاریخ ہند قدیم قیمت ۔ ۸ ر — کے ایم پانکر کی کتاب کا ترجمہ جسے موصوف نے جامعہ کے شعبہ تصنیف و تالیف کی درخواست پر لکھا تھا۔

تاریخ الدولتین قیمت عمر — خلافت بنی امیہ اور بنی عباس کے عہد حکومت کی مختصر اور جامع تاریخ۔

تاریخ امریکہ قیمت ۔ عالہ — امریکہ کی مکمل و مفصل تاریخ، انقلابات و سیاسیات امریکہ کا بیان۔

ترکی جمہوریہ قیمت ۔ عمر — ترکوں کی مفصل سیاسی تاریخ۔

تاریخ نجد قیمت ۔ عہ ر — نجدیوں کے مذہبی عقائد، سیاسی حالات اور طرز معاشرت پر مکمل کتاب ہے۔

تاریخ القرآن قیمت ۔ عہ ر — قرآن حکیم کی جمع و ترتیب، حفاظت، فصاحت و بلاغت اور نزول کی مکمل تاریخ ہے۔

تاریخ الامت مکمل ۱۲ — اسلام کی مکمل و مستند تاریخ۔

حصہ اول سیرۃ الرسول — عمر
" دوم خلافت راشدہ — عالہ
" سوم خلافت بنی امیہ — عمر
" چہارم خلافت عباسیہ — دعالہ
" پنجم عباسیہ بغداد — عا
" ششم عباسیہ مصر — عالہ
" ہفتم خلافت عثمانیہ — عہ ر

سوانح عمریاں

سیرت محمد علی قیمت ۔ سے ر — مولینا محمد علی کی مکمل سوانح عمری جس میں مولینا کی زندگی کے تمام واقعات تحقیق سے لکھے گئے ہیں۔

مکتبہ جامعہ دہلی

ضخامت تقریباً ۴۰۰ صفحات متعدد تصاویر

تلاش حق قیمت عا

گاندھی جی کی خود نوشت زندگی کے حالات اور تجربے ۲ جلدیں مع متعدد تصاویر۔

ٹالسٹائی قیمت ۳ر

روس کے قائد اعظم، مشرق کے مصلح، انسانیت کے شیدائی، ٹالسٹائی کے حالات

جمال الدین قیمت ۸ر

اخوت اسلامی کا پرجوش داعی، عالم گیر اتحاد اسلامی کا زبردست حامی جس نے ہندوستان، ایران، مصر اور فرانس میں بڑے بڑے کام کئے۔

اورنگ زیب قیمت ۱۲ر

اورنگ زیب پر اعتراضات کے جواب اور من گھڑت تاریخ کا کچا چٹھا۔

حیات حافظ قیمت عہ

لسان الغیب حضرت خواجہ حافظ کی زندگی کے حالات اور ان کی شاعری پر مفصل تبصرہ آخر میں چند مشہور غزلیں بھی دیدی گئی ہیں۔

حیات جامی قیمت ۸ر

فارسی کے مشہور شاعر مولینا نور الدین جامی کے حالات، اور ان کے تصوف پر بحث،

سیرت عمرو بن العاص قیمت عہ

مشہور مدبر صحابی اور نامور فاتح مصر حضرت عمرو بن العاص کی زندگی کے حالات،

ضیاء الدین برنی قیمت ۶ر

عہد تغلق کے نامور مورخ ضیاء الدین برنی، مصنف تاریخ فیروز شاہی کے حالات اور اس کی تاریخ پر تبصرہ،

خادمات خلق قیمت ۱۰ر

یورپ اور امریکہ کی چند پاک سیرت خواتین کے حالات جنہوں نے اپنی زندگی قوم پر وقف کردی تھی۔

ادب

سیر المصنفین قیمت عہ

اردو کے تمام مصنفین اور نثر نگاروں کے حالات، ادب اردو کی دل پسند تاریخ حصہ اول عہ حصہ دوم عہ

کیمیا گر چند مختصر افسانوں کا مجموعہ،
قیمت عہ/ پڑھنے والوں کو ان افسانوں
میں اپنی زندگی کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور
نظر آئے گا۔

نیرنگ ۱۱؍ ادبی مضامین اور ایک
قیمت عہ/ تاریخی ڈرامہ ہے، ان
مضامین میں ضمیر کی آواز جستجوئے مسرت
قابل ذکر ہیں۔

مضامین رسالہ جوہر جامعہ ملیہ
قیمت عہ/ کے قلمی رسالہ
جوہر کے مضامین کا مجموعہ۔

لیلۃ القدر مولینا ابوالکلام
قیمت ۱ر آزاد کا ایک مضمون
ہے۔

دیوان غالب (جرمنی) اس میں غالب کا
عہ/ - عہ/ خود نوشتہ مقدمہ،
غزلیات، قصائد اور رباعیات ہیں
بیاض کے لئے نفیس حاشیہ اور سادہ اوراق
شامل ہیں۔ خوبصورت جلد ہے۔ پہلے
اس کی قیمت للعہ/ ہے رکھی اب عہ/، عہ/ ہے

مرقع غالب (جرمنی) آپ کے کمرہ کی زینت
قیمت ۸ر کے لئے، ایک
عمدہ چیز ہے، غالب مرحوم کی سہ رنگی تصویر
جرمن ہنرمندی کا خاص نمونہ ہے، دو قسم
کے اشعار الگ الگ درج ہیں۔

دیوان شیدا (جرمنی) مسیح الملک
قیمت - عہ/، عہ/ حکیم اجمل خاں
کے فارسی اور اردو کلام کا مجموعہ مسیح الملک
کی شاعری اپنے احباب کی مجلس تک
محدود تھی۔ مرحوم کی اجازت پر مکتبہ جامعہ
نے خاص طور پر جرمنی میں طبع کرایا۔

کلام جوہر مولینا محمد علی جوہر
قیمت ۸ر کے جدید اور قدیم
کلام کا یہ مجموعہ ہے۔ شروع میں مولینا
عبدالماجد دریابادی کا مقدمہ بھی ہے

انتخاب میر سعدی ہند میر تقی میر
قیمت ۱۲ر علیہ الرحمۃ کے چھ دواوین
سے یہ انتخاب تیار ہوا ہے۔ اس میں تمام
اشعار جمع کر دئے گئے ہیں۔

بچوں کی کتابیں

تاریخ اسلام کا جدید نصاب

ہمارے نبی ۔۔ جماعت دوم ۔۔	۳ر
نبیوں کے قصے ۔۔ " سوم ۔۔	۵ر
سرکار دو عالم ۔۔ " چہارم ۔۔	۸ر
خلفائے اربعہ ۔۔ " پنجم ۔۔	۱۰ر

درسی کتابیں

ہمارے رسول ۔۔۔	۵ر
اچھی باتیں ۔۔	۴ر
بچوں کا قاعدہ ۔۔۔	۴ر
رہنمائے قاعدہ ۔۔	۲ر

بچوں کیلئے ڈرامے

بچوں کا انصاف ۔۔۔	۴ر
اسکول کی زندگی ۔۔۔	۴
دیانت ۔۔	۲ر
محنت ۔۔	۴ر
شریر لڑکا ۔۔۔	۴ر
قوم پرست طالب علم ۔۔	۴ر

بچوں کیلئے عام معلومات بڑھانیوالی کتابیں

دنیا کے بسنے والے ۔۔	۸ر
تاریخ ہند کی کہانیاں ۔۔	۴ر
اسلامی عقائد ۔۔۔۔	۸ر
میلاد النبی پروجکٹ ۔۔	۸ر
باغبانی پروجکٹ ۔۔۔	۸ر
آنحضرت ۔۔	۶ر

پیامِ تعلیم

بچوں کیلئے پندرہ روزہ تعلیمی رسالہ

چندہ سالانہ ۲ر

مکتبہ جامعہ دہلی

علی گڑھ میگزین کا عظیم الشان سالنامہ

مرتبہ حضرت سید وحید اکبر آبادی؛

علی گڑھ میگزین نے اردو زبان وادب کی جو گرانبہا خدمات انجام دی ہیں۔ وہ اہل نظر سے مخفی نہیں اس کا عام نمبر دوسرے رسالوں کے خاص نمبروں کے برابر ضخیم ہوتا ہے۔ لہٰذا اب آپ اس کے سالنامے کی خوبیوں کا اندازہ بآسانی کر سکتے ہیں، سالنامہ ڈھائی سو صفحات پر شائع ہوا ہے۔ علمی وادبی مضامین، نظم ونثر کے علاوہ اس میں سرسیدؒ کے اس قلمی خط کا عکس شائع ہوا ہے جو انہوں نے مولینا حالی کو ان کی مسدس کے متعلق لکھا تھا۔ سالنامہ یقیناً نئے سال کا ایک عجیب وغریب تحفہ ہوگا، اس غرض سے کہ ہر شائق اردو اس کا مطالعہ کر سکے، اسکی قیمت صرف عہ (محصول ڈاک ۱۰؍) رکھی گئی ہے۔ طلبہ سے محصول ڈاک معاف

"منیجر علی گڑھ میگزین۔ علی گڑھ"

علی گڑھ میگزین (انگریزی)

اسکول اور کالجوں کے طالب علموں کے لئے بہترین رسالہ، عام واقفیت اور مضمون نگاری کی مہارت حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ، سالانہ قیمت چار روپے طالب علموں سے تین روپے۔ غریب طالب علموں کے ساتھ اور بھی رعایت کیجائے گی، نمونہ کا پرچہ جو سو صفحات اور متعدد تصاویر پر مشتمل ہے۔ ۸؍ کے ٹکٹ بھیجنے پر روانہ کیا جا سکتا ہے،

منیجر علی گڑھ میگزین (انگریزی)
مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ؛

حیاتی

صحت کو بحال رکھتی اور جسم کو طاقت بخشتی ہی

دماغی کام کرنیوالوں کے لئے ایک اچھی چیز ہی، اس کا اثر براہ راست دل، دماغ، جگر اور معدہ پر پڑتا ہے۔

دائمی قبض کی شکایت بالکل رفع ہو جاتی ہی

چند ہی روز کے استعمال میں آپ نئی طاقت نئی قوت محسوس کرنے لگیں گے

مقدار خوراک ایک تولہ سے ڈیڑھ تولہ تک صبح اور شب میں سونیکے وقت۔

قیمت فی سیر عہ

مسیح الہند دواخانہ (رجسٹرڈ) قرول باغ دہلی

اردو کی سب کتابیں

آپ مکتبہ جامعہ سے طلب فرمائیں

چندہ سالانہ پانچ روپیہ

قیمت فی پرچہ آٹھ آنہ

پرنٹر و پبلشر: محمد مجیب، بی اے (آکسن)

نے

جامعہ برقی پریس دہلی میں چھپوا کر شائع کیا

رجسٹرڈ نمبر ۱۰۵۲

اپریل ۱۹۳۳ء



جامعہ

جامعہ ملیہ کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ

جلد ۲۰ | بابت ماہ اپریل ۱۹۳۳ء | نمبر ۴

مطبع جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

1927

جامعہ

زیر ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری — ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے پی ایچ ڈی

جلد ۲۰ | ماہ اپریل ۱۹۳۳ء | نمبر ۴

فہرست مضامین

(محمد مجیب صاحب بی اے آکسن، پرنٹر و پبلشر نے جامعہ دہلی سے شائع کیا)

معاہدۂ عمرانی

فلسفہ | اگر روسو کی تمام تصانیف پر غور کی نگاہ ڈالی جائے تو ایک خیال کسی نہ کسی شکل میں روسو کی ہر تصنیف میں ملے گا یعنی فطرت اور تمدن (فطری اور متمدن انسان) کا تضاد۔ یہ وہ تضاد ہے جس کا روسو کی زندگی کی تشکیل میں بڑا حصہ ہے۔ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ کن حالات میں اسے اپنے خاندان پیشہ، وطن اور مذہب سب سے ایک ایک کر کے قطع تعلق کرنا پڑا۔ کوئی تعجب نہیں کہ اسی وجہ سے اس کے اس خیال کو تقویت ہوئی ہو کہ وہ اس زندگی کی مدح سرائی کرے جس میں انسان کا تعلق اپنے سوا کسی سے نہ ہو۔ فطری انسان اچھا ہے، آزاد ہے؛ متمدن برا ہے۔ غلام ہے۔ "خدا اپنے ہاتھ سے تمام چیزیں اچھی بناتا ہے مگر وہ انسان کے ہاتھ میں آتی ہیں اور خراب ہو جاتی ہیں" روسو اپنی تصنیف "ایمیل" ان الفاظ سے شروع کرتا ہے۔ "معاہدۂ عمرانی" کے ابتدائی الفاظ بھی اسی کا اظہار کرتے ہیں: "انسان آزاد پیدا ہوا ہے مگر جدھر دیکھو وہ پا بزنجیر ہے"۔

روسو کا فلسفہ شروع میں متمدن انسان سے نہیں فطری انسان سے بحث کرتا ہے۔

اور قانون فطرت اسی صورت میں ترتیب دیا جا سکتا ہے جب پہلے انسان فطرت سے تعارف ہو۔ انسان کے دل کے اندر ارادہ اور جذبات میں کشمکش جاری ہے وہ ارادہ کرتا بھی ہے اور نہیں بھی کرتا وہ اپنے آپ کو آزاد بھی محسوس کرتا ہے اور پابند بھی۔ نیکی کو پہچانتا بھی ہے اور بھلائی کرنے کی خواہش بھی رکھتا ہے، مگر اس سے اکثر بدی سرزد ہوتی ہے! غرض کبھی ارادے اور کبھی جذبے کی موج اسے اپنے ساتھ بہالے جاتی ہے۔ ارادے کو روسو کے فلسفے میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ ارادہ ہی تمام اعمال کی بنیاد ہے۔ اور خود انسان ارادے کے سوا کچھ نہیں۔ مگر ارادے کے علاوہ انسان ضمیر کا بھی مالک ہے جو اسے اپنے ہی اعمال کی نہیں دوسروں کے اعمال

کی بھی برائی بھلائی سمجھا تا ہے۔ جذبات کا بڑی حد تک جسم پر قابو ہوتا ہے اور ان کا اثر انسانی ارادے پر بھی پڑتا ہے۔ مگر عمل کے اچھے یا بُرے ہونے کے متعلق صرف ضمیر ہی گواہی دے سکتا ہے۔ ضمیر انسان کے دل کی آواز ہے اور وہی انسانوں کا سچا رہنما۔ اب اگر انسان کا ارادہ اور عمل ضمیر کی آواز کے مطابق ہے تو وہ آزاد ہے یعنی وہ فطری انسان ہے۔ بیرونی آزادی کی کوئی حقیقت نہیں اگر انسان اپنے دل سے اپنے آپ کو آزاد محسوس نہ کرے وہ شخص جو حقیقی طور پر آزاد ہے صرف اسی چیز کا ارادہ رکھتا ہے جس کے حاصل کرنے پر اسے قدرت ہے۔ روسو کے خیال میں آزادی غیر ذمہ دارانہ بے لگامی کا نام نہیں۔ آزادی کی لازمی شرط ہے پابندی۔ مگر وہ پابندی جو خود اپنی خوشی سے ہو۔ آزاد صرف وہ انسان ہے جو اپنے ضمیر کی وجہ سے نیک ارادہ ہے۔ فطری انسان طبعًا اچھا ہے، البتہ ہم لوگ بُرے ہیں۔ فطری انسان کی خواہشات کم بھی ہوتی ہیں اور اچھی بھی۔ مگر متمدن زندگی میں ان کی بھرمار ہونا شروع ہوتی ہے اور یہ زیادہ تر دوسروں کی دیکھا دیکھی: جو کچھ زید کے پاس ہے وہ بکر کے پاس کیوں نہ ہو؟ فطری زندگی میں تو انسان کی سب سے بڑی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ کسی طرح اپنی بقا کا سامان کرلے۔ مگر یہی جان کی حفاظت کا جذبہ تمدن کی حالت میں انانیت کی صورت اختیار کرلیتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان برائی میں بھی مبتلا ہو جاتا ہے اور غلام بھی بن جاتا ہے۔ اس کا ارادہ اور عمل دونوں دوسروں کے پابند ہو جاتے ہیں اپنی ذات سے محبت اور اپنی فکر (amouu de soi) بری چیز نہیں، مگر جب دوسروں کو نقصان پہنچا کر اپنا فائدہ کرنے کا جذبہ (amouu propre) انسانوں کے دلوں میں جگہ کرلے تو سماج کی تباہی ناگزیر ہے۔

روسو کا دعویٰ ہے کہ اگر انسانوں کے متعلق کوئی صحیح رائے قائم کرنا ہے تو فرد کی زندگی کا مطالعہ کرنا چاہیئے سماج کو سمجھنے کے لئے انسانوں کا پرکھنا ضروری ہے۔

چنانچہ روسو اپنے تمام دعووں کی بنیاد فطری انسان پر رکھتا ہے۔ اور تمام سیاسی اور معاشرتی مسائل اسی کے ذریعہ حل کرتا ہے۔ مگر جب وہ فطری زندگی کے راگ گاتا ہے تو اس

کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ وہ لوگوں کو اس بات کی دعوت دیتا ہے کہ وہ جنگلوں میں جا کر بسیں اور درندوں کی سی زندگی گذاریں، وہ تو صرف یہ چاہتا ہے کہ انسان اپنی حقیقت کو پہچانے اور اپنی اصلیت کو دوبارہ معلوم کرے۔ روسو کو اس سے بحث نہیں کہ انسان یا سوسائٹی کی موجودہ حالت کیا ہے۔ وہ تو فطری انسان کو پیش نظر رکھ کر سوسائٹی کے متعلق رائے قائم کرتا ہے۔ اور اگر سچ پوچھا جائے تو اس کا فطری انسان دراصل خود اُس کی ذات ہے۔ وہ اپنی "اندرونی آواز" اپنے ضمیر کو اپنا رہنما بناتا ہے اور نیک و بد کی تمیز اسی کے ذریعہ کرتا ہے۔ وہ تمام دنیا کو اپنے پیمانے سے ناپتا ہے اور غالباً اسی میں اس کی انتہا پسندی کا راز مضمر ہے۔ وہ اپنے پیشرو مونٹیکو کی طرح دنیا و مافیہا کا مشاہدہ کرنے کے بعد اپنے نظریے قائم نہیں کرتا۔ وہ نظریئے قائم کرکے یہ بتاتا ہے کہ دنیا کو کیا ہونا چاہیئے! اس کے ذہن میں ریاست کا ایک خاص تخیل ہے اور وہ تمام سیاسی مظاہر کو اسی کسوٹی پر کس کر دیکھتا ہے۔ موجودہ طریقہائے حکومت کے متعلق کوئی رائے قائم کرنے کیلئے ضروری ہے کہ بہترین طریقے کا علم ہو۔ چنانچہ "معاہدۂ عمرانی" میں تمام سیاسی اداروں اور ملکی قوانین سے قطع نظر کرکے روسو نفس قانون سے بحث کرتا ہے وہ یہ سوال کرتا ہے کہ وہ کون سے قوانین ہیں جو خود انسانوں کے بنائے ہوئے ہوں اور ان پر فرائض عاید کرسکیں۔ اور اس کے جواب میں وہ پہلے ایک ایسی سوسائٹی اور ریاست کا تخیل پیش کرتا ہے جس کی بنیاد قانونِ فطرت پر ہو۔ ایسی ریاست میں آزادی اور مساوات کا دور دورہ ہے اور نظام سیاسی کسی قانون کا پابند نہیں۔

مگر عجیب بات ہے کہ انسان جو آزاد پیدا ہوا ہے۔ ہر طرف پا بزنجیر نظر آتا ہے۔ آخر اس صورت حال کو قانونی شکل کیونکر دی جاسکتی ہے؟ روسو کے خیال میں یہ صورت قانوناً اور اخلاقاً اسی وقت جائز ٹھیر سکتی ہے جب انسان کی آزادی برقرار رہے۔ کہ یہ انسانی حکومت کے لئے سب سے پہلی اخلاقی شرط ہے خود روسو کے الفاظ میں: "مسئلہ یہ ہے کہ اجتماع کی کوئی ایسی شکل تلاش کی جائے جس میں قوت اجتماعی کے ذریعہ ہر شریک کی جان و مال کی حفاظت ہو سکے اور جس کی بنا پر گو ہر شخص کُل میں شریک ہو تاہم وہ صرف اپنی تابعداری کرے اور اس کی وہی آزادی قایم رہے جو اسے پہلے حاصل تھی"

اس مسئلہ کا حل روسو کے خیال میں "معاہدۂ عمرانی" پیش کرتا ہے۔

یہ خیال کہ ریاست کی بنیاد معاہدہ پر ہے نہ صرف اس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ اسے لاک کے علاوہ اور بہت سے مشہور حکما نے پیش کیا ہے بلکہ اس وجہ سے بھی کہ جدید ریاست کی تخلیق اور تشکیل میں اس نظریہ کا بڑا حصہ ہے۔

اس نظریہ کی پوری تاریخ کا یہاں پر نہ موقع ہے اور نہ گنجائش۔ یہاں اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ خیال عہد قدیم میں بھی کسی نہ کسی شکل میں موجود تھا۔ پروتاغورس اور اس کے بعد افلاطون دونوں کے ہاں اس کی طرف اشارات ملتے ہیں[1]۔ اسی طرح زمانہ وسطیٰ میں قیصر اور پاپائے روما کی کشمکش میں "معاہدہ" اور قانونِ فطرت کے نظریوں سے دونوں فریقوں نے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی مگر اس زمانہ میں معاہدہ بجائے ریاست کے حکومت کی بنیاد قرار دیا جاتا تھا۔ اور یہ نہ صرف اس وجہ سے کہ زمانہ وسطیٰ کے فلسفے پر ارسطو کی تعلیمات کا گہرا اثر تھا بلکہ اس وجہ سے بھی کہ ریاست کی ابتدا کلیسا کے نزدیک انسانی ارادے یا کم از کم محض انسانی ارادے کی بنا پر ممکن نہ ہو سکتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ زمانہ وسطیٰ میں ریاست کی ابتدا یا غرض و غایت کی بجائے حکومت اور حاکم غور و فکر کے موضوع بنے اور ان کی تشریح کے لئے "معاہدہ عمرانی" کی بجائے "معاہدہ محکومیت" تجویز کیا گیا اس لئے کہ معاہدۂ عمرانی کے قبول کرنے کے تو معنی یہ تھے کہ فرد کو تمام تر نظام حکومت کا مبدا و منبع قرار دیا جاتا اور اس زمانہ میں اس خیال کے بدعت بلکہ الحاد ہونے میں کسے شبہ ہو سکتا تھا!

مگر جب سولھویں صدی میں عیسائیت کی تاریخ میں وہ انقلاب رونما ہوا جسے ریفارمیشن کے نام سے پکارا جاتا ہے تو معاہدۂ عمرانی کے نظریے کو بھی فلسفۂ سیاست میں اہمیت حاصل ہونا شروع

---

[1] ریم (Rehm) کی Geschichte. der Staatsrechts - wissenschaft) - میں نہایت خوبی کے ساتھ اس نظریہ کی تدریجی نشو و نما اور مکمل تاریخ درج ہے۔

ہوئی۔ انگلستان میں رچرڈ ہوکر[1] نے معاہدۂ عمرانی کو ریاست کی بنیاد قرار دیا۔ اسی طرح جرمنی میں التھوسیس[2] اور ہالینڈ میں گروسیس[3] اس خیال کے پیشرو ہیں۔ مگر انگریزی حکماء ہابس[4] اور لاک[5] کے بعد سے اس نظریہ کو فلسفہ میں خاص اہمیت حاصل ہوئی۔

روسو نے بھی ان تمام حکما کی طرح ریاست اور قانونی نظام کو معاہدۂ عمرانی کی مدد سے جائز ٹھیرایا ہے۔ اس کے ذہن میں معاہدۂ عمرانی کا جو تخیل ہے اس کے الفاظ یہ ہیں: "ہم میں سے ہر ایک مشترک طور پر اپنی ذات اور اپنی قوتوں (صلاحیتوں) کو ارادہ اجتماعی کے حوالہ کرتا ہے اور اس کے عوض ہم میں سے ہر فرد "کل" کا جزو لاینفک بن جاتا ہے"

روسو کو سمجھنے کے لئے ایک بات اچھی طرح ذہن نشین ہونا چاہیئے وہ یہ ہے کہ روسو، ہابس کے علاوہ دوسرے فلسفیوں کی طرح جو معاہدے کو ریاست کی بنیاد قرار دیتے ہیں، اس معاہدے کو تاریخی حیثیت نہیں دیتا۔ روسو کے ہاں تو اس معاہدے کی حیثیت محض ایک خیال کی ہے جس کے ذریعہ قانون اور قانونی نظام کی تشریح ممکن ہو سکتی ہے اور ان کے جواز کی صورت پیدا کی جا سکتی ہے۔

مگر روسو کی تعلیمات کی جان "معاہدۂ عمرانی" نہیں بلکہ "ارادہ اجتماعی" ہے ارادۂ اجتماعی گویا اجتماعی ضمیر کا دوسرا نام ہے۔ اور جماعت اسی وقت آزاد ہے جب تک وہ صرف اپنے ضمیر کی آواز کے سامنے سر تسلیم خم کرتی ہے۔ روسو اجتماعی ارادہ اور مختلف افراد کے ارادوں کے مجموعے میں فرق کرتا ہے، اس لئے کہ ارادوں کا مجموعہ تو گویا انفرادی رایوں اور

---

(1) Richard Hooker, Laws of Ecclesiastical Polity (1594)

(2) Johannes Althusius, Politica (1603)

(3) Hugo Grotius, The Law of War and peace (1625)

(4) Thomas Hobbes, De cive (1642) and Leviathan (1651)

(5) John Locke, Two Treatises on Civil Government (1690)

مفادوں کا مجموعہ ہوگا اور اجتماعی مفاد کو انفرادی مفاد کا ہم معنی کبھی نہیں قرار دیا جا سکتا
برخلاف اس کے ارادۂ اجتماعی کے پیش نظر مخصوص افراد کی بھلائی نہیں بلکہ فلاح اجتماعی ہوتی ہے
اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ارادۂ اجتماعی کو عملی جامہ پہنانے کی کیا صورت ہے؟ اس کی صورت
روسو کے خیال میں صرف یہ ہے کہ حاکم و محکوم ایک ہوں یعنی حکومت عوام قائم ہو۔ اور جب سب
برابر اپنے اوپر فرائض عاید کریں اور ہر فرد جماعت سے صرف اس چیز کا مطالبہ کرے جسے
وہ خود دینے کو تیار ہو۔ تو یہ ظاہر ہے کہ ہر فرد اپنے عمل میں اجتماعی فلاح و بہبود کو مدنظر رکھے
گا۔ اور اسی اصول میں مساوات، قانونی مساوات کا راز بھی پنہاں ہے۔ معاہدۂ عمرانی تمام
شہریوں کے فرائض اور حقوق یکساں مقرر کرتا ہے۔

ارادۂ اجتماعی کے لئے ضروری ہے کہ وہ پوری جماعت کا ارادہ ہو۔ اس کے یہ معنی
نہیں کہ تمام افراد کے ارادے کسی بات پر بالکل متفق ہوں۔ اس لئے کہ ارادے کو اجتماعی حیثیت
رایوں کی تعداد کی بنا پر حاصل نہیں ہوتی۔ بلکہ اس مفاد کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے جو
تمام افراد کو متحد کرتا ہے اور ارادے میں "اجتماعیت" پیدا کرتا ہے۔ اور یہی مفاد اجتماعی کا
تخیل ہے جس کی مدد سے روسو قانون وضع کرنے کو جماعت کا حق قرار دیتا ہے۔

قانون کسے کہتے ہیں؟ روسو کے خیال میں قانون کسی خاص موضوع پر جو اجتماعی
مفاد سے متعلق ہو ارادہ اجتماعی کے باقاعدہ اور علانیہ اظہار کا نام ہے گویا قانون ارادۂ اجتماعی
کا محتاج ہے۔ اور جس قانون کو ارادۂ اجتماعی سے جواز حاصل نہ ہو وہ قانون کہلانے کا مستحق
نہیں۔ یہ حق صرف جماعت کو حاصل ہے کہ وہ قوانین وضع کرے، اس لئے کہ صرف اسی کو اپنی
ضروریات کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ پھر قانون کے لئے لازمی شرط یہ ہے کہ وہ کسی خاص شخص یا چیز
سے متعلق نہ ہو۔ بلکہ اس کا اطلاق عام ہو۔

صرف ایک قانون ایسا ہے جس کے لئے کامل اتفاق آرا ضروری ہے۔ اور وہ
معاہدۂ عمرانی ہے باقی تمام قوانین کثرت رائے سے وضع کئے جا سکتے ہیں۔ اسی بات سے روسو

پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ اکثریت کی مطلق العنان حکومت کا قائل ہے۔ مگر در اصل یہ صحیح نہیں
ورنہ روسو کے تمام نظریئے خاک میں ملجائیں۔ اکثریت کا ارادہ تو ہمیشہ صحیح اور اچھا ارادہ نہیں ہوا
کرتا۔ ارادۂ اجتماعی جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں ارادوں کے اتحاد و اتفاق کا نام نہیں۔ اس سے وہ
ارادہ مراد ہے جس کے پیش نظر فلاح اجتماعی ہو۔ پس رائے دہی کا مقصد یہ معلوم کرنا نہیں کہ کسی
مخصوص مسئلہ پر جماعت کی کیا رائے ہے۔ رائے دہی کی غرض اس سوال کا جواب حاصل کرنا ہے
کہ کوئی خاص چیز فلاح اجتماعی میں ممد ہے کہ نہیں؟ رائے دہی کے موقع پر ہر فرد اس مخصوص مسئلے
پر اس ارادہ کا اظہار کرتا ہے جو اس کے خیال میں ارادۂ اجتماعی ہے اور مجموعی حیثیت سے رائے
دہی پر نظر ڈالنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ارادۂ اجتماعی کیا ہے۔ فرض کیجئے میں نے رائے دہی کے
موقع پر اپنے ارادے کا اظہار کیا۔ مگر رائے دہی کے نتیجہ سے یہ معلوم ہوا کہ ارادۂ اجتماعی کچھ اور ہے
تو اس کے معنی صرف یہ ہوں گے کہ میں غلطی پر تھا۔ اور میں نے جسے ارادۂ اجتماعی خیال کیا تھا وہ
در اصل ارادہ اجتماعی نہ تھا۔ پس جب روسو اکثریت کے فیصلہ پر گفتگو کرتا ہے تو اس کے ذہن میں
ہمیشہ ایسی اکثریت کا فیصلہ ہوتا ہے جس کے پیش نظر مخصوص افراد یا جماعتوں کی فلاح و بہبود نہیں
بلکہ فلاح اجتماعی ہو۔ اور ایسی صورت میں اکثریت کا فیصلہ صحیح بھی ہو سکتا ہے اور اچھا بھی اور اگر
یہ نہ ہو تو پھر ریاست میں آزادی کا خاتمہ ہے اور آزادی کے خاتمے کے ساتھ خود ریاست کا خاتمہ!

روسو سیاسی فرقوں اور جماعتوں کو ریاست کیلئے بڑے خطرے کا باعث سمجھتا ہے۔ اور
اس کی وجہ وہ یہ بتاتا ہے کہ گو ہر سیاسی فرقے کا ایک اجتماعی ارادہ ہوتا ہے مگر پوری جماعت
کے مقابلے میں اس "اجتماعی ارادہ" کی حیثیت محض انفرادی ارادے کی ہوتی ہے۔ سیاسی فرقوں کی
وجہ سے سچا اجتماعی ارادہ مشکل سے پہچانا جاتا ہے۔ ان کا مفاد نہ تو انفرادی مفاد ہوتا ہے اور
نہ پوری جماعت کا۔ وہ ایک بیچ کی چیز ہوتی ہے۔ اور جس ریاست میں صرف دو سیاسی فرقے ہوں
وہاں پر تو ہمیشہ اس فرقے کے ارادے کو اجتماعی ارادہ تصور کیا جائے گا جسے اکثریت حاصل ہو۔ پس
اگر سیاسی فرقوں کا وجود ناگزیر ہی ہو تو یہ بہتر ہے دو کی بجائے ایسے بہت سے فرقے ہوں۔

ہر ریاست میں روسو کے خیال کے مطابق اقتدار اعلیٰ کا ہونا ضروری ہے۔ یہ اقتدار اعلیٰ غیر محدود ہے۔ اس کے لئے سب کچھ جائز ہے۔ ہابس اور بلیکسٹن یہاں تک روسو کے ہم خیال ہیں۔ مگر روسو اور ان دونوں میں بڑا فرق یہ ہے کہ ہابس کے خیال میں اقتدار اعلیٰ کا مالک بادشاہ بلیکسٹن کے خیال میں پارلیمنٹ اور روسو کے نزدیک خود جماعت ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ روسو فرد کو جماعت پر قربان کر دیتا ہے۔ یا وہ یہ کہتا ہے کہ جماعت کے مقابلہ میں فرد کو کوئی حقوق حاصل نہیں۔ وہ وضاحت سے بیان کرتا ہے کہ فرد اور جماعت دونوں کے ایک دوسرے پر حقوق بھی ہیں اور فرائض بھی۔ جماعت فرد پر صرف اس صورت میں فرائض عاید کر سکتی ہے جب وہ خود ارادۂ اجتماعی کی پابند ہو۔

روسو نے دستور اساسی کے جو اصول مقرر کئے ہیں ان میں اقتدار اعلیٰ اور حکومت (قوت عاملہ) کا فرق خاص حیثیت رکھتا ہے۔ اقتدار اعلیٰ کی مالک پوری جماعت ہے۔ برخلاف اس کے حاکم یا سلطان یا عامل وہ فرد یا افراد کا مجموعہ ہے جسے پوری جماعت کی طرف سے یہ خدمت تفویض ہوئی ہو کہ وہ ارادۂ اجتماعی کو جس کا اظہار قانون کی شکل میں ہوتا ہے، عمل کا جامہ پہنائے۔ روسو سے پہلے مختلف فلسفیوں نے حکومت کی تشریح "معاہدۂ محکومیت" کے ذریعے کی تھی جو حاکم اور محکوم میں طے پایا ہو۔ اور اس معاہدے کی بنا پر محکوم کے مختلف حقوق مقرر کئے تھے مگر روسو معاہدے کو حکومت کی نہیں ریاست اور سوسائٹی کی بنیاد تصور کرتا ہے یہ معاہدہ محکومیت کا معاہدہ نہیں۔ اقتدار اعلیٰ جماعت کو معاہدۂ عمرانی کی بنا پر حاصل ہے برخلاف اس کے حاکم پوری جماعت (یعنی صاحب اقتدار اعلیٰ) کا نامزد کیا ہوا ہے۔ اقتدار اعلیٰ جس کا استعمال قانون وضع کرنے کی صورت میں ہوتا ہے ناقابل تقسیم ہے اور اس لئے قانون وضع کرنے میں حکومت کو کوئی دخل نہ ہونا چاہیئے جس لمحے حکومت قانون وضع کرنے کے حق کو غصب کرے اسی وقت معاہدہ عمرانی ٹوٹ جاتا ہے اور معاہدۂ عمرانی کے ٹوٹتے ہی ریاست کے وجود کی اخلاقی یا قانونی علت باقی نہیں رہتی۔ حکومت کا کام صرف یہ ہے کہ وہ یہ دیکھے

کہ جو قوانین جماعت نے وضع کئے ہیں ان پر عمل ہوتا ہے۔ نیز عام اصولوں کو خاص صورتوں اور واقعات پر منطبق کرے۔

اب تک جو کچھ کہا گیا اس سے معلوم ہوا ہوگا کہ جمہوری حکومت کو روسو دوسری قسم کی حکومتوں پر ترجیح دیتا ہے۔ مگر وہ ریاست کی ظاہری شکل و صورت پر بہت زور نہیں چاہتا اور نہ حکومت کا کوئی ایسا تخیل پیش کرنا چاہتا ہے جسے ہر جگہ اور ہر زمانے کے لئے بہترین کہا جا سکے۔ پھر روسو کا جمہوری حکومت کا تخیل بہت وسیع ہے۔ اس کے خیال میں ہر وہ حکومت جو قانوناً جائز ہو جمہوری حکومت ہے جمہوریت لازمی طور پر اشرافیہ یا حکومتِ عوام کا نام نہیں۔ جمہوری اصول کا ہر اس ریاست میں دور دورہ ہے جہاں ارادۂ اجتماعی یعنی قانون کے ذریعے حکومت ہوتی ہے اور اس صورت میں شاہیہ بھی بعض اوقات جمہوریت کی مرادف ہو سکتی ہے۔

روسو ایسا دستور تو پیش کرنے کے لئے تیار نہیں جو ہر جگہ اور ہر زمانے کے لئے موزوں ہو مگر اس کی رائے میں عام طور پر بہترین دستور کی صورت وہی ہے جب کہ قانون کا وضع کرنا اور اس پر عمل کرانا علیحدہ علیحدہ جماعتوں کے فرائض نہ ہوں۔ اور قانون کا وضع کرنا چونکہ پوری جماعت کا حق ہے اس لئے حکومت بھی پوری جماعت کو تفویض ہونا چاہیئے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ پوری جماعت کی بلا واسطہ حکومت قایم ہو۔ مگر روسو کو اچھی طرح معلوم ہے کہ بلا واسطہ حکومت عوام کے تخیل کو عملی جامہ پہنانا کم از کم اس زمانے میں ناممکنات سے ہے۔ بلا واسطہ حکومتِ عوام کی لازمی شرط یہ ہے کہ ریاست بہت چھوٹی ہو۔ جہاں تمام شہری ایک جگہ جمع ہو سکیں۔ مگر اس زمانے میں صورت کچھ اور ہے۔ اس لئے جہاں تک حکومت کا تعلق ہے۔ روسو اس بات پر مجبور ہے کہ بلا واسطہ حکومت عوام کے تخیل کو قربان کرے اور حکومت کا حق جماعت کی منتخب کی ہوئی "اشرافیہ" کے سپرد کرے۔ اور یہ اشرافیہ افلاطون والی اشرافیہ ہو یعنی فلسفیوں اور حکما کی جماعت گر چہ قانون وضع کرنے کا سوال آتا ہے تو روسو جماعت کے نمائندوں کو اس کا آخری اختیار نہیں دیتا برخلاف انگریزی نظریے کے جس پر مونٹیسکیو نے اپنی "روح قانون" میں بہت زور دیا ہے اور جس کے مطابق قوم کے نمائندے جب ایک مرتبہ منتخب ہو گئے

تو پھر وہ سوائے اپنی ضمیر کے اور کسی کے سامنے جوابدہ نہیں، روسو نمایندوں کو اس بات پر مجبور کرنا چاہتا ہے کہ وہ مجالس وضع قوانین میں اپنے منتخب کرنے والوں کے خیالات کی لازمی طور پر ترجمانی کریں اور اگر وہ ایسا نہیں کرتے تو انتخاب کرنے والوں کو اس کی معقول طریقہ سے روک تھام کرنے کا حق ہونا چاہیئے وہ قانون جو ارادۂ اجتماعی کے خلاف ہو، چاہے اسے قوم کے نمائندوں نے ہی وضع کیا ہو، باطل ہو۔

ایک دلچسپ سوال یہ ہے کہ روسو اشتراکیت کا قائل ہے کہ انفرادیت کا ؟ جو مصنف اسے اشتراکیت کا حامی خیال کرتے ہیں وہ اس کی تصنیف "انسانی عدم مساوات کے اسباب" کے ان الفاظ کو بہت اہمیت دیتے ہیں جو اس نے "موجودہ سوسائٹی کے بانی" کے متعلق کہے ہیں۔ وہ شخص جس نے پہلے پہل زمین کے ایک قطعہ پر قبضہ کر کے یہ کہا کہ یہ میری ملک ہے اور جس کے اس دعویٰ کو دوسرے احمقوں نے بے چون وچرا تسلیم بھی کر لیا وہ روسو کے خیال میں ہماری موجودہ سوسائٹی کا اصل بانی ہے "کتنے جرائم، جنگوں، قتل و غارتگری، مصائب اور آلام سے بنی نوع انسان کو نجات ملتی اگر کوئی شخص حد بندی کے پتھر اکھاڑ پھینکتا یا کھائیوں میں مٹی بھر دیتا اور اپنی قوم کو مخاطب کر کے یوں چلا اٹھتا : اس دھوکہ باز کی بات ہرگز نہ مانو۔ تمہارا اب خاتمہ ہے اگر تم یہ بھول گئے کہ زمین کی پیداوار کے مالک تم سب ہو اور زمین کسی کی ملک نہیں" بلاشبہ اس عبارت کے آخری حصے سے اشتراکیت کی بو آتی ہے لیکن روسو کی پوری تعلیمات کو اگر سامنے رکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ نہ اشتراکی ہے اور نہ شخصی ملکیت کو قطعی طور پر ریاست کے حق میں قربان کرنے پر تیار۔ وہ تو ریاست کو صرف اس حد تک دست اندازی کی اجازت دیتا ہے جس حد تک فلاح اجتماعی اس کی طالب ہو، اور جس کی ضرورت کا خود جماعت کو احساس ہو۔ وہ اپنے مقالہ "معاشیات" میں یہاں تک کہتا ہے کہ "اس میں کسی قسم کے شبہ کی گنجائش نہیں کہ ملکیت تمام مدنی حقوق میں سب سے زیادہ ناقابل دست اندازی (sacred) ہے، یہ بعض اعتبارات آزادی سے بھی زیادہ اہم ہے" اور "ملکیت معاشرتی نظام کی صحیح معنوں میں بنیاد ہے اور فرائض شہریت کی بھی ضامن"

"انسانی عدم مساوات کے اسباب" اور "معاشیات" میں روسو متضاد باتیں کہتا ہوا نظر آتا

ہے، مگر دراصل ایسا نہیں. ملکیت کا حد سے تجاوز سیاسی نظام کو درہم برہم یا کم از کم خراب کرنے کے لئے کافی ہے. روسو اس خطرے سے اچھی طرح آگاہ ہے جس کا ایسی صورت میں رونما ہونا یقینی ہے جب ریاست میں ایک طرف تو چند افراد کی ایک جماعت دولت سے مالا مال ہو اور دوسری طرف ایک بڑی جماعت بھوکوں مر رہی ہو۔ ایسی صورت میں ریاست کی بنیاد غیر مستحکم ہوگی اور کسی اجتماعی اصلاح کا وجود نہ ہوگا۔ جس قدر ان جماعتوں میں دولت و افلاس کا فرق بڑھتا جائے گا اسی قدر قوانین بے کار ہوتے جائیں گے اور اس لئے "یہ حکومت کے اہم ترین فرائض میں سے ہے کہ مال و دولت کی حد سے زیادہ کمی زیادتی کو دور کرے"۔

ہم اختصار کے ساتھ روسو کے فلسفۂ سیاست پر نظر ڈال چکے۔ اس فلسفہ کی اہمیت کا اندازہ کچھ اس سے ہو سکتا ہے کہ جدید فلسفہ کا سب سے بڑا امام (کانٹ) اپنے تمام سیاسی اور عمرانی نظریوں کے لئے، خود اپنے قول کے مطابق، روسو کا رہین منت ہے۔ اور روسو کے فلسفہ کا دنیا کے "عمل" پر جو اثر ہوا اس کی گواہی بلا استثنا فرانسیسی انقلاب کی ہر تاریخ دیتی ہے۔



تصوّرِ باری کا ارتقا

۲

شرکت اور وحدانیت — اب اس امر پر غور کرنا ہے کہ کثرتیت (بت پرستی یا شرک) سے وحدانیت (توحید) کس طرح پیدا ہوتی ہے۔ اس میں بھی وہی اصول عمل کرتے ہیں۔ مذہبی شعور کے اولین درجے میں جس نوعیت کی وجدانی تشبیہہ کام کرتی ہے حقیقت میں وہ شخصی وجودوں کا تصور نہیں پیدا کرتی۔ شخصی وجود میں بوقت واحد متخالف و متبائن صفات ہوتی ہیں۔ حیات شخصی گویا ایک سررشتہ ہے جس میں نہ صرف متخالف و متبائن صفات ہم سلک ہوتی ہیں بلکہ اوقات و لمحات میں بھی ربط و تعلق پیدا ہو جاتا ہے جن میں یہ صفات وقوع پذیر ہوتی ہیں۔ اس نوعیت کی صفات کا قائم کرنا کسی قدر روحانی ترقی پر منحصر ہے، جس کی مثال زیادہ تر طفلانہ مدارج میں نہیں ملتی۔ کیونکہ بچوں اور وحشیوں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ کسی شے کے صرف ایک ہی پہلو یا صفت کی شناخت کر سکتے ہیں موقت اور مخصوص اصنام کے مرتبے سے بلند ہو کر جزئی تجربات کی مدد سے ایک کل کی تعبیر کرنا خاصی صلاحیت کا کام ہے۔ اس لئے کہ شخصی وجود ایک ہی حیثیت یا ایک ہی صفت میں تحویل نہیں ہو سکتا دوسرے الفاظ میں ایسے تصورات قائم کرنے کی قابلیت پیدا ہونی چاہیئے جن سے کسی فرد کی خصوصیات متمیز ہو سکیں۔ ایک منفرد وجود کے مثالی (typical) تصور سے مراد ایک ایسا تصور ہے جو اس وجود پر مختلف شیون و حالات میں یکساں طور پر صادق آسکے۔ اور ایسے تصورات قائم کرنا بڑے کمال کی بات ہے۔ کیونکہ منفرد شخصی وجود کی ماہیت عموماً نہ صرف پیچیدہ ہوتی ہے بلکہ ان میں وسعت بھی پیدا ہوتی رہتی ہے لہذا یہ تصورات لازمی طور پر نامکمل ہوتے ہیں۔ شخصی وجودوں کی نسبت ہمارے تصورات اکثر صورتوں میں مصنوعی اور مبہم ہوتے ہیں، جن کی تصدیق تمام تر مشاہدے سے نہیں ہو سکتی۔ اور کسی شخصی وجود کی ذاتی خصوصیات کی نسبت ہمارا علم اعتقاد پر مبنی ہوتا ہے نہ کہ معلومات پر۔

اصنام کی صفات میں گہرائی کا آغاز | جس طرح کسی فرد کا جزئی مشاہدہ اور جزئیات کے تصور سے نکل کر مثالی تصورات کے عالم میں داخل ہونا نفسیاتی اعتبار سے عالم تصورات کی ایک اہم ترین ترقی ہے اسی طرح موقت اور مخصوص اصنام کا ایسے اصنام میں تبدیل ہو جانا جو بجا طور پر شخصی کہلانے کے قابل ہوں تاریخ مذہب میں ایک اہم ترین عروج ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اب مذہب حیاتیت سے کثرتیت میں منتقل ہو گیا ہے۔ اس نوبت پر مقدس وجودوں اور مظاہر فطرت میں، جن کے وہ لازم تھے، نمایاں امتیاز قائم کیا جاتا ہے۔ اور خود ان معبودوں کو زیادہ قیمتی اور گہری صفات سے متصف کیا جاتا ہے۔ اس منزل میں مذہب و ایمان کی قابلیت پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے کہ ایک شخص اور اس کے انکشاف میں اضافت مکانی قائم ہو گئی ہے، جو ان ادنیٰ مدارج میں نمودار نہیں ہو سکتی جن پر ہم غور کر چکے ہیں۔ اصنام اور مظاہر فطرت جو اب تک بلا امتیاز پر ایک دوسرے سے وابستہ تھے، اب متمایز ہو جاتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آخر الذکر میں معروضی مشاہدہ اور تحقیق کی زیادہ قابلیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس انتقال سے مذہبی عقاید کا مرتبہ بہت بڑھ جاتا ہے۔ کیونکہ یہ اصنام اب زیادہ گہری اور قیمتی صفات سے متصف ہونے لگے ہیں اور بعض مظاہر فطرت براہ راست انہی کے مظاہر سمجھے جاتے ہیں۔ انسان اب پہلی مرتبہ غیر مرئی عالم میں قدم رکھتا ہے۔ یوسنر نے اس امر پر بے حد زور دیا ہے کہ ایک خاص منزل ارتقاء (مثلاً بت پرستی) میں اصنام اسم خاص حاصل کرتے ہیں۔ اس سے پہلے مخصوص اصنام کی طرف انہی صفات سے اشارہ کیا جاتا ہے جو ان سے منسوب ہوتی ہیں اسم خاص اسی وقت قابل فہم ہوتا ہے جب کہ متعدد شیون و صفات ایک واحد تصور میں جمع ہو جائیں تاریخ کی رو سے یہ بھی ٹھیک طور پر نہیں بتایا جا سکتا کہ کثرتیت کا آغاز کب سے ہوا۔ کیونکہ ہم معلوم کر چکے ہیں کہ مخصوص اور موقت معبودوں میں بھی تشبیہی میلان اور پوشیدہ قوت موجود تھی اور اسی وجہ

Höffding: Psychology. V. B. 9; vi. c. vii. 6, E. B (لہ دیکھو پہلا صفحہ)

Höffding: The Philosophy of Religion. iii p. 143 لے

سے آخرالذکر اصنام کی واضح مثالیں پیش کرنا تقریباً نا ممکن ہے۔

عبادت قدامت پرست ہے | مورخین مذہب عبادت کے قدامت پسند اور تحدیدی اثر کو شد ومد کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سے حیاتِ احساسی کا پتہ چلتا ہے کیونکہ احساس کو عبادت میں پناہ ملتی ہے۔ اگر کسی خاص خطے یا قوم کی عبادت ایک خاص معبود میں مرتکز ہو جائے تو یہ دیوتا کسی ایسے معبود کے قبول و اختیار میں سدراہ ثابت ہوتا ہے جو زیادہ قوی اور دقیق صفات سے متصف ہو تصورات پر عبادت کے اثر کی درخشاں مثال خود لفظ اللہ ہے جس کے معنی لسانیات کے اعتبار سے وہ ہیں جس کی عبادت کی جاتی ہے، تصور الٰہی اور طریق عبادت میں تعلق ہونے کی وجہ سے اگر آخرالذکر میں کوئی بنیادی تغیر واقع ہو تو لازمی طور پر اول الذکر میں بھی ترمیم ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ نظم عبادت اکثر تغیر و تبدل کو گوارا نہیں کرتی۔ اسی لئے قدیم تصورات جب قدیم رسم و رواج سے وابستہ ہو جاتے ہیں تو زیادہ عرصہ تک قائم رہتے ہیں اور قدیم رسم و رواج اپنے ہم عصر تصورات کے بعد بھی باقی رہتے ہیں (مثلاً دوران حج میں صفا و مروہ کے درمیان دوڑنا اور منیٰ میں سنگ باری کرنا) اس صورت میں صرف عادت رہ جاتی ہے اور احساس قدیم عادت سے آسانی کے ساتھ دست بردار نہیں ہوتا۔ اس دور میں قدیم و جدید احساسات کے مابین زبردست کش مکش جاری رہتی ہے یعنی قدیم احساس کا میلان یہ ہوتا ہے کہ سارے شعور پر چھا جائے اور اس پر اپنا رنگ چڑھا دے اور جدید احساس چاہتا ہے کہ خود شعور میں سما جائے اور سب کو متاثر کرے۔ اس طرح دونوں میں ایک کش مکش جاری رہتی ہے اس لئے کہ جو احساسات روایات کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں وہ توسیع کا میلان رکھتے ہیں اور اگر وہ جدید احساس پر قابو نہ پا سکیں تو کم سے کم کوشش کرتے ہیں کہ ان کو اپنے رنگ میں رنگ کر تبدیل ہیئت کر لیں اگر ناگزیر صورتوں میں قدیم تصورات برقرار نہیں رہ سکتے تو جدید تصورات کے مقابلہ میں خود ہی اپنی ہیئت بدل دیتے ہیں۔

عمل انتخاب و ترکیب و تکمیل | لیکن عالم تصورات پر احساس کا تحدیدی اور امتناعی اثر آئینہ کا صرف ایک رخ ہے۔ ہو سکتا ہے کہ جدید تجربات اپنے اندر ایسا سریع النفوذ اثر رکھتے ہوں کہ انتخابات

وتکمیل کی بدولت قدیم تصورات میں خود بخود ترمیم ہوجائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سب اصنام شعور کے حق میں یکساں قیمتی نہیں رہتے۔ جن مخصوص اصنام میں زیادہ مستقل اور قوی احساسات پیدا کرنے کی سب سے زیادہ قابلیت ہوتی ہے ان کو دوسروں پر تفوق حاصل ہوتا ہے ان کی طرف خاص طور پر توجہ کی جاتی اور ان کو خاص حیثیت دی جاتی ہے دوسرے اصنام کے ساتھ ان کا مقابلہ ترک کردیا جاتا ہے اور ذہن کسی ایسی بات پر زور نہیں دیتا جس سے مقابلے کا خیال تک پیدا ہو۔ اب ایک غیر شعوری عمل تکمیل جاری ہوجاتا ہے۔ اس انتخاب و استکمال کے ساتھ قدرتی طور پر عمل ترکیب بھی جاری رہتا ہے۔ کیونکہ اور جتنے آثار اور قابل قدر صفات دیوتاؤں کی اعلیٰ صفات سے کچھ بھی مناسبت یا تعلق رکھتے ہیں ان سب کو اس تکمیل یافتہ دیوتا میں جمع کردیا جاتا ہے۔ اب اس کو ایک خاص قدر وقیمت کا حامل سمجھا جاتا اور اس کے بعد جو بھی نئی صفت تجربے میں آئے اس کو اس سے منسوب کردیا جاتا ہے۔ ہر عظیم الشان دیوتا کے تخیل میں انتخاب، تکمیل و ترکیب سے کام لیا جاتا ہے۔

اخلاقی مذہب، مذہب فطرت کی تکمیل یافتہ صورت ہے | جو اصنام مستحسن اور مشترک صفات (مثلاً تحفظ خاندان و قبیلہ و قوم) کے محافظ سمجھے جاتے ہیں ان کو خصوصیت کے ساتھ تبائن اعمال کا موجب سمجھا جاتا ہے۔ جب انسان دوسروں کی صحبت کے اثر سے یا خود اپنے ہی اندر خیر وشر میں تضاد و تبائن محسوس کرتا ہے اور یہ تضاد و تبائن اس کے شعور میں نمایاں جگہ لے لیتا ہے تو وہ ان کے کمال سے اپنے دیوتا کو متصف کردیتا ہے۔ یہ تکمیل پذیر تشبیہہ اخلاقی نقطۂ نظر سے نہایت اہم ہے۔ کیونکہ نوع انسان کو اسی کی بدولت وہ نورانی اور مقدس مثالیں ہاتھ آئی ہیں۔ جن کو اس نے مشعل راہ بنایا ہے۔ اس طرح مذہب فطرت سے اخلاقی مذہب حاصل ہوتا ہے۔ تاریخ مذاہب میں اس انتقال کو عظیم ترین اہمیت حاصل ہے لیکن یہ انتقال بھی سابقہ انتقالات کی طرح قوانین بالا کے مطابق وقوع میں آتا ہے۔ اگر قوت رعد و برق کا تجربہ نہ ہوتا تو بجلی کے دیوتا کا کون قائل ہوتا؟ اسی طرح اگر یہ نہ معلوم ہوتا کہ حقایق زندگی میں خیر بھی ایک حقیقت ہے تو کوئی متنفس بھی معبودوں کی نیکی اور اچھائی پر ایمان نہ لاتا۔ اصنام کو اخلاقی اقدار حیات کا حامل سمجھنے سے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچتا ہے کہ انسان ان اقدار کا معترف ہوچکا ہے

عمل مقابلہ | ان اتماعی، انتخابی، تکمیل اور ترکیبی اثرات کے علاوہ، جن کو احساس، ترقی تصورات میں استعمال کرتا ہے، ابھی عالم احساس کے اندر مقابلے کے اثرات کی اہمیت پر غور کرنا باقی ہے۔ دو حالتوں کے مقابلے کا ردعمل ان تصورات پر ہوتا ہے جو ہر حالت کے ظہور یا تحریک کا باعث ہوتے ہیں۔ مثلاً اگر ایک غایت مقرر کرلی گئی ہے تو خیالی کمال اور منکر کی محدود انسانیت کے تقابل کی بدولت یہ غایت ایک بلند تر سطح پر پہنچ جائے گی۔ اس کے برعکس غور و فکر سے غایت میں جتنی وضاحت بڑھتی جاتی ہے منکر کی محدودیت بھی اسی قدر نمایاں ہوتی جاتی ہے۔ لہٰذا یہ دور مقابلہ خدا کے تصور کے ارتقاء میں بیحد اہمیت رکھتا ہے۔

تناسخ | جو دائرہ تصورات کلیۃً اصنام سے متعلق ہے اس کے باہر تناسخ ارواح کا عقیدہ احساسات کے انتخابی اور انتقالی اثر کی ایک اچھی مثال ہے۔ اس خیال کا کہ روح موت کے بعد، دوسرے جسم میں منتقل ہو جاتی ہے۔ غالباً کوئی ماخذ نہیں ہے۔ یہ خیال تو معمولی حیاتیت سے متعلق ہے جو ترقی کے ایک خاص زینے پر دنیا کی تمام اقوام میں پیدا ہو جاتا ہے۔ کیونکہ شخصی بقا کو ابتداء میں مشکل ہی سے مذہبی اہمیت حاصل رہی ہوگی۔ یہ عقیدہ نہ صرف مشرقی ایشیا کی اقوام میں بلکہ افریقہ، آسٹریلیا، اور گینی کے باشندوں، نیز اہل گرین لینڈ اور شمالی امریکہ کے قبائل میں بھی پایا جاتا ہے۔ البتہ ویدی عہد میں ہندوستان کے مذہب نے تناسخ کے مسئلہ میں اہم حصہ لیا تھا۔ اپنشد میں اس کو بہت اہمیت دی گئی ہے۔ لیکن ہندوستان کے ابتدائی مذاہب میں اس کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔ اور اب علمیان تھیاسوفی (Theosophy) اس کو قوانینِ فطرت اور اصول ارتقاء کی بنیاد پر قائم کرنے کی بے سود کوشش کر رہے ہیں۔

کثرتیت ایک نفسیاتی معمہ ہے | اب ہم پھر کثرتیت کی طرف لوٹتے ہیں۔ اس کی ترقی نفسیاتی اور تاریخی واقعات کی ایک گتھی ہے جس کو سلجھانا سخت دشوار ہے۔ تاہم اس امر کو تسلیم کرنے کے کافی وجوہ ہیں کہ عالم مذہب کے اندر وہی نفسیاتی اور منطقی قوانین عمل کرتے ہیں، جو حیات ذہنی کے دوسرے عوالم میں کارگر ہیں۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ کثرتیت ہمارے سامنے ایک نفسیاتی معمہ

پیش کرتی ہے۔ کیونکہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ انسان کئی متضاد مقدس ہستیوں کی اطاعت کر سکے؟ اکثر اوقات ایک صنم دوسرے کا ضد ہوتا ہے۔ گویا ایک صنم کا خیال دل میں جمانا دوسرے کا نقش مٹانے کے مرادف ہے۔ اس مشکل کا حل غالبًا یہ ہے کہ انسان تجربہ اور احساس کے وقت اپنے پیش نظر تصور میں اس قدر مستغرق رہتا ہے کہ اسے مقابلے کا موقع تک نہیں ملتا۔ شاید اسے دوسرے اصنام کے تصور کی فرصت بھی نہیں ہوتی۔ جو تصورات قوی اور گہرے احساس کے لمحوں میں ہم پر عمل کرتے ہیں ان کا موازنہ اور مقابلہ بعد کے فکر و غوص سے ممکن ہے، اور تناقضات کا علم بھی اسی وقت ہوتا ہے۔ جب تک ان تناقضات کو دور نہ کیا جائے حیات نفسی کو اطمینان و سکون نصیب نہیں ہو سکتا۔ اور جب تک جدید تجربات ان تمام مسائل و مشکلات کو نظر انداز کرنے پر مجبور نہ کر دیں جو غور و فکر کی بدولت ہم پر منکشف ہوئے تھے ہم اسی پس و پیش میں رہتے ہیں۔ مذہبی ارتقا کی تمام منزلوں میں یہی پیش آتا ہے۔ ہمیشہ ایک عام میلان موجود ہوتا ہے کہ متضاد و متبائن تصورات میں جو معروضی احساس کے مختلف تجربات سے پیدا ہوں، یکسانی پیدا کی جائے۔ کثرتیت کی اس مشکل کو، جیسا کہ اس سے پہلے ذکر آ چکا ہے، اس طرح حل کیا جاتا ہے کہ تمام اصنام کو ایک ہی نسل کے ارکان قرار دیا جاتا ہے اور ان کی ایک علیحدہ دنیا فرض کی جاتی ہے وغیرہ۔ اس طرح یہ مشکل آسانی سے دور ہو جاتی ہے۔ اور انسانی تعلقات کی مثالوں سے ان کی کثرت کو ایک رشتہ میں مربوط کر دیا جاتا ہے اور پھر انسان اور اصنام کے درمیان بھی یہی تعلقات قائم کئے جاتے ہیں۔ مثلاً خدا کے لئے آدمیوں کا باپ اور بادشاہ وغیرہ کے الفاظ استعمال کرنا۔

اقوام کے اختلاط اور ارتباط سے مذہب میں ترقی ہوتی ہے کسی قوم کی مذہبی ترقی محض اسی کے تجربات پر منحصر نہیں رہی ہے۔ بلکہ ہوتا یہ ہے کہ وہ تمام تصورات جو دوسری اقوام کے اختلاط سے یا ان کے ماتحت آ جانے سے پیدا ہوتے ہیں باہم مخلوط ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ اقوام کے اختلاط سے ہر مذہب ترقی کرے۔ درحقیقت اس سے ادنیٰ مذہب میں ترقی ہوتی ہے اور اعلیٰ مذہب میں کچھ نہ کچھ تنزل ہو جاتا ہے۔ مثلاً اسلام میں جا بجا گرد و پیش سے ایسی چیزیں داخل ہو گئی ہیں جو شعار اسلام سے بالکل بعید ہیں۔ آغاز اسلام ہی میں عبداللہ بن سبا یہودی اور اس کے ہم خیال جو اسلام قبول کرنے کے

باوجود سابقہ معتقدات پر قائم تھے حضرت علی کی محبت کے اظہار میں اتنا غلو کرنے لگے کہ حضرت علی کو خدا کے مرتبے پر پہنچا دیا۔ ابن سبا کا دعویٰ تھا کہ حضرت علی میں خدا حلول کر گیا ہے[1] بعض جاہل صوفیہ یا متصوفین خدا کے ایک مقدس اور بزرگترین بندے کو، جس کو خدا نے آخری مرتبہ رسالت کے لئے منتخب کیا تھا، "احمد بے میم" اور "عرب بے عین"[2] سے تعبیر کہنے لگے۔ اور اسی ضلالت اور گمراہی کا نام تصوف رکھا۔ عیسائیوں کی اختلاط کی بدولت تیسری صدی سے اسلام میں رومن کیتھولک نظام داخل ہو گیا۔ اور پیری مریدی کے سلسلے خوب پھیلے۔ اس نظام کا اساسی عقیدہ یہ ہے کہ خدا رسی یا خدا شناسی بالواسطہ ہی ممکن ہے۔ جو اسلام کے سراسر منافی ہے لیکن اکابرین صوفیہ نے اس سے ذرا ہٹ کر اپنے لئے ایک نیا راستہ اختیار کیا۔ ان بزرگان طریقت نے یہ مسلک اس لئے اختیار کیا کہ سلوک میں ایک باخبر رہنما کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور سالک اس راستے کے خطرات سے بچنے کے لئے اپنے واسطے ایک تجربہ کار رہبر تلاش کر لیتا ہے لیکن یہ اپنی متلاشیان حق کے لئے ہے جو خدا طلبی میں سرگرم و سرگرداں رہتے ہیں حافظ نے اس کو اس طرح ادا کیا ہے۔

بمے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید ‏ ‏ ‏ ‏ که سالک بیخبر نبود زراه و رسم منزلها

بہرحال متاخرین میں پادریوں کے نظام کی تقلید یعنی آج کل کی نام نہاد پیری مریدی انتہا کو پہنچ گئی ہے۔ الا ماشاء اللہ۔ ایرانی قوم خیال پرور، حسرت زدہ، اور غمناک سرشت رکھتی ہے اور دردکی چاشنی گویا اس کی فطرت میں داخل ہے اسی لئے اس نے نوحہ و ماتم کو مذہب کا ایک عنصر بنا دیا۔ ہندوستان ہی کو لیجیے، یہاں کے عام مسلمانوں کی مذموم بدعتیں شخص پرستی[3]، قبر پرستی[4]، صدر پشتی[5] اور

---

[1] اس خیال کے حامیوں کو حلولیہ کہتے ہیں [2] یہ دونوں فقرے ایرانی تراش خراش کے ہیں لیکن عام طور پر مشہور ہے کہ یہ دونوں احادیث ہیں۔ [3] اسلام نے بزرگوں کی تعظیم و احترام کی تلقین کی ہے۔

[4] ابن تیمیہ نے قبر پرستی کو بت پرستی کا پیش خیمہ قرار دیا ہے۔

[5] شیخ صدر الدین امروہوی۔

تیع رسوم معیار اسلام پر ہرگز پوری نہیں اتر سکتیں۔ غرض جب اقوام آپس میں اتحاد پیدا کرتی ہیں تو ان کے بے شمار اصنام بھی آپس میں مخلوط ہو جاتے ہیں حتیٰ کہ ایک مورخ نے اس دعوے میں یہاں تک غلو کیا ہے کہ جب تک مختلف مذاہب آپس میں متصادم نہ ہوں کہیں مذہبی ترقی نہیں ہوتی[1]۔ اس اعتبار کر مذہبی غایات کی راہِ ترقی تنگ و تاریک اور پیچیدہ ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اعمالِ ترکیب و تشبیہ اور تاثراتِ مقابلہ و توسیع کی تعداد بے حد و بے شمار ہو جاتی ہے۔

وحدانیت تک انسان کی کس طرح رسائی ہوئی | عالم اصنام کا تخیل کثرتیت (شرک) اور وحدانیت (توحید) کی درمیانی کڑی ہے۔ کثرتیت کے وحدانیت میں منتقل ہونے کی دو صورتیں ہیں جو آخر کار ایک دوسرے میں ضم ہو جاتی ہیں۔

(۱) عالم اصنام میں ایک خاص صنم دوسرے اصنام پر تفوق و برتری حاصل کرتا اور اس کے بعد باقی تمام اصنام بلکہ غیر اقوام کے اصنام سے بھی فضیلت میں بڑھ جاتا ہے۔ اور بالآخر یہی خدا ایک واحد خدا مانا جاتا ہے۔ یہ عموماً خدا کے تخیل کے تنزیہ اور اس میں گہرائی پیدا کرنے کا نتیجہ ہے۔ یا اس کے برعکس خدا کے تصور کا تنزیہ اور گہرائی انسان کی رہنمائی وحدانیت کی طرف کرتی ہے۔

۲۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی صنم کے تصور میں خود بخود ترقی ہو جائے۔ اور یہ تصور خاص طور پر کسی مخصوص صنم کے تخیل میں گہرائی پیدا کرنے یا تقویت پہنچانے پر مبنی نہ ہو بلکہ اس کا اساس وہی الٰہی (مقدس) عنصر ہو جو تمام اصنام میں مشترک ہے۔ الٰہی عنصر سے مراد وہ عنصر ہے جس نے سب سے پہلے دیوتاؤں کو دیوتا بنایا اور جو مختلف اصنام میں مختلف حیثیتوں سے جلوہ نما رہا۔ پہلی نوعیت کی ترقی سب سے پہلے اسیریائی۔ بابلی۔ مصر اور اسرائیلی مذاہب میں ہوئی۔ اسرائیلی مرسلوں نے ارتقاء وحدانیت ایک مکمل اور تاریخی اعتبار سے نہایت اہم مثال دنیا کے سامنے پیش کی اور اسلام (مذاہب وحی کے) اسی سلسلہ کی آخری کڑی اور ان کی مختتم اور مکمل صورت ہے۔

---

[1] Tiele: Elements of the science of Religion i p. 226.

مذاہب وحی | اس وقت تک ہیں جتنے مذاہب وحی کا ثبوت ملا ہے وہ تمام تر سامی النسل پیغمبروں سے متعلق ہیں جن میں زیادہ اولوالعزم پیغمبر ایک طرف بنی اسرائیل میں پیدا ہوئے اور دوسری طرف حضرت اسمٰعیل کی اولاد میں رسول عربی، جو مسلمانوں کے عقاید کی رو سے خاتم النبیین ہیں۔ اسرائیلی وحدانیت کا ارتقاء ارتقائے یہوہ کے مرادف ہے جس نے ایک خاص اور قومی خدا کے مرتبہ سے ترقی کرکے ایک عالمگیر خدا کا مرتبہ حاصل کیا۔ اس کے باوجود بنی اسرائیل نے یہوہ کو اپنی قوم کے لئے مختص کر رکھا تھا اور غیر کو اس کی عبادت میں شریک ہونے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ عام طور پر پیغمبر کا مقصد صرف یہی نہیں ہوتا کہ قوم یا اس کے پیشواؤں کے دنیاوی سود و بہبود کے اسباب دریافت کرے۔ بلکہ اسے دنیا کے عارضی تعلقات و اضافات سے ماورا اپنی قوم کی اخروی اور ابدی خوشحالی کی فکر و انگیز ہوتی ہے۔ مگر رسول عربی کی عدیم المثال علو مرتبت کا ثبوت اس امر سے ملتا ہے کہ ان کی تبلیغ کسی خاص قوم، یا ملک یا کسی خاص زمانے کے لئے مختص نہیں بلکہ تمام افراد انسان سے متعلق ہے پیغمبر کی ذات میں ایک وجد آور جذبہ جاگزیں ہوتا ہے جو دنیا کے عظیم الشان واقعات و حوادث سے اس کے اندر موجزن ہوتا ہے۔ اور اس میں یہ قوت بھی ودیعت ہوتی ہے کہ اپنی قوم کے تصورات غائی کی اہمیت کو جتلائے اور خود بھی ان کی توثیق و تصدیق کرے۔

ہم ان دو مختلف نقطہ ہائے نظر میں امتیاز کر سکتے ہیں جو اسرائیلی وحدانیت کے اساس ہیں۔ ان میں سے ایک کو عالم کے حوادث عظیمہ سے بحد متاثر ہوا ہے اور دوسرا اخلاقی مقاصد اور اس کے مسائل و مباحث سے۔ لیکن ان دونوں میں اس امر کی جد و جہد کی گئی ہے کہ ایک جدید ماحول میں بھی انھی روایاتی مذہبی تصورات کو برقرار رکھا جائے جو ان کو کبھی اعلیٰ مدارج پر پہنچانے میں کامیاب ثابت ہوئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب قوم کی خود مختاری جاتی رہی تو یہوہ اس کے ساتھ تباہ ہونے سے بچ گیا۔ اب وہ خالص قومی خدا نہ رہا بلکہ سارے عالم کا خدا بن چکا تھا۔ اس لئے کہ سابقہ تصورات اب اس سے وابستہ نہیں تھے بلکہ وہ اعلیٰ اخلاقی تصورات کا حامی اور سرپرست تسلیم ہونے لگا تھا۔ اسی وجہ سے اس پر قوم کی بدقسمتی کا اثر نہیں پڑا۔ بلکہ اس کو اپنی قوم کے مقابلے میں اس قدر حیرت انگیز تفوق و برتری حاصل ہوئی کہ تاریخ میں ایسی مثالیں بہت کمیاب ہیں۔ بنی اسرائیل کے پیغمبروں نے ہمیشہ اس امر کی کوشش کی ہے کہ نوع

انسان کی توجہ خارجیت وظاہریت سے ہٹا کر باطنیت و اخلاق کی طرف مبذول کرائی جائے۔ یہاں تاریخی اور اخلاقی نقطہائے نظر ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتے ہیں۔ لیکن اسرائیلی انبیا کے زمانے میں جو کام ادھورا رہ گیا تھا اس کی تکمیل رسول عربی کے زمانے میں ہوئی۔ اسلام کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے پیش نظر سابقہ مذاہب کا نمونہ نہیں ہے بلکہ ایک اعلیٰ نصب العین کے مطابق مذہب کو درجۂ کمال تک پہنچا دیا گیا ہے۔ جس کا ثبوت اس کی عالمگیر اخوت و مساوات میں¹ اور فطرت کے ساتھ اس کی مطابقت میں ملتا ہے۔ نیز اسلام کا اللہ اخلاقی تصورات کی ہمہ گیری اور ان کی باطنیت کو تمام قومی تحدیدات سے ماوراء لے جاتا ہے۔

غرض دنیا کو کامل وحدانیت تک پہنچنے میں بڑا عرصہ لگا۔ اس کی یہ نعمت عظمیٰ بے جنگ و دو اور بے جد وجہد نصیب نہیں ہوئی لیکن دنیا اس عظیم الشان اور مقدس ترین ہستی کو ہرگز فراموش نہیں کر سکتی جس کا آفتاب رسالت فاران کی چوٹیوں سے طلوع ہو کر سارے عالم پر جلوہ افگن ہوا۔ اسلام نہ صرف سابقہ مذاہب وحی کی ترکیب کامل ہے بلکہ اس نے دنیا کے سامنے مکمل ترین وحدانیت اور نہایت جامع مذہب پیش کیا ہے۔ اور ایجابی مذاہب میں یہی ایک مذہب ایسا ہے جس نے زندگی کے اقدار سے کامل بحث کی ہے۔ رسول عربی کا ظہور ایسے زمانے میں ہوا جب کہ نوع انسان بے شمار ٹھوکریں کھا چکنے اور ارتقاء کی کٹھن منزلیں طے کر چکنے کے بعد اس قابل بن چکی تھی کہ خدا کے ساتھ دلی رابطۂ اتحاد اور غیر محدود تعلق قائم کر سکے۔ غرض عالم مذاہب میں اسلام ہی وہ مذہب ہے جو نوع انسان کو توحید کی مکمل ترین تعلیم دیتا ہے۔ اور اسلام کا خدا ہی وہ خدا ہے جو انسانوں کے وحدت پرست قلوب کو کامل اطمینان و تشفی بخش سکتا ہے اس لئے کہ دنیا اب ترقی کے اس زینہ پر پہنچ گئی ہے۔ جہاں کثرتیت کا رنگ نہیں جم سکتا² گو اب بھی دنیا میں ادنیٰ سے ادنیٰ اور بت پرست مذاہب موجود ہیں لیکن

---

¹ مذاہب کی پارلیمنٹ کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے جو ۱۸۹۳ء میں شکاگو میں منعقد ہوئی تھی اس کا صدر کینن لکھتا ہے کہ تمام مذاہب کے مقابلے سے تصفیہ کن ثبوت مل چکا ہے کہ وحدانیت (توحید) ہی خدا کا بہترین تصور پیش کرتی ہے۔

اس کی وجہ صرف یہی نہیں ہے کہ وحدانیت کی آواز ان بت پرست اقوام کے کانوں تک نہیں پہنچی بلکہ ان میں توحید کو قبول کرنے کی قابلیت اور صلاحیت بھی پیدا نہیں ہوئی ہے۔

مذاہب وحی کے مقابلہ میں ہندوؤں اور یونانیوں کی ترقی دوسری سمت میں ہوئی۔ ہندوؤں میں کوئی خدا عالمگیر نہیں۔ ان کی نظر و فکر اس قوت کی جانب مبذول ہوئی جن کی بنا پر اصنام کو الٰہی مرتبہ اور اعلیٰ حیثیت حاصل ہوئی تھی۔ برہما کو ابتدائً ساحری اور عبادت کی تخلیقی قوت مانا جاتا تھا لیکن بعد میں خود مبدء ہستی قرار دیا گیا۔ اگر سوال کیا جائے کہ برہما کا حقیقی مفہوم کیا ہے تو بجز اس کے اور کچھ نہ کہا جائے گا کہ وہ اس روح سے مشابہ ہے جس کا احساس ہر شخص کو اپنی ذات کے اندر ہوتا ہے۔ وحدانیت کی طرف اس قوم کا رجحان سب سے پہلے اپنشد کے عہد میں اصول حسنی کی حیثیت سے ہوا۔ لیکن یہ وحدانیت سے ابھی کوسوں دور ہے، بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ بت پرستی میں الجھ کر رہ گئی ہے۔ یونانیوں میں وحدت کے میلان کو صرف فلاسفہ نے ترقی دی۔ زینوفینز ایک ایسے مبدء واحد تک جا پہنچا ہے جو کسی ذی حس تخیل کا معروض نہیں بن سکتا۔ لیکن اس نے کثرتیت پر اخلاقی حیثیت سے بھی تنقید کی تھی۔ افلاطون نے زیادہ تر اسی آخر الذکر نقطہ سے اپنی فکر کا آغاز کیا تھا۔

اسلام | اب اسلام کی چند خصوصیات پر اس حیثیت سے غور کیا جائے گا کہ وہ مذاہب وحی کی سب سے آخری کڑی، سب سے مکمل اور سب سے بڑا توحیدی مذہب ہے۔

اسلام نے نہ صرف ایک واحد اور عالمگیر خدا کا ممکن سے ممکن اور لطیف سے تصور پیش کیا ہے اور باطنی اور اخلاقی حیثیت سے مذہب کو معراج کمال پر پہنچا دیا ہے۔ بلکہ عالم مذاہب میں یہی ایک ایجابی مذہب ہے جو تمام اقدار حیات کی کامل حفاظت کرتا ہے۔ اسی نے دینی اور دنیاوی زندگی میں سابقہ مذاہب کی انفرادیت کو مٹا کر مذہب کو اجتماعی اور معاشرتی اساس پر قائم کیا، جو عالم مذہب میں ایک نئی چیز ہے۔ اسی نے فطرت اور فوق الفطرت کے فرق کو مٹایا۔ اسی نے مذہب کو آسان، مطابق فطرت اور تمام شعبہ ہائے زندگی کے لئے ہمہ گیر بنایا۔ تاریخ مذاہب میں سب سے پہلی مرتبہ انسان اور انسانیت کو پہلے انتہا زور دیا۔ علم اور ایمان، عقل اور ما فوق العقل کے امتیاز کو دور کیا۔ نیز ذہنی اور اخلاقی فضیلت

کی وجہ سے زندگی کے تمام شعبوں پر اس طرح چھا گیا کہ اب اسلام میں یہ تمیز نہیں ہو سکتی کہ مذہبی کیا ہے اور غیر مذہبی کیا ہے۔ بلکہ مذہب میں اتنی جامعیت پیدا کر دی گئی ہے کہ ہر وہ چیز جو مذہبی ہے فطرت، اخلاق اور عقل کے مطابق ہے۔ مذہب کا یہ زاویۂ نظر تاریخ مذاہب میں عدیم النظیر ہے۔ اس لئے اسکی عالمگیر اخوت و مساوات اور اس کی محیر العقول جامعیت پوری طرح سمجھ میں نہیں آسکتی جب تک کہ اس کے باطنی پہلو، اس کے اعلیٰ معیار زندگی، اس کی وسعت نظر، اور اس کی لچک اور صورت پذیری کو پہلے ہی سے ذہن نشین نہ کر لیا جائے۔ اگر دوسرے مذاہب کے معیار یا کسی مثال کو پیش نظر رکھ کر اسلام کا مطالعہ کیا جائے گا تو اس کی حسن و خوبی اور اس کی افضلیت و اکملیت کا ہرگز اندازہ نہ ہو سکے گا۔ کیونکہ اسلام کے معیار پر ہر مذہب کو جانچا جا سکتا ہے لیکن کوئی مذہب اس کے معیار کا کام نہیں دے سکتا۔ اس لئے کہ اس کا معیار دوسروں سے بہت بلند ہے۔

توحید اسلام نے نہ صرف خدا کی وحدانیت کی تعلیم دی ہے بلکہ تقریباً ان مسائل سے بھی ثنویت مٹادی ہے جو عام طور پر ثنوی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ اسی لئے منکرین اسلام مذہب میں کسی ثنویت کو گوارا نہیں کرتے۔ چنانچہ مبدء و حقیقت کائنات کی وحدت بھی مذہب ہی کے حدود میں داخل ہے۔ لیکن مذاہب کی یہ ثنویت کوئی مفروضہ نہیں بلکہ نتیجہ ہے، سبب نہیں بلکہ مسبب ہے۔ وحدتی مذاہب کی ثنویت پر کئی حیثیتوں سے نظر ڈالی جا سکتی ہے اور اس کی کئی قسمیں ہو سکتی ہیں۔

۱۔ خیر و شر کے نقطۂ نظر سے انسان اپنے تجربے اور مشاہدے سے نیکی اور بدی کا وجود پاتا اور ان میں امتیاز کرنے لگتا ہے لیکن جب ان متضاد چیزوں میں مطابقت پیدا کرنے سے قاصر رہتا ہے تو اپنی نامعقولیت کی وجہ سے اس معمے کو یوں حل کرتا ہے کہ نیکی کا خدا الگ ہے اور بدی کا الگ۔ اس کی بین مثال ایرانی مذہب میں ملتی ہے جس میں نیکی کا خدا ارمزد اور بدی کا اہرمن[1] تھا۔ اسلام کی رو سے کائنات میں علی الاطلاق شر کا وجود نہیں ہے۔ بلکہ عالم انسان میں نیکی اور

---

[1] اور یہ بالآخر دونوں یزدان میں ضم ہو جاتے تھے۔

بدی کا اضافی مفہوم ہے۔ اور انسان کی فطرت ناقص ہونے کی وجہ سے اس کے افعال بھی ناقص ہوتے ہیں۔ اور اسی نقصان کو بدی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ نیکی اور بدی دونوں خدا ہی کی طرف سے ہیں مگر ارادے کے بعد اعمال انسانی میں اختیار کو دخل ہونے سے شر کا ذمہ دار خود انسان ہے۔

۲. فلسفہ اور مذہب نے انسان کے تخیل میں ذہن اور مادہ جسم اور روح، روح اور فطرت میں تفریق پیدا کرکے ایک ناقابل حل شکل پیدا کردی ہے۔ جسم عارضی اور فانی ہے، روح ایک ناقابل فنا حقیقت ہے اور جسم سے جدا ہوکر بھی کسی نہ کسی صورت میں اور ایک نہ ایک حیثیت سے باقی رہیگی گویا دونوں کی حقیقت جدا ہے۔ بعضوں نے اس کی تقسیم روح، حیات اور جسم میں کرکے تثلیث پیدا کردی ہے۔ اسلام نے نہ صرف فطرت اور ما فوق الفطرت کی تفریق مٹا کر اس خلیج کو پاٹنے کی کوشش کی ہے بلکہ دونوں کو خدا کی مخلوق اور اسی کی صفت قرار دیکر ان میں وحدت پیدا کردی ہے۔ دوسرا عنصر یہ ہے کہ جس طرح جسم کے لئے روح درکار ہے اسی طرح روح پر آثار خارجی مترتب ہونے کے لئے جسم درکار ہے۔ اور جسم اصل میں روح کا ایک خارجی اثر صورت اور مظہر ہے یا صوفیائے اسلام کے خیال کے بموجب خدا کے علم کے مطابق اس کی صفات منفعلہ پر جب صفات فاعلیہ عمل کرتے ہیں تو اس سے جسم یا آثار خارجی ظہور میں آتے ہیں۔ قرآن کی ظاہری تعلیم کی رو سے علمائے مذہب حیات ما بعد الموت کو جسمانی قرار دیتے ہیں۔ خواہ یہ مثالی صورت ہی کیوں نہ ہو۔ بعض مفکرین اسلام نے مادہ کو روح کی پیداوار قرار دیا ہے[1]۔ جس سے یہ ثنویت مٹ جاتی ہے۔ ان کی اس توجیہ کہ ساری حقیقت حیات ذہنی کی ارتقا ہے یہ مراد ہے کہ تمام نفسیاتی زندگی کا انحصار جسم اور جسمانی حالات پر ہے۔ اس سے یہ مراد ہے کہ جسم یا مادہ سے جدا نفسیاتی زندگی نہیں قائم ہو سکتی کیونکہ فطرت میں حیات نفسی بذات خود کہیں قائم نہیں ہے، اور نہ کہیں جسم اور روح میں تفریق ہوئی ہے۔ یہ سب انسان کے ذہنی اعتبارات

---

[1] جلال الدین رومی۔

قالب از ما ہست شد نے ما از و　　　بادہ از ما مست شد نے ما از و　(مثنوی)

اور اسی کے امتیازات ہیں جس کی معروضی حقیقت کچھ نہیں ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ آثار خارجی ہی کی تفصیلات ہیں۔

۳۔ معاشری۔ اس کی نوعیت محض تاریخی ہے۔ یعنی یہ کہ مذہبی اور دنیاوی امور میں کوئی مناسبت نہیں ہے مذہبی اور دنیاوی زندگی دو جداگانہ حقایق ہیں۔ لیکن اسلام نے دنیاوی اور مذہبی زندگی میں کوئی فرق باقی نہیں رکھا جو دنیاوی زندگی خدا کے خوف، جذبات کے بہترین استعمال اور فطرت وعقل و اخلاق کے مطابق ہو وہی روحانی زندگی بھی ہے اور وہی مذہبی بھی۔ اسلام کی رو سے زندگی کا کوئی شعبہ دائرۂ مذہب سے خارج نہیں بشرطیکہ وہ ان اعتبارات سے خارج نہ ہو۔ عام طور پر ہم جس کو دنیاوی زندگی کہتے ہیں وہ مذہبی نقطۂ نظر سے سلبی زندگی ہے نہ کہ ایجابی۔ اس کے علاوہ اسلام نے معاشری یا اجتماعی (اور اخلاقی) زندگی کے بہترین اصول سکھائے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ افراد انسان کو اپنی فطری صلاحیتوں کے نشو ونما کا بہترین موقع عطا کیا ہے۔ اسلام کی اجتماعی قوت اور عالمگیر اخوت ومساوات کا یہی وہ راز ہے جس نے دنیا کو حیرت میں ڈال رکھا ہے[1]۔ کالا ہو یا گورا امیر ہو یا فقیر، مہذب ہو یا غیر مہذب، عالم ہو یا جاہل، بادشاہ ہو یا رعیت۔ مشرق کا رہنے والا ہو یا مغرب کا، شمال کا رہنے والا ہو یا جنوب کا سب آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ اسلام کی یہ زنجیر اتنی قوی ہے کہ سارے نوع انسان کو ایک ہی سلسلے میں منسلک کر دیتی ہے

۴۔ علم اور ایمان کی ثنویت یعنی علم اور ایمان دو متضاد چیزیں ہیں۔ یہ بڑا معرکۃ الآرا مسئلہ ہے جس کو سند (وحی) سے قریبی تعلق ہے اور اس مسئلے پر اب تک برابر بحث جاری ہے لیکن اسلام میں یہ ایک طے شدہ مسئلہ ہے۔ یعنی مذہب میں کوئی جزء ایسا نہیں ہے جو دائرہ علم سے خارج سمجھا جائے

---

[1]۔ یہ وہ دُرّ یتیم ہے جو اب تک مغرب کے غواصان فکر کے ہاتھ نہیں لگا ہے کاش یورپ مذہب اسلام اختیار کرے۔ یہی اس کی تمام داخلی اور خارجی مشکلات کا واحد اور ممکن حل ہے یہی وہ مسیحا نفس ہے جو اس کی تمام اخلاقی کمزوریوں اور مالی مشکلات کے امراض کو دور کر کے کامل شفا بخش سکتا ہے۔

بے سوچے سمجھے بلا خلاف عقل کوئی چیز تسلیم نہیں کی جا سکتی۔ ایمان وہی ہے جو صحیح علم کی بنیاد پر قائم ہو۔ حتیٰ کہ 'یومنون بالغیب' بھی علم ہی پر منحصر ہے۔ اسی لئے اسلام کو مطابق عقل کہا جاتا ہے۔ اسلام نے کسی ایسے عقیدے کی تکلیف نہیں دی جو ناقابل فہم اور خلاف عقل ہو۔ علم اور ایمان میں کوئی فرق نہیں اور نہ ان میں تفریق ممکن ہے۔ کیونکہ انسان کی نفسیاتی ذات سے کسی عنصر کو اس طرح علیحدہ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اور تمام عناصر سے بالکلیہ غیر متاثر رہے۔ ایمان خود ایک قسم کا قوی علم ہے، کیونکہ وہ اس معروض کی ماہیت پر منحصر ہے جس پر خود وہ قائم ہے۔ اور علم بھی ایک قسم کا ایمان ہے۔ کیونکہ اس کا دارومدار زیادہ تر کامل علم کی غیر متحقق غایت پر ہے، جو تمام ذہنی ارتقا کا داخلی اصول ہے۔ انسان کی حیات نفسی کے مختلف عناصر اور ان کی ترکیب کو ایک ایک کرکے گنانے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ان کا وجود بھی فی نفسہٖ جدا جدا پایا جاتا ہے۔ قرآن ہر چیز میں عقل انسانی سے استشہاد کرتا ہے:۔

افلا تعقلون ؟	کیا تم اس بات کو نہیں سمجھتے ؟
افلا تذکرون ؟	کیا تم اس سے یادداشت حاصل نہیں کرتے ؟
فہل من مدکر ؟	کیا ہے کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ؟
افلا تفکرون ؟	کیا تم غور و فکر نہیں کرتے ؟
افی اللہ شک فاطر السموٰت و الارض ؟	کیا تم کو خدا کے متعلق کسی قسم کا شک ہے جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے۔

۵۔ اس کے بعد ایک اور اساسی ثنویت مذہب میں پائی جاتی ہے جس کے ارتفاع کی کوشش میں نوع انسان نے اپنی پوری قوت صرف کر دی ہے۔ اس کی دو صورتیں ہیں۔

الف۔ خدا کی ماورائیت۔ خدا کائنات اور خاص کر انسان سے الگ اور ماورا ہے۔ وہ عالم پر فرمانروائی کرکے اپنے منشا اور مشیت کی تکمیل چاہتا ہے۔ انسان کی اخلاقی درستگی اور اس کی نجات اس کے ارادے میں ہے اور وہ اس کی تکمیل کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ لیکن اسلام میں داخلیت و ماورئیت دونوں ہم پلہ ہیں۔ اور قرآن سے اس کی جابجا شہادت ملتی ہے۔

(ب) آیا خدا کی وحدت کے مفہوم میں یہ موضوع بھی داخل ہے کہ خدا کامل حقیقت کا مرادف ہے، یا وہ مبدء ہے جس پر ساری حقیقت کا مدار ہے۔ اکثر منکرین اسلام کا دعویٰ ہے کہ توحید اسلام مبدء اور حقیقت کی ثنویت کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ خدا کی وحدت کے مفہوم میں مسئلہ آخر الذکر بھی داخل ہے ساری کائنات میں ایک ہی بالذات حقیقت موجود ہے۔ مسئلہ وحدت الوجود انھی آخری مسائل سے بحث کرتا ہے۔

وحدت الوجود | سب سے آخر میں وحدانیت اور وحدت الوجود کے تعلق پر ایک سرسری نظر ڈال لینی چاہئے جیسا کہ پہلے ذکر آ چکا ہے۔ ابتدائی وحدانیت کا مفروضہ قوی بنیاد پر قائم نہیں ہے۔ اور نہ قرین قیاس ہے۔ البتہ اس کو الہیت مطلقہ کے نام سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔ وحدانیت مذہب کی متاخر صورت معلوم ہوتی ہے۔ لیکن بلاشبہ مذہب کی روح اور اس کا تصور توحیدی مذہب ہی میں بدرجۂ اتم ظاہر ہو سکتے ہیں۔ کثرتیت مذہبی اغراض و مفاد کو منتشر کر دیتی ہے۔ انسان کو اپنے بہبود کا یقین اور خدا پر بھروسہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ ایک اور صرف ایک ہی خدا پر ایمان ہو اور اس کا کوئی مقابل، کوئی حریف اور کوئی ضد نہ ہو۔ اور کامل قدرت اور جمیع صفات اسی ایک ذات میں داخل ہوں۔ جب ہی انسان میں خوف و رجا مستحکم ہو سکتا ہے جو مذہب کا اساس ہے۔

وحدانیت شعورِ مذہبی کا کمال ہے۔ جب تک ایک خدا پر یقین نہ آئے مذہبی اور اخلاقی اقدار کی حفاظت و صیانت اور ان کی کافی ضمانت نہیں حاصل ہو سکتی۔ اگر کائنات کا ایک ہی خدا ہے تو کل اقدار حیات کی حفاظت کا بھی یقین ہو گا۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ یہ مذہب کا معراجِ کمال ہے خدا کی وحدانیت کو تسلیم کرنے سے یوں تو مذہب کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ لیکن انسان کی فطرت وحدت پسند واقع ہوئی ہے وہ اپنی ہر فکر میں وحدت کا متلاشی اور عالم کی اس کثرت اور گوناگونی میں ایک وحدت حقیقی کا جویا ہے۔ وہ جب تک وحدت کو نہ پالے چین نہیں لیتا اس سے ظاہر ہے کہ تلاش وحدت ترقی یافتہ انسان کے غور و تامل کا نتیجہ ہے۔ اس عالم کی کثرت میں تلاش و جستجو کرتے کرتے وہ آخر اس منزل پر جا پہنچتا ہے کہ اگر خدا ایک ہے تو حقیقت و مبدء کائنات بھی وہی ہے اور ایک

ہی ہے۔ کوئی ترقی یافتہ انسان ثنویت کو گوارا نہیں کر سکتا لہٰذا اس کے حق میں ناگزیر ہو جاتا ہے کہ مبدء کائنات اور خدا میں تطبیق دے کہ خدا ہی کو مبدء کائنات قرار دے تاکہ عالم میں کہیں ثنویت باقی نہ رہے یہی وحدانیت کی آخری اور انتہائی صورت ہے۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نہ نکالنا چاہیئے کہ وحدت الوجود کا مسئلہ ہمیشہ مذہبی نوعیت کا ہوتا ہے۔ وحدت الوجود کی کئی اقسام اور کئی مدارج ہیں۔ اس کے نقطۂ آغاز کی طرح اس کے نتائج میں بھی اختلاف ہے۔

اگرچہ وحدت وجود کا مسئلہ دور ترقی کی حالیہ پیداوار ہے، لیکن ارتقاء کی ابتدائی منازل میں کم از کم اس کی علامات پائی جاتی ہے۔ ابتدائی انسان کے دھندلے شعور میں سب سے پہلا نقش اس کا بیٹھا ہوگا کہ اس سارے کارخانۂ عالم میں کوئی قوت ہے جو عمل کر رہی ہے۔ ہندوؤں کے 'رتا' اور 'کرما' کے تخیل میں تمام اشیاء کے پس پردہ ایک ایسی قوت کا تصور پایا جاتا ہے جو اٹل قانون کی مدد سے کارفرما ہے۔ قدیم چینی 'تاؤ' (Tao) کے تصور میں کائنات کی ایک ابدی تنظیم کا خیال موجود ہے۔ یونانی 'موائیرا' اور ایرانی 'اشا' کا بھی یہی تصور ہے۔ لیکن جب عالمگیر مبدء کا عقیدہ کثرتیت کے رنگ میں ظاہر ہو تو اس تصور کا موجب ہوتا ہے کہ تمام دیوتاؤں کے پس پردہ ایک مشترک قوت ہے۔ اور اس سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ مختلف دیوتا ایک حقیقت واحد کی مختلف صورتیں ہیں۔ چنانچہ مصر کی سلطنت وسطیٰ میں غور و فکر نے مختلف خداؤں کو 'را' کے مظاہر قرار دیا ہے۔ وحدت الوجود کا یہ میلان زیادہ تر ترقی کے ان منازل میں تقویت حاصل کرتا ہے جب کہ ان کے دیوتا محدود و متعرف نہیں ہوتے اور ان کی صفات معین نہیں ہوتیں۔ 'وید' کے دیوتا بھی اسی نوعیت کے تھے۔ کیونکہ ایک کی صفات آسانی سے دوسرے کے حق میں منتقل ہو جاتی تھیں۔ اسی طرح محض عمل انتقال سے اپنشد اور ویدانت کی وحدت وجود (ادویت) قائم ہوئی جس میں تمام طبعی مظاہر ایک وجود حقیقی میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ برہما اور آتما، روح اور وجود مطلق باہم ایک ہیں الحاصل مذہبی وحدت وجود زیادہ تر تائلی ترقی کا نتیجہ ہے جو عقل کے تقاضے سے پیدا ہوتی ہے

خلاصہ | فلسفۂ مذہب کی رو سے یہ بتانا مقصود تھا کہ تصور باری میں ارتقا کا عمل سلسلۂ زماں

میں نہیں ہوا بلکہ خدا کے تصور کی اطمینان بخش توضیح میں تبدریج توسیع ہوتی آئی ہے۔ اور اس کی ترقی پذیر، لطیف تر اور معنی خیز صورتیں تدریجاً نمایاں ہوتی گئی ہیں۔ نیز یہ کہ وحدانیت عالم مذاہب کی سب سے ترقی یافتہ اور سب سے آخری صورت ہے، جو مذہب کا معراج کمال ہے۔

———— • ————

مومن کا طنزیہ کلام

عام طور پر "طنزیات" کے ذیل میں تمام ظریفانہ تحریریں شامل کی جاتی ہیں اور کل ظریف انشاپردازوں کا شمار "طنزیین" کی صف میں کیا جاتا ہے۔ خود میرے خیال میں ظرافت اور طنز میں کوئی امتیاز نہیں قائم کرتا مگر میری ناقص رائے میں ان دونوں میں نہایت نازک فرق ہے۔ طنز زیادہ سے زیادہ ظرافت کی ایک شاخ قرار دی جاسکتی ہے۔ اس کا مقصد کبھی محض تفریح وانبساط ہوتا ہے اور کبھی اس سے بلند تر مقصد یعنی ظرافت کے پردے میں اصلاح و تربیت۔ عام ہنسنے ہنسانے والی تحریروں میں جس مقام سے کسی پر چوٹ شروع ہو، کوئی چبھتا ہوا، مزیدار یا اچھوتا فقرہ کسا جائے، خواہ پھولوں کی چھڑی سے ذرا "خبر" لی جائے یا دل کھول کر "مرمت" ہو وہیں سے طنز کا آغاز ہوتا ہے۔ بعض لوگ اس کی ایک اور تعریف کرتے ہیں یعنی طنز ایک طرز انشا، ایک خاص انداز بیان کا نام ہے جس میں "دور کی کوڑی" لائی جائے۔ لکھنے والے کو جو کہنا ہے اسے اس طرح کہتا ہے گویا مقصود اس کا بالعکس ہے لیکن طنز کو صرف ان نظروں میں دیکھنا اس کی وسعت کو محدود کرنا ہے۔ طنز کے لئے ندرت کا ہونا بھی لازمی ہے ندرت بیان اور ندرت معنی دونوں ورنہ بہ صورت دیگر وہ ایک سطحی، پست، اور رکیک چیز ہو کر رہ جائے گی اور اعلیٰ درجہ کے لٹریچر میں جگہ پانے کی مستحق نہ رہے گی۔

یورپ کی ترقی یافتہ زبانوں بالخصوص انگریزی زبان میں طنز ایک نہایت وسیع اور خاص صنف ادب شمار کی جاتی ہے جس کی خود اپنی اپنی علیحدہ صنفیں ہیں اور ان کے ہاں طنزیہ لٹریچر بہ افراط موجود ہے۔ انگریزی کے سب سے پہلے شاعر چاسر سے لیکر بائرن اور آخر آخر میں ہمارے اپنے زمانے میں برنارڈ شا اور چسٹرٹن تک کم و بیش ہر زمانے میں چوٹی کے طنز گو شعرا و نثر نگار موجود رہے ہیں۔ ان کے ہاں طنز سے بڑے بڑے اصلاحی کام لئے گئے ہیں۔ یہ موضوع بجائے خود ایک دوسرے مضمون کا محتاج ہے جس کے بیان کی یہاں گنجائش نہیں۔ اردو زبان میں بھی طنز موجود ہے لیکن

یہ صرف چند خاص امور تک محدود ہے اور اس سے بہت ہی شاذ اصلاح و ہدایت کا کام لیا ہے۔ اور ایسے شعرا یا انشا پرداز تو بہت کم ہیں جنھوں نے اس صنف تحریر کی ترقی و تہذیب ہی کو اپنی ادبی زندگی کا مقصد قرار دے لیا ہو۔

اس سے مطلب نہیں کہ ہمارے ہاں ظریف انشا پردازوں یا شاعروں کی کمی ہے۔ نہیں ابتدائی زمانے ہی سے ہمیں ہجوگو شعرا اور مزاحیہ نگاروں سے سابقہ رہا ہے لیکن سچی اور پاکیزہ طنز ان کے ہاں برائے نام ہے یہ مضمون ایک شاعر کی نسبت ہے اس لئے بالفعل صرف شاعری ہی میں طنز کو تلاش کرنا ہے۔ اردو کی شاعری میں ہمیں کافی ظریف شاعروں کے نام ملتے ہیں جعفر کی "زٹلیات" سے قطع نظر کی جائے تو میر ضاحک، بقا، فدوی، مکین، کے ناموں کے علاوہ سودا، انشا، مصحفی، غالب، مومن، اور آخر آخر میں حضرت داغ جن کا یہ شعر ــ

دیکھنا پیر مغاں حضرت زاہد تو نہیں کوئی بیٹھا نظر آتا ہے پس خم مجھ کو!

ہر خوش مذاق اور زندہ دل سخن سنج کے زبان پر ہے اور ان کی چلبلی، شوخ اور چٹ پٹی طنز کی دلکش مثال ہے، ریاض خیر آبادی اور قبلہ میر اکبر حسین اکبر مرحوم کے اسمائے گرامی پیش پیش ہیں موخرالذکر بزرگ اس فہرست میں سب سے آخر لیکن خالص ظریفانہ حیثیت سے سب پر فائق ہیں موجودہ دور کے ایک اور ظریف شاعر حضرت ظریف کا نام بھی امتیازی حیثیت رکھتا ہے لیکن ان سب شعرا میں سے حضرت اکبر کو چھوڑ کر جنھوں نے طنزیات کا وہ وسیع مفہوم سمجھا جو سمجھنا چاہیے اور جو اسے دوسری زبانوں میں حاصل ہے اور طنز کو زندگی، مذہب، سیاست، معاشرت، تہذیب، تمدن غرض حیات و ممات کے مختلف اور لاتعداد پہلوؤں پر ناقابل تقلید اور قابل رشک طریقے سے حاوی کر دیا اور حضرت ظریف سے قطع نظر کرکے جن کی شاعری کی خصوصیت علیٰحدہ ہے دیگر شعرا نے کبھی کبھی ہنسنے ہنسانے کے لئے اور صرف ایک خاص حد تک طنز سے کام لیا۔ ان سب شعرا کا میدان کارزار کم و بیش غزل ہے جس میں تلاش سے طنزیہ اشعار بھی مل جاتے ہیں زیادہ کیا تمامتر شیخ، عصر، واعظ، محتسب، یا ناصح پر چوٹیں ہوتی ہیں جنھیں سمجھنے میں تاکہ یہ حضرات ان بجائے

غریبوں کو رسوا اور ذلیل کرنے کے ساتھ خود بھی تہذیب اور حسن ذوق کی حدود سے تجاوز کر جاتے ہیں اور سنجیدگی کو بالائے طاق رکھ کر ناک پر انگلی رکھ کر مٹکنے لگتے ہیں۔ ہمیں ان کے اس طرز سے کوئی شکایت نہ ہونا چاہیے اور انھیں کے زمانے کے مذاق سے انھیں جانچنا چاہیے۔ یہ ابتدائی اور غیر تربیت یافتہ دور قوموں کی تاریخ کی طرح ادب اور شاعری کی تاریخ میں پایا جانا بھی بالکل مطابق فطرت ہے .... ان مختصر حدود کے اندر بھی سودا سے قطع نظر جنھوں نے اس چیز کو امتیاز بخشا اور جن کی طنز میں زہر ہلاہل بھرا ہے مومن کو ہمارے نزدیک "طنزیات" میں ایک خاص حیثیت حاصل ہے سودا کو بعض اور وجوہ سے بھی علیحدہ کرنا پڑتا ہے۔ اول تو وہ طنز کو غزل میں بہت کم جگہ دیتے ہیں یا وہ اسے ایک مستقل حیثیت دے کر نظم کی صورت میں پیش کرتے ہیں دوسرے ان کے موضوعوں کا دائرہ اس محدود دائرہ سے زیادہ وسیع ہے اور وہ اس فرض کو محض رشا اور تبرکاً جیسا کہ اور شعرا کا دستور ہے نہیں ادا کرتے بلکہ یہ چیز ان کا حصہ ہو گئی ہے اس حیثیت سے وہ بہت بلند درجہ پر ہیں اور مومن ان کی گرد کو نہیں پہنچتے۔ ساتھ ہی سودا اعتدال سے بھی گذر جاتے ہیں اور ایسے پنجے جھاڑ کے لوگوں کے پیچھے پڑتے ہیں کہ ان سے دامن چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے ان کی طنز کے مار شاہی شیر بچے کے ملے سے کم نہیں، ان کی طنز کی زد سے لوگ اس طرح خائف رہتے ہیں جیسے شہباز کے پنجے سے کمزور پرند۔ برخلاف مومن کے کہ طنز ان کا پیشہ نہیں ہے اور ان کے ہاں ایسی بے اعتدالی نہیں پائی جاتی۔ وہ بہت احتیاط سے اور بچ بچ کر اپنے حریفوں پر وار کرتے ہیں ان وجوہ کی بنا پر سودا اور مومن کا کوئی مقابلہ نہیں۔ حضرت ریاض خیر آبادی کی "طنزیات" بھی خاصا لطف رکھتی ہیں۔ اور حقیقت میں موجودہ شعرا کیا شعرائے سابق میں بھی ان کے مخصوص اوصاف و انداز میں ان کا کوئی مقابل نہیں لیکن ان کے ہاں بھی شوخی و بے باکی و ہوسناکی کبھی کبھی ہمیں آنکھ اور کان بند کر لینے پر مجبور کرتی ہے۔

مومن کے شاعرانہ کمال کی داد میں عام طور پر بخل سے کام لیا گیا ہے۔ اصل میں بہت کم لوگوں نے اس کے کلام کا مطالعہ کیا ہے اور جنھوں نے پڑھا بھی انھوں نے صرف اس کے تغزل

سے کام رکھا۔ حالانکہ مومن کے کلام کی خصوصیات مختلف ہیں اور کئی پہلوؤں سے اس کی شاعری پر تنقید ہو سکتی ہے یہ بے توجہی غالباً ضرورت سے زیادہ غالب پرستی کا نتیجہ ہے جس کی روزافزوں اور لازوال شہرت نے، گو وہ کتنی ہی حق بجانب اور بجا کیوں نہ ہو اس دور کے دوسرے شعرا کے کارناموں کی عظمت کو گھٹا دیا ہے۔ مومن کی عدم شہرت کا راز اس کی کم مائگی نہیں بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسے حالی یا ڈاکٹر بجنوری جیسا نقاد نہیں نصیب ہوا۔ غالب کے ایک بہت بڑے شاعر ہونے میں شک نہیں آج مجھ جیسے ادنیٰ طالب علم کا اس کے کمال کا اعتراف نہ کرنا میری اپنی کم نظری اور بدتوفیقی کی دلیل ہوگا۔ سب سے پہلے مجھے اس امر کا اظہار کرنا ہے کہ مجھ سے زیادہ خوش عقیدگی اس کے ساتھ کم لوگوں کو ہوگی۔ اس کے ادراک، الہام، بلندنظری اور اعلیٰ تخیل میں کسے شک ہو سکتا ہے لیکن اس کی عظمت کا اعتراف و احساس دوسرے شعرا کی طرف سے بے اعتنائی برتنے کی وجہ نہیں ہو سکتی۔ حقیقتاً اردو شاعری کا یہ دور بھی عجیب و غریب دور گذرا ہے جس میں غالب، مومن، ذوق، اور شیفتہ جیسے سخنورانِ باکمال نے دادِ سخن دی۔ ان میں سے ہر شاعر اپنے اپنے کمال میں لاثانی ہے اور ہر ایک سے واقف اور لطف اندوز ہونے کے لئے برسوں کی ریاضت درکار ہے مومن بھی ان زندۂ جاوید ہستیوں میں سے ایک ہے جس کی شاعری کے چند در چند خصوصیات میں سے ایک خصوصیت اس کی "طنزیات" بھی ہیں۔

حسب معمول مومن کی طنزیات بھی غزل میں ملتی ہیں اور ان کے بھی وہی محدود موضوع ہیں جن پر اور شعرائے طبع آزمائی کی ہے مثلاً ناصح پر چوٹ، واعظ پر بوچھار، رقیب کی ملامت و بدخواہی، محتسب سے چھیڑ چھاڑ لیکن انھوں نے یہ کام ایسے اہتمام سے کیا ہے اور ان کی طنز میں ایسا مزہ ہے اور ایسے ایسے نادر طریقوں اور امتیازی انداز بیان سے انھوں نے ان سب حضرات کی خبر لی ہے کہ معلوم ہوتا ہے انھیں اس کا خاص شوق تھا اور اس میں انھیں بڑا مزہ آتا تھا بالخصوص ناصح اور واعظ سے تو ان سے ایک منٹ کو نہیں بنتی وہ ان کی وجود کو برداشت نہیں کر سکتے۔ ایسی بھی کیا بدظنی! وہ بجائے تو ان کی ہمدردی اور دل سوزی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں [illegible]

برعکس ان کے نام سے بیزار ہو جائیں. مگر ہمیں اس سے کیا. مومن کے خیرخواہوں یا بدخواہوں کو خود
مومن سے زیادہ کون جان سکتا ہے؟ مانا کہ ان کی رفاقت بے لوث ہے مگر یہ عشق وہ بُری بلا ہے
کہ عاشق کو خود معشوق سے بے نیاز کر دیتا ہے .

اک درد ہو بس آٹھ پہر دل میں کہ جسکو   تسکین دعا سے ہو نہ تخفیف دوا سے!

ہمیں تو ان کے ناصح مشفق ہمیشہ منھ کی کھاتے نظر آئے. مومن کے مزاج میں بڑی مستقل مزاجی ہے. وہ انکو
منھ نہ لگانے کے بجائے ان کی معصومیت سے لطف اٹھاتے ہیں گھوم گھام کر وہ حضرت ناصح یا واعظ
کی خدمت میں پہنچ جاتے ہیں انھیں ایک طنزیہ تمسخر آمیز سلام کرتے ہیں اور ان کی صحبت سے لطف اندوز
اور تازہ دم ہو کے آگے بڑھتے ہیں. دس پانچ منٹ حسن و عشق یا ادھر ادھر کی باتیں کیں اور حضرت
ناصح سے ایک خاص پر لطف طرز سے مصافحہ کرنے کے لئے ہاتھ بڑھایا. ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ حسن
وعشق کا ذکر بھی خیر سے انھیں حضرات کو جلانے اور تڑپانے کے لئے کرتے ہیں. ناصح کا نام آیا اور ان
کے چہرے پر شگفتگی دوڑ گئی .... ثبوت لیجئے! کم و بیش ہر غزل میں دو چار رجمہ عشقیہ اشعار کے بعد
وہ ان حریفوں پر وار کرتے نظر آتے ہیں. ان کی عام خصوصیت یعنی انداز بیان کا انوکھا پن جو
ان کی شاعری کی جان ہے یہاں بھی ہر قدم پر موجود ہے اور اس وصف نے ان کی طنزیات
کو اور زیادہ دلکش، با معنی اور پر لطف بنا دیا ہے. تعجب ہے کہ مومن کے کلام کی اس خصوصیت پر
کسی کی نظر نہ گئی. حالانکہ اس کے ہاں یہ طنزیات دبی ہوئی، چھپی ہوئی رہنے کے بجائے اجاگر اور
ابھری ہوئی معلوم ہوتی ہیں اپنے بیان اور معنی دونوں کی ندرت کی وجہ سے وہ پہلی نگاہ میں
نظر آجاتی ہیں.

اب میں ان طنزیہ اشعار کا ایک مختصر انتخاب علیحدہ علیحدہ عنوانات کے تحت میں پیش
کرتا ہوں. مومن کے کلام میں بالعموم حسب ذیل موضوعات پر طنزیات ملتی ہیں.

۱. مذہب و تقدس، اس موضوع پر ان کی طنزیات زیادہ تر مقطعوں میں ملتی ہیں جہاں
وہ اپنے تخلص کی رعایت سے ہمیشہ فائدہ اٹھاتے ہیں اور کوئی نہ کوئی بات ضرور پیدا کرتے ہیں

اس کے پردے میں کہیں واعظوں سے نوک جھوک اور کہیں بتوں سے چھیڑ چھاڑ ہوتی رہتی ہے۔

دشمن مومن ہی رہے بت سدا   مجھ سے مرے نام نے یہ کیا کیا

مومن کا مقطع ان کی غزل کی جان ہوتا ہے یہ بات بہت کم شعرا کو نصیب ہوئی ہے۔ بہت سے شعرا تو محض غزل مکمل کرنے کے لئے مقطع کہتے ہیں۔ مومن کا مقطع اس قدر مشہور ہے کہ یہاں اس کی مثال پیش کرنا بے کار معلوم ہوتا ہے تاہم یہ چند مقطعے ملاحظہ ہوں۔

ذکر شراب و حور کلام خدا میں دیکھ   مومن میں کیا کہوں مجھے کیا یاد آگیا

کعبے سے جانب بت خانہ پھر آیا مومن   کیا کرے جی نہ کسی طرح سے زنہار لگا

بت خانے سے نہ کعبے کو تکلیف دے مجھے   مومن بس اب معاف کہ یاں جی بہل گیا

اللہ ری گمرہی بت و بت خانہ چھوڑ کر   مومن چلا ہے کعبہ کو اک پارسا کے ساتھ

ہو گئے نام بتاں سنتے ہی مومن بیقرار   ہم نہ کہتے تھے کہ حضرت پارسا کہنے کو ہیں

مومن تم اور ذکر بتاں اے پیر و مرشد خیر ہو   یہ ذکر اور منہ آپ کا صاحب خدا کا نام لو

عمر ساری تو کٹی عشق بتاں میں مومن   آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہونگے

خدا کی بے نیازی ہائے مومن   ہم ایماں لائے تھے ناز بتاں سے

۲. مومن کی طنزیات کا خاص میدان واعظ اور ناصح مشفق پر چوٹ کرنا اور ان کی فضیحت کرنا ہے۔ اسی میدان میں ان کی ظرافت اور زندہ دلی کے جوہر کھلتے ہیں۔ دیکھئے کس کس رنگ میں اور کن کن پہلوؤں سے ان حضرات کی خبر لی گئی ہے۔ اگر اس کے عنوانات قائم کئے جائیں تو تفصیل و تشریح نہ صرف طوالت کا ملکہ لطف کی کمی کا باعث بھی ہو جائے گی۔ قابل غور بات انداز بیان اور مضمون ہونوں کا انوکھا پن ہے جس خصوصیت کی طرف مضمون کی ابتدائی سطور میں توجہ دلائی جا چکی ہے:-

ہاں تو کیوں کر نہ کرے ترکِ بتاں اے واعظ — ایسی حوریں تری قسمت میں کہاں اے واعظ

منتظر ہے کسی بت کا جو نہیں تو کیوں ہے! — مجلس وعظ میں ہر سو نگراں اے واعظ

سچ ہے کافر تری تقریر سے کیوں کر نہ جلیں — شعلۂ آتشِ دوزخ ہے زباں اے واعظ

ڈر مری آہ سے ظالم، نہ جلا جی کر نہیں — یہ جہنم سے تو کم شعلہ فشاں اے واعظ

اہل جنت سے کرو دل بری حور کا ذکر — ایسی باتیں کوئی سنتا نہیں یاں اے واعظ

کیسی آرام پس مرگ مگر کافر تو — اہل اسلام کا ہے دشمن جاں اے واعظ

شرم کی بات نہیں ہے یہ، اثر ہو کیوں کر
نہ میں مومن ہوں نہ تو پیر مغاں اے واعظ

نچوڑیں گے ہم اپنا دامن تر — جہنم میں ہے اے واعظ اگر آگ

توبہ گنہ عشق سے فرمائے ہے واعظ — یہ بھی کہیں دل دے کے گنہگار ہوا ہے

"فرمائے ہے" کے ٹکڑے نے کیسا مزہ دیا۔ ایک تو شعر کے یوں ہی کیا کم لطیف معنی تھے اس پر یہ طرز بیان! اسی طرح کا ایک اور شعر ہے

اس وسعتِ کلام سے جی تنگ آگیا — ناصح تو میری جان نے دل گیا گیا

"وسعت کلام" کی وسعت ملاحظہ ہو اور پھر اس کی نشتر زنی ممکن نہیں کہ وار خالی جائے اور ایسی چوٹ کھا کر ناصح جاں بر ہو سکے رعایت کے متلاشی "وسعت" کے ساتھ "جی تنگ آگیا" میں خوبی

کا ایک اور پہلو نکال سکتے ہیں۔ دوسرے مصرعہ میں "جان نہ لے" کا ٹکڑا کس قدر بلیغ ہے۔ ایک مطلب تو یہ ہوا کہ تو مجھے پریشان نہ کر میرا سر نہ کھا۔ دوسرا اور لطیف تر پہلو یہ نکلا کہ دل تو محبوب کی نذر ہوا اب جان تو لیتا نظر آتا ہے پورا شعر کس قدر دلکش، بلیغ اور پر لطف ہے۔

میں تو دیوانہ تھا اسکی عقل کو کیا ہو گیا | قیس کہتا ہے مجھے ناصح کو سودا ہو گیا

ناصح کی دیوانگی کس طرح ثابت کی ہے۔ کیا خوب!

پوچھنا حال یار ہے منظور | میں نے ناصح کا مدعا جانا

ناصح یہ گلہ کیا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا | تو کب مری سنتا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
ناصح کو جو چاہوں تو ابھی ٹھیک بنا دوں | پر خوف خدا کا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

ٹانکنے چاک گریباں کو تو ہر بار لگا | ہاتھ کٹواؤں جو ناصح رہے اب تار لگا

اس میں بھی خاص بات ہے مومن کو چاک کے ٹانکنے پر کوئی اعتراض نہ تھا مگر وہ ناصح کی اس سینہ زوری پر کہ وہ ہر بار ٹانکتا ہے برہم ہیں اب تو محض ضد کی وجہ سے وہ ایک تار بھی ثابت نہ چھوڑیں گے۔

کچھ اور مثالیں ملاحظہ ہوں :۔

کوئی سنتا ہی نہیں بکتا ہی کیا دیوانہ وار | میرے دل کے ساتھ ناصح کا بھی کیا جاتا ہے جی

کچھ نہیں نظر آتا آنکھ لگتے ہی ناصح | گر نہیں یقین حضرت آپ بھی لگا دیکھیں

لگ جائے شاید آنکھ کوئی دم شب فراق | ناصح ہی کو لے آؤ گر افسانہ خواں نہیں

اثر ہوتا ہی کب ہم سے وفاداروں کا اے ناصح — فغاں سے پیشتر تم خجلت تقریر تو کھینچو

لے ناصحو آ ہی گیا وہ فتنۂ ایام لو — ہمکو تو کہتے تھے بھلا اب تم تو دل کو تھام

عشق میں ناصح بھی ہے کیا مدعی — جرم ثابت ہو گیا انکار سے

پند گو اب تو ہی فرما کس کو سودا ہے یہ کون — اور کی سنتا نہیں اپنی ہی بکتا جائے ہے

بات ناصح سے کرتے ڈرتا ہوں — کہ فغاں بے اثر نہ ہو جائے

ہم حال کہے جائیں گے سنئے کہ نہ سنئے — اتنا ہی تو یاں صحبت ناصح کا اثر ہے

منھ کو نہ سیا ناصح کی بخیہ گری اتنی — لوں میں بھی ابھی لیتے ہیں پردہ دری اتنی
یہ کون کہے اس سے کی ترک وفا میں نے — کر تو ہی ذرا ناصح پیغام بری اتنی

اچھے موقع پر ناصح کی یاد آئی اس کو پیغامبر بنا کر بھیج رہے ہیں۔

نہ کرنی تھی نصیحت اسکے بیٹھے پر قیامت کی — عجب فتنہ ہے ناصح بھی کہ یہ فتنے اٹھاتا ہے

ناصح "فتنہ" ہو یا نہ ہو شاعر کے فتین ہونے میں کوئی کلام نہیں جس نے ایسا موقع پیش کیا۔ اور لیجئے.
اب کے تو ناصح صاحب بری طرح پھنسے

کیوں کہا تھا یہ کہ بکتے بکتے سر پھرنے لگا — اب تو باندھونگا میں ناصح اسکو بھی زنجیر سے

۲۔ تیسرے درجہ پر ان کی وہ طنزیات ہیں جو انھوں نے محتسب یا رقیبوں پر کہی ہیں اور جو تعداد میں

نسبتاً بہت کم ہیں۔ بایں ہمہ لطف سے خالی نہیں۔ مثلاً:۔

خاک میں حیف یہ شراب ملے　　　محتسب بادہ خوار ہوتا تھا

محتسب وہم ہے تو پہلے پلا دیکھ مجھے　　　نہ لنڈھا، پی لے، مے ناب ہے زہراب نہیں

رندوں پہ یہ بیداد خدا سے نہیں ڈرتا　　　اے محتسب ایسا تجھے کیا شاہ کا ڈر ہے

پس شکستن خم صبر محتسب معقول　　　گناہ گار نے سمجھا گناہ گار مجھے

غیر نکلا ترے گھر سے گئی اس وہم میں جان　　　غل ہوا چور کا اس کوچہ میں گر آخر شب

ہے یہ بندہ ہی بے وفا صاحب!　　　غیر اور تم بھلے، بھلا صاحب!

"بھلا صاحب" نے کیا بات کی شعر کو بھی طنز کا ایک تیز نیچہ بنا دیا۔

۴۔ شاذ و نادر شعرائے ہم عصر پر بھی طعن و تشنیع ملتی ہے لیکن وہ زیادہ قابل اعتنا نہیں یہ ہے ایک مختصر سا انتخاب مومن کے ان اشعار کا جو اسے طنزیہ کی صف اول میں لا بٹھلاتے ہیں مزید لطف اندوزی کے لئے شائقین مومن اس کے دیوان سے رجوع فرمائیں۔ اسی طرح اس کے کلام میں مختلف قسم کی خوبیاں ہیں جن میں سے بعض پر بشرط فرصت، پھر کبھی روشنی ڈالنے کی کوشش کی جائے گی۔

عربوں کے آثار

دنیائے علم و عمران میں !

دنیا میں عرب نامی ایک قوم نمودار ہوئی۔ علم و اخلاق سے تہی مایہ، تہذیب و تمدن سے عاری۔ اور فنون و صنائع سے ناواقف۔

پاس ہی روم و ایران کے قصر فلک بوس اپنی عظمت و ہیبت کا اعلان کر رہے تھے، ان کی تہذیب و تمدن کا خورشید جہاں تاب ایک عالم پر ضیا بار و کرم گستر تھا۔ لیکن عرب کا کاشانہ، محروم تھا، وہ جاہل تھے، بدخو تھے۔

لیکن دیکھیے! وہ قوم ایک عالم پر چھا گئی، کشورکشائی اور ملک گیری میں کوئی اس کا ہمسر نہ رہا۔ علم و حکمت کی طرف جب متوجہ ہوئی تو یونان کے اسفار و اوراق کو کھنگال کر نئے علم نئے فلسفے، اور نئے نظریات سے علم و حکمت کی دنیا میں تہلکہ ڈال دیا، تعمیر و صنائع کی طرف توجہ مبذول ہوئی، تو الحمرا اور قصر زہرا کی بنیادیں پڑ گئیں، غرض عرصۂ حیات کے جس گوشہ میں داخل ہوئی، مظفر و منصور، دنیا کے جس چپہ پر قدم رکھا۔ فاتح و کشورکشا کی حیثیت سے، علم و فن کی جس محفل میں داخلہ ہوا تو صدر نشین مسند علم و فن کے امتیاز خصوصی سے۔

گرچہ تھے صفحۂ ہستی پہ ہم اک حرف غلط　　　لیک اٹھے بھی تو اک نقش بٹھا کے اٹھے

دنیا زود فراموش ہے، عربوں کے ملکات و فضائل لوگوں کے ذہن و دماغ سے محو ہوتے جا رہے ہیں، لہٰذا "یاد دہانی" کے طور پر اگر کبھی کبھی وہ داستان پارینہ زیب قرطاس و قلم ہوتی ہے تو مضائقہ کیا ہے؟

صفحات ذیل مصر کے مشہور علمی رسالہ "المقتطف" میں شائع ہوئے ہیں، ترجمہ نذر ناظرین ہے۔

یہ پیش نظر رہے کہ رسالہ کا ایڈیٹر مسلمان نہیں عیسائی ہے

رئیس احمد جعفری ندوی

ایک صدی کے اندر ہی اندر عربوں نے متعدد ممالک پر قبضہ کرلیا، یہاں تک کہ چین جیسے دور دراز مقام پر بھی ان کی فوجیں نظر آنے لگیں، نتیجہ یہ ہوا کہ دیکھتے ہی دیکھتے ان کے نام سے دنیا کی قومیں لرزہ براندام ہوگئیں۔

ملک گیری سے جب ان کی طبیعت سیر ہوگئی تو انھوں نے علم وفن کی طرف توجہ کی اور تھوڑے ہی عرصہ میں اس میدان میں بھی وہ سب سے آگے نظر آنے لگے، ایک طرف سلطنت عباسیہ کا آفتاب نصفت واقبال مائل بہ غروب تھا، تو دوسری طرف علم وحکمت کا مہر درخشاں طلوع ہو رہا تھا اور آگے چل کر حکومت مختلف ٹکڑوں میں تقسیم ہوگئی۔ بہت سے خود مختار عناصر پیدا ہوگئے مگر علمی ترقیوں کو جب بھی فروغ حاصل رہا، پہلے اگر ایک مرکز تھا، تو اب علم وفن کی سرپرستی کے متعدد مراکز ہوگئے۔

عربوں نے اسی پر اکتفا نہیں کی کہ مختصر مدت میں یونان، فارس، اور ہندوستان کے مختلف علوم وفنون کو عربی میں ترجمہ کرلیا ہو، بلکہ انھوں نے ان میں وسعت پیدا کی، جدید اضافے کئے، اور نئے نئے نظریات قائم کئے، جو آج تک حضارت فرنگ کے لئے اساس کا کام دے رہے ہیں۔

فن تاریخ میں عربوں نے ایسا امتیاز حاصل کیا تھا کہ علماء مغرب کے لئے وہ آج تک مایۂ حیرت واستعجاب ہے، دوسری اقوام وامم کے مقابلہ میں عربوں کے مولفات کو جو ترجیح حاصل ہے وہ ہر شخص کو معلوم ہے، مثلاً، کشف الظنون کو لیجئے، جس میں کتب وفنون کے اسماء سے متعلق مفصل معلومات پیش کئے گئے ہیں، ان کی تعداد جن کا کتاب میں ذکر ہے ۱۳۰۰ تک پہنچتی ہے، اور پھر شروح واختصارات وغیرہ متزاد۔ اور وہ تاریخی کتابیں جو سال وسنین کی حسن ترتیب کے اعتبار سے قابل ذکر ہیں، مثلاً طبری، ابن اثیر، ابو الفداء یا جو اقوام وممالک کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئیں مثلاً مسعودی مقریزی، ابن خلدون، وغیرہ، اس قبیل کی کتابیں تو حد شمار سے خارج ہیں[1]۔ ایسے ایسے مولف ومصنف بھی

[1] زیدان۔ تاریخ التمدن الاسلامی ج ۳۔ ص ۹۳

جو اپنی عبارت کی روانی و شگفتگی اور حسنِ استدلال کے اعتبار سے ممتاز ہیں۔ اکثر عرب مورخوں کو علمائے مغرب نے "حکمت گرو" تسلیم کیا ہے۔ یورپ کے علمی حلقے اس وقت تک ان کتابوں سے مستفید ہو رہے ہیں۔ ابن خلدون ہی کو لیجئے، اس نے اپنی مشہور تاریخ کی تالیف اور ترتیب میں ممالک و مساکن کا خاص طور سے خیال رکھا ہے، مغرب اور اندلس کے متعلق اس نے ایسے ایسے معلومات پیش کئے، جہاں تک کوئی بھی نہ پہنچ سکا، تاریخ ابن خلدون کا مقدمہ خاص اہمیت رکھتا ہے، یورپ کے ایک مشہور عالم کا قول ہے "ابن خلدون کا مقدمہ فلسفۂ تاریخ سے لبریز ہے، کوئی بھی وہاں تک نہ پہنچ سکا، جہاں تک ابن خلدون کی طبع بلند پہنچی ہے، بلکہ میں تو کہتا ہوں روم و یونان کے علما بھی اس کی گرد کو نہیں پہنچے"۔

فن جغرافیہ میں بھی عربوں کو تقدم کا شرف حاصل ہے، پہلے تو انھوں نے یونان وغیرہ کی کتابوں کا ترجمہ کیا، ترجمے کے بعد انھوں نے اس فن کو اور بھی وسیع کیا، اپنے مشاہدات و تجربات سے اضافہ کیا، اس لئے کہ یہ قوم خود ایک جہانگیر قوم تھی، بطلیموس کی بہت سی غلطیوں کی تصحیح عربوں ہی نے کی[1] اور یہ عرب ہی تھے جو صحرائے افریقہ تک پہنچ گئے، اور بلاد سوڈان میں بھی اپنے جھنڈے گاڑ آئے۔ گذشتہ اقوام سے عرب اس باب میں بھی ممتاز ہیں کہ انھوں نے فن جغرافیہ میں بہت سی کتابیں اپنے مشاہدات و تجربات سیاحت سے متعلق تالیف کیں۔ زمین کے جو نقشے بنائے ان میں بھی ایک اسلوب بدیع کے مالک ہوئے، ان کے لئے یہ فخر کافی ہے کہ کرہ پر نقشہ کھینچنے کا اصول سب سے پہلے انھیں نے معلوم کیا۔ خط نصف النہار کا طول درجہ معلوم کرنے میں بھی عرب ہی سب سے اوّل رہے۔ مشہور عرب جغرافیہ دانوں میں مسعودی، بیرونی، ادریسی، یاقوت، مقریزی، قزوینی، اور ابن بطوطہ سے ہر شخص واقف ہے۔

ان سب میں ادریسی کی شخصیت وہ تھی کہ بارہویں صدی عیسوی میں تو اس کا کوئی ہمپایہ پیدا نہیں ہوا ادریسی ہی نے روجر بادشاہ صقلیہ کی فرمائش سے ایک کتاب "نزہۃ المشتاق فی اختراق الآفاق" تالیف کی، جس میں بلاد و ممالک کا نہایت تفصیلی تذکرہ تھا۔ اس کے علاوہ اس نے روجر کیلئے

---

[1] زیدان۔ تاریخ التمدن الاسلامی ج ۳ ص ۱۸۱

ایک نقشہ بھی تیار کیا تھا[1] جس میں اس زمانے کے تمام قابل ذکر اقالیم کو دکھایا گیا تھا، ادریسی کی وہ شخصیت ہے جو جغرافیۂ اسلام اور جغرافیۂ فرنگ کے درمیان حلقۂ اتصال کی حیثیت رکھتی ہے، کتاب "تراث الاسلام" میں ہے کہ

"بادشاہ روجر کا ایک مسلمان عالم سے جغرافیہ پر کتاب لکھانا، اور نقشہ بنوانا اس بات کا ثبوت ہے کہ مسلمان اس زمانے میں علمی اعتبار سے اپنے تمام اقران و اماثل میں ممتاز تھے"

بعض لوگوں کا خیال ہے عرب بس نقل و ترجمے کے ماہر تھے، علوم و فنون میں انھیں براہ راست کوئی دست رس نہیں حاصل تھی، یہ تحقیق انیق انھی "یورپ زدہ" حضرات سے ظہور میں آتی ہے جن کا سارا علم و فن رہین منت ہوتا ہے استادان فرنگ کا، یا پھر وہ نوجوان اس قسم کے اقوال کا اظہار کرتے ہیں جو فرنگیت سے مرعوب و متاثر ہیں، ورنہ اس قول کا مہمل ہونا بالکل ظاہر و باہر ہے، وہ فرنگی علما، جن کو خدا نے عدل و انصاف کا مادہ دیا ہے، اس کے علی الاعلان معترف ہیں کہ عربوں نے نقل و ترجمے میں اپنی مہارت کا جو ثبوت دیا ہے۔ اس سے کہیں زیادہ ہے خود انھیں علوم و فنون میں دستگاہ تھی،

یونانی، سریانی، کلدانی، وغیرہ میں طب پر جو مسالہ تھا پہلے تو عربوں نے اسے حاصل کیا، پھر اس فن میں انھوں نے ترمیم و تغیر کیا، اور حک و اصلاح سے کام لیا بلکہ اضافہ وایزاد کے بھی نہایت بے بہا نمونے چھوڑے، کتاب تراث الاسلام میں ہے۔

"عربوں نے طب یونانی میں بہت کافی اضافہ کیا۔ اور ان کا یہ اضافہ تجربہ پر مبنی تھا، جو اس کا ثبوت ہے کہ وہ طب سے رسمی اور نظری طور سے ہی نہیں واقف تھے، بلکہ عملی حیثیت سے بھی کافی ممتاز تھے"[2]

اس بیان سے ان لوگوں کی تسکین ہو جانی چاہیئے جن کے خیال میں عربوں کا علم طب

---

[1] انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا مادہ Map

[2] کتاب تراث الاسلام Legacy of Islam

نظری تھا۔ اس فن میں ان کے بڑے قیمتی مولفات بھی ہیں، مثلاً ابن سینا کا قانون اور ابوالقاسم خلف بن عباس زہراوی اندلسی کی کتاب التصریف وغیرہ۔ ان کتابوں سے فرنگیوں نے اپنی نہضت جدید میں بڑے بڑے فائدے اٹھائے ہیں، اٹھارویں صدی عیسوی تک عربوں کی بعض کتابیں یورپ کی یونیورسٹیوں کے نصاب تعلیم میں داخل رہیں۔ عربوں میں جن لوگوں نے فن طب میں غیر معمولی مہارت حاصل کی، بہت ہیں جسے تفصیل مطلوب ہو طبقات الحکما، تراجم الحکما، اور کشف الظنون وغیرہ کی طرف رجوع کرے، یہ بات بہرحال ثابت ہے کہ طب اور صیدلتہ میں عربوں نے نمایاں حیثیت حاصل کرلی تھی۔

اس طب کو ایک باقاعدہ نظام کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی۔ ایک افسر اعلیٰ طلبہ کا امتحان لیتا تھا۔ ممتاز طالب علموں کو انعام بھی ملتا تھا، چنانچہ صرف بغداد میں بزمانہ خلیفہ معتضد باللہ ان کی تعداد آٹھ سو تک پہنچ گئی تھی، اور ان میں وہ ستر افراد مستثنیٰ تھے جو خدمت سلطانی کے لئے معمور تھے[۱]

اس فن میں صرف مردوں ہی کو کمال نہیں تھا بلکہ عورتیں بھی مردوں کے دوش بدوش نظر آتی تھیں، مثلاً اخت حفید، اور اس کی دونوں بیٹیاں، ان عورتوں کو خاص طور سے عورتوں کے معالجہ میں کمال حاصل تھا[۲]۔

موجودہ زمانہ میں جو طریقہ رائج ہے، عرب اس سے بے خبر نہ تھے، ان کے ہاں بھی باقاعدہ نبض دیکھی جاتی تھی، پیشاب کا معائنہ کیا جاتا تھا۔ اور وہ لوگ حکما، یونان کے افکار و آرا پر داد تحقیق و تنقید بھی دیتے تھے۔ یونانی کتابوں پر انھوں نے جو حاشئے لکھے، تعلیقیں تیار کیں، مفید اور مناسب اصلاحات کیں، ان کے علاوہ اور متعدد طریقوں سے وہ اس فن کو جلا دیتے رہتے تھے وہ عرب ہی تھے، جنھوں نے طب میں کلوروفارم جیسی چیزوں کو معالجہ کے لئے ضروری قرار دیا تھا

---

[۱] ابن ابی۔ طبقات الاطبا، ج ۱ ص ۲۲۲۔

[۲]۔ ابن ابی اصیبعہ۔ طبقات الاطبا۔

طرح آج کل جراحت کے لئے داغ دینا ایک ضروری چیز سمجھا جاتا ہے، اسی طرح وہ بھی کرتے تھے عربوں ہی نے سب سے پہلے مرض سل میں ناخونوں کے ٹیڑھے ہو جانے کو ایک علامت کی صورت میں معلوم کیا۔ یرقان اور ہیضہ کا علاج دریافت کرنے میں عربوں ہی کو شرف اوّلیت حاصل ہے جنون کے مرض میں افیون کے فوائد کا انکشاف بھی عربوں ہی کا رہین منت ہے، نزیف دبہتے ہوئے خون کو روکنے) کے لئے ٹھنڈے پانی کا تریڑا دینا بھی عربوں کی ایجاد ہے، شانہ اتر جانے کی صورت میں اسے بٹھانے کے لئے وہ بھی وہی طریقہ استعمال کرتے تھے جو آج کل رائج ہے[1]، اسی طرح جذام چیچک، کھسرا وغیرہ کی شکل وصورت اور خصائص وغیرہ کے متعلق عربوں نے تحریری سرمایہ پیدا کیا۔

طب کے درس اور مریضوں کے علاج کے لئے ایک خاص عمارت مخصوص ہوتی تھی جس کو بیمارستان کہتے تھے، اور جس طرح آج کل طبی درسگاہوں سے لوگ سند فراغت حاصل کرکے نکلتے ہیں وہاں سے بھی وہ طبابت کی سند لے کر نکلا کرتے تھے، علاج کے لئے جو عمارت مخصوص ہوتی تھی، اس میں ہر قسم کا ضروری سامان اور آلات موجود رکھنے کا کافی انتظام تھا "نرسنگ" کے لئے ملازم تیمارداروں (خدم) کی ایک جماعت ہر وقت موجود رہتی تھی، جو امراض ان کے زمانہ میں معروف تھے، ان کے علاج کے لئے الگ الگ وارڈ دغرفہ) تھے[2]

علم الجراحت سے متعلق تحقیق وانکشاف کا سہرا زکریا رازی کے سر ہے، اور ان لوگوں میں جنھوں نے عمل بالید، سرجری، اور آلات وغیرہ کے استعمال میں خاص مہارت حاصل کرلی تھی، ابوالقاسم خلف بن عباس الزہراوی کو خاص امتیاز حاصل ہے[3]

صیدلۃ دوواسازی) اور جڑی بوٹی کی تحقیق وتفتیش پر بھی عربوں نے خاص طور سے اپنی توجہ

---

[1] زیدان تاریخ التمدن الاسلامی ج ۳ ص ۱۸۰

[2] ابن ابی اصیبعہ۔ طبقات الاطبار ج ۱ ص ۱۸۳

[3] ڈاکٹر احمد عیسیٰ۔ آلات الطب والجراحت عند العرب ص ۴-۵

مبذول کی، چنانچہ ہندوستان اور دوسرے ممالک سے اس باب میں نہایت وسعت قلب سے انھوں نے فائدہ اٹھایا۔ یورپ تک کو اس کا اعتراف ہے کہ فن دواسازی کے بانی ہونے کا فخر عربوں ہی کو حاصل ہے[1]۔ یورپ میں آج بھی بہت سی جڑی بوٹیاں انھیں ناموں سے معروف ہیں جو عربوں کے رکھے ہوئے ہیں۔

فن کیمیا کے بہت سے مرکبات عربوں ہی کی بدولت عالم وجود میں آئے، عمل تقطیر، عمل ترشیح، عمل تذویب، بخارات بنا کے عرقوں کی کشید، قلمیں بنانا، الکحل تیار کرنا یہ سب وہ چیزیں ہیں جنھیں پہلے پہل عربوں ہی نے جانا پہچانا، بہت سی معدنی تیزاب اور نباتی قلویات (کھاری چیزیں) اور معدنی قلویات عربوں ہی نے معلوم کیں۔ ان تمام چیزوں میں وہ مجتہدانہ نظر رکھتے تھے کہ بہت سے قدیم کیمیاوی تجربات کو انھوں نے باطل کر دکھایا۔

ارباب نظر سے یہ حقیقت بھی پوشیدہ نہیں ہے کہ بارود کو مرکب کی صورت میں عربوں ہی نے پیش کیا، ابن اثیر کا قول ہے کہ "عربوں نے بعض ایسی دوائیں ایجاد کی تھیں کہ اگر وہ لکڑی پر مل دی جاتیں تو آگ ان پر اثر نہیں کرتی تھی" شیشے کی صنعت میں بھی عربوں نے اپنے کمال کا سب سے اعتراف کرایا، ہمیں یہ بھی فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ علم نباتات میں بھی عربوں نے ایک استاد کی حیثیت اختیار کرلی تھی، اس علم میں ابن بیطار، اور رشید الدین ابن الصدری غیرفانی شہرت کے مالک ہیں، موخرالذکر کو اس فن کی تحقیق و تجسس کا یہاں تک سودا تھا کہ

"ان کے ساتھ ہمیشہ ایک مصور رہتا تھا، جب وہ گھاس پات اور جڑی بوٹی کی تحقیق کے لئے نکلتے تھے، مصور کے پاس ہر طرح کے رنگ اور مسالے موجود رہتے تھے، جب رشید الدین ایسے مقامات پر پہنچتے تھے جہاں نباتات کی فراوانی ہوتی تھی، تو وہ اس کا مشاہدہ کرتے تھے، تحقیق کرتے تھے، پھر مصور کو دکھاتے تھے، مصور اس کے رنگ، پتیوں کی تعداد، شاخوں اور جڑوں کا پورا پورا اندازہ کرکے

---

[1] زیدان۔ تاریخ التمدن الاسلامی ج ۳ ص ۱۸۱۔

بالکل اسی طرح اس درخت کی تصویر کھینچتا تھا، اور ہو بہو اس کی نقل تار کے رکھ دیتا تھا اس سلسلہ میں رشید الدین نے نہایت دلچسپ طریقہ اختیار کیا تھا یہ کہ وہ پہلے مصور کو پودے کی بالکل ابتدائی صورت دکھاتے تھے، اس کی تروتازہ صورت کی طرف متوجہ کرتے تھے، اور مصور اس کی تصویر لے لیتا تھا، پھر جب وہ پودا بڑھ جاتا تھا، اس میں دانے آجاتے تھے، تو پھر اس کی تصویر لی جاتی تھی، پھر جب وہ پودا خشک ہو جاتا تھا، اور گرنے کے قریب ہوتا تھا تو پھر اس کی تصویر لی جاتی تھی، اس تحقیق کا یہ نتیجہ ہوتا تھا کہ پڑھنے والا یہ محسوس کرتا کہ گویا وہ بچشم خود پودے کی اس نشوونما، اور تغیر و تبدل، کا معائنہ کر رہا ہے، ظاہر ہے یہ تحقیق کتنی کامیاب اور مکمل ہوتی ہوگی[1] میں نہیں سمجھتا کہ آج کل کے ماہرین علم نباتات ابن الصوری سے زیادہ تحقیق و تدقیق کا ثبوت دے سکتے ہیں۔

عربوں نے طبیعیات (فزکس) پر بھی اپنی محنت و کوشش صرف کی چنانچہ اس باب میں بھی نئی نئی بحثیں ان کی بدولت ہمیں نظر آتی ہیں پہلے تو انھوں نے یونانی کتابوں کا ترجمہ کیا، اور ترجمے کے بعد پھر اس فن میں انھوں نے حسب عادت وسعت کی، بہت سے مسائل کا اضافہ کیا، ان کی ترقی کا یہ عالم تھا کہ روز بروز اپنے لئے وہ نئی راہیں پیدا کرتے رہے۔ انھوں نے ایسے آلات بنائے تھے کہ جن کے ذریعہ سے وہ ثقل نوعی تک کا حساب رکھتے تھے، ایسے ایسے پیمانے انھوں نے تیار رکھے تھے کہ ایک گرام کے ۴ ۰۰۰۔ حصہ سے کم وزن کا فرق تک وہ معلوم کر لیتے تھے، نظریہ جذب کے متعلق بھی ان کے بہت سے اقوال ملتے ہیں[2]، روشنی کے متعلق بھی ان کے مستقل نظریات ہیں کہ اس سے پہلے کسی کی رسائی ذہن وہاں تک نہ ہوئی تھی، بلکہ اس مسئلہ میں انھوں نے بہت سے اضافے کئے، یونانیوں کی صحت طلب آراء و افکار کی تصحیح کی، اس مسئلہ پر اگر آج عربوں کے اضافے نہ ہوتے

---

[1] ابن ابی اصیبعہ طبقات الاطباء ج ۲ ص ۲۱۹

[2] ڈاکٹر صروف، بسائط علم الفلک ص ۲۲

تو یہ مسئلہ اس منزل تک نہ پہنچتا جہاں آج نظر آرہا ہے بعض ارباب نظر کا خیال ہے کہ اس مسئلے پر عربوں کے
مقالات و نظریات ہی کی بدولت دوربین کی ایجاد عمل میں آئی [1]۔ امراض چشم اور ان کی تشریح سے
متعلق بھی عربوں کا بہت سا تحریری سالہ موجود ہے [2]

موسیقی میں وتر خاص عربوں ہی کی ایجاد ہے، جسے زریاب نے اندلس میں اضافہ کیا تھا
قانون بھی عربوں کا ایجاد کردہ ہے۔ اس کی موجودہ ترکیب (ساخت) فارابی کی دی ہوئی ہے [3]
یہ مشہور قصہ تو اکثر کو معلوم ہوگا کہ فارابی نے ایک باجہ ایجاد کیا تھا۔ جو صرف دو لکڑیوں سے بنا تھا
ان لکڑیوں کی ترتیب میں جب ذرا سا تغیر کر دیا جاتا تھا تو مختلف قسم کے راگ نکلنے لگتے تھے، چنانچہ ایک
مرتبہ وہ سیف الدولہ کے دربار میں حاضر تھا، اس سے سوال کیا گیا کیا تم گانے بجانے سے کچھ ذوق
رکھتے ہو؟ فارابی نے اثبات میں جواب دیا، پھر اپنی جیب سے ایک خریطہ نکالا، اسے کھولا، اور اس میں
سے دو لکڑیاں نکالیں، انھیں ایک خاص انداز میں ترتیب دیا، اور بجانا شروع کیا، تو یہ حال ہوا کہ
مجلس میں جتنے لوگ بھی تھے سب کھلکھلا کر ہنستے ہنستے برا حال ہوگیا، پھر ان لکڑیوں کی ترکیب میں ایک
خاص تغیر کیا، اور بجانا شروع کیا، اب کی اہل مجلس پر راگ کے اثر سے گریہ طاری ہوگیا، اور ہر شخص
بے حال ہوگیا، اس کے بعد پھر اس نے اپنی لکڑیوں میں ایک خفیف سا تغیر کیا، اور بجانے لگا، نتیجہ
یہ ہوا کہ حضار محفل پر غنودگی طاری ہوئی، اور دربان تک خراٹے لینے لگا، فارابی نے لکڑیاں جیب
میں رکھیں اور یہ جا وہ جا غائب ہوگیا تھا [4]، آسمانی میں پرواز کا خیال بھی سب سے پہلے عربوں کو آیا، سب سے
پیشتر اس معاملہ کی طرف جس کا ذہن منتقل ہوا، وہ عباس ابن فرناس تھا، نفح الطیب میں ہے کہ۔

---

[1] انسائکلوپیڈیا برٹانیکا، مادہ Light

[2] کاجوری۔ تاریخ الفزکیس، ص ۲۳

[3] ابن خلکان ج ۲ ص ،،

[4] ابن خلکان ج ۲ ص ،،

"عباس نے اپنے جسم کو فضا میں اڑانے کی کوشش کی۔ پہلے تو اس نے اپنے بدن پر پر جوڑے پھر دو بازو تیار کئے، جیسے چڑیوں کے ہوتے ہیں، اس کے بعد اس نے فضا میں کافی عرصہ تک پرواز کی، لیکن یہ پہلا تجربہ اس کے لئے ایک حد تک تکلیف دہ ثابت ہوا۔ اترتے وقت اس کے جسم کے پچھلے حصے میں کچھ چوٹ آئی۔ اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ پرندا اترتے وقت اپنے پچھلے حصہ سے زیادہ مدد لیتا ہے، عباس نے غلطی یہ کی کہ دم نہیں بنائی[1]۔"

اب ہمیں چاہیئے کہ عربوں نے فن ریاضیات اور فلکیات میں جو ترقی کی تھی ایک نظر اس پر بھی ڈال لیں۔ ان دونوں مسئلوں پر علماء یونان اور ہندوستان کا جو تحریری مواد تھا اس سے استفادے کے بعد عربوں نے ان مسائل میں بھی قابل قدر اضافہ کیا۔ حساب میں عدد کے خواص اور دوسرے متعلقات پر انھوں نے سیر حاصل بحثیں کی ہیں، لفظ صفر بھی سب سے پہلے عربوں کے قلم سے نکلا، کسر عشری بھی عربوں ہی کا وضع کیا ہوا ہے، نو کا عدد گرا کے جمع کرنے کا اصول بھی عربوں ہی کی جانب منسوب ہے[2]، ہندی ہندسوں کو انھیں نے نقل کرکے رواج دیا، خوارزمی نے اپنی ایک تالیف میں لکھا ہے کہ موجودہ ہندسے ہم کو ہندیوں سے پہنچے ہیں[3] اور عربوں سے انگریزوں نے لئے ہیں۔

فن جبر و مقابلہ میں اگر یونانیوں کو کچھ درک تھا بھی تو بہت ناقص، ہم بلاخوف تردید یہ دعویٰ کرسکتے ہیں کہ یہ فن بھی عربوں ہی کے وضع کردہ فنون میں سے ایک ہے، کاجوری کا قول ہے کہ جب اس پر نظر جاتی ہے کہ عربوں نے جبر و مقابلہ کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا، تو عقل حیران رہ جاتی ہے۔ سب سے پہلے لفظ جبر کا استعمال بھی عربوں نے کیا اور ان سے انگریزوں نے لیا، اس فن پر انھوں

---

[1] المقری۔ نفح الطیب ج ۲ ص ۲۳۱

[2] کتاب تراث الاسلام ص ۳۹۴

[3] سمتھ کارپنکی۔ الارقام الہندیہ العربیہ ص ۵

نے مستقل نظریات بھی قائم کئے تھے جو اس وقت تک قائم ہیں، معادلات کے لئے حلول جبری و ہندسی بھی انھیں نے ایجاد کئے، درجۂ ثانیہ اور ثالثہ کے معادلات سے بھی انھوں نے سب سے پہلے دنیا کو روشناس کرایا۔ اس فن میں عربوں نے ایسی ایسی ایجادیں کیں کہ علماء فرنگ آج تک انگشت بدنداں ہیں۔ کاجوری کا قول ہے کہ معادلات تکعیبی کا حل[1] جو قطوع مخروط کے واسطے سے ہوتا تھا عربوں کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ درجۂ رابعہ کے معادلات کے بعض اوضاع بھی انھوں نے حل کئے[2]، مامون کے حکم سے محمد بن موسیٰ خوارزمی نے اس علم پر ایک کتاب شائع کی، جس نے بڑی شہرت حاصل کی جس سے ساری دنیا میں خوارزمی کا نام پھیل گیا، علماء فرنگ نے فن جبر پر جتنی کتابیں تحریر کیں وہ اسی کتاب پر مبنی تھیں، یہ کتاب فرنگیوں کے کورس میں بھی داخل رہی، اور ایک مدت دراز تک یہ لوگ اس سے استفادہ کرتے رہے، مثلثات میں بھی عربوں نے بہت جدت سے کام لیا، نسب مثلثہ کے عداد میں، عربوں ہی نے سب سے پہلے مماس کو داخل کیا[3]۔ تناسب جیوب کا قانون بھی عربوں ہی کے اکتشاف کا نتیجہ ہے، اور ان کے فخر کو یہ کافی ہے کہ کروی مثلثات کے حل کا عام قاعدہ انھیں نے بنایا، نظیر مماس، اور قاطع اور اس کی نظیر، ان چیزوں کے لئے جدولیں بھی سب سے پہلے عربوں نے تیار کیں اور واقعہ تو یہ ہے کہ علم المثلثات میں عربوں نے کوئی ایسی چیز نہیں چھوڑی کہ پھر اس پر خاص طور سے کوئی اضافہ کیا جاتا چنانچہ علماء فرنگ کو بھی اس کا اعتراف ہے۔

فلکیات میں بھی عربوں نے اپنی ذہانت و قابلیت، اور ایجاد و اختراع کا ایک زمانے سے لوہا منوا لیا، انھوں نے سابق فلکی علماء کی طرح یہ نہیں کیا کہ نظریات ہی قائم کرکے رہ گئے ہوں، بلکہ انھوں نے اس فن کو عملیات میں داخل کر لیا، رصد وغیرہ کا قائم کرنا بعض نہایت اہم نظریات فلکی

---

[1] کاجوری۔ تاریخ الریاضیات، ص ۱۰۷

[2] " " "

[3] انسائکلوپیڈیا آف برٹانیکا، مادہ مثلثات (Trigonometry) و نصیر الدین طوسی۔ شکل القطاع ص ۱۳۹

عربوں ہی کے طبع وقاد کا نتیجہ ہیں، انھوں نے بہت سے رصد خانے قائم کئے، اور ان میں منفعت بخش ارصاد کا انتظام کیا، اس فن میں انھوں نے ایسی مہارت کا ثبوت دیا کہ علما فلکیین دنگ رہ گئے، کوئی ان کی برابری نہیں کر سکا۔ مغرب نے بھی عربوں کے تفوق کو تسلیم کیا ہے۔ یہاں تک کہ لالاند مشہور فرانسیسی عالم فلکی تبانی کو ان بیس علمار فلکیین میں شمار کرتا ہے، جو اپنی مہارت و خصوصیات کے اعتبار سے ساری دنیا میں فرد ہیں [1]۔ زمین کی کرویت پر بھی عربوں کے بہت سے اقوال ملتے ہیں، ان کا یہ خیال بھی تھا کہ زمین ایک محور پر گردش کر رہی ہے، بڑی منفعت بخش زیچیں بھی انھوں نے ایجاد کیں، زمین کے لئے نقطۂ ذنب کی حرکت عربوں نے بیان کی، گرمائی اور سرمائی اعتدال کی قیمت میں بھی انھوں نے اصلاحیں کیں، فلک معدل النہار پر فلک بروج کے میل کی قیمت کا اندازہ بھی عربوں نے ہی کیا۔ اور تعجب خیز امر یہ ہے کہ اس میل کا حساب نہایت دقیق ہے، اپنی رصد میں انھوں نے ایک دقیقے تک کا حساب رکھا تھا [2]۔ آفتاب زمین سے کتنا بلند ہے؟ اس سوال کا جواب جو انھوں نے دیا تھا، وہ تقریباً وہی ہے، جو آج کل کے علماء فلکیات دیا کرتے ہیں [3]۔ آلات رصد میں اسطرلاب بھی عربوں کی ایجاد ہے۔ غرض اس فن میں انھوں نے غیر معمولی اضافے کئے، میں نے نبائط علم الفلک میں دیکھا ہے کہ پچاس فیصدی ستاروں کے نام وہی ہیں، جو عربوں نے رکھے تھے، اور آج تک وہ فرنگی زبانوں میں برابر استعمال ہو رہے ہیں۔ اس فن میں ان کی مہارت اور کمال کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ بعض فلکی علماء نے ایسے مکانات بنائے تھے، جن میں آسمان تھا، آسمان پر تارے تھے، بادل تھے، بجلیاں تھیں، سب ہی کچھ تھا اور دیکھنے

---

[1] ملاحظہ ہو مقتطف، بابت ماہ جنوری ۱۹۳۱ء

[2] اسمٰعیل مظہر تاریخ الفلک العربی ص ۴۵۔ ۴۶

[3] اسمٰعیل مظہر " ص ۴۶

[4] فانڈیک۔ کتاب علم الہیئۃ ص ۱۳۷

والے کو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ بیچ آسمان کے نیچے کھڑا ہوا ہے[1] علمائے مغرب کا اس میں اختلاف ہے کہ حرکت قمر میں انواع خلا کے اکتشاف کا سہرا کس کے سر ہے؟ بعض لوگ تیخو براہی کا نام لیتے ہیں اور بعض ابو الوفا کا[2] لیکن اب یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ اس انکشاف کا سہرا ابو الوفا کے علاوہ کسی اور کے سر نہیں ہے[3]۔

جب عربوں نے عیش و عشرت کے میدان میں قدم رکھا، تو اس میں بھی وہ سب بازی لے گئے، ایک طرف اگر علوم و فنون میں انھوں نے اپنی نظریات و خیالات کی ندرت کاریوں سے ایک عالم کو محو حیرت بنا رکھا تھا، تو دوسری طرف بزم و انجمن میں بھی وہ سب پیش پیش تھے، ان کی بزم آرائیاں آج تک لوگوں کی زبانوں پر اور کتابوں کے اوراق پر محفوظ ہیں، انھوں نے جب شعر و شاعری کی طرف توجہ کی، تو اس میں ایسا کمال پیدا کیا کہ میدان میں کوئی حریف نہیں رہ گیا، جب موسیقی کی طرف ان کی نظر متوجہ ہوئی، تو ایسے راگ اور باجے ایجاد کئے کہ مرور ایام کے باوجود آج تک وہ باقی ہیں، جب انھوں نے تعمیر پر نظر عنایت کی، تو ایسے ایسے قصور و محلات تیار کر کے کھڑے کر دئے، کہ دنیا میں جنت کا نمونہ قائم کر دیا، ان کی عمارتوں کی خوبی و خوشنمائی، سنگینی و استحکام، اور تناسب و تناسق پر جب نظر پڑتی ہے تو عقل حیران رہ جاتی ہے، ایک نظر مصر کی عمارات، دمشق کی جامع اموی، اور اندلس کے قصور و معابد پر ڈالو، تو عظمت اب بھی وہاں سجدہ ریز نظر آئے گی۔

الحمرا کی فرداً فرداً خصوصیات میں بیان کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا، لیکن میں نے اس کے متعدد اوصاف مقالات کتب میں پڑھے ہیں جو مشاہدے پر مبنی تھے اور ہر وصف ایک دوسر

---

[1] المقری۔ نفح الطیب ج ۲ ص ۲۲۱

[2] کاجوری۔ تاریخ الریاضیات ص ۱۰۵

[3] کتاب تراث الاسلام ص ۳۹۵

سے علیٰحدہ، یہ نتیجہ ہے "الحمرا کی اعجوبہ زائیوں اور حیرت فروشیوں کا، اس کی عظمت اور جلال ہندسی (انجنیرنگ) کا کون انکار کرسکتا ہے؟ مغربی علماء نے بھی الحمرا کے گن گائے ہیں اور اس کی نزاکت صنعت اور استحکام عمارت کا اعتراف و اقرار کیا ہے، فرنگیوں نے محلات اور کوشکوں کے نام "حمبرا" اذکزارا" (یعنی حمرا اور قصر) رکھنا شروع کئے "حمبرا" (حمرا) کے معنی ہی ان کے یہاں اس قصر کے پڑ گئے، جو خوبصورت ہو، مضبوط ہو، اس کے اندر باغیچہ ہو، طرح طرح کے پھول ہوں، غرض ہر چیز سے آراستہ و پیراستہ ہو[1]

قصر حمرا، عربوں کی جاہ و حشم، اور عیش و تنعم کی ایک زندہ یادگار ہے، خوف طوالت کی خیال سے اشبیلیہ کے قصر کبیر اور اندلس کے قصر زہرا اور قصر زاہرہ وغیرہ کا ذکر نظر انداز کیا جاتا ہے۔ قصر زہرا میں سنگ مرمر، اور دوسرے طرح طرح کے نادر پتھروں کو اس حسن و خوبی سے استعمال کیا گیا تھا کہ قوت بیان، اس کی تشریح سے عاجز ہے، اس میں سیکڑوں طلا، سرخ کی مورتیں تھیں، مثلاً عقاب ہرن، گھڑیال، شاہین وغیرہ، ان میں سے ہر مورت ہیرے جواہرات سے مرصع تھی، فوارے کی طرح اس کے منہ سے پانی نکلتا رہتا تھا[2]

یہ عمارتیں کیا بنیں ہمارے شعرا اور ادبا کے لئے ایک اچھا خاصہ میدان ہاتھ آگیا، مختلف شعراء نے اپنے اشعار میں، اور ادبا نے اپنی نثر میں ان عمارتوں کے کمالات و خصوصیات حسن و جمال تشریح و تعبیر، اور اصلی تصویر کھینچنے میں اپنا پورا زور قلم صرف کر دیا۔

سطور بالا میں فن تعمیر کی چند نادر مثالیں پیش کی گئیں۔ ان کے علاوہ عراق، شام، اور دوسرے ممالک اسلامیہ میں حضارت و تمدن کے جو نمونے عربوں نے قائم کئے، وہ ایسے ہیں کہ عصر حاضر کے بڑے بڑے علماء بھی ان کا اعتراف کرتے ہیں، اسپین کے ایک بہت بڑے انجنیر کا بیان ہے کہ جب

---

[1] مجلۃ الکلیۃ جلد ۱۵۔ ص ۳۳۰

[2]

میں مسجد قرطبہ کو دیکھتا ہوں، تو محسوس کرتا ہوں کہ ہمارے ملک میں سب سے بڑا اور اہم، اور قابل ذکر تحفہ جو ہے، وہ یہی مسجد ہے، میرا خیال تو یہ ہے کہ دنیا اب تک اس مسجد کی نظیر نہیں پیش کرسکی" آگے چل کے وہ کہتا ہے کہ مختلف قسم کی صناعات میں اور پانی کو طرح طرح سے کاٹ کے نکالنے میں عربوں نے جو طریقے اختیار کئے تھے، عہد حاضر کا فن اب تک وہاں نہیں پہنچ سکا ہے۔ فلسفہ میں عربوں نے جو کمال حاصل کیا تھا۔ اس سے ایک دنیا واقف ہے، کندی، ابن سینا، ابن ہیثم، اور ابن رشد وغیرہ ان اساطین میں ہیں کہ اب تک بہت سے دانشوران مغرب ان کی خوشہ چینی کو اپنے لئے باعث فخر سمجھتے ہیں۔

عربی حضارت تمدن کے بحر بے پایاں کے یہ چند قطرے تھے، جو اس صحبت میں پیش کئے گئے مغربی علماء نے عربوں کے عمران و تمدن پر بہت سیر حاصل بحثیں کی ہیں جن میں سے ہر ہر گوشہ ایک دفتر کی حیثیت رکھتا ہے فرنگی علماء نے جب کبھی عربوں کے مآثر کی جستجو کی، تو ان پر یہ حقیقت منکشف ہوگئی کہ عرب ہر چیز میں سبقت لے جا چکے ہیں، ایک بڑے مغربی دانشور کا قول ہے" بہت سی ایجادات و اختراعات کو ہم یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ یہ ہمارے مساعی کا نتیجہ ہیں، لیکن تھوڑے ہی عرصہ کی کاوش و جستجو کے بعد ثابت ہوگیا کہ ہمارا خیال غلط تھا، عرب ان چیزوں میں ہم سے مدت ہوئی بازی جا چکے ہیں"

پھر یہ بھی یہ عجیب بات ہے کہ ایک طرف تو ایسے قدر شناس مغربی علماء ہیں جو قدم قدم پر عربوں کی رہنمائی، اور دستگیری کے قائل ہیں، اور دوسری طرف ایسے حق ناشناس بھی جو اپنے زعم علم میں اس کی ضرورت کبھی محسوس نہیں کرتے کہ اپنے مآخذ و مصادر کا تذکرہ کردیں اس لئے کہ اس میں عربوں کا ذکر آجائے گا اور اسے وہ پسند نہیں کرتے۔ لیکن ایسے انصاف پرور علما بہرحال موجود ہیں جو نہایت فراخدلی سے عربوں کی علمی و عمرانی خدمات کا اعتراف خندہ جبینی

---

[۱] المقری۔ نفح الطیب ج ۱ ص ۲۳۰

کے ساتھ کرتے ہیں۔

فلوریاں کا قول ہے کہ "اپنے زمانہ میں عربوں نے علوم وفنون کی ترقی میں جو کچھ کیا، ویسا کوئی نہیں کرسکا، اگر ہم یہ کہیں کہ یورپ ان کے خدمات علمی کی بنا پر ہمیشہ انکا رہین منت رہا اور شاید رہے گا؟ (مترجم) تو یہ مبالغہ نہیں ہے، بالخصوص تیرھویں اور چودھویں صدی عیسوی کی نہضت میں ان کی یہ خدمت ایک بہت بڑی عامل تھی"۔

بلاشبہ حضارت عرب ایک حلقۂ اتصال ہے یونان اور حضارت جدیدہ کے درمیان، وہ عرب ہی تھے جنھوں نے یونان وغیرہ کے علوم کو ضائع ہونے سے بچایا، وہی تھے جنھوں نے ان علوم وفنون کو عربی میں منتقل کیا، وہی تھے، جنھوں نے ان علوم وفنون پر اضافے کئے، اور بالآخر اسپین کی راہ سے یہ سارا سرمایہ یورپ پہنچادیا۔ کاجوری اور سمت اعتراف کرتے ہیں کہ ریاضیات اور فلکیات میں عرب سب کے استاد تھے، بارون دی فو کہتا ہے، "یونان نے جو علمی ورثہ چھوڑا، رومی اسے نہ قائم رکھ سکے، نہ اس کی قدر کرسکے، لیکن عربوں نے اس میراث کی حفاظت کی، اور اسے درجۂ کمال تک پہنچادیا یعنی یہی نہیں کہ انھوں نے اس میراث کو جوں کا توں باقی رکھا ہو بلکہ اسے ترقی کے سب سے بڑے درجے پر پہنچادیا۔ انھوں نے اسے پروان چڑھانے میں اپنی پوری کوششیں صرف کردیں، اور بالآخر انھوں نے وہ میراث عہد حاضر کو سپرد کردی"

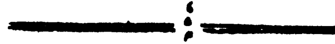
ڈاکٹر سارطون نے جامع امریکیہ، بیروت میں ایک خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا۔

"بعض مغربی علماء خواہ مخواہ عربوں کی جلالت علمی کا اعتراف نہیں کرتے، قرون وسطیٰ عربوں نے علم وفن کو جو فروغ دیا، اس کا اقرار کرتے ہوئے وہ ہچکچاتے ہیں، کہتے ہیں، عربوں نے یونانی علوم فنون کو نقل وترجمہ کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں کیا، یہ ایک بہت بڑی غلط بیانی ہے۔ اگر ہم اسے فرض بھی کرلیں کہ نقل وترجمہ کے علاوہ انھوں نے کچھ اضافے نہیں کئے تب بھی کیا یہ دنیا کی ایک عظیم الشان خدمت نہیں تھی؟ اگر ان کے ترجمے آج نہ ہوتے، تو ہم ترقی کی اس منزل پر نہ ہوتے بلکہ اب تک ہم قرون وسطیٰ ہی میں نظر آتے"۔

ڈاکٹر سارٹون کا یہ خیال بھی ہے کہ انکشاف سے اگر فائدہ نہ اٹھایا جائے تو اس کی حیثیت کچھ نہیں رہ جاتی لیکن جو انکشاف سے فائدہ اٹھائے، اس کو برتنا سیکھے اور سکھائے وہ بھی ڈاکٹر صاحب کی نظر میں اس کا مستحق ہے کہ اسے موجد مانا جائے چنانچہ فرماتے ہیں،

"قرون وسطیٰ میں عرب دنیا کے سب بڑے معلم تھے۔ عربوں کے نقل و ترجمہ کی حیثیت میکانکی نہیں تھی کہ لفظ بہ لفظ رکھ دیا، یا ہوبہو چربہ اتار دیا، بلکہ ان کی چیزوں میں روح تھی، زندگی تھی۔ انھوں نے یونان سے علوم و فنون حاصل کرنے میں بھی کوئی تامل نہیں کیا، اور ہندوؤں سے بھی بلا تامل انھوں نے قابل اخذ چیزیں حاصل کیں"

یہ ہے ایک مختصر سی داستان ایک گذری ہوئی قوم کی جو اگرچہ زندہ ہے، لیکن مر چکی ہے۔



مایا کے کھیل

رام بھروسے کاچھی کا جوان بیٹا پچھلے سال گرمیوں میں پولیس والوں کی گولیوں سے زخمی ہو کر مر گیا وہ بے قصور تھا۔ گاؤں گاؤں کے کسانوں نے لگان کی تخفیف کے سلسلے میں جو بلوے کئے تھے۔ اس سے اُسے کوئی تعلق نہ تھا۔ وہ بچارا بہن کی سسرال سے اپنے گھر واپس آرہا تھا۔ راستے میں موضع یعقوب پور کے کسانوں کی بھگدڑ میں پھنس گیا۔ سامنے سے پولیس گولی چلا رہی تھی اس کے بھی دو گولیاں لگیں۔ اور ایسی کاری کہ وہیں گاؤں کی سرحد کے پاس خیراتی کے کنوئیں کے قریب اس کی جان نکل گئی۔

رام بھروسے کی پکڑ دھکڑ ہوئی۔ حاکم کے سامنے پیشی ہوئی۔ مگر دو چار گاؤں کے بھلے مانسوں اور داروغہ جی کی گواہی صفائی سے رام بھروسے مظلوم قرار دیا گیا بیٹے کی جان کی قیمت سرکار سے ایک ہزار روپیہ ملی۔

پورے گاؤں پر بلوے کا تاوان لگا۔ پیسے والوں کا حال پتلا ہو گیا۔ عزت داروں کی بات میں دم نہ رہا۔ اب رام بھروسے پورے پکے ایک ہزار روپیہ کا مالک ٹھاکر بھوپ سنگھ کے دوارے آنے جانے لگا۔ پہلے بیگاریوں میں پکڑا جاتا تھا۔ ٹھاکر صاحب گاؤں کے نمبردار تھے۔ ان کے ہل چلانا پڑتے تھے۔ اور جو کبھی چلم کے لئے تباکو مانگ بیٹھتا تھا تو ٹھاکر صاحب کی گالیاں سہنی پڑتی تھیں۔ اب ٹھاکر صاحب پر گھٹتی پڑ رہی تھی۔ نمبرداری ٹوٹ چکی تھی اور رام بھروسے پر لکشمی جی ہنس رہی تھیں۔ اس لئے حالات کی صورت بدل گئی۔ آتے جاتے اگر رام بھروسے کاچھی ٹھاکر بھوپ سنگھ سے دوچار ہوتا۔ تو ٹھاکر صاحب "کہو سیٹھ" کہہ کر بات کرتے اور جو ٹھاکر صاحب کے ڈیرے پر جانا ہو جاتا۔ تو ٹھاکر صاحب اپنے حقے کی چلم خود اتار کر رام بھروسے کو دیتے کہ "لو ایک دو دم لگا لو"

دو چار سال تک یہی ڈھنگ رہے لیکن رام بھروسے کے ہاں لچھمی جی کا دل نہ لگا۔ دو چار نقصان ہوئے پہلے کسانی جانتا نہ تھا۔ کاشتکاری کے داؤں پیچ اور اونچ نیچ سے واقف نہ تھا۔ کمیرا بنا کسان اور کام نہ سنبھلا۔ دوسری طرف روپیہ کا نشہ سوار تھا۔ دو چار مقدمے ہوئے اس میں وکیل منشی اور اہلکاروں نے روپے کھائے۔ اور سرکار کا دیا روپیہ پھر سرکار کے خزانہ میں پہنچ گیا۔ مگر رام بھروسے کاچھی بالکل بگیاری نہ بن سکا۔ چونکہ روپیہ چلے جانے کے بعد بھی کچھ چاندی کی ایسی چمک چھوڑ جاتا ہے کہ ہر ایک کا زور چلنا آسان نہیں رہتا۔ لیکن رام بھروسے پھر کیرے ہوگئے۔ فصل کا اناج اور دو آنے روز پر سوے ولدوں کے کھیت جوتنے لگے۔

ٹھاکر صاحب کی بہن کا لڑکا نائب تحصیلدار تھا وہ دوسرے ضلع سے تبدیل ہوکر نواب گنج کی تحصیل میں آگیا۔ نائب تحصیلدار کی میل ملاقات افسروں اہلکاروں سے تو تھی ہی۔ اب انھوں نے اپنے ماموں ٹھاکر بھوپ سنگھ کی بگڑی بات بنانی شروع کی تحصیلدار صاحب سے ملایا ڈپٹی صاحب کے سامنے پیشی کرادی۔ داروغہ جی سے لحاظ ملاحظہ قائم ہو ہی گیا تھا۔ غرض کہ پھر ٹھاکر صاحب کا زور گاؤں میں بندھ گیا۔ نمبرداری مل گئی۔ نہر کا پانی ضلعدار صاحب کی مہربانی سے وقت پر ملنے لگ گیا فصل اچھی ہوئی۔ چار پیسے ہاتھ میں آئے اور ٹھاکر صاحب کا گاؤں میں وہی رتبہ ہوگیا جو پہلے تھا۔ پھر رام بھروسے کاچھی ان کے کھیتوں پر کام کرنے لگ گیا۔ اور اب پھر وہ جب کبھی چلم کے لئے تمباکو مانگتا تو ٹھاکر صاحب پہلے کی طرح کہہ دیا کرتے کہ " ابے کاچھی کیوں اپنی ذات بھولتا ہے کیوں جوتے کھانے کی دل میں ہے "

پہلے تو رام بھروسے یہ ڈانٹ سن کر ڈر جایا کرتا تھا لیکن اب وہ کچھ مسکرا دیا کرتا ہے۔ اور جی ہی جی میں کہتا ہوا چلا جاتا ہے کہ " مانس کی کچھ نہیں یہ تو سب مایا کے کھیل ہیں "

———•———

کیفیات

وفورِ بیخودی میں بڑھ گیا ہوں سوءِ دل سے
خیالِ دوست بھی آتا ہے اس منزل میں مشکل سے

نکلتی ہے تمنا اِس طرح ٹوٹے ہوئے دل سے
کہ جیسے شمع ہنگامِ سحر اٹھتی ہے محفل سے

وہ راحت ہے محیطِ عشق و طوفانِ حوادث میں
کہ دل ڈوبا سا جاتا ہے خیالِ قربِ ساحل سے

خوشا وہ دور جب دل تھا رہینِ رنجِ ناکامی
کہ اب تو زندگی ہے تلخ فکرِ برق و حاصل سے

مرے حق میں ہے تیرِ نیم کش بھی پرسشِ پنہاں
سمجھتا ہوں کہ وہ غافل نہیں ارمانِ بسمل سے

وہ خود ہیں جو بہت نازاں تھا حسنِ دلربائی پر
اسے ہم اپنے دل میں کھینچ لائے جذبِ کامل سے

غمِ الفت کو دردِ زیست کا حاصل سمجھتے ہیں
یہاں تک اہلِ دل مسرور ہیں کیفیتِ دل سے

نہ پوچھو لذتِ ذوقِ طلب راہِ محبت میں
دلِ دیوانہ مجھ کو دور ہی رکھتا ہے منزل سے

اٹھائیں گے کہاں تک زحمتِ دستِ جنوں وحشی
کہیں مضبوط ہے تارِ نفس طوق و سلاسل سے

دمِ نظارگیٔ حسن کس عالم میں پہنچے گا
وہ دیوانہ جو مجنوں ہو گیا ہو رنگِ محمل سے

تڑپنے بھی نہیں دیتی مری خوئے وفا مجھ کو
بہت جی گھٹ رہا ہے زحمتِ بازوئے قاتل سے

نشاطِ زیست کیسی؟ ہر نفس پر اب یہ عالم ہے
کوئی سر پھوڑتا ہو جس طرح دیوارِ حائل سے

جوابِ گرمجوشی سرد مہری ہی سہی کوکب
چراغِ کشتہ ہوں! اب کیا کہوں یارانِ محفل سے

شاعرِ عظیم

ڈاکٹر جے۔ ٹی۔ سنڈرلینڈ انگریزی کے مشہور انشاپرداز اور متحاف ہیں کلکتہ کے مشہور رسالہ "ماڈرن ریویو" میں اکثر سیاسی مباحث پر ان کے بلند پایہ مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔
موصوف نے حال ہی میں ایک پارۂ ادبی عنوان بالا پر سپردِ قلم فرمایا ہے جس میں ایک عقلمند فلسفی کی نظر سے "برگِ درختاں سبز" کو معرفتِ کردگار کا دفتر بنا کر دکھلانے کی کوشش کی ہے ایک مغربی ادیب کا یہ "عرفانی تخیل" خصوصاً اس دورِ مادیت میں قابلِ ستائش ہے ذیل میں اس کا اردو ترجمہ پیش کیا جاتا ہے، جو امید ہے کہ دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔

خدائے (عزوجل) شاعرِ عظیم ہے۔
کائنات اس کی نظموں کی غیر محدود کتاب ہے۔
فسانۂ ارتقا اس کی پرشوکت اور حیرت انگیز رزمیہ نظم ہے۔
تواریخِ اقوام اس کے شاندار ڈرامے ہیں۔
طبقات الارض کے انکشافات یعنی چٹانوں کے بیان کئے ہوئے گذشتہ عہدِ قدیم کے قصے، اس کے مقدس مرثیے ہیں۔
پہاڑ خصوصاً عظیم الشان سر بفلک پہاڑوں کے سلسلے، اس کی بلند ترین نظمیں ہیں۔ بڑے بڑے تناور درخت اس کے مسبعات (SONNETS) ہیں۔
آفتاب کے طلوع اس کی حمد و ثنا کے قصائد، اور غروب اس کی عظمت، عبادت، اور پوجا کے پرسکون نغمے ہیں۔
ہواؤں کے قہقہے اور نالہ و فریاد، گھنے جنگلوں اور صحراؤں میں اس کے غم اور مسرت کے

ترانے ہیں۔

سیکڑوں ریتیلے ساحلوں پر سمندر کی نرم آہیں اور سسکیاں اس کے نوحے ہیں۔ رعد و برق کے طوفان، دریاؤں کے تیز رو سیلاب، گہرے کناروں اور پتھریلے ساحلوں پر بجرے پایاں کی امواج کا شور تلاطم اس کے پرسطوت گانے ہیں۔

آبشار اس کے قطعات ہیں۔

لہرانے والے چشمے اس کے بزمیہ اشعار ہیں۔

کنجوں میں چہچہانے والی چڑیاں اس کے دوہے ہیں۔

براعظموں اور سمندروں میں پرندوں کا حیرت انگیز سلسلۂ مسافرت (ہجرت) اس کی منظوم داستانیں ہیں۔

دنوں اور راتوں کا تغیر پذیر غیر منقطع، اور مخفی سلسلہ، اور موسموں کی مسلسل آمد و رفت، اس کے منظوم ناٹک اور بزمیہ ڈرامے ہیں۔

پھول، جو ہر جگہ زمین کو خوبصورت اور شاداب بناتے ہیں، اس کے سحر انگیز "نغمہائے بے الفاظ" ہیں۔

چشموں میں پانی کا ہنسنا اور لہریں لینا، چھپروں پر مینہ کی جھڑیوں کی بوچھاڑ؛

تتیریوں اور شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ، اور فضا میں خوبصورت سپید پروں کی پھڑ پھڑاہٹ، جنھیں ہم "برف کی قاشیں" کہتے ہیں؛

چھوٹے پرندوں کا چہچہانا، جھینگروں کا شور مچانا، اور گڑھوں میں مینڈکوں کا ٹرّانا۔

جگنوؤں کی آگ مچولی، پانی کی سطح پر بلبلوں کی درخشانی اور ستاروں کی جگمگاہٹ۔

یہ سب اس کی "بچکانی نظمیں"، اس کے کنڈر گارٹن کے چھوٹے گیت، اور خوشدل بچوں کے لئے اس کی لوریاں ہیں۔

پہاڑیوں کے پوشیدہ گوشہ ہائے عزلت، اور گھنے جنگلوں کی خلوتیں؛
چاند اور ستاروں سے مزین، رات کے وقت پر سکون آسمان کا منظر؛
پہاڑ کی چوٹیوں سے، کسی کے زیر قدم تمام دنیا کو سمیٹنے والے، وسیع نظارے، اور پر اسرار سمندر کے کنارے، جہاں وسیع پانی لامتناہی آسمانوں سے ہم آغوش نظر آتا ہے، اور روح انسانی کی وسعتوں کو ظاہر کرتا ہے؛

یہ سب اس کے خاموش نغمہ ہائے عبادت ہیں، جو ہمیشہ انسانوں کو روحانی امن اور سکون اور زندگی کو شاندار بنانے والی اشیاء کے تصور کی دعوت دیتے ہیں۔

آپ کو اپنا نمبر خریداری یاد ہے؟

اگر یاد نہ ہو تو مہربانی فرما کر پتے کی چٹ پر ملاحظہ کریجیے۔ خط و کتابت میں نمبر کے حوالہ سے بڑی سہولت ہو جاتی ہے ورنہ بسا اوقات جواب دینا بھی مشکل ہو جاتا ہے براہ کرم اسے نہ بھولیے

مہتمم

نالۂ دلگداز کیفی بسالِ وصالِ والا جناب رئیس الاحرار

مولانا محمد علی مرحوم ۱۹۳۱ء

یہ تاریخ سیرت محمد علی میں شائع ہونے کے لئے آئی تھی مگر افسوس ہے کہ کتاب کے چھپ چکنے کے بعد پہنچی انشاء اللہ دوسرے ایڈیشن میں چھپ جائے گی۔ اس وقت ہم اسے ناظرین جامعہ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں د دیا

محمد با علی باہم شہید ملک و ملت بود — بدنیا در ہزار و ہشت صد ہفتاد و شش آمد

پئے بہبودی اہل وطن ترک مناصب ساخت — بے بہبود مسلم با حکومت پنجہ کش آمد

بزنداں او فتاد۔ آزار ہا برداشت غمہا خورد — مگر از پردلی اندر بلاہا شاد و خوش آمد

قوی شد بازوئے گاندھی بزور دست و بازویش — سپر انداز دست سلطنت از حملہ‌اش آمد

ز ہندوستان بہ لندن شد پئے تاسیس آزادی — شبے کردہ شکرت صبح۔ رنجہ شد نفس آمد

رگ جاں در گسستہ اندراں حالت بجنت شد — دل عالم ز دست فرقتش در کشمکش آمد

چو فکر اتحاد عالم اسلام بے حد داشت — بہ تدفینش طلبہا از فلسطین و حبش آمد

بعلم و فضل او کا نبیائے بود مصداقے — نزیل مسجد اقصیٰ ہماں انبیا رفتش آمد

بچارم جنوری شد فوت و پس از نوزدہ روزے — بہ بالیں لحد آں مہر طینت ما ہوش آمد

الٰہی دہ اماں پس ماندگانش را ازیں طوفاں — بہ گرداب است کشتی ناخدا در خواب خوش آمد

بگفت از بہر تاریخ وفاتش کیفی محزوں

بہ لندن مرد و در بیت المقدس مرقدش آمد

۱۹۳۱ء

لہ۔ اشارہ ہے حدیث نبوی کی طرف علماء امتی کا نبیاء بنی اسرائیل۔

جراثیم ملیریا کی تاریخ

سر رونالڈ روس کی وفات پر بعض اخبارات نے یہ بیان شائع کیا کہ ملیریا کے جراثیم سب سے پہلے ڈاکٹر رونالڈ روس نے دریافت کئے ہیں حالانکہ ان کا بیان حقیقت کے خلاف تھا کیونکہ اس کی دریافت تو ایک فرانسیسی ڈاکٹر لافران کی جد و جہد کا نتیجہ ہے جو ۱۸۸۰ء میں مکمل ہو چکی تھی۔ یہ ڈاکٹر فرانسیسی فوج متعینہ ٹونس الجزائر و مراکش کا طبیب تھا۔ فوج میں یہ مرض اکثر پیدا رہتا تھا اس لئے اس نے اس پر توجہ کی اور اس کے اسباب دریافت کر کے چھوڑے۔

بہر حال اس جرثومہ کا انکشاف اخبارات کے اس بیان سے معرض اختلاف میں آگیا ورنہ یہ دونوں باتیں پہلے ہی سے معلوم تھیں۔ اور سر رونالڈ روس کی انکشاف کے متعلق مزید تحقیق یہ بھی تھی کہ انھوں نے جرثومہ ملیریا دریافت ضرور کیا تھا مگر وہ جرثومہ جو پرندوں میں ملیریا کا باعث ہوتا ہے نہ کہ انسانوں میں پرندوں کا ملیریائی جرثومہ انسانی ملیریائی جرثومہ سے مختلف ہوتا ہے مگر اختلاف و اشتباہ کی بدولت ضرورت محسوس ہوئی کہ مسئلہ پر مزید تحقیق کی جائے۔ اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ بکٹریالوجی (علم جراثیم) کے ماہر خصوصی ڈاکٹر زکی خالد سے اس باب میں معلومات اخذ کی جائیں۔

چنانچہ آئندہ معلومات ڈاکٹر صاحب موصوف ہی کے رہین تحقیق ہیں۔

ڈاکٹر صاحب موصوف نے فرمایا کہ اس کی دریافت بھی عجیب و غریب دلچسپ کہانی سے کم نہیں ہے جس طرح پولیس اور سراغرسانی کے اخبار دلچسپی سے پڑھے اور سنے جاتے ہیں اس کی دریافت کی کیفیت بھی ایسی ہی دلچسپ ہے۔

تقریباً بیس سال سے متواتر مختلف اقوام کے ڈاکٹر اس کے تلاش میں سرگرداں تھے

اور ہر ایک نے اس کی کافی جانچ کی اور سب مختلف وقتوں اور مختلف مقامات پر تقریباً صحیح نتیجے پر پہنچے جو جو تکالیف اور مصائب انھوں نے ان دریافتوں میں اٹھائے ان کو ہم بخوف طوالت نظر انداز کرتے ہیں۔ ان لوگوں نے یورپ، ایشیاء، افریقہ ہر سہ بڑا عظموں میں گشت لگائی ملیریا کے اسباب کو دریافت کیا اکثر مواقع پر موت کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ گروہ اپنے اہل وعیال وطن دوست واحباب سے دور علم کے شوق اور اس کی تحقیقات میں مصروف جنگلوں اور ایسے میدانوں میں جہاں ملیریا کثرت سے ہوتا ہے سفر کر رہا تھا۔ ان علماء میں مختلف اقوام کے لوگ شامل تھے جن میں انگریز فرانسیسی اور اطالوی سب تھے۔

یہ ایک عجیب بات ہے کہ یہ مختلف اقوام اور مختلف الخیال علماء تھے لیکن طرز تحقیق سب کا ایک ہی تھا میری رائے میں یہ حقیقی ہیرو تھے اور علم پر اور انسان پر ان کے کارناموں اور ان کی تحقیقات کا بہت بڑا احسان ہے۔ ان کی زندگی اور ان کے کارنامے ہمیشہ ہمیشہ یادگار رہیں گے۔ آئندہ آنے والی بہادر قومیں ان کے نقش قدم کی پیروی کریں گی۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے دنیا اور اس کی جملہ دلچسپیوں کو چھوڑ کر تنہا جنگلوں کو اختیار کیا اور معلومات حاصل کی ان کی معلومات جب تک دنیا کو فائدہ پہنچاتی رہے گی ان کی کوششیں مشکور ہوتی رہیں گی سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے فرمایا۔

۱۸۸۰ء میں نوجوان ڈاکٹر لافیران (فرانس) نے خوردبین کے ذریعہ سے ملیریا کے مریضوں کے خون کا معاینہ کیا۔ یہ مریض الجزائر میں تھے اور یہ ڈاکٹر وہاں متعین تھا۔ ڈاکٹر نے خون کے سرخ ذرات میں نہایت چھوٹے جراثیم محسوس کئے۔

پانچ سال بعد ڈاکٹر گولگی نے یہ معلومات حاصل کی کہ یہ جراثیم مختلف قسم کے ہوتے ہیں اور خون کے ذرات سے نکل کر جسم پر اثر انداز ہوتے ہیں اور ان کے نتائج اور اثرات بھی مختلف ہوتے ہیں وغیرہ

کھڑے ہونے اور لرزہ آنے کا سبب بھی اس نے بیان کیا اور یہ بتایا کہ عموماً مغرب کے وقت ہی ایسا کیوں ہوتا ہے۔ ڈاکٹر کوخ گولگی اور سیلی کی متفقہ یہ رائے ہوئی کہ ملیریا کی متعدد قسمیں ہیں اور ہر قسم کے ملیریا کا تعلق اسی قسم کے جراثیم سے ہے یعنی جس طرح جراثیم مختلف النوع ہیں اسی طرح ملیریا بھی مختلف النوع ہے۔ اس جگہ سے جراثیم ملیریا کی بحث شروع ہوگئی۔ اور تحقیقات سے معلوم ہوا کہ یہ قسمیں سب ہمارے ہی خون میں پرورش پاتی ہیں۔ اور پھر ہم کو ہی فنا کرتے ہیں یہ بھی معلوم ہوا کہ ہمارے سرخ ذرات خون سے اپنی غذا حاصل کرتے ہیں اور توالد و تناسل کے سلسلہ سے بڑھتے ہیں۔ جب کثرت ہو جاتی ہے تو نظام صحت کو درہم برہم کر دیتے ہیں۔ جب ہم ملیریا میں مبتلا ہوتے ہیں تو ہمارے خون کے لاکھوں ذرات فنا ہو جاتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے ملیریا کے مریض فقر الدم یعنی قلت خون کا شکار ہوتے ہیں۔ اب ایک سوال یہ ہے کہ یہ جراثیم کہاں سے آتے اور کہاں پیدا ہوتے اور کس طرح ایک سے دوسرے میں منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جب۔ ملیریا کا سبب دریافت ہو گیا تو پھر مفکرین نے اس مسئلہ پر غور کیا کہ مریض سے تندرست جسم تک یہ مرض کس طرح منتقل ہوتا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر لا فیران (فرانس) اور ڈاکٹر کنگ (انگلستان) نے خیال کیا کہ مچھر کے ذریعہ سے یہ جراثیم مریض سے تندرست جسم میں منتقل ہوتے ہیں اور تندرست کو مریض بنا دیتے ہیں۔ لیکن ابھی یہ خیال تحقیق کا مرتبہ نہ حاصل کر سکا تھا۔

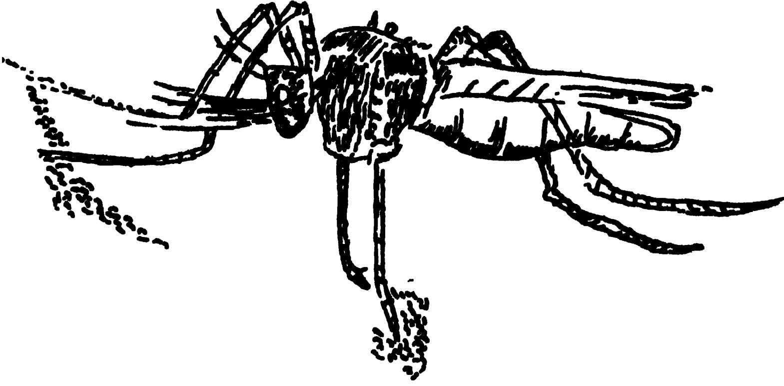
سر پے ٹرک نے رائے قائم کی کہ یہ جراثیم مچھر کے معدے میں اتر جاتے ہیں اور پھر جسم انسان میں اس کے معدہ سے منتقل ہوتے ہیں۔ اپنا دور حیات مچھر کے جسم میں پورا کرتے بڑھتے رہتے ہیں اور پھر جسم انسانی میں مچھر کے ذریعہ سے جب وہ انسان کو کاٹتا ہے۔ منتقل ہو جاتے ہیں اس نظریہ کے مطابق جراثیم ملیریا کی زندگی کے دو دور تسلیم کئے جاتے ہیں پہلا دور جب کہ وہ مچھر کے معدے میں ہوتے ہیں دوسرا دور جب کہ وہ انسان کے جسم میں ہوں جب انسان کے جسم میں ہوتے ہیں تو خون کے سرخ ذرات میں بڑھتے رہتے ہیں۔ مچھر کے جسم میں جب ہوتے ہیں تو اس کے معدے میں نشوونما پاتے ہیں۔ اس نظریہ پر بہت سے دلائل دیئے گئے ہیں اور ان دلائل سے

معلوم ہوتا ہے کہ یہ نظریہ بالکل درست اور قابل تسلیم ہے۔

ڈاکٹر روس نے ان نظریوں اور تحقیقاتوں کے بعد ثابت کیا کہ جراثیم ملیریا جو پرندوں پر اثر انداز ہوتے ہیں وہ بھی مچھر کے ہی معدے میں پرورش پاتے اور ترقی کرتے ہیں ان کی زندگی کے بھی دو دور ہیں پہلا دور جب کہ مچھر کے معدے میں ہوں دوسرا دور جب کہ پرندے کے خون کے اجزا سے اپنی غذا حاصل کریں۔

جس مچھر کے معدے میں یہ جراثیم پرورش پاتے اور زندہ رہتے ہیں اس کی شکل دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ایک سونڈ مثل ہاتھی کی سونڈ کے ہوتی ہے جس میں وہ جراثیم ہوتے ہیں جو تعدیہ سے پہلے پرندوں کے خون میں پائے جانے والے جراثیم کے مشابہ ہوتے ہیں یہ ہے وہ تحقیقات جو ڈاکٹر رونالڈ روس نے کی تھی۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم غلط بحث کر کے انسانی جراثیم ملیریا کا مکتشف ڈاکٹر رونالڈ روس کو نہ مان لیں اس میں شک نہیں کہ ڈاکٹر موصوف نے اپنی تحقیقات سے یہ ثابت کر دیا تھا کہ مریض سے تندرست تک ملیریا کا تعدیہ مچھر کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔ اس لئے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آئندہ تحقیقات کے لئے ایک بڑا راستہ پیدا کر دیا اور ملیریا کے اسباب تعدیہ پر بحث کرنے کی بہت سی سہولتیں پیدا کر دیں جس حد تک پرندوں کا تعلق ہے ۱۸۹۵ء میں ملیریائی جراثیم کا اکتشاف مکمل ہو چکا تھا مگر انسان میں ملیریا کی پیدائش اور تعدیہ کے اسباب معلوم کرنے کا سہرا دو اٹالین علماء گراسی اور بنامی کے سر تھا۔ انھوں نے ثابت کیا کہ تعدیہ انافلس مچھر کے ذریعے سے ہوتا ہے اس حقیقت کی توضیح کی کہ ملیریا کے جراثیم اپنی زندگی کے دونوں دور مچھر کے معدے اور انسان کے خون میں کس طرح پورے کرتے ہیں یہ بیان کرنا بھی ضروری ہے۔ یورپ میں اٹلی ہی وہ جگہ ہے جہاں ملیریا پھیلانے والے مچھر کثرت سے پائے جاتے ہیں۔

مچھر جس کے جسم میں ملیریا کے جراثیم موجود ہیں





جراثیم ملیریا مچھر کے معدے میں اڑ رہے ہیں

تجربہ ہی سب سے بڑی دلیل ہے۔ تجربے اور مشاہدات ہی سے ہم کسی نظریہ کی کامل تصدیق کر سکتے ہیں یا انکار کرتے ہیں۔ دو انگریز علماء نے اس طرف توجہ کی وہ اٹلی سے لندن ایسے مچھر لائے جن کے معدوں میں ملیریا کے جراثیم پرورش پا رہے تھے لندن میں جہاں ملیریا کا نام بھی نہ تھا چند تندرست اشخاص کو ان مچھروں سے کٹوایا۔ جب مدت معینہ گذر گئی ان اشخاص پر ملیریا کا اثر ہوا اور بیمار ہو گئے جب ان کے خون کا معائنہ کیا گیا تو ملیریا کے جراثیم پائے گئے۔ اس تحقیقات کے بعد اس میں کوئی شک نہیں رہا کہ ملیریا جراثیم کے ذریعہ پیدا ہوتا ہے اور یہ جراثیم مچھروں کے ذریعہ سے ایک جسم سے دوسرے جسم میں منتقل ہوتے ہیں۔ انسان نے کامل ایک چوتھائی صدی اس کی تحقیقات میں گذاردی آخر وہ گوہر مقصود حاصل کر سکا۔ باوجود اس مشاہداتی تصدیق کے غافل انسان اس پر یقین نہیں رکھتا اور بہت لوگ تو اس کو جانتے بھی نہیں کہ یہ کیا ہے اور کیوں ہوتا ہے ڈاکٹر زکی خالد کی رائے حاصل کرنے کے بعد دوسرے مشہور ماہر فن ڈاکٹروں سے ملیریا سے بچنے کے طریقے معلوم کئے گئے چنانچہ ڈاکٹر حسنین کی رائے حسب ذیل ہے۔

مچھر سے امراض ذیل کا تعدیہ ہوتا ہے۔

۱۔ ملیریا۔
۲۔ ڈینگو فیور
۳۔ فیل پا (انسان کی پنڈلی اس قدر موٹی ہوتی ہے جیسے ہاتھی کی) ۴۔ زرد بخار

اس کے تعدیہ سے محفوظ رہنے کے حسب ذیل طریقے ہیں۔

۱۔ جہاں تک ہو سکے اس مچھر کو اپنے گھر میں آنے نہ دو ایسے مقامات کو صاف رکھو جہاں عموماً اس کی سکونت رہے اور اس کو پناہ مل سکے۔

۲ جہاں تک ہو سکے مچھر دانی میں سویا کرو اور اس کے کنارے بستر کے نیچے دبے ہوں تاکہ مچھر کسی طرح بھی ان میں داخل نہ ہو سکے۔

۳۔ مچھروں کو جو تمہارے گھر میں ہیں بالکل فنا کر ڈالو۔

۴۔ جہاں تک ہو سکے گھروں میں گندہ پانی جمع نہ ہونے دو موری اور نالیاں ہفتہ میں کم سے کم ایک مرتبہ صاف کی جایا کریں پانی اور پانی کے برتن ہمیشہ صاف رہیں اور جہاں مچھر پیدا ہوتے ہوں وہ جگہ عموماً نم دار ہوتی ہے وہاں صفائی کی طرف خاص توجہ رکھی جائے اور ایسی ادویہ چھڑکی جائیں جو مچھر کو فنا کر دیتی ہیں۔

۵۔ اگر مچھر سے کسی طرح بھی حفاظت ممکن نہ ہو تو پھر کونین کو استعمال کرنا چاہیئے۔ ایک یا دو خوراک ڈاکٹر کے مشورے سے ضرور استعمال کرتے رہنا چاہیئے۔

اگر کوئی شخص ملیریا میں مبتلا ہو جائے تو حسب ذیل ہدایات پر عمل کرنا چاہیئے

۱۔ فوراً ڈاکٹر یا طبیب سے رجوع کریں۔

۲۔ شفاء کامل کے بعد بھی تین ماہ تک کونین کا استعمال جاری رکھنا چاہیئے۔

۳۔ ایسے اشخاص کو جن پر مرض کا ایک دفعہ حملہ ہو چکا ہے دوسرے مریض اشخاص سے دور ہی رکھا جائے تاکہ وہ دوبارہ پھر اس کی زد میں نہ آئیں۔

امید ہے کہ ہمارا مضمون لوگوں کو ملیریا سے محفوظ رکھنے لئے اگر وہ ان ہدایات پر عمل پیرا ہوئے تو ضرور مفید ہوگا۔

———— • ————

دل کی آواز[1]

دل کی آواز ہے یہ درد کی فریاد نہیں (جگر)

سخت حیرت ہے یہ کس بزم میں آیا ہوں میں
اہل محفل کو بڑے غور سے تکتا ہوں میں

ایک صورت نظر آتی نہیں دیکھی بھالی
کون سے لوگ ہیں یہ جن میں کہ تنہا ہوں میں

بیکسی پر مری روتی ہے مری تنہائی
صفت شمع جب اس بزم میں جلتا ہوں میں

آہ دنیا، تری وسعت میں یہ کیا ہے کہ کوئی
نہ تو میرا ہے شناسا نہ کسی کا ہوں میں

ہم زباں ہے نہ کوئی اور نہ کوئی ہمراز
داستاں اپنی ہواؤں کو سناتا ہوں میں

پھینک دیتا ہوں فضاؤں میں نوائیں دل کی
اپنا دمساز کسی کو نہیں پاتا ہوں میں

کوئی دل سوز نہیں دہر میں اس دل کے سوا
اور اس دل سے بھی کم بخت بھڑکتا ہوں میں

برق کی لہر سی ہے ہر رگ وپے میں ساری
ہمہ تن نبض کے مانند تڑپتا ہوں میں

کچھ عجب حال ہے آشفتہ مزاجی کا مری
کبھی رو دیتا ہوں میں اور کبھی ہنستا ہوں میں

دل دھڑکتا ہے تو کانوں میں یہ آتی ہے صدا
رحم اے شدت احساس کہ پھٹتا ہوں میں

روح گھٹتی ہے جو اس تنگ قفس میں میری
صفت مرغ گرفتار پھڑکتا ہوں میں

سانس لیتا ہوں تو اندر سے نکلتا ہے دھواں
کون سی آگ ہے یہ جس میں کہ جلتا ہوں میں

کبھی تسکیں کے لئے ہے گل و گلشن کی تلاش
کبھی وحشت میں سوئے دشت بھٹکتا ہوں میں

---

[1] اس نظم کے قوافی کی نسبت اہل فن سے یہ عرض ہے کہ میں نے جان بوجھ کر اس غلطی کو جائز رکھا ہے۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو اپنے ضمیر سے شرمندہ ہوتا۔ کیا غالب کا یہ مصرعہ یاد دلانے کی ضرورت ہے۔

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے   نالہ پابند نے نہیں ہے۔

کوئی دیکھے مری اس وقت کی شوریدہ سری
در و دیوار سے جب سر کو ٹپکتا ہوں میں

دلِ آگاہ بھی کیا چیز ہے اللہ! اللہ!
جب کلی کوئی چٹکتی ہے دہلتا ہوں میں

کون سی آگ ہے یارب نہ جلایا جس نے
روز و شب گو کہ اسی آگ میں جلتا ہوں میں

راکھ کر دی تپشِ عشق نے ساری ہستی
ایک شعلہ کی طرح پھر بھی بھڑکتا ہوں میں

کسی کروٹ کسی پہلو نہیں آرام مجھے
کون سا درد ہے یہ جس سے تڑپتا ہوں میں

چین آتا نہیں اک دم بھی جو دل کو یارب
کس کو اس پاپ کی بستی میں بھٹکتا ہوں میں

وہی بیزار ہیں اس دہر میں میرے دم سے
جن پہ دم دیتا ہوں جان چھڑکتا ہوں میں

چمن دہر کے ہر پھول کو چاہا، لیکن
وائے افسوس محبت کو ترستا ہوں میں

پھول پھر پھول ہیں کانٹوں کو بھی چوما میں نے
سب کی آنکھوں میں مگر پھر بھی کھٹکتا ہوں میں

میں کہ فطرت مری خود گل سے بھی نازک تر ہے
مجھ کو حیرت ہے کہ خاروں سے الجھتا ہوں میں

چھینٹ سے جس کی نجس ہو مرا ظرف عالی
ایسے پانی میں شب و روز نہاتا ہوں میں

کوئی دم ساز و ہم آہنگ و ہم آواز نہیں
کیوں نہ سر پھوڑ کے مر جاؤں کہ تنہا ہوں میں

آہ آؤں گا ترے دم میں نہ اب اے دنیا
مکر اور فن کو ترے خوب سمجھتا ہوں میں

اوپری دل سے مجھے چاہنے والے لوگو
پیار کہتے ہیں کسے اس کو سمجھتا ہوں میں

ظاہری آنکھ سے اے دیکھنے والو مجھ کو
کہتے ہو قطرۂ ناچیز ہوں، دریا ہوں میں

دیکھ لو غور سے مجھ کو کہ نہ پھر دیکھو گے
قطرۂ اشک تپتا ہوں، ڈھلکتا ہوں میں

میں نہ جانوں گا تمھیں کوئی نہ سمجھے گا مجھے
اپنی شوریدگیِ طبع میں یکتا ہوں میں

یوں نہ مایوس ہو تو اے دلِ شوریدہ مزاج
تیری اس شعلہ نوائی کو سمجھتا ہوں میں

کچھ دنوں صبر ابھی کر مرے پیارے وحشی
تیری محرومیِ تقدیر پہ کڑھتا ہوں میں

روح رہنے کی نہیں قالبِ خاکی میں جلیلؔ
توڑ کر اس کو نکل جائے گی کہتا ہوں میں!

تنقید و تبصرہ

کتب

طلسمِ زندگی ۔ نقوشِ مانی ۔ کلیدِ عربی ۔ تعلیم زدہ بیوی ۔ تختِ طاؤس ۔ پیغامِ رمضان۔
سرمایۂ صحت ۔ آمدن سی تفعلی ۔ موازنۂ صلیب و ہلال

طلسمِ زندگی | از میاں بشیر احمد بی ۔ اے (آکسن)، بیرسٹر ایٹ لا مدیر ہمایوں ۔ مصور تقطیع بڑی ، حجم ۲۰۰ صفحے ، لکھائی چھپائی عمدہ ، کاغذ نہایت نفیس ، جلد کپڑے کی جس پر خوشنما سنہری بیل بوٹے بنے ہیں ۔ قیمت پانچ روپے۔ ملنے کا پتہ ، سید عبد اللطیف منیجر رسالہ ہمایوں ، نمبر ۲۳ لارنس روڈ ، لاہور۔

اردو دانوں میں کون ایسا ہوگا جو میاں بشیر احمد صاحب کے نام سے واقف نہ ہو ۔ آپ ان معدودے چند لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے اپنی زندگی اردو ادب کی خدمت کے لئے وقف کر دی ہے ۔ آپ ہی جیسے حضرات کی کوشش سے پنجاب میں اردو کو وہ فروغ حاصل ہوا ہے جو اسے کسی اور صوبے میں یہاں تک کہ صوبۂ متحدہ میں بھی نصیب نہیں ہوا تھا ۔ آپ کا رسالہ ہمایوں برسوں سے زبان و ادب اردو کی اشاعت و ترقی کی سعی میں سرگرم ہے اور علاوہ اور خوبیوں کے اس کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ رسائل و اخبارات میں جو تو تو میں میں آئے دن ہوا کرتی ہے اس سے کوسوں دور رہتا ہے اور خاموشی سے اپنا کام کرتا رہتا ہے ۔

"طلسمِ زندگی" میاں صاحب کے مختصر ادبی مضامین کا مجموعہ ہے جن میں سے بعض رسالہ ہمایوں میں شائع ہو چکے ہیں مگر اب ترمیم و تغیر کے بعد بالکل بدل گئے ہیں بعض بلکہ ایسے ہیں جو اس سے پہلے کہیں شائع نہیں ہوئے تھے ۔ یہ مضمون چھ حصوں میں حسب ذیل عنوانات کے ماتحت مرتب کئے گئے ہیں ۔

مناظر ، صدائے روح ، آئینۂ دل ، جد و جہد ، سرگوشیاں ، خیالاتِ پریشاں ۔

ہر حصے کا سرورق نہایت خوش نما زنگارنگ نقش و نگار سے آراستہ ہے ۔ مضامین کی تشریح گیارہ خوش نما تصاویر (جن میں سے بعض رنگین بھی ہیں) ، اور ایک کارٹون سے کی گئی ہے ۔ میاں صاحب کے اسلوب بیان کی ندرت ، بے ساختگی اور شگفتگی سے شائقینِ ادب ہمایوں کے ذریعے سے خوب واقف ہیں ، اتنا کہہ دینا

کافی ہے کہ موجودہ مجموعے کے بیشتر مضامین میں یہ صفات پوری طرح موجود ہیں اور جابجا نیک نفسانہ ظرافت نے اور لطف پیدا کر دیا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ کتاب وہ مقبولیت حاصل کرے گی جس کی وہ مستحق ہے۔

نقوشِ مانی | مجموعہ کلام جناب سید کلب احمد صاحب مانی جائسی۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۱۷۶ صفحے، لکھائی چھپائی پاکیزہ، کاغذ عمدہ، قیمت مع محصول ڈاک عا، ملنے کا پتہ درج نہیں غالباً دفتر رسالہ تسنیم آگرہ ہوگا۔

حضرت مانی جائسی شعرائے عصر میں بلند مرتبہ رکھتے ہیں۔ یوں تو آپ کی مشق سخن کوئی پینتیس برس سے جاری ہے مگر بیس برس سے آپ کا کلام اردو کے ممتاز رسالوں اور خاص خاص مشاعروں کے ذریعے جوہر شناسانِ شعر سے خراج تحسین وصول کر رہا ہے۔ مگر ایک تو اس وجہ سے کہ آپ کم کہتے ہیں اور کم سناتے ہیں دوسرے اس وجہ سے کہ آپ کے کلام میں اردو روزمرہ کے ساتھ فارسی ترکیبیں کثرت سے ہوتی ہیں اور آپ کی طبیعت نے پامال مضامین کو چھوڑ کر معنی آفرینی کی راہ اختیار کی ہے آپ کی شہرت خواص تک محدود ہے۔ نہایت خوشی کی بات ہے کہ آپ کے کلام کا مجموعہ شائع ہو گیا اور باغ سخن کے گل چینوں کو وہ پھول جن کی خوشبو سے وہ ایک ایک کر کے لطف اٹھا چکے تھے ایک گلدستے کی شکل میں مرتب ہو کر پہنچ گئے۔ ہم اس مجموعے پر اپنی طرف سے تنقید کرنے کی جگہ کچھ منتخب اشعار نقل کرتے ہیں تاکہ پڑھنے والے خود ہی کلام کی خوبیوں کا اندازہ کر لیں۔

ایک نظم "فلسفۂ عشق" کے پہلے دو شعر ہیں:۔

ہے عشق اک سودائے سر یا کاہشِ روح و رواں	یا لذتِ دردِ جگر یا حسرتِ آرامِ جاں
مجموعۂ آلام ہے، سوزِ دلِ ناکام ہے	یا موت کا پیغام ہے یا ہے بلائے جاں ستاں

"کارنامۂ حسن" کے دو شعر ملاحظہ ہوں۔ اس نظم میں شاعر نے یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ حسن اپنا کوئی مستقل وجود نہیں رکھتا جس چیز پر عشق کی نظر پڑ جائے وہی حسن بن جاتی ہے۔

یہ حسن یہ اک روشن لو ہے، نظارہ سوز و پرضو ہے	مگر اس کا نور اک پرتو ہے یعنی روشن بالذات نہیں
ہاں جس سے ہے روشن نام اس کا جس سے ہے یہ شہرہ عام اس کا	یوں جس سے بڑھا اکرام اس کا وہ عشق ہی اور اس کا آئیں

بعض نظموں کے عنوانات یہ ہیں: رازِ بقا، سوگوارِ آرزو، پیامِ بہار، دیارِ دوست، کش مکشِ امید، فریبِ وفا، آہِ نارسا، خاکسترِ مشتعل۔

مناظرۂ حسن و عشق بڑے معرکے کی نظم ہے۔ اس میں وہی "اضافیتِ حسن" کی بحث ہے مگر خشک

منطقی انداز میں نہیں بلکہ دلکش اور دلنشیں شاعرانہ رنگ میں۔

غزلوں کے چند شعر ملاحظہ ہوں:۔

خامشی اچھا ہے شیوہ پیکر تصویر کا
یعنی کیا کہنا کسی کی شوخیٔ تحریر کا

اثر دل دوزجوان کی نگاہ اولیں میں تھا
الٰہی منتقل ہو جائے اب وہ میرے آنسو میں

یہ میں نے کب کہا تھا آپ کے ابرو نہیں قاتل
مجھے کچھ شک اگر تھا بھی تو دست نازنیں پر تھا

گلہ بے جا بھی کرتا ہوں کہ اس جلوے کا شائق ہوں
ندامت سے جو اک دن آپ کے روئے حسیں پر تھا

عمر تو صرف ہو چکی قید قفس میں باغباں
چھوڑ دے اب کہ مر رہوں ایک بہار دیکھ کر

پس نگاہ ہو تم نے پہنچایا پیام دلبری
کچھ دہان تنگ سے ان کو بھی فرمانے تو دو

کانٹے ہی کانٹے بچھیں بستر یہ مانی تو سہی
آرزو کا ایک کانٹا دل میں چبھ جانے تو دو

زندگی سے موت تک ہے فاصلہ اک سانس کا
پھر بھی کیا معلوم کتنی دور ہیں منزل سے ہم

آہ بن جاتی ہے نشیمن سوز
برق جب جلوہ گر نہیں ہوتی

وہ ابھی ڈرتے ہیں ذکر نالۂ شبگیر سے
کیونکہ ناواقف ہیں ضبط آہ کی تاثیر سے

کچھ نہیں ماجرائے طور و کلیم
دل تھا یارائے دید لا نہ سکا

یاد بھی تو نے مجھ کو کی میری　　میں ترا بھولنا بھلا نہ سکا

بندہ آئینۂ خدائی ہے　　سجدہ شان جبیں مٹا نہ سکا

کلید عربی پہلا حصہ | از جناب خلیل احمد صاحب لکھنوی تقطیع چھوٹی، ضخامت ۴۰ صفحات، طباعت و کتابت اور کاغذ معمولی، قیمت ۳ر۔ ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ دہلی یا دفتر رسالہ پیشوا دہلی۔

جناب مولانا قاری خلیل احمد صاحب بچوں کو عربی زبان کی تعلیم کے لئے جدید اصول پر چھوٹی چھوٹی ریڈروں کا ایک سلسلہ لکھ رہے ہیں۔ یہ اس کا پہلا حصہ ہے۔ اس میں آسان اور مفرد جملوں کی مشق کرائی ہے۔ آخر میں عربی افعال کی گردان کا ایک نقشہ بھی دے دیا ہے۔ امید ہے کہ یہ سلسلہ بچوں کے لئے مفید ہوگا۔

تعلیم زدہ بیوی | از جناب فضل حق قریشی دہلوی، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۵۰ صفحات، کتابت و طباعت اور کاغذ متوسط، قیمت ۵ر۔ ملنے کا پتہ: ساقی بک ڈپو، دہلی۔

یہ ایک مزاحیہ ڈراما ہے اور اس کا مقصد عورتوں کی غلط تعلیم و تربیت کے نتائج سے آگاہ کرنا ہے۔ اس میں دکھایا گیا ہے کہ ایک تعلیم یافتہ عورت میں محض غلط تعلیم و تربیت کے اثر سے کیسی اخلاقی خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ وہ اپنے مڈل فیل شوہر سے کیا نامناسب برتاؤ کرتی ہے اور آزادی و تفوق کے زعم باطل میں کیا کیا گل کھلاتی ہے۔ آخر ایک اچانک حادثہ اس کی آنکھیں کھول دیتا ہے۔ تمام پچھلی باتیں سراب معلوم ہوتی ہیں اور وہ اپنے مڈل فیل میاں کے قدموں پر گر کر معافی مانگتی ہے۔ ڈراما اپنے مقصد میں کامیاب ہے اور کچھ دن ہوئے روشن تھیٹر دہلی میں کامیابی کے ساتھ اسٹیج بھی کیا جا چکا ہے۔

تخت طاؤس | از جناب مولوی محمد عبد اللطیف خاں صاحب کشتہ قادری امتی فاضل دانرزبان پرشین (بی۔ ایل۔ ای مؤلف "حیات عزیز"، ضخامت ۱۴۰ صفحات، کتابت و طباعت اور کاغذ اچھا، تقطیع بڑی قیمت عہ۔ غالباً مؤلف سے مین پوری کے پتے پر مل سکے گی۔

اس کتاب میں جناب مولوی عبد اللطیف صاحب کشتہ نے مشہور تخت طاؤس کے متعلق تاریخی

حالات جمع کر دیے ہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے بہت سے یورپین مورخین کے بیانات کی تردید کی اور بہت سی پیچیدہ گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کی ہے اور بقول جناب تبصرہ نگار بہت سے تاریخی انکشافات کئے ہیں۔

کتاب کے شروع میں ۲۰ صفحات میں جناب ظہیر الدین صاحب علوی وکیل نے تبصرہ کو تعارف لکھا ہے جس میں بجائے کتاب پر تبصرے کے جو ایک تبصرہ نگار کا اصلی مقصد ہونا چاہیے زیادہ تر جناب مصنف کے حالات پر نہایت عقیدت مندانہ لہجے میں بحث کی گئی ہے۔ پھر خود جناب مصنف کا مقدمہ ہے جو ۱۶ صفحات کو محیط ہے۔ اس میں انھوں نے اس تصنیف کی وجوہ لکھی ہیں۔ مغلیہ عہد کی تمدنی ترقیوں کا تذکرہ کیا ہے۔ کوہ نور ہیرے کے متعلق بعض مغربی مصنفوں کے بیانات کی تنقید کی ہے اور اس کتاب کے لئے مواد فراہم کرنے میں جو دقتیں پیش آئی ہیں ان کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کے بعد تقریباً آٹھ صفحات میں کتب حوالہ کی فہرست ہے۔ اب اصل کتاب شروع ہوتی ہے۔ اس میں مختصر سی تمہید کے بعد شاہ جہاں کے مختصر حالات ہیں۔ پھر تخت طاؤس کے متعلق حالات و تاریخی انکشافات ہیں۔ اس سلسلے میں بھی بعض غیر ضروری چیزیں بیچ بیچ میں آگئی ہیں۔ کتاب میں سب سے زیادہ اہم چیز اس کے ذیلی حواشی ہیں۔ مصنف نے اس میں دل کھول کر اپنی محنت اور وقت صرف کیا ہے۔ اکثر مقامات پر ایک ایک نوٹ تین تین صفحوں میں سمایا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ جناب کشتہ نے اس سلسلے میں بہت مفید معلومات یکجا کر دی ہیں اگرچہ بعض مقامات پر یہ حاشیے اصل کتاب کے لئے کچھ زیادہ مفید نہیں ہیں اور ایک دو سطروں میں کام چل سکتا تھا۔ بہرحال اصل کتاب تقریباً ۳۰، ۴۰ صفحوں میں آئی ہے اور باقی صفحات تبصرہ، مقدمہ اور ذیلی حواشی کی نذر ہو گئے ہیں۔ تاہم جناب کشتہ کی کوششیں قابلِ قدر ہیں اور امید ہے کہ تاریخ کے طالب علم اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔ کتاب میں تخت طاؤس کی دو تین تصویریں بھی ہیں۔ جلد بھی خوبصورت ہے۔

پیغام رمضان | از جناب عبد المجید قرشی۔ ضخامت ۴۴ صفحات تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ کتابت و طباعت اور کاغذ متوسط، قیمت ۳/ ملنے کا پتہ: دفتر اخبار ایمان، پٹی ضلع لاہور۔

جناب مؤلف اس کتاب کا مقصد دیباچے میں خود ہی تحریر فرماتے ہیں:۔

"میں نے اس رسالے میں صوم رمضاں کی علمی، اقتصادی، تنظیمی اور سیاسی حیثیت ایک زندہ اور عملی تحریک ایک نظام عمل اور ایک قرارداد قانون کے طور پر واضح کرنے کی کوشش کی ہے اور بتایا ہے

کہ مسلمان رمضان کو اپنی زندگی کے عملی پروگرام کے ساتھ جوڑ کر اس قدر عظیم اور بے مثال عملی فوائد حاصل کر سکتے ہیں جو کسی تبلیغی، تنظیمی، سیاسی اور اصلاحی پروگرام سے حاصل نہیں ہو سکتے۔"

رمضان شریف کے فضائل و احکام کے سلسلے میں اردو میں بہت سے رسالے اور کتابیں شائع ہو چکی ہیں مگر ہمارا خیال ہے کہ "پیغام رمضان" ان سب سے الگ اور نہایت مفید و کارآمد کتاب ہے۔ زبان صاف اور طرز بیان دلچسپ ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ہر مسلمان اس رسالے کو خرید کر سرمۂ بصیرت بنائے گا۔ آخر میں جناب قریشی نے اپنے اس ارادے کا اعلان کیا ہے کہ آئندہ سے تحریک سیرۃ النبی کے ساتھ ساتھ تحریک رمضان و قرآن کے لئے جدوجہد کا بھی آغاز کیا جائے گا۔ خدا انھیں اور سیرت کمیٹی کو اپنے اس ارادے میں کامیاب کرے۔

سرمایۂ صحت | از حکیم مولوی حافظ یوسف حسن خاں سوری، ضخامت ۱۱۵ صفحے، تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶، کتابت و طباعت متوسط، کاغذ معمولی، قیمت ۴ر۔ ملنے کا پتہ: بابو محمد الیاس خاں صاحب سوری مکان مولوی یوسف حسن خاں سوری بہار شریف، بابو وجاہت حسین خاں صاحب محلہ سرار پور گیا۔

اردو زبان میں اب تک صحت و تندرستی کے موضوع پر کوئی ایسی کتاب ہماری نظر سے نہیں گزری جو بچوں کے لئے لکھی گئی ہو۔ جناب حکیم مولوی یوسف حسن خاں صاحب نے یہ مختصر سا رسالہ لکھ کر ایک بڑی کمی کو پورا کیا ہے۔ رسالے کی زبان نہایت آسان اور بچوں کے لئے مناسب ہے۔ امید ہے کہ یہ رسالہ عام مقبولیت حاصل کرے گا۔

آمدن سی لفظی | از جناب ابو المحاسن متین، ضخامت ۴۰ صفحات، کتابت و طباعت اور کاغذ معمولی قیمت ۲ر۔ ملنے کا پتہ: جناب غلام دستگیر صاحب تاجر کتب چارکمان حیدرآباد۔

جناب ابو المحاسن متین صاحب نے آمدنامہ فارسی کو نئی ترتیب اور جدید طرز پر لکھا ہے۔ علاوہ اس کے شروع میں طریقۂ تدریس کے متعلق کچھ ہدایات لکھی ہیں اور کتاب کے آخر میں صرف و نحو کے مختصر سے قواعد بھی تحریر کئے ہیں۔

موازنۂ صلیب و ہلال | از جناب نکہت شاہجہاں پوری بی۔ اے آنرز۔ حجم ۲۳۶ صفحات، تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶،

کتابت و طباعت متوسط، کاغذ دبیز، قیمت عمہ، ملنے کا پتہ صدیق بک ڈپو لکھنؤ یا الناظر بک ایجنسی لکھنؤ۔

جناب نکہت نے اس کتاب میں موجودہ مغربی یا عیسائی تمدن سے مسلمانوں کی گذشتہ ترقیوں کا تقابل کیا ہے۔ آج کل کے مغرب زدہ نوجوان یورپ کی تمدنی ترقیوں سے مسحور ہیں اور اس امر سے بڑی حد تک ناواقف ہیں کہ ان کے اسلاف نے بھی کچھ نہ کچھ کارنامے انجام دئے ہیں اور موجودہ ترقیوں کی اساس انھیں کی تمدنی کوششیں ہیں۔

شروع میں جناب مؤلف نے آٹھ صفحوں میں فہرست مطالب کے عنوان سے مضامین کی فہرست دی ہے۔ پھر ان کی تصویر اور "خطاب با نوجوانان ملت" کے عنوان سے ایک فارسی نظم ہے۔ اس کے بعد مقدمہ ہے اور پھر اصل کتاب شروع ہوتی ہے۔ کتاب مختلف ابواب میں منقسم ہے۔ موٹی موٹی سرخیاں یہ ہیں: سرگذشت صلیب و ہلال، اسلامی عظمت و جلال، معمورۂ حسن و عشق، موسیقی اور اسلام، یورپ کی ادبی روح اور اسلام، اسلامی علوم و فنون، اسلامی سائنس و طب یورپ میں، اسلام کی تجارت اور یورپ کی تمدنی تربیت، مصوری اور اسلام، اسلام اور تربیت یہود۔ پہلے باب میں انھوں نے دکھایا ہے کہ دسویں صدی عیسوی میں یورپ جہالت و وحشت کی گمراہیوں میں مبتلا تھا اور اس کے مقابلے میں اندلس کے مسلمانوں کی ترقی نصف النہار پر تھی اور یورپ میں اسی راہ سے تہذیب و تمدن کی کرنیں پہنچیں۔ دوسرے اور تیسرے باب میں اندلس کے متمدن شہروں کا تذکرہ ہے۔ ان کی شاندار عمارتوں، باغوں، شاہی محلات اور محکمۂ انتظام کی تفصیل ہے۔ اسی سلسلے میں عورتوں کی آزادی، ان کی علمی و ادبی سرگرمیوں کا تذکرہ ہے۔ چوتھے باب میں اس الزام کی واقعات و دلائل کے ساتھ تردید کی گئی ہے کہ مسلمان موسیقی کی ترقی میں حائل ہوئے۔ پانچویں باب میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ مغربی ادب بڑی حد تک اسلامی ادب سے متاثر ہے۔ شروع میں بہت سی عربی حکایتیں مغربی زبانوں میں ترجمہ کی گئیں یا ان کو سامنے رکھ کر قصے لکھے گئے۔ فرانس کے بہت سے گیت ہو بہو عربی جذبات کی نقل ہیں۔ فارسی ادب و شعر نے بھی مغربی ادب پر بہت اثر ڈالا۔ چھٹے باب میں اسلامی علوم و فنون کا تذکرہ ہے۔ اس میں مؤلف نے مسلمان مردوں اور عورتوں کے شاعرانہ ذوق اور ان کی علمی و ادبی سرگرمیوں کا حال لکھا ہے۔ اور مشہور یونیورسٹیوں، کتب خانوں اور علمی اکادمیوں کے نام گنائے ہیں۔ صرف قرطبہ میں آٹھ ہزار پبلک اسکول تھے جن میں ہر خطے اور ہر قوم کے لوگ بلا تفریق مذہب و ملت تعلیم حاصل کرتے تھے اور ان کے تمام اخراجات حکومت کے ذمے ہوتے تھے۔ پھر مسلمان علما کی علمی سرگرمیوں اور ان کی تصنیف و تالیف کا ذکر ہے اور فلسفہ، سائنس، طب، جغرافیے میں ان کی انتہائی ترقیوں کی تفصیل ہے۔

بقیہ ابواب بھی اسی قسم کی علمی تحقیقات سے لبریز ہیں۔ کتاب میں زیادہ تر موازنہ اندلس کے حالات سے کیا گیا ہے اس لئے کہ وہی مغربی قوموں سے زیادہ قریب ہے اور اسی کے تہذیب و تمدن کا اثر مغرب پر براہ راست پڑا۔ مؤلف نے ان تاریخی حقائق کے ثبوت میں اکثر و بیشتر خود مغربی مصنفین کے بیانات پیش کئے ہیں اور شروع سے آخر تک اس کا التزام رکھا ہے۔ کتاب کی تالیف میں مصنف نے نہایت محنت و کاوش سے کام لیا ہے اور نہایت قیمتی معلومات فراہم کردی ہیں۔ زبان نہایت صاف و سلیس اور پیرایۂ بیان دلچسپ ہے۔

رسائل

ہونہار سالگرہ نمبر۔ دستور

ہونہار سالگرہ نمبر | ایڈیٹر فیاض حسین صاحب نسیم جامعی، چندہ سالانہ تین روپے، فی پرچہ ۴؍ اس پرچہ کی قیمت ۹؍۔ مقام اشاعت دہلی۔

یہ پرچہ جناب فیاض حسین صاحب نسیم (جامعی) چوتھے سے نویں درجے تک کے طلباء کے لئے نکالتے ہیں اور نہایت محنت اور سلیقے سے مرتب کرتے ہیں۔ مضامین میں خاصا تنوع ہوتا ہے۔ علاوہ بریں ہر ماہ فوٹو بلاک اور دستی تصویروں کا بھی انتظام ہے۔ زیر نظر نمبر کی ضخامت ۱۰۰ صفحات ہے۔ اس میں قصے کہانیاں، مضامین نظم و نثر، صنعت و حرفت، کشیدہ کاری، معمے، لطیفے، فوٹو بلاک کی اور دستی تصاویر اور کارٹون غرض بچوں اور بچیوں کی دلچسپی اور تفریح کے لئے ہر قسم کا سامان موجود ہے۔ ٹائٹل بہت خوشنما اور دیدہ زیب ہے۔ قیمت باوجود ان تمام خوبیوں کے صرف ۹؍۔

دستور ہفتہ وار ہے | ایڈیٹر آزاد دہلوی، ضخامت ۲۴ صفحات بتقطیع اللال کی قیمت سالانہ ۶؍، فی پرچہ ۲؍ مقام اشاعت دہلی۔

یہ پرچہ تین مہینے سے نکل رہا ہے اور خوشی کی بات ہے کہ برابر ترقی کی راہ پر گام زن ہے۔ جناب آزاد صاحب اسے بڑی سنجیدگی اور سلیقے سے مرتب کرتے ہیں۔ علمی، ادبی، تفریحی مضامین، نظمیں، افسانے غرض ایک ہفتے وار پرچے کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ سب اس میں موجود ہوتی ہیں۔ قومی اور ملکی معاملات پر اظہار خیال بھی نہایت سنجیدگی سے کیا جاتا ہے۔ تقریباً ۸، ۱۰ صفحے ہر پرچے میں فوٹو بلاک کی تصاویر کے بھی ہوتے ہیں۔

دنیا کی رفتار

ہندوستان

نوشتۂ تقدیر انتظار کی گھڑیاں مشکل سے کٹتی ہیں مگر خدا خدا کر کے صبح امید کے انتظار میں پریشانی کی راتیں گذر گئیں اور ۱۷ مارچ کو ہندوستان کا "نوشتۂ تقدیر" یعنی آیندہ دستور اساسی کے متعلق حکومت برطانیہ کی تجاویز شائع ہو گئیں! جن لوگوں کو آخری گول میز کانفرنس کی کارروائیاں اور وزیر ہند کی آخری تقریر یاد ہے ان کے لئے "قرطاس ابیض" کوئی ایسی بات نہیں جو خلاف توقع ہو۔ البتہ افسوس ہر شخص کو ہے کہ جو آئینی دستور سرکار نے ہمارے لئے تجویز کیا ہے اس پر چل کر 'سوراج' کی منزل مقصود تک یہ ملک شاید قیامت تک نہ پہنچ سکے گا۔

... ...

جو تجاویز اس وقت پیش نظر ہیں غالباً پہلی گول میز کانفرنس کے انعقاد سے پہلے ہی تیار ہو چکی تھیں لیکن ان کی اشاعت کے لئے مناسب وقت اور موقعے کا انتظار تھا۔ اسی میں تین سال لگ گئے اور آخر وقت تک یہ کسی کو نہ محسوس ہونے دیا گیا کہ 'وقت گذاری' کی جا رہی ہے۔ چنانچہ ہندوستان کے بڑے بڑے مدبرین کے لئے طرح طرح کی دماغی عیاشیوں کا انتظام مسلسل تین سال تک رکھا گیا اور 'تبادلۂ خیالات' ہوتا رہا یہاں تک کہ حکومت کو اپنی مدمقابل جماعت کے بازو بظاہر جب شل ہوتے نظر آئے تو اطمینان کی سانس لے کر اپنی 'خلوص نیت' اور 'نیک ارادوں' کے ثبوت کے لئے وہ تجاویز شائع کی گئیں جن پر ہندوستانی اور برطانوی نمایندوں نے گویا کہ زیادہ سے زیادہ اتفاق رائے کیا ہے۔

مگر ابھی تک چونکہ حکومت کو فریق مخالف کی طرف سے کلی اطمینان نہیں ہے اس لئے صرف حکومت کی تجاویز ہمارے سامنے آئی ہیں جو پہلے ایک منتخب کمیٹی کے سامنے چھان بین کے لئے پیش کی جائیں گی۔ اس کے بعد مسودۂ قانون تیار ہوگا اور پارلیمنٹ کی منظوری کے لئے پیش کیا جائے گا۔ منتخب کمیٹی نے اگر مناسب ترمیمات نہ قبول کیں تو پھر پارلیمنٹ سے رشتۂ امید وابستہ کرنا پڑے گا۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ دستور اساسی اپنی آخری صورت میں کب نافذ ہوگا۔

... ...

حکومت کی تجاویز کا خلاصہ یہ ہے کہ موجودہ "گورنمنٹ آف انڈیا" ایکٹ منسوخ کر دیا جائے اور اس کی جگہ ایک نیا قانون "کانسٹی ٹیوشن ایکٹ" یا دستوری قانون کے نام سے منظور کیا جائے۔ اس ایکٹ کے مطابق ایک وفاقی نظام حکومت ہندوستان میں قائم کیا جائے۔ وفاقی مجلس برطانوی ہند کے منتخب اراکین اور دیسی ریاستوں کے نامزد نمائندوں پر مشتمل ہو۔ مرکزی وفاقی حکومت کا رکن رکین اور حاکم اعلیٰ گورنر جنرل ہوگا اور اس کی حیثیت بادشاہ کے نمائندے کی ہوگی۔ گورنر جنرل کی مشیر اور معاون وزرا کی ایک کونسل ہوگی جو چند شرائط کے ماتحت مجلس کے سامنے ذمہ دار اور جواب دہ ہوگی۔ گورنر جنرل کا تقرر شاہی سند سے عمل میں آئے گا۔ جہاں تک دیسی راجاؤں اور شاہ انگلستان کے معاملات کا تعلق ہے گورنر جنرل کو بحیثیت 'وائسرائے' بھی کچھ اختیارات حاصل ہوں گے مگر ان کا کوئی ذکر دستوری قانون میں نہ ہوگا۔ مرکز میں اور صوبجات میں تمام حاکمانہ اختیارات اصولاً ملک معظم کو حاصل ہوں گے مگر عملاً مرکز میں گورنر جنرل اور صوبجات میں گورنران کو تفویض کر دئے جائیں گے۔ مرکز میں وفاقی ذمہ دار حکومت کے قیام کے لئے تین شرائط کا پورا ہونا ضروری ہے (۱) کل دیسی ریاستوں کی مجموعی آبادی کا نصف حصہ جس کو کم از کم کل دیسی ریاستوں کی نشستوں میں سے نصف نشستوں کا حق حاصل ہو وفاق میں شرکت کے لئے آمادہ ہو جائے (۲) رزرو بنک قائم ہو جائے (۳) پارلیمنٹ کے ہر دو ایوان ملک معظم سے درخواست کریں کہ وفاقی ذمہ دار نظام حکومت کے قیام کے لئے فرمان شاہی صادر کیا جائے۔

... ...

وفاقی حکومت اگر قائم ہو جائے تو مرکزی حکومت کے چند شعبہ جات کا انتظام بہ 'تحفظات' گورنر جنرل سے متعلق رہے گا اور وزرا کو ان شعبہ جات کے معاملات میں کسی قسم کا دخل نہ ہوگا۔ یہ 'مخصوص' شعبے تین ہیں: اول فوج' دوسرے معاملات 'خارجہ' تیسرے کلیسا کا انتظام۔ جہاں تک ان تین شعبوں کا تعلق ہے گورنر جنرل براہ راست ملک معظم اور پارلیمنٹ کے سامنے جواب دہ ہوگا۔ بقیہ امور میں گورنر جنرل وزرا کے مشورے کے مطابق کام کرے گا اور اس لئے وزرا مجلس کے سامنے جواب دہ قرار دئے گئے ہیں۔ مگر یہاں بھی گورنر جنرل کو بات بات پر دخل دینے کا اختیار دیا گیا ہے تاکہ گورنر جنرل اپنی ذمہ داری پر جس وقت چاہے کسی شعبے کے انتظام میں مداخلت کر سکتا ہے۔ اختیارات دو قسم کے ہوں ایک "اختیارات خصوصی" اور دوسرے "اختیارات تمیزی"۔ اختیارات خصوصی حسب ذیل حالات میں بغیر وزرا کے مشورے کے استعمال کئے جائیں گے:۔

(۱) جب ملک میں نقض امن کا خطرہ ہو۔
(۲) اقلیتوں کے مفاد کو نقصان پہنچے۔
(۳) سرکاری اسامیوں کے معاملے میں ناانصافی کی جائے۔
(۴) دیسی ریاستوں کے معاملات میں دخل دیا جائے۔
(۵) حکومت کا اعتبار اور ساکھ خطرے میں ہو۔
(۶) تجارتی کاروبار میں نسل و رنگ کے امتیازات قائم کئے جائیں۔
(۷) گورنر جنرل کے متعلقہ امور فوج، معاملات خارجہ اور انتظام کلیسا کے سلسلے میں جب ضرورت ہو۔

مذکورہ بالا اختیارات خصوصی کے علاوہ گورنر جنرل کو کچھ اختیارات تمیزی بھی حاصل ہوں گے اور ان اختیارات کے استعمال کرنے کے لئے بھی گورنر جنرل وزرا کے مشورے کا پابند نہ ہوگا۔ تفصیل درج ذیل ہے:۔

(۱) گورنر جنرل وفاقی مجالس کے انعقاد، التوا اور برخاست کرنے کا حق رکھتا ہے۔
(۲) مسودات قانون کو منظور کر سکتا ہے یا منظوری دینے سے اجتناب کر سکتا ہے یا ملک معظم کی منظوری کے لئے روک سکتا ہے۔
(۳) اگر ضرورت ہو تو وفاقی مجالس کا مشترکہ اجلاس منعقد کر سکتا ہے۔
(۴) مجلس کے فیصلے کے خلاف اپنا فیصلہ صادر کر سکتا ہے۔
(۵) مجلس میں مباحثوں کو درمیان سے روک سکتا ہے۔
(۶) اپنی مخصوص ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے مجالس کے قواعد وضوابط میں اضافہ اور ترمیم کر سکتا ہے۔

... ...

وفاقی مجلس کے دو ایوان ہوں گے اور دونوں کے اختیارات مساوی ہوں گے سوائے اس کے کہ میزانیہ کا مسودہ پہلے ایوان عام میں پیش کیا جائے گا۔ ایوان عام میں زیادہ سے زیادہ ۳۷۵ ارکان ہوں گے۔ اس میں سے ۱۲۵ ارکان دیسی ریاستوں کے نمائندے ہوں گے باقی برطانوی ہند کے نمائندے جن کا انتخاب براہ راست ہوا کرے گا۔ ایوان خاص میں ارکان کی کل تعداد زیادہ سے زیادہ ۲۶۰ ہوگی

جن میں سو نمائندے دیسی ریاستوں کے، ۲۵۰ منتخب نمائندے برطانوی ہند کے (جن کا انتخاب صوبجاتی کونسلوں کے ذریعے ہوا کرے گا) اور دس ارکان کو گورنر جنرل نامزد کیا کرے گا۔

یہ ایک مختصر خاکہ ہے وفاقی طرز کے ایک ذمہ دار بلکہ غیر ذمہ دار نظام حکومت کا جو ہندوستان کے لئے تجویز کیا گیا ہے۔ جہاں تک صوبجات کا تعلق ہے جدید دستور کے مطابق دو نئے صوبے سندھ اور اوڑیسہ قائم کرنے کی تجویز ہے۔ اس طرح برطانوی ہند ۱۱ صوبوں میں منقسم ہو جائے گا۔ ہر صوبے میں ایک گورنر بادشاہ کے نمائندے کی حیثیت سے حاکم اعلیٰ ہوگا، اور اس کو بھی وہی اختیارات خصوصی حاصل ہوں گے جن کا ذکر گورنر جنرل کے اختیارات کے سلسلے میں ہو چکا ہے لیکن صوبجات میں حکومت کا کوئی شعبہ تنہا گورنر کے سپرد نہیں کیا جائے گا بلکہ وزرا کی ایک کونسل ہوگی جو تمام امور کی ذمہ دار ہوگی اور صوبجاتی مجلس کے سامنے جوابدہ بھی ہوگی۔ گورنر اگر اپنے اختیارات خصوصی سے کبھی کام لے گا تو اس کی ذمہ داری وزرا پر نہ ہوگی۔

... ...

صوبجاتی کونسلوں میں ارکین کی تعداد اور فرقہ وارانہ نمائندگی کے متعلق جو فیصلہ وزیر اعظم نے ۴ اگست ۱۹۳۲ء کو کیا تھا وہ علیٰ حالہ قائم رہے گا۔ بنگال، بہار اور صوبہ متحدہ میں مجلس کے دو ایوان ہوں گے اور باقی صوبجات میں صرف ایک ایک لیکن قانون اساسی میں یہ گنجائش رکھی جائے گی کہ اگر کسی صوبے میں ایوان کی ضرورت ثابت ہو تو دوسرا ایوان قائم کر دیا جائے یا اگر کہیں دو ایوان غیر ضروری ثابت ہوں تو ایک ایوان توڑ دیا جائے۔

صوبجاتی اور مرکزی حکومت کے درمیان مداخل کی تقسیم حسب ذیل تجویز کی گئی ہے۔

۱۔ (الف) وہ مدات آمدنی جو کلیتہً مرکزی حکومت کو دی گئی ہیں۔ محصول درآمد (علاوہ محصول نمک)، ریلوں کی آمدنی، زر و بنک اور تسکیک زر کا منافع، مرکزی حکومت کے ملازمین پر انکم ٹیکس کی آمدنی، اور مشترکہ سرمایہ دار کمپنیوں پر محصول کی آمدنی۔

(ب) جو مرکزی حکومت وصول کرے گی لیکن اس آمدنی کا کوئی حصہ صوبجات کو بھی دیا جا سکتا ہے۔ محصول برآمد، نمک پر چنگی کی آمدنی، تمباکو اور دیگر منشیات پر محصول آبکاری (اس میں شراب کی چنگی شامل نہیں ہے۔)

۲۔ (الف) وہ مدات آمدنی جو کلیتہً صوبجات کو دی گئی ہیں:۔

مالگذاری۔ شراب اور دیسی ادویہ کا محصول آبکاری۔ اسٹامپ کی آمدنی۔ جنگلات اور دیگر مدات کی آمدنی جن کا تعلق اب تک صوبجات سے رہا ہے۔

(ب) ٹرمنل ٹیکس کی آمدنی صوبجات کو دی گئی ہے مگر مرکزی حکومت کو اختیار دیا گیا ہے کہ اس پر اضافہ کر کے مزید رقم خود وصول کرے، لیکن اس قسم کا اضافہ ۱۲½ فی صدی سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔

... ...

ایک وفاقی عدالت بھی قائم کی جائے گی جو عند الضرورت دستوری قانون کی توضیح اور تاویل کر سکے اور مرکزی اور صوبجاتی اور ریاستی حکومتوں کے مابین اختلافی مسائل کا فیصلہ کر سکے۔ وفاقی عدالت ایک چیف جج اور چند ججان پر مشتمل ہو گی جن کا تقرر ملک معظم کی طرف سے ہو گا۔ اس عدالت میں صوبجاتی ہائی کورٹ کے فیصلوں کے خلاف مرافعہ بھی دائر کیا جا سکے گا۔

... ...

وزیر ہند کی کونسل آف انڈیا، اپنی موجودہ شکل میں نہ رہے گی اس لئے کہ "اس کی کوئی ضرورت آئندہ نہ ہوگی" مگر چونکہ وزیر کو بہر حال اپنے فرائض بطریق احسن انجام دینے کے لئے چند مشیروں کی ضرورت ہوگی اس لئے وزیر ہند کو اختیار دیا جائے گا کہ کم از کم تین اور زیادہ سے زیادہ چھ مشیر اپنی مدد اور مشورے کے لئے مقرر کرے۔

جہاں تک ملازمتوں کا تعلق ہے انڈین سول سروس، انڈین پولیس سروس، ریلوے، ڈاکخانہ اور کسٹم کی اعلیٰ اسامیوں پر تقررات، ترقی، تنزل اور برخاست کرنے کے اختیارات وزیر کو حاصل تھے اس لئے آئندہ بھی ان ملازمتوں کے حقوق کا تحفظ وزیر ہند کے سپرد کیا گیا ہے۔ انڈین سول سروس اور انڈین پولیس سروس کی اسامیوں پر تقرر آئندہ بھی وزیر ہند ہی کرے گا۔ باقی دیگر اسامیوں کا معاملہ ابھی زیر غور ہے۔

سرکاری ریلوں کا انتظام ایک بورڈ کے سپرد کیا جائے گا اور یہ بورڈ از روئے دستور اساسی قائم کیا جائے گا تاکہ مرکزی مجالس کی سیاست کا مضر اثر ریلوں کے تجارتی کاروبار پر نہ پڑے۔

... ...

یہ ایک مجمل خلاصہ ہے ہندوستان کے آئندہ نظام حکومت کے متعلق برطانوی حکومت کی تجاویز کا۔

ان تجاویز کا اب تک کسی حلقے سے خیر مقدم نہیں کیا گیا بلکہ ہر متعدد جماعت نے ان تجاویز پر اپنی مایوسی کا اظہار کیا ہے۔ ہندوستان کا مطالبہ تھا کہ خود مختار اور ذمہ دار حکومت قائم کی جائے اور برطانوی نمائندوں سے سمجھوتہ یہ ہوا تھا کہ صوبجات میں مکمل خود مختاری دی جائے مگر مرکز میں چند تحفظات کے ساتھ خود مختاری دی جائے گی اور وہ تحفظات بھی خالص اور صریحاً ہندوستان کے مفاد کے لئے ہوں گے' اسی سمجھوتے کی بنیاد پر گول میز کانفرنس منعقد ہوئی تھی لیکن تجاویز شائع ہوئیں تو تمہید ہی میں گذشتہ سمجھوتے کے اندر یہ لفظی ترمیم نظر آتی ہے کہ 'تحفظات' بجائے "صرف ہندوستان کے صریحی مفاد کے" "ہندوستان اور برطانیہ کے 'مشترکہ' مفاد کے لئے" تجویز کئے گئے ہیں۔ چنانچہ اگر وفاقی ذمہ دار حکومت قائم ہو بھی جائے (جس کی امید ایک مدت تک بظاہر نظر نہیں آتی) تو مجوزہ تحفظات کی بدولت نام کی بھی 'ذمہ دار' حکومت نہیں ہوگی بلکہ ایک انتہائی درجہ کی 'غیر ذمہ دار' شخصی اور مطلق العنان حکومت مرکز میں قائم ہو جائے گی جو صوبجات کی خود مختاری اور 'ذمہ داری' کو بھی خاک میں ملا دے گی۔

صوبجات میں دو عملی کا طریقہ ناکام ثابت ہو چکا ہے مگر اب اس کو دوبارہ مرکز میں آزمایا جا رہا ہے۔ گورنر جنرل اور گورنران صوبہ کی ضرب المثل مطلق العنانی جدید دستور کے نفاذ کے بعد علی آئین اور دستور کے مطابق ہو جائے گی۔ سول سروس اور انڈین پولیس سروس کو ذمہ دار وزرا کے تصرف اور اثر سے محفوظ رکھا گیا ہے تاکہ ان کی 'آہنی سیرت' میں آئندہ بھی کوئی لچک نہ پیدا ہو۔ ان اسامیوں کی ترقی اور تنزل کا اختیار وزیر ہند کے ہاتھ میں اس لئے دیا گیا ہے کہ اگر برطانوی اور ہندوستانی مفاد میں کوئی تصادم ہو تو یہ ملازمین برطانیہ کے ساتھ اپنی وفاداری کا ثبوت دیں اور حق نمک ادا کر سکیں۔

... ...

مرکزی حکومت کی مالیات کے اسی فی صدی حصے کا خرچ مطلق العنان گورنر جنرل کے ہاتھ میں ہوگا اور 'ذمہ دار' وزرا کو اس میں کوئی دخل نہیں دیا گیا ہے۔ باقی ۲۰ فی صدی جو 'ذمہ دار' وزرا کے ہاتھ میں دیا گیا ہے اس پر بھی گورنر جنرل کی کامل نگرانی رہے گی۔

حکومت کی تجاویز پر ایک نظر ڈالنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کو آئندہ کے لئے یہ قوی اندیشہ ہے کہ ہندوستان اور برطانیہ کے مفاد میں ہمیشہ تضاد رہے گا۔ اسی لئے برطانوی حکومت مجبور ہے کہ اپنے مفاد کے تحفظ کے لئے ہر قسم کے تحفظات دستور اساسی میں رکھے۔ ہندوستان کے دستور اساسی کی

ترتیب کی ذمہ داری ہندوستانیوں کی نا اہلی کی وجہ سے جب تک برطانوی حکومت پر ہے اس وقت تک "تحفظات" اختیارات خصوصی اور اختیارات تمیزی کی تلوار اسی طرح ہمارے سروں پر لٹکتی رہے گی اس سے نجات اسی وقت ملے گی جب ہندوستان خود اپنے آئندہ دستور اساسی کی تشکیل کے لئے تیار ہو جائے گا۔

ممالک غیر

انگلستان، امریکہ اور معیشت عالم

برطانیہ کے وزیر اعظم اور ریاستہائے متحدہ امریکہ کے صدر میں جو گفتگو آج کل ہو رہی ہے اس کے نتائج پر ساری دنیا کی آنکھیں لگی ہوئی ہیں۔ ناظرین کو یاد ہوگا کہ گذشتہ دسمبر میں جب انگلستان نے امریکہ کو قرضہ کی ایک قسط ادا کی تھی اس وقت ایک تحریر اس مضمون کی بھیجی تھی کہ اب ان اقساط کا ادا کرنا ممکن نہ ہوگا اور خود قرض خواہ کے لئے ان کی ادائیگی بہت مضر ثابت ہوگی۔ اس کا جواب امریکہ نے ۹ دسمبر کو دیا تھا اس میں یہ بات تسلیم کی تھی کہ "موجودہ کساد بازاری کے زمانے میں کہ ہر چیز کی قیمت بہت گھٹ گئی ہے اس قرض کا بوجھ قرض داروں کے لئے بہت بڑھ گیا ہے[1]" اور یہ بھی تسلیم کیا تھا کہ "اس مسئلہ کو دنیا کی معاشی حالت کے رو براہ لانے سے بہت گہرا تعلق ہے جس سے برطانیہ اور امریکہ دونوں کے اہم اغراض وابستہ ہیں۔" اس تحریر میں یہ بھی جتا دیا گیا تھا کہ صدر جمہوریہ آمادہ ہیں کہ "برطانوی حکومت سے مل کر سارے معاملے پر از سر نو غور کریں اور زر رائج اور شرح مبادلہ کو استوار بنانے، تجارت کو فروغ دینے اور قیمتوں کو بڑھانے کی تدابیر سوچیں" لیکن نیت یہ تھی کہ اس غور و جستجو کے معنی یہ نہیں کہ قرضہ بالکل

---

[1] ناظرین آسانی سے اس کو سمجھ لیں گے کہ اجناس کی قیمت گھٹنے سے قرضدار کا بوجھ کیسے بڑھ جاتا ہے۔ اجناس کی قیمت گھٹنے کے معنی ہیں کہ زر کی قیمت بڑھ گئی ہے۔ جس چیز کے لئے پہلے زیادہ روپیہ دینا ہوتا تھا اب کم روپے سے وہی چیز حاصل ہو سکتی ہے۔ اگر کسی کسان پر دس روپے قرض ہوں اور گیہوں کا نرخ ۱۰ سیر کا ہو تو وہ یہ قرض دو من گیہوں بیچ کر ادا کر سکتا ہے۔ لیکن اگر نرخ ۲۰ سیر ہو جائے تو اسی قرض کی واپسی کے لئے اسے پانچ من گیہوں بیچنے پڑیں گے۔ اس لئے قیمتوں کے گھٹنے سے قرضدار کا بوجھ بڑھتا اور قیمتوں کے بڑھنے سے اس کا بوجھ ہلکا ہوتا ہے۔

معاف کردیا جائے بلکہ ہونا یہ چاہئے کہ امریکی مال کے لئے منڈیاں پیدا کرکے اور اسلحہ کے مجنونانہ مقابلے کو بند کرکے اس کی تلافی کی جائے۔

امریکہ کے سابق صدر اور موجودہ صدر میں آئندہ طرز عمل کے متعلق اختلاف تھا۔ مسٹر ہوور چاہتے تھے کہ قرضہ جنگ اور دوسرے معاشی مسائل کو اسلحہ کے مسئلے سے وابستہ کردیں، مسٹر روزولٹ اسے مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ اب تمام مسائل پر کھلے دل سے گفتگو ہوگی اور ممکن ہے مسٹر میکڈانلڈ اور مسٹر روزولٹ کا تدبر اس معاشی گتھی کو سلجھانے کی کوئی تدبیر نکال سکے۔ دنیا کا بڑا حصہ چاہتا ہے کہ قرض کا یہ قصہ ختم ہی ہو تو اچھا۔ ذیل کے اعداد سے کچھ اندازہ ہوگا کہ قرض دار اب کہاں تک اس قرض کے بوجھ کو اٹھانے کے لئے تیار ہیں۔ جب پچھلی قسط واجب الادا ہوئی تھی تو مندرجہ ذیل قرض داروں نے ادائگی سے معذرت کی۔

۱. فرانس	۱۹,۲۶۱,۴۳۲,۵۰ ڈالر
۲. بلجیم	۲,۱۲۵,۰۰۰,۰۰ ڈالر
۳. پولینڈ	۳,۳۰۲,۹۸۰,۰۰ ڈالر
۴. ہنگری	۴۰,۷۲۹,۳۵ ڈالر
۵. استھونیا	۲۶۶,۳۷۰,۰۰ ڈالر

لیکن کیا امریکہ اپنا قرضہ معاف کردے گا؟ اس کے جواب کے لئے ذرا امریکہ کی موجودہ حالت پر نظر کرنی چاہیئے۔ خود مسٹر روزولٹ صدر جمہوریہ کا اندازہ ہے کہ ان کے ملک میں بے کاروں اور بے روزگاروں کی تعداد ۱۲ ملین ہے! قومی آمدنی میں تین سال کے اندر ۴۰ ہزار ملین ڈالر کی یعنی ۵۰ فی صدی کی کمی ہوگئی ہے!! پچھلے ڈھائی برس میں سرکاری میزانیے میں ۵۳۰۰ ملین ڈالر کا خسارہ ہو چکا ہے اور اس وقت ۱۲۰ ملین ماہانہ کے حساب سے اس خسارے میں اضافہ ہو رہا ہے!! شکاگو اور فلے ڈلفیا جیسے بلدیے دیوالہ نکال چکے ہیں۔ غیر منقولہ جائداد پر قرض اتنا بڑھ گیا ہے کہ اندازہ کرنا مشکل ہے؛ زرعی زمینیں رہن رکھ رکھ کر کسان ۱۲ ہزار ملین ڈالر سے کچھ زیادہ ہی قرض لے چکے ہیں اور ان کے مال کی قیمت اتنی گر گئی ہے کہ اس قرض کا بوجھ ۳۰ ہزار ملین ڈالر کے قرض کے برابر ہے۔ سرکاری امداد کے باوجود ۱۹۳۲ء میں ۱۴۰۰ بنکوں نے دیوالے نکالے اور اگر حکومت نے تقریباً ۸۰ کروڑ ڈالر بنکوں کی مدد کے لئے نہ نکالے ہوتے تو نہ جانے اور کتنے بنکوں کا یہی حشر ہوتا۔

ان نامساعد حالات نے عام طور پر تو اب تک امریکہ کو اس بات پر آمادہ کیا ہے کہ وہ باقی دنیا کے

جھگڑوں سے الگ تھلگ رہ کر اپنے خانگی مصائب کے دور کرنے کی تدبیر کرے اور انخلال نے معیشت عالم سے ایک بیزاری سی پیدا کردی ہے جو نہ دنیا کے لئے مفید ہے نہ خود امریکہ کے لئے۔ ان معاشی معاملات پر امریکہ کی رائے عامہ متحد نہیں ہے۔ بنک والوں اور معاشی ماہروں کا ایک چھوٹا سا گروہ ہے جو چاہتا ہے کہ امریکہ کو اب یوں رو ٹھنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ قرض پر اصرار کرنے سے اگر تجارت ختم ہوئی جاتی ہے اور دنیا کی معاشی حالت کے سدھرنے کا امکان نہیں رہتا جس کے بغیر امریکہ کی حالت کا درست ہونا بھی محال سا ہے تو بہتر اچھا ہے قرض کو ہی ختم کیا جائے۔ لیکن اس گروہ کا اثر امریکہ میں کچھ زیادہ نہیں۔

دوسرا گروہ جو خاصا با اثر ہے اور اہل سیاست نیز جرائد میں جس کے بہت سے حامی ہیں وہ کہتا ہے کہ دنیا کی زبوں حالی سے چشم پوشی کرنا نہ صحیح ہے نہ مفید۔ دوسرے ممالک کی بات ماننی چاہئے اور قرض داروں کا بار ہلکا کرنا چاہئے مگر اس کے عوض کچھ لینا بھی چاہئے۔ یہ لوگ "دے وانگبین" کی لاگ چاہتے ہیں، تاجر ہیں، سودا کرتے ہیں۔ اس کے سب سے بڑے نمائندے سابق صدر ہوور ہیں۔ اپنی آخری تقریروں میں سے ایک میں انھوں نے صاف صاف فرمایا تھا کہ "میں قرضوں کو یکسر منسوخ کرنے کا حامی نہیں میرا خیال ہے کہ امریکہ قرضے کی نقد واپسی کے معاملے میں جو بھی مزید قربانی کرے اس کی تلافی کسی اور طریقے سے دنیا کی منڈیوں میں ہونی چاہئے"۔

لیکن عام امریکن شہری قرض معاف کرنے کی تجویز کو تو سننا ہی نہیں چاہتا اور اس سودے کے بھی خلاف ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ یہ مسئلہ زیر بحث آیا اور یورپ کے شاطر سیاسی ہیں چل دے جائیں گے۔ قرض قرض ہے اور ادا ہونا چاہئے۔ یہی گروہ تعداد میں سب سے زیادہ ہے اور اگر جدید صدر معاشی حالات میں خوشگوار تبدیلی کے وسائل کی تلاش میں ہوں تو اسی اکثریت کو سمجھانا سب سے زیادہ دشوار کام ہوگا۔ مگر دنیا کی معاشی زبوں حالی اور خود امریکہ کی معاشی حالت دونوں انھیں مجبور کریں گی کہ کوئی نہ کوئی تدبیر نکالیں۔ اس لئے کہ یہ بات ثبوت کی محتاج نہیں رہی کہ اگر اس قرض کے معاملے میں امریکہ نے دوسرے ممالک کے ساتھ رعایت نہ کی تو آج نہیں تو کل ساری دنیا کا معاشی نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ ہمارا خیال ہے کہ امریکہ بادل ناخواستہ قرض داروں کے لئے بہت کچھ رعایتیں کرے گا، اپنے لئے کچھ رعایتیں منڈیوں میں حاصل کرے گا، پونڈ اور ڈالر میں غالباً کوئی شرح مبادلہ مستقل مقرر کردی جائے گی، زر رائج کی مقدار بڑھانے کیلئے قیمتوں کو بڑھانے کی تدابیر کی جائیں گی، چاندی کو غالباً پھر نظام زر میں دخل ہوگا، اور انگلستان اور امریکہ

کی متحدہ مساعی آئندہ عالمی معاشی کانفرنس میں معیشت عالم کو بہت کچھ سہارا دے سکیں گی۔

ہٹلر کا پروگرام | ہٹلر کے انتخاب کے متعلق ہم کسی پچھلی اشاعت میں لکھ چکے ہیں۔ اس زمانے میں اخبارات میں جرمنی کے متعلق بہت کچھ شائع ہوتا رہا۔ یہودیوں پر جو مظالم ہوئے اور ہو رہے ہیں ان کا حال سن کر ساری دنیا حیرت میں رہ گئی۔ یہودیوں نے ان مظالم کے خلاف جو بین الاقوامی قوتیں منظم کرنا چاہیں ان کا حشر بھی اچھا نہ ہوا اور ہٹلر کی جماعت نے یہودیوں کے معاملے کا ایسا سخت پروگرام پیش کیا کہ بالآخر یہودیوں نے گفت و شنید سے معاملے کو طے کرنا پسند کیا۔ ہٹلر کی پارٹی نے ان مظالم سے اپنے بے شمار وعدوں میں سے کم سے کم ایک تو پورا کر ہی دکھایا اور کچھ عرصے کے لیے اپنے ساتھیوں کو مطمئن کر دیا۔ ضمناً یہ فائدہ بھی ہوا کہ یہودیوں سے سمجھوتے کے معاوضے میں بڑی بڑی رقمیں وصول کر کے پارٹی کی مالی حالت کو زیادہ مستحکم کر لیا گیا تاکہ اگر پروگرام کے دوسرے حصوں کے نفاذ میں سرمایہ داروں سے اختلافات پیدا ہوں تو پارٹی کو روپے کی کمی بے بس یا کمزور نہ کر سکے۔

ہٹلر نے سیاسی زندگی میں اس تیزی سے ترقی کی ہے کہ ایک افسانہ سا معلوم ہوتا ہے اور ہر شخص اسے اپنے مذاق کے موافق سمجھتا ہے۔ ایسی حالت میں اگر اس کے مقاصد کو اس کی زبان ہی سے ادا کیا جائے تو بہتر ہے۔ صدر اعظم ہونے کے تھوڑے ہی دن بعد ہٹلر نے ایک بڑی معرکۃ الآرا تقریر میں اپنی حکومت کے مقاصد ۱۲ دفعات میں یوں بیان کیے تھے۔

(۱) ہمارے پروگرام کی پہلی دفعہ تو یہ ہے کہ ہم جھوٹ نہیں بولنا چاہتے! یہی وجہ ہے کہ میں نے ہمیشہ قوم کے سامنے آ کر بے سوچے سمجھے وعدے کرنے سے احتراز کیا ہے۔ تم میں سے کوئی میرے خلاف یہ شہادت نہیں دے سکتا کہ میں نے کبھی کہا ہے کہ ہماری قوم کی تعمیر نو صرف چند دنوں کا کام ہے۔ میں نے ہمیشہ یہی کہا ہے اور یہی کہتا ہوں کہ جرمن قوم کی حیات نو کا مسئلہ دراصل قوم کی داخلی قوت اور صحت کا مسئلہ ہے۔ جس طرح میں نے تقریباً ۱۴ برس اس تحریک کے لیے کام کیا ہے، یکسوئی اور استقلال کے ساتھ، ساتھیوں سے ان ۱۲ ملین تک پہنچنے کے لیے، اسی طرح اب ہم سب مل کر کام کریں گے جرمن قوم کو پھر سے زندہ کرنے کا۔ اور جس طرح آج مجھے اور میری تحریک کو جرمن سلطنت کی قیادت تفویض ہوئی ہے اسی طرح ہم اس جرمن سلطنت کو پھر زندگی اور بڑائی دے کر دنیا کی قیادت دلائیں گے اور اس مقصد سے کوئی چیز ہمیں

باز نہ رکھ سکے گی۔

(۲) دوسری بات یہ ہے کہ میں تم سے یہ وعدہ نہیں کرتا کہ قوم کی تعمیر نو کا یہ کام خود بخود ہو جائے گا۔ ہم تو اس کے لئے کام کریں گے ہی لیکن ساری قوم کو اس میں ہمارا ہاتھ بٹانا ہوگا۔ یہ کبھی یقین نہ کرنا کہ آزادی، خوش حالی، زندگی ہمیں یکایک آسمان سے مرحمت ہو جائیں گی۔ ان سب کی جڑ اپنا ارادہ اور اپنی محنت ہے۔

(۳) تیسرے یہ کہ اس سارے کام میں ہمارے لئے ایک حقیقت، ایک عقیدہ دلیل راہ ہوگا اور وہ یہ کہ کبھی پرائی مدد پر بھروسا نہ کرنا، کسی ایسے کی مدد پر جو ہماری اپنی قوم سے نہ ہو۔ جرمن قوم کا مستقبل بس خود ہم پر منحصر ہے۔ خود اپنے کام سے، خود اپنی مشقت سے، خود اپنے استقلال سے ہم ابھریں گے جس طرح دوسری قومیں اور ایک دفعہ خود جرمن قوم خود ابھری تھی۔

(۴) چوتھی بات یہ کہ زندگی کے آئین ہمیشہ ایک سے رہتے ہیں چنانچہ ہم اپنی قوم کی تعمیر نو کا کام بے جان نظریوں سے نہیں لیں گے جو کسی پردیسی کی کھوپڑی سے نکلے ہوں بلکہ ان ازلی قوانین کے مطابق اس کام کو کریں گے جو تجربہ اور تاریخ ہمیں بتلاتے ہیں اور جنھیں ہم خوب جانتے ہیں۔

(۵) اور ان قوانین کو ہم ایک پانچویں دفعہ میں یوں پیش کرتے ہیں: ہماری زندگی کی اساس دو عناصر پر ہے جن سے کوئی ہمیں محروم نہیں کرسکتا۔ نسل اور زمین، قوم اور ملک یہی دو چیزیں ہیں جن سے ہم قوت حاصل کریں گے اور انھیں پر اپنے فیصلوں کی بنیاد رکھیں گے۔

(۶) ہمارے جہاد کا مقصد اسی پانچویں دفعہ سے مشتق ہے یعنی اس قوم اور اس ملک کا قیام و بقا۔ اس قوم کی بقا اس علم کی بنا پر بس یہی ہماری زندگی کا مقصد ہو سکتا ہے۔ ہم محض تخیلات کے لئے زندہ نہیں رہتے، محض نظریوں کے لئے نہیں، سیاسی جماعتوں کے دور از کار پروگراموں کے لئے نہیں۔ نہیں، ہم تو جیتے ہیں اور مرتے ہیں جرمن قوم کے لئے، اس کے وجود کو برقرار رکھنے کے لئے، مستقبل میں اس کے جہاد حیات کی کامیابی کے لئے، اور ہمیں یقین ہے کہ اسی طریقے سے ہم اس چیز میں بھی مدد دے سکتے ہیں جسے دوسرے اتنا پیش پیش رکھتے ہیں یعنی امن عالم، کہ اس کے لئے پہلے مضبوط قوموں کی ضرورت ہے جو اس کی حفاظت کرسکیں! تمدن عالم، کہ اس کی بنیاد قوموں کے تمدن ہی پر ہو سکتی ہے؛ اور ایک عالمی معیشت، کہ اس کا تصور بھی اسی وقت ممکن ہے کہ قومی قومی معیشتیں اس کی حامل ہوں۔ ہم اپنی قوم سے شروع کرتے ہیں اور اسی طرح دنیا کی ترتیب نو میں مدد دے سکتے ہیں، کہ نظم و ترتیب عالم کی عمارت میں ہم خود ایک مضبوط پتھر نہیں۔

(۷) ہاں ایک بات اور۔ وہ یہ کہ چونکہ ہم اپنی قوم کی بقا اور اس کے جہاد زندگی کو کامیاب بنانا اپنا مقصد جانتے ہیں لہٰذا ہمیں اسباب زوال کو ہٹانا ہوگا اور قوم کے مختلف طبقوں میں صلح کرانی ہوگی اور یہ کام ہفتوں میں یا مہینوں میں نہیں ہوسکتا جب ۷۰ برس تک طبقاتی انتشار کی کوششیں جاری رہ چکی ہوں۔ ہاں یہ مقصد ہے جس سے ہم کبھی روگردانی نہ کریں گے، عملاً اس نئی جمعیت کی تعمیر میں کوشاں رہیں گے اور انتشار کے اسباب کو روکتے رہیں گے

(۸) ان طبقوں میں صلح کرا کر ہم آگے بڑھیں گے اور اس متحدہ قوم کو اس کی قوت کے اصلی منبع تک پہنچائیں گے اور تعلیم کے ذریعے اپنے بچوں کے ذہن میں خدا پر یقین اور اپنی قوم پر اعتماد پیدا کرائیں گے۔

(۹) پھر ہم آگے بڑھیں گے اور اس قوم کی عمارت جرمن کسان کے کندھوں پر کھڑی کریں گے کہ کسان ہی ہر قومی زندگی کی بنیاد ہے۔ میں جو جرمنی کے مستقبل کے لئے جہاد کر رہا ہوں تو مجھے لازماً جرمن زمین اور جرمن کسان کے لئے جہاد کرنا ہے۔ یہی ہمارے شہروں کی آبادی کے لئے آدمی دیتا ہے۔ یہی صدیوں سے ہماری قوت کا منبع ہے اور اس کی بقا لازمی ہے۔

(۱۰) اس کے بعد ہماری قومی زندگی کا دوسرا اہم عنصر ہمارے مزدور ہیں۔ وہ مزدور جو آئندہ اس قوم میں اجنبی کی طرح نہ رہیں گے جنہیں قوم پھر اپنے میں لے لے گی اور جن کے لئے سب دروازے کھل جائیں گے کہ وہ جرمن قوم کے مجاہد کی حیثیت سے جرمن جمعیۃ قومی میں شریک ہوسکیں۔

(۱۱) ہم جرمن قوم کی قوت ذہنی کو نشو و نما کے مواقع دیں گے، شخصیت کی قدر بڑھائیں گے اور فرد کی قوت تخلیق کو پھر اس کا ازلی حق دیں گے، زوال آمادہ جمہوریت کے مظاہر کا خاتمہ کر دیں گے اور ان کی جگہ اس حقیقت کو دیں گے کہ ہر بڑی چیز صرف انفرادی شخصیت کی قوت سے پوری ہوتی ہے اور ہر وہ چیز جسے باقی رکھنا ہے پھر انفرادی شخصیت کے سپرد کرنی چاہیے۔

(۱۲) اس پارلیمنٹی جمہوری نظام کی مخالفت سے ہمارے پروگرام کی بارہویں دفعہ نکلتی ہے یعنی اپنی قومی زندگی کو صاف ستھرا بنانا:

زندگی کے ہر شعبے میں ستھرائی، انتظام ملکی میں صفائی، سیاسی زندگی میں ستھرائی، تمدنی زندگی میں ستھرائی۔ ہم جرمنی کی عزت کو پھر سے قائم کریں گے۔ اپنے دلوں میں حریت کا جذبہ پیوست کریں گے، اپنی قوم کو حقیقی جرمن تمدن سے بہرہ یاب کریں گے، حقیقی جرمن موسیقی، حقیقی جرمن طرز تعمیر سے، حقیقی جرمن آرٹ سے کہ انھیں کے ذریعے ہماری روح ہمیں واپس ملے گی۔ ہم اپنی قوم کی عظیم الشان روایات کی تعظیم کرائیں گے، ماضی کے کاموں

کو اجاگر کریں گے، اپنی تاریخ کی بڑی بڑی شخصیتوں کی یاد تازہ کریں گے .... ہم اپنے نوجوانوں کے دلوں میں ان لوگوں کی عظمت پیدا کریں گے جنھوں نے ہماری قوم کی زندگی اور اس کے مستقبل کے لیے سب سے بڑی قربانی پیش کی تھی .... ہم نوجوانوں میں اپنی فوج کی عظمت پیدا کریں گے کہ یہ اس کی عزت کریں اور اسے جرمن قوم کا سب سے بڑا اظہار قوت سمجھیں .... لہذا یہ پروگرام گویا ہر شعبۂ زندگی میں احیار قومی کا پروگرام ہوگا، ہر اس چیز اور شخص سے بیزار جو قوم کے خلاف ہے، ہر اس کا دوست اور بھائی جو ہماری اور اپنی قوم کے احیار کے لئے کوشاں ہے۔"

ممالک اسلامی

ایران حکومت ایران اور اینگلو پرشین آئل کمپنی کے جھگڑے کا مختصر ذکر جنوری کے رسالے میں آچکا ہے قارئین کرام کو تفصیلی حالات معلوم کرنے کا شوق ہوگا۔ ۲۶ نومبر ۱۹۳۲ء کو ایرانی مجلس وزرا کا ایک جلسہ ہوا جس کی صدارت خود شاہ ایران نے فرمائی اور اس میں یہ طے ہوا کہ آئل کمپنی کو جو مراعات حاصل ہیں انھیں فسوخ کر دیا جائے۔ یہ ٹھیکا ۱۹۰۱ء میں ولیم۔ کے۔ ڈارسی کو ملا تھا۔ ایک قلیل نقد رقم اور سالانہ منافع کے ایک حصے کے بدلے میں ڈارسی کو یہ حق دیا گیا تھا کہ وہ پانچ شمالی صوبوں کے علاوہ تمام ایران میں مٹی کے تیل کی تلاش کرے، اسے نکالے اور اس تیل اور اس کی تمام مصنوعات کو جہاں چاہے لے جائے۔ دو برس کے بعد ان مراعات سے فائدہ اٹھانے کے لئے ایک کمپنی قائم ہوئی اور ۱۹۰۹ء میں "اینگلو پرشین آئل کمپنی" نے ڈارسی سے تمام حقوق حاصل کر لئے۔

۱۹۱۳ء میں کمپنی کو مزید سرمایے کی ضرورت ہوئی۔ اس وقت تک حکومت برطانیہ کو بھی اپنی بحری فوج کے لئے تیل کی کثیر مقدار کے حاصل کرنے کی ضرورت کا احساس ہو چکا تھا۔ اس لئے حکومت نے اتنا سرمایہ فراہم کر دیا کہ کمپنی کے بیشتر حصے اس کے ہاتھ میں آگئے۔ یہ اندازہ کیا گیا ہے کہ ۱۹۲۳ء تک حکومت برطانیہ نے اس سرمایے کا سہ چند پا لیا جو اس نے اس کمپنی میں لگایا تھا۔ اس دوران میں پیداوار میں بہت اضافہ ہو گیا ۱۹۲۱ء کے ۲۱۰ لاکھ ٹن کے مقابلے میں ۱۹۲۷ء میں پیداوار ۴۰ لاکھ ٹن اور ۱۹۲۹ء میں ۵۹ لاکھ ٹن ہوئی۔ اس کے بعد کمی شروع ہوئی چنانچہ ۱۹۳۰ء میں پیداوار ۵۰۷ لاکھ ٹن ہوئی۔ اسی کے ساتھ ساتھ قیمتیں بھی کم ہو گئیں اور اس طرح نفع صرف ۸۰ لاکھ ڈالر رہ گیا۔

ایرانی حکومت کا حصہ کمپنی کے نفع میں ۱۶ فی صدی ہے۔ ۱۹۲۱ء میں اسے تیس لاکھ ڈالر ملے تھے۔ ۱۹۲۶ء میں یہ رقم بڑھ کر ۷۵ لاکھ ڈالر ہوگئی۔ ۱۹۳۰ء میں ۴۵ لاکھ ڈالر ملے لیکن ۱۹۳۱ء میں ۱۰ لاکھ ڈالر سے زیادہ حکومت ایران کو نہیں ملے اور یہی کمی ۱۹۳۲ء میں بھی جاری رہی۔ اس کمپنی کو بوجہ ایک برطانوی کمپنی ہونے کے حکومت برطانیہ کو ایک بڑی رقم محصول آمدنی کی صورت میں ادا کرنی پڑتی ہے۔ ۱۹۳۱ء میں یہ رقم تقریباً سہ چند تھی اس رقم کی جو حکومت ایران کو منافع کی صورت میں ملی تھی۔ اس طرح نہ صرف یہ کہ حکومت ایران کی آمدنی میں ایک بڑی رقم کی کمی پڑ گئی بلکہ یہ بھی ظاہر ہوگیا کہ ایک ایسے کاروبار سے جو ایران کی سرزمین پر کیا جاتا ہے اور وہ بھی ایران کی فطری دولت کے بل بوتے پر اس سے خود حکومت ایران کے مقابلے میں حکومت برطانیہ کو زیادہ نفع حاصل ہوتا ہے۔

کچھ عرصہ ہوا ایرانی حکومت نے کمپنی سے معاہدے پر نظر ثانی کرنے کی بابت گفت و شنید شروع کی تھی اور اس کی وجہ یہ بتائی تھی کہ ۳۰ برس میں حالات بالکل بدل گئے ہیں کمپنی کے ارباب حل و عقد نے اسے منظور کیا اور ایک سال ہوا دوسرا معاہدہ ہونے والا ہی تھا کہ گفت و شنید جاری نہ رہ سکی۔ ایران کے وزیر مالیات نے ٹھیکے کی منسوخی کا باقاعدہ اعلان کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ حکومت ایک ایسا نیا معاہدہ کرنے پر آمادہ ہے "جس کی بنیاد دونوں فریق کے حقوق پر ہو۔"

ایرانی حکومت کی اس کارروائی سے انگلستان میں ہل چل مچ گئی۔ ایرانی تیل سے متعلق تمام برطانوی حقوق کے چھن جانے سے برطانوی بحری فوج کے لئے بڑی مشکلات پیدا ہو جائیں گی اگرچہ ان مشکلات میں ان حقوق کی وجہ سے جو برطانیہ کو عراق میں حاصل ہیں کچھ کمی ضرور ہو جائے گی۔ بظاہر تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ حکومت ایران کو ایسی یک طرفہ کارروائی کا حق نہیں حاصل تھا اور اس نے ایک ایسا معاہدہ منسوخ کر دیا جس کی میعاد ابھی تیس سال تک باقی ہے۔ لیکن بین الاقوامی مناقشات کا فیصلہ اسی آسانی اور سادگی سے نہیں کیا جاسکتا جس سے دو اشخاص کے باہمی جھگڑے طے کئے جاسکتے ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ قابل لحاظ ایرانی قوم کی ذہنی کیفیت ہے۔ یہ قوم ان تمام دیرینہ قیود سے آزادی چاہتی ہے جو گذشتہ حکومت کے زمانے میں ایران پر کسی طرح بھی عائد ہو گئے تھے۔ اس کے علاوہ انگلستان کے خلاف جذبات میں کچھ غیر معمولی جوش نظر آتا ہے جس کا اظہار اس واقعے سے بھی ہوتا ہے کہ حکومت ایران نے برطانوی ہوائی جہازوں کو اپنی سرزمین پر اڑنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔

۲۷ دسمبر ۱۹۵۱ء کو حکومت برطانیہ نے اینگلو پرشین آئل کمپنی کی طرف سے ٹھیکے کی منسوخی پر باقاعدہ سرکاری طور سے احتجاج کیا۔ اس کے جواب میں حکومت ایران نے اپنے حقوق کا اعادہ کیا اور یہ بھی اعلان کیا کہ کمپنی کی جائداد کو اگر اس زمانے میں کوئی نقصان پہنچے گا تو حکومت اس کی ذمہ دار نہ ہوگی۔ اس اعلان کے خلاف برطانوی دارالعوام میں ۵ دسمبر کو نائب وزیر امور خارجہ نے بہت سخت تقریر کی اور اس میں کہا کہ برطانوی حکومت کمپنی کی جائداد یا کاروبار کے کسی نقصان کو برداشت نہیں کر سکتی اور وہ کمپنی کے مفاد کی حفاظت کے لئے تمام جائز طریقوں سے کام لے گی۔ اس کے بعد ۸ دسمبر کو یہ اعلان ہوا کہ حکومت برطانیہ اس معاملے کو عدالت عالم کے سامنے پیش کرے گی اور اس دوران میں تمام جائداد کی حفاظت کی ذمہ دار حکومت ایران ہوگی۔ اگر حکومت ایران حفاظت نہ کر سکے گی تو حکومت برطانیہ خود حفاظت کی تدابیر اختیار کرے گی۔

حکومت برطانیہ کی اس مداخلت پر ایران میں بہت خفگی کا اظہار کیا گیا اور تین دن کے غور و فکر کے بعد مجلس وزرا نے جس کی صدارت خود شاہ ایران نے کی تھی حکومت برطانیہ کی تحریر کا جواب دیا۔ اس جواب میں ٹھیکے کی منسوخی کے ۹ وجوہ گنائے گئے تھے اور عدالت عالم کے حق سماعت کی اس بنا پر تردید کر دی گئی تھی کہ یہ جھگڑا ایک حکومت اور ایک نجی کمپنی کے درمیان ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ حکومت ایران نے یہ بھی ظاہر کیا کہ وہ جمعیت اقوام کے سامنے حکومت برطانیہ کی دھمکی اور دباؤ کی شکایت پیش کرے گی۔ ۱۴ دسمبر کو حکومت برطانیہ نے خود ہی اس قضیے کو جمعیت اقوام کی مجلس کے سامنے پیش کیا اور اس طرح عدالت عالم سے رجوع کرنے کے خیال کو ترک کر دیا۔ ۱۵ دسمبر کو ایرانی پارلیمنٹ کے ایک مباحثے کے دوران میں وزیر امور خارجہ نے یہ بیان کیا کہ حکومت ایران کی یہ کارروائی نہ تو حکومت برطانیہ کی مخالفت پر مبنی ہے اور نہ کسی غیر ملکی شخص یا جماعت کی مخالفت پر بلکہ ایرانی قوم اپنے حقوق کو حاصل کرنا چاہتی ہے اور ان کے حاصل کرنے کے لئے وہ ہر ممکن طریقہ اختیار کرے گی۔ حکومت ایران نے نظامت جمعیت اقوام سے یہ درخواست بھی کی کہ مجلس کی نشست ملتوی کر دی جائے تاکہ ایرانی نمائندوں کو تیاری کرنے اور جنیوا پہنچنے کا موقع مل سکے۔ ۱۹ دسمبر کو مجلس میں اس مسئلے پر کچھ ابتدائی گفتگو ہوئی اور عارضی طور پر ۲۴ جنوری بحث و مباحثے کی تاریخ مقرر کی گئی۔

۲۰ دسمبر کو ایرانی پارلیمنٹ نے ٹھیکے کی منسوخی کی تصدیق کی حسین خاں علائی جو پہلے امریکہ اور فرانس میں ایرانی سفیر رہ چکے ہیں اور جو ایران کے بہترین مدبر سمجھے جاتے ہیں ایرانی وفد کی سرکردگی کے لئے منتخب ہوئے۔ وزیر امور خارجہ نے اپنی تقریر میں کہا کہ حکومت برطانیہ کی مداخلت بے جا کی وجہ سے ایرانی حکومت اور اینگلو پرشین کمپنی میں کوئی

دوستانہ سمجھوتا نہ ہوسکا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ حکومت ایران نے کسی خارجی اثر سے متاثر ہو کر اس ٹھیکے کو منسوخ نہیں کیا ہے
اور نہ ایرانی قوم کمپنی کی جائداد کو غصب کرنا چاہتی ہے بلکہ وہ تو صرف منافع میں سے اپنا واجبی حصہ لینا چاہتی ہے۔

یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ اسی دن جب کہ وزیر امور خارجہ نے ان معتدل خیالات کا اظہار کیا ایرانی پارلیمنٹ
نے ترکی سے دوستی اور غیر جانبداری کے ایک معاہدے کی تصدیق کی اور اٹلی سے جنگی جہاز اور جرمنی سے فوجی طیارے منگانے کا فیصلہ کیا

مجلس جمعیت اقوام کے سامنے ۲۶ جنوری کو سر جان سائمن برطانوی وزیر امور خارجہ اور مرزا علی اکبر خاں داور ایرانی وزیر عدل
کے درمیان اینگلو پرشین آئل کمپنی کے قضیے پر ایک دلچسپ مباحثہ ہوا۔ سر جان سائمن کا دعویٰ تھا کہ مراعات کی منسوخی ناجائز ہے
اور اس وقت تک کوئی گفت و شنید نہیں ہوسکتی جب تک حکومت ایران حکم منسوخی کو واپس نہ لے لے۔ ایرانی مقرر نے
یہ کہا کہ مجلس کو اس مسئلے کی سماعت کا اختیار ہی نہیں ہے اور نظیر میں خود حکومت برطانیہ کے رویے کو پیش کیا جو اس نے
فنستان کے خلاف ایک قضیے میں جو جہازرانی سے متعلق تھا اختیار کیا تھا۔ اس موقع پر حکومت برطانیہ نے یہ دلیل
پیش کی تھی کہ فنستان نے برطانوی قانون کے مطابق خود انگلستان میں پوری چارہ جوئی نہیں کی تھی۔ داور نے کہا
کہ اسی طرح اس موجودہ مسئلے میں اینگلو پرشین آئل کمپنی نے ان تمام مواقع سے فائدہ نہیں اٹھایا تھا جو اسے ایرانی
عدالتوں میں حاصل تھے۔ سر جان سائمن نے جواب دیا کہ ایرانی عدالتوں میں چارہ جوئی سے کیا فائدہ جب خود
ایرانی پارلیمنٹ نے منسوخی کی تصدیق کر کے ایک ایسا قانون نافذ کر دیا جس کی پابندی ایرانی عدالتوں پر فرض ہے۔
ایرانی وزیر نے اس کا یہ جواب دیا کہ ایرانی پارلیمنٹ کی تصدیق سے محض اظہار اعتماد مقصود تھا اور عدالتوں کے
اختیارات پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اس کے بعد مجلس کی نشست اس لئے ملتوی ہوگئی کہ فریقین کو باہمی گفت و
شنید کا موقع دیا جائے۔ اس سلسلے میں چیکوسلوواکیا کے وزیر امور خارجہ نے بہت مدد کی اور بالآخر ۳۰ جنوری کو یہ
اعلان کیا گیا کہ ایک عارضی سمجھوتا ہوگیا ہے۔

اس سمجھوتے کی دفعات یہ ہیں کہ برطانوی اور ایرانی حکومتیں اپنے قانونی حقوق کو محفوظ رکھتی ہیں لیکن
فی الحال مجلس جمعیت اقوام کے سامنے اس مسئلے کے فیصلے پر اصرار نہیں کرتیں اور اسے آئندہ مئی تک ملتوی کرتی ہیں۔
اس درمیان میں کمپنی حکومت ایران سے نئے مراعات حاصل کرنے کی غرض سے فوراً گفت و شنید شروع کرے گی۔ کمپنی
اس زمانے میں اپنا کاروبار جاری رکھے گی۔ اگر گفت و شنید ناکامیاب ثابت ہوئی تو یہ مسئلہ پھر مجلس کے سامنے پیش ہوگا۔

شذرات

پچھلے مہینے جامعہ ملیہ کے دائرے کے ایک رکن محمد عثمان صاحب اپنے عزیزوں اور رفیقوں کو داغ جدائی دے گئے۔ مرحوم مدرسہ تحتانیہ کے معلم اور بچوں کے دار اقامہ کے نگراں تھے اور اپنے احساس فرض، ذوق عمل اور حسن اخلاق کی بدولت جامعہ کے اساتذہ اور طلبہ میں حقیقی معنی میں ہر دل عزیز تھے۔ ان کا جوش اور خلوص ان کے شاگردوں اور رفیقوں کے لئے نمونے کا کام دیتا تھا۔ کسی ضروری کام سے رخصت پر گھر تشریف لے گئے تھے۔ وہاں یکایک نمونیا میں مبتلا ہوئے اور دو تین دن کے اندر انتقال کر گئے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ہمیں مرحوم کی والدہ ماجدہ اور دوسرے اقربا سے دلی ہمدردی ہے اور ہم صمیم قلب سے دعا کرتے ہیں کہ خدا مرحوم کی مغفرت کرے اور ان کے عزیزوں، رفیقوں اور شاگردوں کو اس صدمۂ جانکاہ میں صبر عطا فرمائے۔ جامعہ کے ایک استاد نے مرحوم کی تاریخ وفات کہی ہے جو حسب ذیل ہے:

عثماں کہ نسبتش بہ محمدؐ قریب بود — با فرط شوق خود بہ جوار نبی شتافت

پرسید سال رحلت او دل ز فکر من — "مرحوم شد محمد عثماں" جواب یافت

۱۳۵۱ھ

اپریل میں جامعہ کو ڈاکٹر سر محمد اقبال، عبد اللہ یوسف علی صاحب اور مولانا سید سلیمان ندوی کے خیر مقدم کا شرف حاصل ہوا۔ ایسے بزرگوں کی تشریف آوری ہم لوگوں کی نظر میں وہی قدر رکھتی ہے جو دوسروں کے نزدیک ارباب جاہ و حکومت کے نزول اجلال کو حاصل ہے۔ مدرسہ عام معاشرے کا ایک ادارہ ہے اور اس کے ساتھ بے شمار رشتوں سے مربوط ہے۔ مدرسے کے اساتذہ اور طلبہ کو معاشرے کے نمائندوں یعنی مشاہیر قوم کی زیارت اور ان کی صحبت کے فیض سے بصیرت اور ہدایت کے علاوہ برکت اور تقویت بھی حاصل ہوتی ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ ان مشاہیر میں سب سے زیادہ عقیدت مدرسے کے طلبہ اور اساتذہ کو ارباب علم و فضل سے ہونا چاہیے کیونکہ ان کی اقلیم کے حکمراں یہی لوگ ہیں۔ بےشک اراکین سلطنت کا احترام بھی ایک قدرتی جذبہ ہے مگر اسی ملک میں جہاں سلطنت قومی اور ملکی ہو۔ ہندوستان میں تو یہ جذبہ عموماً اعلیٰ مقاصد کی جگہ ادنیٰ اغراض پر مبنی ہوتا ہے۔ سچے دل سے اگر قدر ہوتی ہے تو انہیں حضرات کی جو ذاتی جوہر رکھتے ہیں اور اپنے ملک و قوم کی خدمت میں صرف کرتے ہیں۔

مولانا سید سلیمان صاحب ابتدا سے جامعہ پر نظر عنایت رکھتے ہیں اور پہلے بھی کئی بار تشریف لاکر ہم سب کو اپنے بزرگانہ اخلاق سے گرویدہ کر چکے ہیں۔ اس مرتبہ آپ اردو اکادمی کی دعوت پر تشریف لائے تھے اور ۱۱ اپریل کے جلسے میں آپ نے "مسلمانوں کی آیندہ تعلیم" کے موضوع پر ایک فاضلانہ خطبہ ارشاد فرمایا جس میں عام تمدنی اور خاص مذہبی اور اخلاقی نقطۂ نظر سے موجودہ تعلیم پر تنقید تھی اور اس کی اصلاح کی صورتیں بتائی گئی تھیں۔ موصوف کے خیالات اس بحث پر بہت بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ جمہور ملت کی تمدنی اور تعلیمی ضروریات کا جو اندازہ آپ کر سکتے ہیں وہ محکمۂ تعلیم کے افسر یا فن تعلیم کے ماہر ہرگز نہیں کر سکتے کیونکہ ان حضرات کو نہ عام مسلمانوں کی معاشرتی حالت کے مطالعے کی طرف توجہ ہے اور نہ اس کا موقع حاصل ہے۔ ہم اس خطبے کو مئی اور جون کے جامعہ میں شائع کریں گے اور اس کے بعد بہت جلد یہ علیحدہ رسالے کی صورت میں چھپ جائے گا۔

اس سال یہ اردو اکادمی کا پہلا جلسہ تھا کیونکہ جنوری اور فروری میں رمضان کی وجہ سے کوئی جلسہ نہیں ہو سکا اور مارچ میں ہمارے اور کل قوم کے معزز مہمان حسین رؤف بے صاحب کے لکچر ہوتے رہے۔ اب انشاء اللہ اگست سے دسمبر تک ہر مہینے جلسے ہوں گے اور اس کمی کی پوری طرح تلافی ہو جائے گی۔

علامہ اقبال جامعہ سے ہمیشہ ہمدردی فرماتے رہے ہیں چنانچہ ۱۹۲۶ء میں جامعہ کی امداد کے لئے قوم سے جو اپیل کیا تھا اس پر صرف پانچ چھ بزرگوں کے دستخط تھے جن میں علامہ موصوف بھی شامل تھے۔ مگر ہم لوگوں کی بدقسمتی سے آپ کو ابھی تک جامعہ میں تشریف لانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ پچھلے مہینے کے آغاز میں آپ ایک دن چائے کی دعوت میں تشریف لائے اور اس کے بعد لاہور سے زحمت سفر اٹھا کر خاص اس غرض سے دہلی آئے کہ رؤف بے صاحب کے دوسرے لکچر میں صدارت فرمائیں اور چونکہ تیسرے لکچر کے صدر ڈاکٹر سپرو صاحب تشریف نہیں لا سکے اس لئے اس میں بھی آپ ہی نے مسند صدارت کو زینت بخشی۔ اسی زمانے میں جامعہ کے طلبہ اور اساتذہ کی التجا پر آپ نے وعدہ فرمایا کہ تھوڑے ہی دن کے بعد پھر تشریف لاکر اہل جامعہ کو اپنی تقریر سے مستفید فرمائیں گے۔ ۵ اپریل وہ مبارک تاریخ تھی جب آپ نے اس وعدے کا ایفا کیا۔ ۵ بجے شام کو آپ نے جامعہ کی انجمن اتحاد کا سپاسنامہ قبول فرمایا اور اس کے جواب میں محبت اور شفقت کے جو کلمے ارشاد کئے وہ ہم لوگوں کے دل سے کبھی محو نہ ہوں گے۔ اس کے بعد ۹ بجے شب کو آپ نے اپنے سفر یورپ کے حالات پر تقریر

فرمائی جس کا عنوان آپ نے "لندن سے غرناطہ تک" قرار دیا تھا۔ اس کے سب سے دلچسپ حصے دو تھے۔ ایک وہ جس میں آپ نے فرانس کے مایۂ ناز فلسفی برگساں سے اپنی ملاقات کا ذکر کیا دوسرا وہ جس میں آپ نے جدید اسپین کے حالات بیان فرمائے خصوصاً اس رجحان پر روشنی ڈالی جو وہاں کے باشندوں کو آج کل اسلامی تمدن کی طرف ہے۔ آپ کے خیال میں جو لوگ تہذیب اور معارف اسلام کی تاریخ کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں ان کے لئے اسپین میں جا کر رہنا ناگزیر ہے اور انھیں وہاں کی حکومت اور وہاں کے ارباب علم سے ہر طرح کی مدد ملے گی۔

علامہ موصوف کی صحبت سے تھوڑے عرصے میں [illegible] کے سبب [illegible] ذاتی روابط جو جامعہ کے بہت سے استاد اور طالب علم آپ سے رکھتے تھے اور گہرے ہوگئے اور جماعتی حیثیت سے اس قومی ادارے سے آپ کا رشتہ تعلق اور مستحکم ہوگیا۔ امید ہے کہ آئندہ آپ جب کبھی دہلی تشریف لائیں گے تو جامعہ کو اپنا گھر سمجھ کر یہیں قیام فرمائیں گے اور ہمیں خدمت اور استفادے کا موقع دیں گے۔

عبداللہ یوسف علی صاحب نائب شیخ الجامعہ کی دعوت پر تشریف لائے اور آپ نے نہایت غور سے جامعہ کے ہر شعبے کو دیکھا اور ہر چیز کے متعلق بہت تفصیل سے سوالات کئے۔ آپ کا یہ معائنہ خالص تنقیدی نظر سے تھا اور اس میں رعایت کو بہت کم دخل تھا۔ شکر ہے کہ اس کا نتیجہ ہمارے حسب مراد نکلا اور آپ نے ہر طرح اطمینان اور استحسان کا اظہار فرمایا۔ اس وقت آپ دہلی میں مزید قیام نہیں کر سکتے تھے اس لئے جامعہ میں کوئی تقریر نہ کر سکے مگر آپ نے وعدہ فرمالیا ہے کہ موسم سرما میں یورپ سے آنے کے بعد ہم لوگوں کو اپنے خطبے سے مستفید کریں گے۔

جن حضرات کو اردو زبان کی اشاعت اور ترقی کی فکر ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ طباعت اور رسم خط کا مسئلہ کتنی زبردست اہمیت رکھتا ہے۔ ان سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ پتھر کی چھپائی زمانے کی ضروریات کو پورا نہیں کر سکتی اور اگر اردو زبان کو دوسری زبانوں کا مقابلہ کرنا ہے تو ٹائپ کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ نسخ کا ٹائپ اردو میں مدت سے موجود ہے مگر وہ مقبول نہیں ہوا کیونکہ نستعلیق کی دلکشی ہماری نظروں اور دلوں کو اس قدر مسحور کر چکی ہے

کہ سوائے اس کے کوئی خط ہیں ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ مدت سے حکومت حیدرآباد کی سرپرستی میں نستعلیق ٹائپ بنانے کی کوشش ہو رہی ہے اور اس میں بہت کچھ کامیابی بھی ہو چکی ہے مگر ابھی وہ ٹائپ جو حیدرآباد میں بنا ہے تجارتی حیثیت سے گراں پڑتا ہے اور اسے عام رواج حاصل نہیں ہو سکتا۔ ہمیں یہ معلوم کرکے نہایت مسرت ہوئی کہ ایس اے قریشی صاحب جو طباعت خصوصاً ٹائپ سازی کے ماہر ہیں اور مدتوں سے اس مسئلے کی تحقیق علمی اصول پر کر رہے ہیں ایسا ٹائپ بنانے میں کامیاب ہو گئے ہیں جو خوبصورت اور دیدہ زیب بھی ہے اور اسی کے ساتھ ان شرائط کو بھی پورا کرتا ہے جو تجارتی حیثیت سے کامیاب ہونے کے لئے ضروری ہیں۔ چنانچہ انھوں نے اس ٹائپ کو طیار کرنے کے لئے ایک کارخانہ "قابل اطمینان نستعلیق ٹائپ فاؤنڈری" کے نام سے قرول باغ دہلی میں کھولا ہے اور اس کارخانے کو چلانے کے لئے ایک کمپنی ایک لاکھ روپے کے سرمایے سے قائم کی ہے جس کے حصے دس دس روپے کے رکھے گئے ہیں۔ ہم نے قریشی صاحب سے گفتگو کرنے کے بعد اس امر کا پورا اطمینان کر لیا ہے کہ قریشی صاحب اس فن کے ماہر ہیں اور نہایت محنت اور صبر کے ساتھ علمی اور عملی اصول پر کام کرتے ہیں اس لئے ہمیں قوی امید ہے کہ ان کا بنایا ہوا ٹائپ فنی حیثیت سے مکمل ہو گا۔ البتہ اس پر رائے دینے کے ہم اہل نہیں ہیں کہ نستعلیق ٹائپ کو تجارتی حیثیت سے کہاں تک کامیابی حاصل ہو سکتی ہے اور اس کمپنی کا نظم و نسق کیسا ہے۔ بہرحال ہم ان سب حضرات سے جنھیں اردو زبان کی بقا اور ترقی منظور ہے پر زور سفارش کرتے ہیں کہ قریشی صاحب سے مل کر یا خط و کتابت کے ذریعے اس کمپنی کے متعلق اپنا اطمینان کر لیں اور پھر اس کے حصے خود بھی خریدیں اور اپنے دوستوں کو بھی خریداری پر آمادہ کریں۔ زبان کی سچی خدمت کا یہ نہایت عمدہ ذریعہ ہے۔

شاعری کے قدردانوں، تاریخ اسلام کے شائقوں بلکہ ان لوگوں کو جو اسلام کے نام لیوا ہیں یہ سن کر مسرت ہو گی کہ حضرت حفیظ جالندھری کے شاہنامۂ اسلام کی دوسری جلد بھی طیار ہو گئی ہے اور عنقریب شائع ہونے والی ہے۔ یہ جلد بھی دو ہزار اشعار پر مشتمل ہے اور اس میں جنگ بدر، فتح مکہ اور اس کے بعد کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔ پہلی جلد کو جو قبول عام حاصل ہوا وہ شائد ہندوستان میں اس صدی کی بہت کم کتابوں کو نصیب ہوا ہو گا۔ گھر گھر یہ کتاب پہنچ گئی ہے۔ بچے بچے کی زبان پر اس کے شعر ہیں۔ لوگ اسے جلسوں میں سناتے ہیں، چھوٹے چھوٹے حلقوں میں پڑھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ علاوہ شاعرانہ خوبیوں کے اس کا ہر شعر جوش اور خلوص میں ڈوبا ہوا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ دوسری جلد بھی ہاتھوں ہاتھ لی جائے گی تاکہ مصنف کو اس سلسلے

کی تکمیل کا حوصلہ ہو کتاب کے معمولی ایڈیشن (غیر مجلد) کی قیمت تین روپے اور خاص ایڈیشن (مجلد منقش مطلا) کی قیمت ساڑھے بارہ روپے ہے۔ کتب خانہ شاہنامۂ اسلام، انار کلی، لاہور سے مل سکتی ہے۔

اس مہینے ملک و ملت کے سر سے ایک ایسے بزرگ کا سایہ اٹھ گیا جس کا نظیر زمانہ بڑی مشکل سے پیدا کرے گا۔ سید حسن امام مرحوم کی ذات میں علم و فضل، جاہ و مرتبت، دولت و سطوت کے علاوہ حب وطن اور درد قوم کی صفات بھی بدرجہ اتم موجود تھیں اور ملک کا ہر طبقہ آپ کے تدبر اور خلوص کا معترف تھا۔ سیاست میں آپ شہریت پسندانہ پالسی پر عامل رہے۔ چنانچہ نیشنل کانگریس کی صدارت پر بھی فائز ہوئے۔ آخر میں آپ سیاسی معاملات سے علیحدہ رہتے تھے مگر پھر بھی آپ کی ہمدردی اور آپ کے مشورے سے قومی تحریک کو قابل قدر مدد ملتی رہتی تھی۔ آپ کی وفات ساری قوم اور سارے ملک کے لئے نہایت سخت حادثہ ہے اور آپ کے عزیزوں خصوصاً والد بزرگوار اور صاحب زادوں کے لئے تو ایسی جاں کاہ مصیبت ہے جس کے برداشت کرنے کی قوت خدا ہی دے سکتا ہے، بندوں کے حد اختیار بلکہ حد خیال سے باہر ہے۔ ہم دل سے مرحوم کی مغفرت اور پسماندگان کی تسکین کی دعا کرتے ہیں۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

علی گڑھ میگزین

مدیر

آل احمد سرور بی اے ایس سی

علی گڑھ میگزین نہ صرف طلبا کے تمام رسائل پر یک گونہ فوقیت رکھتا ہے بلکہ اردو کے اور رسائل میں بھی اسے ایک امتیازی درجہ حاصل ہے کیونکہ مشرق و مغرب کے قران اسعدین کا بہترین نمونہ یہی ہے بصیرت افروز مقالے اور اعلیٰ ترین تنقیدیں اسکی زینت ہوتی ہیں مغربی زبانوں سے بہترین تراجم برابر درج ہوتے رہتے ہیں اور اردو کے تمام ممتاز شعراء کا کلام شائع ہوتا رہتا ہے۔

اگر دنیائے ادب میں علی گڑھ کی ترقی دیکھنا ہو تو علی گڑھ میگزین ملاحظہ فرمائیے قدیم طلباء کے لئے مادر کالج کی یاد تازہ کرنے کے لئے اس سے اچھا پرچہ نہیں۔

علم و ادب کے شائقین ضرور اس کے خریدار بنیں۔ سالانہ چندہ ساڑھے تین روپے معہ محصول جس میں سالنامہ بھی شامل ہے نمونے کا پرچہ ۸

مینجر علی گڑھ میگزین مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

ادب

سیر المصنفین قیمت ـ/۵ — اردو کے تمام مصنفین اور نثر نگاروں کے حالات ادب اردو کی دل پسند تاریخ۔

کیمیا گر قیمت ـ/۸ — چند مختصر افسانوں کا مجموعہ۔ پڑھنے والوں کو ان افسانوں میں اپنی زندگی کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور نظر آئے گا۔

نیرنگ قیمت ۱۲/ — بارہ اُدبی مضامین اور ایک تاریخی ڈرامہ ہے۔ ان مضامین میں ضمیر کی آواز، جستجو نے مسرت قابل ذکر ہیں۔

مضامین رسالہ جوہر قیمت ـ/۸ — جامعہ ملیہ کا قلمی رسالہ جوہر کا مجموعہ۔

لیلۃ القدر قیمت ـ/۱ — مولینا ابو الکلام آزاد کا ایک مضمون ہے۔

دیوان غالب (جرمنی) قیمت ۱۲/ — اس میں غالب کا خود نوشتہ مقدمہ غزلیات، قصائد، اور رباعیات ہیں۔ بیاض کے لئے نفیس حاشیہ دار سادہ اوراق شامل ہیں، خوبصورت جلد ہے پہلے اس کی قیمت للعہ روپے رکھی

مرقع غالب (جرمنی) قیمت ـ/۸ — آپ کے کمرہ کی زینت کے لئے، ایک عمدہ جز ہے۔ غالب مرحوم کی سہ رنگی تصویر جرمن ہنرمندی کا خاص نمونہ ہے۔ دو قسم کے اشعار الگ الگ درج ہیں۔

دیوان شیدا (جرمنی) قیمت ۱۲/ — مسیح الملک حکیم اجمل خان کے فارسی اور اردو کلام کا مجموعہ مسیح الملک کی شاعری اپنے احباب کی مجلس تک محدود تھی، مرحوم کی اجازت پر مکتبہ جامعہ نے خاص طور پر طبع کرایا۔

کلام جوہر قیمت ـ/۱۲ — مولینا محمد علی جوہر کے جدید اور قدیم کلام کا یہ مجموعہ ہے۔ شروع میں مولینا عبد الماجد دریابادی کا مقدمہ بھی ہے۔

چندہ سالانہ پانچ روپیہ

قیمت فی پرچہ آٹھ آنہ

پرنٹر، پبلشر: محمد مجیب، بی اے (آکسن)

نے

جامعہ برقی پریس دہلی میں چھپوا کر شائع کیا

رجسٹرڈ

نمبر ۱۸۵۲

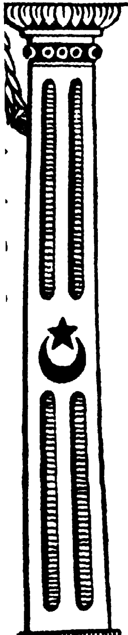


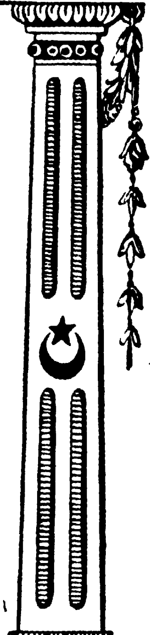


جامعہ

جامعہ ملیہ کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ

جلد ۲۰ | بابت ماہ مئی ۱۹۳۳ء | نمبر ۵





مطبع جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

A.H. Faruqi 1927

الوراثۃ فی الاسلام فن وراثت پر عربی میں یہ ایک آسان رسالہ ہے۔ قیمت ۸ر

ذکرے ولادت نبوی پر مولانا ابوالکلام آزاد کا یہ معرکۃ الآرا مضمون ہے اس کی قدر الہلال کے مطالعہ کرنے والے حضرات کر سکتے ہیں۔ قیمت ۸ر

بشرے اسلام میں خدا کا تخیل صرف جبار و قہار ہی نہیں بلکہ رحمٰن و رحیم بھی ہے۔ از سید سلیمان ندوی قیمت ۶ر

الورد والریحان بچوں کے لئے چند قابل حفظ احادیث کا انتخاب ہے تاکہ وہ آنحضرت صلعم کے اس مختصر کلام کو بآسانی یاد کر سکیں۔ قیمت دو آنہ۔

ہمارا دین اس میں ارکان خمسہ اسلام کی خوبیاں عام فہم اور سلیس اردو میں لکھی گئی ہیں۔ قیمت ۲ر

فلسفہ مذہب پروفیسر سید وہاج الدین صاحب کا دلچسپ مقالہ (زیر طبع) قیمت ۸ر

تاریخ

تاریخ مغربی یورپ ہسٹری آف ویسٹرن یورپ کا ترجمہ ہے جس میں وہاں کی معاشرت علم و ہنر اور سیاسی اداروں کی بتدریج ترقی کو دکھایا گیا ہے۔ قیمت ڈھائی روپے۔ عہ۸ر

تاریخ ہند قدیم کے ایم پانیکر کی کتاب کا ترجمہ ہے جسے موصوف نے جامعہ کے شعبہ تصنیف و تالیف کی درخواست پر لکھا تھا۔ قیمت ۸ر

تاریخ الدولتین خلافت بنی امیہ اور بنی عباس کے عہد حکومت کی مختصر اور جامع تاریخ۔ قیمت ۸عہ

تاریخ امریکہ دریافت امریکہ سے بیسویں صدی کے آخر تک کے مفصل حالات نہایت ہی دلچسپ کتاب ہے۔ صفحات ۷۰۰ قیمت دو روپے

تاریخ نجد نجدیوں کے مذہبی عقائد، سیاسی حالات اور طرز معاشرت پر مکمل کتاب ہے۔ قیمت عہ

تاریخ الامت ابتدا سے لیکر خلافت عثمانیہ تک اسلام کی مستند تاریخ۔ قیمت مکمل ؏۵

۱۔ حصہ اول سیرۃ الرسول قیمت ۸عہ

۲۔ حصہ دوم خلافت راشدہ۔ ۸ر

۳۔ حصہ سوم خلافت بنی امیہ۔ ۸عہ

۴۔ حصہ چہارم خلافت عباسیہ۔ ۸ر

۵۔ حصہ پنجم خلافت عباسیہ بغداد۔ ۸ر

۶۔ حصہ ششم خلافت عباسیہ مصر۔ ۸ر

۷۔ حصہ ہفتم۔ خلافت عثمانیہ۔ عہ

سوانحِ عمریاں

سیرت محمد علی مولانا محمد علی کی مکمل سوانحعمری ضخامت ۴۰۰ صفحہ کے قریب متعدد تصاویر قیمت ؎

تلاشِ حق گاندھی جی کے خود نوشت زندگی کے حالات اور تجربات۔ ۲ جلدیں مع متعدد تصاویر۔ ایک روپیہ قسم اول ۲ روپے۔

ٹالسٹائی روس کے قائداعظم، مشرق کے مصلح اور انسانیت کے شیدائی، ٹالسٹائی کے حالات۔ قیمت ۳ر

جمال الدین اخوت اسلامی کا پرجوش داعی جس نے ہندوستان، ایران، مصر اور فرانس میں بڑے بڑے کام کئے۔ ۸ر

اورنگ زیب اورنگزیب پر اعتراضات کے جواب اور من گھڑت تاریخ کا کچا چٹھا۔ قیمت ۸ر

حیات حافظ لسان الغیب خواجہ حافظ کی زندگی کے حالات اور انکی شاعری پر مفصل تبصرہ۔ قیمت ؎

حیات جامی فارسی کے مشہور شاعر مولانا نورالدین جامی کے حالات اور ان کے تصوف پر بحث۔ قیمت ۸ر

ضیاء الدین برنی عہد تغلق کے نامور مورخ ضیاء الدین برنی مصنف تاریخ فیروز شاہی کے حالات اور اس کی تاریخ پر تبصرہ۔ قیمت چھ آنے ۶ر

سیرت عمرو بن العاص نامور فاتح مصر حضرت عمرو بن العاص کی زندگی کے حالات۔ قیمت ؏

خادماتِ خلق یورپ اور امریکہ کی چند پاک سیرت خواتین کے حالات جنہوں نے اپنی زندگی قوم پر وقف کر دی تھی قیمت ۱۰ر

ادب

سیر المصنفین اردو کے تمام مصنفین کے حالات ادب اردو کی دلپسند تاریخ۔ قیمت ؎

کیمیا گر چند مختصر افسانوں کا مجموعہ قیمت ؏

نیرنگ ۱۲ ادبی مضامین اور ایک تاریخی ڈرامہ ہے۔ ؎

مضامین رسالہ جوہر جامعہ ملیہ کا قلمی رسالہ جوہر کے مضامین کا مجموعہ۔ قیمت ایک روپیہ

لیلۃ القدر مولانا ابوالکلام آزاد کا ایک مضمون ہے ۱ر

دیوان غالب (جرمنی) اسمیں غالب کا خود نوشتہ مقدمہ، غزلیات قصائد اور رباعیات ہیں۔ پاکٹ سائز، رنگین تصویر ؎ و ؏

مرقع غالب (جرمنی) کمرہ کی زینت کیلئے عمدہ چیز ہے، غالب مرحوم کی رنگین تصویر۔ دو قسم کے اشعار الگ الگ درج ہیں قیمت ۸ر

دیوان شیدا (جرمنی) مسیح الملک حکیم اجمل خاں کے فارسی اور اردو کلام کا مجموعہ۔ مرحوم کی اجازت سے مکتبہ جامعہ نے خاص طور سے جرمنی میں طبع کرایا۔ قیمت ؏

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جامعہ
دہلی

زیر ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری   ڈاکٹر سید عابد حسین ایم ۔ اے ، پی ایچ ۔ ڈی ۔

جلد ۲۰   بابتہ ماہ مئی ۱۹۳۳ء   نمبر ۵

فہرست مضامین

محمد مجیب بی ۔ اے (آکسن) پرنٹر و پبلشر نے جامعہ برقی پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر رسالہ جامعہ سے شائع کیا۔

مسلمانوں کی آیندہ تعلیم

یہ خطبہ جناب مولانا سید سلیمان ندوی نے اردو اکادمی کے جلسے میں ۱۱ اپریل ۱۹۳۳ء کو پڑھا تھا۔ ہم اسے دو قسطوں میں مئی اور جون کے پرچوں میں شائع کریں گے۔ اس کے بعد انشاء اللہ بہت جلد یہ علیحدہ رسالے کی صورت میں چھپ جائے گا۔

دوستان و عزیزان جامعہ! آج سے آدھی صدی پہلے مولانا شبلی مرحوم نے علی گڑھ ایجوکیشنل کانفرنس کے ایک جلسے میں "مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم" پر ایک مضمون پڑھا تھا جو نہایت مقبول ہوا تھا اب آدھی صدی کے بعد ضرورت ہے کہ "مسلمانوں کی آیندہ تعلیم" کے مسئلے پر غور کیا جائے۔

اُسی زمانے میں سر سید مرحوم نے مسلمانوں کے انحطاط کا سبب اور اس کا علاج مسلمانوں کے اہل دماغ طبقے سے پوچھا تھا۔ بہت سے صاحبوں نے اس کا سبب جہالت اور اس کا علاج "تعلیم جدید" کو قرار دیا تھا۔ چنانچہ نصف صدی تک ہم نے اس فیصلے پر آنکھ بند کر کے عمل کیا اور ان کے بتائے ہوئے راستے پر چلتے رہے۔ اب نصف صدی کے بعد پھر اس سوال کی ضرورت ہے کہ ہم کو کس قسم کی جدید تعلیم چاہیئے۔ ان پچاس برسوں میں ہم نے صرف تعلیم تعلیم پکارا ہے اور ایک منٹ کے لئے بھی اس پر غور نہیں کیا ہے کہ کیسی تعلیم؟

ترک موالات کی پچھلی تحریک پہلا موقع تھا جس میں مسلمان نادانستہ طور سے اچانک اس موڑ پر پہنچ گئے، جہاں ان کو اس کا فیصلہ ضروری ہو گیا ورنہ ہلاکت کا عمیق غار ان کے پاؤں کے نیچے تھا۔

اب یہ کوئی چھپا راز نہیں کہ تعلیم کے مسئلے پچاس برس پہلے کے مقابلے میں اب بالکل اور نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ پہلے جدید تعلیم کی ضرورت کا سب سے بڑا سبب سرکاری نوکریاں تھیں اور یہ یقین تھا کہ سرکاری نوکریوں کا دروازہ اسی کنجی سے کھلے گا، لیکن اب یہ مسئلہ اس صورت کے بجائے اس صورت میں ہے کہ نئی تعلیم کی ضرورت اس لئے ہے کہ "پیٹ" کا سوال اسی سے حل ہو گا۔ پچاس

برس کے بعد مولانا حالی کا یہ طعنہ واقعے کی شکل میں ہمارے سامنے آگیا۔

نہ پڑھتے تو سو طرح کھاتے کما کر　　وہ کھوئے گئے اور تعلیم پا کر

مسلمانوں میں جدید تعلیم کی اوسط ہر سال آگے بڑھ رہی ہے، آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ ۱۸۸۳ء میں علی گڑھ سے مولانا شبلی نے اپنے وطن کے دوستوں کو یہ مبارکباد بھیجی تھی کہ

"اب کی پٹنہ محمڈن اسکول سے جو خاص مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے آٹھ لڑکے انٹرنس میں پاس ہوئے، جن میں پانچ مسلمان ہیں۔" (مکاتیب اول صفحہ ۳۰ طبع دوم)

اور اب یہ حال ہے کہ ہر سال انٹرنس اور میٹرک کیا، اس سے وہ چند گریجویٹ ہو رہے ہیں، تاہم اب کیا مسلمانوں کا انحطاط کم ہو گیا اور وہ اب ترقی کر رہے ہیں؟ مولانا شبلی مرحوم جب مولویوں کے مدرسوں کو چھوڑ کر علی گڑھ کالج آئے تھے تو وہاں کے طلبہ کو دیکھ کر حسب ذیل فقرے لکھے تھے۔

"یہاں آکر میرے خیالات مضبوط ہو گئے، معلوم ہوا کہ انگریزی خواں فرقہ نہایت مہمل فرقہ ہے مذہب کو جانے دو، خیالات کی وسعت، سچی آزادی، بلند ہمتی، ترقی کا جوش برائے نام نہیں، یہاں ان چیزوں کا ذکر نہیں آتا، بس خالی کوٹ پتلون کی تماشاگاہ ہے۔ ہمارے شہر کے نوخیز لڑکے مجھ کو بی۔ اے کی نسبت یہ خیال دلاتے تھے کہ وہ مذہبی باتوں کو تمام تر ضعیف ثابت کر دیں گے، لاحول ولا، وہ غریب تو زمین کی حرکت بھی سمجھ نہیں سکتے۔"

"سید صاحب (سرسید) نے اکثر مجھ سے فرمایا کہ ہندوستان کے تمام انگریزی تعلیم یافتہ مسلمانوں میں ایک بھی ایسا نہیں جو کسی مجمع میں کچھ کہہ سکے یا لکھ سکے، صرف تین شخصوں کو مستثنیٰ کرتے تھے۔ وہ فرماتے ہیں کہ انگریزی ان کے دماغوں میں کچھ تبدیلی نہیں پیدا کرتی۔"

یہ خط ۱۸۸۳ء کا ہے جس کو اب پورے پچاس برس ہوئے۔ کیا تھوڑے تغیر کے ساتھ مسلمانوں کی جدید تعلیمی کیفیت یہی نہیں ہے؟ اصل یہ ہے کہ ہم نے جب جدید تعلیم کی اشاعت کا کام شروع کیا تو یہ سمجھے کہ ایل۔ اے بی سی ڈی ہمارے کامیابیوں کے خزانے کی وہ کنجی ہے جو کبھی الف لیلہ کے علی بابا کو ہاتھ آگئی تھی۔

اس سے پہلے کہ ہم آگے بڑھیں ہم کو تعلیم کی حقیقت پر ایک لمحہ غور کرنا چاہیے۔

تعلیم | تعلیم کے لفظی معنی سکھانے کے ہیں اور ہم اپنی زبان میں اس کے معنی سیکھنے سکھانے کے لیتے ہیں۔ اور اس سے مراد پڑھنے اور لکھنے کا فن سیکھنا ہے اور آج کل اس کے معنی اس سے بھی زیادہ محدود ہیں یعنی انگریزی زبان میں لکھنے اور پڑھنے کو ہم تعلیم کہتے ہیں۔ ہم نے اب تک بار بار جب تعلیم کا لفظ استعمال کیا ہے تو اس سے مراد وہ سرکاری تعلیم لی ہے جو عام یونیورسٹیوں کے ماتحت دی جاتی ہے۔ دوسرے معنوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ لکھنے اور پڑھنے کا وہ ہنر یا پیشہ جو سرکاری نظام کے ماتحت سکھایا جاتا ہے۔

سب سے پہلے یہ بات ذہن نشین کرنا چاہئے کہ کسی زبان کے چند حروف کو لکھنا اور ان کو پڑھ لینا اسی طرح کا ایک ہنر یا پیشہ ہے جس طرح نجاری، لوہاری، معماری اور دنیا کے دوسرے پیشے ہیں۔ اگر کوئی اس حرف شناسی کے ہنر یا پیشے سے ناواقف ہے تو وہ اسی طرح موردِ الزام ہو سکتا ہے جس طرح اس بات پر کہ وہ نجاری یا لوہاری یا معماری کا کام کیوں نہیں جانتا۔ موجودہ عہد سے پہلے کبھی کسی قوم کی ترقی اور تنزل کے مسئلے میں یہ چیز حدِ فاصل نہ تھی کہ اس میں فی صدی کتنے لوگ لکھنے اور پڑھنے کا پیشہ جانتے ہیں۔ کیا جب عربوں نے رومیوں اور ایرانیوں کو شکست دے کر تاج و تخت پر قبضہ کیا وہ اپنی فی صدی تعلیم میں اپنے حریفوں سے بڑھ کر تھے۔ پھر جب انھیں عربوں کو سسلی میں نارمنوں نے اور اندلس میں اسپینیوں نے اور عراق و خراسان میں تاتاریوں نے شکست دی تو وہ فی صدی تعلیم میں ان نارمنوں، اسپینیوں اور تاتاریوں سے کم تھے۔

خود ہندوستان میں مسلمانوں کو ایک طرف سکھوں نے اور دوسری طرف مرہٹوں نے دبا کر ان کے نظامِ حکومت کو درہم برہم کر دیا تو سکھ اور مرہٹے اس وقت مسلمانوں سے فی صدی تعلیم میں بڑھ کر تھے؟

عزیزو! یہ "فی صدی" کا لفظ بھی ان منتروں میں ہے جن کو یورپ کے سیاسی ساحروں اور جادوگروں نے اپنی محکوم دنیا میں پھونک رکھا ہے اور اب ہم اس سے اتنے مسحور ہو گئے ہیں کہ ہر چیز کو اسی جادو کی ترازو سے تول کر جانچتے اور مانتے ہیں؛ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ قوم کی قوت اور طاقت اس کی کمیت اور تعداد میں نہیں بلکہ اس کی کیفیت میں ہے۔ اگر کہیں صرف تعداد کی کثرت قوت کی مرادف ہوتی تو ۵۰ ہزار انگریز ۳۵ کروڑ ہندوستانیوں پر حکومت نہ کر سکتے اور نہ چار کروڑ جاپانی چالیس کروڑ چینیوں کو ہر قدم پر شکست دیتے چلے جاتے۔

قوم کی ترقی کا راز | ان واقعات سے جو شاہدات ہیں یہ راز خود بخود فاش ہو جاتا ہے کہ قوم کی ترقی کا راز فی صدی کا جادو نہیں بلکہ اس قوم کی قومیت کی معنوی روح اور ذہنی قوت میں ہے۔ اس کے لئے سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ قوم کے سامنے اس کی زندگی کا کوئی متفقہ اور متحدہ مقصد ہو، اس کے افراد اپنے ذاتی اور شخصی اغراض زندگی کے ساتھ ساتھ من حیث المجموع ایک مشترک مقصودِ زندگی رکھتے ہوں جس کے حصول میں اس کا ہر چھوٹا بڑا، امیر غریب، عورت مرد غرض اس قوم کا ہر فرد پوری طرح معروف و منہمک ہو اور اسی کی دھن میں اس کا جینا، مرنا، اٹھنا، بیٹھنا، چلنا، پھرنا سب کچھ ہو اور ہر فرد کو یہ متحدہ مقصد اتنا عزیز ہو کہ جب کبھی اس کے سامنے اس کے ذاتی اور شخصی مقاصد اس کے مشترکہ قومی مقصد سے متصادم ہوں تو بے تامل وہ اپنے تمام ذاتی مقاصد اور شخصی فوائد یہاں تک کہ خود اپنے وجود کو بھی اس پر نثار کر دے۔

اٹھارھویں صدی کے ہندوستان کی تاریخ میں جو واقعات پیش آئے ان کی تحلیل کیجیے تو اس راز سے خود بخود پردہ اٹھ جائے گا کہ ارکاٹ، سرنگا پٹم، پلاسی، بکسر، لکھنؤ اور دلی میں مٹھی بھر انگریز ہندوستانی ریاستوں اور سلطنتوں کو اس آسانی سے کیوں کر توڑ پھوڑ کر رکھ دیتے تھے۔ ایک طرف ایک متفقہ مقصد، متحد قوت اور منظم طاقت تھی، دوسری طرف منتشر افراد اور پراگندہ اشخاص تھے جن میں سے ہر ایک کا مقصود الگ اور مطلب جدا تھا۔ کہیں اگر کوئی خاندان حکمراں تھا تو اس کے مختلف افراد بھی اس ریاست کی گدی اور مسند کے لیے باہم نبرد آزما تھے۔ آرکاٹ اور بنگال کی نوابیوں میں کیا یہی پیش نہیں آیا، حیدر علی اور ٹیپو جنھوں نے اپنے سامنے ایک مضبوط مقصد رکھا تھا، دیکھیے کہ ان کی یہ ذہنی مضبوطی ان کی جسمانی اور فوجی مضبوطی کی صورت میں کس طرح ڈھل گئی تھی اور اس وقت تک اس "آہنی انسان" کی قوت میں کمزوری نہیں آئی جب تک اس کے خاندان اور دربار میں وحدت کی جگہ شخصی مقاصد اور ذاتی منافع کی کثرت نہ آ گئی۔ مذہب کی اصطلاح میں اسی "ذہنی وحدت مقصد" کا نام **ایمان** ہے جس کے بغیر کسی عمل کو اعتبار کا درجہ نہیں مل سکتا۔

اخلاق اور کیرکٹر کی مضبوطی جس کے بغیر کسی قوم کی معنوی زندگی کا وجود ہی نہیں ہو سکتا بہت کچھ اسی مقصدِ عزیز کی گراں بہا متاع کی حفاظت، بقا، ترقی اور استواری کی خاطر وجود میں آتی ہے۔ ایثار،

قربانی، عزم، استقلال، فیاضی، بہادری اور موت سے بے خوفی اسی طلسم کے روحانی اسرار ہیں۔ یہ حقیقت میں وہ جرس ہے جس کی آواز پر قوموں کے قافلے اپنے سفر طے کرتے ہیں اور کامیابی کی منزل کا پتہ لگاتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ ہماری قوم کا اس دنیا میں کوئی بھی متحدہ مقصد ہے؟ اگر نہیں ہے تو وہ قوم نہیں بلکہ جانوروں کا گلّہ اور حیوانوں کا جھنڈ ہے۔

غور سے دیکھئے اسی ملک میں ہندو قوم آباد ہے۔ اس پر انقلابات کے بیسیوں دور گذر چکے ہیں، صدہا سال کی حیرانی و سرگردانی کے بعد اس نے اب اپنی زندگی کا ایک مقصد قرار دے لیا ہے، ان کے چھوٹے سے لے کر بڑے تک، نوکری پیشے سے لے کر آزادی طلب تک، غریبوں سے لے کر دولت مند مہاجنوں تک، محکوموں سے لے کر ان کے رئیسوں اور راجاؤں تک، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے کانگریسیوں سے لے کر خوشامدیوں تک ہر ایک نے اپنے سامنے کم از کم ایک متحدہ مقصد رکھ لیا ہے اور وہ مخالفت کی ہر قوت کو ٹھکرا کر اور عائق و مانع کی ہر دیوار کو ہٹا کر ہندو ذاتوں کو واحد قوم بنانا اور اس کے تمام پچھلے خصوصیات کے ساتھ اس کو اس ملک میں مستقل وجود بخشنا۔ اب اس قوم کی ہر کوشش ہر راہ سے اسی ایک منزل مقصود پر آکر ختم ہوتی ہے، اس کے اہل سیاست کی کوشش یہ ہے کہ اس کو سیاسی خود مختاری اور اس ملک پر حکومت کی پوری ذمہ داری بخشیں۔ اہل تعلیم اس کو تعلیمی ذرائع سے حاصل کرنے کے لئے اس کے علم و فن کے پیمانے کو اونچا کر رہے ہیں، اصلاح معاشرت کے کارفرما اس کو معاشرتی اور تمدنی طریقوں سے آگے بڑھا رہے ہیں، اہل دین اس کی دینی وحدت کی دھن میں ہیں، اہل علم اس کے معلومات کا خزانہ بھر رہے ہیں، اہل ادب اس کے لئے ایک واحد زبان کی تخلیق میں مصروف ہیں، انتہا یہ ہے کہ اس کے مجبور قیدی بھی ذاتوں کی تفریق کے خلاف حصول وحدت کے لئے بیس دیوار لڑ رہے ہیں، الغرض "قومی وحدت" کی تشکیل کی جتنی صورتیں اور تدبیریں ہیں قوم کے مختلف کارکن اور کارفرما اپنے اپنے مذاق کے لحاظ سے ان میں سے ہر ایک کی تکمیل میں مصروف ہیں اور ان میں سے ہر ایک یہ جانتا ہے کہ دوسرا بھی دوسری راہ سے وہیں جا رہا ہے جہاں وہ خود جانا چاہتا ہے اس لئے راہ رو اور راہ بر باہم دست و گریباں نہیں۔

الغرض قوم کی زندگی کے لئے سب سے پہلی چیز "وحدت مقصد" کا وجود ہے۔ یہی وہ مرکزی نقطہ ہے جس کے ارد گرد قوم کے تمام افراد کے اعمال چکر کھاتے ہیں، حکمراں اپنی حکومت کے تخت پر، واعظ اپنے منبر پر، سپاہی اپنے میدان میں، اہل پیشہ اپنے بازار میں، عالم اپنی درس گاہ میں، صناع اپنی کارگاہ میں، اخبار نویس اپنے دفتر میں، یہاں تک کہ اس کے مجرم اور ڈاکو بھی اپنی کمین گاہ میں، اپنے دوسرے کاموں کے ساتھ اسی ایک مقصد کے لئے جیتے اور مرتے ہیں۔

تعلیم کا پہلا مقصد، مقصد زندگی کی تبلیغ

تعلیم کا پہلا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ وہ قوم کے افراد میں اس کے واحد مقصد کی تبلیغ اور تکمیل کا فرض انجام دے۔ قوم کے ہر فرد میں بچپن سے اس مقصد کی صحت کا یقین اور اس کی رفعت اور بلندی کی تقدیس اور اس کے حصول اور بقا کی خاطر ہر آزمائش اور امتحان میں پڑنے کی غیر متزلزل جرأت پیدا کرے۔

ہم کو پہلے سوچنا چاہئے کہ اول مسلمانوں کے سامنے اور خصوصاً ہندوستان کے مسلمانوں کے سامنے ان کی زندگی کا کوئی مقصد ہے بھی۔ اگر ہے تو ہندوستان کے اس سرے سے لے کر اس سرے تک کوئی درس گاہ اپنے سامنے وہ نصب العین رکھتی ہے۔

ہمارا پچھلا نظام تعلیم کتنا ہی برا سہی لیکن یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس کے سامنے ایک مقصد تھا، اور وہ مذہب کی خدمت اور اس کے زیر سایہ علوم و فنون کی تحصیل اس مقصد کا اثر یہ تھا کہ تعلیم ہمارے نظام زندگی میں ایک دنیوی نہیں بلکہ ایک مذہبی فریضہ تھا یہاں تک کہ کتابیں اور کتابوں کے اوراق بھی ہمارے نزدیک مقدس اور ادب اور احترام کے قابل تھے، ہمارے اندر مذہب کی شیفتگی اور عقیدت تھی اور اس کی نصرت کے لئے ہر علم و فن کو سیکھتے تھے اور پڑھتے تھے۔ ہم نے فلسفہ یونان سے اور ریاضیات ہندوستان سے سیکھا اور اسی طرح دوسرے عقلی علوم بھی دوسری غیر مسلم قوموں سے لئے، مگر غور سے دیکھئے کہ ہمارے اسلاف نے ان میں پوری اصلاح و ترمیم کرکے ان کو اپنے نصاب درس میں اس طرح رکھا کہ وہ آج تمام تر اسلامی علوم معلوم ہوتے ہیں۔ ارسطو اور افلاطون کا فلسفہ جو کہتے ہیں کہ دہریت سکھاتا ہے جب وہ ہماری مشرقی درس گاہوں میں پڑھایا جاتا ہے تو پہلے اعوذ باللہ اور پھر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ کر شروع کیا جاتا ہے، خدا کا نام آتا ہے تو

نیچر اور فطرت کے بے حس اور بے جذباتی ناموں سے اس کی تعبیر نہیں ہوتی بلکہ واجب تعالیٰ، باری تعالیٰ اور مبدءِ فیاض کے فلسفیانہ لیکن باادب ناموں سے اس کی تعبیر کی جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فلسفہ پڑھنے کے باوجود مشرقی درس گاہوں کے طلبہ میں بے دینی یا مذہبی بے حسی پیدا نہیں ہوتی۔

جب ہمارا فلسفی مصنف اپنے فلسفے کا آغاز کرے گا تو قرآن پاک کی اس آیت کی تعلیم کو اپنی غرض بتلائے گا کہ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا (جس کو حکمت دی گئی اس کو بڑی نیکی دی گئی) جب ہیئت و فلکیات کا درس دے گا تو تمہید میں وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اور رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا اور لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ اور فلکیات کی دوسری مناسب آیتوں کو پہلے پیش کرے گا۔ جغرافیے کی کتاب لکھے گا تو کہے گا کہ یہ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ کی تفسیر ہے۔ علم طب پڑھائے گا تو شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ اور العلم علمان علم الادیان وعلم الابدان کو دیباچے میں ذکر کرے گا۔ فلکیات کی ایک کتاب کا مصنف امام غزالیؒ کے اس فقرے کو طغرائے فخر بنا کر آگے بڑھتا ہے ومن لم یعرف الهيئة والتشریح فهو عنّينٌ في معرفة الله تعالیٰ (اور جس نے ہیئت اور علم تشریح کو نہیں جانا تو وہ خدا کی معرفت میں نامراد ہے)۔ غرض جس علم و فن کو بھی ہماری کتابی تعلیم ہمارے سامنے رکھتی تھی اس کو اپنے مقصد میں رنگ کر پیش کرتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ہر عقلی علم و فن اور ہر دنیاوی صنعت و ہنر بھی سراپا دین اور یکسر مذہب کے پیکر میں جلوہ گر ہوتا تھا۔ ہمارے اساتذہ آج کل کے علمی دکاندار اور دنیاوی پیشہ ور کی حیثیت نہیں بلکہ وارثِ پیغمبر، نائب رسول اور روحانی باپ کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس لئے ہر شاگرد اس بات کی کوشش کرتا تھا کہ وہ استاد کے رنگ میں رنگ کر ظاہر ہو اور استاد بھی آج کل کی طرح اپنے کام کو داد و ستد کا معاملہ اور ایک ہاتھ سے لینے اور دوسرے ہاتھ سے دینے کی بیوپار اور مزدوری کا پیشہ نہیں سمجھتے تھے بلکہ ایک مقدس کام اور دینی فریضہ۔ اس لئے اس راہ میں ان سے وہ وہ ایثار اور قربانی کے مظاہر مناظر پیش ہوتے تھے جن کو آج کل لوگ مشکل سے باور کر سکتے ہیں۔

آج کل کی تعلیمی تاریخ میں یہ کوئی انوکھی بات نہیں کہ چند روپیوں کی خاطر استاد اِس کالج سے اُس کالج اور اِس یونیورسٹی سے اُس یونیورسٹی میں دوڑے پھرتے ہیں اور صرف بڑی تنخواہ کو اپنی عزت کا

ذریعہ جانتے ہیں اور ہمہ وقت پانچ پانچ دس دس روپیے کے اضافوں کی خاطر زمین و آسمان کے قلابے ملاتے رہتے ہیں۔

لیکن ہماری پچھلی تعلیمی تاریخ میں یہ واقعے بداخلاقی اور دون ہمتی کی مثال سمجھے جاتے تھے، اول تو تعلیم پر اجرت اور معاوضہ لینے ہی کو وہ تقویٰ اور دیانت کے خلاف سمجھتے تھے اور پھر لیتے بھی تھے تو وجہ کفاف سے آگے نہیں بڑھتے تھے۔ وہ بڑے بڑے علما جن کے ناموں کی عزت ہمارے دلوں میں ہے انھوں نے دس دس اور پندرہ پندرہ روپیوں پر اپنی زندگی بسر کردی ہے اور لطف یہ کہ وہ اپنے اس ایثار کو ایثار کہہ کر لوگوں پر اپنے احسان کا بار بھی نہیں رکھتے تھے۔

تعلیم کے لئے وطن سے باہر نکلنا اور خصوصاً بیرونی ملکوں میں جانا آج ہمارے لئے تعجب انگیز سمجھا جاتا ہے لیکن ایک وہ زمانہ بھی گذر چکا ہے جب ہماری نگاہوں کے سامنے زندگی کا مقصد اور حیات کا نصب العین تھا تو علم کی طلب میں نہ تو خشکی کی مسافت، اور نہ تری کی ہولناکی ہماری ہمتوں کو پست اور ہمارے ارادوں کو کمزور کرتی تھی۔ محدثین نے ایک ایک حدیث کی خاطر مشرق سے مغرب اور مغرب سے مشرق تک کی سرزمین کو چھان ڈالا تھا۔ بخارا کا یتیم محمد بن اسماعیل بخاری اپنی بیوہ ماں کے زیر سایہ ترکستان سے عرب جاتا ہے اور واپسی میں عراق، ایران اور خراسان کے ایک ایک مشہور شیخ کی درس گاہ کو چھان ڈالتا ہے۔ مصر کے طالب العلم خراسان آتے ہیں، خراسان کے مصر جاتے ہیں، اسپین اور سسلی سے چل کر عراق و مصر و شام و عرب آتے ہیں اور مصر و شام سے اسپین جاتے ہیں۔ بیت المقدس کے ایک عالم طاہر المتوفی ۵۰۸ھ نے علم کی طلب میں بغداد، مکہ، مدینہ، تنیس، دمشق، حلب، جزیرہ، اصفہان، نیشا پور، ہراۃ، جرجان، آمد، استر آباد، بوشنج، بصرہ، دینور، ری، سرخس، شیراز، قزوین، کوفہ، موصل، مرو، نہاوند، ہمدان، واسط، اسد آباد، اسفرائین، آمل، اہواز، بسطام، خسرو باد وغیرہ شہروں کی خاک چھانی۔ جغرافیے میں دیکھئے یہ شہر افغانستان کے شہر ہرات سے لے کر ترکستان، خراسان، ایران، عراق اور شام تک پھیلے ہوئے ہیں۔

محمد بن مفرج اموی اندلسی کی راہ طلب میں یورپ، افریقہ، اور ایشیا تینوں براعظموں کے شہر داخل ہیں۔ اسپین کا شہر قرطبہ، افریقہ کا شہر مصر اور ایشیا کے شہر دمشق، صنعاء اور زبید (یمن) ان کے

تعلیمی مقامات ہیں۔ ولید اندلسی پیدا تو یورپ کے شہر سرقسطہ (سراگوزہ) میں ہوئے لیکن اندلس سے لے کر خراسان تک کو چھ گردی کی۔ ابو محمد عبداللہ بن عیسیٰ بن ابی حبیب اندلسی علم اور وزارت کے خانوادے سے تھے' وہ اسپین سے فارغ ہو کر اسکندریہ اور مصر آئے' پھر مکہ گئے' پھر عراق میں داخل ہوئے اور بغداد میں مقیم رہے' پھر خراسان کی راہ لی اور نیشاپور اور بلخ میں قیام کیا' پیدا اسپین کی خاک میں ہوئے اور ۵۴۲ھ میں افغانستان کے شہر ہراۃ میں پیوند زمین ہوئے۔ حسین ابن احمد پیدا قرطبہ میں ہوئے اور ۴۵۶ھ میں یمن کی سرزمین میں دفن ہوئے۔

تاج الدین سرخسی ۵۰۳ھ میں پیدا خراسان کے شہر سرخس میں ہوئے' نشو نما شام میں ہوئی اور وفات ۵۹۳ھ میں اندلس میں پائی۔ نحو کے مشہور امام ابو علی قالی پیدا عراق کے شہر دیار بکر میں ہوئے' پھر تعلیم و تعلم کی خاطر ملکوں کی سیر کرتے بغداد اور موصل سے چل کر اسپین میں جا کر دم لیا اور ۳۵۶ھ میں قرطبہ میں وفات پائی۔ ابن المقری اصفہان کے محدث تھے۔ انھوں نے اصفہان' بغداد' موصل' حران' عسقلان' کوفہ' تستر' مکہ' بیت المقدس' دمشق' صیدا' بیروت' مکہ' رملہ' واسط' عسکر مکرم' حمص' رقہ اور مصر تک چار مرتبہ آمد و رفت کی۔ کہتے ہیں کہ ابن فضالہ کی ایک تصنیف کے نسخے کی خاطر ستر مرحلے سفر کے طے کئے اور اس کی حالت یہ تھی کہ اگر کسی نان پز کے سامنے ایک روٹی کے معاوضے میں اس کو پیش کیا جاتا تو وہ اس کو قبول نہ کرتا۔

حماسہ کے مشہور شارح تبریزی کا یہ واقعہ سننے کے قابل ہے کہ وہ پیٹھ پر کتابوں کا پشتارہ باندھے جب پیادہ اپنے وطن سے ابو العلا معری کی خدمت میں شام پہنچے ہیں تو پسینے سے کتابوں کی یہ حالت تھی کہ ان کا ایک ایک ورق دوسرے سے چپک گیا تھا۔

آج یورپ کی مشہور یونیورسٹیوں میں دنیا کے گوشے گوشے کے طالب علموں کو دیکھ کر ہم دنگ رہ جاتے ہیں لیکن اگر پچھلے عہد کی دکھانے والی دوربینیں ہوتیں تو آپ مکہ معظمہ' مدینہ منورہ' دمشق' اصفہان' قاہرہ' بغداد' بخارا' ہراۃ' اور نیشاپور میں ان سے بھی زیادہ حیرت انگیز منظر دیکھ سکتے۔

میں اس عہد کی صرف دو درسگاہوں کو آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ ایک کوفہ میں حضرت امام ابو حنیفہ کی درسگاہ اور دوسری مدینہ منورہ میں امام مالک کی۔ امام ابو حنیفہ کے حلقہ تعلیم میں مکہ' مدینہ منورہ

دمشق، بصرہ، واسط، موصل، جزیرہ، رقہ، نصیبین، رملہ، مصر، یمن، یمامہ، بحرین، بغداد، اہواز، کرمان، اصفہان، حلوان، استرآباد، ہمدان، نہاوند، رے، قومس، دامغان، ترمذ، ہراۃ، نہستار، خوارزم، سیستان، مدائن، مصیصہ اور حمص کے طلبہ شریک تھے۔ ذرا نقشے میں ان شہروں کے بعد مسافت پر نظر ڈال لیجئے۔

امام مالک کی درسگاہ مدینہ منورہ میں ہے۔ حالت یہ ہے کہ دنیا کے گوشے گوشے سے موجیں اٹھتی ہیں اور یثرب کی پہاڑیوں سے آکر ٹکراتی ہیں۔ عرب کے شہروں میں مکہ معظمہ، صنعاء، عدن، طائف، یمامہ، ہجر، حضرموت، زبید، فدک، شام کے شہروں میں سے ایلہ، دمشق، عسقلان، غلاط، مصیصہ، بیروت، حمص، طرسوس، رملہ، نصیبین، حلب، بیت المقدس، اردن، صور اور انطاکیہ اور عراق کے شہروں میں سے بغداد، بصرہ، کوفہ، حران، موصل، جزیرہ، واسط، انبار، رقہ، رہا، اور ممالک عجم میں سے جرجان، کرمان، ہمدان، رے، طالقان، نیشاپور، طبرستان، طوس، مدائن، قزوین، قومستان، جیلان، آمد، کردستان، دینور، سیستان، ہراۃ، بخارا، سمرقند، خوارزم (خیوا)، مرو، سرخس، ترمذ، بلخ، نسا، مشرق ہوچکا اب مغرب کی طرف چلئے۔ مصر کے شہروں میں سے قاہرہ، اسکندریہ، فیوم، اسفان، تینس اور شمالی افریقہ اور اسپین کے شہروں سے افریقیہ، تونس، قیروان، برقہ، طرابلس، مراکش، طلیطلہ، بسطنہ، باجہ، قرطبہ، سرقسطہ، اور اٹلی کی سسلی اور ایشیائے کوچک کے سمرنا (ازمیر) سے طالب العلم آ اور جا رہے تھے۔

ان واقعات کو سنتے وقت یہ بھی ذہن میں رہے کہ اس وقت دنیا میں نہ آج کی طرح ریلیں تھیں جنھوں نے ایک شہر کو دوسرے شہر سے ملا دیا ہے اور نہ دخانی جہازات تھے جنھوں نے ایک ملک کو دوسرے ملک سے جوڑ دیا ہے اور جو برسوں کے سفر کو ہفتوں میں اور مہینوں کے راستوں کو دنوں میں اور دنوں کی مسافت کو گھنٹوں میں طے کرتے ہیں اور وہاں نہ ڈاک و تار کے یہ انتظامات تھے جو گھر بار اور اہل وطن کی خبریں دمبدم پہنچاتے رہتے ہیں اور نہ یہ ہوٹل اور مسافر خانے تھے جو مسافروں کو گھروں سے زیادہ آرام پہنچاتے ہیں اور نہ کوک کمپنی کا وجود تھا جو رتی سے پہاڑ تک کا انتظام آپ کے لئے شہر شہر کرتی پھرتی ہے۔
لیکن ایک لمحہ ٹھہرئے۔ یہ گذشتہ عہد کی داستان کہن استخواں فروشی کے لئے آپ کو نہیں سنائی گئی ہے بلکہ اس سوال کے جواب کے لئے کہ وہ کون سا جذبہ تھا جو ان طالب علموں کو اس زمانے میں اس

طرح کوچہ بہ کوچہ، شہر بہ شہر اور ملک بہ ملک لئے پھرتا تھا کہ نہ ان کو پہاڑ روکتے تھے، نہ جنگل ڈراتے تھے، نہ دریا عائق ہوتے تھے، پھر کیا جوش و خروش تھا جو ان کو اس راہِ طلب میں اس طرح بے چین اور مضطرب رکھتا تھا۔

ہیچ گہ ذوقِ طلب از جستجو بازم نداشت دانہ می چیدم من آں روزے کہ خرمن داشتم

عزیزو! وہ صرف ان کا وہ مقصدِ زندگی اور نصب العین تھا جس کو "دین کا ولولہ" اور "مذہب کا جوش" کہتے ہیں۔ یہ ان کی زندگی کی روح تھی اور ان کی حیات کا مقصد۔ ان کے قبضے میں یہی بجلی کا وہ خزانہ تھا جس سے ان کی تعلیم، تمدن، تجارت، صنعت، سلطنت، حکومت، فتوحات، غرض ایک بامراد قوم کے وہ تمام کارخانے جو زندگی کے مختلف شعبوں سے عبارت ہیں، چل رہے ہیں۔

اس سے دوسرے درجے پر جو جذبہ ہے وہ سیاست ہے۔ اگر اسلام میں دین خود سیاست ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ سیاست کا جذبہ کار اس میں دین کے تحت ہے۔ ایک اللہ کے ماننے والے خواہ وہ کالے ہوں یا گورے، ایشیائی ہوں یا اروپی سب کے سب سلطنت میں برابر کے حصے دار ہیں۔ اسلام میں صلح و جنگ اور فتوحات کی ترقی، تجارت، ملک گیری اور قوموں کو غلام بنانے کی نیت سے نہیں بلکہ اگر ہے تو صرف اس لئے ہے کہ انسانوں میں قومیت، وطنیت اور رنگ و روپ کی مختلف برادریوں کی جگہ ہم خیالی کی ایک برادری قائم ہو جائے۔ انسانوں کے درمیان طبعی اور فطری تفرقوں کو "ملیت" کی بنیاد نہ قرار دیا جائے جو کبھی ٹوٹ اور مٹ نہیں سکتے بلکہ ان خیالات و ذہنیات کو قرار دیا جائے جس کو سوچنے اور سمجھنے کے بعد ہر انسان بدل سکتا ہے۔

توحید اسلام کی وہ روح ہے جس نے دین کے علاوہ سیاست کا کام بھی انجام دیا اور کم از کم بارہ برس تک اس نے ہر میدان میں اسلام کے علم کو بلند رکھا ہے، اسلام کا ہر سپاہی تن تنہا تلوار ہاتھ میں لے کر نکلتا تھا اور چند روز میں نومسلموں کی ایک جماعت اپنے ساتھ لے کر دنیا کے کسی نہ کسی گوشے میں اپنی سلطنت کھڑی کر لیتا تھا۔ افریقہ میں، بحری جزیروں میں اور مختلف ملکوں کے دور و دراز گوشوں میں اس طرزِ سیاست نے بڑی بڑی ریاستیں اور حکومتیں کھڑی کر دیں۔ اسی طرح غلاموں کو اسلام کی آزادی سے

مالامال کر کے ان کو شمشیر زنی، کشور کشائی اور تخت نشینی کا اہل بنا دیا۔ مصر میں غلاموں کی سلطنت صدیوں تک اسی طرح چلتی رہی ہے۔ اسپین اور مراکش کے فاتح یہی بربری نو مسلم ہیں جنہوں نے بارہا شمالی افریقہ میں حکومتیں کیں۔

وہ کون سا جذبہ تھا جو نو مسلم ترکوں، تاتاریوں اور مغلوں کو ایک علم کے زیر سایہ منظم کر کے چین کی دیواروں سے لے کر قسطنطنیہ کے سواحل تک کے ملکوں پر ان کو بارہا حکمراں بناتا رہا۔ سبکتگین ایک معمولی ترک غلام سپہ سالاری تک پہنچتا اور پھر غزنی میں ایسا گروہ خاندان پیدا کرتا ہے جو ہندوستان پر سو سال تک چھایا رہتا ہے، غور کے نو مسلم جو محمودی کے مسلمان بنائے ہوئے ہیں، وہ اٹھتے ہیں اور آندھی کی طرح غزنی سے لے کر بحر ہند تک پر قابض ہو جاتے ہیں۔

ان مثالوں سے میرا مقصد صرف یہ ہے کہ میں یہ دکھاؤں کہ اسلام نے کیوں کر دین ہونے کے ساتھ سیاست کا فرض انجام دیا۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہئے کہ اسلام کا جذبۂ دین بجائے خود اس قدر پُر زور اور قوی ہے کہ اس کو اپنی زندگی کے لئے کسی الگ سیاسی قوت کا سہارا ڈھونڈھنے کی ضرورت نہیں پڑتی ہے۔

؎ عشق خود راہ است وہم خود منزل است

بایں ہمہ اس حقیقت سے تغافل نہیں برتا جا سکتا کہ یورپ نے دو سو برس سے مشرقی قوموں اور اسلامی ملکوں میں جو فشار برپا کر رکھا ہے اس کے لئے یہ لازمی ہو گیا ہے کہ ایک ملک کی بسنے والی تمام قومیں اور جماعتیں باہم ایک دوسرے کے ساتھ مل کر اس طرح دوش بدوش کھڑی ہوں کہ حریف ہماری صفوں کو چیر کر درہم برہم نہ کر سکے۔ اس کے لئے ضرورت ہے کہ اسلامیت اور وطنیت کو ٹکرانے کے بجائے اسی طرح ان میں تطبیق دی جائے جس طرح ہم عقل و نقل اور معقول و منقول کو تطبیق دیتے ہیں۔ غلط فہمی سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ اسلامیت اور وطنیت باہم ایسے حریف ہیں جن میں کبھی صلح نہیں ہو سکتی۔ اسلامیت کے حامی ہر چیز میں مسلمانوں کی علیحدگی کے خواہاں ہیں اور وطن کی دوسری قوموں سے مل کر متحدہ محاذ کے بجائے محاذ کو تقسیم کر کے اس کی حفاظت اور مدافعت کے فرائض کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے تقسیم کرنا چاہتے ہیں۔ دوسری

طرف وطنیت کے طرف اور اس تفریق و امتیاز کے لئے مذہب کو ذمہ دار سمجھ کر اسلامیت کے جذبات سے تہی کرنے پر آمادہ ہو رہے ہیں۔ پہلے کا نتیجہ اگر وطن کی خدمت سے قصور ہے تو دوسرے کا نتیجہ مذہب سے بے زاری ہے اور یہ دونوں نتیجے ہم کو ہلاکت اور بربادی کی طرف لے جا رہے ہیں حالانکہ جس طرح عقل و نقل کی تطبیق ممکن ہے ایسے ہی دین اور وطن کی تطبیق بھی ممکن ہے۔ ۱۹۲۰ء کی تحریک خلافت اور جمعیۃ العلماء کے نظریہ سیاست نے اس امکان کو واقعے کی صورت میں ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے۔ کیا ۱۹۲۰ء کا خلافتی اس عہد کے کانگریسی سے کسی حیثیت میں پست تھا اور موجودہ عہد تحریک میں جمعیتی خادمان وطن کانگریسی خدمت گذاروں سے کسی بات میں کم ہیں؟ حالانکہ سب کو ہر کہ جمعیۃ العلماء سرتاپا مذہبی جماعت ہے اور با ایں ہمہ وطنی خدمات میں خالص وطن پرستوں سے کسی درجے کم رتبہ نہیں۔

میرے نزدیک جس طرح ندوۃ العلماء کی درسگاہ عقل و نقل کی تطبیق ہے، جامعہ ملیہ اسلامیت اور وطنیت کی تطبیق اور اسی لئے یہ دونوں درسگاہیں مسلمانوں کی آیندہ تعلیم میں بہت بڑا اثر رکھیں گی۔

میرے نزدیک جب تک ہندوستان کے مسلمان اسلامیت اور وطنیت کی کشمکشوں کا بہترین فیصلہ نہ کریں گے اس ملک میں ان کا مستقبل صد درجہ خطرناک رہے گا۔

ہندوستان میں اسلامیت اور وطنیت کی مصالحت اور تطبیق

ان تمام ملکوں میں جہاں مسلمانوں کو تعدادی اکثریت حاصل نہیں ہے ان کے دینی اور وطنی فرائض میں یکجہتی اور ہم آہنگی پیدا کرنے کی بہترین صورت یہ ہے کہ خالص مذہبی اور قومی امور و مسائل میں اپنی وطنی حکومت کے زیر سایہ نیم خود مختاری حاصل کر کے ملک کے عام سیاسی و انتظامی امور و مسائل میں اپنے دوسرے ہم وطنوں کے ساتھ اشتراک عمل کریں۔ صاف لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ ان کے اپنے مذہبی و تمدنی مسائل میں جن سے قومیت عبارت ہے ان کی وطنی حکومت ان کو اپنے زیر سایہ خود مختاری عطا کرے اور دیگر عام ملکی سیاسی انتظام و مسائل میں وہ دیگر فرزندان وطن کے دوش بدوش ایک متحدہ نظام کا جزو ہو کر اپنی تعدادی حیثیت کے مطابق اشتراک عمل کریں۔ موجودہ سیاسی اصطلاح میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ ایک طرف مسلمان اپنے لئے بلا شرکت غیرے "کلچرل اٹانومی" حاصل کریں اور دوسری طرف عام ملکی سیاسیات میں وہ اپنے

ہم وطنوں کے ساتھ شریک رہ کر اپنی آبادی کے مطابق حقوق اور نمایندگی پر قناعت کریں۔ اس طرح مسلمانوں کی ایک امتیازی قومی حیثیت بھی قائم ہو جاتی ہے اور دوسری طرف ان پر وطنی اتحاد کے توڑنے کا الزام بھی قائم نہیں ہوتا۔ جن مذہبی و قومی اغراض و مصالح کی حفاظت کی خاطر وہ نمایندگی اور انتخاب نمایندگی کی علیحدگی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ وہ بجائے خود علیحدہ نمایندگی سے طے ہوں گے اور پھر دوسری طرف عام سیاسیات میں ان کو دوسروں سے نہ کوئی رعایت چاہنے کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ استحقاق سے زیادہ مطالبے کی بھیک مانگنے کی ذلت اٹھانی پڑتی ہے اور نہ لوگوں کو عام ملکی معاملات و سیاسیات میں ان کی مخصوص قومی معاملات میں علیحدگی کی بنا پر ملکی تفرقے کا خیال پیدا ہو سکتا ہے۔

اس طرح مسلمانوں کی دو مجلسیں ہوں گی، ایک خالص اسلامی جو ان کے خالص اسلامی امور و معاملات کا فیصلہ کرے گی اور دوسری مخلوط مجلس خواہ وہ مخلوط ہی انتخاب سے ہو جو عام ملکی مسائل کا تصفیہ کرے گی۔

ہم نے جہاں تک ان مسائل پر غور کیا ہے ہم کو اس سے زیادہ بہتر حل اس مشکل مسئلے کا نظر نہیں آتا۔ یقیناً کسی ایسے نظام کے جزئیات کو طے کرنے اور اس کو بنا کر کھڑا کرنے میں جو پہلے سے ملک میں رائج نہ ہو ایک اجنبیت محسوس ہوتی ہے مگر جس طرح پر نئی اصلاحات کے ہر نظام کو بالآخر ہم طے کر کے عمل میں لاتے ہیں اسی طرح اس پر بھی ہم عمل کر سکتے ہیں۔

اس مختصر تشریح سے یہ ظاہر ہو گا کہ ہندوستان میں ہماری قومی زندگی کے حسب ذیل مقاصد ہیں:

۱۔ پیغام اسلام کی تعمیل، حفاظت اور بقا۔

۲۔ اس ملک کے لئے ایک عام جمہوری نظام حکومت کا قیام۔

۳۔ اس عام ملکی جمہوریہ کے ماتحت خالص "اسلامی کلچرل اٹانومی" کا قیام۔

یہ وہ مقاصد ثلاثہ ہیں جن کو ہم اپنی قومی زندگی کی روح عمل قرار دے سکتے ہیں۔ ان کے لئے جدوجہد، اشاعت و تبلیغ اور بالآخر کامیابی اور کامیابی کے بعد ان کی حفاظت اور بقا ہماری قومی زندگی کا مستقل پروگرام ہو سکتا ہے۔

شاید اس موقعے پر مجھ سے اپنے موضوع سے ہٹنے کی بازپرس کی جائے لیکن اگر میری تقریر

کا پچھلا حصہ حاضرین کے ذہن نشین ہے تو یقیناً وہ میری طرف سے اس بازپرس کا جواب دے سکتے ہیں۔

میرے نزدیک تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ وہ قوم کے بچوں کو ان کی زندگی کے قومی مقاصد کی تلقین اور تفہیم کرے اور ان کے اندر ان مقاصد کی یقینیت کی روح پیدا کر کے ان کو سرتاپا عمل بنائے۔ دنیا میں آج جہاں کہیں کوئی قومی حکومت ہے اسی اساس تعلیم پر ان کی قومی عمارت کی بنیاد قائم ہے۔ انگلستان میں جس طرح آکسفورڈ اور کیمبرج انگریزوں کے تعلیمی مرکز ہیں اسی طرح ان کے نظری سیاسیات کے مرکز بھی ہیں۔ وزیراعظم سے لے کر معمولی رکن پارلیمنٹ تک ان درسگاہوں کے احاطوں میں آکر اپنی سیاسیات کے نظریوں کو بیان کرتا اور وہاں کے طالب علموں کو آئندہ کی سیاسی ذمہ داری کے لئے تیار کرتا رہتا ہے۔

اگر کوئی ہم سے پوچھے کہ موجودہ نظام حکومت نے ہندوستان پر سب سے بڑا ظلم کیا کیا ہے تو میں کہوں گا کہ اس کا سب سے بڑا ظلم اس ملک کے بچوں کی بے مقصد تعلیم ہے جس نے پوری قوم کی زندگی کو بے مقصد بنا دیا ہے اور دنیا میں ایک ایسی قوم کی تخلیق کی ہے جس کی زندگی کی کوئی غایت نہیں ہے۔ سبب کھلا ہوا ہے۔ انگریزی حکومت نے اس ملک کی تعلیم کو قومی تعلیم و تربیت کی نظر سے نہیں بلکہ سیاسی نقطۂ نظر سے دیکھا۔ اس کو ضرورت ہوئی کہ مسلمانوں کی اور دوسری قوموں کی اس روحانی زندگی پر موت طاری کر دی جائے جس سے قومی و مذہبی عصبیت پیدا ہوتی ہے اور اس کے لئے ضروری ہوا کہ اس تعلیم کو ہر قسم کی مذہبی اور قومی تعلیم کی اسپرٹ سے خالی کر دیا جائے۔

دوسری طرف اس کو اپنی سلطنت کے چلانے کے لئے ایسے کم قیمت دیسیوں کی ضرورت تھی جو اس کے محکموں کے دفتری کاروبار کو سنبھال سکیں۔ اس لئے ایک ایسا نظام تعلیم جاری کیا جس میں کوئی زندگی نہ تھی اور علوم میں سے بھی صرف وہ چیزیں سکھائی جائیں جن کی ضرورت آئندہ بننے والے کلرک (بابوؤں) کو پیش آسکتی ہے۔

اسکول تک ہم کو کیا سکھایا جاتا ہے؟ ایک ایسی بدیسی زبان جس کے ذریعے سے ہم اپنے افسروں سے گفتگو کر سکیں اور ان کے لئے ان کی زبان میں ان کے لئے سواد مہیا کر کے رکھ سکیں، اور جغرافیہ جس میں زیادہ تر ہم یہ جانیں کہ وہ دنیا کے کون کون سے براعظم، جزیرے اور ٹاپو ہیں جہاں وہ عَلَم لہراتا ہے جس کا

آفتاب دنیا سے کبھی نہیں ڈوبتا' اور تاریخ جس میں ہم کو یہ سکھایا جاتا ہے کہ ہندوستان کی موجودہ قوموں نے کیوں کر ایک دوسرے پر ظلم کیا ہے تاکہ اس ملک کی قومی تفریق کا ناسور کبھی بھرنے نہ پائے۔

ہندوستان کی تاریخ کا وہ حصہ جس میں ہندوستان کی انگریزی شہنشاہی کے بنانے والے لارڈوں کا ذکر ہوتا ہے پڑھ کر بے انتہا ہنسی آتی ہے۔ ہر لارڈ نے اس ملک کی اصلاح کی خاطر جو تکلیفیں اٹھائی ہیں اور جو انتظامات کئے ہیں ان کا ذکر ہوتا ہے۔ پھر وہ رخصت ہو کر جب جاتا ہے اور دوسرا آتا ہے تو پھر انھیں مناقب کی تکرار ہوتی ہے۔ اس لغو طریقۂ نصاب کا جس قدر جلد ہندوستان سے خاتمہ کیا جا سکے اسی قدر بہتر ہے اور اس کے بجائے ہم کو وہ نصاب اختیار کرنا چاہئے جن سے ہمارے قومی مقاصد کے جذبات کی پرورش اور تکمیل ہو اور قوم کو زندہ قوم' سرگرم عمل قوم اور بامقصد قوم بنائے۔

ہم نے ہزاروں اور لاکھوں کے صرف سے ملک میں جا بجا اسلامی اسکول' اسلامی کالج بلکہ اسلامی یونیورسٹی قائم کی ہے لیکن اس سوال کا کوئی جواب ہے کہ قومی نقطۂ نظر سے اس قسم کے اسلامی اسکول' اسلامی کالج اور اسلامی یونیورسٹی کس قدر مفید ثابت ہوئے ہیں اور بے مقصد تعلیم کے سوا ان سے کیا فائدہ پہنچا ہے بجز اس کے کہ ان کے قیام سے چند مسلمان ماسٹروں اور پروفیسروں کی پرورش ہوتی ہے اور کچھ مسلمان طالب علموں کو کلاس میں جگہیں مل جاتی ہیں۔ مگر ان کو اس نظر سے اگر دیکھا جائے کہ یہ قوم کے ذاتی سرمایے سے سرکاری نظام تعلیم کی اشاعت کا فرض انجام دیتا ہے تو یہ بالکل لاحاصل معلوم ہوتے ہیں کہ قومی سرمایے سے جو اسکول اور کالج قائم ہوتے ہیں وہ قومی نتائج کے لحاظ سے سرکاری مدارس سے کس حال میں بہتر ہیں؟ اسی لئے میرے نزدیک سرکاری نظام تعلیم کی مجبورانہ پیروی کی حالت میں کہیں بہتر یہ ہے کہ ہم اس سرمایے کو طلبہ کے وظائف دینے اور شہروں میں صرف اسلامی دارالاقامے قائم کرنے میں صرف کریں کہ ان اسلامی اسکولوں اور کالجوں سے جو فائدہ پہنچنا ممکن ہے وہ درسگاہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ دارالاقامے کی حیثیت سے ہے۔

بہرحال یہ ایک جملۂ معترضہ ہے۔ کہنا یہ ہے کہ بے مقصد تعلیم سے قومی ترقی اور ملت کی زندگی کی توقع رکھنا پنجاہ سالہ تجربے کو جھٹلانا ہے اور اس تعلیم نے صرف نوشت و خواند کے ہنر کی تعمیم و اشاعت کے

لحاظ سے خواہ کسی قدر فائدہ پہنچایا ہو مگر قوم کی زندگی اور ملت کی سربلندی میں اس سے فائدے کے بجائے روزافزوں نقصان پہنچ رہا ہے۔ مذہبی مقصد زندگی سے تغافل کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ حرف الامین جن کا زبان پر لانا بھی پہلے شکل تھا اب وہ برملا ادا کئے جا رہے ہیں اور قومی تخیل سے بے پروائی کا نتیجہ یہ ہے کہ قومیت کا شیرازہ بکھر رہا ہے اور خیالات و اعتقادات کی وحدت کی گرفت جس سے وحدتِ قومیت عبارت ہے ڈھیلی پڑتی جا رہی ہے! اور ایک ایسی قوم پیدا ہو رہی ہے جو ظاہر و باطن دونوں لحاظ سے حکمراں قوم کے لغافے کی صرف نقل ہے۔

مسلم یونیورسٹی کے لئے ۱۹۱۱ء میں جس وقت ملک میں جوش و خروش برپا تھا مولانا شبلی مرحوم نے لاہور کے وفد میں اپنی وہ فارسی نظم پڑھی تھی جس کا ایک مصرع یہ ہے:-

کہ ایں سر رشتۂ تعلیم ما در دست ما باشد

لسان العصر اکبر مرحوم نے فوراً اس پر برجستہ جوابی نظم کہی تھی جس کے ایک مصرعے کے آخری الفاظ یہ تھے "مگر دست شما وست شما باشد"۔ لوگوں نے شاید اس کو صرف شاعرانہ سوال و جواب پر محمول کیا ہو مگر بیس برس کے بعد معلوم ہو گیا کہ لسان العصر نے جو شبہ ظاہر کیا تھا وہ شبہ نہیں حقیقت تھا۔ اس طول بحث اور درازنفسی کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے سامنے اب یہ حقیقت واقعہ بن کر سامنے آ جانا چاہئے کہ ان کو پہلے اپنا قومی نقطۂ نظر اور ملی زندگی کا مقصد معین کرنا چاہئے اور اس پر اپنی تعلیمی عمارت کی بنیاد قائم کرنی چاہئے اور آئندہ ہماری درس گاہیں صرف نوشت و خواند کا حرفہ اور پیشہ سکھانے کے لئے نہ ہوں بلکہ زندہ قوم کے افراد کی تخلیق اور آفرینش کے لئے۔

اسی لئے مسلمانوں کی آئندہ تعلیم کے لئے ضروری ہے کہ ایسی درس گاہیں بکثرت قائم کی جائیں جو با مقصد ہوں اور ان کا سر رشتہ واقعی مسلمانوں کے حقیقی ہاتھوں میں ہو۔ مسلمانوں نے اس ملک پر ایک ہزار برس تک حکومت کی مگر انھوں نے ہندوستان پر یہ ظلم کبھی نہیں کیا کہ یہاں کے کروڑوں دماغوں کی تربیت اپنے سیاسی ہاتھوں میں لے کر ان کو مذہبی و قومی جذبات سے یکسر خالی کر دیں۔ اب ضرورت ہے کہ مسلمان اس نظام تعلیم سے علانیہ بغاوت کریں اور ایسی درس گاہوں کی بنیاد قائم کریں جو ان کو ان کی

زندگی کا مقصد بتائیں اور ان پر ان کی حیات ملی کے اسرار کھولیں

ایک زمانہ تھا کہ جب سرکاری نوکری ہی مسلمانوں کی زندگی کا تنہا مقصد تھی۔ اس وقت ملک کی عربی درس گاہوں پر یہ پھبتی کہی جاتی تھی کہ یہ اپاہجوں کے پیدا کرنے کی کلیں ہیں۔ اس طعن کو قبول کر لینے کے بعد بھی ہم یہ دعوے کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ وہ بظاہر خواہ کسی قدر پست و مبتذل حالت میں ہوں تاہم وہ بامقصد ہیں اور اپنے مقصد پر ان کو ناز ہے اور زمانے نے بتا دیا کہ زمانے کی بے التفاتیوں اور بے توجہیوں کے باوجود وہ زندگی رکھتی ہیں اور آپ کو سن کر تعجب ہوگا کہ آج کل کے ایک بڑے سرگرم کانگریسی نے مجھ سے یہ کھلا اعتراف کیا کہ موجودہ قومی مقاصد کے سمجھنے میں اور ان پر عمل کرنے میں آزاد عربی مدارس کے تعلیم یافتہ غلام انگریزی اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ سے بڑھ کر ثابت ہوئے۔ اس کا سبب بالکل کھلا ہوا ہے کہ آزاد عربی مدارس کی تعلیم کا مقصد سرکاری نوکری اور سرکاری اعزاز کی تلاش نہیں جو ہمارے ہر قومی حوصلے کو پست کر دیتی ہے۔

مسلمانوں کی علیحدہ تعلیم | اوپر کے معروضات اگر ذہن نشیں ہوں تو اس حقیقت کے تسلیم کرنے میں عذر نہ ہونا چاہئے کہ مسلمانوں کی بامقصد تعلیم کے لئے یہ نہایت ہی ضروری ہے کہ ان کی قومی درسگاہیں بالکل الگ ہوں جہاں ان کو خاص ان کے مذہبی و قومی مقاصد کی بنا پر تعلیم دی جائے۔ ہمارے بہت سے مسلمان دوستوں کی یہ خواہش ہے کہ سرکاری کونسلوں میں ان کی نشستیں معین ہوں اور ان نشستوں کا انتخاب مخلوط نہ ہو تاکہ مسلمانوں کی مستقل ہستی قائم رہے۔ میرا خیال ہے کہ سرکاری نشستوں میں عدم مخلوط انتخاب سے کہیں زیادہ ضروری یہ ہے کہ ان کی تعلیم و تربیت مخلوط نہ ہو تاکہ ان کی علیحدہ قومی ہستی فنا نہ ہو جائے اور ان کے قومی مقصد کی مستقل زندگی برباد نہ ہو جائے۔

اسی اصول کی بنا پر مسلمانوں کی ابتدائی تعلیم کا مسئلہ نہایت غور و فکر کے قابل ہے۔ مسلمان ملک کی دوسری قوموں کی طرح میونسپلٹی اور ڈسٹرکٹ بورڈ کے ٹیکس ادا کرتے ہیں لیکن آپ دیکھیں گے کہ وہ میونسپلٹی اور ڈسٹرکٹ بورڈ کی تعلیم سے بہت کم فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اکثر میونسپل اور تحصیلی اسکول تقریباً ہندو اسکول ہیں، وہاں کی تعلیم کیا اپنی زبان کے لحاظ سے اور کیا اپنے جذبات کے لحاظ سے تمام تر ہندو ہے۔ مذہبی تعلیم سے وہ یکسر خالی اور جذبات ملی سے یکسر عاری ہیں۔ ایسی حالت میں مسلمان طلبہ کا ان میں کم ہونا قدرتی بات ہے۔

یہ تو ان مدارس کا سلبی پہلو ہے، ایجابی پہلو یہ ہے کہ میونسپلٹی اور ڈسٹرکٹ بورڈ کے ابتدائی مکاتب دیہاتی اور شہری ہندو آبادی کی ابتدائی تعلیم کے تمامتر کفیل ہیں مگر مسلمان ان مدارس و مکاتب سے بجا طور پر احتراز کرکے نہ تو خود اپنی طرف سے اور نہ سرکار کی طرف سے ابتدائی مکاتب کا اتنا وسیع سلسلہ اپنے قبضے میں رکھتے ہیں ایسی حالت میں دوسری قوم کے مقابلے میں مسلمانوں کا ابتدائی تعلیم میں کم ہونا بالکل کھلی بات ہے۔ یو۔ پی میں سرکاری اسلامی مکاتب کی اسکیم بھی اس لئے ناکام ہے کہ ان کے لئے بھی ان کے سررشتے کا خاص لازمی نصاب قبول کرنا ضروری ہے جو ہمارے اغراض کے مطابق نہیں۔

مکتبی تعلیم کا نظام | پورا ملک ابتدائی اسلامی مکاتب کے متحدہ نظام کے سلسلے سے بالکل محروم ہے جابجا شخصی یا جماعت کے چندوں سے کہیں کہیں بعض مکتب ہیں جن میں سے ہر ایک انفرادی طریق تعلیم اور الگ نصاب پر جاری ہے اور جو ہر قسم کی ترقی کی اسکیم سے محروم ہے۔ پورے ملک میں چھوٹے بچوں کا ایک بھی معیاری مکتب نہیں جو چھوٹے بچوں کی مکتبی تعلیم و تربیت کا نمونہ پیش کرے۔ جامعہ ملیہ کے کارفرما دوستوں اور ندوۃ العلماء کے ارکان کے سامنے میں نے اس ضروری تجویز کو بار بار پیش کیا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ جامعہ کے کارفرما ادھر توجہ کررہے ہیں اور ان کے احاطے میں اس قسم کے معیاری مکتب کے بننے کی پوری صلاحیت موجود ہے۔ گورکھپور میں انجمن اجرائے مکاتب کے نام سے ایک مجلس نے چند سال سے کام شروع کیا ہے اور اس وقت تک چالیس مکتب ضلعے میں قائم کئے ہیں۔ اسی قسم کے اجرائے مکاتب کی ہر ضلعے میں ضرورت ہے جن کے پیش نظر صرف ابتدائی مکتبی تعلیم ہو اور ہمارا حق پہنچتا ہے کہ ہم میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں سے اپنے ان مکتبی سلسلوں کے لئے مالی امداد کا جائز مطالبہ کریں اور جب کبھی ہندوستان کے نظام حکومت کا آسمان و زمین بدلے ہم یہ مطالبہ کریں کہ مسلمانوں کی اس تعلیم کا پورا انتظام اس صیغے کے سپرد کیا جائے جس کا مطالبہ مسلمان اپنے مستقل قومی و مذہبی امور و معاملات کے سلسلے میں کررہے ہیں۔

میری اس گذارش سے اس نتیجے تک پہنچنا آسان ہے کہ قومی تحفظ کے لئے مسلمانوں کے غیر مخلوط انتخاب کے مطالبے سے بہت زیادہ ضروری غیر مخلوط تعلیم کا مطالبہ ہے خصوصاً جب وہ وقت آئے گا کہ ملک میں جبری تعلیم کا نفاذ ہو اس وقت مسلمانوں کے لئے علیحدہ مستقل نظام تعلیم کی ضرورت آج سے

زیادہ عیاں ہو جائے گی۔

ضرورت ہے کہ بچوں کی ابتدائی تعلیم پر پوری توجہ کی جائے اور اس کے لیے ٹرینڈ معلم تیار کیے جائیں اور بچوں کے نفسیات سے باخبر اہل قلم ان کی استعداد کے مطابق ایسا تدریجی نصاب بنائیں جو سادہ سے سادہ، سہل سے سہل ہو۔ "حمایت اسلام لاہور" کا نصاب بہت کچھ مقبول ہے مگر افسوس ہے کہ اس میں الفاظ کے استعمال میں بے احتیاطی برتی گئی ہے مثلاً دینیات کی پہلی ہی کتاب میں محتاج، پیغمبر وغیرہ الفاظ جو پانچ پانچ حرفوں سے مرکب ہیں استعمال کیے گئے ہیں۔ کیا بچہ آسانی سے ان کا تلفظ کر سکتا ہے۔ نصاب کے الفاظ چھوٹے چھوٹے آسان اور سہل ہوں۔ ان کی کتاب اس احتیاط سے چھاپی جائے کہ ہر نقطہ اور شوشہ اس طرح اپنی جگہ پر لکھا ہو کہ بچے کو اشتباہ نہ ہو۔

ابتدائی تعلیم میں دو اور مشکلیں حل کرنی ہیں: قرآن پاک کے پڑھانے کے آسان طریقے کی تلاش تاکہ قرآن پاک جلد سے جلد ختم ہو سکے۔ لوگ قرآن پاک پڑھانے کے لیے پہلے قواعد بغدادی یا یسرنا القرآن وغیرہ پڑھاتے ہیں اور اسی سے تعلیم کا آغاز کرتے ہیں۔ میرے خیال میں یہ طریقہ غلط ہے۔ میرا تجربہ یہ ہے کہ پہلے بچے کو اردو پڑھائی جائے اور جب اردو داں ہو جائے تو اردو عبارت عربی خط میں چند روز پڑھائی جائے۔ اس کے بعد قرآن پاک شروع کرا دیا جائے۔ اس سے کم از کم ایک سال کا وقت بچ جاتا ہے۔ لیکن ضرورت ہے کہ بچوں کے لئے ایسے قرآن چھاپے جائیں جن میں خط کی بلکہ ہر حرف کی اور نقطے اور شوشے کی پوری احتیاط کتابت میں کی جائے تاکہ حروف اور نقطے بچوں کی نظروں میں مشتبہ نہ ہونے پائیں! اور ہر حرف کی صرف ایک ہی شکل پورے قرآن کی کتابت میں اختیار کی جائے تاکہ اختلافِ صور بچوں کا ذہن اس حرف کے پہچاننے میں مشوش نہ کردے۔

پھر اس پر بھی غور کرنا ہے کہ ہندوستانی زبان کے مفرد اور مرکب حروف اور الفاظ کے پڑھنے کی آسان سے آسان صورت کیا ہو سکتی ہے۔ افسوس ہے کہ انجمن ترقی اردو کے سوا اور کسی نے ادھر توجہ نہیں کی ہے۔ بچوں کے لئے جو نصاب بنایا جائے اس میں شروع سے اس کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ وہ ان کی مذہبی اور قومی روح کی تربیت کرے۔ بدیسی نظام تعلیم کی بے مقصد کتابیں جن میں چوہا اور بلی کے بے جوڑ

اور بے مزہ قصے ہمارے بچوں کے لئے وہ غذائے فاسد ہے جو جزو بدن نہیں ہوتی بلکہ ان کے دماغی ہاضمے کو ابھی سے خراب کر ڈالتی ہے اور ہم نے بار بار کہا ہے کہ بے مقصد تعلیم قومی زندگی اور ملی حیات کے لئے ایک ذرہ کار آمد نہیں۔

ہم ترکوں کو ملحد کہنے کے عادی ہیں لیکن بہرحال انھوں نے اتنا پورے یقین کے ساتھ سمجھ کر لیا ہے کہ اگر ہم کو زندہ رہنا ہے تو با مقصد قوم ہو کر زندہ رہنا ہے۔ چنانچہ اسی لئے انھوں نے اپنے سیاسی انقلاب کے ساتھ تعلیمی انقلاب کو ضروری سمجھا ہے۔ امریکہ کے ایک مشنری رسالے "مسلم ورلڈ" نے ترکی ابتدائی تعلیم کی ریڈروں سے ایک سبق نقل کیا ہے جو درج ذیل ہے:-

"مذہب اسلام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور ہمارے پیغمبر صلعم پر ایمان لایا جائے جنھوں نے ہم کو اسلام کی تعلیم دی۔ ہم اللہ تعالیٰ اور پیغمبر صلعم پر عقیدہ رکھنے کو ایمان کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جس نے کائنات اور ہم کو پیدا کیا قدرت والا ہے۔ ہم پورے طور سے یہ نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ کیا ہے یا کیوں کر ہے، وہ بہت بڑا ہے...... ..

بچو! تم دیکھتے ہو کہ ایمان لوگوں میں اتحاد پیدا کرتا ہے اور ان کو قوت اور مسرت بخشتا ہے۔ اللہ تعالیٰ پیغمبر صلعم اور مذہب اسلام پر عقیدہ رکھنا مذہبی ایمان ہے۔

ہمارا ایک قومی ایمان بھی ہے۔ ہم ترک ہیں۔ ترک تہذیب یافتہ اور متمدن ہیں۔ ہمارا ملک ہمیشہ ترقی کرتا جائے گا اور ہمیشہ دشمنوں پر فتح یاب ہوگا۔ جس وقت ترک کا نام لیا جاتا ہے میرا سینہ فخر سے پھول جاتا ہے اور میرا سر بلند ہو جاتا ہے۔ میں ان لوگوں سے محبت کرتا ہوں جو میری قوم اور میرے ملک کے لئے مفید ہیں۔ جو میرے محبوب ملک کو نقصان پہنچاتے ہیں ان سے مجھے مطلق محبت نہیں۔"

اوپر کے اس ابتدائی سبق پر غور کیجئے کہ ترک مدبروں نے تعلیمی حقیقت کا پتہ کس طرح پا لیا ہے اور دین و وطن کے دوگونہ جذبات کو باہم کس طرح ایک دوسرے سے ہم آغوش کیا ہے۔ یہی وہ راستہ ہے جو قوموں کی ان کی منزل مقصود کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔

(باقی آئندہ)

غالب

مصنفہ سید عبداللطیف پی ایچ ڈی (لندن)، مترجمہ سید معین الدین قریشی، ایم اے (عثمانیہ)

غالب کو جس نظر سے دیکھئے وہ ایک عجیب و غریب تصنیف ہے۔ بہتر تو یہ تھا کہ اس کا اردو ترجمہ نہ کیا جاتا اس لئے کہ کتاب کے "خد و خال" اس کا نشو و نما اور اس کی روح سراسر انگریزی ہے اور اردو میں اس کی حقیقت تک پہنچنا ہر شخص کا کام نہیں ہے۔ مثلاً کتاب کا نام ہے "غالب کی حیات اور اردو شاعری کی تحقیقی تحسین"۔ یہ پورا جملہ اگر انگریزی عبارت میں نقل کیا جائے تو انگریزی داں طبقے کے لئے اس کا مضمون بالکل واضح ہو جاتا ہے یعنی "A critical appreciation of his life and Urdu Poetry" درآں حالیکہ اردو زبان میں "تحسین" کا لفظ وہ مطلب پوری طرح ادا نہیں کر سکتا جو ہم معنی انگریزی لفظ سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہ ایک مثال ہے جو ۱۳۰ صفحے کے اس مختصر رسالے کے اکثر اجزاء پر صادق آتی ہے۔ اور جن ابواب میں شعر، صوفیانہ رنگ اور شخصی رجحانات وغیرہ سے بحث کی گئی ہے وہاں یہ خامی مضحکہ خیز صورت اختیار کر لیتی ہے۔ جناب مصنف نے اپنے دیباچے میں یہ بات کھول کر رکھ دی ہے کہ جو لوگ یہ رائے رکھتے ہیں کہ انھوں نے اردو کے دامن میں پرورش نہیں پائی وہ قطعی غلطی پر ہیں۔ اور اگرچہ انھوں نے اس انکار کے بعد زباں دانی کا کوئی دعویٰ نہیں فرمایا ہے لیکن زبان و ادب اردو کے متعلق اس عنوان سے اظہار خیال کیا ہے جس سے ان کی فطری بالغ نظری اس خاص میدان میں ایک معجزانہ حیثیت اختیار کر لیتی ہے یعنی وہ ادب و زبان کی ان گہرائیوں سے واقف ہیں اور ان سرچشموں کا کھوج نکالتے ہیں اور ان بلندیوں تک پہنچ سکتے ہیں جہاں اب تک اردو لکھنے اور بولنے والے لوگوں کی رسائی نہیں ہوتی۔ وہ معترض ہیں کہ "اپنی چار دیواری میں بیٹھ کر یہ حضرات اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ اردو ادب ابھی عالم عنفوان میں ہے۔ وہ ابھی عبوری دور میں ہے اور شباب کی منزل مقصود کی طرف جادہ پیما، لیکن عنفوان اور عنفوان سے شباب تک پہنچنا دور کی بات ہے۔"

اب یہ دور کی کوڑی لانے کا کام انھوں نے اپنے ہی ذمے رکھا اور اپنے زعم باطل میں یہ سمجھا ہے

کہ کوئی دوسرا اس کا اہل نہیں۔ اسی دیباچے میں نقادانِ ادب اردو کو وہ ان الفاظ میں یاد فرماتے ہیں کہ "دیوانہ وار افراد کی یہ برادری روز بروز بڑھتی ہی گئی اور ادبی رائے زنی کے احساس تناظر کا گلا گھونٹتی رہی"۔ اس "احساس تناظر" کی حقیقت جناب مصنف نے واضح نہیں فرمائی۔ یہ اور اس قسم کے دوسرے حقائق ان کی تصنیف کے آئینہ صفحات میں بے شمار نظر آتے ہیں اور ع مدعا عنقا ہے اپنے عالم تحریر کا بے اختیار یاد آجاتا ہے۔

باب اول میں جناب مصنف نے مولانا حالی مرحوم اور ڈاکٹر بجنوری دونوں پر یکساں تنقید فرمائی ہے اور خلاصہ اس کاوش کا یہ ہے کہ ان دونوں صاحبوں کو فن تنقید سے لگاؤ نہ تھا اور ڈاکٹر بجنوری باوجود مغربی تعلیم کے اپنے جوش عقیدت سے مجبور ہو کر گمراہی پر اتر آئے۔ آپ کو یہ بھی شکایت ہے کہ "حالی و بجنوری دونوں کے طرز تنقید میں ایک بڑا عیب یہ بھی ہے کہ ایک آدھ شعر سے وہ یہ نتیجہ نکال لیتے ہیں کہ غالب ہیئت داں اور فلسفی، واعظ اور عاشق سبھی کچھ تھا"۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک آدھ شعر میں فلسفے کا کوئی مسئلہ بیان کر دینا اور بات ہے اور شاعر کو فلسفی قرار دینا بالکل دوسری چیز۔ اگر کسی شعر میں یہ ممکن ہے کہ اس کے چھوٹے سے "اعضائے ترکیب" میں ایک مسئلہ ہیئت و فلسفہ کا یا حکمت و موعظت کی کوئی بات سما سکے تو یہ غزل کا کمال ہے اور اس کی صدہا مثالیں موجود ہیں لیکن اس حقیقت کی غلط تاویل کرنے کا کسی کو حق نہیں پہنچتا۔

باب دوم سے باب چہارم تک جناب مصنف نے اپنا زور قلم محض فن تنقید کی پرورش اور توضیح میں صرف فرمایا ہے اور یہ نہایت دلچسپ، مفید اور قابل قدر ہے۔ لیکن غالب کی زندگی اور غالب کی شاعری کو دیکھنے اور سمجھنے میں اس سے کہاں تک مدد مل سکتی ہے یہ ایک سوال ہے جس کے لئے ڈاکٹر صاحب کو اپنی کتاب پر نہیں بلکہ فن تنقید کے ان اصولوں پر دوبارہ نظر فرمانی چاہیے، جن کی بنیاد پر "تنقیدی تحسین" کی یہ پوری عمارت تعمیر کی گئی ہے۔

اس مختصر رسالے کے ۲۰۰ صفحات اصول تنقید کو واضح کرنے کے لئے صرف کئے گئے ہیں اور کلام غالب کی تنقید صرف ۸۰ صفحے میں ہے۔ ان ۲۰۰ صفحات میں دیوان اور مکتوبات کی تاریخی ترتیب واضح کی ہے اور اس کی روشنی میں شاعر کی حیثیت اور اس کے مرتبے کو جانچنے کی کوشش کی گئی ہے اور اعتراض یہ ہے

کہ مولانا حالی نے "مطلق ماخذ کو تاریخی لحاظ سے ترتیب نہیں دیا اور کمال یہ ہے کہ باوجود اتنی مدت گزر جانے کے سید عبداللطیف صاحب نے یہ کارنمایاں انجام دیا ہے۔"

باب چہارم سے وہ حصہ شروع ہوتا ہے جس میں جناب مصنف نے غالب کی شاعری کو اس کے سوانح حیات کے اثر اور ماحول میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ وہ واقعات زندگی سے ان کیفیات کا سراغ لگانا چاہتے ہیں جن کی اثر پذیری نے غالب سے شعر کہلوائے اور جن کا انعکاس مضامین شعر میں ہوا ہے۔ اسی کوشش میں غالب کی زندگی کے خاص اور اہم واقعات کو بنیاد قرار دے کر اس زمانے کے مکتوبات و غزلیات میں ان سے مترتب ہونے والے تاثرات کی تلاش کی گئی ہے۔ یقیناً یہ کوشش اور مشغلہ دلچسپ ہے لیکن یہ کام ایسے شخص کی دسترس سے باہر ہے جس نے بقول بعض حضرات " اردو کے دامن میں پرورش نہیں پائی بلکہ جنوبی ہند کی محض ایک غیر ترتیب یافتہ بولی دکھنی کا آغوش یافتہ ہے"۔ اور یہ حقیقت اس وقت بھی ناقابل انکار ہے جب کہ وہ محض غالب کی شاعری پر تنقید کرتے ہوئے "شعری عمل" کے لئے جداگانہ عنوانات قائم کرسکنے کا بھی اہل ہو مثلاً (۱) ابتدائی ہیجان (۲) افکار (۳) تصور (۴) لفظیات شعر (۵) تنظیم شعر اور صورت شعر کے معیار قائم کرکے غالب کے شعر کو جانچنا دوسری بات ہے اور واقعات زندگی کا اشعار سے براہ راست تعلق نکالنا بالکل دوسری چیز جو بجز اتفاقی شاعری کے عام طور پر پورے وثوق کے ساتھ ثابت نہیں کہا جا سکتا اس لئے کہ غزل میں رسمی اوزان و قوافی ہیں اور ایسا مانوس طرز ادا کہ اس انبوہ میں سے دل کی پھانس چن لینا آسان کام نہیں۔ واقعہ تو یہ ہے کہ صد ہا سال سے ایشیائی ممالک میں دیوان حافظ سے لوگ تفاول کرتے ہیں اور ہر شخص اپنے مطلب کا " افکار" بلکہ "حقیقت الامر" اور " واقعات آئندہ" ان ہی اشعار میں پالیتا ہے جو بالعموم ہر شاعر کے دیوان میں اسی مضمون پر اور اسی انداز میں لکھے گئے ہیں۔ پھر استعارہ و تشبیہ اور زبان کی نزاکتوں اور گہرائیوں میں الجھنے کے باوجود کسی متعین واقعے کو ان سے صحیح طور پر متعلق کرلینا آسان نہیں۔

مطلب ہے ناز و غمزہ وے گفتگو میں کام ۔۔۔ چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کے بغیر
ہرچند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو ۔۔۔ بنتی نہیں ہے بادۂ و ساغر کے بغیر

غزل کی ماہیت پر اگر دوسرے پہلو سے نظر کی جائے تو واضح ہوگا کہ وہ نہ مسلسل نظم ہے اور نہ قطعہ بلکہ غزل کا ہر شعر بجائے خود ایک مکمل مضمون ہے۔ ان چند مکمل مضامین میں سے ایک یا دو متعلق واقعات ہو سکتے ہیں اور باقی اشعار کا غیر متعلق ہونا ناگزیر ہے۔ پھر اس انتخاب کا طریقہ کیا ہوگا؟ کیا اس کے لئے بھی اول "مواد" پیدا کر کے "ماخذ" و "رہنما" تلاش کئے جائیں؟ کیا ان الفاظ کی مدد سے دل کے پردے کھل سکتے ہیں اور زندگی کی تاریکیاں منظر عام پر آسکتی ہیں؟ ڈاکٹر عبداللطیف کو اپنی ادبی بصیرت اور صحت مذاق پر کچھ اس بلا کا اعتماد ہے کہ وہ ان چند معیاروں سے جن کی وضاحت میں ان کی کتاب کا بڑا حصہ وقف ہے اس غمازی کا فرض ادا کرنا چاہتے ہیں جس کی اہلیت مبدء فیاض نے عام مخلوق میں ودیعت نہیں کی اس لئے کہ وہ شرافت نفس کو اپنی شان ستاری کا ایک پرتو قرار دے کر دنیا میں حسن اخلاق کا وجود قائم رکھنا چاہتا ہے تاکہ بدگمانی، تنگ نظری، دریدہ دہنی اور عیب جوئی ادبی تنقید کا نصب العین نہ بن سکے۔

باب پنجم اسی مسئلے کی تطبیق ہے جس میں "غالب کا زاویۂ نگاہ" زندگی کے متعلق "بیان کیا گیا ہے اور خارجی اثرات سے اس کی سیرت کو نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس باب کا خلاصہ یہ ہے کہ جن واقعات نے "غالب کی دماغی رَو بدل دی" وہ (۱) قمار بازی کے جرم میں سزائے قید اور (۲) واقعۂ غدر ۱۸۵۷ء ہیں۔ ان دونوں واقعات کا یہ اثر ہوا کہ غالب "مردم بیزار" ہوگیا اور اگرچہ اسباب دنیا میں سے اکثر اس کو میسر تھے، علم و فضل کی قدردانی بھی ہوئی، خطاب و خلعت سے سرفراز ہوا اور شہرت و عزت بھی پائی، معاش کی تنگی نہ تھی، ہمدم و ہمساز بھی تھے "لیکن غالب کے ذہن کی ساخت ہی کچھ ایسی تھی کہ وہ نہ تو عطائے رحمانی کا شکرگزار تھا اور نہ کسی انسانی خدمات کا۔ خلاف مردانگی وہ ہمیشہ کڑھتا ہی رہا۔"

اگر ڈاکٹر صاحب کے بیان کردہ معیار تحقیق و اصول تنقید کو یہاں استعمال کیا جائے (جس کے لئے ہمیں ۲۰۰ صفحات لکھنے کی ضرورت نہیں) تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اب تک جس قدر ژرف نگاہی صاحب

ممدوح نے صرف فرمائی ہے وہ انھیں چند جملوں کے لکھنے کے لیے تھی ورنہ کلام غالب نہ اس قابل تھا
کہ ڈاکٹر صاحب اس پر توجہ فرماتے اور نہ مرزا غالب کی سیرت جو ان واقعات سے متاثر ہو چکی تھی ایسی
چیز تھی جس کو کوئی صاحب فکر و اہل قلم اپنی توجہ کا مرکز بنانے پر آمادہ ہوتا اس لئے کہ "خلاف مردانگی" کا
ثبوت حاصل ہو جانے کے بعد کسی اخلاقی سیاسی یا فلسفیانہ شاعر کے متعلق اگر کچھ کہا بھی جائے تو کیا۔

غالب کے جن اشعار سے اس نظریے پر استدلال کیا گیا ہے ان کو یہاں نقل کرنا بیکار
ہے اس لئے کہ خود جناب مصنف کو تسلیم ہے کہ "یہ جستہ جستہ اشعار ہیں جن میں شخصی عنصر شاید زیادہ نہ ہو"
اس امر کو تسلیم کر لینے کے بعد بھی کہ ان اشعار میں شخصی عنصر نہیں ہے اس ادعا کے لئے جس بے دردی
کا ثبوت جناب مصنف نے دیا ہے اس کی بے غالب کی "خلاف مردانگی" بے اطمینانی سے بھی بڑھ گئی
ہے۔ اب ان اشعار کو بھی ملاحظہ فرمائیے جو اس دعوے کے ثبوت میں پیش کئے گئے ہیں۔ ان کی
تعداد بتیس ہے اور اگرچہ حق انتخاب مجھے حاصل نہیں لیکن اس مضمون خاص پر یہ تین شعر بہترین ہیں:-

ہے جہان کے اپنی نظر میں خاک نہیں ۱ سوائے خون جگر سو جگر میں خاک نہیں

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب ۲ ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

نومیدی ما گردش ایام نہ دارد ۳ روزے کہ سیہ شد سحر و شام نہ دارد

ان اشعار سے ڈاکٹر صاحب کی فکر رسا کا اندازہ کیا جا سکتا ہے!

دوسرا ثبوت مثنوی گہر بار ہے۔ اس کی حقیقت اور اس پر اعتراض کی نوعیت بھی خود ڈاکٹر صاحب
کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے۔ "سچ تو یہ ہے کہ 'بادہ وہ جو سر پہ چڑھ کے بولے' مرزا کا کمال بدیہی کی
نظم میں بھی چمک اٹھتا ہے اور جس لطیف شاعرانہ تخیل کی مذمت کی جا رہی ہے وہی اس کا اعجاز ہے لیکن
اب سید عبداللطیف صاحب کو بہلانے والا کمال سے پیدا کیا جائے۔ شاید ایسا ویدہ ور مرزا غالب کو
بھی میسر نہ آتا کہ ع عنقا را بلند است آشیانہ۔ فرماتے ہیں کہ

"یہ ایک طویل مناجات ہے جس میں رحمت الٰہی کو جوش دلایا گیا ہے کہ اس کی بشری

کمزوری کو بخش دے۔ اس مقام پر امید تھی کہ غالب کا سر نیاز جھک جائے گا کہ اس نے کفرانِ نعمت کیا اور اپنی ان خدا داد قوتوں کو عام مقصد کی تلاش میں جھٹلا دیا جس سے وہ آشفتہ حال اسیرانِ مصیبت کو مسرت و راحت کے لازوال نغمے سنا سکتا تھا۔ لیکن غالب ایسا کیوں کرنے چلا تھا۔ وہ پھر الٹا خدا ہی کو موردِ الزام قرار دیتا ہے کہ اس نے ظرف و حوصلے سے زیادہ غم اس کے حصے میں دے دیا یہاں تک کہ وہ عطیاتِ ربانی کا دلی شکریہ بھی ادا نہیں کر سکتا۔"

ڈاکٹر صاحب نے اصولِ تنقید بیان کرتے ہوئے بار بار اس خطرے سے آگاہ فرمایا ہے کہ چند اشعار سے کوئی عام نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا۔ مثنوی ابرِ گہربار کے بھی چند ہی اشعار نقل کئے گئے ہیں اور جو نتیجہ نکالا گیا ہے وہ واقعے اور مضمون دونوں کے خلاف ہے۔ اعتراض یہ ہے کہ (۱) غالب کا سرِ نیاز مناجات میں بھی نہ جھکا۔ (۲) خدا کو موردِ الزام قرار دیتا ہے کہ اس نے ظرف و حوصلے سے زیادہ غم اس کے حصے میں دے دیا۔ اس مسئلے کے متعلق جو غلط فہمی ڈاکٹر صاحب کو ہوئی وہ بالکل قابلِ معافی ہے اس لئے کہ شاید ان کے لئے یہ دشوار ہے کہ مناجات میں شکایت اور شکوے کی نزاکت کو محسوس فرما سکیں اور غالباً یہ اس سے بھی زیادہ مشکل ہے کہ وہ اس جذبے تک پہنچ سکیں جس کی بنا پر دلِ شکستہ خدا سے شکایت کرتا ہے کہ "اس نے ظرف و حوصلے سے زیادہ غم اس کے حصے میں دے دیا"۔ یہ خدا کی شکایت ہے یا ظرف و حوصلے کی؟ ع

یہ آنسوؤں کی کمی نہیں ہے رعایتِ ظرفِ آستیں ہے

معلوم نہیں سید معین الدین قریشی صاحب جو "غالب" جیسی گراں مایہ تصنیف کو غالب کی زبان بولنے والوں تک پہنچانے کے ذمے دار ہیں محض "لفظیات" تک دلچسپی رکھتے ہیں یا کبھی انھوں نے ڈاکٹر عبداللطیف سے شکوۂ باری، شکوۂ فلک، شکوۂ دوست، شکوہ عدو، شکوۂ ہجر وغیرہ وغیرہ مختلف اسالیب ادا کی نزاکت و خوبی پر گفتگو بھی فرمائی ہے۔ بہرحال ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ شکوہ شعر و سخن میں ہزاروں معنی پیدا کرتا ہے اور جو شخص طویل مناجات میں رحمتِ الٰہی کو جوش دلانے کے لئے شکوہ کرتا ہو اور وہ بھی زبانِ شعر میں تو یقیناً وہ "خدا کو موردِ الزام نہیں قرار دیتا"۔ اور اگر شکایت و الزام صرف اسی قدر ہے کہ "اس

نے ظرف و حوصلے سے زیادہ غم اس کے حصے میں دے دیا" تو ظاہر ہے کہ یہ شکایت خود اپنی کوتاہی اور بے کسی کا اعتراف ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں۔ اگر اردو اور فارسی زبان کے شعراء تک ڈاکٹر صاحب کی نظر ہو یا وہ کسی دوسرے واسطے سے ان تک پہنچ سکیں (جیسے کہ وہ ورڈس ورتھ، شیلے، برونگ، آرنلڈ، شکسپیر، ملٹن تک پہنچے ہیں بلکہ ان شعراء سے گزر کر سینٹ پال تک بلند پروازی فرمائی ہے) تو ان کو معلوم ہو گا کہ یہ طرز کلام کسی شاعر کے لئے معیوب نہیں اور نہ وہ "مردم بے زاری" کی آخری حد ہے بلکہ

ایں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند

نیز اس مسئلے کے متعلق ایک قول فیصل ہے جس سے خواہ ڈاکٹر صاحب کی تسکین نہ ہو لیکن دوسرے لوگ مطمئن ہو جاتے ہیں یعنی

با خدا دیوانہ باش و با محمدؐ ہوشیار

ڈاکٹر صاحب کو شکایت ہے کہ مرزا مذہب کے معاملے میں اس قدر "صلح کل" کیوں ہے، اس نے وہابی فرقے کے خلاف کیوں لکھا، اپنے تئیں اثنا عشری کیوں کہتا ہے اور بعض شیعہ حضرات کے خلاف کیوں قلم اٹھایا اور انتہا یہ ہے کہ اس نے مندرجہ ذیل رباعی کیوں لکھی وھو ہذا

جن لوگوں کو ہے مجھ سے عداوت گہری کہتے ہیں مجھے وہ رافضی اور دہری
دہری کیوں کر ہو جو کہ ہووے صوفی شیعی کیوں کر ہو ماوراءالنہری

ڈاکٹر صاحب کے ذہن میں خود غالب کی کہی ہوئی موٹی بات بھی نہیں آسکتی کہ مذہب کے متعلق غالب کا یہ رویہ اس لئے تھا کہ وہ صوفی تھا اور اس کا اعلان اور اقرار کرتا ہے۔ اب رہا یہ مسئلہ کہ صوفی کے کیا معنی؟ تو صوفی کے خواہ کچھ معنی ہوں اور اس کے عقاید کچھ ہی کیوں نہ ہوں اس قدر یقینی ہے کہ وہ بے انتہا بے تعصب، وسیع نظر اور "صلح کل" ہوتا ہے اور پڑھا لکھا صوفی تو کچھ اس سے بھی زیادہ۔

اسی طرح غالب کی وطن پرستی کا معاملہ ہے۔ بے شک وہ انگریزوں کو پسند کرتا تھا، گورنروں اور کمشنروں کے لئے قصائد لکھے اور تعریفوں کے پل باندھ دیئے لیکن وہ دلی کی بربادی اور ہندوستان کی سوگواری پر بھی آنسو بہاتا تھا۔ اگر اس عہد کے حالات جاننے والے لوگوں سے کبھی ڈاکٹر عبداللطیف کو

ملنے کا موقع ملے تو وہ اس متضاد جذبے کو بیشتر لوگوں میں پائیں گے۔ غالب اس معاملے میں منفرد نہ تھا اور نہ یہ کمینہ پن اور دنائت طبع کی دلیل تھی لیکن ڈاکٹر صاحب کی یہ رائے قطعی درست ہے کہ وہ موجودہ دور کا قوم پرید نیشلسٹ نہیں تھا اور جن لوگوں نے اس کی وطن پرستی کے گیت گائے ہیں وہ بھی حقیقت سے بالکل دور نکل گئے ہیں۔

ڈاکٹر عبداللطیف نے "صوفیانہ رنگ" کا جلی عنوان قائم کیا ہے اور فرماتے ہیں کہ:۔

"غالب کے کئی نقادوں نے سنجیدگی کے ساتھ یہ بات بھی بتلائی ہے کہ وہ بڑا صوفی تھا۔ واللہ اعلم! کسی خیال کا ذہنی ادراک اور چیز ہے اور اس میں بس جانا اور بات۔ اس کے علاوہ ایسے فقرے جو صوفیانہ مسلک کے حامل ہیں غزل گو شعرا کی قدامت پسند دکان سخن میں عرصے سے موجود ہیں۔ دیکھئے خود غالب اس خصوص میں کیا کہتا ہے آرائش مضامین شعر کے واسطے کچھ تصوف اور کچھ نجوم لگا رکھا ہے ورنہ سوائے موزونیت طبع کے یہاں کیا رکھا ہے۔' محض اس بنا پر کہ غالب کے اشعار میں صوفیانہ خیالات پائے جاتے ہیں ہمیں یہ نتیجہ نہیں نکال لینا چاہئے کہ وہ صوفی تھا۔"

میں جناب مصنف کو بتانا چاہتا ہوں کہ غالب کے کسی نقاد نے آج تک یہ نہیں کہا کہ وہ "بڑا صوفی تھا" اور اس کہنے کے یہ معنی کبھی نہیں ہوتے کہ مرزا اسد اللہ خاں غالب گلی قاسم جان والی مسجد میں خرقہ لپیٹے ایک گوشے میں مراقب بیٹھے رہتے تھے، جب کبھی حالت استغراق میں افاقہ ہوتا ارادت مندوں کا مجمع ان کو گھیر لیتا اور سلسلۂ رشد و ہدایت جاری ہو جاتا تا آنکہ وہ نماز کے وقت اسی طرح شریک نماز ہوتے مگر کبھی صف اول سے قدم نہ بڑھاتے اور نہ زبان طعن و شکوہ دراز کرتے بعد عصر مسجد سے قدم باہر نکالتے اور ہزار ہا ارباب حاجت پیچھے پیچھے نظر آتے لیکن وہ اپنی شان انکسار میں نہ گردن موڑ کر دیکھتے اور نہ کسی کو یہ جرأت ہوتی کہ آگے بڑھ کر اپنی احتیاج پیش کر سکے۔ پھر قدم شریف میں حلقہ قائم ہوتا اور نماز مغرب کے بعد ذکر جہر شروع ہو جاتا اور پھر یہ سرستان حسن ازل اسی طرح آخر رات تک وہاں مشغول طاعت حق رہتے!! کیا صوفی کے صرف یہی معنی ہوتے ہیں؟

سخن شناس نہ دلبرا خطا ایں جا است!

کاش ڈاکٹر صاحب کسی کاوش کی تکلیف نہ اٹھاتے اور نہ تحقیق کی الجھنوں میں بھٹکتے پھرتے۔ غالب نے جو کچھ کہا سچ کہا "آرایش مضامین شعر کے واسطے کچھ تصوف اور کچھ نجوم لگا رکھا ہے ورنہ سوائے موزونیت طبع کے یہاں کیا رکھا ہے۔" جس کسی نے غالب کو صوفی بتایا وہ ان ہی معنوں میں کہ اس کے اشعار میں مضامین تصوف پائے جاتے ہیں اور بقول ڈاکٹر صاحب یہ وہی اشعار ہیں جو "غزل کو شعرا کی قدامت پرست دکان سخن میں عرصے سے موجود ہیں" اور بس۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کو غالب کی سیرت اور اس کے ذاتی حالات میں دھبہ لگانے کا جو شوق دامن گیر ہے اس کا تقاضا ہے کہ وہ بغیر سبب عیب پیدا کرتے ہیں اور افسوس یہ کہ یہ کام بھی ان کے بس کا نہیں، اس لئے کہ جس قدر دعاوی انھوں نے اس بحث کے سلسلے میں فرمائے ہیں ان میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں جس کا ثبوت وہ فراہم کر سکے ہوں۔ ابتداءً خارجی اثرات کی تلاش میں ڈاکٹر صاحب نے غالب کی ذات میں بٹہ لگانے کی کوشش کی ہے اور اپنی اس مکروہ ذہنیت کو تحقیقات علمی کا جامہ پہنا کر غالب کے باپ دادا کو اس لئے ذلیل قرار دیا ہے کہ ان کا پیشہ " اجورہ داری" تھا اور اس پیشے کی ارذل خصوصیات ورثتاً غالب کی سیرت کا جزو بن گئی ہیں لیکن وہ اپنی اس "تجویز" کو پایۂ تحقیق تک پہنچانے کے لئے دوسرے اہل علم کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ نظریۂ توریث کو تسلیم کرنے کے بعد غالب کے ذاتی عیوب اور ذہنی رکاکت کے ثبوت فراہم کریں اور اگر نظریۂ توریث کے قائل نہ ہوں تو دوسرے طریقوں پر ان عیوب کا سراغ نکال کر ان کو نمایاں کریں۔ لیکن غالباً عام طور پر اردو بولنے والے اس بنیادی اور نسبی عیب کی حقیقت نہ سمجھے ہوں جس کو مصنف نے " اجورہ داری" سے موسوم کیا ہے۔ ان کی تصنیف کے اکثر اجزا کی طرح یہ بھی انگریزی لفظ Mercenary کا غیر معروف ترجمہ ہے جس کے معنی انگریزی میں جو کچھ بھی ہوں اردو میں مرزا غالب کے آباو اجداد کے پیشہ سپہ گری کو ظاہر کرتا ہے۔ فن سپہ گری سے دنائت و رکاکت کو اس لئے وابستہ کیا گیا ہے کہ ہندوستان کے دور انحطاط میں بعض اشخاص فوجی ملازمت قومی اغراض کے خلاف قبول کر لیتے ہیں۔ بلکہ اس زمانۂ ہیجان و ابتلا میں قومی اغراض

کیا تھیں یہ ایک وسیع سوال اور جداگانہ بحث ہے اور اس سے خود مصنف کو بھی بحث نہیں۔
باب ششم میں پہ عظمت شاعری کو واضح کرنے کے لئے غیر ملکی نقادان فن کے مختلف اقوال نقل ہیں اور اس کے بعد غالب کے کلام پر اصل تنقید شروع ہوتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہی وہ حصہ ہے جو سب سے زیادہ غیر دلچسپ اور بے معنی ہے۔ لہٰذا اس کے متعلق کچھ لکھنا خود ڈاکٹر عبداللطیف صاحب پر ظلم ہوگا اس لئے کہ نہ وہ اس مضمون سے دلچسپی رکھتے ہیں اور نہ اس کو سمجھنا چاہتے ہیں

یارب نہ وہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات　　　دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

ڈاکٹر صاحب کی روایت کے مطابق غالب اور خدا کے تعلقات بھی اچھے نہ تھے ورنہ شاید یہ امید ہوتی کہ غالب کی یہ دعا جو اس وقت میرے واسطے سے ان کے لئے کی گئی ہے مقبول ہو جائے اور ان کو " اور دل " مل جائے تب کہیں یہ مشکل حل ہو سکے۔ کلام غالب پر جو تنقید کی گئی ہے اس کی ایک مثال بھی اگر پیش نظر ہو تو سطور بالا کی حقیقت واضح ہو سکتی ہے۔ ملاحظہ ہو:-

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے　　　عرش سے پرے ہوتا کاش کہ مکاں اپنا

"بتلائیے اس شعر میں کون سا فلسفہ ہے۔ اگر حیدر آباد سے کسی شخص کو لندن لے جانے کے وسائل حاصل ہو جائیں اور وہاں پہنچ کر سینٹ پال کی سب سے اونچی چوٹی پر جا بیٹھے تو وہ یقیناً قدیم لندن کی سرزمین پر ایک طائرانہ نظر ڈال سکے گا۔ لیکن اصل مرحلہ تو یہ ہے کہ پہلے وہ لندن جائے اور پھر اس کو وہاں کے مشہور و معروف گرجا پر چڑھنے کا موقع حاصل ہو۔ کیا غالب کو اپنی اس زندگی میں کبھی عرش کے آستانے تک بھی رسائی ہوئی؟"

میرے ایک دوست سوال کرتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کو سینٹ پال تک تکلیف کرنے کی کیا ضرورت پیش آئی کیا چار مینار جو گھر کے گھری میں تھا اس قابل نہ تھا کہ اس کی مثال دی جا سکتی اور اگر عرش آشیاں ہونے کے لئے یورپ کا سفر ضروری تھا تو پھر ایفل ٹاور اس کام کے لئے زیادہ موزوں تھا کہ پیرس کی دلکشی اور مینار کی بلندی دونوں اپنی خصوصیات میں ممتاز ہیں۔ دوسرے یہ بھی دریافت طلب ہے کہ عرش کے لئے کوئی آستانہ ضروری ہے یا نہیں اور عرش اور اس کے آستانے میں کوئی

حدود اضمی ہیں یا ان دونوں کے لئے کوئی ایسا معیار ہے جس سے ذہن ان کی حقیقت تک پہنچ سکے مختصر یہ کہ عرش کسے کہتے ہیں اور اس کا آستانہ کیا چیز ہے؟ کیا عبداللطیف صاحب اس کا جواب دے سکتے ہیں؟

جیسا کہ ابتدا میں ظاہر کیا جا چکا ہے "غالب" نہ صرف انگریزی زبان میں مرتب کی گئی ہے بلکہ اس کی "ترکیب اعضا" طرز ادا، معیار تنقید، غرض سب کچھ انگریزی ہے۔ جس مغربی ذہنیت سے مصنف نے مشرق کے بلند پایہ شاعر پر نکتہ چینی کی ہے وہ سادگی کی دلیل ضرور ہو سکتی تھی اگر اس میں اپنی سیرت کی خصوصیات اور عالی ظرفی کے رجحانات کو دخل نہ دیا جاتا اس لئے کہ اب وہ کتاب ایک فتنے کی حیثیت رکھتی ہے جس سے بجز گمراہی اور فساد خیال کے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ اور اصل انگریزی میں اس کی یہ خصوصیت اور زیادہ خطرناک ہو جاتی ہے اس لئے کہ اردو ادب سے ناواقف مطالعہ کرنے والے مرزا غالب کی نسبت جو رائے قائم کریں گے وہ اصل حقیقت کے بالکل خلاف ہوگی ہمیں حیرت ہے سید معین الدین قریشی پر کہ انھوں نے اپنی قابلیت اور وقت کا یہ مصرف کیوں نکالا کہ "غالب" جیسی کتاب کو اردو میں ترجمہ کر کے پیش فرمایا اور یہ حیرت محض اس لئے ہے کہ ترجمہ اچھا ہے اور زبان شگفتہ ورنہ جہاں تک ان کے جذبۂ شوق کا تعلق ہے وہ خوشی سے اس سعادت میں شریک ہوں اور غالب کو مطعون کرنے میں امداد فرمائیں لیکن شاید وہ واقف نہیں کہ اس کتاب میں مصنف کا طرز استدلال اور اظہار خیال آپ اپنی تشریح ہے اور مطالعے کے بعد یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ جناب مترجم نے غالب کو زیر بار احسان کیا ہے یا ڈاکٹر عبداللطیف کو رسوا کرنا چاہا ہے۔

"دکھنی کا آغوش یافتہ" بجائے "تربیت یافتہ" کے استعمال کیا گیا ہے (ص ب)۔ "اجرہ دار" Mercenary کا ترجمہ معلوم ہوتا ہے لیکن جس موقعے پر استعمال ہوا ہے وہاں نہ یہ مطلب ادا ہوتا ہے اور نہ سپاہی و عسکری کے معنوں میں یہ استعمال کیا جا سکتا ہے (ص ۶۰)۔ ایک موقعے پر لفظ "خانہ ساز" کا عجیب و غریب استعمال ہوا ہے اور افسوس کہ اسی جملے میں غالب کی تعریف بھی کی گئی ہے خواہ دو حرفی ہی کی زبانی کیوں نہ ہو۔ ملاحظہ ہو:۔

"اس لحاظ سے اس کو اردو نثر کے خانہ سازوں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔"

جناب مترجم نے غالباً انگریزی لفظ Architect کا ترجمہ فرمایا ہے لیکن اردو زبان میں "خانہ ساز" دوسرے معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور اس کو فن تعمیر و بنائے مکان سے صرف دور کا واسطہ ہے۔ یا ایک دوسری جگہ لکھا ہے "جو صاحب اصل مسودے پر کام کرنا چاہیں"۔ یہ جملہ زیادہ غیر مانوس نہیں لیکن اردو میں یہ مطلب دوسری طرز سے ادا کیا جاتا ہے محض انگریزی کی نقالی اردو کے لئے باعث فخر نہیں ہے۔ ایک موقعے پر لکھا ہے کہ "اب ہم پھر غالب کی طرف رجوع ہوتے ہیں"۔ "رجوع کرنا" عام طور سے مستعمل ہے اور فصیح ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر عبداللطیف کی یہ تصنیف ذہنی غلامی کی مکمل مثال ہے۔ انھوں نے اس روح سے کام لیا ہے جو آج سے چند قرن پہلے یورپ کے تعلیم یافتہ افراد میں ظاہر ہوتی تھی اور جس کے بعض نمونے اب بھی کہیں کہیں نظر آجاتے ہیں۔ اکبر الہ آبادی، اقبال اور پھر سیاسی و اجتماعی تحریکات نے اس غلامی کے خلاف جہاد کیا اور مسلسل جد و جہد کے بعد اب عزت نفس کی حقیقت ہندوستانیوں پر کچھ کچھ منکشف ہو چلی ہے لیکن اس لعنت کے جراثیم امراض وبائی کی طرح کبھی کبھی سر اٹھاتے رہتے ہیں اور ڈاکٹر عبداللطیف کے اس کتابی پیکر میں یہی مادۂ فاسد اب پھر رونما ہوا ہے۔ اکبر الہ آبادی نے کسی دوسرے موقعے پر اس کی طرف اشارہ کیا ہے:۔

انھیں کے مطلب کی کہہ رہا ہوں زبان میری ہے بات ان کی
انھیں کی محفل سنوارتا ہوں چراغ میرا ہے رات ان کی
فقط مرا ہاتھ چل رہا ہے انھیں کا مطلب نکل رہا ہے
انھیں کا مضمون، انھیں کا کاغذ، قلم انھیں کا دوات ان کی

بلاغت اور اس کی مختصر تاریخ

قوت گویائی انسان کی ایک اہم ترین صفت ہے جس کے بغیر وہ اپنی تمدنی اور معاشرتی مشکلات حل نہیں کر سکتا۔ قدرت نے جس طرح ہر چیز کو حسن و قبح کے دو پہلو عطا فرمائے ہیں زبان کو اس فطری اور نیچرل تقسیم سے محروم نہیں رکھا۔

یہ قوت ہر شخص میں حسب قابلیت کم و بیش پائی جاتی ہے۔ بعض لوگ معمولی طریقے سے بھی اپنے دل کی بات دوسروں کو نہیں سمجھا سکتے اور بعض معمولی سے معمولی بات کو بھی اس خوبصورتی سے ادا کر سکتے ہیں جس کا سامعین پر اچھا خاصا اثر پڑتا ہے۔ زبان کے اسی خوبصورت پہلو کا نام بلاغت ہے۔

معاشرت انسانی کی مختلف ضرورتوں کے اعتبار سے جب کوئی زبان عالم وجود میں آتی ہے تو جس طرح ابتدا میں معاشرت کے طریقے سیدھے سادے اور بے تکلف ہوتے ہیں اسی طرح زبان بھی شروع شروع نہایت سادے لباس میں جلوہ نما ہوتی ہے۔ مبالغہ اور مضموں آفرینی کا کہیں پتہ نہیں ہوتا۔ تشبیہات و استعارات شاذ و نادر کہیں کہیں آجاتے ہیں۔ جس مضمون کو ادا کرنا ہوتا ہے اس کو بغیر کسی ایچ پیچ کے بے تکلف ادا کر دیا جاتا ہے۔ لیکن جوں جوں معاشرت کے طریقے وسیع ہوتے جاتے ہیں سامان زندگی میں تکلفات پیدا ہوتے جاتے ہیں، نفاست و لطافت بڑھتی جاتی ہے۔ اسی قدر زبان بھی تمدن کے ساتھ ساتھ عروج کرتی جاتی ہے، الفاظ میں تراش خراش پیدا ہو جاتی ہے، استعارات و تشبیہات میں نزاکت اور رنگینی آجاتی ہے، مبالغے میں زور اور مضمون نگاری میں ترقی ہوتی جاتی ہے۔

عربی ادب میں جاہلیت کا کلام دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ کوہ و صحرا، دشت و بیابان، دشوار گزار راستے اور مٹے ہوئے کھنڈر ان کے ادبی ذوق کے جولان گاہ تھے لیکن یہی بادیہ پیما عرب جب حکومت اور دولت کے منصب پر فائز ہوئے تو ان کے کلام میں دقت آفرینی اور رنگیں بیانی کی کوئی حد نہیں رہی جس کا صحیح اندازہ متنبی، ابونواس، بحتری، ابو تمام وغیرہ کے کلام کا مطالعہ کرنے سے بخوبی ہو سکتا ہے۔

ہر زبان کے لٹریچر سے بلاغت کو وہی تعلق ہے جو روح کو جسم سے ہے۔ کلام میں جان اسی وقت پڑتی ہے جب وہ بلیغ انداز سے ادا کیا گیا ہو اور سامعین پر کوئی خاص اثر ڈالتا ہو ورنہ ناقابل التفات سمجھ کر ٹھکرا دیا جاتا ہے۔

بلاغت چونکہ ایک فطری اور وجدانی چیز ہے اس لئے چند الفاظ میں اس کی کوئی جامع و مانع تعریف نہیں کی جا سکتی۔ گو متاخرین نے اس کو الفاظ کی زنجیروں میں جکڑ کے دریا کو کوزے میں بند کرنا چاہا ہے لیکن دراصل اس کے ذوقی اور وجدانی ہونے کی وجہ سے یہ راہ عمل غلط ہے بلکہ متقدمین کے مسلک کے مطابق اس کی حقیقت کا مختلف طریقوں سے سمجھنا دراصل صحیح ہے تاکہ ان سب کے مجموعے سے بلاغت کا ایک صحیح نقشہ پیش نظر ہو جائے۔

عربی علم بلاغت پر اگر گہری نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ زمانۂ جاہلیت میں کسی بلیغ کلام کی جانچ پڑتال کے لئے کچھ قواعد مقرر نہ تھے بلکہ بلاغت کے ان طبعی اور فطری اصول پر جو قدرت نے ہر سخن فہم اور دقیقہ سنج طبیعت کو عنایت فرمائے ہیں کلام کے حسن و قبح کی جانچ پڑتال کی جاتی تھی۔

اس فن کی تدوین کا خیال اس وقت پیدا ہوا جب دنیا کے سامنے داعیِ حق پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید پیش کیا اور ساتھ ہی اس کے اعجاز اور بلیغ ہونے کا دعویٰ بھی کیا علمائے کرام نے اس دعوے کے ثبوت کے لئے اصول بلاغت کی طرف توجہ کی۔ عربی زبان میں ایک نیا دور شروع ہوا علوم و فنون مدون ہونے لگے اور عربی زبان کی گرامر مرتب کی گئی۔

سب سے پہلے حضرت علیؓ نے ابوالاسود دئلی کو جو آپ کے شاگرد اور کبار تابعین میں سے تھے عربی گرامر کے چند قواعد کی تعلیم فرمائی۔ ابوالاسود دئلی نے انھیں پر قیاس کر کے چند اور اصول مرتب کئے اور حضرت علیؓ کی خدمت میں پیش کر کے ان کی تصحیح بھی کرائی۔

علامہ ابن خلدون نے اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

اول من کتب فیہا ابوالاسود الدئلی من بنی کنانۃ ویقال باشارۃ علی

ابوالاسود دئلی پہلا شخص ہے جس نے اس موضوع پر خامہ فرسائی کی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ انھوں نے یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ

رضی اللہ عنہا۔ | کے اشارے سے کیا تھا۔ (مقدمۂ ابن خلدون مصری صفحہ ۴۸۰)

کتاب کی شکل میں سب سے پہلے علامہ جاحظ (المتوفی ۲۵۵ھ) نے ایک تصنیف پیش کی جس کا نام "کتاب البیان والتبیین" ہے۔ اس کا دوسرا نام "التبیین والتبیان" بھی ہے۔

جاحظ اپنے زمانے کا بہت بڑا فاضل انشا پرداز تھا۔ لوگ اس کو ادبا عرب کا سردار اور فصاحت و بلاغت کا امام مانتے ہیں۔ ارباب علم و ادب میں شاید ہی کوئی شخص اس کے مرتبۂ کمال تک پہنچا ہو۔

اس نے یوں تو مختلف فنون میں بہت سی بے نظیر کتابیں لکھی ہیں لیکن "البیان والتبیین" سے ان کو کوئی نسبت نہیں۔ یہ اپنے موضوع پر بالکل اچھوتی سب سے بہتر کتاب ہے۔ اس میں خطباء و شعراء کا کلام، دلچسپ حکایات و لطائف اور مواعظ کے نمونے بڑی خوبی سے جمع کئے گئے ہیں۔

علامہ ابن خلدون نے فن ادب پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

سمعنا من شیوخنا فی مجالس التعلیم ان اصول ھذا الفن و ارکانہ اربعۃ وھی ادب الکاتب لابن قتیبہ و کتاب الکامل للمبرد و کتاب البیان والتبیین للجاحظ و کتاب النوادر لابی علی القالی وماسوی ھذہ الاربعۃ فتبع لھا و فروع عنھا

ہم نے اپنے اساتذہ سے علمی درسگاہوں میں سنا ہے کہ اس فن کے اصول و ارکان صرف چار کتابیں ہیں۔ ابن قتیبہ کی ادب الکاتب، مبرد کی کتاب الکامل، جاحظ کی کتاب البیان والتبیین اور ابو علی القالی کی کتاب النوادر۔ ان چار کے علاوہ بقیہ کتابیں سب انھیں کی تابع اور فروع ہیں۔

(مقدمہ ابن خلدون مصری صفحہ ۴۸۴)

اسی صدی ہجری میں عبداللہ بن المعتز عباسی (المتوفی ۲۹۶ھ) بھی تھا۔ یہ اپنے عہد کا بہت بڑا نازک خیال اور بلیغ شاعر تھا۔ اس نے بھی اس موضوع پر چند کتابیں لکھی ہیں جن میں سے کتاب البدیع سب سے زیادہ مشہور ہے۔ یہ فن بدیع میں سب سے پہلی کتاب ہے۔

علامہ جرجی زیدان نے اپنی کتاب "تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ" میں اس کا تذکرہ کرتے ہوئے

لکھا ہے کہ کتاب البدیع کا ایک نسخہ اب تک کتب خانۂ اسکوریال میں موجود ہے۔ واللہ اعلم۔

چوتھی صدی ہجری میں قدامہ ابن جعفر بغدادی (المتوفی ۳۱۰ھ) نے تنقید نثر و نظم پر سب سے پہلے نقد الشعر اور نقد النثر دو مستقل کتابیں لکھیں جن میں سے نقد الشعر زیادہ مقبول ہوئی۔ آج کل بعض یونیورسٹیوں میں داخل نصاب ہے۔

اس کتاب میں نہایت خوبی سے شعر کی تعریف کی گئی ہے اور لفظ و معنی کی باہمی ترکیب کے اعتبار سے شرائط نظم مفصل بیان کئے گئے ہیں۔

قدامہ نے اور بھی بہت سی کتابیں تصنیف کی ہیں جن کا تذکرہ صاحب الفہرست نے صفحہ ۱۳۰ میں کیا ہے۔

کچھ عرصے کے بعد ابو ہلال عسکری (المتوفی ۳۹۴ھ) نے نثر و نظم کی تنقید کے سلسلے میں ایک اور قیمتی کتاب تصنیف کی جس کا نام کتاب الصناعتین ہے۔ اس کتاب میں نثر و نظم کے بلند پایہ انتخابات، چیدہ چیدہ اشعار، بلیغ سے بلیغ خطبے بہت ہی خوبی سے جمع کئے گئے ہیں۔ ایک ایک مسئلے کی متعدد مثالیں پیش کر کے فصاحت و بلاغت پر خوب خوب موشگافیاں کی ہیں اور بتایا ہے کہ ایک خطیب یا مضمون نگار اپنے لیکچر یا خامہ فرسائی میں کیوں کر کامیاب ہو سکتا ہے۔

مثلاً وہ اصول خطابت پر بحث کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ ایک مقرر کا فرض ہے کہ تقریر کرتے وقت اس کا دل قوی اور مضبوط ہو، اعضا ساکن اور مطمئن ہوں، زبان صاف اور شستہ ہو، آواز اچھی اور معتدل ہو، موقعے اور محل کے مناسب مضامین کا انتخاب کر سکتا ہو، سامعین کے مذاق اور میلان طبع سے واقف ہو، امرا اور عوام کے مراتب کا لحاظ رکھتا ہو تاکہ سامعین کے جذبات برانگیختہ ہو سکیں۔

پانچویں صدی ہجری میں علامہ ابن رشیق قیروانی (المتوفی ۴۵۶ھ) نے ایک نہایت ہی بیش بہا کتاب لکھی جس کا نام کتاب العمدۃ فی الشعر و نقدہ ہے۔ اس کتاب کا نام ہی اس کا عنوان ہے۔ اس موضوع پر پہلے قدامہ ابن جعفر، ابو ہلال عسکری وغیرہ نے گو قابل قدر کتابیں لکھیں مگر جس خوبی اور وضاحت سے کتاب العمدہ میں اشعار پر تنقید کی گئی ہے کسی اور کتاب میں اس کی چوتھائی بھی نہیں۔ تنقید اشعار کے

سلسلے میں مختلف طریقوں سے اصول بلاغت منضبط کئے گئے ہیں۔ شعراء کی اصطلاحیں، ان کے خاص خاص عنوانات، ان کے باہمی مباحثے، نظم و نثر کا مقابلہ، ان پر تنقید و نکتہ چینی کے طریقے، لطائف و ظرائف، شعراء کے طبقات، ان کے باہمی امتیازات اور وہ تمام اصول جو صحیح طور پر بلاغت کے لئے دستور العمل بننے کے قابل ہیں تفصیل سے بتائے گئے ہیں۔ ابن خلدون نے اپنے مقدمہ میں کئی جگہ اس کا ذکر کیا ہے اور آخر میں تنقید اشعار پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

وبالجملہ فہذہ الصناعۃ وتعلمہا مستوفیٰ فی کتاب العمدۃ لابن رشیق۔	خلاصہ یہ ہے کہ یہ فن اور اس کا تعلم پورے طور پر ابن رشیق کی کتاب العمدہ میں پایا جاتا ہے۔ (مقدمہ ابن خلدون مصری صفحہ ۵۰۴)

اس دور کی آخری کڑی شیخ عبد القاہر جرجانی (المتوفی ۴۷۱ھ) تھا۔ یہ شخص علم کلام، علم نحو، علم فقہ کا امام اور فن بلاغت کا مؤسس مانا جاتا ہے۔ اس نے صحیح معنوں میں علم بلاغت کو جامۂ تدوین سے آراستہ کیا۔ اس کے منتشر اور پراگندہ شیرازے کو یکجا کرکے ہر ایک کے لئے جدا جدا فصول اور ابواب قائم کئے، فن معانی کو فن بیان سے علیحدہ کرکے دلائل الاعجاز اور اسرار البلاغہ ہر ایک کے لئے علیحدہ علیحدہ کتابیں تصنیف کیں جن میں بجائے عقلی دلائل کے ادبی ذوق کا لحاظ رکھتے ہوئے نہایت ہی ادیبانہ انداز میں مثالیں پیش کرکے بتایا ہے کہ دیکھو اس کلام میں جو کچھ زور ہے وہ محض اس لئے کہ فلاں لفظ فلاں جگہ پر ہے یا فلاں لفظ فلاں لفظ سے مقدم یا مؤخر ہے۔ اگر اس ترتیب کو بدل دیا جائے تو کلام میں وہ خوبی باقی نہیں رہتی جو موجودہ حالت میں ہے۔

الفاظ کا باہمی تناسب اور ان کی نشست ہر کلمے کی دوسرے کے ساتھ موزونیت اور کھپت فصاحت کی جان ہے۔ کبھی دو کلمے ہم معنی ہوتے ہیں مگر کسی عبارت یا شعر میں ایک ہی کلمہ کھپ سکتا ہے اگر اس کے بجائے دوسرا کلمہ رکھ دیا جائے تو کلام میں بھداپن پیدا ہوجاتا ہے اور جب کلام میں ایسے الفاظ جمع ہوجاتے ہیں باہم مناسبت رکھتے ہیں تو زبان میں خود بخود ان کے ادا کرنے میں ایک سلاست اور روانی پیدا ہوجاتی ہے جس کو فن بدیع کی اصطلاح میں انسجام کہتے ہیں۔
صناعۂ لفظی و معنوی اور ان کے تمام اقسام اس قدر تفصیل سے بیان کئے ہیں کہ کسی شخص نے

اب تک ان مسائل پر اتنی وضاحت وخوبی سے خامہ فرسائی نہیں کی۔ پھر یہ بھی بتایا ہے کہ ایک کلام کو دوسرے کلام پر فضیلت محض انتخاب الفاظ کی وجہ سے نہیں ہوتی بلکہ اس میں معنی کو بڑا دخل ہے۔ الفاظ سے جس قدر حصہ متعلق ہے اس کو فصاحت کہتے ہیں اور جن چیزوں کا تعلق معنی سے ہے ان کو بلاغت کہتے ہیں۔

چھٹی صدی ہجری تک متقدمین کا یہ مذاق باقی رہا۔ وہ اس فن کے اصلی مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہمیشہ اصول بلاغت ادیبانہ انداز میں بیان کرتے رہے تاکہ متعلم کو خطابت وصحافت میں کافی دستگاہ حاصل ہوجاوے اور وہ ہر موضوع پر تحریر وتقریر کا ایک اعلیٰ نمونہ پیش کرسکے۔

لیکن ساتویں ہجری میں جب ابویعقوب یوسف سکاکی (المتوفی ۶۲۶ھ) کا دور آیا تو افسوس ہے کہ دریا کا رخ دوسری طرف پھر گیا۔ اس نے علم بلاغت کو منطقی رنگ میں رنگ دیا اور علوم ادبیہ کو پس پشت ڈال کر معقولات کا ایک بڑا طومار اضافہ کردیا۔

متاخرین نے سکاکی کی کتاب "مفتاح العلوم" کو بہت سراہا۔ اس کے متعدد خلاصے اور حاشیے لکھے گئے اور فلسفیانہ رنگ میں اس کثرت سے شروح وحواشی پڑھائے جانے لگے کہ اصل فن کا کہیں پتہ نہیں رہا۔ جن میں علامہ تفتازانی (المتوفی ۷۹۱ھ) کی تصنیفات مطوّل اور مختصر معانی سب سے زیادہ مقبول ہوئیں اور مدت سے درس نظامی میں داخل ہیں جو اس وقت ہندوستان کے زیادہ تر مشرقی مدارس میں رائج ہے اور جس کی تحصیل کئے بغیر کوئی شخص عالم کہے جانے کا مستحق نہیں ہوسکتا۔

زمانے کی رفتار اور جدید مذاق کے ساتھ ساتھ دنیا کی تمام چیزیں بدلتی جارہی ہیں لیکن ہمارا عربی نصاب تعلیم جو آج سے صدیوں پہلے فلسفہ ومنطق کے عروج کے دور میں تیار کیا گیا تھا آج بھی بلا کسی ترمیم وتنسیخ کے رائج ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ عربی زبان باوجود ہماری مذہبی زبان اور ہمارے ذوق سے قریب تر ہونے کے ہم کو مدتوں میں ویسی نہیں آتی جیسی انگریزی زبان باوجود ایک اجنبی زبان ہونے کے تھوڑے عرصے میں آجاتی ہے اس لئے کہ اس میں زمانے کے مذاق کے مطابق ایک روح ہوتی ہے جس کا ہمارے یہاں کہیں نشان تک نہیں ملتا۔

یہ سب کچھ دراصل اس بے نتیجہ طریقہ تعلیم کا اثر ہے جو بدقسمتی سے ہندوستان کے اکثر مدارس میں مروج ہے۔ عالم اسلامی علماء کے اس جمود اور کورانہ تقلید پر جس قدر بھی ماتم کرے کم ہے۔

جمالیہ عربک کالج (مدراس)

کالج کی مختصر تاریخ | ۵۰ برس کا زمانہ گزرتا ہے کہ جناب حاجی جمال محی الدین صاحب نے اس کالج کی بناڈالی تھی۔ شروع شروع میں یہ کالج عربی کا مدرسہ تھا جس میں عربی زبان میں بہت سے علم پڑھائے جاتے تھے جس طرح کہ ہندوستان کے دوسرے عربی مدرسوں میں تعلیم دی جاتی ہے۔

آج سے آٹھ سال پہلے حاجی صاحب موصوف کے سعادت مند فرزند سیٹھ جمال محمد صاحب ایم' ایل' اے نے اپنے مدرسے کے نصاب تعلیم میں تھوڑی سی تبدیلی پیدا کردی۔ وہ یہ کہ پرانے علوم کے ساتھ چند نئے علوم کی تعلیم بھی لازمی کردی اور اسی وقت سے اس مدرسے کا نام "جمالیہ عربک کالج" ہوگیا۔

طریقۂ تعلیم | جمالیہ عربک کالج میں تعلیم کا طریقہ نہ بالکل جدید ہے اور نہ قدیم۔ انگریزی تعلیم کو لازمی قرار دینے کے باوجود مشرقیت کو برقرار رکھنے کا ہر وقت خیال رکھا جاتا ہے۔ زمانۂ قدیم میں تعلیم کے دو طریقے تھے۔ ایک تو یہ کہ استاد پڑھتا تھا اور طلبہ سنتے جاتے تھے اور ضروری اشارات اور بعض وقت استاد کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ اپنی کاپی میں لکھتے جاتے تھے۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ شاگرد پڑھتا تھا اور استاد معانی اور ضروری بحثوں کی تشریح کرتا تھا۔ جمالیہ عربک کالج میں یہ دونوں طریقے عمل میں لائے جاتے ہیں۔ اسکول میں اکثر وبیشتر طلبہ ہی کو پڑھنا پڑتا ہے اور کالج میں یہ فرض استاد انجام دیتا ہے لیکن ایک تہائی کے قریب طالب علموں کو بھی قرأت میں شریک ہونا پڑتا ہے۔ تعلیم حدیث کے سلسلے میں ایسا کرنا استاد و شاگرد دونوں کے لئے باعث سعادت سمجھا جاتا ہے۔

تقسیم نصاب | سردست جمالیہ کالج میں مدت تعلیم آٹھ سال رکھی گئی ہے۔ چار سال اسکول کے لئے اور چار کالج کے لئے۔ اسکول کے چار سالوں کی تقسیم اس طور پر کی گئی ہے کہ پہلے دو سالوں میں عربی زبان اور دینیات پر زور دیا جاتا ہے۔ اسکول کے تیسرے سال سے انگریزی بھی شروع کرادی جاتی ہے۔ اسکول میں ذریعۂ تعلیم تامل زبان ہے مگر اسکول کے پہلے ہی سال سے اس بات کی کوشش کی جاتی

ہے کہ طلبہ کو اردو بھی آجائے۔ اس کے لئے شروع ہی سے اردو کا ایک گھنٹہ رکھا جاتا ہے۔

کالج میں ذریعہ تعلیم عربی اور اردو زبان کو رکھا گیا ہے۔ کالج کے پہلے ہی سال سے اردو کی طرف خاص توجہ کی جاتی ہے جو کالج کے آخری سال تک باقی رہتی ہے۔ اسی کے ساتھ طلبہ کو انٹرمیں تک انگریزی حساب، اقلیدس، الجبرا، تاریخ ہند و انگلستان (تاریخ اسلام کے علاوہ) اور جغرافیہ وغیرہ کی بھی تعلیم دی جاتی ہے اور جس وقت طالب علم یہاں سے فارغ ہو کر نکلتا ہے تو عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ مذکورہ بالا علوم سے بھی بقدر ضرورت واقف ہوتا ہے۔

سال آئندہ سے ایک تجویز اور بھی زیر غور ہے کہ فارغ التحصیل طلبہ کو دو سال کی مدت اور دی جایا کرے۔ اس زمانے میں یہ طلبہ دینیات کے کسی ایک یا دو فنون میں مہارت پیدا کریں۔ اسی کے ساتھ ان کو مذاہب عالم کا بھی مطالعہ کرایا جائے۔

مقصد تعلیم جمالیہ عربک کالج کی خصوصیت اس کا مقصد تعلیم ہے۔ انگریزی اور عربی کے جداجدا اسکولوں کے قیام نے ان دونوں زبانوں کے جاننے والوں میں ایک خلیج حائل کر دی ہے۔ تحریک آزادی کے بہت زیادہ ترقی کر جانے کے باوجود عربی اور انگریزی تعلیم یافتہ طبقوں میں وہ اتحاد و اتفاق نہ پیدا ہو سکا جس کی ضرورت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دونوں طبقے ایک دوسرے کے مذاق اور رجحان سے ناآشنا ہیں اور اسی وجہ سے وہ تفریق جو دونوں میں پیدا ہو گئی ہے کسی طرح نہیں مٹتی۔ سیٹھ جمال محمد صاحب کو اس چیز کا احساس تھا۔ اسی لئے موصوف نے ہندوستان کے بعض مخصوص علما کے علاوہ اپنے ممالک اسلامیہ کے سفر کے زمانے میں مصر میں علامہ طنطاوی (مصنف تفسیر جواہر) سے اس سلسلے میں تبادلۂ خیال کیا۔ علامہ موصوف نے علوم عربیہ کے ساتھ ساتھ علوم جدیدہ کی تعلیم کی پرزور تائید کی۔ لہٰذا جمالیہ کالج میں عربی کے ساتھ ساتھ انگریزی وغیرہ کو نصاب تعلیم میں داخل کر لیا گیا تاکہ وہ تفریق بھی دور ہو جائے جو بدقسمتی سے دو تعلیم یافتہ طبقوں میں پیدا ہو چکی ہے۔ اسی کے ساتھ علوم جدیدہ سے ضروری واقفیت پیدا ہو جائے تاکہ وقت کی ضروریات کا صحیح اندازہ کیا جا سکے۔ غرض کہ جمالیہ دین و دنیا دونوں کی تعلیم دینا چاہتا ہے اور جنوبی ہند میں جمالیہ کالج اسی نصب العین کو سامنے رکھتا ہے۔ جو شمالی ہند میں جامعہ ملیہ دہلی کے پیش نظر ہے۔

دارالاقامہ | جالیہ کالج کے دو بورڈنگ ہیں۔ ایک بڑا بورڈنگ جس میں تقریباً ۵۰ طلبہ رہتے ہیں۔ بڑا بورڈنگ ایک شاندار عمارت ہے۔ اس کے اردگرد کافی کشادہ میدان ہیں۔ اس کے کمرے اس قدر چوڑے اور آرام دہ ہیں کہ ایک کمرے میں پانچ آدمی بآرام رہ سکتے ہیں۔ بورڈنگ کسی ایک استاد کی نگرانی میں دیدیا جاتا ہے اور استاد (نگران دارالاقامہ) کی آسانی کے لئے انتظام کی یہ صورت رکھی گئی ہے کہ ہر کمرے کے رہنے والے طلبہ میں سے کسی ایک کو مانیٹر مقرر کر دیا جاتا ہے جو ان کے چال چلن، تعلیم، نماز اور کھیل وغیرہ کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ مؤدب (نگران دارالاقامہ) کی طرف سے سارے بورڈنگ کا ایک طالب علم کو ذمہ دار قرار دے دیا جاتا ہے جو تمام کمروں کے مانیٹروں سے ان کے ساتھیوں کے متعلق بازپرس کرتا ہے۔ عام نگرانی اس کا فرض منصبی ہوتا ہے۔ چھوٹے دارالاقامے میں پندرہ طالب علم رہتے ہیں اور اس میں بھی انتظام کی یہی شکل ہے۔

طلبہ کی انجمنیں | طلبہ کی دو انجمنیں ہیں۔ ایک کالج کی طرف سے جس کا نام لٹریری سوسائٹی ہے۔ ہر مہینے اس کی ایک میٹنگ ہوتی ہے جس کی اطلاع ناظر (پرنسپل) کالج اور انجمن کے سکریٹری (جو ایک طالب علم ہوتا ہے) کی طرف سے دی جاتی ہے۔ باہر کے مقررین بھی بلائے جاتے ہیں چنانچہ ابھی حال میں مسٹر پال کو دعوت دی گئی تھی۔ یہ بزرگ مدراس کے مشہور عیسائی ہیں۔ آپ کی شخصیت اپنے مخصوص خیالات کے باعث تمام دنیا کے عیسائیوں میں بین الاقوامی شہرت حاصل کر چکی ہے۔ موصوف نے انگلستان سے واپسی پر سب سے پہلی تقریر جالیہ کالج میں کی۔ ہندوستان کے بعض مشہور علماء و زعماء بھی اپنی تشریف آوری سے اس سوسائٹی کو مشرف کر چکے ہیں۔

عام طور پر طلبہ خود ہی کوئی عنوان مقرر کرتے ہیں جس کے ماتحت موافق و مخالف خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے۔ اس انجمن کے جلسوں میں اساتذہ بھی شریک ہوتے ہیں۔ اس انجمن کے جلسوں کی صدارت عموماً کوئی نہ کوئی استاد کرتے ہیں۔

دوسری انجمن طلبہ کی نجی انجمن ہے جس کا تعلق بورڈنگ سے ہے۔ اس انجمن کے جلسوں کی نگرانی مؤدب کرتا ہے اور وقتاً فوقتاً طلبہ کو ضروری ہدایات دیتا ہے لیکن طلبہ اپنی کارروائیوں میں بالکل

آزاد ہوتے ہیں۔ اس کے جلسوں میں مختلف زبانوں میں تقریریں ہوتی ہیں جس کی اطلاع پہلے سے دے دی جاتی ہے۔ عام طور پر تامل اور انگریزی اور کبھی کبھی اردو اور عربی میں تقریریں ہوتی ہیں۔

ورزش | ورزش اور کھیلوں کا بھی خاص طور پر خیال رکھا جاتا ہے۔ شام کے وقت چھوٹے بڑے سب لڑکے کسی نہ کسی کھیل میں حصہ لیتے ہیں۔ عام طور پر طلبہ والی بال اور بیڈمنٹن کو زیادہ دلچسپی سے کھیلتے ہیں۔ کھیلنے کے لئے بڑے بڑے میدان موجود ہیں۔

عملی کام | اس کی بھی کوشش کی جارہی ہے کہ طلبہ کو کچھ عملی کام بھی کرنا چاہئے۔ اس کے لئے کچھ زمین ان کو دے دی گئی ہے جس میں وہ کچھ نہ کچھ کرتے ہیں۔ آج کل طلبہ اپنے بورڈنگ کے سامنے کے حصے میں ایک چھوٹا سا باغ لگا رہے ہیں۔ فرصت کے اوقات میں تھوڑا سا وقت عملی کاموں میں بھی صرف کرایا جاتا ہے۔

کتب خانہ | کالج سے متعلق ایک چھوٹا سا کتب خانہ بھی ہے جس میں عربی کے مختلف فنوں کی کتابوں کی اکثریت ہے۔ انگریزی، اردو اور تامل میں بھی بقدر ضرورت کتابیں موجود ہیں۔ کتب خانے میں عام طور پر وہی کتابیں ہیں جو درس و تدریس سے تعلق رکھتی ہیں۔ کالج کی طرف سے ایک مخصوص رقم ماہوار کتابوں کے اضافے پر صرف ہوتی ہے۔

ہندو اساتذہ | جمالیہ کالج کو مخصوص روایات کے ماتحت لانے کے لئے ہندو اساتذہ بھی رکھے گئے ہیں۔ ان کے ساتھ وہ تمام رعایتیں روا رکھی جاتی ہیں جن سے مسلمان اساتذہ مستفید ہوتے ہیں۔ غالباً یہ جمالیہ کالج ہی کی خصوصیت ہے کہ وہ اپنے مخصوص مقاصد کے مطابق بڑی فراخ دلی کے ساتھ اپنے ہاں ہندو اساتذہ کو بھی جگہ دیتا ہے۔

اساتذۂ کالج | جمالیہ کالج کے اسٹاف میں مندرجہ ذیل اساتذہ ہیں:-

(۱) مولوی عبدالوہاب صاحب بخاری، افضل العلما، ایم۔ اے، ایل۔ ٹی (پرنسپل)

(۲) مولانا حسن محمد صاحب جمالی (۳) مولانا محمد یوسف صاحب جمالی (۴) مولانا محمد شریف صاحب جمالی (۵) مولانا محمد حسین صاحب باقوی، افضل العلما (۶) مولوی رحیم احمد صاحب، افضل العلما، بی۔ اے۔

(۷) مولانا کمال الدین صاحب جمالی (۸) مسٹر وردا چاریا بی۔ اے (ہیڈ ماسٹر) (۹) مسٹر اللہ بچے۔ بی اے، بی۔ایل (۱۰) مسٹر پی۔ وی محمد صاحب بی۔ اے (۱۱) مسٹر ایس پرماسیوم (۱۲) مسٹر عبداللہ (۱۳) خلیل احمد

جمالیہ کی حیثیت | نصاب کی مخصوص تبدیلیوں اور ان میں خاطر خواہ کامیابی کی توقع پر جمالیہ عربک کالج کو بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ جنوبی ہند کے مدارس بھی جمالیہ کو ایک کامیاب اور مفید درسگاہ سمجھتے ہیں۔

جمالیہ کا مستقبل | کالج کی صورت اختیار کر لینے کے بعد جمالیہ کے منتظمین اپنے کالج کو ترقی کے انتہائی درجوں تک پہنچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کا نصب العین دین و دنیا دونوں ہی ہیں۔ اس لئے ان کی جد و جہد دونوں چیزوں کے وابستہ کرنے پر صرف ہوتی ہے۔

جمالیہ کے منتظمین کی ان بزرگوں سے جنھیں مسلمانوں کی تعلیم سے دلچسپی ہے یہ درخواست ہے کہ اگر وہ اپنے مفید مشوروں سے ہمیں مستفید فرمانے کی زحمت گوارا فرمائیں گے تو ان مشوروں کو خلوص قلب کے ساتھ قبول کیا جائے گا اور ہم ان کے شکر گزار ہوں گے۔

غول بیابانی

عرب کے نزدیک جن اور شیاطین میں فرق ہے بعض نے جن کو ایک جنس اور شیاطین کو دوسری جنس قرار دیا ہے۔ بعض نے یہ تفریق کی ہے کہ جن تو نیک اور طاہر روحیں ہیں اور موذی اور شریر روحیں شیاطین ہیں شیاطین جو زیادہ خبیث ہیں انھیں مَارِد کہتے ہیں۔ ان ماردین میں جو زیادہ زورآور و تنومند ہیں عفریت کہلاتے ہیں جن کی تعریف شیخ الرئیس بوعلی سینا یوں کرتے ہیں کہ جن وہ حیوان ہوائی ہیں جو مختلف شکلیں اختیار کر سکتے ہیں۔ جنوں کو موت آتی ہے شیاطین کو نہیں آتی۔

حن (بجائے حطی) جنوں کا ایک قبیلہ ہے یا جنوں میں سے بچے، لنگڑے، رذالے، کم ذات حن کہلاتے ہیں۔

شیصبان بھی جنوں کے ایک قبیلے کا نام ہے اور اپنے سرگروہ کے نام سے مشہور ہے۔

عرب جاہلیت کی خرافات میں سے ہے کہ آدھے آدمی اور آدھے جن ایسی خلقت کو شِق کہتے ہیں حن کے متعلق بھی ایک قول یہ ہے کہ انسانوں اور جنوں میں ایک درمیانی خلقت ہے۔

جس کا آدھا جسم سِعْلاۃ (دیونی، ساحرہ جن) کا اور آدھا آدمی کا ہو اسے غُلوق کہتے ہیں۔ اور جس کا آدھا جسم آدمی کا اور آدھا فرشتے کا ہو اسے عِلبان کہتے ہیں۔

جُرہُم کی پیدائش کو آدمی اور فرشتے سے خیال کرتے ہیں۔ جرہم اس قبیلے کے سردار تھے جو یمن سے آکر حوالی مکہ معظمہ میں بس گئے تھے۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے اسی قبیلے میں شادی کی تھی۔

پری اور آدمی سے جو نسل چلی ہے وہ نسناس سے نامزد ہے۔ سدِّ آذربیجان کے اوپر نسناس اور ان کی نسل آباد ہے۔

پریوں اور یاجوج ماجوج کے متعلق خیال ہے کہ یہ نبات و حیوان کے ملنے سے پیدا ہوتے ہیں۔

حضرت ابن عباس کا قول ہے کہ قریش رُوسا جن کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے قرآن شریف نے

ان کی اس بات کو بے عقلی ٹھہرایا۔

ذوالقرنین کے متعلق کہا کرتے تھے کہ اس کی ماں قبرے اور باپ عبرے تھا۔ قبرے کو فرشتہ اور عبری کو آدمی سمجھتے تھے۔ نکاح و جماع جن و انس میں واقع ہونا درست مانتے تھے۔

گھومنے پھرنے والے جنوں کو عرب نَظَرہ بولتے ہیں۔

کوئی جِنّی (جن کا مفرد) یا جِنّیہ جو کسی انسان کا پیچھا کرے اور ساتھ ساتھ پھرے اُسے تابع مؤنث ہو تو تابعہ کہتے ہیں۔

جو گھروں میں آدمیوں کے ساتھ رہتا ہے عامر کہلاتا ہے جمع عمار ہے۔

وہ جن جو بچوں کو چھیڑا کرتا ہے اسے ارواح کہتے ہیں (فقہ اللغۃ للثعالبی)۔

احقب ان جنوں میں سے ایک ہے جنھوں نے قرآن شریف سنا تھا۔

جنوں میں سے طاہر و نظیف و نیکوکار کو مَلَک سے تعبیر کرتے ہیں۔

شیاطین الجن میں سے جو مارد ہیں ان کی بھی نوعیں ہیں۔

انواع ذکور کے نام ہیں

عَیْہَران۔ دیو۔ عیابیر جمع۔ عُطْرُوب یا قُطْرُب۔

انواع اناث کے نام ہیں۔

غول۔ سعلاۃ۔ قطربہ و شہام ہیں۔

بیان مذکورہ سے معلوم ہوا کہ غول (غیبتی) جسے عرب مؤنث جانتے ہیں جن ماردیں میں سے ہے۔ یہ ساحرہ مشہور ہے۔ اردو زبان میں لفظ غول مذکر مستعمل ہے۔

غول طرح طرح کی شکلیں اختیار کرتا رہتا ہے۔ اسی طرح سعلاۃ کو بھی یہ قدرت حاصل ہے یہ بھی ساحرہ مانی جاتی ہے۔ جنگل بیابان میں مسافر کو راستہ بھلا کر اور سنسان جگہ میں لے جا کر اسے مار ڈالنے کی بہت سی حکایتیں غول کی طرف منسوب ہیں۔

عرب اس روشنی کو بھی غول ہی سمجھتے تھے جو دور سے جنگل میں نظر آیا کرتی ہے۔ قبرستانوں اور گھٹوں

میں دیکھی جاتی ہے اس کے پاس تک پہنچو تو ہٹ کر ادھر اُدھر ہو جاتی ہے۔

غول کے خیال نے آہستہ آہستہ مدارجِ تخیل طے کئے۔ تصور نے اس کی شکل انسانی اور پاؤں گدھے جیسے بنائے حتیٰ کہ اس فرضی مخلوق کو بعض عربوں نے دیکھنے اور پہچاننے کا دعویٰ کیا۔

تَأَبَّطَ شَرًّا قدیم شعرائے عرب میں سے ہے۔ اس کے اشعار میں غول کا بہت ذکر آتا ہے یہانتک کہ بیاباں نوردی میں اکثر مواقع پر غول آپ کے رفیقِ طریق رہے ہیں (اغانی جلد ۱۰ صفحہ ۲۰۹)

ایک مرتبہ ان سے غول نے شرارت کی ٹھانی۔ یہ تاڑ گئے اور تلوار کے ایک ہی بھرپور ہاتھ سے اس کے ٹکڑے کر دیے۔ قزوینی نے غول کو جن شیطنہ کی قسم سے قرار دیا ہے۔

حیوٰۃ الحیوان دمیری اور کتاب الحیوان جاحظ (مطبوعہ قاہرہ) میں غول کو عرب کی روایات مذکور کی بنا پر حیوانوں میں شمار کیا ہے۔ اس کی جمع غیلان اور اغوال آتی ہے۔

غول کی صفات مذکورہ کے لحاظ سے عربی زبان میں کئی لفظ پیدا ہو گئے ہیں مثلاً

تَغَوُّل طرح طرح کی صورتیں اختیار کرنا۔ پھر معنی میں اور عموم ہوا تو رنگ بدلنے، حالت بدل جانے اور کیفیت اور ہو جانے کے لئے بھی آنے لگا مگر ان معنوں میں بھی ذم لازم رہا۔ بری حالت سے اچھی حالت بدل جانے پر اس لفظ کا اطلاق نہیں ہوتا۔ چنانچہ کعب بن زہیر نے قصیدہ بردہ میں سعاد کو اس کے تغیر و تلون کے سبب نہ تو غول سے تشبیہ دی نہ مصدر تغول کا کوئی صیغہ برتا حالانکہ غول اس قصیدے کا قافیہ تھا۔

اغتیال کسی کو دھوکے یا پُراسرار طریق سے قتل کر ڈالنے کو کہتے ہیں۔ یہ بھی ہر آفت و ہلاکت پر مجازاً بولا جانے لگا مگر وہی جو کسی کے شامتِ اعمال کے نتیجے میں آئے۔

غول بھی ہر بھوت پریت کے لئے نہیں بولتے تھے یہ بیابان ہی کے لئے خاص تھا۔

اسلام آیا تو غول کے معنی میں بڑا عموم آگیا۔ اول تو غول کو جو ایک خاص ہیئت و صورت وہم نے دے رکھی تھی وہ مٹ گئی۔ حضرت نبی کریمؐ نے فرمایا کہ لَا غُوْلَ وَلَا صَفَرَ یعنی غول کی (جس کی ہیئت جسمانی تو انسانی اور پاؤں گدھے جیسے مانے جاتے تھے) کوئی اصلیت نہیں اور صَفر کے مہینے کی نحوست بھی کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ (لسان العرب صفحہ ۱۲)

اس فرمان سے عربوں کے توہم کا جو غول کے متعلق تھا ازالہ ہوگیا۔ البتہ وہ اب غول کو ایک مجازی ہستی ماننے لگے مگر معتزلہ اس کے بھی قائل نہ رہے (کشاف کلکتہ صفحہ ۱۲۰۵)

اہل سنت کے محققین کہتے ہیں کہ اس حدیث میں جس طرح صفر کی نفی فرمائی ہے اسی طرح غول کی فرمائی ہے۔ صفر کا مہینہ تو ہے مگر اس کی نحوست سراسر وہم تھی۔ اسی کا رد منظور ہے علیٰ ہذا غول بھی ہو مگر اس کی ہیئت کذائی اور مقام کا تعین بیابان سے خصوصیت یہ سب واہمہ تھا۔ اس کا ازالہ کر دیا۔ مثلاً جنگلوں اور راستوں میں ٹھگ آدمیوں کو حالت سفر میں دھوکے سے مار ڈالتے ہیں اور جو کچھ ان کے پاس ہوتا ہے لے لیتے ہیں۔ یہ غول ہیں۔ اسلام کے اثر سے اس لفظ کے معنی میں بڑا انقلاب پیدا ہوگیا چنانچہ قطر المحیط بطرس البستانی میں غول کے معنی لکھے ہیں "کُلُّ ما اغتال الانسانَ فاھلکہٗ فھُوَ غولٌ" یعنی ہر وہ شے جو انسان کو فریب دے اور اس کی ہلاکت کا موجب ہو جائے وہ غول ہے۔

ہر نقصان دہ چیز پر غول کا اطلاق اسلام نے عام کر دیا تاکہ عرب کا توہم باقی نہ رہے۔ ایک حدیث میں آتا ہے الغضب غول الحلم۔ غضب حلم و بردباری کے لئے غول ہے۔

حادثات ارضی و سماوی، وبا، مرض سب کو غول قرار دینا زبان نے جائز کر دیا۔ ایک حدیث میں آیا ہے اذا تغولت الغیلان فبادروا بالاذان۔ جب طرح طرح کے حادثے ہونے لگیں تو اذان اول وقت دیا کرو۔

(بادروا کے معنیٰ دو طرح سمجھے گئے ہیں ایک توجیہ میں نے کئے جس سے مراد یہ معلوم ہوتی ہے کہ اول وقت نماز پنجگانہ کی اذان دینے سے اور فرض جماعت سے ادا کرکے جو وقت ملے اس میں نوافل ادا کئے جائیں۔ آیۂ کریمہ "تَعَاوَنُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ" کا مفہوم ان معنیٰ کا مؤید ہے۔ دوسرے یہ کہ جب کوئی حادثہ رونما ہو تو جلد اذان دینے لگو کہ اس کی آواز سے بلائیں بھاگتی ہیں۔)

غرضکہ اسلام کے بعد عرب سے خیالی و وہمی غول بالکل سدھار گیا اور زیر آشیانہ عنقا اس نے نشیمن اختیار کر لیا۔ کسی شاعر نے کہا ہے:۔

الغولُ والخِلُّ والعنقاءُ ثالثۃٌ　　اسماءُ اشیاءَ لم توجد ولم تکن

غول اور بھی وحشتی اور دیس عنقا ایسی چیزوں کے نام ہیں کہ نہ وہ ہوتی ہیں نہ پائی جاتی ہیں۔
قرآن شریف میں لفظ غول بفتح غین شراب جنت کی تعریف میں آیا ہے۔ "لافیہا غولٌ ولاہم عنہا ینزفون"
نہ اس میں ہلاکت ہوگی اور نہ وہ اس سے متوالے ہوں گے۔ یہاں غول کے معنی ہیں ایسے طریقے پر ہلاک کرنا
کہ محسوس نہ ہو۔ (مفردات راغب)
اسی طرح شیطان کے معنی میں اسلام کے بعد عربی ادب میں بہت وسعت آگئی۔ چور کو بھی شیطان
کہنے لگے۔ حضرت ابو ایوبؓ فرماتے تھے کہ شیطان میرے مچان سے کھجور چرائے جاتے ہیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ
کی حدیث میں شیطان کا کھجور چرانا ثابت ہے۔
ایک شاعر نے تمام اہل شام کو شیاطین کہہ دیا ہے۔

ملائکۃ الارض اہل الحجاز　　　واہل الشآم شیاطینہا

اہل حجاز تو زمین میں فرشتے ہیں اور اہل شام شیاطین ہیں۔ (فرائد اللغۃ)
اردو میں غول کا مرادف وہم معنی چھلاوا ہے۔ یہ اگیا بتیال کے معنی پر بھی اور مختلف صورتوں
میں روپ دکھلانے کے معنی پر بھی حاوی ہے۔ اردو میں بھی جن اور بدروحوں کی کئی اقسام ہیں:۔ دیو، جن،
بھوت، پریت، چنڈال، آسیب، غول، پرچھانواں مذکر ہیں۔ چڑیل، ڈائن، بھائی، دیونی، بھوتنی مؤنث
ہیں۔ پری بھی مؤنث ہے اور ایک حسین اور غیر موذی مخلوق ہے۔ دیو یہاں فارس سے آیا ہے۔ سرکش اور
متمرد انسان کو بھی دیو کہہ دیتے ہیں۔ بھوت وہ بدروح ہے جو جسم چھوٹنے کے بعد دنیا میں ماری ماری پھرتی
ہے۔ مجازاً غصے کو اور برے بدصورت آدمی کو بھی کہتے ہیں۔
پریت ہر ناپاک روح کو بولتے ہیں۔ وہ روشنی جو پیچھے پیچھے آتی ہے اس کو اگیا بتیال کہتے ہیں۔
کاف فارسی مشدد اور مخفف دونوں طرح ہے۔
چنڈال بھوت کی کمینی اور بدذات قسم ہے۔ ایک کمینے فرقے کا نام بھی ہے۔ آسیب بھی سختی اور
صدمے کے معنی پر آتا ہے۔
ڈائن اپنے بچوں کو آپ کھا جاتی ہے۔ زن جگر خوار، بدصورت عورت کو مجازاً کہتے ہیں۔

بھائی وہ روح جو خوشی اور غم کی باتیں کہہ کے بچوں کو سوتے جاگتے ہنساتی رلاتی ہے ؎

طرفہ غمگیں ہوں کہ روتی گئی وہ آہ شعور   آئی طفلی میں بھائی جو ہنسانے مجھ کو

ایران، مصر، طرابلس اور ترکی میں بھی عام طبقے غول کو مانتے ہیں۔ انگریزی میں بھی لفظ غول (Ghoul) پہنچ کر مسخ ہو گیا ہے اور ogre کا مرادف بن گیا ہے۔

الف لیلہ میں سندباد جہازی قصہ سیف الملوک قصہ وزیر حاسد میں جن و غول کا بیان آتا ہے۔

لین صاحب نے اپنی کتاب مصریین حاضر میں غول کا قبریں تلاش کر کے مردوں کی لاش کو کھا جانا وہاں کے عوام کا مسلمہ بتایا ہے۔

مقریزی نے خطط میں ایک روایت کی ہے کہ دیو اور غول وارالکلب کی بیماری عارض کر دیتے ہیں۔

طیارہ

آئیے آج ہم اس پر غور کریں کہ ہوائی جہاز کا وجود دنیا میں کیسے ہوا جس نے آج دنیا کو اپنی کرشمہ سازیوں سے محوِ حیرت کر دیا ہے۔ صدیوں سے لوگوں کے دماغ میں یہ خیال چکر لگا رہا تھا کہ وہ ہوا میں اڑنے کی کوئی نہ کوئی ترکیب معلوم کریں۔ چنانچہ اسی کو مدنظر رکھتے ہوئے کچھ لوگوں نے کوششیں بھی کیں لیکن بے سود۔ ۱۷۸۲ء اور ۱۷۸۳ء میں دو بھائیوں مونٹ گولفیر (Mont Golfier) نے غبارے بنائے اور ان میں گرم ہوا بھر کر اڑائے، جس میں انھیں کچھ کامیابی کی جھلک نظر آئی۔ تب تو ان کی ہمت بندھی اور ان میں سے ایک کو اس بات کی ہمت ہوئی کہ وہ خود کسی ایک غبارے میں بیٹھ کر اڑے۔ چنانچہ وہ کامیاب ہوا۔ پھر کیا تھا۔ ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا غرضکہ اسی طرح لگاتار کئی سفر کئے گئے۔ اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد ہائڈروجن کا ظہور ہوا جو اس مقصد کے لئے بہت زیادہ موزوں ثابت ہوئی۔ بہت بڑے بڑے غبارے تیار کئے گئے، اور لوگوں نے اڑانا شروع کیا۔ اس طرح لوگوں نے ہوا میں اڑنے کا طریقہ تو معلوم کر لیا لیکن تقریباً سو سال تک یہ نہ معلوم کر سکے کہ غبارے کو قابو میں کیسے کیا جائے کیونکہ غبارے کے اڑنے کا دارومدار ہوا پر تھا اور جس طرف کو ہوا چلتی تھی اسی طرف کو وہ بھی اڑا چلا جاتا تھا۔ اس طرح بہت سی جانیں بھی ضائع ہو گئیں۔

غبارہ کس طرح ترقی پذیر ہوا؟

باوجود ان تمام نقصانات کے لوگوں نے شوق کی وجہ سے اس بات کی کوشش جاری رکھی کہ کوئی عمدہ سے عمدہ طریقہ نکالا جائے۔ چنانچہ انھیں اس میں کامیابی بھی ہوئی اور رفتہ رفتہ وہ اس درجے پر پہنچے کہ ۱۹۰۱ء میں دو جرمن سائنس دانوں نے اپنے غبارے کو ۷۰ میل فی گھنٹے کی رفتار سے اڑایا۔ اس کے بعد سب سے لمبا سفر جو ڈیڑھ ہزار میل کا تھا ایک فرانسیسی نے ۱۹۱۲ء میں پیرس سے اڑ کر روس تک پہنچ کر پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔ لوگوں نے ہوا کی لہروں اور گرمی و سردی کے درجوں کے متعلق اس قسم کے سفر سے بہت کافی معلومات حاصل کر لی تھیں۔ یہ غبارے صرف اسی لئے نہیں

استعمال کئے گئے بلکہ ان سے جنگوں میں بہت کافی مدد لی گئی۔

سب سے بڑی کامیابی اس طرح حاصل کی گئی کہ غبارے کے ساتھ ایک ٹوکری بنائی گئی اور اس میں ایک انجن لگا دیا گیا جس میں پروپلر (Propeller) اور تپوار (Rudder) دونوں لگے ہوئے تھے۔ اس طرح سے انہیں اتنی کامیابی تو حاصل ہو گئی تھی کہ وہ معمولی ہوا میں جدھر چاہتے جاتے لیکن اگر کوئی ہوا کا تیز جھونکا آتا تو پھر اس پر کامیابی حاصل نہیں ہوتی اور وہ اسی جھونکے میں یا تو تباہ ہو جاتے یا اسی کی سمت میں اس وقت تک اڑے چلے جاتے جب تک کہ اس کا اثر باقی رہتا۔

دوسرا کامیاب قدم ایک برازیلی سینٹوس ڈومونٹ (Santos Dumont) اور ایک جرمن کاؤنٹ زپلن (Count Zeppelin) نے اٹھایا۔ اس برازیلی نے ایک گوبھی کی شکل کا ایک غبارہ بنایا جس کا ایک گوشہ بڑھا ہوا تھا۔ اس نے ۱۹۰۱ء میں پیرس کے Eiffel مینار کے گرد نصف گھنٹے میں چکر لگایا۔ پھر وہ اس جگہ پر پہنچ گیا جہاں سے وہ پہلے روانہ ہوا تھا۔ اس کے صلے میں اسے بیس ہزار ڈالر بطور انعام دے گئے۔ اس بہادر موجد نے اپنی توجہ اب ہوائی جہاز کی طرف منعطف کی اور اس پہلی چیز سے بالکل بے پروا ہو گیا۔ دوسرے فرانسیسیوں نے بھی دوسروں کی دیکھا دیکھی اپنی کوششیں جاری رکھیں یہاں تک کہ ایک بوہیمی افسر میجر فان پرسی ول (Major Van Parseval) نے ایک غبارہ تیار کیا جس کو وہ اپنی خوشی کے مطابق ہر طرف لے جاتا تھا۔

کاؤنٹ زپلن کا تیار کردہ ایک بہت بڑا ہوائی جہاز

کاؤنٹ زپلن نے ایک جدید طرز ایجاد کیا۔ اس نے اپنے ہوائی جہازوں کا باہری حصہ بہت پتلے لوہے کا بنایا اور اندرونی حصے کو مختلف کمروں میں تقسیم کر دیا جو گیس کے تھیلوں سے بھرے رہتے تھے۔ اگر ان میں سے کوئی خراب ہو جاتا تو دوسرے اسے اوپر ہی قائم رکھتے تھے۔ سنہ ۱۹۰۸ء میں ایک نیا طریقہ چڑھاؤ کا معلوم کیا گیا۔ دوسرے بہتر جہاز بنائے جانے لگے یہاں تک کہ سنہ ۱۹۱۰ء میں ایک سو میل کا سفر ایک گھنٹے سے کچھ زیادہ عرصے میں طے کیا گیا۔ اس سفر کو زیادہ اہمیت اس وجہ سے دی جاتی ہے کہ اس میں جہازراں کے ساتھ ساتھ دوسری سواریاں بھی تھیں۔ کاؤنٹ زپلن نے دوسرے بھی بہت سے جہاز بنائے جن سے بہت سے سفر کئے گئے ان میں

قلعوں کے علاوہ چوبیس ہوائیاں بھی ہوتی تھیں بعض بعض وقت جہاز پچاس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے جاتا تھا۔ جہاز بہت بڑے اور بہت زیادہ وزنی ہوتے تھے اور ان میں سے بہت سے بلند ہوا کی وجہ سے تباہ ہو گئے۔

دوران جنگ عظیم میں ان جہازوں کو جن کو زپلن نے بنایا تھا اور اب وہ زپلن کے نام سے مشہور ہو گئے تھے فوجی مقصد کے لئے استعمال کیا گیا۔ وہ اس قابل ہو گئے تھے کہ شمالی سمندر کو پار کر سکیں اور انگلستان کے مختلف حصوں پر بم گرائیں یا فرانس کے اوپر سے اڑ کر پیرس پر حملہ کریں۔

ہوا سے بھاری مشین کا بننا یہ تمام مشینیں جو اب تک تیار ہوئی تھیں سب کی سب ہوا سے ہلکی ہوا کرتی تھیں لیکن ان کی کامیابی کا بہت بڑا حصہ اس بات میں مضمر تھا کہ وہ ایک ایسی مشین تیار کر لیں جو ہوا سے بھاری ہو۔ بہت سے لوگوں نے اس سوال کے حل کرنے کی کوشش کی۔ اس سے قبل بہت سے لوگوں نے کہا کہ اونچائی سے اس طرح پھسلنا چاہئے جیسے کہ گلہریاں پھسلتی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بھی کامیاب نہیں ہوا۔ انیسویں صدی کے آخری سالوں میں دوسرے بہت سے لوگ بھی اس کام میں مشغول تھے چنانچہ ایک جرمن اوٹو لیلی تھل (Otto Lilienthal) اور ایک امریکی باشندہ اوکٹیو چینوٹ (Octave Chanute) نے ایک پھسلنے کا آلہ تیار کیا اور اس سے وہ پھسلنے میں کامیاب ہو گئے۔ اب وہ بہت بڑی بڑی جگہوں سے آسانی کے ساتھ اتر سکتے تھے۔ لیلی تھل اپنے مرنے سے قبل دو ہزار مرتبہ سے زیادہ اڑا ہو گا۔

مشہور و معروف انگریز موجد سر ہیرام میکسیم نے ایک مشین تیار کی جس میں ایک انجن لگا ہوا تھا۔ یہ ۱۸۹۴ء میں پہلی مرتبہ آزمائی گئی لیکن اس میں کوئی خرابی رہ جانے کی وجہ سے یہ تھوڑی ہی دور اڑ سکی اور سر ہیرام نے پھر تجربے کرنے چھوڑ دیئے۔ واشنگٹن کی انسٹی ٹیوٹ کے ایک پروفیسر لیج۔ پی۔ لینگلے نے جو اس وقت اس سوال کا حل سوچ رہا تھا وہاں کی کانگریس کو مجبور کیا کہ وہ اسے پچاس ہزار ڈالر تجربوں کے لئے دے۔ اس نے بہت سی چھوٹی چھوٹی مشینیں بنائی تھیں جن میں انجن بھی لگے ہوئے تھے۔ وہ بغیر کسی آدمی کے ہوا میں اڑتیں۔ آخر میں اس نے ایک بڑی مشین بنائی تھی جس میں جاندار بھی بیٹھ سکتا تھا۔ جب اس کو آزمایا گیا تو مشین اڑتے وقت دو مرتبہ خراب ہو گئی اور وہ ریزہ ریزہ ہو گئی۔ پروفیسر لینگلے نے وہ تمام رقم

جولے وگیج بھی خرچ کر ڈالی اور اس کی یہ ناکامی جرح تمسخر و مذاق کا سبب قرار پائی چنانچہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ اس کے غم میں دل کی حرکت بند ہو جانے کی وجہ سے انتقال کر گیا۔ وہ بالکل صحیح راستے پر تھا کیونکہ اس کی وفات کے بعد یہ معلوم ہوا کہ اگر اس کی مشین میں چند تغیر کر دیے جاتے تو وہ ضرور اڑتی۔ پروفیسر موصوف کے متعلق یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ وہ اڑنے والی مشین کا ماہر تھا۔

اس کے بعد تقریباً تمام آدمیوں نے بازو کے سائز اور شکل کے متعلق بہت کچھ سیکھنے کی کوشش کی لیکن جن لوگوں نے اس بات کی کوشش کی کہ بجلی استعمال کریں انھیں یہ معلوم ہوا کہ مشین کی مجموعی طاقت بڑھانے کے لیے یہ بہت زیادہ وزنی ثابت ہوئی۔ اس وقت تک گیسولین انجن جسے ہم موٹروں میں دیکھتے ہیں بہت ترقی پکڑ چکا تھا۔ دو امریکیوں نے اس بات کا فیصلہ کیا کہ وہ اس سے ہوائی جہاز بھی چلا سکیں گے۔

دو امریکیوں کا اس مسئلے کو حل کرنا

اورول اور ولبر رائٹ دو امریکیوں نے ڈے ٹن اور اوہیو میں سائیکلوں کی مرمت کے لئے دو کانیں کھول رکھی تھیں۔ انھیں موٹر سائیکل کا بھی کافی تجربہ تھا۔ انھوں نے ۱۹۰۰ء میں پھیلنے والے آلے سے تجربہ شروع کیا تاکہ وہ بازوؤں کی بہترین شکل و سائز معلوم کر سکیں۔ وہ شمالی کیروشیا کے سمندری ساحل پر گئے تاکہ ان کے کام میں کوئی حارج نہ ہو۔ آخر کار ۱۹۰۳ء میں ایک مشین بنائی گئی جو ہوا میں ایک آدمی سمیت ۵۹ سیکنڈ تک ٹھہری رہی۔ اس طرح مسئلہ حل ہو گیا۔ اس کے بعد پھر رفتہ رفتہ اس میں ترقی ہوتی گئی۔ رائٹ برادرس نے بھی اپنی کوششیں جاری رکھیں اور ۱۹۰۵ء میں ایک ۲۴ میل کا سفر طے کر کے پھر اپنی جگہ پر واپس آ گئے۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت بڑے بڑے سفر طے کیے گئے۔ ۱۹۰۸ء میں ولبر رائٹ نے بیمینس میں جو فرانس میں واقع ہے سب سے طویل سفر طے کیا جو ابھی تک کسی سے نہ ہو سکا تھا اس نے ایک جہاز میں ۷۵ میل کا سفر طے کیا اور دوسرے میں وہ ۲ گھنٹے ۲۰ منٹ تک لگاتار ہوا میں مقیم رہا۔ ان دو امریکیوں نے اس کام کو بہ نسبت ایک تجربہ کار سائنس داں اور ایک ہوشیار کارکن کے نہایت خوش اسلوبی اور خوبصورتی سے انجام دیا۔

یکایک تمام دنیا نے اس بات کو معلوم کر لیا کہ ہوا پر بھی قبضہ کر لیا گیا اور وہ کس سے ؟ ایک بہت معمولی چیز سے جس میں ایک مشین، پروپلر (آگے ڈھکیلنے کا آلہ) کے ساتھ لگی ہوتی ہے۔ پھر کیا تھا تمام مہذب ممالک نے اڑنے والی مشین بنانی شروع کر دی۔ اس میں پیش پیش وہ لوگ تھے جو مشین کی تعلیم سے واقف تھے چنانچہ انھوں نے بہت ہی کم عرصے میں کافی ترقی کر لی ہوائی جہاز جس میں دو بازو ہوتے ہیں اور اسے انگریزی میں مونوپلین کہتے ہیں بنائے گئے اور بعض تین بازوؤں اور چار بازوؤں والے ہوائی جہاز بھی بنائے گئے۔

لمبے فاصلے کی پہلی اڑان | سب سے پہلے فرانسیسیوں کو سرداری کے عہدے سے سرفراز کیا گیا۔ سینٹوس ڈومونٹ نے بہت سے غبارے اور ہوائی جہاز بنائے۔ ۱۹۰۹ء میں ایک بہت در فرانسیسی بلیریوٹ نے آب رود انگلستان کو کیلے سے ڈوور تک پار کیا جس کا فاصلہ ۲۱ میل ہے۔ اس کے بعد انگریزوں کو جوش آیا اور ایک انگریز فارمن نے اڑ کر یہ معلوم کر لیا کہ اس کی کیا حالت تھی۔ جی ایچ۔ کرٹس ایک امریکی باشندے نے یورپ اور امریکہ میں اپنی ہمت اور دلیری کی نمائش سے لوگوں کو اچنبھے میں ڈال دیا تھا۔ مسٹر کرٹس نے بھی ایک ہوائی جہاز بنایا تھا جس کو ہائیڈروپلین کہتے ہیں (اگرچہ دوسرے لوگ بھی اسی نقطۂ نظر کو سامنے رکھ کر کام کرتے تھے لیکن ابھی تک کوئی کامیاب نہیں ہوا تھا) یہ ایک بہت طاقتور جہاز ہوتا ہے جس کے سامنے اڑنے والی کشتیاں بھی مضبوطی سے بندھی ہوتی ہیں۔ یہ نہایت آسانی سے پانی سے اوپر اٹھ سکتا ہے اور بغیر کسی خطرے کے اتر سکتا ہے۔ یہ درحقیقت ایک اڑنے والی کشتی ہے۔

پہلے چند سالوں میں بہت سے جہازرانوں نے اپنی جانیں ضائع کر دیں کیونکہ انھیں نہ تو مشینوں کا کام کرنا آتا تھا اور نہ ہوا کی لہروں سے واقفیت تھی۔ بہت سے حادثات پیش آنے کے بعد انھوں نے یہ معلوم کیا کہ جس قدر اوپر جائیں گے اسی قدر کم خطرہ ہے کیونکہ اتنی بلندی سے گرنے میں انھیں کافی وقت لگتا تھا اور وہ اس عرصے میں مشین کو دوبارہ ٹھیک کر لیتے تھے۔ اس میں سب سے زیادہ خطرناک شکل انجن کے کسی حصے کے ٹوٹ جانے سے پیدا ہو جاتی تھی جس کی وجہ سے ہوائی جہاز کی رفتار میں

رفتہ رفتہ کم ہوتی جاتی، پھر نیچے جھکتا اور بالآخر گر پڑتا تھا۔

جہازراں گرنے سے محفوظ کیسے ہو گئے؟

فی زمانہ تجربہ کار جہازراں جانتے ہیں کہ ایسے موقعے پر کیا کرنا چاہئے۔ وہ لیور دشین کا ایک حصہ ہی کی مدد سے جو اس کے ہاتھ میں ہوتا ہے ایلیویٹر مشین کا حصہ، نیچے کر دیتا ہے جس کی وجہ سے جہاز کا اگلا حصہ بالکل نیچے کی طرف جھکتا ہے۔ تماشائیوں کو تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جہاز بالکل تباہ ہو جائے گا لیکن وہ زمین پر پہنچنے سے پہلے لیور کو دوسرا چکر دیتا ہے اور اپنی مشین کو سیدھا کرتا ہوا آہستہ آہستہ زمین پر نیچے اتر جاتا ہے۔ اس سے بھی محفوظ ترین طریقہ یہ ہے کہ مشین کو گرتے وقت دائرے کی شکل میں گھماتے ہوئے اتارے تاکہ جہازراں آسانی کے ساتھ اپنے اترنے کی جگہ کا بہترین انتخاب کر سکے۔

دوسری طرف وہ تمام خطرات جو ایک مبتدی کو پیش آیا کرتے تھے رفع کر دیئے گئے۔ چھ سال تک کوئی جہازراں کسی ایسے خطرے میں جو ہوا کے تیز چلنے سے نمودار ہو جایا کرتے تھے گرفتار نہ ہوا۔ ایک دن ایک انگریز لیتھم نے اپنی مشین کو ایک خوفناک ہوا کے تند جھونکے میں ڈال دیا۔ چند منٹ تک وہ بری طرح سے اس جھونکے کے خلاف پھڑپھڑاتا رہا۔ یکایک مڑا اور ۹۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے ہوا کے جھونکے سے نکل گیا۔ اس کے بعد ہی اس ہمت ور جہازراں نے پھر اپنا جہاز اسی تند جھونکے میں لا ڈالا اور دس منٹ کے بعد اپنی کامیابی پر فخر کرتا ہوا اتر آیا۔

ایک جہازراں جو کوہ الپس کے اوپر سے گذر گیا

اس کے بعد کے سالوں میں چیوز نامی ایک شخص نے کوہ الپس کی بلندی کو ہوائی جہاز سے پار کر کے تمام دنیا کو حیرت میں ڈال دیا۔ اگرچہ اس نے کوہ الپس کی دوسری جانب اڑنے میں کسی خرابی کی وجہ سے اپنی جان دے ڈالی لیکن اس نے ثابت کر دیا کہ بلند سے بلند جگہ کو پار کرنا ناممکنات میں سے نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جہاز کے اوپر چڑھنے کی کوئی حد مقرر نہیں ہے لیکن جب جہازراں دو اور تین میل کی بلندی پر پہنچتا ہے تو ہوا کا پھیلاؤ اسے مدہوش اور بیمار کر دیتا ہے۔ اوپر ہوا میں سردی بھی بہت ہوتی ہے لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ایک جہازراں بیس ہزار فیٹ کی بلندی پر جو تقریباً چار میل کے برابر ہے جانے میں کامیاب ہو گیا۔

پہلے پہل لمبے سفر کی اڑان شخصی تصور کی جاتی تھی کیونکہ ہوائی جہاز اتنے مضبوط نہیں ہوتے تھے کہ وہ اپنے ساتھ اس قدر ایندھن لے جاسکیں جو اس طویل سفر میں انجن کے لئے درکار ہو لیکن رفتہ رفتہ وہ اس مشکل پر حاوی ہوگئے۔ لمبی اڑانوں میں سے سب سے پہلی اڑان ایک امریکی روگرس کے ذریعے ۱۹۱۱ء میں عمل میں آئی۔ وہ نیویارک سے اڑ کر کیلیفورنیا پہنچا جو ۴۰۰۰ میل ہے۔ اس سفر میں اس کی مشین کی مرمت میں پندرہ ہزار ڈالر صرف ہوئے۔ جب وہ کیلیفورنیا پہنچا تو اس کی مشین کا شاید ایک پرزہ بھی اپنی اصلی حالت پر باقی نہ تھا۔ اس کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد جبکہ وہ کیلیفورنیا کے ایک مقام لونگ بیچ پر سمندر کا کنارہ دیکھ رہا تھا کہ سمندر کی ہوا کے ایک تند جھونکے نے رڈر اور مشین کے پچھلے حصے کو بگاڑ دیا جس کی وجہ سے رڈر کا حرکت کرنا ناممکن ہوگیا۔ چنانچہ جب اس کی مشین گرنے لگی تو وہ ٹھیک نہ کرسکا اور نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اس کے ساتھ ہی ختم ہوگیا۔

ایک یادداشت کے ٹوٹتے کے بعد دوسری یادداشت

روگرس کی قائم کردہ یادداشت کے دو سال بعد ایک فرانسیسی تیلم نے ۱۳۰۰۰ میل کا سفر ۳۹ دن میں طے کیا۔ اس طرح اس نے اپنی محنت سے پہلی یادداشت کی فاتحہ پڑھ دی۔ اب یہ ممکن ہوگیا تھا کہ ایک مشین ہوا میں ۱۱ گھنٹے آسانی سے ٹھہر سکتی ہے۔ اب تو لندن سے پیرس اور جرمن کے شہروں میں بغیر کہیں اترے ہوئے اڑ کر پہنچ جانا ایک معمولی سی بات تھی۔ لوگ ایک انگریز اور ایک فرانسیسی کے جہاز کا قصہ بیان کرتے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ ایک ہوائی جہاز ایک ملک سے اڑ کر دوسرے ملک میں کس رفتار سے پہنچا تھا۔

اگلے وقت میں چالیس پچاس میل فی گھنٹہ کی رفتار ایک ہوائی جہاز کے لئے بہت بڑی رفتار سمجھی جاتی تھی اور آج کل یہ ممکن ہوگیا ہے کہ ایک شخص بذریعہ ہوائی جہاز ۱۲۵ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے جاسکتا ہے اور خوش قسمتی سے ہوا بھی موافق ہو تب تو وہ ۱۵۰ میل یا اس سے بھی زیادہ فی گھنٹہ کی رفتار سے جاسکے گا۔

ایک جہازراں کے لئے ہوش و حواس کا قائم رکھنا بہت زیادہ ضروری ہے

حواس کا ٹھیک رکھنا اس شخص کے لئے جو اڑنا چاہتا ہے نہایت ضروری ہے۔ اگر جہازراں نہ ڈرے تو حادثات بہت کم

وقوع پذیر ہوں گے۔ اس لئے آج کل اس جہاز کو کل نما جاتا ہے جس کا چلانے والا بھی اس کے تمام کل پرزوں کو اپنے قبضے میں کر لے۔

چند سال پہلے ایک فرانسیسی ہوا باز ہوا میں اڑ رہا تھا کہ یکایک اس کی مشین کو ایک تیز ہوا کے جھونکے نے الٹ دیا۔ خوش قسمتی سے وہ ایک اچھی خاصی بلندی پر تھا اور ایک تسمے سے بندھا ہوا تھا۔ اس نے اپنے ہوش و حواس کو قائم رکھا، مشین کو ٹھیک کیا اور آہستہ سے صحیح و سلامت نیچے اتر آیا۔ اس کے چند مہینے بعد ہی ایک دوسرے فرانسیسی نے اپنی مشین کو الٹ لیا اور اوپر سے نیچے پلٹا کھانے لگا۔ آج کل یہ ایک معمولی کرتب سمجھا جاتا ہے۔ ایک جہاز راں جس نے اس کو بار بار کیا کہتا ہے کہ جہاز کے اوپر سے نیچے پلٹا کھانے میں جب تم جھکاؤ سے روانہ ہوتے ہو تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ تم خاموش بیٹھے ہو اور دنیا تمہارے گرد گھومتی ہے اور افق تمہارے قدموں کے نیچے غائب ہو جاتا ہے اور پھر دوبارہ تم اسے اپنے سر پر آتے ہوئے دیکھو گے۔ یہ تمام چیزیں اس قدر جلد ہو جاتی ہیں کہ تم ایک لمحے کے لئے نہیں سمجھ سکتے کہ کیا واقعہ پیش آیا اور تمہیں سوائے اس کے اور کوئی تکلیف نہ ہوگی کہ خون تیزی کے ساتھ آنکھوں میں دوڑنے لگے گا۔ اس سے بچنے کے لئے جہاز راں کو چاہئے کہ اوپر سے نیچے کی طرف ایک کرسی میں اپنے آپ کو ایک فیتے میں باندھ کر دوسری طرف لٹک جائے۔

انسان ہوا میں توازن قائم رکھنا بھول جاتا ہے۔

یہ ایک تعجب خیز امر ہے کہ انسان ہوا میں توازن قائم رکھنے کے خیال کو بھول جاتا ہے۔ جہاز راں اس بات کو اچھی طرح جانتا ہے کہ کب اس کی مشین آگے یا پیچھے چلتی ہے لیکن اسے اس بات کی تمیز نہیں ہوتی کہ اس کی مشین دائیں یا بائیں جھکتی ہے۔ اپنی سطح کو وہ برابر قائم رکھنے کے لئے اپنے پاس ایک آلہ رکھتا ہے جس سے وہ بخوبی پتہ چلا لیتا ہے کہ اس کی مشین کس طرف کو جھکتی ہوئی ہے۔ زمین بھی اسے اپنی حالت محسوس کراتی ہے۔ جہاز راں کہرے میں جانے سے بہت ڈرتا ہے اس لئے کہ وہ وہاں پہنچ کر تمام اطراف کی اٹکل بھول جاتا ہے۔ ایک جہاز راں اپنا تجربہ بیان کرتا ہے کہ وہ یکایک کہرے میں آ پڑا جس سے وہ اس قدر پریشان ہوا کہ اس نے اپنی مشین کو الٹ لیا۔ اس کے باوجود بھی اسے اس کی تمیز نہ تھی کہ اس کا سر نیچے لٹک رہا ہے۔ لیکن جب فیتہ جس سے وہ

بند ہوجاتا تھا کھنچ گیا اور اس کی جیب سے چیزیں نکل کر ہوا میں اڑنے لگیں تو اسے خیال ہوا کہ اس نے اپنی مشین الٹ لی ہے۔ پھر اسے سیدھا کیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہوائی جہاز کو جو پہلا عملی جامہ پہنایا گیا وہ لڑائی کے مقصد کے لئے تھا۔ ایک جنرل کے لئے اس سے زیادہ اور کیا قیمتی چیز ہو سکتی ہے کہ وہ ہوا میں ایک میل کی بلندی پر اڑ کر اپنے دشمنوں کی نقل و حرکت کا بالکل اسی طرح معائنہ کرے جیسے کہ ایک شخص نقشے میں مقامات کو دیکھتا ہے۔

جنگ میں ہوائی جہاز کی سب سے بڑی اہمیت

دوران جنگ عظیم میں ہر ایک فوج اپنی اڑنے والی پلٹن کے ساتھ جس میں سو سو جہاز راں ہوتے تھے شامل ہو گئی تھی۔ ان میں سے چند بہت ور اسکاؤٹ تو وہی ہیں جنہوں نے اگلے وقت میں اپنے اپنے کرتب دکھلائے۔ اس زمانے میں اسکولوں کو خاص کر اسی لئے قائم رکھا گیا کہ لڑکوں کو جہاز رانی سکھلائی جائے۔ چنانچہ وہ تمام واقعات جن کو اڑنے والے اسکاؤٹوں نے تجربے سے معلوم کیا تاریخ جنگ عظیم کا سب سے زیادہ دردناک حصہ ہے۔

ہر روز علی الصباح اسکاؤٹ جہاز راں اپنے خیمے سے مشین میں باہر نکلتا اور ایک گول دائرہ بناتا ہوا وہ ایک میل کی بلندی پر چلا جاتا۔ بعض بعض مرتبہ وہ اکیلا نہیں بلکہ اپنے کسی ایک ساتھی کو بھی ساتھ لے لیتا جس کی جگہ اس کے آگے ہوتی۔ اس کا کام صرف یہ ہوتا تھا کہ وہ بیٹھے بیٹھے ان تمام حرکتوں کو جو اس کے نیچے ہوتی تھیں بغور ملاحظہ کرے۔ پھر یکا یک مشین آگے جھٹتی تھی اور ان مہلک چیزوں کو جو وہ اپنے ساتھ رکھتی تھی دشمنوں کی فوج میں پھینک دیتی تھی۔ فوراً ہی دشمنوں کی توپیں، بندوقیں چلنے لگتیں جن کی گولیاں بلا مبالغہ پانچ پانچ میل تک اوپر جاتی تھیں اور رائفلیں لگاتار چھوٹنے لگتیں۔ اس عرصے میں وہ کم سے کم چار ہزار فیٹ سے زیادہ بلندی پر پہنچ جاتے۔ ایسے موقعوں پر وہ اکثر دشمنوں کی فوجوں کا فوٹو بھی لیا کرتے تھے۔

پھر وہ اوپر جا کر یہ نہیں کہ خاموش اڑا کرتے بلکہ اوپر ہی اوپر دشمن کے علاقے پر نظر بھی رکھتے اور جب موقع ہاتھ آتا نیچے جھکتے اور ایک بم یا تو کسی ٹرین پر جو بارود سے بھری رہتی یا کسی فوج پر پھینک کر اڑ جاتے۔ ادھر سب چیزیں جل کر خاک سیاہ ہو جاتیں بعض بعض وقت ہوائی جہازوں کا آپس میں مقابلہ

بھی ہوتا تھا۔ یہ جہاز رانوں کے لئے سب سے زیادہ خطرناک موقع تھا۔ ان میں سے ہر ایک کبھی چھپتا کبھی دائرے کی شکل میں ایک دوسرے کے گرد گھومنے لگتا۔ غرض کہ ان میں سے ہر ایک یہ چاہتا کہ اسے کوئی اچھا موقع ملے کہ وہ فوراً حملہ کر دے۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد ان میں سے کوئی ایک کامیاب ہو جاتا۔ ایک فرانسیسی مسٹر پیگوڈ جنھوں نے سب سے پہلے ہوائی جہاز سے اوپر سے نیچے جھکے کھانے کا طریقہ معلوم کیا اس قسم کی بہت سی لڑائیاں لڑ چکا ہے۔ ایک مرتبہ اس کی مشین بالکل بے کار ہو گئی اور وہ دشمن کے علاقے میں گر پڑا اور اس کی مشین گرتے ہی ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ یہ دیکھ کر اس کے اوپر ایک دشمن آ پڑا۔ مسٹر پیگوڈ نے جس کے زیادہ چوٹ نہیں آئی تھی فوراً جھپٹ کر دشمن کو جو ایک جرمن تھا مارا اور اس کے جہاز میں بیٹھ کر اپنے علاقے میں پہنچ گیا لیکن اس کے چند ہی ہفتے بعد مسٹر پیگوڈ کا اس کے کسی دشمن نے بندوق سے خاتمہ کر دیا۔ اس کے چند دن کے بعد اس کی قبر پر ایک پھولوں کا ہار جو عیسائیوں کے دستور کے مطابق مردے کے ساتھ بھیجا جاتا ہے، ہوائی جہاز سے گرا دیا گیا۔ ہار کے ساتھ ایک پرچہ دستیاب ہوا جس پر یہ عبارت لکھی ہوئی تھی "پیگوڈ جو اپنے دشمن کے ہاتھوں ایک بہادرانہ موت مارا گیا"

ہوائی جہاز کا آگے چل کر کیا حشر ہو گا کوئی نہیں بتلا سکتا۔ ہاں غلوں کے دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہوائی جہاز آگے چل کر گھر گھر اسی طرح پھرا کریں گے جیسے فی زمانہ موٹر چلا کرتے ہیں۔

الہامِ اقبال

دیکھ چکا المنی کوششِ اصلاحِ دیں
جس نے نہ چھوڑے کہیں عہدِ کہن کے نشاں

حرفِ غلط بن گئی عصمتِ پیرِ کنشت
اور ہوئی فکر کی کشتیِ نازک رواں

چشمِ فرانسیس بھی دیکھ چکی انقلاب
جس سے دگرگوں ہوا مغربیوں کا جہاں

ملتِ رومی نژاد کہنہ پرستی سے پیر
لذتِ تجدید سے وہ بھی ہوئی پھر جواں

روحِ مسلماں میں ہے آج وہی اضطراب
رازِ خدائی ہے یہ کہہ نہیں سکتی زباں

دیکھیے اس بحر کی تہ سے اچھلتا ہے کیا
گنبدِ نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا

آزادی

(ٹیگور کی ایک دلپذیر نظم سے متاثر ہو کر اشعار ذیل لکھے گئے)

جہاں ہر دل میں ہو جوشِ محبت ذوقِ غم خواری
جہاں ہر سر میں ہو سودائے ایثار و رواداری

جہاں مسلک ہوا خواہی ہو، مذہب شفقت و نصرت
جہاں ہو کفر بد عہدی، جہاں ایماں وفاداری

جہاں عنقا ہو نامِ امتیازِ خویش و بیگانہ
جہاں محسوس ہو فرقِ دل آزاری و دلداری

عطا کر دے خدایا ہم کو آزادی کی وہ منزل

جہاں چرچا نہ ہو پیچ و خمِ راہِ سیاست کا
جہاں ہو ہر طرف حق و صداقت کی عملداری

جہاں ہو امتیازِ رہنما و راہزن ظاہر
جہاں ہو سرفروشی لازمِ اوصافِ سرداری

جہاں ہر فرد ہو بے خوفِ استبدادِ باطل سے
جہاں ہو بچہ بچہ جاں نثارِ شانِ خودداری

عطا کر دے خدایا ہم کو آزادی کی وہ منزل

جہاں رونا نہ ہو تاریکیٔ جہل و ضلالت کا
جہاں گھر گھر ہو مہرِ علم و حکمت کی ضیا باری

جہاں مردانگی ہو نامِ حسنِ خلقِ انساں کا
جہاں ہر شخص ہو مفتونِ سلمائے نکوکاری

جہاں تابانیٔ جوشِ عمل سے دل فروزاں ہوں
جہاں ہو ظلمتِ عیش و تن آسانی سے بیزاری

عطا کر دے خدایا ہم کو آزادی کی وہ منزل

جہاں پایا نہ جائے فرقِ نسل و مذہب و ملت
جہاں نابود ہو جوشِ تعصب کی غلط کاری

جہاں اقوامِ عالم منسلک ہوں سلکِ الفت میں
خراسانی و ہندی تازی و چینی و تاتاری

جہاں شیر و شکر ہوں جذبۂ مہر و مروت سے
کلیسائی و موسائی و تسبیحی و زناری

عطا کر دے خدایا ہم کو آزادی کی وہ منزل

مطالبات

نگاہِ محبت فزا چاہتا ہوں
مسافر ہوں اک رہنما چاہتا ہوں

تجلی نظر آشنا چاہتا ہوں
تجھے جلوہ گر دیکھنا چاہتا ہوں

ستم چاہتا ہوں جفا چاہتا ہوں
کہ مشقِ طریقِ وفا چاہتا ہوں

نہ پوچھے کوئی مجھ سے کیا چاہتا ہوں
کہ اپنے کئے کی سزا چاہتا ہوں

ابھی خام ہے کچھ مذاقِ تمنا
کرم ہائے صبر آزما چاہتا ہوں

مجھے کوئی کافر مسلمان کر دے
مجازِ حقیقت ادا چاہتا ہوں

دلا دے کوئی یاد، بھولا ہوں کس کو
بتا دے کوئی ہائے کیا چاہتا ہوں

خریدار ہے کون دنیا میں دل کا
کہاں اور کیا بیچنا چاہتا ہوں

خطا پر ندامت خطا در خطا ہے
خطا کر کے دادِ خطا چاہتا ہوں

کیا ہے محبت نے گستاخ کتنا
کہ تجھ سے تجھے مانگنا چاہتا ہوں

ہوس چاہتی ہے تجلیِ عریاں
مگر میں نگاہِ رسا چاہتا ہوں

جو قیدِ مجاز و حقیقت اٹھا دے
وہ کیفیتِ دل کشا چاہتا ہوں

تمنا مری اور محدود کوکب
مقامِ ورا الورا چاہتا ہوں

رقابت

نسیمہ کو اپنے شوہر کریم سے غیر معمولی محبت تھی۔ کریم کی شریک زندگی بن کر وہ اپنے آپ کو بہت ہی خوش قسمت سمجھتی تھی مگر قدرت ان دونوں کو ہمیشہ کے لئے جدا کرنا چاہتی تھی...... کریم کو اپنی بعض ضروریات کی تکمیل کے لئے وطن کو کچھ دنوں کے لئے خیرباد کہنا پڑا .... ریل کا سفر تھا گاڑی اپنی پوری رفتار سے چل رہی تھی کہ ایک اسٹیشن کے قریب لائن ٹھیک نہ ہونے کی وجہ سے پہیے پٹری سے اتر گئے اور گاڑی الٹ گئی۔ ڈبوں کے ٹکرانے سے بہت سی جانیں ضائع ہوئیں، کریم بھی انھیں جان دینے والوں میں سے تھا۔ لاش کو اس کے گھر پہنچایا گیا۔ بیوی جس نے جلد ملنے کی آرزو میں شوہر کو ہنستے ہوئے الوداع کہا تھا اب حسرت و یاس کے ساتھ اس کا استقبال کر رہی تھی۔

لاشے کی ہمراہی میں ایک ڈاکٹر اور دو سپاہی تھے۔ میت کو ورثا کے سپرد کرتے ہوئے ڈاکٹر نے نسیمہ کے ساتھ بہت ہی ہمدردی کا اظہار کیا اور یہ نصیحت کی کہ نعش کو ہرگز نہ دیکھنا تاکہ اس کی وہ زندہ تصویر جو تم نے اسے الوداع کہتے وقت اپنے تصور میں قائم کی تھی ہمیشہ کے لئے تمہارے ذہن میں رہے۔ نسیمہ اس نصیحت کی تلخی کو برداشت نہ کر سکی، بے ساختہ اس کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی لیکن اس نے اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیا کہ مسرت و انبساط کا خاتمہ ہو چکا ہے اور اس لئے ڈاکٹر کے مشورے کو مان لینا ہی بہتر ہے کیونکہ مرحوم کے بے حس و حرکت اور ٹکڑے ٹکڑے جسم سے صحیح و سلامت جسم کی خیالی تصویر بدرجہا بہتر ہے۔

مرحوم گاڑی الٹنے کے بعد بھی چند منٹ تک زندہ رہے۔ ڈاکٹر نے کہا " اور جب ان کو اٹھایا گیا ہے تو ان کے ہاتھ میں ایک خط تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ مرنے سے پہلے انھوں نے اپنی بیوہ کے حق میں کوئی وصیت نامہ لکھا ہے۔"

نسیمہ نے والہانہ انداز میں ڈاکٹر کے ہاتھ سے خط لے لیا۔ خون آلود کاغذ میں پنسل سے

یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے "میں تمہیں خدا کے سپرد کرتا ہوں، دیکھو! اُسے نہ بھولنا ....

یہ الفاظ ایک معما تھے۔ نسیمہ ان کے حل کرنے کی کوشش کرتی تھی مگر ناکام رہتی تھی۔ بس اس وقت سے اس کا یہ شغلہ ہوگیا کہ ان الفاظ کو بار بار دہراتی اور حل کرنے کی کوشش کرتی۔ وہ مضطرب تھی کہ کس طرح یہ معما حل ہو اور یہ معلوم ہو کہ وہ کون عورت ہے جس کو میرا شوہر زندگی کے آخری اور نازک ترین لمحات میں بھی نہیں بھولتا۔

وقت گذر رہا تھا، حیرت و استعجاب اس کی رگ و پے میں سرایت کرتا جا رہا تھا اور صرف چند گھنٹوں کے غم و الم نے اسے برسوں کا بیمار بنا دیا تھا۔

جنازے کو اول منزل کرنے کے لئے مجلس عزا برپا ہوئی اور یہ ایک اتفاق ہی تھا کہ نسیمہ نے ایک نقاب پوش عورت کو دیکھا جو مجمعے کے بالکل سامنے کھڑی ہوئی تھی، سراپا رنج و اندوہ کی تصویر معلوم ہوتی تھی ....؛ تمام حاضرین کریم کی ناگہانی موت پر اظہار افسوس کر رہے تھے بعض لوگ مرحوم کی بیوہ کے ساتھ خود بھی شریک بین تھے لیکن اس نقاب پوش عورت کی کچھ ایسی بری حالت ہو رہی تھی جو دیکھی نہیں جاتی تھی، .... امام نے مجلس کو ختم کرنے کے لئے اپنی نصیحت آمیز تقریر شروع کی، نقاب پوش عورت شدت غم سے اس آخری حملے کو برداشت نہ کر سکی، پیر لڑکھڑائے اور دھم سے زمین پر گر پڑی۔ کچھ لوگ دوڑے اور معبد سے باہر کھلی فضا میں لا ڈالا۔

نسیمہ کو یقین ہو گیا کہ میرے عزیز شوہر نے اسی عورت کے متعلق وصیت کی ہے، میرا فرض ہے کہ اس سے ملوں اور اس کے حالات معلوم کروں۔

نعش سپرد خاک کر دی گئی۔ نسیمہ اس حالت میں گھر کو پلٹی کہ چہرہ زرد تھا، کثرتِ گریہ سے آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ نسیمہ کے ساتھ ایک اور شخص بھی ہو لیا تھا جو رشتے دار تھا اور کریم کا دوست بھی۔ نسیمہ نے شوہر کی آخری وصیت کی اسے اطلاع دی اور اس سے خواہش کی کہ کسی طرح اس عورت کا پتہ چلائے جس کی حالت آج کے مجمعے میں سب سے زیادہ نازک تھی۔

کریم کی یاد نے دوبارہ بے قرار کر دیا "اس شخص نے بہت ہی مایوس ہو کر کہا" .... غم

کی کیا حقیقت ہے میری رائے میں تو سب کو مرحوم کے ساتھ ہی دفن ہو جانا چاہئے تھا.......... نسیمہ کی آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہوئی اور اس نے اس طرح اس شخص کی طرف دیکھا گویا کہہ رہی ہے کہ "...... محبت کی کشمکش موت کی سختیوں سے کہیں زیادہ ہے......" ایک آہ سرد کے ساتھ کانپتی ہوئی آواز سے کہا "...... کریم کا منشا یہی معلوم ہوتا ہے کہ میں اس عورت سے تعارف پیدا کروں اور اس کی خبر گیری کروں...... کیا معلوم کہ اس کے پاس کریم کی بولتی چالتی یا قابل دید کوئی نشانی ہو"

"اس کے کوئی اولاد نہیں ہے" اس شخص نے کہا۔

نسیمہ۔ کریم سے اس کے تعلقات کا تمہیں علم ہے؟

شخص۔ ہاں! اس لئے تو میں عرض کر رہا ہوں کہ اس قصے کو مرحوم کے ساتھ ہی دفن کر دو تا کہ تمہاری زندگی اور اجیرن نہ ہو۔

یہ سنا تھا کہ نسیمہ کی سوزش قلب میں اور اضافہ ہو گیا لیکن اس نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ میں اپنے شوہر کی محبوبہ سے ضرور ملاقات کروں گی، گو مجھے ناقابل برداشت مصائب ہی کا کیوں نہ سامنا کرنا پڑے۔

تین دن کے بعد نسیمہ کے گھر ایک نوجوان لڑکی آئی جس کا نام امینہ تھا، سیاہ لباس زیب تن تھا، چہرے سے غم کے آثار ظاہر ہو رہے تھے۔ نسیمہ نے بڑے زور شور سے اس کا استقبال کیا اور اس کے ساتھ رہنے کی خواہش کی۔

نسیمہ کے عزیز و اقارب کو یہ خبر پہنچی تو سب کے سب حیران ہو گئے۔ کوئی نسیمہ کی وسیع القلبی کی تعریف کر رہا تھا، کوئی اس نرمی پر اسے ملامت کر رہا تھا لیکن نسیمہ شوہر کی وصیت کے پورا کرنے ہی میں ہر چیز سے زیادہ مسرت محسوس کر رہی تھی۔

دن کا اکثر حصہ اس طرح پر گذرتا تھا کہ نسیمہ کریم کے متعلق امینہ سے گفتگو کرتی رہتی تھی۔ دونوں میں سے ہر ایک کی خواہش تھی کہ ایک دوسرے کا غم غلط کرے۔

ہر صبح کو دونوں ساتھ ساتھ مرحوم کی قبر پر جاتیں، کچھ دیر وہاں ٹھہر کر اپنی گذشتہ زندگی کی یاد

کرتیں اور پھر گھر لوٹ آتی تھیں جہاں ان کا سارا دن مختلف تذکروں میں گذرتا تھا۔ ہر ایک کریم سے اپنی محبت کی داستان کو اول سے آخر تک پوری تفصیل کے ساتھ بیان کرتی تھی یا پھر کریم کے خطوط کو پڑھ کر سنایا جاتا تھا۔

کچھ دنوں کے بعد یہ رد عمل شروع ہوا کہ نسیمہ امینہ کی داستان سنتی، اپنے شوہر کے خطوط جو امینہ کے پاس بھیجے گئے تھے، پڑھتی۔ .... دل میں ایک اضطراب پیدا ہوتا اور آنکھیں حسرت سے نم ہو جاتی تھیں ...... میں نے اس کے ریزہ ریزہ جسم کو دیکھنے سے اس لئے انکار کیا تھا کہ اس کی پیاری اور زندہ صورت میرے خیال میں موجود رہے لیکن اب میں دیکھتی ہوں کہ اس کی زندگی کس قدر آلودہ تھی، اس سے متعلق جو لفظ بھی سنتی ہوں وہ میرے دل پر تیر و نشتر کا کام دیتا ہے..... میں اس سے محبت کرتی تھی، اس کے خلوص پر مجھے اعتماد تھا، میں اپنے آپ کو اس کی موجودگی میں بڑا خوش قسمت سمجھتی تھی........ لیکن اب میں اپنے گذشتہ اعتماد پر متاسف ہوں...... یہ سوچتے سوچتے نسیمہ کا دل پھر مایوسیوں سے بھر گیا، اس کی زندگی پھر مکدر ہو گئی، دل ہی دل میں نادم تھی کہ میں نے امینہ کو کیوں پاس رکھا اور ان رنج دہ واقعات کو کیوں سنا...... اسے امینہ سے ایک نفرت سی ہو گئی کیونکہ وہ نشانیاں جو امینہ کے حصے میں آئی تھیں وہ نسیمہ کے حق زوجیت کو چھیننے والی تھیں، اس کی گذشتہ کامرانیوں میں ایک طرح کا سرقہ تھیں۔

ایک صبح کو نسیمہ تنہا کریم کی قبر پر چلی گئی، پہنچی ہی تھی کہ امینہ کو آتے ہوئے دیکھا، اس کے ہاتھوں میں گلاب کے پھولوں کا ہار تھا جسے مزار پر چڑھاتے ہوئے اس نے نسیمہ سے کہا "کیوں بہن! آج تم اکیلی ہی چلی آئیں؟"

نسیمہ نے بات کو کاٹتے ہوئے کہا "ہاں!........ اور اس وقت سے ہم ایک دوسرے سے قطع تعلق ہی کر لیں، تو بہتر ہے۔"

امینہ پر سکتہ سا چھا گیا لیکن پھر بھی اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا "ہاں! ہمیں اس وقت سے پہلے ہی علیحدگی اختیار کر لینا چاہئے تھی!"

نسیمہ۔ کاش......... ..کریم کی موت کے بعد تم سے میری ملاقات نہ ہوتی......۔
..... سچ پوچھو تو آج دوبارہ کریم کو اپنے ہاتھوں سے کھو رہی ہوں.........
لیکن آج کا.......... صدمہ......... اس کی موت کے دن کے صدمے
سے بدرجہا زیادہ ہے۔

تنقید و تبصرہ

کتب

نوجوان ویرتھر کی داستان غم - حدیث ادب - تعلیم و نفسیات - مونا وانا کلید قرأت۔

لاالٰہ الااللہ نفسیات مذہب۔

نوجوان ویرتھر کی داستان غم | گوئٹے کا مشہور ناول مترجمہ ریاض الحسن صاحب ایم۔اے۔ تقطیع ۲۲×۱۸، حجم ۴۴۱ صفحے، مقدمہ مترجم ۵۰ صفحے۔ لکھائی چھپائی معمولی، کاغذ اچھا، قیمت عہ مجلد عا۔ شائع کردہ لٹریری سنڈیکیٹ نمبرا ایلی روڈ الہ آباد۔

ویرتھر گوئٹے کی نوجوانی کے عہد کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ ان دنوں کچھ عمر کے تقاضے سے کچھ زمانے کی ہوا کے اثر سے گوئٹے رومانی رنگ میں سر سے پیر تک رنگا ہوا تھا۔ ہندوستان میں بھی موجودہ دور بگڑی ہوئی رومان پرستی کا دور ہے۔ اس لئے ویرتھر ہمارے عام مذاق سے ملتی جلتی چیز ہے اور اس کے ترجمے کو لوگ دلچسپی سے پڑھیں گے۔ یہ ایک نوجوان کا قصہ ہے جو احساس کی تیزی اور جذبات کی شدت کا شکار ہو کر نہ صرف مفید عمل سے بلکہ صحیح مشاہدے سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔ ایک طرف اس کا حساس دل محبت اور انس سے معمور ہے جذبات لطیف کی ہلکی سے ہلکی آواز کو سنتا اور سمجھتا ہے حسن فطرت اور حسن انسانی کے گوناگوں جلووں کا لطف اٹھاتا ہے مگر دوسری طرف روزمرہ کی زندگی میں وہ واقعات کے صحیح تناسب کے اندازے سے معذور ہے، اس کی قوت ارادی اور قوت عمل عام معیار سے بہت کم ہے۔ اس کا عشق میں مبتلا ہو جانا سونے پر سہاگا ہو جاتا ہے۔ اس کا احساس وہ چند قوی اور ادراک، ارادہ اور عمل اسی نسبت سے ضعیف ہو جاتا ہے اضطراب اور التہاب بڑھتے بڑھتے بلائے جان ہو جاتا ہے اور وہ خودکشی کر لیتا ہے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ اس میں گوئٹے نے خود اپنی ایک داستان محبت بیان کی ہے اور سوائے خودکشی کے اور سارے واقعات خود اس پر گذرے تھے۔

ترجمہ گو انگریزی کے واسطے سے کیا گیا ہے مگر انگریزی عبارت سے قریب رہنے کی وجہ سے اصل سے زیادہ دور نہیں ہوا۔ البتہ روانی جو اصل کتاب کی ایک بہت بڑی خصوصیت ہے ترجمے میں نہیں پائی

جاتی۔ کہیں کہیں الفاظ کا انتخاب اور جملوں کی ترکیب قابل اعتراض ہے۔ ذیل میں ہم چند نمونے پیش کرتے ہیں۔

صفحہ ۲۔ "میں اس کے متوفی مالک پر ایک اجڑے ہوئے تاب خانے میں جو اس کی محبوب جگہ تھی اور آج میری ہے آٹھ آنسو بھی رو چکا ہوں۔"

صفحہ ۳۔ "جب گھاس کی پتیوں میں اس چھوٹی دنیا کا ترنم سن کر بے شمار کیڑوں اور مکوڑوں پر وقعت تماشا ہوتا ہوں تو اس وقت میں اپنے نہاں خانۂ دل میں اس محلّی ہستی کی جھلک پاتا ہوں جس نے انسان کو اپنی صورت پر بنایا ہے اور جس کی ابدی رحمت ہماری زندگی کا ستون ہے۔"

صفحہ ۴۔ "درختوں کا جھرمٹ"۔ "بطریقی تمدن"

(Patriarch جب کلیسا کے ایک مخصوص مذہب کے معنی میں ہو تو اس کا ترجمہ بطریق کر سکتے ہیں ورنہ سردار خاندان، سردار قبیلہ یا سر قبیلہ۔ بطریقی کی جگہ سر قبیلی کہہ سکتے ہیں جو جامعہ عثمانیہ کی ایک کتاب میں استعمال ہوا ہے۔)

صفحہ ۵۔ "تم نے اکثر پریشان ہو کر میرے چہرے کی کیفیت انتہائی رنج سے انتہائی خوشی میں اور معمولی دلگیری سے تند جذباتی میں بہ سرعت بدلتے دیکھا ہے۔"

... ...

کتاب کے ساتھ مبسوط مقدمہ ہے جس کا نام خدا جانے کیوں "ابتدائیہ" رکھا گیا ہے۔ مقدمے میں گوئٹے کی زندگی کے حالات، اس کی تصانیف کا مختصر اور ویرتھر کا کسی قدر مفصل ذکر اور گوئٹے کے فلسفۂ حیات کا لباب ہے۔ اس سے بحیثیت مجموعی مقدمہ نگار کی وسعت مطالعہ اور دقت نظر کا ثبوت ملتا ہے اور کتاب کی اہمیت پوری طرح پڑھنے والوں کے ذہن نشین ہو جاتی ہے۔

حدیث ادب | حضرت احسان بن دانش کا دیوان تقطیع ۲۲×۱۸، حجم ۱۶۰ صفحے، لکھائی چھپائی اچھی، کاغذ اوسط درجے کا۔ قیمت ؏ مجلد ؏، شائع کردہ انجمن تعمیر ادب، ملنے کا پتہ: ذی شان بک ڈپو، مزنگ لاہور۔

حضرت احسان کاندھلہ ضلع مظفر نگر کے باشندے ہیں اور غالباً لاہور میں مقیم ہیں۔ آپ قاضی محمد ذکی صاحب ذکی کے شاگرد رشید ہیں جنھوں نے اوائل عمر ہی میں آپ کو زریں ارشادات سے احساس

کی دولت جاوید عطا کر کے فراق کی روح فرسا گھڑیوں کی سپرد کر دیا؟ آپ کے کلام سے واقعی شاعرانہ احساس اور تاثر کا ثبوت ملتا ہے اور ایک عرصے کی مشق اور کاوش کا پتہ چلتا ہے۔ زیادہ تر غزل کے مروجہ رنگ کی پیروی ہے البتہ بعض اشعار میں مضمون پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور کہیں کہیں کوئی ایسا شعر بھی نکل آتا ہے جو اہل ذوق کو پھڑکا دیتا ہے۔ اس مجموعے میں آپ کے "دور اولیں" اور "دور ثانی" کی غزلیں ہیں اور چند قطعے اور رباعیاں "حسن منتشر" کے عنوان سے۔ ذیل میں ہم چند منتخب اشعار درج کرتے ہیں:۔

ہنگامہ کیوں وہ اب سر منزل نہیں رہا — تو ل گیا کہ ڈھونڈنے والے نہیں رہے

تری تمام اداؤں کا مدعا ہوں میں — مرے جہان تمنا کا آسرا تو ہے

دعا کر رہے ہیں دوا کرنے والے — خدا کے لئے اب تو بالیں پہ آؤ

تری تلاش میں ہوں اپنی جستجو کے لئے — کہاں کی منزل مقصود کارواں کیسا

افسوس ہے کہ بعض اوقات حضرت احسان نے الفاظ کی صحت کا خیال نہیں رکھا۔ ذیل کے اشعار سے اس کا اندازہ ہو جائے گا:۔

ع ۔ چاندنی رات اور یہ قبرستاں کی سرزمیں

ع ۔ ہٹا دے اس سیہ کارہ کا پیراکمبل دل سے

مجھ کو کعبے میں کبھی یہ محویت حاصل نہ تھی — اللہ اللہ سجدۂ پائے صنم کی کیفیت

ع ۔ رب ارنی کی حدیں ضبط نے جب طے کر لیں

تعلیم ونفسیات | از میاں ظہور الدین احمد ایم۔اے، ایل ایل۔بی، پروفیسر فلسفہ ومنطق اسمٰعیل کالج اندھیری، تقطیع ۲۲×۱۸/۱۶، حجم ۴۵ صفحے، لکھائی چھپائی بہت معمولی، کاغذ اوسط درجے کا، قیمت ۸/، غالباً مصنف سے مل سکتی ہے۔

یہ ایک لکچر ہے جو میاں ظہور الدین احمد صاحب نے بمبئی کارپوریشن کے اردو اسکولوں کے معلموں کے جلسے میں دیا تھا اور اب رسالے کی شکل میں شائع ہوا ہے۔ اس میں عام فہم الفاظ میں دلچسپ طریقے سے تعلیم کا حقیقی مقصد اور تعلیم اور نفسیات کا باہمی تعلق سمجھایا گیا ہے۔ بقصد کی بحث میں تعلیم کا تعلق اخلاق اور معاشرت سے خوبی کے ساتھ دکھایا ہے۔ اس کے بعد ان نفسی قوتوں کا ذکر ہے جو عملی تعلیم میں معاون ہوتی ہیں۔ ان کے وظائف کی تشریح ہے اور ان سے کام لینے کی تدبیریں بتائی گئی ہیں۔ علاوہ مدرسوں کے ان سب حضرات کو جو تعلیم کے مسئلے سے ذوق رکھتے ہیں اس رسالے کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔

مونا وانا (ڈراما) | مصنفہ میٹرلنک، مترجمہ جمیل احمد صاحب قدوائی ایم۔اے، تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶، حجم مع فرہنگ ۱۴۲ صفحے، قیمت ۱۲/

جمیل احمد صاحب قدوائی اس سے پہلے بھی یورپی زبانوں کے ادبی کارناموں کا ترجمہ کرکے اردو زبان کی خدمت کر چکے ہیں۔ مونا وانا ہمارے ادبی ذخیرے میں ایک اور قابل قدر اضافہ ہے۔ ڈراما کا موضوع ایک مشہور تاریخی واقعہ ہے اور میٹرلنک نے اس واقعے کو دلچسپ طریقے سے بیان کرنے کے علاوہ اخلاقی فرائض کی کشاکش اور محبت کا بے باک دلوں پر افسوس پہونچنا بھی بہت خوبی سے دکھایا ہے۔ تاریخ سے جنھیں شوق ہے وہ اطالیہ کی سیاسی اور ذہنی فضا کے مشاہدے سے لطف اٹھا سکتے ہیں۔

کلید قراءت | از مولانا خلیل احمد صاحب فاضل دینیات، سائز چھوٹی، حجم ۴۵ صفحات، قیمت درج نہیں۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ جامعہ ملیہ قرول باغ، دہلی۔ یا مولانا خلیل احمد صاحب جمالیہ عربک کالج پرسوربارکس مدراس۔

فن تجوید وقراءت پر اس سے پہلے بھی اردو میں دو ایک رسالے نکل چکے ہیں لیکن مولانا خلیل احمد صاحب نے یہ رسالہ جدید اسلوب پر لکھا ہے۔ زبان نہایت سادہ اور سلیس ہے اور ہر سبق کے آخر میں سوالات بھی دئے گئے ہیں۔ امید ہے کہ بچوں کے لئے یہ رسالہ مفید ثابت ہوگا۔

لا الٰہ الا اللہ | از مولوی محمد ادریس خاں صاحب نجیب آبادی تقطیع خورد، حجم ۹۰ صفحات کتابت و طباعت اور کاغذ معمولی، قیمت ۳ر ملنے کا پتہ: منیجر کتبہ عبرت نجیب آباد۔

اس رسالے کا مقصد خود مصنف کے الفاظ میں حسب ذیل ہے۔

"اس رسالے میں توحید باری تعالیٰ اور شرک کا بیان ہے تاکہ مسلمان شرکیہ عقاید و اعمال سے پرہیز کر سکیں۔ ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ اس رسالے میں بداعمالیوں اور بدعقیدگیوں کا رد ہے لیکن کسی خاص شخص یا جماعت کو نشانہ نہیں بنایا گیا نہ کسی خاص شخص کا نام لیا گیا ہے، نہ کسی شخص یا جماعت کا خصوصی تصور اس رسالے کی نگارش و تالیف کے وقت ذہن میں موجود تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو رسالے کے مضامین کا اثر ناقص اور اس کے منافع کم ہو جاتے۔"

یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلمانوں میں خواہ وہ ہندوستان کے ہوں یا کسی دوسرے ملک کے قرآن و حدیث سے بے توجہی بڑھتی جا رہی ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ طرح طرح کے عقائد و توہمات نے ان کے دلوں میں گھر کر لیا ہے جن کا صحیح اسلام سے دور کا تعلق بھی نہیں۔ جناب مصنف کا مقصد اس رسالے سے یہی ہے کہ مسلمانوں کو اس دین مبین سے روشناس کریں جو قرآن و حدیث میں ہے۔ کتاب کی موٹی موٹی سرخیاں یہ ہیں، ہستی باری تعالیٰ اور شرک، اسلام، اختلاف مذاہب کی حقیقت، توحید فی العبادۃ، شرک کی حالت زار، مشرکین کے احوال و اقوال قرآن مجید کی روشنی میں، تمام مشرکوں کی ایک ہی آواز، قرآن مجید سے مشرکوں کا اعراض کیا واقعی قرآن مجید کا سمجھنا سخت دشوار ہے، مسلم نما مشرکین کے اقوال و عقاید وغیرہ۔

یہ عنوانات بجائے خود کتاب کی اہمیت کو ظاہر کرتے ہیں۔ ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے استدلال اور استناد اکثر و بیشتر قرآن مجید اور صحیح احادیث سے کیا ہے۔ طرز بیان بھی سنجیدہ، صاف، سلیس اور سلجھا ہوا ہے۔ مناظرہ کا رنگ اختیار نہیں کیا گیا ہے۔ ہمارے خیال میں اس کتاب کا مطالعہ ہر مسلمان کے لئے مفید ہے۔

نفسیات مذہب | از جناب سید و ہاج الدین صاحب بی۔ اے، بی۔ ٹی، استاد عثمانیہ کالج اورنگ آباد، تقطیع خورد، ضخامت ۶۰ صفحات، کتابت و طباعت اعلیٰ، کاغذ متوسط، قیمت ۸ر ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ قرول باغ دہلی۔

یہ مقالہ پروفیسر وہاج الدین صاحب نے جنوری ۱۹۳۲ء میں اردو اکادمی کے جلسے میں پڑھا تھا۔

نفسیات مذہب بظاہر ایک خشک علمی مضمون ہے لیکن پروفیسر صاحب کے طرز بیان نے اس میں غیر معمولی دلچسپی پیدا کردی ہے۔ جامعہ کے پچھلے نمبروں میں اس مقالے کا ملخص بھی شائع ہو چکا ہے اس لئے ہم کسی تفصیلی تبصرے کی ضرورت نہیں سمجھتے ناظرین نے خود ہی اندازہ کر لیا ہوگا۔

رسائل و اخبارات

ترجمان القرآن۔ طبیب روحانی۔ بہار (ہفتہ وار)۔ محدث (ماہوار)۔ مالیات (ماہوار)۔

افسانہ (ماہوار)۔ گہوارۂ ادب

ترجمان القرآن | ایڈیٹر سید ابوالاعلیٰ مودودی، سائز جامعہ کا، ضخامت، صفحات، کتابت و طباعت اور کاغذ اعلیٰ۔ قیمت صہ سالانہ۔

ترجمان القرآن پر جامعہ کی کسی اشاعت میں ریویو ہو چکا ہے۔ دوسری جلد کے آغاز سے اس میں اہم تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ سائز بڑا کر دیا گیا ہے۔ ادارت مولانا ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کو تفویض ہوئی ہے مضامین میں بھی خاص تنوع ہے۔ کتابت و طباعت بھی اتنی بہتر ہے کہ غالباً اس سے بہتر حیدر آباد میں ممکن نہیں۔ ہم اس اعلیٰ علمی اور مذہبی رسالے کے مطالعے کی پر زور سفارش کرتے ہیں۔

طبیب روحانی | ایڈیٹر پروفیسر واقف شمس الافاضل ضخامت ۶۰ صفحے تقطیع ۲۰×۳۰/۸، چندہ سالانہ ۱/۸، مقام اشاعت لاہور۔

یہ رسالہ لاہور کے مشہور عامل جناب کریم الدین صاحب کی سرپرستی میں نکلتا ہے۔ پہلے کچھ مجبوریوں کی وجہ سے بند ہو گیا تھا۔ اب پھر جاری ہوا ہے۔

بہار ہفتہ وار | چیف ایڈیٹر لالہ رگھونا تھ رائے ایم۔اے۔ یہ ہفتہ وار رسالہ بچوں اور بچیوں کے لئے لاہور سے نکلتا ہے۔ زیر نظر نمبر لطیفہ نمبر ہے۔ اس میں بچوں کی دلچسپی کے لئے ہر قسم کا سامان فراہم کیا گیا ہے۔ مولانا وحید الدین سلیم مرحوم کی ایک نظم (پیام عمل) کے دو شعر جناب ایڈیٹر اکبر مرحوم کی طرف منسوب کر دئے ہیں۔

محدث (ماہوار) | ایڈیٹر عبدالحلیم ناظم صدیقی رحمانی حجم ۱۶ صفحات تقطیع ۲۰×۲۶/۸ کتابت متوسط، کاغذ معمولی، مقام اشاعت دارالحدیث رحمانیہ دہلی۔

یہ رسالہ دہلی کے مشہور مدرسہ دارالحدیث رحمانیہ کا آرگن ہے۔ جناب شیخ عطاء الرحمن صاحب اس کے مالک اور مولانا احمداللہ صاحب شیخ الحدیث رحمانیہ نگراں ہیں۔ اس کا پہلا نمبر پیش نظر ہے۔ شروع میں 'مناسبات' کے عنوان سے جناب ایڈیٹر صاحب کا افتتاحیہ ہے اور اس میں اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے بعد مضامین کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ یہ مضامین سب مذہبی ہیں اور نہایت آسان اور سادہ زبان میں لکھے گئے ہیں۔ چند عنوانات یہ ہیں: توحید باری، موجودہ مسلمان اور قرآن، صحابہ کرام اور حب نبوی، محرم میں مسلمانوں کا حقیقی لائحہ عمل وغیرہ۔ عام افادے کی غرض سے رسالے کی قیمت کچھ نہیں رکھی گئی ہے صرف ۱ کے ٹکٹ دفتر میں بھیج دینے پر رسالہ غالباً سال بھر کے لئے مفت جاری ہو جائے گا۔

مالیات (ماہوار) | ایڈیٹر سید حفظ الرحمن، ضخامت ۸۰ صفحات تقطیع ۲۰×۲۶/۸، کتابت و طباعت اچھی، چندہ سالانہ ؎، مقام اشاعت دی پریمیر انشیورنس کمپنی لمیٹڈ، پٹنہ۔

ہندوستان میں بنکنگ اور بیمہ کا کاروبار روزافزوں ترقی پر ہے۔ یہ رسالہ انھیں چیزوں کے متعلق مفید معلومات بہم پہنچانے کے لئے جاری کیا گیا ہے۔ اس کے سرپرست ہمارے مشہور رہنما قاضی احمد حسین صاحب اور نگراں پالیسی سید محمد جلیل صاحب ہیں۔

اس وقت ہمارے سامنے اس کا پہلا نمبر ہے۔ اس میں نثر و نظم کے کل ۱۹ مضمون ہیں اور تمام کے تمام کسی نہ کسی خصوصیت کے حامل ہیں۔ ان میں مالیات، بیموں کی تاریخ، ممالک اسلامیہ میں بیمہ کا رواج، بنکنگ، مسلمانوں کے مالی تنزل کے اسباب، صرف عامرہ وغیرہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ غرض رسالہ اپنے مقصد کے اعتبار سے کامیاب ہے اور محنت سے مرتب کیا جاتا ہے۔ جن حضرات کو ان مسائل سے دلچسپی ہو ان سے ہم اس کے مطالعے کی سفارش کریں گے۔

افسانہ (ماہوار) | سرپرست جناب سردار سر سکندر حیات خاں سابق گورنر پنجاب، مدیران اعزازی ملک محمد اسلم خاں ایم۔ اے کینٹب و سردار موہن سنگھ ایم۔ اے، پی ایچ ڈی و سید عابد علی عابد ایم۔ اے، مدیر مسئول سید

نذیر نیازی صاحب بی۔ اے (جامعہ) قیمت سالانہ اعلیٰ ایڈیشن تین روپے معمولی دو روپے۔

یہ رسالہ فن افسانہ نگاری کو ترقی دینے کے لئے نکالا گیا ہے۔ شروع میں سر اکبر حیدری، سر فضل حسین، سید راس مسعود، سر جوگندر سنگھ، مسٹر گوکل چند نارنگ، ڈاکٹر شیخ محمد عالم کے پیغامات ہیں۔ اس کے بعد کوئی بارہ مضامین نظم و نثر ہیں۔ مضامین کی ابتدا تقریب سے ہوتی ہے۔ اس میں جناب ملک عبد القیوم صاحب نے رسالے کے مقصد کو ان الفاظ میں واضح کیا ہے:۔

"ہندوستان میں فن افسانہ نگاری کے نام لیوا ناشتہ قدیم سے موجود ہیں مگر ان افسانہ نگاروں کی تصانیف کا بیشتر حصہ ذوق سلیم سے گرے ہوئے اجزا پر مشتمل ہے۔ بس ضرورت ہے کہ اس فن کی ضرورت زمانے کے مطابق تجدید کی جائے اور شائقین فن کے لئے ایک خوان ادب ترتیب دیا جائے جس سے ایک طرف اردو ادب کے قرار و قیام میں مدد ملے تو دوسری طرف تہذیب اخلاق ایسے مستم بالشان مقصد کی توضیح ہو..... الخ"

ہماری بھی دعا ہے کہ "افسانہ" اپنے ان اعلیٰ مقاصد میں کامیاب ہو۔ رسالے کا آغاز اچھا ہے امید ہے کہ آئندہ اور ترقی کرے گا۔

گہوارۂ ادب (مصور) | ایڈیٹر ایم۔ اے سبزواری و شانتی نرائن ورما، ضخامت ۱۰۰ صفحات تقطیع ۲۰×۳۰/۸، قیمت فی پرچہ ۶/، مقام اشاعت بھوپال۔

یہ الگزنڈرا (جہانگیرانی) اسکول بھوپال کا آرگن ہے اور غالباً سالانہ نکلے گا۔ مضامین نظم و نثر کی تعداد ۹۹ ہے۔ یہ مضامین زیادہ تر اسکولوں کے طلبہ ہی نے لکھے ہیں خصوصاً دسویں درجہ کے لڑکوں کا حصہ زیادہ ہے۔ مضامین کی ترتیب میں ہر قسم کی دلچسپیوں کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ طلبہ کی بعض نظمیں خاص طور سے اچھی ہیں خصوصاً شکر نعمت اور جامعۂ عثمانیہ۔ عزم انسانی کے عنوان سے ایک نظم مولانا فہمی ترمذی کی ہے اور بہت اچھی ہے۔ غرض رسالہ مجموعی حیثیت سے بہت بہتر ہے۔ ہم اس اسکول کے طالب علموں کو اس کامیابی پر مبارکباد دیتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ ان کی یہ ادبی کوششیں اسی طرح جاری رہیں گی۔

دنیا کی رفتار

ممالک غیر

یورپ اور آنے والی جنگ؟ ابھی تین ہی برس ہوئے ہیں کہ دنیا کی تقریباً تمام متمدن قوموں نے مل کر ایک عہد کیا تھا (میثاق کیلاگ) کہ اب دنیا میں کبھی جنگ نہ ہوگی! آج دو براعظموں میں جنگ ہو رہی ہے!! ۴۲ قوموں نے متفقہ طور پر چین میں جاپان کے اقدام کو برا بتلایا مگر جاپان کی فوجیں چین میں شہر پر شہر فتح کرتی جاتی ہیں اور منچوریا کے علاوہ ملک کے بہت بڑے حصے پر قابض ہو چکی ہیں۔ آج سے تین سال پہلے موسیو بریان کی 'ریاستہائے متحدہ یورپ' کا چرچا تھا۔ آج یورپی ریاستوں میں خفیہ معاہدے ہو رہے ہیں اور آنے والی جنگ کی پیش بندیاں۔ یورپی ممالک کے اخبارات اٹھا کر دیکھئے، معلوم ہوتا ہے کہ ہر قوم دوسری قوم سے خائف ہے اور خصوصاً جب سے جرمنی میں ہٹلر کی جماعت کو کامیابی حاصل ہوئی ہے جنگ کے امکان پر ہر طرف گفتگو ہو رہی ہے۔ آئیے دیکھیں کہ یہ اندیشہ اس قدر عام کیوں ہے؟

جرمنی سب سے پہلے جرمنی کو لیجئے۔ جرمنی نے صلحنامہ ورسائی کو کبھی بھی قطعی تسلیم نہیں کیا تھا۔ فاتحوں نے فتح کے خمار میں مفتوح پر ایسے شرائط عائد کئے تھے کہ کوئی خوددار قوم انھیں ہمیشہ کے لئے تسلیم نہیں کرسکتی تھی چنانچہ صلحنامے پر دستخط ہونے کے وقت سے جرمنی میں اس کے خلاف پیہم احتجاج ہوتا رہا۔ اس سے جرمنی کے مشہور مدبر اشٹریزیمان نے بہت کام بھی نکالا اور اپنی قوم کے لئے طرح طرح کی رعایتیں حاصل کیں مگر مفتوح قوم ہونے کا احساس، عدم مساوات کا برتاؤ، جرمنی پر جنگ کی ذمہ داری کا عاید کرنا یہ باتیں ایسی تھیں کہ ان کی تلخی اشٹریزیمان کی سیاسی کامیابیوں سے مٹ نہ سکتی تھی۔ ہٹلر نے وعدہ کیا کہ وہ جرمنی کے دامن سے یہ داغ دھو دے گا۔ جو لوگ برسر اقتدار تھے وہ قومیت کے اس بڑھتے ہوئے طوفان سے ڈرا ڈرا کر دوسری دول سے جرمنی کے لئے رعایتیں حاصل کرتے تھے۔ رعایتیں مل جاتیں تو ہٹلر کی جماعت اسے اپنی ہی کامیابی سمجھتی، رعایتیں نہ ملتیں تو دوسری جماعتیں مطعون ہوتیں اور ہٹلر کو تقویت ہوتی۔ غرض پچھلے چند سال کے ہر اہم واقعے نے اس قومی اشتراکی جماعت کو قوت پہنچائی اور یہ بالآخر برسر اقتدار آگئی۔ اسے حکومت نہ ملتی تو خالص کمیونسٹ جماعت فروغ پاتی اور

دونوں صورتیں امن عالم کے لئے یکساں مضر تھیں۔

ہٹلر کے پروگرام میں کئی مطالبات ہیں جن سے امن عالم بڑے خطرے میں ہے۔ ایک تو وہ جنگ عظیم کے صلحناموں میں بنیادی تغیر چاہتا ہے۔ دوسرے جرمن نو آبادیوں کی واپسی کا مطالبہ کرتا ہے۔ آسٹریا اور جرمنی کے اتحاد کا حامی ہے۔ تاوان جنگ کے مسئلے کو یکسر ختم کرنا چاہتا ہے اور پولینڈ کو جرمنی کا جو حصہ صلح کے نتیجے میں سے دے دیا گیا ہے اس کی واپسی کا طالب ہے۔

ان مطالبوں میں سے بعض تو ضرور پورے ہو جائیں گے۔ صلحناموں میں تو ایک ایک کرکے بے شمار تبدیلیاں ہو گئی ہیں۔ جنگ کی ذمہ داری والی دفعہ کے بدلنے میں ذرا دشواری ضرور ہوگی لیکن مادی خطرات کے مقابلے میں کوئی ملک بھی اس اخلاقی معاملے پر کیوں مصر ہوگا! تاوان جنگ کا مسئلہ عملاً ختم ہو ہی چکا۔ البتہ اسٹریا اور جرمنی کا اتحاد اور پولینڈ سے اپنے ملک کی واپسی ایسے مسائل ہیں کہ ان سے بین الاقوامی سیاست میں سخت پیچیدگیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔

آسٹریا سے جرمنی کے اتحاد کو فرانس پسند نہیں کرتا اور ۱۹۱۹ء سے برابر اس کی مخالفت کر رہا ہے۔ فرانس نے یہ کبھی نہیں سوچا کہ اگر اسٹریا جرمنی کے ساتھ مل جاتا تو شاید ہٹلر کی حکومت کی نوبت نہ آتی اور اسٹریا کی جمہوری سیاسی جماعتوں سے جرمنی کی معتدل جماعتوں کو بہت سہارا ملتا۔ فرانس نے ہمیشہ یہ سوچا کہ اگر یہ اتحاد ہو گیا تو جرمنی کو اس سے زیادہ رقبہ مل جائے گا جتنا جنگ میں اس سے چھنا تھا۔ اور سوا چار کروڑ فرانسیسیوں کے مقابلے میں کوئی سات کروڑ جرمن ہو جائیں گے! چنانچہ علاوہ صلحنامہ ورسائی کے ان دفعات کے جن میں یہ اتحاد جمعیۃ اقوام کی متفقہ رائے کے بغیر ممنوع ہے اسٹریا سے کئی بار عہد لیا گیا ہے کہ وہ اس اتحاد میں شریک نہ ہوگا اور اسی اتحاد کو روکنے کے لئے فرانس اور چکوسلوواکیا میں بھی باہم معاہدہ ہو چکا ہے۔

دوسری گتھی پولینڈ کی ہے۔ جرمن قوم پرستوں کا خیال ہے کہ ان کے ملک کا جو حصہ خواہ مخواہ پولینڈ کو دیا گیا ہے اس کی واپسی کی خاطر انھیں جنگ تک کرنی چاہئے۔ پولینڈ والے کہتے ہیں کہ یہ علاقہ حقیقتاً پولش ہے اور جب فریڈرک اعظم نے اسے جرمنی میں شامل کیا تو یہ صدیوں تک پولینڈ کے ہاتھ میں رہ چکا تھا۔ اس کی آبادی میں ۰۰ فی صدی سے اوپر پول بستے ہیں اور پولینڈ کے لئے سمندر تک پہنچنے کا یہی ایک راستہ ہے۔ پولینڈ کی حکومت نے اس علاقے سے بہتیرے جرمن زمینداروں کو نکال بھی دیا ہے اور قدم قدم پر جرمنوں کے لئے جو رکاوٹیں ہیں انھوں نے جرمنی میں جذبات کو اور بھی مشتعل کر رکھا ہے۔ ادھر ڈانزک

کا بندرگاہ جسے جرمنی سے الگ کرکے ایک خود مختار بلدیہ بنا دیا گیا ہے بالکل جرمن ہے اور ہرچند علیحدگی سے اس کی تجارت کو بہت ترقی ہوئی ہے مگر یہ جرمنی ہی میں شامل ہونا چاہتا ہے۔ ان وجوہ سے بعض لوگ قیاس تک پیش گوئی کرچکے ہیں کہ یورپ کی آیندہ جنگ اسی علاقے میں شروع ہوگی۔



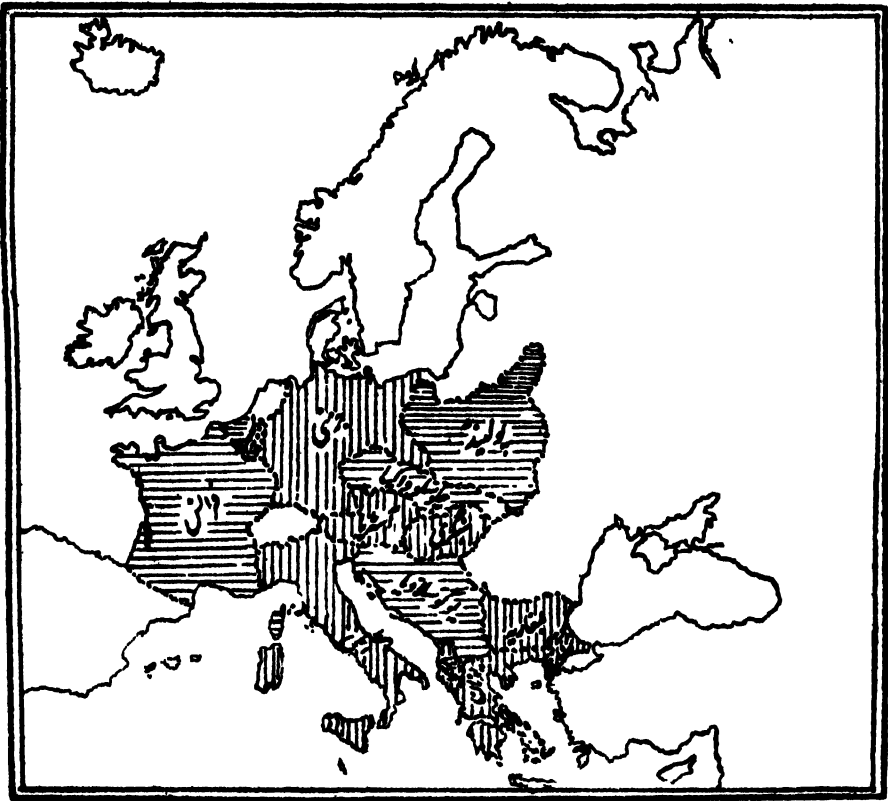
اٹلی | جدید اٹلی کی سیاسی تاریخ پر نظر ڈالیے تو اس میں دو مختلف رجحانات نمایاں معلوم ہوں گے بری رجحان اور بحری رجحان۔ کبھی اٹلی براعظم یورپ کی طرف رخ کرتا ہے اور اپنے مستقبل کو خشکی پر استوار کرنا چاہتا ہے اور کبھی بحر روم میں تفوق حاصل کرکے بحری عظمت حاصل کرنے کا خیال اسے آتا ہے۔ کسی نے ٹھیک کہا ہے کہ اگر سیاست کی باگ کسی شمالی مدبر کے ہاتھ میں ہوتی ہے تو بری رجحان غالب ہوتا ہے اور کسی جنوبی کے ہاتھ میں ہو تو

بحری رجحان. کرتی جنوبی تھا اسی لئے اٹلی نے جرمنی اور آسٹریا سے معاہدہ کرکے اتحاد ثلاثہ کی بنیاد رکھی تھی اور بر اعظم کی طرف سے یوں یکسو ہوکر بحر روم میں اپنا اثر بڑھایا تھا اور آسٹریا کے علاقوں پر دعویٰ چھوڑ کر اپنی افریقی نوآبادیاں حاصل کی تھیں لیکن ۱۹۱۵ء میں جب اٹلی اپنے ساتھیوں کو دغا دے کر فرانس اور انگلستان کے ساتھ جنگ میں شریک ہوا تو اس وقت بری رجحان ہی نے ہوا کا رخ پلٹا تھا اور ساحل ایڈریاٹک پر تسلط کی خواہش نے اٹلی کی سیاست کو بالکل بدل دیا تھا اور اس صورت حال کے پیدا کرنے میں مسولینی کا بڑا حصہ تھا جو شامل ہے! اٹلی کو ٹریسٹ، پولا اور فیوم کے بندرگاہ مل گئے، اور اس کی سرحد بھی اتنی آگے بڑھ گئی کہ کوئی دس لاکھ سلافی اور کوئی ۳ لاکھ جرمن بھی اٹلی کی رعایا بن گئے!

یہ بڑی کامیابی تو ہو ہی چکی پھر جب مسولینی بر سر اقتدار آیا تو اس نے چاہا کہ اس کامیابی کو تو ہاتھ سے نہ جانے دے اور ہو سکے تو بحری کامیابی کی طرح ڈالے۔ چنانچہ جس شخص نے دو سال پہلے ایک وزارت کو اسی وجہ سے شکست دی تھی کہ وہ یوگاسلاویا سے معاملات صاف کرکے خشکی کی طرف سے یکسوئی چاہتی تھی، اسی نے یوگوسلاویا کے ساتھ معاہدے کی تصدیق کی اور ادھر سے توجہ ہٹا کر بحر روم کی سیاست کو مرکز توجہ بنایا۔ لیکن یوگوسلاویا نے ایسا نہ ہونے دیا اور فرانس سے معاہدہ کرلیا۔ چنانچہ اٹلی اب مجبور ہے کہ براعظم کے معاملات میں دخل دے اور مختلف دول سے تعلقات پیدا کرکے پھر ایک توازن قوائے یورپ میں قائم کرے اور جس فرانس کی خاطر اٹلی نے اپنے پرانے ساتھیوں کو چھوڑا تھا اسی کے خلاف پھر ساز باز کرے۔ چنانچہ آج اٹلی بھی مختلف صلحناموں اور معاہدوں میں ترمیم کا اتنا ہی حامی ہے جتنا کہ قوم پرست جرمنی اس لئے کہ اٹلی یہ نہیں چاہتا کہ اس کے ایک طرف فرانس ہو اور دوسری طرف فرانس کا دوست یوگوسلاویا اور براعظم میں اٹلی کا کوئی یار و مددگار نہ ہو! گویا یورپی سیاست میں ایک فریق تو وہ ہے جو صلحناموں میں بنیادی تغیر چاہتا ہے اور اس کی تدبیریں کررہا ہے۔ اس میں اہم ملک جرمنی اور اٹلی ہیں اور ان کا ساتھ غالباً آسٹریا، ہنگری، بلغاریہ، یونان، البانیا اور ترکی دیں گے۔

فرانس | دوسرا گروہ وہ ہے جو جنگ کے بعد کی حالت کو دوام بخشنا چاہتا ہے۔ اس کا سرگروہ فرانس ہے اور اس کے معین پولینڈ، چکوسلوواکیا، رومانیا، یوگوسلاویا اور بیلجیم۔ ان سب کے پاس کوئی ۱۷ لاکھ فوج تو مسلح تیار ہے اور کوئی سوا کروڑ تربیت یافتہ محفوظ فوج ہے! یہ سب صلحناموں کو مقدس منوانا چاہتے ہیں اور ان کو برقرار رکھنے کے لئے میدان جنگ میں اترنے کو تیار ہیں لیکن باوجود اس فوجی قوت کے

پلٹنے مضبوط نہیں ہیں جتنا لوگ خیال کرتے ہیں۔ پولینڈ کو روس اور یوکرینیا کی طرف سے پورا اطمینان نہیں ہے۔ چکوسلو ویکیا تے ملک کے دو طرف جرمنی علاقہ ہے اور یوگوسلاویا پر روپیہ اور فوجی حملوں کی وجہ سے فرانس کا سب سے زیادہ اثر ہے لیکن اس میں اندرونی مناقشات بے شمار ہیں اور اس کے چاروں طرف اٹلی کے ساتھی ہنگری، بلغاریہ، البانیہ اور یونان ہیں۔ فرانسیسی نظام کی یہ کمزوریاں بس اس طرح پوری ہو سکتی ہیں کہ فرانس کو بحر روم میں تفوق حاصل ہو لیکن وہاں اٹلی رقیب موجود ہے!



برطانیہ یورپ اس طرح دو متخاصم گروہوں میں بٹ گیا ہے۔ ان گروہوں میں برطانیہ کا نام کہیں نہیں آیا۔ اس لئے کہ برطانیہ کے شاطران سیاست ابھی دونوں سے الگ ہیں اور دونوں کے ساتھ۔ اگر جرمنی ذرا زور باندھتا ہے تو یہ اسے ڈانٹ دیتے ہیں کہ خبردار حد جائز سے آگے نہ بڑھو، اور فرانس کو خیال ہوتا ہے کہ ہمارے "تحفظ" کی جو ذمہ داری انہوں نے اپنے سر لی ہے وہ کچھ تو پوری کر رہے ہیں۔ پھر یہ فرانس سے کہتے

ہیں کہ جرمنی کا یہ مطالبہ مانو ورنہ گڑبڑ ہو جائے گی اور جرمنی سمجھتا ہے کہ یہ ہمارے دوست ہیں۔ یہ خود بظاہر جھگڑے سے الگ رہنا چاہتے ہیں اور دونوں کو سمجھاتے ہیں کہ لڑنا جھگڑنا بری بات ہے، اسلحہ کم کرو اور امن سے رہو۔ لیکن یہ صورت زیادہ دن چل نہیں سکتی۔ یہ فرانس سے بگاڑنا نہیں چاہتے کیونکہ فرانس کی دوستی انگلستان کے لئے سب سے قیمتی دوستی ہے۔ ایک انگریز مدبر کا قول ہے "فرانس ہمارے ساتھ ہو تو پھر کوئی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا"۔ فرانس کہتا ہے کہ اگر تمہارے کہنے سے ہم نے اسلحہ کم کردئے تو اٹلی اور جرمنی دو دن میں صلحناموں کو ختم کرکے رکھ دیں گے۔ لہذا برطانیہ اگر یہ کر سکے کہ پر امن طریق پر صلحناموں میں ایسی ضروری ترمیمیں کرا دے جس سے جرمنی اور اٹلی اور ان کے ساتھی کم و بیش مطمئن ہو جائیں اور پھر فرانس کو یقین دلا سکے کہ مزید ترمیم کی کوشش کی گئی تو برطانیہ اپنے روپیے اور فوج سے اس کی پوری مخالفت کرے گا تو شاید ان مسلح ٹولیوں میں تصادم ملتوی ہو جائے ورنہ سب سامان تیار ہے ایک چنگاری کی دیر ہے اور کوئی غیر متوقع واقعہ بھی چنگاری بن سکتا ہے!

جرمنی میں یہودی ہٹلر کی قومی اشتراکی جماعت کے برسر اقتدار آتے ہی یہودیوں کے ساتھ بدسلوکیوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا ہے جو ابھی ختم ہوتا نظر نہیں آتا اور بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ جرمنی میں بحیثیت جماعت کے یہودیوں کا وجود مشکل ہی سے قائم رہ سکے گا۔ ہسپتالوں سے یہودی ڈاکٹر برخاست کر دئے گئے ہیں، عدالتوں سے یہودی اہلکار علیحدہ کئے جا رہے ہیں۔ یہودی طالب علموں پر مدرسوں اور جامعات کے دروازے بند ہوتے جاتے ہیں۔ یہودی دوکانوں سے لوگ مال نہیں خریدتے۔ یہودی مصنفوں کی کتابیں کتب خانوں سے نکال کر چوراہوں پر جلائی جا رہی ہیں۔ غرض یہودیوں کے لئے اس متمدن ملک میں زمین تنگ ہے۔

یہودیوں کے خلاف جرمنی میں اور تقریباً تمام مسیحی ممالک میں ایک تعصب تو ہمیشہ سے موجود ہے۔ اس کی تاریخی اصل بلاشبہ مذہبی ہے لیکن اس کی موجودہ وجہ زیادہ تر معاشی ہے۔ یہودیوں کی سیاسی بے سروسامانی، ان کا اپنا وطن نہ ہونا، ان کی اپنی ریاست نہ ہونا یعنی سب وہ چیزیں جن کی وجہ سے ان پر آج یہ ظلم ممکن ہے اور ہمیشہ مسیحی دنیا میں ممکن رہا ہے یہی مغضوبیت جس کی وجہ سے وہ خدا کی وسیع زمین میں ہر جگہ پردیسی کی طرح رہتا ہے اسی میں اس کی معاشی ترقی کا راز بھی نہاں ہے۔ معاشی فروغ کے لئے پردیسی ہونے سے بڑی مدد ملتی ہے اور دنیا کی معاشی تاریخ میں ہر جگہ پردیسیوں کا بڑا حصہ ہے۔ پردیسی کے سر پر روایات ملکی کا بار

نہیں ہوتا، مروت کی رکاوٹیں اس کی راہ میں حائل نہیں ہوتیں، ہم جنسوں کا خیال اسے کسی چیز سے نہیں روکتا۔ وہ جو چاہتا ہے کر سکتا ہے اور دولت کمانے کے لئے کوئی راہ اچھی ہو یا بری، اس پر بند نہیں ہوتی۔ ایک ملک سے دوسرے کو جانے میں، ایک پیشہ بدل کر دوسرا اختیار کرنے میں، نفع اگر ایسے کاروبار میں حاصل ہو جو مفادِ عام کے خلاف ہے تو بھی اس سے نفع اٹھانے میں پردیسی کو تامل نہیں ہوتا۔ چنانچہ معاشی زندگی میں خالص نفع طلبی کی ذہنیت کو جو عہدِ جدید کے نظامِ سرمایہ داری کی مخصوص ذہنیت ہے پردیسیوں نے اور خصوصاً یہودیوں نے بہت مدد دی ہے۔ یہی بین الاقوامی تجارتی تعلقات قائم کرنے میں سب سے پیش پیش رہے ہیں۔ سامانِ تعیش، جواہر اور ریشم کی تجارت سے انھوں نے مغربی طرزِ معاشرت پر خاصا اثر ڈالا ہے۔ دوسری طرف تمباکو، شراب، غلہ، اون اور شکر کی تجارت پر یعنی ان چیزوں کی تجارت پر بھی ان کا قبضہ رہا ہے جو بڑے پیمانے پر پیدا کی جا سکتی ہیں اور عام استعمال میں آتی ہیں۔ سوتی کپڑے، نیل اور روئی کی تجارت سے انھوں نے اکثر مغربی ممالک میں روایتی معیشت کو درہم برہم کر دیا ہے۔ جہاں کہیں تو آبادیاں بسیں وہاں یہ پہنچے ہیں نئی دنیا میں سب سے پہلے تاجر یہی یہودی تھے۔ امریکہ کے سب سے پہلے صنعتی کارخانے یہودیوں نے قائم کئے غرض سرمایہ داری کے نظامِ معاش کے نشو و نما میں یہودیوں نے اپنی تعداد سے کہیں زیادہ حصہ لیا۔

جرمنی میں یہودیوں کی کل تعداد ۶ لاکھ کے قریب ہے یعنی آبادی میں ایک فی صدی لیکن بڑے صنعتی کارخانوں کے نگرانوں اور منصرموں میں یہ کوئی ۱۴ فی صدی ہیں۔ بجلی کے بڑے کارخانوں کے مالکوں اور نگرانوں میں یہودی ۲۳ فی صدی سے اوپر ہیں، دھاتوں کے کارخانوں میں ۲۵ فی صدی، چمڑے اور ربر کے کاروبار میں ۳۰ فی صدی، بنک تو اکثر و بیشتر ان کے ہاتھ میں ہیں صرافی کی بڑی بڑی دوکانیں تقریباً سب کی سب یہودیوں کی ہیں۔

یہ باتیں معمولی جرمن کو بہت کھلتی ہیں اور مذہبی اور نسلی تعصبات کے ساتھ یہ معاشی محرکات مل کر انھیں بہت قوی کر دیتے ہیں۔ ہٹلر کی جماعت نے اس نفرت کو بہت کچھ اکسایا ہے اور پھر جرمن قوم کی ہر مصیبت کا ذمہ دار یہودیوں ہی کو ٹھہرایا ہے۔ سالہا سال سے نفرت کی اس آگ کو بھڑکایا جا رہا تھا، اب اس کے شعلے قابو سے باہر ہو گئے ہیں۔ غالباً اکثر یہودیوں کو جرمنی سے رفتہ رفتہ ہجرت کرنی ہوگی اور خیال ہے جس ملک کی طرف یہ رخ کریں گے وہاں کی معاشی زندگی میں سرمایہ داری نظام کو غیر معمولی تقویت پہنچے گی۔ لیکن اس خانماں بر دوش قوم کے ساتھ "بیسویں صدی" کی مہذب دنیا کا یہ سلوک انسانیت کے لئے درسِ عبرت کا کام دے گا!

ممالک اسلام

عرب سعودی | ابھی یہ حقیقت غالباً عام طور پر لوگوں کو نہیں معلوم ہے کہ ملک ابن سعود نے اپنے مقبوضات کا سرکاری نام اب بجائے نجد و حجاز کے 'عرب سعودی' رکھ دیا ہے۔ یہ تبدیلی تو خیر لفظی ہے لیکن اسی کے ساتھ ساتھ آج کل وہاں چند بہت اہم واقعات رونما ہو رہے ہیں۔ مسٹر جان فلبی جو ابھی تھوڑا ہی عرصہ ہوا حلقۂ اسلام میں داخل ہوئے ہیں اور ملک ابن سعود کے ذاتی دوست ہیں اس سال ایام حج میں مکہ پہنچے ہیں۔ وہاں کے حالات پر انھوں نے حال ہی میں ایک مضمون لکھا ہے جو لندن ٹائمز اور اسٹیٹسمین میں شائع ہوا ہے۔ اس کا اقتباس ہم یہاں پیش کرتے ہیں:۔

"عرب کی معاشی حالت کا دار و مدار اب تک حاجیوں کی تعداد پر رہا ہے۔ وہابی حکومت کے پہلے تین سال میں تو حالت اچھی رہی لیکن اس کے بعد عام کساد بازاری کی وجہ سے حاجیوں کی تعداد کم ہونے لگی۔ حکومت کے پاس پس انداز کچھ نہیں تھا اس لئے حالت دن بدن خراب ہی ہوتی گئی سنہ ۱۹۲۹ء سے دشواریوں میں اضافہ ہی ہو رہا ہے۔ پہلے حاجیوں کی تعداد اوسطاً ایک لاکھ ہوتی تھی لیکن سنہ ۱۹۳۰ء میں یہ تعداد چالیس ہزار کے قریب رہ گئی اور دوسرے سال اس میں بھی کمی ہوئی۔ سنہ ۱۹۳۱ء کے موسم حج میں ایک اہم واقعہ یہ پیش آیا کہ صرافوں نے مل کر کچھ ایسی ترکیب کی کہ عربی فلس کی قیمت کم ہونے لگی۔ سرکاری طور پر ایک نقرئی ریال کے بدلے میں ۲۲ فلوس ملتے تھے لیکن اس دن ۶۰ تک نوبت پہنچ گئی۔ حکومت چاہتی تو سٹے بازی کو روک سکتی تھی مگر اس کے مشیر اچھے نہ تھے۔ روکنا تو درکنار اس نے خود اس حالت سے فائدہ اٹھانا شروع کیا۔ ایک شاہی فرمان کے ذریعے سے ریال کی قیمت ۴۴ فلوس مقرر کر دی گئی اور حکومت کے نمایندوں نے چاندی کے بدلے فلوس خریدنے شروع کئے۔ تعداد تو ۴۴ مقرر تھی مگر انھیں بعض اوقات ایک ریال کے بدلے ۶۰ فلوس تک ملے۔ ایک دن تو یہ کیفیت رہی اور دوسرے دن حکومت نے یہ ستم ظریفی کی کہ ریال کی قیمت پھر ۲۲ فلوس کر دی۔ اس طرح حکومت اور صرافوں کو تو بہت فائدہ ہوا لیکن بیچارے غریب لوگ مارے گئے۔ یہی نہیں بلکہ عربی سکوں سے لوگوں کو ایک قسم کی بدگمانی بھی پیدا ہو گئی۔ بنکوں نے مقامی سکوں کو ہاتھ لگانا چھوڑ دیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ ریال کی قیمت کم ہوتے ہوتے اتنی رہ گئی جتنی اس میں چاندی تھی۔ پہلے ایک طلائی پاؤنڈ کے عوض صرف ۱۰ ریال ملتے تھے لیکن آج کل ہر جگہ آسانی سے ۲۰ ریال مل سکتے ہیں۔ اس طرح جن لوگوں کے

پاس صرف چاندی کے سکے تھے ان کے لئے اشیا کی قیمت گویا دوگنی ہوگئی۔

حاجیوں کی تعداد کم ہو جانے کی وجہ سے حکومت کی آمدنی بھی کم ہوگئی اور بڑی دقت پیش آئی۔ اس وقت حکومت کے ذمے تمام قرضہ ۳ لاکھ طلائی پاؤنڈ تو تھا ہی اس پر طرہ یہ ہوا کہ سرکاری ملازموں کی تنخواہیں باقی رہنے لگیں۔ نومبر ۱۹۳۱ء میں جو حساب لگایا گیا تو پورے چھ مہینے کی تنخواہیں باقی تھیں۔ اب حکومت کو بجز اس کے کوئی چارہ نہ تھا کہ قرضے کی ادائیگی کے التوا کا اعلان کرتی چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ لیکن نہ تو دنیا کی عام کساد بازاری کم ہوئی اور نہ حاجیوں کی تعداد بڑھتی ہوئی دکھائی دی۔ اس وجہ سے التوا کی مدت ختم ہونے کے بعد بھی حکومت نہ تو قرضے کی قسط ادا کر سکی اور نہ ملازموں کی تنخواہیں۔ یہ بات واقعی قابل قدر ہے کہ سرکاری ملازموں نے کوئی غیر معمولی صورت ناجائز آمدنی کی نہیں نکالی۔

اب حکومت کے لئے صرف دو صورتیں ممکن تھیں۔ یا تو وہ اتنا ہی پاؤں پھیلاتی جتنی چادر تھی یا چادر کو بڑھانے کی کوشش کرتی۔ دوسری صورت زیادہ دلکش تھی اور نئے وسائل کی تلاش بھی اتنا مشکل کام نہیں تھا جتنا کہ سمجھ لیا گیا تھا۔ یہ خیال عام طور پر پھیلا ہوا ہے کہ عرب کی معاشی حالت صرف حاجیوں پر ہی منحصر ہے لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ دوسرے وسائل بھی موجود ہیں مگر اب تک عرب ان کی طرف محض اس لئے توجہ نہیں کرتے تھے کہ ان کے خیال میں ان وسائل سے صرف غیر ملکی کفار ہی کام لے سکتے تھے اور ان کی ہوس ملک گیری اس قدر بڑھی ہوئی ہے کہ ان کا داخلہ عرب میں بہر صورت خطرناک ثابت ہوتا۔ اب سخت احتیاج نے اس راسخ عقیدے پر نظر ثانی کرائی اور اس راہ میں پہلا قدم خود ملک عبدالعزیز بن سعود نے اٹھایا۔

تقریباً دو سال سے بعض خیالات گدگدی پیدا کر رہے تھے اور حکومت آہستہ آہستہ اس راستے پر چل رہی تھی جو اب تک ممنوع تھا۔ "رعایات" کو لوگ اب تک "غیر ملکی تجارتی اقتدار" کا مرادف سمجھتے رہے ہیں اور اس لئے انہیں ملکی آزادی کا منافی سمجھا گیا ہے۔ جدید طرز عمل سے ان خیالات کی تردید شروع ہوگئی ہے اور اس وقت جبکہ تباہی قریب تھی حکومت نے ایسی نئی تجویزیں پیش کی ہیں جن کی کامیابی تو ابھی بالکل یقینی نہیں ہے لیکن ان سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ عرب نامساعد حالات سے مغلوب ہونے والے نہیں ہیں اور ابھی ان میں زندگی موجود ہے۔ انھوں نے اپنے وسائل کو بڑھانے کا ارادہ کر لیا ہے اس لئے کہ یہی ایک صورت ان کے زندہ رہنے کی ہے۔ جہاں تک ممکن ہوگا "رعایات" صرف مسلمانوں کو دی جائیں گی لیکن جب غیروں کا داخلہ حکومت کے لئے مفید ہوگا تو انہیں بھی ایسے شرائط پر داخل کیا جائے گا جن سے عربی

آزادی میں خلل نہ پڑے۔

اس طرح عرب میں ایک نیا باب کھل رہا ہے اور اس کی ابتدا مناسب طور پر ذرائع آمد و رفت کی ترقی سے ہوتی ہے۔ جدے اور مکے کے درمیان ریل جاری کرنے کا خیال نیا نہیں ہے۔ اس صدی کے شروع میں سلطان عبدالحمید نے قسطنطنیہ کو مرکز اسلام سے ریل کے ذریعے منسلک کرنے کا فیصلہ کیا تھا اور ۱۹۱۰ء میں ریل مدینے تک پہنچ گئی تھی مگر مقامی عربوں کی مخالفت کی وجہ سے یہ کام آگے نہ بڑھ سکا۔ اب آخر کار اگر کوئی حادثہ نہ پیش آگیا تو ۱۹۳۵ء کے وسط تک جدے سے مکے تک ریل جاری ہو جائیگی۔ پہلا قدم اٹھ چکا ہے۔ " رعایات " ہندی مسلمانوں کی ایک جماعت کو اس شرط پر عطا ہوئی ہیں کہ پچاس برس کے بعد ریل اور اس کے تمام متعلقات حکومت کی ملک ہو جائیں گے۔ چھ مہینے میں مہتمم تعمیرات نیل پہنچ جائیں گے اور اس طرح بہت سے بے کاروں اور بھوکوں کے لئے کام مہیا ہو جائے گا۔

حکومت کی معاشی دشواریوں کا صرف ایک حل ہو سکتا ہے اور وہ ایک سرکاری بنک کا وجود ہے۔ شریف حسین بھی عرصے تک اس خیال میں رہے۔ بہت سے امید وار اٹھے مگر نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ اب آخر کار سابق خدیو مصر عباس حلمی کی تجویز منظور ہوئی۔ سرکاری بنک کے قیام کے لئے ایک معاہدہ مرتب ہو گیا ہے اور اس پر سرکاری مہر بھی ثبت ہو چکی ہے۔ شرائط بھی ایسے ہیں کہ حکومت اور ملک کے لئے مفید ثابت ہوں گے۔ اب یہ امید کی جا سکتی ہے کہ جلد حکومت کا قرضہ ادا ہو سکے گا۔ محاصل درآمد وغیرہ بھی بار کفالت سے آزاد ہو جائیں گے۔ سابق خدیو نے اس تجویز کو اٹھا کر ' مرکز اسلام ' کی جو خدمت کی ہے اس پر وہ تمام عالم اسلامی کے شکریے کے مستحق ہیں۔"

سرکاری بنک کی کیا نوعیت ہوگی اور اس کے منافع کہاں سے آئیں گے' اس میں سود لیا اور دیا جائے گا یا نہیں اور ان کا سرمایہ کن پیدا آور کاموں میں لگایا جائے گا یہ سب تفصیلات اس مضمون سے نہیں معلوم ہوتیں۔ جب تک ان کا علم نہ ہو کوئی رائے قائم کرنا قبل از وقت ہوگا۔

دوسرے ذرائع سے یہ خبر معلوم ہوئی ہے کہ ریل کے ٹھیکے پر تقریباً ½ ۲ لاکھ روپیہ سلطان ابن سعود کی حکومت کو پیشگی منافع کی صورت میں ملے گا اور سرکاری بنک کے لئے سابق خدیو عباس حلمی نے ۳۵ لاکھ ڈالر (تقریباً سوا کروڑ روپیہ) کے سرمایے کی ضمانت کی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ سرمایہ اور کہاں سے آتا ہے اور اس نظام سرمایہ داری کا اثر عربوں پر کیسا پڑتا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ غریب عرب

نہ تواس نظام کی پیچیدگیوں سے واقف ہے اور نہ اسے اس سے کوئی فائدہ پہنچے گا۔ اب رہی حکومت
سو اس کو تو نفع ضرور ہو گا مگر کون کہہ سکتا ہے کہ ایک دفعہ اس چکر میں پڑ کر وہ غریبوں کے مفاد کا بھی خیال
رکھے گی۔ قعرِ دریا میں تختہ بندی کے بعد دامن کا تر نہ ہونا آسان نہیں ہے۔

شذرات

علوم اسلامیہ سے جو لوگ دلچسپی رکھتے ہیں وہ عرصے سے اپنی اپنی جگہ پر ایک ایسے مرکزی ادارے کی ضرورت محسوس کر رہے تھے جو ان علوم کی چھان بین کرنے والوں میں اتحاد عمل پیدا کر سکے۔ بیشتر حضرات تو اس خیال کو اپنے سینے میں چھپائے ہی رہے مگر لاہور کے اہل علم نے خیال پیدا ہوتے ہی اس پر عمل بھی شروع کر دیا۔ چنانچہ دسمبر ۱۹۳۲ء میں چند حضرات نے جمع ہو کر ایک ' ادارۂ معارف اسلامیہ ' کی بنیاد رکھی۔ یہ کام تو آسان تھا مگر مسلمانوں میں ایسے ادارے کی ضرورت کا احساس پیدا کرنا اتنا ہی مشکل ثابت ہوا اور چار برس کے بعد گذشتہ اپریل میں اس کی نوبت آئی کہ ادارۂ معارف اسلامیہ کا پہلا اجلاس منعقد ہو سکے۔

... ...

اس ادارے کے مقاصد یہ ہیں:-

(۱) ہندوستان کے تمام محققین اسلامیہ کے درمیان اشتراک عمل، اتحاد ذہنی و اجتماعی اور وسائل امداد باہمی کے قیام میں سہولتیں بہم پہنچانا۔

(۲) محققین کی ایسی مشکلات کو جو بسا اوقات ان کے مشاغل علمیہ میں پیش آتی ہیں، حتی الامکان رفع کرنے کی کوشش کرنا۔

(۳) محققین کو نتائج تحقیقات علمیہ کی اشاعت کی غرض سے جمع کرنا۔

(۴) بیرونی ممالک کے مستشرقین کو وقتاً فوقتاً افادۂ علمیہ کی غرض سے دعوت دینا۔

(۵) ارتقائے تمدن اسلامی کے سلسلے میں اسلام کی مختلف خدمات کو منظر عام پر لانا۔

(۶) عام طور پر اسلامی تحقیقات کے لئے قوم میں تحریص و تشویق کی تحریک جاری رکھنا۔

(۷) آمدنی کافی ہونے پر ایک دار الکتب، ایک دار الاشاعت اور ایک مشرقیات کا دار النفائس (میوزیم) کھولنا۔

... ...

ان مقاصد کے اہم اور مفید ہونے میں کسے شک ہو سکتا ہے۔ اب تک تو ان سے بحث محض ایک

علمی بحث ہوتی مگر اب کہ اس ادارے نے پہلا اجلاس کر کے ایک عملی قدم بھی اٹھا دیا ہے ان مقاصد کی اشاعت اور حتی المقدور ان کے حصول کی کوشش نہ کرنا کسی طرح جائز نہیں ہے۔ "امم سابقہ کے عروج و زوال اور ترقی و تنزل کے افسانے آنے والی نسلوں کے لئے ہمیشہ سبق آموز ہوتے ہیں ..... ان سے بڑھ کر کسی قوم کے لئے کوئی درس ترقی نہیں ہو سکتا۔ جب یہ ہے تو پھر ایک قوم کے لئے خود اپنے ماضی کی روایات کی تحقیق اور ان کے برقرار رکھنے کی سعی کتنی اہم ہو سکتی ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ اس کو ثابت کرنے کی کوشش تحصیل حاصل ہوگی۔"

... ...

ادارۂ معارف اسلامیہ کا پہلا جلسہ ۱۵ اپریل ۱۹۳۳ء کو پنجاب یونیورسٹی کے ہال میں منعقد ہوا۔ خلیفہ شجاع الدین صاحب صدر مجلس استقبالیہ نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور علامہ سر محمد اقبال نے باقاعدہ افتتاح فرمایا۔ اس موقع پر جناب موصوف نے جو تقریر فرمائی اس میں اس ادارے کے اغراض و مقاصد اور ان کی اہمیت پر روشنی ڈالی اور تمدن عالم میں اسلامی تمدن کی حیثیت اجمالاً بیان فرمائی۔

ادارے کا یہ اجلاس دو دن تک جاری رہا اور کئی مضامین پڑھے گئے۔ وقت کی کمی کی وجہ سے پورے مضامین نہیں پڑھے جا سکے اور چونکہ بیشتر حضرات نے اپنے مضمون کا کوئی خلاصہ تیار نہیں کیا تھا اس لئے سننے والوں کو کچھ بہت زیادہ فائدہ ان کی تحقیقات علمیہ سے نہیں پہنچا۔ امید ہے کہ آئندہ اجلاس میں نہ صرف حضرات منتظمین بلکہ اصحاب مضامین بھی اس نقص کی طرف توجہ فرمائیں گے۔ ایسے علمی جلسوں میں جہاں ہر شخص کا مضمون ایک مختلف شعبے سے متعلق ہوتا ہے عام افادے کی صرف یہی ایک صورت ہے کہ ہر صاحب مضمون اپنے مضمون کا ایک خلاصہ قبل از وقت تیار کر کے بھیج دے اور وہ خلاصہ اجلاس میں شریک ہونے والوں کو پہلے سے دے دیا جائے تاکہ اگر انھیں کچھ بحث کرنا ہو تو وہ اس کے لئے تیار ہو کر آئیں ورنہ ان مضامین کو سنانے اور سننے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی قابل لحاظ ہے کہ ہر علمی مضمون پڑھ کر سنانے کے قابل نہیں ہوتا۔ یہ ممکن ہے کہ مضمون تحقیق کا اعلیٰ نمونہ ہو لیکن سنانے سے وہ کسی کی سمجھ میں نہ آئے اور سننے والوں کو کوفت ہو۔ ایسے مضامین کے خلاصے کی اور بھی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔

... ...

ایک اور اہم نقص اس اجلاس کی کارروائی میں یہ تھا کہ صدر مجلس استقبالیہ کا خطبہ افتتاحی تقریر اور اکثر مضامین کی زبان انگریزی تھی۔ ان حضرات میں سے ہر ایک کی مادری زبان اردو ہے اور اگر یہ چاہتے

تو اپنے مافی الضمیر کو اچھی طرح اور بعض صورتوں میں تو یقیناً انگریزی سے بہتر طور پر اردو میں ادا کر سکتے تھے، لیکن ہماری ذہنی غلامی کی یہ ایک نہایت افسوس ناک مثال ہے کہ ہم جب اپنے علوم و معارف کی ترویج کے لئے بھی اٹھتے ہیں تو ایک غیر زبان سے کام لیتے ہیں۔ اگر اس اجلاس میں علوم جدیدہ یا سائنس کے مسائل پر بحث کی گئی ہوتی تو ہم یہ کہہ کر اپنے دل کو تسکین دے لیتے کہ ابھی "ظرف تنگنائے" اردو "بقدر شوق" نہیں ہے اور اہل علم حضرات کے بیان کے لئے کچھ اور وسعت چاہئے لیکن اس ادارے کا نام تھا "ادارۂ معارف اسلامیہ" اور جن مسائل سے بحث کی گئی وہ تھے اسلامی تاریخ اور اسلامی آداب سے متعلق۔ پھر جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ایک طرف تو ہم دوسروں کے مقابلے میں اردو کی حمایت میں زمین اور آسمان کے قلابے ملاتے رہتے ہیں اور دوسری طرف خود اس زبان سے ایسی لاپروائی برتتے ہیں تو شیخ سعدی کا یہ قول یاد آتا ہے:۔

ہر کس از دست غیر نالہ کند　　　سعدی از دست خویشتن فریاد

... ...

ادارۂ معارف اسلامیہ کے اس پہلے اجلاس میں بجز ان دو نقائص کے اور سب محاسن ہی تھے۔ حسن انتظام، مہماں نوازی اور خوش اخلاقی ہر طرف نمایاں تھی۔ جلسے وقت پر ہوئے اور کامیاب رہے۔ سب سے زیادہ جو چیز پسند کی گئی وہ مخطوطات اور تصاویر کی نمایش تھی۔ اس نمایش کا انتظام بہت اچھا تھا اور چیزیں بہت سلیقے سے سجائی گئی تھیں۔ ان میں بعض قدیم مخطوطات کے علاوہ پروفیسر محمود شیرانی صاحب نے سکوں کا جو مجموعہ پیش کیا تھا وہ واقعی قابل دید تھا۔ ایسے اہم اور مختلف النوع سکے اتنی تعداد میں کسی عجائب خانے میں بھی مشکل سے ملیں گے چہ جائیکہ کسی ایک شخص کے ذاتی مجموعے میں۔ نمائش میں جو چیزیں رکھی گئی تھیں ان کی فہرست بھی اجلاس کی روداد کے ساتھ شائع ہونے والی ہے اس لئے ہم اس وقت تفصیلات سے احتراز کرتے ہیں۔ امید ہے کہ اس ادارے کا دوسرا اجلاس جہاں بھی ہوگا حضرات منتظمین اس قسم کی ایک نمائش کا بھی ضرور انتظام فرمائیں گے۔

... ...

ہمیں امید ہے کہ ادارۂ معارف اسلامیہ کی مجلس انتظامیہ کے ارکین جن میں علامہ سر محمد اقبال اور سر شیخ عبد القادر بھی شامل ہیں اس ابتدا کے بعد خاموش نہ بیٹھیں گے بلکہ اس کے اغراض و مقاصد

کی ترویج جاری رکھیں گے اور اس کے لئے سرمایہ فراہم کرنے کی کوشش کریں گے۔ ادارے کے لئے ایک کتبخانے کا وجود ناگزیر ہے اور علوم اسلامیہ کا ایک ایسا کتب خانہ ہندوستان میں کہیں بھی نہیں ہے جس سے کام کرنے والوں کو ضروری کتابیں مل سکیں۔ ایسی حالت میں اس باب میں اور زیادہ جلدی کی ضرورت ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر علامہ اقبال مجمع علمی دمشق، گب میموریل، رائل ایشیاٹک سوسائٹی، مجلس المانی مشرقی (D. M. G.) اور اسی قسم کے دوسرے ہندوستانی اور بیرونی اداروں سے درخواست فرمائیں تو وہ ضرور اپنی مطبوعات ادارے کے کتب خانے کے لئے بلا قیمت عطا کرنے پر راضی ہو جائیں گے۔ اس کے علاوہ حکومت مصر سے یہ درخواست کرنی چاہئے کہ عربی کتابوں کی ایک معتد بہ تعداد اس کتب خانے کو عطا کرے۔

... ...

ان سب انتظامات اور خط و کتابت کے لئے ضروری ہے کہ کوئی شخص مستقل طور پر اسی کام کے لئے متعین ہو۔ پنجاب یونیورسٹی کے اساتذۂ علوم مشرقیہ میں سے ہر شخص خود اپنے فرائض منصبی اور اپنے علمی مشاغل میں اس قدر مصروف رہتا ہے کہ ان سے یہ توقع کرنا کہ وہ کافی وقت اس کام میں صرف کر سکیں گے زیادتی ہوگی۔ ہمیں امید ہے کہ اراکین مجالس انتظامیہ جلد سے جلد کم از کم اتنا سرمایہ تو ضرور ہی فراہم کرلیں گے کہ ادارے کے لئے ایک مستقل ناظم کا تقرر ممکن ہو سکے۔ اسی سلسلے میں ایک بات اور قابل لحاظ ہے اور وہ یہ کہ ادارے کے ہر عام اجلاس کے موقعے پر ایک عام کاروباری جلسہ بھی ہونا چاہئے جس میں ادارے کی ترقی کے لئے باہر کے لوگوں سے بھی مشورہ کیا جائے۔ اس سے نہ صرف یہ فائدہ ہوگا کہ بعض مفید مشورے مل جائیں گے بلکہ یہ بھی ہوگا کہ عام طور پر لوگوں کی دلچسپی میں اضافہ ہوگا اور وہ اپنی ذمہ داری کو زیادہ محسوس کریں گے

... ...

اس ادارے سے متعلق ہم نے جو اپنی رائے اس تفصیل سے پیش کی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سے ہمیں بہت سی توقعات ہیں اور اس کی ترقی کا خیال ہمیں ہر وقت رہتا ہے۔ ہم ادارۂ معارف اسلامیہ کے ارباب حل وعقد کو یہ یقین دلانا چاہتے ہیں کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے کارکن اپنی استطاعت کے مطابق اسے ہر قسم کی مدد دینے کے لئے آمادہ ہیں اور ہم امید کرتے ہیں کہ یہ ادارہ ہندوستان میں

علوم اسلامیہ کے احیا کا ذریعہ بنے گا ۔ ہ

مژدۂ صبح دریں تیرہ شبانم دادند　　　　شمع کشتند و ز خورشید نشانم دادند

---

۱۵ مئی سے جامعہ میں کالج کی جماعتوں میں تعطیل ہوگئی اور یکم جون سے اسکول بھی بند ہو جائے گا۔ یکم اگست کو حسب معمول کالج اور اسکول دونوں کھل جائیں گے۔

...　　...　　...

جامعہ کے بعض اساتذہ تعطیل کے زمانے میں بھی اس آرام سے محروم رہتے ہیں جس کا انھیں سال بھر کی شدید محنت کے بعد استحقاق ہو جاتا ہے اور اپنا وقت زیادہ تر ملک کے مختلف حصوں کا دورہ کرنے میں صرف کرتے ہیں تاکہ جامعہ کے مقاصد کی اشاعت کریں اور اس کے لئے مالی امداد حاصل کریں عام دستور تو یہ ہے کہ قومی تعلیم گاہوں کی سفارت کا کام ملک کے معتمد رہنما انجام دیتے ہیں اور اساتذہ اس خدمت سے معذور رکھے جاتے ہیں لیکن جامعہ ملیہ مسلمانوں کی تعلیم گاہ ہے جن کے رہنما عموماً عملی کاموں سے پرہیز کرتے ہیں یا اگر ان کی طرف متوجہ بھی ہوتے ہیں تو اسی وقت جب ان کے ذریعے سے حکام وقت کا تقرب اور اعزاز و منصب حاصل ہونے کی امید ہو۔ جامعہ ملیہ کی خدمت کرنے میں سراسر زحمت ہے اور کسی قسم کے ذاتی فائدے کی امید نہیں اس لئے اگر یہ حضرات اس سے پہلو تہی کرتے ہیں تو کوئی تعجب نہیں لیکن چونکہ جمہور ملت جامعہ ملیہ کی ضرورت کو دل سے محسوس کرتے ہیں اس لئے ان کا دست فیض اکابر قوم کے توسط کے بغیر جامعہ کی مدد کے لئے خود بخود بڑھتا ہے۔ پھر بھی ہر کام کے لئے کرنے والوں کی ضرورت ہوتی ہے خصوصاً چندہ جمع کرنے کا کام اس زمانے میں اس قدر دشوار ہے کہ اس کے لئے بڑے مستقل مزاج، جفاکش، مخلص لوگ درکار ہیں۔ اس لئے جامعہ کے چند اساتذہ قریب قریب ہر سال تعطیل میں بھی راحت و آرام، بال بچوں، عزیزوں دوستوں کی صحبت کو چھوڑ کر نکل کھڑے ہوتے ہیں اور جہاں تک اپنی فرصت اور ہمت اور قوم کی توفیق اور ہمت کفایت کرتی ہے ایک رقم جمع کر لیا کرتے ہیں۔ چنانچہ اس سال یہ دو صاحب گرمی کے تعطیل کے زمانے میں صوبہ متحدہ کا دورہ کر رہے ہیں تاکہ مختلف مقامات پر ہمدردان جامعہ کے حلقے قائم کریں۔

...　　...　　...

ہمدردان جامعہ کی تحریک جیسا ہم کسی پچھلے پرچے میں لکھ چکے ہیں گذشتہ سال اکتوبر سے شروع ہوئی

ہے۔اس کا مقصد یہ ہے کہ جن جن مقامات پر مسلمانوں کی آبادی ہے وہاں ان لوگوں کے حلقے قائم کئے جائیں جو جامعہ ملیہ کے تعلیمی نصب العین کے حامی ہیں۔ یہ حضرات ایک چھوٹی سی ماہانہ رقم جسے وہ نہایت آسانی سے ادا کر سکتے ہوں جامعہ کی امداد کے لئے دیتے ہیں اور یوں بھی ہر طرح کی کوشش ان خدمات کی تائید میں کرتے ہیں جو جامعہ ملیہ انجام دے رہی ہے۔ اس بار وسط مئی سے آخر جولائی تک اساتذۂ جامعہ کے وفود صوبہ متحدہ وغیرہ کا دورہ کریں گے۔ اس وقت حسب ذیل پروگرام پیش نظر ہے اور حتی الامکان اس کی پابندی کی جائے گی:۔

مئی ۔ آخری دو ہفتے : فرخ آباد، ایٹہ، مین پوری، بلند شہر۔

جون ۔ پہلا اور دوسرا ہفتہ : سہارنپور، دہرہ دون، بجنور۔

" ۔ تیسرا ہفتہ : شملہ۔

" ۔ چوتھا ہفتہ : بارہ بنکی اور گونڈا۔

جولائی۔ اعظم گڈھ، جونپور، غازی پور، بلیا، مرزاپور، گورکھپور، بنارس، الہ آباد۔

ہمیں امید ہے کہ رسالۂ جامعہ کے قارئین کرام جو ان مقامات پر موجود ہیں ان وفود کی ہر طرح امداد کریں گے کیونکہ ان سے بڑھ کر جامعہ ملیہ کی تعلیمی اور ذہنی تحریک کا قدردان کوئی نہیں ہو سکتا۔

... ...

اس وقت تک ہمدردان جامعہ کی تحریک کو خدا کے فضل سے اچھی کامیابی ہوئی ہے۔ خاص شہر دہلی میں اس حلقے کے رکن پانچ سو سے زائد ہو چکے ہیں۔ میرٹھ میں حلقہ قائم ہو گیا ہے اور شہر کے اکثر حضرات جو تعلیمی ذوق اور قومی درد رکھتے ہیں اس میں شریک ہو گئے ہیں۔ علی گڈھ جو وفد گیا تھا اسے حسب توقع پوری پوری کامیابی ہوئی۔ مسلم یونیورسٹی کے قریب قریب کل اساتذہ جو پہلے سے جامعہ کے حقیقی ہمدرد تھے اب اصطلاحی ہمدرد بھی بن گئے۔ امید ہے کہ جناب شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب شروع جون میں حیدرآباد تشریف لے جائیں گے۔ وہاں جامعہ کے سچے بہی خواہ اور سرپرست بہت بڑی تعداد میں موجود ہیں اس لئے یہ تحریک انشاء اللہ وہاں خوب سرسبز ہوگی۔

نذر دربار رسالت

شعرائے اسلام سے اپیل

میلاد کی محفلوں میں جو نعتیں عام طور پر پڑھی جاتی ہیں وہ اگرچہ عاشقان نبیؐ کے والہانہ جذبات کی آئینہ دار ہونے کے لحاظ سے قابل قدر ہیں لیکن بعض بعض اشعار کے مضامین اور تیور ایسے سوقیانہ اور بے باک پائے جاتے ہیں جو سلیم المذاق سامعین کو بار گذرتے ہیں بعض اشعار وفور محبت و عقیدت سے اس قدر لبریز ہوتے ہیں کہ حدود شریعت سے تجاوز کا لحاظ نہیں رہتا ۔ اکثر نعت خواں اصحاب خود انتخاب کرنے سے معذور ہوتے ہیں اس لئے ارکان سیرت کمیٹی جالندھر نے محسوس کیا ہے کہ ایک مجموعۂ نعت شائع کرنے کی ضرورت ہے جو پاکیزہ جذبات کا حامل ہو اور جس میں احترام نبویؐ کا مل طور پر ملحوظ رہے ۔ سرکار کائنات صلعم کی حیات طیبہ کے ان روشن واقعات کی جانب لطیف اور پر کیف اشارات ہوں جن سے اقوام عالم کو فلاح دارین کا سامان میسر آیا اور حضورؐ کے رحم و کرم، عدل، بذل، شجاعت، فصاحت، عفو، فقر، امانت و دیانت، بردباری، تحمل، محبت، رواداری، مساوات اور ان جملہ اخلاق حمیدہ کا تذکرہ ہو جو انسانیت کی تکمیل کا باعث اور دنیا کے لئے مشعل ہدایت ہیں اور ذکر حبیبؐ بھی اس انداز میں ہو کہ ہادی برحقؐ کی رفعت و عظمت، وابستگان دربار رسالت کی سعادت اور اسلام کی عالمگیر رحمت کا نقشہ پیش نظر کر کے مردہ قوم میں از سر نو روح پھونک دی جائے اور ساز دل کے تار تار سے نغمۂ محبت نبویؐ پیدا ہو جائے لیکن ضعیف اور غیر مثبتہ روایات سے احتراز کیا جائے ۔

اس مجموعے میں ایسی نظمیں بھی شامل ہوں گی جو حیات نبوی کے مختلف واقعات کے متعلق ہوں ۔ ایک حصہ ایسی نعتوں اور نظموں کے لئے مخصوص ہوگا جو بچوں کے لئے آسان زبان اور پیرایے میں لکھی گئی ہوں ۔ کچھ ایسی نعتیں اور نظمیں بھی ہوں گی جو بچیوں کے لئے لکھی جائیں اور ان سے وہ برکات ظاہر ہوں جو رسول کریمؐ کی ذات سے فرقۂ اناث کو حاصل ہوئیں ۔

تمام نعت اور نظمیں ایسی بحروں میں ہوں جو ترنم کے لئے موزوں ہوں ۔ انشاءاللہ یہ مجموعہ یوم النبیؐ سے قبل بہ اہتمام خاص، پاکیزہ کتابت، نفیس طباعت اور عمدہ کاغذ پر شائع ہو جائے گا ۔ تمام شعرائے اسلام سے استدعا ہے کہ اپنی اپنی نعتیں اور نظمیں مرحمت فرما کر سعادت دارین حاصل کریں ۔ بارگاہ رسالت کے لئے یہ نذر تیار ہو رہی ہے ۔ ہر ایک شاعر جس کا ایمان ہو کہ نعت رسولؐ سرمایۂ سعادت ہے، اپنے اپنے گلہائے اشعار لے آئے کہ فرقۂ شعرا کی جانب سے یہ گلدستۂ عقیدت مرتب ہو کر افصح عرب سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار رحمت میں پیش ہو ۔ ایک پھول بھی منظور ہو گیا تو گلدستے کے تمام گل و گیاہ شرف قبولیت سے ممتاز ہو کر باعث نجات و فلاح دارین ہو جائیں گے

نیاز مند

پیرزادہ عبدالحمید بی اے، ایل ایل ۔ بی ہیڈر میونسپل کمشنر سکریٹری سیرت کمیٹی شہر جالندھر (پنجاب)

مصفی

طب یونانی کا تازہ کرشمہ

انسان کی زندگی کا مدار خون پر ہی، خون اگر خراب ہو گیا ہو تو آدمی کی تندرستی قائم نہیں رہ سکتی ہندوستانی دواخانہ دہلی مصفیٰ ایجاد کرکے تمام ملک کو مقابلہ کی دعوت دیتا ہے، اور بلا خوف تردید دعوٰی کرتا ہے کہ صفائی خون کیلئے مصفی سے بہتر دوا آج تک نہ ایشیا پیش کر سکا ہی، اور نہ یورپ!

مصفی ہندوستان کی جڑی بوٹیوں کا خلاصہ ہی اور مسیح الملک ثانی حکیم حاجی محمد احمد خاں صاحب کے مشورہ سے جدید سائنٹیفک طریق پر تیار کیا گیا ہی خون کی خرابی سے پیدا ہونے والے ہر مرض کی تیر بہدف دوا ہی، کھجلی داد پھنساں وغیرہ حتی کہ سوزاک، آتشک اور جذام کا زہریلا مادہ بھی اس کے استعمال سے ہمیشہ کو لئے نابود ہو جاتا ہی، اس کی ایک خوراک چاء کا ایک چمچہ ہی اور بلحاظ نفع مصفی درحقیقت اکسیری چیز ہی، قیمت ۱۲؍ خوراک کی شیشی صرف ۱۲؍ محصول ڈاک علاوہ ہوگا۔

ترکیب استعمال:۔ ایک خوراک صبح، ایک شام تھوڑے پانی میں ملاکر، اور اگر مرض کا جوش زیادہ ہو تو دن میں تین مرتبہ استعمال کیا جائے۔

ہندوستانی دواخانہ پوسٹ بکس نمبر ۲۲ دہلی سے طلب کیجئے

آپ کیا کر رہے ہیں

اپنی پیاری اردو زبان کے لئے کچھ تو کیجئے!

حیدر آباد کے مشہور و معروف علم دوست جاگیردار جناب نواب سالار جنگ بہادر

کی زیر سرپرستی

ایک لمیٹڈ کمپنی قائم ہو گئی ہے جس نے

قابل اطمینان نستعلیق ٹائپ

کی ایجاد کو موجد سے خرید لیا ہے۔ جس کی مزید تفصیل کیلئے پراسپیکٹس منگائیے!
اگر آپ بھی چاہتے ہیں کہ عالم اردو میں ایک شاندار اور خوشگوار انقلاب پیدا ہو جائے اور روزانہ اخبار و رسائل اور کتابیں دیدہ زیب ٹائپ میں کمپوز ہو کر چھپنے لگیں تو پراسپیکٹس کی وسیع اشاعتوں اور حصوں کی فروختگی میں شرکت کیجئے

المشتہر:-

خوشنخط نستعلیق ٹائپ فاؤنڈری لمیٹڈ دہلی

ہندوستان کا بہترین اخبار

نوید

ایڈیٹر
سید حسن ریاض

مولانا حسرت موہانی
ڈاکٹر و آنریبل شیخ مشیر حسین قدوائی
نواب محمد اسمٰعیل خانصاحب بیرسٹر ایٹ لا

سیاسیات عالم پر مغز مضامین۔ اسلامی ممالک کے حالات، افسانے، ظرافت کے رنگ میں تحریکات عالم پر تبصرے، شایع ہوتے ہیں:۔

اعلیٰ طبقہ میں بہت مقبول ہے۔ اس لئے نوید کا اشتہار بہت کامیاب ہوتا ہے۔ نمونہ مفت۔ ایجنٹوں کو ایک مرتبہ پانچ پرچے تجربے کے لئے بلا قیمت دیئے جاتے ہیں:۔

تازہ برقی خبریں پر از معلومات اور بصیرت افروز مقالات اسلام اور وطن کی محبت میں ڈوبی ہوئی تحریریں

روزانہ

مدینہ

میں شایع ہوتی ہیں، جو ہندوستان کے ہر گوشہ اور ممالک غیر میں بیحد پسند کیا جاتا ہے یہ بے مثل اور کثیر الاشاعت اخبار اشتہار دینے والوں اور ایجنٹوں کے لئے بہترین ذریعہ تجارت ہے۔ نمونہ مفت طلب فرمائیں

قیمت سالانہ	ششماہی	سہ ماہی	ماہانہ	فی پرچہ
۱۵ عہ	۱۲ آر	للعہ	۸ ہر	ار

پتہ:۔ منیجر روزانہ مدینہ بجنور (یوپی)

سیرتِ محمد علیؒ

شائع کردہ مکتبہ جامعہ دہلی

سیرت کے مطالعہ کرنے کے بعد آپ صحیح اندازہ کر سکیں گے محمد علیؒ کا دل اسلامی جذبات سے کس قدر لبریز تھا۔ اور قوم ملک کے لئے اس نے کیا کیا خدمات انجام دیں تمام حالات آپ سیرت میں پڑھیں:۔

۲۰×۲۶/۸ کے سائز پر تقریباً ۶۰۰ صفحات، کتابت و طباعت نہایت عمدہ متعدد فوٹو۔

قیمت تین روپیہ

درحقیقت سیرت محمد علیؒ تاریخ سیاسیات ہند کا ایک اہم باب ہے

مکتبہ جامعہ دہلی

۹۱۰ے

چندہ سالانہ پانچ روپیہ

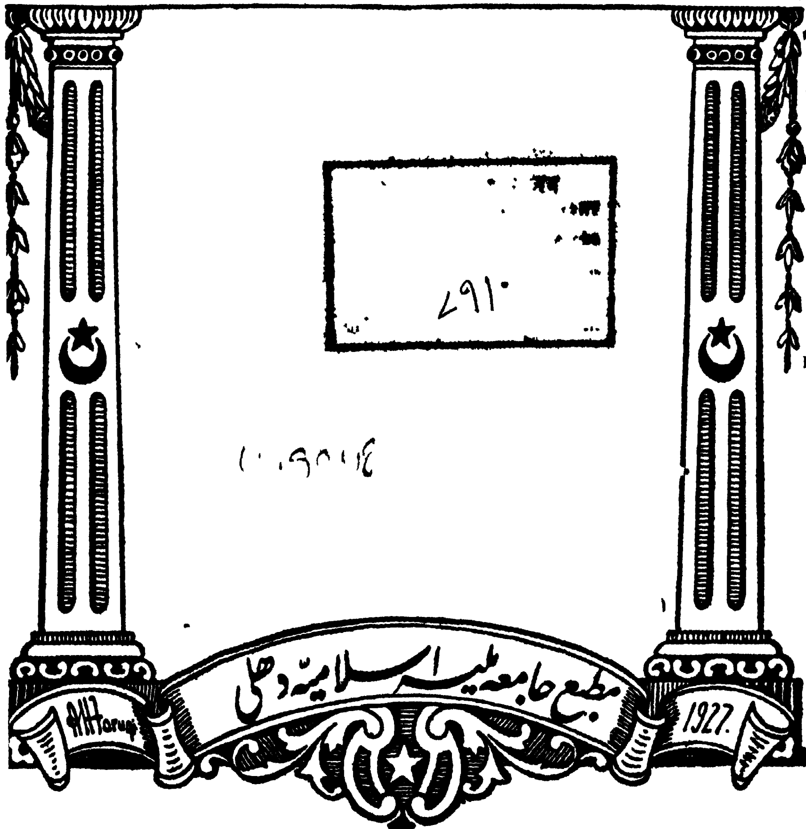
قیمت فی پرچہ آٹھ آنہ

پرنٹر، پبلشر: محمد مجیب، بی اے (آکسن)

نے

جامعہ برقی پریس دہلی میں چھپوا کر شائع کیا


جامعہ
جامعہ ملیہ کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ
نمبر ۱
بابت ماہ جولائی ۱۹۳۳ء
جلد ۲۱


مطبع جامعہ ملیہ اسلامیہ دھلی
1927.

فہرست

مطبوعاتِ جامعہ دہلی

مذہب، تاریخ، سوانح عمریاں، ادب، ڈرامے، بچوں کی کتابیں



مذہب

نفسیات مذہب | مقالہ اُردو اکاڈیمی، مذہبی جذبہ نفس انسانی میں کن کن شکلوں میں نمودار ہوتا ہی اس کا دوسرے جذبات سے کیا ہی اور اس کا اثر مجموعی نفسی زندگی پر کس صورت میں اور کس حد تک پڑتا ہی، از پروفیسر سید وہاج الدین صاحب۔ قیمت ۸ر

سیرۃِ نبوی اور مستشرقین | مستشرقین یورپ اسلام اور پیغمبر اسلام پر شریر اور مغالطہ انداز میں حملہ کیا کرتے ہیں، اس کتاب میں مدلل جواب دیا گیا ہی۔ قیمت عہ

تاریخ القرآن | قرآن حکیم پر نہایت ہی جامع کتاب ہے طبع دوم۔ از مولنا محمد اسلم صاحب جیراجپوری قیمت عمر

بیان | الفرقان فی معارف القرآن کا دوسرا حصہ، سورۂ آل عمران کی مکمل تفسیر قیمت عہ ۱۲ر

صراط مستقیم | سورۂ انفال و توبہ کی تفسیر فلسفۂ جنگ جہاد فتح و کامرانی کے قوانین و ضوابط۔ قیمت دو روپئے۔

عبرت | احسن القصص یعنی سورۂ یوسف کی تفسیر نصیحت آمیز اور عبرت انگیز نتائج کا مرقع۔ قیمت ایک روپیہ۔

برہان | سورۂ نور کی مکمل تفسیر۔ امت اسلامیہ کے لئے ایک لائحہ عمل۔ قیمت ایک روپیہ عہ ر

سبیل الرشاد | سورۂ حجرات کی تفسیر ہے اس میں علمی مسائل کی فلسفیانہ تشریح عقل کی روشنی میں کیگئی ہی۔ قیمت ۱۰ر

ذکریٰ | پارۂ عم کی تفسیر جس میں ان تمام چھوٹی چھوٹی سورتوں کی تفسیر ہی جنھیں ہم نماز میں پڑھتے ہیں۔ قیمت عبار

محجوب الارث | مولنا محمد اسلم صاحب کا یہ رسالہ محجوب الارث اولاد کے متعلق ہی۔ اس میں بتایا گیا ہی کہ اولاد کبھی محجوب الارث نہیں ہوسکتی قیمت ۴ر

الوراثۃ فی الاسلام | فن وراثت پر عربی میں یہ یہ ایک آسان رسالہ ہے۔ قیمت ۸ر

مکتبۂ جامعہ دہلی

ذکرے ولادت نبوی پر مولانا ابوالکلام آزاد کا یہ معرکۃ الآرا مضمون ہے اس کی قدر الہلال کے مطالعہ کرنے والے حضرات کر سکتے ہیں۔ قیمت ۸ر

بشریٰ اسلام میں خدا کا تخیل صرف جبار و قہار ہی نہیں بلکہ رحمن و رحیم بھی ہے۔ از سید سلیمان ندوی قیمت ۶ر

الورد والریحان بچوں کے لئے چند قابل حفظ احادیث کا انتخاب ہے تاکہ وہ آنحضرت صلعم کے اس مختصر کلام کو آسانی یاد کر سکیں۔ قیمت دو آنہ۔

ہمارا دین اس میں ارکان خمسہ اسلام کی خوبیاں عام فہم اور سلیس اردو میں لکھی گئی ہیں قیمت ۲ر

تاریخ

تاریخ مغربی یورپ ہسٹری آف ویسٹرن یورپ کا ترجمہ ہے جس میں وہاں کی معاشرت علم و ہنر اور سیاسی اداروں کی بتدریج ترقی کو دکھایا گیا ہے۔ قیمت ڈھائی روپے عـہ

تاریخ ہند قدیم کے۔ ایم پانیکر کی کتاب کا ترجمہ ہے جسے موصوف نے جامعہ کے شعبہ تصنیف و تالیف کی درخواست پر لکھا تھا۔ قیمت ۸ر

تاریخ الدولتین خلافت بنی امیہ اور بنی عباس کے عہد حکومت کی مختصر اور جامع تاریخ۔ قیمت عیہ

تاریخ نجد نجدیوں کے مذہبی عقائد، سیاسی حالات اور طرز معاشرت پر مکمل کتاب ہے۔ قیمت عہ ر

تاریخ الامت ابتدا سے لیکر خلافت عثمانیہ تک اسلام کی مستند تاریخ۔ قیمت مکمل عللعہ

۱۔ حصہ اول سیرۃ الرسول قیمت عیر
۲۔ حصہ دوم خلافت راشدہ۔ عاـر
۳۔ حصہ سوم خلافت بنی اُمیہ۔ عیر
۴۔ حصہ چہارم خلافت عباسیہ عاـر
۵۔ حصہ پنجم خلافت عباسیہ بغداد عاـر
۶۔ حصہ ششم خلافت عباسیہ مصر۔ عاـر
۷۔ حصہ ہفتم۔ خلافت عثمانیہ۔ عہ ر

سوانح عمریاں

سیرت محمد علیؒ مولانا محمد علی کی مکمل سوانح عمری ضخامت ۷۰۰ صفحہ کے قریب متعدد تصاویر قیمت [illegible]

تلاش حق گاندھی جی کے خود نوشت زندگی کے حالات اور تجربات۔ ۲ جلدیں مع متعدد تصاویر ایک روپیہ قسم اول دو روپے۔

ٹالسٹائی روس کے قائد اعظم، مشرق کے مصلح اور انسانیت کے شیدائی، ٹالسٹائی کے حالات۔ قیمت ۳ر

جمال الدین اخوت اسلامی کا پرجوش داعی جس نے ہندوستان، ایران، مصر اور فرانس میں بڑے بڑے کام کئے ۸ر

اورنگ زیب اورنگ زیب پر اعتراضات کے جواب اور من گھڑت تاریخ کا کچا چٹھا قیمت ۸ر

حیات حافظ لسان الغیب خواجہ حافظ کی زندگی

کے حالات اور اُن کی شاعری پر مفصل تبصرہ قیمت عہ ر

حیاتِ جامی فارسی کے مشہور شاعر مولانا نورالدین جامی کے حالات اور اُن کے تصوف پر بحث قیمت ۸ر

ضیاء الدین برنی عہد تغلق کے نامور مؤرخ ضیاء الدین برنی مصنف تاریخ فیروز شاہی کے حالات اور اس کی تاریخ پر تبصرہ۔ قیمت چھ آنے ۶ر

سیرۃ عمرو بن العاص نامور فاتح مصر حضرت عمرو بن العاص کی زندگی کے حالات۔ قیمت عہ ر

خادماتِ خلق یورپ اور امریکہ کی چند پاک سیرت خواتین کے حالات جنھوں نے اپنی زندگی قوم پر وقف کر دی تھی۔ قیمت ۱۰ر

ادب

سیر المصنفین اُردو کے تمام مصنفین کے حالات ادب اُردو کی دل پسند تاریخ۔ قیمت صہ ر

کیمیا گر چند مختصر افسانوں کا مجموعہ قیمت ایک روپیہ۔

نیرنگ ۱۲ ادبی مضامین اور ایک تاریخی ڈرامہ ہے۔ قیمت عہ ر

مضامین رسالہ جوہر جامعہ ملیہ کا قلمی رسالہ جوہر کے مضامین کا مجموعہ۔ قیمت ایک روپیہ

لیلۃ القدر مولانا ابوالکلام آزاد کا ایک مضمون ہے۔ قیمت ار

دیوان غالب جرمنی اس میں غالب کا خود نوشتہ مقدمہ غزلیات، قصائد اور رباعیات ہیں۔ پاکٹ سائز سہ رنگی تصویر۔ عہ/ و عہ

مرقع غالب جرمنی کمرہ کی زینت کے لئے عمدہ چیز ہے، غالب مرحوم کی سہ رنگی تصویر۔ دو قسم کے اشعار الگ الگ درج ہیں۔ قیمت ۸ر

دیوان شیدا (جرمنی) مسیح الملک حکیم اجمل خاںؒ کے فارسی اور اُردو کلام کا مجموعہ، مرحوم کی اجازت پر مکتبہ جامعہ نے خاص طور سے جرمنی میں طبع کرایا۔ قیمت عہ

کلام جوہر مولانا محمد علیؒ جوہر کے جدید اور قدیم کلام کا مجموعہ ہے اور شروع میں مولانا عبدالماجد دریاآبادی کا مقدمہ ہے۔ قیمت ۸ر

انتخاب میر سعدی ہند میر محمد تقی میر علیہ الرحمہ کے چھ دواوین سے یہ انتخاب تیار ہوا ہے قیمت ۱۲ر

انتخاب سودا مرزا محمد رفیع سودا میر کے ہم چشم ہیں یہ مجموعہ اُن کے اچھے کلام سے تیار ہوا ہے قیمت ۱۲ر

انتخاب حسرت حسرت کے تمام دواوین کا عطر ہے۔ قیمت ۱۲ر

جواہر ملیہ دس تاریخی ملی نظموں کا یہ مجموعہ ہے۔ دلچسپ اور نتیجہ خیز ہے، یہ نظمیں درس میں داخل ہیں قیمت ۳ر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جامعہ
دہلی

زیر ادارت

مولنا اسلم جیراجپوری | ڈاکٹر سید عابد حسین ایم۔اے، پی ایچ۔ڈی۔

جلد ۲۱	بابتہ ماہ جولائی ۱۹۳۲ء	نمبر ۱

فہرست مضامین

محمد مجیب بی۔اے (آکسن) پرنٹر و پبلشر نے جامعہ برقی پریس دہلی میں چھپوا کر شائع کیا۔

عربی اور فارسی شاعری کے امتیازات

تشبیہ و استعارہ

(۲)

صنائع بدائع پر بھی عربیت کا رنگ غالب ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ فارسی شاعری نے تشبیہات میں اپنی سرحد علیحدہ قائم کی اور اس کی خصوصیات بھی عربی تشبیہات کی نسبت زیادہ ہیں لیکن اس کے ساتھ یہ بات بھی غور و توجہ کے لائق ہے کہ فارسی تشبیہات کا زیادہ حصہ نیچرل تشبیہات سے خالی ہے اور اکثر تشبیہات میں بعدِ الفہم بھی پایا جاتا ہے۔ عربی تشبیہات سے انسانی دماغ اور اس کی قوت مدرکہ کو جس قدر قرب و سہولت حاصل ہے فارسی تشبیہات میں اسی نسبت سے بعد و دشواری پائی جاتی ہے۔

عربی تشبیہات کا اکثر حصہ حسی اور مادی ہوتا ہے۔ ابونواس شراب کے بلبلوں کی تعریف میں کہتا ہے۔

ع حصاء در علی ارض من الذہب یعنی "بلبلے ایسے ہوتے ہیں جیسے سونے کی زمیں پر موتی کے ریزے پڑے ہوتے ہیں۔" اس مفہوم کو کہ "بادشاہ تمام انسانوں سے باعتبار مرتبے کے افضل ہوتا ہے" کس سادگی سے لکھا ہے "فانّ فی الخمر معنًا لیس فی العنب" یعنی شراب اگرچہ انگور سے بنتی ہے لیکن جو بات شراب میں ہوتی ہے وہ انگور میں نہیں اسی طرح بادشاہ اگرچہ طبقۂ انسان ہی سے ہوتا ہے مگر جو بات بادشاہ میں ہوتی ہے وہ اور انسانوں میں کہاں"! کس خوبی اور سادگی سے بادشاہ کی برتری اسی کی جنس سے ثابت کی گئی ہے، کوئی پیچ اور گھماؤ نہیں۔

صدغ الحبیب و حالی   کلاہما کاللیالی

محبوب کی زلف اور اپنی حالت کی تشبیہہ "لیل" سے نہایت سادہ تشبیہہ ہے۔

کان مثار النقع فوق رؤسنا   واسیافنا لیل تہاوی کواکبہ

اس شعر کے اندر گرد کی تاریکی میں تلواریں چمکنے کو رات کے ستارے ٹوٹنے سے تشبیہ دی ہے۔ وجہ شبہ کس قدر صاف و سادہ ہے دماغ پر زور ڈالنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

فانظر الیہ کزورق من فضۃ قد اثقلتہ، حمولۃ من عنبر

کشتی پر جب زیادہ بوجھ لادا جاتا ہے تو اس کا اکثر حصہ زیر آب رہتا ہے اور صرف کنارے چمکتے رہتے ہیں، اسی وجہ سے شاعر اس کے کنارے کو ماہ نو سے تشبیہ دیتا ہے۔ شاعر کا خیال اپنی وسعت اور باریکی کے اعتبار سے انتہا سے زیادہ وسیع و لطیف ہے۔ وجہ شبہ تلاش کرنے میں کسی قسم کی دقت و پریشانی اٹھانی نہیں پڑتی۔

فارسی میں ماہ نو کی تشبیہ میں ظہیر فاریابی نے خوب زور طبع صرف کیا ہے۔ معاصرین ظہیر با وجود زور طبع صرف کرنے کے اس کی گرد کو بھی نہ پہنچ سکے۔

قصیدے کی تمہید اس طرح شروع کرتا ہے کہ "جب شام ہوئی تو میں نے دیکھا کہ لوح لاجوردی پر کسی نے بخط خفی 'ن' لکھ دیا ہے یا دریا میں کشتی بہتی چلی جا رہی ہے یا یونس (علیہ السلام) بطن حوت سے نکل کر کنار آب پڑے ہوئے ہیں۔" اسی طرح کی دو ایک تشبیہوں کے بعد لکھتا ہے کہ "لوگ آپس میں بحث و نزاع کر رہے تھے کہ یہ کیا چیز ہے اور کیسی ہے۔ اتنے میں میں نے عقل کے پاس جا کر دریافت کیا کہ کون سا معشوق ہے جس کے کان کا آویزہ آسمان اتار لایا ہے؟ یا کسی کے قبا کی بیل تراش لی ہے؟ یا کسی معشوق کے ہاتھ کا کنگن اڑا لایا ہے۔ اگر جرم کوکب ہے تو اتنا خمیدہ کیوں ہے، اور اگر پیکر ماہ ہے تو اس قدر نحیف و زار کس وجہ سے ہے؟ عقل نے ان تمام تعجبات کا یہ جواب دیا کہ "جو کچھ تو نے اب تک اس کے متعلق خیالات قائم کئے ہیں ان میں سے ایک خیال بھی ٹھیک اور صحیح نہیں۔ اگر تو حقیقت جاننا چاہتا ہے تو غور و توجہ سے سن۔ حقیقت میں یہ بادشاہ کے گھوڑے کا "نعل" ہے جس کو فلک نیلگوں انتہائی فخر و تکبر سے ہر ماہ اپنے سر رکھ لیتا ہے۔"

چوں بوزمیں طلیعۂ شب گشت آشکار آفاق ساخت کسوت عباسیاں شعار
پیدا شد از کرانہ میدان آسماں شکل ہلال چوں سر چوگان شہریار
دیدم ز زر ریختہ بدیں لوح لاجورد نونے ست گوئیا بقلم کردہ نگار

روئے فلک چو لجۂ دریا و ماہِ نو | مانند کشتئے کہ زدریا کند گذار
یا بر مثالِ ماہیِ یونس میانِ آب | آہنگ در کشیدنِ او کردہ از کنار
یا ہمچو یونس آمدہ بیرون زبطنِ حوت | افتادہ برکرانۂ دریا نحیف و زار
در معرضِ خلافِ جہانے زمرد و زن | تو میش در نظارہ و خلقے در انتظار
من باخرد بحجرۂ خلوت نشستہ ام | گفتم کہ "اے نتیجۂ الطافِ کردگار"
بازاینچہ نقش بوالعجب و شکلِ نادرست | کز کارگاہ غیب ہمی گردد آشکار
آں شاہد از کجاست کہ این چرخ شوخ چشم | از گوش او بروں کشد ایں نغز گوشوار
گردوں زجامۂ کہ دریدست ایں طراز | گیتی زساعدِ کہ بود دست ایں سوار
گر جرم کوکب ست چرا شد چنیں دوتا | در پیکر مہ است چرا شد چنیں نزار
گفت "آنچہ برشمردی ازیں جملہ ہیچ نیست | دانی کہ چیست باتو بگویم باختصار
نعلِ سمندِ شاہِ جہاں ست کاسماں | ہر ماہ برسرش نہد از بہر افتخار"

ایک دوسرے شاعر نے اسی چیز کو اس رنگ سے پیش کیا ہے۔

اے ماہ چو ابروانِ یاری، گوئی | نے ہمچو کمانِ شہریاری، گوئی
نعلے زدہ اززرِ عیاری، گوئی | برگوشِ سپہر گوشواری، گوئی

یعنی "اے چاند تو ابروئے معشوق ہے، نہیں نہیں، بلکہ بادشاہ کی کمان ہے یا خالص سونے کا نعل ہے، یا آسمان کے کان کا بالا ہے"۔

اگرچہ ظہیر کی طرح بات پیدا نہ ہوسکی مگر پھر بھی تخیل کے اعتبار سے بہت بلند چیز بیان کی ہے۔
فارسی شاعری میں فطری اور حسی تشبیہات کی بہ نسبت عربی شاعری کے کمی ہے لیکن جو کچھ بھی ہیں وہ اپنی شوخی و نزاکت کے اعتبار سے بہت بہتر صورت میں ہیں۔

دو زلف تابدار او بہ چشم اشکبار من | چو چشمۂ کہ اندرو شنا کنند مارہا (قاآنی)
چمن ہنوز لب از شیر ابر ناشستہ | چو شاہداں خطِ سبزش دمید گرد عذار (ظہیر فاریابی)

حقیقت میں تشبیہ و استعارہ جسم شاعری کے لئے روح کی حیثیت میں داخل ہے۔ انشاپردازی اور عروس شاعری کے حسین چہرے کے لئے اگر کوئی چیز خط و خال ہو سکتی ہے تو وہ صرف تشبیہ و استعارہ ہے بغیر ان دونوں کے اس کے جمال دل افروز میں کشش و کہربائی پیدا نہیں ہو سکتی۔

بہت سے موقعے ایسے ہوتے ہیں کہ اگر اس وقت کسی چیز کو معمولی انداز میں بیان کر دیا جائے تو وہ بالکل بے کیف اور بے مزہ معلوم ہوتی ہیں لیکن اگر اسی چیز کو استعارے اور تشبیہ کے پردے میں بیان کیا جائے تو وہی سادہ چیز تیر و نشتر بن جاتی ہے۔ داغ کا ایک شعر ہے:۔

گیا تھا کہہ کے اب آتا ہوں قاصد کو تو موت آئی　　　دلِ بیتاب واں جا کر کہیں تو بھی نہ مر رہنا

داغ نے دیر کرنے کو موت آنے اور مر رہنے سے تعبیر کیا ہے۔ اگر شعر میں یہ دونوں لفظ نہ ہوتے تو شعر کی اثر انگیزی بالکل جاتی رہتی۔ اس صورت میں یوں بیان کیا جاتا کہ " قاصد نے بہت دیر لگائی، اے دل کہیں تو بھی دیر نہ لگانا۔"

نظیری کا شعر ہے:۔

تا منفعل ز رنجش بیجانہ بنیمش　　　می آرم اعتراف گناہ نبودہ را

اس شعر کی لطافت، دلکشی، کہربائی اور دل آویزی کا نقشہ الفاظ کی مدد سے کھینچنا سعیٔ لاحاصل ہے۔ " گناہ نبودہ " کے ٹکڑے نے جسدِ شعر میں جان ڈال دی ہے۔ اگر مفہوم شعر کو اس اچھوتے انداز سے شاعر بیان نہ کرتا تو اتنی کہربائی ہرگز نہ پیدا ہوتی۔

غالب فرماتے ہیں:۔

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ　　　ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہوتا

شاعر نے دوسرے مصرع میں طنزاً بطور استعارے کے " دیر پشیماں " کی جگہ " زود پشیماں " کہا ہے اور اسی طنزیہ طرز نے کلام میں جان سی ڈال دی ہے۔ اگر " دیر پشیماں " کہدیا جاتا تو یہ دلکشی نہ پیدا ہوتی۔

تکلیف و مصیبت اور حزن و ملال میں تو کوئی متنفس بھی قصداً و ارادتاً تشبیہ و استعارے کا استعمال نہیں کرتا لیکن اس وقت بھی جو بات انسان کی زبان سے بلا قصد و ارادہ نکلتی ہے وہ تشبیہ و استعارے کا پہلو

لے ہوتی ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان فطرۃً اس نہج و طریقے پر مجبور ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ کسی شخص کا لڑکا مر جائے تو وہ اس مصیبت کو بلا قصد و ارادہ یوں ادا کرے گا کہ "سینہ پھٹ گیا، آسمان ٹوٹ پڑا، دل چھلنی ہو گیا، پہاڑ گر پڑا۔"

یہ امر واقعہ ہے کہ استعارے اور تشبیہ کے استعمال کے لئے ہر انسان بلا تخصیص "علم و جہل" فطرۃً مجبور ہے۔ کلام میں ساری کشش و کہربائیت اس کی معتدل آمیزش سے پیدا ہوتی ہے، بغیر اس کے شاعری کے چہرے پر رنگینی نہیں آتی۔ یہی وہ منتر ہے جس کے ذریعے شاعر لوگوں کے دلوں کو تسخیر کر لیتا ہے اور یہی وہ سحر ہے جس سے شاعر ادنیٰ سے ادنیٰ چیز کا چولا بدل ان کو شعر بنا لیتا ہے۔ شعر میں وسعت و پہنائی اس وقت تک پیدا نہیں ہوتی جب تک استعارے اور تشبیہ کی چاشنی موجود نہ ہو۔

بہ برقع مہ کنعاں کہ بود حسن آباد   بہ حجلہ گاہ زلیخا کہ بود یوسف زار

یعنی "ماہ کنعاں (حضرت یوسف علیہ السلام) کے نقاب کی قسم جو کہ حسن آباد تھا اور زلیخا کی خلوت گاہ کی قسم جو کہ یوسف زار تھی۔"

شاعر نے پہلے مصرعے میں یوسف علیہ السلام کے چہرے کے حسن کو "حسن آباد" سے استعارہ کیا ہے اور دوسرے مصرعے میں زلیخا کے خلوت کدے کو "یوسف زار" کہا ہے۔ "حسن آباد" اور "یوسف زار" کے تشبیہ کے اضافے نے شعر کے مفہوم میں جذب و کشش اور وسعت و پہنائی انتہا سے زائد پیدا کر دی ہے۔ اگر شاعر اس کو تشبیہ و استعارے کے زور پر بلند نہ کرتا تو یہ مفہوم اس طرح ادا کیا جاتا کہ "یوسف علیہ السلام کے چہرے کی قسم جو نہایت حسین و جمیل تھا اور زلیخا کے حجلہ گاہ کی قسم جو کہ حسن و عشق کے اثر کی وجہ سے روشن ہو گیا تھا"، مگر یہ حسین اور وسیع مفہوم کیسے ادا ہوتا کہ "یوسف علیہ السلام کا نقاب ایک ایسی بستی ہے جہاں حسن نے سکونت اختیار کر لی ہے اور زلیخا کا خلوت کدہ گویا یوسف زار بنا ہوا ہے یعنی ہزاروں لاکھوں یوسف اس جگہ موجود ہیں"۔ صرف تشبیہ کی ندرت نے اس شعر کے جسد میں جان ڈالی ہے۔

ہوا جب تیزی سے چلتی ہے تو اکثر نازک شاخیں اور پھول زمین پر گر جایا کرتے ہیں۔ شاعر اس حالت سے تشبیہ کا رنگ پیدا کر لیتا ہے اور شعر میں جان پڑ جاتی ہے۔

باد در کہسار جام لالہ را بر سنگ زد　　　گل بہ خندہ گفت آرے این چنیں باید ہمی

یعنی کہسار کے اندر ہوا نے لالہ کا پیالہ اٹھا کر زمین پر پٹک دیا اور پھول نے ہنس کر کہا شاباش یہی کرنا چاہئے تھا۔

بعض موقع پر شاعر ایک غیر معمولی دعویٰ کرتا ہے اور پھر اس کو ممکن بنانے کی کوشش کرتا ہے شاعر کو یہ ضرورت صرف تشبیہ کے زور سے پوری کرنی ہوتی ہے۔ تخیل کی بلند پروازی کے امتحان کا یہ بہت نازک اور اہم موقع ہوتا ہے۔ اگر شاعر کی قوت تخیل فطرۃً بلند اور وسیع ہے تو وہ اس نازک موقع پر ضرور کامیاب ہو جائے گا۔ ورنہ ثبوت دعوے میں اس کا بیان کمزور ہو جائے گا۔ شاعر کے لئے یہ موقع بہت سوچ سمجھ کر قدم اٹھانے کا ہوتا ہے۔ تخیل کی معمولی سی بے اعتدالی کی وجہ سے ثبوت دعوے میں خرابی رونما ہو جاتی ہے اور پھر اس کا دعویٰ قابل سماعت بھی نہیں رہتا۔ اس موقع کے رنگ کو بھی فارسی شاعری نے نہایت خوبی سے ادا کیا ہے۔ شاعر کا دعویٰ ہے کہ "سلاطین میں عشق و محبت کی سوزش اور جلن نہیں ہوتی"۔

چونکہ عشق و محبت کی جلن اور سوزش فطرۃً ہر شخص میں موجود ہوتی ہے۔ یہ سوزش عام و خاص کی قید سے آزاد ہے۔ اس کوچے میں شاہ و گدا سب ایک ہی لباس میں نظر آیا کرتے ہیں۔ اس منزل میں "فلاں ابن فلاں" کی کوئی تخصیص نہیں یہ وہ دریائے بے ساحل ہے جس میں فقیر و غنی سب ساتھ ساتھ سفر کرتے ہیں۔ بظاہر شاعر کا یہ دعویٰ سراسر غلط معلوم ہوتا ہے لیکن شاعر تشبیہ کے ذریعے اس دعوے کو ثابت کرتا ہے اور نہایت خوبی سے ثبوت دعویٰ پیش کرتا ہے۔

کہتا ہے کہ "ہر قسم کے پتھر میں چنگاریاں ہوتی ہیں (پتھر پر ضرب پڑنے سے شرارے پیدا ہوتے ہیں) لیکن الماس اور لعل میں چنگاریاں نہیں ہوتیں"۔ الماس اور لعل پتھر کے اقسام میں بادشاہ کا مرتبہ رکھتے ہیں۔ اسی طرح بادشاہ وقت بھی عام انسانوں کے مقابلے میں ہر حیثیت سے بلند مرتبہ رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کو عشق کی مصیبتوں اور اس کی سوزشوں سے دوچار ہونا نہیں پڑتا۔

بہ سوز عشق شاہاں را چہ کار ست　　(دعویٰ)

کہ سنگ لعل خالی از شرار ست　　(ثبوت)

صرف تشبیہ کی قوت اور اس کی اثر انگیزی سے شاعر نے ثبوت دعوے کو مضبوط بنا دیا۔ اگر تشبیہ

سے کام نہ لیا جاتا تو یقیناً پختگی میں کمی رہتی۔

شاعر ایک اور دعویٰ کرتا ہے کہ "بادشاہ دردِ عشق سے بیگانہ ہے"۔ اس کے ثبوت کی اس کو ضرورت ہوئی، قوتِ متخیلہ میں جنبش ہوئی اس نے شاعر کی حس کو ایک ایسے مقام پر پہنچا دیا جہاں وہ ثبوت دعوے کا سامان اچھی طرح مہیا کر سکتا ہے۔ اس مقام پر پہنچ کر اس نے نہایت بے ساختگی اور لطافت کے ساتھ اس کا ثبوت پیش کر دیا۔

زدردِ عشق شہ بیگانہ باشد (دعویٰ)

کہ جائے گنج درویرانہ باشد (ثبوت)

سارا زور صرف تشبیہی تمثیل نے پیدا کیا ہے ورنہ کچھ بھی نہ تھا۔

تواضع اور فروتنی امیر و غریب، رذیل و شریف سب کے لئے ایک اچھی چیز سمجھی جاتی ہے لیکن شاعر اپنی قوتِ متخیلہ کے زور پر ایک نیا دعویٰ کرتا ہے:۔

تواضع ز گردن فرازاں نکوست (دعویٰ)

اس دعوے کو ثابت کرنے کے لئے شاعر نے قانونِ نفسیات پر ایک گہری نظر ڈالی اور اس کے بعد اس کی عقل کی رسائی نے اس حقیقت کو معلوم کر لیا:۔

گدا اگر تواضع کند خوئے اوست (ثبوت)

شاعر کا دعویٰ ہے کہ نااہل کی تربیت سے کوئی نتیجہ مرتب نہیں ہو سکتا اس کی نااہلی اس کی طبیعت کا خمیر ہوتی ہے لہٰذا اس کا دور کرنا سوائے تضیعِ اوقات اور کچھ نہیں۔ ہاں بیشک اس کی تربیت سے بہت سے فائدے مرتب ہو سکتے ہیں جس کی طبیعت میں دستِ قدرت نے جوہرِ قابل ودیعت کیا ہو۔

ہیچ صیقل نکو نداند کرد آہنے را کہ بدگہر باشد (دعویٰ)

چوں بود اصل جوہرِ قابل تربیت را درو اثر باشد (دعویٰ)

شاعر اپنے اس دعوے کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ طائرِ تخیل میں جنبش پیدا ہوتی ہے اور حالتِ پرواز میں عالمِ رنگ و بو کے واقعات پر نظر ڈالتا ہے اور فوراً چند نظائر اس کی چشمِ رسا کے سامنے آ جاتے ہیں۔

ان میں سے وہ چند نظیریں اپنے ثبوت دعوے میں پیش کرنے کے لئے منتخب کر لیتا ہے۔

سگ بدریائے ہفتگانہ بشوی چونکہ تر شد پلید تر باشد (ثبوت)

خر عیسیٰ اگرش بہ مکہ برند چوں بیاید ہنوز خر باشد (ثبوت)

یعنی "کتے کو اگر تمام دنیا کے سمندروں میں غسل دیا جائے جب بھی وہ پاک نہیں ہو سکتا بلکہ جس قدر تر ہوتا جائیگا اسی مناسبت سے نجاست بڑھتی جائے گی۔ اور اگر خر عیسیٰ کو مکہ بھی لے جائیں جب بھی واپسی پر وہ گدھا ہی رہے گا۔ اسی طرح نا اہل کی تربیت سے کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے پند و نصیحت سراسر بے کار ہے۔"

اسی دعوے اور ثبوت کو ابو شکر بلخی نے دوسرے انداز سے پیش کیا ہے۔

درختے کہ تلخش بود گوہرا اگر چرب و شیریں دہی مرورا (دعویٰ)

ہماں میوۂ تلخ آرد پدید ازو چرب و شیریں نخواہی مزید (ثبوت)

یعنی "جس درخت کی اصل تلخ ہے اگر اس کو چرب و شیریں غذا بھی دو جب بھی اس میں ثمر تلخ ہی آئیں گے شیریں پھل اس میں نہیں آسکتے۔"

شاعر ایک اور دعویٰ کرتا ہے کہ "اگر بچے کو بحالت طفلی ادب اور لحاظ کی تعلیم نہ دی جائے تو وہ جوان ہو کر بھی بے ادب اور بد تہذیب رہے گا۔" چونکہ حقیقی تعلیم و تربیت ابتدا ہی سے ہوا کرتی ہے اگر ابتدا میں وہ محروم تربیت رہا تو جوانی اور بڑھاپے دونوں میں اس سے آثار حیوانیت ظاہر ہوتے رہیں گے۔

ہر کہ در خردیش ادب نکنی در بزرگی فلاح ازو برخاست (دعویٰ)

شاعر کی تخیلی قوت کس نئے انداز سے ثبوت دعوے کا سامان فراہم کرتی ہے:۔

چوب تر را چنانکہ خواہی پیچ نشود خشک جز بآتش راست (ثبوت)

یعنی "ہری اور تر لکڑی کو جس قدر اور جہاں سے چاہو خمیدہ کر لو لیکن خشک لکڑی سوائے حرارت آتش اور کسی چیز سے سیدھی یا ٹیڑھی نہیں ہو سکتی۔" بچہ کی مثال بھی بالکل ہری لکڑی کی طرح ہے جس طریقہ پر اس کو تعلیم دی جائے گی وہی رنگ وہ اختیار کرے گا۔

یہ صحیح ہے کہ تشبیہ و استعارے کو شاعری سے اسی قسم کی نسبت ہے جو قالب کو روح کے ساتھ

اور بقول مولانا حالی "یہ سب چیزیں شعر میں جان ڈالنے والی ہیں۔ جہاں اصل زبان کا قافیہ تنگ ہو جاتا ہے وہاں شاعر انھیں کی مدد سے اپنے دل کے جذبات اور دقیق خیالات عمدگی کے ساتھ ادا کرتا ہے۔ اور جہاں اس کو اپنا منتر کارگر ہوتا نظر نہیں آتا وہاں انھیں کے زور سے وہ لوگوں کے دلوں کو تسخیر کر لیتا ہے" لیکن ہر چیز میں اعتدال اور میانہ روی استحسان و پسندیدگی کی نظر سے دیکھی جاتی ہے۔ انسان نے جہاں اعتدال کے دائرے سے قدم نکالا فوراً اس میں لغزش پیدا ہو جائے گی۔ یہی حال تشبیہ و استعارے کا ہے جب تک حیات کے دائرے میں دماغ کی گردشیں اور جولانیاں رہیں گی اس وقت تک اس کے اندر لطافت اور جذب و کشش کا سمندر موجزن رہے گا لیکن جوں ہی اس دائرے سے تجاوز ہوا پھر عقل کی رسائی نا ممکن نہیں تو مشکل ضرور ہو جائے گی۔

تشبیہ و استعارے میں جس قدر بعد ماخذ اور مجازی معنی سے دوری ہوتی جائے گی اسی قدر اس کی لطافت و چاشنی میں صورت خرابی رونما ہوتی جائے گی۔ استعارے اور تشبیہ کی ساری خوبی صرف اس میں ہے کہ اس کے اندر بعد ماخذ وغیرہ نہ ہو۔

یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ فارسی شاعری کی نازک خیالیاں اور جدت طرازیاں اس منزل پر پہنچ گئی تھیں جہاں پر حیات اور مادیات کی سرحدیں ختم ہوتی ہیں اور سوائے تصورات و وہمیات کچھ باقی نہیں رہتا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں شاعر اپنی دماغی اور تخیلانہ موشگافیوں کے جوہر کی نمود کے لئے خیالی اور وہمی گھوڑے دوڑانے لگتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس مقام پر پہنچ کر شاعری پھر شاعری نہیں رہتی بلکہ ایک معمہ اور چیستاں کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور پھر اس کے سمجھنے کے لئے مخصوص دماغ اور ذہنیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ وہ اسکول بن جاتا ہے جس میں معلم تو سب کچھ جانتا ہے لیکن متعلم کورا ہی رہتا ہے۔ دماغ تو تشبیہات و استعارات کی باریکیوں میں الجھا رہتا ہے۔ مطالب و مفاہیم کی جانب توجہ کون کرے۔

گوشہار آشیان مرغ آتشخوارہ کرد　　　　برق عالم سوز یعنی شعلۂ غوغائے من

اس شعر کے سمجھنے کے لئے پہلے چند باتوں کو بطور مقدمہ یا تمہید سمجھنا پڑے گا۔

(۱) پہلے یہ سمجھئے کہ مرغ آتشخوارہ ایک پرند کا نام ہے۔

(۲) چونکہ آہ و فریاد میں آگ کی طرح گرمی و حدت ہوتی ہے اس لئے آہ و نالے کو شعلے سے تشبیہ دی ہے۔

(۳) مرغ آتشخوار کے رہنے کا مقام آگ ہوتا ہے۔

اس تفصیل اجمال کے بعد شعر کا مطلب سمجھ میں آتا ہے۔

روانی اسپ کی تعریف ملاحظہ ہو:۔

بکشوریکہ درو نام تازیانہ برند — بلوح سنگ نگیرد شبیہہ او آرام

اس شعر کے سمجھنے کے لئے بھی چند باتوں کو مقدمۃ الجیش کی صورت میں قائم کرنا ہوگا۔

(۱) گھوڑے کی روانی کا اثر تصویر میں بھی پیدا ہو گیا ہے۔

(۲) تازیانہ لگانے کی ضرورت نہیں بلکہ تازیانے کا نام لینا کافی ہے۔

(۳) تصویر کے سامنے تازیانے کا نام لینے کی بھی کوئی ضرورت نہیں بلکہ اس ملک میں تازیانے کا نام لے لینا کافی ہے۔

(۴) پتھر پر کندہ ہونے کی حالت میں بھی تصویر میں یہ اثر ہوتا ہے۔

ساغوش پر بادۂ رنگیں چناں آید بچشم — کز میان آب روشن برفروزی آذرے

پانی میں آگ کا روشن کرنا محض قوت خیال پر مبنی ہے، خارج میں اس کا وجود ممکن نہیں، بلکہ ایک حیثیت سے قوت خیال پر بھی مبنی نہیں ہو سکتا۔ "لو فرضنا" کے تحت میں داخل کیا جا سکتا ہے۔

اس مفہوم کو کہ "انگیٹھی میں آگ جلائی تو دھواں کم ہو جاتا تھا اور آگ زیادہ ہوئی جاتی تھی" اس رنگ میں ادا کیا ہے۔

بباغ شعلہ در دہقان انگشت — بنفشہ می درود۔ و لالہ می کشت (نظامی)

یعنی "انگیٹھی کا دہقان شعلوں کے باغ میں بنفشہ کاٹتا جاتا تھا اور لالہ بوتا جاتا تھا" ممکن ہے کہ شاعر کے نزدیک تشبیہ میں لطافت و رنگینی پیدا ہو گئی ہو لیکن سامع کا دماغ مشبہ، مشبہ بہ، وجہ شبہ، اور غرض تشبیہ کے سمجھنے میں چکر کھا جائے گا۔

زگیسو، گہ کمر می کرد و گہ تاج　　بداں تاج و کمر شہ گشتہ محتاج

زلف محبوب کے جوڑے کو جو کبھی بندھا ہوتا ہے اور کبھی کمر پر پڑا ہوتا ہے، کمر اور تاج سے تشبیہ دی ہے۔

قلم کی تشبیہ میں بھی جو کچھ زور قلم صرف کیا گیا ہے وہ بھی ملاحظے کے قابل ہے۔

ع۔ مشک در جیب، لعل در داماں　　(نظامی)

ع۔ زلف او خم شدہ در گوش، سخن می گوید

شراب کا پیالہ پیتے وقت لب کی جو کچھ ہیئت ہوا کرتی ہے اس کو حلقے سے تشبیہ دی ہے۔

بہ نوشین لب آں جام را نوش کرد　　زلب جام را حلقہ در گوش کرد

اس خیال کو کہ "محبوب کا تبسم پھول کے شگفتہ ہونے کی حالت سے بہت زیادہ خوشنما اور جاذب نظر معلوم ہوتا ہے" اس قدر دور از خیال استعارات سے بھر دیا ہے کہ دماغ اس کے سمجھنے میں چکرکھا جاتا ہے۔

تبسمے کہ بہ خون بہار تیغ کشید　　کہ خندہ بر لب گل نیم بسمل افتاد است

یعنی "تبسم ایک قاتل ہے اس نے بہار کی خوں ریزی کے لئے شمشیر بے نیام کرلی ہے اور اس کا وار خندۂ گل پر ہوا اور خندۂ گل نیم بسمل ہو کر رہ گیا"

خون بہار، تبسم شمشیر اور خندۂ گل کا بسمل ہونا کس قدر بعید الماخذ اور عسیر الفہم استعارات ہیں اسی قسم کے تخیلات شاعری کے خوشنما چمنستان کو خارستان بنا دیتے ہیں جہاں قدم قدم پر دامن فہم و عقل الجھتا رہتا ہے۔

بدر چاچ کے سارے قصائد اسی قسم کے بعید الفہم اور دور از کار استعارات و تشبیہات کا مجموعہ ہیں کسی جگہ "آہوئے مادہ" سے "آفتاب" مراد لیتا ہے اور کسی جگہ "اشک زلیخا" سے "کواکب" کہیں "افعی" سے "برج عقرب" اور کہیں "آب خشک" سے "پیالہ" اور بعض جگہ "پنج دریا" سے "پانچ انگلیاں" مراد لیتا ہے۔ یہ استعارات اس قسم کے ہیں کہ بیسویں صدی کا دماغ ان کو سمجھنے سے یکسر عاجز ہے۔

بعض تشبیہات و استعارات میں تو اس قدر لطافت و نزاکت پیدا کی جاتی ہے کہ الفاظ کا وزن برداشت کرنا بھی ان کے لئے ناممکن سا ہو جاتا ہے۔ حباب جس طرح چھونے سے ٹوٹ جاتا ہے اسی طرح اگر ان چیزوں کو علاوہ تشبیہ کے الفاظ سے چھو لیا گیا تو ان کی لطیف و نازک صورت کو صدمہ پہنچ جائے گا۔

ہمہ شب برلب و رخسار و گیسو میزنم بوسہ   گل نسرین و سنبل را صبا در خرمن است امشب

بعض اوقات بے جان چیزوں کو بھی صاحب فہم اور ذی ادراک تصور کر کے ان کی جانب ارادی کاموں کو منسوب کیا جاتا ہے۔

نہ گفت و من بشنودم، ہر آنچہ گفتن داشت   کہ در بیان نگہش کرد بر زباں تقدیم
لبش چو نوبت خویش از نگاہ باز گرفت   فتاد سامعہ در موج کوثر و تسنیم (عرفی)

یعنی "اس نے ایک لفظ بھی نہیں کہا لیکن اس کی تمام گفتگو میں نے اچھی طرح سن لی کیونکہ تقریر و مخاطبہ میں اس کی نگاہوں نے زبان سے پیش دستی کی۔ جب لبوں نے نگاہ سے اپنی باری مانگی تو سامعہ کوثر و تسنیم میں ڈوب گیا"

دشمن کے خوف زدہ اور مرعوب ہونے کا نقشہ کس قدر گھماؤ سے کھینچا ہے۔ طبیعت میں بجائے انبساط کے انقباض پیدا ہو جاتا ہے۔

ز رعشہ باطن خصمت چو جعد حور و بتان   شکن بروئے شکن خم بروئے خم چیند

اس مفہوم کو کہ "آج کا دن گویا ایک پھول کے مانند ہے جو شگفتہ ہو رہا ہے اور گل کا دن شگفتہ ہو کر مرجھا گیا اور غنچہ بن گیا" کس قدر خوش طریقے سے بیان کیا ہے۔ صرف تشبیہ و استعارے کی پیچیدگی پر اس کی اساس قائم ہے۔ ع "بہ بر شگفتن امروز غنچہ گشتن دے"

غرض یہ ہے کہ استعارات و تشبیہات کو اس وقت تک افادے کے تحت میں داخل کیا جا سکتا ہے جب تک کہ وہ حسیات و مادیات کے دائرے سے متجاوز نہ ہوں۔ تخیل کی بلند پروازی پر اگر ان کی بنیاد و اساس قائم ہو گی تو پھر یقیناً ان کی افادی حیثیت میں فرق رونما ہو جائے گا اور کنہ مقصود تک طائر فہم کی رسائی بھی نہ ہو سکے گی۔

اس قسم کی غیر مانوس نازک خیالیوں نے حقیقت میں فارسی شاعری کی تشبیہات کو فطری درجے سے گرادیا اور متاخرین کا کلام تو اچھا خاصا چیستاں اور معما بنا ہوا ہے۔ شعر کا سمجھنا "جوئے شیر" لانے سے کسی طرح کم نہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ ہر چیز کی ابتدا میں عموماً سادگی اور سچائی کارفرما ہوا کرتی ہے لیکن جوں جوں اس میں صنعت کاریوں اور دماغی کاوشوں کو دخل ہوتا جاتا ہے اسی قدر اس میں دقت نظر اور اشکال پسندی بڑھتی جاتی ہے۔ انسانی دماغ کا انداز یہ ہے کہ وہ آخری درجے میں پہنچ کر خود بخود تسہیل میں اشکال پیدا کر لیتا ہے، سادگی سے ہٹ کر صنعت کاریوں کے انداز زیادہ پیدا ہو جاتے ہیں۔ اصول نفسیات کے اعتبار سے انسانی دماغ کی ساخت میں رنگینی اور گل کاری کے اثرات کو بہت کچھ دخل حاصل ہے۔

دور اول کی سادگی | انسان کی فطرت چونکہ تدریج پسند ہے۔ وہ ہر چیز میں تدریجی ارتقائیت کو استحسان و پسندیدگی کی نظر سے دیکھتی ہے۔ اس کی یہ فطرت مخصوص شعریت کے ضمن میں بھی تمام و کمال موجود ہے۔ جب شاعری نے نہاں خانۂ دماغ سے باہر قدم نکالا تو اس وقت اس کی حالت اس کم سن بچے کی طرح تھی جو اپنے مطالب کو سیدھے سادے الفاظ میں ادا کرتا ہے۔ نہ تو اس کو فصاحت و بلاغت کی پروا ہوتی تھی اور نہ لطافت و نزاکت سے کچھ واسطہ۔ اختصار و اجمال کی خوبیوں سے اس کے کان آشنا نہیں ہوتے۔ شاعری کا ابتدائی عہد اسی قسم کی سادگی اور سچائی کا سرمایہ دار تھا، نہ تو اس کو تکلفات و تصنعات سے کوئی واسطہ تھا اور نہ تلمیحات و کنایات سے زیادہ تعلق۔ پیچ اور گھماؤ سے نفرت تھی تشبیہ و استعارے کا ذکر ہوتا تھا لیکن نہ اس قدر کہ طبائع پر گراں گزرے۔ یہ سب چیزیں نہایت سامنے کی ہوتی تھیں۔ ہر زبان میں شاعری کے ارتقا کا یہی معیار رہا ہے۔ کسی قوم کی شاعری اس قاعدے کے مستثنیات میں داخل نہیں ہو سکتی۔ فارسی ادبیات کے دور سادہ میں "دل" کو "چوب در آتش افتادہ" سے استعارہ کرتے تھے۔

احوال دلم مپرس کاں بے چارہ   چوبےست در و فتادہ آتش، دل نیست

یعنی "میرے دل کا حال نہ پوچھو! وہ ایک لکڑی ہے جس میں آگ لگ گئی ہو" لیکن اسی مفہوم کو متاخرین کے یہاں بھی ملاحظہ کیجئے۔ اس عہد میں دل ترقی کرتے کرتے "چوب در آتش افتادہ" سے صرف پارۂ آتش بن گیا ہے۔

ع یک پارہ آتش است کہ دلش نام کردہ اند

عروض کے قواعد کا بھی چنداں لحاظ نہیں کیا جاتا تھا صرف اظہار جذبات کا نام شاعری تھا۔ "ط" "ذ" اور "ث" "د" کو ہم قافیہ باندھا کرتے تھے جیسے "احتیاط" "اتحاد" اور "حدیث" "شنید"۔ انتہا یہ تھی کہ صحت الفاظ کی بھی پروا نہ تھی، "سقیم" کو "سقم" اور "ابلہ" کو "ابلاہ"، "ہرگز" کو "ہرگیز" بلا روک ٹوک لکھا کرتے تھے۔ انگلیوں کو "قاقم" کی دم اور پشت دست کو "شکم قاقم" سے تشبیہ دیتے تھے۔

پشت دستش چوں "شکم قاقم" نرم   چوں "دم قاقم" کردہ سر انگشت سیاہ

چہرے اور زلف کی تشبیہ میں کہتے تھے کہ "برف پر کالا کوا بیٹھا ہوا ہے":

بر روئے برف زاغ سیہ را نگاہ کن   چوں زلف بر رخ بتم آں تمسہ سیاہ

سرد ہوا کے موسم میں جو برف کے گالے سے اڑا کرتے ہیں ان کی تشبیہ بھی ملاحظہ کیجئے۔

بہ ہوا در نگر کہ لشکر برف   چو کند اندرو ہمی پرواز

راست ہمچوں کبوتران سفید   راہ گم کردگان ہیبت باز

یعنی "ہوا میں ذرا غور تو کرو! برف کا لشکر اس میں کیسا اڑ رہا ہے، ٹھیک اسی طرح جیسے سفید کبوتر باز کے خوف سے اپنا راستہ بھول جایا کرتے ہیں"۔

روئے و موئے تو نامۂ خوبی است   چہ بود نامہ، جز سفید و سیاہ

یعنی "تیرا چہرہ اور زلف حسن کی ایک خوشنما کتاب ہے اور کتاب میں سوائے سیاہ و سفید کے اور کچھ نہیں ہوتا"۔
غنچہ اور پستہ چونکہ سامنے کی چیزیں ہیں اور دماغ کی رسائی میں کوئی دقت و پریشانی اٹھانی نہیں پڑتی اس لئے قدما کے سیدھے سادے طور میں دہن کو غنچہ اور پستہ سے تشبیہ دیا کرتے تھے لیکن جب متاخرین کی نازک خیالیوں اور دقت آفرینیوں کا دور آیا تو پہلے اس کو "ذرہ" بنایا پھر "جوہر فرد" اور آخر میں سرے سے معدوم کر دیا۔

ع خورشید رو، ذرہ دہاں، تاریک مو، روشن رواں

ع غنچۂ جوہر فرد است دلیل تقسیم

ع پیدا لب و پنہاں وہاں، ایں نوش تن آں نوش جاں

زلف کو متقدمین کے عہد میں سنبل، صلیب، خوشۂ انگور اور کمند سے تشبیہ دیا کرتے تھے۔

ع زلف بکشا تا دگر راہب نگوید کاں صلیب

گرفتہ زلف گرہ گیر در میان دو لب	چو خوشۂ عنب اندر میانۂ عناب

لیکن متاخرین کی جدت پسندیوں اور ان کی اختراعات نے اس کو "تسلسل" اور "دام نظر" کی حد تک پہنچا دیا۔

کمر کی تشبیہ میں بھی اور باتوں کی طرح سادگی پائی جاتی ہے۔ متقدمین کے دور میں شاخ سے تشبیہ دیتے تھے، پھر ترقی کر کے ہلال کہنے لگے۔

متاخرین کا دور جب اپنی تمام و کمال رعنائیوں کے ساتھ آیا تو ان کی طبائع کی تراش خراش نے اس معاملے میں بھی نئی نئی راہیں پیدا کیں۔ محسوسات سے گذر کر خیالی دنیا کی بنیادیں قائم کی گئیں۔ "شاخ" اور "بال" کے بجائے "تار نظر" اور "رگ گل" نظر آنے لگے، کہیں اس کو تخیل موہوم اور لطیف خیال اور کہیں باریک مضمون سے تعبیر کیا گیا حتیٰ کہ آخر میں بچاری سرے سے غائب ہی ہو گئی۔

متاخرین کے عہد میں "مدح" نے انتہائی مذموم شکل اختیار کر لی تھی۔ اپنے ہی جیسے بلکہ اپنے سے بھی زیادہ ذلیل و بے حس، عیش پسند اور کاہل انسانوں کو فلک نشیں، تقدس پناہ، ظل اللہ بنا دیا گیا تھا، منہ پر کی مکھیاں اڑانے کی طاقت نہ تھی، میدان جنگ کی صورت کبھی دیکھی نہ تھی، شمشیر کو بے نیام دیکھ کر ارتعاشی کیفیت پیدا ہو جایا کرتی تھی، لیکن خدا کی سیدھی سادی مخلوق کو خوفزدہ کرنے کے لئے اس مہمل انسان کو اس صورت سے پیش کیا جاتا تھا۔

بگاہ کینہ کز تنہا نشیند از بر توسن	بداندیشش چناں داند کہ یک عالم سوار آید
بگاہ خشم مژگانہائے او در چشم بدخواہاں	چو تیر تہمتن در دیدۂ اسفندیار آید
چہ پایہ جسم ملکے دیں کہ کرد و ساز رزم کیں	کہ ساختی بہر زمیں زلاشتشاں مزارہا

ظلم و تعدی اور جور و ستم کی کوئی ایسی شکل نہ تھی جو حاکم وقت کی جانب سے مجبور و لاچار مخلوق پر روا

نہ رکھی جاتی ہو لیکن اس کو اس خوبصورت اور بہتر انداز میں پیش کیا جاتا تھا کہ (نعوذ باللہ) عدل خداوندی کی بھی اس کے سامنے کوئی حیثیت نہیں۔

زبیم عدل او خسپند بر جہاں کس غنیمت بیلی — بچشم فتنہ پنداری خواص کو کنار آمد

گیتی چو مہدی عہد او نظم جہاں از جہد او — وز عدل او در عہد او مہتاب کتاں پرورد

بدطینتی، بدمزاجی، بدخلقی اور ترش روئی میں بادشاہ وقت اپنی مثال آپ ہے۔ بدخوئی کی وجہ سے ہر شخص مصیبت بر دوش ہے۔ تمام مخلوق اس کی بدمزاجی سے عاجز آ چکی ہے لیکن خوشامدی شاعر اس کو دنیا کے سامنے اس طرح پیش کرتا ہے گویا وہ مکارم اخلاق اور محاسن طینت میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ کبھی اس سے کوئی ایسی بات صادر ہی نہیں ہوتی جس پر بدخلقی اور بدمزاجی کا اطلاق کیا جا سکے۔

ہر خصلت و ہنر کہ گزید از جہاں خرد — در طینت تو تعبیہ کردست کردگار (ظہیر فاریابی)

خصائل جمیل تو بدہر ہر کہ بشگرد — وجود کائنات را دگر ہیچ بشمرد (قاآنی)

مداح او با خویشتن گر راند از خلقش سخن — جائے بطبعش ذوالمنن ہر شب رضواں پرورد (")

حدیث خلق او از خامہ چوں در نامہ بنویسم — سراسر نقش دیوانم چو نقش قندھار آید (")

ع بہشت عدن آیتے ز خلق مشکبوئے تو (")

حاکم وقت سو رندوں کا ایک رند ہے۔ صبح سے شام تک بجز مے نوشی اور لہو و لعب دوسرا کوئی کام نہیں۔ حرم سرا میں لالہ رخ اور مہر افروز مہ وشوں کی کوئی تعداد متعین نہیں کی جا سکتی۔ دربار آتش افروز لالہ رنگ اور نرگس چشم مغبچوں سے بھرا ہوا ہے لیکن مطلب آشنا شاعر اس کو مخلوق کے سامنے اس طرح پیش کرتا ہے گویا "ہزاروں زاہدان شب زندہ دار" اس کے زہد و اتقا پر نثار ہیں۔

دیں بنا ہید بذات تو و ذات تو پناہ — بخداوند تبارک و تعالیٰ آورد (سلمان ساوجی)

ع سجدۂ درگہ او نور جبیں می بخشد

غرض یہ ہے کہ متاخرین کے دور میں اس صنف کو اس بری طرح پامال کیا گیا جس سے عام انسانوں کو اپنی ہستی کی عزت و ذلت کا احساس ہی مٹ گیا تھا، خداوند قدوس کے قہر و غضب کا خیال

دل سے مٹ سکتا تھا لیکن کیا مجال کہ بادشاہ کی مطلق العنان ہستی کے قہر و غضب کا خیال ایک منٹ کے لئے بھی دل سے محو ہو جائے لیکن متقدمین کے سادہ دور میں یہ بات نہ تھی۔ ان کے انداز بیان میں سادگی اور واقعیت ہوتی تھی۔

ہمت بلند باید کردن کہ تو ہنوز | برپایہ نخستیں از نردبانیا

متاخرین کے دور میں ایسی سچی اور صحیح بات کہنے کی کس کو ہمت تھی۔

دیگر باتوں کی طرح عشقیہ خیالات میں بھی سادگی پورے طور سے موجود تھی۔ جس قدر سچے جذبات دل میں پیدا ہوتے تھے ان کو تشبیہہ و استعارے کی نزاکتوں سے بچا کر ظاہر کیا کرتے تھے۔ اظہار جذبات میں تصنع اور تکلف کا گمان بھی دل میں نہیں آتا تھا۔ عاشقانہ جذبات کے اظہار کا یہ عالم تھا۔

ہمہ جز قصد جفا می نکنی | حاجتم ہیچ روا می نکنی
نکنی بر من بے چارہ سلام | ور کنی جز بہ ریا می نکنی

قدما ضعف و ناتوانی کے مضمون کو مبالغے میں بھی بھولے پن سے ادا کرتے تھے۔

یک موے بدزدیدم از زلفت | چوں زلف زدی اے صنم ابہ شانہ
چونانش بہ سختی ہمی کشیدم | چوں مور کہ گندم کشد بہ خانہ
با موے بہ خانہ در شدم، پدر گفت | منصور کدام است ازیں دوگانہ

یعنی جب تو نے بالوں میں کنگھی کی تو میں نے تیری زلف کا ایک بال چرا لیا۔ میں اس کو بہ مشکل اس طرح کھینچتا تھا جس طرح چیونٹی گیہوں کا دانہ اپنے بل میں لے جاتی ہے۔ بال لے کر جب میں گھر پہنچا تو میرے والد نے کہا کہ "ان دونوں میں کون مظفر و منصور ہے" لیکن متاخرین کے دور میں اسی مضمون کو اس رنگ میں ادا کیا گیا ہے۔

تنم از ضعف چناں شد کہ اجل جست و نیافت | نالہ ہرچند نشاں داد کہ در پیرہن است

یعنی "میں اس قدر نحیف و زار ہو گیا ہوں کہ موت نے ہر چند مجھ کو تلاش کیا لیکن میں نہ ملا حالانکہ نالہ بار بار بتا رہا تھا کہ میں پیرہن میں ہوں"

نازک خیالیاں پیدا ہونے کی وجہ | فارسی شعرا کی نازک خیالیاں اور جدت پسندیاں حد انتہا پر پہنچنے کی خاص وجہ یہ تھی کہ وہ جس طرف بھی نظر اٹھاتے تھے اس طرف ان کی آنکھیں لہلہاتے ہوئے سبزے اور صاف و شفاف قدرتی آبشاروں سے دوچار ہوتی تھیں۔ اگر ایک طرف بنفشہ وسنبل کے صحرا نظر آتے تھے تو دوسری طرف ان کی نظریں یاسمن و نرگس کی خوشنمائیوں اور دلفریبیوں سے کیف اندوز ہوتی تھیں۔ ان کی نظروں کے سامنے تمام دنیا کے کیف آور مناظر جمع تھے۔ وہ اپنی نزاکتِ طبع اور نازک خیالی کے باعث محبوب کی زلف معطر کو بنفشہ اور سنبل کی لٹ سے، نیم باز اور مخمور آنکھوں کو نرگس خوابیدہ سے، خط عارض کو سبزۂ نودمیدہ سے، دندان آبدار کو درشبنم سے، ذقن کو سیب سے، کمر کو رگ گل سے، دہن کو غنچے سے اور چہرے کو گلستان سے تشبیہ دیسکتے تھے۔

اے خوش آں روز کہ آں سیب ذقن سبز شود | ہر چہ می گفتمت اے عہد شکن سبز بود

دو پر چیں کردی از سنبل گرد یک گلستاں گل | دنداں پر چیں پر چیں تر شد و ناتواں کردی

لیکن عرب کا سادہ فطرت شاعر زیادہ سے زیادہ معشوق کی زلف کو رسی سے، کمر کو زنبور کی کمر سے اور انگلیوں کو مسواک سے تشبیہ دے سکتا ہے۔ عربی شاعر کی نظریں ان کیف آور مناظر سے آشنا نہ تھیں۔ انھوں نے نرگس و یاسمن، سنبل و بنفشہ اور سرو وغیرہ کا نام تک نہ سنا تھا' ان کے کان آبشاروں کی دلکش صداؤں سے آشنا نہ تھے۔ جو چیزیں کبھی کسی نے دیکھی سنی نہ ہوں' ان کے اثر و کیفیات سے واقف ہونا مشکل بات ہے۔ اگر عرب کی مقدس زمین بھی ان چیزوں کو اپنے آغوش میں لئے ہوتی تو اس کی شاعری بھی اس جنت ارضی کے خوشنما سرمایے سے خالی نہ ہوتی۔ اس کے پاس تو تشبیہات و استعارات کی پیچیدگیوں کے بجائے سامنے کی نہایت سادہ مگر دلکش چیزیں ہیں۔

وفرع یزین المتن اسود فاحم | اثیث کقنو النخلۃ المتعثکل

یعنی "وہ اپنی زلفیں اپنے عاشقوں کو دکھاتی ہے اور وہ زلفیں بہ سبب اپنی درازی کے زینت کمر ہیں، اور ایسی گھنی ہیں جیسے خوشہ اور کوئلے کی طرح سیاہ ہیں۔" اس شعر میں معشوقہ کی سیاہی زلف کو کوئلے سے تشبیہ دی ہے اور بالوں کے گھنے پن کو خوشۂ خرما سے۔ دونوں تشبیہیں سامنے کی اور نیچرل ہیں۔ دماغ کو

متحرک کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

وتعطو برخص غیر شثن کانہ اساریع ظبی او مساویک اسحل

محبوبہ اپنی نرم ونازک انگلیوں سے دجونرمی و رنگ میں موضع "ظبی" کے کرموں کی طرح ہیں، اس کے علاوہ جو باریکی اور سیدھے پن میں درخت اسحل کی مسواکیں ہیں، چیزوں کو اچھی طرح گرفت میں لے لیتی ہے۔" اس شعر کے اندر معشوقہ کی انگلیوں کو نرمی ونازکی میں موضع "ظبی" کے کرموں سے تشبیہ دی گئی ہے اور طول واستقامت میں درخت "اسحل" کی مسواک سے۔ دونوں تشبیہوں سے عربی رنگ اور اس کی خصوصیت بیک نظر ظاہر ہو جاتی ہے۔

وتضحی فتیت المسک فوق فراشہا نؤوم الضحی لم تنتطق عن تفضل

مشک کے ریزے چاشت کے وقت معشوقہ کے بستر پر پڑے رہتے ہیں اور چاشت تک وہ مست خواب رہتی ہے اور وہ اچھے کپڑے پہن کر کمر میں پٹکا نہیں باندھتی کیونکہ یہ خادمہ کا کام ہے اور وہ مخدومہ ہے جس کی خدمت کے لئے بہت سی چھوکریاں حاضر ہیں۔ بستر پر مشک کے ریزوں کا پڑا رہنا صرف عربی تخیل ہے۔ ایرانی تخیل مشک کی جگہ نرگس و یاسمن اور لالہ ونسریں کا ذکر کرتا۔ ایرانی محبوب کی تعریف میں یہ بات داخل نہیں کہ وہ چاشت تک پڑا سوتا رہے۔ چمنستان ایران کا نرم ونازک محبوب صبح خیزی کا عادی ہوتا ہے، صبح کی کیف آور اور انبساط آگیں نسیم سے لطف اندوزی اس کا روزانہ کا مشغلہ ہوتا ہے۔ سبزۂ خوشرنگ کی صبائیت کے اثر کی وجہ سے اس کی آنکھوں میں ڈورے پڑے رہتے ہیں، چمنہائے رنگین اس کی مستقل تفریح گاہیں ہوتی ہیں، صبح کے وجد آفریں وقت میں صحن گلزار سیکڑوں پری پیکر اور نازک اندام حسینوں کو اپنی آغوش میں لئے اٹھکھیلیاں کرتا ہوتا ہے۔

توگوئی ساحت بستاں بہشت عدن را ماند زبس غلمان و حور آنجا قطار اندر قطار آید

باغ کے ہر گوشے سے بربط وطنبور اور چنگ ونے کی آوازیں آتی ہوتی ہیں۔ ایک طرف اگر نے نوازی ہوا کرتی ہے تو دوسری جانب مے گساری۔

زہر سوئے نوائے ارغنون وچنگ ونے خیزد زہر کوئے صدائے بربط وطنبور وتار آید

یکے ایں جا نواز دنے، یکے آں جا گسارے   صدلے ہائے ہوئے ہے زہر سوئے ہزار آید

غرض یہ ہے کہ صبح کے وقت گلزاروں میں معشوقوں کا ایک مجمع سا ہوتا ہے اور ایک عجیب مدہوش کن تفریح کا سامان نظر آتا ہے۔ ع بہر جا جشنے و جشنے بہر گامے قدح نوشے۔

عاشقان خستہ جگر بھی اس سرور آگیں کیف سے لطف اندوز ہونے کے لئے قصد چمن کرتے ہیں اور اس صہبا اثر منظر سے ان کے دل و دماغ میں سروری کیفیت پیدا ہو جایا کرتی ہے اور حالت رقص میں طرح طرح کی سرمستیاں ظاہر ہونے لگتی ہیں۔

یکے بر لالہ پا کوبد کہ ہے ہے رنگ مے دارد   یکے از گل بوجد آید کہ بخ بخ بوئے یار آید

یکے بر سبزہ می غلطد یکے در لالہ می رقصد   یکے گاہے رود از ہش یکے گہ ہوشیار آید

یکے برکف نہد لالہ کہ ترکیب قدح دارد   یکے برگل کند تحسیں کزو بوئے نگار آید

یکے با دبرہ سادہ بصحن بوستاں گردد   یکے با ساغر بادہ بطرف جوئبار آید

ساحت عرب اپنی سنگلاخی کی وجہ سے ان وجد آفریں اور کیف بیز مناظر سے خالی ہے۔ اس کا رنگ تخیل مائل بہ سادگی ہے۔

وتبسم عن المی کان منورا   تخلل حر الرمل دعص لہ ند

وقت تبسم میری محبوبہ کے دندان آبدار ایسے چمکتے ہیں جیسے "بابونہ" کی شاداب کلیاں جو خاص تودۂ ریگ پر ہوتا ہے" تو وہ ریگ کی قید اس وجہ سے لگا دی کہ وہ آب باراں سے قدرے تر رہا کرتا ہے اور ایسی جگہ کی کلیاں بہ نسبت اور جگہ کے کچھ شاداب ہوا کرتی ہیں۔ عرب میں دندان تابندہ کو بابونہ کی کلیوں سے تشبیہ دیتے تھے، لیکن ایران کا بہار پروردہ اور رنگیں مزاج شاعر نہایت جوش و خروش اور مستی کے عالم میں کہتا ہے:۔

ع عقد ثریا در لبش، سی ماہ انشاء غبغبش

کان البرین والدمالیج علقت   علی عشر اد خروع لم یخضد

یعنی "وہ ایسی نازک اندام ہے کہ پازیب کنگن اور بازو بند جو وہ پہنے ہوئے ہے بسبب نزاکت جسم

ایسے معلوم ہوتے ہیں گویا وہ اکھہ اور ازنڈ پر بنائے گئے ہیں، معشوق کی نزاکت جسمی کو اکھہ اور ازنڈے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس صحرائی تشبیہ میں نیچرل نگہ مزہ ہے لیکن انبساط دل اور شگفتگی دماغ کے سامان نہیں ہیں۔

وعینان کالماویتین اشکتنا بکھفی حجاجی صخرۃ قلت مورد

یعنی "اس کی دونوں آنکھیں اپنی درخشندگی کے اعتبار سے گویا دو آئینے ہیں اور وہ دو غمیدہ ہڈیوں میں جڑے ہوئے ہیں (غمیدہ ہڈی سے ابرو کے نیچے کی ہڈی مراد ہے) اور وہ دونوں ہڈیاں اپنی سختی میں اور وہ دونوں آنکھیں اپنی درخشانی میں اس پتھر کی طرح ہیں جو کسی قدر گڑھے میں ہو اور اس میں کسی قدر صاف وشفاف پانی چمکتا ہو۔" اس شعر میں دونوں آنکھوں کو آئینے سے تشبیہ دی گئی ہے اور وجہ شبہ صفائی وشفافی ہے اور استخوان ابرو کو سنگ سخت سے' اس میں وجہ شبہ استحکام ومضبوطی ہے۔ لیکن ایران کی بہار آفریں اور انبساط آگیں سرزمین کا شاعر اپنی رنگیں مزاجی کے باعث آنکھ کو نرگس شہلا سے تشبیہ دیتا ہے اور اس کے اندر کچھ اس انداز سے وجد آفریں کیف واثر بھرتا ہے کہ طبیعت خود بخود اس کی کربائی کی طرف مائل ہو جاتی ہے۔ اس تشبیہ میں وہ اس قدر گلکاریوں اور رنگینیوں سے کام لیتا ہے کہ گلزار طبع کا پوشیدہ سے پوشیدہ گوشہ شگفتہ اور فرحت آثار بن جاتا ہے۔

لب سے آلود' دہان پر شکر' نرگس مست اے مسلماں! کس روز بہ بینیاں دارد

چونکہ عربی شاعر کے سامنے نرگس شہلا کی خوابیدگی اور مخموریت کی کوئی مثال نہ تھی اس لئے اس کی تشبیہ میں فطری سادگی ہے' رنگینی وشوخی سے کوئی واسطہ نہیں۔ ایرانیوں سے اگر ربط وضبط ہوتا تو بہت ممکن تھا کہ آمد ورفت اور تعلقات کی بنا پر ان کے اندر بھی کچھ ایرانی سرمستیاں اور رنگینیاں پیدا ہو جاتیں۔ ایران چونکہ اس وقت آسمان تمدن کا ایک درخشندہ ستارہ سمجھا جاتا تھا' اس کا طریق معاشرت بلند تھا' انتظام وانصرام کے لحاظ سے بھی وہ بہت آگے بڑھا ہوا تھا اور عرب تہذیب وتمدن کے اصول ومبادیات سے بھی آشنا نہ تھے' بجائے مدنیت کے بدویت کا رنگ غالب تھا اس وجہ سے ایرانی ان کو نفرت وحقارت اور ذلت وخواری کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ایران کے دروازے ان کے لئے بند تھے۔

سرزمین ایران اس سرے سے اس سرے تک چمنستان و سنبلستان بنی ہوئی تھی، زمین کا چپہ چپہ چمن زار اور گوشہ گوشہ بہارستان معلوم ہوتا تھا۔ اگر ایک طرف طاؤس کی سیلی آواز سنائی دیتی تھی تو دوسری جانب بلبل کی چہک نغمۂ گوش بنی رہتی تھی۔ اگر ایک طرف سبزے کی لہک جان نکالے لیتی تھی تو دوسری طرف خوشبو کی لپٹ مشام جان کو معطر کرتی رہتی تھی۔ ہر قدم پر آبشاروں کی صدائیں فردوس گوش اور سبزۂ طاؤس رنگ جنت نظر کا لطف دیتا تھا۔ تمام ملک تختۂ زمردیں بنا ہوا تھا نسیم صبح گاہی کا ایک جھونکا دلوں میں کیف و سرور کا دریا موجزن کر دیتا تھا۔

فیضے عجب دریں گل صبح از صبا رسید | بیروں کشیم رخت کدورت صفا رسید (کلیم)
بوئے آتش گل در گرفت است | کہ بلبل رفت و در آب آشیاں کرد " "

یعنی "پھولوں کی وجہ سے باغ میں اس طرح آگ لگ گئی ہے کہ بلبل نے جا کر پانی میں گھونسلے بنالئے ہیں۔"

بہ صورت بید مجنوں آبشار است | رطوبت برگ را از بس رواں کرد

یعنی "بہار کی وجہ سے اتنی رطوبت بڑھی ہوئی ہے کہ بید مجنوں پانی کا جھرنا معلوم ہوتا ہے۔"

در چمن باد سحر بوئے تو سودا می کرد | گل بہ کف داشت زر و غنچہ گرہ وامی کرد

"باغ میں باد صبا محبوب کی خوشبو فروخت کر رہی تھی اس لئے گل کے ہاتھ میں زر تھا۔"

یہ انھیں چیزوں کا اثر ہے کہ جن کی وجہ سے ایرانی شاعر بہاریہ مضامین باندھنے میں تمام دنیا سے گوئے سبقت لے گیا ہے۔ اس کے منہ سے جو لفظ بھی نکلتا ہے وہ رندی و مستی کا ایک چھلکتا ہوا جام معلوم ہوتا ہے۔ بہاریہ میدان میں پہنچ کر شاعر کی رنگین طبیعت میں رندانہ جولانیاں اور امنگیں ترقی کر جاتی ہیں۔ وہ خود بھی اس نشے میں مدہوش ہو جاتا ہے اور دوسروں پر بھی اس نہ اترنے والے نشے کا اثر ڈالتا ہے اور ان کو بھی اپنی طرح سرخوش و سرشار بنا لیتا ہے۔

دفتر حسن بہار است کہ در عہد تو شست | برگ گل نیست کہ از باد در آب افتاد است

"یہ جو پانی میں نظر آ رہا ہے پھول کا پتہ نہیں ہے بلکہ ملکۂ بہار نے حسن محبوب دیکھ کر اپنے حسن کا دفتر پانی میں دھو ڈالا ہے۔"

بار دیگر بر شاخ گلبن بے برگ و بار　　افسر زریں بر آرد ابر مروارید بار

یعنی "پھول کی خشک ٹہنی کو موتی برسانے والے بادل نے پھر تاج زریں پہنا دیا"

سپاہ ابر نیسانی بہ صحرا رفت از دریا　　نثار لولوئے لالہ بہ صحرا برد از دریا

یعنی "ابر نیساں کی فوج دریا سے نکل کر صحرا میں چمکتے ہوئے موتی نثار کرنے کو لاتی ہے"

یہی وہ نشاط انگیز اور کیف آور چیزیں ہیں جن کی آمد کی وجہ سے انسان پر وجد و کیف کی سی حالت طاری ہو جاتی ہے۔ یہی وہ سرور بخش اور انبساط آگیں موسم ہوتا ہے جس میں چمنستان ایران کا باشندہ کیف و سرمستی کے بے پایاں سمندر میں غواصی کرنے لگتا ہے اور جس وقت اس کی آنکھیں دفتر حسن سے اکتساب لطف میں مشغول ہوتی ہیں اس وقت وہ بے ساختہ پکار اٹھتا ہے۔

چیزے دگر مگوے ہمیں گو کہ در چمن　　سبزہ خوش است و آب خوش و جوئبار خوش

جب اس کیف میں زیادہ صہبائیت پیدا ہوتی ہے تو پھر دل و دماغ وارفتہ ہوش ہو جاتے ہیں۔ اس منزل پر پہنچ کر استفہامی یا استعجابی صورت باقی نہیں رہتی بلکہ جرأت کے انداز پیدا ہو جاتے ہیں۔

ساقیا! بزم طرب ساز کہ از بلبل و گل　　کار و بار چمن امروز بہ برگ است و بساز

اعتدال ہوا کی کیفیت کے سامنے اعجاز عیسوی بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔

ز اعتدال ہوا حکم جانور گیرد　　اگر بنوک قلم صورتے کنند نگار

یعنی "ہوا کے اعتدال کا یہ عالم ہے کہ اگر نوک قلم سے کوئی صورت نقش کر دیں تو اس میں بھی جان پڑ جائے گی"

زمانہ ایست کہ بر قفل اگر نسیم وزید　　بسان غنچہ اش از انبساط خنداں کرد

یعنی "آب و ہوا کی اثر انگیزی اس درجے پر پہنچی ہوئی ہے کہ جب وہ قفل سے لگ جاتی ہے تو وہ اس کے اثر کی وجہ سے غنچے کی طرح کھل جاتا ہے"

لیکن عربی زمین اگر ایک طرف صحرا و بیابان اپنے آغوش میں لئے ہوئے ہے تو دوسری جانب پہاڑ اور کھنڈر، بنفشہ و سنبل اور لالہ و سوسن کے بجائے خار مغیلاں نظر آتے ہیں۔ وہاں کی بہاریں زیادہ سے زیادہ نخلستانی حصے کو شمار کیا جا سکتا ہے۔ لالہ و گل، سوسن و نسریں، بنفشہ و سنبل کا وہاں کوسوں پتہ نہیں۔ زمین

بجائے تختۂ زمردیں ہونے کے گرم ریگ سے تپتی رہتی ہے۔ نسیم جانفزا کے بجائے بادِ صرصر کے تیز اور گرم تھپیڑوں سے سامنا کرنا پڑتا ہے۔ طبیعت میں سکون و اطمینان کی جگہ اضطراب و بے چینی جاگزیں رہتی ہے۔ ریگستان کے گرم ذرے آبلہ پائی کے سامان مہیا کرتے رہتے ہیں۔

سرزمین ایران کا ہر بچہ آنکھ کھولتے ہی عقل و خرد میں مستی پیدا کرنے والے جلوہ فروش مناظر سے ہم آغوش ہو جاتا ہے مگر عرب کی وادی غیر ذی زرع کا رہنے والا انسان ان عجائب و غرائب سے خواب میں بھی کیف اندوز نہیں ہوتا وہ پہاڑوں، چٹیل میدانوں اور ریگستانی مناظر کی مصوری بہتر انداز سے کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کو سب سے بڑا ملکہ ناقوں کی رفتار اور روانی کی تصویر کھینچنے میں حاصل ہے اس کی تصویر سیکڑوں مختلف انداز سے کھینچتا ہے۔

کانّ ثبیراً فی عرانین وبلہ　　　　کبیر اناس فی بجاد مزمل

یعنی جب کوہ ثبیر پر بڑی بوندوں والی بارش ہوئی تو اس کی مختلف نالیوں سے جھاگ اور پانی بہنے لگا۔ پانی کا بہاؤ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا کوئی بڑا سردار دھاریوں دار کملی اوڑھے بیٹھا ہے۔ پہاڑ کو سردار اور پانی بہنے کی مختلف نالیوں کو دھاریوں سے تشبیہ دی ہے۔

قفانبک من ذکری حبیب و منزل　　　　بسقط اللوی بین الدخول فحومل

یعنی اے میرے دوستو! تھوڑی دیر کے لئے اس جگہ ٹھہرو یہ میری محبوبہ کا اجڑا ہوا مکان ہے۔ آؤ ذرا دیر معشوق اور اس کے مکان کی یاد میں آنسو بہالیں جو دخول و حومل کے میدان میں ایک غیر مستقیم تودۂ ریگ پر ہے۔

تری بعر الارام فی عرصاتہا　　　　وقیعانہا کانہ حب فلفل

یعنی تجھ کو آہوان سفید کی مینگنیاں اس کے صحنوں اور نشیبوں میں ایسی معلوم ہوتی ہوں گی کہ گویا وہ کالی مرچ کے دانے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اب وہ منزل بالکل ویران ہے اور اس میں سوائے ہرنوں کے اور کوئی نہیں رہتا۔

لخولۃ اطلال ببرقۃ ثہمد　　　　تلوح کباقی الوشم فی ظاہر الید

یعنی موضع ثہمد کی پتھریلی زمین میں میری محبوبہ خولہ کے کھنڈرات ایسے نظر آتے ہیں جیسے گودنے کے نشان ہاتھوں پر نمایاں ہوتے ہیں۔

جنوح دفاق عندل ثم افرعت   لہا کتفا ہا فی معالی مصعد

یعنی وہ اونٹنی نشاط و سرور کی وجہ سے کلیلیں بھرتی رہتی ہے، کود نے پھاندنے والی اور سر کی بلند ہے اس کے دونوں مونڈھے ایک اونچے قصر کے برابر ہیں۔

واتلع نہاض اذا اصعدت بہ   کسکان بوصی بدجلۃ مصعد

یعنی "اس ناقے کی گردن بہت بلند ہے۔ جب وہ اس کو اٹھاتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دریائے دجلہ میں کشتی رواں کا دنبالہ ہے۔"

فارسی تشبیہات کی اس اثر انگیزی کے باوجود عرب کی فطری سادگی کا یہ اثر ہے کہ قدمائے ایران کے کلام میں جا بجا عربی سادگی کے انداز پائے جاتے ہیں۔"

عربوں کا عام قاعدہ تھا کہ وہ گھونگھر والے والے بالوں کو خوشہ انگور سے تشبیہہ دیتے تھے، چنانچہ میر معزی نے جو قدمائے ایران میں شمار کیا جاتا ہے اس شعر میں عربی تشبیہہ کو اڑایا ہے۔

گرفتہ زلف گرہ گیر در میان دولب   چو خوشۂ عنب اندر میانۂ عناب

عربی شعرا عموماً معشوق کی زلف کو رسی یا صلیب سے تشبیہہ دیتے تھے چنانچہ محمود رواقی جس کو تذکرہ نویسوں نے قدما میں شمار کیا ہے۔ اس کے اس مصرعے میں عربی اثر موجود ہے۔

ع زلف بکشا تا وگر راہب نگوید کانصلیب

دور متوسطین تک یہ اثر بہت کچھ نمایاں رہا ہے۔

رسن زلف تو سر رشتۂ جان من و شمع   ماہ خورشید نمایش ز پس پردۂ زلف (حافظ شیرازی)

(باقی آیندہ)

زکوٰۃ

سورۃ التوبہ پارہ ۱۰ - اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ؕ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝

ترجمہ: "زکوٰۃ کا روپیہ صرف محتاجوں اور مسکینوں کو دینا چاہئے اور ان کو جو اس کو جمع کریں اور ان کو جن کے دل اسلام کی طرف کھنچے (مراد ہے نو مسلم سے) .... الخ:"

مذکورہ بالا آیت میں زکوٰۃ کے روپیہ کا مستحق ان لوگوں کو بھی بتلایا گیا ہے جو اس کو جمع کریں اور جو اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ زکوٰۃ کا روپیہ یک جا جمع کر کے مسلمانوں کی ایک ایسی تنظیم کے ماتحت خرچ کیا جا سکتا ہے جو ان کی ترقی اور بہبودی کی ذمہ دار ہو۔ ہر مسلمان کو علیحدہ علیحدہ یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنی زکوٰۃ کا روپیہ اپنی حسب منشا جس طرح چاہے صرف کرے۔ اس طرح زکوٰۃ کا مدعا حاصل نہیں ہوتا اور زکوٰۃ دینے والا اپنے فرض سے سبکدوش نہیں ہوتا کیونکہ وہ اس کا بیجا استعمال کرتا ہے۔ ہر شخص کے واسطے یہ معلوم کرنا قطعی ناممکن ہے کہ زکوٰۃ کے روپیہ کا کون مستحق ہے اور اسی لئے اسلام نے اس کا جمع اور خرچ کرنا ایک تنظیم کے ماتحت رکھا ہے۔ مثلاً اکثر لوگ نااہل لوگوں کو زکوٰۃ کے روپیہ سے حج کرنے کے لئے بھیج دیتے ہیں یا لنگرخانے جاری کرتے ہیں جس سے زیادہ تر پیٹ بھرے ہی فائدہ اٹھاتے ہیں اور مستحقین محروم رہ جاتے ہیں، یا مسجدیں بنواتے ہیں یا اور ایسے کام کرتے ہیں جن میں ان کا نام ہو اور اس طرح سے زکوٰۃ کا استعمال محض خلاف تعلیم اسلام اور بے جا ہی نہیں ہے بلکہ سخت مضر ہے۔ زکوٰۃ کا مقصد قومی اور ملکی ترقی ہے اور وہ بطور ایک محصول کے مسلمانوں پر فرض کی گئی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ محصول ملکی اور قومی ترقیات کے واسطے ہوتا ہے نہ کہ وہ ان کی حسب منشا، صرف کرنے کے لئے۔ جہاں مسلمانوں کی اپنی سلطنت ہے وہاں زکوٰۃ کا روپیہ ملکی خزانے یا بیت المال میں داخل ہونا چاہئے کیونکہ ان کی حکومت خود ان کی بہبودی اور ترقی کی ذمہ دار ہے لیکن جہاں مسلمانوں کی اپنی حکومت نہیں ہے وہاں ان کی ایسی جماعت جیسی ہندوستان میں مسلم لیگ تھی

ان کی بہبودی اور ترقی کی ذمہ دار ہے اور اس لئے زکوٰۃ کا روپیہ جمع و خرچ کرنا اس کا حق ہونا چاہیئے تھا مگر مسلمانوں نے اپنے مذہب کے زریں اصولوں میں سے کسی ایک اصول کی بھی صحیح طور سے پابندی نہیں کی کیونکہ انھوں نے مذہب کو چند بے معنی رسوم کا مجموعہ تصور کر لیا اور اس کے اصولوں کو مذہب سے خارج کر دیا۔ اگر وہ کاش ایک اصول کی بھی صحیح طور سے پابندی کرتے تو ان کی حالت ایسی ناگفتہ بہ نہ ہوتی جیسی آج ہے۔ آج مسلمانوں میں لاکھوں ہٹے کٹے فقیر اس زکوٰۃ کے بیجا صرف کی بدولت پیدا ہو گئے ہیں جن کی تعداد روز بروز بڑھتی جاتی ہے اور جو اپنی تمام عمر سستی اور کاہلی میں بسر کرتے ہیں اور ان کو کبھی اپنی حالت کے سنبھالنے کا خیال تک نہیں آتا۔ بھیک پر ایک عرصے سے بسر اوقات کرنے کے باعث ان میں نہ تو غیرت باقی رہی ہے اور نہ ذریعہ معاش تلاش کرنے کی ہمت و قابلیت۔ اس طرح مسلمانوں میں کاہلی اور افلاس روز بروز ترقی پذیر ہیں اور اس کا جو ضرر رساں اثر مسلمانوں کی قومی زندگی پر پڑ رہا ہے وہ ناقابل بیان ہے۔ مسلمانوں کے تمام قومی کام مثلاً مدرسے، بینک، شفا خانے، یتیم خانے، کتب خانے، خیراتی کارخانے، مختلف قسم کی انجمنیں، اور دوسرے رفاہِ عام کے کام اول تو نظر ہی نہیں آتے اور جو موجود ہیں وہ بدترین حالت میں محض اس وجہ سے پڑے ہوئے ہیں کہ زکوٰۃ کا روپیہ منشائے الٰہی کے خلاف ہر شخص اپنی حسب منشا صرف کر رہا ہے اور مسلمانوں میں سستی اور کاہلی کی عادتیں پیدا کر رہا ہے، مفت خوروں کی تعداد بڑھا رہا ہے اور ان میں عیاشی کو ترقی دے رہا ہے۔ افسوس ہے کہ اسلام کے ایسے زریں اور بیش قیمت اصول کا ایسا بدترین استعمال ہو رہا ہے اور اس پر لوگوں کا یہ اعتقاد ہے کہ ہم نیکی کر رہے ہیں اور بہشت خرید رہے ہیں۔ زکوٰۃ کے روپیہ کے صرف کرنے کا تو مسلمانوں کو علیحدہ علیحدہ حق ہی حاصل نہیں ہے، یہ تو قوم کی امانت میں خیانت کرنا ہے۔ زکوٰۃ کا مدعا دولت کو مساویانہ طور پر تقسیم کرنا، نسل انسانی کی مجموعی خوشحالی کو بڑھانا اور انسانی تکالیف کو کم کرنا ہے۔ نسل انسانی کی خوش حالی اس زمانے میں بھوکوں کا پیٹ بھرنے سے نہیں بڑھ سکتی بلکہ ان کو خود اپنا پیٹ بھرنے کے قابل بنانے اور ان میں اپنی حالت کو ترقی دینے کا خیال پیدا کرنے سے بڑھ سکتی ہے۔ اس لئے کسی غریب، محتاج یا ضرورتمند کی زکوٰۃ یا خیرات کے روپیے سے فوری کھانے پینے، پہننے اوڑھنے کی ضرورت اپنے اپنے طور پر پوری کر دینا ہرگز مفید اور بار آور ثابت نہیں ہو سکتا اور اس لئے ثواب میں داخل نہیں ہو سکتا کیونکہ اس طرح سے تو افلاس

میں بلاد اضافہ ہوتا ہے سستی اور کاہلی پھیلتی ہے اور مصیبتیں بڑھتی ہیں بلکہ زکوٰۃ یا خیرات اس وقت میں مفید اور بار آور ثابت ہو سکتی ہے اور اس کا مدعا اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب اس سے مدرسے، یتیم خانے اور ایسے صنعتی کارخانے اور تجارتی کاروبار جاری کئے جائیں جہاں غریب اور محتاج تعلیم پاکر یا کام سیکھ کر خود محنت کرکے اپنی روزی پیدا کرنے کے قابل ہوں اور ان کی محنت بھی بار آور ہو۔ اس کے علاوہ اسلامی بینکنگ بینک اور بیمہ کمپنیاں وغیرہ مخصوص طور پر انھیں لوگوں کے واسطے قائم ہوں تاکہ ان میں عیاشی اور فضول خرچی سے باز رہنے، روپیہ پیسہ پس انداز کرنے اور دور اندیشی سے کام لینے کی عادتیں پیدا ہوں۔ یہ تمام کام ہر شخص علیحدہ علیحدہ نہیں کر سکتا اس لئے لازمی طور پر زکوٰۃ یا خیرات کا روپیہ ایک تنظیم ہی کے ماتحت جمع اور خرچ کرنا زکوٰۃ یا خیرات کے مقصد کو پورا کر سکتا ہے اور اسلام کے اس ایک ہی اصول کے صحیح استعمال سے مسلمانوں کی حالت سنبھل سکتی ہے اور ان کا تنزل ترقی سے بدل سکتا ہے۔ بعض لوگ اس مقام پر یہ اعتراض کر سکتے ہیں کہ زکوٰۃ ایک مذہبی فرض ہے اور کلام مجید میں یہ حکم آیا ہے کہ ہر مسلمان کو زکوٰۃ دینی چاہئے لہٰذا ایک مسلمان کا اتنا ہی فرض ہے کہ وہ اپنے مال کی ہر سال زکوٰۃ نکال دے اور جو کچھ زکوٰۃ حساب سے نکلتی ہو وہ غریبوں اور محتاجوں کی امداد پر صرف کر دے خواہ کسی طریقے سے کرے اور خواہ اس کی یہ امداد قوم کے لئے مفید ہو یا مضر۔ اس کا ایک جواب تو یہ ہے جو ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ اس آیت کے یہ الفاظ کہ "زکوٰۃ کے روپیہ کے وہ لوگ بھی مستحق ہیں جو اس کو جمع کریں" یہ ثابت کرتے ہیں کہ زکوٰۃ کا روپیہ ایک تنظیم کے ماتحت جمع اور خرچ ہونا چاہئے زکوٰۃ دینے والے کو اس کے خرچ کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ کلام مجید نے جو باتیں مسلمانوں پر فرض کی ہیں وہ انھیں کے فائدے کے واسطے ہیں، خدا کا اس میں کوئی فائدہ یا نقصان نہیں ہے۔ آپ زکوٰۃ ادا کریں یا نہ کریں اس کی ذات قطعی بے نیاز ہے۔ کلام مجید نے تو زکوٰۃ کا ایک زریں اصول ہمارے ہی فائدے کے لئے ہم کو بتلایا اور اس کو ایک تنظیم کے ماتحت جمع اور خرچ کرنے کی تعلیم بھی اسی لئے دی تاکہ اس کا صحیح استعمال ہر ملک اور ہر زمانے کی ضروریات کے مطابق کیا جا سکے اور یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ انسانی زندگی کی ضروریات ہر ملک اور ہر زمانے میں بدلتی رہتی ہیں۔ لہٰذا آج زکوٰۃ یا خیرات کا اپنی موجودہ ضروریات کے مطابق صحیح استعمال کرنا بالکل منشائے الٰہی کے مطابق ہے۔ اب یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ موجودہ حالت میں جبکہ

ہندوستان کے مسلمانوں میں بدقسمتی سے اس قسم کی کوئی مرکزی یا مقامی تنظیم بھی موجود نہیں ہے جو ان کی قومی ترقی اور بہبودی کی ذمہ دار ہو کیونکہ لے دے کر جو ایک ٹوٹی پھوٹی مسلم لیگ تھی وہ بھی فرقہ بندیوں اور خودغرضیوں کی نظر ہو گئی تو مسلمان اپنا زکوٰۃ کا روپیہ کس کو دیں حقیقت میں یہ ایک ایسا سوال ہے کہ جس کا کوئی حل ہمارے پاس اس وقت موجود نہیں مگر چونکہ یہ ایک مذہبی فرض ہے اور مسلمانوں کو زکوٰۃ ضرور ادا کرنی چاہئے اس لئے دوسرا بہترین طریقہ اس کے لئے یہی ہو سکتا ہے کہ ہر شخص اپنی زکوٰۃ یا خیرات کا روپیہ اپنے ان مختلف مقامی یا بیرونی اداروں کو دے جن کو وہ اپنی دانست میں یہ سمجھتا ہو کہ وہ قومی خدمات انجام دے رہے ہیں لیکن فقیروں کو شاہ صاحبوں کو زائرین یا مجاوروں کو خیرات یا زکوٰۃ کا روپیہ دینا محض بے کار ہی نہیں ہے بلکہ ملکی اور قومی مفاد کے منافی ہے اور اس لئے تعلیم اسلام کے خلاف ہے۔

یقین

آپ کا نام انعام اللہ خاں اور یقین تخلص ہے۔ آپ دہلی میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی آپ کا خاندان نہ صرف زہد و تقوے میں شہرت پذیر تھا بلکہ امارت میں بھی ممتاز تھا۔ آپ کے والد ماجد کا نام شیخ اظہر الدین خاں ہے۔ اگرچہ تذکرہ نویسوں نے کوئی تاریخ پیدائش نہیں لکھی لیکن آپ کے دیوان کے دیباچہ نگار کی رائے میں آپ کی تاریخ پیدائش سنہ ۱۱۴۰ھ ہے اور تاریخ وفات سنہ ۱۱۶۹ھ۔ آپ مرزا مظہر جان جاناں کے شاگرد تھے اور آپ نے اپنے استاد کی تعریف میں چند شعر بھی بعض بعض غزلوں میں لکھے ہیں۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ آپ اپنے باپ کے ہاتھ سے قتل کئے گئے لیکن تذکرہ نویسوں میں وجہ قتل کے متعلق بیحد اختلاف ہے بعضوں نے قیاسات سے کام لیا ہے اور بعضوں نے بغیر سمجھے بوجھے محض نقل پر اکتفا کیا ہے۔ مگر بات یہی صحیح معلوم ہوتی ہے کہ یقین کے قتل کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوئی۔

آپ افیون بھی کھاتے تھے اور اس بری عادت کی وجہ سے آپ کا رنگ و روغن جاتا رہا تھا بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ یقین نے کچھ نہیں لکھا بلکہ مرزا مظہر جان جاناں نے تمام دیوان لکھ دیا ہے۔ ہمیں بذات خود اس سے انکار ہے اور ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ استاد اپنے عزیز شاگرد کے لئے بھی ایک پورا دیوان خود لکھنے کی کیوں زحمت اختیار کرے۔ علاوہ ازیں رنگ کلام بھی مرزا مظہر جان جاناں کا نہیں معلوم ہوتا۔ یقین کو محض بدنام کیا گیا ہے ورنہ اس قصے کی کوئی اصلیت نہیں۔

کلام پر تبصرہ | آپ نے ایک سو ستر غزلیں پانچ پانچ شعروں کی لکھی ہیں اس لئے آپ کے اشعار کی مجموعی تعداد آٹھ سو پچاس ہوتی ہے۔ انجمن ترقی اردو نے جو دیوان مرتب کرایا ہے اس میں سوائے غزلوں کے اور کوئی صنف کلام موجود نہیں ہے۔ بعض تذکرہ نویسوں نے دیگر اصناف سخن کا بھی ذکر کیا ہے مگر وہ کلام اب ہمارے سامنے موجود نہیں ہے لہذا ہم اس پر کوئی رائے بھی ظاہر نہیں کر سکتے۔

غزلوں کے متعلق بھی بعض بعض تذکرہ نویسوں نے مبالغہ سے کام لیا ہے۔ مؤلف "گل رعنا" نے

تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ:۔

"اگر یقین جیتے رہتے تو میر ہوں یا مرزا کسی کا چراغ ان کے سامنے نہیں جل سکتا تھا۔"

نہیں معلوم مولوی عبدالحق مرحوم نے یہ رائے کیونکر قائم کی۔ کم از کم میر تو وہ شخص ہے جس کا جواب آج تک پیدا نہیں ہو سکا۔ یقین نے جو کچھ لکھا ہے اس سے ہرگز یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ یہ شخص غزل گوئی میں بے نظیر ہے۔ میں تو میر صاحب کا صرف ایک شعر پیش کرتا ہوں اور کہتا ہوں کہ یقین کے تمام دیوان میں سے ایک شعر یا ایک مصرع ہی ایسا نکال دیجئے۔ یقین کی رسائی ایسے بلند مضامین تک اگر وہ اور بھی زندہ رہتے ہرگز نہ ہوتی۔ ان کا انداز بیان خوب ہے لیکن تخیل معمولی ہے۔ ممکن ہے کہ اس زمانے میں یہ ایک نئی بات ہو کیونکہ اس وقت محض ایہام گوئی کا رواج تھا۔ بہرحال میں یہ ماننے کے لئے تیار ہوں کہ یقین کے انداز بیان میں جدت ہے۔ میر صاحب فرماتے ہیں:۔

سرسری تم جہان سے گزرے ورنہ ہر جا، جہان دیگر تھا

اب انصاف سے کہیے کہ ایسے بلند خیالات کا شائبہ بھی یقین کے دیوان میں پایا جاتا ہے؟ اگر ایک شعر بھی تمام دیوان میں بلند ہوتا تو ہم اس سے اندازہ کر سکتے کہ شاید چالیس پچاس برس کی عمر تک پہنچ کر میاں یقین بھی علوئے تخیل سے کام لیتے۔ مگر وہاں تو بہت معمولی خیالات کا اظہار کیا گیا ہے البتہ انداز بیان خوب ہے اور اس زمانے کے لحاظ سے ضرور قابل تعریف ہے۔

مرتب دیوان یقین نے یقین کی چند غزلیں حاتم، میر، سودا، درد اور تاباں کی غزلوں کے بالمقابل پیش کی ہیں۔ ہم بخوف طوالت ہر ایک شاعر کے کلام سے یقین کے کلام کا موازنہ نہیں کر سکتے۔ البتہ مثال کے طور پر صرف درد کے دو شعر پیش کرتے ہیں جن کے قافیے یقین کے یہاں بھی بندھے ہیں۔

یقین	درد
سبھی مرتے ہیں خوش قدی پہ جی دیتے ہیں شادی پر	گلستان جہاں کی دید کیجو چشم عبرت سے
تکلف برطرف یہ نوحہ گر بندہ ہے ماتم کا	کہ ہر اک سرو قد ہے اس چمن میں نخل ماتم کا

یقین کے یہاں یہ خیال بندھا ہے کہ سب لوگ خوشی پسند کرتے ہیں مگر میں رنج کو پسند کرتا ہوں

وجہ ظاہر نہیں کی کہ کیوں ایسا ہے۔ مثلاً غالب نے کہا ہے:۔

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج　　مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

مشکلوں کا آسان ہونا کس خوبی سے دکھایا ہے۔ یہاں یہ بات نہیں۔ اب آپ کے قیاس پر شعر کا مطلب منحصر ہے۔ سمجھ لیجئے کہ دل ہاتھ سے جاتا رہا ہے اور میاں یقین اس کا ماتم کر رہے ہیں اور یہ غم جانگزا ان کو نہایت مرغوب ہے۔ یا یہ کہ لوگوں کو تو خوشی پسند ہے مگر ہم تو ہمیشہ رنجور ہی رہے۔ ظاہر ہے کہ یہ خیال بہت معمولی ہے البتہ انداز بیان قابل تعریف ہے۔

درد نے اپنے شعر میں اس خیال کو ظاہر کیا ہے کہ دنیا جو بہت خوبصورت معلوم ہوتی ہے اس میں تکلیف ہی تکلیف ہے۔ جو لوگ بظاہر خوش نظر آتے ہیں وہ بھی مبتلائے رنج ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے اس کائنات کا نہایت غور سے مطالعہ کیا ہے اور نہایت خوبی کے ساتھ اپنے عمیق مطالعہ کا نتیجہ ایک شعر کے اندر رکھ دیا ہے۔ یقین کے شعر کو درد کے شعر سے کوئی نسبت نہیں۔

یقین　　　　درد

شکوۂ حسن سے آنسو ہمارے سوکھ جاتے ہیں　　چمن میں باغباں سے صبح کو کہتی تھی یہ بلبل
یقیں سورج کے آگے کب اثر رہتا ہے شبنم کا　　گلوں کے منہ پہ یوں چڑھتی ہے دیدہ دیکھ شبنم کا

یقین نے ایک معمولی خیال پیش کیا ہے اور تشبیہ بھی معمولی ہے۔ کہتا ہے کہ جس طرح دھوپ میں شبنم خشک ہو جاتی ہے اسی طرح ہمارے آنسو اس آفتاب حسن کے آگے سوکھ جاتے ہیں یعنی معشوق کے دبدبہ حسن کی وجہ سے ہم اس کے سامنے نہیں رو سکتے۔

درد کے یہاں بھی تشبیہ تو معمولی ہے لیکن وجہ جدت طراز ہے۔ کسی شاعر نے آج تک یہ خیال ظاہر نہیں کیا کہ گل جیسی نازک شے پر شبنم کا پڑنا گستاخی میں داخل ہے مزید براں عاشق یعنی بلبل کی زبان سے اس خیال کا ادا ہونا نہایت پر لطف ہے۔ ہمارے نزدیک درد نے اس قافیے کو بھی یقین سے بہت بہتر باندھا ہے۔

یقین اپنے کلام کے لحاظ سے اچھے شاعر ضرور ہیں لیکن ان کے جوانمرگ ہونے نے ابوالفضل

کا یہ فقرہ جو اس نے عرفی کے لئے لکھا ہے "غنچۂ استعدادش ہنوز ناشگفتہ پژمرد" اپنے لئے موزوں کرلیا ہے۔
یقین کا شمار ہرگز استادانِ فن میں نہیں کیا جا سکتا۔ وہ صرف دوسرے درجے کے شاعروں میں ممتاز جگہ پانے
کے مستحق ہیں اور یہ بھی صرف اس وجہ سے کہ وہ بلحاظ زمانہ متقدمین میں داخل ہیں۔ اس وقت اردو شاعری
عالم طفولیت میں تھی۔ جس کسی شاعر نے بھی زبان کی صفائی اور خیالات کی عمدگی پر اپنا عزیز وقت صرف کیا ہے
وہ سب ہمارے شکریے اور اعزاز کے مستحق ہیں۔ آپ کے کلام میں اگرچہ قدیم اور متروک الفاظ بدستور موجود
ہیں لیکن ان کا استعمال بار بار نہیں ہوا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مختصر مجموعۂ کلام ہونے کی وجہ سے متروک
الفاظ کو بار بار استعمال کرنے کی نوبت نہ آئی ہو۔ بہرحال آپ کا کلام صفائی زبان اور خیالات کی برجستگی کے
لحاظ سے ضرور عمدہ ہے۔ تشبیہات اور استعارات بھی آپ کے کلام میں بکثرت ہیں بعض شعر درد اور اثر سے
بھی پر ہیں۔ بامزہ بھی ہیں لیکن اگر کوئی آپ کے کلام کو سوز و گداز سے مملو بیان کرے تو میں ہرگز یہ تسلیم کرنے
کے لئے تیار نہیں۔ گنتی کے چند اشعار ہیں جو پُردرد ہیں۔ البتہ آپ نے اس بات کا لحاظ رکھا ہے کہ بھرتی
کے شعر غزل میں داخل نہ کئے جائیں چنانچہ آپ نے ہر غزل میں صرف پانچ اشعار لکھے ہیں۔ یہ تو ظاہر ہے
کہ آپ کے یہ منتخب اشعار بھی سب کے سب اچھے نہیں ہیں تاہم اتنے سبک اور رکیک بھی نہیں جو پُرگو شاعروں
کے یہاں پائے جاتے ہیں۔

اب ہم ذیل میں قارئین کرام کو تذکرہ نویسوں کی آرا سے بھی روشناس کرتے ہیں جو انھوں نے یقین
کے کلام کی نسبت ظاہر کی ہیں:-

میر تقی میر:

"یقین شاعر ریختہ صاحب دیوان ازبس کہ اشتہار دارد محتاج بہ تعریف و توصیف
نیست۔۔۔۔۔ بر و پوچ چندے کہ بافتہ است کہ ما و شما نیز می توانیم بافت۔ ایں قدر
برخود چیدہ است کہ رعونت فرعون پیش او پشت دست بر زمیں می گزارد۔۔۔۔ بعد
از ملاقات ایں قدر معلوم شد کہ ذائقہ شعر فہمی مطلق ندارد۔"

ہم تو بہت خوش ہوئے کہ یقین نے میر کی بددماغی کو بھی مات کردیا خواہ وہ سخن فہم تھے یا نہ تھے۔

فتح علی گردیزی جو یقین کے دوست تھے :

"شہباز خیالش بعید معنی بلند پرواز است و ہمائے اندیشہ اش بر قلہ قاف سخن بہ پر فشانی ممتاز۔ بے اغراق ریختہ گوئی را بہ طاق بلند گزاشتہ و تخم معنی در زمین سخن کاشتہ و آنچہ از طبعش سر زدہ از فرط شیوع و حسن قبول در تمام ہندوستان بر افواہ و السنہ جاری شدہ"

قیام الدین قائم :

"صدر نشین بزم شعرائے متاخرین .... دو مصرع از زبان ہائے خامہ سحر طرازش بایں ہمہ لطف و خوبی می تراود کہ بمجرد استماع در دل عشاق قطرات خوں شدہ از دیدہ فرو می چکد"

محسن نرائن شفیق اورنگ آبادی :

"یقین یکتائے عصر و یگانۂ زمانہ است"

قدرت اللہ شوق :

"مشق سخن او بپایۂ استادی رسیدہ بود اما اجلش مہلت نداد۔ ہر قدر کہ دیوانش مرتب است ہمہ انتخاب و از درد خالی نیست"

میر حسن :

"اشعارش بسیار رنگین و موثر اند سخن او خالی از دردمندی نیست"

قطب الدین باطن :

"فن شعر میں کامل"

کریم الدین :

"تمام قسم کے اشعار میں ماہر و آگاہ کامل"

ناسخ و سید علی حسن خاں :

"شاعر پر درد و بامزہ"

مرزا علی لطف:

"کلام مرغوب طبع اور اشعار جاں خراش دل و جاں"

خواجہ حمید الدین اورنگ آبادی:

"یقین کا کلام متین ہے"

نواب مصطفٰے خاں شیفتہ:

"کلامش سیر نمک است حلاوت دلخواہ دارد"

مصحفی:

"در دورۂ ایہام گویاں اول کسے کہ ریختہ را شستہ و رفتہ گفتہ ایں جوان است"

دیوان یقین میں جو قدیم الفاظ اور متروکات استعمال ہوئے ہیں حسب ذیل ہیں:-

نئیں بجائے نہیں ع نام حمد اور مدح کا لینا مجھے انصاف نئیں - تجھ حسن بجائے تیرے حسن، بسرتی بجائے بھول جاتی - آشیاں کرتا بجائے آشیاں بناتا - سجن بجائے یار - دیوے بجائے دے - امتحان کرنا بجائے امتحان لینا - ایدھر بجائے ادھر - بچارے بجائے بیچارے - کسو بجائے کسی - کبھو بجائے کبھی - راکھا بجائے رکھا - جاگہہ بجائے جگہ - دیکھ بجائے دیکھ کر - کیونکہ بجائے کیوں کر - ہو جو بجائے ہو - پڑیو بجائے پڑے - کیا چاہیے بجائے کرنا چاہیے - ہموں بجائے ہیں - ستی بجائے سے - جفا اٹھایا ہوں بجائے جفا اٹھا چکا ہوں - کو بجائے کا ع کہ ہوتا ہے جنوں کے شور کو سیر چمن باعث - لو ہو بجائے لہو، ریکھے بجائے خوش ہو - دوانہ بجائے دیوانہ ع پھر نہ دی ہم کو کسو نے اس دوانے کی خبر - بن بجائے بغیر یا سوائے - کیجے بجائے کیجیے - خموشی ساتھ بجائے خموشی کے ساتھ - زور بجائے بہت - میں بجائے میں نے - ٹک بجائے ذرا - انھوں کو بجائے ان کو - باؤ بجائے ہوا - لاگی ہے بجائے لگی ہے - بھینسا وا بجائے پھنسا ہوا - امید سے بجائے امید پر ع الفت میں کس امید سے کیجے دماغ صرف - اتی بجائے اتنی - نپٹ بجائے بہت وغیرہ وغیرہ۔

لہذا یہ خیال کرنا کہ یقین کا کلام قدیم الفاظ اور متروکات سے خالی ہے یا بہت کم قدیم الفاظ استعمال

ہوئے ہیں غلط ہے لیکن یہ صحیح ہے کہ ایک ایک دو دو شعر میں یہ متروکات آگئے ہیں بار بار دہرائے نہیں گئے۔ اسی وجہ سے یقین کا کلام صاف اور خوشنما معلوم ہوتا ہے۔

آپ کے کلام میں بعض نقائص بھی ہیں جن کو ہم ذیل میں درج کرتے ہیں:۔

آج کل کے محاورے کے مطابق اس قسم کی فارسی اضافت نہایت معیوب خیال کی جاتی ہے:۔

تری آنکھوں کی کیفیت کو مے خانے سے کیا نسبت ۔۔۔ نگہ کی گردشوں کو دورِ پیمانے سے کیا نسبت

بہ نہیں ہوتا کسی مرہم سے اس سینے کا داغ ۔۔۔ ہو گیا ناسور آخر یارِ دیرینے کا داغ

بدترین تعقید کی مثالیں لیجیے:۔

اب جوں سرِ شک خاک سے سکتا نہیں ہوں اُٹھ ۔۔۔ آنکے میں دل کی آنکھ سے اتنا گرا نہ تھا

کہاں سکتے ہیں چڑھ منہ پر بتانِ ناز و تمکیں کے ۔۔۔ کہ ہیں ہم صبر کے بے خرج مفلس ہیں وال دیں کے

گرچہ شیریں شیخ کے ہے وجد میں آنے کا شور ۔۔۔ پر قیامت بانک ہوتا ہے مے خانے کا شور

کوئی کو کئی باندھا ہے:۔

کئی بلبل ان دنوں میں نہ بیٹھیو چنانچہ میں ۔۔۔ جب تک کہ چھوٹوں، ہو گئی آخر بہار حیف

زیادہ کو زادہ باندھا ہے:۔

جو پیتا ہے مرے دل کا لہو، پی لیکن آہستہ ۔۔۔ خدا شاہد کہ شیشے سے ہے زادہ یہ سبو نازک

کہیں کو کئیں باندھا ہے:۔

بدگماں، زاہد! یقیں سے پاکبازاں پر نہ رکھ ۔۔۔ دیکھ کئیں سر پر پڑے گا بے گناہوں کا وبال

شجر کو شجر باندھا ہے:۔

ذرا نہیں ہے مری آہ میں اثر افسوس ۔۔۔ کسی چمن میں خدا شجر بے ثمر نہ کرے

تذکیر و تانیث میں بھی آج کل کے محاورے کے لحاظ سے اختلاف پایا جاتا ہے:۔

تلاش کو مذکر لکھا ہے:۔

رات دن خوباں کو ہے دلہائے مفتوں کا تلاش ۔۔۔ روز و شب لیلیٰ کو تھا درپیش مجنوں کا تلاش

ایک جگہ ظہور کا قافیہ شور باندھا ہے۔ مطلع ہے:۔

وہ کون دل ہے جہاں جلوہ گروہ نور نہیں اس آفتاب کا کس ذرے میں ظہور نہیں

لیکن حسن مطلع تحریر فرماتے ہیں:۔

کوئی شتاب خبر لو، کہ بے نمک ہے بہار چمن کے بیچ دوانوں کا اب کے شور نہیں

بعض مقام پر ردیف غیر ضروری اور بے جوڑ ہو گئی ہے مثلاً۔

بعد مرنے کے بھی ہوں گور میں غمناک ہنوز گرد پھرتے ہیں مری خاک کے افلاک ہنوز

غمناک ہنوز میں ہنوز نہ صرف زائد اور غیر ضروری ہے بلکہ بے ربط بھی ہے۔

اگرچہ آپ کے یہاں یہ التزام کیا گیا ہے کہ فحش اور رکیک اشعار داخل دیوان نہ ہوں تاہم بعض اشعار آج کل کی تہذیب کے لحاظ سے ناگوار طبع ہوتے ہیں۔

سُر نہیں دل کے ملاتے ہائے یہ مطرب پسر بھول جانا چاہیے، ان کے خیالوں کے تئیں

اس شعر میں فرق مراتب کا بھی خیال نہیں رکھا گیا۔ آخر حضرت زلیخا ایک نبی کی بیوی تھیں۔

زلیخا یار کو پہلے مزوں سے آشنا کرتی پھر اُس سے سو طرح پر اپنی حاجت کو روا کرتی

اس لبنتی پوش سے آغوش رنگیں کیجئے جی میں ہے اس مصرع موزوں کو تضمین کیجئے

موا جاتا ہوں مت اتنا بھی کس کر گوندہ بالوں کو ٹک اک ڈھیلی تو کر دے جان زنجیر اس دوانے کی

آپ کے یہاں بعض فارسی تراکیب خوب استعمال ہوئی ہیں مثلاً سعی ناحق۔ جواب تلخ تقیامت بانمک۔ سنبلستان۔ ذوق سیر گل۔ کف خاکستر۔ سرو خراماں۔ گریباں گیر وغیرہ۔

آپ کے کلام میں تشبیہات و استعارات بکثرت ہیں۔ مثال کے طور پر چند اشعار تحریر کرتا ہوں:۔

دل ترے کو تازہ کرتا ہے ہمارا خون گرم لال تر کرتی ہے جیسے پارۂ آہن کو آگ

ہو رہا ہے دل مرا بے ربط منصوبوں میں بند جس طرح شطرنج کے پیادوں میں گھر جاتا ہے شاہ

ہمیشہ کھینچتا ہوں اشک خوں کو دار مژگاں پر اگر سولی مری کو دیکھتا منصور، رو دیتا

نہیں اتر سکتی کسی افسوں سے کالے کی لہر کیونکہ نکلے سر سے اس زلف پریشاں کی ہوا

ایک غزل آپ کے دیوان میں داخل کی گئی ہے لیکن اس کے تین شعر سوداؔ کے دیوان میں بھی پائے جاتے ہیں۔ مرتب دیوان کا فرض تھا کہ وہ یہ ظاہر کرتے کہ اشعار متنازعہ فیہ کس کے ہیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ مرتب صاحب کو یہ خبر ہی نہیں کہ کلیات سوداؔ میں بھی یہ اشعار درج ہیں۔ چونکہ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ نے حسب ذیل دو شعر سوداؔ کے منتخب اشعار میں شمار کئے ہیں اس لئے ہمارا بھی یقین یہی ہے کہ یہ ہرگز یقینؔ کے نہیں:۔

بدلا ترے ستم کا کوئی تجھ سے کیا کرے   اپنا ہی تو فریفتہ ہووے خدا کرے

قاتل ہماری لاش کی تشہیر ہے ضرور   آئندہ تا کوئی نہ کسو سے وفا کرے

تیسرا شعر حسب ذیل ہے جس میں پہلا مصرع کسی قدر رد و بدل کے ساتھ کلیات سوداؔ میں موجود ہے اور مرتب دیوان یقینؔ نے بڑے شد و مد کے ساتھ محمد صادق خاں اختر کے مشہور قطعہ کے بالمقابل پیش کرکے فرمایا ہے "قطعہ اچھا ہے اور واقعی اچھا ہے مگر یقینؔ نے جو بات دو مصرعوں میں پیدا کردی ہے وہ اس میں نہیں ہے......... یقینؔ کا یہ شعر میری زبان میں 'بے مثل' اور آج کل کی زبان میں شاہکار ہے۔" افسوس مرتب دیوان کو یہ معلوم نہیں کہ اس تعریف کا مستحق یقینؔ کا حریف سوداؔ ہے نہ کہ جناب یقینؔ۔

گر ہو شراب و خلوتِ محبوب خوب رو   زاہد تجھے قسم ہے جو تو ہو تو کیا کرے

یقینؔ کے دیوان میں یہ شعر یوں درج ہے:۔

خلوت ہو اور شراب ہو، معشوق سامنے   زاہد تجھے قسم ہے جو تو ہو تو کیا کرے

یقینؔ نے جو رد و بدل پہلے مصرع میں کی ہے وہ بھی سوداؔ کے اصل مصرع سے فروتر ہے۔

ذیل میں یقینؔ کے کلام سے بہتر منتخب اشعار درج کئے جاتے ہیں:۔

کون کرسکتا ہے اس خلاقِ اکبر کی ثنا   نارسا ہے شان میں جس کے پیمبر کی ثنا

یہ کوہ طور سرمہ ہو گیا سارا ہی کیا کئے   کوئی پتھر بھی بچ جاتا تو دیوانے کے کام آتا

اڑا دی اس ہوا نے مشت خاک بیکساں ناحق   غبار ان کا اگر رہتا تو پیمانے کے کام آتا

خدا دیتا مجھے گر بیر سامانی خدائی کی   تو میں ان بلبلوں کو گلشنوں کا باغباں کرتا

حقیقت میں یہ شعلہ عشق کا ہے برگ گل ورنہ
خلیل اللہ پر آتش کدہ گلزار کیوں ہوتا

برہمن سر کو اپنے پیٹتا تھا دیر کے آگے
خدا جانے تری صورت سے بت خانہ پہ کیا گزرا

موج دریا کی طرح ضبط میں آسکتا نہیں
کوئی کیوں کر کرے احوال پریشاں میرا

گریباں پھاڑ ڈالے رنگ سے ہر گلبدن اپنا
نکالوں خاک سے جوں لالہ گر خونیں کفن اپنا

کیوں نہ ہو تر دامنوں کو شست و شو کی آرزو
میکشاں پر آیۂ رحمت ہے باراں کی ہوا

سر پر سلطنت سے آستان یار بہتر تھا
ہمیں ظل ہما سے سایۂ دیوار بہتر تھا

دام و قفس سے چھوٹ کے پہنچے جو باغ تک
دیکھا تو اس زمیں میں چمن کا نشاں نہ تھا

جو کچھ کہیں یہ تجھ کو یقیں ہے سزا تری
بندہ جو تو بتوں کا ہوا کیا خدا نہ تھا

یہ جیوے ہجر میں، وہ وصل میں بھی جی نہیں سکتا
تکلف برطرف، بلبل کو پروانے سے کیا نسبت

بہار آخر ہوئی ہے اب تو سینے دے گریباں کو
یقیں کرتا ہے کوئی اس قدر دیوانہ پن بس کر

ہم تو اب مرتے ہیں اور بجھتا ہے الفت کا چراغ
دیکھئے کب ہووے روشن پھر محبت کا چراغ

بہت جینے کی تدبیر اہل عرفاں کے نہیں لائق
کہ پینا آب حیواں۔ شان انساں کے نہیں لائق

ناصح سے مجھ کو غم نے کیا شرمسار حیف
سو بار پھٹ چکا یہ گریباں، ہزار حیف

زیارت باغ کی کرتی ہے آنسو سے وضو کر کے
جناب گل میں رکھتی ہے عجب صدق و صفا بلبل

چمن میں مجھ سے دیوانے کے لیجانے سے کیا حاصل
دکھا کر گل، جنوں کو شور میں لانے سے کیا حاصل

اس طرح صیاد کب آزاد چھوڑے گا تمھیں
بلبلو دھومیں مچالو یہ گلستاں پھر کہاں

کعبہ میں بھی گیا، نہ گیا ان بتوں کا عشق
اس درد کی خدا کے بھی گھر میں دوا نہیں

ہیں سو سو التفات تغافل میں یار کے
بیگانگی ہے اس کی کوئی آشنا نہیں

شکوہ جفا کا یار سے کرنا وفا نہیں
بندوں کو اعتراض خدا پر بجا نہیں

وہ کون دل ہے جہاں جلوہ گر وہ نور نہیں
اس آفتاب کا کس ذرہ میں ظہور نہیں

شوق کہتا ہے پکڑ لوں دوڑ کر دامان یار
کیا کروں مستی سے کچھ ہاتھوں میں گیرائی نہیں

کروں کیونکر میں قید زلف سے چھٹنے کی تدبیریں
پڑی ہیں میری ہر انگشت میں جوں شانہ زنجیریں

تماشا کر تصور کو کہ ہر اک اشک میں میرے
تری صورت نظر آتی ہے جوں شیشہ میں تصویریں

دلوں پر برق سی گرتی تھی جب ہم نالہ کرتے تھے
گئیں کیدھر نہیں معلوم ان آہوں کی تاثیریں

کوئی دن اور کرنے دو جنوں مجھ کو بہاراں میں
عبث سیتے ہو اس کو کیا رہا ہے اب گریباں میں

مجنوں کی خوش نصیبی، کرتی ہے داغ دل کو
کیا عیش کر گیا ہے ظالم دوانہ پن میں،

ہوائے گرم کے لگنے سے کب پتھر پگھلتا ہے
یہ نالے ان بتوں کے دل میں کب تاثیر کرتے ہیں

جو کرتا ہے تو اپنی فکر کرلے، تو بہار آئی
خدا کے واسطے یہ بات ویولنے سے کہیو

اسیران قفس کی ناامیدی پر نظر کیجو،
بہار آوے تو لے صیاد مت ہم کو خبر کیجو

کیا ہے عشق ہم نے، تجھ سے ہمدم ہے کے بھروسہ پر
خدا کے واسطے اے آہ، اس دل میں اثر کیجو،

کہا جاتا نہیں کچھ مجھ سے، جو تو کہہ سکے کہیو
مری اس بے زبانی پر نظر اے نامہ بر، کیجو

یہ محراب نماز بے خودی ہے، زاہد و سمجھو
خدا کے واسطے، مستوں کے پہلے کو مت چھیڑو

کوئی مجھ سے نہ بولو، میں تو اب مرنے کو بیٹھا ہوں
خلافت دے گیا ہے خودکشی کی کوہ کن مجھ کو

کہاں تاثیر ہے نالے میں اے مرغ قفس چپ رہ
عبث صیاد کو ناخوش بھی کیوں کرتا ہے بس چپ رہ

کوئی آوارگی کو چھوڑ، کیوں کر راہ پر آوے
عبث تو شور و شر کرتا ہے اتنا اے جرس چپ رہ

نمک ڈالا ہے مجھ میں لے ہما شور محبت نے
کہیں کھائے ہیں تو نے اس مزے کے استخواں سچ کہہ

بہار آئی ہے، کیا کیا چاک، جیب پیرہن کرتے
جو ہم بھی چھوٹ جاتے اب تو کیا دیوانہ پن کرتے

چھٹے اس زندگی کی قید سے اور داد کو پہنچے
وصیت ہے، ہمارا خوں بہا جلاد کو پہنچے

عشق میں راحت نہیں ملتی مگر جوں کوہ کن
جان شیریں دیجیے، تب خواب شیریں کیجیے

شعر خاطر خواہ مجھ سے ہو نہیں سکتا یقیں
جب ہو استعداد ناقص، پیر کامل کیا کرے

جب ہوا معشوق عاشق دلربائی کیا کرے
بندگی کی جس نے خو کی وہ خدائی کیا کرے

چاہنے والے کے مرنے کو کوئی چاہیے ہے کب
عشق ہی دشمن ہو مجنوں کا تو لیلی کیا کرے

حق مجھے باطل آشنا نہ کرے
میں بتوں سے پھروں خدا نہ کرے

دوستی بد بلا ہے اس میں خدا
کسی دشمن کو مبتلا نہ کرے

یار گر منظور ہے، دنیا و عقبیٰ سے گزر
منزل مقصود ہے دونوں جہانوں سے پرے

وہ بلبل کیوں کہ ہووے خار و خس سے آشنا جس کا
نسیم گل سے، مارے نازکی کے آشیاں لرزے

شراب تلخ کی لذت کو پوچھو مے پرستوں سے
کوئی نعمت گوارا تر نہیں ہم کو مصیبت سے

جو سر پاؤں پہ رکھ دیجے تو خوش ہووے بتاں ہم سے
ولیکن ہائے ہو سکتی ہے یہ جرأت کہاں ہم سے

نہ ڈالو مجھ پہ اے مرغان آزاد اپنے سایہ کو
گرفتار وفا کو کام اب کیا ہے گلستاں سے

بہار آئی بجاؤ عندلیبو! ساز عشرت کے
گئیں حسرت کی وہ راتیں، گئے وہ دن مصیبت کے

خبر کیا پوچھے، مرغ چمن سے آشیانے کی
اسیروں کو توقع کب ہے پھر گلشن میں جانے کی

گئے پکڑے شروع گل میں اور پرواز اول میں
نہ دی فرصت زمانے نے ہمیں دھومیں مچانے کی

کوئی میداں نہ جیتا عشق کا فرہاد کے آگے
کسو نے دم نہ مارا تیشۂ فولاد کے آگے

گلا تو پھٹ گیا، نے کی طرح فریاد سے میرا
قیامت دور ہے کس دن ملے گی داد کیا جانے

بگولا بھی ہماری خاک سے اب اٹھ نہیں سکتا
ہمیں یوں کر دیا پامال اے سرو رواں تو نے

نہ جا گلشن میں، بلبل کو خجل مت کر کہ ڈرتا ہوں
یہ دامن دیکھ کر گل کا گریباں چاک ہو جائے

گنہگاروں کو ہے امید اس اشک ندامت سے
کہ دامن شاید اس آب رواں سے پاک ہو جائے

دیار حسن تو خوش ہے ولیکن یہ بڑی مشکل
کہ لٹ جاتا ہے یاں جو کارواں جنس وفا لاوے

مقابلہ میں وفا کے جو یہ جفا ہووے
کہو کسی کا کوئی کیونکہ آشنا ہووے

دیت کا نام نہ لیجے خدا کرے کہ کہیں
مرے جی کے بھی قاتل کا حق ادا ہووے

یہ سب تو کرتے ہیں دعویٰ عشق یار کہیں
جو آزمانے پہ آوے بڑا مزا ہووے

نگاہ یار کی کوئی زباں اب تک نہیں سمجھا
یہ وہ باتیں ہیں نازک جن سے آئینہ بھی حیراں ہے

اگر زنجیر میرے پاؤں میں ڈالی تو کیا ہوگا
بہار آنے دو میرا ہاتھ ہے اور یہ گریباں ہے

حسن اور عشق میں ایک طور سے نسبت ہے ضرور
چشم بیمار تجھے دی ہے، دل زار مجھے

ہیں دوزخ سے آشنا مت ڈرا زاہد کہ ظاہر ہے
خدا ایسا ستم کب اپنے بندوں پر روا رکھے

سکوت اہل سخن کا بھی نہیں خالی افادے سے
قلم کی طرح خاموشی میں یہ رکھتا ہے گویائی

نظر آتا نہیں ثابت، گریباں ایک غنچے کا
چمن پر یہ ستم کرتا ہے، لے باد صبا کوئی

اپنے بندوں کو جلا کر خاک کرتے ہیں یقیں
ان بتوں کی ضد سے ہو جاؤں مسلماں تو سہی



سلطان عبد الحمید خاں مرحوم کے بعض چشم دید حالات

علامہ اسعد شقیری فلسطین کے باشندے ہیں سلطان عبد الحمید خاں مرحوم کے عہد میں خاص دارالانشاء سلطانی میں ملازم تھے۔ حال میں احمد شوقی مرحوم ملک الشعراء عرب کی تعزیت کی غرض سے جو وفد مصر گیا تھا آپ بھی اس کے ایک رکن تھے۔ مصر میں رسالہ "کل شئی" کے نامہ نگار نے آپ سے شرف ملاقات حاصل کرتے ہوئے سلطان مرحوم کے حالات دریافت کئے۔ علامۂ موصوف نے جو واقعات بیان فرمائے ہیں اس کا خلاصہ ہم ناظرین کی دلچسپی کے لئے پیش کرتے ہیں۔

جس وقت سے حضرت سلطان عبد الحمید خاں مرحوم تخت سلطنت پر جلوہ افروز ہوئے اسی وقت سے آپ نے محکمۂ خبر رسانی کی طرف خاص توجہ فرمائی۔ اندرون و بیرون ملک میں کثرت سے جاسوس پھیل گئے۔ یورپ و امریکہ اور اندرون ملک سلطنت عثمانیہ میں کوئی ایسی اہم خبر نہیں ہوتی تھی جس کی اطلاع سلطان کو ان کے جاسوسوں کے ذریعے نہ ہو جاتی ہو۔ اس مقصد کے لئے سلطنت کا بہت زیادہ روپیہ صرف ہوتا تھا۔ یورپ کی سازشیں اور ان کی وزارت خارجہ کے اہم راز ان مصارف و انتظام کی وجہ سے سلطان سے پوشیدہ نہیں رہ سکتے تھے۔ ان جاسوسوں کی ڈاک سلطان کی خدمت میں پیش ہوتی جس کو وہ خود ملاحظہ فرماتے۔ اگر کام کرتے کرتے تھک جاتے تو اپنے کسی صاحبزادے سے سنتے لیکن جبتک کہ یہ روزانہ ڈاک ملاحظہ یا سماعت سے نہ گزر جائے آرام نہ فرماتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ یورپ کی سازشیں سلطان کے علم میں ہوتی تھیں اور وہ عین وقت پر اس کا تدارک فرماتے تھے۔

سلطان کی معزولی کے بعد جو کاغذات برآمد ہوئے ان سے معلوم ہوتا تھا کہ سلطان کس قدر بیدار مغز تھے اور کروڑوں روپیہ اس مقصد کے لئے سلطنت کس طرح صرف کرتی تھی۔

قیصر ولیم نے سلطان کے زمانے میں سلطنت ٹرکی کی سیاحت کی۔ یہ سیاحت تاریخی و پولیٹکل حیثیت سے نہایت اہم تھی۔ سلطان نے اپنے جاسوسوں کو جو جرمنی میں متعین تھے حکم دیا کہ قیصر کے محل کے خاص

خاص کمروں کا نقشہ معہ اس کے فرنیچر کے، تعمیر کے اوقات کار اور ضروریات کا مکمل خاکہ پیش کیا جائے چنانچہ اس کی تعمیل ہوئی سلطان نے بالکل اس کی نقل قیصر اور ملکہ کے لئے قسطنطنیہ میں ترتیب دیدی ویسا ہی فرنیچر اور فرش تھا۔ قیصر اور ملکہ جب شاہی مہمان خانے میں مقیم ہوئے تو ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ تھی جب ہر چیز کو مثل اپنے قصر کے ٹھیک اور مناسب جگہ پر جس طرح وہ جرمنی میں چھوڑ کر آئے تھے قسطنطنیہ میں پایا۔ سلطان اپنے معزز مہمان کو ان خاص کمروں میں چھوڑ کر اپنے محل خاص میں تشریف لے گئے۔ قیصر و ملکہ سخت متعجب تھے اور دل ہی دل میں سلطان کی اس بیدار مغزی اور دانشمندی کو سراہ رہے تھے۔ جب دونوں سونے کے کمروں میں گئے تو جس طرح برلن میں خاص ان کے قصر میں مسہریاں بچھائی جاتی تھیں بالکل اسی طرح یہاں تھیں اور جو سامان جرمنی میں مسہریوں پر تھا بعینہٖ وہی سامان یہاں تھا۔ دونوں نے اب خاص طور سے ہر ایک چیز کا معائنہ کیا کہ کوئی چھوٹے سے چھوٹا فرق محسوس کیا جائے لیکن ممکن نہ ہو سکا۔ دیواروں پر جو نقشے اور تصاویر جس ترتیب سے برلن میں آویزاں تھیں اسی طرح یہاں انتظام تھا اور کچھ فرق نہ تھا۔

ایک مرتبہ سلطان کو اطلاع ہوئی کہ ایک یورپین طاقت اپنے سفیر کو قسطنطنیہ سے محض اس بنا پر بدلنا چاہتی ہے کہ وہ سلطان کا بہت زیادہ طرفدار اور بہی خواہ ہے اور اس کی جگہ ایک ایسے شخص کا تقرر عمل میں لایا جائے گا جو سلطان کا مخالف اور دل سے دشمن ہے۔ یہ جدید سفیر سلطان کی خدمت میں باضابطہ باریاب ہوا۔ اوراق اعتماد پیش کرتے ہوئے رسمی گفتگو کی۔ سفیر کے ساتھ اس کی بیوی بھی تھی۔ سلطان نے سفیر کی بیوی سے کہا کہ کیا آپ ہماری بیگمات سے محل سرا میں ملاقات نہیں کریں گی۔ سفیر کی بیوی نے اس شاہی اعزاز کا شکریہ ادا کیا اور عرض کی کہ اسی وقت اس کو شاہی محلات میں جانے کی اجازت مرحمت فرمائی جائے۔ خود سلطان قصر شاہی میں سفیر مذکور کی بیوی کو لے کر داخل ہوئے۔ سلطان ان کو بہت سے کمروں کو شکوں سے گزرتے ہوئے محلات کی بعض بعض بیگمات سے ملاقات کراتے ہوئے ایک بڑے کمرے میں لے گئے اور کہا یہ ہمارا جواہر خانہ ہے کیا آپ ان قدیمی جواہرات اور نادر روزگار چیزوں کو دیکھنا پسند کریں گی۔ سفیر کی بیوی نے نایاب اشیاء کو دیکھنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ سلطان نے

جواہر خانہ کھلوایا۔ سفیر کی بیوی کی آنکھیں ان عجائب وغرائب جواہرات اور نفیس سامان کو دیکھ کر چوندھیا گئیں۔ ایک موتیوں کے ہار کے پاس جاکر کھڑی ہوگئی جو بہت ہی قیمتی تھا اور عرصے تک غور سے اس کی طرف دیکھتی رہی اور اس کی قیمت کا دل ہی دل میں اندازہ کر رہی تھی۔ سلطان نے وہ ہار اٹھایا اور سفیر کی بیوی کے گلے میں ڈال کر کہا کہ یہ ہار آپ کے گلے میں کس قدر اچھا معلوم ہوتا ہے۔ سفیر کی بیوی نے شکریہ ادا کرتے ہوئے ہار گلے سے اتارنا چاہا تاکہ اس کو اس کی اصلی جگہ پر بدستور رکھدے۔ سلطان نے فرمایا کہ اب یہ ممکن نہیں ہے کہ یہ ہار پھر اپنی جگہ رکھا جائے۔ یہ آپ ہی کے گلے میں مناسب و موزوں ہے یہ اسی جگہ رہے گا اور بطور شاہی یادگار کے آپ کے خاندان میں اس کو رہنا چاہئے۔ سفیر کی بیوی یہ قیمتی ہار حاصل کر کے بے حد مسرور ہوئی۔ اس ہار کی قیمت کا اندازہ ۷ ہزار پونڈ لگایا گیا تھا۔

ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے علامہ موصوف نے فرمایا کہ لوگوں کا خیال ہے کہ سلطان پر اس کے مقربین کا بڑا اثر تھا۔ میری رائے میں تو حقیقت بالکل اس کے خلاف تھی۔ مقربین میں سے ہر شخص سلطان کی دانشمندی اور بیدار مغزی سے واقف و خائف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ چھوٹی سے چھوٹی غلطی اور معمولی سا قصور بھی سلطان سے پوشیدہ نہیں رہ سکتا اور اس کو بصورت ارتکاب جرم ضرور سلطانی سزا بھگتنی پڑے گی۔ دوسرے ان لوگوں کی کوئی بات یا خواہش سلطان کبھی نہیں سنتا تھا۔ وہ جو کچھ کرتا تھا اپنے جاسوسوں کی اطلاعوں اور رپورٹوں پر کرتا تھا۔

سلطان نے اپنی حفاظت خاص کے لئے ایک باقاعدہ فوج رکھی تھی جس کی تعداد تین ہزار تک پہنچ چکی تھی۔ سلطان کو ان کی وفاداری پر پورا بھروسا تھا۔ اس کو خیال تھا کہ یہی فوج خطرے کے وقت اس کی جان و آبرو کی حفاظت کرے گی لیکن افسوس اسی جگہ یہ کہا جاتا ہے کہ اس کی تقدیر برگشتہ ہوگئی اور تدبیر الٹ گئی۔ اس کی سب امیدیں خاک میں مل گئیں اور اس کو اپنے باپ دادا کے موروثی تخت سے بصد یاس و حسرت دست بردار ہونا پڑا۔ یہ مختصر فوج انجمن اتحاد و ترقی کے افسروں کے ہاتھ میں آگئی اور خلاف امید حفاظت کے لئے ناکافی ثابت ہوئی۔

علامہ موصوف نے ایک واقعہ اپنا خود بیان کیا ہے۔ علامہ موصوف سلطان کے خاص دفتر

میں تھے۔ایک روز خود سلطان دفتر میں معہ دفتر کے افسر اعلیٰ کے تشریف لائے اور ایک قدیم شاہی دستاویز ملاحظہ فرمانا چاہی۔ اس صیغے کے افسر نے عرض کیا کہ وہ دستاویز موجود ہے ابھی پیش کی جائے گی۔ سلطان نے حکم دیا کہ جلد نکالدو۔ افسر نے کنجیاں لے کر تمام ضروری مقامات میں تلاش کیا مگر مطلوبہ دستاویز نہ ملی۔ افسر پریشانی اور گھبراہٹ کی وجہ سے کانپ رہا تھا۔ اس کا ہاتھ اور آنکھ کام نہیں دیتے تھے۔ سلطان کو کھڑے کھڑے دیر ہوگئی تھی۔ انھوں نے خود میری طرف متوجہ ہوکر فرمایا کہ تم بیکار کیوں کھڑے ہو کیا تم کو معلوم نہیں کہ مجھے اس کاغذ کی سخت ضرورت ہے تم کیوں تلاش نہیں کرتے۔ میں نے عرض کی حضور عالی میں ابھی پیش کرتا ہوں۔ یہ کہہ کر میں نے کنجیاں لیں اور تمیرا خزانہ کھولا اور بہت جلد وہ کاغذ نکال لایا۔ مجھے اس کی جگہ بھی معلوم تھی اور میں اس قدر بدحواس نہیں ہوا تھا کہ کاغذ نہ نکال سکتا۔

میں نے کاغذ سلطان کے حضور میں پیش کیا۔ پہلا افسر خوف اور پریشانی سے کانپ رہا تھا۔ اس کے ہوش وحواس درست نہ تھے۔ سلطان نے وہ کاغذ ملاحظہ فرمایا۔ یہ وہی کاغذ تھا جو سلطان کو مطلوب تھا۔ سلطان کاغذ لے کر واپس ہوئے اس افسر سے جو اب تک کھڑا کانپ رہا تھا فرمایا کہ اب تم اس عرب پر غصہ کرنا جس نے تمھارا کام کردیا۔ پھر مجھ سے ارشاد فرمایا تمھارا کوئی عزیز مکے میں بھی ہے؟ میں نے عرض کیا کہ میری والدہ محترمہ مکے میں تشریف رکھتی ہیں۔ سلطان تشریف لے گئے۔ کچھ دنوں کے بعد مجھے میری والدہ کے خط سے معلوم ہوا کہ والی مکہ نے ایک کافی رقم مجھے عطا فرمائی کہ یہ سلطان کی جانب سے ہے۔

علامہ موصوف فرماتے تھے کہ سلطان بہت ہی بارعب اور باوقار آدمی تھے۔ ممکن نہ تھا کہ ان کے چہرے پر نظر جائے کوئی شخص کچھ دیر دیکھتا رہے۔ ان کے ہر وقت کے پاس رہنے والے خادم، اہلکار، محرر، کاتب سب ان سے لرزتے تھے اور سب یہ جانتے تھے کہ سلطان کا محاسبہ نہایت سخت اور اس کا غصہ حد درجہ خطرناک ہے جس سے ہمیشہ بچتے رہنا چاہیے۔

سلطنت میں رسم سلاملیق عرصہ سے مروج تھی۔ سلطان وقت جامع مسجد میں جمعہ کی نماز کے لئے تشریف لاتے اور فوج بعد نماز ملاحظہ میں فوجی ترتیب و قواعد کے تحت میں گزرتی۔ سلطان جب قصر سے نماز

کے لئے تشریف لاتے، دو رویہ فوج استادہ ہوتی اور واپسی پر بھی یہ فوج اسی طرح موجود ہوتی تھی۔ باقی فوج صف بندی کے نظام کے ساتھ سامنے سے گزر جاتی۔ بعد ان مراسم کے سلطان قصر میں واپس ہوتے تو سفراء دول، علماء، حکماء اور دیگر ممالک کے مشہور سیاح جو اس وقت قسطنطنیہ میں موجود ہوتے حضور میں شرف باریابی حاصل کرتے۔ معمولی مراسم کورنش و آداب کے بعد یہ لوگ جب واپس ہوتے تو عموماً سلطان کی ہیبت و وقار ان کے دل میں جاگزیں ہوتے اور یہ لوگ اکثر یہی ذکر کرتے ہوتے تھے۔

تخت سلطنت پر جلوہ افروز ہوتے ہی سب سے پہلا حکم سلطان نے یہ دیا کہ ان کے چچا سلطان عبدالعزیز مرحوم کے قاتلوں سے انتقام لیا جائے۔ سلطان کو اپنے چچا سے مطلق محبت نہ تھی بلکہ وہ خود اپنی حفاظت ان قاتلوں اور ان کی سازشوں سے کرنا چاہتے تھے۔ جب باقاعدہ عدالت نے مقدمہ کی سماعت کر کے ملزموں کے خلاف پھانسی کی سزا تجویز کی اور منظوری کے لئے سلطان کے حضور میں یہ تجویز پیش ہوئی تو سلطان نے فرمایا کہ مجھے خونریزی سے زیادہ کوئی چیز ناپسند نہیں۔ ان ملزموں میں سے بعض کو حبس دوام اور بعض کو ہمیشہ کے لئے جلاوطنی کی سزا دیدی گئی۔ اس طرح سزا کے بدلنے سے سلطان نے اپنے رحم و کرم کا سکہ رعایا پر بٹھا دیا۔ ملزمین کے اہل و عیال سلطان کی اس عنایت کے شکر گزار ہو گئے اور اس کا اثر بہت اچھا ہوا۔

سلطان کے بعض مصاحبین کی سازش سے استاد اسعد یعنی علامہ موصوف پر ایک مصیبت نازل ہوئی یعنی ان سے سلطان کو ناراض کر دیا گیا اور ان کو دارالسلطنت سے باہر بھیجدیا گیا اور اسی زمانے میں دستوری حکومت کا اعلان ہو گیا۔ ولایت عکہ کی طرف سے علامہ ممدوح نمائندے منتخب کئے گئے۔ جب یہ سب نمائندے سلطان کے حضور میں شرف باریابی حاصل کرنے گئے تو علامہ موصوف بھی تھے۔ ممدوح فرماتے ہیں کہ مجھے دیکھ کر سلطان نے اپنے بعض مقربین سے ارشاد فرمایا کہ یہ شخص (علامہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) تو ہمارا پروردہ نعمت ہے۔ مطلب یہ تھا کہ جو لوگ اس وقت رعایا کے نمائندے آئے ہیں ان میں اکثر خود ہمارے ہی پروردہ اور ہمارے ہی بنائے ہوئے ہیں۔

(ماخوذ)

انتقام

(ماخوذ)

بڑی تلاش و جستجو کے بعد بالآخر آج جمشید نے اپنی بیوی کو اس کے ساتھ پارک میں دیکھ لیا تھا اور اب وہ ایرک اینڈ کو کی دکان پر کوئی عمدہ سا ریوالور خریدنے میں مصروف تھا۔ اس کے چہرے سے غم و غصہ، رنج، اور استقلال ظاہر ہو رہا تھا۔

"میں نے سوچ لیا ہے جو مجھے کرنا ہے" وہ اپنے آپ سے کہہ رہا تھا "خاندان کے ناموس پر بٹہ لگ گیا ہے۔ میری عزت خاک میں مل گئی ہے اور بحیثیت ایک شہری اور باعزت انسان کے مجھے اس سے ضرور انتقام لینا چاہیئے۔ سب سے پہلے میں اپنی بیوی کو ماروں گا، اس کے بعد اس کے عاشق کو اور آخر میں خود اپنا خاتمہ کروں گا۔"

اس نے ابھی تک نہ تو کوئی ریوالور منتخب کیا تھا اور نہ کسی کو مارا تھا۔ لیکن اس کی آنکھوں کے سامنے تین لاشیں خاک و خون میں لتھڑی ہوئی زمین پر پڑی تھیں اور ان کے گرد لوگوں کا ہجوم تھا۔ عالمِ تصور ہی میں اس نے اخبارات کے کئی افتتاحیہ مقالات پڑھ ڈالے جن میں اس خوفناک واقعہ پر خوب خوب رائے زنی کی گئی تھی۔

دکاندار ایک موٹا سا آدمی تھا جس کی توند باہر نکلی ہوئی تھی۔ وہ مختلف اقسام کے ریوالور جمشید کو دکھا رہا تھا۔ ایک ریوالور دکھاتے ہوئے اس نے کہا "میری تو یہ رائے یہ ہے کہ آپ اسے خریدئے۔ یہ اسمتھ اینڈ ویسن کے کارخانے کا ہے۔ نہایت ہی عمدہ اور مضبوط ہے۔ اس سے بہتر آپ کو نہیں مل سکتا۔ ڈاکوؤں، چوروں اور عاشقوں کے مارنے کے لئے بہترین ہے۔ چھ سو قدم کے فاصلے سے مار سکتا ہے۔ اس کی ایک گولی سے دو آدمی بیک وقت مر سکتے ہیں۔ اور خودکشی کے لئے تو اس سے بہتر کوئی ریوالور ہی نہیں۔"

"اس کی قیمت کیا ہے؟" جمشید نے پوچھا۔

"ایک سو پچیس روپیے۔"

"لیکن اتنی قیمت کا مجھے نہیں چاہیے۔"

"تو پھر میں آپ کو اس سے سستا دکھاتا ہوں۔ ہماری دکان پر تو کئی قسمیں ہیں۔ دیکھئے اس ریوالور کی قیمت صرف پچھتر روپیے ہے۔ لیکن یہ قدیم وضع کا ہے۔ کسی کو مارنے یا خودکشی کے لئے یہ ریوالور کسی کام کا نہیں۔ سب سے اچھا تو اسمتھ اینڈ ولسن کا ہے۔"

"میں کسی کو مارنے یا خودکشی کے لئے نہیں خریدنا چاہتا" جمشید نے اس کی تردید کرتے ہوئے کہا "مجھے تو صرف چوروں وغیرہ کے دھمکانے کے لئے چاہیے۔"

"جی۔ آپ نے ٹھیک فرمایا۔ اور ہمارا تو یہ کام ہی نہیں ہے کہ ہم ہر ایک کے حالات پوچھتے پھریں اور یہ معلوم کریں کہ وہ کس مقصد کے لئے ریوالور خرید رہا ہے۔" دکاندار نے مسکراتے ہوئے کہا "اگر ہم یہ کرنے لگیں تو ہمیں اپنی دکان بند کرنی پڑے گی۔ چوروں کے دھمکانے کے لئے بھی یہ ریوالور ٹھیک نہیں کیونکہ اس کی آواز بہت ہلکی ہوتی ہے۔ اس کے لئے تو ماریٹر ریوالور اچھا ہے۔ کم خرچ بالانشیں۔ ڈوئیل لڑنے کے لئے اکثر آدمی یہی خریدتے ہیں۔"

"میں اس کو ڈوئیل لڑنے کے لئے کیوں نہ دعوت دوں" یکایک یہ خیال جمشید کے دل میں آیا "لیکن یہ نہایت ہی باعزت جنگ ہے۔ ایسے بدمعاشوں کو تو کتے کی موت مارنا چاہیئے۔"

دکاندار نے کئی قسمیں لاکر جمشید کے سامنے رکھ دیں۔ ان میں سب سے اچھا اسمتھ اینڈ ولسن تھا۔ جمشید نے ایک ریوالور اٹھایا اور اس کو دیکھ کر کسی سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے یہ تصور کرنا شروع کیا کہ کس طرح وہ دونوں کو گولی ماریگا۔ اور ان کے سروں سے خون کا فوارہ چھوٹ جائے گا اور کس طرح وہ تڑپ تڑپ کر اپنی جان دیدیں گے۔ لیکن یہ خون اور تڑپنا اس کی تسلی کے لئے کافی نہیں تھا۔ وہ اس سے زیادہ خوفناک منظر دیکھنا چاہتا تھا۔

"میں یہ کیوں نہ کروں" اس نے سوچا "میں اپنے آپ کو اور اس کو مار ڈالوں گا اور اپنی بیوی کو زندہ رہنے دوں گا۔ اس کا ضمیر خود اس کو ملامت کرے گا۔ سارے لوگ اس کو برا بھلا کہیں گے۔ یہ

ملامت اور طعن وتشنیع موت سے بھی زیادہ اس کے لئے اذیت دہ ہوگی۔

اور اس نے تصور کیا کہ کس طرح اس کا جنازہ جا رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہزاروں لوگ ہیں، اور وہ سب کے سب اس کی بیوی کو برا بھلا کہہ رہے ہیں اور وہ یہ فقرے سن کر مارے شرم و ندامت کے زمین میں گڑی جاتی ہے۔

"میرا خیال ہے کہ آپ کو یہی ریوالور پسند آیا ہے" دکاندار نے خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا "میں آپ کی خاطر اس کی قیمت میں دس روپے کم کر دیتا ہوں لیکن میرے پاس اور بھی کئی قسمیں ہیں۔"

دکاندار نے الماریوں میں سے اور کئی ریوالور نکالے اور ان میں سے ایک کو ہاتھ میں لے کر کہنا شروع کیا "دیکھئے اس کی قیمت صرف تیس روپے ہے۔ ان دنوں اس کی قیمت بڑھ گئی ہے کیونکہ آپ کو تو معلوم ہے کہ کسٹم کے محصولات میں اضافہ ہو گیا ہے۔"

جمشید کو اچانک اس خیال سے رنج اور افسوس ہوا کہ وہ مر جائے گا اور اپنی بیوی کی شرم و ندامت اور رنج و تکلیف کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکے گا۔ انتقام میں صرف اس وقت لطف آتا ہے جب کہ اس کا نتیجہ اپنی آنکھوں سے دیکھا جائے۔ اس انتقام سے کیا فائدہ کہ اس کے پھل کو آدمی کھا بھی نہ سکے۔

"بس یہی ٹھیک ہے" اس نے سوچ کر اپنے آپ سے کہا "میں اس کو مار ڈالوں گا۔ اس کے جنازے میں بھی جاؤں گا اور جنازے کے بعد اپنے آپ کو گولی مار لوں گا۔ اگر جنازے سے پہلے ہی گرفتار ہو گیا تو اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ میری بیوی تو ہر صورت سے زندہ رہے گی۔ گرفتار ہونے میں بھی مجھے فائدہ ہے۔ میں مقدمے میں اس کا چال چلن، اس کا اخلاق اور اس کی عیاری و مکاری سب کھول کر بیان کر دوں گا جس سے سب لوگ حیرت میں رہ جائیں گے۔ اگر میں اپنے آپ کو مار ڈالوں گا تو سارا الزام مجھ پر آئے گا۔ وہ بھی مجھے ہی ملزم ٹھہرائے گی اور پورا زمانہ مجھ پر ہنسے گا۔ اگر میں زندہ رہوں تو....."

ایک منٹ کے بعد اپنے آپ سے وہ یہ کہہ رہا تھا "ہاں اگر میں اپنے آپ کو مار ڈالوں گا تو میں ہی ملزم ٹھہرایا جاؤں گا۔ اس کے علاوہ پہلی بات تو یہ ہے کہ میں اپنے آپ کو کیوں ماروں اور

دوسری بات یہ کہ اپنے آپ کو مارنا بزدلی کی نشانی ہے۔ بس یہی ٹھیک ہے کہ میں اپنی بیوی کو نہیں ماروں گا لیکن اس کا خاتمہ کر دوں گا۔ اپنے مقدمے میں سب حالات بیان کر دوں گا اور اس کی عزت و آبرو سب خاک میں مل جائے گی جب میرا بیرسٹر اس پر جرح کرے گا۔ مجھے یقین ہے کہ عدالت، اخبارات اور لوگوں کی ہمدردی میری طرف ہو گی۔"

جمشید تو ان خیالات میں محو تھا اور دکاندار برابر نمونے پر نمونے دکھا رہا تھا۔ "جناب یہ انگریزی نمونہ ہے لیکن یہ سب نمونے اسمتھ اینڈ ویسن کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ آپ نے تو غالباً سنا ہی ہو گا چند ہی دنوں کا واقعہ ہے کہ انگریز افسر نے ہمارے ہاں سے اپنی بیوی کے عاشق کو مارنے کے لئے یہی ریوالور خریدا۔ آپ شاید یقین نہ کریں مگر سچ عرض کرتا ہوں کہ گولی اس کے بھیجے میں سے ہوتی ہوئی لیمپ کی چمنی کو چیرتی ہوئی ایک پیانو پر جا لگی اور وہاں سے اُچٹ کر اس کی بیوی کو بھی زخمی کر ڈالا۔ یہ افسر اب جیل خانے میں ہے اور کچھ شک نہیں کہ اسے کم از کم کالے پانی کی سزا ہو جائے گی۔ مگر کس قدر ظلم ہے۔ سزا کس کو ملنی چاہئے اور ملتی کس کو ہے۔ میرے غم و غصے کی کوئی انتہا نہیں رہتی جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ آجکل لوگوں کے اخلاق کتنے خراب ہو گئے ہیں۔ دوسرے آدمیوں کی بیویوں سے محبت کرنا آجکل ایسا ہی عام ہو گیا ہے جیسے کسی سے سگریٹ لے کر پینا یا کسی کی کتابیں مانگ کر پڑھنا۔" تھوڑی دیر رک کر اور ادھر اُدھر دیکھ کر اس نے پوچھا "لیکن قصور کس کا ہے؟"

مگر جمشید کچھ اور ہی سوچ رہا تھا "اس کے لئے کالے پانی جانا حماقت ہے۔ اگر مجھے کالے پانی بھیج دیا گیا تو یہی ہو گا کہ میری بیوی کسی دوسرے سے شادی کرے گی اور پھر اپنے نئے شوہر کو بھی دھوکہ دے گی۔ اس صورت میں فتح اس کی ہے ... لہٰذا اپنی بیوی کو میں نہیں ماروں گا اور نہ اپنے آپ کو۔ اور اس کو؟ اس کو بھی نہیں ماروں گا۔ مجھے اس سے اچھی تجویز سوچنا چاہئے۔"

"یہ ایک دوسرا نمونہ ہے" دکاندار نے کہا "اور چند ہی دن ہوئے ہمارے ہاں آیا ہے۔"

لیکن چونکہ جمشید اب فیصلہ کر چکا تھا کہ وہ کسی کی جان نہیں لے گا اس لئے اب ریوالور خریدنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ لیکن وہ شرمندہ تھا کہ اس نے خواہ مخواہ دکاندار کا وقت ضائع کیا۔ "اچھا"

اس نے کہا "میں پھر کسی وقت آؤں گا یا اپنے ملازم کو بھیج دوں گا"

یہ کہہ کر اس نے دکاندار کے چہرے کی طرف نہیں دیکھا لیکن اس نے محسوس کیا کہ اسے ضرور کچھ خریدنا چاہئے۔ لیکن سوال یہ تھا کہ خریدا کیا جائے۔ اس نے ادھر اُدھر دیکھا۔ پاس ہی ایک الماری میں ایک سبز ڈبہ تھا۔ "وہ کیا ہے، وہ سبز ڈبہ" اس نے پوچھا۔

"اس میں مچھروں اور مکھیوں کے مارنے کی دوا ہے۔"

"اور اس کی قیمت کیا ہے۔"

"پانچ روپے"

"اچھا اس کو کاغذ میں بندھوا دیجئے۔"

جمشید نے پانچ روپے دئے اور ڈبہ لے کر چلتا بنا۔ اسے غصہ اور افسوس تھا کہ خواہ مخواہ اس کے پانچ روپے ضائع گئے۔

نوید بہار

وہ جانفزا بہار ہے ہوا وہ کیف بار ہے
وہ رنگ کوہسار ہے وہ لطف آبشار ہے
فضا وہ خوشگوار ہے کہ دشت لالہ زار ہے
نہ کوئی بیقرار ہے نہ کوئی دل فگار ہے
نہ کوئی سوگوار ہے
ہوا ہے شاد ہر بشر

تو آنکھ کھول تو ذرا یہ دیکھ ہو رہا ہے کیا
فضا ہے کتنی جانفزا ہوا ہے کتنی دل کشا
چمن ہے کیا ہرا بھرا کھلے ہیں پھول جا بجا
نظارہ حسن کا کیف زا تجھے بھی حق ہے عیش کا
جو چاہے دل کا مدعا
تو کاہلی سے کر حذر

کہاں کا رنج اور غم کہاں کا شکوۂ ستم
کہاں کا گریۂ الم نکال گھر سے تو قدم
بہار کا ہے وہ کرم چمن ہے غیرت ارم
یہ کہہ رہا ہے ہر صنم نہ ہو عمل کا ذوق کم
ترے ہی واسطے ہیں ہم
تجھی پہ سب کی ہے نظر

سجی ہے کیسی انجمن   کھلے ہیں لالہ و سمن
ہر ایک گل ہے خندہ زن   ہر اک نہال ہے مگن
جبیں پہ کیوں ہے یہ شکن   خیال کلفت و محن
ہے سخت حوصلہ شکن   نہ ہو ملول جانِ من
ذرا تو دیکھ یہ پھبن   چمن ہے یا کوئی دلھن
یہی نہ ہو ترا وطن
خبر بھی ہے تجھے مگر

بڑھے ہیں دل کے حوصلے   جو دل میں رنج و حزن تھے
وہ آج دور ہو گئے   یہ چاہئے یہاں تجھے
کہ شاد اور خوش رہے   جگہ نہ دل میں غم کو دے
یہ زندگی کے مرحلے   نہیں ہیں کچھ ترے لئے
اگر ہیں زندہ ولولے
تو ہر قدم پہ ہے ظفر

جو بزمِ کائنات ہے   تو یہ عرصۂ حیات ہے
قدم کو گر ثبات ہے   عمل پہ التفات ہے
تو بس تری نجات ہے   نہ ہار ہے نہ مات ہے
نہ فکر واہیات ہے   نہ وجہِ مشکلات ہے
یہ سب ترے ہی ہات ہے
تجھے نہیں کوئی ضرر

عمل میں ہے اگر کمی   تو ہے فضول زندگی
کہ جانِ زیست ہے یہی   اسی کی سب ہے روشنی

جو آرزو ہے عیش کی تو کاہلی نہ کر کبھی،
کہ جس نے کی ہے کاہلی وہ قوم خود ہی مٹ گئی
یہ سب تری ہنسی خوشی
عمل پہ بس ہے منحصر
کہاں ترا وہ جوش ہے کہاں ترا خروش ہے
جو تجھ کو عقل و ہوش ہے جو حسِ چشم و گوش ہے
جو تو عمل فروش ہے تو کس لئے خموش ہے
تو کیوں یہ سست کوش ہے جو یادِ عیشِ دوش ہے
جو فکر نا و نوش ہے
تو اپنا جام آپ بھر!

برطانوی اور افغانی معاہدات

افغانی اور برطانوی تعلقات کی ابتدا احمد شاہ ابدالی بانیِ مملکت افغانستان کے بعد اس کا بیٹا تیمور شاہ مسند نشین حکومت افغانستان ہوا۔ عہد تیموری میں افغانستان کی مملکت عہد شباب پر تھی۔ تیمور کے بعد جب شاہ زماں تخت نشین ہوا تو اسی زمانے سے انگریزوں کا افغانستان کے ساتھ سیاسی تعلق سمجھنا چاہیے کیونکہ شاہ زماں شمالی ہندوستان پر حملہ کرنا چاہتا تھا اس وجہ سے انگریزی برین کو افغانستان کی طرف سے ایک طرح کا خدشہ پیدا ہو گیا۔

ایرانی اور برطانوی تعلقات کی ابتدا اس خدشے سے محفوظ رہنے کے لئے انگریزوں نے ایرانیوں سے دوستی اور روابط پیدا کرنے کی کوشش کی۔ مورخین کا خیال ہے کہ ایرانی اور برطانوی تعلقات کی ابتدا ۱۵۶۱ء سے ہوئی مگر اصل تعلق ان دونوں ملکوں کا اسی زمانے سے سمجھا جاتا ہے جب ۱۷۹۳ء میں سر جان میلکم کی زیر سرکردگی شاہ ایران کے پاس گورنر جنرل ہند کی طرف سے سفارت گئی۔ "افغانی خطرے" سے ہندوستان کو محفوظ رکھنے کے لئے برطانوی اور ایرانی سفرار کے درمیان معاہدہ ہوا جس کا لب لباب یہ تھا کہ:-

(۱) افغانی تاخت و تاراج سے سرزمین ہند کو محفوظ رکھا جائے۔

(۲) ایران میں فرانسیسیوں کا غلبہ نہ ہونے پائے۔

(۳) ایران میں برطانوی تجارت کے لئے تمام سہولتیں مہیا کی جائیں۔

فرانس اور روس کی مشہور و معروف جنگ کے بعد دونوں حکومتوں کے درمیان ایک صلح نامہ ہوا اور اس کے بعد دونوں نے مصمم ارادہ کیا کہ ہندوستان پر حملہ کر کے انگریزوں کو سرزمین ہند سے نکال کر باہر کریں۔

چنانچہ مئی ۱۸۰۸ء میں فرانسیسی سفارت بسرکردگی مانشر کسوک ایران میں ایک عہدنامے

کے لئے آئی۔ اس معاہدے کا ماحصل یہ تھا کہ فرانسیسی فوجی افسر ایران کی فوج کو نئی فوجی قواعد سکھائیں گے اور دونوں حکومتیں اپنے متخاصمین کی مدافعت کے لئے ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔

ایرانی اور فرانسیسی معاہدے کے بعد انگریزی مدبرین نے ایک نئی چال چلی وہ یہ کہ ایک طرف سر ملکم کی جگہ سر ہرفرڈ کو ایرانی سفارت پر مامور کیا جس نے ایرانیوں کو اپنے دام فریب میں پھنسا کر فرانسیسیوں کا اقتدار ایرانی دربار سے ایک حد تک مٹا دیا اور از سر نو ایک دوسرا معاہدہ ایران اور انگلستان میں ۱۸۰۹ء میں ہوا جس کا لب لباب وہی تھا جو پہلے معاہدے کا تھا۔

معاہدۂ اول | اسی اثنا میں شاہ زماں کا انتقال ہو گیا اور اس کی جگہ شاہ شجاع تخت نشین افغانستان ہوا۔ لارڈ منٹو گورنر جنرل ہند نے آنریبل الفنسٹن کی سرکردگی میں ایک سفارت افغانستان اس غرض سے روانہ کی کہ شاہ افغانستان سے ایک معاہدہ مودت کرے تاکہ روسی اور فرانسیسی خطرے سے ہندوستان محفوظ رہ سکے۔ یہ سب سے پہلا معاہدہ ہے جو برطانوی اور افغانی مملکت کے درمیان ہوا جس کی تمہید اور شرائط حسب ذیل ہیں:-

اس سازش کی وجہ سے جو روس اور فرانس نے ایران کے ساتھ اس غرض سے کی ہے کہ افغانستان اور ہندوستان پر حملہ کر کے فتح کر لیں۔ آنریبل الفنسٹن بطور سفیر مختار از جانب لارڈ منٹو گورنر جنرل جو ہندوستان کے برطانوی مقبوضات کے مختار کل ہیں کابل تشریف لائے ہیں کہ حفاظت افغانستان اور ہندوستان کی تدابیر کے لئے ارا کین مملکت افغانستان سے گفتگو کریں اور دونوں مملکتوں کے مفاد کے لئے ایک معاہدہ کریں۔ چنانچہ اس تمہید کے بعد حسب ذیل شرائط معاہدہ قرار پائیں۔

(۱) چونکہ فرانس اور روس نے ایران سے سازش کی ہے کہ افغانستان اور ہندوستان کی سرزمین پر قبضہ کیا جائے اس لئے ملازمان شاہ افغانستان کا فرض ہے کہ ان کو آگے بڑھنے نہ دیں اور تمام تر کوشش عمل میں لا کر فرانس اور روس کو اپنے ملک سے خارج کر دیں اور ان کو ہندوستان تک آنے نہ دیں۔

(۲) اگر ایران فرانس اور روس نے متفق ہو کر سرزمین افغانستان پر حملہ کیا تو حکومت برطانیہ کا

فرض ہے کہ شاہ افغانستان کی ہر طرح سے مدد کرے ۔ اس کام میں جو کچھ خرچ ہوگا اس کی متحمل خود حکومت برطانیہ ہوگی اور جب تک ایران، فرانس اور روس کی سازش رہے گی یہ عہدنامہ بھی قائم رہے گا اور فریقین اس کی تعمیل کرتے رہیں گے۔

(۳) حکومت برطانیہ اور حکومت افغانستان میں دائمی دوستی اور مودت قائم کرنے کی سعی کی جائے گی اور حکومت افغانستان کا فرض ہوگا کہ کسی فرانسیسی شخص کو اپنے ملک میں داخل نہ ہونے دے۔

غرض یہ پہلا معاہدہ دونوں حکومتوں نے منظور کرلیا۔ شاہ افغانستان نے اپنی مہر اس عہدنامے پر ثبت کردی اور اس طرح گورنر جنرل ہند نے بھی اس کو پسند کرکے منظور کرلیا۔ ۱۸۱۵ء تک اس معاہدے پر عمل رہا۔ اس کے بعد جب ۱۸۱۵ء میں واٹرلو میں نپولین کو انگریزوں نے شکست دے کر قید کرلیا اور دوسری طرف روس اور ایران کی طرف سے بھی حملے کا خطرہ کم ہوگیا تو اب اس معاہدے کی شرط دوم کی رو سے یہ معاہدہ ساقط ہوگیا۔

معاہدۂ دوم | زماں شاہ کے بعد اس کے بھائیوں میں تخت کابل کے لئے لڑائیاں ہوتی رہیں۔ ۱۸۰۳ء میں شاہ شجاع تخت کابل لینے میں کامیاب ہوگیا لیکن آئے دن ملک بغاوتوں اور سازشوں کا جولانگاہ بن گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ شاہ شجاع نہ مرد میداں تھا اور نہ سیاست داں تھا۔ علاوہ ازیں بڑھاپے نے اس کے قویٰ کو مضمحل کردیا تھا جس کی وجہ سے وہ حکومت کرنے کے قابل نہ رہا، ملت افغانیہ میں شاہ موصوف غیر ہردل عزیز تھا۔ عام طور پر افغانی سردار اس کو نفرت کی نظر سے دیکھنے لگے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۰۹ء میں تمام افغانستان میں ایک عالمگیر بغاوت رونما ہوئی۔ باغیوں کے سرغنہ وزیر خاں نے شاہ شجاع کو شکست دی۔ اب شاہ موصوف نے افغانستان چھوڑ کر ہندوستان میں اول اول رنجیت سنگھ کے ہاں پناہ لی لیکن رنجیت سنگھ نے بجائے خاطر مدارات کے شاہ شجاع کے ساتھ برا سلوک کیا وہ یہ کہ شاہ موصوف کے پاس جتنے جواہرات تھے وہ سب چھین لئے اور بحالت مجبوری شاہ شجاع نے لدھیانہ میں انگریزوں کے ہاں پناہ لی اور حکومت انگریزی نے شاہ موصوف کے لئے وظیفہ مقرر کردیا لیکن

شاہ شجاع نے تخت کابل کا خیال ابھی تک ترک نہیں کیا تھا۔ چنانچہ اس نے ایک دفعہ تخت افغانستان کے لئے قسمت آزمائی کرنیکی غرض سے انگریزوں اور سکھوں سے ایک معاہدہ کیا۔

اس سے پیشتر ایک معاہدہ شاہ شجاع اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کے درمیان ہوا تھا جس میں چودہ شرائط تھیں۔ یہ معاہدہ ایک طرح سے تجارتی تھا اور استحکام مودت کے لئے طے پایا تھا۔ اب چونکہ شاہ شجاع انگریزوں کے ساتھ معاہدہ کر رہا تھا اس لئے سکھوں کے ساتھ بھی اسی سلسلے میں معاہدہ کیا۔ چنانچہ یہ معاہدہ شاہ شجاع، انگریزوں اور سکھوں کے درمیان ہوا جو اٹھارہ شرائط پر مشتمل ہے۔ اس کی خاص خاص شرطیں یہ ہیں جو تینوں حکومتوں کے درمیان طے پائیں۔

(۱) تینوں حکومتوں یعنی انگریز، خالصہ افغانوں میں سے ایک کے دوست سب کے دوست اور ایک کے دشمن سب کے دشمن تصور کئے جائیں گے۔

(۲) شاہ شجاع وعدہ کرتے ہیں کہ تخت افغانستان پر قابض ہونے کے بعد انگریزوں اور خالصہ کی فوجی امداد کے عوض ۲ لاکھ روپیہ ادا کریں گے۔ انگریز اور خالصہ شجاع کی امداد کے لئے پانچ ہزار فوج روانہ کریں گے۔

(۳) شاہ شجاع وعدہ کرتے ہیں کہ بغیر رضائے دولت خالصہ اور برطانیہ کسی اجنبی حکومت سے گفتگو نہ کریں گے۔

(۴) شاہ شجاع اعلان کرتے ہیں کہ وہ امیران سندھ کی مالگزاری سے حکومت انگریزی کے حق میں دستبردار ہوتے ہیں۔

غرض جب یہ معاہدہ مرتب ہوا تو تینوں حکومتوں نے اسے منظور کر لیا اور اسی معاہدے کی بنا پر انگریزی فوج نے براہ درۂ بولان افغانستان پر حملہ کر کے شاہ شجاع کو تخت کابل پر بٹھایا۔ امیر دوست محمد گرفتار ہو کر ہندوستان آیا اور اس کے بعد شاہ شجاع انگریزی تلواروں کے سایے میں افغانستان پر حکومت کرنے لگا۔ لیکن تا بہ کے؟

معاہدہ سوم | ۱۸۴۱ء میں افغانستان میں شاہ شجاع اور انگریزی فوجوں کے خلاف بسر کردگی احمد خاں

ایک زبردست بغاوت ہوئی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ افغانوں نے انگریزی فوجوں کو بالکل تہس نہس کر دیا ایک ڈاکٹر بہ مشکل خفیہ طور پر بچ کر ہندوستان پہنچا جس نے انگریزی فوجوں کی تباہی کا حال سنایا۔ اسی بغاوت میں شاہ شجاع کا خاتمہ ہو گیا اور تمام افغانستان محمد اکبر خاں کے ماتحت تھا۔ ادھر ہندوستان میں لارڈ آکلینڈ کی جگہ لارڈ ڈالنبرہ گورنر جنرل ہند مقرر ہو کر آیا اور اس کی پالیسی یہ تھی کہ حکومت برطانیہ کو افغانی معاملات میں دخل نہ دینا چاہئے۔ البتہ انگریزی فوج ایک دفعہ افغانستان جا کر اپنے محصورین کو چھڑا ئے، شہر کابل کو تباہ کر دے اور افغانوں کے دلوں پر رعب بٹھا کر واپس آئے۔ چنانچہ اسی مقصد کو سامنے رکھ کر برطانوی افواج ۱۸۴۲ء میں افغانستان گئیں اور کابل کو تباہ کر کے براہ درۂ خیبر واپس ہو گئیں۔

اس کے بعد امیر دوست محمد خاں کو انگریزوں نے رہا کر دیا اور موصوف نے افغانستان پہنچ کر عنان حکومت سنبھالی۔ اس کے بعد امیر دوست محمد خاں اور انگریزوں کے درمیان ایک طویل مراسلت کے بعد ایک معاہدہ ہوا جس کو ہم معاہدۂ سوم کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

یہ معاہدہ ۱۸۵۵ء میں دونوں حکومتوں کے نمائندوں کے ذریعے سے طے پایا۔ انگریزی حکومت کی طرف سے جنرل لارنس چیف کمشنر پنجاب تھے اور حکومت افغانستان کی طرف سے سردار غلام حیدر خاں ولی عہد افغانستان معین تھے۔ اس معاہدے کے حسب ذیل شرائط قابل ذکر ہیں:-

(۱) ایسٹ انڈیا کمپنی اور امیر دوست محمد خاں والی افغانستان اور ان کے ورثا میں ہمیشہ دوستی رہے گی۔

(۲) ایسٹ انڈیا کمپنی وعدہ کرتی ہے کہ امیر افغانستان کے مقبوضات میں دست اندازی نہیں کرے گی۔

(۳) امیر دوست محمد خاں وعدہ کرتے ہیں کہ وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے مقبوضات میں کبھی دست اندازی نہیں کریں گے۔ کمپنی کے دشمنوں کو اپنا دشمن سمجھیں گے۔

معاہدۂ چہارم | ۱۸۵۶ء میں ایران اور برطانیہ میں ہرات پر جنگ ہوئی اور انگریزوں نے خلیج فارس پر قبضہ کر لیا۔ اس وقت برطانیہ نے امیر دوست محمد خاں کو اپنا دوست بنانا اور مالی مدد دینا ضروری

خیال کیا اور امیر موصوف نے بذات خود سر جان لارنس چیف کمشنر پنجاب سے پشاور میں ملاقات کی اور اس ملاقات کے بعد ۲۶ جنوری ۱۸۵۷ء میں دونوں حکومتوں کے درمیان ایک نیا معاہدہ ہوا۔ اس معاہدے کی ترتیب میں امیر دوست محمد خاں نے بذات خود نمائندگی کے فرائض انجام دئے اور انگریزوں کی طرف سے سر جان لارنس چیف کمشنر پنجاب اور کرنل ایچ۔بی۔ ایڈورڈ کمشنر قسمت پشاور نے نمائندگی کی۔ معاہدے کی گفتگو پشاور میں ہوئی اور اس کے شرائط حسب ذیل ہیں:-

(۱) چونکہ حکومت ایران نے وعدہ خلافی کر کے ہرات پر قبضہ کر لیا ہے اور اس کا ارادہ ہے کہ بلخ، قندھار اور کابل وغیرہ پر قبضہ کرے اس لئے از راہ دوستی حکومت برطانیہ امیر افغانستان سے وعدہ کرتی ہے کہ جب تک یہ جنگ قائم رہے گی ایک لاکھ روپیہ ماہانہ حکومت انگلشیہ امیر افغانستان کو دیتی رہے گی۔

(۲) امیر صاحب وعدہ کرتے ہیں کہ اٹھارہ ہزار فوج موجود رکھیں گے، من جملہ اس فوج کے تیرہ ہزار منظم آئینی فوج ہوگی جو تیرہ رجمنٹ میں منقسم ہوگی

(۳) امیر صاحب روپیہ لینے کا انتظام خود کریں اور اپنے علاقے میں اس کے لے جانے کا انتظام بھی خود کریں۔

(۴) کچھ انگریزوں کے فوجی نمائندے دربار کابل میں مع اپنے اسٹاف کے رہیں گے جو مہم ہرات کی نگہداشت اور مشورے کا کام کریں گے۔ ان کے جان و مال کی حفاظت امیر افغانستان پر لازم ہوگی۔

(۵) امیر افغانستان کا ایک نمائندہ کلکتے میں رہے گا۔

(۶) ایک لاکھ ماہانہ کی امداد ایرانی اور برطانوی جنگ کے اختتام پر ختم ہو جائے گی یا جب گورنر جنرل چاہیں بند کر دیں۔

(۷) جب ایک لاکھ ماہانہ امداد بند ہو جائے گی اس وقت برطانوی نمائندے بھی ہندوستان واپس چلے آئیں گے۔ اگر ضرورت ہوئی تو برطانوی نمائندہ دربار کابل میں رہے گا۔

(۸) اس معاہدے سے پیشتر جو پانچ لاکھ روپے امیر صاحب کو ادا کئے گئے ہیں وہ اس میں محسوب نہیں ہوں گے۔

(۹) یہ عہد نامہ ۱۸۵۵ء منعقدہ پشاور کا ناسخ نہ ہوگا۔ بنابریں امیر افغانستان وعدہ کرتے ہیں کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے دوست امیر موصوف کے دوست اور اس کے دشمن امیر موصوف کے دشمن متصور ہوں گے۔

امیر دوست محمد خاں سے یہ عہد نامے کیوں کر ہوئے؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ انگریز اپنی اس پالیسی کی تکمیل کرنا چاہتے تھے جو روس کی مدافعت کے لئے تھی۔ ابتدا میں انگریزوں نے "روسی خطرے" کو روکنے کے لئے مؤدت کے عہد کئے اور اس کے بعد افغانیوں سے اتحاد کیا۔ ان دونوں قوموں کے معاہدوں کی بنیاد یہ ہے کہ ایرانیوں سے انگریزوں کی دوستی روپے سے خریدی گئی تھی اور افغانوں سے بذریعہ جان و مال۔

"روسی خطرے" سے ہندوستان کو بچانے کے لئے انگریزوں نے ابتدا میں ایرانیوں سے اتحاد پیدا کیا لیکن سیاسی رفتار کی تبدیلی کی وجہ سے انگریز مدبرین نے "روسی خطرے" سے محفوظ رہنے کے لئے ایران کو کوئی مضبوط دیوار نہ سمجھا بلکہ بعض انگریز مدبرین کے نزدیک وہ ایک ریت کی دیوار تھی جس کو معمولی حملہ بھی تہ و بالا کر سکتا ہے۔

اب انگریزوں کو ایک ایسی دیوار کی ضرورت تھی جو "روسی خطرے" کو روک سکے اور روسی پیش قدمی کے لئے پیش بندی کا کام دے۔ چنانچہ تاریخ کے صفحات گواہ ہیں کہ افغانستان نے ہندوستان اور روس کے درمیان سنگین دیوار کا کام دیا۔

معاہدۂ پنجم | امیر دوست محمد خاں نے ۱۸۶۳ء میں انتقال کیا اور شیر علی خاں کو اپنا ولی عہد مقرر کیا۔ امیر دوست محمد خاں کے بیٹوں میں تخت کابل کے لئے سخت لڑائیاں پیش آئیں اور افغانستان کے مختلف حصوں پر دوست محمد خاں کے مختلف بیٹے قابض ہوگئے مگر انگریز افغانستان کی امارت کا حقیقی وارث امیر شیر علی خاں کو سمجھتے تھے ۔ اس کے بعد بھی افغانستان کے سرداروں میں تخت کابل کے لئے لڑائیاں ہوتی رہیں۔ اسی اثنا میں امیر شیر علی کا انتقال ہوگیا اور بالآخر شیر علی کا بیٹا یعقوب خاں کامیاب ہوا اور

اس کے بعد انگریزوں اور یعقوب خاں کے درمیان بمقام گندمک معاہدہ ہوا جس کے شرائط حسب ذیل ہیں :-

(۱) فریقین اس معاہدے کی رو سے صلح اور آشتی پر قائم رہیں گے ۔

(۲) امیر یعقوب خاں وعدہ کرتے ہیں کہ اجنبی حکومتوں سے معاملات وغیرہ کرنے میں انگلستان سے مشورہ کریں گے اور اگر افغانستان پر کوئی حملہ ہوا تو انگریز افغانستان کی مدد کریں گے ۔

(۳) برطانوی سفیر دربار کابل میں رہے گا اور اس کی حفاظت کے لئے کافی باڈی گارڈ ہوگا ۔ علاوہ ازیں انگریزوں کی حفاظت خاص طور پر امیر افغانستان کے ذمہ ہوگی ۔

عہد نامہ گندمک کی رو سے انگریزی اقتدار مملکت افغانستان میں کافی ہو گیا تھا ۔ اگر یہ معاہدہ عملی طور پر قائم رہتا تو قندھار اور درۂ خیبر سے پار اہم فوجی مقامات پر انگریزوں کا قبضہ رہتا اور ان کی وجہ سے کابل پر دباؤ رہتا اور " روسی خطرے " پر انگلستان کا مفید اثر پڑ سکتا تھا ' مگر بعض انگریز مدبرین کی یہ رائے تھی کہ روسی اور برطانوی مفاد اس میں ہے کہ ہندوستان اور روس کے درمیان افغانستان ایک آزاد ریاست رہنے دیا جائے ۔ اس پالیسی پر عمل کرتے ہوئے انگریزوں نے افغانستان کی چھیڑ چھاڑ میں کسی قدر کمی کر دی اور اس لئے بھی کہ اگر انگریز افغانستان کے کسی ایک ٹکڑے پر قابض ہوتے تو ادھر بلخ اور ہرات پر روسی قابض ہو جاتے بغاوتوں کی وجہ سے افغانستان میں یعقوب خاں کی حکومت بھی دیر تک نہ رہ سکی ۔ آخر ۱۸۸۰ء میں یعقوب خاں قید ہو کر ہندوستان روانہ ہوئے اور ان کے بعد امیر عبدالرحمن خاں مسند آرائے افغانستان ہوئے ۔

معاہدۂ ششم | افغانی تاریخ گواہ ہے کہ شیر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے بعد جو شخص فوجی اور انتظامی قابلیت افغان قوم میں بدرجہ اتم رکھتا تھا وہ عبدالرحمن خاں تھا ۔ امیر عبدالرحمن خاں ہی کی ذات تھی جس نے انگریزی اور روسی سیاست کا بہ نظر عمیق مطالعہ کیا تھا ۔ جن لوگوں نے تزک عبدالرحمن پڑھا ہے وہ اس بات کو اچھی طرح جانتے ہوں گے کہ عبدالرحمن خاں افغانستان کو کیا بنانا چاہتا تھا اور برطانوی سیاسی چالوں کو کس طرح سمجھتا تھا اور ان کو کس طرح توڑتا تھا ۔ اعلیٰ مدبر اور غیور افغان ہونے کی وجہ سے امیر

موصوف کو انگریزوں سے چند شکایات پیدا ہوگئی تھیں اور اسی طرح انگریزوں کو امیر موصوف سے کسی قدر شکوہ تھا۔ ان شکایات کو رفع کرنے کے لئے لارڈ لینسڈون نے ۱۸۹۳ء میں دفتر خارجہ کے سکریٹری سر مارٹیمر ڈیورنڈ کو کابل روانہ کیا تاکہ امیر افغانستان کے ساتھ افغانستان اور ہندوستان کی مستقل سرحدوں اور ایک دائمی عہد مودت کے متعلق گفتگو کرے۔ چنانچہ یہ وفد ۱۸۹۳ء میں کابل پہنچا اور ایک طویل بحث ومباحثے کے بعد حسب ذیل معاہدہ طے پایا۔

(۱) مشرق اور جنوبی سرحد کا امیر افغانستان کی حکومت وا خاں سے سرحد فارس تک ہوگی۔
(۲) فریقین ایک دوسرے کی حدود میں مداخلت نہ کریں گے۔
(۳) سرحدی لائن کا تعین بعد میں ایک کمیشن کے ذریعے ہوگا۔
(۴) برطانیہ تسلیم کرتا ہے کہ امیر افغانستان اسمار پر قابض رہیں اور امیر افغانستان یقین دلاتے ہیں کہ سوات، باجوڑ اور چترال پر انگریزی اقتدار رہے گا۔
(۵) علاقہ چمن کے بارے میں امیر صاحب اپنا اعتراض واپس لیتے ہیں اور اس علاقے سے برطانیہ کے حق میں دست بردار ہوتے ہیں۔
(۶) حکومت ہند افغانستان کو ایک مضبوط حکومت دیکھنا چاہتی ہے اس لئے براہ ہند اسلحہ جنگ طلب کرنے میں مداخلت نہ کرے گی اور علاوہ ازیں حکومت ہند خود امیر افغانستان کی مدد کرے گی۔ وہ رقم جو حکومت ہند امیر افغانستان کو بطور دوستانہ دیتی ہے وہ چھ لاکھ سے بڑھا کر ۱۲ لاکھ کی جاتی ہے۔

اس معاہدے کے بعد امیر عبدالرحمٰن نے زیادہ تر اپنی اندرونی اصلاحات کی طرف توجہ کی اور افغانستان کو بہت بڑی حد تک منظم کیا اور مختلف کارخانے قائم کئے اور حکومت افغانستان کے ہر شعبے کو منظم کیا۔

امیر عبدالرحمٰن کے انتقال کے بعد امیر حبیب اللہ خاں ۱۹۰۱ء میں تخت نشین کابل ہوا۔ امیر حبیب اللہ خاں نے اپنی حکومت کی پالیسی بذریعۂ اعلان وہی رکھی جو ان کے والد امیر عبدالرحمٰن کی تھی

اور انگریزوں کے ساتھ اسی معاہدے کو برقرار رکھا۔

امیر عبدالرحمٰن نے مملکت افغانستان کو ایک منظم حکومت بنا دیا تھا۔ امیر حبیب اللہ خاں کے لئے کافی موقعہ تھا کہ ملک کو ایک قدم آگے بڑھاتا لیکن حبیب اللہ خاں اپنے والد کے انتقال کے بعد عیش و آرام کی زندگی بسر کرنے لگا اور ملکی ترقی ایک حد تک رک گئی۔

جنگ عظیم کے زمانے میں ایک جرمن اور ترکی وفد حبیب اللہ خاں کے پاس اس غرض سے آیا کہ افغان قوم ہندوستان پر حملہ کرکے اپنی مکمل آزادی حاصل کرے لیکن امیر حبیب اللہ خاں نے اس مشورے کو نہ مانا۔ بالآخر افغان "نوجوان پارٹی" نے ۱۹۱۹ء میں جلال آباد کے قریب امیر صاحب کو قتل کیا۔

معاہدۂ تقسیم | اس کے بعد امیر امان اللہ خاں تخت افغانستان پر قابض ہوا۔ امان اللہ خاں کو "نوجوان افغان پارٹی" نے تخت پر بٹھایا تھا اور امیر موصوف بذات خود ایک زبردست جذبۂ آزادی اپنے دل میں رکھتا تھا۔ امان اللہ خاں چاہتا تھا کہ ملت افغانیہ اپنے پیدائشی حق یعنی حریت و استقلال سے اسی طرح مستفید ہو جس طرح اور اقوام عالم۔ مزید برآں امیر حبیب اللہ خاں کے عہد میں انگریزی فوجوں نے متعینہ حدود افغانستان سے ۴ میل آگے بڑھ کر قبضہ کر رکھا تھا۔ یہ چیز نوجوان پارٹی کو بہت ناپسند ہوئی۔ ان وجوہات اور جذبۂ آزادی نے امان اللہ خاں کو اپنی مکمل آزادی حاصل کرنے کے لئے مجبور کیا چنانچہ ۱۹۱۹ء میں موقع بھی اچھا ملا کہ افغان اپنی آزادی کے لئے کوشش کریں، کیونکہ افواج ہند جنگ عظیم میں لڑ کر تھک گئی تھیں۔ اسی وقت امان اللہ خاں نے استقلال ملی کے لئے انگریزوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔

افغانی افواج نے انگریزی فوجوں کو شکستیں دے کر مدبرین برطانیہ کو اس بات پر مجبور کیا کہ افغانستان کے استقلال ملی کو تسلیم کرلیں کیونکہ نوجوان افغان پارٹی یہ کبھی برداشت نہیں کر سکتی تھی کہ افغانستان پر اجنبی تسلط قائم رہے۔ جنگ کے التوا کا اعلان ہوا۔ اس کے بعد برطانیہ کی دعوت صلح پر افغانی نمائندے بسرکردگی سردار اعلیٰ علی احمد خاں راولپنڈی پہنچے۔ حکومت ہند نے افغانی وفد کا

شاندار استقبال کیا۔ دونوں حکومتوں کے نمائندوں میں بحث تمحیص شروع ہوئی۔ دوران بحث میں سردار علی احمد خاں نے نوجوان افغان پارٹی کے خیالات کی ترجمانی کرتے ہوئے ایک تقریر میں برطانوی نمائندوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا کہ

"ابتدائے جنگ برطانیہ کی طرف سے ہوئی ہے ایسی حالت میں افغانوں پر مدافعت لازمی تھی۔ اب صلح کی دعوت بھی حکومت برطانیہ کی طرف سے ہوئی ہے۔ ہمارا وفد ہندوستان میں آیا ہے۔ یہ یاد رہے کہ اگر حکومت افغانستان کو برطانیہ کی دوستی کی ضرورت ہے تو برطانیہ کو اس سے کہیں زیادہ افغانستان سے دوستی قائم رکھنے کی ضرورت ہے۔"

گفتگوئے راولپنڈی میں چند ہی امور طے ہونے پائے تھے کہ یہ صلح کانفرنس ملتوی ہو گئی۔ اس کے بعد اپریل ۱۹۲۰ء میں افغانی وفد بسرکردگی وزیر خارجہ سردار اعلیٰ محمود طرزی کوہ منصوری آیا اور گفتگوئے معاہدہ ہوئی۔ اس کانفرنس میں حسب ذیل موضوعات پر بحث ہوئی:۔

استحکام استقلال افغانستان، تقرر سفیر افغانستان بلندن، مسئلہ الحاق وزیرستان با افغانستان، تقرر قنصل خانہائے بالشویکی بہ سرحدات ملحقہ افغانستان اور سہولیات تجارت۔

ان تمام موضوعات پر افغانی نمائندوں نے نہایت جرأت و ہمت کے ساتھ "نوجوان افغان پارٹی" کے خیالات کی ترجمانی کی اور انگریزی نمائندوں نے معلوم کر لیا کہ افغانستان اب وہ افغانستان نہیں رہا کہ انگریزی مدبرین کے مکر و فریب میں پھنسے۔

گفتگوئے منصوری بھی ناکام رہی۔ نمایندگان افغانستان واپس چلے گئے۔ ۵ جنوری ۱۹۲۱ء میں برطانوی وفد بسرکردگی سر ہنری ڈابس کابل گیا تاکہ از سر نو معاہدۂ مودت پر بحث کر کے اسے پایۂ تکمیل تک پہنچائے۔ چنانچہ گفتگوئے کابل میں ایک معاہدہ طے پایا جو چودہ دفعات پر مشتمل ہے جس کی بڑی بڑی شرطیں حسب ذیل ہیں:۔

(۱) دولتین برطانیہ و افغانستان ایک دوسرے کی داخلی و خارجی خود مختاری کے حقوق تسلیم کرتی ہیں اور ان کا احترام کرتی ہیں۔

(۲) دونوں حکومتیں ہندوستان اور افغانستان کی سرحدات کے اس خط کو منظور کرتی ہیں جو راولپنڈی میں طے ہوا تھا یعنی مقام تورخم اور دریائے کابل کی تلمٹی جو سلیمان خولہ بند اور پلوسی کے درمیان ہے وہ علاقہ افغانستان میں شامل ہوگی۔

(۳) حکومت برطانیہ اقرار کرتی ہے کہ افغانی سفرار اور وزرار کے دربار لندن میں وہی حقوق ہوں گے جو دوسری حکومتوں کے سفرار کے ہیں۔

(۴) حکومت افغانستان اقرار کرتی ہے کہ قندھار اور جلال آباد میں برطانوی قنصل خانے قائم کرنے کی اجازت دے گی اور برطانیہ وعدہ کرتی ہے کہ ہندوستان میں کراچی، بمبئی، کلکتہ اور دہلی میں افغانی قنصل خانوں کی اجازت دے گی۔

(۵) حکومت برطانیہ اقرار کرتی ہے کہ افغانستان کی ترقی و بہبودی کے لئے کارخانوں کی کلیں، انجن، سامان تلغراف اور ٹیلیفون اور اسلحات جنگ ہندوستان کے راستے سے اس شرط پر لے جانے کی اجازت دے گی کہ اس کو افغانستان کی دوستی کا یقین ہو۔

(۶) دونوں حکومتیں اقرار کرتی ہیں کہ ایک دوسرے کے نمائندوں کی حفاظت کریں گی۔

(۷) جو مال حکومت افغانستان کی فرمائش پر سیدھا افغانستان جانے کے لئے برطانوی ہند کی بندرگاہوں میں پہنچے گا اس پر محصول نہیں لیا جائے گا اس شرط پر کہ افغانی قنصل اس کی تصدیق کردے۔

اس معاہدے کی بقیہ سات دفعات تجارتی ہیں جن کا ذکر باعث طوالت ہوگا۔ دونوں حکومتوں کے نمائندوں نے اس معاہدے کی تصدیق کی۔ یہ معاہدہ ایک طویل گفتگو کے بعد پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ اس موقع پر دونوں حکومتوں کے حکمرانوں کے پیغامات کا تبادلہ ہوا جس میں شاہ انگلستان اور شاہ افغانستان نے اظہار مسرت کرتے ہوئے ایک دوسرے کی طرف سے دائمی مودت کا یقین دلایا۔

افغانی اور برطانوی معاہدات پر ایک نظر

شاہ شجاع سے لے کر عبدالرحمٰن کے عہد تک جتنے معاہدے افغانوں اور انگریزوں کے درمیان ہوئے تھے ان کی شرائط سے ظاہر ہوتا ہے کہ افغان دب کر صلح کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ افغانستان برطانوی اقتدار کے ماتحت تھا۔ لیکن معاہدہ ششم اور ہفتم کی شرائط سے معلوم ہوتا ہے کہ افغانوں کے اندر جذبۂ استقلال و حریت پیدا ہو چکا تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ کسی قوم سے دب کر صلح کریں۔ یہ جذبہ معاہدۂ ہفتم سے بخوبی واضح ہوتا ہے کیونکہ ترتیب معاہدہ کے وقت افغانی وفد کے نمایندوں نے نہایت قابلیت و تدبر کے ساتھ بحث کی جس کی وجہ سے انگریز مدبرین کی آنکھیں کھل گئیں۔ افغانی نمایندوں نے اپنے استقلال و حریت کے مطالبے کے لئے ڈٹے رہے۔ آخر برطانوی مدبرین افغانستان کے استقلال ملی کے تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اب افغانستان بجائے "نیم آزاد" سلطنت کے "سلطنت مستقلہ افغانستان" کے نام سے موسوم ہوا۔

"نوجوان افغان پارٹی" کے قائد اعظم سابق امیر امان اللہ خاں کی اس تقریر سے جو انھوں نے تکمیل معاہدہ کے بعد برطانوی وفد کے الوداع کے وقت کی تھی افغانستان کے سیاسی مطمح نظر کا پتہ لگتا ہے۔ امیر موصوف نے دوران تقریر میں فرمایا:۔

"میں دیکھتا ہوں کہ آج دولتین افغانستان و برطانیہ کا معاہدہ ہو گیا ہے اور فریقین نے ایک دوسرے کے خیالات و مطالبات قبول کر لئے ہیں۔ میں تو یہی ہی سے متمنی ہوں کہ تمام اقوام عالم آزاد ہو جائیں۔ میں ہرگز نہیں چاہتا کہ کسی شخص کے حقوق آزادی تلف ہوں بالخصوص اپنے وطن اور اپنی سلطنت کے حق آزادی میں کسی قسم کا خلل گوارا نہیں کر سکتا تھا۔ میں خیال کرتا تھا کہ دولت برطانیہ ہی وہ طاقت ہے جس نے افغانستان کو اس کے پیدائشی حق سے محروم کیا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ میرے دل میں سلطنت مذکورہ کی مخالفت کے خیالات بھرے ہوئے تھے۔ میں تو اب بھی افغانستان کی عزت و استقلال کے لئے اپنے خون کا آخری قطرہ بہانے کے لئے تیار ہوں۔"

اس تقریر کے لفظ لفظ سے افغانی قوم کے عزم صمیم کا پتہ لگتا ہے۔ اس چیز نے برطانوی مدبرین پر واضح کر دیا کہ اس چھوٹی سی بہادر قوم کے ساتھ مساوات کا برتاؤ کیا جائے۔ ایک زمانہ تھا کہ بعض مدبرین برطانیہ کو امیر حبیب اللہ خاں ہز مجسٹی سکے لئے مترادف فارسی کے الفاظ مراسلت میں استعمال کرنا ناگوار تھے لیکن اب ۱۹۲۱ء میں معاہدہ ہفتم کی رو سے افغانستان کا کلی استقلال تسلیم کیا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو افراد یا اقوام اپنی عزت و استقلال قائم رکھنا چاہتے ہیں وہ یقین محکم، عمل پیہم کو اپنا دستور العمل بناتے ہیں۔ چنانچہ اس راز کو ملت افغانیہ نے اچھی طرح معلوم کر لیا اور ملت افغانیہ حصول مقصد کے لئے اپنی عزیز جانیں تک قربان کرنے کو تیار ہو گئی۔ ایک مختصر عرصے میں اقوام عالم نے ملت افغانیہ کے استقلال کو مان لیا۔

نوجوان افغانوں نے دنیا پر واضح کر دیا کہ افغان شمشیر زنی اور حکمرانی میں دنیا کی کسی قوم سے پیچھے نہیں ہیں۔ بہت سے مدبرین کا خیال ہے کہ افغان قوم ایک شاندار مستقبل رکھتی ہے اور بہت ممکن ہے کہ یہ قوم آوارہ کوہ و دمن اقوام ایشیا کی رہنمائی کرے۔

ماخذ

فارسی :۔ تاریخ السراج حصہ اول و دوم

تزک عبدالرحمانی

اردو :۔ افغانستان جدید

نیرنگ افغان

تاریخ افغانستان

انگریزی :۔ 1. A short History of India, Burma, Nepal and Afghanistan by J. Tal Boys Wheeler.

2. The Russo-Indian Questions by Capt. F. French.

غزل

(حضرت جگر مرادآبادی)

یادِ جاناں بھی عجب روح فزا آتی ہے
سانس لیتا ہوں تو جنت کی ہوا آتی ہے

میری جانب نگہ ہوش ربا آتی ہے
پھر وہی ظالم مظلوم نما آتی ہے

جا بھی اے ناصح ناداں نہ کر اس کو بدنام
ان جفاؤں سے تو خوشبوئے وفا آتی ہے

نہیں معلوم وہ خود ہیں کہ محبت ان کی
پاس ہی سے کوئی بے تاب صدا آتی ہے

میں تو اس سادگیٔ حسن پہ اس کی صدقے
نہ جفا آتی ہے جس کو نہ وفا آتی ہے

ہائے کیا چیز ہے یہ تکملۂ حسن و شباب
اپنی صورت سے بھی اب ان کو حیا آتی ہے

مرگ ناکام محبت مری تقصیر معاف
زندگی بن کے مرے حق میں قضا آتی ہے

اٹھ گیا کیا جگر درد بہ دل شعلہ بہ جاں
در و دیوار سے ماتم کی صدا آتی ہے

تنقید و تبصرہ

کتب

سوامی دیانند اور ان کی تعلیم۔ اخلاق کی پہلی کتاب۔ نقش آخر (ڈراما)۔
کلیات طغرائی۔ ارکان اسلام۔ نیا میلاد نامہ۔

سوامی دیانند اور ان کی تعلیم | (از خواجہ غلام الحسنین صاحب پانی پتی۔ مجموعی حجم ۲۹۰ صفحے، تقطیع ۲۲×۱۸/۸ الکھائی چھپائی کاغذ اوسط درجے کا۔ قیمت غیر مجلد ۱۲؍ مجلد ۱۴؍۔ ملنے کا پتہ:۔ حالی بک ڈپو، پانی پت، پنجاب)

خواجہ غلام الحسنین صاحب کی تعلیم اور مذہبی خدمات سے ملت اسلامی اچھی طرح واقف ہے۔ موصوف نے اپنی ساری عمر اس کام میں صرف کی ہے کہ ایک طرف تعلیم و تربیت، موعظت و ہدایت سے مسلمانوں کے دلوں میں شمع ایمان روشن کی اور دوسری طرف کلام اور مناظرے کے ذریعے اس شمع کو مخالف ہواؤں سے بچایا۔ مناظرے کو ہندوستان کے لوگوں نے اس قدر پست سطح پر پہنچا دیا ہے کہ مہذب لوگ اس کے نام سے کانوں پر ہاتھ رکھتے ہیں۔ مگر خواجہ صاحب نے کمال کیا کہ اس کوچے میں قدم رکھنے کے بعد بھی اپنے دامن کو اس کیچڑ سے آلودہ نہیں ہونے دیا جو لوگ یہاں ایک دوسرے پر پھینکا کرتے ہیں۔ یہ کتاب جس پر تنقید کی جا رہی ہے اس اعتبار سے ہندوستان میں اپنا نظیر نہیں رکھتی کہ لکھنے والا اس شخص کے حالات لکھ رہا ہے جس کی تعلیم کو وہ سراسر غلط سمجھتا ہے اور عمر بھر اس کی مخالفت کرتا رہا ہے مگر ساری کتاب میں ایک لفظ بھی تہذیب و متانت کی سطح سے گرا ہوا نہیں سوائے خود سوامی دیانند کے اقوال کے جو ان کی سخت کلامی کے نمونوں کے طور پر نقل کئے گئے ہیں۔ سوامی جی کی زندگی کے واقعات بڑی کاوش اور تحقیق سے معلوم کئے گئے ہیں۔ جن امور کے متعلق متضاد روایات ہیں ان کے بیان میں مخالف اور موافق باتیں بلاکم و کاست جمع کر دی گئی ہیں اور پھر دیانت داری سے محاکمہ کیا گیا ہے۔ یہ تو

ظاہر ہے کہ کتاب کا مقصد سوامی جی کی تعلیم کی تردید ہے اور اس مقصد کے حصول میں مصنف نے پوری پوری کوشش کی ہے مگر مہذب مناظرے کے آداب سے اول سے آخر تک کہیں انحراف نہیں ہوا ہے۔ سوامی جی کی ذات کے متعلق نکتہ چینی ضرور ہے اور انتہائی سخت گیری سے ہے مگر اسی حد تک کہ ان کی تعلیم کے خلاف استدلال میں مدد ملے۔ ذاتی کاوش یا عناد کی بنا پر یا دوسروں کی دل آزاری کی غرض سے ایک فقرہ بھی نہیں لکھا گیا ہے۔ ہم خواجہ صاحب کو مبارکباد دیتے ہیں کہ جو مقصد ان کے پیش نظر تھا اس میں وہ پوری طرح کامیاب ہوئے ہیں اور اس کے علاوہ انھوں نے سنجیدہ اور شائستہ مناظرے کا نہایت پاکیزہ نمونہ ملک کے سامنے پیش کر دیا ہے جس کی سب لوگ نہیں تو کچھ لوگ ضرور تقلید کریں گے کتاب کے ساتھ مشرح اور مدلل مقدمہ، نہایت مفصل فہرست اور آخر میں چند صفحات میں سارے مضامین کا خلاصہ ہے۔ ترتیب مضامین میں بھی یہ کتاب ایک جداگانہ شان رکھتی ہے اور بعض امور کے لحاظ سے ہر مصنف کے لئے قابل تقلید ہے۔

اخلاق کی پہلی کتاب (مصنفہ سید غلام الحسنین صاحب پانی پتی۔ ملنے کا پتہ:۔ حالی بک ڈپو پانی پت)

اس کتاب کو ایک بہترین معلم کے عمر بھر کے تجربے کا نچوڑ سمجھنا چاہیے۔ اس میں توحید و معرفت کے نکتے اس طرح بیان کئے گئے ہیں کہ چھوٹی سی عمر کے بچوں کے ذہن میں بیٹھ جائیں اور ان کے دل پر نقش ہو جائیں۔

ہر سبق میں کسی ایسی چیز کا بیان ہے جسے بچے روزمرہ دیکھتے ہیں اور اچھی طرح جانتے ہیں۔ نہایت سہل، شیریں اور پاکیزہ زبان اور سیدھے سادے انداز بیان میں اس کاریگری، حکمت اور حسن ذوق کی تعریف کی گئی ہے جو دنیا کی معمولی سے معمولی چیز کے بنانے میں صرف ہوئی ہے اور اس سے صانع کی ذات اور اس کی صفات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ ہر سبق کے آخر میں اس کا نتیجہ دو چار صاف اور رواں شعروں میں بیان کر دیا گیا ہے جو بچوں کو یقیناً پسند آئیں گے اور بار بار پڑھتے پڑھتے نوک زبان ہو جائیں گے۔ عموماً ان اسباق کا مضمون قرآن مجید کی آیتوں اور حدیثوں سے ماخوذ ہے اس لئے

مسلمانوں کے لئے تو یہ کتاب بہر حال سچے اخلاق اور دینداری کا سرچشمہ ہے لیکن غیر مسلم بھی اپنے بچوں کو پڑھا سکتے ہیں کیونکہ جو اصول اس میں بیان کئے گئے ہیں ان پر دنیا کی ہر متمدن قوم کا مذہب مبنی ہے یا کم سے کم مبنی ہونے کا مدعی ہے۔

نقش آخر (ڈراما) | از جناب اشتیاق حسین قریشی ام۔ اے ۲۰×۳۰/۱۶ ضخامت ۱۰۰ صفحات، کتابت طباعت اور کاغذ متوسط قیمت ۱۲/

جن لوگوں نے جناب اشتیاق حسین صاحب قریشی کے پچھلے ڈراموں معلم اسود، گناہ کی دیوار، ہمزاد اور صید زبوں کا مطالعہ کیا ہے وہ موصوف سے اچھی طرح واقف ہوں گے۔ آپ نے اردو ڈراموں کی موجودہ خرابیوں کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا ہے اور نہایت خاموشی وانہماک کے ساتھ اس کام میں مصروف ہیں جس کا ثبوت وہ مفید ڈرامے ہیں جن کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں۔ آپ ہر سال ایک ڈراما ضرور لکھ لیتے ہیں اور ہر سال وہ اس ڈرامے کو اپنی نگرانی میں نہایت کامیابی کے ساتھ اسٹیج بھی کرلتے ہیں۔

زیر نظر ڈرامے میں انھوں نے موجودہ مغربی تعلیم کے نقائص دکھائے ہیں۔ قصے کا تعلق غدر کے زمانے سے ہے۔ میر عاشق دلی کے ایک باکمال مصور تھے۔ قلعہ معلی میں ان کو بہت رسوخ حاصل تھا اور آخری مغل شہنشاہ بہادر شاہ ان کو بہت قدر و عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ان کا بڑا لڑکا محسن بہت سعادت مند اور ہونہار نوجوان تھا۔ اس کا تعلق بھی قلعۂ معلی سے تھا۔ دوسرے لڑکے کا نام شبیر تھا جو ابھی چھ سات سال کا تھا۔ یہ تینوں قصے کے خاص افراد ہیں۔ یہ خاندان بہت خوش حال تھا اور اطمینان و فراغت کی زندگی بسر کرتا تھا۔ لیکن غدر کے زمانے میں دوسرے شریف گھرانوں کی طرح یہ خاندان بھی تباہ و برباد ہوگیا۔ صرف ایک ماما، محسن اور شبیر بچ رہے۔

محسن اپنے ایک دوست طاہر کے اصرار سے شبیر کو سر سید احمد کے انگریزی مدرسے میں داخل کردیتا ہے۔ انگریزی تعلیم کے اثر سے وہ مغربی تہذیب سے اتنا متاثر ہوجاتا ہے کہ اس کی برائیاں بھی اسے اچھائیاں نظر آتی ہیں اور پرانی تہذیب و شائستگی اسے مضحکہ انگیز معلوم ہوتی ہے اور وہ اچھا خاصا ۱۹۲۳ء کا مسلمان

جنٹلمین بن جاتا ہے جس کی روزانہ دلچسپیوں کا مرکز تھیٹر ہیں اور سینما۔

کتاب شروع سے آخر تک دلچسپ ہے۔ مصنف نے زمانۂ غدر سے پہلے کی اسلامی تہذیب و شائستگی کا نقشہ بہت خوبی سے کھینچا ہے۔ غدر کی مصیبتوں کی داستان بھی بہت درد انگیز ہے۔ اور آخر میں وہ بحثیں بھی دلچسپ ہیں جو سرسید احمد خاں کے مدرسے کے سلسلے میں محسن اور اس کے دوست طاہر کے درمیان ہوئی۔ افسوس کہ یہ بحث تشنہ رہ گئی ہے۔ قصے کا آخری حصہ بھی بہت حسرت ناک ہے۔

آخر میں ہم جناب مصنف کو دو ایک فروگذاشتوں کی جانب بھی توجہ دلانا چاہتے ہیں:۔

غدر کی ابتدا کے زمانے میں انھوں نے میر عاشق کے بھائی میر ناصر کی مرزا غالب اور استاد ذوق سے ملاقات کرادی (صفحہ ۱۹) حالانکہ استاد ذوق کا غدر سے بہت پہلے انتقال ہو چکا تھا۔

(۲) شبیر کی تعلیم کے سلسلے میں انھوں نے سرسید احمد کے مدرسے کے قیام کا تذکرہ کیا ہے حالانکہ وہ غدر سے بہت دنوں بعد (غالباً ۱۸۷۵ء میں) قائم ہوا ہے۔ اس زمانے میں تو شبیر جوانی کی عمر کو پہنچ چکا ہوگا۔

زبان میں کہیں کہیں بہت تکلف و تصنع پیدا ہو گیا ہے خصوصاً عورتوں کی زبان میں۔ ایک جگہ آپ نے 'نیند نہ بھرنا' 'نیند پوری نہ ہونے' کے مفہوم میں استعمال فرمایا ہے (صفحہ ۱۲)۔ ہمارے لئے یہ محاورہ بالکل نیا ہے شاید دلّی میں بولا جاتا ہو۔ عام طور پر آنکھوں میں نیند بھرنا اس وقت بولا جاتا ہے جب نیند کی وجہ سے پلکیں بھاری ہونے لگیں۔ (محاورہ صحیح ہے۔ اعتراض بے جا ہے۔ مدیر جامعہ)

اسی طرح ایک جگہ میر عاشق فرماتے ہیں "خدا سلطنت کے اس ٹمٹماتے ہی چراغ کو روشن رکھے"

ہی کے بے محل استعمال سے فقرے میں کچھ عجیب بھونڈا پن پیدا ہو گیا ہے۔

ان معمولی فروگذاشتوں کو چھوڑ کر کتاب شروع سے آخر تک مفید و دلچسپ ہے۔

کلیات طغرائی | از جناب حکیم فیروز الدین احمد صاحب طغرائی مرحوم امرتسری۔ تقطیع ۲۰×۲۶/۱۶، حجم ۲۰۰ صفحات کتابت و طباعت بہترین، کاغذ سفید اعلیٰ قسم کا دبیز۔ قیمت ۲؎۔ ملنے کا پتہ: کتب خانہ طغرائی امرت سر۔

یہ حکیم فیروز الدین احمد صاحب طغرائی مرحوم کے کلام کا مجموعہ ہے جسے ان کے انتقال کے بعد ان

کے شاگردوں خصوصاً جناب تبسم ایم۔ اے نے نہایت اہتمام و نفاست سے شائع کیا ہے۔ شروع میں جناب تبسم نے حضرت طغرائی مرحوم کے زندگی کے حالات لکھے ہیں۔ پھر ان کے دوسرے شاگرد عرشی امرتسری نے ان کے اردو اور مسٹر ممتاز حسن ایم۔ اے نے فارسی کلام پر تبصرہ کیا ہے۔ اس کے بعد ان کا اردو کا کلام شروع ہوتا ہے۔ پہلے نیچرل اور اصطلاحی نظمیں ہیں، پھر اسلامی نظمیں اور آخر میں اردو غزلیات۔ اس کے بعد فارسی کلام کی بھی تقریباً یہی ترتیب ہے۔

حضرت طغرائی مرحوم فارسی اور اردو کے قادر الکلام اور پختہ مشق شاعر تھے۔ انھوں نے غزل، قصیدے، رباعی اور مخمس وغیرہ غرض تمام اصناف نظم میں طبع آزمائی فرمائی ہے اور اپنی قادر الکلامی کی وجہ سے ہر ایک میں نہایت کامیابی سے عہدہ برآ ہوئے ہیں۔ انھوں نے جدید طرز کی نظمیں بھی کہی ہیں اور انھیں نظموں میں ان کی طبیعت کا اصلی جوہر نمایاں ہے خصوصاً اسلامی نظمیں ان کے دلی درد اور خلوص کی آئینہ دار ہیں۔ ان کی فارسی شاعری قدیم طرز پر ہے لیکن اس سے بھی ان کی کہنہ مشقی ٹپکتی ہے۔ کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے:۔

تصویر یاس پر انھوں نے ایک نظم لکھی ہے۔ اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

بیان دردِ دل کرتا ہوں میں اشعار موزوں میں — عجب سانچے میں ڈھل ڈھل کر نکلتی ہے فغاں میری
گلستان جہاں میں نغمہ پیرائے مصیبت ہوں — کرے گی ہمسری کیا عندلیب بوستاں میری

عیاں میں آج اپنا سوز پنہاں کرکے چھوڑوں گا — جگر کے آبلوں کو آتش افشاں کرکے چھوڑوں گا
ہنساؤں گا ہر اک بے درد کو میں اپنے رونے پر — ہویدا ارتباط برق و باراں کرکے چھوڑوں گا

جگنو پر:۔

چمک دمک ہے گلستاں میں جا بجا کیسی — لگا رہی ہے چکا چوند یہ ضیا کیسی
یہ سحر ہے کہ فسوں ہے عجب تماشا ہے — کبھی نظر میں اندھیرا کبھی اجالا ہے
یہ دور دور دیے کیسے ٹمٹماتے ہیں — بساط سبزہ پہ تارے سے جگمگاتے ہیں
کچھ آج حد سے زیادہ ہے زیب و زینت و فر — عروس باغ نے افشاں چنی ہے ماتھے پر

ہندو مسلم نزاع بڑی نفرت کی نظر سے دیکھتے تھے چنانچہ ایک موقع پر کہتے ہیں :۔

تم آخر پھول ہو گلشن کے اور گلشن تمہارا ہے
نہیں زیبا بکھر کر وجہ تاراج چمن ہونا

جو لالہ ہے رہے لالہ جو نرگس ہے رہے نرگس
ضروری کچھ نہیں ہے نسترن کو یاسمن ہونا

اس اپنی اپنی رنگت میں ہی تم زیب گلستاں ہو
چمن کا کھلکھلانا ہے تمہارا خندہ زن ہونا

غزلوں کا نمونہ :۔

جتنی کماں خمیدہ ہو، جاتا ہے تیر دور
جھکنا غضب ہے اس نگہ شرمسار کا

عجب مری ہوس سجدہ سے ہے ضد ان کو
کہ اپنے نقش قدم کو مٹا مٹا کے چلے

زمانہ کی آنکھیں بدل جائیں گی
ذرا رحم! آنکھیں بدلتے ہوئے

فارسی کلام بہت کم دستیاب ہو سکا ہے لیکن جو کچھ ہے خوب ہے۔ قلت گنجائش کے سبب ہم نمونے کے لئے صرف چند اشعار نقل کریں گے :۔

کشیدم در تمنایش من از سر آرزو دستے
چہ خوش اے ناصح ناداں کہ بردارم از و دستے

چناں فلک بسرم راند لشکر اندوہ
کہ پائمال شدم چوں زمین راہ گذر

لطمہائے موج را آماجگاہم روز و شب
گرچہ از دریا چو ساحل برکنار افتادہ ام

کیفیت ہائے برشگال مپرس
بادہا از سحاب می ریزد

جنت از سر حد کمال گزشت
از نبابت شباب می ریزد

آخر میں ہم یہ ضرور عرض کریں گے کہ اردو غزلوں کے انتخاب میں ذرا اور احتیاط سے کام لیا جاتا تو بہتر ہوتا۔

کتاب کے شروع میں حضرت طغرائی کا فوٹو بھی دیا گیا ہے۔

ارکانِ اسلام | یا دینیات کی چوتھی کتاب، تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶، حجم ۴۴ صفحات۔ کتابت اعلیٰ، طباعت اور کاغذ متوسط۔ قیمت ۲؍۔ ملنے کا پتہ، مکتبہ جامعہ قرول باغ، دہلی۔

کارکنانِ جامعہ بچوں کے لئے دینیات کی کتابوں کا ایک سلسلہ لکھ رہے ہیں۔ یہ کتاب اس سلسلے کی چوتھی کڑی[1] ہے اور اس میں اسلام کے ارکان خمسہ روزہ، نماز، حج، زکوٰۃ وغیرہ کی نہایت سہل اور آسان زبان میں تشریح کی گئی ہے۔ اس موضوع پر بچوں کے لئے جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں یہ ان سب میں ممتاز ہے۔

نیا میلاد نامہ | از جناب سید اشفاق حسین صاحب ایم۔ اے ہیڈ ماسٹر گوڑیائی ضلع رہتک، تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۴۰ صفحات۔ کتابت و طباعت اور کاغذ معمولی۔ غالباً جناب مؤلف کے پتے پر ڈاک کے ٹکٹ بھیجنے پر مفت ملتا ہے۔

جناب اشفاق حسین صاحب نے یہ رسالہ میلاد النبی (۱۲ ربیع الاول ۱۳۵۵ھ) کی تقریب میں پیش کیا تھا۔ اس میں شروع میں محفل میلاد کے مقصد، غرض و غایت اور محفل میلاد کے ادب پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ پھر صاف و سلیس زبان میں آں حضرت کے پیدائش سے ہجرت تک کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔ بیچ بیچ میں نعتیہ نظمیں بھی ہیں۔ محفل میلاد میں بجائے ادھر اُدھر کی غیر مستند کتابیں پڑھنے کے یہ رسالہ زیادہ مناسب اور مفید ہوگا۔

---

[1] اس سلسلے کا پہلا اور دوسرا حصہ ابھی زیر ترتیب ہے۔ تیسرا حصہ اسلامی عقائد اور چوتھا ارکان اسلام کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

رسائل

اصلاح ۔ نکات زکوٰۃ

اصلاح (ماہوار) | اڈیٹر جناب مولوی مطلوب الرحمٰن صاحب نگرامی ندوی تقطیع ۲۰×۲۶/۸، ضخامت ۴۸ صفحات، کتابت و طباعت اور کاغذ متوسط قیمت سالانہ تین روپیہ مقام اشاعت بادشاہ باغ، لکھنؤ۔

یہ ایک دینی تبلیغی اصلاحی ماہوار رسالہ ہے جو مولانا سید سلیمان ندوی اور جناب مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کی زیر نگرانی نکلنا شروع ہوا ہے۔ ایک ہونہار ندوی مولوی مطلوب الرحمٰن صاحب نگرامی اس کے اڈیٹر ہیں۔

زیر نظر نمبر اس کا پہلا نمبر ہے۔ اس میں علاوہ شذرات کے کل چھ مضامین ہیں۔ پہلا مضمون ارادۂ اصلاح کے عنوان سے جناب مولانا عبدالماجد نے لکھا ہے اور بہت خوب لکھا ہے۔ دوسرا مضمون مولوی شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی نے انکار حدیث پر لکھا ہے۔ یہ مضمون رسالہ معارف میں بھی باقساط شائع ہو چکا ہے۔ تیسرا مضمون "اسلام میں عبد اور معبود کا رشتہ" خود جناب اڈیٹر صاحب کا ہے۔ پھر "حدیث دلکش" ایک دلکش مضمون جناب احسن نگرامی نے ارقام فرمایا ہے۔ اس کے بعد منقولات اور قبول اسلام کی خبریں ہیں۔ غرض رسالے میں جتنے مضامین ہیں سب مقصد تبلیغ و اصلاح کے حامل ہیں۔ اور متانت سے لکھے گئے ہیں۔ آج کل مسلمانوں میں جیسی کچھ مذہبی اور معاشرتی خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں نیز چند مغرب زدہ نیم تعلیم یافتہ اور برخود غلط حضرات نے مذہب خصوصاً اسلام کے خلاف جو جاہلانہ حملے شروع کر دیے ہیں وہ ایک مستقل فتنہ ہیں جن کے سدباب کی ابھی سے ضرورت ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ایک ندوی نوجوان نے اس ضرورت کو محسوس کیا۔ ہم انھیں اس مبارک اقدام پر مبارکباد دیتے ہیں اور ہمیں توقع ہے کہ حضرت مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالماجد دریابادی کی نگرانی میں رسالہ دن دونی ترقی کرے گا۔

نکات زکوٰۃ | از مولانا احمد ایم۔ اے صدر ریاض توحید دہلی۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶، حجم ۳۲ صفحات، کاغذ

کتابت و طباعت معمولی۔

نواب گنج دہلی میں ریاض توحید کے نام سے ایک انجمن قائم ہوئی ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ احیائے سنت کے لئے نہایت خاموشی سے کام کیا جائے۔ اس کے لئے انجمن کا موجودہ پروگرام یہ ہے کہ ایسے چھوٹے چھوٹے اور مختصر رسالے شائع کر کے عام مسلمانوں میں مفت تقسیم کئے جائیں جن میں اسلامی مسائل کو صحیح روشنی میں پیش کیا جائے۔ اس سے پہلے دو رسالے شائع ہو چکے ہیں۔ یہ تیسرا رسالہ ہے جس میں زکوٰۃ کے متعلق تمام مسائل آسان زبان میں جمع کر دئے گئے ہیں۔ اس رسالے کی یا اس انجمن کے دوسرے رسالوں کی قیمت کچھ نہیں رکھی گئی ہے بلکہ جو صاحب بیرنگ منگوانا چاہیں انھیں بیرنگ بھیج دئے جاتے ہیں ورنہ ڈاک کے ٹکٹ بھیجنے پڑتے ہیں۔

دنیا کی رفتار

ہندوستان

جاپان اور ہندوستان | جاپان نے ہندوستان کے بازاروں میں اپنا سستا مال بھیج بھیج کر ہندوستانی اور انگریزی صنعت کو جو نقصان پہنچایا ہے اس کے تدارک کی تدبیریں ہو رہی ہیں۔ جاپانی کپڑے پر محاصل درآمد بہت بڑھا دئے گئے ہیں لیکن اُدھر جاپان نے بھی ہندوستانی روئی کی خریداری بند کر دی ہے۔ اس معاشی لڑائی کو سمجھوتے سے طے کرنے کی فکر بھی کی جا رہی ہے۔ لندن میں، جہاں ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ ہوا کرتا ہے، جاپانی اور انگریز نمائندوں میں بات چیت ہو رہی ہے اور خیال ہے کہ عنقریب حکومت ہند سے بھی براہ راست جاپان گفتگو شروع کرے گا۔

ذیل کے اعداد سے ہندوستان اور جاپان کے معاشی تعلقات کی اہمیت کا اندازہ ہو سکے گا۔

ہندوستان سے جو مال باہر جاتا ہے اس میں سے ۱۹۳۱-۳۲ء میں کوئی ۹ فی صدی جاپان نے خریدا تھا۔ اس سال میں جاپان نے ۱۱ کروڑ روپیہ کی تو روئی ہندوستان سے خریدی تھی یعنی ہندوستان سے جتنی روئی باہر گئی اس میں تقریباً آدھی کی کھپت جاپان میں ہوئی۔ پھر ہندوستان کا خام لوہا کوئی ۶۶ لاکھ کا جاپان نے خریدا یعنی کل برآمد کا نصف۔ جاپان میں جتنا رنگا ہوا چمڑا باہر سے آتا ہے اس میں ۸۰ فیصدی ہندوستان کا ہوتا ہے۔ تلہن کی جاپانی درآمد میں البتہ ہندوستان کا حصہ بہت ہی کم ہے۔ جاپان کوئی ڈیڑھ کروڑ ین قیمت کا تلہن ہر سال خریدتا ہے جس میں سے ہندوستان سے ۱۰ لاکھ ین سے بھی کم کا مال جاتا ہے۔ ان سب چیزوں کی کھپت ابھی جاپان میں بہت کچھ ہو سکتی ہے۔

دوسری طرف جاپانی مال کے لئے ہندوستان کی منڈی بہت اہم ہے۔ ذیل میں جاپانی کپڑے کی درآمد کے اعداد درج کئے جاتے ہیں:-

سنہ	درآمد چین میں (مربع گز)	درآمد ہندوستان میں (مربع گز)
۱۹۳۰	۵۵۲ ملین	۳۷۴ ملین
۱۹۳۱	۳۳۴ "	۳۶۰ "
۱۹۳۲	۲۸۹ "	۵۹۲ "

ہندی۔ جاپانی تجارت کے سلسلے میں ایک بات اور پیش نظر رکھنی چاہیئے اور وہ یہ کہ پچھلے کئی سال سے جاپان برابر ہندوستانی مال کی خریداری کم کر رہا ہے اور اپنا صنعتی مال زیادہ بھیج رہا ہے جیسا کہ ذیل کے اعداد سے واضح ہوگا۔

	سنہ ۳۰ء	سنہ ۳۱ء	سنہ ۳۲ء
جاپان کی برآمد ہندوستان کو	۱۲۹ ملین ین	۱۰۰ ملین ین	۱۹۲ ملین ین
جاپان میں درآمد ہندوستان سے	۱۸۰ "	۱۳۳ "	۱۱۷ "

اگر جاپان اور ہندوستان میں کوئی تجارتی معاہدہ ہو تو درآمد و برآمد میں کسی مقررہ نسبت کی ضمانت ہونی ضروری ہے ورنہ جاپان ہمارا مال نہ لے گا اور اپنی سستی مصنوعات سے ہماری نئی صنعتوں کو ختم کر دے گا۔

انتقال عدن | حکومت ہند کے محکمۂ سیاسیات نے حال میں ایک مراسلہ شائع کیا ہے اور اس میں وہ دلائل پیش کئے ہیں جن کی وجہ سے حکومت برطانیہ کے نزدیک عدن کا نظم و نسق حکومت ہند سے لے کر برطانوی محکمۂ نوآبادیات کے سپرد کر دینا چاہیئے۔ ہمارے محکمۂ سیاسیات نے اس کے ساتھ حکومت ہند کی رائے شائع نہیں کی جس سے معلوم ہوتا کہ اس معاملے میں ہماری حکومت برطانوی خیال کی موافقت کرے گی یا مخالفت غالباً اس کی ضرورت اس لئے نہیں سمجھی گئی کہ اپنے اوپر رائے کی ذمہ داری لئے بغیر معاملے کو مجلس قانون ساز کے آیندہ اجلاس میں پیش کر دیا جائے گا کہ یہ مجلس ہی ہندوستانی 'رائے عامہ' کی 'ترجمان' ہے۔ اس مجلس کے بہت سے بااثر رکن ملک کے آئندہ دستور اساسی کی ترتیب میں مصروف ہیں غالباً وہ لندن سے واپس نہ ہو سکیں گے اور یہ مجلس آسانی سے فیصلہ کر دے گی کہ عدن محکمۂ نوآبادیات

کے سپرد کردیا جائے، پھر کسی کو یہ کہنے کی مجال نہ ہوگی کہ ہندوستان کی رائے عامہ کے خلاف ایسا کیا گیا۔

عدن پر انگریزی قبضہ ۱۸۳۹ء میں ہوا۔ ۱۸۳۷ء میں ایک انگریزی جہاز عدن کے قریب تباہ ہوگیا تھا۔ اس کے ملاحوں اور مسافروں کے ساتھ بندرگاہ کے باشندوں نے کچھ بدسلوکی کی۔ اس پر حکومت بمبئی نے سلطان لحج سے جو حکمراں تھا جواب طلب کیا۔ سلطان نے تلافی مافات کا وعدہ کیا اور ساتھ ہی یہ پیام بھیجا کہ اگر تم عدن خریدنا چاہتے ہو تو میں بیچتا ہوں۔ لیکن جب ایک انگریز افسر بیعنامے کی تکمیل کے لئے وہاں پہنچا تو سلطان کے بیٹے نے بیچنے سے انکار کردیا۔ اس 'گستاخی' کی سزا میں ایک بری و بحری مہم عدن بھیجی گئی اور عدن کو بتاریخ ۱۶ جنوری ۱۸۳۹ء برطانوی ہند سے ملحق کردیا گیا! اس الحاق کی وجہ سے ہندوستانی تاجروں نے عدن میں قدم جمائے۔ آج ان کے ہاتھ میں عدن کی بہت کچھ املاک ہے' نمک سازی میں ان کا خاصا دخل ہے اور انھوں نے ہر طرح عدن کی ترقی میں مدد دی ہے۔ برطانوی محکمۂ نوآبادیات کے ماتحت علاقوں میں معمولاً جو سلوک ہندوستانیوں کے ساتھ ہوتا ہے وہ ایسا نہیں ہے کہ ہندوستانی آسانی سے وہاں جاکر بسیں۔ اگر ہندوستانی تاجروں کو یہ گمان ہوتا کہ عدن بھی سو سال بعد محکمۂ نوآبادیات کے ماتحت آجائے گا تو شاید وہ عدن کی تجارت میں اتنا حصہ نہ لیتے۔ زیادہ تر ان ہندوستانی تاجروں کا اثر ہے کہ عدن کی تجارت نے اتنا فروغ پایا۔ ۱۸۳۹ء میں عدن کی آبادی ایک ہزار سے بھی کم تھی۔ آج ۴۵ ہزار سے اوپر ہے۔ مالگذاری ۴۰ لاکھ روپیہ سے اوپر ہے۔ سال میں کوئی ۱۴۰۰ جہاز یہاں سے گذرتے ہیں۔

انتقال عدن کی یہ تجویز کوئی بارہ تیرہ برس پرانی ہے۔ ابتدا اس کی یوں ہوئی کہ عدن کی مجلس تجارت نے سنہ ۲۰ء میں ایک قرارداد منظور کی کہ عدن محکمۂ نوآبادیات کو منتقل کردیا جائے۔ اس مجلس کے رکن عرب اور ہندوستانی تاجر بھی ہیں۔ لیکن یہ تجویز بلا اطلاع صرف یورپی تاجروں نے منظور کرکے شائع کردی۔ اس پر کوئی ساڑھے تین سو عرب اور ہندی تاجروں کے دستخط سے ایک اعلان شائع ہوا کہ ہم اس انتقال کے سخت مخالف ہیں۔ اور وائسرائے ہند سے درخواست کی کہ وہ اس معاملے میں ہندوستانیوں کی مدد فرمائیں۔ اس درخواست کی تائید ہندوستان کی رائے عامہ نے بھی زور کے ساتھ کی۔ معاملہ بظاہر رفع

وضع ہوگیا مگر مارچ ۲۷ء میں کمانڈرانچیف نے مجلس قانون ساز میں اعلان کیا کہ یکم اپریل سے عدن کے فوجی اور سیاسی معاملات برطانوی حکومت نے اپنے ذمہ لینے کا فیصلہ کیا ہے۔ لیکن چونکہ عدن میں زیادہ تر ہندوستانی رعایا آباد ہے اس لئے بلدیۂ عدن حکومت ہند کے ماتحت رہے گی۔ اس فیصلے کے اعلان سے پہلے مجلس قانون ساز کو رائے دینے کا موقع بھی نہیں دیا گیا۔

نومبر ۳۱ء میں یہ انتظام بھی حکومت بمبئی سے حکومت ہند کو منتقل کردیا گیا اور اب تجویز یہ ہے کہ یہ بھی محکمۂ نوآبادیات کے سپرد کردیا جائے۔

تجارتی اہمیت کے علاوہ عدن ایک بحری اہمیت بھی رکھتا ہے۔ شاید آنے والی وفاقی حکومت ہند پر اس اہم بحری ذمہ داری کا بوجھ ڈالنا قرین مصلحت نہیں سمجھا گیا ہے۔

ممالکِ غیر

معاشی کانفرنس | معاشی زندگی میں مدوجزر تو ہمیشہ ہی ہوتا رہا ہے لیکن سرمایہ داری کے رواج سے پہلے اس کی وجہ اتفاقی حوادث ہوا کرتے تھے مثلاً وباؤں سے آبادی کا کم ہوجانا، قحط یا جنگ سے معاشی زندگی کا شیرازہ بکھر جانا وغیرہ۔ لیکن سرمایہ داری نظام کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کاروبار کا یہ اتار چڑھاؤ اس کا خاصہ ہے اور کم و بیش ایک سی مدت میں مرفہ الحالی سے لے کر کساد بازاری تک مراحل طے کرتا رہتا ہے۔

آج کل دنیا کی معاشی زندگی جس تکلیف دہ دور سے گذر رہی اور جس کی وجہ سے بے شمار انسان بے روزگار پڑے سڑ رہے ہیں اس سرمایہ داری کی اس مخصوص صفت کا اثر بھی ہے اور کچھ ایسے حوادث و واقعات کا بھی جو اس نظام سے خاص طور پر متعلق نہیں ہیں، اسی وجہ سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ جس طرح سرمایہ داری نظام میں کساد بازاری کا زمانہ خود بخود گذر جاتا ہے اور اس کے بعد مرفہ الحالی کا دور آتا ہے اس طرح اس مرتبہ بھی اس مصیبت کا خاتمہ خود بخود ہوجائے گا۔ چنانچہ ساٹھ سے اوپر ممالک کے نمائندے

اس مصیبت سے چھٹکارے کی تدابیر پر غور کرنے کے لئے لندن میں جمع ہیں اور اس اجتماع کی قراردادوں پر ساری دنیا کی نظریں لگی ہوئی ہیں۔ اس کانفرنس کی کارروائی کو قابل فہم بنانے کے لئے ہم ذیل میں ان وجوہ و اسباب کا اجمالی ذکر کرتے ہیں جنھوں نے موجودہ کساد بازاری پیدا کی ہے کہ انھیں کو رفع کرکے اس کا خاتمہ ممکن ہے۔

اس کی ایک بڑی وجہ تو یہ ہے کہ جنگ کے بعد دنیا میں دولت پیدا بہت ہوئی اور اس کو استعمال کرنے والے کم ہو گئے! دولت آفرینی بڑھنے کی دو خاص وجوہ ہیں۔ ایک تو صناعت و زراعت میں عقلی طریق کار کا رواج عام ہوا تاکہ زیادہ سے زیادہ اور سستا سے سستا پیدا کرکے دنیا کے باشندوں کیلئے پھر وہ چیزیں فراہم کی جائیں جن کے لئے وہ جنگ کے زمانے میں ترس ترس گئے تھے۔ جو کارخانے توپیں اور بندوقیں بناتے تھے انھوں نے صنعت کے لئے ملیں اور زراعت کے لئے ٹریکٹر بنا بنا کر معاشی زندگی کے طریق کار میں (خصوصاً زراعت میں) ایک انقلاب سا پیدا کر دیا اور دنیا میں اکثر چیزوں کے ذخائر میں بہت اضافہ ہو گیا۔

دولت آفرینی میں اضافے کی دوسری وجہ یہ ہوئی کہ جنگ کے بعد ہر ملک نے کافی بالذات ہونے کی کوشش کی۔ ہر ایک نے اپنی اپنی صنعت اور اپنی اپنی زراعت کو ترقی دینے اور دوسرے ممالک کی مدد سے بالکل مستغنی ہو جانے کی ٹھانی۔ جو چیزیں آسانی سے ملک میں پیدا نہ بھی ہو سکتی ہوں ان کے پیدا کرنے کی بھی کوشش شروع ہوئی۔

عام بات ہے کہ اگر بازار میں چیزوں کی رسد بڑھ جائے اور گاہک اتنے ہی رہیں اور ان کی مانگ بھی نہ بڑھے تو قیمتیں گر جاتی ہیں۔ اور اگر گاہک بھی کم ہو جائیں یا ان کی مانگ گھٹ جائے تو قیمت میں بہت زیادہ کمی ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اس مرتبہ یہی ہوا۔ ادھر دولت آفرینی بڑھنے سے رسد بڑھی۔ ادھر ایک تو شدید احساس قومیت نے ہر ملک میں "سودیشی" مال کو ترجیح دینے کی تحریک پیدا کی، دوسرے حکومتوں نے دیسی صنعتوں کی تامین کے لئے محاصل درآمد بڑھا کر بین الاقوامی تجارت میں رکاوٹیں ڈالیں، دوسرے جنگ میں ہارے ہوئے ممالک تاوان جنگ کے بار سے دبے ہوئے، قرض مانگیں تو قرض نہ ملے،

بین الاقوامی منڈی میں خریداری سے قاصر ہوگئے! چوتھے مشرقی ممالک خصوصاً چین کے لوگوں کی قوت خرید چاندی کی قیمت گھٹ جانے سے بہت کم ہوگئی۔ غرض متعدد اسباب نے رسد کی افزونی کے ساتھ طلب کو گھٹایا اور اس طرح قیمتوں کو بہت گرا دیا۔

کساد بازاری کی دوسری اہم وجہ یہ ہے کہ دنیا میں زر رائج کی مقدار کم ہوگئی۔ یہ بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ اگر کسی ملک میں روپے کی مقدار بہت بڑھا دی جائے اور بازار میں چیزیں اتنی ہی رہیں جتنی پہلے تھیں تو چیزوں کی قیمت بڑھ جائے گی۔ اس کے برعکس اگر چیزیں اتنی ہی رہیں بلکہ بڑھ جائیں اور روپیہ کم ہو جائے، تو قیمتیں گھٹیں گی اور یہی ہوا۔ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ جنگ کے بعد دنیا میں دولت آفرینی یکایک بڑھی لیکن دنیا کے سونے کی بڑی مقدار صرف دو ملکوں یعنی امریکہ اور فرانس کے تصرف میں آگئی۔ اس زمانے میں دنیا کے اکثر ممالک نے سونے کو اپنے زر رائج کا معیار بنا لیا۔ لہذا سونے کی مقدار کم ہونے کی وجہ سے یہ اپنے یہاں زر رائج کی مقدار نہ بڑھا سکے۔ یعنی چیزیں زیادہ ہوئیں، زر کم، لازم تھا کہ قیمتیں گھٹیں۔

موجودہ معاشی انتشار کی تیسری اہم وجہ یہ ہے کہ جنگ میں دنیا کی جو دولت دھواں بن بن کر اڑی اس کا بوجھ موجودہ نسل پر قرضۂ جنگ کی شکل میں ہے اور دولت آفریں طبقہ جو مذکورہ بالا وجوہ سے اپنے مال کی قیمت یوں بھی حاصل نہیں کر پاتا ان قرضوں کا سود ادا کرنے کے لئے ٹیکس دیتے دیتے مرا جاتا ہے اور جب اشیاء کی قیمت گھٹتی جاتی ہے ان ٹیکسوں کی وجہ سے لاگت بڑھ رہی ہے اور کاروبار کو ناممکن بنائے دیتی ہے۔

چنانچہ معاشی کانفرنس کے سامنے سب سے اہم مسائل یہ ہیں کہ (۱) قیمتیں کس طرح بڑھائی جائیں کہ کاروبار ذرا پنپنے اور معیشت کے تن مردہ میں جان پڑے (۲) اس غرض کے لئے ملکوں نے جو دیواریں محاصل کی اپنے چاروں طرف اٹھا رکھی ہیں وہ کس طرح مسمار کی جائیں کہ بین الاقوامی تجارت کا سلسلہ ذرا چل نکلے (۳) دنیا میں زر رائج کی مقدار کس طرح بڑھائی جائے اور مختلف ملکوں کے زر میں شرح مبادلہ کس طرح مقرر ہو کہ روز کے اتار چڑھاؤ سے تجارتی کاروبار میں انتشار اور عدم تیقن کم ہو۔ (۴) جنگی

قرضوں کا خاتمہ کرکے معاشی زندگی کی گردن میں جو یہ سنگ گراں لٹک رہا ہے اسے کس طرح ہٹایا جائے۔

اگر سرمایہ داری نظام کی زندگی کے کچھ دن باقی ہیں تو یہ کانفرنس ان مسائل کا حل نکالنے میں کامیاب ہو جائے گی۔ غالباً جنگی قرضے کالعدم کردئے جائیں گے؛ سونے کے ساتھ ساتھ چاندی سے کم سے کم محدود طریقے پر معیار زر کا کام لیا جانے لگے گا اور اس کی قیمت بڑھے گی۔ اس کی وجہ سے زر و اعتبار میں اضافہ ممکن ہوگا اور قیمتیں چڑھیں گی۔ محاصل درآمد کا آہنی نظام یک قلم تو مسترد نہ ہو سکے گا لیکن شرح محاصل میں بہت کچھ کمی ہو جائے گی۔

لیکن اگر قوم پرستی اور خود غرضی کی فتح ہوئی اور کانفرنس میں یہ مسائل طے نہ ہو پائے تو ایک معاشی جنگ ہوگی جس میں ہر ملک دوسرے کا دشمن ہوگا، محاصل کی دیواریں اور اونچی کی جائیں گی، ہر ملک کاغذی زر چھاپ چھاپ کر اپنے زر رائج کی قیمت گھٹائے گا یعنی ملک کے اندر اشیا کی قیمت بڑھے گی اور پردیسیوں کے لئے شرح مبادلہ کے موافق ہونے کی وجہ سے مال کی خریداری میں فائدہ ہوگا۔ لیکن سب ملک جب یہی کریں گے تو ان کا باہمی مقابلہ سارے نظام معاشی کو درہم برہم کردے گا۔ اور چونکہ اس وقت دنیا کے سامنے معاشی زندگی کا ایک دوسرا نظام یعنی اشتراکی نظام کم سے کم تجربے کے طور پر آ چکا ہے اس لئے یہ ناکامی ممکن ہے کہ عالمگیر انقلاب کا پیش خیمہ بن جائے۔ یہی خطرہ شاید اس معاشی کانفرنس کو کامیاب کردے۔

روس اور سرمایہ دار ممالک ادھر لندن میں دنیا کے سرمایہ دار ممالک اپنے نظام معاشی کی گتھیوں کو سلجھانے میں مصروف ہیں، ادھر روس جس نے اشتراکی معیشت کا عظیم الشان تجربہ شروع کر رکھا ہے کساد بازاری اور قیمتوں کے اتار چڑھاؤ کے پھیرے سے تو بالکل مستغنی ہے لیکن خود اپنے تجربے کی مشکلات سے دوچار ہے۔ سرمایہ داری اور اشتراکی معاشی نظاموں کی مشکلات کی نوعیت ہرچند کہ بالکل مختلف ہے لیکن ہیں دونوں اس وقت سخت مصیبت میں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ لندن کی معاشی کانفرنس میں ان سطروں کے لکھتے وقت تک سرمایہ دار ملکوں میں سمجھوتے کے بہت کم آثار ہیں لیکن یہ خبر آ چکی ہے کہ روس اور برطانیہ میں تجارتی معاہدہ عنقریب ہونے والا ہے اور شاید یہ خبر بھی جلد سننے میں آئے کہ روس کی موجودہ حکومت کو بڑی لیت و لعل کے بعد امریکہ نے بالآخر

تسلیم کر ہی لیا!

انگلستان اور روس میں تجارتی مناہمت کی خبر اس لیے اور تعجب خیز ہے کہ ابھی حال میں وہاں ایک انگریزی کمپنی کے ۶ ذمہ دار ملازمین پر جو مقدمہ چلا تھا اور اس پر انگلستان میں جس غیض و غضب کا اظہار کیا گیا تھا اسے لوگ ابھی مشکل سے بھولے ہوں گے۔ ناظرین کو یہ بھی یاد ہوگا کہ موجودہ انگریزی حکومت روس سے تجارتی معاہدے کو اٹاوا کے معاہدے کے منافی بھی قرار دے چکی ہے اور اسی وجہ سے جب روسی۔ برطانی تجارتی معاہدہ ۱۶ اپریل کو ختم ہوا تو بظاہر اس کی تجدید کی کوئی امید نہ تھی۔

روس انگریزوں کی اس بے رخی پر تو ناخوش تھا ہی، اسے یہ شبہ بھی تھا جس کا اظہار روسی اخبارات میں بلا تکلف ہوتا رہا ہے کہ انگریز جاپانیوں کو اکسا اکسا کر مشرقِ بعید میں روسی اثر کو کم کرانے کی تدبیریں کر رہے ہیں۔

ادھر انگریزوں کو وہی پرانی شکایات ہیں کہ روس ہمارے مقبوضات میں، خصوصاً ہندوستان میں اپنا تبلیغی کام نہیں روکتا۔ دوسرے یہ کہ انقلاب سے پہلے روس پر جو قرضہ تھا اسے تسلیم نہیں کرتا، اور جو املاک انقلاب کے زمانے میں اور انقلاب کے بعد تلف ہوئی اس کا معاوضہ نہیں دیتا۔ ان شکایتوں کے علاوہ ایک اور قضیہ لینا کی سونے کی کان کا بھی ہے کہ ایک برطانوی شرکت تجارتی کو اس کان کا ٹھیکہ دیا گیا تھا، پھر آپ ہی آپ روسی حکومت نے اس معاہدے کو منسوخ کر دیا۔ ہرجانے کا تصفیہ ثالث پر چھوڑا گیا۔ ثالث نے جب ایک کروڑ تیس لاکھ پونڈ ہرجانہ تجویز کیا تو روسی حکومت نے اس فیصلے کو تسلیم کرنے سے صاف انکار کر دیا اور بہت گفت و شنید کے بعد اپنی طرف سے آٹھ لاکھ پونڈ پیش کیے جسے ظاہر ہے انگریزوں نے قبول نہیں کیا۔

لیکن باوجود ان اختلافات کے دونوں کو ایک دوسرے کی ضرورت ہے۔ انگلستان اس کساد بازاری کے عالم میں اپنے ہاتھ سے اتنی بڑی منڈی کس طرح جانے دے اور روس جو جلد سے جلد اپنے ملک میں بڑے صنعتی کارخانوں سے دولت آفرینی کے رائج طریقے کو یکسر بدلنے کے درپے ہے انگلستان کی بنی ہوئی کلوں سے اپنے کو کیسے مستغنی بنا سکتا ہے؟ اور باوجود عقیدۂ معاشی کے بنیادی اختلافات کے اگر ان دونوں میں سمجھوتہ ہو جائے، اور سرمایہ دار ممالک آپس میں لڑتے جھگڑتے رہیں تو کیا عجب ہے۔

انگلستان کی طرح امریکہ بھی اب روس سے سمجھوتہ کرنے کی فکر میں ہے۔ اگرچہ اب تک تو امریکہ کسی

طرح روس کی حکومت کو بھی باضابطہ تسلیم کرنے پر آمادہ نہ تھا۔ پریسیڈنٹ ولسن نے روسی حکومت کو تسلیم کرنے کے لیے تین شرطیں پیش کی تھیں۔ اول یہ کہ روس اپنے تمام سابقہ قرضے کو تسلیم کرے، دوسرے یہ کہ انقلاب میں جو امریکن املاک تلف ہوئی ہے اس کا تاوان ادا کرے، تیسرے یہ کہ امریکہ اور اس کے مقبوضات میں اپنے خیالات کی نشر و تبلیغ سے باز رہے۔ انھیں شرائط کی تکرار پریسیڈنٹ ہارڈنگ نے کی۔ انھیں کو کولج اور ہوورنے دہرایا۔ لیکن روس نے ذرا توجہ نہ کی۔ اب خود بخود امریکہ میں ایک تحریک ہے کہ روس کی حکومت کو تسلیم کر لیا جائے۔ موجودہ صدر نے اپنی انتخاب والی تقریروں میں برابر اس خیال کی تائید کی اور حال میں اکثر کاروباری حلقوں میں اس کی حمایت ہوئی ہے اور سینٹ کے سامنے اس غرض سے ایک تجویز بھی مشہور سینیٹر بورا نے پیش کر دی ہے۔ واقعات کی ستم ظریفی دیکھیے کہ مزدوروں کی اس اشتراکی حکومت کو تسلیم کرنے کے خلاف امریکہ میں جو کچھ کوشش کی جا رہی ہے وہ سب وہاں کی مزدوروں کی جماعت کی طرف سے ہے! نظری عقاید کے مقابلے میں معاشی اغراض کی قوت کا کیسا عجیب مظاہرہ ہے۔

شذرات

شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب آخر جولائی میں حیدر آباد سے واپس تشریف لائے۔ موصوف کے ڈیڑھ مہینے کے قیام میں "ہمدردان جامعہ" کی تحریک کے متعلق بہت کچھ کام ہو گیا۔ حیدر آباد میں "حلقۂ ہمدردان جامعہ" پہلے سے موجود تھا۔ اب اس کے ارکین کی تعداد میں اضافہ ہو گیا ہے اور چندے کی وصولی کا معقول انتظام کر دیا گیا ہے۔ اگست کے آخر میں شیخ الجامعہ صاحب پھر حیدر آباد تشریف لے جائیں گے اس لئے کہ وہاں ابھی بہت کچھ کام باقی ہے۔ حیدر آباد اس زمانے میں ہندوستان کے مسلمانوں کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ تعلیم یافتہ روشن خیال مسلمان جتنی بڑی تعداد میں وہاں موجود ہیں کسی اور شہر میں نہیں۔ اس کے علاوہ جامعہ ملیہ تعلیم کے جن اصولوں کو مدنظر رکھ کر قائم کی گئی ہے اس کے قدردان وہاں کثرت سے ہیں ورنہ بر طانوی ہندوستان میں تو ابھی تک لوگوں کو اسی بات کا سمجھانا دشوار ہے کہ اعلیٰ تعلیم مادری زبان میں ہونا چاہئے اور ہو سکتی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ دہلی کے بعد ہمدردان جامعہ کا سب سے بڑا حلقہ حیدر آباد میں بن جائے گا اور علاوہ سلطنت آصفیہ کی امداد کے جمہور کی طرف سے ہمیں معقول مالی اور اخلاقی مدد حاصل ہو گی۔ جامعہ ملیہ کی روح و رواں ملت اسلامی کی توفیق و تائید ہے۔ اسلامی حکومتوں کی امداد خواہ کتنی ہی گراں قدر کیوں نہ ہو جب تک ان کی رعایا کی مدد اس کے ساتھ شامل نہ ہو ہم اسے ملت کی تائید نہیں سمجھ سکتے اور اس سے مطمئن نہیں ہو سکتے۔

اکثر جامعہ ملیہ کے بہی ہمدردوں کی طرف سے پوچھا جاتا ہے اور کبھی کبھی خود کارکنان جامعہ کے دل میں یہ سوال اٹھا کرتا ہے کہ کیا ملک کی عملی سیاست سے الگ ہو کر ہمارے ادارے نے اپنے فرائض کو ترک کر دیا ہے؟ اس میں تو کسی کو بھی شبہ نہیں کہ جامعہ ملیہ کا اصل مقصد یہ ہے کہ غور و فکر، مشاہدے اور تجربے کے بعد مسلمانوں کی قومی تعلیم کا ایک نظام ترتیب دے اور جہاں تک ممکن ہو اسے عمل میں لا کر ایک نمونہ قائم کر دے جس کی تقلید میں حسب ضرورت اور تعلیم گاہیں کھولی جا سکیں اور سارے ملک میں مسلمانوں

کی تعلیم قومی اور ملی مصالح کے مطابق ہونے لگے۔ اگر ایک چھوٹی سی جماعت اتنا بڑا کام اپنے ذمے لے تو اسے اس میں پورا وقت، پوری توجہ، پوری قوت صرف کرنا پڑے گی تب کہیں مدتوں میں کچھ نتیجہ نکلے گا۔ اسی طرح ہندوستان کی موجودہ سیاست خصوصاً سیاسی آزادی کی تحریک اتنی عظیم الشان چیز ہے کہ اپنے پرستاروں سے فرصت کی چند گھڑیاں نہیں بلکہ زندگی کی کل مدت اپنی خدمت کے لئے طلب کرتی ہے۔ یہ محض ناممکن ہے کہ ایک جماعت ان دونوں کاموں کا بوجھ اٹھا سکے۔

... ...

جامعہ ملیہ کے کارکنوں کی تعداد تیس سے زیادہ نہیں۔ ان تیس آدمیوں کے ذمے جتنے کام ہیں ان کی تفصیل ہم ذیل میں درج کرتے ہیں اور اس کے ساتھ یہ بھی کہ دوسری تعلیم گاہوں میں ان میں سے ہر ایک کام کے لئے کتنے اشخاص کی ضرورت ہوتی ہے۔

کام	
کنڈرگارٹن کی تعلیم مکتب کے دو درجوں میں	اس کام کے لئے کم از کم ۲ اشخاص کی ضرورت ہے
پرائمری اسکول کے چھ درجوں کی تعلیم	" " " ۱۰ " " "
ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کے چھ درجوں کی تعلیم	" " " ۱۲ " " "
کالج کی معمولی اور امتیازی ڈگری کی تعلیم	" " " ۱۲ " " "
درجہ ہائے خاص کی تعلیم	" " " ۴ " " "
اسکول کے کھیل اور ورزش کی نگرانی	" " " ۱ " " "
کالج کے کھیل اور ورزش کی نگرانی	" " " ۱ " " "
چار اقامت خانوں کی نگرانی (علاوہ ان نگرانوں کے جو اپنا زائد وقت اس کام میں صرف کرتے ہیں)	" " " ۱ " " "
تعلیم بالغان، مدرسہ شبینہ وغیرہ کی نگرانی (علاوہ آنریری مدرسوں کے)	" " " ۱ " " "
دفتر ہمدردان جامعہ کی نگرانی (علاوہ کلرکوں کے)	" " " ۱ " " "

مسجل کا کام (علاوہ کلرکوں کے)	اس کام کے لئے کم از کم ۱ شخص کی ضرورت ہے
صدر محاسب کا کام (" " " ")	" " " ۱ " " "
اسکول اور کالج کے پراکٹر کا کام	" " " ۱ " " "
رسالۂ جامعہ کی ادارت	" " " ۱ " " "
پیام تعلیم کی ادارت	" " " ۱ " " "
اردو اکادمی کی نگرانی	" " " ۱ " " "
مکتبہ جامعہ ملیہ کی نگرانی	" " " ۲ " " "
مطبع جامعہ ملیہ کی نگرانی	" " " ۱ " " "
شیخ الجامعہ کا کام	" " " ۱ " " "
صدر مدرس کا کام	" " " ۱ " " "
سکریٹری مجلس تعلیم ملی کا کام	" " " ۱ " " "

اس طرح جامعہ ملیہ کے کل کاموں کو جو اس وقت ہو رہے ہیں اچھی طرح چلانے کے لئے ۵۰ اشخاص کی ضرورت ہے مگر صرف ۳۰ خدا کے بندوں نے یہ سارا بوجھ اپنے سر پر اٹھالیا ہے یعنی اوسطاً ہر شخص دو آدمیوں کا کام کر رہا ہے۔ جو لوگ جامعہ کے اندرونی حالات سے واقف ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس کے اکثر ارکان پر مالی پریشانیوں وغیرہ کے علاوہ کام کا بار آتنا ہے جس کا برداشت کرنا ہر ایک کا کام نہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ اگر ان معدودے چند لوگوں میں سے دو ایک تھک کر بیمار ہو جاتے ہیں تو ان کا کام بھی باقی کارکنوں پر تقسیم ہو جاتا ہے اور سمند ناز پر ایک اور تازیانے کا کام دیتا ہے۔ گرمیوں میں دو مہینے کی تعطیل ہوتی ہے مگر اس سے بعض تو اپنے کام کی نوعیت کی وجہ سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے اور بعض اس زمانے میں کاسۂ گدائی لے کر چندے کے لئے نکل جاتے ہیں اور موسم کی گرم جوشی کے ساتھ ارباب دول کی سرد مہری کا لطف اٹھاتے ہیں۔

... ...

ان سطروں سے مراد نہ تو فریاد کرنا ہے اور نہ داد چاہنا بلکہ دوسروں کے اور اپنے دل سے اس

شبے کو دور کرنا مقصود ہے کہ جامعہ ملیہ کے لوگ ملک کی سیاسی آزادی کی تحریک میں شرکت کر سکتے ہیں مگر نہیں کرتے۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ جامعہ کے لوگوں کے دل حب وطن اور حریت کے جوش سے معمور ہیں، ان میں سے بعض من چلے قومی خدمت کی راہ میں اپنی موجودہ قربانی کو کافی نہیں سمجھتے بلکہ ذوق درد کے تقاضے سے ان آبلہ پاؤں کو رشک کی نظر سے دیکھتے ہیں جو سیاست کی پرخار راہ میں مستانہ وار قدم بڑھائے چلے جا رہے ہیں، پھر بشری کمزوری کی وجہ سے ان کا دل یوں بھی معلمی کی روکھی پھیکی، خاموش، گمنام زندگی سے اکتا کر لیڈری کو ڈھونڈھتا ہے جس میں حرکت، جوش، ہیجان، عام شہرت، نقد عزت کے چٹخارے موجود ہیں۔ مگر مسلمانوں کی تعلیم کو سیدھی راہ پر لگانے کا کام انھیں اس قدر اہم معلوم ہوتا ہے کہ اسے ایک بار ہاتھ میں لینے کے بعد کسی طرح چھوڑ نہیں سکتے۔ وہ اپنے دل کو یہ کہہ کر تسکین دے لیتے ہیں کہ سیاست اور آزادی کی عملی تحریکوں کا دار و مدار جن چیزوں پر ہے یعنی حب وطن، قومی غیرت، ملی حمیت، خدمت کا جذبہ، جفاکشی کی عادت یہ چیزیں تعلیم ہی کے ذریعے سے پیدا ہوتی ہیں اس لئے جو راہ انھوں نے اختیار کی ہے وہ کتنی ہی دور و دراز ہو لیکن آزادی کی منزل تک پہنچنے کی یقینی راہ ضرور ہے۔

... ...

آج ہر طرف سے یہ شکایت سننے میں آتی ہے کہ مسلمانوں کے مذہبی، سیاسی، معاشرتی غرض ہر قسم کے قومی اداروں کو ایسے کام کرنے والے نہیں ملتے جو باوجود علمی اور عملی قابلیت کے مال و دولت، جاہ و منصب، نام و نمود سے بے نیاز ہو کر قلیل معاوضے پر اپنی زندگی ان کی خدمت کے لئے وقف کر دیں۔ اگر جامعہ ملیہ ایسے نوجوان معقول تعداد میں پیدا کر دے تو یہ اس سے بدرجہا مفید ہے کہ اس کے تیس کارکن اپنے ستاون کاموں کے بوجھ کے علاوہ عملی سیاست کا پشتارہ بھی اپنی پیٹھ پر لاد لیں۔ ہم نے مانا کہ آج سیاسی آزادی کی تحریک کو جانبازوں اور سرفروشوں کی شدید حاجت ہے مگر کم سے کم مسلمانوں کے اندر قومی تعلیم کو بیٹھ مار کر کام کرنے والوں کی اس سے بھی بڑھ کر ضرورت ہے اس لئے ہم اپنے دوستوں کے اور خود اپنے دل کے شبہات اور اعتراضات کے جواب میں غالب کا ایک شعر پڑھ کر اس بحث کو ختم کرتے ہیں:۔

بلا سے گر مژۂ یار تشنۂ خوں ہے　　　رکھوں کچھ اپنی بھی مژگان خوں فشاں کے لئے

آپ کیا کر رہے ہیں

اگر اردو زبان کی ترقی سے آپ کو دلچسپی ہے تو ملاحظہ کیجئے کہ ہر طبقہ کے اہل الرائے خوشخط نستعلیق ٹائپ کے
متعلق کیا مشورہ دیتے ہیں اور آپ بھی ہمارے ہمدست وہم نوا ہو جیے۔

۱ جناب نواب سالار جنگ بہادر، جاگیردار حیدر آباد دکن
مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ آپ کی جاں فشاں کوشش بار آور ہونے والی ہے

۲ جناب نواب سر اکبر حیدری معتمد خاص حضور نظام حیدر آباد دکن
مجھے خوشی ہوگی اگر مسٹر قریشی اور آپ کی کمپنی کی کوششوں کو اس کامیابی حاصل ہو جائے گی

۳ جناب ڈاکٹر راس مسعود صاحب وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
میں اس کو باعث فخر خیال کرتا ہوں کہ آپکے کام میں ہاتھ دوں۔

۴ جناب نواب سر مزمل اللہ خاں صاحب آف بھیکم پور
میں نہایت مسرت کے ساتھ سرپرستوں کے زمرہ میں شامل ہوتا ہوں۔

۵ جناب نواب محمد اسمٰعیل خاں صاحب خزانچی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
میں قریشی صاحب کے اس خیال سے کاملاً متفق ہوں کہ اس کام کے لئے ایک کمپنی بنائی جائے

۶ جناب ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب ایم۔ ایل۔ اے
اردو زبان کی ترقی میں نستعلیق ٹائپ نہ ہونے کی وجہ سے بڑی سخت رکاوٹیں ہیں۔

۷ جناب سید سلیمان ندوی، صدر دار المصنفین اعظم گڈھ
میرے خیال میں آپ کی یہ ایجاد عالم اردو میں انقلاب پیدا کر دے گی۔

۸ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب شیخ الجامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی
اگر کوئی باہمت سوداگر اس کام میں روپیہ لگادے تو یہ اردو زبان کی بڑی خدمت ہوگی۔

۹ آنریبل میاں سر فضل حسین صاحب

"میری خواہش ہے کہ آپ ہر طرح کامیاب ہوں۔"

۱۰۔ شوکت علی فہمی دہلی

"آپ کا ٹائپ اقتصادی حیثیت سے خوشنمائی کے اعتبار سے اور ہر لحاظ سے اردو پریس پر ایک بہت بڑا احسان ہے۔"

۱۱ جناب رشید احمد صدیقی صاحب ایم اے پروفیسر اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

"میں اپیل کرتا ہوں کہ اس مبارک تحریک میں جس کے ذریعہ اردو کی طباعت و اشاعت میں ایک انقلاب ہو جائے گا تمام متعلق اصحاب مسٹر قریشی کی فراخ دلی کے ساتھ امداد کریں۔"

۱۲ جناب ضیاء احمد صاحب ایم اے پروفیسر فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

"مسٹر قریشی کی ایجاد بے حد مفید ہے اور اردو داں پبلک سے ہر قسم کی ہمت افزائی کی مستحق ہے۔"

۱۳۔ جناب ایم۔ ایم شریف صاحب مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

میں بڑے شوق کے ساتھ اس دن کا منتظر ہوں جب اردو کی اکثر مطبوعات ٹائپ میں چھپیں گی

۱۴ جناب پروفیسر فیروز الدین مراد بی اے، ایم ایس سی ایف آر ایس اے ایف پی ایس (لندن)

میں نے خوشخط نستعلیق ٹائپ فاونڈری لمیٹیڈ کا پروسپکٹس بہت غور سے پڑھا ہے۔ اور بہت احتیاط کے ساتھ مسٹر قریشی کے ایجاد کئے ہوئے نستعلیق ٹائپ کے نمونوں کا امتحان کیا ہے اور مجھے پورا اطمینان ہو گیا ہے کہ یہ کمپنی بہت جلد نفع کمانے لگے گی میں بڑی خوشی کے ساتھ اس دن کا منتظر ہوں جب میری مصنفہ کتابیں اس خوشخط نستعلیق ٹائپ میں چھپیں گی۔

۱۵ جناب پروفیسر عبدالستار صدیقی صاحب الہ آباد یونیورسٹی

"آپ کا تجویز کیا ہوا ٹائپ اُن سب نستعلیق ٹائپوں سے جو انیسویں صدی کے آغاز سے اب تک بنائے گئے ہیں۔ بہتر ہے"

۱۶ جناب خدا بخش صاحب ایرانی پروفیسر فارسی الفنسٹن کالج بمبئی۔

"اگر اس ٹائپ میں چھاپی جائیں تو ہماری زردشتی دینی کتابیں بہت وسیع اشاعت حاصل کرینگی

یہ ٹائپ یقیناً فارسی زبان کے ادب میں ایک نئی جان ڈال دے گا"

۱۷ جناب بی لگنگ صاحب منیجر لینوٹائپ کمپنی بمبئی

مسٹر قریشی! آپ کے ایجاد کئے ہوئے ٹائپ کو واقف کار اصحاب حیدرآباد دکن کے

سرکاری نستعلیق ٹائپ سے بہت زیادہ بہتر خیال کرتے ہیں۔

۱۸ جناب حاجی مقتدی خاں صاحب شیروانی منیجر مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ

"سب سے زیادہ شہرت حیدرآباد دکن کے نمونہ نے حاصل کی مگر میں دیکھتا ہوں کہ جو کمال

مسٹر قریشی کے نمونوں سے نمایاں ہوتی ہے وہ دیکھنے میں نہیں آئی۔ گورنمنٹ اور ریاستوں

اور تمام علم دوست افراد اور جماعتوں کو اس کی ہر ممکن ہمت افزائی کرنی چاہیئے"

۱۹ خواجہ حسن نظامی صاحب

مسٹر قریشی کا ٹائپ ہر لحاظ سے کامیاب ہے۔

۲۰ جناب ڈاکٹر ہادی حسن صدر شعبہ فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مجھے اس میں شک نہیں ہے کہ آئندہ تمام فارسی اور اردو کتابیں اور رسالے اس خوشنما ٹائپ

سے چھپا کریں گے میری تمنا ہے کہ یہ کمپنی اتنا سرمایہ جمع کرلے کہ اپنی تجویز کے مطابق ٹائپ کو

بازار میں لا سکے۔

۲۱ جناب محفوظ الحق صاحب علمی مولوی فاضل دہلی

حقیقت یہ ہے کہ آج تک ایسا خوبصورت ٹائپ ایجاد نہیں ہوا۔

خط و کتابت اور ترسیل منی آرڈر کا پتہ

خوشخط نستعلیق ٹائپ فاونڈری لمیٹیڈ قرول باغ دہلی



جامعہ



جامعہ ملیہ کا ماہوار علمی وادبی رسالہ

جلد ۲۱ | بابت ماہ اگست ۱۹۳۳ء | نمبر ۲

مطبع جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

A.H. Faruqi 1927.

بسم اللہ

جامعہ

زیر ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری — ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے پی ایچ ڈی

جلد ۲۱	بابتہ ماہ اگست ۱۹۳۳ عیسوی	نمبر ۲

فہرست مضامین

اخلاقی دیوالے کے آثار

(۱)

میرے کرم فرما مجھے برابر ہندوستانی اخباروں کے تراشے[۵۱] بھیجتے رہتے ہیں جن میں منع حمل[۵۲] کی تدبیروں سے انضباط ولادت[۵۳] کی حمایت کی جاتی ہے۔ میں نوجوانوں سے ان کے خانگی معاملات کے متعلق خط و کتابت کر رہا ہوں اور اس کا دائرہ بڑھتا جاتا ہے۔ مجھے خط لکھنے والوں نے بے شمار مسئلے چھیڑ رکھے ہیں ان میں سے صرف چند ہی باتوں سے بحث کرنے کی ان صفحات میں گنجائش ہے۔ امریکی دوست مجھے اس موضوع کے متعلق کتابیں اور مضامین بھیج رہے ہیں اور ان میں سے بعض تو مجھ سے اس بات پر خفا بھی ہو گئے ہیں کہ میں نے منع حمل کی تدبیروں سے کام لینے کی مخالفت کی۔ وہ افسوس کا اظہار کرتے ہیں کہ بعض باتوں میں ترقی پسند رفارمر ہونے کے باوجود میں انضباط ولادت کے معاملے میں دقیانوسی خیالات رکھتا ہوں۔

اس سے مجھے یہ خیال ہوا کہ ان تدبیروں کے حق میں ضرور کوئی قطعی اور حتمی دلیل ہوگی اور میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ میں نے اس موضوع کے متعلق اب تک جو کچھ کہا ہے اس سے زیادہ کہنے کی ضرورت ہے۔ اس فکر میں تھا کہ جو کتابیں اس موضوع پر لکھی گئی ہیں انھیں پڑھوں کہ کسی شخص نے مجھے ایک کتاب "اخلاقی دیوالے کے آثار" لا کر دی۔ اس کتاب میں اسی مضمون کی بحث ہے اور میرے خیال میں بالکل علمی طریقے سے اس پر نظر ڈالی گئی ہے۔ اصل میں یہ کتاب موسیو پال بورو نے فرانسیسی زبان میں لکھی ہے اور اس کا نام

---

۵۱ Cuttings اخبار کے وہ حصے جن میں کوئی خاص یا عجیب مضامین یا خبریں ہوں اور وہ تراش کر الگ کر لئے جائیں۔

۵۲ contraception حمل قرار پانے کو روکنا۔

۵۳ birth control ضرورت سے زیادہ اولاد نہ ہونے دینا۔

D' Indiscipline des Moeurs ہے جس کے لفظی معنی ہیں "اخلاق کی بدنظمی"۔ انگریزی میں اس کا ترجمہ کانسٹیبل کمپنی نے شائع کیا ہے اور ڈاکٹر میری سٹارلیپ سی، بی، ای ایم، ڈی، ایم ایس (لندن) نے مقدمہ لکھا ہے۔ اس میں ۱۵ باب ہیں اور کل حجم ۴۸۱ صفحہ ہے۔

اس کتاب کو پڑھنے کے بعد میں نے دل میں سوچا کہ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ مصنّف کے خیالات کا خلاصہ بیان کرنے سے پہلے مجھے چند مستند کتابیں منع حمل کے مجوزہ طریقوں کی حمایت میں بھی پڑھنی چاہئیں۔ اس لئے میں نے انجمن خدام ہند[۵۱] کے کتب خانے سے اس موضوع کی کُل کتابیں جو وہاں موجود تھیں لے کر پڑھیں۔ کاکا کلیلکر نے جو اس مضمون کا مطالعہ کر رہے ہیں مجھے ہیولاک ایلس کی کتابیں دیں جو خاص اسی مسئلے کے متعلق ہیں اور ایک دوست نے رسالہ "طبیب"[۵۲] کا ایک خاص نمبر بھیج دیا جس میں مشہور طبیبوں کی قیمتی رائیں جمع کی گئی ہیں۔

میرا مقصد اس مضمون کے متعلق کُل مطبوعات جمع کرنے سے یہ تھا کہ جہاں تک ایک ایسے شخص کے لئے جو خود طبیب نہیں ہے ممکن ہے موسیو بورو کے نتائج کی صحت کو جانچوں۔ اکثر یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ ہر مسئلے میں خواہ اس پر خود سائنس والوں نے بحث کی ہو تصویر کے دو رُخ ہوا کرتے ہیں اور دونوں کی حمایت میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے اس لئے مجھے یہ فکر تھی کہ موسیو بورو کی کتاب کا تعارف ناظرین سے کرانے سے پہلے منع حمل کے حامیوں کے خیالات سے واقفیت حاصل کروں۔ میں اچھی طرح سوچ سمجھ کر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ کم سے کم ہندوستان میں منع حمل کے طریقے استعمال کرنے کے حق میں کوئی معقول دلیل پیش نہیں کی جا سکتی لیکن اگر یہ ثابت ہو جائے کہ خود مغرب کے لئے یہ طریقے مضر ہیں تو ہندوستان کے مخصوص حالات پر غور کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں رہتی۔

---

۵۱ Servants of India Society

۵۲ The Practitioner

آیئے اب یہ دیکھیں کہ موسیو بورِرو کیا کہتے ہیں۔ ان کا مطالعہ فرانس تک محدود ہے لیکن فرانس کی اہمیت کچھ کم نہیں۔ اس کا شمار دنیا کے بڑے ترقی یافتہ ملکوں میں ہوتا ہے۔ اس لئے اگر یہ طریقے فرانس میں ناکام ہوئے تو کسی اور جگہ ان کا کامیاب ہونا قرین قیاس نہیں ہے۔

ممکن ہے اس بات میں اختلاف رائے ہو کہ ناکامی کسے کہتے ہیں۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ میں نے اسے جس معنی میں استعمال کیا ہے اسے وضاحت سے بیان کر دوں منع حمل کے طریقوں کی ناکامی اس وقت ثابت ہو گی جب یہ دکھایا جا سکے کہ ان کی بدولت اخلاقی رشتے کمزور ہو گئے ہیں، عیاشی بڑھ گئی ہے، مردوں اور عورتوں نے حمل کے روکنے میں صرف صحت کو اور اولاد کی تعداد محدود کرنے کی اقتصادی مصلحت کو مدنظر نہیں رکھا بلکہ زیادہ تر اس سے اپنی خواہشات نفسانی کو پورا کرنے کا کام لیا۔ یہ اعتدال پسندوں کا خیال ہے۔ انتہا پسند حامیانِ اخلاق کے نزدیک منع حمل کی تدابیر کسی صورت میں بھی جائز نہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ مرد یا عورت کے لئے جنسی جبلت[اہ] کو تسکین دینا صرف اسی وقت ضروری ہے جب اس کا مقصد اولاد پیدا کرنا ہو جس طرح کھانا کھانا صرف زندگی کو قائم رکھنے کے لئے ضروری ہے۔ ان دونوں کے علاوہ ایک تیسرا نقطہ نظر بھی ہے۔ ایک طبقہ یہ کہتا ہے کہ اخلاق کوئی چیز نہیں اور اگر ہے بھی تو اس کا مقتضا ضبط نفس نہیں بلکہ ہر نفسانی خواہش کو اس حد تک پورا کرنا ہے کہ جسم کو ایسا ضرر نہ پہنچ جائے کہ وہ حظ نفس کے قابل نہ رہے جو اصل مقصد ہے۔ اس خیال کے لوگوں کے لئے میرے نزدیک موسیو بورِرو نے اپنی کتاب نہیں لکھی ہے کیونکہ وہ اس کا خاتمہ ٹام مین[۵۲] کے اس قول پر کرتے ہیں "مستقبل ان قوموں کے ہاتھ ہے جو پاکدامن ہیں"۔

اس کتاب کے پہلے حصے میں موسیو بورِرو نے بہت سے واقعات جمع کر دیئے ہیں جنھیں

---

۵۱ sexual instinct جذبۂ شہوت

۵۲ Tom Mann

پڑھ کر سخت رنج ہوتا ہے۔ اس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ کس طرح فرانس میں بڑے زبردست کاروبار قائم ہوگئے ہیں جن کا کام محض یہ ہے کہ انسان کے ادنیٰ ترین جذبات کی تسکین میں مدد دیں۔ منع حمل کے حامیوں کا لے دے کے جو ایک دعویٰ ہے کہ ان طریقوں کے استعمال ہونے سے اسقاط کے واقعات کم ہو جائیںگے وہ بھی ثابت نہیں ہوتا۔ موسیو بورو کہتے ہیں "یقینی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ اس پچیس سال کے عرصے میں جبکہ فرانس میں منع حمل کے طریقوں کا خاص طور پر زور رہا ہے مجرمانہ اسقاط حمل کی وارداتیں کم نہیں ہوئی ہیں۔" بلکہ ان کا تو یہ خیال ہے کہ یہ وارداتیں بڑھتی جاتی ہیں۔ ان کا اندازہ ہے کہ ان کی تعداد ہر سال ۲۷۵۰۰۰ اور ۳۲۵۰۰۰ کے درمیان ہوتی ہے۔ رائے عامہ اب ان کی طرف سے اس قدر کراہت کا اظہار نہیں کرتی جتنا کچھ سال پہلے کیا کرتی تھی۔

(۲)

موسیو بورو فرماتے ہیں "اسقاط کے بعد بچوں کے قتل، محرمات کے ساتھ بدکاری اور اسی قسم کے دوسرے جرائم تک نوبت پہنچتی ہے جو فطرت انسانی کے لئے باعث ننگ ہیں۔ بچوں کے قتل کے بارے میں صرف اتنا کہنا ہے کہ باوجود ان سہولتوں کے جو بن بیاہی زچاؤں کو دی جاتی ہیں اور باوجود منع حمل اور اسقاط کی کثرت کے یہ جرم پہلے کے مقابلے میں بڑھ گیا ہے۔ جو لوگ "بھلے مانس" کہلاتے ہیں ان کی طرف سے اب اس پر اس قدر لعنت ملامت نہیں ہوتی اور جوری اس کے ملزموں کو عموماً بری کر دیتی ہے۔

موسیو بورو نے کتاب کی ایک پوری فصل میں فحش نگاری سے بحث کی ہے۔ وہ اس کی تعریف یوں کرتے ہیں "ان وسائل سے جو ادب، ڈراما اور تصویریں انسانوں کی تفریح طبع اور سکون قلب کے لئے فراہم کرتی ہے گندے اور شہوت پرستانہ مقاصد میں کام لینا"۔ آگے چل کر وہ کہتے ہیں "اس کاروبار کی ہر شاخ کو وہ گرم بازاری حاصل ہوئی ہے جس کا اندازہ ڈائرکٹروں کی قابلیت، تجارتی تنظیم کے کمال، سرمائے کی فراوانی اور طریق کار کی بےنظیر خوبی

کو دیکھ کر ہو سکتا ہے"۔ "اس کے اثرات اس قدر قوی اور عجیب و غریب ہیں کہ انھوں نے انسان کی ساری نفسی زندگی کو متاثر کر دیا ہے"۔ اور "اصلی زندگی کے ساتھ ایک اور شہوانی زندگی جس کا وجود صرف تخیل میں ہے پیدا ہو گئی ہے"۔ اس کے بعد موسیو بورو نے موسیو روئیسن سے یہ دردناک عبارت نقل کی ہے :۔

"وہ کتابیں جن میں شہوانی جذبات اور شہوانی مظالم کا ذکر ہوتا ہے نفسی قانون کے ذریعے سے بیشمار ناظرین پر نہایت قوی ترغیب کا اثر ڈالتی ہیں اور ان کی کثرت اشاعت سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جو لوگ اپنے تخیل میں ایک دوسری شہوانی زندگی بسر کرتے ہیں ان کی تعداد کا کچھ ٹھکانا نہیں (علاوہ ان بیچاروں کے جو پاگل خانوں میں بند ہیں)۔ خصوصاً اس زمانے میں جب اخباروں اور کتابوں کے غلط استعمال سے ہر شخص کے نفس کے گرد بہ قول وجیمس کے "متعدد ضمنی کائناتیں" پیدا ہو جاتی ہیں جن میں ہر شخص اپنے آپ کو محو کر دیتا ہے اور اپنے ساتھ اپنے موجودہ فرائض کو بھی بھول جاتا ہے۔"

یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ سب مہلک نتائج براہ راست ایک بنیادی غلطی سے پیدا ہوتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ شہوانی خواہش کا پورا کرنا بجائے خود انسانی ضروریات میں داخل ہے اور بغیر اس کے نہ مرد کی نشو و نما مکمل ہوتی ہے نہ عورت کی۔ جہاں انسان کے دل میں یہ خیال بیٹھا اور وہ اس چیز کو جسے پہلے بدی سمجھتا تھا نیکی سمجھنے لگا پھر ان تدبیروں کی کوئی انتہا نہیں رہتی جن سے شہوانی جذبہ اُبھرتا ہے اور اسے تسکین دینے میں مدد ملتی ہے۔

اس کے بعد موسیو بورو حوالوں اور مثالوں کے ذریعے سے یہ دکھاتے ہیں کہ کس طرح روزانہ اخباروں، رسالوں، ناولوں، تصویروں اور تھیٹر کے ذریعے سے اس ناپاک مذاق کی تسکین کا روز افزوں سامان ہوتا ہے۔

اب تک غیر شادی شدہ لوگوں کے اخلاقی انحطاط کا ذکر تھا اس کے بعد موسیو بورو

ان اخلاقی بے عنوانیوں کا ذکر کرتے ہیں جو شادی کے بعد ہوتی ہیں۔ وہ کہتے ہیں" امراء، متوسط طبقے اور کسانوں میں بہت سی شادیاں دولت کی حرص اور عزت کی ہوس پر مبنی ہوتی ہیں شادی اس غرض سے بھی کی جاتی ہے کہ کوئی عُہدہ مل جائے، جائدادیں خصوصاً دو زمینداریاں اکٹھی ہو جائیں وہ تعلق جو پہلے سے ہے قانونی شکل اختیار کرلے۔ ناجائز اولاد جائز قرار پا جائے۔ گٹھیا کے مریض کو بڑھاپے میں دل و جان سے خدمت کرنے والی مل جائے، فوجی بھرتی کے وقت انسان اپنے تعیّن کا مقام منتخب کرسکے بلکہ کبھی اس لئے بھی کہ عیّاشی کی زندگی جس سے انسان کا جی سیر ہوتا جاتا ہے ختم ہو جائے اور ایک دوسری قسم کی شہوانی زندگی اس کی جگہ اختیار کی جاسکے۔"

اس کے بعد موسیو بورو اعداد و شمار سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ ان شادیوں سے عیّاشی کم ہونے کے بجائے بڑھ جاتی ہے۔ اس ذلت و خواری کو ان آلات سے بہت مدد ملی ہے جو سائینس یا مکانک کی ایجادات کہلاتے ہیں اس غرض سے بنائے گئے ہیں کہ جماع کے فعل کو روکے بغیر اس کے اثرات کو محدود کردیں۔ میں ان افسوسناک عبارتوں کو چھوڑتا ہوں جن میں زناکی زیادتی کا ذکر اور طلاق اور قانونی علیحدگی[۱] کے حیرت انگیز اعداد و شمار ہیں جن کی تعداد پچھلے بیس[۲] سال میں دُگنی سے زیادہ ہو گئی ہے۔ میں اس بے روک آزادی کی طرف بھی صرف سرسری اشارے پر اکتفا کرتا ہوں جو" دونوں جنسوں کے لئے یکساں معیار اخلاق" کے اصول پر عورتوں کو نفس پرستی کے لئے دیدی گئی ہے۔ منع حمل اور اسقاط کے طریقوں کے درجۂ کمال پر پہنچ جانے سے دونوں جنسیں اخلاقی قیود سے آزاد ہو گئی ہیں ایسی حالت میں لوگ خود شادی کا مضحکہ اڑاتے ہیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ مندرجہ ذیل عبارت موسیو بورو نے ایک مصنف سے نقل کی ہے جس کی کتابیں عوام میں مقبول ہیں "میری رائے میں شادی ہمیشہ ایک نہایت وحشیانہ رسم ہے۔ مجھے ذرا بھی شبہہ نہیں کہ اگر نسل انسانی عقل و انصاف میں کچھ

---

[۱] judicial seperation عدالت کا فیصلہ جس کی رو سے میاں بیوی بغیر طلاق کے ایک دوسرے سے الگ ہو جاتے ہیں۔

ترقی کرے گی تو یہ رسم موقوف کر دی جائے گی .... لیکن مرد اتنے ناشائستہ ہیں اور عورتیں اتنی بزدل ہیں کہ جس قانون کی ان پر حکومت ہے اس سے برتر قانون کا مطالبہ نہیں کر سکتے۔" موسیو بورو نے ان افعال پر جن کا ذکر آچکا ہے اور ان نظریوں پر جن کی رو سے یہ جائز ثابت کئے جاتے ہیں تفصیل سے نظر ڈالی ہے۔ وہ جوش میں آکر چلّا اُٹھتے ہیں "غرض یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ اخلاقی بے نظمی کی تحریک ہمیں نئی منزلوں کی طرف لے جارہی ہے۔ سوال یہ ہے کہ آخر وہ منزلیں کون سی ہیں؟ آیا وہ مستقبل جو ہمارے سامنے ہے ترقی حُسن، اور روز افزوں روحانیت سے معمور ہے یا تنزل اور ظلمت، بدصورتی اور بہیمیت سے جو روز بروز بڑھتی جائے گی؟ کیا یہ بے نظمی جس کا دَور دورہ ہے، اس قسم کی مفید بغاوت ہے جو فرسودہ اخلاق کے خلاف ہوا کرتی ہے، اس قسم کا مبارک جہاد جسے آئندہ نسلیں شکر کے ساتھ یاد رکھتی ہیں کیونکہ یہ چیزیں خاص خاص زمانوں میں ان کی نہضت اور ترقی کے آغاز کے لئے لازمی ہیں؛ یا یہ ہماری قدیم جہالت اور وحشت ہے جو ان اخلاقی قوانین کے مقابلے میں اٹھ کھڑی ہوتی ہے جن کی سختی اسی لئے ناگزیر ہے کہ اس کے بغیر ہم ان بہیمی جذبات کو روک نہیں سکتے؟ ایسا تو نہیں کہ ہمارا سابقہ ایک نامبارک بغاوت سے ہے جو زندگی اور سلامتی کے خلاف ہو رہی ہے؟" اس کے بعد موسیو بورو اس بات کی نہایت زبردست شہادت پیش کرتے ہیں کہ اب تک اس کے نتائج ہر طرح بیحد مُضر ثابت ہوئے ہیں یہاں تک کہ ان سے انسانی زندگی کی ہلاکت کا خطرہ ہے۔

(۳)

ان دونوں باتوں میں زمین آسمان کا فرق ہے کہ میاں بیوی جہاں تک بشری قوت کام دے ضبط نفس کے ذریعے سے اپنی اولاد کی تعداد کو محدود رکھیں یا وہ اس مقصد کو اس طرح حاصل کریں کہ شہوانی فعل کا لُطف تو اُٹھاتے رہیں مگر بعض تدبیروں سے اس کے نتائج کو روک دیں۔ پہلی صورت میں ان کا ہر طرح فائدہ ہے۔ دوسری صورت میں سراسر نقصان ہے۔ ایم بورو نے اعداد و شمار اور نقشوں کے ذریعے سے یہ ثابت کیا ہے کہ منع حمل کے طریقوں

کاروزافزوں استعمال جس کا مقصد یہ ہے کہ شہوانی خواہش دل کھول کر پوری کی جائے مگر اس کے قدرتی نتائج روک دئے جائیں یہ رنگ لایا ہے کہ نہ صرف پیرس میں بلکہ سارے فرانس میں اموات کی شرح ولادت کی شرح سے بڑھ گئی ہے۔ جن ۸۷ علاقوں میں فرانس منقسم ہے ان میں سے ۶۸ میں شرح ولادت شرح اموات سے کم ہے۔ ایک جگہ یعنی لوت کے علاقے میں اموات کی شرح ۱۶۲-اور ولادت کی ۱۰۰ ہے۔ اس کے بعد تارن وگارون کا نمبر ہے جہاں اموات ۱۵۶-اور ولادتیں ۱۰۰ ہیں۔ ان اُنیس علاقوں میں بھی جہاں ولادت کی شرح اموات سے زیادہ ہے کئی ایسے ہیں جہاں فرق محض برائے نام ہے۔ صرف دس علاقوں میں اتنا فرق ہے جو قابل ذکر ہے۔ سب سے کم شرح اموات یعنی ۱۰۰ ولادتوں کے مقابلے میں بہتّر موت لی ہاں اور پادوکیلے میں ہے۔ موسیو بورو ثابت کرتے ہیں کہ یہ آبادی کے گھٹنے کا عمل جسے وہ "اختیاری موت" کہتے ہیں ابھی تک جاری ہے۔

اس کے بعد موسیو بورو فرانس کے صوبوں کی حالت پر تفصیل سے نظر ڈالتے ہیں اور ذیل کی عبارت موسیو گید سے نقل کرتے ہیں جو انھوں نے ۱۹۱۴ء میں نارمنڈی کے متعلق لکھی تھی "پچاس برس کے عرصے میں نارمنڈی میں تین لاکھ باشندے کم ہوگئے ہیں اور یہ تعداد ضلع اورن کی پوری آبادی کے برابر ہے۔ ہر ۲۰ سال میں اس صوبے میں ایک ضلعے کے برابر آبادی کم ہوتی جاتی ہیں۔ اور چونکہ اس میں صرف سو ضلعے ہیں اس لئے ایک صدی کا عرصہ اس کے لئے کافی ہے کہ اس کے زرخیز مرغزار فرانسیسیوں سے خالی ہوجائیں۔ میں نے خاص کرکے فرانسیسیوں سے خالی ہوجانا کہا کیونکہ یقیناً دوسرے لوگ یہاں آکر آباد ہوجائیں گے اور اگر ایسا نہ ہو تو افسوس کی بات ہے۔ کے این کے آس پاس لوہے کی کانوں میں جرمن لوگ کام کر رہے ہیں اور ابھی کل ہی کا ذکر ہے کہ اس مقام پر جہاں سے ولیم فاتح جہاز میں بیٹھ کر انگلستان روانہ ہوا تھا چینی مزدوروں کا ایک ہراول دستہ جہاز سے اُترا ہے۔ اس پر موسیو بورو یہ اضافہ کرتے ہیں" اور خدا جانے کتنے

اور صوبے ہیں جن کی حالت ایسی ہی ابتر ہے۔"

اس کے بعد وہ یہ دکھاتے ہیں کہ آبادی کے گھٹنے کا لازمی نتیجہ یہ ہوا ہے کہ قوم کی فوجی قوت کم ہو گئی ہے۔ ان کے نزدیک فرانس سے ہجرت کر کے مقبوضات میں آباد ہونے والوں کی تعداد کی کمی کا باعث بھی یہی ہے۔ پھر وہ فرانس کی نو آبادیوں کی توسیع کے رک جانے اور فرانسیسی تجارت، فرانسیسی زبان اور ادب کے تنزل کا باعث بھی اسی کو قرار دیتے ہیں۔

اس کے بعد موسیو بورو پوچھتے ہیں "کیا یہ فرانسیسی لوگ جنھوں نے جنسی ضبط وانضباط کو ترک کر دیا ہے راحت و مسرت، مادی بہبود، جسمانی صحت اور ذہنی تہذیب کے حاصل کرنے میں آگے بڑھ گئے ہیں" اور خود ہی جواب دیتے ہیں "جہاں تک صحت کے بہتر ہونے کا تعلق ہے چند لفظ کافی ہوں گے ہم بہت چاہتے ہیں کہ تمام اعتراضات کا جواب باقاعدہ طور پر دیں مگر اس دعوے پر تو سنجیدگی سے غور کرنا بہت ہی دشوار ہے کہ جنسی "آزادی" سے جسم کو قوت اور صحت کو فائدہ پہنچے گا۔ ہر طرف سے یہ سننے میں آتا ہے کہ نو عمروں اور بالغوں دونوں کی طاقت کم ہو گئی ہے۔ جنگ سے پہلے فوجی افسروں کو بار بار رنگروٹوں کا جسمانی معیار گھٹانا پڑا۔ اور ساری قوم کی مشقت کو برداشت کرنے کی قوت گھٹ گئی ہے۔ ظاہر ہے یہ کہنا صحیح نہیں ہوگا کہ اس تنزل کا سبب صرف اخلاقی ضبط کی کمی ہے۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ شراب خواری کی کثرت صحت کو خراب کرنے والے مکانوں وغیرہ کے ساتھ ساتھ اس چیز کو بھی اس تنزل میں بہت کچھ دخل ہے اور اگر ہم غور سے دیکھیں تو آسانی سے معلوم ہو جائے گا کہ یہ بداخلاقی اور وہ جذبات جن پر اس کی بنا ہے ان دوسری بلاؤں کے سب سے بڑے حامی اور مددگار ہیں۔

"امراض خبیثہ کی خوفناک کثرت نے صحت عامہ کو اس قدر نقصان پہنچایا ہے جس کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔"

موسیو بورو نو مالتھوسیوں[۱] کے اس نظریئے کو بھی تسلیم نہیں کرتے کہ جو معاشرہ انضباط

---

[۱] Neo-Malthusians منع حمل کے حامیوں کا ایک گروہ

ولادت سے کام لیتا ہے اس کے افراد کی دولت اس انضباط کی نسبت سے بڑھ جاتی ہے۔ اور اپنے قول کی تائید میں وہ جرمنی کی ترقی پذیر شرح ولادت کا مقابلہ فرانس کی تنزل پذیر شرح ولادت سے کرتے ہیں جس کے ساتھ ساتھ اس ملک کی دولت بھی کم ہو رہی ہے۔ اور وہ کہتے ہیں یہ بات بھی نہیں ہے کہ جرمنی میں تجارت کی حیرت انگیز توسیع کا سبب یہ ہو کہ وہاں مزدوروں کی اجرت دوسرے ملکوں سے کم ہے۔ وہ موسیو روسینول سے یہ الفاظ نقل کرتے ہیں "جن دنوں جرمنی کی آبادی ......۴۱ تھی وہاں لوگ بھوکے مرتے تھے۔ مگر جب سے آبادی ......۶۸ ہوگئی ہے دولت برابر بڑھ رہی ہے" اس کے بعد وہ خود فرماتے ہیں "یہ لوگ ہرگز راہبوں کی سی زندگی بسر نہیں کرتے۔ پھر بھی ان کے لئے یہ ممکن تھا کہ ہر سال سیونگ بنکوں میں بڑی بڑی رقمیں جمع کریں جن کی تعداد ۱۹۱۱ء میں دو کھرب بیس ارب فرانک تھی حالانکہ ۱۸۹۵ء میں صرف ۸۰ ارب فرانک جمع تھے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ ہر سال ۸ ارب پچاس کروڑ فرانک کا اضافہ ہوتا رہا۔"

ذیل کی عبارت جو موسیو بورو جرمنی کی صنعتی ترقی کا ذکر کرنے کے بعد اس کے عام تہذیب و تمدن کے متعلق لکھتے ہیں دلچسپی سے پڑھی جائے گی :۔

"بغیر عمرانیات کا ماہر ہونے کے انسان یقینی طور پر کہہ سکتا ہے کیونکہ یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ یہ صنعتی ترقی ناممکن تھی اگر زیادہ شائستہ مزدور، زیادہ تعلیم یافتہ مستری، مکمل تربیت یافتہ انجینیر دستیاب نہ ہوتے ...... صنعتی مدرسے تین طرح کے ہیں :۔ پیشہ آموز جن کی تعداد پانسو ہے اور ان میں ۷۰۰۰ طالب علم تعلیم پاتے ہیں، صنعتی جو اس سے بھی زیادہ تعداد میں ہے اور ان میں بعض میں ایک ہزار سے زیادہ طالب علم ہیں اور یہ یونیورسٹیوں کی طرح ڈاکٹر کی گراں قدر سند دیتے ہیں .... ۳۶۵ تجارتی مدرسے ہیں جن میں ۳۴۰۰۰ طالب علم ہیں اور بے شمار مدرسوں میں زراعت کی تعلیم ہوتی ہے جس سے ۹۰۰۰ طلبہ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ بھلا ان چار لاکھ طلبہ سے جو پیدائش دولت کے مختلف صیغوں میں تعلیم پاتے ہیں

ہمارے ملک کے پیشہ آموز مدرسوں کے پینتیس ہزار طلبہ کا کیا مقابلہ اور کیا وجہ ہے کہ جب ہمارے ۱۷۷۰۰۰۰ اہموطن جن میں سے ۹۰۷۷۷۹ اٹھارہ برس سے کم عمر کے ہیں کاشتکاری پر بسر کرتے ہیں۔ ہمارے زراعتی مدرسوں میں صرف ۳۲۲۵ طلبہ ہیں۔؟" موسیو بورو نے کمال احتیاط سے یہ بات صاف کر دی ہے کہ جرمنی کی اس حیرت انگیز ترقی کا سبب محض ولادتوں کا اموات سے زیادہ ہونا نہیں ہے مگر وہ بجا طور سے کہتے ہیں کہ اگر دوسرے حالات موافق ہوں تو غالب شرح ولادت قومی نشوونما کی ناگزیر شرط ہے۔ انھیں جو دعوے ثابت کرنا ہے وہ یہ ہے کہ افزائش پذیر شرح ولادت ہرگز مادی بہبود اور اخلاقی ترقی کے منافی نہیں ہے شرح ولادت کے معاملے میں ہم ہندوستانیوں کی وہ حالت نہیں ہے جو فرانسیسیوں کی ہے۔ مگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کی غالب شرح ولادت بہ خلاف جرمنی کے قومی نشوونما کے لئے مفید نہیں ہے۔ مگر مجھے پہلے سے اس باب کا مضمون بیان نہیں کرنا چاہیئے جو میں نے موسیو بورو کے اعداد و شمار اور نتائج کی روشنی میں ہندوستانی حالات سے بحث کرنے کے لئے مخصوص کر دیا ہے۔

جرمنی کے حالات پر جہاں شرح ولادت شرح اموات سے بڑھی ہوئی ہے غور کرنے کے بعد موسیو بورو کہتے ہیں" کیا ہم یہ نہیں جانتے کہ فرانس مجموعی قومی دولت کے اعتبار سے چوتھے نمبر پہ ہے اور وہ بھی اس طرح کہ تیسرے نمبر والے سے بہت پیچھے ہے؟ فرانس کی آمدنی اس روپے سے جو مختلف کاموں میں لگا ہوا ہے ۲ کھرب ۵۰ ارب فرانک سالانہ ہے اور جرمنی کے لوگوں کی تقریباً ۱۰ کھرب فرانک ہے ۔۔۔۔۔۔ ہماری زمین کی آمدنی ۱۸۷۹ء اور ۱۹۱۴ء کے درمیان یعنی ۳۵ برس کے عرصے میں ۴ کھرب فرانک کم ہو گئی ہے یعنی بجائے ۹ کھرب ۲۰ ارب کے ۵ کھرب ۲۰ ارب رہ گئی ہے۔ ضلعے کے ضلعے ایسے ہیں جن میں کاشت کرنے کے لئے آدمی نہیں ہیں اور بعض تعلقوں میں سوائے بوڑھوں کے جوان نظر ہی نہیں آتے۔"
آگے چل کر وہ فرماتے ہیں۔" اخلاقی بے نظمی اور مستقل لاولدی کا نتیجہ یہ ہے کہ قوم کی فطری صلاحیتیں

تنزل پذیر ہیں اور معاشرتی زندگی میں بیّن طور پر بوڑھوں کا غلبہ ہے...... فرانس میں ہزار آدمیوں میں صرف ۱۷۰ بچے ہیں حالانکہ جرمنی میں ۲۲۰ اور انگلستان میں ۲۱۰ ہیں........ ....بوڑھوں کا تناسب ضرورت سے زیادہ ہے اور دوسرے لوگ جو اخلاقی بے نظمی اور اختیاری لاولدی کی وجہ سے قبل از وقت ضعیف ہو گئے ہیں ان پر بھی وہی بڑھاپے کی مایوسی اور ہراس طاری ہے جو از کار رفتہ نسلوں میں ہوا کرتا ہے۔"

اس کے بعد مصنف کہتا ہے" ہم جانتے ہیں کہ فرانسیسی قوم کے اکثر لوگ اپنے حکمرانوں کی اس خانگی حالت (اخلاقی بدعنوانیوں) کی طرف سے بے پرواہیں کیونکہ ایک بڑا سہل نظریہ بنالیا گیا ہے کہ" خانگی زندگی پر پردہ پڑا رہنے دو" اور وہ نہایت رنج کے ساتھ موسیو لیو پولڈ مونود کا یہ قول نقل کرتے ہیں :۔

"یہ تو بڑی اچھی بات ہے کہ شرمناک مظالم کو دور کرنے کے لئے لڑائی لڑی جائے اور مظلوموں کی بیڑیاں کاٹ دی جائیں مگر ان لوگوں کو کیا کہئے گا جن کی بزدلی کا یہ حال ہے کہ اپنے ضمیر کو تحریصوں سے نہ بچا سکے جن کی شجاعت ایک بوسے سے یا ایک چین جبیں سے مغلوب ہو جاتی ہے........ جو بغیر شرم و حیا کے بلکہ بڑے فخر کے ساتھ اس عہد وفا کو توڑتے ہیں جو انھوں نے ایک مبارک اور مقدس ساعت میں اپنی بیوی سے کیا تھا، جو اپنے گھروں کو خود غرضی اور خود پرستی کے ظلم میں گرفتار رکھتے ہیں...... ایسے لوگ دوسروں کو کیونکر آزاد کرا سکتے ہیں۔"

آخر میں مصنف ساری بحث کا خلاصہ ان الفاظ میں بیان کرتا ہے" غرض جدھر دیکھئے یہی نظر آتا ہے کہ ہماری اخلاقی بدنظمی کی مختلف شکلوں نے فرد کو، خاندان کو اور مجموعی معاشرے کو نہایت شدید نقصان پہنچایا ہے اور ہمیں ایسی مصیبت میں مبتلا کر دیا ہے جو سچ مچ بیان سے باہر ہے۔ ہمارے نوجوانوں کی عیاشی، عصمت فروشی کی گرم بازاری، فحش کتابوں کی کثرت، روپے یا عزت یا عیش و عشرت کی خاطر شادی کرنا، زناکاری، طلاق، اختیاری منع

حمل اور اسقاط نے قوم کو ناکارہ کردیا ہے اور اس کی افزائش روک دی ہے۔ افراد اپنی قوتوں کی حفاظت میں کامیاب نہیں ہوئے ہیں اور تعداد کی کمی کے ساتھ ساتھ نئی نسل اخلاقی صفات کے لحاظ سے بھی گر گئی ہے۔ "ولادت کم مگر آدمی بہتر" یہ اصول ان لوگوں کے لئے کچھ عجیب کشش رکھتا تھا جن کی نظر کو انفرادی اور اجتماعی زندگی کے مادی تصور نے محدود کر دیا تھا اور جو یہ سمجھتے تھے کہ انسانوں کی نسل کشی بھی بھیڑ بکری یا گھوڑے کی طرح ہو سکتی ہے۔

آگسٹ کونٹ نے بڑا اچھا فقرہ کہا ہے کہ یہ لوگ جو ہماری معاشرتی بیماریوں کے طبیب ہونے کے مدعی ہیں اگر بیکاری کا پیشہ اختیار کرتے تو اچھا تھا کیونکہ وہ فرد اور جماعت دونوں کی نامحدود نفسی پیچیدگیوں کے سمجھنے کی قابلیت نہیں رکھتے۔

"اصل بات یہ ہے کہ انسان جتنے خیالات رکھتا ہے، جتنے فیصلے کرتا ہے، جتنی عادتیں ڈالتا ہے ان میں سے کسی کا اثر اس کی انفرادی اور معاشرتی زندگی پر اس قدر گہرا نہیں ہوتا جتنا ان خیالات، فیصلوں اور عادتوں کا جو شہوانی خواہش کے تقاضے سے متعلق ہیں خواہ وہ اس کا مقابلہ کرے اور اس پر غالب آئے خواہ اس سے دب کر مغلوب ہو جائے دونوں صورتوں میں اس کے عمل کی لہر معاشرتی زندگی میں بہت دور دور تک پہنچتی ہے کیونکہ فطرت کا حکم یہی ہے کہ جو فعل سب سے زیادہ پردہ خلوت میں پوشیدہ ہے وہ عالم جلوت میں بے شمار اثرات پیدا کرے۔

"اس خلوت کی آڑ میں ہم اپنے دل کو ضابطۂ اخلاق کی خلاف ورزی کرتے وقت یوں سمجھا لیتے ہیں کہ ہمارے برے فعل سے کوئی اہم نتائج پیدا نہیں ہوں گے۔ جہاں تک ہماری ذات کا تعلق ہے ہمیں اطمینان ہو جاتا ہے کہ ہمارے فعل کا مقصد ہی اپنی ذاتی غرض یا لذت ہوتی ہے۔ اب رہا مجموعی معاشرہ تو ہم یہ سمجھ لیتے ہیں کہ وہ ہماری ناچیز ذات سے اس قدر بلند تر ہے کہ ہمارے کرتوت کو آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہم دل ہی دل میں امید رکھتے ہیں کہ "دوسرے لوگ پاکباز اور پارسا رہیں گے۔ ستم

یہ ہے کہ ہمارا یہ بزدلانہ اندازہ اس وقت تک قریب قریب ٹھیک نکلتا ہے جب تک ہم بدفعلی کا ارتکاب عادتاً نہیں بلکہ گاہے ماہے کرتے رہتے ہیں۔ اس لئے ہم اپنی اس کامیابی پر بھول جاتے ہیں اور اپنے رویئے پر قائم رہتے ہیں یہاں تک کہ رفتہ رفتہ ہم اسے جائز سمجھنے لگتے ہیں اور یہی ہماری سب سے بڑی سزا ہے۔

"لیکن ایک دن آتا ہے جب اس مثال کے اثر سے دوسرے بھی اس فعل کے مرتکب ہوتے ہیں۔ ہماری ہر بدفعلی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ "دوسرے لوگوں" کا نیکی کا دامن تھامے رہنا جس پر ہم اس قدر بھروسا کرتے ہیں مشکل ہو جاتا ہے اور اس کے لئے بڑی ہمّت کی ضرورت پڑتی ہے۔ ہمارا ہمسایہ یہ سمجھ کر کہ میں کب تک بیوقوف بنتا رہوں ہماری تقلید پر کمر باندھ لیتا ہے۔ اسی دن سے تباہی کا آغاز ہو جاتا ہے اور ہر شخص آسانی سے اندازہ کر سکتا ہے کہ اس کی بدکرداری کے نتائج کیا ہیں اور اس کی ذمہ داری کی حد کہاں تک ہے ....

"وہ بُرا فعل جو ہمارے نزدیک پردے میں نہاں تھا ظاہر ہو جاتا ہے اس کے اندر ایک خاص غیر مادی شعاع افگنی کی قوت[1] ہوتی ہے اور اس کا اثر ہر جماعت میں ہر طبقے میں پہنچ جاتا ہے۔ ہر ایک شخص کے جُرم کی سزا سب کو بھگتنا پڑتی ہے کیونکہ ہمارے افعال کی تاثیر اس حلقے کی طرح جو موجوں کی حرکت سے پیدا ہوتا ہے پھیلتے پھیلتے معاشرتی زندگی کے سمندر میں بڑی دور دور تک پہنچتی ہے ....

"اخلاقی بے نظمی سے بقائے نسل کا چشمہ فوراً خشک ہو جاتا ہے۔ بالغ مرد اور عورت اخلاقی اور جسمانی کمزوری میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور ان کی زندگی کو گھن لگ کر رہ جاتا ہے۔"

(۴)

اخلاقی بے نظمی منع حمل کے طریقوں سے اس کی مزید شدت اور اس کے خوفناک نتائج کا ذکر کرنے کے بعد مصنف اس کے علاج کی تدبیروں پر غور کرتا ہے۔ میں ان حصّوں کو چھوڑتا ہوں

---

[1] radio-activity

جن میں وضع توانین کا ذکر ہے اور یہ دکھایا گیا ہے کہ ان کا ہونا ضروری ہے گو بذات خود یہ بالکل بیکار ہیں۔ آگے چل کر اس نے یہ بتایا ہے کہ نہایت احتیاط کے ساتھ رائے عامہ کی تربیت سے ان فرائض کا احساس پیدا کرنے کی ضرورت ہے کہ بن بیاہے پاکدامن رہیں وہ بیشمار انسان جو اپنی شہوانی خواہشات کو ہمیشہ کے لئے روک نہیں سکتے شادی کرلیں اور شادی کے بعد عہد وفا کو نباہیں اور زن وشو کے تعلقات میں بھی اعتدال برتیں۔ پھر اس نے اس دلیل پر نظر ڈالی ہے جو پاکدامنی کے خلاف پیش کی جاتی ہے کہ "اس کا حکم مرد اور عورت کی طبیعی فطرت کے خلاف اور ان کی صحت کے توازن کے لئے مُضر ہے" اور "یہ ناقابل برداشت" مداخلت ہے فرد کی آزادی اور خود مختاری میں اور اس کے اس حق میں کہ راحت حاصل کرے اور اپنی زندگی جس طرح چاہے گذارے"۔

مصنف اس نظریئے کا مخالف ہے کہ عضو تناسل اور اعضا کی طرح "تسکین کا طالب رہتا ہے"۔ اس کا کہنا یہ ہے کہ "اگر یہ بھی دوسرے اعضا کی طرح ہوتا تو اس کامل قوت ضبط کی کیا توجیہ کی جاتی جو ہمارے ارادے کو اس پر حاصل ہے اور اس کا کیا جواب دیا جاتا کہ جذبہ شہوت کا پیدا ہونا جسے ریاکار "شہوانی حاجت" کہتے ہیں ان بیشمار محرکات کا نتیجہ ہے جو ہمارا تمدن لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے سن بلوغ سے برسوں پہلے پیدا کر دیتا ہے؟"

میرا بے اختیار جی چاہتا ہے کہ اس قابل قدر طبی شہادت کو نقل کر دوں جو اس کتاب میں اس بات کے ثبوت میں جمع کی گئی ہے کہ ضبط نفس نہ صرف بے ضرر ہے بلکہ صحت کے لئے ضروری ہے اور اس کا حاصل کرنا یقیناً ممکن ہے:۔

ٹیوبنگن یونیورسٹی کے پروفیسر اوئیسٹرلن کہتے ہیں "شہوانی جبلت نہ اتنی اندھی ہے اور نہ اس قدر قوی کہ اسے اخلاقی قوت اور عقل کے ذریعے سے قابو میں رکھنا بلکہ بالکل مغلوب کرلینا ناممکن ہو۔ نوجوان مرد کو بھی نوجوان عورت کی طرح مناسب وقت تک ضبط نفس سے کام لینا لازم ہے۔ اسے جان لینا چاہیئے کہ اس قربانی کا نتیجہ مضبوط صحت اور سدا بہار قوت ہے۔

"یہ بات جتنی بار کہی جائے کم ہے کہ عفت اور پاکدامنی عضویات اور اخلاق دونوں کے قوانین کے سراسر مطابق ہیں اور شہوت پرستی مذہب اور اخلاق کی طرح عضویات اور نفسیات کی رو سے بھی جائز ثابت نہیں کی جاسکتی۔"

لندن کے رائل کالج کے پروفیسر سر لائنل بیل کا قول "سب سے بہتر اور برتر اشخاص کی مثال سے ہمیشہ یہ ثابت ہوتا رہا ہے کہ سب سے قوی جبلت بھی مضبوط اور سنجیدہ ارادے اور کردار و معاشرت میں کافی احتیاط کے ذریعے سے پوری طرح رد کی جاسکتی ہے۔ شہوانی خواہش کا ترک اگر محض خارجی موانع کی وجہ سے نہیں بلکہ ایک اختیاری اصول عمل کے طور پر برتا گیا ہے تو اس سے آج تک کسی شخص کو نقصان نہیں پہنچا۔ غرض ضبط نفس کا قائم رکھنا اتنا زیادہ مشکل نہیں بہ شرطیکہ یہ ایک نفسی کیفیت کا جسمانی مظہر ہو...... ضبط نفس محض افعال تک محدود نہیں بلکہ اس میں جذبات کی پاکیزگی اور وہ قوت شامل ہے جو گہرے عقیدوں سے پیدا ہوتی ہے۔"

سوئیستانی ماہر نفسیات فوریل کی رائے ہے "ہر قسم کے اعصابی افعال مشق سے بڑھتے اور قوت پاتے ہیں۔ برخلاف اس کے کسی خاص حصے کے معطل رہنے سے اس میں تحریک پیدا کرنے والے اسباب کا اثر کم ہو جاتا ہے۔

"وہ سب اسباب جن سے شہوانی بے چینی پیدا ہوتی ہے خواہش نفس کی شدت میں اضافہ کرتے ہیں ان اکسانے والی چیزوں سے پرہیز کیا جائے تو احساس کم ہو جاتا ہے اور خواہش رفتہ رفتہ گھٹتی جاتی ہے۔ نوجوانوں میں یہ خیال رائج ہو گیا ہے کہ ضبط نفس کوئی غیر طبعی اور ناممکن چیز ہے حالانکہ بہت سے لوگ اپنے عمل کے ذریعے سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ شہوانی خواہش کے ترک سے صحت کو نقصان نہیں پہنچتا۔"

ربنگ لکھتا ہے "میں بعض نوجوانوں کو جانتا ہوں جن کی عمر ۲۵، ۳۰ بلکہ اس سے بھی زیادہ ہے اور وہ کامل ضبط نفس سے کام لیتے ہیں یا جس وقت ان کی شادی ہوئی اس

وقت تک اس پر عامل تھے۔ ایسی مثالیں شاذ نہیں ہیں۔ البتہ یہ لوگ اپنا اشتہار نہیں دیتے۔
"مجھ سے بہت سے طالب علموں نے اپنے پوشیدہ حالات بیان کئے ہیں اور یہ شکایت کی کہ میں نے اس بات پر کافی زور نہیں دیا کہ شہوانی خواہش آسانی سے قابو میں لائی جاسکتی ہے"۔
ڈاکٹر ایکٹن کے نزدیک "شادی سے پہلے نوجوان کامل ضبط نفس سے کام لے سکتے ہیں اور انھیں یہی کرنا چاہیئے"۔
سر جیمس پیجٹ دربار انگلستان کے طبیب خاص کا قول ہے "جس طرح پاکبازی سے روح کو نقصان نہیں پہنچتا اسی طرح جسم کو بھی ضرر نہیں ہوتا اور ضبط خواہش بہترین طرز عمل ہے"۔
ڈاکٹر ای پیریر رقمطراز ہیں "یہ عجیب خبط ہے جس کا دور کرنا بہت ضروری ہے کیونکہ اس میں نہ صرف بچے بلکہ ان کے باپ بھی مبتلا ہیں کہ کامل ضبط نفس میں بہت سے خطرے فرض کرلئے گئے ہیں۔ اصل میں پاکدامنی نوجوانوں کے لئے جسمانی، اخلاقی اور ذہنی تحفظ کا ذریعہ ہے"۔
سر اینڈریو کلارک کہتے ہیں "ضبط خواہش سے نقصان نہیں پہنچتا، نشوونما نہیں رکتی۔ اس سے آدمی کی قوت اور سکت بڑھ جاتی ہے اور ادراک تیز ہو جاتا ہے۔ برخلاف اس کے خواہش نفس کی پیروی سے انسان کو اپنے اوپر قابو نہیں رہتا، سستی اور ڈھیل کی عادتیں پڑجاتی ہیں، سارے نظام جسمانی پر بے حسی اور پستی چھا جاتی ہے اور وہ ان بیماریوں کی زد میں آجاتا ہے جو کئی پشتوں تک منتقل ہوا کرتی ہیں۔ خواہش نفس کی پیروی کو نوجوانوں کے لئے ضروری قرار دینا صرف خطا ہی نہیں بلکہ ظلم ہے۔ یہ بات غلط بھی ہے اور مُضر بھی"۔
ڈاکٹر سر بلیڈ لکھتے ہیں "خواہش نفس کی پیروی میں جو مضرتیں ہیں انھیں ہر شخص جانتا ہے ان میں اختلاف کی گنجائش نہیں۔ ضبط خواہش کے نقصانات محض خیالی ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ مقدم الذکر کی توجیہہ میں بہت سی ضخیم عالمانہ کتابیں لکھی گئی ہیں اور موخرالذکر کی تاریخ لکھنے والا آج تک کوئی پیدا نہیں ہوا۔ ان نقصانات کی طرف لوگ محض چھپے اشارے کرتے رہتے ہیں جو شرم کی وجہ سے گفتگو تک محدود رہتے ہیں اور منظر عام پر آنے کی تاب

نہیں لاسکتے۔"

ڈاکٹر مانٹی گازا "عضویات عشق"[۱] میں تحریر کرتے ہیں" میں نے آج تک نہیں دیکھا کہ پاکبازی سے کوئی بیماری پیدا ہوئی ہو.........سب لوگ خصوصاً نوجوان اس کے فوری فوائد کا تجربہ کر سکتے ہیں۔"

برن یونیورسٹی کے مرضیات اعصاب کے مشہور پروفیسر ڈاکٹر دوبوائے کا بیان ہے۔
"ضعف اعصاب کے مریض ان لوگوں میں زیادہ ہوتے ہیں جو شہوت پرستی کی باگ ڈھیلی چھوڑ دیتے ہیں بہ نسبت ان اشخاص کے جو حیوانیت کے بندے نہیں ہوتے۔" اور ان کی شہادت کی کامل تصدیق ڈاکٹر فیرے بسیٹر ہسپتال کے طبیب نے کی ہے کہ جو لوگ نفسی پاکبازی برت سکتے ہیں وہ ضبط خواہش کریں تو ان کی صحت کے لئے مطلق خطرہ نہیں۔ صحت کا انحصار جنسی جبلت کی تسکین پر نہیں ہے۔"

پروفیسر الفریڈ فورنیئے رقمطراز ہیں" اس مسئلے میں کہ ضبط خواہش میں نوجوانوں کے لئے خطرے ہیں بہت کچھ بیہودہ اور غیر ذمہ دارانہ گفتگو کی گئی ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر یہ خطرے موجود ہیں تو میں ان سے بے خبر ہوں اور مجھے بہ حیثیت طبیب کے آج تک ان کے وجود کا کوئی ثبوت نہیں ملا باوجودیکہ مجھے طبی معائنوں میں ہر طرح کے مریضوں کے دیکھنے کا موقع حاصل ہوا ہے۔"

"اس کے علاوہ میں ماہر عضویات کی حیثیت سے اتنا اور کہوں گا کہ حقیقی قوت مردمی کم و بیش اکیس سال کی عمر میں حاصل ہوتی ہے اور اس سے پہلے جنسی حاجت محسوس نہیں ہوتی خصوصاً اس صورت میں کہ وہ غیر طبعی تحریکوں کے ذریعے سے قبل از وقت ابھاری نہ گئی ہو مقررہ عمر سے پہلے شہوت جنسی کا پیدا ہونا محض مصنوعی چیز ہے اور اکثر بے راہ تربیت کا نتیجہ ہوتا ہے۔"

---

[۱] La physiologie de l'amour

"بہرحال آپ یقین کیجئے کہ فطری رجحان کو روکنے میں اس قسم کے خطرے کم ہیں
بہ نسبت اس کے کہ وہ قبل از وقت پورا کیا جائے۔ آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ میرا کیا مطلب ہے"
ان مستند شہادتوں کو نقل کرنے کے بعد جن میں اور بہت سی آسانی سے اضافہ کی جا سکتی
ہیں، موسیو بورو نے اس تحریک کو نقل کیا ہے جو ۱۹۰۲ء میں بروسلز میں مجلس سدِّ امراض
جسمانی و اخلاقی نے بہ اتفاق رائے پاس کی تھی۔ اس مجلس میں تمام دنیا کے ماہرین فن جمع
ہوئے تھے۔ تحریک کے الفاظ یہ ہیں" نوجوانوں کو سب سے بڑھکر اس بات کی تلقین کرنا چاہیئے
کہ پاکبازی اور ضبط خواہش نہ صرف بے ضرر ہیں بلکہ ان صفات میں سے ہیں جن پر محض طب
اور حفظان صحت کے نقطۂ نظر سے بیحد زور دینے کی ضرورت ہے"۔
اس کے بعد موسیو بورو کہتے ہیں" چند سال ہوئے کرسچیانا یونیورسٹی کے طبی شعبے کے
پروفیسروں نے بھی بالاتفاق ایک بیان شائع کیا تھا۔ ہم سب لوگوں کے تجربے کے
مطابق یہ قول کہ پاکبازی کی زندگی صحت کے لئے مضر ہے محض بے بنیاد ہے۔ ہمارے
نزدیک تجرد میں عمر بسر کرنے سے کسی طرح کا نقصان نہیں پہنچتا"۔
"غرض مخالفوں کے دلائل پر غور ہو چکا۔ اب ہم عمرانیات اور اخلاقیات کے ماہر،
موسیو روئیسن کے ہمزبان ہوکر کہہ سکتے ہیں کہ" شہوانی خواہش غذا اور ورزش کی ضروریات
کی طرح نہیں جسے تھوڑی حد تک بھی پورا کرنا لازمی ہو۔ یہ واقعہ ہے کہ مرد اور عورت
پاکبازی کی زندگی بسر کر سکتے ہیں اور نہ بجز چند غیر طبعی اشخاص کے کسی کو کوئی خاص خرابی
بلکہ تکلیف تک محسوس نہیں ہوگی۔ یہ کہا جا چکا ہے (اور اس کی جس قدر تکرار کی جائے کم
ہے کیونکہ اس بنیادی حقیقت سے بھی اس کثرت سے لوگ ناواقف ہیں) کہ طبعی افراد
کو جن کی بہت بڑی اکثریت ہے، ضبط خواہش سے مطلق کسی طرح کی بیماری نہیں ہوتی۔
البتہ خواہش نفس کی پیروی سے بہت سے شدید امراض جن سے ہر شخص واقف ہے پیدا
ہوتے ہیں۔ قدرت نے فاضل غذا کے لئے ایک نہایت سہل اور حکمی تدبیر کر دی ہے یعنی

احتلام اور ماہواری ایّام"۔

"اس لئے ڈاکٹر ویری کا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ یہاں سچی جبلت یا حقیقی حاجت کا سوال نہیں ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ اگر وہ غذا کی حاجت پوری نہ کرے یا سانس کی آمدورفت کو روک دے تو کیا انجام ہوگا لیکن کسی نے کوئی ایسی مثال نہیں بتائی ہے کہ عارضی یا مستقل ضبط خواہش سے کسی طرح کی بیماری شدید یا مزمن پیدا ہوئی ہو......... طبعی زندگی میں ہمیں بہت سے پاکدامن لوگوں کی مثالیں نظر آتی ہیں جو دوسرے لوگوں سے نہ تو سیرت کی پختگی میں کم ہیں نہ ارادے کی قوت میں نہ صحت اور طاقت میں اور اگر وہ شادی کریں تو اولاد پیدا کرنے میں بھی ہیٹے نہ رہیں گے........... وہ حاجت جس کے مدارج اس قدر مختلف ہوں وہ جبلت جو اس قدر آسانی سے ٹل جائے۔ اصل میں نہ کوئی حاجت ہے اور نہ کوئی جبلت"۔

مجامعت اس لڑکے کی، جو نشوونما کی حالت میں ہو کسی عضویاتی ضرورت کو پورا نہیں کرتی بلکہ اس کے برعکس اس کی طبعی ارتقا کا تقاضا کامل پاکدامنی سے پورا ہوتا ہے اور وہ لوگ جو اس سے انحراف کرتے ہیں اپنی صحت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچاتے ہیں۔ بلوغ کے ساتھ بڑی بڑی تبدیلیاں ہوتی ہیں، جسم کے مختلف وظائف میں ہلچل سی مچ جاتی ہے اور ایک عام نشوونما کا آغاز ہوتا ہے۔ عنفوان شباب کی منزل میں قدم رکھنے والے لڑکے کو اپنی ساری قوت حیات کی ضرورت پڑتی ہے کیونکہ اکثر اس عمر میں بیماری کی مدافعت کرنے کی صلاحیت کم ہو جاتی ہے اور بیماری اور اموات کی شرح اس سے پہلے کے دور کے مقابلے میں بڑھ جاتی ہے............ عام نشوونما اور عضوی ارتقا کا طولانی عمل، جسمانی اور نفسی تغیرات کا وہ پورا سلسلہ جس کے بعد بچہ مرد بنتا ہے فطرت سے شدید محنت اور سعی کا طالب ہے۔ ایسے وقت میں ہر طرح کی بے اعتدالی خطرناک ہے خصوصاً شہوانی قوت کا قبل از وقت استعمال"۔

(۵)

پاکدامنی کے عضویاتی فوائد کا ذکر کرنے کے بعد موسیو بورو اس کے اخلاقی اور ذہنی برکات کے

متعلق پروفیسر مانٹی گازا سے ذیل کی عبارت نقل کرتے ہیں :۔
"سب لوگ خصوصاً نوجوان پاکبازی کے فوری فوائد کا تجربہ کر سکتے ہیں۔ اس کی بدولت حافظہ پُرسکون اور قوی ہو جاتا ہے، دماغ میں تیزی اور رسائی، ارادے میں مضبوطی اور مجموعی سیرت میں وہ استحکام پیدا ہو جاتا ہے جو عیاشوں نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھا۔ پاکدامنی کے آئینے میں ہمیں اپنے گرد و پیش کی چیزیں طرح طرح کے خوشنما رنگوں میں نظر آتی ہیں جو کسی بلور کے ذریعے سے ممکن نہیں۔ اس کی شعاعوں سے کائنات کا ذرّہ ذرّہ منور ہو جاتا ہے اور اس کی بدولت ہم سعادت سرمدی کے ماہ کامل سے نور اور سرور حاصل کرتے ہیں جو گہن سے پاک اور زوال سے بری ہے۔" اور اس پر وہ خود یہ اضافہ کرتے ہیں :۔ "جو طاقتور نوجوان پاکدامن رہتے ہیں ان کی خوشدلی، خوش مزاجی اور اعتماد نفس کے مقابلے میں ان کے ان ساتھیوں کا خواہش کا جنون اور اضطراب قلب باعث عبرت ہے، جو ہوائے نفس کے بندے ہیں"۔ اس کے بعد وہ پاکدامنی کی برکتوں کا مقابلہ عیاشی کے افسوسناک نتائج سے کرتے ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے "ترک خواہش سے کسی قسم کی بیماری پیدا ہونے کی ایک مثال بھی پیش نہیں کی جا سکتی" اخلاقی بے ضبطی سے جو مہلک امراض پیدا ہوتے ہیں ان سے ہر شخص واقف ہے .... انسان کا جسم .... اس طرح سے سڑ کر رہ جاتا ہے کہ ناقابل اظہار ہے .... پھر اس گندگی کو بھی نظرانداز نہیں کرنا چاہیئے جو دل و دماغ اور تخیل کو آلودہ کر دیتی ہے۔ جدھر دیکھیئے سیرت و اخلاق کی پستی، شباب کی بے قید ہوس رانی، اور خود غرضی کی شدت کا رونا رویا جاتا ہے"۔

یہ ہے حقیقت شہوانی ضرورت کی جس کے نام سے نوجوان شادی سے پہلے کھل کھیلتے ہیں جو لوگ اس ہوس رانی کے اصول کے حامی ہیں۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ خواہش نفس پر قیود عائد کرنے کے معنی ہیں "انسان کی اس آزادی میں مداخلت کہ وہ اپنے جسم سے جس طرح چاہے کام لے"۔ مصنف دلائل کے طومار سے یہ ثابت کرتا ہے کہ شہوانی خواہش کے پورا کرنے کی آزادی پر قیود عائد کرنا عمرانی اور نفسی نقطۂ نظر سے ضروری ہے۔

مصنف کہتا ہے "عمرانیوں کے نزدیک اجتماعی زندگی محض ایک طلسم ہے گوناگوں تعلقات کا ایک جال ہے عمل اور ردعمل کا جس کے اندر کسی ایسے مشغلے کا تصور بھی ممکن نہیں جو اور مشاغل سے علیحدہ اور دراصل بے ربط ہو خواہ ہم کوئی ارادہ کریں، کسی بات کی کوشش کریں عصبیت ہمارے کاموں کا رشتہ ہمارے ابنائے جنس کے افعال سے جوڑ دیتی ہے اور ہمارا ہر خیال خواہ وہ کتنے ہی گہرے پردوں میں چھپا ہو، ہر خواہش خواہ وہ کتنی ہی بے ثبات ہو اپنا اثر اس قدر دور تک پہنچاتی ہے کہ ہمارا ذہن اس کی وسعت کے اندازے سے معذور ہے۔ انسان کا خاصۂ معاشرت کوئی عارضی یا فروعی خاصیت نہیں۔ یہ اُس کی فطرت میں داخل ہے۔ اس کی انسانیت کا جزو ہے۔ اس کا انسان ہونا ہی معاشرت پسند ہونے کا باعث ہے۔ کوئی اور میدان عمل انسانی فطرت سے اس حد تک خصوصیت نہیں رکھتا۔ عضویات اور اخلاقیات، معاشیات اور سیاسیات، علم اور جمالیات، مذہب اور معاشرت غرض سب چیزیں پراسرار روابط، غیر معین تعلقات کے ایک عالمگیر نظام کی پابند ہیں۔ یہ رشتہ اس قدر استوار ہے یہ جال اس قدر مضبوط ہے کہ بعض اوقات عمرانیات کا ماہر انسانی تعلقات کے لامتناہی سلسلے کو جو اس کی آنکھوں کے سامنے زمان و مکان کی وسعت میں پھیلتا چلا جاتا ہے دیکھ کر واقعی بڑی مشکل میں پڑ جاتا ہے وہ ایک ہی نظر میں اس کا اندازہ کر لیتا ہے کہ بعض اوقات انسان کی ذمہ داری کس قدر عظیم الشان ہوتی ہے اور وہ آزادی جو بعض معاشرتی حلقے اسے دینا چاہتے ہیں اس کے مقابلے میں کتنی بے حقیقت ہے۔"

مصنف آگے چل کر کہتا ہے "اگر ہم یہ مانتے ہیں کہ بعض صورتوں میں انسان کو سڑک پر تھوکنے کی اجازت نہیں ہے............ تو وہ اتنے بڑے حق کا مطالبہ کیسے کر سکتا ہے کہ اپنی جنسی قوت کو جس طرح چاہے صرف کرے؟ کیا اس قوت کو کوئی دنیا سے نرالی مراعات حاصل ہے کہ وہ عصبیت کے عالمگیر قانون کے اثر سے بچ جاتی ہے؟ آخر وہ کون شخص ہے جو اتنا نہیں سمجھتا کہ اس فعل کی انتہائی اہمیت سے تو فرد کے عمل کا

ردعمل اور بھی شدید ہوجاتا ہے؟ فرض کیجئے کسی نوجوان لڑکے اور لڑکی میں وہ جھوٹی دوستی ہوگئی ہے جس کی حقیقت سے ناظرین واقف ہیں۔ یہ دونوں خیال خام میں رہتے ہیں کہ ان کے پیمانِ محبت سے کسی اور کو واسطہ نہیں۔ وہ آزادی کے قلعے میں محصور ہو کر اپنے دل کو سمجھا لیتے ہیں کہ ان کے اس فعل سے جو پردہ خلوت میں پوشیدہ ہے معاشرے کو کوئی دلچسپی نہیں اور وہ سراسر اس کی مداخلت سے باہر ہے۔ کیسا طفلانہ دھوکا ہے! اجتماعی عصبیت جو ایک قوم کے کل افراد کو بلکہ قوموں کے دائرے سے آگے بڑھ کر تمام نوع انسانی کو متحد کرتی ہے سب دیواروں سے یہاں تک کہ خلوت خانے کی چار دیواری سے بھی گذر جاتی ہے اور باہمی تعلقات کا زبردست سلسلہ اس مفروضہ ذاتی فعل کو معاشرتی زندگی میں بہت دور کے افعال سے جوڑ دیتا ہے اور اس ربط میں انتشار پیدا کر دیتا ہے۔ ہر فرد جو اپنے اس حق پر اصرار کرتا ہے کہ عارضی یا بے ثمر جنسی تعلقات پیدا کرے، جو اس آزادی کا مطالبہ کرتا ہے کہ اپنی قوت تناسل کو محض اپنی لذت کے لئے استعمال کرے معاشرے میں تفریق اور ابتری کی بنا ڈالتا ہے خواہ اس کا یہ مقصد ہو یا نہ ہو۔ ہمارے معاشرتی ادارے گو وہ ہماری خود غرضیوں اور بے وفائیوں سے بگڑ چکے ہیں، ابھی تک ہم سے اس کے طالب ہیں کہ ہم خوشی سے ان ذمہ داریوں کو قبول کریں جو خواہش تناسل کے ساتھ لازمی طور پر وابستہ ہیں اسی قبولیت کے بھروسے پر معاشرے نے اپنے بے شمار کاروبار پھیلا رکھے ہیں۔ مثلاً ملکیت، اجرت، وراثت تشخیص محصول، فوجی خدمت، حق انتخابات، مدنی حقوق وغیرہ۔ اگر فرد اپنے حصے کی ذمہ داری سے انکار کر دے تو وہ ایک آن واحد میں سارے کارخانے کو ابتر کر دیتا ہے اور معاہدۂ اجتماعی کے سب سے اہم اصول کی خلاف ورزی کا مرتکب ہوتا ہے۔ وہ دوسروں کے بوجھ کو بڑھاتا ہے اور خود اچھا خاصا مفت خورا، طفیلی، چور، دغاباز ہے۔ ہم معاشرے کے سامنے جس طرح اپنی سب قوتوں کے معاملے میں جواب دہ ہیں اسی طرح جسمانی قوت کے معاملے میں بھی ہیں۔ بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس میں ہم پر اور بھی زیادہ ذمہ داری ہے۔

کیونکہ ایسا معاشرہ جو غیر مسلح ہے اور بیرونی حملوں سے تقریباً آزاد ہے اس چیز کو ہماری مرضی پر چھوڑنے پر مجبور ہے کہ ہم اپنی جسمانی قوت کو مناسب طریقے سے معاشرتی مفاد کے مطابق صرف کریں "

اس معاملے کے نفسی پہلو کے متعلق بھی مصنف اسی قدر سخت خیالات رکھتا ہے۔

" مدتوں پہلے کسی نے یہ بات کہی تھی کہ آزادی دیکھنے میں رحمت سہی مگر اصل میں زحمت ہے یہی تو اس کی عظمت اور شان ہے۔ آزادی قیود عائد کرتی ہے، جبر سے کام لیتی ہے۔ وہ ہر شخص کی سعی کے مجموعے کو بڑھا دیتی ہے۔ ہر فرد آزاد ہونا چاہتا ہے۔ اسے یہ لو لگی ہوتی ہے کہ اپنی خود مختاری کا دائرہ وسیع کر کے اپنے نفس کی تکمیل کرے۔ بات تو سیدھی سی معلوم ہوتی ہے مگر پہلے پہل جو تجربے ہوتے ہیں انھیں سے اس کا پیچیدہ اور تکلیف دہ ہونا ثابت ہو جاتا ہے۔ وحدت ہماری فطرت۔ اور ہماری اخلاقی زندگی کا خاصہ ہے تو ہوا کرے ہمیں اپنے دل میں یہ محسوس ہوتا ہے کہ بہت سی لہریں ایک دوسرے سے مختلف اور متضاد اٹھا کرتی ہیں ان سب میں ہمیں اپنے نفس کا شعور ہوتا ہے مگر تمام باتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہمیں ان میں انتخاب سے کام لینا چاہیئے۔ ہم بھی جیّد ماہر تعلیمات فارسٹر کے ہم زبان ہو کر پوچھتے ہیں، اے نوجوان تو کہتا ہے کہ تو اپنی مرضی کی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے۔ اپنی خودی کو حقیقت کا جامہ پہنانا چاہتا ہے مگر یہ تو بتا کہ تو اپنی خودی کے کس حصّے کو حقیقت کا جامہ پہنائے گا؟ اس کا کون سا حصّہ بہتر اور برتر ہے۔ وہ جس کا مرکز تیری عقلی قوت ہے یا وہ جو تیری فطرت کے پست ترین طبقے یعنی حسیات سے وابستہ ہے؟ اگر یہ سچ ہے کہ جماعت اور فرد کی ترقی اس کا نام ہے کہ روحانیت کو روز بروز فروغ ہو اور روح کو مادّے پر کامل غلبہ حاصل ہو جائے تو ظاہر ہے کہ ہمیں انتخاب میں شبہہ یا تامل نہیں ہوگا البتہ عمل کرنے کی قوت چاہیئے اور کام بھی سہل نہیں ہے۔ شاید آپ یہ جواب دیں "مگر میں تو انتخاب کی ضرورت نہیں سمجھتا میں تو اپنے

نفس کو بہ حیثیت ایک ہم آہنگ اور منظم کل کے حقیقت کا جامہ پہنانا چاہتا ہوں۔ اچھا یوں ہی سہی۔ مگر یہ یاد رکھنا کہ خود یہ ارادہ ایک انتخاب ہے کیونکہ ہم آہنگی قائم کرنے کے لئے نزاع اور انتشار کو دور کرنا پڑتا ہے۔ گوئٹے کا قول ہے "مر کر نئی زندگی حاصل کر" اور یہ محض صدائے بازگشت ہے ان الفاظ کی جو انیس سو سال پہلے مسیحؑ نے کہے تھے " بہ تحقیق میں تم سے کہتا ہوں جب تک گیہوں کا دانہ زمین پر گر کر فنا نہ ہو جائے وہ اکیلا رہتا ہے مگر فنا ہونے کے بعد وہ خوب پھلتا ہے۔"

موسیو گابریل سیائیے لکھتے ہیں" ہم آدمی بننا چاہتے ہیں۔ یہ بات کہنے میں تو سہل ہے مگر حق ہمیشہ فرض کی صورت اختیار کر لیتا ہے ایسے سخت فرض کی جس میں ہر شخص کم و بیش قاصر رہتا ہے۔ ہم بہت اکڑ کر کہتے ہیں کہ ہم آزاد ہونا چاہتے ہیں۔ اگر آزادی سے مراد ہے جو جی چاہے وہ کرنا یعنی جبلی خواہشات کی غلامی تو ہمیں اس پر اس قدر فخر کرنے کی ضرورت نہیں۔ اور اگر سچی آزادی مراد ہے تو ہمیں کمر باندھ کر اس لڑائی کے لئے تیار ہو جانا چاہیئے جو کبھی ختم نہیں ہوگی۔ ہم اپنی وحدت کا اپنی شخصیت کا اپنی آزادی کا ذکر کرتے ہیں اور بڑے فخر سے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ ہم خدا کے لافانی بیٹے ہیں۔ مگر افسوس! جب ہم اس نفس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہیں تو وہ ہاتھ نہیں آتا بلکہ بہت سے بے ربط اجزا میں تحلیل ہو جاتا ہے جو ایک دوسرے کی نفی کرتے ہیں۔ متضاد خواہشات اس کے اندر انتشار پیدا کرتی ہیں اور انھیں خواہشات سے وہ مرکب ہے۔ اس کے مخصوص جوہر کے علاوہ اس کی حقیقت سوائے ان تعصبات کے جو اس پر غالب ہیں اور ان تحریصات کے جو اسے لبھاتی ہیں اور کچھ نہیں۔ اس کی مفروضہ آزادی اصل میں غلامی ہے جو اسے محسوس نہیں ہوتی اور اسی لئے وہ اس کا مقابلہ نہیں کرتا۔"

روئیس کہتا ہے" ضبط نفس وہ نیکی ہے جو سکون و اطمینان سے معمور ہے مگر نفس پرستی ایک اجنبی مہمان کو بلا لاتی ہے جس سے ہلاکت کا خطرہ ہے۔ خواہش نفس کا ظہور یوں تو ہر عمر میں تکلیف دہ ہوتا ہے مگر جوانی میں تو یہ خطرہ ہے کہ وہ انسان کو وضع فطرت سے

بالکل منحرف نہ کردے یعنی قوت ارادی اور حسیات کے توازن کو ناقابل تلافی طور پر بگاڑ نہ دے۔ ایک لڑکا جو پہلی بار کسی عورت سے خواہ وہ کوئی بھی ہو وقتی دلچسپی کے طور پر صحبت کرتا ہے وہ اصل میں اپنی جسمانی، ذہنی اور اخلاقی زندگی کو جوکھم میں ڈال رہا ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ کل اس کا اثر اسے اپنے گھر میں اپنے کام میں اپنی معاشرتی زندگی میں نظر آئے گا وہ نہیں جانتا، کہ حسّی لذت کا انکشاف کیونکر بھوت بن کر اس کے پیچھے پڑ جائے گا، اسے حقیقی معنی میں اپنا بندہ بنائے گا اور یہ بندگی ایسی ہو گی جس سے نجات کی آس نہیں۔ ہم نے بہت سی زندگیاں دیکھی ہیں جن سے ابتدا میں بڑی بڑی امیدیں تھیں مگر آگے چل کر برباد گئیں اور ان کی پہلی ناکامی کی گھڑی وہی تھی جو ان کی پہلی اخلاقی لغزش کی تھی۔"

"شاعر کے مشہور اشعار میں فلسفی کے ان الفاظ کا مضمون یوں ادا کیا گیا ہے:۔

انسان کی اچھوتی روح ایک گہرے برتن کی طرح ہے
اگر وہ پہلے قطرے جو اس میں ڈالے جائیں ناپاک ہوں
تو پھر چاہے اسے سات سمندر کے پانی سے دھوئیں
اس کی اتھاہ گہرائی کسی طرح پاک نہیں ہو سکتی۔"

"گلاسگو یونیورسٹی کے عضویات کے پروفیسر جان جی۔ ایم کینڈرک کی نصیحت بھی اس سے کم اہم نہیں۔ "جذبہ شہوانی کو جو نیا نیا پیدا ہوتا ہے ناجائز طور پر تسکین دینا نہ صرف اخلاقی جرم ہے بلکہ جسم کے لئے بھی نہایت مضر ہے۔ یہ نئی ضرورت اگر پوری کر دی جائے تو ظالم حاکم کی طرح سر پر سوار ہو جاتی ہے۔ مجرمانہ مروّت سے کام لے کر انسان اس کی اطاعت کرتا ہے اور اسے اور بھی تحکم پسند بنا دیتا ہے۔ ہر نئے فعل سے عادت کی زنجیر میں ایک اور کڑی بڑھ جاتی ہے۔

"بہتوں میں اُسے توڑنے کی طاقت نہیں رہتی اور بے بسی کی حالت میں ان کا خاتمہ جسمانی اور ذہنی تباہی پر ہوتا ہے۔ وہ اس عادت کے غلام بن کر رہ جاتے ہیں جو اکثر

بدی کی وجہ سے نہیں بلکہ جہالت کی وجہ سے پڑ جاتی ہے۔ اس سے محفوظ رہنے کی بہترین تدبیر یہ ہے کہ انسان اپنے خیالات کو پاک رکھے اور اپنی ساری زندگی کا انضباط کرے۔"

اس کے بعد موسیو بورو ڈاکٹر ڈیس کاند کا یہ قول نقل کرتے ہیں "رہی جنسی خواہش سو ہمارا دعویٰ ہے کہ عقل اور ارادے کو اس پر پورا پورا قابو حاصل ہے۔ یہ ضروری ہے کہ جنسی حاجت کا نہیں بلکہ جنسی خواہش کا لفظ استعمال کیا جائے کیونکہ یہ کوئی عضوی وظیفہ نہیں ہے جس کے پورے ہونے پر انسان کی زندگی موقوف ہو۔ حقیقت میں یہ کوئی حاجت نہیں ہے مگر بہت سے لوگوں نے اسے حاجت سمجھ رکھا ہے۔ وہ اس خواہش کو جس نظر سے دیکھتے ہیں اس کی وجہ سے ان کے نزدیک جماع اشد ضروری چیز ہے۔ ہم تو ہرگز اس فعل کو فطری قوانین کی اضطراری اور انفعالی اطاعت کا نتیجہ نہیں سمجھتے۔ بلکہ ہمارے خیال میں وہ ایک فعل اختیاری ہے جو اپنے قصد یا اپنی مرضی سے کیا جاتا ہے اور اکثر اس کی تجویز اور تیاری پہلے سے ہوتی ہے۔" (باقی آئندہ)

قربانی

ہر ملک اور ہر قوم کی ابتدائی تہذیب میں جبکہ انسان کے دماغ میں خدائے واحد کا تخیل اور اس کی صفات کا تصور ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ انسان اپنے ذہنی دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لئے انسان اور جانور کی قربانی کو سب سے زیادہ افضل سمجھتا تھا کیونکہ وہ اپنے دیوتاؤں کو اپنا ہی جیسا کھانے پینے کا پابند اپنی ہی شکل کے مشابہ اور اپنے ہی جیسے جذبات رکھنے والا خیال کرتا تھا جیسا کہ پرانے دیوتاؤں کے مجسموں کے مشاہدے سے ثابت ہوتا ہے جو انسانی شکل کے مشابہ ہیں۔ رفتہ رفتہ جب انسان کی دماغی حالت میں کچھ ترقی ہوئی تو اس نے دیوتاؤں پر انسان کا خون چڑھانا ترک کر دیا لیکن جانوروں کی قربانی بعض قوموں میں اب تک جاری ہے، جیسے ہندوستان میں کالی کلکتہ والی پر آج بھی ہزارہا جانور قربان کئے جاتے ہیں ہر نوع قربانی کی ابتدا ہر ملک اور ہر قوم کی ابتدائی تہذیب میں اسی باطل اعتقاد کے ماتحت ہوئی کہ خدا اپنی شکل، ضروریات عادات و جذبات میں انسان کے مشابہ ہے اور جو جانور شراب پھل پھول اور زیورات وغیرہ اس پر چڑھائے جاتے ہیں وہ ان کا جوہر استعمال کرتا ہے اور چونکہ یہ قربانی کی رسم انسان کے دماغ میں خدا کا تصور پیدا کرنے کے لئے ہزارہا سال سے امداد کرتی چلی آرہی تھی اور اُس زمانہ کے نیم وحشی انسان کی فطرت کا ایک جز ہو گئی تھی اور ان کی ضروریات زندگی اور تمدن کے لحاظ سے ان کے لئے بہت مفید تھی اس لئے فطرت انسانی کے پیدا کرنے والے خدا نے جب عرب کی نیم وحشی قوم میں آج سے چودہ سو برس پہلے نبی آخر الزماں کے ذریعہ سے اپنی ذات وصفات کا صحیح تصور قائم کرنا چاہا تو اس مروجہ رسم کو شراب یا "ربا" (یعنی مستحقین خیرات وزکوٰۃ وقرض حسنہ کو دوگنے اور چوگنے سود پر روپیہ قرض دینا) کی طرح سے حرام یا ناجائز نہیں کیا کیونکہ وہ شراب یا ربا کی طرح سے مخرب اخلاق یا مضر نہیں تھی بلکہ وقتی اور مقامی تمدنی ضروریات کے لحاظ سے ایک

مفید اور کار آمد رسم تھی مگر چونکہ وہ ایک باطل اعتقاد کے ماتحت دیوتاؤں کو خوش کرنے کا ذریعہ سمجھی جاتی تھی اس لئے جب خدا نے اس کے وقتی اور مقامی فوائد کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کو مثل شراب و ربا کے حرام یا ناجائز نہیں کیا تو یہ لازمی بات تھی کہ جس باطل عقیدے کے ساتھ یہ وابستہ تھی اس عقیدے کی تردید و تکذیب کر کے خدائے واحد کے عقیدے کے ساتھ اس کو وابستہ کیا جائے چنانچہ اس کے متعلق جو آیت کلام مجید میں نازل ہوئی ہے وہ یہ ہے۔ "۲۲: ۳۷۔ لن ینال اللہ لحومھا و لا دماؤھا و لکن ینالہ التقویٰ منکم۔ یعنی نہ تو ان کا گوشت اور نہ خون خدا قبول کرتا ہے بلکہ وہ تمہارا تقویٰ (یعنی برائیوں سے بچنا) قبول کرتا ہے۔" اور پھر دوسری جگہ ارشاد فرمایا "۴۹: ۱۵۔ او جاھدوا باموالھم و انفسھم فی سبیل اللہ، اولئک ھم الصدقون (یعنی اور جو خدا کی راہ میں اپنی دولت اور اپنے نفس کے ساتھ کوشش کرتے ہیں وہی سچے مومن ہیں)" ان دونوں آیتوں کا جن میں پہلی خاص قربانی کے متعلق ہے اور دوسری بطور عام حکم کے ہے یہی مطلب ہے کہ جانوروں کی خونریزی خدا کی نظروں میں کوئی فعل حسن نہیں ہے کیونکہ وہ گوشت اور خون کو قبول نہیں کرتا ہے جیسا کہ اسلام سے پہلے لوگوں کا اعتقاد تھا بلکہ اس کے نزدیک سچا مومن وہ ہے جو برائیوں سے بچتا ہے اور خدا کی راہ میں اپنے جان و مال سے کوشش کرتا ہے یعنی بنی نوع انسان کی خدمت کرتا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب جانوروں کی قربانی خدا قبول نہیں کرتا ہے تو پھر ان کا ذکر کلام مجید میں کیوں آیا اور ان کی قربانی کے متعلق ہدایتیں کس لئے نازل ہوئیں۔ غلامی کی رسم کے متعلق کلام مجید کے احکام پر غور کرنے سے یہ سوالات خود بخود حل ہو جائیں گے۔ اس رسم کے متعلق کلام مجید نے کہیں صاف الفاظ میں ممانعت نہیں کی بلکہ اس کو جائز رکھتے ہوئے غلاموں کے ساتھ نیک سلوک کرنے اور ان کو آزاد کرنے کی جابجا ترغیب دی ہے اور اس کو ایک کار ثواب بتلایا ہے اور بعض مقامات پر کسی فرض کی عدم ادائگی کے کفارے یا کسی قصور کی تلافی میں غلاموں کو آزاد کرنے کا حکم دیا ہے تو کیا کلام مجید میں اس رسم کے بند کرنے کا صاف حکم نہ ہونے اور گناہوں کے

کفارے میں غلاموں کو آزاد کرنے کی ہدایتیں موجود ہونے سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ غلامی کی رسم کو قائم رکھنا خدا کی منشا کے مطابق ہے اور اگر اس کو قائم نہ رکھا گیا تو بعض گناہوں کے کفارے میں جو غلاموں کو آزاد کرنے کا حکم ہے اس کی حکم عدولی ہو جانے سے مسلمان گناہ کے مرتکب ہو جائیں گے۔ اکثر مسلمانوں کا ایسا عقیدہ ہے تو اسلام پر غیر مسلم کا یہ اعتراض بالکل صحیح ہوگا کہ اسلام نے اس وحشیانہ رسم کو جائز قرار دے دیا لیکن ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مسلمان کبھی اسلام پر اس اعتراض کا عائد کیا جانا پسند نہیں کرتے بلکہ اس کے خلاف یہ ثابت کرتے ہیں کہ اسلام ہی نے سب سے پہلے اس رسم کے بند کرنے کی کوشش کی۔ اگر رسم غلامی کے متعلق کلام مجید میں صاف الفاظ میں ممانعت نہ ہوتے ہوئے بلکہ برعکس اس کے غلاموں کے ساتھ سلوک کرنے اور گناہوں کے کفارے میں آزاد کرنے کی ہدایتیں موجود ہوتے ہوئے مسلمان اس رسم کو بند کرنے سے کسی گناہ کے مرتکب نہیں ہوتے تو کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ جانوروں کی قربانی کے متعلق محض کلام مجید میں بعض ہدایتیں موجود ہونے سے اس رسم کو بند کرکے دوسرے مفید ذرائع سے اس کی روح کو قائم رکھنے سے مسلمان کیونکر کسی گناہ کے مرتکب ہو سکتے ہیں۔ خاصکر ایسی حالت میں جبکہ کلام مجید نے صاف بتلا دیا کہ خدا جانوروں کا گوشت یا خون قبول نہیں کرتا بلکہ وہ تمہارا تقوٰے پسند کرتا ہے جس طرح سے بعض مخصوص وقتی اور مقامی وجوہات کی بنا پر کلام مجید نے رسم غلامی کو قائم رکھا اور فوراً بند کرنے کا صاف الفاظ میں حکم نہیں دیا اسی طرح سے بعض دیگر وقتی اور مقامی وجوہات کی بنا پر جن کی تفصیل اوپر بیان کی گئی ہے رسم قربانی کو بھی قائم رکھا اور فوراً بند کرنے کا حکم نہیں دیا اور جس طرح رسم غلامی کی موجودگی میں بہترین انسانی خدمت غلاموں کو آزاد کرنے کے ذریعہ سے کی جاسکتی تھی وہ رسم غلامی کے بند ہو جانے کی صورت میں ان جدید ذرائع سے کی جاسکتی ہے جو موجودہ کشمکش حیات کے باعث غلاموں کو آزاد کرنے کے مقابلے میں زیادہ اہم اور مفید ہیں اسی طرح سے آج سے چودہ سو برس پہلے کے مقامی طرز معاشرت کی موجودگی میں جو بہترین انسانی خدمت جانوروں کو قربان کرکے ان کا گوشت

تقسیم کرکے کی جاسکتی ہیں۔ وہ آج اس ترقی تہذیب کے زمانے میں جبکہ مسلمانوں کی تعداد کروڑوں سے تجاوز کر گئی اور ان کی ضروریات تبدیل ہو گئیں اور کثیر التعداد ہو گئیں اور ان کا طریق زندگی بدل گیا ان جدید ذرائع سے کی جاسکتی ہے جو تقسیم گوشت کے مقابلہ میں زیادہ ضروری اور منفعت بخش ہیں مثلاً درسگاہیں، یتیم خانے خیراتی شفاخانے تجارتی کمپنیاں اور کارخانے وغیرہ قائم کرنا۔

اب ہم قربانی کی اس آیت پر غور کریں گے جو کلام مجید میں خاص قربانی کی ہدایت کے متعلق نازل ہوئی ہے۔ "۲۲: ۲۷و۲۸ - وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ یَاْتُوْکَ رِجَالًا وَّعَلٰی کُلِّ ضَامِرٍ یَّاْتِیْنَ مِنْ کُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ ۙ لِّیَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَیَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِیْۤ اَیَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰی مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِیْمَةِ الْاَنْعَامِ ۚ فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْبَآىِٕسَ الْفَقِیْرَ۔ ترجمہ۔ اور انسان کے درمیان حج کا اعلان کر دے وہ تیری طرف پیدل اور ہر جھکے ہوئے اونٹ پر آئیں گے ہر ایک دور کے راستے سے آتے ہوئے تاکہ وہ اپنے واسطے فائدے دیکھیں اور مقررہ اوقات میں خدا کا نام لیں ان پر جو کہ اس نے ان کو چوپایوں سے دیا ہے، تب اس میں سے خود کھاؤ اور مصیبت زدہ اور محتاجوں کو کھلاؤ۔" ان آیات میں قربانی کے متعلق صرف دو ہدایتیں ہیں ایک یہ کہ جو کچھ چوپایوں کی قسم سے خدا نے ان کو دیا ہے اس پر مقررہ وقت میں خدا کا نام لیں اور دوسرے یہ کہ اس میں سے خود کھائیں اور مصیبت زدہ اور محتاجوں کو کھلائیں۔ غریبوں اور محتاجوں کی مدد کرنے کا اصول "اوجاهدوا باموالهم" عملی طور پر سمجھانے کے لئے اور خدائے واحد کا تصور ذہن میں پیدا کرنے کے لئے ابتدائی طریقہ قدرتی طور پر یہی ہو سکتا تھا کہ جو رسم قربانی ان میں قدیم الایام سے جاری تھی اور ان کی وقتی اور مقامی ضروریات کے اعتبار سے ان کے لئے مفید تھی اسی کے ذریعے سے ان کو یہ دونوں باتیں سمجھائی جائیں لہٰذا خدائے واحد کے تصور کی طرف رہنمائی کرنے کے لئے مقررہ اوقات میں اس پر خدا کا نام لینے کی ہدایت کی گئی اور غریبوں اور محتاجوں کی امداد کا سبق سکھانے کے لئے اس میں سے مصیبت زدہ اور محتاجوں کو کھلانے کا حکم نازل ہوا۔ باقی جانوروں کی قربانی کا جہاں تک تعلق ہے وہ صرف ان دونوں اصولوں کو عملی طور پر

سمجھانے کا ایک مقامی اور ابتدائی ذریعہ ہے نہ کہ ایک دائمی حکم ہے۔ اگر خدا جانوروں کی قربانی کا اپنی طرف سے حکم دیتا تو وہ اپنے ہی حکم کے متعلق یہ کبھی نہیں فرماتا کہ "میں ان کا گوشت اور خون قبول نہیں کرتا ہوں" اس کی مثال ایسی ہے جیسی والدین اور بچوں کی جب بچے بالکل چھوٹے ہوتے ہیں اور ان کی ذہنیت محدود ہوتی ہے تو والدین ان کی بہت سی باتوں کو برداشت کر کے ان کی صرف اس قدر تصحیح کر دیتے ہیں جتنی کہ ان کے لئے مفید ہوتی ہے اور جتنی کہ وہ اس عمر میں سمجھ سکتے ہیں اور برداشت کر سکتے ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ بچوں کی صحت کے لئے کھیل کود بہت مفید ہے لیکن وہ کھیلتے میں اپنے جسم کو غلاظت بھی لگا لیتے ہیں مگر سمجھدار والدین ان کو محض غلیظ ہو جانے کی وجہ سے کھیل کود سے قطعی منع نہیں کرتے ہیں بلکہ ان کو صاف رہنے کی ہدایت کرتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ خود اپنے ہاتھ سے ان کو نہلاتے دھلاتے اور صاف کپڑے پہناتے ہیں لیکن جب وہ بڑے ہو کر سمجھدار ہو جاتے ہیں اس وقت والدین ان کے کھیل کود میں مصروف رہنے کو پسند نہیں کرتے کیونکہ اب کھیل کود ان کے لئے مضر ہے۔ کھیل کود کی بجائے اب ان کے لئے مشکلات زندگی کا مقابلہ کرنا زیادہ مفید ہے۔ اس حقیقت سے کوئی تاریخ داں انکار نہیں کر سکتا کہ نزول قران کے وقت عرب ایک متمدن قوم ہونے کے اعتبار سے ایک بچہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی تھی اور خدا کا انسان کے ساتھ تعلق بالکل والدین کی طرح سے مانا جاتا ہے لہٰذا جب تمدن کے بچے کو تمدن کی ابتدائی باتیں سکھائی گئیں تو بالکل بچوں کے کھیل کود کی طرح سے ان کی قربانی کی رسم کو ان کے وقتی اور مقامی مفاد کی غرض سے برداشت کیا لیکن اس کی غلاظت سے روکنے کے لئے ان کے اس باطل اعتقاد کی تغلیط کر دی گئی کہ خدا جانوروں کی قربانی سے خوش ہوتا ہے مگر چونکہ اب تمدن کا بچہ اپنی بچپن کی منزلیں طے کر چکا تو اس کے لئے جانوروں کی قربانی کا کھیل کود مفید نہیں رہا اب اس کے لئے اپنی جان و مال سے بنی نوع انسان کی خدمت کرنے کے وہی آج سے چودہ سو برس پہلے کے عرب کے وقتی اور مقامی ذرائع بیکار ہیں چونکہ زندگی بالکل بدل گئی لہٰذا زندگی کی مشکلات کا مقابلہ کرنے کے ذرائع بھی بدل گئے لہٰذا اب اس کو

بنی نوع انسان کی خدمات کے وہی ذرائع استعمال کرنے چاہئیں جو اس کی موجودہ ضروریات کے لحاظ سے مفید ہوں تاکہ وہ خدا کی خوشنودی کا باعث ہوں اور یہ مسئلہ اس قدر صاف ہے کہ اس میں اور مزید بحث کی ضرورت نہیں تاہم اتمام حجت کے واسطے ہم ایک اور پہلو سے بھی اس پر غور کریں گے حج کے متعلق جو آیت اوپر نقل کی گئی اس میں خدا نے یہ پیشینگوئی کی ہے کہ اسلام تمام دنیا میں پھیل جائے گا اور لوگ دور دراز ممالک سے پیدل اور اونٹوں پر حج کے لئے آیا کریں گے۔
اگرچہ اس عالم الغیب خدا کو یہ علم تھا کہ لوگ ریلوں، موٹروں اور طیاروں میں بھی حج کے لئے آیا کریں گے لیکن اس پیشینگوئی میں اس نے ان سواریوں کا ذکر اس لئے نہیں کیا کہ اس زمانے کے لوگ ان چیزوں کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے بلکہ سواری کے لئے صرف اونٹ کا لفظ استعمال کیا کیونکہ عرب میں دور دراز سفر کے لئے اس زمانہ میں صرف اونٹ ہی استعمال ہوتا تھا، لہٰذا دور دراز سفر کی سواری کے لئے صرف اونٹ کا لفظ استعمال کیا گیا اور چونکہ خدا نے اس پیشینگوئی میں سواری کے لئے صرف اونٹ کا لفظ استعمال کیا ہے اس لئے اگر اونٹ کے لغوی معنی ہی لئے جاویں تو خدا کی پیشینگوئی غلط ہوئی جاتی ہے مگر چونکہ خدا کی پیشینگوئی غلط نہیں ہو سکتی لہٰذا اونٹ کے معنی لازمی طور پر سواری کے لینے پڑیں گے یعنی لوگ مختلف قسم کی سواریوں میں جو جس زمانہ میں رائج ہوں گی حج کے لئے دور دراز راستہ سے آیا کریں گے۔ لہٰذا جب اُسی آیت میں ایک مخصوص چوپایہ یعنی اونٹ کا لفظ مختلف سواریوں کا مفہوم اپنے اندر شامل کر سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ انہیں وجوہات کی بنا پر چوپایوں کا لفظ جو اس زمانہ میں معیار دولت سمجھے جاتے تھے دولت کا مفہوم اپنے اندر شامل نہ رکھتا ہو اور جب اونٹ کی سواری کے بجائے جس کا نام کلام مجید میں مخصوص طور پر بیان کیا گیا ہے ریل، موٹر اور طیارے جو اس زمانہ میں بہترین اور مفید ترین سواری کے ذرائع ہیں حج کے لئے استعمال ہو سکتے ہیں تو چوپایوں کی بجائے جو اب معیار دولت نہیں رہے اور جن کو خدا تو پہلے ہی سے قبول نہیں کرتا تھا روپیہ پیسہ جو اس زمانہ میں بہترین اور مفید ترین معیار دولت ہے کس وجہ سے استعمال نہیں ہو سکتا۔

عیدالضحیٰ اور حج کے موقع پر اب جانوروں کی قربانی کی قطعی ضرورت نہیں کیونکہ اس زمانہ میں نہ تو اس سے قوم کو وہ فائدہ پہنچتا ہے جو اس زمانہ میں پہنچ سکتا تھا جبکہ مسلمان، صرف عرب کے اندر ہی محدود تھے اور انکی سیدھی سادی ضروریات میں صرف پیٹ بھرنے ہی کی ضرورت سب سے زیادہ اہم ضرورت تھی بلکہ جانوروں کی قربانی کی بجائے روپیہ اور پیسہ کی قربانی کی ضرورت ہے کیونکہ اول تو ان کی تعداد اس قدر بڑھ گئی ہے کہ اگر تمام دنیا کے مسلمان جن پر حج فرض ہو سکتا ہے حج کے واسطے مکہ معظمہ جائیں اور وہاں کروروں کی تعداد میں چوپائے قربان کریں تو ان کا محض گوشت ہی ضائع نہ جائے بلکہ وہ جگہ اتنی غلیظ ہو جائے کہ رہنے کے قابل بھی نہ رہے اور دوسرے مسلمانوں کی ضروریات اب محض پیٹ بھرنے ہی تک محدود نہیں رہی ہیں بلکہ اس سے اور زیادہ اہم ضروریات ہیں جن کے پورا کرنے سے مسلمانوں میں محتاجوں کی تعداد خود بخود کم ہو سکتی ہے اور جن پر ان کی قومی بقا و استحکام کا دارومدار ہے اور جو مسلمانوں کی خاص توجہ کی محتاج ہیں۔ کس قدر افسوس اور عبرت کا مقام ہے کہ مسلمان ہر سال عیدالضحیٰ اور حج کے موقع پر اپنا کروڑہا روپیہ چوپایوں کی بیکار خونریزی پر صرف کریں اور جس کے باعث ہندوستان میں انسانی خونریزی مزید برآں ہو اور یہ تصور کریں کہ اس بیکار حیوانی اور انسانی خونریزی سے خدا خوش ہوتا ہے جبکہ اس نے صاف صاف الفاظ میں یہ فرمادیا کہ میں ان کا گوشت یا خون قبول نہیں کرتا اور جبکہ ان کے کروڑہا مفلس بیمار اور کمزور بھائی جو واقعی امداد کے مستحق ہیں بھوکے اور پیاسے گرمی سردی اور بیماری کی تکلیفیں برداشت کرتے ہوئے ٹھوکریں کھاتے پھریں اور جبکہ ان کے ہزاروں قومی بہبودی اور ملکی ترقی کے کام روپیہ کی کمی کی وجہ سے نامکمل پڑے رہیں یا برباد ہو جائیں۔ کیا وہ مذہب جس نے یگانگی اور انسانی برادری کا سبق اول اور آخر مرتبہ دنیا میں انسان کو سکھایا۔ قوم کے محتاج اور اپاہج لوگوں کی پرورش نگرانی اور تعلیم اور قومی اور ملکی ترقی کے واسطے زکوٰۃ کو فرض کیا اور خیرات کرنے اور اپنی جان و مال سے بنی نوع انسان کی خدمت کرنے کو سچے مومن کا شعار بتلایا اس ظلم وستم کو روا رکھ سکتا ہے۔

بہرحال رسم قربانی کے متعلق جو آیات کلام مجید میں نازل ہوئی ہیں ان پر جس پہلو سے بھی غور کیا جائے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ جانوروں کی قربانی بذات خود کوئی خدا کا استمراری حکم یا نیکی یا اس کے خوش کرنے کا ذریعہ نہیں ہے خدا تو برائیوں سے بچنے اور اپنی جان ومال سے بنی نوع انسان کی خدمت کرنے سے خوش ہوتا ہے اور اس خدمت کا جو بہترین اور مفید ترین ذریعہ جس ملک اور جس زمانے میں ہو اسی ذریعے کے استعمال کرنے میں خدا کی منشاء کے مطابق خدا کی فرمانبرداری ہوتی ہے لہٰذا اگر اس زمانہ میں ہندوستان کے مسلمان خدا کی منشاء کے مطابق قربانی کی رسم جاری رکھنا چاہتے ہیں جیسا کہ ہر سچے مومن کا فرض ہے تو ان کو عید الضحیٰ اور حج کے موقعوں پر ان موجودہ اسلامی انجمنوں کو روپیہ بھیجنا چاہیئے جو ان کے نزدیک انسانی خدمات کر رہی ہیں اور ان تمام انجمنوں کو ایک مرکزی تنظیم کے ماتحت قائم کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے جیسی جماعت احمدیہ کی مرکزی تنظیم قایم ہے۔

(مضمون نگار صاحب نے "ضروریات حیات" اور "اسلامی انجمنوں" کے بقا کی فکر میں یہ نہیں خیال رکھا کہ افراد کی مصلحت اندیشی سے اصول دین میں ترمیم نہیں ہوا کرتی۔

حقیقت یہ ہے کہ حج اسلام کا نہایت اہم رکن ہے جس کے ذریعہ امت اسلامیہ کی اجتماعی فلاح و بہبود کا انحصار ہے دنیا کی کسی قوم اور کسی ملت کے پاس حج جیسی مقدس انجمن نہیں ہے حج کے ذریعہ سے ساری امت اسلامیہ ایک ہو سکتی ہے اور میدان عرفات میں ہر سال کے خاتمہ پر نئے سال کے لئے اجتماعی لائحہ عمل امت کے واسطے مرتب کرکے پیش کیا جا سکتا ہے اس اجتماع ملت کی حیثیت جس میں اطراف عالم سے مسلمان آکر شریک ہوتے ہیں ضیوف الٰہی کی حیثیت ہے۔ اس لئے اللہ نے ان لوگوں کو جن کو اس نے دولت دے رکھی ہے فرض کر دیا ہے کہ اس موقع پر قربانیاں کرکے خود بھی کھائیں اور غرباء اور مساکین کو بھی کھلائیں۔ قرآن میں ہے "فکلوا منھا و اطعموا القانع والمعتر"

اس حقیقت کو پیش نظر رکھنے کے بعد کون ہے جو دنیاوی لحاظ سے بھی حج یا قربانی کی مخالفت کر سکتا ہے یا اس کے اوپر کسی وقتی یا ہنگامی ضرورت کو ترجیح دے سکتا ہے۔

رہیں مقامی قربانیاں سو وہ فریضہ نہیں ہیں بلکہ سنت ہیں۔ مگر سال بھر میں ایک دن قربانی کرکے کھانے اور کھلانے سے جس کا مقصد اجتماعیات میں شرکت ہے کونسا نقصان ہے کہ اس میں تبدیلی کی جائے اور پھر اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ قربانی کو بند کرنے کے بعد وہ رقم لازمی طور پر اسلامی انجمنوں کو مل جایا کرے گی؟ (ا - ج)

اسلام اور حالات حاضرہ

(یہ جناب محمد ابراہیم صاحب میر سیالکوٹی کا ایک لیکچر ہے جو انہوں نے جامعہ ملیہ کے سامنے ۱۷ر نومبر ۱۹۳۲ء کو دیا تھا)

اہل مشرق، عام اس سے کہ ہندو ہوں یا مسلمان، اس پر متفق ہیں کہ بعض ہستیاں ایسی بھی ہوتی ہیں جو دوسروں کے لئے موجب خیر و برکت اور باعث فیض و رحمت ہوتی ہیں ان کی برکات اخلاقی و روحانی بھی ہوتی ہیں اور مادی بھی یعنی تمدنی و سیاسی،

اہل یورپ کی ظاہر پرست مادی آنکھ نور روحانیت و اخلاقی شرافت سے بے بہرہ ہے اس لئے وہ اس حقیقت کے ادراک سے قاصر ہیں۔ ان کی تمام سعی مادی ترقی میں خرچ ہوتی ہے اور ان کے ظاہری و باطنی قوی تمام تر اسی میں مصروف عمل ہیں۔ اس لئے ان کو اس کی تحصیل میں ننگ انسانیت پیشوں کے اختیار کرنے سے بھی عار نہیں۔

یورپ کی اس مادی ترقی نے اہل مشرق کے دل و دماغ کو بھی حیران و پریشان کر دیا ہے اور ہم اس کریہہ و ناگوار طبع منظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے سادہ لوح بھائی اپنے آبائی مفاخر کو فراموش کر کے اور اپنی مایۂ ناز اخلاقی شرافت کو بالائے طاق رکھ کر یورپ کی اندھا دھند تقلید کر رہے ہیں، کچھ تو ان کی مادی ترقی دیکھ کر اور کچھ ان کے زیر اثر نشو و نما پا کر وہ یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ یورپ کے عروج و ترقی کا اصلی سبب یہی بے دینی و بداخلاقی ہے اور بس۔ اس طرح سے آہستہ آہستہ روحانی کیف اور اخلاقی اثر ان کے دل و دماغ سے بلکہ فطرت سے مٹ رہا ہے۔ فانا للہ

ایسی ترقی انسانیت کے لئے ہلاکت کا گڑھا ہے۔ کیونکہ انسان روح اور جسم ہر دونوں سے مرکب ہے جس طرح اسے جسم کی پرورش کے لئے مادی چیزوں کی ضرورت ہے اسی طرح اسے

روح کی تربیت وہدایت کے لئے روحانی امور کی بھی حاجت ہے۔

یہ امر مسلّم کل ہے کہ روح جوہر شریف ہے اور مادہ ایک خسیس چیز ہے پس خسیس جزو کی پرورش میں لگ کر شریف جوہر سے غافل و بے پروا ہو جانا شان عقلمندی کے خلاف ہے۔

ایسے ہی لوگوں کے مناسب حال قرآن مجید میں ارشاد ہے :۔

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا ۝ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ۝

(کہف پ۱۶)

یعنی (اے پیغمبرؐ!) اُن سے کہو کہ کیا ہم تم کو ایسے لوگوں کی خبر بتائیں جو اپنی عملی زندگی میں نہایت ہی خسارے میں ہیں یہ وہ ہیں جن کی ساری سعی دنیوی زندگی (کے اسباب کی تحصیل میں) برباد ہو گئی اس پر بھی وہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم جو کچھ بھی کر رہے ہیں اچھا کر رہے ہیں"۔

چونکہ یورپ کے اس جن کا تسلط ہم ہندوستانیوں (ہندو ہوں یا مسلمان) سب کے دماغوں پر تقریباً پورا پورا ہو چکا ہے۔ اور بدقسمتی سے ہمارے مذاق اخلاقی و روحانی حلاوت سے بے ذوق ہو گئے ہیں اس لئے بقولے "اگر زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز" میں اس کے متعلق اس تھوڑے سے وقت میں صرف یہ بیان کر سکوں گا کہ "دین و دنیا میں کیا جوڑ ہے" اور ایک انسان ایک ہاتھ میں دین اور دوسرے میں دنیا لے کر کس طرح زندگی بسر کر سکتا ہے۔ یا بالفاظ دیگر یہ کہ دیندار و پرہیزگار رہتے ہوئے بھی ہم کس طرح دنیا میں ایک مقتدر و مختار قوم بن سکتے ہیں۔ خدا کے فضل سے اسی میں آپ کا موجودہ عقدہ اسلام اور حالات حاضرہ بھی حل ہو جائے گا۔ وَمَا تَوْفِيْقِيْ اِلَّا بِاللّٰهِ

اسلام سے پیشتر عرب کے لوگ تین طرح پر تھے۔

ایک دنیا کی عیش و عشرت میں منہمک اور جسمانی لذتوں سے سرشار، توہم پرستی میں مبتلا اور رواج و رسمیات کے پھندوں میں گرفتار، وقت کے فیشن کے شیدائی اور مقتضائے حال کے فدائی، خدا سے غافل، عقل و انجام بینی کے دشمن، جذبات نفس کے مقہور، اعمال

کی بازپرس سے بے پروا ، ان کا خیال تھا کہ جو کچھ ہے بس یہی مادّی دنیا ہے اس کے بعد عالم عاقبت محض ایک ذہنی و خیالی چیز ہے جس کی حقیقت واقعی کچھ بھی نہیں پس جو جو امورِ عاقبت میں بکار آمد ہیں، یعنی عبادت الٰہی، نیک کرداری، پرہیزگاری، وغیرہا، ان کے اذہان ان کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتے تھے چنانچہ ان کی بابت فرمایا :-

يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غَافِلُوْنَ ٥ (روم پ ۲۱)	"یہ لوگ دنیا کی ظاہری زندگی تو خوب جانتے پہچانتے ہیں لیکن عاقبت کی طرف سے بالکل غافل ہیں"

نیز فرمایا :-

وَقَالُوْا اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ٥ (انعام پ ۷)	"یہ لوگ کہتے ہیں کہ بس ہماری تو یہی دنیا کی زندگی ہے اور ہم (حساب اعمال کے لئے) اٹھائے نہیں جائیں گے"

ان عیش پرستوں کے مقابلے میں ایک دوسرا گروہ بھی تھا، گو تعداد میں بہت تھوڑا تھا وہ ان دنیا داروں کی ایسی بری زندگی سے سخت بیزار اور جسمانی لذتوں اور فانی عیشوں سے سخت متنفر تھا۔ ان کا خیال تھا کہ کسب معاش زن و فرزند کے تعلقات، خدا کی یاد میں حارج ہوتے ہیں اور ان کی وجہ سے بہت سے گناہ سرزد ہوتے رہتے ہیں، جن سے انسانی اخلاق تباہ و برباد ہو جاتے ہیں اور نور روحانیت بجھ جاتا ہے۔

ظلم و ستمگاری، سرقہ و ڈکیتی، زنا و بدکاری، حسد و بغض، خیانت و مکاری، غرض سب برائیوں کا سرچشمہ یہی دنیا داری ہے۔ اس لئے وہ لوگ شہری رہائش اور دنیا داروں کی صحبت سے کنارہ کش ہو کر جنگلوں اور صحراؤں میں تجرّد کی زندگی بسر کرتے تھے، جہاں یہ سخت سخت ریاضتیں ان کا محبوب طبع، مرغوب دل اور فرحت بخش شغل تھیں ان کو رُھبان کہتے تھے چنانچہ اسی رہبانیت کی نسبت فرمایا :-

وَرَهْبَانِيَّةَ ن ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ (حدید پ ۲۷)	یعنی "ترکِ دنیا کی رسم انھوں نے از خود ایجاد کر لی تھی ہم نے ان پر مقرر نہیں کی تھی"

غرض یہ دنیا داری ہر دو گروہ کے نزدیک خدا سے غافل کر دینے والی چیز تھی، ایک نے تو اس میں پڑ کر خدا کو چھوڑ دیا اور جنھوں نے خدا سے لَو لگائی وہ اس دنیا کو سنبھال نہ سکے،

ان دونوں گروہوں کے درمیان ایک تیسرا گروہ بھی تھا، بظاہر درویش لیکن در باطن "گرگ در پوست میش" بھیڑ کی پوستین میں بھیڑیے۔ تلقین دین۔ تعلیم شرائع۔ اصلاح قوم کے دَم بھر کر دنیا حاصل کرنے والے، بلکہ دنیا داروں کی آنکھوں میں خاک ڈال کر ان کی بھی جیبیں کترنے والے، بڑے مکّار، پورے دنیا دار، چنانچہ ان کی بابت فرمایا:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ كَثِيرًا مِنَ الْأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُونَ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ (توبہ پ ۱۰)	"اے مسلمانو! بہت سے علماء (شریعت) اور مشائخ (طریقت) لوگوں کے مال باطل (طریق) سے کھاتے ہیں، اور خدا کی راہ سے روکتے ہیں"!

عرب سے باہر دوسری دنیا کی حالت بھی قریباً یہی تھی، ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ (روم۔ پ ۲۱) (خشکی و تری میں بگاڑ کا غلبہ ہو گیا) مصر و یونان، روم و ایران، تاتار و ہندوستان سب جگہ یہی حال تھا،

الغرض تین طرح کے لوگ تھے۔ عیش پرست جو خدا سے غافل تھے اور خدا پرست جو دنیوی تعلقات سے متنفر تھے اور مکّار دیندار دنیا دار، ایک تو اس تاریکی میں تھے کہ اس دنیا کے سوا کچھ ہے ہی نہیں، اور دوسرے اس غلطی میں تھے کہ دنیا بالکل بیکار و بے سود، بلکہ موجب خسران و نقصان ہے۔ دنیا میں لگیں، تو خدا سے غفلت اور خدا سے تعلق پیدا کریں، تو دنیوی تعلقات سے بے تعلق ہونا لازم اور تیسرے ان دونوں کو کھا جانے والے ہر ایک ان میں سے افراط و تفریط میں پڑ کر جادۂ اعتدال اور صراطِ مستقیم سے منحرف ہو چکا تھا۔ کیونکہ انسان محض مضغۂ گوشت ہی نہیں کہ اس کی کوشش صرف لحمی پرورش ہی پر ختم ہو جائے اور بس۔ پھر اس میں اور دیگر لا یعقل حیوانات میں کیا امتیاز رہے گا؟ اور اسے اشرف المخلوقات کہلانے کا کیا حق ہو گا؟

قرآن مجید میں اسی معنی میں فرمایا :-

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَأْكُلُوْنَ كَمَا تَأْكُلُ الْاَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ (محمد پ ۲۶)	"جو لوگ احسان فروش ہیں (یعنی پیغمبر برحق کی دعوت کا انکار کرکے خدا کے احسانوں پر پردہ ڈالتے ہیں) وہ (دنیا کے فوائد سے) متمتع ہوتے رہتے ہیں، اور کھاتے پیتے ہیں جس طرح بہائم ولایعقل حیوانات کھاپی کر زندگی گزارتے ہیں سو ان کا ٹھکانا جہنم ہے۔"

پھر یہ بھی سمجھنا چاہیئے کہ خدا نے انسان کی لحمی صورت میں ایک نورانی جوہر بھی رکھا ہے جس کی وجہ سے اسے دیگر اکثر مخلوقات پر خصوصی شرف وفضیلت ہے۔ اسی معنی کو سمجھانے کے لئے قرآن مجید میں ارشاد ہے :-

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰي كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا (بنی اسرائیل پ ۱۵)	"ہم نے بنی آدم کو بہت عزت بخشی اور ان کو خشکی اور تری میں سوار کیا اور ان کی روزی ستھری چیزوں کی بنائی، اور ان کو اپنی مخلوقات میں سے (بہت سی اجناس) پر بزرگی و برتری بخشی۔"

نیز یہ کہ انسان فرشتوں کی طرح محض روحانی نہیں ہے کہ محض ذکر خدا اس کی غذا و مایۂ حیات ہو، بلکہ اسے ایک نہایت شاندار اور خوبصورت ہیکل اور متناسب الاعضا سربلند قامت بھی بخشی گئی ہے، یہ ہیکل قدرت کی گرانمایہ امانت و ودیعت ہے، پس اس کا قائم رکھنا بھی انسان کا ایک بھاری فرض ہے۔ چنانچہ فرمایا :-

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ (والتین پ ۳۰)	"ہم نے انسان کو بہتر سے بہتر ساخت میں پیدا کیا ہے۔"

تیسرے گروہ کی غلطی یہ تھی کہ دینداری کی آڑ میں دنیا کمانا مکاری و عیاری ہے جو خلوص قلب اور انابت و رجوع الی اللہ کے خلاف ہے، یہ گروہ پہلے دونوں سے بدتر اور

نہایت خطرناک تھا، پہلے گروہ نے غلطی کی لیکن دنیا میں مشغول ہو کر خود فریب کھایا، کسی دوسرے کو نہیں دیا اور دوسرے گروہ نے غلطی کی، لیکن نیک نیتی سے اور نقصان کیا لیکن صرف دنیوی، باقی رہے یہ تیسرے مکار، سو انھوں نے جان بوجھ کر اپنی عاقبت برباد کر لی اور دیگر لوگوں کو فریب دے کر دنیا کمائی۔ اسی لئے قرآن شریف میں ان کی مذمت بیشتر ہے۔

پس آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہر فریق کو اس کی غلطی سے آگاہ کیا، اور دنیاوی تعلقات کو قائم رکھتے ہوئے پرہیزگار رہنے کی ہدایت کی، نہ صرف زبانی ارشاد وہدایت بلکہ اپنے نمونۂ عمل سے بتلا دیا کہ دین و دنیا ہر دونوں کی گٹھری کو سنبھالتے ہوئے دنیا کے خطرناک دریا سے اس طرح صحیح سلامت پار اتر سکتے ہیں! اَللّٰھُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ عَلٰی مُحَمَّدٍ نَبِیِّ الْمَرْحَمَۃِ۔ اس میں شک نہیں کہ صدیوں کی بگڑی ہوئی طبیعتوں میں یہ ذوق پیدا کرنا اور نسلوں کی اُلٹی ہوئی ذہنیتوں میں یہ خیال ڈالنا بہت مشکل تھا کہ اسی زندگی میں اور انہی چوبیس گھنٹے کے شب روز میں اپنی جسمانی پرورش اور زن و فرزند کے تعلقات اور کسب معاش اور ملک گیری وجہانبانی کی مصروفیتوں میں رہتے ہوئے اور نیند اور بیداری سفر و حضر، صحت وبیماری، دوستوں اور برادروں کے روابط، مخالفین کی مخالفت، حاسدوں کی مزاحمت ایسے امور کی کشمکشوں میں زندگی گزارتے ہوئے، قلبی انابت اور رجوع اپنے خالق ومالک کی طرف بھی رکھ سکتے ہیں۔

اور پھر یہ کہ ان سب تعلقات کو پرہیزگاری کے سایہ میں نبھا سکتے ہیں اور یہ مشاغل یاد خدا میں حارج نہیں ہوتے۔ چنانچہ فرمایا:-

يُسَبِّحُ لَهٗ فِيْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ۙ رِجَالٌ ۙ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ	ان (عبادت گاہوں) میں صبح وشام ایسے لوگ خدا کی تسبیح وتقدیس کرتے رہتے ہیں جن کو سوداگری اور خرید و فروخت خدا کے ذکر اور نماز کے قائم کرنے اور زکوٰۃ کے

يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ ۝

(نور پ۱۸)

ادا کرنے سے غافل نہیں کرنے پاتی۔ وہ لوگ اس دن سے ڈرتے ہیں جب مارے خوف کے دل الٹ جائیں گے اور آنکھیں پھری کی پھری رہ جائیں گی "۔

پھر یہ کہ یہ سب باتیں ذہنی طور پر سمجھا لینی اتنی دشوار نہیں جس قدر یہ کہ ایسی پست خیال، افتادہ اور صحرائی قوم کے عملی قویٰ میں حرکت پیدا کر کے ان کو مصروف عمل کرنا اور پھر کامیابی کے بام پر پہنچانا مشکل ہے۔

لیکن قربان اس رحمۃ للعلمین کے جس نے روحانیت و جسمانیت کا نہایت ہی نازک تعلق اور مشکل جوڑ فریقین کو ذہن نشین کرا کر ان کی غلط فہمی دور کر دی۔

بد تمیز عیش پرستوں میں تو حلال حرام کی تمیز پیدا کر دی اور اس طرح ان کی افراط کو حد اعتدال پہ لے آئے اور اس میں شک نہیں کہ تمتعات دنیوی سے حد اعتدال تک متمتع ہونے سے یاد خدا سے غفلت نہیں ہوتی، چنانچہ فرمایا:۔

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَا اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝

(پ۲۸ منافقون)

" مسلمانو! تم کو تمہارے مال اور تمہاری اولاد خدا کے ذکر سے غافل نہ کر دیں اور جو ایسا کرے گا یعنی ان میں مشغول ہو کر یاد خدا سے غفلت کرے گا تو وہ لوگ گھاٹے میں رہیں گے "۔

نیز فرمایا:۔

يَا بَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا ؕ وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ ؕ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ۝

(اعراف پ۸)

" اے بنی آدم! ہم نے تم پر ایک لباس انعام کیا جو تمہاری شرمگاہ کو ڈھانکتا ہے اور تمہارے لئے موجب زینت بھی ہے اور (اس کے علاوہ) لباس تقویٰ (بھی ہے) جو (اس ظاہری لباس سے) بہت بہتر ہے وہ خدا کے نشانات میں سے ہے تاکہ لوگ تذکر اختیار کریں "۔

اس وقت تک میں جو کچھ بیان کر سکا وہ سب قرآن مجید کی تعلیم کی خوبی کے متعلق تھا اس وقت تک مجھے موقع نہیں ملا کہ آپ کو قرآن حکیم کے "بیان" کی خوبی بھی بتاؤں یعنی یہ کہ قرآن مجید کسی امر کو کس طرح سمجھاتا ہے اور ذہن انسانی کو کس طرح ظاہر سے باطن یا محسوسات سے معقولات کی طرف انتقال کراتا ہے۔

میں جانتا ہوں کہ ان امور میں پڑ جانے سے میں اپنے موضوع سے کسی قدر دور جا پڑونگا لیکن آپ سے معافی کا خواستگار رہتا ہوا اتنا عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس آیت کے حُسنِ بیان اور طرزِ ادا نے مجھے مجبور کر دیا ہے کہ جب تک اس کی بابت کچھ مزید شرح نہ کرلوں آگے نہ بڑھوں۔

صاحبان! اس آیت کے آخر میں لفظ یَذَّکَّرُوْنَ ہے جس کے ترجمے کے لئے مجھے اپنے قصورِ علم یا نقصانِ زبان کی وجہ سے کوئی ایک لفظ اس کے مساوی نہ ملا تو میں اس کا ترجمہ نہیں کر سکا لہٰذا اب مرکب الفاظ میں تشریح کرنے کی ضرورت پڑی۔

تَذَکُّرْ کہتے ہیں ایک بات کو سمجھ کر دوسری بات کے یاد آجانے کو جیسے کہ ایک بات کے سمجھانے سے دوسری بات یاد کرا دینے کو تذکیر کہتے ہیں چنانچہ ارشاد ہے:۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ وَذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰمِ اللّٰهِ (ابراہیم پ۱۳)

"ہم نے موسےٰ کو اپنے نشان دے کر بھیجا کہ اپنی قوم (بنی اسرائیل) کو اندھیروں سے اُجالے کی طرف نکال لاؤ اور ان کو (ان کی موجودہ پست حالی میں) خدا کے ایام (انقلاب روزگار) یاد کرا کر نصیحت کرو۔"

اسی طرح یتیموں کے مال کی حفاظت اور پورے ناپ تول اور عدل و انصاف کی بات کہنے اور عہد کے پورا کرنے کے احکام ذکر کرنے کے بعد فرمایا:۔

ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝ (انعام پ۸)

"یعنی تم کو ان (مذکورہ بالا باتوں) کا (تاکیدی) حکم اس لئے کیا کہ تم تذکّر کرو۔"

یعنی ان امور پر شدت سے کاربند ہو جاؤ یہ سمجھ کر کہ اگر میرے بال بچے یتیم رہ جائیں اور

کوئی ظالم و غاصب ان کا مال ظلم سے کھا جائے اور اگر کوئی شخص کم تول کر یا کم ناپ کر دے اور اگر کوئی شخص میرے متعلق عدل و انصاف کی بات کو پس پشت ڈال دے اور اگر کوئی شخص مجھ سے عہد کرکے پھر جائے اور اسے پورا نہ کرے تو یہ سب باتیں مجھے کیسی بُری لگیں گی۔ بس اسی سے سمجھ لو کہ جس طرح یہ افعال تمہارے حق میں کسی اور سے سرزد ہوں تو تم کو بُرے لگیں گے اسی طرح جب تم کسی دوسرے کے حق میں یہی کام کروگے تو اس کو بھی نقصان وہ ہونے کی وجہ سے ویسے ہی بُرے لگیں گے پس تم ان بدخصائل سے مجتنب رہو۔

اسی طرح اس آیت لباس میں لفظ تَتَّقُوْنَ ذکر کرکے سمجھایا کہ جس طرح تمہارا ظاہری لباس تمہاری ظاہری پردہ پوشی اور زینت کا موجب ہے اسی طرح تقویٰ اور پرہیزگاری بھی ایک لباس ہے جو تمہارے باطنی عیوب چھپاتا اور تمہیں باطنی حسن سے زینت دیتا ہے اور عقل کی رو سے یہ بالکل ظاہر ہے کہ یہ باطنی پردہ پوشی اور زینت اس ظاہری پردہ پوشی اور زینت سے بدرجہا بہتر ہے پس اس کے حاصل کرنے میں سعی و کوشش کرنی لازم ہے۔

اب یہ سوال پیدا ہوگا کہ لباس ظاہری میں پردہ پوشی اور زینت تو ظاہر ہے لیکن تقویٰ میں یہ دونوں باتیں کہاں ہیں؟

اس کا جواب ہے کہ تقویٰ میں دو امر ہیں۔ خدا کے حکموں کو بجالانا اور اس کے منہیات سے باز رہنا، چنانچہ فرمایا:۔

"یہی (مذکورہ بالا تعلیم) میرا سیدھا راستہ ہے پس تم اسی کی پیروی کرنا اور (اس کے سوا دوسرے متفرق) رستوں کی پیروی نہ کرنا کہ وہ تم کو خدا کی راہ سے جدا کردیں گے۔ خدا نے تم کو ان باتوں کا وصیت (تاکید) اس لئے کی ہے کہ تم پرہیزگار بن سکو۔"	وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ (انعام پ ۸)

میرے معزز بھائیو! اور دوستو! ابھی ایک اور بات باقی ہے کہ لباس ظاہری میں پردہ پوشی اور زینت تو ظاہر ہے لیکن تقویٰ میں یہ دونوں باتیں کہاں ہیں؟

دیکھئے! اس آیت میں فَاتَّبِعُوْهُ کا امر بھی ہے اور لَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ کی نہی بھی ہے اور اسی امر و نہی پر کاربند ہونے کو تقویٰ کہا ہے۔ ھٰذا وَ لِلّٰہِ الحَمْدُ۔

پس لباس باطنی یعنی تقویٰ میں منہیات سے بچنے کی رَش تو پردہ ہے اور دوسری رَش یعنی خدا کے امروں کو بجا لانا وہ زینت ہے۔ اَللّٰھُمَّ جَمِّلْنَا بِالتَّقْوٰی

جو لوگ ظاہری لباس سے تو خوب مزین ہیں لیکن تقویٰ سے خالی ہیں، خواہ منہیات و معاصی کے ارتکاب کی وجہ سے خواہ فرائض و احکام کے ترک کی وجہ سے ان کی نسبت آنحضرتؐ نے فرمایا:-

کَاسِیَۃٌ فِی الدُّنْیَا عَارِیَۃٌ فِی الْاٰخِرَۃِ (صحیح بخاری)	ایسی بہت سی عورتیں ہیں کہ وہ دنیا میں تو لباس پہنے ہوئے ہیں لیکن آخرت میں وہ ننگی ہوں گی۔ (اعاذنا اللّٰہ منھا)

ہر چند کہ اس حدیث میں مونث کے صیغے ہیں لیکن مفہوم سے مستنبط ہو سکتا ہے کہ ایسے مردوں کا بھی حکم ایسا ہی ہوگا اور اب آج کل تو بہت سے نوجوان مرد بھی عورتوں کی طرح صورت شکل اور لباس میں محض ظاہری زیب و زینت کے دلدادہ و شائق ہو رہے ہیں اور سادگی اور محنت و جفاکشی ان میں نام کو نہیں رہی کیونکہ زینت اور یہ باتیں جمع ہونی مشکل ہیں۔

اس آیت لباس میں ابھی بہت سی باتیں نکلتی ہیں۔ لیکن اب میں اپنے اصل مضمون کے قریب آنے کے لئے اسی پر اکتفا کرتا ہوا آپ سے معافی چاہتا ہوں ؎

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم + چناں کہ حرف عصا گفت موسیٰ اندر طور

ہمارے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم جس طریق سے ان ہر دو گروہوں کو راہ راست پر لائے اس کا اجمالی نقشہ یوں ہے کہ ایک طرف تو آپ دنیاداروں کو تقویٰ اور پرہیزگاری کے ضروری درجہ اعتدال پر لائے اور دوسری طرف صحرانشین درویشوں کو وہاں سے اٹھا کر شہروں میں لائے کہ شہر اب تمہاری رہائش کے قابل ہو گئے ہیں اور تقویٰ و پرہیزگاری (جو تمہارا اصل مقصود ہے) اس پر عمل پیرا ہوتے ہوئے تمتعات دنیوی سے متمتع ہونا گناہ نہیں ہے۔ شہروں میں

رہو۔ بیوی بال بچے کے تعلقات قائم کرو۔ حلال وحرام میں تمیز کرتے ہوئے کسب معاش کرو اور خدا کی دی ہوئی نعمتوں سے فائدہ اٹھاؤ۔ تقسیم کار کے اصول سے اوقات نماز میں خدا کو یاد کرو۔ کسب کے اوقات میں روزی کماؤ۔ سونے کے اوقات میں آرام کرو۔ گویا معمورۂ عالم کو دنیا داروں اور درویشوں دونوں کے رہنے کے لائق بنا دیا۔

چنانچہ فرمایا :۔

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ۝ (اعراف پ)	"(اے پیغمبرؐ ان خشک زاہدوں سے) کہدو کہ خدا کی زینت جو اس نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کی اور روزی کی ستھری چیزیں کس نے حرام کیں؟ یعنی حرام نہیں ہیں"

باقی رہے تیسری صنف کے لوگ۔ سو ان کے لئے تھوڑی سی فہمائش کافی تھی مثلاً یہ کہ دنیادار تو تم ہو ہی اور دینداری کا دم بھی بھرتے ہی ہو ہم تم کو دنیا داری سے تو منع کرتے نہیں، ہاں یہ ضرور کہتے ہیں کہ تم اپنے عمل میں اخلاص پیدا کرو اور دینی فرائض محض خدا کی رضا کے لئے ادا کرو۔ دیندارانہ وضع کو ذریعہ معاش نہ بناؤ بلکہ ٹھیک اسی طرح دنیادار بن کر حلال وجوہ سے روزی کماؤ جس طرح وہ دنیا دار کماتے ہیں جن کو تم ٹھگتے ہو ایسے لوگ زیادہ تر اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) ہی تھے کیونکہ ایسے کام عموماً لکھے پڑھے اور خصوصاً صوفی صافی ہی کرتے ہیں اور نوشت خواند زیادہ تر اہل کتاب ہی میں تھی۔ اسمٰعیلی لوگ لکھنے پڑھنے سے عموماً عاری تھے وہ ایسی مکاری و عیاری نہیں جانتے تھے، اچھا برا جو کچھ کرتے تھے کھلم کھلا کرتے تھے۔ چنانچہ ان ظاہر پرستوں کی نسبت فرمایا :۔

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۝ حُنَفَآءَ وَ يُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ	"ان کو صرف یہی حکم دیا گیا تھا کہ وہ خدا کی عبادت یک رُخ ہو کر صرف اس سے جی لگانے کے لئے کیا کریں اور نماز بھی پڑھا کریں اور زکوٰۃ (بھی) دیا

وَ ذٰلِکَ دِیْنُ الْقَیِّمَۃِ (بیّنہ پ۳۰) ‖ کریں اور یہ پختہ کار لوگوں کا یہی دستور و آئین ہے۔"

ہر فریق کی اصلاح کے لئے قرآن شریف میں کثرت سے آیات ہیں لیکن میں وقت کی قلت کا لحاظ رکھتے ہوئے انہی آیات مذکورہ بالا پر اکتفا کرتا ہوں اور آپ کو حرف مطلب کے نزدیک ترلاتا ہوں۔

آنحضرت صلعم کی اس حکیمانہ تعلیم سے چند سالوں میں سب کے دماغ روشن ہو گئے اور اس آئینۂ حق نما میں سب کو اپنی کمی بیشی کی صورت اصلی رنگ میں نظر آنے لگی۔ حتیٰ کہ اب خدا تعالیٰ نے ان سے یوں خطاب کیا:۔

وَلٰکِنَّ اللّٰہَ حَبَّبَ اِلَیْکُمُ الْاِیْمَانَ وَ زَیَّنَہٗ فِیْ قُلُوْبِکُمْ وَ کَرَّہَ اِلَیْکُمُ الْکُفْرَ وَ الْفُسُوْقَ وَ الْعِصْیَانَ ط (الحجرات پ۲۶) ‖ "(مسلمانو!) خدا نے ایمان تمہارے نزدیک نہایت ہی محبوب کر دیا ہے اور اسے تمہارے دلوں میں زینت دیدی ہے اور کفر و بدکاری اور نافرمانی تمہارے نزدیک مکروہ و ناپسند کر دی ہے۔"

ملک کی سابقہ حالت کا اس موجودہ حالت سے مقابلہ کرتے ہوئے آپ کو نمایاں طور پر ایک عظیم انقلاب نظر آئے گا۔ زمین و آسمان تو وہی ہوں گے۔ اس زمین پر اس آسمان کے سایہ تلے اب وہ برے اقوال اور گندے افعال نہ پائے جائیں گے جن سے آسمان پھٹنے کے قریب ہوتا تھا اور زمین لرزتی تھی۔ ان آدمیوں کی صورتیں تو وہی نظر آئیں گی لیکن سیرتوں میں دن رات کا فرق معلوم ہوگا۔ یہ کوئی نئی نسل پیدا نہیں ہوئی تھی کہ نسلاً بعد نسلٍ ایسا بڑا انقلاب واقع ہو گیا ہو بلکہ اسی موجودہ نسل کے بڈھے اور جوان مرد اور عورتیں غلام اور ان کے بڑے بڑے گردنکش آقا، خدائے ذوالجلال کے آستانہ پر جبینِ نیاز گھس رہے ہیں اور گڑگڑا کر گذشتہ قصوروں کی معافی چاہ رہے ہیں۔

مدتوں کے بھاگے ہوئے غلام بغیر وارنٹ گرفتاری کے خود بخود کمال انابت و رجوع قلبی سے درگاہِ رب العزت میں حاضر ہو کر عفو جرائم کی درخواستیں گزار رہے ہیں اور لطف یہ کہ

اس میں روحانی حظ اور قلبی مسرت پا رہے ہیں۔

اینٹ پتھر کو سجدہ کرنے والے اب صرف اپنے مالک کے سامنے پیشانی زمین پر رکھ کر اس کی تسبیحیں پڑھ رہے ہیں اور قیصر و کسریٰ تک کے سامنے بھی نہیں جھکتے۔

شراب کے نشے سے سرشار ہو کر بدکاریوں میں راتیں گزارنے والے اور نیند کی بیہوشی سے صبح تک بستروں سے نہ ہلنے والے۔ عفیف و پرہیزگار ہو کر عیالدار ہوتے ہوئے شب بیدار تہجد گزار ہو رہے ہیں، جن کی شان میں یوں وارد ہے:-

تَتَجَافٰی جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّ طَمَعًا (الٓمٓ سجدۃ پ۲۱)	"ان کے پہلو بستروں سے ہٹ ہٹ جاتے ہیں۔ (اور وہ) اپنے پروردگار سے (اس کے عذاب کے) خوف سے اور اسکی رحمت کی امید پر دعائیں مانگتے ہیں۔"

نیز انہی کی صفت میں فرمایا:-

وَ الَّذِیْنَ یَبِیْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّ قِیَامًا (فرقان پ۱۹)	"نیز (رحمٰن کے بندے) وہ لوگ (ہیں) جو اپنے رب کے سامنے سجدے اور قیام میں یعنی تہجد کی نماز میں رات گذار دیتے ہیں۔"

بیوگان اور یتامیٰ کے مال ظلم و استبداد سے کھا جانے والے، جن کے پتھر جیسے دلوں پر اس کی کچھ بھی ٹھیس نہیں لگتی تھی اب وہ بیوگان کی عزت و حرمت کے محافظ اور یتیموں کے کفیل و مربی ہو رہے ہیں اور ان کے مالوں کی نگہبانی کے علاوہ ان کی تعلیم و تربیت میں اپنے عزیز مال و اوقات خرچ کر رہے ہیں کہ وہ کس مپرسی کی حالت سے ترقی کر کے اور قوم کے ہم سنگ ہو کر مفید ارکان ہو سکیں۔

جس قوم میں قانون وراثت میں اس قدر سخت قیدیں تھیں کہ عورت تو عورت ان نرینہ فرزندوں کو بھی محروم رکھا جاتا تھا جو گھوڑے کی پشت پر سوار ہو کر میدان کارزار میں لڑنے کے قابل نہ ہوں۔ اب وہ آنحضرت صلعم کی اصلاح کی برکت سے مرد کے ترکے سے عورت کو

والدین کے ترکے سے بیٹی کو اور خرد سال بلکہ شیر خوار بچے کو بھی حصّہ دے رہے ہیں۔

جو قوم ولادت کے وقت ہی لڑکیوں کا گلا گھونٹ دیتی تھی یا اگر زندہ رکھا تو چند سال بُری بھلی طرح پالتے رہے پھر صغر سنی ہی میں زندہ در گور کر دیا اب وہ اس رحمۃ للعٰلمین کی ہدایات پر عمل پیرا ہو کر اور آپ کے طریق عمل کی پیروی کر کے لڑکیوں کو نہایت شفقت و پیار سے پال رہے ہیں ان کو دین و اخلاق کی تعلیم دے رہے ہیں۔ ہنر اور سلیقہ سکھا رہے ہیں اور عورت کو مرد کے لئے امور خانہ داری میں ایک بہتر معاون و مشیر بنا رہے ہیں۔

سب سے بڑھ کر یہ کہ قدرت نے آنحضرت صلعم کو نمونہ عمل بنانے کے لئے ایک نہیں، دو نہیں، تین نہیں پوری چار بیٹیاں عطا کیں اور تین بیٹے بھی بخشے۔ لیکن خدائے حکیم کی حکمت دیکھئے کہ آپ کے سب بیٹے صغر سنی ہی میں فوت ہو گئے اور سب لڑکیاں زندہ رہیں جن کو آپ نے نہایت شفقت و پیار سے پالا وہ بلوغت کی عمر کو پہنچیں، آپ نے ان کی شادیاں کیں اور ان کے سب امور با حسن صورت انجام دیئے۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ عَلٰی مُحَمَّدٍ نَبِیِّ الرَّحْمَۃِ ؛

مسلمانو! میرے عزیز بھائیو! کیا آپ نہیں چاہتے کہ دلی عقیدت سے نوع انسانی خصوصاً صنف نازک کے ایسے شفیق محسن پر درود شریف بھیجیں، کیوں نہیں، ہاں تو پڑھیئے اَللّٰھُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ عَلٰی مُحَمَّدٍ نَبِیِّ الرَّحْمَۃِ

ظالم ڈاکو اور رہزن، کسی پر ترس نہ کھانے والے۔ اب قافلوں کے محافظ اور مظلوموں کے حامی اور مسلمانوں کے قائد و رہنما ہو رہے ہیں۔

زمانہ جاہلیت کے عربوں کی ضد اور تعصب، کبر و نخوت، فخر و مباہات، رعونت و غرور، آپس میں جنگ و جدال، فتنہ و فساد، مردم آزاری و خونریزی کس کو یاد نہیں ہے۔ وہی لوگ، ہاں وہی لوگ (نہ کہ آئندہ نسل) آنحضرت صلعم کی برکت سے آپس میں ایک دوسرے کے ہمدرد و غمخوار بلکہ بھائی بھائی ہو رہے ہیں انہی سے خطاب کر کے فرمایا۔

وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ اِذْ کُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِکُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِہٖٓ اِخْوَانًا (آل عمران پ۴)

"(مسلمانو!) تم خدا کی وہ نعمت بھی یاد کرو جب تم آپس میں دشمن تھے تو (خدا نے) تمہارے دلوں کو جوڑ دیا، پس تم اس کی نعمت (پیغمبر اسلام و کلام الٰہی) سے (آپس میں) بھائی بھائی ہو گئے"

اس کے بعد قدرت کا تماشا دیکھئے۔ کہ یہی بھیڑ بکری چرانے والے لوگ دنیا کے فاتح ہو کر اخلاق و تدین، تہذیب تمدن اور سیاست و جہانبانی میں استاد روزگار ثابت ہوئے۔ یہ کوئی معمولی انقلاب نہیں تھا میں اپنے ناقص مطالعہ کا اعتراف کرتے ہوئے نہایت وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ زمانہ کی آنکھ نے اپنی پیدائش سے اس وقت تک صفحہ ہستی پر یہ نظارہ کبھی نہیں دیکھا تھا۔ لیل و نہار کے دور میں اسے یہ سماں کبھی نظر نہیں آیا تھا وہ اپنی قسمت پر جس قدر بھی ناز کرے بجا ہے اور اپنے نصیبے پر جس قدر بھی فخر کرے اسے زیبا ہے کہ جس مبارک ہستی کے شوق میں اس نے لکھوکھا لیل و نہار کے سیاہ و سفید رنگ بدلے اور جس صاحب شوکت کے دیدار کی آرزو میں وہ ہزارہا سال سے آفتاب و ماہتاب کی نورانی آنکھوں سے منتظر تھا اُسے (صلعم) اس نے اپنی پیرانہ سالی کے آخری دور میں دیکھ لیا۔ اور دیکھا بھی تو ساری تمنائیں اور آرزوئیں اور جملہ مرادیں اور خواہشیں پوری کرتے ہوئے اور دامن کو گوہر مقصود سے بھرتے ہوئے دیکھا۔

زہے نصیب زمانے کے کہ اس نے اس دن کے بعد کہ عبداللہ بن عبدالمطلب کا یتیم ظالموں کے ظلم سے بچنے کے لئے اپنے وطن مالوف مکہ معظمہ سے رات کے وقت چھپکر ایک یار غار کے ساتھ ہجرت کر جاتا ہے۔ وہ دن بھی دیکھ لیا کہ وہ خدا کا سچا رسول (فداہ روحی) وعدۂ الٰہی اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْکَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّکَ اِلٰی مَعَادٍ (قصص پ۲۰) کی صدا کانوں میں رکھتے ہوئے اس شب ہجرت سے برابر آٹھویں سال دس ہزار قدسیوں کے ساتھ نہایت شان و شوکت سے فاتحانہ حالت میں پھر مکہ معظمہ میں داخل ہوتا ہے اور

فتح کا جھنڈا گاڑ کر اور خدائے واحد کے نام کا جلال پکار کر اپنی قوم کے تمام لوگوں کو خدا کا یہ پیغام سُناتا ہے :۔ یا معشر قریش ان اللہ قد اذھب عنکم نخوۃ الجاھلیۃ وتعظمھا بالاٰباء الناس من اٰدم واٰدم خلق من تراب ثم تلا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا یھا الناس انا خلقناکم الخ یا معشر قریش ویا اھل مکۃ ما ترون انی فاعل بکم قالوا خیرا اخ کریم وابن اخ کریم ثم قال اذھبوا فانتم الطلقاء (طبری جلد۳ صفحہ ۱۲۰) یعنی اے گروہِ قریش! بیشک خدا نے (آج) تم سے جاہلیت کی نخوت اور آبا و اجداد کی وجہ سے فخر کرنا دور کر دیا ہے۔ تمام لوگ آدم سے ہیں۔ اور آدم مٹی سے پیدا کیا گیا تھا پھر آپ نے یہ آیت پڑھی۔ اے لوگو! ہم نے تم سب کو ایک مرد (آدم) اور ایک عورت (حوا) سے پیدا کیا اور تمہاری ذاتیں اور برادریاں صرف تمہاری پہچان کے لئے بنائیں تم میں سے خدا کے ہاں بڑی عزت والا وہ ہے جو تم میں سے زیادہ متقی ہے۔ اے گروہِ قریش! اور اے اہل مکہ تمہارے خیال میں میں تم سے کیسا سلوک کروں گا۔ انھوں نے کہا نیک (سلوک)، آپ (ہمارے) صاحب کرم بھائی ہیں اور صاحب کرم بھائی (عبداللہ بن عبدالمطلب) کے بیٹے ہیں۔ اس پر آپ نے فرمایا جاؤ تم سب آزاد ہو"۔

میرے معزز و عزیز بھائیو! یہ وہ کامیابی ہے جو سوائے آپ کے کسی سیاسی لیڈر کسی فاتح اور کسی مصلح کو کبھی حاصل نہیں ہوئی اور نہ کوئی دوسرا اس عظمت و شان کا گزرا ہے کہ بانیٔ مذہب بھی ہو، بانی قوم بھی ہو اور بانی سیاست و سلطنت بھی ہو۔ یہ ہرسہ امور آپ سوائے آنحضرت صلعم کی ذات بابرکات کے کسی ایک میں یک جا جمع نہیں پائیں گے۔

طول بہت ہو گیا ہے اور مضمون ابھی بہت سا باقی ہے لہذا میں آپ سے معافی کا خواستگار ہوتا ہوا یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اگرچہ میں نے بخیال خود وہ سب باتیں جن کی

آپ کو ضرورت ہے نہایت احتیاط سے واقعات تاریخیہ کے رنگ میں سمجھا دی ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ منزل مقصود ابھی بہت دور ہے اس لئے میں گذشتہ تفصیل کو یکجا جمع کرنے اور بعض اشارات کو واضح کرنے کے لئے آپ سے صرف تین باتیں کہنے کی اجازت چاہتا ہوں، واللہ الموفق،

اوّل یہ کہ آپ نے کبھی سوچا اور خیال کیا کہ اس کارخانہ علت و معلول میں خداوند عالم نے اپنے حبیب رحمۃ للعالمین صلعم کے لئے کیا سامان مہیا کئے تھے اور زمانہ میں کس صورت میں اس کا ساز گار بنایا تھا کہ آپ کو ایسی بڑی کامیابی حاصل ہوئی جو سابقاً کسی کو بھی نہ ہوئی تھی اور اس کے ضمن میں یہ خیال بھی کبھی گزرا کہ خداوند تعالیٰ نے آپ کو ایک سنسان بیابان میں کیوں پیدا کیا؟ جس کے باشندے عام طور پر وحشیوں اور درندوں سے بھی بڑھے ہوئے تھے اور ان میں اور اُن میں سوائے صورت ظاہری کے کوئی نمایاں فرق نہیں تھا۔ کیا خدائے ذوالجلال کو آپ کے لئے کسی متمدن اور علوم وفنون میں ترقی یافتہ اور آئین سلطانی کے خوگر ملک میں جگہ تنگ ہو گئی تھی۔ مثلاً ہندوستان کہ اس کی قدیم روایات اس کی شان کی شہادت دیتی ہیں، اور ایران کہ اس کی سلطنت بھی بہت پرانی تھی۔ اور روم کہ رومن ایمپائر کے قانون کی ہمہ گیری کا سکہ ایک عالم پر چھایا ہوا تھا اور یونان کہ علوم وفنون میں دنیا جہان کا استاد تھا اور مصر کہ اس کے بادشاہوں کا جبروت وسطوت مشہور عالم تھا۔

خداوند عالم نے اپنے حبیب فاتح دنیا، استاد جہاں، مصلح عالم کو ایک سنسان ویرانے میں پیدا کیا اور اس میں بھی اس حصے میں جس کی شان میں خود اس نے اپنے کلام میں وارد ہے۔ بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ (ابراہیم پ ۱۳) یعنی ایسی وادی میں جہاں زراعت نام کو نہیں، یعنی مکہ میں یا یوں کہیئے کہ ایک ناقابل زراعت وادی میں پیدا کیا۔

ظاہر ہے کہ ایسے علاقے کے لوگوں کے اخلاق نرم تو ہوں گے نہیں، سخت ہی ہوں گے ریگستان وسنگستان کے رہنے والے نہ نازک بدن ہو سکتے ہیں نہ نازک مزاج۔ پتھروں میں بسنے

والے موم نہیں ہو سکتے۔ اچھا تو پھر خدا تعالیٰ نے ایسا کیوں کیا؟

قدرت کی اس گہری حکمت کو سمجھنے کے لئے میں ایک سوال کرنے کی جرأت کرتا ہوں اس کے جواب سے خدا کے فضل سے اس حکمت کا راز کھل جائے گا۔ وہ یہ کہ آپ بتائیں کہ بجھے ہوئے یا کچھ دہکتے ہوئے کوئلے میں پھونکیں مار مار کر اسے مفید مطلب بنانا موزوں و آسان ہوگا یا تیز شعلے دار آگ کی تیزی کو اعتدال کے درجے پر لانا؟

(حاضرین نے جواب دیا کہ تیز شعلے دار آگ کی تیزی کو درجۂ اعتدال پر لانا موزوں ومناسب ہوگا) شکر ہے کہ آپ نے وہی جواب دیا جو میرے نزدیک درست تھا کہ شعلے دار آگ کی تیزی کو معتدل کر کے اسے مفید مطلب بنانا موزوں و آسان ہے۔

بس اسی سے سمجھ لیجئے کہ ہندوستان و ایران اور روم و مصر و یونان سب ممالک ترقی پا چکنے کے بعد تنزل کے عمیق گڑھے میں گرے ہوئے تھے۔ شامتِ اعمال جو عیاشی و بدکرداری اور ظلم و بیداد کا لازمی نتیجہ ہے زوال کی صورت میں ان پر وارد ہو چکی تھی ان کے فطری قویٰ زائل ہو چکے تھے اور ان کے جذبات کی تیزی بجھ چکی تھی۔ یا یوں سمجھئے کہ ان کے سب جذبات درجہ تفریط میں تھے لیکن ان سب کے برخلاف عرب کی ساری فطری قوتیں موجود تھیں اگر وہ کسی غیر پر حاکم نہ تھے تو کسی غیر کے محکوم و غلام بھی نہ تھے۔ ؎

نہ بر اشتر بر سوارم نہ چوں اشتر زیر بارم   نہ خداوند رعیت نہ غلام شہریارم

ان کی برائیاں جس قدر اوپر مذکور ہوئیں سب ایسی تھیں جو ان جذبات کے ماتحت ہوا کرتی ہیں۔ جن کا ٹمپریچر درجۂ اعتدال سے گزر کر درجہ افراط پر پہنچا ہوتا ہے۔ ڈکیتی اور رہزنی، قتل و قتال، جنگجوئی اور خونریزی۔ مفاخرت و مبارزت، عصبیت و حمیت، دفاع و انتقام جیسے کام بزدلوں سے نہیں ہو سکتے اور شراب نوشی و عیاشی۔ اسراف و مباہات نام و نمود کے لئے پر تکلف عام ضیافتیں کنجوس مکھی چوس نہیں کر سکتے۔

پس خدائے حکیم نے یہ چاہا کہ فاتح اعظم اور مصلح عالم کو ایک ایسے ملک میں پیدا کرے جو غیروں کے قہر و تغلب سے آزاد ہو۔ ان کی سیاسی روح زندہ ہو وہ قوم خودداری و عصبیت کی مالک ہو اپنی قوم کے سوا کسی غیر کے سائے کو بھی برداشت نہ کر سکتی ہو کسی کی احسانمند ہونے کی بجائے احسان کرنا ان کا فخر ہو۔ بس ان کی اصلاح کے لئے کسی بڑی تکلیف و محنت کی ضرورت نہیں تھی ان کو غلطی کا احساس کرایا اور بٹن دبا کر درجۂ افراط سے درجۂ اعتدال پر لا کھڑا کیا۔ کیونکہ تیز جذبات والا انسان سمجھ آ جانے پر اپنی غلطی کو فوراً تسلیم کر لیتا ہے اور پھر دوسروں کی اصلاح میں اسی طرح جد و جہد کرتا ہے جس طرح مخالفت میں سعی و کوشش کرتا تھا اور حقیقت امر کو سمجھ لینے کے بعد اسے عمل میں لانے کے لئے اس کے سامنے کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی۔ نہ کسی کا دباؤ نہ کسی کا لالچ۔

پس آنحضرت صلعم نے قوم عرب کے تیز جذبات کو درجہ اعتدال پر لا کر ان کو اس قابل بنا دیا کہ وہ ایک قلیل مدت میں فاتح عالم ہو گئے اور ایک صدی کے اندر حکومت اسلام کی حدود اس قدر وسیع ہو گئیں کہ اگر ایک طرف مشرق میں ہندوستان کے سر بفلک پہاڑوں سے ٹکراتی تھیں تو دوسری طرف مغرب اقصٰے میں کوہ پیرینیز کے پار تک پہنچ گئی تھیں۔

دوسری بات جس کی اجازت میں نے آپ سے لی یہ ہے کہ یہ تو قدرت کا کام تھا کہ آنحضرت صلعم کو ایک ایسے آزاد ملک میں پیدا کیا جس پر کسی غیر کا کبھی سایہ بھی نہ پڑا تھا، اس کے علاوہ خود آنحضرت صلعم نے اس قوم کی نبض شناسی کس طرح کی؟ اور ان کی بے قاعدگی کو منظم کس طرح کیا؟ اس میں آپ لوگوں کا اصل مقصود "اسلام اور حالات حاضرہ" پوری طرح واضح ہو جائے گا۔ سو معلوم ہو کہ قومیت کا مدار دو[۲] چیزیں ہیں۔ عصبیت اور اجتماعی قوت۔

حضرات یہ تو آپ صاحبان کو معلوم ہی ہے کہ عربوں میں عصبیت غالب درجے کی تھی اگر کسر تھی تو بس اجتماعی نظام کی تھی۔ کہ ان کی ساری قوت ذاتی جھگڑوں آپس

کی جنگوں اور انتقاموں میں صرف ہوتی تھی اور مجتمع ہونے نہیں پاتی تھی۔ پس آنحضرت صلعم نے ان کو ایک اسٹیج پر مجتمع کرکے آپس میں ایک دوسرے کا ہمدرد و غمخوار بلکہ برادر و غمگسار بنا دیا حقیقت میں یہ بھی الہٰی کرشمہ تھا کیونکہ نبی اللہ کے سب کام خدائی توفیق کی طرف منسوب ہوتے ہیں چنانچہ اسی معنی میں فرمایا:۔ وَ اِنْ یُّرِیْدُوْا اَنْ یَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ هُوَ الَّذِیْۤ اَیَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ وَ اَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مَّاۤ اَلَّفْتَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَیْنَهُمْ اِنَّهٗ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ (انفال پ ۱۰)

یعنی (اے پیغمبر!) اگر یہ (کفار صلح کے رنگ میں) تم کو دھوکا دینا چاہیں تو تم کو تو بس (ایک) اللہ ہی کافی ہے۔ وہ وہی تو ہے جس نے اپنی امداد اور (جماعتِ) مومنین سے تمہاری تائید کی اور ان (مومنوں) کے دلوں میں الفت ڈال دی اگر تم دنیا کا سارا مال خرچ کر دیتے تو پھر بھی ان کے دلوں میں اُلفت پیدا نہ کرسکتے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے (بغیر روپے کے لالچ کے محض اپنے فضل سے) ان میں (ایک دوسرے کی) الفت ڈال دی۔ بیشک وہ بڑا زبردست (اور) بڑا باحکمت ہے۔

پس اے میرے معزز سامعین! اگر آپ بھی حالات حاضرہ پر غالب آنا چاہتے ہیں اور ان کے نتائج کو اپنی مراد کے موافق دیکھنا چاہتے ہیں تو اوّل تو اپنے آپ میں عصبیت قومی اور غیرت و حمیّت دینی و ملّی پیدا کریں اور پھر اپنی قوت کو کسی محکم نظام کے ماتحت مجتمع کریں اور آپ کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے قائم کردہ نظام سے بہتر نظام کہاں ملے گا؟ جو منبر پر چڑھ کر سب کے سامنے بآواز بلند پکار کر فرماتے ہیں خَیْرُ الْھُدٰی ھُدَی مُحَمَّدٍ (صلی اللہ علیہ وسلم) یعنی بہترین سیرت سیرت محمدی ہے۔

آنحضرت صلعم کی اس آواز کو ساڑھے تیرہ سو سال گذر چکے ہیں اور یہ آج تک اسی طرح گونج رہی ہے۔ اس عرصے میں بڑے بڑے مصلح اور ریفارمر گزرے مگر ان میں

کوئی اس مصلح اعظم کے پاسنگ بھی نہیں تھا۔ مثلاً زمانہ حال کے سب سے بڑے آدمی گاندھی جی سمجھے جاتے ہیں جنھوں نے اپنی قوم اور اپنے ملک کی آزادی کے لئے ایک عالم کو تہ وبالا کر رکھا ہے۔ میں ان کے ارادے اور ہمت کی قدر کرتا ہوں گو ایک رسول برحق کے ساتھ ایک ملکی لیڈر اور غیر رسول شخص کا مقابلہ مناسب نہ ہو لیکن چونکہ ان کی اکثر قوم ان کو مہاتما اور بعض خدا کا اوتار بھی سمجھنے لگے ہیں اور ان کی نظر میں گاندھی جی کی عزت وعظمت خدا کے بعد کسی دوسرے سے کم نہیں وہ ان کے نام کی جے پکارتے ہیں ان کے فرمان پر مال و جان، عزت و آبرو، زن و فرزند سب کچھ قربان کر رہے ہیں اس لئے حالات حاضرہ کو مد نظر رکھتے ہوئے میں ان کی سعی اور طریق عمل کی نسبت بھی کچھ کہنا چاہتا ہوں، جس کا مختصر بیان یوں ہے کہ "گاندھی جی بھی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے اصول پر اپنی قوم میں عصبیت وحمیت پیدا کر رہے ہیں اور ان کی قوت کو محکم نظام کے ماتحت جمع کر رہے ہیں" اور وہ اس میں کسی حد تک کامیاب بھی ہو رہے ہیں لیکن یہ نتیجہ کہ منزل مقصود پر پہنچ جائیں بلکہ یہ بھی کہ اسے دور سے بھی دیکھ لیں دہلی میں کھڑا ہو کر کہتا ہوں کہ "ہنوز دلی دور است" کی مثل ہے۔ اسے نہ تو گاندھی جی دیکھیں گے اور نہ وہ نسل جس میں وہ اپنی سعی و عمل خرچ کر رہے ہیں۔

باقی رہیں آئندہ نسلیں سو ان کا حال خدا کو معلوم کہ وہ کس کینڈے کی ہوں گی کیونکہ ابھی تک قوم میں ایکسٹریمسٹ یعنی انتہا پسند بھی ہیں، ماڈریٹ اعتدال پسند بھی ہیں اور ٹوڈی اور خوشامدی اور وفادار نمکخوار بھی ہیں جو نادیدہ خدا پر بتان نظر فریب کو ترجیح دیتے ہیں اور معلوم ہے کہ اجزائے مرکبہ میں کبھی کوئی جزو غالب آجاتا ہے اور کبھی کوئی۔ اس لئے آئندہ کی بابت کوئی صحیح رائے قائم نہیں ہو سکتی۔

گاندھی جی کی یہ ترقی انتہائی سمجھی جائے تو اس کے بعد تنزل و انحطاط لازم، اور اگر اس کے بعد ترقی کا کوئی اور درجہ باقی ہے تو خدا جانے اونٹ کس کروٹ بیٹھے، اور

قوم اس درجہ پر پہنچے یا نہ پہنچے اور گاندھی جی اس دنیا سے کوچ کر جائیں، پس بہر حال گاندھی جی کی زندگی میں موعودہ یا مزعومہ کامیابی موہوم ہے۔

اخلاقی اصلاح میں جتنی کامیابی ہوئی وہ بھی ظاہر ہے۔ شراب خانے برابر کھلے ہیں۔ بمبئی سے کلکتہ و رنگون تک اور کشمیر و پنجاب سے دکن تک تمام ملک کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی لچھمی دیوی کی پجاری روز مرہ ہزاروں لاکھوں روپے خرچ کر کرکے یورپ سے دھڑا دھڑ شراب منگوا رہے ہیں کچھ پی رہے ہیں کچھ پلا رہے ہیں اور ہندوستان کے مال اور ہندوستانیوں کے اخلاق و صحت کو اپنی زر پرستی کے لالچ پر برباد کر رہے ہیں قحبہ خانے کھلے ہوئے ہیں۔ مہاجن پیٹ بھر کر سود کھاتے ہیں۔ سرکاری ملازم دل کھول کر رشوت لیتے ہیں۔

آنحضرت صلعم اپنی زندگی ہی میں خدا کی توحید، اسی کی خالص عبادت اور تزکیہ نفس کی بنیاد پر تہذیب و اخلاق فاضلہ کے سائے میں سیاسی انقلابات اور تمدنی ترقیات کراتے ہیں اور اس باغ کی بہار اپنی آنکھوں سے دیکھ کر اس دنیائے فانی سے انتقال فرماتے ہیں۔ جس قوم کو تیار کرتے ہیں وہی دنیا کی فاتح ہوتی ہے (ابوبکر صدیقؓ و عمر فاروقؓ پیچھے پیدا نہیں ہوئے۔ عثمان ذی النورین اور امیر معاویہ آئندہ نسل میں سے نہیں تھے) اُمّی (ان پڑھ) قوم صاحبان علم کے تختوں کی وارث ہوتی ہے۔ اور ان کے خزانوں اور راندوختوں کو خدا کے نام کی بلندی، تہذیب و علم کی اشاعت اور عدل و انصاف و مساوات کی ترویج میں خرچ کرتی ہے، انھی کی شان میں کہا گیا ہے ع "کیا اُمّیوں نے جہاں میں اُجالا"

شراب خوری و حرام کاری ملک عرب سے یکدم دور ہو گئی، بھیڑ بکری چرانے والے امیر کبیر اور سلاطینِ عالم ہو گئے لیکن خدا سے غافل نہیں ہوئے۔ پہلو میں سیاسی جوش رکھتے ہوئے ماں باپ اور دیگر بزرگوں سے شوخ و گستاخ نہیں ہوئے۔ تمدنی و

اقتصادی ترقی میں حلال و حرام میں تمیز کرتے ہیں۔ سود حرام جانتے ہیں۔ کم تولنا رشوت لینا، غصب اور دھوکے سے مال حاصل کرنا خنزیر کے برابر گنتے ہیں حالانکہ آپ سے پہلے ایام جاہلیت میں وہ یہ سب کام کرتے تھے اور یہاں تو بڑے بڑے سیاسی لیڈر، بڑے بڑے تعلیم یافتہ اور اچھے بھلے کسب حلال کرتے کرتے قومی تحریکوں میں شامل ہو کر وجہ حلال سے کنارہ کش ہو کر ظاہرا یا پوشیدہ قومی چندوں کو ذریعۂ معاش بنا رہے ہیں ع " بہ بیں تفاوت راہ از کجاست تا بکجا "

آنحضرت صلعم مال حرام سے صدقہ اور قومی چندہ قبول نہیں فرماتے۔ چنانچہ ارشاد ہے:۔

لا یقبل اللہ صلوٰۃ بغیر طھور و لا صدقۃ من غلول (ترمذی) "یعنی خدا تعالیٰ طہارت (غسل و وضو) کے بغیر نماز قبول نہیں کرتا اور حرام و خیانت کے مال سے صدقہ خیرات قبول نہیں کرتا۔"

جس طرح حلال کھانے کی نسبت فرمایا:۔

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰکُمْ (بقرہ پ۲) "یعنی اے مسلمانو! کھاؤ تم پاک چیزوں سے جو ہم نے تم کو عطا کیں۔"

اسی طرح خدا کی راہ میں مال خرچ کرنے کی نسبت بھی فرمایا:۔

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا انفقوا من طیّبات ما کسبتم (بقرہ پ۳) "یعنی اے مسلمانو! اپنی پاک کمائی میں سے (راہ خدا میں) خرچ کیا کرو۔"

اور عام اخلاقی و سیاسی و روحانی برائیوں کی ممانعت میں فرمایا:۔

قل انما حرم ربی الفواحش ما ظھر منھا و ما بطن و الاثم والبغی بغیر الحق و ان تشرکوا باللہ ما لم ینزّل بہ سُلطٰنًا و ان تقولوا علی اللہ ما لا تعلمون (اعراف پ۸) یعنی (اے پیغمبر! ان سے) کہہ دو کہ میرے رب نے تو

(ہر قسم کی) بے حیائی ظاہری و باطنی (قولی و فعلی) حرام کر دی ہے اور (ہر قسم کا) گناہ اور ناحق کی بغاوت (و شورش) اور خدا کے ساتھ شریک گردانا جس کے بارے میں خدا نے (کسی دین میں بھی) کوئی دلیل بھی نازل نہیں کی۔ اور یہ بھی (حرام کر دیا ہے) کہ تم خدا کے ذمّے وہ باتیں لگاؤ جن کا تم کو علم نہیں۔"

غرض آنحضرت صلعم نے انسانی ہستی کے سب امور جسمانی و روحانی۔ اخلاقی و تمدنی معاشرتی و سیاسی کی اصلاح کی اور آپ خدا کے فضل سے اپنی کوشش کو اپنی آنکھ سے بار آور دیکھ کر نہایت ٹھنڈے دل سے دنیا سے رخصت ہوئے۔ لیکن گاندھی جی جو آج دنیا بھر میں یا کم از کم ہندوستان میں یا اپنی اکثر قوم میں سب سے بڑے آدمی یا خدا کا اوتار مانے جاتے ہیں۔ نوع انسانی کی نہیں بلکہ صرف ہندوستان کی آزادی دیکھنا چاہتے ہیں پھر بھی باوجود ہر طرح کی ممکن کوشش کرنے کے (خواہ وہ کوشش تدبیر کے متعلق ہو خواہ صرف اموال کے متعلق خواہ تحمل شدائد و مکروہات کے متعلق) ابھی مقصود کے نزدیک تک بھی نہیں پھٹکے۔

پھر یہ کہ آنحضرت صلعم کو جو قوم ملی وہ ان پڑھ ہے مال و دولت میں کمزور ہے۔ تمدن میں بالکل پیچھے ہے۔ تعداد اور دنیوی حیثیت میں اپنے حریفوں اور مخالفوں سے کمتر ہے، لیکن گاندھی جی کی قوم ماشاءاللہ دولت کی دھنی، علوم مروّجہ میں دیگر ہمسایہ قوموں سے فائق، شاہی رسوخ میں ان سب سے آگے۔ تدبیر و مطلب براری میں اُستاد تعداد میں شاہی قوم سے صدہا گنا زیادہ، ممتاز عُہدوں پر فائز، دفاتر پر کلیتہً قابض اور سب سے بڑھ کر یہ کہ گورنمنٹ کی پالیسی کو خوب سمجھنے والی بلکہ ان کے نقش قدم پر چلنے والی لیکن من کی مُراد ابھی تک معرض التوا میں ہے۔ گاندھی جی بھی اعلان کرتے ہیں کہ اگر چھ مہینے تک سواراج نہ ملا تو میں آبادی چھوڑ دوں گا۔ ہمالیہ کی چوٹیوں پر چلا جاؤں گا۔ دس سال کا عرصہ گزر گیا۔ لیکن نہ تو سواراج ملا اور نہ گاندھی جی کوہ ہمالیہ پر گئے۔

دوسری طرف دیکھئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :-

ایھا الناس قولوا لا الٰہ الا اللہ تملکوا العرب و تدین لکم العجم۔

یعنی "اے لوگو! تم لا الٰہ الا اللہ کا اقرار کرلو۔ تم عرب کے بادشاہ ہو جاؤ گے اور عجمی تمہاری رعیت ہو جائیں گے۔"

آپ کی یہ آواز اس وقت کی ہے جب مکہ میں آپ کے ساتھ کوئی قومی جماعت نہیں تھی۔ چند ایک غربا و ضعفاء آپ کے ساتھی تھے جن کو نہ گھروں میں امن تھا نہ شہر میں امان آخر چند سال میں عرب آپ کی حیات طیبہ ہی میں زیر نگیں ہو جاتا ہے اور آپ اپنی رحلت کے آخری دن دوسرے ممالک کی فتوحات کے لئے اپنے دست مبارک سے جھنڈا قوم کے ہاتھ میں دیتے ہیں اور تاکیدی حکم فرماتے ہیں کہ "اس لشکر کو ضرور بھیج کر رہنا" (صحیح بخاری) گویا عرب کے بعد آئندہ فتوحات کا بھی دروازہ کھول کر قوم کو اس میں داخل ہونے کا حکم دیتے ہیں اور دنیا سے نہایت اطمینان کے ساتھ رخصت ہوتے ہیں، یہ ہے وہ کامیابی جس کی نظیر دنیا جہان میں کسی قوم کی تاریخ میں نہیں ملتی۔

آخر اس کا کیا سبب ہے؟ کہ ایسے بڑے بڑے مدبر۔ نبض شناسان زمانہ۔ مالکانِ دولت و ثروت۔ صاحبانِ علم و ہنر۔ جن کے ساتھ ہزاروں نہیں، لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں فدائی لڑنے مرنے، مال و جان قربان کرنے کے لئے موجود ہوں وہ تو ناکام رہیں اور ایک اُمّی سب رکاوٹوں پر غالب آتا ہوا ایک مٹھی بھر بے سامان غریب جماعت سے پوری طرح کامیاب ہو کر دنیا سے رخصت ہو۔

صاحبان! میں اپنی رائے سے اس کا کوئی سبب مقرر نہیں کرتا بلکہ میں اس کارساز و بادشاہ حقیقی، مالک زمین و آسمان کے قول سے استناد کرتا ہوں جس نے آنحضرت صلعم سے اور آپ کی مخلص جماعت سے وعدہ کیا تھا کہ میں تم کو دنیا میں ضرور ضرور حاکم بناؤں گا۔ چنانچہ ارشاد ہے :-

وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّھُمْ فِی الْاَرْضِ کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ وَلَیُمَکِّنَنَّ لَھُمْ دِیْنَھُمُ الَّذِی ارْتَضٰی لَھُمْ وَلَیُبَدِّلَنَّھُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِھِمْ اَمْنًا یَعْبُدُوْنَنِیْ لَا یُشْرِکُوْنَ بِیْ شَیْئًا وَمَنْ کَفَرَ بَعْدَ ذٰلِکَ فَاُولٰئِکَ ھُمُ الْفٰسِقُوْنَ ٥

یعنی خداتعالیٰ تم (بہروہ جماعت مخلصین انجمانہ باز) میں سے ان لوگوں سے جو (خالصاً) ایماندار ہیں اور نیکوکردار بھی ہیں، وعدہ کرتاہے کہ وہ ان کو زمین میں ٹھیک اسی طرح اختیار واقتدار بخشے گا جس طرح اس نے ان سے پہلے لوگوں کو بخشا تھا اور ان کے لئے ان کے اس دین کو جسے اس نے ان کے لئے پسند کیا ہے (یعنی اسلام کو) صاحب مقدور بنا دیگا یعنی وہ اسے اسٹیٹ ریلیجن (سلطنت کا مذہب) بنادے گا اور ان کے (موجودالوقت) خوف کو امن سے بدل دے گا وہ (اس امن واقتدار کی حالت میں) میری ہی عبادت کریں گے میرے ساتھ کسی چیز کو بھی شریک نہیں گردانیں گے۔ اور جو لوگ اس (نشان کے پورا ہونے) کے بعد بھی کافر (ومنکر) رہیں گے تو وہ (نہایت ہی) حکم عدول (ثابت) ہوں گے "۔

یہ آواز آنحضرت صلعم کے اپنے خیال کی نہ تھی بلکہ یہ خدائی نقارہ تھا مولینا روم صاحب ایسی آوازوں کی نسبت فرماتے ہیں ؎

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود | گرچہ از حلقوم عبد اللہ بود

بس صرف یہی اور یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلعم قوم سے جو وعدہ کررہے ہیں وہ خدا کے حکم سے کررہے ہیں جس کا پورا ہونا لازم ہے اور گاندھی جی اپنے خیال اور خواہش سے ایسا کہتے ہیں اور اپنی آواز کو موثر بنانے کے لئے پُرزور الفاظ اور امید افزا عبارتوں سے قوم کو دلاسا دیتے ہیں وَشَتَّانَ بَیْنَھُمَا یعنی ان دونوں میں بہت فرق ہے۔

صاحبان! میں نے آپ کا بہت سا وقت لیا اب میں معافی کا خواستگار ہو آپ سے رخصت ہوتا ہوں۔ وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ ٥

عربی اور فارسی شاعری کے امتیازات

عشقیہ رنگ

بسلسلۂ ما سبق

عشق و محبت کا مادّہ چونکہ فطرت انسانی میں داخل ہے اس لئے قاعدے اور اصول کے موافق خطہ ارضی کے ہر متنفس پر اس کے اثرات یکساں ہونا چاہئیں۔ امیر و غریب، وضیع و شریف جاہل و عالم اور خورد و کلاں کے امتیاز پر اس کے اثرات مرتب ہونا اصول کے خلاف معلوم ہوتا ہے اور نہ کسی جگہ کی آب و ہوا کی اثر انگیزی کو اس میں دخل ہو سکتا ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے۔

معنوی اعتبار سے تو ہر انسان کے اندر عشق و الفت کی سوزش و چاشنی کا مساویانہ ثبوت دیا جا سکتا ہے لیکن حقیقت میں اس کے اثرات آب ہوا کی لطافت، فرحت انگیزی، اور تمدن و معاشرت کے ارتقا کے منت کش ہیں۔ گاؤں کے ایک جاہل اور غیر متمدن انسان کے عشقیہ جذبات اور اس کی کیفیات پر ہر نہج سے غور کیجئے صرف اشتراک جذبات تو ضرور ان کے اندر موجود ہوگا لیکن کیفیت جذبات اور پاکیزی و لطافت کے اعتبار سے وہ کبھی بھی ایک تمدن آشنا کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اسی صورت سے ایک غیر متمدن سوسائٹی اور ملک کا تقابل بھی تہذیب آشنا اور تمدن پذیر ملک و قوم کے جذبات عشقیہ سے کیا جا سکتا ہے۔ اول الذکر کے جذبات میں جس قدر رکاکت و رذالت کی آلودگیاں نظر آئیں گی اسی قدر ثانی الذکر کے جذبات تنوع و ترفع اور لطافت و نفاست کے سرمایہ دار ہوں گے۔

عشق و الفت اور اس کے مقتضیات چونکہ سرشت انسانی کا لازمہ ہیں اس لئے اس اصول کی بنا پر عربی خمیر بھی عشق و محبت کی چاشنی سے خالی نہیں ہو سکتا لیکن جو کیفیت و

چاشنی ایرانی خمیر میں دست فطرت میں ودیعت کی تھی اس کا عشر عشیر بھی عرب کو حاصل نہیں تھا اور اس کا سبب بھی تمدن و معاشرت کی ترقی اور عدم ترقی کا فرق تھا۔

ایران کا صرف تمدن ارتقا کے آخری زینہ پر نہ تھا بلکہ ملک کا گوشہ گوشہ اور چپہ چپہ زندگی کے پُر لطف اور گوناگوں مناظر کو اپنے آغوش میں چھپائے ہوئے تھا۔ آب و ہوا کی لطافت و رنگینی عشق و الفت کی خوابیدہ قوتوں کو ذرا سی دیر میں بیدار کر کے دل و دماغ دونوں کو سرخوش و مدہوش بنا دیتی تھی۔ لیکن عرب کی وادیٔ غیر ذی زرع کو ان محاسن میں سے ایک خوبی بھی حاصل نہ تھی۔

عراق کا حصہ اگرچہ ایرانی حدود سے بالکل متصل تھا اور تخت ایران کے اثرات خصوصی کی وجہ سے یہاں کے عربی باشندے مذہب زردشت قبول کر چکے تھے لیکن وہ سرسبزی و شادابی اس جگہ مفقود تھی جو ملک عرب کے علاقہ شام میں پائی جاتی تھی۔ یہ تمام علاقہ تخت روم کے اثر میں تھا اور اس وجہ سے مذہب عیسوی یہاں فروغ پائے ہوئے تھا۔ تمدن و معاشرت کے اعتبار سے اس علاقہ کا مرتبہ عراق عرب سے بہت پست تھا۔ عراق کا تمدن ایرانی اثر کی وجہ سے تمام عرب سے ممتاز سمجھا جاتا تھا۔ لیکن جو چیزیں اس وقت کی شاعری کے لئے مدد و معاون ہو سکتی تھیں فطرت نے وہ ایک ایک کر کے حجاز کے سب سے پست اور غیر ذی زرع خطہ میں ودیعت کی تھیں۔

عرب میں شعریت کی ابتدا اور اس کا عنفوان آزاد مشربی کا منت کش ہے۔ شام و عراق ایرانی اور رومی سیادت قبول کر چکے تھے اس لئے وہ آزاد مشربی جس پر کہ عرب کے بچے بچے کو ناز تھا ان کی طبائع سے ایک حد تک دور ہو چکی تھی۔ دونوں جگہ کی شاعری پر درباری اثر آہستہ آہستہ اپنا کام کر رہا تھا اس کے برعکس حجاز اور اس کا ملحقہ علاقہ آزادی کی پُر بہار فضا میں زندگی بسر کرنا اپنے لئے طغرائے امتیاز سمجھتا تھا چونکہ شاعری کا آغاز حریت کی فضا میں ہوا تھا اس لئے اس خطہ میں بہ نسبت اور عربی علاقوں کے اس فن کو

بہت ترقی ہوئی۔ مگر چونکہ حجاز کا علاقہ زیادہ تر ریگستانی حصہ پر مشتمل تھا۔ آب ہوا انتہا سے زائد گرم واقع ہوئی تھی۔ سرسبزی اور شادابی کا کوسوں پتہ نہ تھا۔ تمدن و معاشرت کی پستی کے اعتبار سے بھی پورا علاقہ تمام دنیا میں اپنی نظیر آپ تھا ملک کے چپہ چپہ پر بجائے مدنیت کے بدویت کے آثار چھائے ہوئے تھے۔ تقریباً ہر شخص خانہ بدوشی کی سی زندگی بسر کرتا تھا، عشقیہ شاعری اور عشق کے رنگ کو نکھارنے والی جو چیز ہوسکتی ہے وہ ملک کی شادابی و خوش حالی اور تمدن و معاشرت کی ترقی ہے۔ حجاز کا خطہ ان محاسن سے عاری تھا اس لئے یہاں کی عشقیہ شاعری میں وہ جاذبیت و کشش اور کہربائی نہیں پائی جاتی ہے جو ایران کے عشقیہ رنگ میں ہے۔

ہر چیز ملکی خصوصیات کا اثر ضرور قبول کرتی ہے حجازی عرب چونکہ تمدن کی روشنی سے تمتع پذیر نہیں ہوئے تھے اس لئے ان کی شاعری صرف ایک خاص صنف میں محدود ہو کر رہ گئی، عشقیہ رنگ میں بھی انھوں نے اپنے دماغی قوے کو صرف کیا ہے لیکن اس کے بیان میں ایرانی شگفتگی، رنگینی اور جاذبیت کا کوسوں پتہ نہیں بلکہ بدویانہ سادگی کا عنصر غالب ہے۔

عشقیہ رنگ میں اس وقت تک کہربائی پیدا نہیں ہوسکتی جبتک کہ اس کے اندر معاملات محبت اور واردات عشق کو لطافت و رنگینی کے ساتھ سامعہ نواز انداز میں بیان نہ کیا جائے۔ بیشک، سادگی خود ایک قسم کی پاکیزگی اپنے اندر پنہاں رکھتی ہے لیکن اگر سادگی کے پردے میں شوخی اور رنگینی کی جھلک بھی نمایاں کردی جائے تو وہی سادگی تیر و نشتر بن جاتی ہے۔ ایران کا عشقیہ رنگ اسی قسم کا سامان قتل اپنے اندر پوشیدہ رکھتا ہے۔ یہ سادگی کے پردے کو اپنی رنگ آمیزیوں اور گلکاریوں سے ایسا نظر فریب اور جاذب توجہ بنا دیتا ہے کہ پھر دوسری طرف نظر نہیں جمتی جن چیزوں سے عشقیہ جذبات میں تحریک اور ابھار پیدا ہوتا ہے قدرت نے وہ ایک ایک کے ایران کی جنت مثال سرزمین کے لئے مخصوص کردی تھیں۔ جہاں موسم گل آیا اور ان پاکیزہ جذبات میں تحریک پیدا ہوئی۔ شعرائے عرب ان جذبات کی اثر انگیزی سے واقف تو تھے لیکن وہ رنگینیاں اور سرمستیاں میسر نہ تھیں جن کے اثر سے انسانی دماغ میں نشۂ الفت

کی تحریک پیدا ہوتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ ایرانی شاعر اس صہبا کے نہ اُترنے والے نشہ سے مدہوش ہو کر اس راستے کے احساسات و کیفیات کو اس انداز سے بیان کر جاتا ہے کہ بحرِ طبع میں ایک قسم کا شور انگیز تلاطم پیدا ہو جاتا ہے۔ ایرانی شاعر کا ایک ایک لفظ جو اس نشہ کے عالَم میں اس کی زبان سے نکلتا ہے وہ اپنے اندر کیف و انبساط کا ایک ایسا سمندر رکھتا ہے جس کے ساحل کا کوسوں پتہ نہیں ہوتا۔ ایران کا مست و سرخوش شاعر خود ہی اس ہوش رُبا کیفیت سے مُست نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنے نشہ کی کیفیت سے دوسروں کو بھی بیگانۂ ہوش بنا دیتا ہے۔ وہ خود بھی عالمِ رنگ و بو کے تفکرات سے تھوڑی دیر کے لئے آزاد ہو جاتا ہے اور دنیا کو بھی اس سے کیف آگین اور لطف اندوز ہونے کی نہایت مستی کے عالَم میں دعوت دیتا ہے۔ عرب کا شاعر معاملاتِ عشق کو بیان تو کرتا ہے مگر ان کے اندر رنگ آمیزی اور کیف و انبساط پیدا کرنا اس کی سادگی پسند طبیعت سے بعید معلوم ہوتا ہے۔ عشق کے اندر جو معاملات اور واردات پیش آتے ہیں ان کی ترجمانی بھی کرتا ہے لیکن ان معاملات کے بیان میں جن کھربا رنگینیوں اور کیفیتوں کا ہونا ضروری ہے ان کا منزلوں پتہ نہیں۔ اس کے علاوہ اس میدان میں جو مشکلات و حوادث پیش آتے ہیں ان کو تو نہایت شرح و بسط کے ساتھ پیش کرتا ہے لیکن اس کی دلفریبیوں، ہنگامہ آرائیوں اور مستیوں کی کیفیات کو ہاتھ نہیں لگاتا گویا اس کے نزدیک دردِ عشق میں سوائے آزار کے کوئی لذت نہیں۔ ایرانی شاعر اس راستے کی پاشکستگی اور آبلہ پائی کو فیضانِ عشق تصور کرتا ہے۔ ہر قسم کی تکلیف اس کے سامنے عین راحت بن کر آتی ہے بلکہ اس کے نزدیک اس راستے کی تکلیف کو تکلیف سمجھنا مرتبۂ عشق کی توہین ہے ؏

عشق می گویم و جان می دہم از لذّتِ وے

ہر چند ظلم ہست و ستم ہست و داد نیست ۔۔۔ جائے ہنوز نیست بہ ذوقِ دیارِ عشق

یعنی عشق و محبّت کی تکالیف میں وہ کیفِ سرمدی پنہاں ہے کہ اس سے دل نہیں بھرتا اور

تیر پر تیر کھانے کو جی چاہتا ہے۔

دل جز رہِ عشق تو نپوید ہرگز — جز محنت و دردِ تو نجوید ہرگز

یعنی دل سوائے تیری راہِ عشق کے اور کچھ نہیں تلاش کرتا اور بجز تیرے غم عشق اور دردِ محبت کے کچھ نہیں چاہتا۔

رہروان را خستگیٔ راہ نیست — عشق ہم راہ است و ہم خود منزل است

بلکہ وہ اس وقت کی حالت پر جب کہ وہ کسی کے دامِ الفت میں گرفتار نہ تھا افسوس کرتا ہے۔

نالہ از بہر رہائی نہ کند مُرغ اسیر — خورد افسوس زمانے کہ گرفتار نہ بود (عرفی)

یعنی مُرغ اسیر اس لئے آہ و فریاد نہیں کرتا کہ صیّاد ستم پیشہ اس کو کسی طریقہ سے رہا کر دے بلکہ یہ تمام نالہ و شیون صرف اس زمانے کی بربادی کے لئے ہو رہا ہے جبکہ وہ صیاد کے دام کا شکار نہ ہوا تھا۔ زندگی کا حقیقی لطف تو گرفتاری کے بعد ہی حاصل ہوا ہے۔ کاش کہ گرفتاری سے پہلے کا زمانہ بھی صیّاد کی مہمانی میں گزرتا۔

مرزا غالب نے اسی مفہوم کو طنزیہ اُصول کے ماتحت ایک عجیب و دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔

زخم سلوانے سے مجھ پہ چارہ جوئی کا ہے طعن
غیر سمجھا ہے کہ لذّت زخمِ سوزن میں نہیں

ایران کا رنگین مزاج اور بہار پرور وہ شاعر عشق و اُلفت کی پُر بہار وادی کی سیر کرتا ہے اور اس میں سے ایسے ایسے خوش نما پھول توڑ کر لاتا ہے جن کی بھینی بھینی اور مست کُن خوشبو سے ہر شخص تھوڑی دیر کے لئے مست و سرخوش ہو جاتا ہے۔ وہ اس کی ہر پیش آنے والی کیفیت کو سینکڑوں انداز سے پیش کر کے مخاطب و سامع کو دنیا و ما فیہا سے بیگانہ بنا دیتا ہے۔ وہ عشق و محبت کی لذات و کیفیات کو ابتدا سے انتہا تک ایک خاص قسم کی وجدانیت تصور کرتا ہے۔

عشق در اوّل و آخر ہمہ ذوق است و سماع — ایں شرابے است کہ ہم پختہ و ہم خام خوش است (طالب آملی)

یعنی کیفیت عشق اور لذت محبت اوّل سے آخر تک ذوق و سماع میں ڈوبا ہوا ایک نغمہ ہے اور یہ ایک ایسی شراب ہے جو پختہ اور خام دونوں حالتوں میں نہایت پُر کیف اور روشن الغرض وہ حقیقت کے چہرے کی نقاب کشائی کے لئے اس سے بہتر کوئی اور چیز نہیں سمجھتا۔

متاب از عشق رو گرچہ مجازی است
کہ آں بہرِ حقیقت کارسازی است
(مولینا جامی)

اس کے نزدیک تاثیر محبت اور کیفیت عشق سے بڑھ کر کوئی اور اکسیر ہی نہیں، وہ صرف اسی کو ایک ایسی اکسیر سمجھتا ہے جس سے دل کی تمام خباثتیں اور کدورتیں ذرا سی دیر میں دور ہو جایا کرتی ہیں۔ وہ صرف اسی کو ایک ایسی معجون تصوّر کرتا ہے جس سے طبیعت کا انقباض دور ہو کر سوز و گداز اور لطف و نرمی کا مادّہ پیدا ہو جاتا ہے۔

ہیچ اکسیر بہ تاثیر محبت نرسد   کفر آوردم و در عشق تو ایماں کردم (نظیری)

یعنی "دنیا کی کوئی اکسیر تاثیر محبت کے مقابلے میں نہیں ٹھہر سکتی۔ اس کا بیّن ثبوت یہ ہے کہ میں دنیا میں کفر کی کثافتوں سے آلودہ اور ملوّث آیا تھا لیکن تیرے عشق نے ان ہی کثافتوں اور آلودگیوں کو عین ایمان بنا دیا۔"

چونکہ اس کے ملک کا گوشہ گوشہ اور چپّہ چپّہ یوسفستاں بنا ہوا تھا اس لئے وہ چمنِ عشق کی ہر رنگینی اور دلفریبی کو بصد انداز اور بہزار اسلوب بیان کرتا ہے اور اس چمن کے ہر غنچہ کو مختلف طریقوں سے شگفتہ کر کے دلوں میں آگ سی لگا دیتا ہے۔ وہ داستانِ عشق اور افسانۂ محبت کو اس پُر کیف، شور انگیز اور رنگین انداز سے بیان کرتا ہے کہ مخاطب کا دل و دماغ ذوقِ عشق کی کیفیات سے معمور ہو جاتا ہے۔

ہر کس کہ بشنود، شورش ذوق عاشقی۔ از بس کہ حرف عشق بہ لذت ادا کنم

یعنی "درد عشق ایسے پُر کیف اور لذّت بخش انداز سے بیان کرتا ہوں کہ جو کوئی بھی اس کو سنتا ہے وہ ذوقِ عشق میں مست ہو جاتا ہے۔"

لفظ عشق کی تفسیر وہ اس اسلوب سے کرتا ہے جس سے یہ حقیقت ہویدا ہوتی ہے کہ دنیا میں صرف یہی ایک ایسی چیز ہے جو کل ذوی العقول کے اندر اپنے پُر کیف انداز سے طاری اور ساری ہے۔

ہر آنچہ اندر زمانہ درد و دل بود — یکے کردند و عشقش نام کردند
بہ گیتی ہر کجا درد و دلے بود — بہم کردند و عشقش نام کردند

یعنی "دنیا میں جس جگہ بھی درد اور دل پایا جاتا تھا ان کو باہم آمیختہ کر کے عشق نام رکھ دیا" چونکہ سوز، درد اور دل ہر جاندار میں پایا جاتا ہے لہٰذا کوئی جاندار عشق و محبت سے خالی نہیں۔

وہ جانداروں ہی میں عشق و محبت کی کیفیات و اثرات کا مشاہدہ نہیں کرتا بلکہ نباتات و جمادات سے لے کر دریا کی روانی، لہروں کا اضطراب، ہوا کی سنسناہٹ اور ذروں کا اتصال اسی چیز کا نتیجہ سمجھتا ہے۔ ع

جہاں پر فتنہ از غوغائے عشق است

اس کی نظریں چمن عشق کی دلفریبیوں اور نیرنگیوں میں اس قدر محو ہو جاتی ہیں کہ اس کو ہر چیز مئے عشق کے نشہ سے سرشار معلوم ہوتی ہے اور ہر جگہ حُسن محبوب کی سحر طرازیاں اور جلوہ پاشیاں نظر آتی ہیں۔

ہمہ کس طالب یار اند چہ ہشیار و چہ مست
ہمہ جا خانۂ عشق است چہ مسجد چہ کنشت
در عشق، خانقاہ و خرابات شرط نیست
ہر جا کہ ہست پرتو روئے حبیب ہست

ازالۂ شبہہ چونکہ عربی شاعری میں بھی اس قسم کی لطافتیں اکثر مواقع پر پائی جاتی ہیں اس لئے اس کو فارسی رنگ لطافت سے خالی کہنا ضرور ایک قسم کا شبہہ پیدا کر دیتا ہے۔ میں مانتا ہوں کہ عربی شاعری بھی اس میدان میں فارسی شاعری کے رنگ میں رنگی ہوئی ہے

لیکن دیکھنا یہ ہے کہ جس عربی شاعری میں اس قسم کی لطافتیں پائی جاتی ہیں حقیقت میں وہ عربی شاعری ہے بھی یا نہیں۔ زبان کے اعتبار سے تو اس کو ہر شخص عربی شاعری کہنے کے لئے مجبور ہے۔ لیکن جب اس کے طرز ادا، اسلوب بیان اور جذبات کی گہرائیوں پر نظر ڈالی جاتی ہے تو بیک جنبش نظر یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ بجز زبان کے اور کوئی خصوصیت اس کے اندر عربی شاعری کی نہیں جیسا کہ میں پہلے کسی جگہ پر اس بات کو صاف کر چکا ہوں، کہ عربی شاعری میرے نزدیک عبارت ہے صرف اس ارض مقدس کی شاعری سے جس کو حجاز کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

بنو اُمیہ کے ہاتھ میں جبتک زمام خلافت رہی اس وقت تک ایک گونہ عربی اثرات کا پرتو ان کی شاعری پر قائم رہا۔ چونکہ خلفائے اُمیہ کا پایہ تخت علاقہ شام میں تھا اور یہیں سے سلطنت کے تمام امور متعلقہ سرانجام پاتے تھے اس وجہ سے ان اثرات کا پرتو باقی رہا لیکن جب بنو اُمیہ کے ہاتھ سے عباسیوں کے ہاتھوں میں زمام حکومت پہنچی تو انھوں نے بغداد کی سدا بہار زمین کو اپنے لئے منتخب کیا۔ چونکہ بغداد ایرانی حدود سے قریب تر واقع ہوا تھا اس لئے اس جگہ کے منتخب ہوتے ہی ایرانیت تمام دربار پر چھاگئی۔ سلطنت کے تمام شعبوں پر ایرانی اثرات نے قبضہ کر لیا۔ حتیٰ کہ مامون رشید کے عہد میں سرکاری زبان بھی فارسی ہوگئی۔ ایرانیوں کو اپنے نزاکت آفرین تمدن کے سامنے کسی کی تہذیب ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ دربار پر ایرانی ابر کی طرح چھائے ہوئے تھے۔ اس لئے مجبوراً عربوں کو ایرانی رنگ میں اپنے آپ کو رنگنا پڑتا تھا۔ علاوہ ازیں ملک اور اس کی تہذیب کا اثر بھی اپنا کام کرتا رہا۔ مغلیہ عہد میں جتنے فارسی گو شعراء ہندوستان آئے ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں نکل سکا جو ہندوستان کی تہذیب اور آب و ہوا کے اثر سے متاثر نہ ہوا ہو۔ جذبات و خیالات کے علاوہ زبان تک یہاں کے اثرات سے متاثر ہوئے بغیر نہ بچی۔ سینکڑوں محاورات و مصطلحات یہاں ایسے پیدا ہوگئے جن کا سمجھنے والا ایران میں نہیں تھا

اسی اختلاف و بیگانگت کی وجہ سے ایرانیوں نے بجز خسرو "علیہ الرحمۃ" کے سب کو پوچ گویان ہند میں شمار کیا ہے۔ ایران میں سرسبزی و شادابی اور ہوا کی فرحت انگیزی کے باعث تیز ہوائیں یعنی لوئیں نہیں چلتیں لیکن ایرانی شعرا جب ہندوستان آئے تو ان کو مجبوراً اس لفظ کا اضافہ بطریق تفریس کرنا پڑا۔ چنانچہ عرفی کہتا ہے۔

آں باد گہ ہند گر آید جگر آید ۔۔۔ در چاشت گہ از شبنم گل گرد فشانست

مرزا کلیم خاص ایرانی نژاد ہے لیکن یہاں کے اثر کی وجہ سے کس قدر ہندیت کا پرتو جھلکتا ہے۔

منہ بر وعدۂ تنبولیان دل

کہ جز خون خوردن از دے نیست حاصل

ز حسن شستۂ دھوبی چہ گویم

از اں بے پردہ محبوبی چہ گویم

گل گڑھل نہ فہمید ست موسم

شگفتہ چوں رخ یار است دایم

جس ایرانی شاعر نے جنت نشان ہند کی طرف کبھی رخ نہیں کیا ہے وہ شکیب ربائی کا ذمہ دار کسی سرو قامت، شوخ دیدہ ترک بچے کو قرار دیتا ہے۔

درچشم من آمد آں سہی سرو بلند

بربود دلم زدست و در پائے فگند

لیکن جو ہندوستان کی آب و ہوا سے لطف اندوز ہو چکا ہے وہ اس کا ذمہ دار راجپوت اور شیخ زادے کو بھی قرار دیتا ہے۔

بتانِ راجپوت و شیخ زادہ ۔۔۔ شکیب عاشقاں بر باد دادہ

ایران میں ہوا کی فرحت و لطافت اس کے نزدیک نتیجہ ہے صرف گل سوسن، ریحان و نسترن، نرگس و نسرین اور سرو چنار کی بہتات کا۔ لیکن ہندوستان پہنچ کر یہ

چیزیں اس کے دماغ سے نکل جاتی ہیں. ہندیت کے آثار رنگ لانے لگتے ہیں۔

نہالِ نیمش از بس خوش نسیم است

دلِ طوبےٰ زرشک آں دو نیم است

اسی طریقے سے جب عربی شعرا اپنی حدود چھوڑ کر عباسیہ دربار میں پہنچے تو ان کے عاشقانہ جذبات بھی کچھ ایرانیوں کے اختلاط اور کچھ آب ہوا کی اثرانگیزی کی وجہ سے رنگین و پُر کیف ہو گئے وہ سادگی جو اس سے پہلے ان کی شاعری کی اصلی روح تھی جاتی رہی اور اس کے بجائے لطافت و رنگینی اور نزاکت و شوخی پیدا ہو گئی۔

وَ العشق کا المعشوق یعذب قربہ	للمبتلیٰ وَ ینال من حو بائہ

یعنی عاشق کو قربِ عشق ایسا ہی عزیز ہے جیسا قرب محبوب، باوجودیکہ عشق دشمنِ جانِ عاشق ہے مگر بایں ہمہ مرغوب ہے۔ یہ رنگ قدیم شاعری میں بھی نظر آتا ہے لیکن زور و شور، سوز و گداز، جوش و سرمستی، در تغزل کی یہ انتہا نظر آئی جو دور ما بعد کی شاعری میں پائی جاتی ہے۔ فارسی شاعر بھی اسی مضمون کو اسی رنگ میں پیش کرتا ہے۔

جائے ہنوز نیست بہ ذوقِ دیارِ عشق	ہر چند ظلم ہست و ستم ہست و داد نیست

قدیم عربی شاعر اظہارِ عشق کو اپنی محبت کی توہین تصور کرتا ہے لیکن وہی خون جب ایرانی اثرات قبول کر لیتا ہے تو اس کا اخفا اس کے اختیار میں نہیں رہتا۔

کتمت حبّك حتّٰی منك تکرمۃ

ثم استوی فیك اسراری وَ اعلانی

یعنی میں نے تیری محبت کو سب سے چھپایا حتّٰی کہ خود تجھ سے بھی پوشیدہ رکھا لیکن جب عشق غالب آگیا تو میرا اخفا و اظہار برابر ہو گیا۔ فارسی شاعر اسی مفہوم کو اس انداز سے لکھتا ہے۔

میتواں داشت نہاں عشق ز مردم لیکن	زردیٔ رنگِ رخ و خشکیٔ لب را چہ علاج

یعنی لوگوں سے جذبۂ عشق کا چھپانا کوئی مشکل بات نہیں لیکن خشک لبی اور زرد روئی کا کیا علاج۔

اسفی علی اسفی الذی دلھتنی　　عن علمہ فیہ علے خفاء

یعنی مجھ کو غم اس ادراک کے جاتے رہنے کا ہے جس کی لذّت سے تو نے مجھ کو سرخوش و مدہوش بنا دیا اور اس کی وجہ فارسی شاعر کی زبانی سنئے۔ ع

عشق در اوّل و آخر ہمہ ذوق است وسماع

ان المعین علی الصبابۃ بالاسیٰ　　اولیٰ برحمۃ ربّھا و اخائہٖ

یعنی "جو شخص باوجود اس حالتِ عشق کے جو مجھ پہ طاری ہے ملامت کرتا ہے گویا وہ میرے غم کی ترقی میں مدد کرتا ہے اس کو یہ سزاوار و مناسب ہے کہ وہ مجھ پہ رحم کرے اور میری غمخواری کرے نہ کہ نصیحت و ملامت کرکے میرے رنج و غم کو بڑھائے۔"

حقیقت میں اس شعر کے کل تاثرات عکس ہیں ایرانی آب و ہوا کی رنگینی و لطافت کا۔ یا یوں سمجھئے کہ اس رنگ کی ساری آب و تاب ایرانیت کی منّت کش ہے۔

مرزا غالب نے اس مفہوم کو نہایت پاکیزہ انداز میں پیش کیا ہے :۔

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا

عربی شعرا کے تمام ملکی اوصاف یہاں کی آب و ہوا اور تمدن کے نذر ہو چکے تھے یہاں کی بہار آفریں اور نزہت خیز آب و ہوا نے ایسا اثر پیدا کر دیا تھا کہ اپنی سادگی خود ان کو بُری معلوم ہونے لگی تھی بلکہ طبائع کو متوجہ کرکے کلام میں ایرانیت پیدا کی جاتی تھی۔ ایرانی تمدن کا اثر صرف شاعری تک محدود نہ رہا تھا بلکہ عربی تمدن و معاشرت بھی اسی کے زیر اثر ہو گئے تھے عرب کی اصلی شاعری پر جو بنی امیہ کے ابتدائی عہد میں ختم ہو چکی تھی جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو ہم کو ان کی شاعری میں پہاڑوں کی بلندی گھوڑوں اور اونٹوں کی رفتار، گرمی کی شدت، سفر کی مصیبت، مکانوں کی ویرانی اور بادِ سموم

کے جھونکوں وغیرہ کا ذکر کثرت سے ملتا ہے۔

علی الذبل جیاش کان اھتزامہٗ اذا جاش فیہ حمیہ غلی مرجل

یعنی اس گھوڑے کو جب ایڑ کا اشارا کیا جاتا ہے تو وہ بہت گرم ہو جاتا ہے اور اس کے خراٹوں کی آواز ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے ہنڈیا کا جوش۔

کان ثبیرا فی عرانین وبلہ کبیر اناس فی بجاد مزمل

یعنی کوہ ثبیر پر جبکہ بڑے بڑے بوندوں کا پانی برسنا شروع ہوا تو اس کی مختلف نالیوں سے جھاگ دار پانی بہنے لگا۔ یہ منظر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا کوئی بڑا سردار دھاریوں دار کملی اوڑھے بیٹھا ہے۔"

وَ اَتلعُ نہّاضٌ اذا اصعدت کسکان بوصی بدجلۃ مصعد؟

یعنی اس ناقہ کی کشیدہ گردن بہت بلند ہونے والی ہے جب وہ اس کو اٹھاتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دریائے دجلہ میں کشتی رواں کا دنبالہ ہے۔"

عربوں کا دستور تھا کہ خانہ بدوشی کی حالت میں جس جگہ ان کو پانی اور چراگاہیں مل جاتی تھیں اس جگہ وہ اپنے خیمے لگا دیتے تھے چونکہ مختلف قبیلوں کے لوگ خیمہ لگائے ہوئے تھے اس لئے ایک دوسرے سے ربط و ضبط پیدا ہو جاتا تھا اور بسا اوقات یہ ربط عشق و محبت کے درجہ تک ترقی کر جاتا تھا جب پانی وغیرہ ختم ہو جاتا تھا تو سب لوگ ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے تھے پھر جب کہیں اتفاق سے وہاں کبھی گذر ہوتا تھا تو وہ منہدمہ مقامات اور کھنڈروں کو دیکھ کر اپنے محبوب کی یاد میں مضطرب ہو جاتے تھے خود روتے تھے اور دوسروں کو بھی رلاتے تھے اور دردانگیز انداز سے اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر کہتے تھے۔

قفا نبک من ذکری حبیب ومنزل

لسقط اللوی بین الدخول فحومل

یعنی "اے میرے دوستو! ذرا ٹھیرو کہ ہم اپنی محبوبہ کی فرودگاہ کی یاد میں (جو موضع دخول وحمول کے ریت کے ٹیلے پر واقع ہے) اچھی طرح رولیں۔"

عفت الدیار محلها فمقامها   بمنیٰ تابّد غولها فرجامها

"وہ منیٰ کے گھر جن میں چند روز تک قیام رہا تھا سب مٹ گئے اور اس کے مواضع غول اور فرجام برباد ہوگئے۔"

فارسی شعرائے بھی اس رنگ میں اپنی جدت طبع کے چند نمونے پیش کئے گو رنگ عربی ہے لیکن اس کی آب وتاب ایرانی ہے جو بیک نظر معلوم ہوجاتی ہے۔

هست این دیار یار اگر شاید فرود آرم جمل
پرسم رباب و دعد را حال از رسوم و از طلل

ویرانی اور انقلاب حالت کے بیان میں تو بالکل ایرانیت چھائی ہوئی ہے۔

جائیکه بود آں دلستاں با دوستاں در بوستاں
شد زاغ و کرگس را مکاں شد مور و ماہی را وطن

جب عربی شعرا کے دماغوں میں ایرانی رنگ کے اثرات پیدا ہوگئے تو کوہ وبیابان کے مضامین مرغزار و گلزار بن گئے وہاں کی شاعری آبشاروں اور باد نسیم کے ذکر سے خالی رہی لیکن اس خطہ بہار انگیز میں قدم رکھنے کے بعد یہ سب چیزیں داخل ہوگئیں۔

اس تفصیلی بحث سے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آجاتی ہے کہ حقیقت میں عرب کی اس دور کی شاعری باختلاف زبان فارسی شاعری ہے یعنی باعتبار زبان اس کو عربی شاعری کہا جاسکتا ہے لیکن بہ لحاظ تخیلات وجذبات کسی صورت سے بھی اس کو عربی شاعری نہیں کہا جاسکتا، صاف طریقہ سے فارسی رنگ عربی پردے میں سے نظر آرہا ہے۔ عربی شاعری مع اپنی تمام خصوصیات کے صرف وہی شاعری ہے جو ابتدائے اسلام تک باقی رہی تھی اور اس موازنہ کے اندر میری مراد بھی اسی عہد تک کی شاعری سے ہے

اسی وجہ سے میں نے اپنے اس مضمون میں بنو امیہ اور عباسیہ کی دور کی شاعری کو ہاتھ نہیں لگایا۔

عربی شعرا کے حقیقی اوصاف مساوات، بلند حوصلگی، فیاضی، جنگ آزمائی، بہادری اور تواضع تھے اس لئے ان کی شاعری میں یہ اوصاف جن خوبیوں اور جوش کے ساتھ پائے جاتے ہیں وہ جوش و خروش بہاریہ اور عشقیہ رنگ میں نہیں، بہاریہ رنگ تو قدرتاً بہت ہی پھیکا ہے ہاں عشقیہ رنگ میں کچھ سامان لطف ذوق ہے لیکن وہ تیزی اور روانی نہیں جو ایرانی رنگ میں مخصوص ہے۔

عشقیہ رنگ کے تیز ہونے کا سبب ایران میں عشقیہ رنگ کے تیز و شوخ ہونے کے اسباب میں سے ایک سبب حسن بے پردہ کی قیامت خیزیاں اور محشر آرائیاں بھی تھیں یہاں کی سرزمین ہی حسن خیز نہ تھی بلکہ اس کی فضا بھی حسن کی تجلیوں اور ضیا پاشیوں سے معمور تھی۔ سارا ملک یوسفستان بنا ہوا تھا۔ ذرہ ذرہ آفتاب حسن کی تنویر سے مستنیر تھا ہر نوخیز کے چہرے سے حسن کی معصومیت برستی تھی۔ شراب حسن اس جگہ پہنچکر دو آتشہ سے سہ آتشہ بن چکی تھی، حسن کی عریانی نے ملک کے گوشہ گوشہ اور چپہ چپہ میں عشق و محبت کی آگ سی سلگا دی تھی، نوخیز ترکوں کے حسن معصوم کی شورشیں اس آگ پر تیل کا کام کر رہی تھیں، ساقی گری اور مجلس آرائی کی خدمات انھی شاب پروردوں کی سپرد تھیں۔ جلوت و خلوت کے شریک اور سفر و حضر کے ہمدم بھی تھے۔ ان کا تقویٰ شکن غمزہ ہر وقت دل آزاری اور نمک پاشی میں مصروف رہتا تھا ان کے سرخ و سفید اور حسین چہرے پرستاران محبت اور بندگان عشق کے لئے ہر وقت قیامت برپا کرتے رہتے تھے۔ بڑے بڑے امرا و سلاطین ان کے جگر پاش غمزوں سے مجروح ہو کر ان کی غلامی میں زندگی بسر کر رہے تھے حتیٰ کہ زاہدان وقت کا دین و ایمان بھی ان کی زہد شکن اداؤں سے محفوظ نہ رہا تھا۔

محتسب در قفائے رندان است   غافل از صوفیان شاہد باز (سعدی)

سلطنت عباسیہ کے آخری بدنصیب تاجدار نے جب فوج کو غیر ملکی بنانے کے ذوق میں عربوں کو فوجی صیغہ سے علیحدہ کر کے نوخیز ترکوں کو بھرتی کیا تو گلی کوچوں میں انکی آزادانہ آمدورفت شروع ہو گئی اور یہی وہ زمانہ تھا جب ان کے جمال جہاں آرا کی شوخیاں اور حسن نظرفروز کی رعنائیاں عنفوان شباب پر آ گئی تھیں، کسی شخص کا دامن صبر و قرار ان کے حسن و غمزہ کی گرفت سے آزاد نہ تھا ان کے شور انگیز جلووں نے تمام ملک کو نمونۂ رستخیز بنا دیا تھا جس کی طرف ان کی مدبھری نظریں اُٹھ جاتی تھیں اس کو بیگانۂ عقل و ہوش ہونا پڑتا تھا ان کی مستانہ چال ایک قیامت تھی۔ ہر قدم پر خوابیدہ فتنے بیدار ہوتے تھے۔ ع

باصد کرشمہ آں بت بدمست می رود،
خود می کند خرام و خود از دست می رود

سبزہ زاروں میں ان کی گلگشتیں ایک عجیب ہوش رُبا کیفیت اپنے اندر پنہاں رکھتی تھیں ان کے نزہت بخش اور فرحت آثار چہرے دیدۂ مردم نظارہ کے لئے سامان بہار مہیا کرتے تھے۔

یارب ایں بچہ ترکاں چہ بتاں اند کہ ہست دیدۂ مردم نظارہ ازایشاں چہ بہار

یعنی "اے خدا! یہ ترک بچے کیسے معشوق ہیں کہ ان کے دیکھنے سے آنکھ میں بہار پیدا ہوتی ہے"۔

لیکن عرب میں یہ باتیں کہاں میسّر تھیں ان کا حسن سادگی کا سرمایہ دار تھا۔ شوخی و شرارت ناز و غمزہ جو قصرِ حسن کے نقش و نگار ہیں ان سے یہاں کا حسن معرا تھا۔ یہاں ان کے صہبائے حسن میں مستی و چاشنی کا پتہ نہ تھا اور نہ ناز و غمزے میں وہ جگر افگاریاں تھیں جو ایران کے شوخ و شنگ ترکوں کے انداز میں پائی جاتی تھیں چونکہ عرب میں مرد سے عشق و محبت کا اظہار نہیں کیا جاتا تھا، ان کے عشق کا مرکز اصول فطرت کے موافق عورت کی ذات تھی عورت کو کتنی ہی آزادی کیوں نہ ہو لیکن وہ مردوں کی آزادی کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ ایران

کے گلی کوچوں میں ترک بچے اپنی بل کھائی زلفوں کو سنوارے عشقیہ جذبات میں ایک بے پناہ تلاطم پیدا کرتے رہتے تھے۔ یہ اسی کا اثر تھا کہ مدرسوں میں استادوں کی نظریں بھی پری جمال شاگردوں کے چہروں سے ایک منٹ کے لئے جدا نہیں ہوتی تھیں ع

من بتو مشغول و تو با عمرو زید

عربوں کو اصول فطرت کے موافق پردہ نشینوں سے عشق و محبت کے معاملات پیش آتے تھے اس لئے مدتوں تک یہ معاملات صیغۂ راز میں پوشیدہ رہا کرتے تھے چونکہ یہ راز کسی کے چھپائے سے چھپتا نہیں اس لئے جب یہ بات راز کی سرحد سے باہر ہو جاتی تو خاندان کی جانب سے اس عورت کی آزادی اور آمدورفت پر پابندیاں عائد کردی جاتیں، لیکن جب یہ حفاظت ان کی طاقت سے باہر ہو جاتی تو اکثر صورتوں میں اس کا نکاح اس کے عاشق کے ساتھ کر دیا جاتا تھا اس سے دو فائدے نکلتے تھے ایک تو ازدواجی زمانہ نہایت عیش و عشرت اور صلح و امن سے بسر ہوتا تھا دوسرے ذلت و رسوائی سے بھی نجات مل جاتی تھی۔ عربی حسن چونکہ کوچہ بکوچہ تشہیر سے بہت دور رہا اس وجہ سے عرب میں عشقیہ شاعری کو وہ ترقی نصیب نہیں جو ایران کی بہار آفریں زمین کو حاصل ہوئی۔

فارسی شاعری نے وصل و فراق، گلہ و شکر، صبر و قرار اور رقابت کی داستانوں میں جو جو خیال بندیاں اور مضمون آفرینیاں پیدا کی ہیں عرب کی عشقیہ شاعری میں ان پرکیف داستانوں کا دسواں حصہ بھی نہیں پایا جاتا، عہد تمدن کی عربی شاعری میں گو اس قسم کے جستہ جستہ خیالات ایرانی رنگ میں پائے جاتے ہیں لیکن اس دور کی عربی شاعری حقیقت میں باختلاف الفاظ ایرانی شاعری ہے اس لئے اسکی تمثیلات سے یہاں کچھ بحث نہیں۔

اگرچہ فارسی کی عشقیہ شاعری میں عشق و محبت اور وصل و فراق کی مسلسل

داستانوں کے بجائے مفرد خیالات کا حصہ زیادہ پایا جاتا ہے اور محبوب کی جدائی اور وداع وسفر کے حالات تفصیلی اور مسلسل رنگ میں نہیں ملتے لیکن ان مفرد خیالات میں لذت و کیف اور ندرت وجدت کے رنگین جذبات کا جتنا حصہ موجود ہے وہ عربی کے مسلسل اور مفصل انداز میں نہیں. عشق ومحبت کی منزل سے جتنے راستے نکل سکتے تھے فارسی شعرا نے ان میں سے ہر ایک پر اپنے مضمون آفریں قلم سے جیسی کچھ نکتہ آفرینیاں اور جدت طرازیاں کی ہیں عربی شعرا کے دماغ اس طرف رسائی بھی نہیں کر سکتے. محبوب کی بے مہریوں اور فلک نیلگوں کی ظلم فرسائیوں کو کتاب عشق میں سبق اوّل کا درجہ حاصل ہے. فارسی شاعری نے اس سبق کے متن پر جتنی حاشیہ آرائی کی ہے عربی شاعری اس سے یکسر خالی پائی جاتی ہے.

وداع اور سفر محبوب محبوب کا سفر اور اس کے جزئیات کی تشریح عشقیہ شاعری کا خاص موضوع رہا ہے. مختلف انداز سے شعرائے عرب نے اس موضوع پر قلم فرسائیاں کی ہیں اور عجیب عجیب نکتہ آفرینیوں سے کام لیا ہے اگرچہ فارسی کی عشقیہ شاعری کا یہ خاص موضوع نہیں اور نہ اس موضوع پر قلم فرسائی کا اس کو دعویٰ ہے لیکن اس کے باوجود جو رقت اور درد وکرب اس کے انداز میں ہے عربی رنگ اس اظہار اضطراب سے خالی ہے.

خذول تراعی ربربا بخمیلۃ　　　تناول اطراف البریر وترتدی

اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ میری معشوقہ (خولہ) مجھ سے جدا ہو کر جا رہی ہے اور براہ تعلق یا بسبب میری کشش محبت کے میری طرف دیکھتی جاتی ہے جیسے کہ ہرنی اپنے ساتھیوں سے جدا ہو کر دوسرے گلے کے ساتھ چرنے لگتی ہے تو وہ کبھی کبھی اپنے سابق ساتھیوں کو بھی دیکھ لیا کرتی ہے کہ وہ کہاں چر رہے ہیں.

اس شعر کے ہر لفظ پر ایک گہری نظر ڈال جائیے کسی لفظ سے آپ کو اس حسرت و اضطراب کا پتہ نہیں چل سکتا جو محبوب کی جدائی کے وقت عاشق کے غمزدہ دل میں قدرتاً

پیدا ہوا کرتا ہے. بلکہ اس شعر کا طرز بیان واقعہ نگاری کے عام انداز سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے
وداع وسفر کے بیان میں ایسے الفاظ اور ایسے اسالیب کا انتخاب جس سے حسرت واضطراب
کا عالم نہایت شدت کے ساتھ ظاہر ہو بہت ضروری ہے۔

وَ انی لامضی الھمّ عند احتضارہٖ   بعوجاء مرقال تروح و تغتدی

خلاصہ معانی یہ ہے کہ میری محبوبہ گو مجھ سے دور چلی گئی ہے مگر مجھ کو اس تک پہنچنے میں
کوئی دشواری نہیں۔"

اس شعر سے اطمینان اور جرأت کا انداز ثابت ہوتا ہے جو سراسر خلاف ہے وداع
وسفر کے مواقع کے ان مواقع پر جرأت و اطمینان کے بجائے خاکساری، گریہ وزاری اور اضطراب
و بے چینی کے مضامین کا ہونا لابدی ہے۔

بل ما تذکر من نوار وقد نأت   و تقطعت اسبابھا و رمامھا

اپنے آپ کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ اب تو نوار (نام محبوبہ) کو کیا یاد کر کے
روتا ہے اس کے خیال کو چھوڑ دے۔ کیونکہ وہ بہت دور چلی گئی اور اس کے وصال کے
سب راستے بند ہو گئے۔

مریۃ حلت بفید وجاورت   اھل الحجاز فاین منک مرامھا

نوار بنی مرہ کی نسل سے ہے اور وہ مقام فید میں جا اتری ہے اور اہل حجاز کی ہمسایہ
ہو گی پس جب یہ حال ہے تو تیرے لئے کون سی صورت کامیابی کی ہے۔

بمشارق الجبلین او بمحجر   فتضمنتھا فردۃ فرجامھا

اس شعر کے تفصیلی معنی کا خلاصہ یہ ہے کہ محبوبہ (نوار) پہاڑوں سے گھرے
ہوئے میدان میں جا اتری ہے یعنی اب وہ ہم سے بہت دور ہو گئی اور وصل کا کوئی موقع نہیں رہا۔

ان تینوں اشعار سے کسی طرح بھی عاشق کی اضطرابی کیفیت کا پتہ نہیں چلتا۔ بلکہ
عاشق اپنے دل کو تسلّی دیتا ہے کہ جو ہونا تھا سو ہو گیا اب گریہ وزاری سے کوئی فائدہ

نہیں بہتر یہی ہے کہ اس کے خیال وصل کو بھی دور کر دیا جائے ہاں بعض مضامین بصد جستجو ایسے مل جاتے ہیں جن میں وداع وسفر کے وقت کی خصوصیات کا پرتو جھلکتا ہوتا ہے۔

قفی قبل التفرق یا ظعینا — نخبرک الیقین وتخبرینا

یعنی اے ہودج نشین محبوبہ جدائی سے پہلے اپنی سواری ٹھیرا تاکہ ہم تجھ کو اپنی تکلیف مفارقت سے خبر کر دیں اور تو ہم کو اپنے حال سے مطلع کر دے۔

تبصر خلیلی ھل تری من ظعائن — تحملن بالعلیاء من فوق جر ثم

اے میرے دوست! ذرا غور سے دیکھ کیا تجھ کو ایسی زنان ہودج نشین نظر آ رہی ہیں جو اپنا اسباب کجاوے پر باندھ رہی ہیں یا صرف مجھ کو جوش محبت کی وجہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے جلد بتا کہ کیا میرا خیال صحیح ہے تاکہ میں ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو کر ان کے پاس پہنچوں اور ایک آخری نظر ان پر ڈال لوں۔

یہ خیالات اگرچہ کچھ وداعی حالات کی مصوری کرتے ہیں لیکن وہ بات نہیں پیدا ہوتی جو ایرانی رنگ میں ہے۔

فارسی شاعر صرف حالات سفر اور مقتضیات کے ذکر پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ اصولی طور پر ابتدا سے چلتا ہے جب کسی شخص کو کسی سے قلبی تعلق ہو جاتا ہے تو اس کی جدائی اور دوری ایک منٹ کے لئے نہیں بھاتی اس کی مرضی اور خواہش یہی ہوتی ہے کہ اس کا محبوب اس کی نظر کے سامنے رہے، اتفاق سے جب کہیں محبوب جانے کا ارادہ کرتا ہے تو وہ اس کو اس انداز سے روکتا ہے جس سے اس کے باطنی احساس اور اندرونی اضطراب کا نقشہ سامنے آ جاتا ہے اور سامع بیک سماعت اس کی محبت کی گہرائیوں کا صحیح جائزہ لے سکتا ہے اس موقع پر صرف یہی ایک چیز لحاظ کے قابل ہوتی ہے یعنی سفر سے باز رکھنے کے انداز سے اگر اس کے اندرونی احساسات کا پتہ نہ چل سکے تو یقیناً اس کے جذبات میں اثر انگیزی پیدا نہیں ہو سکتی۔ اس انداز کو ملاحظہ کیجئے۔ الفاظ میں تو عمومیت کا رنگ پایا جاتا ہے لیکن

اسلوب بیان اور طرز نگارش سے اس احساس کا پتہ چل جاتا ہے جو کسی کے دل میں ایک عام بے چینی کی لہر پیدا کئے ہوئے ہے۔

از تو نماندہ تاب جدائی دگر مرا بہر خدا مرو بہ سفر یا ببر مرا

اس تقسیم میں جدت آمیز تخصیص کا ایک اور رنگ پیدا کیا ہے جس سے معشوق کی عام سرد مہری اور بے التفاتی کی شان بھی ہویدا ہو جاتی ہے۔

نادیدہ کرد، تا نکنم عزم ہمرہی آں مہ چو دید وقت سفر در گذر مرا

عام قاعدہ ہے کہ جب کوئی کسی عزیز کے سفر کے متعلق یکایک خبر سنتا ہے تو مضطرب سا ہو جاتا ہے۔ عاشق کے نزدیک محبوب کی ہستی سے بڑھ کر اور کون عزیز ہو سکتا ہے۔ جب اس کو اپنے معشوق کے سفر کے بارے میں اچانک خبر ملتی ہے تو اس خبر کو سنکر اسکے مجروح دل پر جیسی کچھ گزرتی ہے اس کو اس انداز سے ظاہر کرتا ہے کہ سامع کے دل پر بھی ایک قسم کی چوٹ سی محسوس ہوتی ہے۔

گر قصد آں نہ داشت کہ گردم ز غم ہلاک
بہر چہ کرد؟ از سفر خود خبر مرا

عربی شاعر کا یہ مخصوص رنگ ہے کہ وہ راستے کی سختیوں مصیبتوں اور دشوار گزاریوں کو اس انداز سے بیان کرتا ہے جس کو سن کر معشوق ارادۂ سفر سے باز آجائے فارسی شاعر نے بھی اس موقع پہ یہی اسلوب اختیار کیا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ ایرانی رنگ تغزل اس بیان میں وہ کیف وسوز پیدا کرتا ہے جس سے عربی رنگ خالی ہے۔

یاران خدائے را بسوئے او گذر کنید باشد کش ایں خیال زخاطر بدر کنید
از حال ما چناں کہ درد کار گر شود آں بے محل سفر کن ما را خبر کنید
منعش کنید از سفر و در میان منع اغراق در صعوبت رنج سفر کنید
گر خود شنید جان من و مژدہ از شما او نشنود مباد کہ ایں جا گذر کنید

یعنی اے دوستو! خدا کے لئے اس بے مہر کے پاس ذرا جاؤ ممکن ہے کہ یہ خیال اس کے دل سے نکالنے میں تم کامیاب ہو جاؤ اس بے موقع سفر کرنے والے سے ہمارا حال اس انداز سے بیان کرو، کہ اس کے دل پر خاص اثر مترتب ہو۔ سفر کے ارادے سے اس کو روکو بسلسلۂ گفتگو میں راستہ کی سختیوں کو بھی خوب بیان کرو اگر وہ مان لے تو میرے پاس خوش خبری لانا میں اس کے عوض اپنی جان نذر کردوں گا اور اگر بدقسمتی سے نہ سُنے تو پھر میرے پاس آنے کا خیال نہ کرنا۔"

عربی کی تمام شاعری کا مطالعہ کر جائیے لیکن یہ انداز بیان اور یہ سوز و گداز آپ کو کسی جگہ بھی نہیں ملے گا باوجودیکہ عربی شاعری کا یہ خاص موضوع ہے مگر کشش و کھربائی فارسی کے ساتھ ہے۔

بدگمانیاں | بدگمانی اور عشق دونوں لازم و ملزوم چیزیں ہیں جہاں عشق پایا جائے گا وہاں بدگمانی کا وجود ضرور ضرور ہوگا یا یوں سمجھئے کہ عشق و محبت کا تقاضا ہی بدگمانی کی تخلیق ہے۔ دنیا کے کسی خطّہ کی شاعری بدگمانی کے بیانات سے خالی نہیں، عربی شاعری نے بھی اس رنگ کو مختلف انداز سے پیش کیا ہے لیکن فارسی شاعری نے "بہ تقاضائے فطرت خویش" اس مضمون میں جو گوناگوں رنگ آمیزیاں کی ہیں عربی شاعری ان رنگ آرائیوں سے معرّا ہے۔

بدگمانی کے سبق کا یہ اہم ٹکڑا ہے کہ محبوب عاشق کی مزاج پُرسی کے لئے آتا ہے۔ لیکن عاشق کے لئے یہ خیال سوہان روح بن جاتا ہے کہ اس کو میرے گھر کا پتہ کیسے معلوم ہوا اور نہ معلوم کہ کہاں کہاں اور کس کس سے میرے گھر کا پتہ اس نے دریافت کیا ہوگا اس ٹکڑے کو ایران کا رند اور مست شاعر گوناگوں انداز اور مختلف قسم کی طلسم کاریوں سے بیان کرتا ہے اور ایک عجیب حسرت و یاس کا عالم پیدا کر دیتا ہے۔ عربی رنگ اس قسم کی رنگینیوں سے خالی نہیں لیکن حسرت و یاس کی تخلیق سے ضرور عاری ہے۔

با آں کہ بہ پرسیدن ما آمدہ مُردم
کایا کہ زیر پرسیدہ رہ خانۂ مارا

اُردو میں مرزا غالب نے اس مضمون کو ایک دوسرے رنگ میں پیش کیا ہے جو یقیناً انھی کا حصہ ہے۔

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں ،
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

عاشق کا کوئی دوست اگر اتفاق سے معشوق کے متعلق کچھ دریافت کر لیتا ہے (خواہ وہ رسمی طور پر خیریت مزاج ہی کیوں نہ ہو) لیکن عاشق کے دل میں پے بہ پے یہ خیالات پیدا ہوتے ہیں کہ "اس نے کیوں اور کس غرض سے یہ دریافت کیا" اس کا اور محبوب کا کیا تعلق ہے۔

کاش اے محرم! انمی پرسیدمت کان مہ کجا است ،
یک سخن گفتی و باز از صد گمانم سوختی ،

جب محبوب کی آنکھوں میں خواب کی سی کیفیت پیدا ہوتی ہے تو عاشق کے دل میں ایک بدگمانی پیدا کرنے والا اضطراب سا پیدا ہو جاتا ہے وہ سوچنے لگتا ہے کہ کہیں ضرور اس نے رات عیش و طرب میں بسر کی ہے جس کی وجہ سے اس وقت اس کی آنکھوں میں نیند بھری ہوئی ہے۔ زلفوں کی آراستگی پر جب نظر پڑتی ہے تو وہ بھی اس کے بدگمان دل کے لئے وجہ بدگمانی بن جاتی ہے۔

خواب آں نرگس فتان تو بے چیزے نیست
تاب آں زلف پریشان تو بے چیزے نیست

حتیٰ کہ بدگمانی کی دنیا میں ایک موقع یہ بھی آتا ہے کہ عاشق خود اپنی ہستی کے متعلق بدگمانی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ خود اپنی نظر بھی معشوق کی جانب اٹھانے کو شک و بدگمانی کی نظر سے دیکھتا ہے اور شوق آرزو کے مطابق نظر اندازی کو بے ادبی پر محمول کرتا ہے۔ ع بحکم شوق تماشا مکن کہ بے ادبی است (عرفی)

مرزا غالب نے اس مفہوم کی حقیقی مصوری کی ہے۔ ملاحظہ ہو۔ ؎

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

ستم انگیزیاں ظلم و ستم یہ وہ الفاظ ہیں جو عشقیہ شاعری کی دنیا میں معشوق کی ذات کے ساتھ بطور صفات استعمال کئے جاتے ہیں دنیا کے کسی خطہ کا محبوب ان صفات سے عاری نہیں۔ عربی شاعری کا محبوب بھی ان صفات سے متصف ہے۔ لیکن ایرانی محبوب میں جس شدت کے ساتھ یہ صفات موجود ہیں اتنی شدت عربی محبوب میں نہیں ایران کا فتنہ گر معشوق عاشق کی کمزوریوں اور حوصلہ مندیوں سے اچھی طرح واقف ہے اس لئے وہ ظلم و ستم اور فتنہ گری کے چہرے کی سو سو طرح سے نقاب کشائی کرتا ہے اور چونکہ وہ اس رمز سے بھی واقف ہے کہ عاشق کو میرے ظلم و ستم سے کوئی تکلیف نہیں پہونچتی بلکہ اس کے لئے عید نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا۔ اس لئے وہ نہایت بیباکی سے عاشق کو چھیڑنے کے لئے نت نئے ظلم ایجاد کرتا ہے۔

ہر گاہ کہ از لطف بہ کیں میل تو بیش است
ادل نمک سینۂ ما پاش کہ ریش است (عرفی)

خود تو رقیب کے ساتھ چہل قدمی میں مصروف ہے راستہ میں کہیں قسمت کا مارا بیچارہ عاشق بھی بل جاتا ہے۔ چھیڑنے کی غرض سے اس سے بھی ساتھ چلنے کو کہتا ہے حالانکہ وہ اس بھید سے خوب واقف ہے کہ اس حالت میں عاشق کی غیرت ساتھ چلنے کو کبھی بھی گوارا نہیں کر سکتی لیکن اس کا مقصود تو بجز شوخی و ناز اور کچھ نہیں۔

سیر دی با غیر دمی گوئی بیا عرفی تو ہم — لطف فرمودی برو کیں پائے رفتارم نیست

ایرانی محبوب کی نوخیزی اور ناز و غمزہ کا مقابلہ دوسری جگہ کا محبوب نہیں کر سکتا یہ صرف ایرانی محبوب کی جمال آرائیوں کا اثر ہے کہ فارسی شاعری نے عشقیہ میدان میں وہ

گوہر آبدار پیش کئے ہیں کہ دنیا کی عشقیہ شاعری اس کے تنوع اور فروغ کے سامنے ماند پڑ گئی۔ ایرانی محبوب ناز و انداز کا ایک پیکر اور حسن و غمزہ کا ایک حسین مجسمہ ہے اور اسی کے ساتھ عشق و محبت کا ادا شناس اور معاملات الفت کا نکتہ داں اس کے مقابل عرب کے محبوب میں بجائے حسن و غمزے کی کشش کے بدویت اور اکھڑ پن کے آثار زیادہ پائے جاتے ہیں۔ واردات عشق کی ادا شناسی سے اس کو کوئی واسطہ نہیں ایران کا بلند و بالا محبوب اپنے حسن دلکش کی پرتو افگنی سے عاشقانہ جذبات کو اس قدر برانگیختہ کر دیتا ہے کہ ہر شخص کا دل عشق و محبت کی فسوں کاریوں سے مسحور سا ہونے لگتا ہے اور ایک عام کیفیت سی طاری ہو جاتی ہے اور یہ بیخودی اتنی ترقی کر جاتی ہے کہ خود محبوب عاشق کی جانب متوجہ ہے لیکن عاشق کو محویت کی وجہ سے کچھ خبر نہیں۔

ربودہ آں چناں از خود خیال آں پری رویم
کہ خود حرفے اگر پرسد جواب او نمی گویم
ز حال او اگرچہ آگہم بیش از ہمہ، لیکن
ز بیتابیٔ شوق احوال او از این و آں پرسم

ایرانی محبوب کا ہر انداز ظلم اپنے اندر ایک ایسا نشتر پنہاں رکھتا ہے جس کے لگنے کے بعد زخم کا اندمال ممکن نہیں اس شوخی کی انتہا کو ملاحظہ کیجئے۔

گفتم چہ گونہ می کشی و زندہ می کنی — از یک نگاہ کشت و نگاہ دگر نہ کرد

گاہے گاہے عاشق کو اپنے پہلو میں جگہ دے دی جاتی ہے بظاہر تو یہ لطف و کرم معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت میں کرم و عنایت مقصود نہیں بلکہ اس میں یہ رمز پنہاں ہوتا ہے کہ وہ اچھی طرح سے چمن حسن کی خوشہ چینی بھی نہ کر سکے۔

در بزم ازاں بہ پہلوئے خود جا دہد مرا
تا راست سوئے او نتوانم نگاہ کرد

رقیب کی مکر آمیز اور بوالہوسانہ انداز گفتگو میں محبوب کو لطف آرہا ہے۔ لیکن عاشق کو فریب میں مبتلا کرنے کی غرض سے وہ رقیب کی جانب سے بطرز حیلہ اپنا منھ پھیر لیتا ہے تاکہ عاشق یہ سمجھ لے کہ رقیب کی جانب اس کو التفات نہیں بلکہ خود رقیب ہی اس کی بزم میں بے شرمانہ آتا ہے۔ حالانکہ محبوب کی ساری توجہ درپردہ رقیب ہی کی جانب ہے۔ عاشق کو تو صرف مبتلائے فریب رکھنا چاہتا ہے۔

چوں کند غیر سخن بہر فریب دل من — رو بگردانی و خود را بہ شنیدن داری

نواب کلب علی خاں مرحوم والی ریاست رام پور نے اسی مفہوم کو ایک عجیب دلکش انداز سے پیش کیا ہے۔

سخن با غیر و روئے سوئے من داری سرت گردم
زچشم حسرتم فہمیدہ باشی بدگمانی را

"سرت گردم" کے اضافی ٹکڑے نے اس مفہوم میں شعریت کا اصلی رنگ پیدا کر دیا۔ معشوق کی بزم ناز میں عاشق اور رقیب دونوں موجود ہیں۔ عاشق بیچارہ رقیب کی موجودگی کے باعث ایک راز کی بات آہستہ سے معشوق سے پوچھتا ہے لیکن وہ اپنی شوخی، ستم ظریفی اور کج ادائی سے نہیں چوکتا اس کا جواب وہ اس انداز سے دیتا ہے کہ رقیب کے کان بھی اس سے آشنا ہو جاتے ہیں چونکہ وہ بات رقیب کے خلاف واقع ہوتی ہے اس لئے عاشق کو اس کی ستم ظریفی کی وجہ سے مفت میں ندامت و شرمندگی حاصل ہوتی ہے۔

چناں گوید جواب من کزاں گردد رقیب آگہ
بہ مجلس گر من بیدل از و حرفے نہاں پرسم

اس کو ظلم آرائی کا صرف ایک انداز ہی یاد نہیں بلکہ سینکڑوں طریقے اس کی قوت اختراع ایجاد کرتی رہتی ہے اس کا ہر انداز ایک نیا ظلم اپنے اندر پنہاں رکھتا ہے کبھی ایسا ہوتا ہے کہ عاشق بہر مصلحت چند روز کے لئے آمد و رفت بند کر دیتا ہے۔ ستم

شعار محبوب کو اس چند روزہ غیر حاضری سے ایک نیا انداز ظلم ہاتھ آجاتا ہے اور وہ اس غیر حاضری کی تعزیر میں پھر اس کو حاضری کی اجازت بھی نہیں دیتا۔

رفتم دو روزے از در او بہر مصلحت
دیگر مرا نخواند وہماں را بہانہ ساخت

چونکہ ظلم وستم اور ناانصافی محبوب کے خمیر میں داخل ہے اس اعتبار سے عربی محبوب بھی اس میدان میں کسی سے پیچھے نہیں لیکن اسی کے ساتھ عاشق کی خبرگیری اور وفاشعاری کے اوصاف بھی اس کی ذات میں پائے جاتے ہیں اگر وہ ایک طرف ظلم دوست ہے تو دوسری جانب رحم وکرم کی نشانیاں بھی اس کے اندر موجود ہیں۔

خذل تراعی ربربا بخمیلۃ تناول اطراف البریر وترتدی

"یعنی میری معشوقہ مجھ سے جدا ہو کر جارہی ہے اور براہ تعلق میری طرف دیکھتی جاتی ہے جیسے کہ ہرنی اپنے ساتھیوں سے جدا ہو کر دوسرے گلے کے ساتھ چرنے لگتی ہے تو وہ کبھی کبھی اپنے ساتھیوں کو بھی دیکھ لیا کرتی ہے کہ وہ کہاں چر رہے ہیں" وقت روانگی عاشق کی طرف دیکھنا اس کے رحم وکرم کی دلیل ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ عرب کا عاشق اپنے آپ کو لئے ہوئے رہتا ہے وہ معشوق کی بے اعتنائیوں اور بے التفاتیوں پر فخر نہیں کرتا بلکہ وہ اس حالت کو زیادہ عرصے تک اپنے لئے ناقابل برداشت تصوّر کرتا ہے اور نہایت شرافت کے ساتھ اس سے علیحدگی اختیار کرلیتا ہے۔

بِطَلِیحٍ اَسْفَارٍ تَرَکْنَ بَقِیَّۃً ۔ مِنْهَا فَاَحْنَقَ صُلْبُهَا وَ سَنَامُهَا

خلاصۂ مفہوم یہ ہے کہ محبوب کے برتاؤ میں اگر کچھ فرق آجائے تو تیرے لئے ضروری ہے کہ تو اپنی تیز رو ناقہ کے ذریعہ اس کے پاس سے علیحدہ ہو جا لیکن ایرانی محبوب کے پاس رحم وکرم کا گذر نہیں وہ ظلم وستم کا ایک مجسمہ ہوتا ہے۔ عاشق کا استفسار حال اس کی ظلم پیشہ سرشت کے سراسر خلاف ہے بلکہ وہ اس طرف توجہ بھی نہیں کرتا اور اگر کبھی اس

کا خیال آ بھی گیا تو اس کا منشا استفسار حال نہیں ہوتا بلکہ اس پردے میں نمک پاشی مدنظر ہوتی ہے عاشق کو ستانے کے لئے رقیبوں سے اس کی حالت دریافت کرتا ہے۔ جس سے بیچارے عاشق کا دلِ غمزدہ اور مجروح ہوجاتا ہے۔

پس از عمرے اگر حال من بیمار می پرسد
نمی پرسد ز من آں نیز ہم ز اغیار می پرسد

اس کی ستم ظریفی اور ظلم ودستی کا ایک انداز یہ ہے کہ عاشق حرماں نصیب کے جو راز اس کو معلوم ہوتے ہیں ان کو تو رقیبوں سے کہہ دیتا ہے لیکن رقیبوں کے حالات اپنے رازوں کی طرح عاشق سے پوشیدہ رکھتا ہے۔

سخن مدعیان راکند از من پنہاں   و آنچہ از من شنود بر ہمہ اظہار کند ؟

عشق ومحبت اور شوق و آرزو کی زیادتی کی وجہ سے عاشق کی یہ عین تمنا ہوتی ہے کہ معشوق اس کی طرف خاص التفات رکھے اور اس کے کہنے پر عمل کرے لیکن محبوب کو عاشق کُشی میں جو لطف آتا ہے وہ عاشق پرستی اور وفا شعاری میں کہاں۔ عاشق کی ذلت ورسوائی میں جو لذت پنہاں ہے وہ تکریم عاشق میں نہیں۔ عاشق کی آرزوؤں کا وہ صرف اس وجہ سے خون کرتا ہے کہ اس سے اس کو لطف آتا ہے وہ عاشق کی رائے کی صرف اس وجہ سے مخالفت کرتا ہے تاکہ رقیبوں کی نظروں میں عاشق کی رسوائی اور سبکی ہوسکے۔

تا مرا در نظر مدعیاں خوار کند   ہر چہ گویم بخلاف سخنم کار کند

عاشق کی خوش قسمتی سے کبھی کوئی ایسا کلمہ اس کے منہ سے نکل بھی گیا جس سے محبت کا مفہوم متعین کیا جاسکے یا عاشق کی دلجوئی کا انداز پایا جاسکے تو فوراً پے بہ پے ایسی باتیں کہا جاتا ہے جس سے کلمات سابقہ کا مفہوم محبت کے دائرے میں محدود کرنا مشکل ہوجاتا ہے

یکبار نہ گفتی سخن مہر کہ در پے   صد گونہ حدیث غلط انداز نہ گفتی

ایرانی محبوب کے ظلم وستم کا سب سے نیا انداز یہ ہے کہ عاشق کسی تدبیر سے اگر بزم محبوب میں

پہنچ بھی گیا تو اس بیچارے سے آنے کی غرض دریافت کی جاتی ہے اور مقصود اس سے یہ ہوتا ہے کہ اس طنزی رنگ سے پریشان ہو کر بزم کو خالی کر دے چنانچہ نتیجہ اس کا یہی نکلتا ہے کہ عاشق بیچارہ شرمندہ ہو کر بزم محبوب سے اُٹھ جاتا ہے۔

پس از عمرے کہ در بزمش بہ صد تقریب بنشینم سخن از مدعائے من کند تا زود برخیزم

عاشق بیچارہ گڑگڑاتا ہے آہ وزاری کرتا ہے لیکن اس کے بے وفا دل میں رحم وکرم کے آثار بھی نہیں پیدا ہوتے وہ اس کی بے چینی اور اضطراب کی جانب التفات بھی نہیں کرتا بلکہ اس کے اظہار اضطراب پر مُسکرا کر منہ پھیر لیتا ہے۔

می نشینم می شکیبم می گدازم ہر دم اضطرابے می کنم اما کہ پروا می کند

معشوق بزم ناز میں سرگرم تماشا ہے اتنے میں اس کو عاشق کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کا خیال پیدا ہوا۔ عاشق کو بلانے کے لئے قصداً ایسے شخص کو بھیجتا ہے جس کو عاشق کے گھر کا پتہ بھی نہیں معلوم اور مقصود اس کج ادائی سے عدم طلبی کے الزام سے برأت ہے۔

با غیر نشینی وفرستی زپے ما آں را کہ نداند رہ کاشانۂ ماہم

عاشق کی گردن زدنی کا وقت ہے حسرت بھری نگاہوں سے وہ چاروں طرف دیکھ رہا ہے کہ شاید دم قتل ہی وہ فتنہ گر سامنے آجائے لیکن اس فتنہ جو اور بے وفا دشمن کی قوت اختراع اس وقت بھی ظلم وستم کے اختراع سے باز نہیں آتی بلکہ ایسے نازک اور کس مپرسی کے عالم میں اس کا ظلم کچھ اور ترقی کر جاتا ہے۔ وہ اٹھتا ہے اور اٹھ کر آنکھوں پر پٹی باندھ دیتا ہے تاکہ وہ حسرت دیدار اپنے ساتھ لے جائے۔

قاتل من چشم بندد چوں کند بسمل مرا تا بماند حسرت دیدار ہم در دل مرا

انجمن نشاط میں محبوب تشریف فرما ہے ہر شخص سے ناز وانداز کے ساتھ باتیں ہو رہی ہیں۔ لیکن بیچارے عاشق کی طرف کوئی توجہ نہیں۔ ہر بوالہوس کو نقاب برافگندہ کرکے محروم صبر وہوش بنایا جاتا ہے حسن کی تجلیوں سے معمور ہو کر اگر محبوب کی جانب اس کی نظر اُٹھ بھی جاتی ہے تو

اس کو بے ادب کہہ کر ڈانٹ دیا جاتا ہے، بوالہوس اس کی اس تحقیر پہ خوش ہوتے ہیں لیکن وہ منزل عشق کا سرد و گرم چشیدہ اس انداز معصومانہ کی لذت سے مست و بیخود ہو جاتا ہے۔

رُخ جلوہ را نمود و مرا گفت تو مبیں   زیں ذوق مست و بیخبرم کان سخن چہ بود

حقیقت تو یہ ہے کہ کاسۂ گدائی کی شکست سے مجنوں کو جو لطف حاصل ہوا تھا اس سے بوالہوس واقف نہیں۔ نظیری نے اسی مفہوم کو دوسرے انداز سے لکھا ہے۔

قسمت چنیں فتاد کہ ترکان مست بیں   در دور ما بطاق نہادند جام را

مرزا غالب نے اس مفہوم میں بدگمانی کا رنگ پیدا کرکے اس کو بہت ہی بلند کر دیا۔

مجھ تک کب اس کی بزم میں آیا تھا دورِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

اگر اس کے دل میں کبھی خیالات نوازش پیدا بھی ہوتے ہیں تو وہ محبت کے جذبے کے ماتحت نہیں بلکہ انسانیت اور عمومیت کے لحاظ سے۔ ع

نوازشے ز کرم می کند محبّت نیست   (نظیری)

اگر انسانیت یا عمومیت کا لحاظ مد نظر نہیں ہوتا تو خود غرضی کے آثار پوشیدہ ہوتے ہیں۔

آفریں بر دلِ نرم تو کہ از بہر ثواب
کشتۂ غمزۂ خود را بہ نماز آمدہ   (حافظ)

(باقی آئندہ)

تنقید و تبصرہ

حقیقت علمی شاعری | از مولوی نصیر الدین حسین صاحب نصیر بیرسٹر ایٹ لا عظیم آبادی
تقطیع $\frac{20 \times 30}{16}$ حجم ۱۶۰ صفحہ۔ لکھائی، چھپائی کاغذ نہایت نفیس۔ قیمت اور ملنے کا پتہ
درج نہیں۔ غالباً مصنف سے اور معارف پریس اعظم گڈھ سے مل سکتی ہے۔

حضرت نصیر کو قارئین جامعہ شاعر نغز گو کی حیثیت سے جانتے ہیں مگر آپ کی نقادی کے کمال سے ابھی تک واقف نہیں تھے۔ "حقیقت علمی شاعری" میں آپ نقاد شاعر یا شاعر نقاد کی شان سے نظر آتے ہیں۔ یہ ایک مثنوی ہے جس میں شاعری کی تعریف اس کی مختلف اصناف کا بیان حقیقی اور مجازی شاعری کا فرق عبرانی، یونانی، سنسکرت، لاطینی عربی شاعری کی خصوصیات، اردو شاعری کی مختصر تاریخ، جس میں قدیم اور جدید شعرا کے کلام پر دو دو چار چار شعر میں تبصرہ کیا گیا ہے، مشرقی اور مغربی شاعری کا مقابلہ یہ سب چیزیں نہایت صاف اور سلیس اردو نظم میں ادا کی گئی ہیں۔ جو حضرات کتاب کا نام دیکھ کر ڈر گئے ہوں ان کے اطمینان کے لئے یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ علمی شاعری سے مراد عام اعلیٰ شاعری ہے اور یہی مصنف کی تنقید کا موضوع ہے نہ کہ کوئی خاص صنف شعر جس میں خشک علمی مباحث نظم کئے گئے ہوں۔ وجہ تسمیہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ "حقیقت علمی شاعری" سے ۱۳۴۹ھ نکلتا ہے جو کتاب کا سال تصنیف ہے۔

ہمارے خیال میں یہ نام خود مصنف نے جو بڑے خوش مذاق شاعر اور ادیب ہیں تجویز نہیں کیا ہوگا بلکہ کسی خوش عقیدہ بزرگ نے ثواب کی غرض سے رکھا ہوگا۔ کتاب سے پہلے مولانا سید سلیمان ندوی کا مقدمہ ہے جس میں مصنف کے فضل و کمال اور مکارم اخلاق کی مختصر مگر نہایت دلکش تصویر ہے۔ پھر سید محمد اسمٰعیل صاحب رسا ہمدانی ایڈوکیٹ نے

(جن کے نام نامی کے ساتھ نہ معلوم کس مصلحت سے ہر جگہ ٹرپل ایم۔ اے گولڈ میڈلسٹ لکھنا ضروری سمجھا جاتا ہے) مصنف کے حالات لکھے ہیں، ان کے فارسی اور اُردو کلام پر تبصرہ فرمایا ہے۔ آخر میں موقع سے مناسبت پیدا کرنے کے لئے اس مثنوی پر بھی مختصر سا ریویو کر دیا ہے۔

مثنوی اہل ذوق کے پڑھنے کی چیز ہے۔ تنقیدی مسائل کو نظم کرنا اور وہ بھی اس طرح کہ خشکی یا پیچیدگی نہ پیدا ہونے پائے اور کہیں کہیں شاعری کا مزا بھی آجائے۔ کوئی سہل کام نہیں۔ اس کے لئے حضرت نصیر ہی جیسے کہنہ مشق اور قادر الکلام شاعر کی ضرورت تھی۔

آزاد روزانہ | ایڈیٹر عبد الباقی صاحب بی۔ اے جامعہ۔ صدیق طبیب صاحب۔ سمٰعیل چشتی صاحب۔ سید محفوظ جامعی صاحب تقطیع معمولی ضخامت ۱۲ صفحات کاغذ اور کتابت وطباعت اعلےٰ قیمت سالانہ عـــہ روپیہ فی پرچہ ایک آنہ۔ مقام اشاعت لاہور۔

جناب عبد الباقی صاحب بی اے جامعہ اور ان کے رفقائے کار نے روزنامۂ زمیندار سے علیحدگی کے بعد آزاد کے نام سے ایک روزانہ اخبار جاری کیا ہے۔ اس وقت اس کا پہلا نمبر پیش نظر ہے جو بہترین کتابت وطباعت کے ساتھ بارہ[۱۲] صفحات پر شائع ہوا ہے۔ سرورق پر دو علمی ومذہبی مضمون ہیں۔ دوسرے صفحے پر ڈاکٹر ٹیگور۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال اور دوسرے عمائدین قوم کے پیغامات ہیں۔ تیسرے صفحے پر یورپ پر ہندوستان کا ذہنی وروحانی تفوق اور یورپ پر امریکہ کا قرضہ دو اعلےٰ درجے کے علمی مضمون ہیں۔ چوتھے صفحے پر قادیانی تحریک اور اس کے معتقدا پر خامہ فرسائی کی گئی ہے۔ ستارہ موزی کا ایک چھوٹا سا مضمون ہے اور سو روپے کا انعامی معما ہے پانچویں صفحے پر مقالہ افتتاحیہ اور نوٹ ہیں۔ علاوہ اس کے ہندوستان کی ممتاز قومی ووطنی مجالس پر سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے۔ پھر اسلامیان ہند کے دس مقتدر زعماء پر ایک دلچسپ مضمون ہے پھر خبریں ہیں۔ پھر سول نافرمانی کے داخلی اور خارجی نتائج پر مشہور فاضل

بابو بھگوان داس کا ایک اہم مضمون اور اس کے بعد ایک مسلسل افسانہ ہے۔ مضامین اور خبروں کی ترتیب میں ایک خاص سلیقہ اور صفائی نظر آتی ہے۔ پالسی قریب قریب وہی ہے جو زمیندار کی ہماری دلی دعا ہے کہ خدا اس نونہال کو پروان چڑھائے۔

ایلکٹریکل انجینرنگ حصہ اول۔ مصنفہ محمد شجیع اللہ صاحب تقطیع ۲۶×۲۰/۸ ضخامت ۱۶۸ صفحات کتابت وطباعت بہترین۔ کاغذ متوسط۔ قیمت دو روپیہ آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ امن بک ایجنسی بازار سریاں والا لاہور۔

محمد شجیع اللہ صاحب الیکٹرک انجینرنگ پر کتابوں کا ایک سلسلہ تیار کر رہے ہیں زیر نظر کتاب اس سلسلہ کی پہلی کڑی ہے۔ اس میں انھوں نے مکانات، مل اور فیکٹری کے وائرنگ پر تمام معلومات نہایت ترتیب اور سلیقہ سے یک جا کر دی ہیں۔ جگہ جگہ نقشے اور تصویریں بھی دی گئی ہیں جس سے کتاب اور بھی مفید ہو گئی ہے۔ ہمارے خیال میں اب تک اس فن پر جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں یہ ان سب سے بہتر ہے۔

بوہرہ قوم اور وقف ایکٹ۔ مرتبہ ایک منصف مسلمان۔ تقطیع ۳۰×۲۰/۱۶ ۹۸ صفحات۔ کاغذ اور کتابت وطباعت متوسط قیمت تین آنہ ملنے کا پتہ مطبع نادری جبل پور۔

بوہروں کے مذہبی پیشوا حضرت مُلّا طاہر سیف الدین مدظلہ کے پاس لاکھوں کروڑوں روپے کے اوقاف ہیں۔ بعض مسلمان چاہتے ہیں کہ اس کے حساب کتاب کی باقاعدہ نگرانی کی جائے اور ادھر بمبئی کی حکومت نے وقف ایکٹ کے نام سے ایک قانون بھی جاری کیا ہے۔ حضرت مُلّا صاحب اور ان کی قوم اس ایکٹ کے خلاف ہے اور اسے ایمان دہرم کے خلاف اور مداخلت فی الدین سمجھتی ہے اور ان کا مطالبہ ہے کہ یہ اوقاف وقف ایکٹ سے مستثنیٰ کر دئے جائیں۔ یہ رسالہ اسی موضوع پر ہے اور ایک منصف مسلمان صاحب نے بڑے زور وشور سے حضرت مُلّا صاحب کی حمایت کی ہے۔

خواجہ میر درد کے مدفن پر

نہ چین دے سکی جب شورشِ نہاں مجھ کو ۔۔۔ ترے حضور میں لائی کشاں کشاں مجھ کو

میں تیری عظمتِ خاکِ مزار کے صدقے ۔۔۔ زمیں بھی آج نظر آئی آسماں مجھ کو

نگاہِ شوق میں مدفن کی ہے یہ تابانی ۔۔۔ کہ ذرّے ذرّے پہ ہے طور کا گماں مجھ کو

سنائی دیتا ہے ہر نغمۂ لطیفِ حیات ۔۔۔ دکھائی دیتا ہے ہر جلوۂ نہاں مجھ کو

نظر کو جس کی تمنّا تھی ایک مدّت سے ۔۔۔ دکھا دیا مری قسمت نے وہ سماں مجھ کو

مجھے وہ نورِ حقیقت عطا کیا تو نے ۔۔۔ کہ اپنے دل پہ ہے اب طور کا گماں مجھ کو

نہیں ہوا کہیں ایسا کہ دادِ غم ملتی ۔۔۔ یہاں پہنچ کے ملی لذّتِ فغاں مجھ کو

حدودِ دہر، قیودِ جہاں سے ہوں آزاد ۔۔۔ زمیں پہ رہ کے ہوئی سیرِ لامکاں مجھ کو

ریاضِ حسنِ معانی کی نو بہار ہے تو
قرار بخش تمنّائے بے قرار ہے تو

(۲)

ترے نفس میں تھی نکہت ریاضِ جنّت کی ۔۔۔ تری نظر میں تھی تفسیرِ رازِ فطرت کی

کلیمِ طورِ معانی خطاب تھا تیرا ۔۔۔ ترا وجود ہی گویا جواب تھا تیرا

ترا کلام ہے رنگین پیامِ فطرت کا ۔۔۔ ترا بیان ہے جھونکا نسیمِ جنّت کا

تجھی سے کھل گئے سربستہ رازِ ہستی کے ۔۔۔ بتائے ہوش کو تو نے رموزِ مستی کے

جہانِ روح میں اِک قاصدِ سکوں تو تھا ۔۔۔ فرازِ عشق کا اِک خضرِ رہنموں تو تھا

ترے کلام کی اب تک بہار باقی ہے ۔۔۔ تری عروس کا اِک اِک سنگھار باقی ہے

ترا جمالِ سخن لازوال ہے اب تک ۔۔۔ سپہرِ شعر پہ نجمِ کمال ہے اب تک

شراب خانۂ اُردو کا تو وہ ساقی ہے
کہ جس کا آج بھی لبریز جام باقی ہے

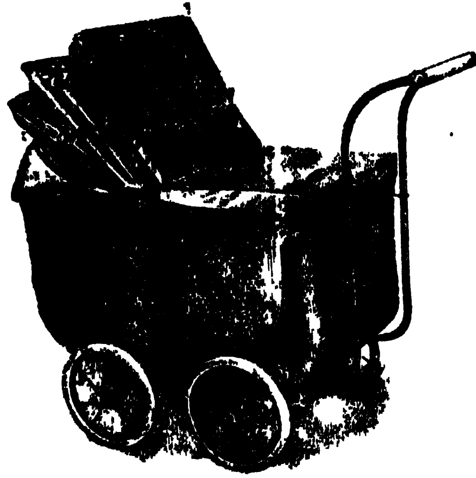
شذرات

جامعہ ملیہ کے ابتدائی مدرسے میں اس سال کنڈر گارٹن کلاس کا افتتاح ہوا ہے جس کی تعلیم اور نگرانی مس فلپسبورن کے سپرد ہے۔ یہ وہ جرمن خاتون ہیں جن کا تعارف ہم قارئین جامعہ سے کرا چکے ہیں۔ کنڈر گارٹن کا طریقہ آزمائش کے طور پر جاری کیا جا رہا ہے۔ سال بھر کے تجربے کے بعد جو نتائج نکلیں گے وہ ہمدردان جامعہ کی خدمت میں پیش کر دئے جائیں گے۔ اس مرتبہ مدرسے کو بڑی مشکل کا سامنا ہے گو الحمدللہ مشکل اس قسم کی ہے جو کامیابی اور ترقی کی وجہ سے واقع ہوتی ہے۔ مدرسے میں داخلے بہت کثرت سے ہو رہے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ چھوٹے بچوں کی تعداد پچھلے سال کے مقابلے میں دگنی ہو جائے گی۔ موجودہ اقامت خانے سب بھر گئے ہیں اور نئی عمارتیں جس وسعت اور مکانیت کی درکار ہیں اب قرول باغ میں نہیں ملتیں۔ اپنی عمارت جلد بنوانے کی ضرورت اب اور بھی شدت سے محسوس ہو رہی ہے۔ اگر اکتوبر تک ہمدردان جامعہ کی تحریک میں خاطر خواہ کامیابی ہو گئی تو غالباً اسی سال عمارت کا سنگ بنیاد رکھ دیا جائے اور اسکی تکمیل کے لئے پوری پوری کوشش شروع کر دی جائے۔

شاید ہم پہلے بھی ان صفحات میں یہ کہہ چکے ہیں کہ جامعہ ملیہ کے تعلیمی نصب العین کو حاصل کرنے میں تدریجی طریقہ اختیار کیا جا رہا ہے یعنی اگرچہ تعلیم مکتب سے لے کر بی اے تک کی ہوتی ہے اور تصنیف و تالیف کا کام بھی جاری ہے لیکن تجویز یہ ہے کہ پوری توجہ اور سعی پہلے ابتدائی تعلیم پر صرف کی جائے پھر ثانوی تعلیم اور اوسط درجے کی صنعتی تعلیم پر، اس کے بعد اعلےٰ تعلیم اور علمی پیشوں کی تعلیم پر اور آخر میں علمی تحقیقات اور اشاعت علوم پر۔ خدا کا شکر ہے کہ ان مدارج میں سے پہلا درجہ یعنی ابتدائی تعلیم کا کام ایک حد تک حسب دلخواہ

ہونے لگا ہے اور امید ہوتی ہے کہ وہ ایک سال میں کارکنان جامعہ کو اس کی طرف سے مطمئن ہو کر آگے قدم بڑھانے کا موقع ملے گا۔ جو مشکلات موجودہ بے حسی کے دور میں قومی کاموں کو پیش آ رہی ہیں ان کا لحاظ کرتے ہوئے اگر جامعہ والے انتہائی سرگرمی اور استقلال سے کام کرتے رہے تب بھی اپنے کام کے کل مدارج پندرہ سولہ برس سے کم میں طے نہیں کر سکتے۔ ہاں اگر یک بیک کچھ ایسے اسباب پیدا ہو جائیں جو قوموں کے دور تغیر میں اکثر پیدا ہو جایا کرتے ہیں اور جنھیں معمولی نظر کے لوگ پہلے سے نہیں دیکھ سکتے تو کیا عجب ہے کہ ملت اسلامی کے اس عارضی جمود کی جگہ وہ ہیجانی حرکت پیدا ہو جائے جسے جذبات پرست کوتاہ اندیش لوگ وقتی شور و غل میں ضائع کر دیتے ہیں لیکن ضبط پسند عاقبت بیں اس سے فائدہ اٹھا کر تھوڑے وقت میں بہت کام کر ڈالتے ہیں۔ اگر ایسی کوئی لہر اٹھی تو ممکن ہے کہ وہ جامعہ ملیہ کی کشتی کو بھی برسوں کی جگہ مہینوں میں پار لگا دے۔ بہر حال جامعہ کے خادم اس کے لئے تیار ہیں کہ اگر کوئی قریب کی راہ نہ بھی ملے تو دور کے دشوار گذار راستے سے ساری کڑیاں جھیلتے ہوئے آج کی جگہ کل منزل مقصود پر پہنچیں۔

یہ پرچہ جولائی کے پرچے کے تھوڑے ہی دن بعد شائع ہو رہا ہے۔ اس لئے "دنیا کی رفتار" کا مضمون اس میں نہیں دیا گیا بلکہ ستمبر کے جامعہ میں دیا جائے گا۔ ستمبر کا رسالہ قریب قریب تیار ہے اور اگر طباعت میں دشواریاں نہ پیش آئیں تو ستمبر کے شروع میں شائع ہو جائے گا۔ ہم کئی بار رسالے کو پوری پابندی سے نکالنے کا اعلان کر چکے ہیں اور ہر بار اپنی انتہائی کوشش کے باوجود کامیاب نہیں ہوئے اس لئے اب ہم اس قسم کا کوئی اعلان نہیں کرتے لیکن کوشش جاری ہے اور اس کا نتیجہ بھی ظاہر ہو جائے گا۔



نمبر ۱۵۹۲

رجسٹرڈ

ستمبر ۱۹۳۳ء



جامعہ

جامعہ ملیہ کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ

نمبر ۳ | بابت ماہ ستمبر ۱۹۳۳ء | جلد ۲۱

مطبع جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

A.H. Faruqi 1927.

جامعہ

بسم اللہ

زیر ادارت

محمد اسلم جیراجپوری — ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے پی ایچ ڈی

جلد ۲۲ — فہرست مضامین رسالہ جامعہ بابتہ ماہ ستمبر ۱۹۳۳ء — نمبر ۳

اخلاقی دیوالے کے آثار

(گذشتہ سے پیوستہ)

(۶)

شادی سے پہلے اور ازدواجی زندگی میں پاکدامنی پر زور دینے اور زبردست دلائل سے یہ ثابت کرنے کے بعد کہ ضبطِ نفس بجائے ناممکن یا مضر ہونے کے سراسر ممکن اور جسم اور نفس کے لئے مفید ہے موسیو بورو ایک پورے باب میں دائمی ترکِ خواہش کے امکان اور قدر و قیمت سے بحث کرتے ہیں۔ اس کا پہلا پیراگراف اس قابل ہے کہ یہاں نقل کیا جائے:-

"ان نجات دہندوں، ان سچی جنسی آزادی کے ہراولوں کی صفِ اول میں جگہ پانے کے مستحق وہ نوجوان مرد اور عورتیں ہیں جنہوں نے زیادہ یکسوئی کے ساتھ کسی بڑے مقصد کی خدمت کرنے کی غرض سے یہ پسند کیا ہے کہ عمر بھر پاکدامن رہیں اور شادی کی مسرتوں سے ہاتھ دھولیں۔ ان کے اس ارادے کے اسباب حالات کے لحاظ سے مختلف ہوتے ہیں۔ کسی نے اپنا فرض سمجھا ہے کہ بیمار ماں یا باپ کی تیمارداری کرے، کوئی یتیم بھائیوں اور بہنوں کے لئے والدین کی جگہ پر ہے، کوئی اپنی زندگی سائنس یا آرٹ یا غریبوں کی خدمت، یا اخلاقی تعلیم یا عبادت کے لئے وقف کرنا چاہتا ہے یا چاہتی ہے۔ اسی طرح اس اختیاری ایثار کے مدارج ہوتے ہیں...... کچھ لوگ معقول تعلیم کی برکت سے جو انہیں برے خیالات سے بچاتی ہے اور عمدہ اخلاقی حفظانِ صحت کے اصول پر عمل کرنے کی بدولت جنسی تحریصات سے قریب قریب آزاد ہوتے ہیں۔ بعض جو نیکی کی راہ میں آگے بڑھے ہوئے ہیں بعض صورتوں میں سخت کشمکش کے بعد جس کی شدت کو وہی خوب جانتے ہیں اپنی بہیمیت کو مغلوب کرنے اور اپنے جسم پر فتح پانے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔ بہرحال ان سب مردوں اور عورتوں نے ایک ہی بات دل میں ٹھان رکھی ہے۔ انھوں نے یہ سمجھ لیا ہے ان کے لئے خدمتِ خلق کی بہترین صورت یہ ہے کہ شادی نہ کریں اور اپنے آپ سے یا اپنے خدا سے عہد کر لیا ہے کہ ساری

عمر پاکدامنی سے بسر کریں گے۔ تاہم ناکہ شادی کا فرض بالکل صاف ہے جس میں شبہ کی گنجائش نہیں۔ پھر بھی بعض صورتوں میں جیسا ہم آگے چل کر دیکھیں گے تجرد کا عزم یقیناً جائز ہے کیونکہ اس کا محرک ایک پاک اور برتر مقصد ہے۔ جب لوگوں نے میکائیل انجیلو کو شادی کرنے کی رائے دی تو اس نے کہا "مصوری بڑی رشک پسند محبوبہ ہے وہ سوکن کی روادار نہیں!"

میں اس شہادت کی تصدیق میں بہت سے یورپی حضرات کے تجربات پیش کر سکتا ہوں جو ہمیشہ ترک خواہش پر عامل رہے اور جن کا ذکر موسیو بورو نے کیا ہے۔ یہ تو بس ہندوستان ہی میں ہوتا ہے کہ بچپن سے شادی کا چرچا ہونے لگے۔ ماں باپ کے دل میں سوائے اس کے کوئی خیال کوئی حوصلہ نہیں ہوتا کہ ایک تو اپنے بچوں کا سہرا دیکھ لیں دوسرے ان کے کھانے پینے کا کچھ بندوبست کر جائیں۔ ان میں سے پہلی چیز کا تو نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے جسم اور نفس میں قبل از وقت گھن لگ جاتا ہے اور دوسری کی بدولت وہ کاہلی میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور اکثر طفیلی بن کر رہ جاتے ہیں۔ ہم لوگ پاکدامنی اور اختیاری افلاس کی مشکلات میں بہت مبالغہ کرتے ہیں، ان باتوں کو بڑا کمال سمجھتے ہیں، انہیں مہاتماؤں اور جوگیوں کے لئے مخصوص قرار دیتے ہیں اور ان لوگوں کو معمولی زندگی کے دائرے سے باہر جانتے ہیں۔ ہمیں یہ بات یاد نہیں رہتی کہ جس زندگی کی معمولی سطح اس قدر پست ہو اس میں سچے مہاتماؤں اور جوگیوں کا ہونا تو کیا اس میں بھی نہیں آسکتا۔ قاعدہ ہے کہ بدی خرگوش کی طرح تیزی سے دوڑتی ہے اور نیکی کچھوے کی طرح بہت استقلال سے مگر آہستہ آہستہ قدم رکھتی ہے۔ چنانچہ مغرب کی عیش پرستی ہمارے یہاں بجلی کی رفتار سے پہنچ گئی ہے، اس نے اپنی گوناگوں دلفریبیوں سے ہماری آنکھوں کو خیرہ کر دیا ہے اور زندگی کی حقیقتوں پر پردہ ڈال دیا ہے۔ مغرب کی جو برکتیں ہر لحظہ تار برقی کے ذریعے ہم پر نازل ہوتی رہتی ہیں اور جو نعمتیں ہر روز دخانی جہازوں کے مال کی صورت میں ہمارے ساحلوں پر اترا کرتی ہیں ان کے سامنے ہمیں پاکدامنی کے نام سے شرم سی آتی ہے اور اختیاری افلاس جرم سا معلوم ہوتا ہے۔ مغرب میں بھی عفت کا خزانہ موجود ہے جو چھوٹا سہی مگر کبھی ختم ہونے والا نہیں اور جن لوگوں کو خدا نے چشم بصیرت دی ہے وہ اس کی پُر فریب سطح کے نیچے تک دیکھ سکتے ہیں۔ یورپ کے صحرا میں جا بجا نخلستان موجود ہیں جن سے پینے والے خالص آب حیات پی سکتے ہیں۔ وہاں سیکڑوں مرد

اور عورتیں بے شیخی بگھارے بے باتیں بنائے پاکدامنی اور اختیاری افلاس برتتے ہیں اور اکثر محض اس سبب سے جو اپنی جگہ بہت کافی ہے کہ کسی اپنے پیارے کی یا ملک کی خدمت میں زندگی بسر کریں۔ ہم اکثر روحانیت کے لمبے چوڑے دعوے کرتے ہیں گویا اسے زندگی کے معمولی کاروبار سے کوئی تعلق نہیں اور یہ محض ان زاہدوں کے لئے مخصوص ہے جو ہمالیہ پہاڑ کے جنگلوں میں روپوش ہیں یا غاروں میں چھپے بیٹھے ہیں۔ وہ روحانیت جو روزمرہ زندگی سے بے تعلق ہے اور اس پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتی محض ایک "پیکر خالی" ہے۔ جن نوجوان مردوں اور عورتوں کے لئے "ینگ انڈیا" ہر ہفتے چھپا کرتا ہے انھیں یہ جان لینا چاہئے کہ اگر وہ اپنے آس پاس کی فضا کو پاک کرنا اور اپنی کمزوری کو دور کرنا چاہتے ہیں تو وہ ہمیشہ پاکدامن رہیں اور یہ بات اتنی مشکل نہیں ہے جتنی وہ سمجھتے آئے ہیں۔

سنئے موسیو بورو اور کیا فرماتے ہیں: "جوں جوں وہ (یعنی جدید عمرانیات) ہمارے آداب معاشرت کی ارتقا پر نظر ڈالتی ہے اور علمی مطالعہ اجتماعی حقیقتوں کا کھوج لگاتا ہے، یہ بات ثابت ہوتی جاتی ہے کہ دائمی پاکدامنی برتنے سے حیات کے انضباط میں جو بہت بڑا کام ہے کس قدر مدد ملتی ہے۔ مانا کہ شادی انسانوں کی بہت بڑی اکثریت کے لئے زندگی کی طبعی حالت ہے مگر سب لوگ تو شادی کر نہیں سکتے اور نہ انھیں کرنا چاہئے۔ اگر ہم ان خاص ہستیوں سے جن کا ذکر ہو چکا ہے قطع نظر بھی کر لیں تو کنواروں کی تین قسمیں ایسی ہیں جو شادی نہ کرنے کی وجہ سے مورد الزام نہیں قرار پا سکتیں، ایک تو وہ نوجوان مرد اور عورتیں جو معاشی یا کاروباری اسباب کی بنا پر شادی کو ملتوی کرنا فرض سمجھیں دوسرے وہ لوگ جنھیں مناسب شریک زندگی نہ ملنے کی وجہ سے مجبوراً کنوارا رہنا پڑتا ہے۔ تیسرے وہ جنھیں بعض عضویاتی نقائص کی وجہ سے جو وراثت سے منتقل ہو سکتے ہیں، شادی سے پرہیز کرنا چاہئے بلکہ بعض اوقات تو اس کا خیال تک دل سے نکال دینا چاہیے۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ ترک نکاح میں جو خود ان کی راحت اور معاشرت کے مقاصد دونوں کے لحاظ سے ضروری ہے ان لوگوں کا رنج اور بھی گھٹ جائے گا اور خوشی اور بھی بڑھ جائے گی جب وہ دیکھیں گے کہ ہمارے علاوہ دوسرے بھی ہیں جنھوں نے باوجود کامل جسمانی اور ذہنی قوت کے اور بعض صورتوں میں باوجود مقدرت کے یہ عزم کر لیا ہے کہ ساری عمر شادی نہ کریں گے۔ ان

اختیاری کنواروں اور کنواریوں کا جنھوں نے اپنی زندگی کو پوری طرح خدا کی بندگی یعنی عبادت اور تہذیب نفس کے لئے وقف کر دیا ہے، یہ دعوے ہے کہ ان کی آنکھوں میں ترک نکاح زندگی کی پست حالت کا نہیں بلکہ بلند حالت کا نام ہے جس میں انسان بخوبی ثابت کر دیتا ہے کہ ارادہ جبلت پر غالب آسکتا ہے۔

مصنف کہتا ہے " دائمی تجرد لڑکوں اور لڑکیوں پر جن کی ابھی شادی کی عمر نہیں ہے یہ ثابت کر دیتا ہے کہ جوانی کا زمانہ پاک دامنی کے ساتھ بسر کرنا ممکن ہے" ان لوگوں کو جن کی شادی ہو چکی ہے یہ فرض یاد دلاتا ہے کہ ازدواجی تعلقات میں پورا پورا ضبط قائم رکھیں اور اپنی ذاتی غرض کو، خواہ وہ بجائے خود جائز ہی کیوں نہ ہو، ہرگز ہرگز اخلاقی عالی ظرفی اور وفاداری کے بلند تر مطالبات پر غالب نہ آنے دیں"

فارسٹر کہتا ہے " تجرد کے عہد سے شادی کی تحقیر متعلق نہیں ہوتی بلکہ یہ تو نکاح کے عہد کا سب سے بڑا پشت پناہ ہے اس لئے کہ اس کی بدولت انسان کا اپنی فطرت کے دباؤ سے آزاد ہونا محسوس شکل میں نظر آجاتا ہے۔ یہ من کی موجوں اور خواہش نفس کے حملوں کے مقابلے میں ضمیر کا کام دیتا ہے۔ تجرد بھی شادی کے لئے ایک زرہ ہے اس معنی میں کہ اس کی وجہ سے بیاہے لوگ اپنے آپ کو ازدواجی تعلقات میں محض پوشیدہ فطری قوتوں کا غلام سمجھنے سے محفوظ رہتے ہیں اور فطرت کے مقابلے میں کھلم کھلا فاعل مختار بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں جن میں اس پر غلبہ پانے کی قوت ہے۔ جو لوگ دائمی تجرد کو غیر فطری سمجھ کر اس کا مضحکہ اڑاتے ہیں وہ نہیں جانتے کہ کیا کر رہے ہیں۔ ان کی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ جس طرز خیال کی رو سے وہ اس طرح کی باتیں کہتے ہیں اس کا لازمی نتیجہ عیاشی اور تعدد ازدواج ہے۔ اگر فطرت کا تقاضا اٹل ہے تو پھر بیاہے لوگوں سے ضبط نفس کی توقع کیوں کر کی جاسکتی ہے؟ پھر وہ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ بہت سی شادیوں میں میاں بیوی میں سے ایک کو دوسرے کی علالت یا کسی اور معذوری کی وجہ سے مہینوں، برسوں بلکہ کبھی کبھی ساری عمر حقیقی تجرد کی زندگی بسر کرنا پڑتی ہے یہی ایک ثبوت کافی ہے کہ سچی وحدت ازدواج کا دارومدار اس پر ہے کہ تجرد کی قدر و قیمت کیا سمجھی جاتی ہے۔

(۷)

دائمی ضبط نفس کے متعلق جو باب ہے اس کے بعد کے ابواب میں نکاح کے فرض اور اس کے

ناقابلِ انفساخ ہونے کی بحث ہے مصنف کہتا ہے کہ سب سے بہتر حالت تو دائمی ضبطِ نفس ہے مگر یہ عام لوگوں کے بس کی بات نہیں۔ ان کے لئے تو نکاح کو فرض سمجھنا چاہئے۔ اس لئے یہ دکھایا ہے کہ اگر نکاح کا اصل مقصد اور اس کی قیود صحیح طور پر سمجھ لی جائیں تو کوئی شخص مانعِ حمل تدابیر کی حمایت کا نام بھی نہ لے۔ موجودہ اخلاقی بے ضبطی کا سبب غلط اخلاقی تربیت ہے۔ ان اہلِ قلم کے خیالات کی تردید کرنے کے بعد جنہوں نے نکاح کا مضحکہ اڑایا ہے مصنف لکھتا ہے:۔

آئندہ نسلوں کی خوش قسمتی سمجھئے کہ یہ خیال محض چھوٹے معلمینِ اخلاق کا اور ان لوگوں کا ہے جو اخلاقی حس سے بلکہ اکثر حقیقی ادبی ذوق سے بھی کورے ہوتے ہیں۔ ہمارے زمانے کے سچے ماہرینِ نفسیات اور ماہرینِ عمرانیات کی ہرگز یہ رائے نہیں۔ اخباروں اور ناولوں اور تھیٹروں کی پرشور دنیا اور اس دوسری دنیا میں جہاں فکر کی تربیت ہوتی ہے اور ہماری نفسیاتی اور عمرانی زندگی کی پراسرار جزئیات کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ جتنا اختلاف اس بارے میں ہے کسی اور چیز میں نہیں۔"

اس کے بعد موسیو بورو ان دلیلوں کی تردید کرتے ہیں جو بے قید محبت کے حق میں پیش کی جاتی ہیں۔ انہیں مِنُو لسٹن کی اس رائے سے اتفاق ہے کہ شادی نام ہے مرد اور عورت کے اتحاد کا، عمر بھر کی رفاقت کا، قانونِ الٰہی اور انسانی قانون کے حقوق کے یکجا ہو جانے کا۔ "شادی محض" دیوانی کا معاہدہ "نہیں ہے بلکہ "ایک مقدس رسم، ایک اخلاقی ذمہ داری ہے۔" اس نے یہ کام کر دکھایا کہ بندر کو دو پیروں پر کھڑا کر دیا (یعنی انسان بنا دیا)۔" یہ سمجھنا بہت بڑی غلطی ہے کہ جن لوگوں کی باضابطہ شادی ہو جائے ان کے لئے سب کچھ جائز ہے۔ یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ اگر میاں بیوی عام طور پر توالد و تناسل کے بارے میں اخلاقی قانون کی پابندی کر سکتے ہیں تو ان کے لئے جائز ہے کہ اس کے علاوہ صحبت کے اور طریقے جو ان کا جی چاہے اختیار کریں۔ اس قدغن سے خود ان کا بھی فائدہ ہے اور معاشرے کا بھی جس کے قیام اور نشو و نما کا دار و مدار شادی پر ہے۔ مصنف کی رائے میں "شادی نے جنسی جبلت کو جن ضابطوں میں جکڑ رکھا ہے ان سے انحراف کے نت نئے موقعے جو نکلتے آتے ہیں سچی محبت کے لئے دائمی خطرے کا باعث ہیں۔ اس خطرے کو دور کرنے کے لئے نگرانی کی ضرورت ہے کہ جنسی خواہش کا پورا ہونا ان حدود کے اندر رہے جو خود شادی کے مقصد

نے مقرر کردی ہیں۔ سینٹ فرانسس آف سیلس کہتے ہیں "قوی اثر دواؤں کا استعمال بہت خطرناک چیز ہے کیونکہ اگر ان کی مقدار زیادہ ہو جائے یا ان کی ترکیب ٹھیک نہ ہو تو بہت نقصان ہوتا ہے۔ شادی کو مذہبی اور متبرک رسم بنانے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ یہ زنا کاری کی دوا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ بڑی اچھی دوا ہے مگر اسی کے ساتھ بے حد قوی اثر ہے اس لئے اگر احتیاط سے استعمال نہ کی جائے تو بہت خطرناک ہے۔"

اس کے بعد مصنف اس نظریے کی مخالفت کرتا ہے کہ فرد کو اپنی مرضی سے نکاح کرنے اور توڑنے کی یا خط نفس کی زندگی بغیر اس کی ذمہ داریوں کے بسر کرنے کی آزادی حاصل ہے۔ وہ وحدت ازدواج پر زور دیتے ہوئے کہتا ہے :۔

"یہ کہنا غلط ہے کہ فرد آزاد ہے چاہے شادی کرے چاہے خود غرضانہ تجرد کی زندگی بسر کرے۔ اب رہے وہ لوگ جن کی شادی ہو گئی ہے وہ اور بھی کم اس بات کا حق رکھتے ہیں کہ آپس کی رضامندی سے اپنا نکاح فسخ کریں۔ ان کی آزادی اس وقت ظاہر ہوئی تھی جب انھوں نے ایک دوسرے کو پسند کیا تھا ہر شخص کا فرض ہے کہ پوری پوری واقفیت کے بعد اچھی طرح غور کر کے اپنے رفیق حیات کا انتخاب کرے جس کے ساتھ مل کر وہ اپنی نئی زندگی کی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھا سکتا ہے لیکن جب ایک بار نکاح ہو گیا اور اس کی تکمیل بھی ہو گئی تو اب اس کے فعل کے ساتھ بے اندازہ نتائج وابستہ ہو جاتے ہیں جو ہر طرف بڑی دور تک پہنچتے ہیں۔ ان کا دائرہ ان دو شخصوں کی ذات سے کہیں آگے بڑھ جاتا ہے جن سے یہ عمل میں آیا تھا۔ ممکن ہے یہ نتائج بے اصول انفرادیت کے زمانے میں جیسا کہ آج کل ہے خود میاں بیوی کو نظر نہ آئیں مگر ان کی اہمیت کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ جیسے ہی گھریلو زندگی کا توازن بگڑا، جیسے ہی یک زنی[1] کے مفید ضابطے کی جگہ خواہش نفس کا قدم آیا، ساری ہیئت اجتماعی کو شدید ضرر پہنچ جاتا ہے۔ جو شخص ان غیر محدود اثرات سے، ان نازک رابطوں سے واقف ہے وہ اس بات کو سن کر نہیں ڈرتا کہ جہاں اور تمام انسانی ادارے عالمگیر قانون ارتقا کے ماتحت ہیں وہاں شادی میں بھی ضروری تغیرات لازم ہیں کیونکہ

---

[1] ایک مرد کا صرف ایک عورت سے شادی کرنا اور اس کے سوا کسی سے جنسی تعلقات نہ رکھنا۔

اسے یقین ہے کہ اس معاملے میں جو کچھ ترقی ہوگی وہ ہر پھر کر نکاح کے رشتے کو اور مضبوط کر دے گی۔ آج کل جبکہ باہمی رضامندی سے طلاق کا مطالبہ ہو رہا ہے نکاح کے ناقابل انفساخ ہونے کی جتنی مخالفت کی جائے گی رفتہ رفتہ اتنی ہی اس قاعدے کی معاشرتی قدر و قیمت روشن ہوتی جائے گی اور یہ دستور جو صدیوں تک محض ایک مذہبی ضابطہ سمجھا جاتا تھا کیونکہ اس کی معاشرتی اہمیت ابھی تک سمجھ میں نہیں آئی تھی، ایک ایسا اصول معلوم ہونے لگے جو فرد کے لئے بھی سودمند ہے اور عام معاشرے کے لئے بھی مفید ہے۔

نکاح کے ناقابل انفساخ ہونے کا قاعدہ کوئی من مانی چیز نہیں جو زیبائش کا کام دیتی ہو بلکہ یہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تار و پود میں شامل ہے۔ لوگ ارتقا کا ذکر بہت کیا کرتے ہیں۔ انھیں یہ بھی تو سوچنا چاہئے کہ نوع انسانی کی یہ غیر معین ترقی جس کی خواہش سبھی کو ہے کیونکر ممکن ہے۔ فارسٹر لکھتا ہے ذمہ داری کے احساس کا گہرا ہونا، فرد کا یہ تربیت حاصل کرنا کہ خود ساختہ ضابطوں کی پابندی اپنی خوشی سے کرے، صبر اور کرم میں اضافہ، خود غرضی کی روک تھام، جذباتی زندگی کو خواہش نفس کی عارضی لہروں اور انتشار کی قوتوں سے محفوظ رکھنا یہ سب انسان کی داخلی زندگی کے وہ عناصر ہیں جن کے متعلق ہم بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ یہ اعلیٰ اجتماعی تہذیب کے لوازم ہیں اور اس وجہ سے ان پر اس ابتری کا کوئی اثر نہیں پڑتا جو معاشی حالات میں یا کوئی غیر معمولی تغیر واقع ہونے سے پیدا ہو جاتی ہے۔ بلکہ سچ پوچھئے تو معاشی ترقی خود عام معاشرتی ترقی سے وابستہ ہے اس لئے کہ معاشی امن اور کامیابی کا دارو مدار اصل میں ہمارے معاشرتی اتحاد عمل کی سچائی اور خلوص پر ہے۔ ہر معاشی تغیر جو ان بنیادی اصولوں کو نظر انداز کرتا ہے خود ہی اپنی تردید کر دیتا ہے اس لئے اگر ہم اخلاقی اور عمرانی پہلو سے جنسی تعلقات کے مختلف طریقوں کی حقیقی قدر و قیمت پر غور کرنا چاہتے ہیں تو سارا فیصلہ اس سوال کے جواب پر منحصر ہے ہماری پوری معاشرتی زندگی کی توسیع اور تقویت کے لئے کون سا طریقہ سب سے مناسب ہے؟ کس میں سب سے زیادہ اس کا امکان ہے کہ عمر کے مختلف مدارج میں ذمہ داری بے نفسی اور ایثار کا زیادہ سے زیادہ احساس پیدا کرے، بے ضبط خود غرضی اور لاابالی پن کو سب سے مؤثر طریقے سے روکے؟ جب معاملے پر اس نقطۂ نظر سے غور کیا جائے تو اس میں ذرا سا بھی شبہ نہیں رہتا کہ یک زنی اپنی معاشرتی اور تعلیمی قدر کی بنا پر لازمی طور سے ہر اعلیٰ تہذیب کا دائمی اصول بن کر رہے گی۔ یہی

ترقی سے مکمل کا رشتہ ڈھیلا نہیں ہوگا بلکہ اور کس جائے گا........ خاندان ہی وہ مرکز ہے جہاں انسان معاشرتی زندگی کے لئے ہر قسم کی طیاری کرتا ہے یعنی ذمہ داری، ہمدردی، ضبط نفس، باہمی رواداری اور باہمی تربیت سیکھتا ہے اور خاندان کو مرکزی حیثیت اسی وجہ سے حاصل ہے کہ اس کے تعلقات عمر بھر قائم رہتے ہیں اور ناقابل انفساخ ہوتے ہیں اور اس استقلال کی بدولت مشترک خاندانی زندگی اس قدر گہری، مستحکم اور انسانوں کے باہمی روابط کے لئے موزوں ہو جاتی ہے کہ کوئی اور زندگی اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی ہم کہہ سکتے ہیں کہ یک زنی کا اصول انسان کی معاشرتی زندگی کا اخلاقی معیار ہے۔"

اس کے بعد وہ آگسٹ کونٹ کا قول نقل کرتے ہیں "ہماری طبیعتوں میں اس قدر تلون ہے کہ ان من کی موجوں کو قابو میں رکھنے کے لئے معاشرے کی مداخلت ضروری ہے ورنہ یہ انسانی زندگی کو اس قدر پست کردیں گی کہ وہ ادنے اور بے معنی تجربات کا ایک سلسلہ بن کر رہ جائے گی۔"

ڈاکٹر ڈیوز لکھتے ہیں "ایک بے سروپا خیال جو اکثر شادی شدہ لوگوں کی مسرت میں خلل ڈالتا ہے یہ ہے کہ عشق کی جبلت ایک ظالم بادشاہ کی طرح ہے جس کی خوشی پوری کرنا ہی پڑتی ہے چاہے جو کچھ بھی انجام ہو........ حالانکہ انسان کی خصوصیت اور اس کی ارتقا کا صریح مقصد ہی یہ ہے کہ وہ اپنی خواہشات کی غلامی سے روز بروز آزاد ہوتا جائے۔ بچے رفتہ رفتہ اپنی روزمرہ کی حاجتوں اور اپنے جذبات کو قابو میں لانا سیکھتے ہیں۔ یہ اصول جو اچھی تربیت میں ہمیشہ مدنظر رہتا ہے کوئی من گھڑت چیز نہیں جو عملی زندگی سے بے تعلق ہو۔ کیونکہ ہماری فطرت کی ارتقا کا عین مقصد یہی ہے کہ وہ ہمارے ان شخصی رجحانات کے تابع ہو جائے جنھیں ارادہ کہتے ہیں۔ جن باتوں کا نام ہم نے "طبیعت" یا "مزاج" رکھ چھوڑا ہے وہ اصل میں بجز ارادے کی کمزوری کے اور کچھ نہیں۔ جو شخص واقعی مضبوط ارادہ رکھتا ہے وہ اپنی قوتوں سے صحیح وقت پر کام لینا جانتا ہے۔"

(۸)

اب ہمیں اس سلسلے کو ختم کرنا ہے۔ کوئی ضرورت نہیں کہ ہم بیورو کی اس تنقید کا بھی ذکر کریں جو انھوں نے مالتھس کے نظریے پر کی تھی، جس نے اپنے ہم عصروں میں افراط آبادی کے مسئلے اور اس اصول کی حمایت

سے عمل ڈال دی تھی کہ اگر نوع انسانی کو ہلاکت سے بچانا ہے تو انضباط ولادت پر عمل کرنا چاہیئے۔ خود مالتھس نے تو اس کا علاج ضبط خواہش تجویز کیا تھا مگر نو مالتھوسی[1] ضبط خواہش کے قائل نہیں بلکہ یہ کہتے ہیں کہ بیسی کثرت جماع کے نتائج سے بچنے کے لئے آلات سے اور کیمیاوی ذرائع سے کام لیا جائے۔ موسیو بورو اس کی دل سے تائید کرتے ہیں کہ انضباط ولادت اخلاقی ذرائع سے یعنی ضبط نفس سے کیا جائے اور آلات اور کیمیاوی ذرائع کے استعمال کی نہایت سختی سے مخالفت کرتے ہیں۔ اس کے بعد وہ مُردوروں کی حالت ان کی شرح ولادت پر نظر ڈالتے ہیں اور خاتمہ کتاب میں یہ دکھاتے ہیں کہ انفرادی آزادی اور انسانی ہمدردی کے نام سے کیسی کیسی اخلاق سوز حرکتیں کی جاتی ہیں۔ وہ رائے عامہ کی رہنمائی اور نگرانی کے لئے منظم کوشش کی رائے دیتے ہیں، ریاست کی مداخلت کی حمایت کرتے ہیں مگر آخر میں سب سے قابل وثوق تدبیر اسے سمجھتے ہیں کہ مذہبی احساس کو زندہ کیا جائے۔ اخلاقی وبائے کو دور کرنے یا روکنے کے لئے معمولی طریقے کافی نہیں ہیں خصوصاً اس صورت میں جب بدکاری نیکی سمجھی جاتی ہو اور پاکدامنی کمزوری، ضعیف الاعتقادی بلکہ بداخلاقی کہلاتی ہو۔ اس لئے کہ مانع حمل تدابیر کے بہت سے حامی واقعی ضبط خواہش کو غیر ضروری بلکہ مضر قرار دیتے ہیں۔ اس صورت میں مذہب کی مدد کے سوا باضابطہ بدکاری کے روکنے کی کوئی موثر تدبیر نہیں ہے۔ یہاں مذہب کا لفظ تنگ اور محدود معنی میں استعمال نہیں ہوا ہے۔ سچا مذہب زندگی میں خواہ وہ انفرادی زندگی ہو یا اجتماعی سب سے زیادہ موثر چیز ہے۔ مذہب کا جذبہ دل میں پیدا ہونا ایک انقلاب ہے، ایک کایا پلٹ ہے، ایک نئی زندگی ہے۔ ایسی موثر قوت محرکہ کے سوا موسیو بورو کے خیال میں کوئی چیز بھی فرانس کو اس اخلاقی ہلاکت سے نہیں بچا سکتی جس کی طرف وہ قدم بڑھا رہا ہے۔

* * *

اب ہمیں مصنف سے اور ان کی کتاب سے رخصت ہو جانا چاہیئے۔ ہندوستان کی وہ حالت نہیں ہے جو فرانس کی ہے۔ ہمارا مسئلہ کسی قدر مختلف ہے۔ مانع حمل تدابیر کا رواج ہندوستان میں عام نہیں ہے۔

---

[1] وہ لوگ جنہوں نے مالتھس کے نظریہ میں ترمیم کر کے اسے دوسری ترتیب دیا ہے۔

تعلیم یافتہ طبقوں میں ان کا استعمال خال خال ہونے لگا ہے۔ میرے خیال میں تو وجوہ ان تدابیر کے استعمال کی بتائی جا سکتی ہیں ان میں سے ایک بھی ہمارے ملک میں موجود نہیں ہے۔ کیا متوسط طبقے کے لوگوں کو اولاد کی کثرت کی شکایت ہے؟ انفرادی مثالیں یہ ثابت کرنے کے لئے کافی نہیں ہیں کہ متوسط طبقوں میں شرح ولادت بہت زیادہ ہے۔ میں نے ہندوستان میں لوگوں کو ان طریقوں کی حمایت صرف بیوہ عورتوں اور کم سن بیویوں کے معاملے میں کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ پہلی صورت میں مقصود ناجائز اولاد سے پیچھا چھڑانا ہے، ناجائز تعلقات سے بچنے کی فکر نہیں۔ اور دوسری صورت میں خوف صرف حمل کا ہے کم سن لڑکی سے جبراً صحبت کرنے میں کوئی ڈر نہیں۔ یا پھر ایک طبقہ مریض، کمزور، زنانے نوجوانوں کا ہے جو چاہتے ہیں کہ اپنی بیویوں سے یا دوسروں کی بیویوں سے صحبت کریں اور جس فعل کو وہ خود گناہ سمجھتے ہیں اس کے نتائج سے محفوظ رہیں۔ ایسے لوگ میرے نزدیک سارے ہندوستان میں، جو انسانوں کا سمندر ہے، بہت شاذ ہوں گے جو صحت اور قوت کی حالت میں صحبت تو کرتے ہیں مگر بچوں کا بوجھ اٹھانا نہیں چاہتے۔ ان لوگوں کو اپنی مثال پیش کر کے اس عمل کی حمایت کرنے کا کوئی حق نہیں، جو اگر ہندوستان میں عام ہو جائے تو یقیناً سارے ملک کے نوجوانوں کو تباہ کر کے رکھ دے گا۔ موجودہ تعلیم نے جس میں حد سے زیادہ تصنع ہے قوم کے نوجوانوں کی جسمانی اور ذہنی قوت کو سلب کر لیا ہے۔ ہم میں سے اکثر لوگ بچپن کی شادی کی اولاد ہیں۔ صحت اور صفائی کے اصولوں سے غفلت کرنے کی وجہ سے ہمارے جسموں میں گھن لگ گیا ہے۔ ہماری غلط اور ناقص غذاؤں نے جن میں نہایت گرم اور تیز مسالے پڑتے ہیں ہمارے ہاضمے کو بے کار کر دیا ہے۔ ہمیں منع حمل کی تدبیروں کی اور ان چیزوں کی جو ہماری بہیمی خواہش کو پورا کرنے میں مدد دیں کوئی ضرورت نہیں۔ ہمیں تو یہ سبق رٹانے کی ضرورت ہے کہ اپنی خواہش کو قابو میں رکھیں یہاں تک کہ بعض صورتوں میں اسے بالکل ترک کر دیں۔ ہمیں قول سے اور مثال کے ذریعے سے یہ سکھانے کی ضرورت ہے کہ اگر ہمیں ذہنی اور جسمانی کمزوری سے نجات پانا ہے تو ترک خواہش نہایت ضروری ہے اور یقیناً ممکن ہے۔ ہم سے پکار پکار کر کہنے کی ضرورت ہے کہ اگر ہم بونوں کی قوم نہیں رہنا چاہتے ہیں تو یہ لازم ہے کہ ہم اس تھوڑی بہت قوت حیات کو جسے ہم روز ضائع کیا کرتے ہیں بچا کر رکھیں۔ ہماری نوجوان رانڈوں سے یہ کہنے کی ضرورت ہے کہ چھپ کر گناہ کرنے کی بجائے کھلم کھلا شادی کا مطالبہ کریں۔

تمہیں اس کا اتنا ہی حق ہے جتنا نوجوان رنڈوؤں کو۔ ہمیں ایسی رائے عامہ پیدا کرنے کی ضرورت ہے کہ بچپن کی شادی کا سدباب ہو جائے۔ ہم لوگوں کی کیفیت سخت اور مسلسل کام سے بددلی، محنت اور جفاکشی سے جسمانی معذوری، سن چلے پن کے کاموں کا زور شور سے شروع ہو کر بیٹھ جانا، جدت کی کمی، غرض جو چیزیں ہم روز مرہ دیکھا کرتے ہیں ان کا سبب زیادہ تر جماع کی کثرت ہوتی ہے۔ مجھے امید ہے کہ نوجوان اپنے دل کو اس خیال سے دھوکا نہیں دیتے ہوں گے کہ اگر اولاد نہ ہو تو صحبت میں کوئی حرج نہیں۔ اس سے کمزوری پیدا نہیں ہوتی۔ واقعہ یہ ہے کہ جماع کا فعل اگر اس خلاف فطرت تحفظ کے ساتھ کیا جائے جو حمل سے بچنے کے لئے ہوتا ہے کہیں زیادہ ضعف پیدا کرتا ہے بہ نسبت اس کے کہ یہ پورے احساس ذمہ داری کے ساتھ عمل میں آئے۔

"انسان کا ذہن بجائے خود ایک عالم ہے، اور آپ ہی آپ دوزخ کو جنت اور جنت کو دوزخ بنا دیتا ہے۔"

اگر ہم یہ سمجھنے لگیں کہ ہمارے لئے خواہش نفس کا بندہ بننا ضروری ہے اور اس میں کوئی ضرر یا گناہ نہیں ہے تو ہم اس کی باگ ڈھیلی چھوڑ دیں گے اور پھر واقعی یہ ہمارے روکے نہ رکے گی۔ لیکن اگر ہم تربیت کے ذریعے اپنے دل میں یہ خیال پیدا کر لیں کہ اس خواہش کی پابندی ہرگز ضروری نہیں بلکہ یہ باعث ضرر ہے، گناہ ہے اور ہم اسے قابو میں رکھ سکتے ہیں تو ہم پر یہ حقیقت کھل جائے گی کہ ضبط نفس بالکل ممکن ہے۔ ہمیں عیاشی کی اس تیز شراب سے جو مغرب سے نئی حقیقت اور نام نہاد انسانی آزادی کے بھیس میں آتی ہے خبردار رہنا چاہیے، بلکہ اگر ہم اتنی ترقی کر گئے ہیں کہ اپنے بزرگوں کی قدیم حکمت سے بے نیاز ہیں تو ہمیں مغرب ہی کی اس ہوش افزا آواز پر کان دھرنا چاہیے جو اس کے دانشمندوں کے تجربات کے ذریعے سے کبھی ہم تک پہنچ جاتی ہے۔
چارلی اینڈریوز نے مجھے ایک پر از معلومات مضمون[1] "تولید اور تجدید" پر بھیجا ہے جو ولیم لافٹس ہیر کا لکھا ہوا ہے اور مارچ ۱۹۲۶ء کے رسالہ "اوپن کورٹ" میں شائع ہوا ہے۔ یہ ایک نہایت مدلل علمی مقالہ ہے۔ اس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ تمام اجسام دو وظائف کو ادا کرتے ہیں یعنی ایک تو اندرونی تولید جسم کی تعمیر

۱؎ یہ مضمون کتاب کے آخر میں ضمیمے کے طور پر درج کیا جائے گا۔

کے لئے دوسرے بیرونی تولید بقائے نسل کی غرض سے۔ ان عملوں کو وہ "تولید" اور "تجدید" کہتے ہیں۔ تجدید کا عمل یعنی اندرونی تولید فرد کے لئے بنیادی اہمیت رکھتا ہے اس لئے یہ ضروری اور اولٰے ہے، بیرونی تولید یا تناسل خلیوں کی افزونی سے ہوتا ہے اس لئے یہ ثانوی چیز ہے .... اس لئے اس درجے میں قانون حیات یہ ہے کہ بعضہٖ وان کے خلیوں کو پہلے تو تجدید کے لئے اور پھر تولید کے لئے غذا پہنچائی جائے۔ غذا کی کمی کی صورت میں تجدید کو مقدم سمجھنا چاہیئے اور تولید کو روک دینا چاہیئے۔ اس سے یہ پتہ چل سکتا ہے کہ تولید کو روکنے کی ابتدا کیوں کر ہوئی اور اس کے بعد اس نے نوع انسانی میں ترک خواہش اور عام رہبانیت کی شکل کس طرح اختیار کی۔ اندرونی تولید یعنی تجدید کا روکنا ناممکن ہے بجز اس کے کہ انسان مرنے پر کمر باندھ لے۔ اس طرح گویا یہ بھی معلوم ہو گیا کہ موت کی طبعی اصل کیا ہے۔ تجدید کے حیاتیاتی عمل کو بیان کرنے کے بعد مصنف کہتا ہے " مہذب انسانوں میں جماع اس سے کہیں زیادہ ہوتا ہے جتنا آیندہ نسل کے پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے اور وہ اندرونی تولید پر مقدم رکھا جاتا ہے جس کا انجام بیماری، موت بلکہ اس سے بھی بدتر ہے"۔ کسی شخص کو، جو ہندو فلسفے میں ذرا سا بھی دخل رکھتا ہے، مسٹر ہیر کے مقالے کا یہ پیراگراف سمجھنے میں ذرا بھی دقت نہیں ہوگی:-

> "تولید کا عمل محض مکانیکی طریقے سے واقع نہیں ہوتا اور نہ ہو سکتا ہے بلکہ خلیوں کی تقسیم در تقسیم کی طرح یہ ایک حیاتی عمل ہے یعنی اس میں ادراک اور ارادہ پایا جاتا ہے۔ یہ بات کہ ذی حیات چیزوں کی تفریق ان کا ایک دوسرے سے ممیز ہونا اور جداگانہ وجود اختیار کرنا محض مکانیکی[1] ہے کسی طرح عقل میں نہیں آتی۔ تاہم اس طرح کے بنیادی عمل ہمارے موجودہ شعور سے اس قدر بُعد رکھتے ہیں کہ بہ ظاہر جانور یا انسان کے ارادے کا ان میں کوئی دخل نظر نہیں آتا۔ لیکن ایک ذرا سے غور سے یہ ظاہر ہو جائے گا کہ جس طرح موجودہ ارتقا یافتہ انسانوں کا ارادہ ان خارجی حرکات اور

---

[1] Mechanical محض مادے اور حرکت کے قانون کے ماتحت۔

افعال کو ادراک کی رہنمائی میں وقوع میں لاتا ہے اسی طرح جسم کی تدریجی ارتقا کی ابتدائی منزلوں میں، ماحول کی حدود کے اندر، اس کو حرکت میں لانے کے لئے ضرور ایک قسم کا ارادہ اور ادراک موجود ہوگا۔ اس چیز کو آج کل نفسیات کے ماہر لاشعور[1] کہتے ہیں۔ یہ ہمارے نفس کا ایک حصہ ہے جو ہمارے روزمرہ خیالات سے بے تعلق ہے لیکن اپنے وظائف کے ادا کرنے میں بہت ہوشیار اور چوکس ہے یہاں تک کہ شعور کو تو نیند بھی آجاتی ہے مگر اسے کبھی نہیں آتی۔"

کون شخص اس کا اندازہ کر سکتا ہے کہ اگر جماع کا فعل بغیر کسی اور مقصد کے کیا جائے تو اس سے ہمارے نفس کے لاشعوری حصے کو جس کا عمل زیادہ مستقل ہے کسی قدر ناقابل تلافی ضرر پہنچ جائے گا۔ تولید کی سزا موت ہے۔ جماع کا عمل نر کے لئے قطعاً تفرقی[2] عمل ہے (یعنی اس سے موت کی تمہید شروع ہو جاتی ہے)، اور وضع حمل کی شکل میں مادہ کے لئے بھی۔ اس سے مصنف یہ استدلال کرتا ہے:-

"مردی، قوت حیات اور بیماریوں سے محفوظ رہنا، یہ ان لوگوں کا حصہ ہے جو خواہش نفس کو بالکل ترک یا قریب قریب ترک کر دیتے ہیں۔ تولید یا صرف لذت نفس کے لئے جنین کے خلیوں کو تجدید کے عمل سے ہٹانے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہمارے اعضا تازہ مایہ حیات کی رسد سے محروم ہو جاتے ہیں جس کا مضر اثر ان پر آہستہ آہستہ پڑتا رہتا ہے اور ایک روز ظاہر ہو کر رہتا ہے۔ ان عضویاتی واقعات سے ایک شخصی اخلاق جنسی کی بنیاد پڑتی ہے جو کامل ضبط نہیں تو اعتدال کا ضرور تقاضا کرتا ہے اور بہر حال اس سے ضبط کی اصلیت سمجھ میں آجاتی ہے۔"

مصنف، جیسا کہ آسانی سے قیاس کیا جا سکتا ہے، کیمیاوی طریقوں اور آلات کی مدد سے انضباط ولادت کا مخالف ہے بہ قول اس کے:-

---

[1] The Unconcious

[2] Katabolism اس عمل کی ایک شکل جس میں جسم حیوانی کے اندر مخزنہ مایہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔

"اس کی بدولت ضبط نفس کے محرکات جو دور اندیشی پر مبنی ہیں باقی نہیں رہتے اور اس کا موقع ملتا ہے کہ شادی کے بعد خواہش نفس کی پیروی کی کوئی اور حد نہ رہے سوائے اس کے کہ ضعیفی میں یہ خواہش خود بخود کم ہو جائے۔ اس کے علاوہ ظاہر ہے کہ غیر نکاحی تعلقات پر بھی اس کا اثر پڑتا ہے۔ اس سے ناجائز، بے تعید، بے ثمر صحبت کا دروازہ کھل جاتا ہے جو جدید صنعت و حرفت، عمرانیات اور سیاسیات کے نقطہ نظر سے نہایت خطرناک ہے۔ یہاں ان چیزوں کی تفصیل کرنے کا موقع نہیں ہے۔ اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ منع حمل کے ذریعے نکاحی اور غیر نکاحی تعلقات میں جماع کی کثرت میں سہولت پیدا ہو جاتی اور اگر میرا مندرجہ بالا عضویاتی استدلال صحیح ہے تو یہ فرد اور جماعت دونوں کے لئے برا ہوگا۔"

ہندوستان کے نوجوانوں کو یہ مقولہ جس پر موسیو بورو نے اپنی کتاب ختم کی ہے دل پر نقش کر لینا چاہیئے۔

"مستقبل ان قوموں کے ہاتھ ہے جو پاکدامن ہیں۔"

انسان کی پیدائش کا مقصد

کلام مجید میں انسان کی پیدائش کا مقصد "۵۱ : ۵۶" میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے "ما خلقت الجن والانس الا لیعبدون" یعنی نہیں پیدا کیا جن اور انسان کو مگر اپنی عبادت کے لئے۔ علمائے ظاہر عبدیت کے معنی محض رسمی طور پر نماز ادا کرنا اور ماہ رمضان کے روزے رکھنا یا ایک گوشے میں بیٹھ کر تسبیح پڑھنا وغیرہ لیتے ہیں اور جس شخص نے پانچ وقت روزانہ جماعت کے ساتھ رسمی نمازیں ادا کرلیں اور رمضان میں روزے رکھ لئے اور باقی اوقات تسبیح پڑھنے میں بسر کر دئے اس نے گویا اپنا فرض عبدیت کما حقہٗ ادا کر دیا۔ اب اس کو اپنا اور کوئی انسانی فرض ادا کرنے کی ضرورت نہیں لیکن "یعبدون" یعنی فرائض عبدیت ادا کرنے کے یہ معنی صحیح نہیں ہیں کیونکہ اگر انسانی زندگی کا مقصد محض رسمی نماز روزہ ہوتا تو کلام مجید میں انسانی زندگی کی رہنمائی کے واسطے روزہ اور نماز کے احکام کے علاوہ دیگر احکام ہی نہ ہوتے۔ مگر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ کلام مجید میں نماز و روزہ کے احکام کے ساتھ دیگر احکام بھی موجود ہیں جو احکام نماز کے مقابلے میں زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں جیسے نکاح و طلاق، تقسیم ترکہ، عہد و مواثیق، تعلقات باہمی، قوانین جنگ، اکل و شرب اور سزائے جرائم وغیرہ۔ کلام مجید میں مختلف شعبہائے زندگی کے متعلق تفصیلی احکام کا موجود ہونا اور نماز کے متعلق پوری تفصیل کا نہ ہونا اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ انسان کے فرائض منصبی نماز کے تفصیلی ارکان سے کم اہمیت نہیں رکھتے۔ اس سے ہمارا ہرگز یہ مقصد نہیں ہے کہ نماز روزہ اور تلاوت وغیرہ غیر ضروری چیزیں ہیں لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ عبادت انسان کو نیک زندگی بسر کرنے کی طرف راغب کرنے کے ذرائع ہیں نہ کہ اس کی زندگی کا مقصد۔ چنانچہ کلام مجید میں اس کو اس طرح واضح کیا گیا ہے "۲۹ : ۴۵۔ اتل ما اوحی الیک من الکتب واقم الصلوٰة ان الصلوٰة تنہیٰ عن الفحشاء والمنکر ولذکر اللہ اکبر" [illegible] سے جو کچھ تم پر ظاہر کیا گیا ہے اس کو پڑھو اور نماز کو قائم رکھو تحقیق نماز فحش اور بدی سے بچاتی ہے اور تحقیق [illegible] کا ذکر کرنا بہت بڑی چیز ہے۔" اور اسی طرح روزے کے احکام میں فرمایا "

کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم لعلکم تتقون ایام معدودات ط" ترجمہ "اے ایمان والو روزہ تمہارے لئے فرض کیا جیسا کہ تم سے قبل لوگوں پر فرض کیا گیا تھا تاکہ تم برائیوں سے بچو کچھ مقررہ دنوں کے واسطے۔" ان دونوں آیتوں میں نماز اور روزے کا مقصد بتلا دیا گیا ہے کہ یہ تم کو فحش، بدی اور برائیوں سے بچانے کے ذریعے ہیں۔ لہذا معلوم ہوا کہ انسانی زندگی کا مقصد فحش، بدی اور برائیوں سے بچا ہے یعنی نیکی کی زندگی بسر کرنا ہے اور نماز روزہ اس مقصد کے حاصل کرنے کے دو ذریعے ہیں۔ نماز اور روزے کے متعلق ہم تفصیلی بحث علیحدہ علیحدہ نماز اور روزے کے عنوان سے کریں گے اس لئے ہم اس مقام پر "یعبدون" کے معنی کو دیگر عقلی اور نقلی دلائل کے ذریعے سے روشنی میں لانے کی کوشش کریں گے۔

کائنات میں جتنی چیزیں پیدا کی گئی ہیں خدا نے ان کی پیدائش کا ایک مقصد مقرر کیا ہے اور اس مقصد کے حصول کے لئے قوانین فطرت بنائے ہیں اور ہر ایک چیز ان قوانین فطرت کے مطابق اپنے مقصد آفرینش کی تکمیل کی طرف کوشاں ہے مثلاً چاند، سورج، ستارے، درخت، پانی، ہوا وغیرہ ہر ایک اپنے مفوضہ کام میں مصروف ہے۔ چاند، سورج اور ستارے چونکہ ہم سے اتنی دور ہیں کہ ہم کو ان کی اندرونی حالت کا ابھی پورا علم حاصل نہیں ہوا ہے لیکن درخت، پانی، ہوا وغیرہ ہم سے قریب تر ہیں اس لئے ہمیں ان کے متعلق کم از کم اتنا ضرور معلوم ہو گیا ہے کہ وہ کس قانون کی پابندی کرتے ہیں مثلاً پانی کے واسطے یہ قانون ہے کہ وہ گرمی سے بھاپ کی شکل میں تبدیل ہو کر اوپر کی طرف اڑتا ہے اور وہاں ٹھنڈا پا کر مختلف صورتوں میں منجمد ہو کر پھر زمین ہی پر گر پڑتا ہے۔ اسی طرح درختوں کے متعلق یہ قانون فطرت مقرر ہے کہ وہ زمین، ہوا اور پانی سے اپنی خوراک حاصل کریں اور سورج کی گرمی سے بڑھیں اور پھولیں پھلیں اور یہ دونوں چیزیں یعنی پانی اور درخت بالآخر حیوانی زندگی کے واسطے مفید ثابت ہوں لہذا درخت اور پانی کے واسطے خدا کی عبادت یہی ہے کہ وہ ان قوانین فطرت کی جو ان کے واسطے مقرر کر دئے گئے ہیں ہمیشہ پابندی کرتے ہیں چنانچہ کلام مجید میں ان چیزوں کی قوانین فطرت کی پابندی کو سجدہ اور تسبیح وغیرہ کے الفاظ سے ظاہر کیا گیا ہے جیسا کہ (۵۵: ۶) میں فرمایا "والنجم والشجر یسجدان" ترجمہ۔ ستارے اور درخت سجدہ کرتے ہیں اور (۱۶: ۴۹) میں فرمایا "وللہ یسجد ما فی السموات وما فی الارض من دابہ" یعنی جو کچھ آسمان و زمین

میں چلنے والی شے ہے خدا کو سجدہ کر رہی ہے اور سورہ یٰسین میں فرمایا "کل فی فلک یسبحون" یعنی آسمان کی تمام چیزیں تسبیح پڑھ رہی ہیں۔

ان آیات میں ستاروں اور درختوں اور آسمان و زمین کے درمیان جتنی چیزیں ہیں ان سب کے لئے خدا نے سجدہ اور تسبیح کے الفاظ استعمال کئے ہیں اور ظاہر ہے کہ ان چیزوں کا سجدہ یا تسبیح سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ وہ اپنے اجزائے ترکیبی کے امتزاج و اختلاط کے اثرات و مظاہرات کو قوانین فطرت کے تحت مکمل طور پر ظاہر کر رہے ہیں اسی طرح انسان کے لئے بھی اپنے اجزائے ترکیبی کے امتزاج و اختلاط کے اثرات و مظاہرات کو قوانین فطرت کے ماتحت مکمل طور پر ظاہر کرنا اس کی طبیعت کا مقتضا ہے لیکن اتنا فرق ضرور ہے کہ دیگر اشیا میں چونکہ تعقل اور قوت ارادی نہیں ہے اس لئے وہ اپنے اجزائے ترکیبی کے تاثرات کو موقع اور محل کے اعتبار سے ظاہر کرنے پر قادر نہیں ہیں یعنی ان کے واسطے یہ ناممکن ہے کہ کبھی وہ ان تاثرات کو ظاہر کریں اور کبھی نہ ظاہر کریں۔ وہ موقع اور بے موقع ان کے ظاہر کرنے پر قطعی مجبور ہیں اور اس لئے ان کا ان اثرات کو موقع اور بے موقع ہر وقت اور ہر جگہ ظاہر کرنا سجدہ یا تسبیح یا عبودیت ہے مگر چونکہ انسان کو تعقل اور قوت ارادی بھی عطا ہوئی ہے اس لئے اس کے واسطے اپنے اجزائے ترکیبی کے تاثرات کو عقل کی رہنمائی کے ماتحت ظاہر کرنا اس کے لئے سجدہ یا تسبیح یا عبادت ہے۔ مثلاً اگر آگ میں ایک روی کا غذ یا ایک ہزار روپیہ کا نوٹ یا ایک زندہ انسان ڈال دئے جائیں تو وہ تینوں کو جلا دے گی وہ ایک ہزار روپیہ کے نوٹ کی قیمت یا انسانی جان کی کوئی پروا نہیں کرے گی کیونکہ اس میں تعقل اور قوت ارادی نہیں ہے اور اس کا یہ فعل خدا کی فرمانبرداری یا عبادت میں شامل ہے۔ اسی طرح انسان کے اجزائے ترکیبی کا یہ اثر ہے کہ اس کو بھوک اور پیاس لگتی ہے اس کو اپنے بھائی کو مصیبت میں مبتلا دیکھ کر ہمدردی پیدا ہوتی ہے، اس کو اپنی بہادری اور فیاضی کے دکھانے کی خواہش ہوتی ہے لیکن اگر وہ اپنی بھوک اور پیاس بجھانے کے لئے دوسروں کی چیزیں زبردستی استعمال کرے، یا اپنی ہمدردی، فیاضی اور بہادری کی خواہشات پوری کرنے کے لئے کسی واجب القتل قیدی کو جیل خانے کی دیوار توڑ کر چھڑا لائے اور اس کو اپنی حفاظت میں رکھے تو اس کا یہ فعل عبادت میں شمار نہیں کیا جاسکتا البتہ اگر وہ جائز طریقوں سے اپنی قوت بازو کے ذریعے سے اپنی روزی تلاش کرتا ہے یا کسی کمزور۔ اور

بے گناہ انسان کو کسی ظالم کے ظلم سے بچاتا ہے تو اس کے یہ تمام فعل عبادت میں شمار کئے جائیں گے کیونکہ اس کے اول الذکر افعال عقل کی رہنمائی کے ماتحت سرزد نہیں ہوئے اور آخر الذکر عقل کی رہنمائی کے ماتحت سرزد ہوئے۔

بہرحال جب بے جان چیزوں کے اجزائے ترکیبی کے امتزاج کے تاثرات خدا کے نزدیک سجدہ یا تسبیح یا بالفاظ دیگر عبادت خیال کئے جاتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ جاندار مخلوق اور خاص کر انسان کے وہ افعال جو اس کے اجزائے ترکیبی کے امتزاج کے تاثرات سے عقل سلیم کی رہنمائی کے ماتحت ظہور پذیر ہوں خدا کے نزدیک سجدہ یا تسبیح یا عبادت خیال نہ کئے جائیں۔ دیگر جاندار مخلوق اور انسان کے اجزائے ترکیبی میں سوائے عقل کے اور کوئی فرق نہیں تو لازمی طور پر ان دونوں مخلوق کی عبادت میں بھی سوائے اس کے اور کوئی فرق نہیں ہو سکتا کہ اول الذکر کا اپنے طبعی رجحانات اور فطری خواہشات کو غیر عقلی اور غیر فکری طریق پر بے تکلف پورا کرنا عبادت ہے اور آخر الذکر کا ان کو عقل و شعور کی رہنمائی کے ماتحت پورا کرنا عبادت ہو۔ عقل انسانی اسی بات کو تسلیم کر سکتی ہے اور یہی کلام مجید کی مذکورہ بالا آیتوں سے بھی ثابت ہوتا ہے ورنہ تاروں اور درختوں اور جو کچھ زمین و آسمان کے درمیان ہے ان کے واسطے سجدہ اور تسبیح کرنے کے متعلق جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ بالکل بے معنی ہو جاتا ہے۔ اس لئے ہم کو لازمی طور پر یہی ماننا پڑے گا کہ جس طرح سے سجدہ اور تسبیح کے الفاظ دیگر بے جان اور جاندار مخلوق کے فطری اور طبعی افعال کے واسطے بطور استعارے کے استعمال ہوئے ہیں اسی طرح سے انسان کے ان فطری اور طبعی افعال کے واسطے جو اس سے عقل سلیم کی رہنمائی کے ماتحت سرزد ہوتے ہیں یہی الفاظ یا اسی قسم کے دوسرے الفاظ مثلاً صالح، محسن اور متقی وغیرہ استعمال ہوئے ہیں اور ان تمام الفاظ کا یہی مطلب ہے کہ انسان اپنے اجزائے ترکیبی کے امتزاج کے تاثرات کو عقل کی رہنمائی کے ماتحت ظاہر کرے اور چونکہ تمام قدرتی عناصر اور اشیا وغیرہ فطری طور پر اپنی حالت کو بے نقص اور مکمل رکھنے کی کوشش کرتی ہیں تاکہ ایک دوسرے کے ساتھ اثر آفرینی اور اثر پذیری کا عمل صحیح طور پر جاری رکھ سکیں مثلاً ہوا اسی وقت مکمل ہوتی ہے جب اس کے تمام اجزائے ترکیبی جیسے آکسیجن، نائٹروجن، کاربونک ایسڈ گیس اور مائی بخارات وغیرہ ایک خاص نسبت کے ساتھ اس میں موجود ہوں۔ اسی وقت وہ صاف ہوا کہلاتی ہے اور اسی وقت حیات انسانی کے واسطے بہترین تصور کی جاتی ہے۔ چنانچہ ہوا خواہ کتنی ہی غلیظ کر دی جائے وہ ہمیشہ

صاف ہونے کی کوشش کرے گی اور خلا میں پھیل کر صاف ہو جائے گی یہی کیفیت پانی کی ہے کہ وہ اپنے آپ کو صاف کرنے کے لئے گھروں کی نالیوں میں سے نکل کر نالوں کی راہ بہتا ہوا دریا میں شامل ہو کر صاف ہو جائے گا اور پھر تبخیر و انجماد کے ذریعے سے اپنی مکمل حالت میں زمین پر آئے گا۔ اسی طرح انسان کا بھی یہی فرض منصبی یا حق عبودیت ہے کہ وہ اپنی حالت کو مکمل بنانے کی کوشش کرے تاکہ اپنے قرب و جوار کی ذی حیات اور غیر ذی حیات مخلوق کے ساتھ اثر آفرینی اور اثر پذیری کا عمل صحیح طور پر جاری رکھ سکے چونکہ دیگر عناصر اور اشیاء وغیرہ کے اجزائے ترکیبی محض مادی یا جسمانی ہیں لہذا ان کا ہر ایک فعل بغیر ارادے اور بغیر شعور کے ہوتا ہے اور اس لئے نفع کے ساتھ ساتھ نقصان پہنچاتا ہے لیکن برخلاف اس کے انسان کے اجزائے ترکیبی میں علاوہ مادی یا جسمانی اجزا کے دماغی اور اخلاقی اجزا بھی شامل ہیں اس لئے جب تک انسان اپنے مادی یا جسمانی اجزا کے ساتھ دماغی اور اخلاقی اجزا کو بھی خاص مناسبت کے ساتھ مکمل بنانے کی کوشش نہ کرے گا اس وقت تک وہ مکمل انسان نہیں ہو سکتا کیونکہ جیسا کہ اوپر ثابت کیا گیا ہر ایک چیز اسی وقت مکمل ہوتی ہے جبکہ اس کے تمام اجزائے ترکیبی ایک خاص مناسبت کے ساتھ اس کے اندر موجود ہوں اور جب انسان اپنے تمام اجزائے ترکیبی کو مکمل بنائے گا تو یہ لازمی بات ہے کہ وہ اپنی ذمہ داری کو محسوس کرے گا اور اس کا ہر فعل انسانی جماعت کے فائدے کے واسطے نہ ہو گا لہذا انسان کو اپنی جسمانی، دماغی اور اخلاقی تینوں قسم کی قوتوں میں کمال حاصل کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ وہ جماعت انسانی کا بہترین رکن اسی وقت بن سکتا ہے جبکہ اس کی تینوں قسم کی قوتیں مناسب کمال حاصل کرلیں تاکہ ایک قوت دوسری قوت سے رہنمائی حاصل کر سکے اور ایک دوسرے کی رہنمائی کے ذریعے سے ان سے وہی اعمال سرزد ہوں جو جماعت انسانی کے زیادہ سے زیادہ افراد کو زیادہ سے زیادہ فائدے پہنچا سکیں۔

اگر کسی جماعت انسانی یا ایک ملک کے باشندوں کے اکثر افراد کا اس کلیہ پر عمل ہے یعنی ان کی جسمانی، دماغی اور اخلاقی حالتیں مناسب طور پر ترقی یافتہ ہیں اور وہ اپنی جماعت کے زیادہ سے زیادہ آدمیوں کو زیادہ سے زیادہ فائدے پہنچانے کی کوشش کرنا ہی اپنا مقصد آفرینش یا خدا کی فرمانبرداری سمجھتے ہیں تو قانون فطرت یا منشاء الٰہی کے مطابق وہی جماعت انسانی یا قوم عزت اور حکومت کے ساتھ دنیا

میں قائم رہے گی اور جس قوم کے اکثر افراد کا عمل اس کے خلاف ہے وہ قوم یا تو اول الذکر قوم کی غلامی کرے گی یا فنا ہو جائے گی۔ یوروپین اقوام کے اکثر افراد کا اس کلیہ پر عمل ہے اور ان کی جسمانی، دماغی اور اخلاقی حالتیں مناسب طور پر ترقی یافتہ ہیں اور وہ بنی نوع انسان کے فائدے کے واسطے رات دن نئی نئی قسم کی ایجادوں، تجربوں اور تحقیقاتوں میں اپنی جانیں قربان کرنا مقصد آفرینش اور خدا کی عبادت تصور کرتے ہیں تو قانون فطرت یا منشاء الٰہی کے مطابق وہی قومیں آج عزت کی زندگی بسر کر رہی ہیں، دنیا پر حکومت کر رہی ہیں اور گویا وہی مسلمان ہیں نہ کہ وہ قومیں جو خود کو مسلمان کہتی ہیں، ذلت کی زندگی بسر کر رہی ہیں اور دوسری اقوام کی غلامی کر رہی ہیں چنانچہ کلام مجید میں یہ بات نہایت واضح طور پر بیان کر دی گئی ہے "سورۂ بقر ۲۔ ان الذین امنوا والذین ھادوا والنصریٰ والصابئین من امن باللہ والیوم الاخر وعمل صالحاً فلھم اجرھم عند ربھم ولاخوف علیھم ولاھم یحزنون" ترجمہ کوئی انسانی جماعت خواہ وہ یہود ہو یا نصاریٰ ہو یا صابی ہو اگر اس کا خدا اور روز جزا پر ایمان ہے اور اس کے اعمال صالح ہیں تو اس کو اس کے رب کی طرف سے بڑے بڑے اجر دیے جائیں گے اور اس کے واسطے نہ کوئی خوف ہے اور نہ رنج ہے"۔ اس آیہ کریمہ سے ظاہر ہو گیا کہ اجر صرف عمل صالح کا ملتا ہے اور عمل صالح کی تعریف سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ انسان اپنی جسمانی، دماغی اور اخلاقی قوتوں کو معیار زمانہ کے مطابق مکمل بنا دے اور اپنے قرب وجوار کی ذی حیات اور غیر ذی حیات مخلوق کے ساتھ اثر آفرینی اور اثر پذیری کا عمل صحیح طور پر جاری رکھے یا بالفاظ دیگر زیادہ سے زیادہ مخلوق کو زیادہ سے زیادہ فائدے پہنچائے۔ بعض لوگ اس جگہ یہ اعتراض کر سکتے ہیں کہ اس آیت میں جو خداوند تعالیٰ نے اجر دینے اور خوف و رنج سے محفوظ رکھنے کا وعدہ فرمایا ہے اس کا تعلق اس دنیا سے نہیں ہے بلکہ آخرت سے ہے تو ایسے معترضین کی تشفی کے لئے ہم کلام مجید کی دوسری آیتیں پیش کرتے ہیں جن میں اسی دنیا میں اجر دینے کا وعدہ فرمایا گیا ہے "۱۴:
۲۷۔ یثبت اللہ الذین آمنوا بالقول الثابت فی الحیوٰۃ الدنیا وفی الاخرۃ ویضل اللہ الظالمین"
"یعنی اللہ اپنے پختہ قول کے ساتھ ایمان داروں کو حفظ و امن کے ساتھ اس دنیا میں قائم رکھتا ہے اور آخرت میں بھی قائم رکھے گا لیکن جو ظالم ہیں ان کو خدا گمراہ رکھتا ہے"۔ اس آیت میں تو صاف الفاظ میں

اسی دنیا میں حفظ و امن کے ساتھ قائم رکھنے کا وعدہ ہے اور اگر اس آیت سے بھی تسلی نہ ہو تو ایک دوسری آیت میں یہ بات بالکل صاف کر دی گئی ہے کہ جس قوم کے عمل صالح ہوں گے وہی قوم اس دنیا میں حکومت کرے گی چنانچہ ارشاد فرمایا " ۱۴: ۵۵ وعد اللہ الذین امنوا منکم وعملوا الصلحت لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم یعنی تم میں سے جو لوگ خدا پر ایمان رکھتے ہیں اور عمل صالح کرتے ہیں ان کے ساتھ اللہ کا یہ وعدہ ہے کہ وہ ان کو زمین پر خلیفہ (بادشاہ) بنائے گا جیسا کہ ان سے قبل خلیفہ بنایا۔" اس آیت سے تو اس بات کے یقین کر لینے میں کسی قسم کے شبہ کی گنجائش ہی نہیں رہی کہ عمل صالح کا اجر اسی دنیا میں ملتا ہے اور وہ حکومت کی شکل میں دیا جاتا ہے اور حکومت ہی کی شکل میں دیا گیا ہے۔ اور پھر دوسری آیتوں میں کلام مجید نے یہ بھی جتا دیا ہے کہ جو قوم عمل صالح نہیں کرے گی وہ یقیناً ہلاک ہو جائے گی اور اس کی جگہ دوسری قوم لے لے گی جیسا کہ ارشاد ہوا "۱۴: ۱۰۔ ثم جعلنکم خلئف فی الارض من بعدھم لننظر کیف تعملون یعنی پھر ہم نے ان کی تباہی کے بعد تم کو زمین میں خلیفہ بنایا تاکہ ہم دیکھیں کہ تم کیسے اعمال کرتے ہو۔" اور پھر اس کے بعد دوسری آیت میں بتلا دیا کہ اگر تم بھی عمل صالح نہ کرو گے تو تم بھی ہلاک ہو جاؤ گے " ن الذی خلق الموت والحیوۃ لیبلوکم ایکم احسن عملا یعنی اس نے موت و حیات کے قانون کو اس لئے جاری کیا ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ تم میں سے کون عمل صالح کرتا ہے۔" کیونکہ وہی قوم ہلاک ہو گی جو عمل صالح نہیں کرے گی جیسا کہ فرمایا "۴۶: ۳۵ فھل یھلک الا القوم الفاسقون یعنی کیا سوائے فاسق قوم کے کوئی اور قوم بھی ہلاک ہو سکتی ہے۔" ایسی صاف اور بین آیات کی موجودگی میں کوئی سمجھدار مسلمان جو کلام مجید کو الہامی کتاب مانتا ہے اور اس کو اپنی رہنمائی کا ذریعہ بنانا چاہتا ہے یہ نہیں کہہ سکتا کہ کلام مجید میں انسان کی پیدائش کے مقصد کو جو " لیعبدون " کے لفظ سے ظاہر کیا گیا ہے اس کے معنی رسمی عبادات نہیں بلکہ عمل صالح ہے۔ لہذا جب کلام مجید سے یہ بات ثابت ہے کہ انسانی زندگی کا مقصد عمل صالح ہے اور جن لوگوں نے عمل صالح کئے خدا نے ان کو اس دنیا میں حکومت، دولت اور عزت بخشی اور آخرت میں اجر دینے کا وعدہ فرمایا اور جو عمل صالح کریں گے خدا ان کو حکومت، دولت اور عزت بخشے گا اور آخرت میں بھی اجر دے گا اور جو اس کے خلاف کریں گے وہ تباہ و برباد ہو جائیں گے تو پھر ہمیں

اس بات کے یقین کر لینے میں کونسی وجہ مانع ہو سکتی ہے کہ مذہب ہماری اسی دنیا میں رہنمائی کے لئے آیا ہے اور ہم کو وہ اصول بتلاتا ہے جو جماعت انسانی کی اجتماعی ترقی اور بہبودی کے واسطے فطرتاً لازمی ہیں اور جن کو مذہب کی اصطلاح میں نیکی، عبادت، احسان، اتقا یا عمل صالح کہتے ہیں اور جن کی خلاف ورزی سے ہلاکت لازم آجاتی ہے۔

ہم اس مقام پر انسان کی اجتماعی ترقی اور بہبودی کے صرف چند ابتدائی اور بنیادی اصول پر بحث کریں گے۔ سب سے پہلا اصول انسانی ترقی کا یکجہتی یعنی مل کر کام کرنا ہے۔ اگر کسی جماعت انسانی کے اندر افتراق و انشقاق ہے تو وہ جماعت زیادہ عرصے تک اپنی ہستی قائم نہیں رکھ سکتی۔ قانون فطرت یا احکام الٰہی کے مطابق اس کو نیست و نابود ہو جانا چاہیئے چنانچہ کلام مجید نے اس اصول کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے " واعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا یعنی خدا کی رسی کو مضبوط پکڑو اور تفرقہ مت ڈالو" لیکن کیا کوئی مسلمان کہہ سکتا ہے کہ اس کا خدا کے اس حکم پر عمل ہے جو عمل صالح یا مقصد آفرینش کی محض ابتدائی کڑی ہے۔ آج وہ قوم جس کا شیرازہ ہمیشہ بکھرا رہا اور جس کی بدولت وہ ہمیشہ بیرونی اقوام کی محکوم رہی اپنے تفرقات مٹانے کی کوشش کر رہی ہے اور ایک مرکز پر مجتمع ہو رہی ہے لیکن برخلاف اس کے مسلمانوں کی جماعت میں روز نئے نئے فرقے پیدا ہوتے جاتے ہیں جو ایک دوسرے کی تکفیر و تکذیب کرنا ہی عمل صالح اور فرض عبدیت سمجھتے ہیں اور اس طرح سے اپنے مرکز سے دور ہو کر اپنی طاقت کو کمزور کر رہے ہیں اور برابر خدا سے اجر کے متوقع بھی ہوتے ہیں حالانکہ کلام مجید نے صاف الفاظ میں یہ فرما دیا " ان اللہ یامر بالعدل والاحسان یعنی اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ دوسروں کے ساتھ انصاف اور احسان کرو" اور ہم اس کے خلاف دوسروں کے ساتھ محض ناانصافی ہی نہیں بلکہ ظلم کرتے ہیں۔

عمل صالح کی دوسری کڑی علم حاصل کرنا ہے اور چونکہ علم ہر زمانے میں ترقی کر رہا ہے اس لئے کوئی انسانی جماعت جبتک وہ اپنے زمانے کے تمام علوم حاصل نہ کرے گی اور ان سے فائدے نہ اٹھائے گی، اس وقت تک وہ اپنی ہستی کو عزت کے ساتھ قائم نہیں رکھ سکتی مگر کشتی اسلام کے ناخدا علم کو محض منقولات یا ان معقولات کے اندر محدود سمجھتے ہیں جو چوتھی یا پانچویں صدی ہجری تک دیگر زبانوں سے عربی زبان میں منتقل

ہو چکے تھے گویا توپ بندوق کے زمانے میں وہ اپنے پرانے تیر و تلوار سے کام چلانا چاہتے ہیں اور موٹر کار اور ہوائی جہاز کا مقابلہ چھکڑے اور اونٹ گاڑی سے کرنا چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان فرسودہ اور زنگ آلودہ آلات سے وہ دور حاضرہ کی کشمکش حیات میں کس طرح کامیاب ہو سکتے ہیں۔ کلام مجید میں علم کو نیکی سے تعبیر کیا گیا ہے جیسا کہ فرمایا " ومن یوت الحکمۃ فقد اوتی خیراً کثیراً یعنی جس کو حکمت دی گئی اس کو بڑی نیکی دی گئی " اور پھر سورہ آل عمران میں فرمایا " ان فی خلق السمٰوٰت والارض واختلاف الیل والنہار لاٰیٰت لاولی الالباب الذین یذکرون اللہ قیاماً وقعوداً وعلیٰ جنوبھم ویتفکرون فی خلق السمٰوٰت والارض ربنا ما خلقت ھذا باطلا یعنی بیشک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں اور رات اور دن کے اختلاف میں البتہ نشانیاں ہیں عقلمندوں کے لئے جو ذکر کرتے ہیں اللہ کا کھڑے اور بیٹھے اور اپنی کروٹ پر لیٹے اور غور کرتے ہیں آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار یہ جو کچھ تو نے پیدا کیا ہے بے فائدہ نہیں ہے " اس وقت تک جس قدر علوم انسان نے حاصل کئے ہیں وہ سب ثوابت و سیار کی اشکال و حرکات کے مشاہدے کرنے اور ان پر غور و فکر کرنے اور جس قدر کرۂ ارض پر مظاہر قدرت ہیں ان سب کے مطالعے اور تجربات کے ذریعے سے حاصل کئے ہیں اور آیت مذکورہ بالا میں یہی راز ظاہر کیا گیا ہے کہ مظاہر قدرت پر ہر وقت غور و فکر کرو اور اس کے ذریعے سے نئی نئی معلومات حاصل کرو اس سے تم کو خدا کی عظمت و شان کا بھی یقین حاصل ہوگا اور فائدے بھی حاصل ہوں گے اور یہ خیال نہ کرو کہ یہ سب چیزیں بے کار ہیں۔ تم جس قدر ان پر غور و فکر کرو گے اور جس قدر ان کے متعلق تحقیق و تفتیش کرو گے اسی قدر تمہیں ان کے نئے نئے خواص اور نئے نئے استعمال معلوم ہوں گے اور اسی قدر تم ان سے زیادہ فائدے اٹھاؤ گے کیونکہ تمام چیزیں تمہارے ہی فائدے کے لئے بنائی گئی ہیں جیسا کہ فرمایا " ھو الذی خلق لکم ما فی الارض جمیعاً یعنی جو کچھ دنیا میں ہے خدا نے تمہارے واسطے پیدا کیا ہے "۔ چنانچہ خلافت بنی امیہ اور بنی عباسیہ کے زمانے میں مسلمانوں نے اس ارشاد الٰہی کی پورے طور پر تعمیل کی اور اس کے ذریعے سے جو کچھ ترقی انھوں نے کی وہ آج کسی سے پوشیدہ نہیں ہے مگر خلفائے بنی عباسیہ کے آخر زمانے میں مسلمانوں میں مذہب اور عبادت کا مفہوم محض چند مقررہ رسموں میں تبدیل ہو گیا اور علوم کا حاصل کرنا کفر و الحاد سمجھا جانے لگا۔ اسی زمانہ سے

ان کی پستی کا آغاز ہو گیا۔

عمل صالح کی تیسری کڑی تنظیم ہے تنظیم سے مراد یہ ہے کہ کسی جماعت انسانی میں جو شخص اپنی جماعت کی صحیح رہبری کی اہلیت رکھتا ہو اس کو اپنا رہبر بنا کر باقی تمام جماعت اس کے احکام کی متفقہ طور پر پیروی کرے۔ تاریخ ہم کو بتلاتی ہے کہ دنیا میں انہیں قوموں نے ترقی کی ہے جنھوں نے ایک قابل رہبر کے ماتحت اپنے اندر ایک مکمل تنظیم قائم کر لی ہے۔ انسان کے علاوہ ہم بعض ان جانوروں میں بھی ایسی تنظیم پاتے ہیں جو انسان کی طرح ایک اجتماعی زندگی بسر کرتے ہیں۔ شہد کی مکھی کو دیکھئے کہ وہ اپنے ایک سردار کے ماتحت کس قدر منظم زندگی بسر کرتی ہے جس سے اس کی طاقت اس قدر بڑھی ہوئی ہے کہ دوسرے جانوروں کا تو ذکر ہی کیا ہے بعض اوقات اشرف المخلوقات انسان بھی اس کی تنظیم سے ایسا عاجز آجاتا ہے کہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا اور چنانچہ اخبارات میں اکثر اس قسم کی خبریں شائع ہوتی رہتی ہیں کہ فلاں مقام پر فلاں شخص کو شہد کی مکھیوں نے ہلاک کر دیا۔ یہ تنظیم ایسی ہی چیز ہے کہ کمزور ترین ہستی کو بڑی سے بڑی طاقت رکھنے والی ہستی پر غالب کر دیتی ہے برخلاف اس کے کوئی جماعت تعداد میں کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو ایک چھوٹی سی منظم جماعت کا مقابلہ نہیں کر سکتی اور یہ وہ واقعات ہیں جو روزمرہ ہمارے مشاہدے میں آتے ہیں چین کتنی بڑی سلطنت ہے اور اس کی کتنی بڑی آبادی ہے لیکن اس میں نہ تو یک جہتی ہے اور نہ تعلیم ہے اور پھر اس پر ایک تنظیم کے ماتحت بھی نہیں ہے لہذا جاپان جیسی چھوٹی سی منظم سلطنت نے اس کو کس قدر ذلیل کر رکھا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اصول تنظیم ایک جماعت یا قوم کی بقا کے لئے اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ یک جہتی اور علم اور چنانچہ کلام مجید میں تنظیم کے متعلق یہ حکم نازل ہوا ہے " ۴ : ۵۸ ۔ ان اللہ یامرکم ان تؤدوا الامٰنٰت الی اھلھا واذا حکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل ط یعنی تحقیق اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانت ان کے سپرد کرو جو اس کے اہل ہیں، وہ لوگوں کے درمیان انصاف کریں۔" اس آیت کا صاف الفاظ میں یہ مطلب ہے کہ قوم کی رہبری اور سرداری جو ایک قسم کی امانت ہے وہ ایسے لوگوں کے سپرد کرنی چاہئے جو اس کی اہلیت رکھتے ہیں۔

یہ ہیں وہ زبردست اصول جو اسلام نے مسلمانوں کی قومی زندگی کے استحکام اور ترقی کے واسطے پیش کئے یعنی یک جہتی، علم اور تنظیم اور یہ تینوں اصول گویا "یعبدون" کی اجمالی تفسیر ہے اور وہی شخص مومن کہلائے

جاننے کا مستحق ہے جو علوم حاصل کر کے اپنی جسمانی، دماغی اور اخلاقی حالت کو مکمل بنا کر ایک تنظیم کے ماتحت یکجہتی کے ساتھ جماعت انسانی کے زیادہ سے زیادہ افراد کو زیادہ سے زیادہ فائدے پہنچانے کی کوشش کرتا ہے۔ جیسا کہ فرمایا "ان اکرمکم عند اللہ اتقکم یعنی اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ قابل عزت وہ ہے جو سب سے زیادہ نیکی کی زندگی بسر کرتا ہے۔" ان اصول کے علاوہ اور جو کچھ کلام مجید میں اوامر و نواہی کے طور پر احکام صادر ہوئے ہیں وہ سب مذکورۂ بالا مقاصد کی تکمیل کے تفصیلی ذرائع ہیں۔ بہرحال جس انسانی جماعت کے اکثر افراد ان مذکورۂ بالا اصول کو اپنی زندگی کا مقصد یا نصب العین بناتے ہیں وہی صالح ہیں اور "لیعبدون" کی صحیح طور پر پیروی کرتے ہیں اور وہی قانون فطرت یا حکم الٰہی کے مطابق اس دنیا میں امن، خوشی، عزت اور حکومت کی شکل میں اجر پانے کے مستحق ہیں اور آخرت میں بھی اجر پائیں گے۔ یہ وہ حقیقت ہے جس سے کوئی انصاف پسند انسان انکار نہیں کر سکتا اور جس کی تصدیق کلام مجید ان الفاظ میں کرتا ہے۔ "و انتم الاعلون ان کنتم مومنین یعنی اگر تم حقیقت میں مومن ہو تو تم سب پر غالب آؤ گے"۔ پس معلوم ہوا کہ انسان کی زندگی کا مقصد عمل صالح کرنا ہے اور عمل صالح ہی کے ذریعے سے یہی نہیں کہ انسان اس دنیا میں سرخرو ہوتا ہے اور امن و خوشی اور عزت و حکومت کی زندگی بسر کرتا ہے کیونکہ یہ تو عمل صالح کا محض مادی معلول ہے، روحانی خوشی جو انسان کو اس سے حاصل ہوتی ہے وہ خدا کا دیدار ہے چنانچہ خداوند تعالیٰ فرماتا ہے "فمن کان یرجو لقاء ربہ فلیعمل عمل صالحا یعنی جو چاہتا ہے کہ اپنے رب کا چہرہ دیکھے اس کو چاہیے کہ عمل صالح کرے۔" اب اس سے زیادہ اور کیا روشن دلیلیں اس بات کے ثبوت میں پیش کی جا سکتی ہیں کہ انسانی زندگی کا مقصد عمل صالح کرنا ہے جس کو خدا نے "لیعبدون" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے اور جس کی تعلیم و تنبیہ کلام مجید میں جابجا موجود ہے۔

سن کیانگ یا چینی ترکستان کا مسئلہ

جغرافی کیفیت | مجھ سے فرمائش کی گئی ہے کہ سن کیانگ کے متعلق کچھ اور لکھوں۔ میں نے اپنے دوست جناب عبدالرحمٰن کاشغری صاحب سے جو ندوے میں عربی کے استاد ہیں ذکر کیا کہ مدیر جامعہ کی فرمائش کس طرح پوری کی جائے تو انھوں نے فرمایا کہ سن کیانگ اور اس کے آس پاس کے ملکوں کا نقشہ اٹھا کر دیکھو سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ ان کی ہدایت کے مطابق میں نے سن کیانگ کا نقشہ نکالا اور اسی پر غور کرنا شروع کیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ خطہ جس کو ہم سن کیانگ یا چینی ترکستان کہتے ہیں چین، روس اور برطانوی ہند تین ملکوں کے درمیان واقع ہے۔ یہاں سے ہندوستان میں آنے کے لئے دو ہی راستے ہیں ایک تو ختن سے گلگت ہوتے ہوئے کشمیر پہنچتا ہے اور دوسرا کاشغر سے پامیر کو عبور کر کے افغانستان ہوتا ہوا پشاور تک آتا ہے۔ روس جانے کے لئے بھی دو صورتیں ہیں۔ ایک تو ہم دریائے الیٹش کے کنارے ہوتے ہوئے روسی ترکستان جا سکتے ہیں، دوسرے شہر تاچن (Tachim) سے دو نغاریہ (Dungaria) کا رخ کرکے سائبیریا میں داخل ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح چین کے اندر داخل ہونے کے لئے دو راستے ہیں۔ ایک تو حامی سے روانہ ہو کر آنسی (Anoi) ہوتے ہوئے صوبہ کانسو (Kanou) کے پایۂ تخت لان چاؤ (Lan Chau) کی طرف اور دوسرا شہر کیتائی (Kitai) سے برکول (Barkul) اور جنوبی منگولیا ہو کر چہار (Chahar) کے پایۂ تخت کلگن (Kalgan) تک۔

کشمیر کی پشت پر کوہ کون لون (Kun Lun) ہے اور افغانستان کے مشرق میں پامیر واقع ہے۔ وہ علاقہ جو چین کے صوبہ چین ہائی (Chinhai) سے ملا ہوا ہے جبال آمبر ٹاٹائی (Amban

---

لے مسئلہ سن کیانگ کے متعلق جو کچھ لکھا جائے گا وہ صرف میری ہی رائے نہیں ہے بلکہ کاشغری صاحب کے خیالات بھی اس میں شامل ہیں۔

(Altai) اور وہ علاقہ جو منگولیا کی سرحد سے ملا ہوا ہے کوہ التائی (Altai) کہلاتا ہے۔ وہ علاقہ جو سائبیریا سے متصل ہے کوہ برکیل (Barkil) ہے۔ تھیان شان (Thien Shan) یعنی جبل السماء بالکل سن کیانگ کے درمیان واقع ہے جو اس صوبے کو شمالی اور جنوبی دو حصوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ جنوبی تھیان شان کا صحرا تکلہ مکان (Takla Makan) سن کیانگ کا ربع الخالی ہے جو ایک بالکل بنجر زمین ہے۔ زرخیز علاقہ جنوبی اور شمالی تھیان شان کے غرب میں ہے۔ جنوب میں دریائے ترم (Tarim) ہے جس کے کنارے آقرہ، کاشغر، یارقند، مارلباشی اور ختن واقع ہیں۔ شمال میں دریائے ایلیٹس (Illiitioh R.) ہے، جو روسی ترکستان کے اندر چلا گیا ہے جس کے کنارے پر خوبعہ، ایلی، جنھار، ووسو، سولٹ اور ارومچی۔ کیٹائی شمالی سن کیانگ کے مشرق میں اور تاچن اس کے شمال مغرب میں ہیں۔

کل صوبے میں ۲۹[ا] اضلاع ہیں جو تین قسموں میں منقسم ہیں۔ قسمت اول میں بارہ ضلعے ہیں جن میں سے چھ یعنی طرفان، آقسو، کچار، کاشغر، یارقند اور ختن جنوبی تھیان میں ہیں، اور پانچ یعنی کیٹائی، ارومچی، خولجہ، ایلی اور تاچن شمالی تھیان شان میں ہیں اور حامی مشرق سن کیانگ میں۔ قسمت دوم میں چودہ ضلعے ہیں۔ باقی قسمت سوم میں ہیں۔ قسمت اول کا صدر مقام "ٹو" (Tao) کہلاتا ہے اور وہاں کا حاکم "ٹو این" (Tao yen)۔ قسمت دوم کے صدر مقام کو "ہین" (Hien) کہتے ہیں اور وہاں کے حاکم کو "ہین چن" (Hien Chan)۔ قسمت سوم کے صدر مقام کو "زی چن" (Zi Chan) اور وہاں کے حاکم کو "زی چن" (Zi Chan)۔

سن کیانگ کا پایۂ تخت اس وقت ارومچی ہے۔ وہاں ایک حاکم اعلیٰ رہتا ہے۔ منچو کے زمانے میں توچون (Tu Chun) یعنی گورنر جنرل کہلاتا تھا۔ جمہوریت چین نے اس خطاب کو بدل دیا ہے اب چوشی (Chu Shee) یعنی صدر صوبہ کہلاتا ہے۔ سن کیانگ کی موجودہ شورش اسی "چوشی" چن شوزن (Chin Shoo Zin) نامی کے خلاف برپا کی گئی ہے کیونکہ اسی نے مسلمانوں کے

[ا] سالنامہ Shen Pao (Shanghai) صفحہ ب ۲۹۔

مفاد کو پامال کرنے کی کوشش کی تھی۔ جس وقت میں یہ مضمون تیار کر رہا ہوں سن کیانگ کی صورت حال یہ ہے کہ مسلمان[۱] جنوبی تھیان شان پر قابض ہیں اور شمالی تھیان شان میں چینی حکام کا اقتدار ہے۔ اس شورش میں تھیان شان یا جبل السما، جو ایک اونچی دیوار کی طرح صوبہ سن کیانگ کے درمیان واقع ہے خوب کام آیا۔ اس نے نہ صرف سن کیانگ کے جغرافی حیثیت سے جنوبی اور شمالی دو حصے کر دئے بلکہ سیاسی اقتدار بھی دو جماعتوں میں تقسیم کر دیا۔

تاریخی تعلقات ہم کو معلوم ہو گیا کہ سن کیانگ ان تین ملکوں کے درمیان واقع ہے۔ وہاں سے ہر ملک میں جانے کے لئے صرف دو ہی راستے ہیں ورنہ ہر طرف قدرتی رکاوٹیں موجود ہیں۔ سن کیانگ کے ان تین ملکوں کے درمیان واقع ہونے کی وجہ سے ہر ایک ملک کے لئے اس کا امکان ہے کہ وہ اسے اپنے اندر شامل کرلے لیکن یہ ضرور ہے کہ جب تک کوئی ملک ان قدرتی رکاوٹوں پر غالب نہ آجائے وہ اپنی حکومت کا اثر وہاں قائم نہیں کر سکتا یعنی جس ملک کے ساتھ سن کیانگ کی آمد و رفت زیادہ آسان ہوگی اس کا اثر وہاں زیادہ ہوگا۔

معاہدۂ ایلی (۱۸۸۱ء) سے قبل سن کیانگ کا دروازہ روسیوں کے لئے بالکل بند تھا۔ پامیر اور ہمالیہ کے سبب سے اہل سن کیانگ کے لئے ماوراء النہر کے اس طرف آمد و رفت رکھنا مشکل تھا لیکن شمالی تھیان شان کے راستے سے چین کے اندر آنے جانے میں کچھ ایسی دقت نہ تھی اور جنرل شوچونگ تانگ (۱۸۷۸ء) نے اس راستے کو اور آسان بنا دیا۔ یہی وجہ تھی کہ انیسویں صدی کے وسط میں وہاں چینیوں کا نفوذ ہو گیا اور اس وقت سے آج تک[*] سن کیانگ میں ان کا سیاسی اقتدار رہا۔

چین کے تعلقات سن کیانگ کے ساتھ حضرت مسیحؑ سے قبل شروع ہو چکے تھے۔ ترکوں کے قبائل غز جو اس زمانے میں 'ہون لو' (Hiung Noo) کہلاتے تھے، برابر چین کی سرحد پر یورش کرتے تھے۔ جب چین شی وانگ ٹی نے (۲۲۱ ق م۔ ۲۴۶ ق م) چین کی طوائف الملوکی اور جاگیرداری نظام

ؔ۱ دیکھو نقشہ

نقشہ
سن کیانگ یا چینی ترکستان
حدود سن کیانگ
چینگ سائی و چینگ ہیا
روسی ترکستان
سائبیریا
منگولیا
کوہ ترکول
چینگ ہیا
چینگ ہائی
جبال کون لون
تبت
کشمیر
سی کانگ
شانسی

کا خاتمہ کر کے چین کو متحد کیا تو اس نے تتاری یورش کو روکنے کے لئے دیوار چین بنائی۔ پہلی صدی عیسوی میں تتاریوں نے چین پر دوبارہ حملہ کیا۔ چین کے مشہور جنرل 'پان چاؤ' (Pan chao) (۹۴ مسیحی) نے ان کو دیوار چین کے اُدھر چینی ترکستان میں پسپا کر دیا۔ پھر وہ ان کا پیچھا کرتا رہا یہاں تک کہ ان کا مضبوط قلعہ ختن فتح ہو گیا۔ ختن کا فتح ہونا تتاریوں کے لئے ایک ایسی ضرب کاری تھی کہ ان کو پھر چین پر یورش کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ پانچویں صدی میں تتاری قبیلے نے آٹیلا کے زیر قیادت یورپ پر یورش کی اور اسی یورش کے ساتھ قبیلہ غز ایشیائے کوچک میں پھیل گیا لیکن اس قبیلے کی ایک شاخ 'کیٹائی' یا 'کاٹی' (Kitai — Cathy)، ترکستان میں رہ گئی۔ چھٹی صدی کے شروع میں اس خاندان نے چینی ترکستان میں اپنی ریاست قائم کر لی۔ کول ٹگن (Koltagan)، اور بکیکا خاں (Bekiku Khan)، ان کے مشہور حاکموں میں سے تھے۔ ان کا پایۂ تخت طرفان (Turfan)، تھا۔ اس کے بعد یہ ملک کچھ دن تبت کے ماتحت رہا لیکن بارھویں صدی میں مغلوں نے آکر اس پر قبضہ کر لیا۔ اسلام کو اس زمانے میں یہاں خوب فروغ ہوا کیونکہ تخت چین مغلوں کے ہاتھ میں تھا (۱۲۷۰ء - ۱۳۶۸ء)۔ اور چینی ترکستان کے اکثر قبیلے مسلمانوں کے گروہ میں داخل ہو گئے لیکن چودھویں صدی کے آخر میں مغلوں نے چین سے شکست کھائی۔ اس شکست کے ساتھ چینی ترکستان سلطنت چین میں شامل ہو گیا۔ اس وقت گو یہ علاقہ چین کے ماتحت تھا لیکن سوائے تھوڑا سا خراج ادا کرنے کے اسے چین سے کوئی سروکار نہیں تھا بلکہ بجائے چینی اثر کے ریاست خوارزم کا اثر اس پر زیادہ تھا۔ پایۂ تخت سے دور ہونے کی وجہ سے حکومت چین اپنے حکام چینی ترکستان نہیں بھیج سکتی تھی اور تمام انتظامات مسلمانوں کے ہاتھ میں چھوڑ دئے گئے تھے لیکن انیسویں صدی کے وسط میں یعقوب خاں جو روسی ترکستان کا رہنے والا تھا چپکے سے کاشغر میں جو اس وقت یہاں کا پایۂ تخت تھا داخل ہو گیا اور وہاں کے حاکم کا خاتمہ کر کے خود بادشاہ بن بیٹھا۔ وہاں کے مسلمانوں نے حکومت چین سے مدد مانگی۔ حکومت چین نے جنرل ٹسو چونگ ٹانگ (Tso Chung Tang) کو روانہ کیا۔ جنرل موصوف ابھی راستے میں تھا کہ خبر آئی نیاز حکیم جو یعقوب خاں کا دشمن تھا اس کا خاتمہ کر کے خود کاشغر پر قابض ہو گیا۔ لیکن ٹسو چونگ ٹانگ برابر آگے بڑھتا چلا گیا یہاں تک کہ وہ ارومچی میں پہنچ گیا۔ اس نے وہاں کے

مسلمانوں کو خوب بیوقوف بنایا۔ یہ لوگ جاہل اور ناسمجھ تھے اور ان میں مذہبی جنون بھی بہت تھا۔ ان کی جہالت اور مذہبی جنون سے فائدہ اٹھا کر جنرل لشو چونگ ٹانگ نے ان کے سیاسی اقتدار کا خاتمہ کر دیا، چینی ترکستان کو سلطنت چین کا ایک صوبہ بنا دیا (١٨٨٠ء) اور ارومچی کو پایۂ تخت قرار دیا۔ یعقوب خاں صرف ١٣ سال تک بادشاہ رہا اور اس کی موت کے ساتھ سلطنت بھی مسلمانوں کے ہاتھ سے چلی گئی۔ ١٨٨٠ء سے لے کر ١٩١٠ء تک وہاں سکون رہا اور کسی قسم کی بدنظمی کی خبر نہیں آئی لیکن ١٩١٠ء میں مسلمانوں نے بغاوت ٹائی پنگ اور اصلاحی تحریک سے فائدہ اٹھا کر آزاد ہونا چاہا لیکن ناکام رہے۔ یہی زمانہ تھا جب چین میں انقلاب رونما ہوا۔

انقلاب چین اور سن کیانگ

١٩١١ء میں جبکہ چین میں سیاسی انقلاب رونما ہوا اور نانکنگ جمہوریت چین کا اعلان کیا گیا تو سن کیانگ بعینہٖ چین کا ایک صوبہ قرار دیا گیا۔ گورنر گو چینی ہوا کرتا تھا لیکن اس کی یہ مجال نہ تھی کہ مذہبی امور میں مداخلت کرے۔ اس کا تعلق صرف سیاست سے تھا۔ صوبے کے اندرونی انتظامات میں گورنر بالکل خود مختار تھا۔ امور خارجہ جو اس صوبے سے تعلق رکھتے تھے حکومت پیکن کے مشورے سے یا دفتر خارجہ کے ذریعے انجام پاتے تھے۔ گو یہاں کے لوگ یہ جانتے تھے کہ وہ چین کی رعایا ہیں لیکن ان کو اندرونی چین سے بہت کم واسطہ تھا۔ چین میں انقلاب کے بعد انقلاب ہوتا رہا لیکن اس کا اثر یہاں بہت کم نظر آتا تھا۔ سن کیانگ اور چین کی اس بے تعلقی کی کئی وجوہ ہیں۔ ایک تو یہ کہ دونوں ملکوں کے باشندوں میں خون اور رنگ کا فرق ہے۔ چینی ترکستان میں جو لوگ بستے ہیں وہ تاری، منگولی، ترک، قرغز، قلموک اور دونغان (Dungan or Tungan) ہیں۔ خالص چینی یعنی خاص زرد نسل کے لوگ زیادہ سے زیادہ دس فی صدی ہوں گے۔ وہ بھی ان لشکریوں کی اولاد ہیں جو جنرل لشو چونگ ٹانگ کے ساتھ ارومچی میں جا کر بس گئے تھے۔ مذہب کے لحاظ سے چینی بدھ کے ماننے والے اور اسلاف پرست (Ancestor worshippers) ہیں اور تاری، منگولی و دیگر قبیلے اسلام کے معتقد ہیں۔ ان کی تعداد دیگر قوموں کے مقابلے میں ٩٠ فی صدی ہے۔ سن کیانگ کا رقبہ ٥٣٢,٦٠,٠٠٠ مربع میل ہے اور کل باشندے ٢٥,٦٧,٦٤٠ ہیں۔ ٩٠ فی صدی کے حساب سے یہاں مسلمانوں کی تعداد کم و بیش

.... ۱۰،۳۴۲ سمجھنا چاہیئے۔ لیکن جس چیز نے اہل سن کیانگ اور باشندگان چین کے درمیان سب سے زیادہ بے ربطی پیدا کر رکھی ہے وہ اختلاف زبان ہے چین کے لوگ چینی بولتے ہیں اور سن کیانگ کے مسلمان ترکی ان کی ترکی زبان گو استنبولی ترکی سے مختلف ہے لیکن دونوں ایک ماں کی بیٹیاں ہیں۔ دونوں کے مصدر عربی ہیں اور دونوں عربی حروف میں لکھی جاتی ہیں۔ باشندگان سن کیانگ میں بہت کم ایسے ہیں جو چینی زبان سے واقف ہوں اور اہل چین میں بہت کم ایسے ہیں جو ترکی یا عربی جانتے ہوں حتی کہ چینی مسلمان بھی عموماً ان زبانوں سے کورے ہیں۔ زبان کے اختلاف کی وجہ سے ان کی معاشرت بھی مختلف ہے قوموں کا عام قاعدہ ہے کہ وہ ہمیشہ اپنی معاشرت کو برتر سمجھتے ہیں۔ چینی لوگ سن کیانگ والوں کو اس لئے جنگلی کہتے ہیں کہ ان میں تعلیم سرے سے مفقود ہے۔ اور اہل سن کیانگ چینیوں کو اس وجہ سے نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں کہ وہ کافر ہیں۔ ایسی حالت میں سن کیانگ کے لوگوں کا اہل چین سے بے تعلق ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ ان وجوہ کے علاوہ اور ایک وجہ بھی ہے وہ یہ کہ دونوں ملکوں میں آمد ورفت بہت دشوار ہے۔ قافلوں کو سوائے پیدل یا گدھے یا اونٹ پر سفر کرنے کے کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ لان چاؤ سے ارومچی تک کم سے کم تین مہینے کا وقت لگتا ہے۔

سن کیانگ گو اس وقت جمہوریت چین کے ماتحت ہے لیکن اس پر مرکزی حکومت کا اثر بہت کم ہے یعقوب خاں کے استیصال کے بعد جو چینی وہاں رہ گئے گو ان کی تعداد کم ہے لیکن وہ چالاک اور حریص ہیں۔ مسلمانوں کی تعداد چینیوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ مسلمان جسمانی لحاظ سے قوی اور جنگ جو قوم ہیں لیکن منتظم نہیں ہیں۔ وہ جان دے سکتے ہیں لیکن حکومت کو نہیں سنبھال سکتے۔ اگر ان میں انتظامی مادہ ہوتا تو یعقوب خاں اپنے ماتحت کے ہاتھ سے قتل نہ ہو جاتا۔[1]

نوٹ صفحہ گذشتہ (1) Tyan: Two years of Nationalist China (Page 413).

(1) Douglas: China (Page 349).

اور اسلامی ریاست چین کے ہاتھ میں نہ چلی جاتی۔ اس وقت قرغز اور تاری ترک جواب تک اس ملک میں آباد ہیں بیرونی ممالک کے ساتھ کم تعلق رکھنے کی وجہ سے ذہن اور سیاست کے اعتبار سے پست چینیوں سے بھی بدرجہا پست ہیں چینیوں میں ضعف ضرور ہے لیکن حرکت کی کمی نہیں۔ ان لوگوں پر تو بالکل جمود طاری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قانون اور دستور کی رو سے مساوی حقوق اور مواقع ملنے کے باوجود انھوں نے سیاست میں کوئی نمایاں حصہ نہیں لیا اور نہ سیاسی اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کی۔ ملکی انتظامات بجز مذہبی امور کے سب چینیوں کے ہاتھ میں ہیں۔

بعض چینی جنرل اور ان کا عیش پرستی کا فلسفہ

سن کیانگ کے حاکم گو حکومت چین کی طرف سے مقرر ہوتے ہیں لیکن سوبجاتی امور میں ان کو پورا اختیار ہے۔ وہ اپنی رائے سے مقامی قانون کا نفاذ یا تنسیخ کر سکتے ہیں۔ چونکہ چینیوں کا کوئی خاص مذہب نہیں ہے اس لئے ان کا معیار زندگی دینی اخلاق پر مبنی نہیں۔ جب چین میں مغربی تعلیم کا اثر نہ تھا تو چینی حکام کی سیرت فلسفہ کانفوشس (استاد کانؑ) اور عقیدۂ تو سے متاثر ہوتی تھی مگر جب مغربی عیش پرستی کی ہوا چین کے طول و عرض میں پھیلی تو بعض چینی حکام نے اپنے پرانے معیار زندگی کو چھوڑ دیا اور لذتیت کے فلسفے نے اس کی جگہ لے لی۔ اس عیش پرستی کے تخیل نے چین کے موجودہ سیاسی نظام پر بہت کافی اثر ڈالا ہے۔ آج کل چین کے شمال سے لے کر جنوب تک اور شرق سے غرب تک جنرل ہی جنرل نظر آتے ہیں۔ خواہ فوجی عہدے ہوں خواہ مدنی، سب کے سب ان جنرلوں کے ہاتھ میں ہیں یہاں تک کہ میونسپلٹی کے صدر اور عدالت کے مجسٹریٹ بھی وہی ہوتے ہیں۔ جنرل وہ کہلاتا ہے جس کے ماتحت کچھ فوج یا پولیس ہو۔ یہ تمام جنرل اکثر ایک دوسرے کے خلاف سازش کرتے ہیں۔ جن جنرلوں کے پاس فوجی قوت زیادہ ہے ان کو یورپ والوں کی طرف سے "ارلارڈ" (War Lord) کا خطاب دیا گیا ہے۔ یہ لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ عوام کے خیرخواہ ہیں اور

ؑ کان (Con) ایک خاندانی نام ہے اور "فوش" یا "فوٹز" ('Fuee or Futze') کے معنی ہیں استاد۔

ان کی جان و مال کے محافظ بھی!

سن کیانگ بھی ان جنرلوں کے اثر سے محفوظ نہ رہا۔ جو کوئی جنرل وہاں مقرر ہوتا اس کا سب سے پہلا کام یہ تھا کہ اپنی قوت بڑھائے اور ذاتی جائداد جمع کرے۔ اس کے لئے وہ مختلف ذرائع اختیار کرتا کبھی افیون کی کاشت کرانے اور اس کو فروخت کرنے کی صورت میں کبھی لگان اور ٹیکس کے اضافے یا محاصل کے پیشگی وصول کرنے کی صورت میں۔ غرض ایمان داری یا بے ایمانی سے جس طرح بھی روپیہ مل سکے وہ اسے سمیٹنے کو طیار رہتا ہے۔ وہ خدا سے نہیں ڈرتا کیونکہ خدا کا قائل ہی نہیں۔ وہ اپنے افسر اعلیٰ کی پروا نہیں کرتا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ افسر اعلیٰ کو اتنی قدرت نہیں کہ اس کو سزا دے سکے۔ گذشتہ سال چین جنگ منچوریا کے موقع پر صوبہ شانٹانگ (Shangtung) میں دو جنرلوں کے درمیان جنگ چھڑ گئی' ایک صوبے کی حکومت کا صدر تھا اور دوسرا تسمت خاص' تسن ٹو (Tsin-too) کا میور (Mayor) تھا' اب یہ خبر ہے کہ صوبہ سی چوان (Sze chuan) میں دو جنرلوں میں لڑائی شروع ہوگئی۔ مرکزی حکومت جو ابھی غیر مستحکم ہے مگر اس میں کچھ قابل اور سمجھ دار لوگ ہیں' ان میں صلح کرانے کی کوشش کر رہی ہے۔ چنانچہ سن کیانگ کے معاملے میں بھی ان ذاتی مخالفتوں کا عنصر موجود ہے۔ The Chinese Journal of India Calcutta نے اپنے ۸ جولائی کے پرچے میں ایک یہ خبر شائع کی ہے کہ اورمچی میں ابتک سکون نہیں ہے۔ کئی سکریٹریوں نے جو چن شوزن کے ماتحت کام کرتے تھے' اس کے فرار ہونے کے بعد' حکومت اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کی لیکن قبل اس کے کہ ان میں سے کوئی کامیاب ہو وانگ موسونگ (wang mo sung) نے جو شورش سن کیانگ کی تحقیقاتی کمیشن کا صدر حکومت نانکینگ کی طرف سے مقرر کیا گیا تھا' وہاں پہنچ کر ان کو دبا لیا اور وہ خود امن قائم کرنے میں

---

(1) New Asia. Nanking (Vol. 3 No 4, page 124).

(2) China submits herself to Chaos (Current History: New york, June 1933.)

مشغول ہو گیا۔ سن کیانگ کی موجودہ حالت کیا ہے یہ میں بعد میں بیان کروں گا۔

عیسائی جنرل اور کانسو کے مسلمان

یہاں پر ایک عیسائی جنرل کا ذکر کرنا غالباً خارج از موضوع نہ ہوگا کیونکہ اس شخص نے ۱۹۲۶ء میں ایک ایسی حرکت کی تھی جس سے مسلمانان کانسو کو بہت نقصان پہنچا۔ اس واقعے کے بیان کرنے سے میرا مقصد صرف بعض جنرلوں کی شخصی اور انفرادی سیرت کو دکھانا ہے جسے حکومت کے اصول اور دستور سے کوئی واسطہ نہیں۔ یہ عیسائی جنرل کون ہے؟ یہ وہ حضرت ہیں جن کا نام فانگ یو ہیانگ (Fong Yu Hsiang) ہے اور جنھوں نے حال میں ایک زبردست اعلان شائع کیا ہے کہ وہ جاپانیوں کے ہاتھ سے منچوریا واپس لیں گے۔ یہ شخص 'اتحاد چین' (۱۹۲۸ء) کے بعد دفعتہً مرکزی حکومت سے بگڑ گیا اور شمالی چین میں اپنا قدم جمانے کی کوشش کرتا رہا۔ اس موقع پر اس کو روپیے کی سخت ضرورت تھی، صوبجاتی خزانہ خالی تھا، اور بینک والوں نے قرض دینے سے انکار کیا۔ جب اس نے دیکھا کہ روپیہ وصول کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے تو دفعتہً اس نے ایک فوجی فرمان جاری کر دیا کہ تاجروں سے مزید محصول وصول ہو اور وہ بھی پیشگی لیا جائے یعنی آئندہ کئی سال کا محصول اس وقت وصول کر لیا جائے۔ ظاہر ہے کہ جنرلوں کا یہ طرز عمل عوام کے لئے کس قدر تکلیف دہ ہوگا۔ شمالی چین میں زیادہ تر مسلمان آباد ہیں اور تاجروں کے طبقے میں بھی ان کی تعداد کافی ہے۔ انھوں نے اس فوجی فرمان کی سخت مخالفت کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان اور عیسائی جنرل کے درمیان زبردست جنگ چھڑ گئی۔ آخر کانسو مسلمانوں کا مرکز "ہاچاؤ" (Ha-Chau) فتح ہو گیا اور کئی ہزار مسلمان اس عیسائی جنرل کی تلوار سے شہید ہو گئے۔ موجودہ شورش سن کیانگ کے سلسلے میں ہم نے اس واقعے کا ذکر کرنا اس لئے مناسب سمجھا کہ اس شورش سے قبل کانسو میں بھی ایک اہم واقعہ مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کے درمیان پیش آیا تھا جس میں ماچونگ این اور ان کے خاندان کے لوگ شریک تھے اور اسی ماچونگ این اور اس کے بھائی ماسی این نے موجودہ شورش میں بھی حصہ لیا۔ اس شورش کی خبر اور اس کا فوری سبب ہم نے جون کے 'جامعہ' میں بیان کیا تھا۔ اس مضمون میں ہم کو اس کے دہرانے کی ضرورت نہیں، البتہ کانسو کی موجودہ سیاسی فضا کے متعلق کچھ لکھنا ضروری ہے، بغیر اس کے موجودہ مسئلہ سن کیانگ کے سمجھنے

سے ہم قاصر ہیں۔

واقعہ لین ثان | اس میں شک نہیں کہ یعقوب خاں کا خاتمہ ہونے کے بعد سن کیانگ میں چینی مسلمانوں کا سیاسی اقتدار کم ہوگیا اور صوبجاتی انتظامات میں بجز مذہبی امور کے ان کا دخل بہت کم ہے لیکن کانسو کے مسلمانوں کی حالت ایسی نہیں ہے۔ کانسو کا خاندان 'ما' وہاں کے مسلمانوں کا سیاسی رہنما ہے۔ اس خاندان میں دیندار اور قابل آدمی ہر زمانے میں پیدا ہوتے رہے ہیں۔ انیسویں صدی سے شمالی مغربی چین میں مسلمانوں کی جو کچھ تحریک بھی اٹھی اس میں اس خاندان کے افراد ضرور شریک رہے۔ افسوس ہے کہ یہ لوگ جدید تعلیم سے بہت کم لگاؤ رکھتے ہیں ورنہ چینی مسلمانوں کے لئے اس زمانے میں بہت کچھ کر سکتے۔

کانسو اور سن کیانگ دونوں صوبے بالکل ملے ہوئے ہیں۔ چینی ترکستان کے لوگ عموماً کانسو سے ہو کر شمالی چین میں داخل ہوتے ہیں اور کانسو کے مسلمان بھی اکثر سن کیانگ جایا کرتے ہیں گو راہ دشوار گذار اور موسم سرد ہے۔ 'تائی پنگ' (Taiping) (سنہ ۱۹۱۰ء) کے زمانے میں یہاں کے لوگوں نے کوشش کی کہ شمالی چین میں ایک اسلامی ریاست قائم کر دی جائے لیکن پکین پر ہشت دول یورپ کے متحدہ حملے نے مسلمانوں کو کامیاب نہ ہونے دیا۔ 'ماشو شان' (Ma shu shan) کے آٹھ بھائی 'شورش تائی پنگ' میں شریک تھے مگر تقدیر نے ان کا ساتھ نہیں دیا اور وہ سب کے سب اس شورش میں تباہ ہو گئے۔ باوجود اس ناکامی کے خاندان 'ما' کا رسوخ کانسو میں کم نہیں ہوا۔

خاندان 'ما' میں اس وقت کئی مشہور جنرل ہیں اور وہ کئی مرتبہ کانسو، ننگ ہیا اور چین ہائی کے گورنر بھی رہ چکے ہیں۔ ان کے ماتحت کافی فوج ہے۔ یہ لوگ حکومت نانکنگ کے خیر خواہ ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ سنہ ۱۹۲۶ء میں جبکہ عیسائی جنرل فانگ یو ہیانگ نے حکومت نانکنگ سے بغاوت کر دی اور فوجی خزانہ سے مزید محصول شمالی چین کے مسلم تاجروں پر لگانا چاہا تو ان لوگوں نے اس کی سخت مخالفت کی۔ آخر نوبت جنگ تک پہنچی۔ اس وقت مسلمانوں کے قائد، چونگ این اور ما پن ٹینگ تھے۔ جنگ میں ان لوگوں نے خوب داد شجاعت دی لیکن فوج ناتجربہ کار تھی اور ہتھیار کم تھے۔ آخر انھوں نے عیسائی جنرل سے شکست کھائی اور ہاچاؤ میں جو کانسو کے مسلمانوں کا مرکز ہے خون کی ندیاں بہ گئیں۔

شکست کے بعد ما چونگ این اور ما ین ٹینگ ضلع لین ٹان (Lin Tan) کی طرف بڑھے۔ ان کی فوج بالکل منتشر ہو چکی تھی۔ ان کے ساتھ سوائے دس بیس نوکروں کے بہت کم محافظ تھے۔ یہ لوگ لین ٹان کے قریب پہنچنے کو تھے کہ سرحد پر ایک برطرف شدہ افسر یانگ چی ٹنگ (Yang Chee Shing) نامی نے جو دو سال سے وہاں لوٹ مار کر رہا تھا اور جس کے ماتحت رہزنوں کی ایک اچھی خاصی جماعت تھی اس قافلے کو گھیر کر لوٹ لیا۔ اس کے بعد جنرل موصوف نے اپنی منتشر فوجوں کو جمع کر کے یانگ چی ٹنگ پر چڑھائی کی جو اس وقت شہر پر قابض تھا۔ بیس روز کی مسلسل جنگ کے بعد بھی شہر فتح نہیں ہو سکا۔ آخر جنرل (ما) کو شہر ہیاہا (Hsia Ha) کی طرف جانا پڑا۔ ان کے ہٹتے ہی[1] یانگ چی ٹنگ شہر سے نکلا اور اس نے اردگرد کے مسلمانوں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ کم سے کم پانچ ہزار مسلمان اس کی تلوار کی نذر ہو گئے۔ کروڑوں کی جائداد لوٹ لی گئی۔ صرف مویشی کی تعداد سات ہزار تھی۔ لین ٹان کے قریب اگرچہ سرکاری فوج رہتی تھی لیکن اس نے ان رہزنوں کے استیصال کے لئے کوئی قدم نہیں اٹھایا اور یہ عذر پیش کیا کہ اس کے پاس روپیہ نہیں ہے اور سامان بھی کم ہے! وہاں کے بڑے بڑے مسلم رؤسا مسلمانوں کی اس تباہ حالی کو دیکھ کر صبر نہ کر سکے۔ سب نے مل کر وہاں کے حاکم سے درخواست کی کہ امن و امان قائم کرنے کے لئے کوئی مناسب تدبیر اختیار کرے۔ مسلمان اس کا ساتھ دیں گے۔ آخر یہ طے ہوا کہ مسلمان مقامی حکام کی مدد کریں تاکہ وہ یانگ چی ٹنگ کو وہاں سے نکال دیں۔ اور مسلمانوں کی جان و مال کی حفاظت کریں۔ اکیلے ما من زن یا محمد کرامت علی نے جو مقامی مسلمانوں کے ایک رئیس تھے سو گھوڑے اور ستر ہزار ڈالر حکومت کو دئے اور اس طریقے سے وہاں تھوڑا بہت امن قائم ہوا لیکن یانگ چی ٹنگ جہاں کہیں پہنچا بستیوں کو جلاتا اور مسلمانوں کو قتل کرتا تھا۔

یہ ۱۹۲۹ء کا ذکر ہے۔ اس فتنے کا انسداد اب تک نہیں ہوا۔ کیونکہ یانگ چی ٹنگ نے اب تک مسلمانوں کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ جب کبھی اس کو موقع ملتا تھا وہ اپنی رہزن جماعت کو لے کر شہر لین ٹان

---

[1] نضارۃ الہلال پیکن (جلد چہارم نمبر ۸ صفحہ ۱۲)

پر حملہ کرتا تھا۔ مسلمانوں کی عورتیں، بچے، جان ومال کوئی چیز اس کے ہاتھ سے محفوظ نہ تھی۔ مسلمانوں نے حکومت نانکینگ سے اس کی شکایت کی۔ حکومت نے ان کی درخواست منظور کرلی اور وعدہ کرلیا کہ جلد اس رہزن سردار کی خبر لی جائے گی۔ لیکن حکومت کو ان دنوں اتنی فرصت کہاں تھی۔ جاپان کے ساتھ شدید جنگ چھڑی ہوئی تھی۔ حکومت نانکینگ اس موقع پر مسلمانوں کے لئے صرف اتنا کرسکی کہ اس نے کانسو کے موجودہ گورنر "چو لیز" (Chu Shao Liang) کو مناسب تدبیر اختیار کرنے کی ہدایت کردی لیکن یانگ چی ٹنگ گورنر کے قابو میں آنے والا نہ تھا اور وہ ابتک مسلمانوں کو تنگ کرتا رہتا ہے۔ دیکھئے آئندہ اس کا کیا تدارک ہوتا ہے۔

چینی مسلمانوں کا احتجاج لین ٹانگ کے مسلمانوں نے جب یہ دیکھا کہ ان کا معاملہ اب تک طے نہیں ہوسکا تو انھوں نے تمام چینی مسلم اخبارات میں ایک اپیل شائع کیا۔ چینی مسلمانوں نے اس پر لبیک کہا اور حکومت نانکینگ سے یانگ چی ٹنگ کے خلاف احتجاج کیا۔ ذیل میں اس احتجاج نامہ کا تھوڑا سا اقتباس ہے جو اسلامی اخبار "الصراط المستقیم" پیکن جلد ۲ نمبر ۲، ۳ و ۴ یعنی فروری، مارچ و اپریل نمبر میں شائع کیا گیا تھا۔

> "مرکزی پارٹی، قومی حکومت، اس کے مختلف شعبوں اور ہر صوبے کے گورنر سے یہ عرض ہے کہ کانسو کے ضلع لین ٹانگ سے خبر آئی ہے کہ یانگ چی ٹنگ جو حکومت کا ایک افسر تھا اور ۱۹۳۲ء میں برطرف کردیا گیا تھا شہر لین ٹانگ کے مسلمانوں پر حملہ کر رہا ہے۔ وہ ایک مرتبہ نہیں، دو مرتبہ نہیں بلکہ پانچ مرتبہ یورش کرچکا ہے۔ مرد قتل کردئے گئے ہیں، عورتیں عصمت ریزی کرکے شہر سے نکال دی گئی ہیں۔ اس نے اس پر اکتفا نہیں کی ہے بلکہ ایک بدھ مت کے پیشوا کو جو "نیو ہاشانگ" کے نام سے موسوم ہے آمادہ کیا ہے کہ وہاں کے غیر مسلموں سے مل کر مسلمانوں کو ستائے۔ چنانچہ ضلع صوان فان، میں وہ ایک "یشاکو" نامی کے چھوٹے بچے کو جس کی عمر ایک سال سے بھی کم ہی پکڑ کر لے گیا۔ گو وہاں کے مسلمانوں نے یانگ چی ٹنگ کے خلاف استغاثہ دائر کیا اور

صوبجاتی حکومت نے فیصلہ یہی کر دیا کہ ملزم کو سخت سزا دی جائے لیکن سیاسی وجوہ سے وہ یانگ چی ٹنگ کے خلاف کوئی باقاعدہ کارروائی نہیں کرسکی۔ یانگ چی ٹنگ دیکھتا ہے کہ مظلوم مسلمانوں کا کوئی سرپرست نہیں ہے اس لیے دل کھول کر وحشت اور درندگی کے ہولناک منظر دکھاتا ہے۔ وہ مسلمانوں کی جائدادیں ضبط کرلیتا ہے اور ان کے کھیت اجاڑ دیتا ہے۔ اب مسلمانوں کے بیس گاؤں اس کے ہاتھ میں ہیں۔ وہ ان کو اپنی ذاتی جائداد بنانا چاہتا ہے۔ وہ مسلمان کسانوں کے کاروبار میں مزاحم ہوتا ہے اور ان کو اپنے گاؤں کے اندر آنے نہیں دیتا۔ صوبہ کانسو کے دیگر حکام یانگ چی ٹنگ کی قوت سے ڈرتے ہیں اور اس کے خلاف کچھ نہیں کرتے ......"

"...... مانچو کے زمانے سے لے کر آج تک شمال مغربی چین میں مسلموں اور غیر مسلموں کے درمیان بسا اوقات کشمکش رہتی ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ ان میں کوئی مذہبی اختلاف یا نسلی جذبہ ہے، بلکہ یہ ہے کہ بعض سرکش افراد کانسو میں اپنی قوت جمانا چاہتے ہیں اور اس غرض کو حاصل کرنے کے لئے وہ برابر مسلمانوں کو تنگ کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر خوں ریزی تک نوبت پہنچتی ہے۔ یہ بات جمہوریہ چین سے مخفی نہیں کہ اس وقت ملک کے چاروں طرف عجیب عجیب واقعات رونما ہوئے ہیں۔ منگولیا اور تبت میں امن و امان نہیں ہے۔ مانچو نے منچوریا میں جاپان کے زیر سایہ اپنی حکومت قائم کرلی ہے۔ اب صرف مسلمان حکومت چین کے وفادار اور خیر خواہ رہ گئے ہیں اور وہ حتی الامکان اس کی مدد کرتے ہیں۔ لیکن یہ سرکش یانگ چی ٹنگ مسلمانوں سے ہم وطنوں کا سا سلوک نہیں کرتا بلکہ ان کے مٹانے کی فکر میں ہے۔ مسلمانوں پر بار بار حملہ کرنا، ان کی جائداد کو لوٹنا، انھیں خانماں برباد کرکے چھوڑ دینا اس کی وحشت اور درندگی کے جذبے کو پورا نہ کرسکا۔ اب اس نے مسلمانوں کا نام و نشان تک مٹانے کا تہیہ کرلیا ہے چنانچہ "شین یاؤ" (Shen nao) میں اس نے ایک بڑا جلسہ کرایا،

جس میں یہ تجویز پیش کی گئی کہ مسلمانوں کا خاتمہ کر دیا جائے۔ تین چار سال سے وہاں
کے مسلموں اور غیر مسلموں میں جو اختلافات چلے آ رہے ہیں یہ اس سرکش کے پیدا کیے
ہوئے ہیں۔ اگر حکومت اس کے انسداد کے لئے کوئی عملی تدبیر اختیار نہیں کرتی تو
ہمیں اندیشہ ہے کہ یہ معاملہ اور تشویش ناک صورت اختیار کرے گا جس سے ایک ایسی
آگ بھڑک اٹھے گی جس کا بجھانا ناممکن ہو گا۔ چینی مسلمان یانگ چی ٹنگ کے خلاف
پر زور احتجاج کرتے ہیں اور حکومت سے یہ جائز مطالبہ کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے ساتھ
انصاف کیا جائے اور اس فتنہ و فساد کے بانی کی سرکوبی کی جائے......"

مندرجہ بالا بیان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شمال مغرب میں کئی سال سے بے چینی ہے اور
مسلموں اور غیر مسلموں میں نزاع چلی آ رہی ہے۔ یہ تو یقین ہے کہ ابھی تک یہ لڑائی کسی مذہبی جنون یا رنگ اور
نسل کے خیال پر مبنی نہیں ہے بلکہ صرف چند ہوس پرستوں اور عیش پرستوں کی ذات سے ہے لیکن اگر اس
واقعے نے طول کھینچا تو اس کا اندیشہ ضرور ہے کہ مسلمان اور غیر مسلمان ایک دوسرے کے مقابلے میں صف آرا
ہوں گے۔ یہ ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ یہ سب واقعات حکومت چین سے بہت کم تعلق رکھتے ہیں۔ حکومت چین
اور مسلمانوں میں کوئی مخالفت نہیں ہے اور نہ عام چینیوں اور مسلمانوں میں کوئی جھگڑا ہے۔ یہ اختلاف بعض
مقامات اور بعض افراد تک محدود ہے۔ یین نان کے واقعے میں بعض غیر مسلمانوں نے بھی مسلمانوں کا ساتھ دیا
ہے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ مسلمان حق بجانب ہیں۔ اس وقت سن کیانگ سے جس شورش کی خبر آئی ہے اس کی
نوعیت اسی قسم کی ہے۔ شورش کی خبر اور فوری سبب میں پہلے بیان کر چکا ہوں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس
صوبے میں بیرونی اثرات کہاں تک ہیں۔

روس اور سن کیانگ | چین کو چھوڑ کر سن کیانگ میں اس وقت تین قوتوں کا اثر موجود ہے یعنی جاپان،
روس اور برطانیہ۔ دنیا یہ جانتی ہے کہ روس اور برطانیہ نے عرصے سے وہاں اپنا اپنا اثر قائم کر رکھا ہے
لیکن یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ حال میں جاپان کی توجہ بھی سن کیانگ کی طرف ہو گئی ہے۔ تینوں کے
اثرات کی نوعیت مختلف ہے۔ روس کا اثر زیادہ تر معاشی ہے، جاپان کا تعلیمی اور برطانیہ کا سیاسی۔

سن کیانگ کا رقبہ بہت وسیع اور وہاں کی آبادی بہت کم ہے۔ سوائے کوہستانی اور ریگستانی علاقوں کے زمین ہر جگہ زرخیز اور قابل کاشت ہے اور معدنی دولت سے مالا مال ہے۔ سونا، چاندی، تیل کے چشمے، کوئلے اور دوسری چیزوں کی کانیں بکثرت ہیں۔ پھر یہ کہ دیسی صنعت بالکل ابتدائی منزل میں ہے۔ بیرونی مصنوعات کے لیے اس سے بہتر منڈی اور بازار کہیں نہیں ملے گا۔ ان باتوں کی بنا پر ملک گیری کی ہوس رکھنے والوں اور سرمایہ داروں کی آنکھیں اس خطے پر لگی ہوئی ہیں اور مختلف قومیں مختلف تدبیریں کر رہی ہیں کہ اپنا اثر بیاں جمائیں۔ سن کیانگ اب صرف چین اور چینی ترکستان کے مسلمانوں کا مسئلہ نہیں رہا ہے بلکہ بین الاقوامی مسئلہ بن گیا ہے۔ کچھ سیاسی وجوہ سے اور کچھ معاشی وجوہ سے وسط ایشیا میں اگر کوئی جگہ سیاسی گھوڑوں کے دوڑانے کا میدان بن سکتی ہے تو یہی چینی ترکستان ہے۔

روس نے قریب ہونے کی وجہ سے پہلے تو بیرونی منگولیا پر اپنا اقتدار جما رکھا ہے اور اپنے زیر سایہ ایک خود مختار منگولی ریاست قائم کر لی ہے۔ اب اس کی توجہ سن کیانگ کی طرف ہے۔ سن کیانگ میں روسی مداخلت معاہدہ ایلی سے (۱۸۸۱ء) شروع ہوئی۔ معاشی میدان پورا اس کے قبضے میں ہے بلکہ اس کے تعلیمی اثرات بھی چین کی بہ نسبت کہیں زیادہ ہیں۔ یانگ چین شین نے اپنے زمانے میں روسی اثر کو روکنے کی کوشش کی۔ اس نے تاجروں کو منع کر دیا تھا کہ سرکاری ایجنٹوں کے واسطے کے بغیر روس کے ساتھ کاروبار نہ کرنا چاہیئے۔ مال کی درآمد برآمد صوبجاتی حکومت کی نگرانی میں تھی۔ مال کی قیمت اور مقدار کو حکومت نے کم و بیش محدود کر رکھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے اپنے زمانے میں روسی مصنوعات کے سیلاب کو ایک حد تک روکے رکھا۔ ۱۹۲۹ء کے بعد چن شوزن گورنر ہوا تو اس نے اس بندش کو اٹھا دیا۔ غالباً اس کا ارادہ تھا کہ بالشویکی اصول پر سن کیانگ کی معیشت کی تکمیل کرے اور ممکن ہے اسی غرض سے اس نے روسیوں کو اپنی فوج میں داخل کیا ہو جو بعد میں موجودہ شورش کا ایک سبب ثابت ہوا۔

سن کیانگ کی تجارت اور صنعت میں روس کا بڑا دخل ہے اور بازار زر قریب قریب پورا روس کے ہاتھ میں ہے۔ معاہدہ ایلی (۱۸۸۱ء) کی رو سے روسیوں کو سن کیانگ میں رہنے، کاروبار کرنے اور زمین جوتنے کے حقوق حاصل ہیں۔ ان دنوں سائبیریا۔ روسی ترکستان ریلوے کی تکمیل ہونے سے وہاں کی آمد

رفت اور زیادہ ہوگئی ہے۔ روسیوں نے اپنی تجارت کو سن کیانگ میں فروغ دینے کے لیے شہر غولجہ اور تاچن کو مرکز بنایا ہے۔ جہاں سے مال کی درآمد و برآمد ہوتی ہے۔ سن کیانگ میں زرعی پیداوار بہت کافی ہے جن میں سے چاول، روئی، گیہوں، انگور اور دوسرے میوے قابل ذکر ہیں۔ ان کا تقریباً ایک ثلث روس جاتا ہے۔ باقی چیزیں جو روس کو جاتی ہیں وہ کاشغر کا ریشم اور قالین، ارومچی اور طرفان کے مویشی، ان کی پشم اور کھالیں ہیں۔ ان چیزوں کے عوض میں روس اپنے جوتے، پیتل کے برتن، لوہے کا سامان، سوتی کپڑا وغیرہ چینی ترکستان میں لا کر نہایت سستے داموں پر بیچتا ہے۔ انگریزی تجارت کو روسی مقابلے کی وجہ سے بہت نقصان ہو رہا ہے۔ مجموعی لحاظ سے روس کی تجارت سن کیانگ میں ۶۵ ہے اور انگریزی ۲۸، چینی و جاپانی ۷۔ روس نے چینی ترکستان کو اپنی منڈی بنانے کے لیے مختلف تدبیریں اختیار کی ہیں۔ ان میں سے ایک تدبیر یہ ہے کہ انھوں نے گورنر چن شو زان کے ساتھ ایک خفیہ تجارتی معاہدہ کیا[1] جس کی بنا پر دریائے املیش کے کنارے چار شہروں کو روسی تجارتی بندرگاہ بنایا گیا، تجارت کی آمد و رفت میں روسیوں کو آزادی دی گئی، چنگی کے متعلق روسی مال کے لیے خاص رعایت کی گئی اور تمام بڑے بڑے شہروں میں روس کو اپنے ایجنٹ قائم کرنے کی اجازت دی گئی۔ روسی مصنوعات کے کثرت سے آنے کی وجہ سے تھوڑی بہت دیسی صنعت تھی وہ بالکل تباہ ہوگئی اور اس تجارتی تسلط کے ساتھ روس نے اپنے بنکوں سے نوٹ جاری کیے جو اس وقت سارے سن کیانگ میں چلتے ہیں۔

انگریز اور سن کیانگ ہم نے ذکر کیا تھا کہ سن کیانگ میں روسی اثر معاشی ہے۔ اب ہم انگریزوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اگرچہ مغربی سن کیانگ میں انگریزوں کی تجارت بھی کافی ہے لیکن وہ روس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس وقت انگریزوں نے وہاں جو اثر قائم کیا ہے وہ سیاسی ہے موجودہ شورش میں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ انگریزوں کا ہاتھ ہے۔ خواہ واقعۃً انگریزوں کا ہاتھ نہ ہو مگر اس کی طرف شبہ کیا

---

(1) Current Events, Nanking Volume VIII, No. 6, page 246.

جاسکتا ہے چنانچہ 'چائنا ویکلی ریویو' شنگھائی نے اپنی اشاعت مورخہ ۵ مئی میں ایک مضمون کے سلسلے میں یوں بیان کیا ہے کہ مسلمانوں کے پاس جو آلات حرب ہیں وہ برطانوی کارخانوں کے ہیں اور یہ بھی بیان کیا ہے کہ حکومت ہند کے حکام نے علمی تحقیقات کے بہانے سے ایک تحقیقاتی مہم روانہ کیا تھا جس کا مقصد مقامی لوگوں میں چین کے خلاف سازش پھیلانا تھا۔

السلام پیکین اپنی اشاعت (جلد چہارم نمبر ۰ صفحہ ۱۵) ۱۵ اپریل ۱۹۲۳ء میں یوں لکھتا ہے:۔

"سن کیانگ ایک بین الاقوامی تنازع کی جگہ ہے۔ اب زیادہ خطرہ ہے کہ یہ کسی نہ کسی وقت چین کے ہاتھ سے نکل جائے گا کیونکہ یہ روس اور برطانوی ہند دونوں کے سیاسی گھوڑے دوڑانے کی جگہ ہے۔ یہ ایک طرف روسی ترکستان کے ساتھ ملا ہوا ہے اور روس نے اب سائبیریا روس ترکستان ریلوے کو مکمل کر دیا ہے۔ دوسری طرف یہ افغانستان کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ افغانستان اور ہندوستان انگریزوں کے زیر اثر ہیں۔ چونکہ سن کیانگ کے مسلمانوں کا رسم و رواج، مذہب اور طرز معاشرت ان مسلمانوں سے ملتا جلتا ہے جو پامیر کے اس پار ہیں اور ان میں دینی اتحاد ہے۔ اس لئے انگریز ان مسلمانوں کی جہالت سے فائدہ اٹھا کر پان اسلامزم کا ڈنکا بجاتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ افغانستان اور ہندوستان کے ساتھ مل جاؤ۔"

شنگھائی کا ایک اور مشہور ماہوار رسالہ Shun Pao Monthly جلد دوم نمبر ۲ میں لکھتا ہے:۔

"سن کیانگ کی شورش کے متعلق جنوری میں ایک خبر استنبول سے موصول ہوئی تھی کہ ملک گیری کی ہوس رکھنے والے اس موقع کو غنیمت سمجھ کر یہ کوشش کر رہے ہیں کہ سن کیانگ میں ایک اسلامی ریاست قائم کی جائے جو روس اور برطانوی ہند کے درمیان ایک روک کا کام دے سکے۔ گویا وہ شورش برطانوی ہند سے تعلق رکھتی ہے۔ ایک مستعفی انگریزی افسر جو عرصہ ہندوستان اور سنگاپور کے محکمۂ نو آبادیات میں بھی رہ چکا ہے علمی تحقیق کے نام سے کئی مرتبہ سن کیانگ گیا ہے اور وہاں کی سیاسی حالات کا

مطالعہ کرتا رہا ہے ......"

مندرجہ بالا بیانات خواہ افواہ ہوں خواہ حقیقت لیکن کوئی شخص اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ حکومت برطانیہ کی خواہش ہے کہ سن کیانگ میں ایک ایسی اسلامی ریاست قائم کی جائے جو مزدوری اور ملوکی حکومت کے درمیان ایک سد سکندری کا کام دے سکے۔ روس اور برطانیہ کے درمیان سن کیانگ میں علاوہ سیاسی کشمکش کے تجارتی کشمکش بھی ہے۔ یہ کشمکش زار کے زمانے سے شروع ہوئی تھی۔ کاشغر اور خولجہ میں روسی سفیر مقرر ہو جانا اس بات کا ثبوت تھا کہ روس دل ہی دل میں یہ تدبیر سوچ رہا ہے کہ سن کیانگ کو اپنی ہی منڈی بنائے چنانچہ جب برطانیہ نے اپنا سفیر وہاں بھیجا تو روسی سفیر نے قنصل برطانیہ کے خلاف سخت پروپگنڈا کیا لیکن چینی گورنر جنرل کی اجازت سے آخر برطانوی قنصل خانہ وہاں قائم ہو گیا اور وہاں کے لوگوں کے ساتھ تجارت کرنی شروع کی۔ اس پندرہ بیس سال کے اندر برطانیہ کا تجارتی اثر اس قدر بڑھ گیا کہ یہ ملک روس کا جانی دشمن ہو گیا۔ روس نے برطانوی تجارت کو شکست دینے کے لئے سائبیریا۔ روسی ترکستان ریلوے تعمیر کی جس کی وجہ سے روس اور چینی ترکستان کے درمیان آمد و رفت آسان ہو گئی اور نقل و حمل کی دشواری سے ایک دو سال سے برطانوی تجارت بہت کم ہو گئی چنانچہ برطانوی قنصل متعینہ کاشغر کی رپورٹ سے جو ۲۰ اکتوبر ۱۹۳۲ء میں اسٹیٹسمین (کلکتہ) میں شائع کی گئی تھی۔ پتہ چلتا ہے کہ گذشتہ سال میں برطانوی تجارت میں چار لاکھ روپیہ کی کمی ہو گئی۔ رپورٹ تین وجوہ بتاتی ہے ایک تو ہند اور کاشغر کے درمیان کے نقل و حمل کی دشواری، دوسرے روسی مال کا مقابلہ، تیسرے شرح مبادلہ کا گرنا لیکن جس چیز نے برطانوی تجارت کو زیادہ نقصان پہنچایا ہے وہ روسی مقابلہ ہے۔ چنانچہ رپورٹ ہذا میں آگے چل کر لکھا گیا ہے:

" روسی مقابلہ یورپی مصنوعات کے لئے بڑی مصیبت ہے کیونکہ روسی مال بہت ارزاں فروخت کیا جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ روس کی روش کچھ عرصے تک جاری رہے گی۔ دواؤں، سوت، رنگ، مسالے، اونی اور سوتی مال اور سگریٹ میں روسی مقابلہ زیادہ اور سخت ہے ......"

چین میں شرح مبادلہ کا گرنا برطانوی تجارت کے زوال کا سبب نہیں ہے۔ اصلی سبب یہ ہے کہ وہاں کا بازار زر روس کے ہاتھ میں ہے۔ ارومچی، طرفان، خولجہ اور کاشغر میں روسی بنک ہیں۔ زر کا

مبادلہ عموماً ان بنکوں کے ذریعے سے ہوتا ہے۔ دوسرا اہم سبب آمد و رفت کی دشواری ہے۔ کاشغر اور ہند کے درمیان کوہستانی علاقہ ہے، ریلوے اور موٹر سروس قائم نہیں ہے، صرف گدھے اور خچر سے راستہ طے کیا جا سکتا ہے آنے جانے میں مہینوں لگ جاتے ہیں۔ مزید برآں برطانوی مال کا سرمایہ زیادہ ہے اور بار برداری کے سارے اخراجات لگا کر برطانوی مال سن کیانگ پہنچ کر کہیں زیادہ گراں ہو جاتا ہے۔ برطانوی ہند عرصے سے اس دشواری کو محسوس کر رہا ہے کہ ریلوے بالفعل تعمیر نہیں ہو سکتی۔ موٹر سروس قائم کیا جانا بھی مشکل ہے۔ ہوا کے راستے سے کام لینا نسبتاً زیادہ آسان ہے۔ چنانچہ گزشتہ سال موسم گرما میں شملہ کے ایئر کلب (Air Club) کا ایک تفریحی مہم پر تحقیق کرنے کے لئے گلگت گیا تھا کہ آیا ہندوستان اور کاشغر کے درمیان ہوائی راستے کا انتظام ہو سکتا ہے یا نہیں۔ ہم عنقریب سنیں گے کہ برطانوی ہند، کاشغر اور ہند کے درمیان ہوائی راستہ قائم کر کے روسی مفاد کو شکست دی گئی۔

برطانیہ نہ صرف یہ چاہتا ہے کہ چینی ترکستان میں اپنے سیاسی گھوڑے دوڑائے اور وہاں کی منڈی پر قابض ہو جائے بلکہ اس نے اندرونی انتظامات میں بھی ہاتھ ڈالنا شروع کیا ہے۔ برطانوی قنصل خانے کے قائم ہونے کے بعد سب سے پہلا کام انگریزوں نے یہ کیا کہ کاشغر میں اپنا ڈاک خانہ قائم کیا جس سے نہ صرف سرکاری ڈاک بھیجی جاتی ہے بلکہ عام لوگوں کی بھی۔ چنانچہ کاشغر سے جو خطوط ہندوستان کی طرف آتے ہیں ان پر گورنمنٹ آف انڈیا کے ٹکٹ لگے ہوتے ہیں حالانکہ کاشغر چین کے ماتحت ہے اور مراسلات پر حکومت چین کے ٹکٹ لگنے چاہئیں تھے۔ بالفعل خط و کتابت کا سلسلہ بند ہے اور جو کچھ خبر ہندوستان کو آتی ہے وہ برطانوی قنصل کی لاسلکی سے شملہ آتی ہے اور بعض تاجر جو چینی ترکستان سے سرحد یا پشاور میں پہنچتے ہیں، اخبارات کو اپنے خیال کے مطابق بیان دیتے ہیں جس میں مبالغہ بہت زیادہ ہوتا ہے، صورت حال پر روشنی نہیں پڑتی۔ برطانوی ہند دوسرا کام یہ کرنا چاہتا ہے (اب زیر غور ہے) کہ کسی مسلمان کو برطانوی قنصل جنرل متعینہ کاشغر بنایا جائے جو حکومت برطانیہ کا خیر خواہ ہو تاکہ وہاں جا کر وہاں کے جاہل متعصب اور جامد مسلمانوں کو اپنے ساتھ ملائے اور ان کو حکومت برطانیہ کے زیر اثر لانے کی کوشش کرے۔

جاپان اور سن کیانگ | روس اور برطانیہ کی دیکھا دیکھی جاپان کو بھی جوش آ گیا۔ اس کی دلی تمنا ہے

کہ چونکہ سن کیانگ اقلیم ایشیا میں ہے، لہذا ایشیائیوں کے ہاتھ میں رہنا چاہئے۔ جاپان کی بڑھتی ہوئی آبادی اور دست کاری کی ترقی اور مصنوعات کی زیادتی یہ سب باتیں جاپان کو مجبور کرتی ہیں کہ منچوریا کے علاوہ کوئی اور ملک دریافت کرے اور نئی منڈیاں تلاش کرے۔ جاپان کی منچوریا و منگولیا کی پالیسی دنیا میں مشہور ہے۔ منچوریا تو اس کے قبضے میں چلا گیا اور اندرونی منگولیا اس کے زیر اثر ہے۔ اندرونی منگولیا اور سن کیانگ ساتھ ساتھ ملا ہوا ہے۔ وہاں اپنا اثر جمانے کے بعد اس کی توجہ لامحالہ سن کیانگ کی طرف ہوگی۔ اہل جاپان آج کل بڑے سمجھ دار اور مدبر بن گئے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ سن کیانگ میں بالفعل ان کا سیاسی اقتدار نہیں ہو سکتا اور معاشی میدان میں روس اور برطانیہ دونوں کا مقابلہ کرنا بھی اس کے لئے مشکل ہے۔ اس لئے جاپان نے اس وقت سن کیانگ کے متعلق سیاسی اور معاشی تدبیر سے بہتر ایک اور پالیسی اختیار کی جو بعد میں مسلمانان سن کیانگ اور اہل جاپان کے لئے ضرور مفید ثابت ہوگی۔ تدبیر یہ ہے کہ حکومت[1] جاپان نے ایسے سرمایہ سے سن کیانگ میں مختلف قسم کے اخبار جاری کئے ہیں جن سے صرف پروپگنڈا مقصود ہے اور دوسری طرف حکومت جاپان یہ کوشش کر رہی ہے کہ سن کیانگ سے جتنے زیادہ مسلم طلبہ کو جاپان میں بلا سکے بلائے۔ اس غرض سے ٹوکیو میں حکومت جاپان نے ایک جامع مسجد تعمیر کی ہے۔ "الصراط المستقیم" پیکن لکھتا ہے کہ شاہ جاپان نے کچھ جاپانیوں کو اسلام کو قبول کرنے کی اجازت دی ہے، تاکہ جاپانی نومسلموں کے ذریعے سے اسلامی دنیا کو اپنے ساتھ ملالیں۔ اسلامی رسم و رواج اور اسلامی زبان یعنی عربی سے شغف پیدا کرنے کی کوشش بعض جاپانی نومسلموں نے بھی کی ہے۔ ایک جاپانی[2] طالب علم جامعہ ازہر میں دو سال تک رہا، پھر ممالک اسلامیہ کے حالات کا مطالعہ کرنے کی غرض سے شام سے ہوتا ہوا عراق آیا اور پھر ایران میں پہنچا لیکن اپنی آرزو پوری نہ کر سکا اور تپ میعادی میں مبتلا ہو کر انتقال کر گیا۔ جاپان کے پایۂ تخت میں اس وقت اسلامی مدرسے کا انتظام ہے اور

---

[1] الصراط المستقیم پیکن، جلد سوم نمبر ۶، بابت ماہ جون ۱۹۳۳ء

[2] الفتح قاہرہ، جلد ہفتم عدد ۳۴۷ صفحہ ۱۳۔

حکومت جاپان نے سن کیانگ سے ۵ ۱ مسلم طلبہ اپنے ہاں بلائے ہیں اور ان کو جدید تعلیم دی جا رہی ہے۔[1]
جاپان کی یہ تعلیمی پالیسی اگر دس پانچ سال تک جاری رہی تو سن کیانگ کے مسلمان ضرور اس کی طرف مائل ہو جائیں گے بشرطیکہ جاپان کوئی ایسا قدم نہ اٹھائے جو اسلامی اصول کے منافی ہو کیونکہ چینی ترکستان کے مسلمان ایک طرف تو روسی اشتراکیت سے تنگ آ گئے ہیں اور دوسری طرف موجودہ چینی گورنر سے خفا ہیں اور بہت ممکن ہے کہ مستقبل قریب میں چینی ترکستان کے مسلمان اپنے اقتصادی اور معاشی حقوق جاپان کے سپرد کر دیں۔ یہ صورت اگر پیدا ہو جائے تو یہ مسلمانوں کے لئے مفید ہو گی یا مضر بالفعل ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ آیندہ کے واقعات ہمیں بتلا دیں گے۔

صورت حال | معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ شورش فروری کے آخر میں شروع ہوئی۔ چینی رسالے کا بیان ہے کہ ماچونگ این نے سب سے پہلے اس جہاد کا علم اٹھایا یعنی حامی کے مسلمانوں کی حمایت کے واسطے خروج کیا۔ ایک تو اس وجہ سے کہ چن شوزن نے حامی کے مسلمانوں کی جاگیر کے ضبط کرنے کا حکم دیا تھا اور دوسرے اس وجہ سے کہ اس نے لین تان میں ۱۹۲۹ء یانگ چی ژنگ سے شکست کھائی تھی۔ یانگ چی ژنگ یقیناً یانگ چن شین سابق گورنر سن کیانگ کے خاندان سے تعلق رکھتا ہے، یانگ چن شین کے مقتول ہونے کے بعد چن شوزن گورنر ہوا۔ چن شوزن ماتو شین کے قتل میں شریک تھا۔ ماتوشین یانگ چن شین کا سکریٹری تھا اور یہ ماچونگ این کے خاندان سے تھا۔ اس نے جب دیکھا کہ چن شوزن یعنی موجودہ گورنر جس کا ہاتھ مسلمانوں کے خون سے آلودہ ہو چکا تھا مسلمانوں پر ظلم کر رہا ہے تو اس نے حامی پر حملہ کر دیا۔

چینی مسلم اخبار اور غیر مسلم اخبارات نے اس خبر کی سخت تردید کی ہے کہ یہ مسلم و غیر مسلم سوال ہے اور اس بات سے انکار کیا ہے کہ موجودہ شورش حکومت کے خلاف برپا کی گئی ہے۔ یہ چن شوزن کی ذات کے خلاف برپا کی گئی ہے۔ حاجی محمد یوسف نے جو فرانسیسی بستی کی مسجد کے امام ہیں الصراط المستقیم

---

[1] الصراط المستقیم پیکن، جلد سوم، نمبر ۶ بابتہ ماہ جون ۱۹۳۳ء۔

کی جون کی اشاعت میں ایک بیان دیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے:۔

"بیرونی لوگوں میں یہ خبر مشہور ہے کہ سن کیانگ میں مسلموں و غیر مسلموں میں فساد ہو گیا۔ یہ غلط ہے کیونکہ کئی صدیوں سے مسلم و غیر مسلم بھائیوں کی طرح رہتے ہیں مسلمان غیر مسلموں کے ساتھ معاملہ کرتے ہیں، خرید و فروخت کرتے ہیں، ان میں کامل اتحاد ہے، نفاق کا نام بھی نہیں۔ اس شورش کا سبب کچھ اور ہے یعنی ما فوشین کا قتل"[1]

غیر مسلم رسالوں میں بھی یہی خیال نظر آتا ہے۔ چنانچہ رسالہ 'واقعات رواں'[2] نانکینگ اپنی جولائی کی اشاعت میں لکھتا ہے۔

"سن کیانگ کی شورش کے متعلق باہر کے اخبارات میں یہ شور مچ رہا ہے کہ یہ مسلم و غیر مسلم کی لڑائی ہے۔ یہ سفید جھوٹ ہے۔ سن کیانگ میں اگرچہ مسلمان بستے ہیں اور ان کے ساتھ غیر مسلم چینی بھی رہتے ہیں لیکن اب ایک دوسرے سے گھل مل گئے ہیں۔ موجودہ شورش چن شوزن کی ذات کے خلاف برپا کی گئی ہے کیونکہ اس نے مسلمانوں پر سخت ظلم کئے اور ما فوشین کا خون بھی اس کی گردن پر تھا۔ ما فوشین مسلمانوں میں بہت ہر دلعزیز تھا۔ اسے یاد کر کے سن کیانگ کے مسلمان روتے تھے۔۔۔"

جب ہم حکومت نانکینگ کا اعلان پڑھتے ہیں تو یہی خیال اس میں پاتے ہیں۔ چنانچہ اس اعلان میں حکومت کہتی ہے

"قومی مساوات اور مذہبی آزادی ہماری[3] جماعت کا سیاسی عقیدہ ہے اور

---

[1] الصراط المستقیم پیکن جون ۱۹۳۳ء

[2] Current Events, Nanking Volume VIII, No. 6, Page 245.

[3] Kero mintang (قومی جماعت)

دستور حکومت نے اس عقیدہ کو اپنے بنیادی اصول میں داخل کیا ہے۔ باشندگان سرحد کے
معاملے میں حکومت برابر عدل اور انصاف سے کام لیتی ہے۔ صوبہ سن کیانگ مغربی حصہ
پر واقع ہے۔ آمد و رفت کی دشواری اور دوری کی وجہ سے مرکزی حکومت کا اثر وہاں
مشکل سے پہنچ سکتا ہے اور وہاں کے امور بالکل گورنر کے ہاتھ میں چھوڑ دیئے گئے ہیں۔
معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ گورنر چن شوزن نے اپنے عہدے پر مامور ہونے کے بعد عوام کی رائے
کا احترام نہیں کیا' اور نہ اس نے ان کے مفاد کے لئے کچھ کیا بلکہ اس نے صرف ذاتی قوت اور دولت حاصل
کرنے کی کوشش کی۔ یہ حرکت یقیناً مرکزی حکومت کی حکمت عملی کے منافی اور دستور جمہوریت چین کے مخالف
ہے۔ اس نے اپنی فوج میں سفید روسیوں کو داخل کرنے سے مسلمانوں کو بہت تکلیف دی جس کی وجہ سے
مسلمان اس کے خلاف ہو گئے۔ اب چن شوزن برطرف کر دیا گیا ہے' سفید روسی فوج بھی برخاست کر دی
جائے گی۔ سن کیانگ کی گورنری کے لئے دوسرا قابل اور لائق آدمی مقرر کر دیا جائے گا۔ بالفعل وانگ
موسونگ کو اس واسطے روانہ کیا جاتا ہے تاکہ سن کیانگ کے حالات کی تحقیق کی جائے۔ مسلمانوں کو جو شکایات
ہوں وہ دور ہو جائیں۔ مرکزی حکومت مسلمانوں کے جذبات کا احترام کرے گی اور ہر معاملہ حکومت نانکینگ کے
پاس نمائندے بھیج کر طے ہو سکتا ہے۔[له]

رسالہ 'واقعات رواں' نانکینگ آخر میں لکھتا ہے کہ چن شوزن کے برطرف کرنے اور سفید روسیوں کو
برخاست کرنے کے بعد وہاں سکون ہو گیا اور بعد میں کسی قسم کی شورش کی خبر نہیں آئی لیکن ادھر کشمیر کی طرف
سے جو خطوط کاشغری صاحب کے پاس آئے ہیں ان میں بیان کیا گیا ہے کہ کاشغر میں اسلامی حکومت قائم
ہو گئی ہے اور طرفان سے لے کر ختن تک مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے۔ یہ خطوط تاجروں کے پاس سے آئے
ہیں جو دو مہینے سے اپنا ملک چھوڑے ہوئے تھے۔ یہ ظاہر ہے کہ جو کچھ ان خطوط میں بیان کیا گیا ہے وہ

له Current Events, Nanking, Volume VIII, No. 6, page 246.

میں شورش کے وقت کے حالات ہیں۔ ان حالات کا شملے کی اطلاع سے مقابلہ کیا جائے جو ۱۶ جون ۱۹۳۳ء کے ٹائمز آف انڈیا میں شائع ہوئی تھی تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ صوبہ سن کیانگ اب تک چین سے علیحدہ نہیں ہوا ہے مسلمانوں نے جن علاقوں پر قبضہ کر لیا ہے اور جن میں انھوں نے اپنا اقتدار قائم کیا ہے وہ صرف سن کیانگ[۵۱] کا نصف حصہ ہے اور سن کیانگ کا شمالی حصہ مع اورمچی چینی حکام کے ہاتھ میں ہے۔ چونکہ اس صوبے کے مستقبل کے متعلق ہم کو بھی کچھ بیان کرنا ہے ہم یہاں شملے کی اطلاع مورخہ ۱۴ جون ۱۹۳۳ء کا ترجمہ درج کر دیتے ہیں تاکہ سن کیانگ کی تصویر قارئین کے سامنے آ جائے۔ وھو ہذا:-

۱۴ جون ۱۹۳۳ء شملہ

کاشغر کی آخری خبر مورخہ ۲۵ مئی سے ظاہر ہوتا ہے کہ باغی سرداروں کے درمیان ایک عارضی صلح نامہ ۱۹ مئی کو ہو گیا تھا اور بالفعل چینیوں اور اور دومغانیوں پر حملہ روک دیا گیا۔ تاہم مقامی حالت ابتک ناقابل اطمینان ہے۔

آستو کے ترکی سردار نے مقامی کمانڈر انچیف سے چارج لے لیا ہے۔ قرغزی سردار عثمان علی جنرل ہو گیا ہے۔ ٹوین (مقامی حاکم) نے اپنا دفتر (یامن) شہر کے باہر منتقل کر دیا ہے اور دومغانی سردار ما جان شانگ ترکی تیموری فوجوں کی اکثریت کے ساتھ کاشغر جدید میں ہے۔ ما جان شنگ نے سو جن شو کو اپنے جنرل اسٹاف کا رئیس مقرر کیا ہے اور ٹوین (مقامی حاکم) کے فرائض کو انجام دینے کے لئے اس نے یونس بیگ کو شریک کر لیا ہے۔

یارقند کے فتح ہونے کے متعلق پہلے جو خبر آئی تھی وہ غلط ہے۔ شہر کو حوالہ کر دینے کا انتظام تو ہو گیا تھا لیکن دومغانیوں کی امدادی فوج کے آنے سے یہ انتظام درہم برہم ہو گیا اور لڑائی پھر شروع ہو گئی......" (۱۶ جون ۱۹۳۳ء ٹائمز آف انڈیا)

---

[۵۱] دیکھو نقشہ

اس کے علاوہ لندن ٹائمز نے بھی اس واقعے کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ ٹائمز آف انڈیا اسٹیٹسمین وغیرہ نے اپنی اشاعت مورخہ ۲۲ جولائی ۱۹۳۳ء میں ان تفصیلات کو نقل کیا ہے:۔

"جو تفصیلات شہر کاشغر پر قبضہ ہونے کے متعلق موصول ہوئی ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرغز کی بہت سی فوج آرتوش سے آئی۔ ۱۴ مئی کو دریا کو پار کرکے پرانے شہر پر حملہ آور ہوئی اور ٹوشک دروازے سے داخل ہوگئی اور چینی دیوار کو چھوڑ کر ٹوپن (مقامی حاکم) کے دفتر میں جمع ہوئی جو ایک کچی اینٹ کی عمارت ہے۔ شہر پر قابض ہونے کے بعد قرغزیوں نے پہلے لوٹ مار کو منع کر دیا تھا۔ لیکن دوسرے دن تقریباً ایک سو چینی مارے گئے اور ان کا مال لوٹ لیا گیا۔ اسی روز دوپہر کو تیمور کے ماتحت تین سو ترک آئے ہیں اور قرغزیوں نے ان کو شہر کے اندر داخل ہونے کی اجازت دی۔ ٹوپن (مقامی حاکم) نے جو اپنے دفتر میں مقید تھا باغیوں کی شرائط کو قبول نہیں کیا۔ چینیوں کی بڑی تعداد نے جو شہر میں محصور تھی آقسو سے آئے ہوئے دو منگانیوں کی (۲۰ مئی) اطاعت قبول کر لی کیونکہ وہ یہ پسند نہیں کرتے تھے کہ قرغز ان پر قابض ہو جائیں۔"

اس کے بعد طوفان بے تمیزی برپا ہو گیا۔ چار ممتاز چینی ۲۱ مئی کو قتل کر دیئے گئے اور معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد باغیوں کے سردار روپیہ جمع کرنے اور آپس میں لڑنے میں مشغول ہو گئے۔ ۲۸ مئی کو تنازع نے تشویش ناک صورت اختیار کر لی یعنی دو منگانی سردار ماجان شانگ نے تیمور کو گرفتار کر لیا۔ قرغزوں نے جو عثمان علی کے تحت میں ہیں جنگی مظاہرہ کرکے تیمور کو چھڑایا اور دوسرے دن قرغز اور ترک دونوں نے مل کر دو منگانیوں کے اوپر حملہ کیا جن میں سے کچھ قتل ہوئے، کچھ گرفتار ہو گئے۔ یارقند میں بھی ابھی تک امن نہیں ہے۔ نئے شہر پر حملہ پھر شروع ہو گیا ہے......"

ان بیانات سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ شمالی سن کیانگ جس میں ارومچی، خولجہ، ایلی، تاچین، کیتائی، سولون وغیرہ مشہور شہر ہیں چینیوں کے تسلط میں ہے اور جنوبی سن کیانگ کے مشہور شہر آقسو، کچار کاشغر

یارقند اور ختن مسلمانوں کے ہاتھ میں ہیں۔ یہ مسلمان تین قبیلوں کے ہیں قرغز، ترک اور دومغان۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان میں آپس میں سخت اختلافات ہیں۔ قرغز اور ترک ایک طرف ہیں اور دومغان ایک طرف لیکن دومغان میں اکثر چینی اور تھوڑے بہت ترک موجود ہیں۔ کاشغر کے دو شہر ہیں ایک جدید دوسرا قدیم۔ قدیم شہر عثمان علی کے ہاتھ میں ہے اور جدید یا چان لٹانگ اور سوچن شوالغ ہیں یارقند جدید پر معلوم نہیں مسلمانوں نے قبضہ کر لیا ہے یا نہیں۔ آزاد اسلامی ریاست اس وقت تک قائم ہونا مشکل ہے جب تک دومغان اور قرغز دونوں متحد نہ ہو جائیں۔

سن کیانگ کا مستقبل سن کیانگ کی صورت حال آپ کے سامنے ہے۔ اب ہمیں اس پر غور کرنا ہے کہ اس کا مستقبل کیا ہوگا؟ اگرچہ اس وقت قطعی طور پر ہم سن کیانگ کی قسمت کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے لیکن اس کے ماضی اور حال اور ان واقعات کو مدنظر رکھتے ہوئے جو مسئلہ سن کیانگ سے گہرا تعلق رکھتے ہیں کچھ اندازہ ضرور کر سکتے ہیں کہ کیا صورت ممکن ہو سکتی ہے۔ قارئین ان باتوں کو اپنے سامنے رکھیں۔ جو جغرافی حیثیت واقعۂ لین ٹان اور بیرونی اثرات کے عنوانات کے ماتحت ہم نے بیان کی ہیں اور اس اختلاف کو نظر انداز نہ کریں جو دومغان اور قرغز کے درمیان موجود تھا اور ہے۔ ان کی یہ مخالفت کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ اس کی ابتدا غالباً یعقوب خاں کے بعد سے شروع ہوئی۔ قرغز، دومغان کو معمولی چینیوں سے بدتر سمجھتے ہیں اس بنا پر کہ ان پر چینی معاشرت کا اثر زیادہ ہے اور وہ چینیوں کے ساتھ معاملہ کرنے سے پرہیز نہیں کرتے ہیں۔ قرغز اور ترک دونوں میں ترکی رنگ گہرا ہے اور دومغان میں چینی رنگ۔ اگرچہ اس وقت دومغان، ترک اور قرغز سب نے مل کر گورنر چین شوزن کے خلاف شورش کی ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان میں اتحاد عمل یا اتحاد مقصد ممکن ہے۔ دومغانیوں کا مقصد چینی ترکستان پر اپنا تسلط جمانا ہے اور قرغز اور ترک افغانستان اور ہندوستان کے ساتھ ملنا چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس معاملے میں وہ حکومت برطانیہ کی امداد کے بغیر کچھ نہیں کر سکتے۔ اگر انگریزوں سے مدد لے کر اپنے آپ کو چین سے علیحدہ کرنا چاہیں تو دو صورتوں سے خالی نہیں یا تو وہ کامیاب ہوں گے یا ناکامیاب۔ اگر کامیاب ہوئے تو یقیناً چینی ترکستان کی سیاست میں انگریزوں کا اثر غالب ہوگا۔ ایسی حالت میں ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان کا برائے نام استقلال ان کے لیے مفید ثابت

ہوگا۔ 'آزادی' کا مفہوم ہم یہ نہیں سمجھتے کہ کوئی ملک ایک بیرونی حکومت سے علیحدہ ہوجائے اور دوسری بیرونی حکومت کے ماتحت رہے۔ چینی ترکستان میں انگریزوں کا قبضہ ہوجائے تو نہ صرف وہاں کے مسلمانوں کو پھر کبھی اٹھنے کا موقع نہیں ملے گا بلکہ افغانستان کو بھی خطرہ ہے کہ وہ اس کے آہنی پنجے میں اسیر نہ ہوجائے۔ یہ صورت نہ مسلمانوں کے لئے مفید ہوسکتی ہے اور نہ عالم اسلامی کے لئے۔

اور اگر قرغز اور ترک اس تحریک میں ناکام ہوئے یعنی 'کاشغریہ'[1] میں اپنی حکومت قائم نہ کرسکے یا ان کی قائم کی ہوئی حکومت ناپائدار ثابت ہوئی تو انھیں بہت سخت نقصان پہنچے گا۔ دنیائے اسلام غالباً یہ جانتی ہے۔ اس نے موجودہ شورش کے زمانے میں یہ جان لیا ہوگا کہ اس سے قبل یعقوب خاں نے کاشغریہ میں ایک مستقل حکومت قائم کی تھی جو ۱۳ سال تک رہی لیکن اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ ان دنوں کانسو اور شانسی کے مسلمانوں میں 'ماہوالونگ' کے زیر قیادت آزادی کی تحریک جاری تھی۔ اس نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور کاشغر میں اپنا اقتدار جمایا۔ اس کے متعلق عالم اسلامی کے سب سے بڑے زندہ مصنف علامہ شکیب ارسلاں اپنی کتاب میں یوں لکھتے ہیں: "اگر ماہوالونگ[2] نہ ہوتا تو یعقوب خاں کچھ نہ کرسکتا۔ اس نے جو کاشغر میں ۱۳ سال تک حکومت کی وہ ماہوالونگ کی تحریک کی بدولت تھی۔ لیکن ان تحریکوں کے نتیجے کے متعلق جو ۶۰ سال پہلے اس سرزمین میں اٹھی تھیں علامہ شکیب ارسلان فرماتے ہیں: "وہ بغاوتیں جن کا علم مسلمانوں نے گذشتہ صدی میں بلند کیا ان کے لیے بہت مضر ثابت ہوئیں۔ اس سے ان کی ترقی رک گئی۔ اگر یہ تحریکیں رونما نہ ہوتیں تو حکومت چین میں ان کی آواز بلند ہوتی[3]......"

اگر یہ سوال کیا جائے کہ "آیا چینی ترکستان میں دولت اسلامیہ قائم ہوسکتی ہے؟" تو میرا جواب اثبات میں ہے کیونکہ موجودہ چین کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اس کے خلاف بغاوت کرنا بہت آسان ہے اور اس میں

---

[1] کاشغریہ اس علاقے کو کہتے ہیں جو مغربی چینی ترکستان میں واقع ہے۔

[2] حاضر العالم اسلامی، الجزء الاول صفحہ ۱۰۸۔

[3] حاضر العالم اسلامی، الجزء الاول صفحہ ۱۰۸۔

کامیابی کا بھی امکان ہے۔ البتہ یہ یقین نہیں کہ یہ آزاد دولت اسلامیہ زیادہ دن چل سکتی ہے۔ آزاد دولت اسلامیہ سے میرا مطلب ایک ایسی اسلامی حکومت ہے جس میں مسلمان اپنے پاؤں پر کھڑے ہوں اور کسی غیر قوم کے ماتحت نہ رہیں، نہ وثنی چینیوں کے ماتحت، نہ بالشویکی روسیوں کے، اور نہ ملوکیت پسند انگریزوں کے۔
جب ہم چینی ترکستان کا نقشہ دیکھتے ہیں تو نظر آتا ہے کہ یہ ملک کوہستان اور صحرا کے درمیان مقید ہے۔ ان کا مخرج یا چین ہے یا روس یا ہندوستان۔ اسلامی سلطنت کے قائم کرنے میں چینی ترکستان کے مسلمان بالشویکی روس سے مدد نہیں لیں گے کیونکہ جب تک وہ مسلمان ہیں یہ بات برداشت نہیں کر سکتے کہ ان کی مسجدیں ناچ گھر یا قمار خانے بن جائیں۔
یہ ہو سکتا ہے کہ انگریز ان کی مدد کریں لیکن اس بات کو طبیعت گوارا نہیں کرتی کہ چینی ترکستان پر انگریزوں کا تسلط ہو اور یہ وہاں کے باشندوں کو اپنا غلام بنائیں۔ حکومت برطانیہ کے ماتحت مسلمانوں کو وہ آزادیاں اور حقوق نہیں مل سکتے ہیں جو انہیں جمہوریت چین کے ماتحت حاصل ہیں۔ چینی حکومت اور مسلمانوں میں کوئی کشمکش نہیں ہے۔ موجودہ شورش بالکل مقامی اور شخصی ہے۔ جن وجوہ سے مسلمانوں کو شکایت پیدا ہو گئی ہے ان کا تدارک کسی اور تدبیر سے ہو سکتا ہے۔
چینی ترکستان میں پائدار دولت اسلامیہ اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتی جب تک دو نغان اور قرغز میں اتفاق اور اتحاد نہ ہو اور دوسرے ممالک اسلام کی حالت سازگار نہ ہو۔ ممالک اسلامی کی موجودہ حالت ایسی نہیں ہے کہ وہ چینی ترکستان کے مسلمانوں کی کوئی عملی مدد کر سکیں یعنی اسلحہ اور روپیہ پہنچا سکیں۔ ترکی کو اس وقت اپنی ملت کی تعمیر سے فرصت نہیں ہے۔ شاہ نادر خاں کو شاہ امان اللہ خاں کے واپس آنے کا ڈر ہے۔ تونس کے مسلمان برابر "المدد" "المدد" کی صدا "الفتح" "القاہرہ" میں کر رہے ہیں۔ فلسطینی عرب یہودی سیلاب سے بہت پریشان ہیں، ابن سعود کی حکومت مالی پریشانیوں میں مبتلا ہے، جاوا کے مسلمان حکومت ہالستان کے شکنجے میں ایسے دبے ہیں کہ ہل نہیں سکتے۔ رہے ہندوستان کے مسلمان ان کے متعلق میں کچھ نہیں کہتا کہ وہ کس طرف جا رہے ہیں۔ علاوہ اس کے ممالک اسلام کا اس وقت کوئی مرکز نہیں ہے جس پر وہ جمع ہو سکیں اور نہ ان کا کوئی متحدہ مقصد ہے جس کے لئے سب مل کر

سعی کریں۔

اگر دونغان اور قرغز میں اتحاد نہ ہوا تو مجھے اندیشہ ہے کہ اس وقت چینی ترکستان میں وہی واقعہ پیش آئے گا جو ۶۰ سال قبل یون نان (yun-nan) کے مسلمانوں کو پیش آ چکا ہے۔ گذشتہ صدی میں یعقوب خاں کی بغاوت کے علاوہ صوبہ یون نان میں بھی ایک شورش ہوئی جس کی ابتدا گورنر اور مسلم سرداروں کی مخالفت سے ہوئی تھی۔ یہ ۱۸۵۵ء سے ۱۸۷۳ء تک رہی۔ دووین شوی یا محمد سلیمان نے چالیس[1] ہزار فوج تیار کر کے ڈالی (Dali) سے خروج کیا اور پایۂ تخت یونان فو (yun-nan-fu) پر حملہ آور ہوا۔ اس وقت چن یوی این (chin yueh yin) یون نان کا گورنر تھا۔ دووین شوی کامیاب ہونے والا تھا کہ مسلمان سرداروں میں اختلاف ہو گیا۔ آخر بجائے اس کے کہ سب مل کر کفار پر حملہ کریں آپس میں لڑنے لگے۔ دووین[2] شوی (Tu wen shui) ایک طرف تھا اور دوسری طرف ماجو لانگ (Ma ju lung) تھا۔ ایک نے تو شہر ڈالی کو اپنا مرکز بنایا اور دوسرے نے یون نان فو کو۔ ماجو لانگ شاہی فوج کے ساتھ مل گیا اور دووین شوی نے اپنا نمائندہ بھیج کر انگلستان[3] سے مدد مانگی۔ دووین شوی کا انگلستان سے مدد مانگنا اس کی ناکامی کا باعث ہوا کیونکہ اس زمانے کی مانچو حکومت گو ظالم تھی اور مسلمانوں کے حقوق کا لحاظ بہت کم کرتی تھی لیکن اسے خود مسلمانوں کی تحریک سے اتنا خوف نہ تھا جتنا کہ انگلستان کی مداخلت سے۔ چنانچہ قبل اس کے کہ انگلستان کی مدد دووین شوی کے پاس پہنچ سکے، شاہی فوج نے ماجو لانگ اور دووین شوی دونوں کا خاتمہ کر کے اس شورش کا استیصال کر دیا۔ اس بے نتیجہ تحریک میں چینی مسلمانوں کا سب سے بڑا ادیب "مافوچو" یا حاجی محمد یوسف بھی شہید ہو گیا جسے یونان کے مسلمان اب تک روتے ہیں۔

---

[1] نضارۃ الہلال پیکن جلد پنجم عدد ۷، صفحہ ۱۸۔

[2] حاضر العالم الاسلامی، الجزء الاول، صفحہ ۱۷۹۔

[3] Douglas : China صفحہ ۳۴۵۔

اس واقعے کی بنا پر ہم اس وقت چینی ترکستان کے مسلمانوں کو یہ مشورہ نہیں دے سکتے کہ وہ برطانوی ہند کی مدد سے اپنی مستقل حکومت کاشغر میں قائم کریں کیونکہ مغربی ملوکیت اور سرمایہ داری کی حکومت چین کی سخت دشمن ہے۔ اگر عثمان علی خاں جو اس وقت کاشغر کا حکمراں ہے انگریزوں سے مدد مانگے تو حکومت چین غالباً ایسی پالیسی اختیار کرے گی جو مسلمانوں کے لیے بہت مضر ہوگی یعنی وہ روس سے مدد لے کر اس شورش کا استیصال کرے گی اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ دونغانیوں سے کہے کہ تم سن کیانگ کے حکمراں بن جاؤ۔ اگر یہ صورت پیش آئی تو وہاں کے مسلمان آپس میں کٹ مریں گے۔ کوئی سچا مسلمان ہرگز یہ منظر دیکھنا نہیں چاہتا۔ علاوہ دونغان اور قرغز کے اتحاد کے میں نے چینی ترکستان میں آزاد اسلامی حکومت کے قائم رہنے کی شرط ممالک اسلامی کی عملی مدد قرار دی تھی۔ ۶۰ سال قبل جب یعقوب نے کاشغریہ میں اپنی سلطنت قائم کرنا چاہی تو دولت عثمانیہ اور خدیو مصر نے اس کو روپیہ اور اسلحہ سے مدد دی تھی[1] اس زمانے میں ممالک اسلامی کا شیرازہ اس قدر منتشر نہ تھا جتنا اب ہے۔ آج کل کوئی اسلامی ملک ایسا نہیں جو عثمان علی خاں کو ایک روپیہ یا ایک بندوق بھی بھیج سکے۔ اگر کوئی امید ہو سکتی ہے تو یہی ہے کہ شائد ایک دن ایسا آئے جب قرغز اور دونغان کے دل میں خدا اتحاد کی برکتوں کا احساس پیدا کردے۔ دونغان کی بہت سی شاخیں کانسو اور نینگ ہیا میں بھی ہیں۔ کانسو کا خاندان 'ما' (Ma) دونغان ہے۔ ان دو قبیلوں کے ملنے کے معنی یہ ہیں کہ سن کیانگ، کانسو، نینگ ہیا اور چینگ ہائی چار صوبے ایک دوسرے کے ساتھ مل جائیں گے۔ اور اگر ممالک اسلامی بھی ان کی مدد پر ہوں تو چینی مسلمانوں کی آیندہ ریاست صرف کاشغریہ یا سن کیانگ کے اندر محدود نہ رہے گی بلکہ ان چار صوبوں پر مشتمل ہوگی۔

خیر یہ تو آیندہ کی بات ہے مگر موجودہ شورش سے جہاں تک ہم نے غور کیا ہے بالفعل کئی نتائج حاصل ہونے کا امکان ہے۔ چینی اور غیر چینی اخباروں سے معلوم ہوتا ہے کہ فی الحال جنگی کارروائی تو روک دی گئی ہے لیکن قرغز اور ترک کاشغریہ میں قدم جمانے کی کوشش کر رہے ہیں اور چینی فوج جس

---

[1] الجامعۃ الاسلامیہ، یافا فلسطین مورخہ ۔۔۔۔

میں مسلمان اور غیر مسلمان شامل ہیں ارومچی، خولجہ اور تاچن سے ہٹائی نہیں گئی ہے اور حکومت نانکنگ نے اپنے اصول اور دستور کے مطابق تحقیقاتی کمیشن بھیجا ہے ۔ اس کے بعد غالباً حکومت نانکنگ ایک مسلمان گورنر مقرر کر کے چینی ترکستان بھیجے گی تاکہ مسلمانوں کو کوئی شکایت باقی نہ رہے یا کوئی ایسا چینی گورنر جو اسلامی رسوم سے واقف ہو اور افسروں میں بھی زیادہ تر مسلمان ہی رہیں گے ۔ ان دونوں صورتوں میں پورا سنکیانگ حکومت چین کے ماتحت رہے گا لیکن اندرونی انتظامات گورنر اور مسلم افسروں کے ہاتھ میں چھوڑ دیے جائیں گے ۔ ایک تیسری صورت یہ ہے کہ اگر قمر غذ اور ترک چینی حکومت سے صلح نہیں کرتے تو چینی ترکستان بالفعل دو حصوں میں تقسیم ہو جائے گا ۔ ایک شمالی جو چینی حکومت کے ماتحت رہے گا اور دوسرا جنوبی جہاں کئی مسلمان حکمراں الگ الگ حکومت کریں گے ۔ نہ تیمور عثمان علی کے ماتحت رہے گا اور نہ عثمان علی یونس بیگ کے ماتحت ۔ یہ حالت کب تک قائم رہ سکے گی اس کے متعلق ہم اس وقت کوئی پیشین گوئی نہیں کر سکتے۔[1]

---

[1] اس مضمون کے مکمل ہونے کے بعد یہ خبر ملی کہ چن شوزن کو برطرف کر کے لیو وین لانگ Liu Wen Lung سنکیانگ کا گورنر مقرر ہوا اور تحقیقاتی کمیشن کا صدر وانگ موسنگ Wang mo sung اپنے کام سے فارغ ہو کر نانکنگ واپس آ رہا ہے ۔

حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے شہر کے کھنڈر

اثری تحقیقات سے طوفان نوحؑ کی تائید

اس وقت تک جو ترقی انسان نے اپنی سواریوں میں کی ہے ان میں سب سے تیز رفتار سواریاں ہوائی جہاز اور موٹر کار ہیں لیکن انسانی تخیل کی پرواز ان سواریوں سے بھی بہت زیادہ تیز ہے ہمیں چاہیئے کہ ہم اپنے خیال کی تیز رفتاری سے فائدہ اٹھا کر ماضی کو دیکھیں، ان ٹیلوں پر جا کھڑے ہوں جو بابل و نینوا اور بنی عباس کے بغداد سے پہلے کے تمدن کی یادگاروں کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے خاموش ہیں اور ماضی کا قصہ کہنے کے لئے اپنی بے صدا اینٹ اور پتھر سے بولنے والی زبان میں آور[1] قوم کے مفاخر تمدنی بیان کرتے ہیں۔ بابل اور نینوا جو کلدانی اقوام کے تمدن کے چشم و چراغ تھے یہ دونوں شہر آور قوم کے کھنڈروں پر ہی آباد ہوئے تھے۔ آور ان سے پہلے کے تمدن کے مالک اور اسی ملک کے حاکم تھے۔ مشرق میں جب ان کی سلطنت تھی تو دوسری کوئی سلطنت ایسی نہ تھی جو ان سے ہمسری کا دعوےٰ کرتی۔ ہم آج ان اینٹوں اور پتھروں کی زبانی ان کے حالات فراہم کر کے آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

ان ریت کے ٹیلوں اور کھنڈروں پر جب ہم غور کرتے اور ان کو تصور کی عینک سے دیکھتے ہیں تو ہمیں وہ زمانہ یاد آتا ہے جبکہ یہ شہر جو آج کھنڈروں اور ٹیلوں میں پوشیدہ ہے اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ نہ صرف عراق بلکہ ایشیا کے بہت بڑے حصۂ ملک پر حکومت کر رہا تھا۔ اس کا مشہور برج زجورات آج بھی پانچ ہزار سال سے زمانے کی گردش کا مقابلہ کر رہا ہے۔ اگرچہ اپنی اگلی خوش نمائی کھو چکا ہے تاہم مضبوطی کے ساتھ اپنی جگہ قائم اپنے بانیوں کی عظمت دنیا کے سامنے ثابت کر رہا ہے۔ اس برج پر پہنچ کر

---

[1] آور، ایک قوم کا نام ہے۔

عجیب قدرت خداوندی کا ظہور ہوتا ہے۔ آسمان سے باتیں کرنے والی چوٹی پر چڑھنے والا انسان دور دور افق تک شہر کے کھنڈروں، ریت کے ٹیلوں کا ایک وسیع میدان دیکھتا ہے۔ اس شہر کی وسعت کا اندازہ کر کے قدیم ترین قوم آدر کی عظمت و شوکت کا سکہ اس کے دل پر بیٹھ جاتا ہے۔ وہ شہر کے آثار حد نگاہ تک دیکھ کر محسوس کرتا ہے کہ اپنے زمانے میں یہ شہر اپنی عظمت و بزرگی میں اس زمانے کے لندن، نیو یارک، پیرس، برلن وغیرہ سے کسی طرح کم نہ تھا۔ آج اس وسیع میدان میں اور اس کے قرب و جوار میں بھی آثار حیات کا کہیں پتہ نہیں ہے، نہ پانی ہے نہ گھاس، نہ کچھ کھانے کو میسر ہو سکتا ہے لیکن پانچ ہزار سال قبل اس جگہ کی یہ حالت نہ تھی۔ یہاں زندگی تھی اور اپنے حقیقی معنوں میں زندگی کے آثار تھے، حرکت تھی اور حرکت ہی حقیقت میں زندگی ہے۔ آج یہ جگہ میدان اور ریگستان ہے لیکن پانچ ہزار برس پہلے یہ ایک زندہ متحرک شہر تھا۔

فرض کرو اگر یہ انقلاب جو آج مشرق میں ہوا اس وقت مغرب میں ہوتا تو کیا ہوتا۔ جس طرح ہم یہاں ریگستان بے آب و گیاہ دیکھتے ہیں اور کسی قسم کے آثار حیات نظر نہیں آتے، غالباً مغرب میں یہ حالت نہ ہوتی۔ یہاں سبزہ ہوتا، چراگاہ ہوتے اور کم سے کم مویشی چرائے جاتے لیکن یہاں کچھ بھی نہیں ہے۔ اب ہمیں اس ویرانے کو دیکھنا چاہیے۔ خلیج فارس کے کنارے پر یہ شہر آباد تھا۔ کشتی سے بھی سفر کیا جاتا تھا لنگر گاہ شہر کے پاس تھا۔ یہاں قبائل شمر آباد تھے جن کی زبان نہایت سخت اور لہجہ کرخت تھا۔ یہی قبائل اس شہر کے مالک تھے۔ اون، کھالیں، ٹھیکریاں، عمدہ کتابت کے نمونے، جنتری وغیرہ کے نقوش جو اس ویرانے میں مدفون ہیں ان کے آثار وغیرہ پر غور کرنے سے اس قوم کی اعلیٰ معاشرت کا پتہ چلتا ہے۔ آج بھی ہم ان ساحلوں پر اس قوم کے مزدوروں کو نصف برہنہ بکری کی کھالوں کے کرتے پہنے دیکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ روز بروز جو کھدائی کا کام اس شہر کے کھنڈروں میں جاری ہے اور جو جدید آثار رہیں دستیاب ہوتے رہتے ہیں ان سے قوم آدر کے حالات روز بروز زیادہ معلوم ہوتے جاتے ہیں جس سے ہماری پچھلی تحقیقات کی تصدیق ہوتی جاتی ہے۔ جن امور کا ہم تصور اور قیاس کرتے تھے ان کی تائید ہوتی ہے۔ روز بروز تحقیقات سے مزید ثبوت فراہم ہوتا جاتا ہے اور ہم قوم آدر کی عظمت و شوکت سے واقف ہوتے جاتے ہیں۔ ہمیں معلوم ہوتا جاتا ہے کہ ان کے زمانے میں ان کا تمدن، حکومت دوسری

دنیا کے مقابلے میں کس پائے کے تھے۔

نقشہ دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ جائے وقوع کے اعتبار سے یہ شہر کس قدر عمدہ جگہ پر واقع تھا۔ دریائے فرات کی، جنوب ومغربی سمت میں جہاں دجلہ آکر ملتا ہے یہ شہر آباد تھا اور اس کے پاس ہی سمندر تھا۔ اب سمندر اس سے دور ہٹ گیا ہے اور زمین نکل آئی ہے۔ سمندر کے پانی کے خشک ہونے اور زمین نکلنے کا عمل رفتہ رفتہ تدریجی طور پر ہوتا رہا ہے۔

علمائے طبقات الارض کا خیال ہے کہ خلیج فارس کی دونوں سمتوں میں جو ممالک ہیں آٹھ ہزار سال قبل یہاں پانی تھا۔ یہ پانی سمٹا، اطراف برآمد ہوئے اور نہایت زرخیز ممالک پیدا ہو گئے چنانچہ عراق عرب بھی اس میں سے ایک ملک ہے۔

توریت کی کتاب تکوین میں جس پانی کے خشک ہونے اور زمین برآمد ہو کر قابل زراعت ہونے کا ذکر ہے وہ یہی مقام ہے۔

بعض ایسی روایتیں جن کی تاریخی شہادت فراہم نہیں ہوئی سنی گئی ہیں کہ جب سمندر کے نیچے سے یہ زمین برآمد ہوئی اور سب سے پہلے یہ خطہ آباد ہوا تو پہلا شہر یہی مقام تھا جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں۔ اسی کے کھنڈروں پر بابل و نینوا آباد ہوئے بلکہ یہی کہا جاتا ہے کہ طوفان نوح کے بعد جو شہر آباد ہوا وہ یہی شہر تھا لیکن علمائے آثار قدیمہ جنھوں نے شہر کے کھنڈروں سے مواد برآمد کر کے تحقیقات کی اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اس ملک میں جو سب سے پہلا شہر آباد ہوا وہ یہی شہر تھا۔ اس کا ثبوت روز بروز فراہم ہوتا جاتا ہے۔ یہ شہر حقیقت میں شروع میں ایک چھوٹا سا حقیر گاؤں تھا، پھر قصبے کی صورت اختیار کی اور رفتہ رفتہ عظیم الشان شہر ہو گیا قبائل شمر اس شہر کے مالک اور بانی تھے جو بقول علامہ کرکی سامی اقوام میں سے تھے جو دجلہ اور فرات کے اطراف میں آباد تھیں۔ یہ لوگ فن کتابت سے واقف تھے، زراعت کا پیشہ کرتے تھے اور کان کنی اور دھاتوں کے استعمال سے آگاہ تھے۔ یہ سب چیزیں انھوں نے خود اپنی ذہانت سے معلوم کی تھیں کسی قوم اور قبیلے سے انھوں نے حاصل نہیں کیں بلکہ یہ کتابے جانا ہوگا کہ وہ فن کان کنی میں کل اقوام کے استاد ہیں انھوں نے شہر، قصبے اور دیہات آباد کئے، فن کتابت سکھا، اپنے پڑوسی ممالک کو سکھایا۔ فن حرب میں ماہر تھے،

حساب جانتے تھے۔ فرات کے اطراف میں ان کی چراگاہیں تھیں، مویشی پالتے اور فائدہ حاصل کرتے تھے۔ زمانے کے تغیرات ہیں کہ آج یہ جگہ ویران ہے۔ غرض جب پانی اس زمین سے ہٹا اور رفتہ رفتہ یہاں خشکی نمودار ہوئی تو قبائل شمر نے ان پر قبضہ کیا، چراگاہ بنائی، کاشت شروع کی، شہد کی غرض سے کھیاں اور دودھ کی غرض سے مویشی پالے اور رفتہ رفتہ اس ملک میں اس زمانے کے موافق ایک عظیم الشان سلطنت قائم کی جس کی نظیر اس وقت کوئی نہ تھی۔ قبائل شمر نے قانون قدرت کی پیروی کی، اپنی طبیعت کو استاد بنایا، مفید باتیں حاصل کیں، مضر باتوں سے اجتناب کیا، رفتہ رفتہ ترقی کرتے گئے۔ اس زمانے میں آٹھ دس سال پہلے قبائل شمر کو کوئی نہیں جانتا تھا سوائے چند علمائے آثار قدیمہ کے کہیں کوئی ان کا ذکر بھی نہیں کرتا تھا۔

لیکن آج قبائل شمر دنیا میں مشہور ہیں۔ تمام وہ لوگ جن کو آثار قدیمہ اور قدیم تاریخی حالات سے دلچسپی ہے ان کو جانتے ہیں۔ روز بروز ان کے کارنامے علمائے آثار کے ذریعے سے دنیا میں نمودار ہوتے جاتے ہیں۔ کھدائی کا کام برابر جاری ہے اور وہ ان قبائل کی شہرت میں برابر اضافہ کر رہا ہے۔

ان کی حالت سمجھنے کے لئے کہ وہ کیا تھے فرض کرو۔ آج شمالی امریکہ کسی وجہ سے برباد ہو جائے، اس کے آثار سب کھنڈر ہو جائیں، دنیا رفتہ رفتہ اس کے تمدن کو بھول جائے۔ اب سے پانچ ہزار برس بعد علمائے آثار ان کھنڈروں کو کھودیں اور شمالی امریکہ کے تمدن کو دنیا کے سامنے روشناس کریں تو اس وقت اہل امریکہ کی جو وقعت ہوگی اسی وقعت و عظمت کے ہمارے سامنے آج اہل شمر مستحق ہیں۔

انگریزوں اور اہل امریکہ نے چند وفود ان آثار کی کھدائی کی غرض سے روانہ کئے۔ انھوں نے عجیب عجیب حالات معلوم کئے اور کثرت سے تاریخی مواد فراہم کیا۔ اثری مہم کے انچارج مسٹر لیونارڈ ہیں۔ ۱۹۲۲ء سے یہ کام شروع ہوا۔ تاریخ میں اس کھدائی سے نہایت ضروری اور اہم ترین باب کا اضافہ ہو گیا لیکن سب سے پہلے یہ کام ۱۹۲۲ء میں ہی شروع نہیں ہوا بلکہ ۱۸۵۴ء میں انگریزی حکومت نے مسٹر ٹیلر قنصل بصرہ کو حکم دیا تھا کہ وہ شہر آور کے کھنڈروں کا پتہ لگائے کیونکہ بعض ایسی تختیاں اس زمانے میں بھی دستیاب ہوئی تھیں جن میں بعض اہم تاریخی واقعات منقوش تھے۔ ۵۰۰ ق۔م میں کوئی بادشاہ کہیں سے واپس لوٹ کر بسج زجورات میں اپنے تخت پر بیٹھا تھا جب ان الواح کی عبارت روشنی میں آئی تو مہذب و متمدن دنیا

میں ان کی تحقیقات کی طرف توجہ ہوئی۔ تورات جاننے والے لوگوں کو سخت تعجب ہوا جب ان کو یہ معلوم ہوا کہ یہ وہ جگہ ہے جہاں حضرت ابراہیم پیدا ہوئے اور یہیں وہ واقعات پیش آئے جو توریت میں ان کے متعلق مذکور ہیں۔ مسٹر ٹیلر نے سب سے پہلے یہ امر ثابت کیا کہ پیٹریرک نامی یہودی عظیم کا آباد کیا ہوا شہر جس کے متعلق عرصے سے خیال کیا گیا تھا کہ وہ سوائے عالم خیال کے اور کہیں نہیں تھا ایک زمانے میں عالم وجود میں تھا اور اس کی جائے وقوع یہیں تھی۔ یہودی اور نصرانی شہر آور کے متعلق تین امور میں متفق ہیں:-

(۱) انسانی تمدن سب سے پہلے باقاعدہ یہاں نمودار ہوا۔

(۲) طوفان کے بعد یہی شہر سب سے پہلے آباد ہوا' اور

(۳) حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام اسی شہر میں پیدا ہوئے۔

علماء آثار قدیمہ نے جو مواد کھدائی کے ذریعہ حاصل کیا ہے اور اس پر بحث کی ہے وہ ان امور کی بہت کچھ تائید کرتے ہیں۔ ہم کو بھی اس پر کافی روشنی ڈالنا چاہیے۔

اگر ممکن ہوا تو ہم قوم آور کی ترقی و زوال کے حالات' ان کے زمانے کا تعین اور اس کا ثبوت پیش کریں گے۔ یہ شہر جس کے متعلق اقوام متفق ہیں کہ ایک زمانے میں عالم وجود میں تھا لیکن یہ نہیں جانتے تھے کہ اس کی جائے وقوع کہاں ہے دو ہزار سال تک انسان کے علم سے باہر رہا۔ پھر کیا وجہ ہوئی کہ وہ اس کی جگہ کے صحیح تعین اور پھر اس کی کھدائی سے اپنے خیال کی تصدیق فراہم کر سکا۔ دوسری صدی قبل مسیح کے ایک غیر مشہور مصنف نے جس کا نام یوپولیمس ہے اس شہر کا ذکر کیا تھا، تاہم تاریخ اس کے جائے وقوع کا تعین نہ کر سکی لیکن یہ معلوم ہو چکا تھا کہ یہ شہر دریائے فرات کے کنارے آباد تھا اور اس زمین پر آباد کیا گیا تھا جو سمندر سے نکلی تھی۔ عمر خیام مشہور اسلامی مہندس فلاسفر نے (جو اپنی رباعیات کی وجہ سے زیادہ مشہور ہے) اپنی تحریر میں ظاہر کیا تھا کہ یہ قطعہ زمین ایک تنگ سبزہ زار پر واقع تھا جو زرخیز اور بنجر زمین کے درمیان حد فاصل تھا۔ ان حالات کی بنا پر دریائے فرات کے کنارے یہ زمین تلاش کی گئی جہاں یہ کھنڈر ریت کے ٹیلوں کے نیچے مدفون ہے۔ ہم نے اس کی جگہ مقرر کی کہ ان حالات کی بنا پر یہی جگہ شہر آور کے وقوع کی ہے۔ دریائے فرات پاس ہے سمندر قریب ہے۔ جو زمین سمندر سے نکلی ہوئی ہوتی ہے مقابلتہً دیگر قرب و جوار کی زمین کے

زیادہ سرسبز ہوتی ہے۔ بڑے بڑے دریا جب طغیانی پر آتے ہیں تو آس پاس کے شہر بستیاں سب برباد کر دیتے ہیں۔ یہی کیفیت شہر آور کی کسی وقت فرات نے کر دی تھی۔ پانچ ہزار سال کا زمانہ کافی زمانہ ہے۔ جن جن حکومتوں نے اس درمیان میں اس ملک پر حکومت کی ان کی تاریخوں میں کہیں اس شہر کا ذکر نہیں ملتا۔ قبائل شمر، بابلی، آشوری، ایرانی، یونانی، ترک اپنے اپنے وقتوں میں اس ملک پر حاکم ہوتے رہے لیکن شہر آور کے کھنڈروں کا کہیں کسی نے ذکر نہیں کیا۔ لیکن اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو خیال اور تاریخی کی تحقیقات کی جانب اس زمانے میں ہے وہ قدیم حکومتوں کو نہ تھا۔ دوسری سب سے بڑی بات یہ بھی تھی کہ یہ دریا عرصے تک اسی زمین پر بہتا رہا اور کل شہر کو پانی کے نیچے رکھا۔ رفتہ رفتہ فرات اپنی جگہ سے ہٹا اور یہ زمین برآمد ہوئی۔ یہ عمل چند سالوں میں نہیں ہوا بلکہ ہزاروں اور سیکڑوں سال اس میں صرف ہو گئے۔ اس وقت یہ کھنڈر فرات سے پانچ میل دور جانب شرق واقع تھا۔

اس زمانے میں فرات اپنی جگہ سے تقریباً دس میل ہٹ گیا۔ قدیم زمانے میں جو ملک کا انتظام ہو گا وہ بہت اچھا ہو گا جیسا کہ عموماً دستور ہے لیکن گردش زمانہ کا اثر ہر چیز پر ہوتا ہے۔ آور شہر اور اس کا انتظام بھی اس سے محفوظ نہیں رہ سکتا تھا۔ چنانچہ نہیں رہا۔ اس کے ارکان نے جیسا چاہئے تھا حفاظت نہیں کی اور ملک تباہ ہو گیا۔ معلوم ہوتا ہے پانچ سو سال قبل مسیح میں یہاں بالکل ویرانی اور تباہی مسلط ہو چکی تھی یہاں بہت تھوڑے لوگ آباد تھے جو فقر و فاقے کی زندگی گزارتے تھے۔ بعد کو یہ لوگ بھی یہاں سے تلاش معاش میں چلے گئے اور یہ جگہ بالکل ویران ہو گئی سوائے ان کے آثار کے اس ویران حصے میں کوئی ذی حیات باقی نہیں رہا۔ اس ویرانی اور تباہی کا بڑا سبب یہ بھی ہے کہ موسم گرما میں ہفتے کے کم سے کم پانچ دنوں میں سخت ترین آندھی آتی رہتی ہے جو اپنے ساتھ ریت لاتی اور لے جاتی ہے۔ اس زمانے میں آندھی کا مقابلہ میدان میں ناممکن ہوتا ہے۔ آنکھ، کان، ناک، منہ میں ریت گھس جاتی ہے اور انسان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اس وقت وہ کیا کرے۔ عقل خبط ہو جاتی ہے اور سمجھ جواب دے دیتی ہے۔ یہ آندھی گرم بھی ہوتی ہے، سانس لینا انسان کے لئے دشوار ہو جاتا ہے۔ تاریکی کی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ دن کو اپنا ہاتھ نہیں سوجھتا۔ ہمارے پاس بعض عربی روایات ایسی بھی ہیں کہ قوم عاد اسی طرح آندھی کی نذر ہو گئی اور سب بستی برباد ہو گئی

آج ان کی جائے وقوع اور ان کے آثار کا تعین کہیں نہیں ہو سکتا۔ یہی حالت قوم آد کی ہوئی جس سے قوم عاد کی تباہی کا ثبوت مطابق اجمال معلوم ہوتا ہے اور اس عربی روایت کا بھی کہیں نہ کہیں آثار کے ذریعے کافی ثبوت ثبوت فراہم ہو جائے گا۔

ہم کو اس ملک میں موسم سرما میں اپنے مقفل گھروں کو ہفتے میں تین بار صاف کرنا پڑتا ہے اور باریک ریت بند کمروں میں داخل ہو جاتی ہے تو پھر وہ جگہ جو بالکل کھلی ہوئی ہو جہاں گرمی کی آندھیاں اپنے ساتھ ریت کے پہاڑ لے کر چلیں اور ہفتے میں پانچ پانچ مرتبہ ان کا دور ہو اس کا کیا حال ہو گا۔ ہم نے بعض بعض حالات ایسے بھی دیکھے ہیں کہ ریت نے تمام گھر بند کر دیا حتیٰ کہ اس کی چھت تک پہنچ گئی جس طرح آج ایک گھر ریت میں بند ہو کر پوشیدہ ہو سکتا ہے اسی طرح ایک ملک' ایک قوم فنا ہو سکتی ہے۔

اس ریت نے ایک فائدہ ضرور پہنچایا کہ آور قوم کے کھنڈر صحیح و سالم برآمد ہوئے' غارتگروں اور لٹیروں نے ان کو تباہ و برباد نہ کیا جس طرح کہ شام و مصر اور خود عراق کے دیگر شہر برباد کر دیئے گئے۔ اس شہر کے آثار چار سو سال قبل مسیح میں جس حالت میں تھے اسی حالت میں آج برآمد ہو رہے ہیں زمانے کی دست برد سے جو چیز فنا ہو گئی وہ تو ہو گئی باقی سب اشیاء بدستور موجود ہیں۔ اس وقت تک جو آثار برآمد ہوئے ہیں ان سے ہم زمانے کا تعین ۲۵۰۰ ق۔م سے ۴۰۰۰ ق۔م تک کا کر سکے ہیں جو آثار ہمارے سامنے ہیں ان میں مخطوطے اور دیگر اشیاء بھی شامل ہیں اور اب ہم ان سے اس زمانے کی تاریخ مرتب کر سکتے ہیں۔

ہمیں قبائل شمر کی زبان کے متعلق بھی کچھ کہنا ہے جس کے بغیر اس زمانے کی تاریخ اور اس کے ماخذ کے سمجھنے میں سہولت نہیں ہو سکتی۔ اہل شمر نہ تو کاغذ استعمال کرتے تھے اور نہ جھلی پر لکھتے تھے نہ درختوں کے پتوں پر جیسا کہ اہل مصر اور شامی ممالک میں اس زمانے میں دستور تھا۔ ان کی تحریر کا دستور بہت سادہ تھا۔ وہ گارا بناتے اور اس کی تختی تیار کرتے جیسے صابون کی مستطیل ٹکیاں آج کل ہوتی ہیں اسی طرح ان کی تختیاں مٹی کی بنی ہوئی ہوتی تھیں۔ پھر کسی سخت قلم سے جیسے لوہے وغیرہ معدنی چیز کے اوزار سے وہ نقش کیا کرتے تھے۔ ابتدائی کتابت اس طرح ہوئی کہ چیزوں کی تصویریں بنایا

کرتے تھے۔ پھر تصویروں سے اصوات و آوازیں پیدا ہو کر ان کی صورتیں بنائی گئیں۔ اس قسم کی الواح مٹی کی دستیاب ہوئی ہیں اور ان پر اپنے اپنے زمانے کے نقوش ہیں۔ پھر صورتوں سے حروف اور حروف سے الفاظ بنائے گئے۔ ایسے الفاظ جن میں ایک سے زیادہ حروف شامل تھے وہ لکھے گئے۔ غرض اسی طرح اہل شمر کی زبان میں سب سے پہلے کتابت عراق میں ہوئی۔ اسی اصول پر سامی زبان سب سے پہلے مرتب ہوئی۔ سامی اقوام نے اسی طرح لکھنے کی ابتدا کی اور حرفوں سے لفظ اور لفظوں سے جملے بنائے۔ یہ زبان عرصے تک ان ممالک میں مروج رہی۔

یہ تمام اصول کتابت وغیرہ بابلیوں سے پہلے ہی مرتب ہو چکے تھے۔ اولیت کی جو فضیلت ہم اہل بابل کو دیتے تھے اس سے غالباً اب وہ محروم ہو چکے ہیں۔ یہ تحریر اور یہ زبان زمانے کے تغیر کے ساتھ ساتھ متغیر ہوتی ہوئی اس وقت تک قائم رہی کہ اس دنیا میں عبرانی اقوام ظاہر ہوئیں اور انھوں نے ابجد کے مطابق حروف و الفاظ ترتیب دئے۔ لیکن اہل بابل و نینوا کا طرز کتابت عرصے تک وہی رہا جو شمریوں کا تھا۔ جو کتابے انیبال کے خزانے سے برآمد ہوئے ہیں ان سے اسی قسم کی کتابت پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ کتابے اشوری اقوام نے نینوا میں جمع کئے تھے اور اس کا زمانہ ۷۰۰ ق م ہے۔ ان کتابوں سے ہم ۵۰۰ ق م کی تاریخ پر روشنی ڈال سکتے ہیں۔ ان کی تائید علمائے افلاک نے بھی کی ہے۔ اس طرح علمائے آثار قدیمہ اور علمائے فلکیات نے اپنی اپنی جگہ پر جو تحقیقات کی اس سے دونوں ایک ہی نتیجے پر پہنچے اور اس کا خلاصہ ہم ناظرین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔

"قوم آور کی جو زیادہ سے زیادہ تاریخ ہم تعین کر سکتے ہیں وہ ۳۱۰۰ ق م ہے۔ اس سنہ میں بادشاہ مس انی پدا نامی تخت سلطنت پر بیٹھا تھا۔ یہی پہلا بادشاہ تھا جو قوم آور میں تخت نشین ہوا۔ اس بادشاہ کی تخت نشینی کی تاریخ ہم نے جملہ علمائے آثار کے اتفاق سے قائم کی ہے، اس میں زیادہ سے زیادہ سو برس کی غلطی ممکن ہے کہ سو سال قبل ہو یا سو سال بعد، اس سے زیادہ غلطی کا احتمال نہیں۔ مس انی پدا سے قبل کے بھی برتن اور بعض تمدنی سامان دستیاب ہوا ہے جو ۳۵۰۰ ق م کا ہے اور اس پر اس زمانے کے حکمراں خاندان کے نام بھی منقوش ہیں لیکن علماء اس پر یقین نہیں کرتے۔ ان کے نام صاف و واضح

نہیں ہو سکے۔ ان کی حقیقت ابھی تک اسی طرح پوشیدہ ہے جس طرح ان آثار کی کھدائی سے قبل تھی۔ اس لئے ہم اس مضمون کو مس انی پدا کی تخت نشینی ہی سے شروع کریں گے اور اس مضمون میں ۳۵۰۰ ق۔م تک کے حالات ہی سے بحث کریں گے۔ اس زمانے میں قبائل شمر کی تمدنی حالت یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ نہایت اچھے صناع تھے۔ ڈھلائی کے کام میں ماہر تھے اور خنجر، خود اور بت بناتے تھے۔ ان کے سونے کے برتن، مختلف آلات وغیرہ جو دستیاب ہوئے ہیں وہ ان کی قوت ایجاد اور کاریگری پر دلالت کرتے ہیں۔ تقریباً پانچ سال ہوئے ایک جگہ کھدائی کے موقع پر ایک خنجر برآمد ہوا جو ان کے بادشاہ مس کلم دغ نامی کا تھا جس جگہ یہ خنجر برآمد ہوا اسی جگہ ۵۰ ٹکڑے سونے کے بھی ملے تھے۔ ان پر مٹی نے اس طرح اثر کر رکھا تھا کہ ان کی حقیقت نہیں معلوم ہو سکتی تھی۔ لیکن جب ان کو بالکل صاف کیا گیا تو معلوم ہوا کہ ان کے نقوش اطالوی فن کے عہد کمال سے زیادہ بہتر اور خوشنما ہیں۔ مس انی پدا کے زمانہ کے بعد ۲۵۰۰ ق۔م تک ہم کوئی ایسی چیز نہیں دیکھتے جس سے اس زمانے کی تاریخ مرتب ہو سکے۔ لیکن اس درمیان میں جو اہم واقعات پیش آئے وہ ظاہر کئے جاتے ہیں۔ ۲۹۰۰ ق۔م میں قوم آور ایشیا کے اکثر ممالک سے تجارتی تعلقات رکھتی اور وہاں آتی جاتی تھی۔ جو جواہرات عراق میں نہیں ہوتے تھے وہ دیگر ممالک سے لائے گئے تھے اور یہاں کی قیمتی اشیاء معاوضے میں دی گئی تھیں۔ اس وقت سونا، چاندی، تانبا، عقیق، لاجورد دیگر ممالک سے آئے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قوم آور فن تجارت میں کافی دست گاہ رکھتی تھی۔ اپنے ملک کی پیداوار دوسرے ممالک کو لے جاتی اور وہاں سے قیمتی پیداوار اور مفید اشیاء لاتی تھی۔ جن ممالک سے ان کے تجارتی تعلقات ثابت ہوتے ہیں وہ حسب ذیل ہیں: ایشیائے کوچک، شام، ایران، کوہ قاف، افغانستان اور ہندوستان وغیرہ۔ قدیم تاریخ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ۲۹۰۰ ق۔م کے قریب قوم آور کی کسی ایشیائی سلطنت سے جنگ ہوئی تھی جس میں قوم آور کو ایسی شکست ہوئی کہ مس انی پدا کے خاندان سے حکومت جاتی رہی۔ علمائے آثار اس کی تحقیقات کی طرف کامل انہماک سے متوجہ ہوئے۔ انھوں نے کھدائی کے ذریعے قوم آور کے وہ مندر دریافت کر لئے جو بابلی لشکروں نے تباہ و برباد کر دئے تھے اور آج تک ان کے کھنڈر موجود ہیں۔ جس طرح ایک ورق کے بعد کتاب کا دوسرا ورق ہوتا ہے اسی طرح ان آثار کا حال ہے۔ قدیم آثار کے اوپر ان کے بعد

والے زمانے کے آثار ہیں۔ سب سے قدیم آثار سب کے بعد دستیاب ہوتے ہیں۔

بابلیوں کے آثار سے قبل جو آثار ہیں وہ قوم آور کے ہیں کیونکہ اہل بابل نے ان کی حکومت ختم کرکے اپنی حکومت قائم کی تھی چھ سو سال تک یہ قوم مغلوب رہی۔ ان کی عمارتوں اور مندروں سے مغلوبیت کے آثار نمایاں ہیں۔ بمقابلہ ان کے فاتحین کی عمارات کے ان کی عمارتیں پست اور ذلیل ہیں اور غلامی کا ثبوت دے رہی ہیں۔ لیکن ۲۳۰۰ ق۔م میں یہ قوم اس غلامانہ پستی سے باہر نکلی اور پھر اپنی سلطنت قائم کی۔ کامل آزادی کے بعد ترقی کرنا شروع کیا جو تمام آزاد اقوام کا خاصہ ہے اور آزادی کے بغیر کوئی قوم بھی دنیا میں ترقی نہیں کر سکتی۔ یہ کلیہ ہے جس کو زمانہ ہمیشہ سے ثابت کر رہا ہے اور کرتا رہے گا۔ قوم آور نے آزادی کے بعد اپنی گذشتہ عظمت و شوکت بہت جلد حاصل کر لی۔

واقعہ یہ ہوا کہ آور رامو ایک حاکم تھا جس کا وہ مشہور خنجر ہے جو حال میں اس کے مدفن سے برآمد ہوا ہے اور ہم اس کا ذکر کر چکے ہیں۔ اس نے آور قوم کو دوبارہ زندگی بخشی اور خود بادشاہ ہوا۔ اس نے آور سلطنت کے استقلال کے بعد اس کے تمدن اور معاشرت کی طرف توجہ کی اور ان کو انتہائی ترقی پر پہنچایا۔ اس کے بادشاہ ہونے کے بعد اس قوم کے عجیب عجیب عمرانی کارنامے ظاہر ہوئے۔ اس نے اپنا نام بادشاہ اقوام شمر رکھا اور اپنے لقب میں اس کا بھی اظہار کیا کہ ملک آور کی چاروں آبادیوں میں اس کی شہنشاہی ہے۔ یہ بات بھی ظاہر کی کہ خلیج فارس سے بحر متوسط تک وہی مطلق العنان شہنشاہ ہے اور اس نے یہ عظیم الشان سلطنت محض اپنی قوت بازو اور اپنے لشکر کی کوشش و جانفشانی سے حاصل کی ہے جیسا عام طور سے دستور ہے کہ فاتحین اپنے رہنے کے مقامات کو مضبوط اور ناقابل تسخیر بنایا کرتے ہیں اسی طرح اس بادشاہ نے بھی اپنے شہر کی فصیل اسی طرح بنائی تھی جس طرح قیصر اغسطین نے شہر روما میں بنائی تھی۔ فرق صرف یہ ہے کہ قیصر نے مٹی سے تعمیر کی ہوئی فصیل کو چونے کی عمارت میں تبدیل کر دیا اور بادشاہ آور رامو نے شہر آور کی فصیل پختہ اینٹ اور مٹی سے بنائی تھی۔ اس فصیل کے دیکھنے سے اس بادشاہ کی عظمت و شوکت اور حسن مذاق کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ فصیل بھی ان ٹیلوں کے نیچے سے کھدائی میں برآمد ہو چکی ہے۔ جو مہم اس کھدائی کے کام پر بھیجی گئی تھی اس کا بڑا کام وسط شہر کی کھدائی کرنا اور معلومات حاصل کرنا تھا۔ چنانچہ کام کے

پہلے ہی سال میں انھوں نے ایک مندر کی فصیل کے آثار معلوم کر لئے ہیں۔ یہ مندر اس شہر کا سب سے بڑا مندر سمجھا جاتا ہے۔ یہ مستطیل ہے تین چوتھائی میل لمبائی میں اور چوتھائی میل چوڑائی میں جس قدر کمرے اور مقامات اس مندر میں دریافت ہوئے ہیں سب میں چاند دیوتا کی پرستش کی جاتی تھی جس کا نام ان کی زبان میں ننار، تھا یا اس کی زوجہ کی جو بن جال سے موسوم تھی، پرستش ہوتی تھی۔ لفظ بن جال کے معنی ان کی زبان میں سیدہ عظیمہ کے تھے۔ شہر آور کی یہ خصوصیت ہے کہ وہاں چاند کی نقرئی شعاعیں اتنی صفائی سے ضیا پاشی کرتی ہیں کہ باریک حروف کی کتابت بھی آسانی سے پڑھی جا سکتی ہے۔ جب تحقیقات کرنے والے یہ منظر دیکھتے ہیں تو ان کے لئے یہ سمجھنا دشوار نہیں ہوتا کہ اسی خصوصیت کی وجہ سے آور قوم میں عبادت قمر کا جذبہ پیدا ہوا ہوگا۔ اسی دور میں جبکہ قوم آور مفتوح حالت میں تھی مشہور اور مضبوط ترین برج زجورات نامی تیار ہوا۔ اس کے پاس ہی کھجور کے باغات تھے اور چاند دیوتا کا مندر۔ گمان ہے کہ اس برج اور مندر کے پاس یا اس کے کسی حصے میں شاہان قدیم کے خزائن یا دیگر اندوختہ دستیاب ہو۔ اس کا فیصلہ مستقبل میں ان مہم والوں کے اعمال پر منحصر ہے۔ جب ۲۱۷۰ ق۔م میں بادشاہ اِپی سن خاندان آور ماموکے آخری تاجدار کو عیلامیوں نے گرفتار کر کے سلطنت آور کا دفعۃً خاتمہ کر دیا۔ اس وقت شہر بابل آباد کیا گیا جس نے آور قوم کے عام آثار اور اعلام کو چھپا دیا۔ خاندان عموری اس پر حکومت کرنے لگا۔ یہ لوگ سامی عربی اقوام میں سے تھے۔ اس قوم نے اپنے زمانے میں انتہائی ترقی کی یہاں تک کہ قرب وجوار میں ان کے مقابلے کا کوئی بادشاہ نہ تھا۔ آور قوم مفتوح ہو چکی تھی، وہ عراق کے مختلف حصص میں پھیل گئی اور گمنامی کی زندگی گزارنے لگی۔ اس کے بعد قبائل شمر کا وجود تاریخ میں بحیثیت ایک حاکم اور زبردست قوم کے نہیں ملتا۔

۱۹۲۳ء میں مہم والوں نے متمدن دنیا کو مطلع کیا تھا کہ عجیب وغریب انکشافات ہوئے ہیں اور آور کی تاریخ کے لئے نہایت عمدہ مفید مواد فراہم ہوا ہے لیکن وہ مواد سونے کی تختیاں یا ہتھیار وغیرہ نہیں ہیں جیسا کہ پہلے بادشاہوں کے حالات میں ذکر کیا جا چکا ہے۔ مگر مٹی کے روغنی برتن، صندوقچوں کی کارگیری، دیگر سامان اور اس قسم کی بہت سی چیزیں اس عہد کی جو دستیاب ہو چکی تھیں، اندازہ کیا گیا ہے کہ ۳۵۰۰ ق۔م زمانے کی ہیں۔ یہ آثار شمریوں کے آثار سے بھی بالکل مختلف ہیں جو اس ملک میں بعد میں

آباد ہوئے اور یہاں کے تمدن کو ترقی پر پہنچایا۔ یہ آثار مٹی کے ایک یکساں طبقے کے نیچے مدفون تھے جس کی دبازت ہر جگہ برابر تھی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ طبقہ ایک ہی زمانے میں دفعۃً دفن ہو گیا تھا۔ کئی طبقات کے ملنے سے یہ شکل پیدا نہیں ہوئی تھی اور ایک ہی طبقے کے دستیاب ہونے کا واضح مفہوم یہ ہے کہ بلاشبہ اسی طوفان عظیم کا نتیجہ ہے جس نے طوفان سے پہلے کے تمدن کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ اس لئے یہ قیاس بھی کیا جا رہا ہے کہ وہ طوفان جس کا ذکر تورات میں ہے وہی ہے جس کا اندیشہ دجلہ وفرات کے درمیانی شہروں میں درپیش تھا جس میں ہر سال طغیانی آتی تھی اس لئے گمان غالب یہ ہے کہ مٹی کا یہ مدفون طبقہ انھیں قدیم مقامی طوفانوں کا نتیجہ ہو گا۔

جب ہم غور کرتے ہیں تو ہمیں اس میں شک نہیں رہتا کہ یہ وہی طبقہ ہے جو اس مشہور طوفان میں دفن ہو گیا تھا مگر جو دلائل ہمارے پاس موجود ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ جو طوفان اس طبقے کے دب جانے کا باعث ہوا۔ وہ وہی طوفان ہے جس کا ذکر کتاب تکوین میں ہے اور وہی طوفان ہے جو بعد میں تورات کے عقیدے میں عالم گیر طوفان بن گیا جس کو ہم طوفان نوح کہتے ہیں جس کے دلائل حسب ذیل ہیں:-

(۱) یہ آثار جو اب دریافت ہوئے ہیں وہ ان سے بھی قدیم ترین آثار ہیں جو قوم آور کے کھنڈروں میں اس وقت تک دستیاب ہو سکے ہیں۔ جو مٹی اور ریت آثار پر سے ہٹایا گیا ہے وہ دوسرے آثار کے مقابلے میں زیادہ قدیم معلوم ہوتا ہے۔

(۲) جس نوع کا تمدن اس طوفان میں تباہ ہو گیا اس کے آثار پھر قوم آور کے تمدن میں نہیں پائے گئے۔ قبل از طوفان تمدن کی امتیازی خصوصیات میں خاص قسم کی مٹی کے رنگین برتن ہیں جو بعد میں کہیں استعمال نہیں کئے گئے۔

(۳) ان آثار سے اوپر جو آثار ملے تھے ان میں اور قدیم ترین آثار میں بین فرق ہے اور یہ پتہ چلتا ہے کہ قدیم آثار ان سے بھی نیچے دفن ہیں اور اس کے بعد کے اس کے مقابلے میں کم گہرائی میں دفن ہیں۔

یہ آثار جو قدیم ترین آثار کے مقابلے میں جدید کہے جا سکتے ہیں قوم شمر کے آثار ہیں۔ یہ قوم فن کتابت

سے واقف تھی اس میں طوفان کی روایات مشہور تھیں اور ان کی کتابوں میں طوفان کا ذکر موجود ہے۔ یہ وہی طوفان ہے جو تورات کے سفر تکوین میں بیان کیا گیا ہے۔

طوفان کے خیال سے انھوں نے عمارتیں مضبوط بنائی تھیں اور فن تعمیر پر خاص توجہ رکھتے تھے چنانچہ برج زجورات کو بھی اسی خیال سے مضبوط بنایا تھا۔ ان آثار سے خصوصاً ان بابلی مٹی کی تختیوں سے جو خود صاحب کشتی کی لکھی ہوئی دستیاب ہو چکی ہیں ہم اس نتیجے پر ضرور پہنچتے ہیں کہ طوفان نوح اور یہ طوفان بہت کچھ مماثلت رکھتے ہیں۔ بہت ممکن ہے یہ ثابت ہو جائے کہ یہ طوفان جس کا ثبوت یہاں فراہم ہو رہا ہے وہی طوفان ہو جو طوفان نوحؑ کے نام سے عالم میں مشہور ہے۔ اس کشتی بان کا نام ناپستم لکھا گیا ہے۔ یہ نام نوحؑ کے مقابلے میں ہے اور اس کا بیان تورات کی عبارت سے کس درجہ مشابہ ہے۔

لوح کی عبارت

چھ دن اور چھ رات سخت آندھی چلتی رہی جو رفتہ رفتہ خطرناک صورت اختیار کر گئی زمین پر طوفان آگیا۔ ساتویں روز دن نکلتے پر آندھی بند ہوئی سمندر ساکن ہوئے، طوفان رک گیا۔ انسانوں کی جو جنگ ہوا اور پانی سے ہو رہی تھی بند ہو گئی۔ مجھے زمین نظر آئی میں نے روزہ رکھا۔ انسان کیچڑ اور گیلی زمین کی طرف لوٹنے کے لیے بیتاب تھے سوائے میدان کے کوئی چیز نہیں دکھائی دیتی تھی۔ کھیت صاف پڑے ہوئے تھے۔ مقدس نور میرے چہرے پر پڑ رہا تھا۔ راستہ نظر آنے لگا۔ ساتویں روز ایک کبوتر کو لیا اور کشتی سے اس کو چھوڑا لیکن اس کو کہیں زمین نہیں ملی کہ وہ اس پر قیام کر سکتا اور لوٹ آیا۔ پھر میں نے ایک کوے کو چھوڑا وہ گیا اور جہاں پانی اتر چکا تھا اور زمین برآمد ہو رہی تھی وہاں جا کر اس نے کچھ کھایا۔ آواز دی اور واپس نہیں ہوا۔ میں نے قربانی کی جس کی خوشبو مقدس معبود کو پہنچی۔ اس کی رحمت نے مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا۔

یہ عبارت اور کتاب تکوین تورات کی عبارت کس قدر مشابہ ہے۔ کیا یہ تعجب کی بات نہیں ہے اگر ہم

اس قابل ہو جائیں کہ دونوں طوفانوں کو ایک ثابت کر سکیں۔ عبارت الفاظ اور واقعہ سب ایک دوسرے سے مشابہ ہیں۔ جو الفاظ دلدل گیلی زمین اور میدان کے معنوں میں استعمال ہوئے ہیں وہ عراق کی ان زمینوں پر مشتمل ہیں جو مابین النہرین واقع ہیں۔ پھر پانی کا اترنا گرمی کی شدت مکھیوں کا ہجوم ان واقعات نے اس بیان کو کس قدر واضح او ثابت کر دیا۔

غزل

نالۂ دل اثر انداز نہیں ہے تو نہ ہو
لب ہلا لیتا ہوں آواز نہیں ہے تو نہ ہو

شکر کرتا ہوں ابھی حسرت پرواز تو ہے
اب اگر طاقت پرواز نہیں ہے تو نہ ہو

حسن اور عشق میں جذبات وہی ہیں موجود
کوہکن سا کوئی جاں باز نہیں ہے تو نہ ہو

نگہ یاس سے افسانۂ دل کہہ دوں گا
پُر اثر گر مری آواز نہیں ہے تو نہ ہو

وہ تو افسانۂ دل غور سے سن لیتے ہیں
خلق اگر گوش بر آواز نہیں ہے تو نہ ہو

نظر اپنی ہے فقط تیرے کرم پر ساقی!
در توبہ بھی اگر باز نہیں ہے تو نہ ہو

راز ہی راز ہے جو کچھ بھی ہے معلوم ہمیں
اور دنیا میں کوئی راز نہیں ہے تو نہ ہو

آنکھوں آنکھوں میں تو ہے سلسلۂ ناز و نیاز
گفتگو ہوتی ہے آواز نہیں ہے تو نہ ہو

حسن کی ذات سے نسبت ہے یہی کیا کم ہے
عشق خود باعث اعزاز نہیں ہے تو نہ ہو

رہنمائی دل پر شوق کرے گا میری
کوئی غربت میں جو دمساز نہیں ہے تو نہ ہو

ہم تو حال غم دل اپنا کہے جائیں گے
تو اگر گوش بر آواز نہیں ہے تو نہ ہو

دل تو میرا نگہ ناز کی جانب ہے حمید
دل کی جانب نگہ ناز نہیں ہے تو نہ ہو

جذباتِ مجذوب

سنبھل کر ذرا تیز گامِ محبت	مقامِ ادب ہے مقامِ محبت
مرے سامنے لو نہ نامِ محبت	چھلک جائے گا ہائے جامِ محبت
ارے اک نظر اس طرف بھی خدارا	بپاسِ مروت بنامِ محبت
زباں سے وہ کچھ بھی کہے جائیں مجھ کو	نگہ دے رہی ہے پیامِ محبت
نہ ہوگا ابد تک بھی پورا نہ ہوگا	مرا قصۂ ناتمامِ محبت
ٹھہر یادِ جاناں ٹھہر میرے دل میں	یہی ہے یہی ہے مقامِ محبت
زر و مال و عزت دل و جان و ایماں	ہبہ کر چکا ہوں بنامِ محبت
کہاں ان کی بزمِ طرب کے ہوں قابل	میں شوریدہ سر تلخ کامِ محبت
محبت کے بدلے محبت ستم ہے	نہ لے اف نہ لے انتقامِ محبت
چڑھیں دار پر یا چڑھیں طور پر ہم	رسائی سے بالا ہے بامِ محبت
یہ تھا کون غارت گرِ دین و ایماں	ارے یہ لیا کس نے نامِ محبت
ازل ابتدا ہے ابد انتہا ہے	نہ صبحِ محبت نہ شامِ محبت
بہت دور پہنچا ہے مجذوب پھر بھی	بہت دور ابھی ہے مقامِ محبت

تنقید و تبصرہ

کتب :-

تاریخ شاہجہاں پور | مولفہ جناب مولوی محمد صبیح الدین صاحب شاہ جہاں پوری تقطیع ۲۶×۲۰، ضخامت ۵۱۰ صفحات، کتابت و طباعت متوسط کاغذ معمولی قیمت اور ملنے کا پتہ درج نہیں، غالباً جناب مصنف سے شاہ جہاں پور محلہ گگرا خورد کے پتہ پر مل سکتی ہے۔

یہ شاہ جہاں پور کی بہت مفصل تاریخ ہے۔ اور جناب مولف نے اسے نہایت محنت اور سلیقہ سے مرتب کیا ہے۔ کتاب کے پہلے حصہ میں انہوں نے ہندوستان کی قدیم تاریخ پر اختصار کے ساتھ نظر ڈالی ہے۔ پھر شاہ جہاں پور کی تاریخ ابتدا سے آخر تک بیان کی ہے۔ اس میں انھوں نے اس شہر کی بنا اور بانی کے حالات، یہاں کی مشہور قدیم و جدید مشہور عمارتوں وغیرہ کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے۔ دوسرے حصہ میں شاہ جہاں پور کے علما، مشائخ، حکما، فقرا، اصحاب فنون لطیفہ، رؤسا، خواتین کے حالات ہیں، شعرا کے حالات ہیں، ان کے کلام کا انتخاب بھی درج ہے۔ غرض ہر حیثیت سے یہ اس شہر کی ایک مکمل تاریخ اور جناب مولف کی ہمہ گیری اور وسعت معلومات کی شاہد ہے۔ تاریخی حالات کے بیان کرنے میں انھوں نے حتی المقدور احتیاط سے کام لیا ہے۔ کتاب کے پہلے حصہ میں کہیں کہیں موجودہ سیاسی مسائل کا بھی ذکر آگیا ہے ایسے موقعوں پر ان کے خیالات بہت بے لاگ ہیں، کتاب کی زبان بھی بہت صاف و سلیس اور رواں ہے کتاب کے شروع میں جناب معین الدین صاحب شاہ جہاں پوری کا مقدمہ اور آخر میں جناب مولانا شرف الدین صاحب افصحی ٹونکی کی تقریظ بھی شامل ہے۔

انیس و دبیر کے پانچ مرثیوں کا مجموعہ | مرتبہ نظامی صاحب بدایونی، تقطیع ۳۰×۲۰/۱۶، حجم (۹ ×۱۷×۶×۴۴×۱۵) ۲۴۴ صفحے، لکھائی، چھپائی کاغذ معمولی، قیمت عہ، ملنے کا پتہ نظامی پریس بدایون۔

ان میں تین مرثیے میر انیس کے ہیں جن کے مطلعے حسب ذیل ہیں۔

(۱) جب رن میں سربلند علی کا علم ہوا۔

۲۔ بخدا فارس میدان تہور تھا حُر۔

۳۔ پھولا شفق سے چرخ پہ جب لالہ زار صبح۔

اور دو مرزا دبیر کے ہیں۔

۱۔ پیدا شعاع مہر کی مقراض جب ہوئی۔

۲۔ گلگونہ رخسار فلک گرد ہے رن میں۔

یہ پانچوں مرثیے مختلف یونیورسٹیوں کے نصاب اردو میں داخل ہیں، نظامی صاحب نے طلبہ کی آسانی کے لیے ان کا مجموعہ ایک علیحدہ کتاب کی صورت میں شائع کر دیا ہے۔ آپ اس سے قبل میر صاحب کے مراثی بڑے اہتمام سے تین جلدوں میں شائع کر چکے ہیں جس کی تصحیح حضرت نظم طباطبائی مرحوم نے کی تھی۔ موجودہ مجموعہ میں بھی صحت کا خیال رکھا گیا ہے۔ گو کتابت کی بعض غلطیاں ہو گئیں اور ان کی وجہ سے صحت نامہ کی ضرورت پڑی۔ کتاب سے پہلے تب کا مختصر دیباچہ ہے، اس کے بعد مرثیے کی تعریف اور اس کا مفہوم، اور میر انیس اور مرزا دبیر کے مختصر حالات زندگی بیان کئے گئے ہیں، آخر میں مشکل الفاظ کی فرہنگ اور اشخاص کے ناموں کی تشریح ہے۔ یونیورسٹی کے طلبہ کے علاوہ عام طور شائقین ادب کے لئے یہ مجموعہ ایک بیش بہا تحفہ ہے۔

محشرستان (شائع کردہ مکتبہ عہد آفریں۔ حیدرآباد دکن تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۲۴۵ صفحے لکھائی، چھپائی اوسط درجہ کی، کاغذ عمدہ، قیمت مجلد عہ، غیر مجلد عمہ)

یہ حضرت محشر عابدی کے بارہ افسانوں کا مجموعہ ہے، دو ایک افسانے تاریخی ہیں باقی خیالی افسانہ نویسی کا جو معیار آجکل اردو میں ہے، اس کے لحاظ سے حضرت محشر صف اول میں جگہ پانے کے مستحق ہیں، آپ کے ان افسانوں کی زبان عام طور پر ستھری اور رواں ہے۔ اور اسلوب بیان نہ ورا

اثر سے خالی نہیں۔ قصہ کی ساخت اور ترتیب، سیرت نگاری وغیرہ میں سب افسانے یکساں نہیں ہیں اور یہ قدرتی بات ہے، کیوں کہ ان میں سے بعض بہ قول مولف غیر زبانوں سے ماخوذ ہیں، بعض ترجمہ ہیں۔ اور بعض طبع زاد ہیں۔ یہ بڑی فروگذاشت ہے کہ اپنے اور پرائے افسانوں میں تفریق نہیں کی گئی، اس لئے یہ اندازہ نہیں ہو سکتا کہ مولف کی طبیعت اور تخیل افسانے لکھنے کے لئے زیادہ مناسب ہے یا اخذ اور ترجمہ کے لئے۔ بہر حال اکثر افسانے ادبی اور فنی حیثیت سے قابل قدر ہیں، خدا کرے حضرت جوش ملیح آبادی کی یہ امید صحیح ثابت ہو جو انہوں نے کتاب کے تعارف میں ظاہر کی ہے کہ مولف ایک دن وہاں پہنچ جائیں گے، جہاں ہر بڑا افسانہ نویس پہنچ کر رہتا ہے۔

روح ادب | مولفہ سید حیدر عباس صاحب حیدر بی اے منشی فاضل رام نگر اسٹیٹ بنارس تقطیع چھوٹی حجم ۵۰ صفحے، لکھائی چھپائی، کاغذ عمدہ، قیمت ۸ر

اس چھوٹے سے رسالہ میں ان اغلاط کی تصحیح کی گئی ہے جو اردو بولنے والوں میں عام طور پر رائج ہیں، یہاں تک کہ پڑھے لکھے لوگوں کی زبان پر بھی چڑھ گئی ہیں، بعض لفظوں کی تصحیح کے ساتھ ان کے معنی کی تشریح بھی کر دی گئی ہے۔ مولف نے نہایت مفید کام انجام دیا ہے، مگر کتاب کا نام ضرورت سے زیادہ بلند آہنگ ہے۔ اور قیمت بھی کچھ زیادہ ہے۔

بچوں کا قاعدہ | مرتبہ عبد الغفار مدہولی، شائع کردہ مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ، تقطیع ۲۰×۳۰ حجم ۴۸ صفحے، کاغذ اور چھپائی عمدہ۔ لکھائی نہایت نفیس، تصاویر رنگین اور سادی اوسط درجے کی قیمت صرف چار آنے ۴ر۔

بچوں کو اردو کی الف، بے پڑھانا غالباً طریق تعلیم کا سب سے مشکل مسئلہ ہے۔ شکر ہے کہ اب قابل اور تجربہ کار معلم اس مشکل کو حل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، موجودہ قاعدہ میں مرجہ طریق صوت کو کہانی کے طریقے کے ساتھ ملا کر بچوں کے لئے بڑی آسانی پیدا کر دی گئی ہے۔ یہ قاعدہ

جامعہ ملیہ کے ابتدائی مدرسہ میں پڑھایا جارہا ہے۔ اور بہت کامیاب ثابت ہوا ہے ہمیں امید ہے کہ مکتب کے مدرس اور وہ سب لوگ جو بچوں کو الف بے پڑھانا چاہتے ہیں، اس قاعدے کو منگا کر آزمائش کریں گے، کیا عجب کہ وہ اس کی مدد سے اپنے اور بچوں کے وقت میں کفایت کر سکیں، اور بہت سی بیکار محنت اور الجھن سے بچ جائیں، اس کے ساتھ ایک ۲۰ صفحے کا چھوٹا سا رسالہ "رہنمائے قاعدہ" کے نام سے بھیجا جاتا ہے جس میں قاعدہ کو پڑھانے کا وہ طریقہ درج ہے جس کا تجربہ جامعہ ملیہ میں کیا گیا ہے۔ رہنمائے قاعدہ کی قیمت ۲ر ہے اور یہ بھی مکتبہ جامعہ ملیہ سے مل سکتا ہے۔

حیات نو یہ حالی مسلم ہائی اسکول پانی پت کا سہ ماہی تعلیمی اور ادبی رسالہ ہے۔ پہلے نمبر کو دیکھ کر یہ امید ہوتی ہے کہ اگر مالی دشواریاں نہ پیش آئیں تو یہ رسالہ اسکولوں کے سب تعلیمی رسالوں سے سبقت لے جائے گا۔ نظم اور نثر کے ۲۲ مضامین ہیں، جن میں مولانا حالی، مولوی وحید الدین سلیم حضرت حفیظ جالندھری، حضرت جوش ملیح آبادی کی نظمیں ہیں، خواجہ غلام الحسنین صاحب اور شیخ بدر الاسلام صاحب کے متعدد مقالے ہیں، چند طالب علموں کے مضمون ہیں، کچھ لطیفے، کھیل ہتے، نوٹ، خبریں، خصوصاً حالی مسلم ہائی اسکول کی خبریں ہیں۔ غرض بڑی سائز کے ۸۴ صفحوں میں ایسا نازنگارنگ اور دلچسپ رسالہ جمع کردیا گیا ہے کہ بے اختیار مدیر کے حسن ذوق اور حسن انتخاب کی داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ صرف ایک چیز بہت بے تکی ہے اور وہ پہلے صفحہ پر جلی قلم سے انسپکٹر مدارس اور ڈپٹی کمشنر کا شکریہ ہے محض اس بات پر کہ ان دونوں حضرات نے رسالہ کی اشاعت کی اجازت دے دی۔ یوں تو پوسٹ ماسٹر، مہتمم مطبع، کاتب، سنگ ساز، مشین مین اور بہت سے لوگوں کا شکریہ ادا کرنا چاہئے تھا، جنھوں نے اپنا فرض اسی طرح ادا کیا جیسے انسپکٹر صاحب اور ڈپٹی کمشنر صاحب نے، تعجب ہے کہ سالانہ چندہ کہیں درج نہیں، غالباً منیجر صاحب سے معلوم ہو سکتا ہے۔

روحِ تعلیم | ایک پندرہ روزہ تعلیمی رسالہ ہے جو کلکتہ سے مرزا سجاد علی خاں اختر بی اے، بی ٹی علیگ، کی ادارت میں انگریزی اور اردو میں شائع ہونا شروع ہوا ہے، پہلے نمبر میں ۲۰×۳۰ تقطیع کے ۲۴ صفحے ہیں جن میں سے ۱۶ صفحوں میں اردو کے اور ۸ صفحوں میں انگریزی کے اچھے خاصے مفید مضامین ہیں۔ جو قریب قریب سب مدیر کے لکھے ہوئے ہیں سالانہ چندہ پانچ روپیہ اور ایک پرچہ کی قیمت ۴ر ہے، مدیر روحِ تعلیم دہلی پنجابی اسکول نمبر ۵۔ قیرس لین کلکتہ سے مل سکتا ہے۔

نقیب پندرہ روزہ | مدیر صغیر الحسن صاحب ناصری۔ تقطیع ۲۰×۳۰، ۸ صفحات، قیمت سالانہ چندہ عا، مقامِ اشاعت پھلواری شریف ضلع پٹنہ،

یہ اخبار پندرہ روزہ اخبارِ امارت کا نعم البدل معلوم ہوتا ہے، جو امارت شرعیہ صوبہ بہار کا ترجمان تھا، اس کی پالیسی مضامین کی ترتیب، تہذیب و شائستگی سنجیدگی، متانت غرض ہر چیز وہی ہے جو جریدۂ امارت میں تھی، اس اخبار کی کامیابی کے لئے ہم دل سے دعا کرتے ہیں۔

مقدمہ تاریخ ہند قدیم، جلد اول | مصنفہ اکبر شاہ خانصاحب نجیب آبادی تقطیع ۲۰×۲۶، حجم ۲۱۲ صفحے قیمت عہ، ملنے کا پتہ۔ منیجر مکتبہ عبرت، نجیب آباد۔

فاضل مصنف کے علمی ذوق سے اردو زبان اور ہندوستان کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے حضرات بخوبی واقف ہیں، اس مقدمہ کی تصنیف کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ صرف ہندوستان کی نہیں بلکہ تمام دنیا کی قدیم تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے۔ اور اس میں بہت سے ایسے مسائل پر بحث کی گئی ہے جو پرانے زمانے کا حال پڑھتے ہوئے خیال میں آتے ہیں۔ فاضل مصنف نے اس میں چند مباحثے بھی شامل کر دیے ہیں جو ان کے اور ان کے علم دوست احباب کے درمیان خط و کتابت کے ذریعہ سے ہوئے، اور اس سبب سے ایک بے تکلفی سی پیدا ہو گئی ہے جو کتاب کو اور بھی دلچسپ بنا دیتی ہے۔

لیکن ہماری رائے میں اس کتاب کی علمی وقعت بہت زیادہ ہو جاتی اگر فاضل مصنف نے اپنے موضوع کو زیادہ محدود رکھا ہوتا، اور ایسے مسائل کو جیسے انسانی عمر کا پیمانہ جن پر محض وقت گذارنے کے لئے گفتگو کی جا سکتی ہے، علمی حیثیت دینے کی کوشش نہ کی ہوتی۔ مضمون کی ترتیب یا تو صحیح نہیں یا ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر پہلے اٹھارہ باب خارج کر دیے جائیں۔ تو اصل کتاب کو کوئی نقصان ہوگا۔ لیکن مضامین کے انتخاب میں فاضل مصنف نے ممکن ہے ایسے لوگوں کی دلچسپی کا لحاظ کیا ہو جن سے وہ واقف ہیں اور جن کے مذاق کا ہم کو کچھ علم نہیں۔ دیباچے اور کتاب کے دوران میں بھی فاضل مصنف نے اپنے ذاتی معاملات کا بہت ذکر کیا ہے، اور یہ بات ہمیں ایک علمی تصنیف میں مناسب معلوم نہیں ہوتی، ہر مسئلے میں خیال ہوتا ہے کہ فاضل مصنف اپنے خاص احباب سے مخاطب ہیں، اور وہ ہر مسائل کے انھیں پہلوؤں پر بحث بھی زیادہ کرتے ہیں، جن پر کسی دوست سے خط و کتابت گفتگو ہوتی ہے۔

اکثر مقامات پر بحث کی طوالت سے خاصی الجھن ہوتی ہے۔ اور جہاں مختلف علما اور مورخین کے اقوال بیان کئے گئے وہاں تو عقل گم ہو جاتی ہے، ہمارے نزدیک مصنف کا فرض یہ ہے کہ وسیع مطالعے کے باوجود اپنی رائے بھی رکھے، اور اگر دوسروں کی رائے یا ان کے اقوال بیان کرے تو اس طرح سے کہ پڑھنے والے کے لئے ان کا سمجھنا اور بھی آسان ہو جائے۔ کسی مسئلے پر پچاس آدمیوں کی رائے الگ الگ لکھ دینا اس مسئلہ کو حل کرنا نہیں بلکہ اور الجھا دینا ہے۔ جو شخص معاملہ کو خود سمجھتا ہے اور دوسروں کو سمجھانا چاہتا ہے وہ یہ طریقہ اختیار نہیں کرتا، اگر پچاس آدمیوں کے خیالات بیان کرنا ضروری ہوں تو انھیں کسی خاص ترتیب اور مفصل تشریح کے ساتھ بیان کرنا چاہئے۔ اگر مطالعے کی وسعت ہی ظاہر کرنا ہو تو آخر یا شروع میں کتب حوالہ کی فہرست دینا بہت زیادہ مفید ہوتا ہے۔

ان اعتراضات سے ہمارا مطلب صرف یہ ہے کہ یہ تصنیف علمی تحقیق اور علمی طرز بیان کا اچھا نمونہ نہیں ہے۔ لیکن ان لوگوں کے لئے جو زیادہ دقیق علمی بحث سے گھبراتے ہیں، یہ تصنیف بہت مناسب ہے، اکبر شاہ خاں صاحب بہت سلیس زبان لکھتے ہیں، اور کتاب میں بہت سے مسائل ایسے ہیں جنھیں خالص تاریخی بحث میں تو شامل نہ کرنا چاہئے تھا، لیکن وہ اکثر اردو داں حضرات کے لئے دلچسپی کا باعث ہوں گے۔

دنیا کی رفتار

ہندوستان

اوائل مئی میں مہاتماجی نے قید خانے سے نکلتے ہی قائم مقام صدر کانگریس کو یہ مشورہ دیا کہ وہ تحریک نافرمانی کو چھ ہفتے کے لئے ملتوی کردیں چنانچہ ایسا ہی ہوا، مگر اس مدت کے گذرنے پر بھی مہاتماجی کے جسم پر روزے کا اثر باقی تھا اور وہ کسی مجلسِ شوریٰ میں شریک نہیں ہوسکتے تھے، اس وجہ سے تحریک چھ ہفتے کے لئے پھر ملتوی کی گئی، اور یہ اعلان ہوا کہ وسط جولائی میں کارکنانِ کانگریس کا ایک نجی جلسہ ہوگا، جس میں یہ طے ہوگا کہ آئندہ کیا کیا جائے۔ مہاتماجی کے پاس ان کی رہائی کے بعد ہی لوگوں کے خطوط آنے لگے تھے، کہ تحریک نافرمانی کو ملتوی کردینا چاہئے، اور کوئی دوسری صورت نکالنی چاہئے مہاتماجی کوئی فیصلہ اس وقت تک نہیں کرنا چاہتے تھے جب تک وہ ان لوگوں سے جو مختلف صوبوں میں کانگریس کا کام کررہے تھے مشورہ نہ کرلیتے، با اینہمہ اخبارات میں یہی خبر گرم تھی کہ تحریک نافرمانی باحسن وجوہ ختم کردی جائے گی۔

۱۲ر جولائی کو پونا میں جلسہ ہوا، جس میں مختلف صوبوں کے تقریباً دوسو کارکن موجود تھے پہلے تو مہاتماجی نے لوگوں کو مدعو کرنے کی غرض و غایت بتائی جو یہ تھی کہ وہ صحیح طور پر اندازہ کرنا چاہتے کہ قوم تحریک کو جاری رکھنے کے لئے تیار ہے یا نہیں اور عام طور پر آئندہ لائحہ عمل کے متعلق لوگوں کے کیا خیالات ہیں۔ چنانچہ انہوں نے یہ درخواست کی کہ ہر صوبہ کا ایک نمائندہ اپنے صوبہ کی کیفیت بیان کرے دو دن تک یہ سلسلہ جاری رہا اور مقرر پر مقرر کھڑا ہوکر یہی کہتا تھا کہ کام کرنے والے تھک گئے ہیں، آدمی نہیں ملتے، تحریک نہیں چل سکتی، خصوصاً بمبئی کے کارکن تحریک کو ملتوی کردینے پر بہت زور دے رہے تھے۔ انہوں نے یہ تو نہیں کہا کہ وہ لوگ تھک گئے ہیں بلکہ ان کی

تقریروں سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ کانگریس کے موجودہ مطمح نظر سے بمبئی کی مزدور جماعت کے دلوں میں کوئی جوش نہیں پیدا ہوتا، اور وہ موجودہ حالات میں تحریک میں شریک نہیں ہونا چاہتے۔ اس لئے ان کا خیال تھا کہ تحریک کو جو دم توڑ رہی ہے۔ تھوڑے دنوں میں بالکل مردہ ہو جائے گی، اپنے ہاتھوں ہی سے دفن کر دیا جائے۔ اور کوئی دوسری صورت ایسی نکالی جائے۔ جس سے مزدور اور کسان کانگریس میں جوش و خروش کے ساتھ شریک ہو جائیں اس کی صورت ان کے خیال میں صرف یہ ہو سکتی تھی کہ کانگرس کا مطمح نظر بدل دیا جائے، اور بجائے اس کے کہ ایک مبہم اور غیر متعین مقصد پیش نظر ہو، جیسا کہ آج کل ہے، ایک ایسا لائحہ عمل تیار کیا جائے جس کا بڑا عنصر کسانوں اور مزدوروں کی حالت کا سدھارنا ہو، آجکل کانگریس میں زمینداروں اور کارخانوں کے مالکوں کا اثر بالواسطہ یا بلا واسطہ اتنا بڑھا ہوا ہے کہ کسانوں اور مزدوروں سے اس میں شرکت کی توقع بالکل بیکار ہے، ان کی مدد اور حمایت حاصل کرنے کے لئے جس تبدیلی کی ضرورت ہے وہ ان لوگوں کے خیال میں اسی وقت ممکن ہے جب تحریک نافرمانی ملتوی کر دی جائے اور ٹھنڈے دل سے نئے لائحہ عمل پر غور کیا جائے۔

دوسرے صوبوں کے نمائندوں میں سے بھی ایک دو کے یہی خیالات تھے، لیکن عام طور پر لوگ یہی کہتے رہے کہ ۳۲ء کی تحریک بغیر تیاری کے شروع کر دی گئی تھی اور کام کرنے والوں میں اب بالکل دم نہیں رہا ہے، تیسرے دن مہاتما جی نے ایک طویل تقریر کی، جس میں شروع سے آخر تک لوگوں کے جذبات کو ابھارنے کی کوشش کی گئی تھی، اس تقریر کا مضمون یہ تھا کہ جب تک حکومت ہند سے کوئی سمجھوتا نہ ہو جائے تحریک نافرمانی کو ملتوی کرنے میں بڑی ذلت کا سامنا ہے۔ یہ معلوم کرنے کے بعد عام طور پر قوم تحریک میں جوش کے ساتھ شریک ہونے کے لئے تیار نہیں ہے انہوں نے یہ تجویز پیش کی کہ بجائے جماعتی نافرمانی کے انفرادی نافرمانی رائج کی جائے۔ اور جو لوگ مناسب سمجھیں خود اپنی ذمہ داری پر حکومت کے قوانین کی نافرمانی کریں اس طرح بات بھی رہ جائیگی اور جو لوگ تھک گئے ہیں۔ ان کو آرام کرنے کا موقع بھی مل جائے گا، اس تقریر کا تو اتنا زیادہ اثر نہیں پڑا لیکن اس کے

بعد جو تقریر پنڈت مالوی جی نے کی اس سے لوگ بہت متاثر ہوئے، انھوں نے سرے سے اسی بات سے انکار کیا کہ قوم تھک گئی ہے اور یہ دعویٰ کیا کہ جتنے آدمیوں کی ضرورت ہوگی وہ فراہم کریں گے انھوں نے مہاتماجی کی انفرادی نافرمانی کی تجویز کی بھی مخالفت کی اور یہ کہا کہ کسی قسم کی تبدیلی شکست کی مرادف ہوگی، وہ یہ چاہتے تھے کہ اگر حکومت سے کوئی سمجھوتا نہ ہو تو جماعتی نافرمانی کی تحریک پھر شروع کی جائے۔ مالوی جی جیسی مشہور اعتدال پسند کی زبان سے اس قسم کی پرجوش تقریر سُنکر بھلا کار کنانِ کانگریس کے گرم خون میں کیوں کر نہ جوش آتا، نتیجہ یہ ہوا کہ جب رائے لی گئی تو نہ تو تحریک کے التواکی تجویز منظور ہوئی اور نہ انفرادی نافرمانی کی بلکہ کثرت آراسے یہ طے پایا کہ حکومت سے سمجھوتا نہ ہونے کی صورت میں جماعتی نافرمانی پھر شروع کی جائے، اس کے بعد مہاتماجی کو اس کی اجازت دی گئی کہ وہ وائسرائے سے غیر مشروط ملاقات کی درخواست کریں، اور ممکن ہو تو ایسے سمجھوتے کی کوشش کریں جس سے کانگریس کے وقار کو ٹھیس نہ لگے۔

اس طرح تمام اخبارات کی پیشین گوئیوں پر پانی پھر گیا۔ اور ایسا فیصلہ ہوا کہ جس کی کسی کو توقع نہ تھی، اس جلسہ کی کارروائی میں ایک بات یہ عجیب و غریب تھی کہ تحریک کی التوا کے موافق زیادہ تر نوجوان تھے، اور مخالف زیادہ تر بوڑھے۔ عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ بڈھوں کا خون ٹھنڈا ہوتا ہے اور نوجوانوں کا گرم، اس لئے بادی النظر میں یہ معلوم ہوگا کہ اس جلسہ کے شرکا سے متعلق یہ قاعدہ کلیہ غلط ثابت ہوا لیکن واقعہ یہ نہیں ہے بلکہ اس عجیب و غریب صورت حال کی وجہ کچھ اور ہے۔ کانگریس کے وہ رہنما جو اب بوڑھے ہوگئے ہیں اس دور کی یادگار ہیں جب ملک میں سیاسی بیداری کا نام و نشان نہ تھا، اور اس کی ضرورت تھی کہ لوگوں کے جذبات کو طرح طرح سے ابھارا جائے۔ ان رہنماؤں نے پچھلے پندرہ سال کے عرصہ میں دوسروں کے جذبات کے ابھارنے کی جو کوششیں کیں ان کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خود بھی جذبات کے بندے ہوگئے، اب ان کی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ آجکل کے نوجوانوں کے دلوں میں اس قسم کے جذبات پیدا ہی نہیں ہوتے جن سے خود ان لوگوں کے دل معمور ہیں، محض کانگریس کا نام یا اس کی ساکھ رکھنے کی خواہش نوجوانوں کو اتنی نہیں

ہے جتنی بوڑھوں کو۔ بوڑھوں کا تمام تر سرمایہ ماضی کے کارنامے ہیں۔ اور نوجوانوں کی زندگی اب شروع ہوئی ہے، نوجوانوں کا میدان عمل مستقبل ہے ان سے پارینہ بتوں کی پرستش کی توقع باطل ہے، آجکل کے نوجوانوں میں اشتراکیت کی ہلکی سہی لیکن ایک لہر ضرور دوڑ رہی ہے، اس میں شک نہیں کہ ہندوستان میں بہت کم لوگ ایسے ہیں جنھوں نے اشتراکیت کے نظریوں پر ہر پہلو سے غور کیا ہو، لیکن ان کے جذبات کو اگر کوئی چیز ابھارتی ہے تو وہ اشتراکی حکومت کی خواہش ہے، یہ خواہش ابتدائی حالت میں ہے اور ابھی تک ایک دھندلی خواب کی سی کیفیت رکھتی ہے، لیکن اتنا ضرور ہے کہ پرانی تحریکوں اور پرانے رہنماؤں کا اثر نوجوانوں کے دلوں سے کم ہوتا جاتا ہے۔ کانگریس میں نوجوان شریک ہیں ان کی بھی کم وبیش یہی کیفیت ہے اور یہی وجہ ہے کہ انھیں موجود تحریک نافرمانی سے اتنا لگاؤ پیدا نہیں ہوتا ہے جتنا ان بوڑھوں کو جن کا سرمایہ حیات یہی تحریک ہے۔

پونا کانفرنس کے اس فیصلہ کے بعد گاندھی جی نے وائسرائے کو ایک تار دیا جس میں غیر مشروط ملاقات کی درخواست کی تھی اور ملاقات کا مقصد صلح کے امکانات پر گفتگو کرنا بیان کیا تھا، وائسرائے نے اس وقت ملاقات سے انکار کر دیا۔ جب تک مہاتما جی تحریک نافرمانی کو فسوخ نہ کر دیں وہ ستیاگرہی ہیں اور ان کو صلح کے لئے ہاتھ بڑھانے میں عار نہیں، لیکن حکومت ہند سے جو سراسر جبر وتشدد پر مبنی ہے یہ توقع کرنا کہ وہ ایسے وقت میں جب تحریک نافرمانی نزع کی حالت میں ہے کسی اخلاقی یا روحانی اثر سے متاثر ہوکر صلح کے لئے پیش قدمی کرے گی ایک امید موہوم سے زیادہ نہیں۔ ۱۵ر جولائی کو وائسرائے کا انکاری جواب مل گیا تھا لیکن چونکہ تحریک نافرمانی یکم اگست تک ملتوی کی جاچکی تھی اس لئے کسی فوری کارروائی کی ضرورت نہیں سمجھی گئی اور لوگ پونا کے فیصلہ پر غور کرنے اور آئندہ کے لئے تیاری کرنے کے لئے اپنے اپنے مرکز پر پہنچ گئے، گاندھی جی نے بھی احمد آباد کا رخ کیا اور اپنے آشرم سے قریب ہی قیام فرمایا۔ اپنی ایک قسم کی وجہ سے وہ آشرم میں قیام تو نہ کر سکے لیکن ان کا بیشتر حصہ ان کا آشرم میں ہی گذرتا تھا چند دنوں کے بعد یک بیک یہ خبر شائع ہوئی کہ مہاتما جی نے اپنے آشرم کو بند کر دیا، اور اسکی

وجہ انھوں نے یہ بیان کی کہ تحریک نافرمانی کی وجہ سے بہت سے لوگوں کی تمام جائداد تلف ہوگئی ہے اور چونکہ میرے پاس سوائے آشرم کے اور کوئی جائداد مادی نہیں ہے اس لئے میں اسے خود ہی بند کرتا ہوں، دو تین دن کے بعد یہ معلوم ہوا کہ یہ محض پیش بندی تھی، اور آشرم والوں سے مہاتما جی کوئی اور کام لینا چاہتے تھے، تجویز یہ تھی کہ اپنے آشرم کے ان افراد کے ساتھ جو تیار ہوئے مہاتما جی پا پیادہ بردولی کے تعلقے کا دورہ کرنا چاہتے تھے، اور ان کا مقصد ان کسانوں کے ساتھ ہمدردی کا اظہار تھا۔ جو تحریک نافرمانی میں بالکل تباہ ہوگئے تھے جسب معمول انھوں نے حکومت کو اپنے اس ارادے کی اطلاع دیدی تھی چنانچہ روانہ ہونے سے پہلے ہی وہ اور ان کے ۳۶۔ ساتھی گرفتار کر لئے گئے، یہ گویا انفرادی نافرمانی کی وجہ تھی، مہاتما جی کو دوسرے روز پولیس پونا لے گئی لیکن وہاں پہنچتے ہی ان کو اس حکم کے ساتھ رہا کر دیا کہ وہ ایک مخصوص علاقے سے باہر لیکن پونا کے حدود کے اندر قیام کریں، انھوں نے اس حکم کی نافرمانی کی اور ممنوعہ علاقے کے اندر ہی بیٹھے رہے چنانچہ رہائی کے ایک گھنٹے بعد ہی پھر گرفتار کر لئے گئے، مقدمہ عدالت میں پیش ہوا، اور ایک سال کی سزائے قید ملی اس طرح تین مہینے کی آزادی کے بعد مہاتما جی پھر اپنے پرانے مسکن، یروداجیل میں پہنچ گئے۔

الغرض نافرمانی کی تحریک کا اثر ملک میں بہت ہی خفیف نظر آتا ہے، مشہور کانگریسی رہنماؤں میں سے ابھی صرف سری جت راجگوپال اچاری اور مسٹر آسف اس سلسلہ میں گرفتار ہوئے ہیں، کانگرس کے کارکنوں میں سے شاید مشکل سے ایک سو آدمیوں نے اب تک اس نافرمانی میں حصہ لیا ہوگا، بظاہر کوئی امید معلوم نہیں ہوتی، کہ اس سے زیادہ جوش کا اظہار کیا جائے گا۔ کانگرس والے کچھ تو تھکے ہارے ہیں۔ کچھ کاونسلوں میں جانے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ اور نوجوان کانگرسی کچھ اور ہی خواب دیکھ رہے ہیں، اگرچہ ابھی تک نہ تو کاونسل میں جانے والوں نے کوئی عملی قدم اٹھایا ہے اور نہ نوجوانوں نے، لیکن وہ دن دور نہیں ہے جب دو جماعتیں دو مختلف وجوہ کی بنا پر کانگرس کی موجودہ راہ سے الگ ہو کر اپنے لئے نئی راہیں ڈھونڈیں گی، کون کہتا ہے کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ اور سیاسی تحریک کا اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا۔



ممالکِ غیر

معاشی کانفرنس | جولائی کے پرچے میں ہم نے ان مسائل کا تذکرہ کیا تھا جن کے حل کرنے کے لئے دنیا کے ۶۶ ملکوں کے نمائندے لندن میں جمع ہوئے تھے، ساری دنیا کی نگاہیں اس کانفرنس پر لگی ہوئی تھیں، اور امید تھی کہ معاشی کساد بازاری کو ختم کرنے کے لئے شاید دنیا کے مدبروں کی یہ متحدہ کوشش کوئی راہ نکال سکے گی، لیکن کانفرنس شروع ہوئی اور ختم بھی ہو گئی، بین الاقوامی تعاون پر قومی خود غرضی غالب آئی، معیشت عالم کے جاں بلب مریض کو روبصحت کرنے کے لئے ضرورت تھی کہ اس کے جسم میں اعتماد باہمی کے خون کی پچکاری دی جاتی، سب معالج اس پر متفق ہوئے مگر کوئی تندرست قوم نہ ملی جس کے جسم سے یہ خون لیا جاتا، سب کے خون میں خود غرضی اور شبہ کے جراثیم بھرے پڑے تھے، چنانچہ ۶۶ قوموں کے ۱۶۸ نمائندے لندن میں جمع ہوئے اور مختصر روداد یہ ہے کہ۔ نشستند، گفتند و برخاستند۔

ناظرین کو یاد ہو گا کہ ۱۹۲۷ء میں بھی تمام دنیا کی ایک معاشی کانفرنس جنیوا میں ہوئی تھی۔ اس کانفرنس اور اس کانفرنس کے ارکین کی فہرست پر نظر ڈالیئے تو معلوم ہو جائے گا کہ اس چھ سال میں معاشی دنیا انفرادی آزادی سے ہٹ کر قوم پرستی کی طرف کس تیزی سے بڑھی ہے۔ پہلی کانفرنس میں بڑے بڑے ساہوکار، کارخانوں کے مالک اور تاجر تھے اور اس دوسری میں حکومتوں کے نمائندے۔ پہلی کانفرنس کی ساری کارروائی کا خلاصہ یہ تھا کہ معاشی زندگی میں تنگ قوم پرستی کا غلبہ سخت مضرتیں پیدا کر رہا ہے اور عالمگیر تجارت میں طرح طرح کی رکاوٹیں پیدا کرتا ہے، اسے جہاں تک ہو سکے ہٹانا چاہئے، دوسری کانفرنس میں حکومتوں کے نمائندے اپنے اپنے ملک کے فائدے کے لئے تجاویز پیش کرتے تھے اور جب یہ دوسروں کو پسند نہ ہوئیں تو خود اپنی قومی معیشت کو کافی بالذات بنانے اور ہو سکے تو دوسروں کو نیچا دکھانے کا تہیہ کر کے واپس گئے ہیں۔ پہلی کانفرنس کی قرار دادیں شرمندۂ عمل نہ ہو سکی تھیں، دوسری کانفرنس سے جو لوگ بچھڑے

ہیں وہ بلا سے اپنے ملک کو فوجی جنگ میں نہ سہی معشیت کے تباہ کن معرکوں میں ضرور مبتلا کر سکیں گے۔

کانفرنس کے شروع ہونے سے دو مہینے پہلے مسٹر میکڈانلڈ امریکہ تشریف لے گئے تھے بظاہر ان میں اور صدر جمہوریت میں جو گفتگو ہوئی وہ بہت حوصلہ افزا تھی، مسٹر میکڈانلڈ میٹھی میٹھی باتیں کرنے میں استاد کامل ہیں۔ خیال تھا کہ ان کے امریکہ تشریف لیجانے کا نتیجہ یہ ضرور ہوگا کہ امریکہ قرضۂ جنگ کے معاملے کو بھی اس کانفرنس میں یکسو کر دے گا، لیکن میٹھی باتوں سے تو آموں نہ پھلتے ہیں، امریکہ اپنی ضد پر اڑا رہا کہ اس کانفرنس کو قرضۂ جنگ کے مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں، اور میکڈانلڈ نے افتتاحی تقریر میں قرض کا ذکر کیا تو امریکی نمائندے سخت برہم ہوئے۔ کانفرنس شروع ہونے کے دوسرے دن برطانیہ نے امریکہ کو ۱/۲ ۷ کروڑ کی قسط کی جگہ ایک کروڑ ڈالر قرضہ کے حساب میں ادا کئے، دوسرے ملکوں نے بھی اس کی تقلید کی چنانچہ ۱۵ جون کو جو قسطیں واجب الادا تھیں ان میں ۸۰ فیصدی ادا ہوئیں اور وہ بھی سونے کی جگہ چاندی دے کر۔ اگرچہ قرضداروں کے سر سے ۱۵ جون کا خوف یوں آسانی ٹل گیا لیکن قرض کا قصہ ابھی باقی ہے اور اب قسط کا ایک جزو ادا کر کے برطانیہ اور اکثر ممالک نے قرض کے وجود کو پھر تسلیم کر لیا ہے۔

ادائے قرض پر اس شدید اصرار نے کانفرنس کی فضا تو پہلے ہی دن سے بگاڑ دی اور پھر آخر تک کسی کے سنبھالے نہ سنبھلی۔

برطانوی وزیر مال نے قرضہ جنگ اور قیمتوں کے اتار کو دنیا کی موجودہ بدحالی کی وجہ بتلایا۔ تو امریکہ کے نمائندے مسٹر ہل نے معاشی قوم پرستی اور بیجا محاصل کو اس کا ذمہ دار گردانا یہ عجیب بات تھی کہ امریکہ کا نمائندہ ادھر قوم پرستی کی برائی کر رہا تھا اور ادھر امریکہ میں ایک ایسے قومی معاشی منصوبہ کی تکمیل ہو رہی تھی، جس کا مقابلہ اگر کیا جا سکتا ہے تو روس کی اشتراکی یا اٹلی کی فاشستی معیشت سے، ساری معاشی زندگی پر صدر کو نہایت وسیع اختیارات دے دئے گئے ہیں۔ اور وہ قیمتوں پر، اجرتوں پر، اوقات کار پر، وسعت کاروبار پر، ان اختیارات سے

پورا پورا اثر ڈال رہا ہے۔ اور رفتہ رفتہ امریکہ کی معاشی زندگی آزاد انفرادی سرمایہ داری سے ایک منظم ریاستی اور پابند قومی معشیت کی شکل اختیار کرتی جاتی ہے۔

یہ دو رخی امریکہ نے پہلے دن سے اختیار کی تھی۔ مسٹر ہل جو کانفرنس کی امریکی نمائندوں کے سردار تھے۔ قوم پرستی کے سخت مخالف اور بین الاقوامی تجارت کو پابندیوں سے چھڑانے کے بڑے حامی تھے۔ ادھر صدر جمہوریہ کے مشیر خاص پروفیسر مولی قومی معشیت کو بین الاقوامی تجارت پر فوقیت دے رہے تھے، امریکہ چاہتا یہ تھا کہ پروفیسر مولی کی بات مان کر گھر کی حالت درست کرے۔ ڈالر کا تعلق سونے سے کاٹ کر ڈالر کی قدر مبادلہ گھٹائے یعنی امریکہ میں مال کی قیمت بڑھائے، تاکہ قیمتوں کے بڑھنے سے کاروبار کو فروغ ہو۔ بین الاقوامی تجارت میں بھی امریکہ کا حصہ اس طرح بڑھے کہ ڈالر کی قدر مبادلہ کم ہونے سے دوسرے ممالک کے لوگ امریکہ سے مال خریدیں۔ دوسری طرف مسٹر ہل کی رائے دنیا کے سامنے پیش کرا کر اپنے مال کے لئے دنیا میں منڈیاں پیدا کرے، اور قرضہ جنگ کے دباؤ سے دوسرے ممالک میں اپنی تجارت کے لئے رعایتیں حاصل کرے۔

یورپ کے ممالک کو اصرار تھا کہ قرضہ کا قصہ ختم کرو، اور ڈالر کی قیمت کو کسی ایک نقطے پر قائم کرو۔ تاکہ ہم بھی تو کچھ دم لے سکیں۔ لیکن جس طرح مدت سے ان معاملات پر سمجھوتا نہیں ہوا اس کانفرنس میں بھی نہ ہو سکا۔ اور کیسے ہوتا جب امریکہ اپنی فکر میں تھا اور برطانیہ اپنی نوآبادیوں سے مل کر ساری دنیا کے مقابلے میں اپنی ایک علیحدہ معاشی دنیا بنانے کی تدبیریں کر رہا تھا۔

چنانچہ قومی خودغرضیوں کے اس طوفان میں امید کی کشتی غرق ہوگئی، اور اب جو باقی رہا ہے وہ یہ کہ گیہوں پیدا کرنے والے بعض ملک مل کر یہ کوشش کر رہے ہیں کہ رقبہ کاشت کو کم کر کے گیہوں کی قیمت بڑھائیں۔ اور اس معاملہ میں بھی امریکہ کی یہ دھمکی پہلے سے موجود ہے کہ اگر باہمی سمجھوتے سے بات طے نہیں ہوئی تو ہم اپنے بے حساب ذخیرۂ گندم کو یورپ میں کوڑیوں کے مول بیچیں گے۔

جرمنی اور آسٹریا ان دونوں ملکوں میں ایک ہی قسم کے لوگ بستے ہیں، زبان ایک ہی، تمدن ایک، ظاہر ہے کہ دونوں میں اس کی خواہش ہوگی کہ مل کر ایک متحد ریاست بن جائیں، جو دنیا میں المانی مشن کی علم بردار ہو، لیکن تمدنی اور لسانی اعتبار سے جو تجویز پسندیدہ ہے وہ اب تک سیاسی اور عملی وجوہ سے ناقابلِ عمل رہی ہے، اور تاریخ میں یہ اس حقیقت کی تنہا مثال نہیں کہ اعلیٰ تمدنی مصالح پر ادنیٰ عملی دشواریاں غالب آجاتی ہیں۔

جب بسمارک جدید جرمن ریاست کی بنیاد ڈال رہا تھا، تو آسٹریا ایک ذرا سے اشارے پر اس میں شریک ہونے کو تیار تھا۔ لیکن بسمارک نے یہ اشارہ بھی نہ کیا، اس لئے کہ آسٹریا کیتھولک ہے۔ اور بسمارک نہیں چاہتا تھا کہ بویریا اور رہائن کے خطے کے کیتھولک عنصر کو جرمن ریاست میں اور تقویت پہنچے، وہ پروٹسٹنٹ پروشیا کو جرمن ریاستوں کا سردار بنانا چاہتا تھا، اس لئے آسٹریا کو الگ ہی رکھا گیا۔ علاوہ بریں یہ بات بھی تھی کہ اس وقت آسٹریا کے ساتھ اور متعدد نسلوں کے لوگ بھی اس اتحادِ المانی میں شریک ہوجاتے، اور بسمارک ایک خالص المانی ریاست بنا رہا تھا، اور اس میں دوسری نسلوں کو شامل کرکے پھوٹ کا بیج بونا نہیں چاہتا تھا۔

لیکن جنگ عظیم نے صورت حال بالکل بدل دی۔ جرمنی میں پروشیا کا پہلا سا زور نہ رہا آسٹریا سے بھی اس کے غیر المانی علاقے جدا ہوگئے۔ آسٹریا کے ساتھ اتحاد ہوسکے تو جرمنی کو اب شکست کے بعد وہ چیز حاصل ہوجائے جو فتح سے بھی بمشکل حاصل ہوتی۔ ادھر آسٹریا کے لئے زندگی کا سامان ہوجائے، اس لئے کہ اب نہ اس کی تجارت کے لیے کوئی منڈی ہے اور نہ آرام اور سکون کی زندگی کے لئے کافی معاشی وسائل۔ چنانچہ جنگ ختم ہونے کے بعد سے برابر ان دونوں ملکوں میں اتحاد سیاسی کی کوشش جاری ہے۔

فرانس اور اس کے حلیفوں نے اس اتحاد کی برابر سختی سے مخالفت کی ہے، کہ جرمنی کا قوت پکڑنا انھیں نہیں بھاتا، صلح نامہ ورسائی اور صلح نامہ سان جرمین دونوں میں اس اتحاد کے خلاف صریح دفعات شامل کئے گئے ہیں۔ لیکن صلح ناموں کے دفعات سے ایسے مسائل ختم نہیں کئے جاسکتے،

آسٹریا کو اپنی بے بسی کا احساس ہے اور اس نے صلح کے بعد سے برابر یہ کوشش کی ہے کہ جرمنی سے مل جائے، لیکن جب اندرونی واقعات اور مالی ضروریات دوسرے ملکوں سے مدد لینے پر مجبور کرتی ہیں تو عارضی طور پر اس خواہش کو دبا دیا جاتا ہے۔

لیکن اس وقت کچھ حالت اور نظر آتی ہے، پہلے آسٹریا اتحاد کا بہت خواہاں تھا، اس وقت جرمنی اس کے درپے ہے اور آسٹریا کی موجودہ حکومت نہایت سختی سے اس کی مخالفت کر رہی ہے اور اس سلسلے میں سرحد پر گولی چلنے کی نوبت بھی آچکی ہے۔ جس سے معمولی حالات میں جنگ کا آغاز ممکن تھا۔

عجیب بات ہے کہ آسٹریا کا موجودہ وزیر اعظم (ڈولفس) جو جرمن اتحادی کوششوں کی اس قدر شدت سے مخالفت کر رہا ہے، خود بھی پہلے اتحاد کا بڑا حامی تھا۔ ابھی کوئی سال بھر پہلے ڈولفس نے اتحاد کی تائید کی تھی، لیکن احتیاج بری بلا ہے۔ ڈولفس کا جوش اتحاد فرانس سے سوا چار کروڑ ڈالر کا قرضہ لینے کی خاطر ٹھنڈا پڑ گیا۔ اور آج وہ اس اتحاد کا سخت مخالف ہے۔ لیکن آسٹریا کی طرف سے جتنی سرد مہری ہے۔ جرمنی میں اسی قدر گرم جوشی، اور ہونا بھی چاہئے اس لئے کہ آسٹریا سے اتحاد کی کوشش میں کامیابی کی اس سے زیادہ امید ہے جتنی پولینڈ یا فرانس یا اٹلی سے جرمن علاقے واپس لینے کی۔ چنانچہ جرمنی کوئی ۶۰ لاکھ ڈالر آسٹریا میں تبلیغ و اشاعت کے کام پر صرف کر چکا ہے، اور ملک کے گوشہ گوشہ میں جرمن قومی اشتراکی (نازی) مبلغ اتحاد کا پیغام پہنچا چکے ہیں۔ اور ہر چند ڈولفس بھی ترکی بہ ترکی جواب دے رہا ہے۔ اور جرمن اتحاد کے مقابلہ میں آسٹروی قوم پرستی کی تبلیغ میں سخت کوشاں ہے۔ لیکن گمان یہی ہے کہ قومی اشتراکیت اور جرمن اتحاد کا تخیل زیادہ قوی ثابت ہوگا، اور دیر سویر آسٹریا میں بھی قومی اشتراکی جماعت برسر اقتدار آجائے گی، اور اس کے ساتھ ہی دونوں ملکوں کا اتحاد صلحناموں میں سرمو تغیر کیے بغیر ایک واقعے کی صورت میں دنیا کے سامنے ہوگا۔

جاپان | جمعیت اقوام نے جاپان کو قصوروار ٹھہرایا، جاپان نے جمعیت کو چھوڑ دیا، اراکین جمعیت نے اپنی ناخوشی کا اظہار کیا۔ لیکن جاپان کا تسلط چین پر قائم ہو گیا۔ اور چینی اب براہ راست بلا جمعیت کی وساطت کے جاپان سے صلح کی بابت بات چیت کر رہے ہیں، جاپان نے ملک بھی فتح کیا اور یہ بھی عملاً منوا لیا کہ منچوریا کے مسئلے میں دوسری قوموں کو بولنے کا کوئی حق نہیں، چین نے دیکھ لیا کہ جمعیت پر بھروسہ کرنا اپنے کو دھوکا دینا ہے۔ آخر کار خود اپنے پیروں پر کھڑا ہونا پڑتا ہے اور اگر یہ کمزور ہیں تو کوئی سہارا کام نہیں دیتا۔

چین کو امریکہ پر بڑا بھروسہ تھا، جمعیت اقوام بھی امریکی تعاون کی توقع ہی پر احتجاج کرتی تھی۔ لیکن کامیابی عجیب طلسم ہے۔ امریکہ کا رنگ بھی بدل گیا، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صدر روزویلٹ نے اس معاملہ میں ہوور کے مسلک کو چھوڑ کر پھر پرانی ولسن کی سیاست اختیار کر لی، اور چین میں جاپان کے "اغراض خاص" کا اعتراف کر لیا۔ شاید یہ محض اتفاقی امر نہ تھا کہ جاپان نے چین میں اپنا نیا اقدام فوجی اس وقت کیا جب ان کا سفیر خاص وائی کونٹ اشی واشنگٹن میں صدر امریکہ سے سیاسی اور معاشی مسائل پر تبادلہ خیال کرنے کے لئے گیا ہوا تھا۔

اپنی اس فوجی اور سیاسی کامیابی پر پھول کر اگر جاپان پاؤں پھیلائے تو کیا تعجب ہے، چنانچہ اب جاپان کا مطالبہ ہے کہ ۱۹۳۵ء میں برطانیہ امریکہ اور جاپان کے بحری جہازوں کی نسبت ۱۰ - ۱۰ - ۱۰ کی یعنی سب کی ایک سی حیثیت ہونی چاہیئے، حالانکہ یہ پہلے لندن کانفرنس میں ۱۰ - ۱۰ - اور ۷ کی نسبت طے پا چکی ہے۔ اور اس سے پہلے واشنگٹن کانفرنس میں ۵ - ۵ - اور ۳ کی نسبت قرار پائی تھی۔ غرض بات بہت قرین قیاس ہے کہ جاپان اپنی قوت کو بڑھا کر رفتہ رفتہ ایشیا کے لئے ایک منرو "اصول" منوا لے گا، جس کی رو سے مغربی ممالک کو ایشیا کے معاملات میں مداخلت کا بالکل اختیار نہ رہے گا، اور یہ تنہا ان سے ساتھ جو سلوک چاہے کرے گا۔

ممالکِ اسلامی

عراق | چند دنوں سے اخبارات میں اسوری قبائل اور حکومت عراق کی کشمکش کا ذکر آرہا ہے۔
یہ قبیلے قدیم اسوری اور بابلی تمدن کی رہی سہی یادگار ہیں۔ اور مذہباً عیسائی ہیں۔ یہ لوگ عراق، شام
اور ایشیائے کوچک کی سرحد پر عرصہ دراز سے آباد ہیں اور تینوں حکومتوں کی آنکھوں میں کھٹکتے ہیں
جب حکومت برطانیہ نے عراق کو سن رشد کی سند دے کر اپنی نگرانی سے آزاد کیا۔ اور یہ مسئلہ
جمعیت اقوام کے سامنے پیش ہوا تو اسوری قبائل نے انتظامی خود مختاری کا مطالبہ کیا لیکن جمعیت
نے ان کے حق کو تسلیم نہیں کیا۔ پھر اس کے بعد جب عراق اور شام کی سرحد کے تعین کا مسئلہ
پیش آیا تو اس وقت بھی ان کی شنوائی نہیں ہوئی، اور سرحد اس طرح مقرر کر دی گئی، کہ ان کی بیشتر
تعداد حکومت عراق کے ماتحت آگئی۔ ان قبائل نے اپنے حقوق کا مطالبہ جاری رکھا اور حکومت سے
ان کا جھگڑا بھی کم و بیش چلتا رہا۔ اوائل اگست میں یک بیک یہ خبر شائع ہوئی کہ ان قبائل اور
عراقی فوج کے درمیان جنگ ہوئی جس میں تقریباً سو اسوری اور کوئی بیس فوجی کام آئے۔ حالات
کا جہاں تک پتہ چلتا ہے یہ ہیں کہ اس مقابلے سے کچھ دن پہلے ان قبائل نے سرزمین عراق سے ہجرت
کر کے شامی حکومت کے زیر سایہ آباد ہونے کی کوشش کی، ان کو یہ توقع تھی کہ شام پر چونکہ ابھی فرانس
کا اقتدار باقی ہے اس لئے وہاں ان کی پذیرائی ہوگی، اور یہ اپنے ہم مذہب اور ہم نسل ساتھیوں
کے جوار میں آرام سے زندگی بسر کر سکیں گے کہا یہ جاتا ہے کہ ان قبائل میں سے جو قبیلے زمین شام میں
آباد تھے انھوں نے عراقی قبائل کو اس قسم کی توقع دلائی تھی، اور انھیں دعوت بھی دی تھی۔ جب یہ
لوگ اپنا ساز و سامان لے کر وہاں پہنچے تو حکومت شام کو یہ خطرہ ہوا کہ کہیں "طویلے کی بلا بندر کے سر"
نہ پڑ جائے۔ چنانچہ انھوں نے ان قبائل کو اپنی زمین پر آباد ہونے کی اجازت نہیں دی، اور انھیں
الٹے پاؤں واپس ہونا پڑا، ادھر عراق کی حکومت نے جو میدان خالی پایا تو اس علاقہ پر قبضہ کر لیا
جسے چھوڑ کر یہ قبائل چلے گئے تھے۔ اب جو ان قبائل نے واپس آنا چاہا تو عراقی فوج نے ان

کو روکا اور یہ مطالبہ کیا کہ یہ لوگ اپنے ہتھیار حکومت کے حوالے کر دیں۔ ورنہ انھیں آنے کی اجازت نہ دی جائے گی، ان لوگوں نے اس سے انکار کیا اس لئے کہ انھیں حکومت عراق پر اعتماد نہ تھا نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ لوگ مارے گئے، باقی سے اسلحہ چھین لئے گئے اور انھیں بھاگ کر پہاڑوں میں پناہ لینی پڑی، اس لڑائی کے حالات اور اس کے بعد کی جو کیفیت اخباروں سے معلوم ہوتی ہے اس سے تو یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ حکومت عراق نے غیر ضروری سختی سے کام لیا ہے، کہا یہ جاتا ہے کہ نہ صرف فوج نے بلکہ عوام نے بھی ان قبائل کے قتل و غارت میں حصہ لیا۔ اب یہ خانماں برباد کچھ تو پہاڑوں میں چھپے ہوئے ہیں اور کچھ سب مال و متاع کھو کر مجبوراً خاموش ہیں۔

اس واقعہ کی وجہ سے شاہ فیصل جو سفر یورپ میں مصروف تھے فوراً بغداد واپس آگئے اب انھوں نے خود اپنی نگرانی میں اس علاقے میں امن قائم کرنے کی کوشش شروع کی ہے۔ ان قبائل کے سب سے بڑے پیشوا کو حکومت عراق نے اپنی سرزمین سے خارج کر دیا ہے اور آجکل وہ جزیرۂ قبرس میں مقیم ہیں، ان کے بیانات سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ عراق کی حکومت نے کسی قسم کا ظلم ان لوگوں پر اٹھا نہیں رکھا۔ سرحدی قبائل پر جو مصیبتیں نازل ہوتی رہتی ہیں اس کی شہادت آئے دن ہندوستان کی شمالی مغربی سرحد پر ملتی رہتی ہے، ابھی زیادہ عرصہ نہیں گذرا ہے کہ ترکی اور ایران کی حکومتوں نے کردوں کے ساتھ اسی قسم کا معاملہ کیا، اور ان کی بیشتر تعداد تلوار کے گھاٹ اتاری گئی اب عراق کی حکومت اسوری قبائل کو بیخ و بن سے اکھیڑنے پر آمادہ نظر آتی ہے۔ آجکل قوم پرستی اور نسل پروری کی دنیا میں کچھ ایسی ہوا چلی ہوئی ہے کہ چھوٹی چھوٹی جماعتوں کے لئے عرصہ حیات تنگ ہوتا جا رہا ہے، ارمنی ختم ہو گئے، کردوں کا زور ٹوٹ چکا۔ جرمنی سے یہودی نکالے جا رہے ہیں اور اب اسوری قبائل پر یہ آفت نازل ہوئی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ان چھوٹی چھوٹی جماعتوں کے ساتھ اکثریتوں نے جو برتاؤ کیا ہے اس میں کچھ قصور خود ان جماعتوں کا بھی ہے، ارمنی غدار تھے۔ کرد لٹیرے تھے، جرمنی کے یہود جرمن قوم کی دولت پر قابض تھے۔ اور اسوری قبائل عراق کی خود مختاری میں خلل ڈال رہے تھے، لیکن

ایک طریقہ یہ بھی تو تھا کہ ان کے ساتھ نرمی سے معاملہ کیا جاتا، یا صرف اتنی سختی کی جاتی جتنی بالکل ضروری ہوتی، ایک جماعت کو بلا امتیاز مجرم و غیر مجرم محض ایک خاص نسل یا خاص قبیلے سے منسوب ہونے کی وجہ سے طرح طرح کے مظالم کا نشانہ بنانا کسی صورت میں بھی جائز نہیں ہو سکتا۔ اسی سلسلہ میں یہ خبر ملی کہ عراق کے وزیر داخل نے ایک نئی جماعت کے قیام کی اجازت دی ہے اس جماعت کا نام غالباً "جمعیت فلاح قومی" ہوگا اور اس کا مقصد عراق کو خارجی عناصر سے پاک کرنا، اس کا ظاہری امتیاز اس کے اراکین کی قمیصوں کا رنگ ہے۔ جو جرمنی کی "نازی" جماعت کی تقلید میں خاکی رکھا گیا ہے۔ مقصد بھی اگر خبر صحیح ہے، اسی جماعت کا سا ہے اور ممکن ہے طریقہ بھی وہی اختیار کیا جائے۔ ابھی تک عوام نے اس طرف توجہ نہیں کی ہے۔ صرف تعلیم یافتہ خواص نے اس تحریک کو اٹھایا ہے، مگر کوشش شرط ہے۔ عوام کو شامل ہونے میں کتنی دیر لگتی ہے۔ زمانے کی یہ ستم ظریفی بھی قابل غور ہے کہ جو قومیں یا جماعتیں جو عرصہ کی مظلومیت سے نجات پاتی ہیں۔ اقتدار ملتے ہی خود ظالم بن جاتی ہیں اب تک یہ خیال تھا کہ ظلم و استبداد صرف یورپ کی قوموں کا خاصہ ہے، لیکن جاپان کی مثال نے اس کی کافی تردید کر دی، اور اب ترکی، ایران اور عراق کی حکومتیں بھی اس میدان میں قدم رکھ چکی ہیں یا حکومت کا نشہ جب چڑھتا ہے تو دل اور دماغ کا توازن باقی نہیں رہتا اس وبا سے نہ مشرق محفوظ ہے اور نہ مغرب، نہ عالم اسلامی، اور نہ عالم مسیحی، دیکھئے دنیا کو کب اس سے نجات ملتی ہے۔

شذرات

خدا کا شکر ہے کہ یہ ستمبر کا پرچہ شروع ستمبر میں شائع ہو رہا ہے، ہم اپنی طرف سے پوری کوشش کریں گے کہ آئندہ سے ہر مہینہ کا پرچہ اس مہینہ کی پہلی تاریخ کو یہاں سے روانہ ہو جایا کرے، قارئین کرام میں سے جن صاحب کے پاس ۱۰ تاریخ تک رسالہ نہ پہنچے وہ دفتر کو اطلاع دے دیا کریں تاکہ اگر ان کی کاپی بھیجی جا چکی ہے اور راہ میں گم ہو گئی ہے تو ایک اور کاپی بھیجی جائے۔

مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کے ٹریننگ کالج سے ایک سوالنامہ آیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد ایک اہم مسئلہ پر غور کر رہے ہیں، وہ اس میں باہر کے لوگوں سے بھی مشورہ چاہتے ہیں بعض حضرات کی تجویز ہے کہ مسلم یونیورسٹی کا اسکول جدید طریقے پر چلایا جائے جو آجکل کی تعلیم اور مقابلے کا مقتضا ہے۔ اسکی تفصیل آگے چل کر کی گئی ہے کہ یہ اسکول امرا اور عمائد کے لڑکوں کی تعلیم کے لئے مخصوص کر دیا جائے تاکہ جو مسلمان اپنے بچوں کو پہاڑ کے مدرسوں یا کرنل کے اسکولوں میں بھیجا کرتے ہیں وہ آئندہ سے علیگڈھ بھیجا کریں اس صورت میں حسب ذیل تبدیلیاں کرنا پڑیں گی:-

۱۔ یہ مدرسہ تقریباً خالص اقامتی مدرسہ رہے گا۔ صرف ۱۰ فیصدی غیر مقیم طلبہ ہوں گے، کل مدرسہ میں طلبہ کی تعداد میں سو سے زیادہ نہیں ہوگی۔

۲۔ اس پر بہت زور دیا جائے گا کہ دار الاقامہ میں اتالیق طلبہ کی تعلیم و تربیت کی ہر جز کی نگرانی کریں گے، دار الاقامہ کے نگران کی مدد کے لئے ایک خاتون ہوگی جو بچوں کے کھانے پہننے، صفائی وغیرہ کی دیکھ بھال کرے گی۔

۳۔ جو لڑکے کیمبرج جونیر اور سینیر کا امتحان دینا چاہیں گے انکی تعلیم کے لئے خاص انتظام کیا جائے گا۔

۴۔ سب لڑکوں کے رہنے سہنے کا انتظام اعلیٰ پیمانہ پر کیا جائے گا، جیسا کہ اب انگلش ہاؤس میں ہے۔

۵۔ ہر طالب علم کے مصارف تعلیم تقریباً ایک ہزار روپیہ سالانہ ہوں گے۔

چونکہ اس مسئلہ سے مسلمانوں کو عام طور پر دلچسپی ہوگی اسلئے ہم ان صفحات میں اس پر مختصر سی بحث کرنا چاہتے ہیں اول تو ہمیں اس بات پر سخت تعجب ہے کہ امرا اور عمائد کی جداگانہ تعلیم کی تحریک اس جمہوریت کے دوران میں اٹھی ہے اور وہ بھی ایک اسلامی تعلیم گاہ سے۔ یہ مسلمہ امر ہے کہ تعلیم طرز تمدن اور طرز معاشرت کی پابند ہوتی ہے تعلیم کا عمائدی نصب العین (aristocratic) یورپ میں اسوقت تک مانا جاتا تھا، جب تک حکومت اور قیادت صرف امرا کے طبقہ تک محدود تھی، انقلاب فرانس کے بعد سے حقوق یوں کہنے کو تو کل جمہور کے لئے عام ہو گئے لیکن عملاً اتنا ضرور ہوا کہ امرا کے ساتھ متوسط طبقہ انمیں شریک ہو گیا یعنی سب لوگ نہ سہی پھر بھی بہت لوگ سیاسی غلامی سے آزاد ہو گئے۔ آزادی کی ہوا لگتے ہی انسانی طبیعت تمدن کی مادی اور روحانی نعمتوں کو ڈھونڈنے لگی اور تعلیم و تہذیب ایک بڑے حلقے میں پھیل گئی۔ انیسویں صدی کے آخر تک امیروں کی علیحدہ اور مخصوص تعلیم صرف انگلستان تک محدود رہ گئی، اور بیسویں صدی کے آغاز سے وہاں بھی اس پر ہر طرف سے حملے ہو رہے ہیں۔ کم سے کم اصولی حیثیت سے تعلیم کا یہ نظریہ اب یورپ اور امریکہ میں رد ہو چکا ہے۔ اور اسلامی تاریخ میں تو اول سے آخر تک اس کی مثال نظر نہیں آتی کہ عمائدی تعلیم کا اصول کبھی تسلیم کیا گیا ہو۔ البتہ زوال کے زمانے میں امرا اپنے بچوں کو گھروں پر تعلیم دلانے لگے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ دن میں سرے سے تعلیم ہی مفقود ہو گئی۔

اب بیسویں صدی کا ایک ثلث گذر جانے کے بعد تعلیم کے اس مردود نصب العین کو ہندوستان میں مقبول بنانے کی کوشش ہو رہی ہے۔ پہلے ایس، آر، داس آنجہانی نے ایک "پبلک اسکول" کی تجویز بڑے زور شور سے اٹھائی، اور اب اس کے بعد علی گڑھ میں کسی صاحب کو یہ خیال پیدا ہوا ہے کہ مسلمانوں کا ایک اس قسم کا اسکول قائم کیا جائے۔ ہم جن وجوہ سے اس تجویز کے مخالف ہیں انکو مختصر طور سے لکھتے ہیں۔

۱۔ اس قسم کی تعلیم اسلام اور جمہوریت کے منافی ہے اور وسعت قلب کی جگہ جو تہذیب و شائستگی کا جوہر ہے، تنگدلی پیدا کرتی ہے۔

۲۔ مسلمانوں کا قومی افلاس اس کی اجازت نہیں دیتا کہ صاحبان مقدرت بھی بیکار اس قدر روپیہ اپنے بچوں کی تعلیم پر صرف کریں جس سے اور بہت سے بچوں کی تعلیم ہو سکتی ہے۔

۳۔ مسلم یونیورسٹی میں طلباء کی تعداد کم ہوتی جاتی ہے۔ اگر اس یونیورسٹی کو قائم رکھنا ضروری سمجھا جاتا ہے تو اس کے ساتھ کئی بڑے اسکولوں کی ضرورت ہے تاکہ ان سے یونیورسٹی کے لئے طالب علم مل سکیں نہ یہ کہ جو اسکول موجود ہے اس کے طلبہ کی تعداد اور محدود کر دی جائے۔

۴۔ یونیورسٹی کا سرمایہ امیروں اور غریبوں کے مشترکہ چندے سے جمع ہوا ہے اس کے ایک حصے کو صرف امیروں کی تعلیم پر صرف کرنا کسی طرح جائز نہیں۔ اور ایسے ملتِ اسلامی ہرگز گوارا نہیں کرے گی۔

۵۔ تین سو کی تعداد میں ایسے لڑکوں کا جمع ہونا بہت مشکل ہے جن کے والدین ایک ہزار روپیہ سال ان کی تعلیم پر صرف کر سکیں۔ جو لوگ اپنے بچوں کو پہاڑوں کے مدرسوں میں انگریزوں کے مدرسوں میں بھیجتے ہیں وہ انھیں علی گڑھ نہیں بھیجیں گے کیونکہ یا تو انھیں بچوں کی صحت کا خیال ہوتا ہے یا یہ کہ ان پر حکمراں قوم کے سستے نقلی نمونوں کی برکت سے مغربی تمدن کا ظاہری رنگ چڑھ جائے۔ ان لوگوں کو اپنے بچوں کی عمائدی تعلیم مدنظر نہیں ہوتی اس لئے کہ ہندوستان میں کرانیوں کا شمار عام طور پر عمائدین نہیں کیا جاتا۔

اگر تھوڑی دیر کے لئے عمائدی تعلیم کے نصب العین کو مان بھی لیا جائے، تب بھی ہندوستان میں اس کی گنجائش کسی طرح نظر نہیں آتی اس لئے کہ یہاں عمائد کا طبقہ اس معنی میں سرے سے موجود ہی نہیں ہے جو (Aristocracy.) کے لفظ کے ساتھ مخصوص ہیں۔ اس سے مراد وہ طبقہ ہے جو پشتہا پشت سے حکومت، قیادت، دولت، تہذیب اور شائستگی کا مالک ہے۔ اور اس وجہ سے اس میں بعض مخصوص اخلاقی صفات پیدا ہو گئی ہیں۔ جو اوروں میں نہیں پائی جاتیں۔ ہندوستان دو سو سال سے تنزل کے دور سے گذر رہا ہے۔ ظاہر ہے تنزل پذیر قوموں میں سب سے بدتر حالت امرا کی ہوتی ہے جیسا کہ حالی نے کہا ہے۔

تباہی ہے آتی کسی قوم پر گر ۔۔۔ تو مسخ ان میں ہوتے ہیں پہلے تو نگر

اس لئے یہاں امرا کے اکثر قدیم خاندانوں پر تو عمائد کی تعریف صادق آ ہی نہیں سکتی کیونکہ ان کو زمانے نے خاک میں ملا دیا اور ملا رہا ہے۔ اب رہے وہ لوگ جو سنہ ۵۷ کے انقلاب عظیم کے بعد ابھرے ہیں ان میں البتہ علم اور دولت وغیرہ موجود ہیں لیکن دوسری صفات جو عمائد کے لئے ضروری ہیں ابھی تک پیدا نہیں ہوئیں اس لئے کہ ان کا پیدا ہونا پشتہا پشت کا کام ہے ایسے ہنگاموں میں وہی لوگ زیادہ بڑھتے ہیں جو زمانہ شناس، من چلے اور اخلاقی قیود سے ایک حد تک آزاد ہوتے ہیں۔ ان لوگوں میں یقیناً ترقی کی خلقی صلاحیت ہوتی ہے لیکن انھیں ہو رہیں طے کرنے کے لئے ایک مدت درکار ہوتی ہے جن کی منزل مقصود شان ریاست اور جوہر شرافت ہے۔ غرض ہندوستان میں گو انفرادی حیثیت سے کچھ لوگ موجود ہوں جو دولت کے ساتھ عمائد کی دوسری صفات کے بھی حامل ہیں لیکن ان کا کوئی علیحدہ طبقہ نہیں ہے، اور نہ ان کے امتیاز کا کوئی مسلمہ معیار ہے ایسی صورت میں یہاں تو عمائدی تعلیم کا نام ہی لینا بے معنی ہے۔ غرض یہ تجویز ایک شیخ چلی کا منصوبہ ہے جس کا عمل میں آنا محال ہے اگر یہ آگے بڑھی تو نتیجہ صرف یہ ہوگا کہ مسلم یونیورسٹی کی عام مخالفت جو خدا خدا کر کے اب کم ہوئی ہے پھر بڑھ جائے گی۔ جتنا سرمایہ اور جتنی سعی اس میں صرف ہوگی اس سے کم میں موجودہ اسکول کی اصلاح اور ترقی اس حد تک ہو سکتی ہے کہ یہ ہندوستان کا بہترین مدرسہ بن جائے۔

ہمیں امید ہے کہ وہ حضرات جو قومی تعلیم کے مسائل سے دلچسپی رکھتے ہیں اس مسئلہ کے متعلق اپنی رائے اس پتہ سے روانہ کریں گے۔

Secratary

School Reorganization Comitte

Training College

Aligarh

سب حق محفوظ ہیں

بمضمون نمبر ۵۵۷۶

مصفّیٰ

طب یونانی کا تازہ کرشمہ

انسان کی زندگی کا مدار خون پر ہے۔ خون اگر خراب ہوگیا ہی تو آدمی کی تندرستی قائم نہیں رہ سکتی۔ **ہندوستانی دواخانہ دہلی "مصفّیٰ"** ایجاد کرکے تمام ملک کو مقابلہ کی دعوت دیتا ہے اور بلاخوف تردید دعویٰ کرتا ہے کہ صفائی خون کے لئے "مصفّیٰ" سے بہتر دوا آج تک نہ ایشیا پیش کر سکا ہے اور نہ یورپ۔

"مصفّیٰ" ہندوستان کی جڑی بوٹیوں کا خلاصہ ہے اور مسیح الملک ثانی حکیم حاجی محمد احمد خاں صاحب کے مشورہ سے جدید سائنٹیفک طریق پر تیار کیا گیا ہے، خون کی خرابی سے پیدا ہونے والے ہر مرض کی تیر بہدف دوا ہے، کھجلی، داد پھنسیاں وغیرہ حتیٰ کہ سوزاک آتشک اور جذام کا زہریلا مادہ بھی اس کے استعمال سے ہمیشہ کے لئے نابود ہو جاتا ہے۔ اس کی ایک خوراک چار کا ایک چمچہ ہے، اور بلحاظ نفع **"مصفّیٰ"** درحقیقت اکسیری چیز ہے۔

قیمت بارہ خوراک کی شیشی صرف بارہ آنے۔ محصول ڈاک علاوہ ہوگا

ترکیب استعمال۔ ایک خوراک صبح، ایک شام تھوڑے پانی میں ملاکر، اور اگر مرض کا جوش زیادہ ہو تو دن میں تین مرتبہ استعمال کیا جائے۔

ہندوستانی دواخانہ پوسٹ بکس نمبر ۲۲ دہلی سے طلب کیجیے

نیا اڈیشن　　　　نئے رنگ　　　　نئی طرز

پیکو آرٹ پریس لاہور کا مشہور عالم عکسی رنگین

یازدہ سورہ شریف

معہ اُردو ترجمہ موسومہ بہ

مطالب الفرقان فی ترجمۃ القرآن

کے نئے ایڈیشن میں ہر صفحہ کا ترجمہ اُسکے مقابل کے صفحہ پر شش رنگی جدول میں عکسی بلاکوں کے ذریعے طبع کیا گیا ہے۔ جو پہلے کی نسبت بہت زیادہ دل آویز اور خوشنما ہونے کی وجہ سے دوست، احباب، بزرگوں اور بچوں کو ہدیہ دینے اور روزانہ تلاوت کیلئے ایک نایاب تحفہ ہے

قسم اول مجلد ۶ؔ　　اپنے شہر کے تاجران سے طلب کریں　　قسم دوم مجلد ۱۲ؔ

پیکو آرٹ پریس بیرون موری دروازہ لاہور

بچوں کی تندرستی کہاں سے ملے گی ؟

تندرست بچے شگفتہ پھول ہیں۔ ان کی صحت کھیل کود میں پوشیدہ ہے۔ اسے دواؤں میں تلاش نہ کیجئے، کوئی طاقت کی دوا بچے کو ایسا مضبوط نہیں کرسکتی، جیسا کہ اچھی ورزش اور اچھا کھیل۔

روتے ہوئے بچوں کو

ہمارے شوروم میں لائیے پھر دیکھئے وہ کس طرح خود بخود کھیل میں مصروف ہوکر آپ کی فرصت اور اپنی صحت کا باعث ہوتے ہیں

Meccono Engineering Sets for Boys

اور

ہر قسم کے کھلونے، ہاکی، فٹ بال کیرم بورڈ، بیڈمنٹن، ڈمبل اور (Chest expander-) انڈور گیمس وغیرہ وغیرہ ہم سے خریدئے۔

Victoria Toy Palace
Managing proprietor
Mupand Lal and Sons, Chandni Chowk Delhi

رجسٹرڈ

نمبر ۱۰۵۲

اکتوبر ۱۹۳۳ع



جامعہ

جامعہ ملیہ کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ

جلد ۲۱ | بابت ماہ اکتوبر ۱۹۳۳ع | نمبر ۴

مطبع جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

A.H. Faruqi 1927.

جامعہ

زیرادارت

مولنا اسلم جیراجپوری　ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے پی ایچ ڈی

جلد ۲۱ | بابتہ ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۳۳ عیسوی | نمبر ۴

فہرست مضامین

(محمد مجیب بی اے آکسن پرنٹر و پبلشر نے جامعہ پریس میں چھپوا کر شائع کیا)

سیرۃ النبی

(مجلد سوم)

سیرۃ النبی اس صدی میں اردو کی مخصوص تصانیف میں سے اور دار المصنفین اعظم گڈھ کا ایک اہم علمی کارنامہ ہے اس کی پہلی دو جلدوں پر جو علامہ شبلی مرحوم کی لکھی ہوئی تھیں رسالہ جامعہ میں آج سے بہت پہلے تنقید شائع ہو چکی ہے۔ اس درمیان میں سیرۃ مذکور کی تیسری اور چوتھی جلدیں بھی شائع ہو گئیں جو علامہ موصوف کے شاگرد اور جانشین سید سلیمان صاحب ندوی کی تالیف ہیں۔ اس لئے ان دونوں جلدوں پر بھی ایک تنقیدی نظر ڈالنی ضروری ہے۔

تیسری جلد تمامتر معجزات کے متعلق ہے۔ اس میں پہلے معجزے کی حقیقت اور اسکے امکان وقوع پر قدیم وجدید فلسفے سے سیر کن بحث کی گئی ہے اور پھر آنحضرتؐ کے معجزات نہایت بسط اور تفصیل کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ پوری جلد آٹھ سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ میرے خیال میں عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں سے کسی میں بھی نفس معجزہ پر ایسی مفصل کتاب آجتک نہ لکھی گئی ہوگی۔

اس کتاب کے مطالعے کے وقت اس کی جو باتیں مجھ کو حقیقت کے خلاف معلوم ہوئیں ان کو اختصار کے ساتھ لکھتا ہوں۔

عالم مثال | فلسفہ قدیمہ سے معجزے کے امکان اور اس کے وقوع کی بحث میں سید صاحب نے امام ربانی اور شاہ ولی اللہ صاحب کے عالم مثال کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے جس کی مختصر کیفیت انھیں کے الفاظ میں یہ ہے:۔

"ایک تو یہ عالم اجساد جس کو تم مادہ اور مادیات کہتے ہو۔ دوسرا عالم ارواح یا عالم غیب جو مادی اور مادیات سے منزہ اور مافوق ہے اور تیسرا عالم مثال یا عالم برزخ۔ یہ وہ عالم ہے

جہاں عالم اجساد اور عالم ارواح، عالم شہادت اور عالم غیب دونوں کے اوصاف اور قوانین مجتمع ہو جاتے ہیں (سیرۃ النبی طبع دوم مجلد سوم صفحہ ۲۶)

کیا حقیقت میں ایسا کوئی عالم ہے؟ کیا شاہ ولی اللہ صاحب جو قرآن کے مترجم بھی تھے اور ماہر بھی اس عالم کے وجود پر اس سے ایک حرف کی بھی سند لا سکے؟ کیا اللہ جس نے عالم جسمانی اور عالم روحانی دونوں کی پوری پوری تفصیلات اپنی کتاب میں ذکر کی ہیں اتنے بڑے عالم سے جو دونوں کا جامع ہے بالکل خاموش رہ گیا؟

خود سید صاحب جنھوں نے اس عالم مثال سے معجزے کی بحث میں جابجا کام لیا ہے۔ ماشاء اللہ قرآن کے بڑے عالم ہیں وہی کوئی آیت اس کی سند میں پیش کر دیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ان ارباب معرفت کا یہ عالم مثال بھی افلاطون کے عالم اعیان کی طرح محض خیالی ہے اور بس۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے جن روایات سے اس عالم کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے ان سے اگر اس کا پتہ مل سکتا تو ان سے بہت پہلے رُواۃ حدیث نے اس عظیم الشان عالم کا انکشاف کر لیا ہوتا۔

لیڈر کی شہادت اس کتاب میں سید صاحب کے ایک رفیق کار نے جو فلسفۂ جدیدہ کے ماہر ہیں معجزے کا ثبوت دیتے ہوئے پراسرار واقعات کی عمومیت دکھلانے کے لئے الہ آباد کے انگریزی اخبار لیڈر سے مندرجہ ذیل واقعہ نقل کیا ہے۔

"بردوان میں ایک عجیب پراسرار واقعہ پیش آیا جس نے لوگوں میں کافی سنسنی پیدا کر دی ہے۔ لالہ کندن لال کپور ایک کھتری زمیندار ۱۱ ماہ حال کو ۲ بجے شام کے وقت مرا۔ متوفی چونکہ سوریہ کھتری تھا اس لئے جب تک دوسرے دن صبح آفتاب نہ نکل لیا اس کی لاش جلائی نہ گئی۔ جلانے سے پہلے اس کے لڑکے اندلال نے ایک خالی کمرے میں جہاں کوئی اور نہ تھا لاش کا فوٹو لیا۔ لیکن اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ اس کے فوٹو پر پانچ اور دھندلی تصویریں آگئی ہیں۔ ان تصویروں میں سے دو کو تو خاندان

کے لوگوں نے پہچانا تھا کہ متوفی کی پہلی بیوی اور لڑکے ہیں جن کو مرے ہوئے کئی سال ہو چکے ہیں۔ باقی تصویریں جو زیادہ روشن نہ تھیں پہچانی نہیں جا سکیں" (صفحہ ۱۴۴)

جو لوگ ذرا بھی اخبار نویسی کا تجربہ رکھتے ہیں وہ اس بات کو خوب جانتے ہیں کہ اخبارات اپنی شہرت کے لئے اکثر عجیب وغریب اور جھوٹی باتیں تصنیف کر کے لکھا کرتے ہیں تاکہ حمقا اور عجائب پرستوں میں ان کے اخبار کا چرچا ہو۔ بلکہ بعض اخبارات تو اس قسم کا ایک مخصوص کالم رکھتے ہیں فلسفی صاحب نے اگر ذرا بھی غور و فکر سے کام لیا ہوتا تو اس یقین پر پہنچنا مشکل نہ تھا کہ مذکورۂ بالا واقعہ عقلاً اور شرعاً بالکل محال ہے کیونکہ جو مردے برسوں پہلے جلائے جا چکے ہیں وہ کس عقل اور کس شرع کی رو سے کسی مردہ لاش کی حفاظت کے لئے آسکتے ہیں۔ بفرضِ محال اگر ان کی روح آگئے تو پھر اس کی صورت کشی فوٹو کے ذریعے کیسے ہو سکتی ہے۔

اعظم گڑھ سے بردوان ایک دن سے زیادہ کا سفر نہ تھا کاش وہ خود اس پراسرار واقعے کی تحقیق کے لئے وہاں چلے گئے ہوتے تو ان کو معلوم ہو جاتا کہ اس قسم کا یا تو کوئی واقعہ ہوا ہی نہیں ہے یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ فن تصویر کشی کا کوئی شعبدہ تھا اور بس۔

لندن کے ایک مشہور جریدہ نگار مسٹر اسٹڈ نے جن کو روحانیات سے شغف تھا اپنی تصویر اس قسم کی کھنچوائی تھی جس کے ارد گرد چند روحانیوں کے بھی چہرے نظر آتے تھے مگر وہیں کے ایک نامی سائنسداں نے ان کے اس فریب کا تار و پود بکھیر کر رکھ دیا اور ثابت کر دیا کہ یہ فوٹوگرافی کی ایک "ٹرک" ہے اور کچھ نہیں۔

ثبوت معجزہ | حقیقت یہ ہے کہ معجزہ اپنے امکان یا نفس وقوع میں فلسفۂ قدیم و جدید کے ان تمام دلائل کا جو اس کتاب کے دو سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں قطعاً محتاج نہیں ہے۔ وہ جب واقع ہو جاتا ہے تو کٹر سے کٹر منکر بھی اس کے ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے کیونکہ مشاہدات یقینیات میں سے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس کی کوئی دوسری توجیہ نکال لے جس طرح فرعون اور آل فرعون حضرت موسیٰؑ کے معجزات کو دیکھ کر انکار نہ کر سکے بلکہ ان کو جادو کہنے لگے۔ سورۂ نمل میں ہے:۔

فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ اٰيٰتُنَا مُبْصِرَةً قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۚ وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا ؕ

جب ان کے پاس ہماری نشانیاں چشم دید آگئیں تو وہ بول اٹھے کہ یہ کھلا ہوا جادو ہے۔ اور باوجود اس کے کہ ان کے دلوں کو یقین ہو چکا تھا ظلم اور سرکشی سے ان کے منکر ہوگئے۔

مرکز بحث اصل بحث یہ ہے کہ بعد از وقوع معجزہ ان لوگوں کو جنھوں نے مشاہدہ نہیں کیا ہے اس کا یقین کس طرح دلایا جائے اور اپنے اپنے انبیاء اور اولیاء کی طرف ان کے معتقدین نے جو جو معجزات اور کرامات منسوب کر رکھے ہیں وہ کہاں تک قابل قبول ہیں۔

ہیوم کا قول ہے:-

"جس معجزے کی بنا کسی انسانی شہادت پر ہو وہ حجت واستدلال کے بجائے محض تمسخر انگیز ہے"

"مذہب کے نام سے لوگ ہمیشہ مضحک وخرافات افسانوں کے دام میں آجاتے ہیں۔

صفحہ ۱۳۲"

لیکن سید صاحب کہتے ہیں کہ معجزات کا ثبوت روایتی شہادتیں ہیں۔

"اسلامی روایات اور صحیح معجزات (غالباً احادیث) نبوی کی شہادت اس قدر بلند ہے کہ دنیا کی کوئی تاریخی روایت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اور اس سے معجزات اور خوارق عادات کا قوی ثبوت بہم پہنچتا ہے۔ صفحہ ۲۸"

بحث روایت بالعموم ہماری روایات کا سلسلۂ اسناد چھ چھ اور سات سات راویوں تک پہنچتا ہے مثلاً میں نے سنا زید سے اس نے سنا عمرو سے اس نے سنا بکر سے اس نے سنا خالد سے اس نے سنا اصغر سے اس نے سنا اکبر سے الخ۔ اتنے واسطوں سے جو بات بیان کی جائے وہ نہ شہادت ہے نہ علم ہے اور تا وقتیکہ متواتر نہ ہو اس سے نہ یقین پیدا ہو سکتا ہے نہ اذعان۔ کیونکہ اگر آپ خود اپنا چشم دید واقعہ مجھ سے بیان کریں تو میرے پاس اس کے صدق وکذب جانچنے کا ایک معیار ہے وہ یہ کہ میں آپ کو جانتا ہوں اور آپ کا ایک اعتبار میرے ذہن میں قائم ہے۔ لیکن جب آپ نے اپنا چشم دید واقعہ نہیں بیان کیا بلکہ یہ فرمایا کہ میں نے زید سے سنا تو وہ معیار آپ نے مجھ سے چھین لیا کیونکہ میں زید کو نہیں جانتا۔ اب اس

قول کے صدق و کذب کا فیصلہ آپ کے اوپر رہا کہ آپ زید سے واقف ہیں مگر جب آپ نے یہ کہا کہ زید نے اس کو عمرو سے سنا تھا تو آپ کے پاس بھی کوئی معیار نہ رہا۔ لہٰذا جب روایت کا سلسلہ دو سے تین تک پہنچ گیا تو نہ متکلم کے لئے وہ حجت ہے نہ سامع کے لئے کیونکہ دونوں میں سے کسی کے پاس اس کے جانچنے کا معیار نہیں ہے۔

جواب میں آپ کہیں گے کہ ان روایات کے سلسلہ اسناد میں جو رواۃ ہیں وہ سب کے سب جانچے ہوئے ثقہ اور معتبر ہیں لیکن وہ میرے اور آپ کے جانچے ہوئے نہیں ہیں کہ ہمارے لئے ان کا بیان حجت ہو بلکہ ان کی ثقاہت کی خبر بھی ہم تک بذریعہ روایت ہی کے پہنچی ہے۔ لہٰذا ان کا اعتبار روایت پر موقوف ہے اور روایت کا اعتبار ان کے اوپر اور یہ دور ہے۔ علاوہ ازیں اس بات کا قطعی فتویٰ کہ فلاں ثقہ ہے، یا صدوق ہے یا عدول ہے اصولاً اور دیانتاً صحیح نہیں کیونکہ باطن کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ میں نے فلاں کو بعض باتوں میں تجربہ کیا اور سچا پایا۔ بہرحال روایت خود اہل روایت کے نزدیک بھی یقینی چیز نہیں ہے زیادہ سے زیادہ ظنی تسلیم کی گئی ہے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ | سید صاحب لکھتے ہیں کہ :۔

"متواتر، مشہور اور مستفیض خبروں کو چھوڑ کر خبر احاد تک تم روزانہ یقین کرتے ہو۔ خطوط، تار، اخبارات آجکل کی زندگی کا جزو ہیں اور ان میں سے ہر ایک پر تم کو کامل وثوق ہے۔ رائٹر ایجنسی کے تاروں اور سنجیدہ اخباروں کے کالموں میں عجیب سے عجیب حیرت افزا واقعات، ایجادات و طبی علاجات عموماً بیان ہوتے رہتے ہیں اور لوگ ان کو تسلیم کرتے ہیں۔ آج تمام تجارت کا دارومدار انہیں تاروں پر ہے۔ شدید مالی خطرات کا موقع ہے مگر ہر بیوپاری اور تاجر بخوشی اس خبر احاد کا یقین کر لیتا ہے اور اپنی تمام دولت اس کی نذر کر دیتا ہے اور کبھی یہ عقلی مباحث اور شکوک نہیں پیش کرتا کہ ممکن ہے کہ کسی نے غلط کہہ دیا ہو، ممکن ہے غلط لکھا گیا ہو، ممکن ہے نامہ نگار جھوٹ بولتا ہو، ممکن ہے کاتب نے خود گھڑ کر لکھ دیا ہو۔ تمام

احتمالات عقلی قائم ہو سکتے ہیں مگر عملی یقین پر ان احتمالات کا مطلق اثر نہیں پڑتا۔

ہم شفاخانوں میں جاتے ہیں اور عطاروں اور کمپونڈروں سے دوائیں لے کر باطمینان تمام ان کو استعمال کرتے ہیں حالانکہ معلوم ہے کہ ان شفاخانوں میں اکسیر اور سنکھیا دونوں کی بوتلیں پہلو بہ پہلو رکھی ہیں ممکن ہے کہ تنہا دوا بنانے والے کی یہ اطلاع کہ دوا تمہارے نسخے کے مطابق ہے غلط ہو اور اس لئے اس کے استعمال سے احتراز لازم ہے مگر کبھی یہ خدشہ ہمارے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آتا اور ہم بخوشی اپنی جان کو خبر احاد کے یقین کی نذر کر دیتے ہیں۔ پھر معجزات اور مذہب ہی کے باب میں شہادت کے مسئلے پر تمام عقلی احتمالات اور شکوک کا ازالہ ضروری کیوں تصور کیا جاتا ہے۔" صفحہ ۷۰۔

ہر چند کہ سید صاحب کے اس بیان میں مبالغہ ہے کیونکہ اخبارات اور روزانہ معاملات کے بارے میں بعض خبروں میں جو قرائن کے خلاف ہوتی ہیں ہم شک کرتے ہیں اور کمپونڈروں کی غلطی سے کبھی کبھی موتیں بھی واقع ہو جاتی ہیں لیکن پھر بھی ان کا یہ کہنا صحیح ہے کہ ہم خبر احاد پر زندگی کے روزانہ کاروبار میں عملدرآمد کرتے ہیں۔ مگر مذہبی خبروں میں اور ان میں بین فرق یہ ہے کہ ان کے ماقبل اور متعلقات سے ہم بذات خود واقف ہوتے ہیں اس لئے یہ یقین بعض خبر احاد کی بنیاد پر نہیں ہوتا بلکہ خارجی قرائن سے ہوتا ہے مثلاً شہر کے کسی محلے میں میرا کوئی عزیز سخت بیمار ہے جس کی عیادت کو میں خود بھی جایا کرتا ہوں اور صبح اور شام اس کی کیفیت آنے جانے والوں سے بھی مجھے معلوم ہوتی رہتی ہے۔ ایسی حالت میں اگر ایک شخص جو وہاں آتا جاتا ہے اور جس کو میں بھی جانتا ہوں آکر کہے کہ اس مریض کا انتقال ہو گیا تو میں ان خارجی قرائن کی بنیاد پر اس کو صحیح سمجھوں گا۔

اسی طرح ایک بیوپاری کسی کارخانے سے مال منگوایا کرتا ہے۔ اس کو بار بار کا تجربہ ہے۔ وہ نہ صرف اس کارخانے کی مہر بلکہ اس کے کاغذ اور طرز تحریر سے بھی واقف ہے۔ اب اس نے وہاں سے کوئی مال طلب کیا اس پر کوئی خط اس کارخانے کا قیمت کی طلبی یا اور کسی چیز کے متعلق آتا ہے تو وہ ان سابقہ قرائن سے اس کو صحیح سمجھتا ہے اور روپیہ بھیج دیتا ہے۔

عام حالات میں یہی ہوتا ہے لیکن جب انھیں معاملات میں سے کوئی معاملہ عدالت میں پہنچ جاتا ہے تو پھر خبر اعتماد سے مطلق کام نہیں چلتا۔ رجسٹری شدہ دستاویزوں کے بھی کاتب اور گواہ بلائے جاتے ہیں اور ان سے تصدیق کرائی جاتی ہے اور بجز چشم دید شہادت کے سنی سنائی بات وہاں کوئی نہیں مانی جاتی۔

کیا سید صاحب یہ چاہتے ہیں کہ ادنیٰ ادنیٰ دنیاوی معاملات میں جو احتیاطیں معمولی عدالتیں برتتی ہیں وہ مذہب اور معجزات کے بارے میں نہ برتی جائیں اور عام اخباری خبروں کے درجے میں ان کو رکھ لیا جائے کہ جی چاہا تو مان لیا نہیں تو انکار کر دیا۔

سید صاحب لکھتے ہیں:۔

"یہ کیسی زبردستی ہے کہ جس طرز استدلال پر دنیائے یقین کا عملی کاروبار چل رہا ہے اس کو اگر مذہب استعمال کرے تو مدعیان عقل کی جبین متانت پر بل پڑ جائے" صفحہ ،،۔

سبب یہ ہے کہ دنیائے یقین کے عملی کاروبار کی بعض باتوں میں اگر ہم شک کریں یا ان کا انکار کردیں تو کوئی ملزم ٹھہرانے والا نہیں ہے لیکن مذہب اور معجزات کی کسی روایت میں شک لائیں یا انکار کریں تو آپ ہی کفر کا فتویٰ دینے لگیں گے۔

خاتم النبیینؐ کے معجزے لیکن فلسفہ قدیم اور جدید کی یہ ساری بحثیں اس وقت کارآمد ہو سکتی ہیں جب حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم سے حسی معجزات کا جو خوارق عادات ہوتے ہیں صدور ہوا ہو لہٰذا اصلی بحث یہ ہے کہ اس قسم کے معجزے آنحضرتؐ کو دئے بھی گئے تھے یا نہیں۔ قرآن اس سے انکاری ہے۔ چنانچہ بار بار کفار نے معجزے طلب کئے اور ان سے انکار کیا گیا۔

وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِّن رَّبِّهِ ۞	اور کفار کہتے ہیں کہ اس پر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہ اتاری گئی۔
قَالُوا لَوْلَا أُوتِيَ مِثْلَ مَا أُوتِيَ مُوسَىٰ ۞	کفار نے کہا کہ کیوں نہ اس کو ایسی کوئی نشانی دی گئی جیسی موسیٰ کو دی گئی تھی
وَقَالُوا لَوْلَا يَأْتِينَا بِآيَةٍ مِّن رَّبِّهِ ۞	اور کافروں نے کہا کہ وہ اپنے رب کی طرف سے ہمارے پاس کیوں کوئی

| نشانی نہیں لاتا۔

ان سب کے جواب میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:۔

وَمَا مَنَعَنَا اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ اِلَّآ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ ؕ | اور نشانیوں کے بھیجنے سے کوئی شے ہم کو مانع نہ ہوئی بجز اس کے کہ اگلوں نے ان کو جھٹلایا۔

کیونکہ معجزہ دکھلانے کے بعد اتمام حجت ہو جاتا ہے اور پھر اگر کوئی قوم ایمان نہیں لاتی تو اس کی ہلاکت لازمی ہو جاتی ہے جیسا کہ قرآن کی متعدد آیات میں تصریح ہے۔ اس لئے یہ سلسلہ لتبلار رحمۃ اللعالمین کے عہد میں بند کر دیا گیا۔

خود رسول اللہ لوگوں کے ایمان لانے کی امید پر رجحان رکھتے تھے کہ کوئی ایسی نشانی ملے جیسی یہ لوگ طلب کرتے ہیں۔ اس پر اللہ نے کسی قدر عتاب کے ساتھ فرمایا۔

وَاِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَآءِ فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ؕ | اور اگر ان کی روگردانی تجھ پر گراں گزرتی ہے تو جو تجھ سے ہو سکے تو زمین کے اندر کوئی سرنگ تلاش کر یا آسمان پر کوئی سیڑھی لگا اور ان کے لئے کوئی نشانی لا۔ اور اگر اللہ چاہتا تو ان کو ہدایت پر جمع کر دیتا۔ تو جاہل لوگوں میں سے نہ بن۔

سید صاحب لکھتے ہیں :۔

"کفار کے اس بار بار کے اصرار سے کہ پیغمبر ہم کو معجزہ کیوں نہیں دکھاتے بعض نادان یہ سمجھتے ہیں کہ پیغمبر اسلام نے ان کو کوئی معجزہ نہیں دکھایا کہ اگر وہ کوئی معجزہ دیکھ چکے ہوتے تو بار بار معجزے کے لئے اصرار نہ کرتے لیکن یہ استدلال سرتاپا غلط ہے۔ ان کو نفس معجزہ مانگنے پر نہیں بلکہ مادی اور ظاہری معجزات طلب کرنے پر تنبیہ کی گئی ہے" صفحہ ۲۱۳۔

لاریب۔ ظاہری اور مادی معجزات ہی سے قرآن نے انکار کیا ہے ورنہ عقلی معجزہ تو خود قرآن ہی ہے جس کا وہ تصریح کے ساتھ اظہار کرتا ہے بلکہ یہاں تک کہتا ہے۔

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا | کہدے کہ اگر جن وانس اس بات پر متفق ہو جائیں کہ قرآن کے

بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ۞	مانند کوئی کلام بنائیں تو وہ ویسا نہیں بنا سکیں گے اگرچہ ایک دوسرے کے مددگار کیوں نہ ہوں۔

اس کے بعد اس دعوے کے ثبوت میں سید صاحب صحیح بخاری کی یہ حدیث نقل کرتے ہیں۔

ما من نبی من الانبیاء الا اعطی من الایات ما مثلہ آمن علیہ البشر و انما کان الذی اوتیت وحیا اوحاہ اللہ الیّ۔	پیغمبروں میں سے ہر پیغمبر کو اللہ نے اس قدر معجزے دئے جن کو دیکھ کر لوگ ایمان لائے لیکن مجھے جو معجزہ دیا گیا ہے وہ صرف وہ وحی ہے جس کو اللہ میری طرف بھیجتا ہے۔

اس حدیث کے حسب ذیل نکات سید صاحب نے حل کئے ہیں۔

"(۱) ہر پیغمبر کو کوئی نہ کوئی معجزہ عطا ہوا ہے۔

(۲) دیگر انبیاء علیہم السلام کے معجزات وقتی اور عارضی تھے اور آنحضرتؐ کا معجزہ اعظم یعنی قرآن مجید قیامت تک رہے گا۔

(۳) چونکہ وہ معجزے وقتی اور عارضی تھے اس لئے ان سے جو اثر پیدا ہوا وہ بھی وقتی اور عارضی تھا برخلاف اس کے قرآن مجید چونکہ ہمیشہ دنیا میں قائم رہنے والا ہے اس لئے اس کا اثر بھی دائمی اور ہمیشہ باقی رہنے والا ہے۔" صفحہ ۲۱۶

مگر اس حدیث میں جو سب سے ضروری نکتہ تھا یعنی یہ کہ حضور اکرمؐ نے "انما" کے لفظ سے حصر فرمادیا کہ مجھے سوائے وحی کے اور کوئی معجزہ نہیں دیا گیا ہے اسی کو چھوڑ دیا۔

اب اس کے برخلاف سید صاحب قرآن مجید سے آپ کے ظاہری معجزات پانے کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔

"بعض کم سواد اس دعوے کی جرأت کرتے ہیں کہ قرآن مجید کی آیتیں آپ کو معجزات اور نشانیوں سے معرّا ظاہر کرتی ہیں لیکن اس سلسلے میں غور کے قابل سب سے پہلی بات یہ ہے کہ قرآن مجید نے آپؐ کے متعلق آپؐ کے زمانے کے کافروں کے جو اقوال تردید کی غرض سے نقل

کیے گئے ہیں ان میں متعدد موقعوں پر آپ کو نعوذ باللہ کاہن اور ساحر کہا گیا ہے......." اگر امور غیب کی قبل از وقت اطلاع نہیں دیتے تھے اور معجزات و خوارق کا صدور آپ سے نہیں ہوا کرتا تھا تو کفار آپ کو کاہن اور ساحر کے خطابات سے کیوں یاد کرتے تھے" صفحہ ۲۵۸۔

مجھے حیرت ہے کہ سید صاحب نے کفار کے ساحر اور کاہن کے الفاظ سے رسول اللہؐ کو صاحب معجزہ قرار دینے کی کیسے جرأت کی درآنحالیکہ خود وہ تسلیم کرتے ہیں کہ ان کے ان الفاظ کو قرآن نے تردید کے لئے نقل کیا ہے۔ علاوہ ازیں وہ آنحضرتؐ کو کاہن، ساحر اور شاعر صرف قرآن ہی کی بنا پر کہتے تھے نہ کہ خوارق عادات کے صدور پر۔

کاہن اس لئے کہ قرآن میں غیب کی خبریں ہیں اور ان کے خیال میں غیب کی خبر دینے والا کاہن تھا۔

شاعر اس لئے کہ قرآن کا انداز بالکل اچھوتا تھا جو ان کے طرز کلام سے ملتا جلتا نہ تھا۔

ساحر اس لئے کہ دلکش یا مؤثر کلام کو وہ جادو کہتے تھے اور قرآن کو ایسا ہی سمجھتے تھے چنانچہ سورۂ مدثر میں مکہ کے اس سردار کا قول ہے جو قرآن کو جانچنے کے لئے آیا تھا۔

اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ يُّؤْثَرُ۔ اِنْ هٰذَآ اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ۔	یہ قرآن نہیں ہے مگر جادو جو منقول ہوتا چلا آرہا ہے اور یہ نہیں ہے مگر انسان کا قول۔

اب علاوہ ان آیات کے جو خاتم النبیینؐ کو کسی حسی معجزہ دیئے جانے کی نفی کرتی ہیں میں ایک ایسی آیت نقل کرتا ہوں جو اس بحث کا قطعی فیصلہ کر دیتی ہے اور جس کو سید صاحب نے اپنی اس آٹھ سو صفحات کی طویل و عریض کتاب میں کہیں نقل نہیں کیا ہے۔ وہ یہ ہے:۔

وَاِذَا لَمْ تَاْتِهِمْ بِاٰيَةٍ قَالُوْا لَوْلَا اجْتَبَيْتَهَا ۷:۲۰۳	اور جب تو ان کے پاس کوئی نشانی نہ لایا تو انھوں نے کہا کہ تو نے کوئی نشانی کیوں نہ چنی۔

اس میں تصریح کر دی گئی ہے کہ جس قسم کی نشانی یعنی حسی معجزہ وہ طلب کرتے تھے اس قسم کی کوئی نشانی خاتم النبیین نہیں لائے۔ غرض قرآن کریم اور صحیح بخاری کی حدیث جو اوپر گذر چکی ہیں دونوں

اس بات پر متفق ہیں کہ آنحضرتؐ کو سوائے قرآن کے جو عقلی معجزہ ہے کوئی حسی نشانی نہیں دی گئی۔

سید صاحب نے اپنی کتاب کے تقریباً سو صفحوں میں ان آیات و دلائل نبوی کا بیان لکھا ہے جو قرآن مجید میں مذکور ہوئی ہیں۔ اب ہم کو ان کا	قرآن مجید میں خاتم النبیین کا کوئی ظاہری معجزہ نہیں ہے

جائزہ لینا ہے کہ آیا قرآن کی تصریحات کے برخلاف ان میں کوئی حسی معجزہ تو نہیں ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ کفار عصائے موسیٰ، ید بیضا اور احیاء موتیٰ کی نوعیت کے حسی معجزے چاہتے تھے۔

انھوں نے کہا کہ اس کو ایسا معجزہ کیوں نہ دیا گیا جیسا موسیٰ کو دیا گیا تھا۔	قَالُوْا لَوْلَآ اُوْتِيَ مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى ﴿﴾
چاہیے کہ وہ ہمارے پاس کوئی ایسی نشانی لائے جیسی اگلے رسول دے کر بھیجے گئے تھے۔	فَلْيَاْتِنَا بِاٰيَةٍ كَمَآ اُرْسِلَ الْاَوَّلُوْنَ ﴿﴾

ان میں سب سے پہلے سید صاحب نے معجزۂ قرآن کو لکھا ہے جس کے بارے میں ہم بھی متفق ہیں کہ یہ عقلی معجزہ دائم و قائم خاتم النبیین کو دیا گیا اور قرآن نے اس کو مصرح بیان کیا۔ پھر وہ آپ کی امیت کو بھی معجزہ قرار دیتے ہیں لیکن یہ اگر معجزہ ہے تو جملہ عرب اس میں شریک تھے کیونکہ وہ سب امی تھے۔

ذات نبوی کی حفاظت کا وعدہ بھی معجزات ظاہری میں نہیں ہے بلکہ یہ اللہ کی مہربانیوں میں سے ایک مہربانی تھی۔ اسی طرح جنوں کا حضور اکرم کی خدمت میں آکر مسلمان ہونا بھی معجزہ نہیں ہے اس لئے کہ آپ جن وانس سب کی طرف مبعوث کئے گئے تھے جس طرح انسان آپ کے پاس آکر مشرف باسلام ہوتے تھے اسی طرح جن بھی۔ غلبۂ روم کی پیشین گوئی اور دیگر پیشین گوئیاں یا اخبار بالغیب جو انھوں نے قرآن سے نقل کی ہیں وہ سب کی سب اگر وجہ اعجاز ہو سکتی ہیں تو قرآن کے لئے جس نے ان امور کا بیان کیا، نہ کہ رسول کے لئے۔ اسی طرح ہجرت کا موقع دکھلانا، فرشتوں سے امداد کرنا، لڑائیوں میں فتوحات دینا، میدان جنگ میں پانی برسا دینا وغیرہ وغیرہ جملہ امور نصرت و تائید الٰہی ہیں ان کا شمار معجزات میں اور خاص کر ان معجزات میں جن کو کفار طلب کرتے تھے نہیں ہو سکتا۔ مکہ سے بیت المقدس تک ایک رات میں سفر نہ کفار نے دیکھا نہ مسلمانوں نے بلکہ ابھی تک یہی بحث ہے کہ یہ خواب میں تھا یا بیداری میں۔ پھر

اس کو معجزہ کیسے کہہ سکتے ہیں۔ حیرت یہ ہے کہ سید صاحب نے طیرا ابابیل کی نشانی کو بھی آنحضرت کا معجزہ قرار دیا ہے۔ کیا حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے بنائے ہوئے کعبے کا جو بیت اللہ ہے یہ حق نہیں تھا کہ اللہ دشمنوں سے اس کی حفاظت کرتا۔ پھر یہ اگر معجزہ ہے تو بیت اللہ کا ہے۔ رسول اللہ تو اس وقت تک پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔

غرض جتنے معجزات سید صاحب نے قرآن کریم سے نقل کئے ہیں ان میں سے کوئی بھی حسی معجزہ نہیں ہے جو قرآن کی تصریحات کے برخلاف پڑے۔

شق القمر | بے شک ایک شق القمر ہے جو حسی ہو سکتا تھا اور جس کو نہ صرف زمین بلکہ سبعہ سیارہ اور آسمانوں کے باشندے بھی دیکھ سکتے تھے مگر قطعاً قرآن سے ثابت نہیں کیونکہ قرآن میں تصریح ہے کہ چاند قیامت کے قریب شق ہو گا۔ اس کا بیان قرآن میں صرف ایک ہی جگہ سورۂ قمر میں ہے۔

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ	قیامت قریب آئی اور چاند پھٹا۔

یعنی جوں ہی قیامت قریب آئے گی چاند پھٹ جائے گا۔

وَاِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ	اگر وہ (قیامت کی) کوئی نشانی دیکھیں گے تو بھی منہ پھیر لیں گے اور کہیں گے کہ یہ جھوٹ ہے جو ہمیشہ سے چلا آرہا ہے۔

یعنی قرب قیامت کی نشانی شق قمر دیکھ لینے کے بعد بھی یہ منکرین قیامت کے قائل نہ ہوں گے اور اس کو جھوٹ ہی قرار دیتے رہیں گے۔

یہاں آیت کے لفظ سے غلط فہمی ہوئی ہے۔ لوگوں نے آیت کے معنی آیت رسول لئے حالانکہ یہاں رسول کا مطلقاً ذکر نہیں بلکہ قیامت کا ہے اس لئے آیت سے آیۃ الساعۃ ہی مراد ہو سکتی ہے اور سحر یعنی کلام مزور بنائی ہوئی بات یعنی جھوٹ کے جابجا قرآن میں مستعمل ہے مثلاً

وَلَئِنْ قُلْتَ اِنَّكُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ مِنْ بَعْدِ الْمَوْتِ لَيَقُوْلَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ	اور جو تو کہے کہ تم مرنے کے بعد اٹھائے جاؤ گے تو ضرور یہ کافر کہیں گے کہ یہ تو نہیں ہے مگر کھلا ہوا جھوٹ۔

سید صاحب لکھتے ہیں:۔

"بعض عقل پرست مسلمانوں نے قرب قیامت کی مناسبت سے یہ تاویل کی ہے کہ آنحضرتؐ کے عہد میں شق قمر کا ثبوت نہیں ہوا تھا بلکہ یہ قیامت کے واقعے کا ذکر ہے لیکن اس حالت میں اول تو بے قرینہ ماضی کو چاند پھٹ جائے گا کے معنی میں لینا پڑے گا دوسرے یہ کہ اگر یہ قیامت کا واقعہ ہوتا تو اس کے بعد یہ کیوں ہوتا کہ یہ کافر اگر کوئی بھی نشانی دیکھیں تو منہ پھیر لیں اور کہیں کہ یہ تو جادو ہے جو ہوتا آیا ہے۔ قیامت سامنے آجانے کے بعد اس کے انکار کے کیا معنی اور اس کو مستمر جادو کہنا کیونکر صحیح ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ مستند اور صحیح روایات کی کیوں کر تردید کی جا سکتی ہے" صفحہ ۵۰۶۔

بس اصلی وجہ یہی مستند اور صحیح روایات ہیں جو اس کھلی ہوئی آیت کے سمجھنے سے مانع ہیں۔ آخر اس میں کیا قباحت ہے کہ قرآن کی آیت جس معنی میں ہے اس کو اسی میں رہنے دیجئے اور صاف صاف کہہ دیجئے کہ شق القمر کا معجزہ قرآن سے ثابت نہیں ہے ہاں ۳۲ روایتیں اس پر ضرور شاہد ہیں کیونکہ آپ کے نزدیک جیسا کہ آگے چل کر میں نقل کروں گا اس مستند ذخیرۂ احادیث کو خود اللہ نے معجزے کی حفاظت کے لئے منتخب فرمایا ہے۔

بدر میں فرشتوں کا نزول اللہ کے افضال وعنایات میں سے یہ امر بھی تھا کہ اس نے بدر نیز دوسرے غزوات میں بھی اپنے نبی کی امداد کے لئے فرشتے اتارے۔ ان کے اتارنے کی حقیقت اور اس کی نوعیت اور اس کے متعلق سنت اللہ ان سب امور کی قرآن میں کئی جگہ تفصیل کی گئی ہے لیکن سید صاحب نے قطعاً اس کی طرف اعتنا نہ کی۔ ان کے خیال میں فرشتوں کی فوج پرا باندھے ہوئے آسمانوں سے چلی اور آ کر مسلمانوں کے ساتھ مل گئی اور کفار پر یلغار بول دیا۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"جب دونوں صفیں گتھ گئیں تو خدا کے حکم سے مسلمانوں کی تعداد دشمنوں کی آنکھوں میں ان کی اپنی تعداد سے بھی دوگنی نظر آنے لگی ... یہ مسلمانوں کی تعداد بڑھ کیوں کر گئی تھی۔ کیا آسمان سے فرشتے اتر آئے" صفحہ ۵۲۰۔

اس کے بالکل خلاف انھیں کی زبان سے دوسرا معجزہ سنئے:۔

"اس معرکے میں سن چکے ہو کہ کافروں کی تعداد مسلمانوں سے تگنی تھی ایسی حالت میں مسلمانوں کا بددل ہونا لازمی تھا خدا نے اپنی قدرت کاملہ کا یہ تماشا دکھایا کہ مسلمانوں کی نگاہوں میں کچھ ایسا تغیر کر دیا کہ وہ مسلمانوں کو بہت تھوڑے معلوم ہونے لگے۔ ادھر کفار کو مسلمان تھوڑے نظر آتے تھے مقصود یہ تھا کہ رؤسا کفار میدان سے بھاگ کر جانیں بچا کر نہ جانے پائیں۔ اس کی تدبیر یہ کی کہ مسلمان اپنی اصلی تعداد سے بھی ان کو کم نظر آنے لگے" صفحہ ۵۲۰۔

یعنی ایک ہی حالت میں جبکہ بدر میں دونوں فوجیں گتھی ہوئی تھیں کفار مسلمانوں کو اپنی تعداد سے دونا یعنی کم و بیش دو ہزار دیکھتے تھے اور پھر ان کو ان کی اصلی تعداد یعنی ۳۱۴ سے بھی کم دیکھتے تھے۔

کیا ان دونوں سے ایک تیسرا معجزہ جمع بین الضدین کا نہیں پیدا ہوتا جس کو سید صاحب کی طرف منسوب کرنا چاہیے۔

آپ کہیں گے کہ ان دونوں باتوں پر قرآن کی آیتیں ناطق ہیں۔ میں صرف یہ عرض کرتا ہوں کہ قرآنی آیات کو اس سے زیادہ معقولیت کے ساتھ سمجھنے کی ضرورت ہے۔

آیات موسوی | سورۂ بنی اسرائیل کی تفسیر کرتے ہوئے آیت

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَىٰ تِسْعَ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ | اور ہم نے موسیٰ کو نو کھلی ہوئی نشانیاں دیں۔

کا ترجمہ سید صاحب نے لکھا ہے کہ

"اور ہم نے کوہ طور پر موسیٰ کو نو کھلے ہوئے احکام دئے" صفحہ ۳۰۴

پھر اس کے ثبوت میں مندرجہ ذیل حدیث نقل کی ہے:۔

"صحیح احادیث میں مذکور ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت تشریف فرما تھے۔ سامنے سے دو یہودی گزرے۔ ایک نے دوسرے سے کہا کہ چلو اس پیغمبر سے کچھ سوال کریں۔ دوسرے نے کہا کہ پیغمبر نہ کہو سن لے گا تو اس کی چار آنکھیں ہو جائیں گی (یعنی خوش ہوگا) اس کے بعد وہ آپ کی خدمت میں آئے اور دریافت کیا کہ موسیٰ کو نو آیتیں کونسی دی گئیں۔ آپ نے فرمایا

وہ یہ ہیں کسی کو خدا کا شریک نہ بناؤ، زنا نہ کرو، کسی بے گناہ کو قتل کرو، چوری نہ کرو، جادو نہ کرو، کسی حاکم کے پاس بے جرم کی چغلی نہ کھاؤ، سود نہ کھاؤ، کسی پاک دامن پر تہمت نہ لگاؤ اور میدان جہاد سے نہ بھاگو (اس نویں حکم میں راوی کو شک ہے) اور خاص تمہارے لئے اے یہود! یہ سوا حکم ہے کہ سبت کے دن زیادتی نہ کرو۔ یہ سن کر دونوں یہودیوں نے آپ کے دست وپا کو بوسہ دیا۔ یہ حدیث جامع ترمذی، مسند احمد، نسائی، ابن ماجہ، ابن جریر میں ہے۔ امام ترمذی نے اس حدیث کو دو جگہ نقل کیا ہے اور دونوں جگہ کہا ہے کہ "حدیث حسن صحیح" ! صفحہ ۱۳۱۴

حضرت موسیٰ کے تسع آیات کی تفسیر توریت کے احکام تسعہ کے ساتھ جو اس حدیث میں کی گئی ہے اور جس کو ترمذی نے "حسن صحیح" کہا ہے نہ صرف یہ کہ صحیح نہیں ہے بلکہ قرآن کی رو سے اس کا صحیح ہونا قطعاً ناممکن ہے کیونکہ حضرت موسیٰ کو یہ نو نشانیاں اس وقت ملی تھیں جب مدین سے مصر جاتے ہوئے اللہ نے ان کو فرعون اور اس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا تھا اور اس وقت نہ توریت نازل ہوئی تھی نہ اس کے احکام عشرہ تھے۔

ان دونوں باتوں کی تصریح قرآن میں موجود ہے۔ سورۂ نمل میں ہے:

فِي تِسْعِ آيَاتٍ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَقَوْمِهِ	نو نشانیاں لے کر فرعون اور اس کی قوم کی طرف

پھر سورۂ اعراف میں جس میں حضرت موسیٰؑ کا قصہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے ان نشانیوں کی تفصیل کر دی ہے یعنی عصا، ید بیضا، قحط، نقص ثمر، طوفان، ٹڈی، جوں، مینڈک، خون۔

اس کے بعد حضرت موسیٰؑ اللہ کے حکم سے بنی اسرائیل کو مصر سے لے کر نکلتے ہیں۔ فرعون مع اپنے لشکر کے ان کا پیچھا کرتا ہوا سمندر میں غرق ہوتا ہے اور حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کو لئے ہوئے کوہ طور کی طرف آتے ہیں۔ وہاں اللہ ان کو میقات پر بلاتا ہے اور بنی اسرائیل کی طرف رسول بنا کر توریت عطا کرتا ہے۔

يَا مُوسَىٰ إِنِّي اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسَالَاتِي وَبِكَلَامِي فَخُذْ مَا آتَيْتُكَ وَكُن مِّنَ الشَّاكِرِينَ وَكَتَبْنَا لَهُ فِي الْأَلْوَاحِ مِن كُلِّ شَيْءٍ مَّوْعِظَةً وَتَفْصِيلًا	اے موسیٰ میں نے تجھ کو لوگوں پر اپنی پیغمبری اور ہمکلامی کے لئے چن لیا۔ سو جو کچھ تجھ کو دیتا ہوں اس کو لے اور شکر کر۔ اور ہم نے اس کے لئے تختیوں پر ہر قسم کی نصیحت اور ہر شے کی

بکل شئ | تفصیل لکل شئ

علاوہ بریں اس حدیث سے زیادہ دور نہیں صرف دس ہی صفحے پہلے یعنی صفحہ ۴۰۲ میں سید صاحب نے خود توریت کے احکام عشرہ گنائے ہیں۔ ذرا غور سے دیکھئے تو ان میں اس حدیث کا پانچواں حکم "جادو نہ کر" کہیں ہے۔

روایتی معجزے | اس کے بعد ساری کتاب صفحہ ۴۸۴ سے آخر تک ان معجزات کے ذکر سے بھری گئی ہے جو کتب حدیث میں بیان کئے گئے ہیں مثلاً بت خانوں سے غیبی آوازیں، پتھروں سے سلام کی آواز، کھانوں سے تسبیح کی آواز، ستون کا رونا، اشارے سے بتوں کا گر جانا، درخت کا چلنا اور اس سے آواز آنا، خوشۂ خرما کا درخت سے اتر کر آنا اور پھر واپس چلا جانا، ایک بکری اور دو سیر آٹے میں ہزاروں آدمیوں کا شکم سیر ہو کر کھالینا، انگلیوں سے پانی کا چشمہ بہہ نکلنا وغیرہ وغیرہ۔ اور یہ سب مستند اور صحیح روایتیں ہیں۔ اسی طرح بہت سے ان معجزوں کو بھی بیان کیا ہے جن کا کتب حدیث میں ذکر ہے مگر ان کی روایتیں کمزور یا موضوع ہیں اس لئے ان کو رد کیا ہے۔

میں قرآن کریم کی تصریحات کے بعد کہ خاتم النبیین کو اس قسم کے حسی معجزے نہیں دئے گئے ان روایات کے متعلق کسی قسم کی بحث غیر ضروری سمجھتا ہوں۔

سید صاحب لکھتے ہیں کہ

"دوسرے مذاہب کے پاس ایک ہی مستند چیز یعنی ان کا صحیفہ ہے جس میں ان کے ربانی احکام، ان کے پیغمبروں کے اقوال، حالات، سوانح، معجزات سب کچھ ملے جلے ہیں لیکن اسلام کے قبضے میں دو چیزیں ہیں ایک صحیفۂ الٰہی جس میں صرف خدائی احکام و مطالب ہیں۔ دوسرے حدیث و سنت جس میں پیغمبر کے حالات، اقوال اور معجزات وغیرہ الگ اور مستقل حیثیت سے مذکور ہیں اور وہ بجائے خود روایتی اسناد کے لحاظ سے دوسرے مذاہب کے صحیفوں سے کہیں بلند تر ہے اس لئے خدا نے پیغمبر کے ان دلائل و معجزات کو عدم اہمیت کے باعث بہ تفصیل اپنے صحیفے میں جگہ دینے کی ضرورت نہ سمجھی بلکہ اس کے لئے احادیث کے مستند ذخیرہ

روایات کی موجودگی کو کافی قرار دیا ہے'' صفحہ ۵۰۴۔

یہاں سید صاحب سے صرف یہ سوال ہے کہ اس ممتاز ایزدی کو آپ نے کس طرح معلوم کیا؟ یا کس "وحی محمدی"[1] سے سمجھا؟ پھر یہ کہ "احادیث کے مستند ذخیرے کی موجودگی" کیا ظہور معجزات کے وقت تھی؟ ہم کو تو جہاں تک معلوم ہے روایات کے چھ خزانے جو صحاح ستہ کے نام سے مشہور اور اہل سنت میں متداول اور مقبول ہیں وہ تیسری صدی ہجری اور اس کے بعد مدون ہوئے ہیں۔

آخر میں سید صاحب کو ایک امر کی طرف توجہ دلانا ضروری سمجھتا ہوں کہ انھوں نے مضامین کا بار بار اعادہ کیا ہے اور ایک ہی بات کو کئی کئی طرح سے بیان کیا ہے مثلاً کتاب زیر تنقید کے صفحہ ۲۱ سے صفحہ ۲۱۵ تک صرف چھ صفحات میں قرآن کریم کی تین آیتیں مع ترجمہ و تفسیر کے تین تین بار دہرائی گئی ہیں۔ اس سے نہ صرف غیر ضروری طوالت ہوتی ہے بلکہ لبند پایہ تصانیف میں یہ بہت معیوب ہے۔

جس محنت اور کوشش، جستجو اور کاوش سے سید صاحب نے اس کتاب کو مرتب کیا ہے وہ نہایت قابل تعریف ہے مگر مجھ کو ان کی قدامت پرستی اور تقلید سے جس کی ہر جگہ انھوں نے حمایت کی ہے شدید اختلاف ہے کیونکہ اس کے باعث حق پرستی اور قرآن سے رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔

---

[1] وحی محمدی کا لفظ اسی کتاب میں مجھ کو نظر پڑا۔ غالباً یہ ترکیب خود سید صاحب نے ایجاد کی ہے۔ پہلے مجھ کو خیال ہوا کہ قرآن کو توریت و انجیل سے ممتاز رکھنے کے لئے یہ ترکیب اختیار کی گئی ہے مگر جب کہیں میں نے اس میں وحی موسوی اور وحی عیسوی کا لفظ نہ دیکھا تو یہی سمجھنا پڑا کہ سید صاحب نے اپنی اس شیفتگی کے اظہار کے لئے جو ذات محمدی کے ساتھ ان کو ہے وحی الٰہی کو چھوڑ کر وحی محمدی کو اختیار کیا ہے۔

عربی اور فارسی شاعری کے امتیازات

(بسلسلۂ ماہ اگست)

(۴)

عشقیہ رنگ

حالتِ عشق کا اخفا | ابتدائے محبت میں عاشق کی جانب سے اخفائے حال کی سعی لاحاصل مذہب عشق کی ایک پرانی رسم ہے۔ اس منزل کا ہر رہرو ابتدا میں اس کی سخت احتیاط کرتا ہے۔ فارسی کی عشقیہ شاعری نے اس میدان میں بہت وسعت اور مضمون آفرینی سے کام لیا ہے۔ عربی رنگ تو اس اخفا کی لذت و چاشنی سے قطعاً ناآشنا ہے، وہ اپنی بیباکئ طبع کی بنا پر پہلے ہی قدم میں اس کا اظہار اپنے لئے باعث فخر و نمود تصور کرتا ہے۔

علقتها عرضا واقتل قومها   زعما لعمر ابيك ليس بمزعم

یعنی "جس وقت میرا اور اس کا سامنا ہوا فوراً میں نے اپنے عشق کا اظہار اس سے کر دیا اور میں اس کی قوم سے بلیو وصال لڑتا ہوں اے مخاطب تیرے باپ کی عمر کی قسم یہ ایک ایسی امید ہے جو حاصل ہونے کے قابل نہیں کیونکہ عداوت فریقین مانع وصال ہوگی۔"

فارسی رنگ کے مقابلے میں ضرور اس پر تنگ ظرفی کا طعنہ دیا جا سکتا ہے۔ فارسی شاعر کو اس میدان میں قدم قدم پر حکمت عملی سے کام لینا پڑتا ہے۔ محبوب کی حالت اور خیریت مزاج معلوم کرنے کے لئے بہ ظاہر تو ماہی بے آب نظر آتا ہے لیکن اس حالت میں بھی وہ رازداری کے دامن کو ہاتھ سے نہیں چھوڑتا، مختلف تدبیروں اور حیلوں سے اپنے اضطراب کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہے، ہر مجلس اور ہر انجمن میں شریک ہوتا ہے۔ دنیا کی باتیں چھیڑتا ہے، باتوں ہی باتوں میں اپنے محبوب کی خیریت بھی معلوم کر لیتا ہے۔

بہر جا میروم، اول حدیث شکواں پرسم   کہ حرف آں ستمگر مہرباں را در میاں پرسم (شفائی)

رقیبوں سے گفتگو کرتا ہے تاکہ درمیانِ گفتگو محبوب کی حالت کا کچھ پتہ چل سکے۔

یارانہ با رقیب بے گفتگو کنم تا درمیان تفحصِ احوال او کنم (غضنفری)

بزم میں معشوق سامنے بیٹھا ہے لیکن عاشق شوقِ دیدار میں جاں بلب ہے۔ وہ صرف اس وجہ سے اس کی طرف نگاہ بھر کر نہیں دیکھ سکتا کہ کہیں غیر معاملے کی تہ کو نہ پہنچ جائے اور سارا حال کھل جائے۔

زشوق میرم و سوئے تو ننگرم در بزم برائے آنکہ فتد غیر در گمان دگر

سعدی نے اس مفہوم کو ذرا شوخ اور رنگین الفاظ میں بیان کیا ہے۔

دل و جانم بتو مشغول و نظر در چپ و راست تا ندانند رقیباں کہ تو منظور منی

خسرو نے اس انداز میں ایک اور بات پیدا کی ہے یعنی اتفاق سے جب نظریں چار ہو جاتی ہیں تو فوراً میں اپنی نظر کو ہٹا لیتا ہوں۔

خوش آں زماں کہ بروئش نظر نہفتہ کنم چو سوئے من نگرد او، نظر بگردانم

اظہارِ عشق کا موقع اول تو اس وجہ سے نہیں آتا کہ عاشق کے دل میں اس کے اظہار کی جرأت نہیں ہوتی۔ دوسرے وہ یہ خیال کرتا ہے کہ اظہارِ محبت کے بعد پھر کہیں جائے عافیت اور گوشۂ امن نہیں مل سکتا کیونکہ جب محبوب کو عشقِ عاشق کا پتہ چل جاتا ہے تو پھر وہ ایذا رسانی سے باز نہیں آتا۔

کسے کہ پیش تو اظہارِ آشنائی کرد ترا بدشمنیِ خویشتن رہنمائی کرد (حزنی ترشیزی)

اخفائے حال کا وہ موقع عجیب و غریب ہوتا ہے جبکہ معشوق خود ناز و غمزے کے عالم میں متبسمانہ انداز سے استفسارِ حال کرتا ہے اور عاشق بے چارہ ذلت و رسوائی اور رقیبوں کے خوف سے اخفا کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ اس کا اخفا کچھ اس انداز سے ہوتا ہے کہ معشوق اس کے چہرے کی متوحش حالت سے دل کا چور معلوم کر لیتا ہے اس موقع پر اس کو چھیڑ چھاڑ کی سوجھتی ہے، نئے نئے غمزے اور انداز سے اس کی دلی کیفیت کی چھان بین کرتا ہے اور عاشق کے دل پر ایک عجیب ہوش ربا کیفیت طاری ہو جاتی ہے، شرم و حیا سے چہرے پر ایک رنگ جاتا ہے اور ایک آتا ہے، طبیعت میں انفعالی کیفیت کا اثر رونما ہو جاتا ہے، نہ تو اقرار کرتے بنتا ہے اور نہ اخفا کی کوئی تدبیر سمجھ میں آتی ہے۔ غرض یہ کہ عاشق کے لئے یہ موقع عجیب پریشانی اور تحیر کا

ہوتا ہے۔ فارسی شاعری میں اس موقع کی تفصیلات مکمل طریقے سے موجود ہیں بلکہ ان تفصیلات میں مضمون آفرینیاں بھی خوب پائی جاتی ہیں۔

سوز و گداز | ابن رشیق اور ابن قدامہ نے عشقیہ انداز کو مدنظر رکھتے ہوئے عشقیہ شاعری میں سوز و گداز کے رنگ کو سب پر مقدم رکھا ہے اور وجہ تقدیم بھی صحیح معلوم ہوتی ہے کیونکہ منزل عشق میں قدم رکھنے کے بعد طبیعت میں سوائے سوز و گداز اور رقت کے کچھ باقی نہیں رہتا۔

ع دو عالم بافتن نیز رنگ عشق است (عرفی)

دل پر صلح و امن اور راز و نیاز کی تجلیات پر تو فگن ہونے لگتی ہیں، دشمنی و عداوت کا اثر تک باقی نہیں رہتا، بغض و کینے کی جگہ محبت و دوستی اور مہر و اخلاص کے عام جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔

زمین عشق بہ کونین صلح کل کردم   تو خصم باش و زما دوستی تماشا کن

ع مہر تو نگذاشت جا در دل من کینہ را

عشقیہ شاعری کی ساری اثر انگیزی سوز و گداز کے پردے میں پوشیدہ ہے۔ جذبات جس قدر سوز و گداز میں ڈوبے ہوئے نکلیں گے اسی قدر کیف و تاثر کے انداز زیادہ پائے جائیں گے۔ سوز در حقیقت میں وہ نغمہ ہے جس کا اثر دل میں تیر کی طرح جاگزیں ہو جاتا ہے، دلوں میں کشاکش اور اضطراب کی ایک لہر سی پیدا کر دینا اس کے خصائص میں شامل ہے۔ اردو علم ادب میں میر کے کلام میں نہ تو فلسفیانہ مسائل کا حل پایا جاتا ہے اور نہ کوئی ایسی خاص بات ہے جو ان کے کلام کو دوسروں سے ممتاز کر سکے لیکن جو مقبولیت عامہ اس کو حاصل ہے اس میں اس کا کوئی شریک و سہیم نہیں۔ اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ ان کا کلام از ابتدا تا انتہا مجموعہ ہے رقت و درد اور سوز و گداز کا۔ ان کی شاعری کا ہر لفظ اپنی جگہ پر اثر انگیزی کے اعتبار سے تیر و نشتر کا مرادف ہے۔ چھوٹے چھوٹے سے الفاظ اور فقرے ہیں لیکن اثر انگیزی کی وہ شدت ہے جس نے سب کے کلام کو پھیکا کر دیا۔

انسان کے دل میں جب رقت گداز کی قوت نشو و نما پاتی ہے تو پھر اس کی نظریں ایک مرکز پر آکر جمع ہو جاتی ہیں اور عشق کا خاصہ چونکہ یہی ہے کہ انسان کی تمام فعالی قوتیں ایک نقطے اور ایک مرکز پر جمع

ہو جائیں اس لئے درد و رقت اور سوز و گداز کا پیدا ہو جانا حقیقت میں منزل عشق کی قربت کی دلیل ہے۔

صوفیہ کے نزدیک منزل عشق میں صرف گداز اور راز و نیاز کی تخلیق ہی کتاب عشق کی تکمیل کے لئے کافی ہے، سوز و گداز چونکہ نتیجہ ہوتا ہے عشق و محبت کے غلبے کا اور عشق کا مادہ حضرت انسان سے گذر کر عام حیوانات تک میں اسی انداز سے پایا جاتا ہے لہٰذا اس صغریٰ اور کبریٰ کی ترتیب میں بدیہی طور پر یہ نتیجہ نکل آتا ہے کہ سوز و گداز اور راز و نیاز صرف نوع انسانی کے ساتھ مخصوص نہیں، جانور بھی اس صفت میں برابر کے شریک ہیں بلکہ جدید تحقیقات کی رو سے نباتات بھی اس صفت سے خالی نہیں۔

عشقیہ شاعری کی اثر انگیزی کا تو راز ہی نغمہ سوز میں نہاں ہے۔ اس کو یوں سمجھئے کہ کوئی شخص آپ کے سامنے اکڑ یوں کہے کہ میں نے تو آپ کے لئے طرح طرح کی باتیں برداشت کیں لیکن آپ میری ہمنوائی ذرا نہیں کرتے چونکہ اس بیان میں کوئی سوز و گداز اور رقت و درد نہیں اس لئے اس میں وہ کیف و اثر انگیزی نہیں پیدا ہو سکتی جو اس شعر کے ہر لفظ میں پوشیدہ ہے۔

بہر تو شنیدہ ام سخنہا　　　شاید کہ تو ہم شنیدہ باشی　(ولی)

چونکہ ہر لفظ سوز و اضطراب کا سرمایہ دار ہے اس لئے کیف پنہانی بھی اپنی جگہ پر اچھی طرح موجود ہے۔ خسرو، حافظ، سعدی، نظیری، اور فغانی وغیرہ کے عشقیہ کلام کی ساری لذت و چاشنی صرف اسی سوز و گداز کی کشش ہے۔

شاعری کی بحث کو تھوڑی دیر کے لئے علیحدہ کر دیجئے۔ عام انداز گفتگو پر ایک نظر ڈال جائیے وہی گفتگو اپنی تاثیر کے اعتبار سے کامیاب نظر آئے گی جس کے اندر سوز و درد کے انداز زیادہ پائے جائیں گے۔ عرب کی عشقیہ شاعری اور اس کے طرز بیان پر آپ ایک گہری نظر ڈالئے آپ کو واردات عشق کی بوقلمونی اور محبت کی جذباتی تحلیل اس کے ہر لفظ سے ظاہر ہو گی لیکن سوز و گداز اور راز و نیاز کی وہ چاشنیاں جو عشقیہ رنگ میں ایک خاص مرتبہ رکھتی ہیں کہیں آپ کو نظر نہ آئیں گی۔

تسلت عمایات الرجال عن الصبا　　　ولیس فوادی عن ہواک بمنسل

یعنی "لوگوں کی گمراہی عشق عہد شباب گذر جانے کے بعد جاتی رہتی ہے مگر میرا دل تیری محبت سے جدا ہونے

والا نہیں ہے۔ اس شعر میں جذبۂ عشق کی فراوانی اپنی انتہائی صورت میں پائی جاتی ہے لیکن سوز و گداز جس چیز کا نام ہے اس کا کوسوں پتہ نہیں۔

اس دور کی شاعری کو چھوڑ دیجئے، بنو امیہ کے عہد کی نیم غلامانہ شاعری کو جانے دیجئے، عباسی عہد کی عربی شاعری کو لے لیجئے جس نے اپنے آپ کو ایرانی رنگ میں رنگ لیا تھا۔ اس میں بھی وہ سوز و گداز جو ایرانی شاعری کے لئے مخصوص ہے آپ کو کہیں نظر نہ آئے گا۔

ابرحت یا مرض الجفون بممرض مرض الطبیب لہ وعید العود

اے بیماری چشمان یار تونے مجھ پر ایسی زیادتی کی کہ میرا طبیب بھی بسبب زیادتی مرض بیمار ہو گیا اور اسی کے ساتھ تمام تیمار دار بھی مبتلائے مرض ہو گئے یہاں تک کہ ان کی بھی عیادت کرنا پڑی۔

متنبی کا یہ مشہور شعر ہے۔ شدت محبت کی انتہا پائی جاتی ہے لیکن وہ سوز جو طبیعت میں ایک اضطراب لہر پیدا کر دیتا ہے اس میں نہیں۔

فارسی شاعری نے اپنے عشقیہ رنگ میں جو سوز و گداز پیدا کیا ہے تمام دنیا کی عشقیہ شاعری اس انداز مستانہ سے خالی ہے۔ عربی شاعری کو چھوڑئے انگریزی کی تمدن آشنا شاعری پر ایک گہری نظر ڈال جائیے وہ بھی فارسی شاعری کے پر گداز رنگ کے سامنے بالکل پھیکی اور بے حقیقت سی معلوم ہوگی۔ محبوب کا عاشق کی نظروں کے سامنے سے اٹھ کر جانا اور عاشق کا مختلف حیل و تدابیر سے اس کو روکنا ایک فرسودہ اور عام خیال ہے لیکن جب اسی عمومی رنگ کو سوز و گداز اور رقت و درد کے انداز میں بیان کیا گیا تو وہی رنگ تیر و نشتر بن گیا۔

می روی و گریہ می آید مرا ساعتے بنشیں کہ باراں بگذرد

کیا اس شعر کے خاص انداز اور تیور درد آشنا طبائع کو بے خودی کے عالم میں پہنچانے کے لئے ناکافی ہیں۔

پروانہ و شمع اور گل و بلبل کی یکجائی پر عاشق مہجور کی جب نظر پڑتی ہے تو اس کا غمزدہ دل خیال دوست میں مضطرب سا ہو جاتا ہے اور اس حالت میں وہ اپنی دلی کیفیت سے مجبور ہو کر محبوب کو عالم تصور میں پکارنے لگتا ہے۔

پروانہ و شمع و گل و بلبل ہمہ جمع اند   اے دوست ابیا رحم بہ تنہائی ما کن (حافظ)

اسی مضمون کو ایک اور شاعر نے ذرا انداز بدلتے ہوئے کہا ہے۔

امشب بیا تا در چمن سازیم پر پیمانہ را   تو شمع و گل را داغ کن من بلبل و پروانہ را

یعنی اے محبوب! تو آج کی رات چمن میں تشریف فرما ہو تاکہ آج اس جگہ بزم عیش و نشاط برپا کریں، تو شمع و گل کو رشک سے جلا اور میں پروانہ و بلبل کو۔

ان دونوں شعروں کے گہرے تاثرات پر ایک نظر ڈالنے کے بعد یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ ان کے تمام تاثرات نتیجہ ہیں صرف سوز و گداز کی آمیزش کا۔ اگر اس مفہوم کے بیان میں ایسے الفاظ کا انتخاب نہ کیا جاتا تو یقیناً ان کی کیفیت محل شبہ میں آجاتی۔

سوز و گداز اور رقت و درد کے انداز عموماً عشق و محبت کے غلبے کے بعد پیدا ہوتے ہیں کیونکہ آتش عشق تمام جذبات کو جلا کر خاکستر کر دیتی ہے اور ان سب کے بجائے سوز و رقت کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا اس عینی مشاہدے کے بعد یہ نتیجہ نہایت آسانی سے نکل آتا ہے کہ جس ملک میں عشق و محبت کے چرچے مع اپنی تمام رنگینیوں کے زیادہ ہوں گے وہاں کی شاعری میں سوز و گداز کا رنگ بھی مع اپنی تمام کیفیات کے نمایاں طریقے سے پایا جائے گا۔

ایران کی آب و ہوا میں عشق و محبت کی تخلیق کا مادہ "حسن پرست" فطرت نے خاص طریقے سے ودیعت کیا تھا۔ یہ اسی کا فیضان ہے کہ اگر ایک طرف غلامان مجاز نظر آتے ہیں تو دوسری جانب بندگان حقیقت۔

بہار انگیز ایران کا ہر بچہ کتاب عشق کا کچھ حصہ گہوارۂ طفلی میں ہی ختم کر لیا کرتا تھا اور عالم پیری تک اسی کتاب کے مطالعے میں منہمک رہتا تھا۔

ع ز طفلی تا بہ پیری عشق ورزد (جامی)

عشق مزاج ایران کے نزدیک کائنات کی تمام چہل پہل اور فضا کی ساری رنگینیاں نتیجہ ہیں صرف عشق و محبت کی اثر انگیزی کا۔

ع جہاں پر فتنہ از غوغائے عشق است

زندگی کی ساری لذتیں اس کے نزدیک دل کے اضطراب میں پوشیدہ ہیں بغیر اس کی چاشنی کے دنیا کی ساری نعمتیں اس کے لئے پرِ کاہ کے برابر بھی نہیں۔ وہ اس دل کو جو تیرِ عشق کا زخم خوردہ نہ ہو دل ہی کہنے کے لئے تیار نہیں۔

دل فارغ ز دردِ عشق، دل نیست　　　تنِ بے درد دل جز آب و گل نیست

بلکہ دردِ عشق کی تخلیق کے لئے وہ ہر وقت دست بدعا رہتا ہے۔

غمِ عشق از دلِ کس کم مبادا　　　دلِ بے عشق در عالم مبادا

اور اس کی وجہ بھی اسی کی زبان عشق بیان سے سننے میں لطف آتا ہے۔

ع کہ باشد عالمے خوش عالمِ عشق

اس کی آنکھیں ہر قدم پر ایک ہوش ربا جلوہ اور صبر آزما منظر کی تمنی رہا کرتی ہیں وہ سکون کے بجائے اضطراب کی خواہش کرتا ہے۔ خلشِ زخم سے اس کو جو لذت حاصل ہوتی ہے وہ اس کے اندمال سے نہیں بلکہ اس کا اندمال اس کے لئے باعث صد آزار ہوتا ہے۔

بگذر مسیح از سرِ ما کشتگانِ عشق　　　یک زندہ کردنِ تو بصد خون برابر است

اس کا دل ہر وقت ایک کیفِ سرمدی کی آرزو میں سرگرداں اور پریشان رہا کرتا ہے۔ اس کو ایک ایسے آزار کی تلاش رہتی ہے جس کا کرب و اضطراب اس کو ہر وقت ماہیِ بے آب بناتے اور روئے حبیب کی تجلیاں ہر جگہ اس کو عکس فگن معلوم ہوتی ہیں۔

ع ہر جا کہ ہست پرتوِ روئے حبیب است　　　(حافظ)

ع جمالِ اوست ہر جا جلوہ کردہ　　　(جامی)

حسن کے شرارے اس کے خرمنِ دل کو ہر وقت خاکستر بناتے رہتے ہیں، وہ اس راستے کی آبلہ پائی کو دیکھ کر گھبراتا نہیں بلکہ راہ کو پرخار دیکھ کر مستی کے عالم میں دوریِ منزل کی دعا کرتا ہے۔ سوزِ عشق کی تخلیق کے بعد منزلِ محبت کے سربستہ رازوں کی وہ اس خوبی سے عقدہ کشائی کرتا ہے کہ مرغِ عقل کی پرواز وہاں تک نہیں ہو سکتی۔

کم از سوز عشق آں نکتہ بدانی   کہ سوزد عقل، زحمت نکتہ دانی

اس کے سوز عشق میں وہ حرارت پنہاں ہوتی ہے کہ اگر ایک مرتبہ حضرت مسیح بھی مع اپنے تمام سامان مداوا کے فلک چہارم سے اس کے علاج کے لئے اتر آئیں تو وہ خود بھی اسی سوز میں گرفتار ہو جائیں۔

مریض عشق را نازم کہ از بہر علاج او   مسیح ار بر سر بالیں رود بیمار می گردد

اس کا دل و دماغ ہر وقت مے عشق کے نشے سے بیگانۂ صبر و ہوش بنا رہتا ہے۔ اس حالت میں اول تو غم دنیا اس کے دل میں آتا ہی نہیں اور بفرض محال اگر آ بھی گیا تو وہ معشوق کی محبت کی شکل میں جلوہ نما ہوتا ہے۔

در دل ما غم دنیا غم معشوق شود   بادہ گر خام بود پختہ کند شیشۂ ما   (عرفی)

جب "روئے نکو" اس کے حسن پرست دل کے نزدیک "معالجۂ عمر کوتہ" کا مرتبہ پائے ہوئے ہے تو پھر اس کے عشق کی سرمستیوں کا کون مقابلہ کر سکتا ہے۔

روئے نکو معالجۂ عمر کوتہ است   ایں نسخہ از بیاض مسیحا نوشتہ ایم   (نظیری)

ابتدائے آفرینش سے اس وقت تک لاکھوں علماء و فضلا اور عاقل و فرزانہ زینت بخش جہان آب و گل ہوئے لیکن آج ان میں سے اکثر کے نام و نشان سے بھی ہمارے دماغ آشنا نہیں۔ اس گمنامی کا باعث بظاہر تو دور زمانہ معلوم ہوتا ہے لیکن ایران کا تیکدۂ عشق ان کی گمنامی کی وجہ بیگانگی عشق اور ناآشنائی محبت قرار دیتا ہے۔

ہزاراں عاقل و فرزانہ رفتند   وے از عاشقی بے گانہ رفتند
نہ نامے ماند ز ایشاں نہ نشانے   نہ در دست زمانہ داستانے

اس فرش خاک پر نوع بنوع مرغان خوش نوا و خوش پیکر اپنی نغمہ سنجی اور ترانہ نوازی سے داد خوش نوائی دے رہے ہیں مگر ان میں سے کتنے ہیں جن کی شکل و صورت سے ہم واقف ہیں لیکن ان کے مقابل پروانہ و بلبل کے نام اور ان کی مکمل حالت سے ہر شخص آگاہ ہے۔ اس کی وجہ بھی وہی ہے جو ابھی بیان کی جا چکی ہے یعنی اول الذکر بیگانگی عشق کی وجہ سے دور از نام و نشان رہے اور ثانی الذکر شمع و گل کی شیفتگی کی وجہ سے آشنائے خلق ہوئے۔

بسا مرغان خوش پیکر کہ ہستند | کہ خلق از ذکر ایشاں لب بہ بستند
چو اہل دل ز عشق افسانہ گویند | حدیث بلبل و پروانہ گویند

اسی بات کو مدنظر رکھتے ہوئے وہ ہر شخص سے مخاطب ہو کر کہتا ہے۔

بنہ در عشق بازی داستانے | کہ باشد از تو در عالم نشانے

اس مشرب کو وہاں اتنی ترقی ہوئی کہ مرید جب پیر و مرشد کے سامنے دست بعیت دراز کرتا ہے تو پیر سب سے پہلے اس سے یہ کہتا ہے۔

ع برو عاشق شو آنگہ پیش من آئے

بوڑھے، جوان، رند، صوفی، غنی اور فقیر سب اسی رنگ میں مست تھے۔ ہر شخص اسی میں فنا ہونے کی تمنا کرتا تھا۔ کسی کو اس مرض سے شفایابی کی خواہش نہ تھی۔

ع من نہ خواہم تندرستی خویش را

جب مریض کو طبیب دیکھنے آتا ہے تو عاشق مزاج مریض، طبیب کا حسن و جمال دیکھ کر مبہوت سا ہو جاتا ہے اور اسی حالت میں سب کو مخاطب کر کے کہتا ہے۔

ع خوش طبیبے ست بیا تا ہمہ بیمار شویم

اس کے نزدیک شہید عشق کا مرتبہ شہید مذہب سے بہت بڑھا ہوا ہے کیونکہ شہید مذہب کشتۂ دشمن ہے اور شہید عشق کشتۂ دوست۔

غازی برہ شہادت اندر تگ و پوست | غافل کہ شہید عشق فاضل تر ازوست
در روز قیامت ایں بداں کے ماند | کیں کشتۂ دشمن ست واں کشتۂ دوست

اس کے مقابل جب عرب کی طبائع اور ان کے جذبات پر ایک گہری نظر ڈالی جاتی ہے تو جوش و خروش کا سامان اندازے سے زیادہ معلوم ہوتا ہے لیکن سوز و گداز کا کوسوں پتہ نہیں، سوز و گداز نتیجہ ہوتا ہے عشق و الفت کے غلبے کا۔ جب اس غلبے کا سامان ہی مکمل نہ ہو تو پھر جذبات میں اس کے آثار کیسے پیدا ہو سکتے ہیں۔ عشقیہ جذبات کی تخلیق تمدنی ترقی اور آب و ہوا کی لطافت کے زیر اثر ہوتی ہے۔ عرب کی

سوسائٹی کو ان باتوں میں سے ایک بات بھی حاصل نہ تھی بلکہ اکثر برائیاں سوسائٹی کا جزو بن گئی تھیں، آب و ہوا میں لطافت و پاکیزگی کا نام و نشان نہ تھا۔ تمام عرب میں جہاں عشق و محبت کے چرچے زیادہ نظر آتے ہیں وہ صرف قبیلۂ بنی عذرہ ہے چونکہ اس قبیلے کی جائے رہائش اپنی سرسبزی اور آب و ہوا کی لطافت کے اعتبار سے دوسرے حصص ملک سے بہتر حالت میں تھی اس وجہ سے عرب کی عشقیہ شاعری کے اکثر عاشق و محبوب اسی قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ جب تمام ملک میں صرف ایک قبیلہ عشقیہ جذبات میں ممتاز سمجھا جاتا ہو تو پھر اس ملک کے عام عشقیہ انداز میں سوز و گداز کی چاشنی نہیں پیدا ہو سکتی۔ ایرانی شاعر کو چونکہ یہ سامان حاصل تھے اس لئے وہ اس رنگ کو اس درد کے ساتھ بیان کرتا ہے کہ سننے والا مضطرب ہو جاتا ہے مگر عربی شاعر میں اضطراب پیدا کرنے کی طاقت نہیں، اس کے نزدیک لذت حیات دل کے اضطراب میں پوشیدہ نہیں بلکہ فخر و نبرد آزمائی کے پردے میں نہاں ہے۔ مقتول جنگ کا مرتبہ اس کے نزدیک کشتۂ عشق سے بڑھا ہوا ہے۔

اس تمام تفصیل کا خلاصہ یہ ہے کہ فارسی شاعری کو اس معاملے میں جو رفعت حاصل ہے وہ دنیا کی کسی اور شاعری کو حاصل نہیں۔ فارسی شاعر جب سوز و گداز کے جذبات ادا کرتا ہے تو دلوں میں آگ سی لگ جاتی ہے۔

مرا سوز کہ نازت زکبر یا افتد　　　چو خس تمام شود شعلہ ہم زپا افتد (ابوطالب کلیم)

یعنی مجھ کو نہ جلاؤ ورنہ تمہارا غرور بھی خاک میں مل جائے گا کیونکہ خس جل جانے کے بعد اس کا شعلہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔

تو گر برہم زنی سودائے دل نازے زیاں داری　　　مرا سرمایۂ دنیا و دیں نابود می گردد (نظیری)

یعنی دل کی خرید و فروخت کا جو معاملہ طے ہو چکا ہے اس کو تو اگر شکست کر دے گا تو تیرا صرف ایک ناز ہی کا نقصان ہوگا لیکن میرا تو دنیا و دیں کا تمام سرمایہ جاتا رہے گا۔" فارسی شاعر کا کلام اس چاشنی سے کیسے خالی ہو سکتا ہے جبکہ اس کا وظیفۂ حیات اور مقصد زندگی بجز دعائے سوز اور کچھ نہیں۔

یارب آں سوز فگن در دل دیوانۂ ما　　　کہ کلیم آید و آتش برد از خانۂ ما (طالب کلیم کاشانی)

جوش و مستی | عشقیہ شاعری میں علاوہ دیگر چیزوں کے جوش و مستی کے انداز کی بھی خاص ضرورت ہے۔ یہ دونوں چیزیں عشق و محبت کی خصوصیات اور لوازمات میں داخل ہیں اور عشقیہ شاعری میں ہر اس چیز کا بیان جسے عشق و محبت سے خاص تعلق ہے از بس ضروری ہے اور صرف بیان ہی پر اکتفا نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس کے اندازے اور مرتبے پر بھی نظر رکھنی پڑیگی یعنی جو چیز اپنے اثرات کے لحاظ سے جس مرتبے اور حیثیت کی ہوگی اسی اندازے سے قلم میں طاقت و قوت بھی پیدا کرنا پڑے گی مثلاً یہ نہیں ہو سکتا کہ سوز و گداز یا جوش و مستی جو معاملات عشق میں ایک خاص اور معیاری درجے کی چیزیں ہیں معمولی اسلوب اور سادہ انداز سے بیان کر دی جائیں۔ اگر ان چیزوں کے بیان میں دماغی قوتوں کو خاص طریقے سے بروے کار نہیں لایا جائے گا تو یقیناً عشقیہ رنگ میں بدنمائی پیدا ہو جائے گی اور دلکشی کے تمام سامان مفقود ہو جائیں گے۔

جوش و مستی کی تعریف میں تھوڑا سا اختلاف پایا جاتا ہے بعض کے نزدیک اس کے یہ معنی ہیں کہ "مضمون شعر کو اس انداز سے بیان کیا جائے کہ اس میں بے ساختگی اور اثریت کے پہلو ہر نہج سے نمایاں رہیں یعنی کلام کو دیکھ کر یہ نہ کہا جائے کہ اس مضمون کو زبردستی باندھا ہے بلکہ یہ معلوم ہو کہ شاعر کے منہ سے خود بخود یہ مضمون نکلا ہے" اور بعض کے نزدیک "مضمون کو زوردار اور جوشیلے الفاظ میں ظاہر کر دینا کافی ہے" لیکن میرے نزدیک جوش و مستی کی صحیح تعریف یہ ہے کہ کسی مضمون کو نہایت جوش و خروش اور والہانہ انداز سے بیان کیا جائے۔ اس تعریف میں سابقہ تعریفات بھی اچھی طرح آ جاتی ہیں۔ زیادہ الٹنے پھیرنے کی بھی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

حقیقت میں یہ چیز ہر موقع پر کلام کی اثریت اور افادیت میں وسعت پیدا کر دیتی ہے اور خاص کر عشقیہ مضامین میں تو صد درجہ کیف کے سامان اس سے پیدا ہو جاتے ہیں یہ بالکل صحیح ہے کہ عشقیہ انداز کی ساری کیفیت اسی جوش و مستی کے پردے میں مضمر ہے۔

عہد قدیم کی شاعری میں سب سے زیادہ جوش و خروش جس کی شاعری میں پایا جاتا تھا وہ عبرانیوں کی سیدھی سادی اور سچی شاعری تھی چنانچہ ایک مغربی محقق کا یہ ایک مشہور قول ہے کہ "عبرانی شاعروں کے کلام میں اس قدر جوش ہے کہ ان کا شعر سن کر یہ معلوم ہوتا ہے گویا صحرا میں ایک تناور درخت جل رہا ہے

یا ایک شخص پر وحی نازل ہو رہی ہے۔"

عبرانی کے بعد اس جوش و خروش کی سب سے زیادہ حامل عربی شاعری سمجھی جاتی ہے۔ شعرائے عرب نے اپنی شاعری میں عبرانی اثر پیدا کرنے کی اَن تھک کوشش کی لیکن مرضی کے موافق ان کو کامیابی حاصل نہیں ہوئی اور اسی ناکامیابی کی وجہ سے ان کو آخر میں عبرانی شاعری سے ایک قسم کی نفرت سی ہو گئی تھی۔ عربی شاعری کے جوش اور مضامین سے کسی کو جائے انکار نہیں لیکن یہ واقعہ ہے کہ اس کا سارا جوش و خروش رزمیہ شاعری تک محدود ہے۔ عبرانی جوش و خروش کے جو نمونے اس وقت پائے جاتے ہیں وہ عربی کے رزمیہ جوش کے مقابلے میں بالکل بے اثر اور بے کیف سے نظر آتے ہیں۔ اس صنف سے ہٹ کر عشقیہ رنگ میں اگر دیکھا جائے تو وہ جوش و خروش اور سرمستی نہیں جو فارسی کے عشقیہ رنگ میں ہے اگرچہ فارسی شاعری کی عشقیہ سرمستی خود اس پر طاری ہونے والی سرمستی نہیں ہے بلکہ یہ بھی دوسروں کے جذبات کی ترجمانی ہے لیکن اس کے باوجود تمام دنیا کی عشقیہ سرمستیاں اس پر نثار ہو سکتی ہیں۔ اس رنگ کے اندر بھی گو عربی شاعروں نے ایرانی سرمستیاں پیدا کرنے کی انتہائی کوشش کی ہے لیکن اس کو کامیابی نہیں ہوئی۔ اس کے برخلاف فارسی کی عشقیہ شاعری جوش و سرمستی کے واقعات سے لبریز ہے۔ رودکی سے لے کر قاآنی تک کی سینکڑوں برس کی شاعری پر نظر ڈال جائیے۔ اس عرصے میں سینکڑوں شعرا منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئے مگر آب و ہوا کی یکرنگی اور اثر انگیزی کا یہ عالم رہا کہ ان کی عشقیہ شاعری میں جوش و سرمستی کی ذرہ برابر بھی کمی نہیں ہوئی۔ ایرانی شاعر اس قسم کی کیفیت کو جب اپنے خاص رنگ میں بیان کرتا ہے تو سامع کی طبیعت میں ایک آگ سی لگ جاتی ہے۔ اس آخری دور میں جب ایران سے شاعری کا نام مٹ چکا تھا مرزا قاآنی نے اس رنگ کو اتنا ابھارا کہ درمیان کی سب کوتاہیاں دور ہو گئیں۔

شعر میں جوش و سرمستی پیدا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ مضمون میں بندش الفاظ اور اسلوب بیان کی معاونت سے والہانہ انداز پیدا کر دیا جائے۔

دلم بردہ است شوخے شاہدے شنگ کہ ہمچوں او

نہ ماہے از ختن خیزد نہ ترکے از حصار آید

سادہ سا خیال ہے لیکن جوش و سرمستی کی فراوانی نے اس خیال کو نہایت شوخ بنا دیا ہے۔

نگارا صبح نوروز است و روز بوسہ امروز است — کہ در اسلام ایں سنت بہر عیدے شعار آید

مضمون شعر میں کوئی خاص ندرت و جدت نہیں لیکن جس چیز نے اس کو مستی آور بنا دیا ہے وہ صرف جوش و سرمستی کا ایک خاص انداز ہے۔

محبوب معشوقانہ اداؤں کو چھوڑنا چاہتا ہے عاشق کو یہ بات کسی طرح پسند نہیں۔ وہ نہایت جوش کے عالم میں کہتا ہے ؛۔

ہنوز ایمان و دل بسیار غارت کردنی دارد — مسلمانی میاموز آں دو چشم نامسلماں را

عشقیہ انداز میں جوش و سرمستی پیدا ہونے کی دو وجہیں ہیں سب سے بڑی وجہ آب و ہوا کی فرحت انگیزی اور لطافت ہے اور دوسرا سبب تمدن و معاشرت کی ترقی۔ آب و ہوا کی لطافت اول تو جوش و سرمستی کی تخلیق کی خود ضامن ہے اور اگر تمدن و معاشرت بھی بہتر حالت میں ہو تو پھر مستانہ مضامین کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ ایران کا تمدن جس بلندی پر پہنچ چکا تھا اس کے متعلق کئی جگہ روشنی ڈالی جا چکی ہے اور عرب کی گرم و خشک آب و ہوا اور تمدن کی پستی کے بارے میں بھی مختلف جگہ تفصیلی رائے کا اظہار کیا جا چکا ہے۔ ایران کی عشقیہ شاعری میں جس قدر جوش و سرمستی کی فراوانی پائی جاتی ہے وہ نتیجہ ہے صرف ایرانی آب و ہوا کی لطافت اور تمدن و معاشرت کی ترقی کا۔ اگر عرب کی آب و ہوا اور تمدن کی حالت بھی ایران کے مماثل ہوتی تو یقیناً یہاں کی عشقیہ شاعری میں بھی ایرانی سرمستیاں مکمل طریقے سے پائی جاتیں۔

تصد و تبدی عن اسیل و تتقی — بناظرۃ من وحش وجرۃ مطفل

یعنی وہ حسینہ ہم سے براہ ناز اعراض کرتی ہیں اور اپنا رخسار بطور لگاوٹ ہمارے سامنے ظاہر کرتی ہے اور اپنی آنکھوں کے ذریعے جو موضع وجرہ کے جانوروں کی طرح ہیں آڑ کر لیتی ہیں اور میں اس کی چشم میگوں کو دیکھ کر مست ہو جاتا ہوں اور تاب نظارہ نہیں رہتی۔

عرب کی عشقیہ شاعری میں یہ شعر ایک خاص مرتبہ رکھتا ہے۔ عاشقانہ سادگی اور دیگر خصوصیات عاشقانہ اپنی جگہ پر بہتر حالت میں ہیں لیکن وہ جوش و سرمستی جو آب و ہوا کی لطافت اور تمدن و معاشرت

کی ترقی کا نتیجہ ہوتی ہے اس جگہ کمی کے ساتھ ہے۔

رقابت | معاملات عشق میں رقابت کو ایک خاص درجہ حاصل ہے۔ عاشق اپنے غلبۂ عشق کی وجہ سے یہ چاہتا ہے کہ محبوب صرف اس کی آرزوؤں کی ہر وقت تکمیل کرتا رہے۔ ظاہر ہے کہ دنیا میں ایک شخص بھی ایسا نہیں جو اپنی تمام آزادیوں کو سلب کرکے دوسرے کے اختیار میں اپنی باگ دیدے۔ پھر بھلا محبوب جس کی سرشت اور جبلت میں خودپسندی کا مادہ بھرا ہوتا ہے وہ اپنی عادت ثانیہ کو چھوڑ کر کس طرح دوسروں کی آرزو کا تکمیل کنندہ بن سکتا ہے، اس کو کیا ضرورت ہے کہ وہ اپنی آزادی پر خواہ مخواہ کی پابندیاں عائد کرکے اپنی زندگی کو مصیبتناک بنالے۔ وہ دوسروں سے ملتا ہے، ان کی انجمنوں اور جلسوں میں شریک ہوتا ہے۔ دوسرے اس کے یہاں آتے جاتے ہیں۔ عاشق کو یہ باتیں بہت بری معلوم ہوتی ہیں۔ محبوب نے جہاں دوسرے سے خندہ روئی سے بات چیت کی بس عاشق کے دل پر بجلیاں سی گرنے لگیں اور چہرے پر افسردگی کے آثار پیدا ہونے لگے۔

اگر یک حرف با اغیار با من صد سخن گوید ندارم تاب آں یک حرف ہم خواہم بمن گوید

یہ اسی کا اثر ہوتا ہے کہ عاشق کے دل میں محبوب کی طرف سے طرح طرح کے گمان پیدا ہونے لگتے ہیں اور ہر شخص کو وہ اپنا رقیب سمجھنے لگتا ہے حتیٰ کہ یہ معاملہ ترقی کرکے باہمی عداوت کا ایک مستقل مضمون بن جاتا ہے۔ عرب میں رقیب کا لفظ محافظ کے معنی میں مستعمل ہوتا تھا۔ محبوب کے محافظ جو عموماً اہل خاندان ہوتے تھے عرب ان کو رقیب کے لفظ سے یاد کرتے تھے لیکن فارسی علم میں ایک معشوق کے کئی عاشق آپس میں رقیب کہلاتے ہیں۔ فارسی کی جدت پسندی نے اس کی صفات بھی پیدا کرلیں۔

گفتم اے مہ! با رقیب روسیہ کمتر نشیں زیر لب خندید و گفتا و تیرمی گوید چنیں

اس شعر میں رقیب کے ساتھ لفظ روسیاہ کا اضافہ کرکے اس کے معنوں میں اور شدت پیدا کردی ہے۔

عربی شاعری میں چونکہ رقیب کے معنی محدود تھے اور اس کی صفات بھی متعین نہیں ہوئی تھیں، اس لئے اس میں رقابت کے مضامین کی وہ بہتات نہیں جو فارسی شاعری میں ہے۔ عربی شعرا کو بھی رقیبوں (محافظوں) کے ساتھ معرکہ آرائی کے مواقع پیش آئے ہیں لیکن چونکہ ان کے یہاں یہ لفظ

اپنے خاص معنی موضوع لہ میں استعمال ہوتا تھا اس اعتبار سے عربی شاعری میں اس عنوان پر نظم کی گنجائش فارسی شاعری کی وسعت کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ فارسی میں ہیں چونکہ یہ لفظ معنی غیر موضوع لہ میں با دنیٰ مناسبت استعمال کیا جاتا ہے اس لئے فارسی شعرا نے اس مضمون میں انتہائی خیال آفرینیوں سے کام لیا۔

رقیب کی شرارتیں بعض وقت معشوق کے ظلم و ستم سے بھی سبقت لے جاتی ہیں۔ عاشق کو جو تکلیف رقیب کی خصومت سے پہنچتی ہے محبوب کی کج ادائیوں اور ظلم انگیزیوں سے نہیں پہنچتی بعض وقت عاشق خیال کرتا ہے کہ اس کمبخت کی شکایت خود معشوق سے کرنی چاہئے لیکن پھر سوچتا ہے کہ معشوق کو میری باتوں پر رقیب کے داؤ پیچ کی وجہ سے اعتبار نہیں آئے گا اس لئے دوسروں سے کہلاتا ہے تاکہ دوسرے کے کہنے سے کچھ زیادہ اثر ہو سکے۔

ایں کہ با من کردہ ہر دم غیر غوغائے دگر   خواہم آں مہ بشنود از من از جائے دگر

بزم نشاط میں عاشق و معشوق اور رقیب جمع ہیں معشوق کی نظریں عاشق کے چہرے پر جمی ہوئی اس کی حرکات و سکنات کا مطالعہ کر رہی ہیں لیکن عاشق بیچارے کی آنکھیں اس بات پر لگی ہوئی ہیں کہ کہیں رقیب تو محبوب کی جانب بری نظر سے نہیں دیکھ رہا ہے۔

تو واقفِ من و من واقف نگاہ رقیب   تو پاس خرمن و من پاس خوشہ چیں دارم

معشوق جو مہربانیاں رقیب کے ساتھ کیا کرتا تھا اتفاق سے اس کا حال عاشق کو بھی معلوم ہو گیا۔ عاشق اپنے مقابلے میں مراعات رقیب کی شکایت کرتا ہے لیکن اس عرصے میں محبوب رقیب سے اس بات پر ناخوش ہو جاتا ہے کہ اس نے میری اس پاسداری کی خبر عاشق سے کیوں اور کس وجہ سے کی۔ اب عاشق نہایت ہوشیاری سے معاملے کو طوالت سے بچانے کے لئے خیال محبوب کی تردید کرتا ہے۔

لطف تو دانستہ ام با غیر، از ہجرم مرنج   کو نگفت ایں با من از جائے دگر دانستہ ام

عاشق کو اپنے سر جانے کا کوئی خوف نہیں لیکن یہ خیال اس کو ستاتا ہے کہ کہیں کمبخت رقیب میری سفارش اور شفاعت کے حیلے سے قدم محبوب کا بوسہ نہ لے لے۔

ندارم ہیچ سر، ترسم کہ در ہنگام قتل من   زند غیرے بتقریب شفاعت بوسہ بر پایش

محبوب رقیب کے کہنے میں ہے۔ رقیب کے سامنے اس کی ایک نہیں چلتی۔ مجبور ہو کر رقیب ہی سے التجا کرتا ہے کہ تمام دنیا کی نعمتیں تجھ کو مبارک ہوں لیکن میرا محبوب میرے قبضے میں رہنے دے۔

براورانہ بیا قسمتے کنیم رقیب! جہان وہرچہ درو ہست از تو، یار از من

بزم میں معشوق کا غصہ اور غضب کی حالت میں شمشیر بدست آنا عاشق کو اس وجہ سے اچھا لگتا ہے کہ رقیب اور بوالہوس اس حالت کو دیکھ کر راہِ فرار اختیار کریں گے اور مجھ کو وفاداری اور جاں نثاری کے ظاہر کرنے کا موقع مل سکے گا۔

خوش آں ساعت کہ آید ترک من شمشیر کیں با او رقیباں جملہ بگریزند و من مانم ہمیں با او

معشوق رقیب پر مہربان سا معلوم ہوتا ہے۔ عاشق چونکہ یہ منظر اپنی آنکھ سے دیکھ نہیں سکتا اس لئے وہ رقیب کو بھڑکانے یا افتراق پیدا کرنے کے لئے چال چلتا ہے کہ محبوب کا یہ لطف و کرم حقیقت میں کوئی لطف و کرم نہیں بلکہ مجھ کو ستانے اور پریشان کرنے کے لئے یہ سارا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔

ندارو اے رقیب! آں سست پیماں با تو ہم لطفے گہے حال تو بر رغم من افگار می پرسد

عاشق کی نظروں میں رقیب کی کوئی منزلت ہی نہیں ہوتی۔ وہ اس کو ہمیشہ پست خیال اور دوں ہمت سمجھا کرتا ہے۔ معاملات محبت کی گہرائیوں کے متعلق کبھی کوئی راز کی بات اس کے منہ سے نکل جاتی ہے تو اس کو خفیف کرنے کے لئے کہہ دیتا ہے کہ "ایں گفتۂ من است"

گر گفتہ ز عشق، گہے حرف آشنا آں ہم حکایتے است کہ از من شنیدہ

لیکن بعض وقت ایسا موقع آجاتا ہے کہ رقیب کے مقابل ایک نہیں چلتی اس لئے وہ اپنی ذلت پر ایک عجیب و غریب طریقے سے پردہ ڈالتا ہے۔ کہتا ہے کہ یہ تمام ظلم و ستم میرے لئے باعث تسکین ہیں کیونکہ یہ تمام باتیں میرے محبوب کے اشارے سے ظہور میں آرہی ہیں اور اس کا ظلم خواہ وہ کسی واسطے سے ہو میرے لئے عین لطف ہے۔

صد جور می کنی و نمی رنجم اے رقیب چوں آگہم کہ ایں ہمہ فرمودہ می کنی

عاشق معشوق کے مکان پر جانا چاہتا ہے لیکن یہ خیال اس کو مانع ہوتا ہے کہ میرے نشان پا

سے رقیب کو بھی اس کے مکان کا پتہ معلوم ہو جائے گا، حالانکہ وہ اس بات سے بہت خوش ہے کہ محبوب کے گھر کا پتہ اس کو نہیں معلوم لیکن عاشق کو اس کی دہلیز پر جبہ سائی کے بغیر چین بھی نہیں اس لئے وہ بجائے پاؤں کے سر کے بل چلتا ہے تاکہ زمین پر نشان قدم نہ آسکیں۔

رقیب تا نبرو پے بوادیٔ وصلت بجائے پا ہمہ جا سر نہادہ می آیم

مرزا غالب نے اسی مفہوم کو ذرا اور شوخ بنا کر پیش کیا ہے۔

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

عربی میں یہ لفظ اگر اسی معنی میں مستعمل ہوتا جس میں فارسی شعرا استعمال کرتے ہیں تو اس میں اسی انداز کی مضمون آفرینیاں پائی جاتیں لیکن آزادانہ سرشت نے اس قسم کی مضمون آفرینیوں کو اپنے وقار کے خلاف سمجھا۔

فارسی شاعری نے گو اس رنگ کو بہت تیز اور شوخ بنا کر دنیا کے سامنے پیش کیا لیکن اخلاقی اعتبار سے یہ چیز فارسی شاعری کے حسین چہرے پر ایک بدنما داغ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس رنگ کی تیزی نے سوسائٹی کی تعمیر اور نظام میں ایک خاص قسم کی خرابی پیدا کر دی، صلح و یکجہتی اور اتفاق و اتحاد کے آثار جن کا سوسائٹی کے قصر کی تعمیر میں ایک نمایاں حصہ ہے، ایک ایک کر کے فنا ہو گئے اور اس کے بجائے ہر قسم کی بدنظمی اور انتشار کے آثار پیدا ہو گئے۔ بغض و کینہ اور باہمی عداوت کی جڑیں مضبوط ہو گئیں گو بعض جگہ اس میں بھی صلح عام کی تعلیم پائی جاتی ہے لیکن وہ "الشاذ کالمعدوم" کا درجہ رکھتی ہے، زیادہ عنصر بغض و عداوت کی تعلیم کا اس میں موجود ہے۔

نیازارم زخود ہرگز دلے را کہ می ترسم درو جائے تو باشد

نامہ نویسی اور نامہ بری | عشق کی دنیا میں نامہ نویسی اور نامہ بری کا رواج بھی عہد قدیم کی ایک پسندیدہ یادگار ہے۔ اس کا موقع اس وقت آتا ہے جبکہ معشوق کہیں چلا جاتا ہے یا خفا ہو کر آمد و رفت کے دروازے بند کر دیتا ہے۔ ان دونوں صورتوں میں بیچارے عاشق کی آباد دنیا ذرا سی دیر میں ویران ہو جاتی ہے، ساری آرزوئیں خاک میں مل جاتی ہیں، ایک عجیب پریشانی اور مصیبت کا عالم طاری ہو جاتا ہے، طرح

طرح کے تفکرات اس کو گھیر لیتے ہیں۔ اس بربادی اور مصائب کے عالم میں وہ پھر اسی آبادی کی تمنا کرتا ہے اور اس کی ہر کوشش اسی منظر کی تجدید کے لئے وقف ہوتی ہے لیکن اس کی تمام کوششیں ناشکور ثابت ہوتی ہیں۔ اس کے بعد اس کو ایک ایسے رازدار کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کی طرف نامہ بری کے فرائض انجام دے سکے۔ اس فرض کی انجام دہی کے لئے وہ بڑے معتبر اور تجربہ کار رازداں کی جستجو کرتا ہے تاکہ اس کی در پردہ رقابت سے اس کو دو چار ہونا نہ پڑے۔ عاشق کو چونکہ قاصد کی حالت پر کبھی مکمل اطمینان نہیں ہوتا اس لئے وہ اس کی اندرونی کیفیات کا ہر وقت ایک گہرا مطالعہ کرتا رہتا ہے۔ عشق و محبت کے معاملے میں یہ ایک خاص اور اہم چیز واقع ہوئی ہے اور شعرائے ایران نے عشق کے معاملات کو جس منزل تک پہنچایا ہے اس میں ان کا کوئی شریک وسہیم نہیں، لہٰذا اس راستے میں بھی ان کا کوئی حریف و مقابل نہیں معلوم ہوتا۔

ایران کا مست و بے خود شاعر اس منزل کی ہر وادی میں طرح طرح کے غنچوں کو شگفتہ کرتا چلا جاتا ہے اور اس سبق کے بیان میں گوناگوں معانی کا دفتر کھول دینا اس کے نزدیک بازیٔ طفلاں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ وہ اس معاملے میں ان جدت طرازیوں اور مضمون آفرینیوں سے کام لیتا ہے کہ جہاں دنیا کی نگاہیں نہیں پہنچتیں۔

عام قاعدہ ہے کہ جب کسی عزیز ترین دوست کو کوئی خط لکھتا ہے تو اس کے جذبات میں ایک قسم کا تلاطم پیدا ہو جاتا ہے، مختلف قسم کے خیالات آتے ہیں اور دور ہو جاتے ہیں اور اس بحر خیال کی تلاطم خیزی کے دوران میں وہ ایک ہی بات کو کئی جگہ لکھ جاتا ہے۔ یہی حالت عاشق کے دل کی بھی محبوب کو نامۂ شوق تحریر کرنے کے وقت ہو جاتی ہے، خیالات کا طوفان اس کے سامنے اٹھتا ہے، شوق تحریر میں نہ تو ترتیب مضمون کا خیال باقی رہتا ہے اور نہ اس کی صحت کی پروا رہتی ہے۔ ایک ایک بات کو سو سو بار عالم بے خودی میں لکھ جاتا ہے۔

بہ جاناں نامہ ہرگز عاشق بیمار ننویسد ۔۔۔ کہ از بے طاقتی یک حرف را صد بار بنویسد

قاصد کو جب کوئی پیغام دیتا ہے تو اس سے ایک ایک بات کو سو سو مرتبہ کہتا ہے تاکہ وہ بھول

نہ جائے۔

چو من پیغام خود با قاصد دلداری گویم ۔۔۔ ز بیم آں کہ از یادش رود صد باری گویم

عاشقی کی دنیا میں یہ موقع اکثر آتا ہے کہ عاشق اپنا تمام معاملہ اور اس کا نشیب و فراز قاصد کو سمجھا دیتا ہے اور ساتھ ہی انداز گفتگو بھی سرسری طریقے سے بتا دیتا ہے لیکن جب اس کو قاصد کی در پردہ رقابت کا پتہ چلتا ہے تو اس کو اپنی غلطیوں پر بہت افسوس آتا ہے اس وسیع مضمون کو فارسی کی عشقیہ شاعری نے نہایت اختصار مگر جامعیت کے انداز سے پیش کیا ہے۔

قاصد رقیب بود و من غافل از فریب ۔۔۔ بے درد مدعائے خود اندر میاں نہاد (اسیر ازی)

مرزا غالب نے بھی اسی انداز کا ایک شعر کہا ہے گو مفہوم میں جزوی فرق کہا جا سکتا ہے لیکن تاثیر کے اعتبار سے ایک ہی چیز ہے۔

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا ۔۔۔ بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

عاشق ہجر دوست میں اپنی زندگی سے پریشان ہے۔ قاصد کو بھی محبوب کے رضامند کرنے کے لئے بھیج چکا ہے۔ عین انتظار اور بے چینی کی حالت میں قاصد محبوب کے پاس سے واپس آتا ہے۔ اس کو دیکھ کر عاشق کے چہرے پر خوشی اور مسرت کے آثار رقص کرنے لگتے ہیں اور وہ بے تابانہ انداز سے دریافت کرتا ہے کہ اے قاصد! میری جان تجھ پر قربان ہو جلد بتا کہ اس ظالم نے کیا کہا۔

قاصد بخدا آں بت عیار چہ می گفت ۔۔۔ قربان زبان تو، بگو یار چہ می گفت

عاشق کی یہ عین تمنا ہوتی ہے کہ محبوب کے ناز و انداز سے لذت اندوز ہونے والا اس کے سوا کوئی اور نہ ہو اس لئے قاصد کی زبان سے جب وہ بیماری اغیار کا مژدہ سنتا ہے تو اس سے بمنت یہ کہتا ہے کہ میری جان تجھ پر فدا ہو اس سے بہتر کوئی مژدہ سنا۔

قاصدم مژدۂ بیماریِ اغیار آورد ۔۔۔ جاں فدایش کہ رساند خبرے بہتر ازیں

عاشق محبوب کے پاس قاصد روانہ کرتا ہے۔ اتنے میں طرح طرح کے شکوک اس کو گھیر لیتے ہیں، اب وہ خدا سے دعا مانگتا ہے کہ کوئی ایسا سبب پیدا ہو جائے جس کی وجہ سے وہ محبوب کے

پاس نہ پہنچ سکے۔

می نوشتم براو قاصد و می گوید رشک　　سببے ساز خدایا کہ بمنزل نرسد

اس منزل میں مختلف قسم کے خیالات اس کے دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ قاصد پیغام لے کر روانہ ہو چکا ہے اور اس عرصے میں عاشق بیٹھے بیٹھے یہ سوچا کرتا ہے کہ معلوم نہیں کہ قاصد ابھی اس کے پاس پہنچا یا نہیں اور اگر پہنچ گیا ہے تو میرا حال کہاں تک کہہ چکا ہے۔

چو برد پیام قاصد کنم ایں خیال و گویم　　کہ برش حکایت من بہ کجا رسیدہ باشد

اس معاملے میں وہ موقع عجیب دلکش اور جاذب توجہ ہوتا ہے جبکہ عاشق قاصد گری کے فرائض باد صبا سے لینا چاہتا ہے۔ اس موقع پر اس کا ہر لفظ دلی احساس اور اندرونی اضطراب کی ترجمانی کرتا ہوتا ہے۔ ہر نہج اور ہر انداز سے وہ اس کی حالت وکیفیت دریافت کرتا ہے غیر ذی عقل بلکہ غیر حسی چیزوں کو فرائض کی تکمیل کے لئے مجبور کرنا صرف فارسی شعرا کا کام ہے۔

اے صبا بازم بہ من گوئی کہ جاناں چون است　　آں گل تازہ و آں غنچہ خنداں چوں است

چشم بد خوش کہ ہشیار نہ باشد مست است　　چشم میگونش کہ دیوانہ کند آں چوں است

ہم بر جانان و سر او کہ کم و بیش مگوئے　　گو ہمیں یک سخن است کہ جاناں چوں است

ان اشعار سے صرف دریافت حال اور حسرت کا پتہ چلتا ہے لیکن بعض جگہ اس بیان میں رنگینیوں اور دلفریبیوں کی روح پھونک کر مستی کا سا عالم پیدا کر دیا جاتا ہے۔ رنگین مضامین کی تمہید اس طرح اٹھائی جاتی ہے کہ بہار کا موسم شباب پر ہے، عاشق کے دل میں مستی کے آثار پیدا ہیں، باغ میں گلگشت کے لئے وہ جانا چاہتا ہے، بزم آرائی کا سامان بھی سب موجود ہے لیکن محبوب ساتھ نہیں اس لئے سارا عیش مکدر ہو جاتا ہے۔ باد بہاری کے ذریعے محبوب کے پاس یہ پیغام بھیجتا ہے کہ "باغ میں ایک عجیب انداز سے بہار آئی ہوئی ہے۔ چاروں طرف سبزہ لہلہا رہا ہے، غنچوں کی شگفتگی نے باغ میں آگ سی لگا دی ہے، خوشنما فواروں کا چلنا جنت نظر کا لطف دے رہا ہے، بلبلوں کی نغمہ سنجی فردوس گوش بنی ہوئی ہے" اور اسی کے ساتھ اس کو یہ بھی سمجھا دیتا ہے کہ "اگر وہ باتوں میں ٹالنا چاہے تو کسی طرح

نہ مانتا بلکہ جس طرح ممکن ہو سکے اس کو بیان سے آتا ؎

آمد بہار و شد چمن و لالہ زار خوش — وقتے است خوش بہار کہ وقت بہار خوش

درباغ با ترانۂ بلبل دریں ہوا — مستی خوش است و بادہ خوش است و بہار خوش

اے باد کاہلی مکن و سوئے دوست رو — مارا بکن بہ آمدن آں نگار خوش

چیزے دگر مگوئے ہمیں گو کہ در چمن — سبزہ خوش است و آب خوش و جویبار خوش

گر خوش کنند بہ حدیثے کہ باز گرد — مشش کن و بیا رمشو زینہار خوش

ان اشعار کی لطافت اور انداز بیان پر غور کیجئے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ مستی اور شوخی کا دریا بہ رہا ہے۔ شعرائے عرب کے یہاں ناصبوری کے مضامین کا کم پتہ چلتا ہے کیونکہ اول تو وہ اپنے ذاتی معاملات میں کسی کو رازدار نہیں بناتے تھے اور دوسرے وہ اس معاملے میں اتنے جری ہوتے تھے کہ مصائب برداشت کرکے محبوب کے پاس پہنچ جاتے تھے۔

چونکہ ملک کا اکثر حصہ خانہ بدوشانہ زندگی بسر کرنے پر مجبور تھا جس جگہ پانی کے چشمے وغیرہ ہوتے تھے اس جگہ خیمے نصب کردئے جاتے تھے اور یہ حالت سب کے لئے ایک ہی وقت میں پیش آتی تھی جس موسم میں معشوق کے قبیلے والے پانی وغیرہ کی تلاش میں رخت سفر باندھتے تھے اسی موسم میں عاشق کے قبیلے والوں کو بھی کوچ کا سامان کرنا پڑتا تھا۔ قریب قریب ایک ہی منزل میں پڑاؤ ہوا کرتا تھا اس لئے نہ تو ان کو خطوط لکھنے کی نوبت آتی تھی اور نہ کسی کو نامہ بر بنانے کی ضرورت ہوتی تھی۔ سال میں ایک مرتبہ ان کو یہ موقع ضرور پیش آجاتا تھا اور جب وہ ایک دوسرے سے جدا ہوتے تھے تو دوبارہ ملنے کی ساری تدبیریں پہلے ہی سے سوچ لیتے تھے۔ یہ تھے وہ اسباب جن کی بنا پر عرب کے عاشقوں کو اس کی ضرورت کم پڑتی تھی لیکن ایران میں چونکہ یہ طریقے جاری نہ تھے اس لئے ان کو بغیر اس کے کوئی چارۂ کار نہ تھا اور یہی سبب ہے کہ شعرائے ایران کے یہاں اس عنوان پر بہت کچھ مواد ہے۔

فرانس کی حالت انقلاب کے وقت

لوئی (۱۶) کی میراث | بڑی ہی پرآفات وہ میراث تھی جو لوئی (۱۶) کو ملی۔ ایک حکومت جس کی بدنظمی انتہا کو پہنچ گئی تھی، ایک خزانہ جو قرضوں سے بے طرح گراں بار تھا، ایک قوم جسے استبداد نے کائنات سے بیزار کر دیا تھا، ایک مذہب اور ایک نظام جس نے نئے عقاید کے آگے سپر ڈال دی تھی۔

اس بظاہر سلطنت بباطن انقلاب کے ساتھ لوئی (۱۶) کو کام اس کی اصلاح کا ملا تھا۔ کام کی دشواری سمجھنے کے لئے سلطنت کی حالت ذرا تفصیل سے جاننے کی ضرورت ہے۔

عرصہ دراز سے فرانس میں بادشاہوں کی حکمت عملی یہی رہی کہ نوابوں، امیروں اور مقامی کونسلوں سے اختیارات حکومت لے کر اپنے ہاتھ میں رکھیں۔ حالات ملک اس حکمت عملی کے موافق تھے، اور بادشاہ اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب ہوگئے۔ لیکن فرانس جیسے وسیع ملک میں ایسی حکومت کے لئے غیر معمولی دل و دماغ کے بادشاہ درکار تھے، جس میں تمام اختیارات ایک ہی شخص کے ہاتھ میں مرکوز ہوں اور صوبوں اور ضلعوں کے حکام اس کا بار کچھ بھی ہلکا نہ کرسکیں۔ ایسے بادشاہ فرانس کو نہیں مل سکے۔ ایک طرف عظیم الشان اختیارات تھے، دوسری طرف نااہل حکمراں۔ نتیجہ ظاہر ہے۔

جب لوئی (۱۶) بادشاہ ہوا تو بدنظمی ہر شعبۂ ملک میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس کا نہ کوئی ضابطہ تھا، نہ اصول، سالہا سال گزر جاتے ایک معمولی سی بات کا تصفیہ نہ ہو سکتا۔ سرکاری عہدوں کے لئے قابلیت شرط نہ تھی، یہ ہمیشہ بکا کرتے تھے۔ نہایت ہی کثرت سے عدالتیں تھیں اور مختلف و متضاد قوانین۔ شعبۂ مالیات سب سے ابتر حال میں تھا۔ خزانہ شاہان ماسبق کی فضول خرچیوں سے خالی ہو چکا تھا، سالانہ آمد و خرچ کا نہ کوئی بجٹ بنتا نہ حساب رکھا جاتا۔ کروڑوں کی رقم ہر سال غبن ہوتی، کوئی پوچھنے والا نہیں تھا۔ قرضہ اتنا لیا جا چکا تھا کہ اس کا سود تک ادا نہیں ہو سکتا تھا، حکومت کی ساکھ اٹھ گئی تھی اور جبریہ قرضہ مشکل ہی سے مل سکتا تھا۔ بایں ہمہ نظم و نسق حکومت پر نکتہ چینی جرم تھی، اور تمام معاملات صیغۂ راز میں رکھے جاتے تھے۔

فرانس کی سماجی اور عام معاشی حالت بھی ایسی ہی خراب تھی جیسی سیاسی حالت اور دہی شاہی حکمت عملی ایک حد تک اس کی بھی ذمہ دار تھی۔ بادشاہوں نے امرا وغیرہ سے سماج کی خدمت کا سارا کام لے لیا تھا، مگر اس کے معاوضے میں جو قانونی اور سماجی اعزاز اور معاشی حقوق امتیازی انھیں حاصل تھے وہ بدستور چھوڑ دیے گئے تھے۔ اس کی وجہ سے کچھ لوگ ایسے ہوگئے تھے جو حقوق رکھتے تھے لیکن اکثر فرائض سے مستثنیٰ تھے، اور کچھ ایسے جو فرائض رکھتے تھے لیکن اکثر حقوق سے محروم تھے۔

حقوق رکھنے والے اہل کلیسا اور امرا تھے جن کے طبقے اعلیٰ سمجھے جاتے تھے، فرائض رکھنے والے عامۃ الناس تھے جن کا طبقہ ادنیٰ سمجھا جاتا تھا۔ اہل کلیسا کی جماعت پہلا طبقہ کہلاتی تھی، امرا کی دوسرا اور عامۃ الناس کا تیسرا۔ تیسرا طبقہ کل آبادی کا $\frac{9}{10}$ تھا۔

یہ بڑی مصیبت میں تھا۔ ملک کی معاشی فلاح کا دارومدار اسی طبقہ پر تھا۔ یہی کھیتوں کو کسان اور کارخانوں کو مزدور مہیا کرتا اور یہی حکومت کے ٹیکسوں کا بار بھی اٹھائے ہوئے تھا، لیکن نہ تو سیاسیات میں اس کی کوئی آواز تھی نہ سماج میں کوئی عزت۔ معمولی شہری حقوق بھی پورے حاصل نہ تھے اور تقریباً سارا طبقہ انتہائی افلاس اور مصیبت کی حالت میں زندگی گزار رہا تھا۔

اس کی زبوں حالی کے یوں تو بیسیوں اسباب تھے، حکومت کی بدنظمی، عمال کا تشدد، عدالتوں کی بے انصافی، اعلیٰ و ادنیٰ کی قانونی تفریق، اعلیٰ طبقے کے برتاؤ سے آئے دن کی اہانت اور کوفت، فکر و عمل کی آزادی سے محرومی۔ لیکن جس شے نے اسے بالکل ہی تباہ کر دیا تھا وہ فرانس کا انوکھا قانون مال تھا۔ اس لئے امرا، اہل کلیسا اور سرکاری عہدے داروں کو ٹیکسوں سے تقریباً مستثنیٰ کر دیا تھا، اور غریب عوام بدنظم اور فضول خرچ حکومت کے کثیر مصارف کا بار اٹھانے کے لئے نت نئے ٹیکسوں کا شکار ہوتے رہتے تھے۔ چونکہ سرکاری عہدے فروخت ہوتے اس لئے اکثر دولت مند ٹیکسوں سے بچنے کے لئے عہدے خرید لیتے۔ پس دولتمندوں کی تعداد جتنی بڑھتی جاتی ٹیکس دینے والوں کی تعداد اتنی ہی گھٹتی جاتی اور غریبوں پر اسی تناسب سے ٹیکس بڑھتا جاتا۔

عامۃ الناس کے گراں بار ٹیکسوں میں سے ایک Taille تھا جس کے ذریعے کروڑوں

کی رقم شاہی خزانے میں جاتی تھی۔ اس کا عجیب اصول تھا۔ یہ ہر شخص پر اس کی ظاہری حالت کے اعتبار سے لگایا جاتا جس کی وجہ سے نہ تو کسی کو یہ جرأت تھی کہ اپنی ظاہری حالت اچھی رکھے، نہ یہ حوصلہ کہ اپنا کاروبار معیشت وسیع کرے کیونکہ بسا اوقات دونوں صورتوں میں ٹیکس حیثیت سے بڑھ کر لگ جاتا۔ لوگوں کے آرام و آسائش اور دولت کی پیدائش دونوں پر نہایت ہی ناگوار اثر پڑ رہا تھا، معیار زندگی گھٹ رہا تھا، مگر حکومت کو پروا تک نہیں تھی۔

دوسرا ٹیکس اسی قدر اذیت دینے والا نمک کا تھا۔ حکومت نے نمک سازی کا اجارہ اپنے ہی ہاتھ میں رکھا تھا اور زندگی کی اس ناگزیر ضرورت کے وسیلے سے مفلس ترین فرد کی جیب تک دست حرص دراز کئے ہوئے تھی۔ نمک کا ایک معینہ ٹیکس، امتیازی مراعات رکھنے والوں کے سوا آٹھ سال کی عمر سے ہر ایک کو ادا کرنا پڑتا تھا۔ اجارے کو قائم رکھنے کے لئے طرح طرح کا تشدد عمل میں لایا جاتا۔ کسی کو اتنی اجازت نہیں تھی کہ سمندر کے پانی سے کھانا پکائے، یا نمک کی جھیلوں سے مویشیوں کو سیراب کرے۔ گوشت اور پنیر کی تجارت اور مویشیوں کی پرورش و پرداخت نمک کی قلت سے ناممکن ہو گئی تھی۔ اس مد سے بھی حکومت کئی کروڑ روپیہ وصول کر لیتی تھی، مگر ایک تہائی کے قریب وصولی پر صرف ہو جاتا تھا۔

ان دو ظالمانہ ٹیکسوں کے علاوہ کئی ایک اور مطالبات بھی حکومت کے تھے جو تنہا عوام کی قلیل آمدنیوں سے پورے کئے جاتے۔ لیکن اسی پر بس نہیں تھا۔ ان بے چاروں کو ہر جگہ کی مقامی ضرورتوں کے لئے علیحدہ ٹیکس دینا پڑتا تھا، کلیسا کو علیحدہ، امرا کو علیحدہ۔ رفاہ عام کے کاموں مثلاً سڑکوں وغیرہ کی تعمیر کے لئے بے گاریں پکڑے جاتے اور جبری فوجی خدمت بھی انجام دیتے۔ ہر ضلع کو ایک معینہ تعداد میں سپاہی مہیا کرنے ضروری تھے، اور اگر کوئی فوج کے لئے نامزد ہونے کے بعد بھاگ جاتا تو اس کے پڑوسی مجبور تھے کہ جنگل جنگل اس کو تلاش کرکے پکڑ لائیں یا اس کی جگہ خود بھرتی ہوں۔ امتیازی حقوق رکھنے والے، نیز ان کے ملازم، اس فوجی خدمت سے بھی مستثنیٰ تھے۔

محصلوں کا تشدد و ستم بالائے ستم تھا۔ عام دستور کے مطابق حکومت ٹیکسوں کی وصولی کا ٹھیکہ نیلام کرتی اور جس کی بولی سب سے بڑھ کر ہوتی اسی کو ٹھیکہ ملتا۔ حکومت ٹھیکیداروں سے زیادہ سے

زیادہ لیتی تو یہ بھی ٹیکس دینے والوں سے مروت نہ کرتے اور جس طرح ہوتا مطالبہ وصول کر کے رہتے۔ اس سلسلے میں اکثر بڑے ہی مظالم ہوتے۔ بستر، کپڑے اور ہل کے جانور تک قرقی سے نہ چھوٹتے۔ غریب کسانوں کو اس کے بعد ہاتھوں سے کھود کھود کر زمین تیار کرنی پڑتی۔ مشہور ہے کہ ایک بار کوئی عورت افلاس کی دیوانگی میں اپنے قرق شدہ برتنوں سے بے طرح چمٹ گئی۔ اس کے ہاتھ کاٹ ڈالے گئے۔ انگلستان کا ماہر اقتصادیات آدم اسمتھ ایک جگہ غیر معمولی جوش سے لکھتا ہے "وصولیابی کا یہ طریقہ صرف انھیں کو پسند آئے گا جو شاہی خراج کے مقابلے میں انسان کے خون کی ذرا بھی قدر نہ کرتے ہوں" ایک بار کسی محفل میں والٹیر احباب کے ساتھ مصروف کلام تھا اور موضوع گفتگو مشہور قزاقوں کے کارنامے تھے۔ ہر شخص اپنی باری پر کسی نہ کسی قزاق کا قصہ سناتا۔ اخیر میں لوگوں کے اصرار سے مجبور ہو کر والٹیر نے بھی ایک داستان سنائی "کسی زمانے میں ایک محصل تھا ــــ اب آگے کیا کہوں" اس کی شرح میں دفتر کے دفتر سیاہ کئے جا سکتے ہیں۔

کسان اور تیسرے طبقے میں غالب تعداد انھیں کی تھی، سب سے بڑھ کر قابل رحم تھے۔ اپنے طبقے کے عام شدائد کے علاوہ انھیں زمینداروں کے بہت سے غیر منصفانہ حقوق کا بار بھی برداشت کرنا پڑتا تھا۔ زمیندار اپنی زمین کے معاوضے میں نقد، جنس اور مفت خدمت ہی لینے کے مستحق نہیں تھے بلکہ اپنے اپنے مواضعات میں چکی، تنور اور کولھو وغیرہ کے اجارہ دار بھی تھے جن کے ذریعے کسانوں سے بہت کچھ وصول کر لیتے۔ پھر گویا ان حقوق سے بھی کسان تباہی کے قریب نہیں آ گئے تھے زمینداروں کی شکارگاہوں سے جنگلی جانور بڑے بڑے غولوں میں آ کر باغوں اور کھیتوں کو خراب کیا کرتے اور کسی کو ان پر ہاتھ بھی اٹھانے کی مجال نہیں تھی۔ زمینداروں کو ان حقوق سے جس قدر فائدہ پہنچتا وہ کسانوں کے نقصانوں کا عشر عشیر بھی نہ ہوتا۔

صدیوں کے ظلم سے تنگ آ کر تیسرا طبقہ اپنے سارے ماحول سے بیزار ہو گیا تھا اور تغیر کا آرزومند۔ فلسفیوں نے نئے نئے تخیلات پیش کر کے یہ آرزو اور بھی تیز کر دی تھی اور مستقبل کی بابت پیشین گوئی کرنا کسی مبصر کے لئے دشوار نہیں تھا۔ خاص کر اس لئے کہ فوج تک نئے تخیلات سے متاثر ہو گئی تھی۔

تیسرے طبقے میں کچھ نو دولت سرمایہ دار تھے۔ یہ اگرچہ خوش حال تھے اور عقل تعلیم اور شائستگی میں بھی امراء سے کم نہیں تھے لیکن اپنے سماجی حقوق میں قریب قریب عامۃ الناس کے ہم رتبہ تھے۔ سرکاری عہدے خرید لینے سے انھیں کچھ اعزاز ضرور حاصل ہو سکتا تھا لیکن نہ اتنا جتنا خاندانی امرا کو حاصل تھا۔ پس نو دولت سرمایہ دار بھی خوش نہیں تھے۔ ان کی یہ ناخوشی صرف اپنے ہی لئے نہیں تھی۔ ذاتی مصالح کے علاوہ عامۃ الناس کے مصائب بھی ان کے پیش نظر تھے اور وہ دل سے چاہتے تھے کہ یہ مصائب کسی طرح دور ہو جائیں۔ آگے چل کر انقلاب میں یہی عامۃ الناس کے رہنما ہوئے۔

امتیازی حقوق رکھنے والوں میں اولیت اہل کلیسا کو حاصل تھی۔ یہ مذہبی پیشوا تھے اور بڑا اعزاز و اقتدار رکھتے تھے۔ دولتمند بھی بہت تھے، بڑے بڑے اوقاف کی صورت میں ملک کی دولت کا پانچواں حصہ ان کے قبضے میں تھا۔ یہ حکومت کو باقاعدہ ٹیکس نہیں ادا کرتے تھے، کبھی کبھی بطور خراج کچھ دیدیا کرتے۔ ان کا اقتدار اور ان کی دولت ایک طرح کی امانت تھی جو انھیں اس لئے دی گئی تھی کہ اس کے ذریعے خلق کی خدمت کریں، اسے نیکی کی راہ سمجھائیں اور ضرورت کے وقت مدد دیں، مذہب کو زندہ رکھیں اور علم کو ترقی دیں۔ لیکن مدت سے اہل کلیسا نے راہ نفسانیت اختیار کر لی تھی۔ امانت کو اپنی ملک سمجھ بیٹھے تھے اور فرائض سے بالکل غافل ہو گئے تھے۔ نہ ان میں علم و فضل باقی تھا نہ ان کے عادات و اخلاق درست رہے تھے۔ مطلب اگر تھا تو طلب زر سے، کام اگر تھا تو عیش و عشرت سے۔ چھوٹے پادری البتہ کچھ بہتر حالت میں تھے۔ علم اور ذہن تو ان میں بھی نہ تھا لیکن برائی سے بچنے کی قوت اور فرض شناسی تھوڑی بہت باقی تھی۔ اسی وجہ سے شاید فرانس کے بے انصاف نظام نے ان کی عزت اور مالی حیثیت بھی کم رکھی تھی۔ عیش و عشرت سے زندگی بسر کرنے والے بڑے پادریوں کے مقابلے میں ان کا وہی مرتبہ تھا جو عامۃ الناس کا اعلیٰ طبقوں کے مقابلے میں تھا۔

چنانچہ بے اطمینانی و ناراضی کلیسا میں بھی اسی طرح نظر آتی تھی جس طرح سارے فرانس میں۔ عوام چھوٹے پادریوں کے جذبات میں شریک تھے کیونکہ دونوں کی شکایات یکساں تھیں، اور ان کے رفع ہونے کی صورت بھی ایک ہی تھی۔ انقلاب کے وقت دونوں دوش بدوش کھڑے

پائے گئے۔

امرا پادریوں سے کم درجہ لیکن ان سے بہت زیادہ بے مصرف تھے۔ پادری تو اپنے ذمے کچھ فرائض بھی رکھتے تھے اگرچہ ان سے غافل تھے۔ مگر امرا ہر قسم کی خدمات سے مستثنیٰ تھے۔ شاہی حکمت عملی نے انھیں اس قابل نہ رکھا تھا کہ زراعت میں اپنے کاشتکاروں کو مدد دے سکیں۔ پیرس اور ورسائی کی محفلوں میں عیش و نشاط کی زندگی گزارنے والے یہ زمیندار اپنے علاقوں سے اتنی وحشت کرنے لگے تھے کہ اتفاقی قیام بھی وہاں کا "جلاوطنی" سے تعبیر کرتے۔

بے کاری و آرام طلبی، علیحدگی و مغائرت، اس پر معاشی قانونی اور سماجی اعزاز، غیر ہمدردانہ برتاؤ، نخوت اور تکبر، کچھ عجب نہیں اگر ان باتوں نے امرا اور کسانوں کے تعلقات میں تلخی حد سے فزوں کر دی تھی۔

ملوکیت اپنے حسن تدبیر پر خوش ہو رہی تھی۔ فرائض چھین کر لیکن حقوق چھوڑ کر اس نے امارت کو دہری شکست دے دی تھی۔ وہ اب بے اختیار تھی اور غیر ہر دل عزیز۔ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی دم میں یہ صدیوں کی شکستہ عمارت گرا چاہتی ہے لیکن اس کی بنیادیں ملوکیت کی بنیادوں سے جدا نہ تھیں جب وہ گرنے لگی تو یہ بھی گر گئی۔

تخیل پسندی فرانس کی قومی خصوصیت ہے اور کبھی یہ خصوصیت اس شدت کے ساتھ نہ ظاہر ہوئی ہوگی جیسی کہ اس عہد میں۔ امتیازی حقوق رکھنے والے نئے فلسفۂ حریت و جمہوریت کی پرستش میں عامۃ الناس سے کم نہ تھے حالانکہ یہ فلسفہ صریحاً ان کے حقوق اور مادی مفاد کا دشمن تھا۔ اپنے آپ کو آزاد منش ظاہر کرنا فیشن میں داخل ہو گیا تھا۔ بہت سے عمال حکومت رعایا کے ساتھ نرمی سے پیش آتے اور نئے خیالات کے مطابق ان کی حالت کو سدھارنے کی کوشش کرتے۔ اس فلسفہ کی مقبولیت عام نے حکومت کو اندر ہی اندر کھوکھلا کر دیا تھا۔ اس میں مقابلے کی قوت باقی ہی نہیں رہی تھی، کیونکہ وہی لوگ جن کو انقلاب سے نقصان پہنچتا اور جن کی امداد پر حکومت قائم رہ سکتی تھی نئے خیال کے ہو گئے تھے۔

القصہ ملک ہر اعتبار سے انقلاب کے لئے تیار ہو چکا تھا۔ بس ایک معمولی سی تحریک کی کمی تھی۔ لوئی (۱۶) کی کمزوریوں نے یہ کمی بھی پوری کر دی۔

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں اس باب میں ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ انقلاب نے کیوں کر لوئی (۱۶) کو آلیا۔

ابتدا اس کی حکومت کی امید افزا تھی۔ اس نے وہ تمام نذرانے جو تخت نشینی کے وقت بادشاہوں کو پیش کئے جاتے تھے معاف کر دئے اور اعلان کر دیا کہ حکومت ہمیشہ کفایت شعاری سے کام لے گی اور اپنے قرض خواہوں کے حقوق کا پورا پورا احترام کرے گی۔ چند ہی ماہ بعد اس نے فرانس کی تمام پارلیمنٹوں[1] کو بحال کر دیا اور کاشتکاروں کو جن کے حقوق غلاموں کے سے تھے اور اپنے کھیت کے ساتھ بکا کرتے تھے آزادی عطا کی۔ وزرا کے انتخاب میں بھی اس نے ملک کا مفاد پیش نظر رکھا اور بہتر سے بہتر اشخاص کو حاصل کرنے کی کوشش کی مگر جب تک کہ اصلاحات و مراعات کے ایسے ہی پروگرام پر انتہا تک عمل نہ ہوتا ملک کی تکلیف رفع نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ لوئی (۱۶) کے لئے ناممکن تھا۔ وہ کوئی کام انجام تک نہیں پہنچا سکتا تھا۔

اس کا پہلا وزیر ٹرگٹ نہایت ہی بیدار مغز اور غیر معمولی قابلیت کا آدمی تھا۔ اصلاحات کی مکمل اسکیم اس کے دماغ میں تھی۔ نظام حکومت میں سادگی اور باقاعدگی پیدا کرنا، فضول خرچیوں کو

---

[1] زمانہ قدیم میں فرانس کا ہر صوبہ ایک پارلیمنٹ (عدالت عالیہ) رکھتا تھا۔ اس کے فرائض میں یہ بھی داخل تھا کہ شاہی احکام کی رجسٹری کرے۔ کچھ زمانے بعد بادشاہوں نے محسوس کیا کہ پارلیمنٹوں کا یہ فرض اختیارات شاہی میں مخل ہوتا ہے، کیونکہ لبا اوقات وہ ناپسندیدہ احکامات کی رجسٹری کرنے سے انکار کر دیتیں جس کے معنی عام حالتوں میں یہی تھے کہ ان کا نفاذ نہ ہو۔ چنانچہ جب فرانس میں اقتدار شاہی بڑھا تو ان تمام اداروں کی طرح جو کسی نہ کسی طرح بادشاہوں کی مطلق العنانی میں سد راہ تھے پارلیمنٹیں بھی توڑ دی گئیں اور ان کی جگہ دوسری عدالتیں قائم کی گئیں جن کے ذمے صرف یہی فرض تھا کہ مقدمات فیصل کریں۔ لوئی (۱۶) جب تخت نشین ہوا تو رائے عامہ کو قدیم طرز کی پارلیمنٹوں کا خواہشمند پاکر انھیں بحال کر دیا۔

روکنا، امتیازی حقوق رکھنے والوں پر ٹیکس عاید کرکے تیسرے طبقے کا بار کم کرنا، زراعت کو ترقی دینا، کونسلیں وغیرہ قائم کرکے رعایا اور حکومت کے درمیان اتفاق و یگانگی پیدا کرنا، تینوں طبقوں کے تعلقات کو بہتر بنانا، یہ تھیں وہ تجاویز جنھیں ٹرگٹ ایک ایک کرکے عمل میں لانا چاہتا تھا۔ یہ آسان نہ تھا لیکن وہ ملک کی خاطر تمام دشواریوں کو انگیز کرنے کے لئے تیار تھا۔

کوئی پونے دو سال تک ٹرگٹ اپنی اسکیم کے مطابق کام کرتا رہا۔ اس مدت میں اس نے حکومت کو بہت کچھ سدھار دیا مگر جیسا کہ اندیشہ تھا ساتھ ہی ساتھ دشمن بھی پیدا کرلئے۔ خاصان بادشاہ یعنی اہل دربار دشمنی میں سب سے پیش پیش تھے کیونکہ ان کا داؤ خزانے پر نہیں چلنے پاتا تھا۔ خود ملکہ کے لئے بھی یہ امر باعث شکایت تھا۔ آخر کار ٹرگٹ سے ایک بہت بڑی خطا سرزد ہوئی۔ ملکہ کے ایک عزیز دوست کو اس نے سفارت انگلستان سے برخاست کرادیا۔ اس کا یہ قصور ناقابل معافی تھا، اور اب ملکہ قطعی طور سے اس کے دشمنوں کے گروہ میں شامل ہوگئی۔ کمزور بادشاہ اس گروہ کی مخالفت کی تاب نہ لاسکتا تھا جس کی سرغنہ ملکہ بن گئی تھی۔ اپنے اقارب سے وہ "نہیں" کسی طرح نہ کہہ سکتا تھا۔ چند ہی دنوں میں اسے مجبور ہونا پڑا کہ ٹرگٹ کو معزول کردے۔

یوں اس واحد مدبر کی وزارت کا خاتمہ ہوگیا جو فرانس کو اصلاح اور ترقی کے راستے پر لگا سکتا تھا۔ ٹرگٹ کے دشمن خوش تھے لیکن کروڑوں بے زبان ستم کش غم کے آنسو بہا رہے تھے۔ حامیان ترقی جنھوں نے لوئی (۱۶) کو مصلح سمجھ کر خوش آمدید کہا تھا اپنی غلطی محسوس کرنے لگے اور آہستہ آہستہ یہ خیال عام ہونے لگا کہ اصلاح کے لئے جمہور کو خود اٹھنا چاہیے۔

ٹرگٹ کے بعد تقریباً بارہ سال کی مدت میں یکے بعد دیگرے چھ اشخاص نے قلمدان وزارت سنبھالا، ناکام رہے اور معزول ہوئے۔ بڑی حد تک تو اس ناکامی کی ذمہ داری ملکہ اور اہل دربار پر عاید ہوتی ہے۔ ان کی ریشہ دوانیوں سے وزراء کو کبھی چین ملا نہ نازبرداریوں سے چھٹکارا اور اکثر اسی لئے معزول ہوئے کہ ملک کے مفاد کو ان لوگوں کے مطالبات پر قربان نہ کرسکے لیکن مسئلہ اصلاح خود بھی روز بروز اس قدر مشکل ہوتا گیا کہ کسی سے کچھ بن نہ آیا۔

اصلاحات میں سب سے مقدم مالی و اقتصادی اصلاح تھی تاکہ حکومت آمد و خرچ کا تناسب درست
رکھ سکے اور تیسرے طبقے کا بارگراں ہلکا ہو۔ کفایت شعاری و خوش انتظامی سے جس میں ملکہ اور اہل دربار
مانع تھے کسی قدر مقصد برآری ہوسکتی تھی لیکن بڑی حد تک اصلاح کا مدار ان اقتصادی مراعات کی منسوخی
پر تھا جو امتیازی حقوق رکھنے والوں کو حاصل تھیں۔ اہل کلیسا، امرا اور وہ دولت مند لوگ جنھوں نے
سرکاری عہدے خرید لئے تھے سب سے زیادہ مالدار ہونے کے باوجود ٹیکسوں سے مستثنیٰ تھے۔ ان پر
ٹیکس لگا دینے سے حکومت اور تیسرے طبقے دونوں کی مصیبت دور ہوسکتی تھی۔ حکومت کی مالی حالت استوار
ہوجاتی اور تیسرے طبقے پر اس کی استطاعت سے زیادہ ٹیکسوں کا جو بار تھا ہٹا دیا جاتا۔ لیکن مراعات
کی منسوخی پورے سماجی نظام کو بدل دینے کے برابر تھی۔ کوئی بڑا ہی ہر دلعزیز بادشاہ جس نے اپنی دانائی،
نیک نیتی، خوش انتظامی اور خوش خلقی سے عام رعیت کو اپنا گرویدہ بنا لیا ہوتا اور فوج اور پولیس پر پورا
قابو رکھتا ممکن تھا کہ اس کوشش میں کامیاب ہوجاتا مگر لوئی میں ایسے بادشاہ کے اوصاف نہیں تھے
اور ٹرگٹ کی معزولی کے بعد کامیابی کا رہا سہا امکان بھی باقی نہ تھا کیونکہ رعایا بہت ناراض ہوگئی تھی
اور وہ مراعات کی منسوخی کیا ملوکیت اور سارے نظام قدیم ہی کا خاتمہ کرنا چاہتی تھی۔

ان دشواریوں کے ہوتے ہوئے بھی ٹرگٹ کے بعد نکر نے مالی و اقتصادی اصلاح کا بیڑا اٹھا
ہی لیا۔ نکر بہت ہی بڑا ماہر اقتصادیات تھا، اگرچہ ٹرگٹ کا سا مدبر نہ تھا۔ کفایت شعاری اور قرضہ کی ابتدائی
ان دو صورتوں سے وہ مالی دشواریوں کو حل کرنا چاہتا تھا لیکن اسی درمیان میں امریکہ کی جنگ آزادی
شروع ہوگئی جس میں فرانس نے کئی کروڑ پاؤنڈ صرف کر دئے[۱] اور خزانے کی اصلاح ہمیشہ کے لئے ناممکن ہوگئی۔

---

[۱] ریاستہائے متحدہ امریکہ جو اب ایک آزاد اور دولتمند ملک ہے، ابتداءً انگلستان کی نوآبادی تھا۔ آزادی کے لئے
اسے جو لڑائی انگریزوں سے لڑنی پڑی، اس میں یورپ کی متعدد قوموں نے اس کا ساتھ دیا۔ انھیں میں فرانس
بھی تھا جسے اپنے دیرینہ دشمن انگلستان کو نقصان پہنچانے کا ایسا اچھا موقع مل گیا تھا کہ تمام مشکلات کے ہوتے
ہوئے بھی اس نے اس کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔

آمد و خرچ کا تناسب بدنظمی کے سبب درست نہ ہوتا تھا، اب کروڑوں کا قرضہ اور بھی چڑھ گیا جس کا سود تک ادا ہونے کی صورت نہ تھی۔ بڑی بڑی مشکلوں سے مزید قرضے لے کر حکومت کا کام چلتا تھا مگر کب تک۔ بالآخر اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ رعایا پر نئے ٹیکس لگائے جائیں۔ لیکن قوم کسی نئے ٹیکس کو گوارا نہ کر سکتی تھی۔ پس نہایت ہی کمزور مادی قوت اور اس سے بھی کمزور اخلاقی قوت کے ساتھ لوئی کے وزرا نے جوان ایام میں آئے دن بدلے جاتے نئے ٹیکسوں کے لئے جس قدر کوششیں کیں وہ سب ناکام ثابت ہوئیں اور حکومت کی مشکلات برابر بڑھتی گئیں۔

سب سے بڑی مزاحمت اس معاملے میں پارلیمنٹوں کی طرف سے ہوئی جن کی سرغنہ پیرس کی پارلیمنٹ تھی۔ پارلیمنٹوں کے اراکین تمام صوبوں میں اس طبقے سے مقرر ہوتے تھے جسے امتیازی حقوق حاصل تھے اور ایک طرح سے یہ پارلیمنٹیں اسی طبقے کی نمائندہ تھیں۔ چونکہ نئے ٹیکس کے لئے بادشاہ کی نگاہ بے طرح اس طبقے کے حقوق پر پڑ رہی تھی اس لئے قدرۃً انھوں نے بادشاہ کی راہ میں مزاحم ہونا شروع کر دیا۔ تاہم چونکہ پارلیمنٹوں نے وہ ٹیکس بھی نہ لگنے دئے جو بادشاہ تیسرے طبقے پر لگانا چاہتا تھا اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ انسانی ہمدردی کا جذبہ بھی ان کا محرک تھا۔

مزاحمت کی صورت یہ تھی کہ بادشاہ جب کبھی نئے ٹیکسوں کے لئے حکم بھیجتا پارلیمنٹیں ان کی رجسٹری کرنے سے انکار کر دیتیں۔ چونکہ قانوناً نفاذ سے قبل احکام شاہی کی رجسٹری لازمی تھی، پارلیمنٹوں کے انکار سے احکام کا نفاذ رک جاتا۔ یہ ان کو مسترد کر دینے کے برابر تھا۔

اس معاملے میں عامۃ الناس پارلیمنٹوں کے ہمنوا تھے کیونکہ اگرچہ ان کا طرز عمل خود غرضی سے خالی نہیں تھا، اس زمانے میں پارلیمنٹیں ہی تھیں جو بادشاہ کی مطلق العنانی میں مانع ہو سکتی تھیں۔

نئے ٹیکسوں کے بغیر کام نہ چل سکتا تھا پس بادشاہ اور پارلیمنٹوں میں کشمکش بڑھتی گئی اور اس میں وہ رنگ پیدا ہو چلا جو استبداد و حریت کے تنازع للبقا میں ہوتا ہے۔ فریقین میں جھگڑا ایک وقتی مسئلے یعنی ٹیکس کے لئے تھا مگر بنیادی مسئلہ ٹیکس کا نہ تھا بلکہ ٹیکس لگانے کے اختیار یعنی فرماں روائی کا تھا۔ یہ رنگ امریکہ کی مثال سے بہت بڑھ گیا۔ لوئی نے انگریزوں کے خلاف امریکہ کو مدد دی تو یہ

نہ سمجھا کہ وہ استبداد کے خلاف حریت کو مدد دے رہا ہے ــــ اسی تخیل کو، جو فرانس میں ملوکیت سے برسر جنگ تھا۔ جب امریکہ نے فتح پائی تو اس تخیل کو فرانس میں اور بھی تقویت ہو گئی۔ یہاں کے لوگوں نے محسوس کیا کہ ان کا درد بھی وہی ہے جو امریکہ کا تھا۔ پس علاج بھی وہی ہونا چاہیے۔ متعدد فرانسیسی جو لڑائی کے زمانے میں رضاکار بن کر امریکہ چلے گئے تھے، وہاں کے سادہ طرز معاشرت اور منصفانہ قوانین سے نہایت متاثر ہو کر لوٹے۔ وہاں انھیں فطری آزادی اور مساوات کی اسی فردوس گم شدہ کی جھلک نظر آئی جس کی آرزو فرانس کو تڑپا رہی تھی۔ انھوں نے اپنے ملک میں امریکہ کی بڑی تعریفیں بیان کیں اور ہر خاص و عام کو اس کی تقلید کا شائق بنا دیا۔

جب حکومت کا اصرار بہت بڑھا تو پارلیمنٹوں نے ٹیکسوں کی منظوری کے لئے ایک بہت بڑی شرط لگا دی، جو بالآخر سارے ملک کا مطالبہ بن گئی۔ انھوں نے کہا کہ نئے ٹیکس لگانے کا اختیار صرف "جمعیۃ طبقات[1]" کو حاصل ہے۔ اگر بادشاہ نئے ٹیکس لگانا چاہتا ہے تو جمعیۃ کے اجلاس میں اپنی خواہش کو پیش کرے۔ جب تک ایسا نہ ہو گا اور جمعیۃ کی منظوری حاصل نہ کر لی جائے گی نئے ٹیکسوں کی رجسٹری نہیں ہو سکتی۔

جمعیۃ طبقات فرانس کے ان قدیم اداروں میں سے تھی جو بادشاہوں کی مطلق العنانی میں مانع ہونے کی وجہ سے توڑ دئے گئے تھے۔ اپنے دور حیات میں یہ جمعیت تینوں طبقوں یعنی پادریوں، امیروں اور عامۃ الناس کے نمایندوں پر مشتمل تھی اور اس کا کام یہ تھا کہ رعایا کے خیالات و جذبات بادشاہ کے سامنے پیش کرے۔ اگرچہ اختیارات حکومت جمعیت کو نہیں حاصل تھے، مگر قدیم زمانے کے تاریک دور استبداد میں یہ بھی کم نہیں تھا کہ وقتاً فوقتاً رعایا کے دکھ درد کا اظہار ایک آئینی جماعت کے ذریعے ہوتا رہتا۔ یہ رعایا کی زبان تھی، اس کی جان ــــ زندگی کی تنہا علامت۔ لیکن متکبر بادشاہ اپنے خلاف کسی کی آواز نہیں سن سکتے تھے، خواہ وہ مظلوموں کے نالہ و شیون ہی کیوں نہ ہوں۔ انھوں نے

---

[1] Estates General ۔

جمعیۃ کو توڑ کر رعایا کی زندگی سے رشتہ توڑ دیا تھا۔ وہ جیتی تھی مگر اس میں زندگی کی روح باقی نہیں تھی۔ مدتوں کے بعد لوئی (۱۶) کی دشواریوں نے اسے اب اچھا موقع دیدیا تھا کہ اس ادارے کو دوبارہ زندہ کرائے جس کے ساتھ اس کی حیات وابستہ تھی اور اس نے اس موقع سے پورا فائدہ اٹھایا۔

جمعیۃ کا نام پارلیمنٹوں نے لیا ہی تھا کہ اس کی صدائے بازگشت ملک کے ہر ہر گوشے سے آنے لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے شرطاً سے مطالبہ بن گئی۔ لوگوں کے نزدیک جمعیۃ کے اس انعقاد کی غرض صرف یہ نہیں رہی کہ نئے ٹیکس لگائے جائیں بلکہ یہ بھی ہو گئی کہ ان کا کھویا ہوا حق واپس مل جائے۔

یہ ایسی جرأت تھی کہ لوئی (۱۴) ـــــ کمزور، نیک دل، پریشان حال لوئی (۱۶) بھی اس کی تاب نہ لا سکا اور پارلیمنٹوں کی گوشمالی پر آمادہ ہو گیا۔ دھمکی، تعطل، جلاوطنی ایک ایک کرکے بادشاہ یہ تمام باتیں عمل میں لایا، مگر پارلیمنٹوں کے ارکین اپنی بات پر اڑے رہے۔ ان کے استقلال نے ملک کی ہمدردی ان کے ساتھ اور بھی زیادہ کر دی اور ان کے مصائب نے حکومت کے خلاف اشتعال اور بھی بڑھا دیا۔ فوج تک بادشاہ کی حمایت سے منہ موڑنے لگی۔

جس وقت چھٹے وزیر برین نے عہدۂ وزارت خالی کیا تو حکومت کا رعب اس قدر اٹھ گیا تھا کہ ٹیکس کا وصول ہونا بھی مشکل تھا، ساکھ ایسی اکھڑ گئی تھی کہ کوئی قرضہ دینے پر بھی آمادہ نہیں ہوتا تھا، فوج جو اپنے آپ کو جمہور میں شامل سمجھتی تھی بددل تھی، کاروبار حکومت بند تھا، اور بادشاہ نے عاجز ہو کر جمہور کے مطالبے کے آگے سر تسلیم خم کر دیا تھا۔

ملوکیت کو اب بھی زندہ سمجھنا کوتہ اندیشی تھی۔ تیغ و گردن کا معاملہ محض اس عالم اسباب کی ایک رسم کو پورا کرنے کے لئے باقی تھا ورنہ ارباب قضا و قدر کے نزدیک اس مہابھارت کا فیصلہ جو فرانس میں ہونے والی تھی اسی وقت ہو چکا تھا۔

قربانی کی دینی حیثیت!

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم!

رسالہ جامعہ کے اگست نمبر میں "صدائے حق" کے نام سے ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں قربانی کے متعلق نہایت عالمانہ، عارفانہ اور ناصحانہ لب ولہجے میں گفتگو کی گئی ہے اور آخر میں فیصلہ فرمایا گیا ہے کہ بحالات موجودہ قربانی ایک رسم باطل سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔

مذہب سے متعلق گفتگو کے دو ہی طریقے ہو سکتے ہیں یا تو گفتگو منقولات کی حد تک محدود ہو، یا معقولی انداز میں نفس مسئلہ پر اثباتی یا سلبی اعتبار سے اظہار خیال کیا جائے اور ان دونوں صورتوں میں یہ ضروری ہے کہ معترض جس چیز پر اعتراض کر رہا ہے اس کے مالہ وما علیہ سے واقف ہو، منقولات سے متعلق تمام چیزیں اس کے پیش نظر ہوں، مذہبی تعلیم، احکام، اور اوامر سے بھی وہ پورے طور سے آشنا ہو، اس کے متعلق موافقت یا مخالفت میں جو کچھ کہا گیا ہو وہ بھی اس کے سامنے ہو، پھر اسے بلاشبہ حق ہے کہ وہ کسی مسئلے پر گفتگو کرے اور اپنے نقطۂ نظر سے اسے غلط یا صحیح قرار دے۔

لیکن جب صورت حال برعکس ہو محض غور و فکر یا اقتباس و استنباط سے کوئی رائے قائم کر لی گئی ہو اور منقولی اعتبار سے اس کا کیسہ معلومات بالکل خالی ہو تو میرے خیال میں یہ بہت بڑی جرأت ہوگی اگر پھر بھی پورے ادعا کے ساتھ گفتگو کر کے کوئی آخری فیصلہ کر دیا جائے اور میں کہہ سکتا ہوں کہ "صدائے حق" کے نام سے جن صاحب نے اپنا مضمون شائع کرایا ہے انھوں نے یہی دوسری صورت اختیار کرائی ہے۔

انھوں نے بعض مقامات پر ترجمہ غلط کیا ہے، نفس مسئلہ سے متعلق تمام آیات قرآنی کو اپنے سامنے نہیں رکھا ہے، حدیث وسنت کو ہاتھ بھی نہیں لگایا ہے، نہایت ناقص طور سے چند آیتیں انھوں نے لکھ دی ہیں اور ان سے سیاق و سباق سے بالکل الگ ہو کر ایک نتیجہ اخذ کر لیا ہے اور اسی کو وہ

ملحدانہ انداز میں پیش کر رہے ہیں گویا جو کچھ وہ فرما رہے ہیں وہ مدلل بھی ہے۔

بہرحال، یہ ضروری نہیں کہ اس معاملے میں محترم مقالہ نگار کی پیروی کی جائے۔ مناسب یہ ہے کہ اصل مسئلے پر سنجیدگی سے غور کیا جائے کہ جو کچھ وہ فرما رہے ہیں اس میں کہاں تک شائبۂ صداقت ہے اور کہاں تک ادعا محض؟

ارشاد ہوا ہے:-

"قربانی کی ابتدا ہر ملک اور ہر قوم کی ابتدائی تہذیب میں اس باطل اعتقاد کے ماتحت ہوئی ہے کہ خدا اپنی شکل، ضروریات، عادات وجذبات میں انسان کے مشابہ ہے اور جو جانور شراب، پھول پھل اور زیورات وغیرہ اس پر چڑھائے جاتے ہیں وہ ان کا جوہر استعمال کرتا ہے۔"

محترم مقالہ نگار صاحب جس چیز کو ایقانی لب ولہجے میں "اعتقاد باطل" قرار دے رہے ہیں قرآن مجید کا فیصلہ اس کے متعلق دوسرا ہے۔

ولکل امۃ جعلنا منسکا لیذکروا اسم اللہ علی ما رزقھم من بھیمۃ الانعام فالٰھکم الٰہ واحد فلہ اسلموا وبشر المخبتین الذین اذا ذکر اللہ وجلت قلوبھم والصٰبرین علی ما اصابھم والمقیمی الصلوٰۃ ومما رزقنٰھم ینفقون ؀

اور ہم نے ہر امت کے لئے قربانی کرنا اس غرض سے مقرر کیا کہ وہ ان مخصوص چوپاؤں پر اللہ کا نام لیں جو اس نے ان کو عطا فرمائے تھے۔ سو تمہارا معبود ایک ہی خدا ہے تو تم ہمہ تن اسی کے ہو کر رہو اور آپ گردن جھکانے والوں کو خوشخبری سنا دیجئے، جو ایسے ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں اور جو ان مصیبتوں پر کہ ان پر پڑتی ہیں صبر کرتے ہیں اور جو نماز کی پابندی رکھتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

(ترجمہ از حکیم الامۃ حضرت مولینا اشرف علی صاحب تھانوی)

آیات بالا نے اس "اعتقاد باطل" کی تردید کر دی ہے جو اقتباس بالا میں پیش کیا گیا ہے۔

اسلامی قربانی اس قربانی سے مختلف ہے جو مختلف چیزوں کے مختلف دیوتاؤں کی خوشنودی مزاج کی خاطر کی جاتی تھی۔ قربانی کا مقصد یہ قرار دیا گیا کہ لوگ ان جانوروں پر "اللہ کا نام لیں" "جو معبود ہے اور "جو ایک ہی ہے" اور بتوں اور دیوتاؤں کو چھوڑ دیں کہ صرف اسی کے آگے گردن جھکانے والوں کو خوشخبری ہے۔"

یہاں اس خیال کی بھی تردید ہو جانی چاہئے کہ "خدا ان چیزوں کا جوہر استعمال کرتا ہے" اس لئے کہ قرآن مجید میں اس کی صاف و واضح الفاظ میں تردید موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ کو گوشت و خون نہیں پہنچا بلکہ تقویٰ پہنچتا ہے۔ مطلب یہ کہ جس جذبے، جس روح اور جس نیت کے ماتحت قربانی کی جاتی ہے اللہ تعالیٰ اسے دیکھتا ہے اور اسی کے ماتحت عذاب و ثواب کا حکم صادر فرماتا ہے۔

آگے چل کر فرمایا ہے:۔

"خدا نے جب عرب کی نیم وحشی قوم میں آج سے چودہ سو برس پہلے نبی آخرالزماں کے ذریعے سے اپنی ذات وصفات کا صحیح تصور قائم کرنا چاہا تو اس مروجہ رسم کو شراب یا ربا کی طرح سے حرام یا ناجائز نہیں کیا کیونکہ وہ شراب یا ربا کی طرح سے مخرب اخلاق یا مضر نہیں تھی بلکہ وقتی اور مقامی تمدنی ضروریات کے لحاظ سے ایک مفید اور کارآمد رسم تھی۔

مضمون کا سب سے دلچسپ حصہ یہی ہے۔ اس سے پیشتر مضمون نگار صاحب اس رسم کو "اعتقاد باطل" قرار دے چکے ہیں اور اب ارشاد ہوتا ہے کہ "نبی آخرالزماں کے ذریعے سے (خدا نے) اپنی ذات وصفات کا صحیح تصور قائم کرنا چاہا" تو اسے جائز رکھا اس لئے کہ یہ رسم "مخرب اخلاق یا مضر نہیں تھی" "بلکہ ایک مفید اور کارآمد رسم تھی"۔

کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

اسی سلسلے میں ارشاد ہوا ہے:۔

"لن ینال اللہ لحومھا ولا دماؤھا ولکن ینالہ التقوی منکم یعنی نہ ان کا گوشت اور خون خدا قبول کرتا ہے بلکہ وہ تمہارا تقویٰ قبول کرتا ہے (اس آیت کا) یہی مطلب ہے کہ جانوروں

کی خوں ریزی خدا کی نظروں میں کوئی احسن عمل نہیں کیونکہ وہ گوشت اور خون کو قبول نہیں کرتا ہے"
نہ معلوم کس مقصد کے ماتحت مضمون نگار صاحب نے اس مقام پر آیت کا ترجمہ غلط کیا ہے۔ اول تو یہ کہ انھوں نے اللہ کو فاعل قرار دیا ہے حالانکہ اس جگہ "لحوم" فاعلی حالت میں ہے، دوسرے یہ کہ "ینال" کا ترجمہ فرمایا ہے "قبول" کرتا ہے حالانکہ صحیح ترجمہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو گوشت اور خون نہیں پہنچتا بلکہ تقویٰ پہنچتا ہے۔

پہلے زمانے میں یہ دستور تھا کہ مشرکین جب قربانی کرتے تھے تو خانہ کعبہ پر خون کے چھینٹے دیتے تھے اور گوشت چڑھاتے تھے اُسی "اعتقاد باطل" کے ماتحت جس کا ذکر مضمون نگار صاحب فرما چکے ہیں لیکن اسلام نے منجملہ اور عقائد باطلہ کی اصلاح کے اس "اعتقاد باطل" کو بھی دور کر دیا کہ اس خون چھڑکنے اور گوشت چڑھانے سے کیا فائدہ۔ یہ چیزیں تو خدا تک پہنچنے سے رہیں (اگرچہ ان کی مقبولیت میں کوئی شبہ نہیں) خدا تک پہنچنے والی جو چیز ہے وہ تمہارا التقویٰ ہے یعنی خلوص نیت ہے کہ تم یہ قربانی "رِاءَ الناس" کر رہے ہو یا "حسبۃً للہ"۔ پہلی صورت میں وہ مردود ہے اور دوسری صورت میں مقبول۔ تفصیل کی اگر ضرورت ہو تو ابن جریر، کشاف اور دوسری معتبر کتب تفسیر میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔

رہا "وقتی، مقامی اور تمدنی ضروریات کا لحاظ" تو یہ ایک عجیب مبہم سی بات ہے۔ قرآن مجید میں جس حکم کو بالصراحت بیان کیا گیا ہو، اس کی بجا آوری کی تاکید کی گئی ہو، اس کے انجام دینے پر ثواب و مغفرت کی بشارت ہو، جس کے چھوڑ دینے پر عذاب و عقاب کی دھمکی ہو، جس کو بار بار مکرّرات و مرّات ایک فریضہ اور رضائے الٰہی کا ذریعہ قرار دیا گیا ہو جس کے متعلق کوئی حد بندی نہ ہو، حکم میں عمومیت ہو، عہد رسالت سے لے کر ۱۹۳۳ء تک برابر وہ فریضہ ادا کیا جاتا رہا ہو اس کے متعلق دفعۃً یہ انکشاف دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ تعجب خیز بھی ہے!

آگے چل کر فرمایا گیا ہے:-

"کفارے میں غلاموں کو آزاد کرنے کی ہدایتیں موجود ہونے سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ غلامی کی رسم کو قائم رکھنا خدا کی منشا کے مطابق ہے اور اگر اس کو قائم نہ رکھا گیا تو بعض

گناہوں کے کفارے میں جو غلاموں کو آزاد کرنے کا حکم ہے اس کی حکم عدولی ہو جانے سے مسلمان گناہ کے مرتکب ہو جائیں گے تو کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ جانوروں کی قربانی کے متعلق محض کلام مجید میں بعض ہدایتیں موجود ہونے سے اس رسم کو بند کرکے دوسرے مفید ذرائع سے اس کی روح کو قائم رکھنے سے مسلمان کیوں کر کسی گناہ کے مرتکب ہو سکتے ہیں؟

غلامی اور قربانی کی باہم مطابقت یقیناً مضمون نگار صاحب کا ایک دلچسپ کارنامہ ہے۔

غلامی کو خدا نے کہیں بھی پسندیدہ فعل نہیں فرمایا، نہ اسے "من شعائر اللہ" قرار دیا ہے۔ اسی طرح جہاں کہیں بطور کفارے کے غلام کو آزاد کرنے کی ہدایت ہے وہیں بطور کفارے کے روزہ یا یا اسی قسم کی کسی اور چیز کے متعلق بھی موجود ہے کہ اگر غلام نہ ہو تو بایں طور کفارہ ادا کیا جائے۔

قربانی کے متعلق یہ کہیں نہیں ہے کہ کسی خاص موقع پر تم قربانی کے جانوروں کو آزاد کر دیا کرو بلکہ حکم ہے تو یہ کہ یہ قربانی کی رسم "سنت ابراہیمؑ" اور "من شعائر اللہ" ہے۔ رہا قربانی کی فرضیت اور وجوب کا سوال تو یہ انہیں پر ہے جو صاحب استطاعت ہوں اگر استطاعت نہ ہو تو دس روز کے روزے ضروری قرار دیے گئے ہیں۔

قرآن مجید میں قربانی کے متعلق بہت زیادہ صاف اور واضح الفاظ میں احکام موجود ہیں جن سے اگر عمداً چشم پوشی نہ کی جائے تو یقیناً ہر شخص راہ یاب ہو سکتا ہے مثلاً

والبدن جعلناھا لکم من شعائر اللہ لکم فیھا خیرٌ فاذکروا اسم اللہ علیھا صواف فاذا وجبت جنوبھا فکلوا منھا واطعموا القانع والمعتر کذلک سخرناھا لکم لعلکم تشکرون ○ لن ینال اللہ لحومھا ولا دماؤھا ولکن ینالہ التقوی منکم کذلک سخرھا لکم لتکبروا اللہ علی ما ھدٰکم وبشر المحسنین ○

اور قربانی کے اونٹ اور گائے ہم نے اللہ کی یادگار بنایا ہے، ان جانوروں میں تمہارے فائدے ہیں سو تم ان پر کھڑے کرکے اللہ کا نام لیا کرو پس جب وہ کروٹ کے بل گر پڑیں تو تم خود بھی کھاؤ اور بے سوال اور سوالی کو بھی کھانے کو دو۔ ہم نے ان جانوروں کو اس طرح تمہارے زیر حکم کر دیا تاکہ تم شکر کرو۔ اللہ کے پاس نہ ان کا گوشت پہنچتا ہے اور نہ ان کا خون پہنچتا ہے ولیکن ان کے پاس تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ان جانوروں

کو زیر حکم کر دیا تاکہ تم اس بات پر اللہ کی بڑائی کرو کہ اس نے تم کو
توفیق دی اور اخلاص والوں کو خوشخبری سنا دیجئے۔

(ترجمہ از حکیم الامۃ حضرت مولینا اشرف علی صاحب مدظلہ)

اوپر کی سطروں میں جو آیات پاک پیش کی گئیں ان سے صاف الفاظ میں یہ ظاہر ہوتا ہے کہ قربانی "من شعائر اللہ" ہے اور اس میں " تمھارے لئے بہتری ہے" اور آخر میں ارشاد ہوا ہے کہ " اخلاص والوں کو خوشخبری سنا دیجئے" یعنی ان کے حسن عمل اور حسن نیت کے بدلے میں انھیں ثواب ملے گا اور رضائے الٰہی جیسی دولت بے بہا حاصل ہوگی۔ ان آیات مبارکہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قربانی "وقتی، مقامی اور تمدنی ضروریات" کے ماتحت نہیں باقی رکھی گئی بلکہ ان مصالح کے ماتحت باقی رکھی گئی جو بدستور قائم ہیں یعنی صرف جذبۂ خلوص کا اظہار، تمام دوسرے مصنوعی معبودوں سے رشتہ توڑ کر ایک ہی خدا سے لو لگا کر، اس کا نام لینا، اس کا تذکرہ کرنا اور اس کے حکم کی تعمیل میں قربانی کرنا!

علاوہ ازیں غلامی ایک ایسی رسم ہے جو خود انسانوں کی قائم کی ہوئی ہے اس لئے اس کے متعلق اگر کچھ باتیں ایسی ہوں جن سے یہ احساس ہوتا ہو کہ اسے رفتہ رفتہ کم اور پھر ختم ہو جانا چاہئے تو زیادہ مقام تعجب نہیں لیکن قربانی کا معاملہ بالکل جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔ قرآن مجید ہمیں یہ تعلیم دیتا ہے کہ قربانی تمھارا ایک فریضہ ہے، اسلام (دین ابراہیمی) جب سے ہے یہ رسم چلی آرہی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی یادگار ہے۔ بندوں کا یہ فعل آقا کی خوشنودی کا سبب ہے۔ اس کے کرنے پر ترغیب و تحریص ہے اور نہ کرنے پر عذاب و عتاب کی وعید پھر ہم اسے کیوں کر چھوڑ سکتے ہیں۔

باقی رہی مصلحت سو اس سے الحمد للہ اسلام کا دامن ہمیشہ پاک رہا ہے، کسی مصلحت کی بنا پر کسی ضروری امر کا نفاذ نہ کرنا کسی مذہب کا بھی دستور نہیں رہا ہے اور اگر رہا ہے تو وہ مذہب یقیناً خدائی مذہب نہیں ہے بلکہ کمزور دل مصلحت شناس مصلحوں کی ایجاد ہے جو کبھی بھی اس کی مستحق نہیں کہ عالمگیر قبولیت حاصل کر سکے۔

اسلام جب دنیا میں آیا تو ساری دنیا کفر و طغیان سے لبریز تھی، ایک خدا کے بجائے سیکڑوں

خداؤں کی پرستش ہو رہی تھی، دین حنیف کے آثار و نقوش مٹ گئے تھے اور کفر و شرک کی تاریکیاں حق و صداقت پر چھائی ہوئی تھیں لیکن اسلام کے نیر تاباں نے طلوع ہوتے ہی کفر و شرک کے بادلوں کو چھانٹ دیا۔

دعوت اسلام کے آغاز میں داعی اسلام کو کیا کچھ تکلیفیں نہ دی گئیں، سیم و زر کے انباروں نے کس کس طرح لبھایا اور حسن و جمال کی عشوہ طرازیاں کس کس طرح بے نقاب ہوئیں، خوف ہلاکت اور اندیشہ رسوائی نے کیسے کیسے بھیانک مرقعے پیش کئے، اپنوں اور دوستوں کی رفاقت کے رشتے آن کی آن میں ٹوٹ گئے اور ساری خدائی دشمنی اور قتل پر آمادہ ہو گئی لیکن داعی اسلام کی جبین استقلال پر شکن تک نہ آئی اگر ارشاد ہوا تو یہ کہ یہ کفار اگر میرے ایک ہاتھ میں چاند اور دوسرے میں سورج دیدیں جب بھی میں اس دعوت حق سے باز نہیں آسکتا لیکن چودہ سو برس کی طویل مدت گزر جانے کے بعد ایک نقاب پوش ہستی اٹھتی ہے اور ادعا کے ساتھ کہتی ہے کہ یہ سب کچھ "مصلحت" کے ماتحت تھا! اللہ اللہ! اسلام پر اور داعی اسلام پر یہ کتنا نارو ا سوء ظن ہے!

حقیقت یہ ہے کہ اسلام کی تعلیمات پر اگر صرف قرآن و حدیث کی روشنی میں غور کیا جائے تو یہ ایک مسلمہ اور طے شدہ مسئلہ ہے کہ اسلام میں قربانی کی مذہبی حیثیت ہے اور وہ حج کا ایک اہم رکن ہے جس کو اگر مجبوری اور افلاس کی وجہ سے کوئی شخص نہ ادا کر سکے تو از روئے قرآن اس پر دس روز کے روزے واجب ہوتے ہیں مثلاً ارشاد ہوتا ہے:۔

واتموا الحج والعمرۃ للہ فان احصرتم فما استیسر من الھدی ولا تحلقوا رؤسکم حتی یبلغ الھدی محلہ فمن کان منکم مریضا او بہ اذی من راسہ ففدیۃ من صیام او صدقۃ او نسک، فاذا امنتم فمن تمتع بالعمرۃ الی الحج فما استیسر من الھدی فمن لم یجد فصیام ثلثۃ

اور حج و عمرہ کو اللہ تعالیٰ کے واسطے پورا پورا ادا کیا کرو، پھر اگر روک دیے جاؤ تو قربانی کا جانور جو کچھ میسر ہو اور اپنے سروں کو اس وقت تک مت منڈواؤ جب تک کہ قربانی اپنے موقع پر نہ پہنچ جائے۔ البتہ اگر کوئی تم میں سے بیمار ہو یا اس کے سر میں کچھ تکلیف ہو تو فدیہ دیدے روزے سے یا خیرات دینے سے یا ذبح کر دینے سے۔ پھر جب تم امن کی حالت میں ہو تو جو شخص

ایام فی الحج وسبعۃ اذا رجعتم تلک عشرۃ کاملۃ ذلک لمن لم یکن اہلہ حاضری المسجد الحرام واتقوا اللہ واعلموا ان اللہ شدید العقاب ٥

عمرہ سے اس کو حج کے ساتھ ملا کر متمتع ہوا ہو تو جو کچھ قربانی میسر ہو۔ پھر جس شخص کو قربانی کا جانور میسر نہ ہو تو تین دن کے روزے ہیں حج میں اور سات ہیں جبکہ حج سے تمہارے لوٹنے کا وقت آجائے، یہ پورے دس ہوئے۔ یہ اس شخص کے لئے ہے جس کے اہل مسجد حرام کے قرب میں نہ رہتے ہوں اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور جان لو کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ سزائے سخت دیتے ہیں۔

(ترجمہ از حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی)

آیات بالا سے قربانی کی دینی حیثیت اور مذہبی اہمیت کا اور زیادہ صحیح اندازہ ہو جانا چاہئے۔ ان آیات سے یہاں تک معلوم ہو جاتا ہے کہ اگر کوئی شخص قربانی نہ کرسکے تو اسے دس روز کے روزے رکھنا چاہئے، اگر کوئی شخص روک دیا جائے تو بھی قربانی کرے۔ حلق کی رسم اس وقت تک نہ ادا کرے جب تک قربانی کے جانور اپنے مقام پر نہ پہنچ لیں اور آخر میں ارشاد فرمایا ہے "اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور جان لو کہ اللہ تعالیٰ کی سزا بہت سخت ہوتی ہے"۔ ان صاف وصریح احکام واوامر کی موجودگی میں بھی اگر کوئی صاحب یہی کہتے رہیں کہ یہ سب کچھ "وقتی ضروریات" کے ماتحت تھا، تو سوائے خاموشی کے اور کیا جواب ممکن ہے؟

قرآن مجید کا جتنا زیادہ مطالعہ کیا جائے گا قربانی کی اہمیت وحیثیت روشن ہوتی جائے گی۔ ایک دوسرے مقام پر ارشاد ہوا ہے۔

جعل اللہ الکعبۃ البیت الحرام قیاماً للناس والشہر الحرام والھدی والقلائد، ذلک لتعلموا ان اللہ یعلم ما فی السمٰوٰت وما فی الارض و ان اللہ بکل شیٍٔ علیم ٥

خدا نے کعبہ کو جو کہ ادب کا مکان ہے لوگوں کے قائم رہنے کا سبب قرار دیا اور عزت والے مہینے کو بھی اور حرم میں قربانی ہونے والے جانور کو بھی اور ان جانوروں کو بھی جن کے گلے میں پٹے ہوں یہ اس لئے کہ تم اس بات کا یقین کرلو

کہ بے شک اللہ تعالیٰ تمام آسمانوں اور زمین کے اندر کی چیزوں کا علم رکھتے ہیں اور بے شک اللہ تعالیٰ سب چیزوں کو خوب جانتے ہیں۔

(ترجمہ از حکیم الامتہ مولینا اشرف علی صاحب تھانوی)

جس چیز کو اللہ تعالیٰ مغز فرما رہا ہو اسے نہ معلوم کس دلیل سے "خدا کا تصور قائم کرنے والا" "اعتقاد باطل" کہا جا سکتا ہے۔

ایک اور موقع پر وارد ہوا ہے:۔

ذلک ومن یعظم شعائر اللہ فانہا من تقوی القلوب ٥ لکم فیہا منافع الی اجل مسمی ثم محلہا الی البیت العتیق ٥

یہ بات بھی ہو چکی اور جو شخص دین خداوندی کے ان یادگاروں کا پورا پورا لحاظ رکھے گا تو ان کا یہ لحاظ رکھنا دل کے ساتھ ڈرنے سے ہوتا ہے، تم کو ان سے ایک معین وقت تک فوائد حاصل کرنا جائز ہے پھر ان کے ذبح حلال ہونے کا موقع بیت عتیق کے قریب ہے۔ (ترجمہ از حکیم الامتہ)

اس جگہ یہ فرق بھی پیش نظر رہنا چاہیے کہ اسلام کی قربانی اور دوسری قربانیوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ مشرکین کی قربانیوں کا مقصد ہوتا ہے مختلف قوتوں کے دیوتاؤں کی خوشنودی حاصل کرنا۔ علاوہ ازیں ان کی قربانی زیادہ تر انفرادی حیثیت رکھتی ہے اور پھر یہ بھی ہے کہ ان کی قربانی کا کوئی مصرف نہیں ہوتا جو اجتماعی طور سے برتا جا سکے! برعکس اس کے اسلام کی قربانی ایک جداگانہ اور ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ اس کی حیثیت اجتماعی ہے، اس کا مصرف بھی مقرر و متعین ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ رضائے الٰہی کی تمنا کے ساتھ ہی ساتھ یہ جذبہ بھی کارفرما ہوتا ہے کہ اجتماعی طور سے بہت سے مفلس اور قلاش لوگوں کا بھلا ہو جاتا ہے!

اسلام کی قربانی کے متعلق یہ خیال قائم کرنا کہ اس سے کسی زمانے میں بھی "خدا کے تصور میں مدد ملتی تھی" یقیناً ایک بہت بڑی غلط فہمی ہے۔ اسلام کی سب سے اہم اور سب سے پہلی

دعوت توحید ہے جو بغیر کسی قسم کی آلائش اور ابہام کے اسلام کا اصل اصول رہا ہے۔ جہاں کہیں بھی قربانی پر زور دیا گیا ہے، وہاں کہیں یہ نہیں بتایا ہے کہ اس سے خدا کے تصور میں مدد ملتی ہے بلکہ ہمیشہ توحید پر ساری قوت صرف کی گئی ہے، شرک اور بت پرستی کی قسم کے جذبات کو بیخ و بن سے اکھاڑنا ہی اسلام کا اصل کام ہے۔ قرآن و حدیث میں جا بجا نہایت کثرت سے اس دعوے کے شواہد مل سکتے ہیں۔

ایک اور موقع پر قرآن مجید میں وارد ہوا ہے۔

واذ بوانا لابراہیم مکان البیت ان لا تشرک بی شیئاً وطہر بیتی للطائفین والقائمین ورکع السجود ۝ واذن فی الناس بالحج یاتوک رجالاً وعلی کل ضامر یاتین من کل فج عمیق ۝ لیشہدو منافع لہم و یذکروا اسم الدفی ایام معلومات علی ما رزقہم من بہیمۃ الانعام فکلوا منہا واطعموا البائس الفقیر ثم لیقضو تفثہم و الیوفو نذورہم ولیطوفوا بالبیت العتیق ۝

اور جبکہ ہم نے ابراہیم کو خانۂ کعبہ کی جگہ بتلادی کہ میرے ساتھ کسی کو شریک مت کرنا اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں کے اور قیام و رکوع و سجود کرنے والوں کے واسطے پاک رکھنا! اور لوگوں میں حج کا اعلان کر دو لوگ تمہارے پاس چلے آئیں گے پیادہ بھی اور دبلی اونٹنیوں پر بھی جو کہ دور دراز راستوں سے پہنچی ہوں گی تاکہ اپنے فوائد کے لئے آموجود ہوں اور تاکہ ایام مقررہ میں ان مخصوص چوپایوں پر اللہ کا نام لیں جو خدائے تعالیٰ نے ان کو عطا کئے ہیں۔ سو ان جانوروں میں سے تم بھی کھایا کرو اور مصیبت زدہ محتاجوں کو بھی کھلایا کرو۔ پھر لوگوں کو چاہئے کہ اپنا میل کچیل دور کریں اور اپنے واجبات کو پورا کریں اور اس مامون گھر کا طواف کریں۔ (ترجمہ از حکیم الامت)

صفحات بالا میں قرآن مجید کی جو آیات پیش کی گئیں ان سے میرے خیال میں قربانی کی مذہبی حیثیت اچھی طرح آشکارا ہو گئی۔ حدیث سے کچھ میں نے عمداً پیش کرنے کی جرأت نہیں کی اس لئے کہ یہ معلوم نہ تھا کہ مضمون نگار صاحب حدیث کی دینی حیثیت کے قائل ہیں یا نہیں۔

منقولی حیثیت کا جہاں تک تعلق تھا اس مسئلے پر سیر حاصل بحث و گفتگو ہو چکی ہے چنانچہ

میں ایک اور آیت پیش کر کے اس اعتبار سے گفتگو ختم کرتا ہوں اور وہ یہ ہے:۔

انا اعطینٰک الکوثر، فصل لربک وانحر۔ اللہ تعالیٰ سرکار رسالت سے ارشاد فرماتا ہے کہ ہم نے تمہیں "کوثر" عطا کیا ہے (لہذا بطور اظہار عبودیت و سپاس) تم نماز پڑھو اور قربانی کرو۔ اگر قربانی کوئی مذہبی چیز نہیں تھی اور رضائے الٰہی حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں تھی تو دنیا کی سب سے زیادہ پاک اور پاکباز، معصوم اور مطہر ہستی کو قربانی کی ترغیب کیوں دی گئی۔

شاید نامناسب نہ ہو اگر اس مسئلے پر "عقل و دانش" کی روشنی میں بھی کچھ غور کر لیا جائے۔

فلسفۂ رسوم پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ رسوم کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ رسم میں کوئی مذہبی شان نہ ہو محض نام و نمود، شور و ہنگامہ اور اصراف و نمائش مقصود ہو۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اس سے کچھ فوائد مترتب ہوتے ہوں، زندگی پر کچھ اثرات پڑتے ہوں، عبرت و بصیرت کا درس حاصل ہوتا ہو۔ مذہبی رسوم کا جہاں تک تعلق ہے وہ اسی دوسری قسم میں داخل ہیں۔

مثلاً قربانی کے فلسفے پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ یہ صرف ایک رسم کی بجا آوری ہی نہیں ہے بلکہ اس رسم کہن سے ماضی اور حال میں ارتباط پیدا ہوتا ہے۔ تاریخ میں جو کچھ پڑھا، روایات سے جو کچھ معلوم کیا، مذہبی ارشادات نے جن چیزوں کی طرف راہ نمائی کی، اس رسم کے انجام دینے سے وہ تمام چیزیں تازہ ہو گئیں، معلوم ہو گیا کہ ذبح عظیم کا معاملہ پیش آیا تھا، خدا کی راہ میں ایک محبوب بندے نے اپنے لخت جگر کو بھینٹ چڑھا دیا تھا۔ پس ہر اس شخص پر جو دین حنیف اور ملت ابراہیمی کا ایک فرد ہے واجب ہے کہ اسی روح، اسی جذبے اور اسی احساس کے ماتحت اگر جان کی قربانی نہیں کر سکتا تو کم از کم مال کی "قربانی" سے تو دریغ نہ کرے کہ اس سے زیادہ پست درجہ قربانی اور کیا ہو سکتی ہے؟

قربانی کے متعلق ایک صحابی نے آنحضرتؐ سے استفسار کیا کہ یہ کیا ہے۔ ارشاد ہوا "سنۃ ابیکم ابراہیم" یعنی تمہارے جد امجد حضرت ابراہیمؑ کی سنت۔

بلاشبہ یہ تقاضائے عقل و دانش ہے کہ اس مبارک رسم کو جاری رکھا جائے اور اسی

طرح جاری رکھا جائے جس طرح ہوتی چلی آئی ہے۔

ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام کا وہ غیر فانی کارنامہ جس کی یادگار میں قربانی کی رسم پڑی ہے کس کو نہیں معلوم؟

مشیت نے اپنے دو محبوب بندوں کو امتحان و آزمائش کے لئے منتخب کیا! ایک کہن سال، مرد بزرگ تھا اور دوسرا جواں عمر و جواں سال طفل ہوشمند! باپ کو حکم ملا کہ بیٹے کے گلے پر چھری پھیر دے! قدسیوں میں تہلکہ پڑ گیا کہ یہ کیا ہونے والا ہے مگر مشیت کردگار مسکرائی کہ

انی اعلم مالا تعلمون ۝

آزمائش کی گھڑی آن پہنچی۔ چشم فلک نے دیکھا کہ بوڑھا باپ میدان میں اتر آیا، اس کی آستینیں چڑھی ہوئی تھیں، ہاتھ میں کھنچی ہوئی چھری تھی، دل میں جذبات محبت کا طوفان موجزن تھا، پر آنکھیں عزم آہنی کی آئینہ دار تھیں۔ وہ بڑھا اس حال میں کہ نہ اس کے پیروں میں لغزش تھی اور نہ ہاتھوں میں رعشہ ـــــ آج ایک سر کٹنے کے لئے مضطرب تھا اور ایک خنجر حلقوم سے پار اترنے کے لئے بیتاب ـــــ بالآخر ابراہیمؑ نے اسمٰعیلؑ کی گردن پر چھری رکھدی۔ ربوبیت کاملہ کو اپنے بندوں کی یہ ادا پسند آئی، چشم زدن میں معلوم ہوا کہ "قربانی" مقبول ہوئی۔ خود مشیت نے نہ چاہا کہ اسمٰعیلؑ کی جان ضائع ہو، دیکھا تو چھری کے نیچے ایک جانور پھڑک رہا تھا۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوا:۔

وفدیناہ بذبح عظیم وترکنا علیہ فی الآخرین سلام علی ابراہیم۔ کذلک نجزی المحسنین ۝ انہ من عبادنا المؤمنین ۝

اور ہم نے ایک بڑا ذبیحہ ان کے عوض میں دیا اور ہم نے پیچھے آنے والوں میں یہ بات ان کے سلئے رہنے دی، ابراہیم پر سلام ہو، ہم مخلصین کو ایسا ہی صلہ دیا کرتے ہیں بیشک وہ ہمارے ایماندار بندوں میں سے تھے۔ (ترجمہ از حکیم الامت)

یہ تھا وہ واقعہ جس کی یادگار میں قربانی اب تک اپنی اصل شکل و صورت میں موجود ہے اور جب تک یہ قربانی قائم ہے وہ روح بھی قائم ہے جس کی یادگار میں سب کچھ کیا جاتا ہے۔

اسلام کی اس خصوصیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اس کے ہاں اول تو محض رسوم بہت کم ہیں اور اگر کچھ ہیں بھی تو وہ اس قدر زیادہ فطرت شناسی پر مبنی ہیں کہ ان کے اعتراف کے سوا کوئی چارۂ کار ہی نہیں۔

اسی قربانی کے مسئلے کو لے لیجیے۔ قطع نظر اس کے کہ یہ رسم ماضی اور حال میں ارتباط پیدا کرتی ہے، اس کی یہ خصوصیت کیا کم قابل توجہ ہے کہ اس رسم کی بجا آوری کے ساتھ وہ تمام جذبات تازہ ہو جاتے ہیں جو سرفروشی و جاں نثاری کے لئے ضروری ہیں۔ قربانی کے معنی ہی یہ ہیں کہ آج اگرچہ دنبہ کی، بکری کی، گائے کی یا اونٹ کی قربانی کی جاتی ہے لیکن حقیقۃً اس جذبے کے ماتحت کہ قربانی کرنے والا خود اس کے لئے تیار ہے کہ اگر رضائے الٰہی کا سوال درپیش ہو" من انصاری الی اللہ" کی صدا بلند ہو اور دین حق کو انسانی خون کی ضرورت ہو تو یہی چھری جو آج اس جانور پر چل رہی ہے خود اپنے حلقوم پر بھی چلے گی اور چلنا چاہیئے۔ یہی جذبہ تھا جس نے کئی سو برس بعد سبط رسول اور جگر گوشۂ بتول، امام مظلومؑ کو رضائے حق کے لئے جان کی بازی لگانے پر مجبور کر دیا!

اسی طرح اس رسم کی یہ خصوصیت بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ اس طرح ایک خاص موقع پر چند روپے صرف کر دینے کے بعد خدا کے راستے میں مال و زر قربان کرنے کا جذبہ بھی نہ صرف یہ کہ پیدا ہوتا رہتا ہے بلکہ تازہ بھی ہوتا رہتا ہے۔ ان مصالح کی بنا پر قربانی کی رسم کو غیر ضروری قرار دینا یا اس کی موجودہ صورت کو دوسری اصطلاحی صورتوں میں مدغم کر دینا ایک بہت بڑا ظلم ہے جس کی تلافی آسان نہیں۔

مضمون کے آخر میں صاحب مضمون نے ارشاد فرمایا ہے:۔

"اگر اس زمانے میں ہندوستان کے مسلمان قربانی کی رسم جاری رکھنا چاہتے ہیں تو ان کو عید اضحیٰ اور حج کے موقعے پر موجودہ اسلامی انجمنوں کو روپیہ بھیجنا چاہیئے"

تجویز کے معقول ہونے میں کوئی شبہ نہیں لیکن دینی معاملات کو اس قسم کی تجاویز پر "قربان" کر دینا درحقیقت بہت بڑی غلطی ہے۔ کل ایک صاحب یہ تجویز پیش کر سکتے ہیں کہ سیکڑوں ہزاروں

روپیہ صرف کرکے لوگ خواہ مخواہ حجاز جاتے ہیں جس سے کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچتا، بہتر ہو کہ لوگ اپنے کرائے وغیرہ کا تخمینہ کرکے کسی اسلامی انجمن کو وہ رقم دیدیا کریں۔ محترم مقالہ نگار صاحب خود فرمائیں کہ اگر اس قسم کی تجاویز پیش ہونے لگیں تو مذہبی اوامر و احکام اور رسوم و ہدایات رفتہ رفتہ کس قدر جلد ختم ہوجائیں؟

اسی لئے مذہب میں کسی قسم کی "بدعت" کو "ضلالت" سے تعبیر کیا گیا ہے اور "ضلالت" کے متعلق ارشاد ہوا ہے اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔

مسلمانوں میں قربانی جیسی صحیح مذہبی رسم کے علاوہ اور بہت سی غیر شرعی اور مسرفانہ رسوم ہمسایہ اقوام سے اختلاط کی وجہ سے جاری ہوگئی ہیں۔ انھیں دور کرنے میں اگر جد و جہد کی جائے تو وہ عنداللہ اور عندالناس ہر طرح مشکور ہو۔

آخر میں یہ گزارش شاید بار خاطر نہ ہو کہ نہ صرف "صدائے حق" صاحب کو بلکہ تمام حضرات کو اس قسم کے مسائل پر اظہار خیال سے پیشتر اس پر غور کرلینا چاہئے کہ آیا ان کے سامنے سارا مواد اور تمام ماخذ ہیں یا نہیں؟ بغیر اس قسم کی تیاری کے قلم اٹھانا اپنی جرأت کا ناروا اور افسوسناک مظاہرہ ہے۔

اس مضمون کے بعض اور پہلو بھی اس قابل تھے کہ ان پر گفتگو کی جاتی لیکن شاید وہ علمی گفتگو نہ رہتی بلکہ ادبی ہوجاتی اس لئے انھیں نظر انداز کردیا گیا۔

جہنم میں

جوزف نے اپنی جوانی کا بڑا حصہ ایک چھوٹے سے قصبے میں گزار دیا تھا۔ اس کے پاس ہر ایک ایسی چیز تھی جس سے وہ خوش رہ سکے۔ تمام لوگوں میں اس کی عزت تھی۔ اپنے اور پرائے اس کی نیکی اور حسن اخلاق کی وجہ سے اسے دل سے چاہتے تھے۔ ہر ایک کہتا تھا کہ جوزف بڑا خوش قسمت انسان ہے۔

لیکن خود جوزف کا خیال تھا کہ اس میں کسی چیز کی کمی ہے۔ اور اس کی مسرت اصلی نہیں۔ ایک بوجھ وہ اپنے اوپر محسوس کرتا تھا۔ ایک خلش سی اس کے دل میں تھی لیکن یہ تھا کیوں؟ اس کی اسے خبر نہیں تھی۔ وہ اپنی موجودہ زندگی سے متنفر تھا اور کسی نئی زندگی کا آرزومند۔ لیکن یہ نئی زندگی کیسی ہو اسے معلوم نہیں تھا۔

ایک دن شام کے وقت بغیر کسی مقصد کے وہ قصبے سے باہر نکل گیا۔ چلتے چلتے بندرگاہ تک جا پہنچا جو قصبے کے نزدیک ہی تھا اور وہاں کھڑا ہو گیا۔

پانی ساحل سے ٹکرا رہا تھا اور سرد ہوا چل رہی تھی۔ ہر طرف کئی جہاز خاموش کھڑے تھے لیکن ان میں ایک بڑا جہاز روشنی سے جگمگا رہا تھا۔

یکایک جوزف نے اپنے دل میں کہا "کیا یہ ممکن نہیں کہ میں جہاز پر کسی دوسرے ملک میں پہنچ جاؤں؟"

وہ کھڑا نیلے پانی اور جہازوں کو دیکھتا رہا "کیا یہ ممکن نہیں کہ میں جہاز پر کسی دوسرے ملک میں پہنچ جاؤں؟" اس نے یہ الفاظ دہرائے۔ قریب ہی دو آدمی کھڑے تھے۔ انھوں نے شاید اس کے دل کی کیفیت کا اندازہ لگا لیا تھا۔ وہ اس کے پاس آئے۔ ان میں سے ایک کا رنگ سفید تھا اور دوسرے کا سیاہ۔

اس سفید آدمی نے کہا "جناب! یہ دنیا مجموعہ ہے سمتوں اور فاصلوں کا۔ بیوی، بچے

رشتہ دار، مکان آدمی کے لئے مصیبت ہیں، زندگی وطن میں رہ کر خراب ہوجاتی ہے لیکن دوسرے ممالک میں نہ بچوں کی فکر ہوتی ہے نہ بیوی کی، ان ملکوں میں آدمی کے لئے ہر ایک راستہ کھلا ہے، جس طرف وہ چاہے جاسکتا ہے۔ اسے روکنے والا کوئی نہیں۔ اس لئے اگر آپ میری بات مانیں تو اس قید خانے سے رہائی حاصل کیجئے۔ آپ کو یہاں سے نکل کر پتہ چلے گا کہ مختلف سمتوں اور فاصلوں کے پیدا کرنے کا کیا مقصد ہے۔"

اس حبشی نے کہا " اور حضرت ہرمت کے اس سرے پر خوبصورت ملک اور لوگ ہیں بعض ممالک میں تو آپ کو ایسی اچھی چیزیں ملیں گی کہ آپ سب کچھ بھول جائیں گے اور جزائر میں تو اس سے بھی اچھی چیزیں ہیں۔ غرض ان کی کوئی انتہا ہی نہیں۔"

جوزف خاموش کھڑا سنتا رہا۔ اس نے منہ سے کچھ نہیں کہا۔

حبشی نے پھر کہنا شروع کیا " اس کے علاوہ بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ دوسرے ملکوں میں جاکر آدمی دولتمند ہو جاتا ہے۔ زندگی کی ہر چیز سے لطف اندوز ہوسکتا ہے۔ دنیا میں ایسے خطے بھی ہیں جہاں انسانوں اور جانوروں کا نام تک نہیں۔ وہاں ہر طرف آزادی ہی آزادی ہے۔ لیکن اصلی اور حقیقی آزادی ایک جگہ رہنے سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ تمام دنیا میں چکر لگانے سے۔"

اس پوری گفتگو کے دوران میں ان دونوں آدمیوں کی آنکھیں جہاز پر لگی تھیں جس کے چلنے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ اتنے میں گھنٹی کی آواز آئی اور دونوں یہ کہتے ہوئے ایک چھوٹی سی کشتی میں بیٹھ گئے، " اچھا پھر ملیں گے۔"

جوزف نے پوچھا " تم کہاں جا رہے ہو؟"

" جہنم میں۔"

" فرض کرو میں بھی تمہارے ساتھ چلوں" یہ کہہ کر وہ بھی کشتی میں بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر میں یہ سب جہاز پر پہنچ گئے، اور وہ روانہ ہوگیا۔

اس وقت سے جوزف نے ملاحوں کا پیشہ اختیار کرلیا۔

جہاز کئی ملکوں سے ہوتا ہوا پھر اسی بندرگاہ میں واپس آ گیا لیکن جوزف کو اب ایک جگہ چین نہیں تھا۔ اس نے دوسرا جہاز لیا اور پھر روانہ ہو گیا۔ مہینے اور سال گزرتے گئے لیکن وہ اپنے وطن واپس نہیں آیا۔ کئی جہاز جن پر وہ تھا تباہ ہو گئے لیکن وہ ہمیشہ بچ بچ گیا۔ اس کے کئی ساتھی مر گئے لیکن وہ سخت جان تھا کئی مرتبہ بیماریوں کا شکار ہوا لیکن ہر بار صحیح وسلامت رہا۔ اسے ایسے زخم آئے کہ اس کے بچنے کی کوئی امید نہ تھی لیکن یہ زخم بھی مندمل ہو گئے۔ ان تمام باتوں کے باوجود جوزف نے کسی ایک جگہ اقامت اختیار نہیں کی بلکہ دنیا بھر میں مارا مارا پھرتا رہا لیکن جس چیز کی اسے تمنا تھی وہ نہ ملی۔ آخر کار وہ بوڑھا ہو گیا اور تمام قویٰ نے جواب دیدیا۔ ایک دن وہ ایسا بیمار پڑا کہ مرنے کے لئے سڑک پر لیٹ گیا لیکن اس کی قسمت میں یہ نہیں تھا کہ وہ کتوں کی موت مرے ایک آدمی ادھر سے گزر رہا تھا۔ اس نے اس کو ہسپتال میں پہنچا دیا۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو ایک شخص اس کے پاس آیا اور کہنے لگا "جناب آپ سخت بیمار ہیں اور خدا جانے دم بھر میں کیا ہو جائے۔ جو لوگ بالکل تندرست ہیں ان کی زندگی کا بھی کچھ اعتبار نہیں اس لئے آپ کو چاہیئے کہ آپ اپنے تمام گناہوں سے توبہ کر لیں۔"

جوزف نے لاپرواہی سے جواب دیا "بہت بہتر!"

یہ سن کر وہ شخص بھاگ کر کمرے سے باہر گیا اور تھوڑی دیر کے بعد ایک پادری کو بلا لایا۔

پادری جوزف کے پاس آیا اور نرمی سے کہا "پیارے بیٹے میں نے سنا ہے کہ تمہارا آخری وقت قریب ہے اور تم اپنے گناہوں کا اعتراف خدا کے سامنے کرنے کو طیار ہو؟" یہ کہہ کر اس نے فلسفۂ اعتراف پر ایک زبردست تقریر کی یہاں تک کہ جوزف نے ارادہ کر لیا کہ وہ اپنا دل اس کے سامنے کھول کر رکھ دے گا۔"

پادری نے کہا "اپنے تمام اعمال کو ایک ایک کر کے بیان کرنا۔ کیا تم اس بیماری کی وجہ سے اہم باتوں کو بھول تو نہ جاؤ گے؟"

"جی نہیں" جوزف نے جواب دیا "میں اس وقت اپنی زندگی کو زیادہ صاف اور مکمل

دیکھ رہا ہوں لیکن میں کس ترتیب سے اعتراف شروع کروں، اوقات، مقامات یا اعمال کے لحاظ سے۔"

"جس طرح تمہیں آسانی ہو" پادری نے کہا "لیکن میں اعمال کو اور باتوں پر ترجیح دیتا ہوں۔ میں دیکھتا ہوں کہ تم ایک عقلمند انسان ہو۔ اس آدمی کی خوش قسمتی کا کیا ٹھکانا جو اپنے گناہوں کا اعتراف کر کے خوش خوش دوسری دنیا میں جائے۔"

"میری زندگی" جوزف نے کہنا شروع کیا "محنت اور مشقت میں بسر ہوئی ہے۔ اس لئے میں آرام اور ابدی نیند چاہتا ہوں۔ میں قبر سے نہیں ڈرتا کیونکہ یہی میرے لئے چین کی جگہ ہو گی۔ لیکن افسوس اب میں کبھی ان دلفریب جزائر میں قیام نہیں کر سکتا اور نہ وہ دلکش بولی سن سکتا ہوں جس سے انسان پر ایک بیخودی طاری ہو جاتی ہے۔ اب وقت ہے آرام کرنے کا لیکن جتنی چیزیں میں نے دیکھی ہیں ان میں سے کسی کو نہیں بھول سکتا۔"

جوزف جوش میں آ کر بیٹھ گیا اور پھر کہنا شروع کیا "میری زندگی ایسے نادر تجربات اور عجیب واقعات سے بھری پڑی ہے کہ میں نہیں سمجھ سکتا کہاں سے شروع کروں۔ میری زندگی کا ایک لمحہ بھی ایسا نہیں گزرا جو اپنے اندر کوئی نہ کوئی اہمیت نہ رکھتا ہو۔ میں کس طرح اس حسن اور خوبصورتی کو بیان کر سکتا ہوں جسے میری آنکھوں نے دیکھا اور میرے دل نے محسوس کیا ہے۔ جب آدمی مرنے کے قریب ہوتا ہے تو اس وقت اس کی ساری زندگی اس کے سامنے آجاتی ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ میری زندگی میں ایک بھی ایسی چیز نہیں جو اہم اور قابل ذکر نہ ہو۔ یہ بھی ایک بڑا اہم واقعہ ہے کہ میں نے اپنا وطن اور گھر بار بالکل چھوڑ دیا تھا۔ اس طرح اس کی اہمیت میں بھی شک نہیں کہ میں کبھی گھر واپس نہیں لوٹا اور دنیا میں گھومتا رہا۔ میں کس طرح بیان کروں کہ میں نے کیا کیا۔ میں دنیا کے ہر جزیرے، ہر براعظم اور ہر حصے کو جانتا ہوں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ ان میں کس قسم کے لوگ بستے ہیں۔ اگر اس وقت میں اپنی آنکھیں بند کر لوں تو ہر ایک چیز میرے سامنے آجائے جو میں نے دیکھی ہے اور جس کا آپ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ میں ہر ایک ملک کی عورتوں کے خصائل، عادات اور لباس سے اچھی طرح واقف ہوں۔ میں ہر قسم کے مرض میں مبتلا ہوا ہوں اور میں بتا سکتا ہوں کہ فلاں ملک میں

کس قسم کی بیماری ہوتی ہے اور اس کا علاج کیا ہے۔ میں کئی مرتبہ قید ہوا ہوں اور جان پر کھیل کر رہائی حاصل کی ہے۔"

"ملاح میں یہ نہیں پوچھتا کہ تم کیا تھے اور تم نے کیا دیکھا ہے بلکہ میں یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ تم نے کیسے اعمال کئے، اچھے یا برے؟"

"میرے اعمال" جوزف نے کہا "مختلف ملکوں کے لحاظ سے مختلف تھے لیکن مجھے یقین ہے کہ میں نے ہر ایک وہ کام کیا ہے جس کا مجھے موقع ملا۔ کبھی میں اتنا امیر تھا کہ میری دولت کے سامنے قارون کے خزانے کی کوئی حقیقت نہیں تھی۔ کبھی میں اتنا غریب ہوا کہ میرے پاس ایسی چیز بھی نہیں تھی کہ سانپ کو مار سکوں یا بندر کو دھمکا سکوں۔ ایک دن ایسا تھا کہ میں غلاموں کو خوب پیٹتا تھا اور لوگ میرے سامنے جھکتے تھے لیکن کئی سال تک میں نے دوسروں کی بھی خدمت کی ہے اور گدھوں کی طرح اپنی پیٹھ پر سامان لادا ہے۔"

"یہ سب کچھ بہت دلچسپ ہے لیکن تمہیں چاہئے کہ خدا کے سامنے اپنے گناہوں کا اعتراف کرو۔ کیا تم نے کبھی قتل یا چوری نہیں کی ہے۔ کیا کبھی ڈاکہ نہیں ڈالا ہے۔ کسی بداخلاقی میں مبتلا نہیں ہوئے ہو۔ کسی پر زبردستی نہیں کی ہے۔ کیا تم نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ کسی پر بے رحمی نہیں کی۔ کیا تمہارا ایمان کبھی متزلزل نہیں ہوا؟"

"بے شک میں نے اس قسم کے کام کئے ہیں۔ اگر یہ سب چیزیں بہت اہم ہیں اور آپ پوچھنے پر مصر ہیں تو میں بتاتا ہوں کہ میں نے اپنی حفاظت کے لئے دوسروں کو مارا ہے اور بغیر کسی وجہ کے بھی۔ اگر آپ بداخلاقی کے متعلق دریافت کرتے ہیں تو میں آپ کو وہ تمام واقعات بتا سکتا ہوں جو مجھے مختلف عورتوں اور لڑکیوں کے ساتھ پیش آئے جن کو سن کر آپ سخت متعجب ہوں گے لیکن اس وقت میرے نزدیک یہ باتیں اہم نہیں۔ میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ کس طرح میں نے اتنے دور دراز اور دشوار گزار راستوں کو طے کیا اور کس طرح عمیق سمندروں کو عبور کیا جو اژدہوں کی طرح منہ کھولے ہوئے آدمی کو نگلنے کے لئے تیار ہیں۔"

پادری نے ایک آہ بھر کر کہا "بہتر یہ ہے کہ تم اپنے گناہوں کا اعتراف کر لو اور فضول وقت نہ ضائع کرو۔"

جوزف نے جواب دیا "لیکن جو کچھ میں نے کیا ہے ٹھیک سمجھ کر کیا ہے اور مجھے اپنے کسی عمل یا گناہ سے شرمسار ہونے کی ضرورت نہیں۔ میری زندگی ایک خاص مقصد کے لئے تھی۔ اس میں جو برائی یا بھلائی ہے اسے میں نہیں جانتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بہت ضروری تھا کہ میں دنیا کے ہر حصے میں گھوموں، نئے نئے ملک اور سمندر دیکھوں۔ کیا آپ کے نزدیک یہ ضروری نہیں تھا کہ میں سیکڑوں اچھے اچھے مقامات کی سیر کروں اور نئے نئے جزیروں اور سمندروں کا انکشاف کروں۔"

پادری نے غصے میں اور بلند آواز سے کہا "خدا کے عذاب سے ڈرو۔"

مگر جوزف خاموش نہیں ہوا "میں خدا کے ہر فیصلے کے سامنے سر تسلیم خم کرتا ہوں۔ میں اپنی زندگی کو اس لحاظ سے نہیں دیکھتا کہ میں نے کتنی برائیاں کی ہیں اور کتنی نیکیاں بلکہ اس لحاظ سے جانچتا ہوں کہ میں نے کتنے ہزار میل کے فاصلے طے کئے ہیں اور کتنے ملکوں کو دیکھا ہے لیکن افسوس کہ اب شکستہ ناؤ کی طرح یہاں پڑا ہوں اور کہیں نہیں جا سکتا۔"

پادری چلا اٹھا "لعنت ہے تم پر، میں نے آخری وقت میں کسی شخص کو اس قدر ضد کرتے کبھی نہیں دیکھا۔" یہ کہہ کر چلا گیا۔

جوزف نے بھی زور سے کہا "جاتے ہو تو چلے جاؤ۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم مجھ سے کیا چاہتے ہو۔"

جوزف بہت کمزور ہو گیا تھا اس لئے وہ سو گیا۔ اس نے خواب میں دیکھا کہ وہ ایک شہر میں چلا جا رہا ہے (کس شہر میں اور کہاں یہ نہیں معلوم) یہاں تک کہ وہ ایک بندرگاہ کے کنارے جا پہنچا۔ نیلا پانی آہستہ آہستہ ساحل سے ٹکرا رہا تھا۔ وہاں کئی جہاز کھڑے تھے لیکن ایک بڑا جہاز تھا جس پر خوب روشنی ہو رہی تھی۔ دو آدمی اس کے قریب کھڑے تھے۔ باوجود کوشش کے جوزف ان کو نہیں پہچان سکا اور نہ ان کی گفتگو کا ایک حرف بھی سمجھا حالانکہ وہ اس کی مادری زبان میں گفتگو

کر رہے تھے۔ اتنے میں جہاز سے گھنٹی کی آواز آئی اور وہ دونوں ایک کشتی پر جا بیٹھے۔ جوزف نے ان سے پوچھا "تم کہاں جا رہے ہو؟" ان میں سے ایک آدمی نے جواب دیا "جہنم میں" یہ الفاظ وہ سمجھ گیا۔ "فرض کرو میں بھی تمہارے ساتھ چلوں" یہ کہہ کر جوزف بھی ان کے ساتھ کشتی پر بیٹھ گیا۔ کشتی جہاز کے قریب آگئی۔ پانی اور تاریکی میں امتیاز باقی نہ رہا۔ یہاں تک کہ خود جوزف بھی عالم واقعی سے نکل کر خیالی دنیا میں گم ہو گیا۔

تھوڑی دیر میں ڈاکٹر نے آکر دیکھا تو اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔

غزل

سرمست شراب شوق ہے دل — یا خود ہمہ تن ہے جام مے دل
بجھتی ہی نہیں پیاس اس کی — اتنا بھی نہ ہو خراب مے دل
حسن رخ یار سے عیاں ہے — سب تیرا جمال شوق لے دل
جس کو نہ تری طلب ہو پیارے — ایسا بھی جہاں میں کوئی ہے دل
کیا ایسی پڑی ہے اس پہ افتاد — بیزار جو زندگی سے ہے دل
کس کے غم ہجر میں شب و روز — سرگشتہ و بیقرار ہے دل
کس ساقی ماہ وش سے چھٹ کر — ہے جبت میں مثل موج مے دل
کس مطرب خوش نوا کے غم میں — فریاد کناں ہے مثل نے دل
اک حال پہ مثل طبع جاناں — تجھ کو بھی نہیں قرار اے دل
اب وصل میں ہجر کی ہوس ہے — ہے تو بھی غرض عجیب شے دل

ہے تیرے سوا علیل کا کون
لے یار وفا شعار اے دل!

غزل

(از مصور جذبات حضرت ثاقب لکھنوی)

رہیں خود فراموشی گلوں کو یاد کیا کرتے — اب اس سے بڑھ کے پاس خانۂ صیاد کیا کرتے

تصور عیش کا کرتے ہیں تو غم اور بڑھتا ہے — جو یاد آنے سے بھولا ہو اسے ہم یاد کیا کرتے

دل شوریدہ ہو یا دامن گور غریباں ہو — یہ ویرانے ہیں برسوں کے انھیں آباد کیا کرتے

لہو دل ہو گیا اپنے ہی نالوں سے شب غم میں — کوئی بتلائے اب فریاد کی فریاد کیا کرتے

اسیری راستا دیتی نہیں دل کو تصور کا — قفس والے خیال خاطر آزاد کیا کرتے

زمانہ ہو تو جاتا دست کش آخر تو کیا کرتا — جو زیر خاک ہیں ظالم انھیں برباد کیا کرتے

ترس کو بھی جگہ دیتی نہیں غم دوستی میری — جو ناشادی پہ مرتا ہو اسے وہ شاد کیا کرتے

خوش و ناخوش بسر کی عمر طوفان حوادث میں — مخالف تھی ہوائے عالم ایجاد کیا کرتے

رسائی کب تھی ان کی بزم میں اچھا جو ہوتی بھی — تو ہم کیا ان سے کہتے اور وہ ارشاد کیا کرتے

نیاز و ناز تھے دونوں طرف حد ترقی پر — ہم ان کو بھولتے کیوں کر وہ ہم کو یاد کیا کرتے

ستم احباب کے آئینۂ اخلاص تھے ثاقب
مقام شکر تھا ہم شکوۂ بیداد کیا کرتے

تنقید و تبصرہ

مجموعۂ نغز | تقطیع ۲۰×۳۰ صفحات ۹۰۶ ۔ علاوہ سرورق ۔ مرتبہ حافظ محمود خاں صاحب شیرانی لیکچرر پنجاب یونیورسٹی لاہور ۔ لکھائی چھپائی دیدہ زیب ۔ قیمت درج نہیں ۔

یہ کتاب جناب مرتب نے لاہور سے غازی آباد تشریف لاکر خاکسار کو ہدیۃً عنایت فرمائی تھی انھوں نے مجھ سے تنقید کی خواہش ظاہر نہیں کی تھی لیکن بغوائے گر تو ستانی بہ ستم می رسد ۔ میں ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب کی فرمائش سے اپنی ناچیز رائے حافظ صاحب اور قارئین جامعہ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں ۔ (محمد یحییٰ تنہا)

یہ تذکرہ حکیم ابوالقاسم میر قدرت اللہ متخلص بہ قاسم کی یادگار تالیف ہے ۔ اس کی اشاعت سے بعض امور جو اب تک پردۂ خفا میں تھے ظاہر ہوگئے ۔ اور جہاں یہ ثابت ہوگیا کہ مولوی محمد حسین آزاد کا تذکرہ آب حیات زیادہ تر حکیم صاحب کے تذکرہ "مجموعہ نغز" کا مرہون منت ہے ، وہاں ان نکتہ چینیوں کی بھی قلعی کھل گئی جو آزاد کی غلطیوں کے اظہار کو اپنا خاص فن بنائے ہوئے تھے ۔ مثلاً ولی کے متعلق آزاد کے اس بیان کو بے اصل بتایا گیا تھا ۔

"ولی کہ بنی نوع شعرا کا آدم ہے ۔ اس کے حق میں (میر) فرماتے ہیں ۔" ولی شاعریست از شیطان مشہور تر ۔ میر خاں کمترین اسی زمانے میں ایک قدیمی شاعر دلی کے تھے ۔ انھیں اس فقرے پر بڑا غصہ آیا ۔ ایک نظم میں اول بہت کچھ کہا ۔ آخر میں آکر کہتے ہیں ۔ ع ولی پر جو سخن لاوے اُسے شیطان کہتے ہیں ۔" صلا ۔ ۲۱۲

آزاد کا یہ بیان حکیم صاحب کے ان بیانات پر مبنی ہے " در تذکرہ ہمہ کس را بہ بدی یاد کردہ در حق شاعر شان جلی التخلص بہ ولی نوشتہ کہ وے شاعریست از شیطان مشہور تر و سزائے ایں کردار ناہنجار از کمترین شاعر بلوچی یافتہ کہ وے ہجوہائے متعدد وا کردہ کہ بعضے ازان بغایت

رکیک و بیہودہ در افتادہ" صفحہ ۲۳ . "بنا بر نوشتن میر در تذکرۂ خود شاعر شان جلی المتخلص بہ ولی را کہ وے شاعر یست از شیطان مشہور تر ہجو ہائے رکیک بوا جبی نمود" صفحہ ۱۴۳ "حقش بر جملہ سخن پردازان ہندی ثابت است و سخن برسخنش ابلیس فتنۂ شیطنت میر خاں کمترین کہ خدا کشش بیا مرزد بسیار بموقع و بجا گفتہ کہ ع ولی پر جو سخن لاوے اسے شیطان کہتے ہیں" صفحہ ۲۶۹ .

شاید اب بھی یہ حجت کی جائے کہ نکات الشعرا میں ولی کے متعلق یہ فقرہ درج نہیں ہے لہذا حکیم صاحب کا خود ساختہ ہے ۔ مگر ہم ایسے اصحاب سے یہ سوال کرنا چاہتے ہیں کہ آج کل تو مطابع کی وجہ سے کسی کتاب کا پہلا اڈیشن محفوظ رہ سکتا ہے ۔ اور دوسرے اڈیشن میں جو ایک مدت کے بعد ترمیم و اصلاح کی جائے اس کا مقابلہ پہلے اڈیشن سے بآسانی کیا جا سکتا ہے لیکن قلمی نسخوں میں اول تو اس امر کا پتہ لگانا کہ یہ نسخہ سب سے پہلے لکھا گیا تھا اور دوسرے یہ کہ پھر اس میں کوئی ترمیم و تنسیخ (جو بیک جنبش قلم چشم زدن میں ہو سکتی ہے) ہو کر اس کی نقل نہیں ہوئی ۔ آسان ہے یا دشوار؟ اگر ان کے نزدیک بھی یہ پتہ لگانا دشوار ہے تو پھر یہ مان لینا نہایت آسان ہے کہ جب میر تقی میر کی کتاب نکات الشعرا اس زمانے کے لوگوں نے دیکھی اور ولی کی نسبت شیطان والا فقرہ پڑھ کر برہمی پیدا ہوئی تو میر تقی نے اپنی کتاب میں ترمیم کر دی اور شیطان والا فقرا اڑا دیا ۔ حکیم صاحب وہ بزرگ ہیں جو اپنے مخالفین کا بھی ذکر خیر و خوبی کے ساتھ کرتے ہیں ۔ مثلاً سید انشاء اللہ خاں کے حالات ۔ لیکن صحیح رائے کے اظہار میں دریغ نہیں فرماتے ۔ مثلاً مرزا عظیم بیگ اپنے دوست کی نسبت رائے ۔ لہذا ان پر یہ الزام نہیں لگایا جا سکتا ۔ کہ انھوں نے میر کے ہم عصر ہونے کے باوجود نکات الشعرا کو نہیں دیکھا یا میر خان کمترین ایک فرضی شاعر پیش کر دیا ہے ۔ اور خود شیطان والا فقرا گھڑ کر یہ مصرع بھی " ولی پر جو سخن لاوے اُسے شیطان کہتے ہیں " لکھ دیا ہے

درحقیقت میر صاحب کی نسبت یہ حسن ظن تعجب خیز ہے کہ وہ شیطان والا فقرہ لکھنے پر قادر نہ تھے ۔ انعام اللہ خاں یقین کی نسبت جو اس زمانے کا مشہور شاعر ہے اور جس کا کلام ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے تحریر فرماتے ہیں :-

"بروپوچے چندے کہ بافتہ است کہ ما و شما نیز می توانیم بافت این قدر بر خود چیدہ است کہ رعونت فرعون پیش او پشت دست بر زمیں می گزارد...... بعد از ملاقات ایں قدر معلوم شد کہ ذائقہ شعر فہمی مطلق ندارد۔"

میر صاحب نے دوسروں کو پوچ گو ثابت کرنے کی کوشش میں اپنی فارسی کی بھی مطلق پروا نہیں کی۔ کیا میر صاحب ولی کی نسبت شیطان والا فقرہ نہیں لکھ سکتے تھے۔؟ کم از کم فقرے کی ساخت تو صاف کہہ رہی ہے کہ یہ میر کی فارسی کا ٹکڑا ہے۔

جناب مرتب نے اس کتاب کی اشاعت سے ادب اردو پر بڑا احسان کیا ہے اس سے نہ صرف ان تمام غلطیوں کا ازالہ ہو جائے گا جو صاحب آب حیات سے منسوب کی جاتی تھیں بلکہ ان شعرائے ناموس کے بھی حالات و کلام سے آگاہی ہو جائے۔ جن کو آزاد نے اپنی کتاب میں جگہ نہیں دی تھی۔ اور جن کا کلام بھی اب دستیاب نہیں ہوتا تھا۔ کیوں کہ اس تذکرے کی ایک یہ بھی خصوصیت ہے کہ مشہور اور با کمال شعرا کے اشعار کافی تعداد میں نقل کئے گئے ہیں۔

شعرا کے کلام کے متعلق اگرچہ حکیم صاحب کی آرا اس قدر جچی تلی نہیں ہیں جس قدر کہ نواب مصطفی خاں شیفتہ کی ہیں۔ لیکن طرز تحریر نہایت عمدہ اور شگفتہ ہے۔ میر مصحفی اور حسن کے تذکرے زبان کے لحاظ سے مقابلتاً ژولیدہ اور پراگندہ ہیں۔ جناب مرتب نے مصنف کے حالات کے تحت میں ثابت کیا ہے کہ جو تذکرے حکیم صاحب کے تذکرے سے پیشتر لکھے گئے تھے مثلاً سنہ ۱۱۶۵ھ میں نکات الشعرا اور تذکرۂ علی حسینی گردیزی سنہ ۱۱۶۵ھ میں مخزن نکات سنہ ۱۱۶۸ھ میں چمنستان شعرا سنہ ۱۱۸۰ھ و سنہ ۱۱۹۲ھ کے مابین میر حسن کا تذکرہ سنہ ۱۱۹۳ھ میں تذکرۂ شورش سنہ ۱۱۹۳ھ میں گلزار ابراہیم سنہ ۱۲۰۵ھ میں تذکرۂ مصحفی۔ گلشن ہند سنہ ۱۲۱۵ھ میں تذکرۂ عشقی، سنہ ۱۲۱۶ھ مجموعہ نغز ان تالیفات کے مقابلے میں یقیناً ایک بسوط اور ضخیم تالیف ہے۔ لیکن دو اور تذکرے ہیں جو ضخامت او حجم کے اعتبار سے اس پر فضیلت رکھتے ہیں۔ یعنی عیار الشعرا از خوب چند ذکا جو سنہ ۱۲۰۸ھ یا سنہ ۱۲۱۳ھ میں شروع ہوا۔ اور مولف برابر تیس سال تک اس میں اضافے کرتا

رہا۔ اور جس میں پندرہ سو شعرا کا حال لکھا گیا ہے۔ دوسرا تذکرہ عمدۂ منتخبہ از اعظم الدولہ سرور سنہ ۱۲۱۶
جس میں بارہ سو شعرا کے حالات درج ہیں۔ مگر جناب مرتب کی رائے میں مجموعہ نغز اگرچہ چھ سو تراسی
ریختہ نگاروں کے حالات پر مشتمل ہے اور حکیم صاحب نے ان ہر دو تالیفات سے ممکن ہے استفادہ
حاصل کیا ہو تاہم خود حکیم صاحب کی تحقیقات اور تلاش کو اس تذکرے کی تالیف میں بہت بڑا دخل ہے۔
اشپرنگر ریختہ گویوں کی جدید فہرست تیار کرتے وقت مجموعہ نغز کو تین سو بیس شعرائے اردو کے سلسلے
میں استعمال کرتا ہے ادھر گارسان دتاسی اپنی تاریخ شعرائے اردو میں کثرت کے ساتھ اس سے
کام لیتا ہے۔ پھر آزاد کی مشہور عالم تصنیف آب حیات کی ورق گردانی کی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے
کہ آب حیات کا ایک بڑا حصہ اس تذکرے سے ماخوذ ہے۔

ان معلومات کے بعد مجموعہ نغز کی حقیقی وقعت اور قیمت کا اندازہ خود بخود ہو جاتا ہے۔ ہم
کو نہایت مسرت ہے کہ ایسی نایاب کتاب "کلیۂ پنجاب" کی طرف سے شائع ہوئی۔ جناب مرتب کی
دیدہ ریزی اور محنت و تلاش بھی کچھ کم قابل قدر نہیں ہے۔ آپ نے نسخہ ہذا کو نہایت خستہ اور تباہ
حالت میں پایا۔ مولف کی تحریر میں نقاط کا بہت کم التزام تھا۔ اس لئے اس کو نقل کرنا آسان
نہ تھا متن کی تصحیح میں بھی ہر ممکن ذریعے سے کام لیا گیا ہے کثرت سے کرم خوردہ ہونے کے علاوہ
جس کا اثر عبارت متن پر بھی حامل تھا متعدد اوراق کا کچھ کچھ حصہ ڈیڑھ، ڈیڑھ، دو، دو انچ
کے دور میں ضائع ہو چکا تھا، چنانچہ انڈیا آفس کے کتابخانہ سے ایک نسخہ ۲۱۲۳ آپ کو مل
گیا۔ جو کثرت سے غلط اور سقیم تھا۔ تاہم اس میں بعض اضافے آپ کے نسخے سے زیادہ تھے جن کو
آپ نے متن میں شامل کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ جہاں جہاں اصل نسخے کی عبارت ضائع ہو گئی
تھی وہ حصہ آپ نے انڈیا آفس کے نسخے سے نقل کر لیا اور ایسی عبارت یا الفاظ کو قلابین میں۔
بدیں صورت [ ] محدود کر دیا۔ اور اپنے اضافوں کو قوسین ( ) سے ظاہر کر دیا۔ بے شک
آپ نے کچھ اشعار جو عہد حاضر کے مذاق کے منافی تھے خارج کر دئے ہیں۔ اس کے سوا آپ نے
اصل نسخے کو جوں کا توں رہنے دیا ہے۔ البتہ ضخامت کے خیال سے دو جلدوں میں تقسیم کر دیا ہے۔

آپ نے اپنے دیباچہ میں ثابت کیا ہے کہ اصل نسخہ خود حکیم صاحب کے دست مبارک کا نوشتہ ہے اور جو امور آپ نے بطور شہادت پیش کئے ہیں۔ اس کے لحاظ سے ہم کو بھی اس امر کے تسلیم کرنے میں تامل نہیں ہے۔ اسی یقین پر عمل کرتے ہوئے جناب مرتب نے گذشتہ صدی کے ایک عالم اہل قلم کی خصائص انشاؤ املا کو محفوظ رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اگرچہ آپ اس کے مدعی نہیں کہ نسخۂ مطبوعہ بلحاظ رسم الخط اپنے اصل کا صحیح قائم مقام ہے مگر آپ اس قدر ضرور کہتے ہیں اور بجا کہتے ہیں کہ اول الذکر زیادہ تر آخرالذکر کی خصوصیات پر قائم ہے چنانچہ آپ نے اپنے دیباچہ میں وہ تمام فرق املا کے دکھائے ہیں جو اس زمانے اور اس زمانے کی تحریر میں پائے جاتے ہیں۔

آپ نے شروع میں فہرست مطالب مع جلد درج کی ہے جو بارہ صفحات پر حاوی ہے۔ اس کے بعد دیباچہ لکھا ہے۔ جو چودہ صفحات کا ہے۔ بعد ازاں مصنف کے حالات اور دیگر امور متعلقہ پر روشنی ڈالی ہے۔ اور حکیم صاحب کے تذکرے کی برتری دیگر تذکروں پر ثابت کی ہے۔ آخر میں آپ حیات اور مجموعۂ نغز کے عنوان سے ظاہر کیا ہے کہ کہاں کہاں آزاد نے اس کتاب سے استفادہ کیا ہے۔ ان حالات اور دیگر امور نے بیس صفحات پر کئے ہیں۔

جناب مرتب نے اس کتاب کا نہایت نفیس اڈیشن شائع کر کے ہم لوگوں کو اس سے روشناس کر دیا ہے۔ یہ کتاب مجلد ہے اور جلد بھی نہایت خوبصورت ہے۔ لکھائی چھپائی کاغذ سب عمدہ ہے۔ کسی چیز کی کمی محسوس نہیں ہوتی۔ اگر جناب مرتب حکیم صاحب مرحوم کی تصویر بھی (اصلی نہیں خیالی یا فرضی ہی سہی) چھاپ دیتے تو آکسفورڈ یونیورسٹی کے مطبوعات سے کلیۂ پنجاب کے اس نسخے مطبوعہ کا وزن ہرگز کم نہ رہتا۔ بہر حال ہم جناب مرتب کو مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ اور ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ کہ انھوں نے حکیم صاحب کے مجموعۂ نغز کو جو ایک صدی سے گوشۂ گمنامی میں مقید پڑا تھا تازہ ہوا کھانے کا موقع دیا۔ اور اس کو ایسا نفیس چھاپا کہ خود مولف سے بھی یقیناً اس قدر اہتمام نہ ہو سکتا۔ نیز آپ نے مولف کے نام کو دوبارہ زندہ کر دیا ع "ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند"

آخر میں ہم جناب مرتب کی توجہ چند ایسی غلطیوں کی طرف مبذول کرنے کی جرأت کرتے ہیں جو بظاہر

خفیف معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن جن کا اثر ادب و انشا کو خراب اور بد مذاق بنا رہا ہے۔ اور ہمارے نوجوان تعلیم یافتہ اصحاب کو خود رائی، خود پسندی اور بے پروائی کا سبق دے رہا ہے۔

آپ نے اپنے دیباچے کو شروع کرتے ہوئے تیسری سطر میں تحریر فرمایا ہے:- "گذشتہ چند سالوں میں اردو شعراء و مصنفین کے حالات کے متعلق تحقیق و تلاش کی جو مبارک تحریک ہمارے ملک میں جاری ہوئی ہے ...."

میرے نزدیک سال کی جمع "سالوں" نہایت مذموم ہے۔ یہ جمع کسی مستند شاعر یا مصنف کے یہاں نہیں دیکھی گئی۔ اگلے لوگ سالہا سال کہتے تھے یا برسوں کہتے تھے۔ مثلاً امیر مینائی فرماتے ہیں:-

"رہے گا خلد میں بھی یاد ہم کو لکھنو برسوں"

چوں کہ اس موقع پر اگر آپ "برسوں" استعمال کرتے تو کوئی خرابی واقع نہ ہوتی اور اگر آپ لفظ "سال" ہی استعمال کرنے پر مصر ہیں تو اس کو واحد اور جمع دونوں موقعوں پر لکھ سکتے ہیں۔

مصنف کے حالات کے تحت میں صفحہ (۱۰) کی آخری سطروں میں آپ نے تحریر فرمایا ہے:-

"لیکن ان کی ستیزہ کاری کے قصوں کی تحریر کے وقت بھی ہمارے مصنف کا رویہ تعجب کی حد تک اغماض اور چشم پوشی کو کارفرما ہے۔" ہمارے نزدیک کارفرما کا استعمال اس طرح نہ ہونا چاہئے بلکہ یہ جملہ یوں ادا ہونا چاہئے:-

"........ ہمارے مصنف کے رویہ میں تعجب کی حد تک اغماض اور چشم پوشی کارفرما ہے۔"

اس عنوان کے تحت میں صفحہ (ج) کی آخری سطروں میں آپ لکھتے ہیں:-

"ہم ان الزامات کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتے۔" یہ انگریزی محاورے کا لفظی ترجمہ ہے۔ جو اردو میں اجنبی اور وحشی معلوم ہوتا ہے۔ کیا ان کا مطلب ان الفاظ سے ادا نہیں کیا جا سکتا تھا کہ "ہم ان الزامات کو بالتفصیل بیان کرنا نہیں چاہتے۔" لیکن مشکل یہ ہے کہ بعض مشہور اہل قلم بھی اس قسم کی غلطیوں کو غلطی نہیں سمجھتے اور "اردو میں اضافہ" سے تعبیر کرتے ہیں۔

جناب مرتب صاحب ہمیں معاف فرمائیں اگر ہم نے زبان کی بہتری کو مدنظر رکھتے ہوئے ان چند

فروگذاشتوں کا ذکر اس توقع پر کر دیا ہے کہ آیندہ وہ اپنی تحریریں زیادہ احتیاط سے کام لیں گے۔ اور جیسا کہ اب تک ان کا شعار رہا ہے۔ برابر دادِ تحقیق دیتے رہیں گے۔

گھر گرہستی | از سید شبیر حسین صاحب مولوی فاضل۔ تقطیع ۲۲×۱۸/۸، حجم ۲۰۳ صفحے لکھائی چھپائی اچھی کاغذ اوسط درجے کا، قیمت عہ۔ سید محمود حسن صاحب، ادبی بک ڈپو، امروہہ (یو پی) سے مل سکتی ہے۔

خانہ داری یا تدبیر منزل یونانیوں کے نزدیک علم الاخلاق اور سیاست مدن کی طرح حکمت عملی کا ایک شعبہ سمجھی جاتی تھی۔ اس کی بنیاد پر اس علم کی تعمیر ہوئی۔ جو اب معاشیات یا اقتصادیات کہلاتا ہے مہذب قوموں کو خانہ داری کی اہمیت کا ہمیشہ احساس رہا ہے اس لئے کہ گھر اور اس کا کاروبار انسانی تمدن اور معاشرت کا نقطۂ قائمہ یا قطب ہے۔ اسی کے گرد سارا نظام تمدن گردش کرتا ہے۔ ہندوستانیوں خصوصاً مسلمانوں کی موجودہ پستی کا اصلی سبب یہی ہے کہ ان کی خانہ داری کا قوام ہر طرح سے بگڑ گیا ہے اور اس پستی کے دور ہونے کی کچھ امید ہے تو اسی سے ہے کہ اب گھریلو زندگی کو درست کرنے کی طرف تھوڑی بہت توجہ ہو رہی ہے۔ اس موضوع پر پچھلے تیس چالیس سال میں بہت سی کتابیں لکھی گئیں۔ جن میں مولوی نذیر احمد صاحب مرحوم کی کتاب مراۃ العروس کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس لئے کہ اس میں قدیم طرز کی ہندوستانی معاشرت کی بے مثل تصویر ہے۔ مگر بہت سی کتابیں خصوصاً وہ جو جدید طرز معاشرت کے نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہیں بالکل ناکامیاب ثابت ہوئیں۔ اس کی وجہ علاوہ ادبی نقائص کے دو ہیں۔ ایک تو یہ کہ ان کتابوں کے لکھنے والے ہندوستانی معاشرت کی روح سے بیگانہ ہیں۔ اس لئے ان کی باتیں پڑھنے والوں کے دل میں نہیں اترتیں۔ دوسرے ان میں جو اصلاحی تدابیر بتائی جاتی ہیں وہ اس قدر مصارف چاہتی ہیں کہ سوائے چند امیر گھرانوں کے کسی کے لئے ان کا اختیار کرنا ممکن نہیں گھر گرہستی جو اس وقت ہمارے پیش نظر ہے ان سب عیوب سے پاک ہے اس کی زبان پاکیزہ و شستہ، سادہ اور سلیس ہے۔ طرز بیان سبک، دل آویز اور دل نشیں ہے۔ مضامین، گھر بار کے انتظام، کفایت شعاری، سلیقہ مندی، لباس اور زیور، رسومات، حفظانِ صحت، عزیزوں کے آپس کے تعلقات،

غرض گھریلو زندگی کے کل شعبوں پر حاوی ہیں۔ قصے کا پیرایہ اگرچہ محض برائے نام اختیار کیا گیا ہی لیکن اس کی وجہ سے دلچسپی میں اضافہ ہوگیا ہی۔ کہیں کہیں ظرافت کی چاشنی بھی موجود ہی۔ سب سے بڑی خوبی یہ ہی کہ کتاب امیروں کے لیے نہیں بلکہ معمولی حیثیت کے لوگوں کے لئے لکھی گئی ہی، جنھیں اس قسم کے ہدایت اور مشورے کی سب سے زیادہ ضرورت ہی۔ غرض کتاب اس قابل ہے کہ ہر پڑھی لکھی عورت ایک بار نہیں بار بار پڑھے اور بن پڑھی دوسروں سے پڑھوا کر سنے۔

ان خوبیوں کے ساتھ دو چیزیں ایسی ہیں کہ مصنف کو آئندہ اڈیشن میں جس کا موقع انشاء اللہ بہت جلد آئے گا دور کر دینا چاہئے۔ ایک یہ کہ کہیں کہیں مقامی الفاظ اور محاورے استعمال کئے گئے ہیں جنھیں ہندوستان کے دوسرے حصوں کے لوگ نہیں سمجھ سکتے۔ یا تو ان کی جگہ ٹکسالی الفاظ استعمال کئے جائیں یا پھر ان کی تشریح کر دی جائے۔ دوسرے تصویریں بدل دی جائیں۔ ان سے عبرت تو ضرور ہوتی ہے لیکن اس قسم کی نہیں جیسی مصنف چاہتے ہیں۔

ندیم ۔ بہار نمبر | اڈیٹر جناب انجم گیاوی تقطیع متوسط ، حجم ۲۲۰ صفحات ، کاغذ اور کتابت و طباعت بہتر۔ قیمت ۱۲ ؎ ۔ قیمت سالانہ للعہ ر مقام اشاعت گیا (بہار)

بہار کی زمین اخبارات و رسائل کے لئے بہت شور ہے۔ انتہا یہ کہ پورے صوبے میں اس وقت کوئی معقول و سنجیدہ اردو یا انگریزی روزنامہ تک موجود نہیں۔ اس سے پہلے کئی اچھے اچھے رسالے۔ پٹنہ اور دوسرے مقامات سے نکلے لیکن چند دن جاری رہ کر ناقدری کا شکار ہو گئے جناب انجم سزاوار تحسین و ستائش ہیں کہ اپنی کوشش و ہمت سے اس قدر کامیابی کے ساتھ رسالے کو چلا رہے ہیں۔ اس مرتبہ انھوں نے ایک خاص نمبر، بہار نمبر کے نام سے نکالا ہی اس نمبر کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بہاری اہل قلم حضرات کے مضامین ہیں۔ مضمون نگاروں میں، مولینا سید سلیمان ندوی، مولینا سید نجیب اشرف ندوی، حضرت شاد مرحوم، مولینا مناظر احسن گیلانی، جناب مان پوری، جناب عبدالمالک صاحب آروی، شاہ ولی الرحمٰن صاحب ایم اے، پروفیسر محمد مسلم عظیم آبادی

پروفیسر محفوظ الحق ایم اے، سید ریاست علی ندوی، جناب احمد اللہ صاحب ندوی وغیرہم خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ اسی طرح شعرا میں جناب محسن، جناب نجم گیلانی، حضرت شفق عماد پوری، حضرت شاد مرحوم مولینا تمنا، علامہ آزاد، جناب یاس، جناب بینا، جناب اصغر، جناب تسین، جناب رسا ہمدانی کے نام نظر آتے ہیں۔ مضامین کی ترتیب اور تصاویر کے انتخاب میں بھی ایک خاص سلیقہ نمایاں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جناب اڈیٹر نے بہار کے تقریباً تمام اچھے لکھنے والوں کے مضامین جمع کر کے ایک کارنامہ انجام دیا ہے۔ جس کے لئے وہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ اس سلسلے میں یہ ظاہر کر دینا بھی غیر مناسب نہ ہوگا کہ ہمیں جناب مولینا مناظر احسن صاحب گیلانی کا طرز تحریر پسند نہیں آیا۔ اپنی یا اپنے صوبے کی علمی کاوشوں کی تعریف کرتے وقت کیا ضرور ہے کہ دوسروں کی مذمت کی جائے۔ یا ان کی کوششوں کو گھٹا کر بیان کیا جائے، خالص علمی و ادبی تحریریں تو اس ہیئت سے خالی ہوں تو اچھا ہے۔

الایمان ماہوار۔ ایڈیٹر مولینا مظہر الدین صاحب، تقطیع بڑی۔ ضخامت ۵۶ صفحات کتابت و طباعت اور کاغذ معمولی۔ قیمت سالانہ ایک روپیہ فی پرچہ ۲ر مقام اشاعت دہلی

یہ رسالہ اشاعت و تبلیغ کی غرض سے جناب مولینا مظہر الدین صاحب کی نگرانی و ادارت میں نکلتا ہے۔ مضامین زیادہ تر مذہبی اور تاریخی ہوتے ہیں۔ عام لوگوں کے لئے مفید اور دلچسپ ہیں، ایک روپیہ میں بہت سستا ہے۔

دنیا کی رفتار

(ہندوستان)

گاندھی جی کی گرفتاری کو مشکل سے دو ہفتے ہوئے تھے جب اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی کہ وہ پھر برت رکھنے والے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے برت رکھا اور جب ان کی حالت خطرناک ہوتی تو حکومت نے ان کو رہا کر دیا۔ یہ برت اس وجہ سے رکھا گیا تھا کہ پچھلی قید کی طرح گاندھی جی اس دفعہ بھی اچھوت اُدھار کے کام کے لئے مکمل آزادی کا مطالبہ کرتے تھے اور حکومت صرف محدود آزادی دینی چاہتی تھی، گاندھی جی نے حکومت کو یہ لکھا کہ اگر انھیں اس کام کے لئے پوری آزادی حاصل نہ ہوتی تو زندگی ان کے لئے عذاب ہو جائے گی اور وہ ایسا برت رکھیں گے جو ان کی جان لے کر رہے۔ حکومت نے اس موقعے پر جو بیان شائع کیا اس کا مفہوم یہ تھا کہ گاندھی جی جب اگست میں رہا کئے گئے تو انھوں نے اپنا بیشتر وقت سیاسی معاملات میں صرف کیا اور ہریجنوں کی خدمت کے لئے بہت کم وقت دیا۔ پھر اب قید خانے میں جو وہ مکمل آزادی کا مطالبہ کرتے ہیں وہ معقول نہیں ہے، دوسری دلیل یہ تھی کہ پچھلی دفعہ گاندھی جی سرکاری قیدی تھے اور اس دفعہ معمولی مجرم اس لئے جو رعایتیں انھیں پچھلی دفعے حاصل تھیں وہ اس دفعہ نہیں مل سکتیں۔ آخر میں حکومت نے یہ اعلان کیا تھا کہ اگر گاندھی جی کو واقعی ہریجنوں کی خدمت اس قدر عزیز ہے تو حکومت انھیں اس شرط پر رہا کرنے کے لئے تیار ہے کہ وہ اپنا وقت صرف اسی کام میں صرف کریں۔ اور سیاست سے الگ رہیں۔

رہائی کے بعد گاندھی جی نے اس سرکاری اعلان کا جو جواب شائع کیا اس کا مفہوم یہ تھا کہ حکومت کا یہ الزام کہ انھوں نے رہائی کے بعد بہت کم وقت ہریجنوں کے کام میں صرف کیا سراسر غلط ہے۔ ثبوت میں انھوں نے چند مثالیں اور کام کی تفصیلات بھی پیش کیں۔ سرکاری اور معمولی قیدی کی جو تفریق حکومت نے کی تھی اسے بھی گاندھی جی نے تسلیم نہیں کیا۔ اور کہا کہ یہ تفریق بالکل غیر متعلق بات ہے

مسئلہ در اصل یہ ہے کہ قید خانے میں ہریجنوں کی خدمت کی آزادی اور میری زندگی یا پابندی اور میری موت۔ یہ مسئلہ اس وقت تک باقی رہے گا جب تک میں زندہ ہوں اور نہ صرف میرے سامنے رہے گا بلکہ حکومت اور پبلک کے سامنے بھی اگر میرا مطالبہ غلط ہے کہ مجھے قید خانے کے اندر بھی اس کام کے لئے اتنی ہی آزادی حاصل ہونی چاہئے جتنی باہر ہے تو میرے برت کو ایک گستاخی سمجھ کر حکومت اور پبلک دونوں کو چاہئے کہ میری پروا نہ کریں "

ہریجنوں کے معاملے میں گاندھی جی کا یہ تیسرا برت تھا، پہلا برت انھوں نے پچھلے سال ستمبر میں رکھا تھا جب حکومت کا فیصلہ فرقہ وار نمایندگی سے متعلق شائع ہوا تھا، اس برت کا اثر اتنا زیادہ ہوا کہ دس روز کے اندر ہی ہندوستان کے ہر حصہ سے لوگ بمبئی میں جمع ہوتے اور ایک فیصلہ ہریجنوں کے حق میں ایسا ہو گیا جسے حکومت بھی تسلیم کرنے پر مجبور ہوئی۔ حکومت کی منظوری کی خبر ملتے ہی برت ختم ہو گیا۔ دوسرا برت غیر مشروط تھا اور حکومت کی کسی کارروائی سے متاثر ہو کر نہیں رکھا گیا تھا، بلکہ قوم کی سستی اور سہل انگاری کا نتیجہ تھا، اس برت کے رکھتے ہی حکومت نے گاندھی جی کو رہا کر دیا۔ لیکن چونکہ یہ اکیس دن کا برت تھا اس لئے پوری مدت تک جاری رہا۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ ہریجنوں کی خدمت کی تحریک میں پھر ایک دوڑ گئی اگر اخبارات سے اس کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ پہلے برت سے دوسرے کا اثر کم ہوا اور تیسرے کا تو بہت ہی خفیف اثر ملک میں نظر آتا ہے۔

اس بار رہائی کے بعد گاندھی نے پھر پرنا کٹی میں قیام کیا اور وہیں پنڈت جواہر لال نہرو سے ملاقات کی۔ اس ملاقات پر قوم کی آنکھیں لگی ہوئی تھیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ قوم پرست جماعت میں گاندھی جی کے بعد جواہر لال نہرو ہی سب سے زیادہ مقبول ہیں لیکن سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ نافرمانی کی جو تحریک گاندھی جی کی انگلستان سے واپسی کے بعد شروع ہوئی تھی اس کی ذمہ داری بڑی حد تک جواہر لال نہرو پر ہے۔ گاندھی جی کے اعلان سے پہلے صوبہ متحدہ میں یہ تحریک عملاً شروع ہو چکی تھی اور خود پنڈت جواہر لال نہرو گرفتار بھی ہو چکے تھے۔ یہ حقیقت

بھی اب راز نہیں ہے کہ لارڈ ارون اور مہاتما گاندھی کی مفاہمت پنڈت جواہر لال نہرو کو ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی اور انھوں نے کوئی ارادی کوشش اس معاہدے کو فسخ کرنے کی نہ بھی کی ہو تو کم از کم یہ خواہش ان کی ضرور تھی کہ یہ تکلیف دہ صلح جلد سے جلد ختم ہو جائے۔ ان وجوہ سے گاندھی جی اور پنڈت جواہر لال نہرو کی ملاقات اور زیادہ اہم ہو گئی۔

یہ ملاقات کئی دن تک جاری رہی اور تفصیلات کا تو علم نہیں۔ لیکن اس کا جو نتیجہ نکلا وہ یہ ہے کہ گاندھی جی نے یہ اعلان کیا کہ وہ ایک سال تک نافرمانی کی تحریک میں کوئی جارحانہ اقدام نہیں کریں گے، اور اپنا بیشتر وقت ہریجنوں کے لئے وقف کر دیں گے۔ اس سلسلے میں گاندھی جی نے جو اعلان شائع کیا ہے انھوں نے اس میں یہ اعتراف کیا ہے کہ اس وقت انھیں کسی طرف کوئی درستی نظر نہیں آتی اور نہ مستقبل کی راہ صاف دکھائی دیتی ہے اس کے علاوہ صحت بھی اچھی نہیں ہے۔ بہت غور و فکر اور دعا کے بعد وہ اس فیصلے پر پہنچے ہیں کہ ایک سال تک وہ اپنے آپ کو قیدی تصور کریں گے اور صرف وہی کام کریں گے جس کا مطالبہ انھوں نے قید خانے میں کیا تھا۔ یہ فیصلہ انفرادی ہے اور تحریک نافرمانی کا التوا اس سے لازم نہیں آتا، ان کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت مجبور ہو کر انھوں نے یہ فیصلہ کیا ہے اور خود اس عائد کردہ پابندی سے انھیں بہت تکلیف ہے۔

اس سلسلے میں پنڈت جواہر لال نہرو کا ایک خط اور گاندھی جی کا جواب بھی شائع ہوا ہے اس میں ان تمام اہم مسائل کا بیان ہے جو اس ملاقات میں زیر بحث تھے، اور دونوں نے اپنا نقطہ نظر پیش کیا ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنے خط میں جن امور پر زور دیا ہے وہ یہ ہیں۔

(۱) کراچی کانگرس کی تجویز متعلق بنیادی حقوق۔ اگرچہ پنڈت جی اس سے کلیتاً مطمئن نہیں ہیں لیکن ان کے خیال میں یہ ایک مبارک ابتدا تھی۔ ان کا خیال ہے کہ ہندوستان کی آزادی اس وقت تک بالکل بے معنی ہے جب تک اس کا نتیجہ غریب کسان اور مزدور کی فلاح نہ ہو، اس کے لئے ضروری ہے کہ ان لوگوں سے جو صاحب اقتدار ہیں۔ اقتدار لے کر کم مایہ عوام کو دے

دیا جائے ۔ سب سے بڑی صاحب اقتدار طاقت تو حکومت ہے اور اس کے بعد نوابوں اور راجاؤں کا درجہ ہے ۔ پھر زمیندار اور تعلقہ دار ہیں ۔ اس لئے صرف حکومت کے خلاف تحریک کافی نہیں ہے بلکہ دوسرے صاحب اقتدار طبقوں کے خلاف بھی آواز اٹھانی چاہئے ۔ گاندھی جی نے اس کے جواب میں یہ لکھا ہے کہ ان کی رائے میں یہ کارروائی ابھی قبل از وقت ہوگی وہ اس سے تو متفق ہیں کہ والیان ملک کو ذمہ دار حکومت قائم کرنی چاہئے لیکن ان کو علیحدہ کرنا مناسب نہیں ۔ اس لئے کہ ان سے گاندھی جی کو بہت سی توقعات ہیں ۔ اسی طرح زمینداروں اور تعلقہ داروں سے بھی ایسا برتاؤ کرنا چاہئے کہ ان پر جبر نہ ہو بلکہ بہ رضا و رغبت وہ اپنے بیجا حقوق سے دست بردار ہو جائیں ۔ مہاتما جی کو اس کا تو احساس ہے کہ اس کے لئے عرصہ بہت درکار ہے مگر ان کے خیال میں یہی سب سے زیادہ سیدھا راستہ ہے ۔

۲ ۔ کانگرس کا مقصد ہندوستان کی مکمل آزادی ہے اور اس کا اعلان صاف صاف کر دینا چاہئے ۔

گاندھی جی کو اس سے اتفاق ہے لیکن اس مقصد کو بار بار دہرانے کی انھیں کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی ۔ ان کا خیال ہے کہ اس معاملے میں ان میں اور پنڈت جواہر لال نہرو میں جو اختلاف ہے اس کی بناء اختلاف مزاج پر ہے ۔ پنڈت جواہر لال نہرو ہر چیز کو بار بار صاف صاف بیان کر دینا چاہتے ہیں اور گاندھی جی ایک دفعہ فیصلہ کرنے کے بعد اس کی ضرورت نہیں سمجھتے کہ بار بار فیصلے کا اعادہ کیا جاتے بلکہ ہر ذریعے سے فائدہ اٹھاکر مقصد کی کامیابی کی کوشش کرتے ہیں ۔

۳ ۔ ہندوستان کو چاہئے کہ دنیا کی ترقی پسند جماعتوں کا ساتھ دے اور الگ تھلگ نہ رہے ۔ مہاتما جی کو اس سے اتفاق ہے ۔

۴ ۔ مسٹر آنے کے بیان سے جو غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے کہ کانگرس کا ادارہ ختم ہو گیا وہ خلاف واقعہ ہے ۔ گاندھی جی کا بھی یہی خیال ہے ۔

۵ ۔ پنڈت جواہر لال نہرو کے خیال میں اجتماعی اور انفرادی نافرمانی میں کوئی بنیادی فرق نہیں

ہی اور یہ تفریق بلا وجہ کی گئی ۔ گاندھی جی اس سے متفق نہیں ہیں ۔ ان کی رائے میں سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ اجتماعی نافرمانی میں ایک کارکن کا اثر دوسرے پر لازماً پڑتا ہے اور انفرادی نافرمانی میں یہ ضروری نہیں ۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ اجتماعی نافرمانی کی حالت میں کانگرس کے اداروں کا کام کرتے رہنا ضروری ہے اور انفرادی نافرمانی میں اس کی ضرورت نہیں ۔ نتیجہ یہ نکلا کہ حکومت کے احکام امتناعی کی موجودگی میں اجتماعی نافرمانی بغیر خفیہ کارروائیوں کے ناممکن ہے (خفیہ کارروائیوں کے عدم جواز پر دونوں حضرات متفق ہیں ۔) اور انفرادی نافرمانی باوجود صدہا احکام امتناعی کے جاری رہ سکتی ہے اور اسے جاری رہنا چاہیئے ۔

گاندھی جی نے اپنے جواب میں یہ بھی لکھا ہے کہ کانگرس کے تعمیری پروگرام کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے ۔ قید ہونے والے کم ملیں گے اس لئے ان چیزوں پر زور دینا چاہیئے جن پر سب لوگ عمل کر سکتے ہیں مثلاً کھدر اور ہندو مسلم اتحاد ۔

ان بیانات کا اثر تحریک نافرمانی پر جو اس دفعہ شروع ہی سے نیم جان ہے جو کچھ پڑے گا ظاہر ہے گاندھی جی کی کنارہ کشی کے بعد خواہ وہ عارضی ہی کیوں نہ ہو اس تحریک کا چلنا معلوم اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ بے چارے کارکن جو اس تحریک کے سلسلے میں قید میں مبتلا ہیں اور جن کی رہائی کے لئے کسی غیر معمولی وجہ کے ظہور کا بھی امکان نہیں ہے کب تک اس مصیبت میں گرفتار رہتے ہیں ہر دفعہ گاندھی جی کی رہائی کے بعد کچھ لوگ ان میں اور حکومت ہند میں صلح کرانے کا بیڑا اٹھاتے ہیں اس دفعہ بھی اس کے آثار ہیں لیکن کوئی وجہ بظاہر اس کی نہیں معلوم ہوتی کہ حکومت ایسے موقعے پر جب اس کی دشواریاں ختم ہوتی ہوئی نظر آتی ہیں دست تعاون بڑھائے گی ۔ اور محض اس لئے صلح کرے گی کہ اصول اخلاق کی رو سے صلح جنگ سے بہتر ہے ۔

ممالکِ غیر

جرمنی | جو حضرات یورپ کے سیاسی اور معاشی حالات کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ جرمنی میں ہٹلر اور اس کی پارٹی کا برسرِ اقتدار ہو جانا اس سال کا سب سے اہم واقعہ ہے اور ساری دنیا کی آنکھیں اس وقت ان تجربات کی طرف لگی ہوئی ہیں جو یہ جماعت کر رہی ہے۔ اسی وجہ سے ان صفحات میں بھی پابندی سے ہر مہینے جرمنی کے واقعات کی رفتار پر نظر ڈالی جاتی ہے۔ غالباً رسالہ جامعہ کے پڑھنے والوں کے دل میں بھی نئی جرمن حکومت کے متعلق وہی سوالات پیدا ہوں گے جو یورپ اور امریکا میں ہر شخص کی زبان پر ہیں کہ ہٹلر کی قومی اشتراکی جماعت (نیشنل سوشلسٹ پارٹی جسے اختصار کی غرض سے جرمن ناتسی انگریز نازی کہتے ہیں) کے حقیقی اصول کیا ہیں۔ اس میں قومیت کا عنصر کتنا ہے اور اشتراکیت کا کتنا۔ اس کی تائید ملک میں کون کون سے طبقے کر رہے ہیں۔ اس کے اتنی جلدی قوت پکڑ جانے کے کیا اسباب ہیں۔ وہ اس قوت سے کیا کام لے رہی ہے، اور اس کے اپنے مقاصد میں کامیاب ہونے کا کس حد تک امکان ہے۔ ذیل میں ان سوالات کا جواب اختصار کے ساتھ ایسے ماخذ سے دیا جاتا ہے جو بظاہر بے تعصبانہ تحقیقات کے معیار پر پورا اترتا ہے۔

قومی اشتراکی جماعت جرمنی میں مدت سے قائم ہے۔ اس کا نصب العین یہ ہے کہ ملک کی سیاسی اور معاشی زندگی کی بنا اشتراکی اصولوں پر قائم کی جائے۔ لیکن صرف جرمن قوم کی ضرورتوں اور مصلحتوں کو مدِنظر رکھ کر۔ اب سے چند سال پہلے تک اس جماعت میں بہت تھوڑے لوگ تھے، اشتراکی خیال کے لوگ اسے قومیت پرست اور تنگ نظر سمجھتے تھے اور نیشنلسٹ اس کے اشتراکی رجحان کی وجہ سے مخالف تھے۔ عام خیال یہ تھا کہ اس پارٹی کا نصب العین اضداد کا مجموعہ ہے۔

پچھلے دس سال کے عرصے میں اس کی قوت آہستہ آہستہ بڑھتی رہی۔ جس کی دو وجہیں تھیں ایک تو یہ کہ اطالیہ میں فاشستی جماعت کو جس کے اصول ایک حد تک اس پارٹی کے اصولوں سے ملتے جلتے تھے نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔ اور جرمن قوم پر خصوصاً نوجوانوں کے تخیل پر اس کا

بہت زبردست اثر پڑا ۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ جمہوری اشتراکی جماعت جو ۱۹۱۸ء کے انقلاب کے بعد سے برسرِ حکومت تھی جرمن قوم کو اس سیاسی ذلت اور معاشی پستی سے جس میں اُسے صلح نامہ رسائی نے مبتلا کر دیا تھا نکالنے میں بالکل ناکام رہی اور اندرونی معاملات میں بھی صنعتی سرمایہ داروں کی قوت اور حکمت عملی نے اسے نسچ کر دیا ۔ اس کے بعد نیشنلسٹ جماعت کے ہاتھ میں قوت آئی جس کی سرپرستی صنعتی سرمایہ دار اور کچھ زمیندار کر رہے تھے ، اس جماعت کا بھروسا جنرل فان شلائشر پر تھا ، کہ وہ فوجی قوت اور سختی سے کام لے کر ملک میں اس وقت تک امن قائم رکھے گا کہ معاشی حالت بہتر ہو جائے جنرل فان شلائشر مزدوروں اور کسانوں کا بھی بہی خواہ تھا ۔ اور یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ اگر اسے کامل اختیارات دے دئے جائیں تو وہ ایک حد تک عام قومی مفاد کو مدنظر رکھ کر حکومت کرتا رہے گا ۔ مگر فان پاپن سابق وزیر اعظم کی سازشوں نے فان شلائشر کی حکومت کو قائم نہ رہنے دیا ۔ فان پاپن نے بڑے زمینداروں کو جن کا قائد ہوگن برگ ہے اور علاقہ رھائن کے صنعتی سرمایہ داروں کو یہ یقین دلایا کہ ہٹلر کی سرکردگی میں قومی اشتراکی جماعت کی قوت بڑھتی جاتی ہے اور اسے ساتھ لئے بغیر کسی حکومت کا قائم رہنا مشکل ہے ۔ سرمایہ داروں کو دو اعتراض تھے پہلا یہ کہ یہ اشتراکی پارٹی ہے جو اصولاً سرمایہ داروں کی مخالف ہے دوسرا یہ کہ ہٹلر اپنی پارٹی کی تعداد کے تناسب سے کہیں زیادہ حصہ حکومت میں مانگتا ہے ۔ پاپن نے اطمینان دلایا کہ ہٹلر کی اشتراکیت محض عوام کو خوش کرنے کے لئے ہے ۔ اور یہ بھی کہا کہ میں مجلس وزرا میں صرف دو تین جگہیں لینے پر اس جماعت کو راضی کر دوں گا ۔ غرض باوجود بہت سے سرمایہ داروں کی مخالفت کے بڑے زمیندار اور علاقہ رھائن کے سرمایہ دار اس تجویز پر راضی ہوگئے اور نتیجہ یہ ہوا کہ ہٹلر اپنی پارٹی کے لئے سلطنت کی مجلس وزرا میں صرف دو جگہیں اور پروشیا میں صرف ایک وزارت لے کر اتحادِ عمل پر راضی ہوگیا ۔ بظاہر یہ فان پاپن اور سرمایہ داروں کی بہت بڑی فتح تھی ۔

لیکن ذرا یہ دیکھئے گا کہ قومی اشتراکی جماعت نے جن معدودے چند وزارتوں پر

قناعت کی وہ کون کون تھیں اور ان کی کیا اہمیت تھی، پہلی وزارت حربی تھی جس پر
فان شلائشر کی جگہ فان بلوم برگ کا دوسری وزارت داخلہ تھی جس پر ہر فلک کا، تیسری خاص
پروشیا کی وزارت داخلہ تھی جس پر ہر گورنگ کا تقرر ہوا اس کے معنی یہ تھے کہ سارے ملک
کی فوج اور پولیس قومی اشتراکی وزرا کے ہاتھ میں آ گئی! اس کے علاوہ خود قومی اشتراکی جماعت
کے والنٹیر جو ایک باقاعدہ فوج کی حیثیت رکھتے تھے۔ اور جن کی جد و جہد کو سرکاری فوج اور پولیس
بڑی مشکل سے روکتی تھی اب اپنی پارٹی کے وزرا کے معاون بن گئے۔

ان قوتوں سے کام لے کر ہٹلر نے ۵ مارچ کے انتخابات میں اکثریت حاصل کرنے کی
کوشش کی۔ اس کی تقدیر سے اور کمیونسٹ پارٹی کی حماقت سے اسی زمانے میں رائشٹاگ
(جرمن پارلیمنٹ) میں آگ لگائے جانے کا واقعہ پیش آیا جس کی وجہ سے ہٹلر کی جماعت کے وزرا
کو اس کا موقع مل گیا کہ کمیونسٹ پارٹی کو رائشٹاگ سے خارج کر دیں اور یوں بھی کل نیشلسٹ
پارٹیوں میں یہ لوگ ہر دل عزیز ہو گئے۔ ہٹلر کو پارلیمنٹ میں پوری اکثریت حاصل ہو گئی اس نے
وزیر اعظم کی حیثیت سے جو مجلس وزرا بنائی اس میں دوسری پارٹیوں کے ارکان بھی تھے، لیکن فوج
پولیس، عدالت وغیرہ بدستور قومی اشتراکی وزرا کے ہاتھ میں تھی، کیتھولک جماعت وغیرہ کو
دھمکا کر اسے بھی ہٹلر نے اپنے ساتھ شریک کر لیا۔ اور رائشٹاگ کے اتفاق رائے سے چار برس
کے لئے ڈکٹیٹر بنا دیا گیا۔

جو طرز عمل قومی اشتراکی جماعت نے اختیار کیا وہ سامنے دیکھ کر فان پاپن اور سرمایہ داروں
کی آنکھیں کھل گئیں۔ وہ کام جو کسانوں اور مزدوروں کی امداد کے لئے جمہوری اشتراکی جماعت دس
سال کی حکومت میں نہیں کر پائی تھی وہ ہٹلر کی پارٹی نے چند ہفتوں میں کر لیا۔ کسانوں کی مدد اس
طرح ہوئی کہ غیر ملکوں کی زراعتی پیداوار کا داخلہ جرمنی میں بند کر دیا گیا جس سے دیسی پیداوار کی
قیمت بڑھ گئی، کسانوں کے کل قرضوں کی وصولی ملتوی کر دی گئی اور سود کی شرح گھٹا دی گئی۔
یہ اور دوسری اصلاحات بغیر قانون سازی کے بہت سیدھے سادے طریقے سے انجام

پاگئیں۔ قومی اشتراکی پارٹی نے فاشستوں کی تقلید میں اپنے یہاں اجتماع قوت کا اصول جاری کیا اور اس کا نام "اتحاد عمل" رکھا۔ مقصد یہ تھا کہ نہ صرف حکومت میں بلکہ صنعت و تجارت، زراعت مالیات اور معیشت غرض ملکی زندگی کے ہر شعبے میں قومی اشتراکی جماعت کے افراد کار فرما ہوں تاکہ نئی تنظیم میں اشخاص اور جماعتوں کے اختلاف مقاصد سے خلل نہ پڑے چنانچہ ہٹلر نے پریسیڈنٹ ہنڈنبرگ کی منظوری سے جرمن سلطنت کی کل ۱۶ ریاستوں میں اپنی پارٹی کے گورنر مقرر کئے اور انہوں نے اپنی اپنی مجلس وزرا خود نامزد کی۔ جو مقامی پارلیمنٹ سے آزاد رکھی گئی۔ ان مجالس میں جو صنعت و تجارت وغیرہ کی نمائندگی کر سکتی ہیں، بنکوں میں، بڑے بڑے کارخانوں غرض ہر ادارے میں قومی اشتراکی پارٹی کے لوگ نگراں مقرر کئے گئے یہاں تک کہ مزدوروں کی انجمنیں بھی جمہوری اشتراکی قبضے سے نکل کر اس پارٹی کے ہاتھ میں آگئیں۔ اس قوت کو سمیٹنے میں ہٹلر کو اس عام نفرت سے بہت مدد ملی جو جرمن قوم کو یہودیوں سے ہے۔ ملک کو یہودیوں کے اثر سے پاک کرنے کا بہانہ کر کے اس نے ہر ادارے سے یہودی کارکن نکال دیئے اور اس کی جگہ اپنی پارٹی کے لوگ بھر دیئے۔

مزدوروں کی بے روزگاری دور کرنے کے لئے بھی متعدد تدابیر اختیار کی گئیں، اول تمام جرمن نوجوانوں کے لئے ایک سال تک مزدوری کرنا لازمی قرار دیا گیا۔ اور اس کا خرچ حکومت کے ذمے رکھا گیا۔ دوسرے ایک ارب مارک کے نوٹ اس غرض سے جاری کئے گئے کہ سرکاری عمارتیں اور رفاہِ عام کے ادارے تعمیر کرائے جائیں تاکہ مزدوروں کے لئے کام نکلے بیکار مزدوروں کیلئے علاوہ اس رقم کے جو بے روزگاری میں امداد کے طور پر ملتی تھی صرف ایک وقت کا کھانا اور کچھ اور رقم مقرر کی گئی جو صرف روزمرہ کی ضروریات پر خرچ کی جا سکتی ہے۔ اس طرح تھوڑے روپے میں بہت سے لوگوں کو کام کرنے کا موقع مل گیا۔ تیسرے یہ اعلان کیا گیا کہ جو کارخانے، ادارے یا افراد اپنے یہاں مزید مزدوروں سے کام لیں گے اور جو خاندان مامائیں نوکر رکھیں گے ان کے ساتھ انکم ٹیکس میں رعایت کی جائے گی۔ چوتھے یہ قاعدہ مقرر ہوا کہ جب کسی کی شادی ہو اور اس

میں خانہ داری کا سامان خریدنے کی استطاعت نہ ہو تو ریاست کی طرف سے اسے ایک ہزار مارک قرض دئے جائیں گے اور ماہوار آمدنی میں سے ایک فیصدی کی قسطوں میں ادا کئی ہو گی مگر شرط یہ ہے کہ اگر اس شخص کی آمدنی ایک خاص حد سے کم نہ ہو تو اس کی بیوی مزدوری یا ملازمت نہ کرے ان انتظامات میں مزدوروں کے لئے کام پیدا کرنے کے علاوہ یہ بات بھی مد نظر ہے کہ کہ جہاں تک ہو سکے عورتوں کو گھر کے باہر کام کرنے سے باز رکھا جائے۔

غرض قومی اشتراکی جماعت نے اس مختصر سے عرصے میں اپنے نصب العین یعنی قومیت کے حدود دائرے میں بعض اشتراکی اصول رائج کرنے کی پوری کوشش کی ہے اور اب ایک حد تک کامیابی بھی حاصل کی ہے اور اس کے متعلق یہ کہنا غلط ہے کہ یہ بڑے زمینداروں یا سرمایہ داروں کی مٹھی میں ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ اس کا زیادہ دن بر سر حکومت رہنا اور جو کام شروع کیا ہے اسے انجام تک پہنچانا ممکن ہے یا نہیں بہت کچھ غور و فکر چاہتا ہے۔ یہودیوں پر جو سختیاں کی گئی ہیں ان کی وجہ سے یہ پارٹی دوسرے ملکوں میں بہت بدنام ہو گئی ہے اور تمام دنیا کے یہودیوں نے اس کے خلاف زبردست پروپاگنڈا شروع کیا ہے۔ اگر بیرونی ممالک خصوصاً انگلستان اور امریکا میں رائے عامہ اس جماعت کے خلاف ہو گئی تو امور خارجہ میں اس کی پالیسی بالکل ناکام رہے گی اور اس کی حکومت کا قائم رہنا دشوار ہو جائے گا۔ دوسری طرف داخلی امور میں اس کی کامیابی اس وقت تک صرف عوام اور متوسط طبقے کی تائید کی بدولت ہے۔ اور یہ لوگ اس کا ساتھ اس توقع پر دے رہے ہیں کہ یہ بیرونی قرضوں اور مطالبوں کے بار کو ہلکا کر کے جرمنی کی معاشی حالت کو سنبھالے گی، اگر اس میں کامیابی نہ ہوئی اور یہ ظاہر ہونے کی کوئی امید نہیں تو محض نسل پرستی اور غیر قوموں سے نفرت کے جذبات ابھارنے سے آخر کب تک کام چل سکتا ہے، یہ سچ ہے کہ اس پارٹی کی بدولت اس وقت کسانوں اور مزدوروں کو روکھی سوکھی روٹی مل جاتی ہے۔ لیکن ایک تو اس کا اعتبار نہیں کہ یہ زیادہ دن تک چلے جائے گی دوسرے جرمن کچھ ہندوستانی نہیں جو روکھی سوکھی روٹی پاکر سرکار کے دولت و اقبال کو دعا دیں اس لئے کہ ان کے بہت سے بھائیوں کو وہ بھی نصیب

نہیں۔ اگر ہٹلر کی پارٹی ان لوگوں کا پیٹ بھرنے میں کامیاب نہ ہوئی تو اس کا بھی وہی انجام ہوگا جو دوسری پارٹیوں کا ہوا۔ اس آخری امید سے مایوسی ہونے کے بعد جرمنی میں اور اس کی وجہ سے سارے یورپ میں وہ قیامت برپا ہونے کا اندیشہ ہے جس کے آگے جنگ عظیم ایک کھیل معلوم ہوگی۔

ممالک اسلام

عراق پچھلے مہینے کے رسالے میں جب اسوری قبائل اور حکومت عراق کی باہمی کشمکش پر تبصرہ کیا گیا تھا تو یہ وہم وگمان بھی نہیں تھا کہ اس پرچے میں شاہ عراق امیر فیصل کے انتقال کا ذکر کرنا پڑے گا۔ مرحوم بالکل تندرست تھے اور سوئٹزرلینڈ کے پرفضا مناظر سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ ایک شب کو یکایک قلب کی حرکت بند ہوگئی اور پاس والوں کو بھی خبر نہ ہوئی۔[۱] امیر فیصل کو جس طرح عراق کی بادشاہی ملی وہ ایک بہت ہی دلچسپ داستان ہے۔ اگر جنگ عظیم شروع نہ ہوتی تو وہ اب تک غالباً ترکی فوج میں ایک معمولی افسر ہوتے یا اگر ترکی سلطان کی توجہ ان کی طرف منعطف ہو جاتی تو ممکن تھا کسی بڑے رتبے پر فائز ہوتے۔ لیکن بہر حال یہ موقع تو انھیں نصیب نہ ہوتا کہ باپ اور بڑے بھائی کی موجودگی میں ایک وسیع رقبے پر حکمرانی کرتے اور وہ رقبہ بھی ایسا جس پر خاندان شریفی کا اثر بالکل نہ تھا اور نہ اس کی بظاہر کوئی امید تھی کہ وہاں ان کی حکومت قائم ہوگی۔

جنگ عظیم کے کرشمے سے یہ بھی ایک انوکھا کارنامہ تھا جو بر آیا۔ قیصر جرمنی نے سلطان عبدالحمید سے تعلقات قائم کرنے شروع کئے اور حکومت برطانیہ نے شریف حسین سے ۱۹۰۸ء میں جبکہ

---

[۱] غلط فہمی کی بنا پر پچھلے مہینے کے رسالے میں یہ لکھا گیا تھا کہ امیر فیصل عراق واپس آگئے ہیں اور اسوری قبائل کے فتنے کو فرو کرنے میں مشغول ہیں حالانکہ وہ انگلستان سے روانہ ہو کر سوئٹزرلینڈ میں ٹھہر گئے تھے۔

جنگ عظیم کے آثار بجز چند سربرآوردہ سیاستیں اور بعض اولو العزم شہنشاہوں کے اور کسی کو نظر بھی نہ
آتے تھے اور جب کہ حکومت ترکی اپنے ہمسایوں سے تنگ تھی اور افریقہ کے مقبوضات کھوتی جارہی
تھی۔ سر ہنری مک موہن نے جو مصر میں حکومت برطانیہ کی حکمت عملی کے کارپرداز تھے شریف حسین
کو ایک خط لکھا تھا جس میں انھوں نے یہ وعدہ فرمایا تھا کہ اگر عرب اپنی آزادی کا اعلان کر دیں تو
حکومت برطانیہ ان کی مدد کرے گی۔ جنگ عظیم کے پرآشوب زمانے میں انگریز جاسوس اور گماشتوں
نے عرب کے ہر گوشے میں پھر پھر کر جس طرح بدویوں کو ترکی حکومت کے خلاف بغاوت پر آمادہ
کیا وہ اب کوئی راز نہیں ہے۔ مکہ پر شریف حسین کا قبضہ ہو گیا تھا لیکن مدینے کے باہر ابھی
فیصل مع اپنی فوج کے پڑے ہوئے تھے اور ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کریں کہ انگریز عمرو عیار
لارنس نمودار ہوا، اس کا بیان ہے کہ فیصل کو دیکھ کر اس نے معلوم کر لیا کہ یہی شخص عرب کو متحد اور
ان کے جذبات کو برانگیختہ کر سکتا ہے۔ چنانچہ لارنس نے فیصل کو عرب کے گوشے گوشے میں پھرایا
اور ان کی قابلیت اور صلاحیت کے ایسے گیت گائے کہ عربوں کی ایک بہت بڑی جماعت ان کے
ساتھ ہو گئی۔ اس زمانے میں جب امید و بیم کی حالت تھی فیصل اپنے ساتھیوں سے جو عہد لیتے تھے وہ
یہ تھا۔ "ہم ٹھیریں گے جب تم ٹھیرو گے، ہم چلیں گے جب تم چلو گے، کسی ترک کی فرماں برداری
نہ کریں گے، کسی عربی نژاد کے ساتھ برا برتاؤ نہ کریں گے، اور آزادی پر جان، مال، اہل و عیال
کو قربان کریں گے" جنگ عظیم ختم ہوئی اور حلیفوں نے "تقسیم قبور" شروع کی تو فیصل کی
ذہانت کام آئی اور نتیجہ یہ ہوا کہ برطانوی سیادت میں عراق کا بادشاہ فیصل کو بنایا گیا، اور انجمن
اقوام نے اس فیصلے پر اپنی مہر ثبت کی۔

انگریزوں کی 'ولایت' میں بلوغ کے بعد کی مختصر مدت میں بھی امیر فیصل کی حکومت
بہت کامیاب رہی عراق میں نسبتاً امن رہا، تعلیم اور حفظانِ صحت کا خیال کیا گیا۔ غرض عوام
کی حالت نہ صرف طوائف الملوکی کے زمانے سے بلکہ ترکی حکومت کے دور سے بھی بدرجہا بہتر
رہی۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ آزاد ہونے کے بعد امیر فیصل کا رویہ انگریزوں کے ساتھ ایک طرف اور

عوام کے ساتھ دوسری طرف کیسا رہتا۔ لیکن دست اجل نے اس کا موقع نہ دیا اور امیر فیصل کی روح عین اس زمانے میں قبض کی جب برطانیہ کا دست شفقت ان کے سر سے ہٹا تھا اور ان کو ناصح مشفق سے چھٹکارا ملا تھا۔ یہ زمانہ ان کی آزادی کا تھا، قفس سے نکل کر گلشن کی سیر کا تھا، مگر صیاد برطانیہ سے چھوٹتے ہی صیاد اجل نے آگھیرا، اور امیر فیصل کی روح کو قفس عنصری سے پرواز کرنا پڑا۔

مورخ کا قلم جب بھی عرب کے دور حاضر کی تاریخ لکھے گا تو امیر فیصل کے نامۂ اعمال میں ایک طرف تو عرب کی آزادی کی خواہش اور جواں مردی سے اس آزادی کو حاصل کرنے کی کوشش کا چمکتا ہوا نشان لگائے گا اور دوسری طرف استعمار برطانوی کی مدد کا سیاہ دھبا اپنی حکومت سے اس دھبے کی سیاہی کو امیر فیصل نے بہت کچھ کم کر دیا ہے اور اگر یہ ناگہانی موت نہ آجاتی تو غالباً اس نشان کی سیاہی روشنی سے بدل جاتی لیکن کارکنانِ قضاوقدر کو یہ منظور نہ تھا، ممکن ہے کہ ان کے فرزند ارجمند امیر غازی اپنے کارہائے نمایاں سے خاندانِ شریفی کی پیشانی سے اس بدنما داغ کو مٹا سکیں۔ ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا اس لئے کہ وہ ابھی کم سن ہیں اور ناتجربہ کار بھی۔

شذرات

۳۱ اگست کو ۵ بجے شب کے وقت اردو اکادمی کی طرف سے بجے ، این ، سا آہنی صاحب ایڈیٹر "نیشنل کال" کی صدارت میں ایک مباحثے کا جلسہ منعقد کیا گیا ۔ جناب آصف علی صاحب بیرسٹر نے یہ تجویز پیش کی کہ " موجودہ حالت میں قوم پرور جماعت کا مجالس آئین ساز کو نظر انداز کرنا ملک اور قوم کے مفاد کے منافی ہے " موصوف نے ابتدا ہی میں اس بات کو صاف کر دیا کہ تجویز کے معنی یہ نہیں کہ قوم پرور جماعت آئندہ انتخابات میں کونسلوں میں جانے کا فیصلہ کرے بلکہ صرف اس خیال کو جو ترک موالات کے آغاز کے زمانے سے پھیل گیا ہے دور کرنا مقصود ہے کہ کونسل میں جانا ہر محب وطن اور آزادی کے پرستار قوم پرور فرد کے لئے اصولاً ناجائز ہے ، آپ نے ہندوستان میں آئین ساز مجلسوں کی نشو و نما کی مختصر تاریخ بیان کی اور یہ دکھایا کہ ایک خاص منزل پر پہنچ کر کانگریس نے بعض مصالح کی بنا پر کونسلوں کا مقاطعہ کیا اس کے بعد پھر شرکت کی اور کچھ دن بعد پھر الگ ہو گئی اس کی طرز عمل کی تبدیلیوں پر غور کیا جائے تو یہ بات نظر آتی ہے کہ دونوں مرتبہ مقاطعہ اس غرض سے کیا گیا کہ کانگریس والے مل کر سول نافرمانی کی تحریک کو چلائیں اور بیچ میں اس کے ترک کرنے میں یہ مصلحت تھی کہ ملک سول نافرمانی سے تھک گیا تھا ، اسے ملتوی کرنا ضروری تھا ۔ کانگریس کی جماعت میں سے بعض لوگ معاشرتی اور اقتصادی اصلاح کے کاموں میں لگ گئے مگر جو لوگ خالص سیاسی مذاق رکھتے تھے انھوں نے بجائے اس کے کہ اپنی قوت کو منتشر اور معطل کر دیں اس کا رخ کونسلوں کی طرف پھیر دیا اور جب تک کہ دوبارہ سول نافرمانی کا موقع نہیں آیا وہ کم و بیش مفید طریقے سے وقت گذارتے رہے۔ سول نافرمانی کی دوسری اور تیسری تحریک ختم ہونے کے بعد اب پھر وہی صورت حال درپیش ہے ، اس مرتبہ نئی بات یہ ہے کہ کونسلوں کی اہمیت پہلے سے بہت زیادہ بڑھنے والی ہے ، حلقۂ انتخاب دس گنا ہونے والا ہے ملتے بڑے حلقے پر انتخابات کے زمانے میں اثر ڈالنے کا موقع ایک نہایت زبردست موقع ہے ، اسے تمام تر خوشامد پسند اور رجعت پسند جماعتوں کے لئے چھوڑ دینا دانشمندی سے

بعید ہے، پھر کونسلوں کے اختیارات بھی بڑھ رہے ہیں۔ ان کی قوت کو حقیر سمجھ کر نظر انداز کرنا ناممکن ہے، قوم پرور جماعت یعنی کانگرس کو پوری طرح اس مسئلے پر توجہ اور غور کرنا چاہئے کہ اس کا طرز عمل آئندہ انتخاب کے موقع پر کیا ہو۔ خواہ کانگرس والے خود کونسلوں میں جائیں یا کسی دوسری پارٹی کی تائید کریں یا اس بات کی کوشش کریں کہ کوئی منتخب نہ ہو، بہر حال اس وسیع حلقۂ انتخاب سے کسی نہ کسی طرح کام ضرور لینا چاہئے۔

جناب نور الدین صاحب بیرسٹر نے اس تجویز کی سختی سے مخالفت کی، آپ نے کانگرس کی تاریخ پر تبصرہ کرتے ہوئے دکھایا کہ یہ ابتدا میں خوشامد کے ذریعے حقوق مانگنے والوں کی ایک مختصر جماعت تھی اور اس کی یہ حالت کم و بیش اس وقت تک رہی جب اس نے ترک موالات کا اصول اختیار کر کے غیرت اور خودداری کا ثبوت دیا۔ اسی وقت سے اس کی قوت اور اثر بڑھنا شروع ہوا۔ ابھی اس میں اتنی سکت نہیں کہ تلوار کے ذریعے آزادی حاصل کرے اس لئے اس نے سول نافرمانی کی راہ اختیار کی ہے، جو مقابلتہً محفوظ ہے، اگر وہ اس راہ پر بھی نہیں چل سکتی تو بجائے اس کے کہ پھر کونسلوں کے بھیر میں پڑے جس میں برسوں تضیع اوقات کر کے ذلت اور نقصان برداشت کر چکی ہے اُسے چاہئے کہ قوم کی معاشرتی اقتصادی تعلیمی اصلاح کا تعمیری کام کرے۔ اسی چیز سے آزادی کی بنیادیں مضبوط ہوں گی۔ اور بیداری روشن خیالی، مرفہ الحالی پیدا ہو گی، جو آزادی کی روح ہے، ورنہ جمہوری ادارے جن میں کونسل بھی شامل ہے محض بے جان ڈھانچے ہیں۔

ان حضرات کے علاوہ ڈاکٹر عبد العلیم صاحب، سید محمد صاحب ٹونکی نے تجویز کی تائید میں اور شفیق الرحمٰن صاحب قدوائی، فرید الحق صاحب انصاری بار ایٹ لا۔ اور خواجہ احمد عباس صاحب نے مخالفت میں تقریریں کیں۔ آخر میں آصف علی صاحب نے ایک نہایت پر جوش تقریر میں مخالفین کا جواب دیا۔ اور پھر جناب صدر نے اپنے آخری خطبے میں کل بحث پر تبصرہ فرمایا۔ جس کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ موئدین اور مخالفین

دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ کونسلوں کے ذریعے سے حقیقی آزادی نہیں مل سکتی، اور کونسلوں کی حالت جواب ہے اس کے لحاظ سے ان میں شرکت کرنا کسی طرح مناسب نہیں۔ اختلاف صرف اس امر میں ہے کہ نئے دستور اساسی کے ماتحت جو کونسلیں وجود میں آئیں گی ان میں عارضی طور طور پر شرکت کرنا مفید ہے یا نہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ابھی اس بات کا فیصلہ کرنا قبل از وقت ہے۔ انگلستان کی سیاسی حالت میں ہر طرح کی فوری تبدیلیوں کے امکانات ہیں کوئی نہیں کہہ سکتا کہ نئے دستور اساسی کی کیا شکل ہو جائے گی اور نئی کونسلیں کیسی ہوں گی، آدھی رات کے قریب جناب صدر کے شکریئے پر جلسہ ختم ہوا۔

مباحثہ ہر لحاظ سے نہایت کامیاب رہا۔ حاضرین کی تعداد چار سو سے کم نہیں تھی۔ تقریریں اس قدر دلچسپ تھیں کہ چار گھنٹے تک سب لوگ نہایت شوق سے سنتے رہے اور بار بار اپنے جوش کا اظہار نعرہائے تحسین سے کرتے رہے۔


رجسٹرڈ
نمبر ۱۰۵۴۲
جامعہ
جامعہ ملیہ کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ
جلد ۲۱
بابت ماہ نومبر ۱۹۳۲ع
نمبر ۶
مطبع جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی
1927

نقشِ آخر (ڈراما)

مصنفہ

پروفیسر اشتیاق حسین قریشی ایم اے

اس ڈرامے میں غدر دہلی کے حالات، قدیم مغلیہ تہذیب کا مٹنا، انگریزوں کا تسلط، اور اہل دہلی پر ہولناک مظالم اس انداز میں بیان کئے ہیں کہ پڑھنے والے بے اختیار ہو جاتے ہیں۔ آخری تاجدار دہلی کی بے بسی اور اہل فن و کمال کے مصائب خون کے آنسو رلاتے ہیں۔ اور ۵۷ء کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔

غدر کے زمانے میں جو لوگ دہلی چھوڑ کر ادھر اُدھر چلے گئے تھے پھر واپس لوٹتے ہیں۔ اور اپنے آباد محلے ویران اور بستیاں کھنڈر پاتے ہیں۔

اس وقت قوم کو کسی طرف سے کوئی شعاع امید نظر نہیں آتی اور تمام دماغوں پر مایوسی کی تاریکی مستولی ہو جاتی ہے۔ . . . عین اسی تاریکی میں سرسید احمد خاں پیدا ہوتے ہیں جن کا تعلیمی پروگرام قومی دماغ میں ایک بڑا ہیجان پیدا کر دیتا ہے۔

ڈراما یہیں پر ختم ہو جاتا ہے۔ اور مطالعہ کرنے والے کو ایک گہرے غور و فکر میں چھوڑ جاتا ہے۔

قیمت صرف دس آنے (۱۰/)

مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

تصانیف پروفیسر سجاد مرزا بیگ صاحب

الاستدلال

اس کتاب میں علم منطق کے اصولوں کو سلیس زبان میں سہل طریقہ سے بیان کیا گیا ہے۔ یہ کتاب عقل و معلومات کو بڑھاتی اور صحیح دلیل کرنا سکھاتی ہے۔ قیمت ۸؍

الانسان

یہ کتاب انسان اور اس کے کوائف قلبی خیالات جسمانی اور اس کے گرد و پیش کے واقعات کا ایک جامع و مانع نقشہ ہے۔ قیمت ۱۲؍

الفہرست

اس میں اردو کی تصنیف شدہ کتابوں کے ناموں کے علاوہ اُن کے مصنفین کے نام۔ ان کے ملنے کے پتے اور ان کی جائے طبع سب تفصیل کے ساتھ درج ہیں۔ قیمت دس روپیہ

حکمت عملی

یہ کتاب فلسفۂ عملی پر ایک مبسوط اور جامع کتاب ہے۔ فلسفۂ عملی کی ہر شاخ کو لیا ہے اور ایک ایک کا مستقل عنوان قائم کرکے اس پر نہایت تفصیل سے بحث کی ہے۔ قیمت ۸؍

ملنے کا پتہ

مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

ٹیلیفون نمبر ۵۵۹۶

نئی شان دیسی

مصفی

طبّ یونانی کا تازہ کرشمہ

انسان کی زندگی کا مدار خون پر ہے۔ خون اگر خراب ہوگیا ہے تو آدمی کی تندرستی قائم نہیں رہ سکتی، ہندوستانی دواخانہ دہلی "مصفی" ایجاد کرکے تمام ملک کو مقابلے کی دعوت دیتا ہے اور بلا خوف تردید دعویٰ کرتا ہے کہ صفائی خون کے لئے "مصفی" سے بہتر دوا آج تک نہ ایشیا پیش کرسکا ہے اور نہ یورپ۔

"مصفی" ہندوستان کی جڑی بوٹیوں کا خلاصہ ہے اور مسیح الملک ثانی حکیم حاجی محمد احمد خاں صاحب کے مشورے سے جدید سائنٹیفک طریق پر تیار کیا گیا ہے۔ خون کی خرابی سے پیدا ہونے والے ہر مرض کی تیر بہدف دوا ہے، کھجلی، داد، پھنسیاں وغیرہ حتیٰ کہ سوزاک، آتشک، جذام کا زہریلا مادہ بھی اس کے استعمال سے ہمیشہ کے لئے نابود ہوجاتا ہے۔ اس کی ایک خوراک چائے کا ایک چمچہ ہے، اور بلحاظ نفع مصفی درحقیقت اکسیری چیز ہے

قیمت ۲۴ خوراک صرف عہ علاوہ محصولڈاک

ترکیب استعمال۔ ایک خوراک صبح، ایک شام تھوڑے پانی میں ملاکر اور اگر مرض کا جوش زیادہ ہو تو دن میں تین مرتبہ استعمال کیا جائے

ملنے کا پتہ

ہندوستانی دواخانہ پوسٹ بکس ۲۲ دہلی سے طلب کیجئے

مسلمان وہی ہے جو قرآن پر عمل کرے

حضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے جب لوگوں کو قرآن کی تعلیم سے آگاہ کیا۔ تو ہر شخص نے اس کو سمجھنے اور اُس پر عمل کرنے کی کوشش کی۔ اُنہوں نے دیکھا کہ قرآن پر عمل کرنا نہایت آسان اور اصلاح حال کیلئے بیحد ضروری ہے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اسلام آناً فاناً دنیا کے ہر گوشہ میں پہنچ گیا۔ اور مسلمانوں کی حکومتیں تمام ممالک میں جال کی طرح پھیل گئیں۔

آہستہ آہستہ مسلمانوں کی توجہ قرآن سے ہٹ کر دوسرے مشاغل کی طرف بٹنے لگی منطق و فلسفہ اور کلام بلاغت کی گتھیوں میں اُلجھنے لگے تا آنکہ یہ دور بد آیا جس میں سے ہم گذر رہے ہیں کہ قرآن حروف میں لکھا ہوا تو موجود ہے مگر اُس کی تعلیم کا اثر کسی کے سینے میں نہیں۔ وجہ صرف یہ ہے کہ مسلمان اور تمام علوم حاصل کر سکتا ہے۔ مگر قرآن کو با ترجمہ پڑھنے سیکھنے اور سمجھنے کی اُسے فرصت نہیں پس جب پڑھنے والے نہ رہے تو ایک ایک کرکے پڑھانے والے بھی اُٹھ گئے۔

آج قرآن پاک نہ کوئی سمجھتا ہے نہ سمجھاتا ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ ہماری موجودہ پستی، زوال، اور قابل رحم حالت ہے۔ افسوس اگر کوئی قرآن کو سمجھتا بھی ہے تو اُس پر عامل نہیں۔ کیونکہ آج اُسکے سامنے ناموس شریعت کی خاطر مدد لگانے والا نہ کوئی ابوبکرؓ ہے نہ عمرؓ!

پس آؤ قرآن پڑھو۔ اور پڑھاؤ۔ کہ یہی سرمایہ دین و دنیا ہے۔ ہمارے ہاں جو قرآن پاک مترجم چھپا وہ اس قدر آسان فہم اور مقبول ہے کہ پہلے پاروں کا پہلا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ ختم ہو کر دوسرا ایڈیشن زیر طبع ہے۔ قرآن مجید قسم اول ششش رنگہ معہ ترجمہ موسومہ بہ مطالب الفرقان فی ترجمۃ القرآن ہدیہ بجلد فی پارہ عہ مجلد [illegible]

قسم دوم سہ رنگہ ۱۲/ـ

مفصل حالات اور نمونے کے صفحات مفت طلب فرمائیں

نیاز مند

منیجر پیکو آرٹ پریس بیرون موچی دروازہ لاہور

ذکریٰ ولادت نبوی پر مولانا ابوالکلام کا زبردست مضمون ہے۔ قیمت ۲ر

بشریٰ اسلام میں خدا کا تخیل کیا ہے؟ از علامہ سید سلیمان ندوی۔ قیمت ۱ر

الورد والریحان چند قابل حفظ احادیث کا انتخاب ہے قیمت ۱ر

ہمارا دین ارکان اسلام کی خوبیاں عام فہم اور سلیس زبان میں۔ قیمت ۱ر

کتاب الشفعہ معہ ترجمہ آنریبل سید محمود مرحوم نے مسئلہ شفعہ کو اس کتاب میں مجمع البحرین فتاویٰ قاضی خاں اور عینی سے جمع کردیا ہے۔ قیمت ۱۲

الفوز الکبیر اردو حضرت مولانا شاہ ولی اللہ مرحوم کی اصول تفسیر پر یہ ایک مختصر اور جامع کتاب ہے قیمت ۱ر

المدنیۃ والاسلام اس میں اسلامی تعلیمات پر اصول تمدن کے نقطۂ نظر سے بحث کی گئی ہے۔ قیمت ۸ر

تاریخ

تاریخ مغربی یورپ ہسٹری آف ویسٹرن یورپ کا ترجمہ، وہاں کی معاشرت علم و فن اور سیاسی اداروں کی تدریجی ترقی کا تفصیلی ذکر۔ قیمت ۱۲

تاریخ ہند قدیم کے۔ ایم۔ پانیکر کی کتاب جسے موصوف نے جامعہ کے شعبہ تصنیف و تالیف کی درخواست پر لکھا تھا۔ قیمت ۸ر

تاریخ الدولتین خلافت بنی امیہ اور بنی عباس کے عہد حکومت کی مختصر اور جامع تاریخ، از نیاز فتحپوری قیمت ۱۲

تاریخ نجد نجدیوں کے مذہبی عقائد۔ سیاسی حالات اور طرز معاشرت پر مکمل کتاب ہے قیمت عہ

تاریخ الامت ابتدا سے لیکر خلافت عثمانیہ تک اسلام کی مستند تاریخ سات جلدوں میں قیمت ...

۱۔ سیرۃ الرسول ۱۲ — ۲۔ خلافت راشدہ ۱۲

۳۔ خلافت بنی امیہ ۱۲ — ۴۔ عباسیہ (قسم دوم) ۱۲

۵۔ عباسیہ بغداد ۱۲ — ۶۔ عباسیہ مصر ۱۲

حصہ ہفتم خلافت عثمانیہ عہ

سوانح عمریاں

جمال الدین افغانی مقالہ اردو اکادمی قاضی عبدالغفار صاحب کی برسوں کی ریسرچ کا نتیجہ قیمت ۸ر

سیرت محمد علی مولانا محمد علی کی سوانح حیات صفحات چھ سو متعدد تصاویر قیمت ۵ر

تلاش حق گاندھی جی کی آپ بیتی ۷۰۰ صفحات قسم اول ۱۲ ۔ قسم دوم عہ

ضیاء الدین برنی عہد تغلق کے نامور مورخ کے حالات اور اس کی تاریخ پر تبصرہ قیمت ۱۲

جمال الدین
اخوت اسلامی کے پرجوش داعی سید جمال الدین افغانی کے حالات طلباء کے لئے آسان زبان میں قیمت ۸ر

اورنگ زیب
اورنگ زیب پر اعتراضات کے جواب از شبلی نعمانی مرحوم قیمت ۴ر

سیرۃ عمرو بن العاص
نامور فاتح مصر کے حالات قیمت ایک روپیہ عہ ر

حیات حافظ
حضرت خواجہ حافظ کی زندگی کے حالات اور ان کی شاعری پر تبصرہ قیمت ۱۲ر

حیات جامی
فارسی کے شاعر مولانا نورالدین جامی کے حالات اور ان کے تصوف پر بحث قیمت ۸ر

ٹالسٹائی
مشرق کے مصلح، انسانیت کے شیدائی ٹالسٹائی کے حالات قیمت ۱۲ر

خادمات خلق
یورپ اور امریکہ کی چند پاک سیرۃ خواتین کے حالات۔ قیمت ۱۰ر

جہاں آرا
شاہجہاں کی فاضل بیٹی جہاں آرا بیگم کے حالات اور کارنامے۔ قیمت ۸ر

ادب

سیر المصنفین
ادب اردو کی ایک پسند تاریخ جلد اول عہ ۔ جلد دوم سے

کیمیاگر
چند اخلاقی، ادبی مختصر افسانوں کا مجموعہ قیمت عہ ر

نیرنگ
ایک خاتون کے بارہ ادبی مضامین اور ایک ڈرامے کا مجموعہ۔ قیمت عہ ر

مضامین رسالہ جوہر
جامعہ ملیہ کے قلمی رسالہ جوہر کے مضامین کا مجموعہ۔ قیمت عہ ر

دیوان غالب (جرمنی)
جس میں مرزا کا خود نوشتہ مقدمہ، غزلیات، قصائد اور رباعیات ہیں۔ پاکٹ سائز، خوبصورت جلد مع غالب کی سہ رنگی تصویر۔ جرمن ہنرمندی کا اعلیٰ نمونہ۔ قیمت قسم اول عہ ۔ قسم دوم عہ ر

دیوان شیدا (جرمنی)
مسیح الملک حکیم اجمل خاں کے فارسی اور اردو کلام کا مجموعہ۔ عہ

کلام جوہر
مولانا محمد علی کے جدید و قدیم کلام کا مجموعہ مع مقدمہ مولانا عبدالماجد دریابادی ۸ر

جوہر ملیہ
دس تاریخی نظموں کا مجموعہ درس میں داخل ہے۔ قیمت ۳ر

انتخاب میر	۱۲ر	نالۂ مشیر	عہ ر
انتخاب سودا	۱۲ر	کلام مشیر	عہ
انتخاب حسرت	۱۲ر	نامۂ شبیر	۸ر
مسدس حالی	۸ر	لیلۃ القدر	۱ر

دیوان غالب، مطبع جامعہ ۸ر

چند اچھے ڈرامے

پردۂ غفلت	عہ ر	گناہ کی دیوار	۸ر
کمینی	۴ر	ضیدزبوں	۱۰ر
نقش آخر	۱۰ر	ہمزاد	۶ر

متفرق

مبادی معاشیات — پروفیسر ایڈون کینن کی معاشرت پر مشہور کتاب ہے۔ بترجمہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب ایم اے پی ایچ ڈی، قیمت ۱۲؍

نفسیات شباب — نوجوانوں کی نفسی سیرت انکی تخئیلی زندگی عشق تصورکائنات اور اخلاقی نشوونما پر بحث۔ ترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم اے پی ایچ ڈی۔ قیمت ۳؍

قوم کی آواز — گاندھی جی کی گول میز کانفرنس کی تقریریں اور سفر کے حالات ترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ۱۲؍

آزادی — مشہور سیاست داں مل کی کتاب لبرٹی کا ترجمہ ۱۲؍

مالیات عامہ — ہندوستان کی موجودہ اقتصادی حالت پر مالیات عامہ کے اثرات اور ہمارے افلاس کے اسباب قیمت ۱؍

مشاہدات سائنس — سائنس پر بارہ مختلف مضامین از سید محمد عمر صاحب جعفری بی اے ایم اے پی (برلن)

تاج آفرینش — مصر کی اہل قلم خاتون ملک خانم کے چند نسوانی اصلاحی مقالات۔ قیمت ۱؍

میلاد النبی پروجکٹ — میلاد النبی پر بچوں کی تیاری اور کام کے نمونے قیمت ۶؍

باغبانی پروجکٹ — جدید طریقہ تعلیم کے ماتحت بچوں سے باغیچہ میں کام لیتے ہوئے کس طرح پڑھنا لکھنا سکھایا گیا ہے ۴؍

اسلامی تہذیب	۴؍	خطبہ شیخ الہند	۴؍
قومی تعلیم	۴؍	خطبہ مسیح الملک	۴؍
مسلمانوں کی تعلیم اور جامعہ	۴؍	صلاح کار	۸؍
قواعد عربی	۱۲؍	آزادی ہند	۳؍

نہرو رپورٹ مکمل ۱۲؍

بچوں کی درسی کتابیں

آخری نبی	۳؍	سیرۃ الرسول (خورد)	۱۰؍
ہمارے نبی	۳؍	خلافت راشدہ	۱۰؍
آنحضرت	۴؍	عباسیہ بغداد	۱۲؍
ہمارے رسول	۸؍	اسلامی عقائد	۱؍
سرکار کا دربار	۶؍	ارکان اسلام	۱۲؍
سرکار دو عالم	۸؍	اچھی باتیں	۴؍
چار یار	۸؍	بچوں کا قاعدہ	۴؍
خلفائے اربعہ	۱۲؍	رہنمائے قاعدہ	۴؍
بچوں کی پہلی کتاب	۴؍	مشق خوش نویسی	۱؍

بچوں کے لئے ڈرامے

بچوں کا انصاف	۴؍	شریر لڑکا	۴؍
محنت	۴؍	دیانت	۴؍
اسکول کی زندگی	۴؍	قوم پرست طالب علم	۴؍

بچوں کے لئے اچھی کتابیں

تعلیمی کھیل	۱؍	بچوں کی نقلیں	۸؍
ترکوں کی کہانیاں	۴؍	تاریخ ہند کی کہانیاں	۳؍

عجائب خانہ سمندر ۱۲؍

آسان خوش خطی — ہندوستان کے مشہور خطاط منشی علی محمد خاں صاحب کی لکھی ہوئی خوشخطی کی کاپیاں جن پر لکھنے سے بغیر استاد کی مدد کے بچے اپنا خط اچھا کر سکتے ہیں۔ چار حصے۔ قیمت فی حصہ ۱؍

مکمل سٹ قیمت ۴؍

مکتبہ جامعہ دہلی

جامعہ

زیر ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے۔ پی ایچ۔ ڈی

نمبر ۶	بابتہ ماہ دسمبر ۱۹۲۳ء	جلد ۲۱

فہرست مضامین

(باہتمام محمد مجیب بی۔ اے (آکسن) پرنٹر و پبلشر مطبع جامعہ ملیہ دہلی میں چھپا)

سلطان محمد تغلق کا دہلی کو اجاڑنا اور دولت آباد کو دارالسلطنت بنانا

دہلی کئی بار بسی اور اجڑی لیکن اس کی تاریخ میں ایسا انوکھا واقعہ جیسا کہ محمد تغلق کے زمانے میں گذرا کبھی پیش نہیں آیا۔

محمد تغلق ۷۲۵ھ میں تخت نشین ہوا تو دہلی باوجود متعدد انقلابات کے نہایت آباد اور پر رونق تھی۔ آئے بک نے اسے ۵۸۸ھ میں فتح کرکے ۶۰۲ھ میں ہندوستان کی اسلامی سلطنت کا دارالحکومت بنایا تھا۔ اس وقت بھی دہلی کا حصار شمالی ہند کا ایک مشہور قلعہ تھا لیکن اسلامی حکومت کا مرکز بننے کے بعد دہلی دن دونی رات چوگنی ترقی کرتی چلی گئی۔

آئے بک نے اس میں قصر دولت خانہ تعمیر کیا جہاں محمد تغلق کے وقت تک اکثر مسلمان سلاطین دہلی کی رسم تخت نشینی ادا ہوتی تھی۔ ایل تمش اور بلبن نے اس میں بہت سی عمارتیں بنوائیں جن میں جامع مسجد اور اس کا مشہور عالم مادنہ اور حوض شمسی اول الذکر کے عہد کی اور کوشک لعل مؤخرالذکر کے زمانے کی خاص یادگاریں تھیں۔

بلبن کے رنگیلے جانشین کیقباد نے کیلوکھری میں جو شہر نو کہلاتا تھا ایک نئے شاہی قصر کی بنیاد جمنا کے کنارے ڈالی، اور جب سلاطین غلامان کے اس اخیر تاجدار کے بعد تخت سلطنت خلجیوں کے پہلے بادشاہ جلال الدین خلجی کو منتقل ہو گیا تو اس نے بھی وہیں سکونت اختیار کرکے ایک نیا حصار اور نیا شہر آباد کر دیا۔

علاء الدین خلجی بادشاہ ہوا تو پہلے وہ قدیم دہلی میں بلبن کے بنوائے ہوئے کوشک لعل میں رہتا تھا اور اس نے قدیم دہلی ہی کو مرکز سلطنت بنایا تھا لیکن مغلوں کے استیصال کے بعد اس نے سیری میں اپنا نیا کوشک بنا لیا جہاں اس کے بعد اس کا جانشین قطب الدین خلجی بھی رہتا تھا جس نے اپنے زمانے میں سیری کا حصار اور دوسری عمارتیں جن میں قصر ہزار ستون خاص طور پر مشہور تھا بنوائیں۔

علاء الدین اور قطب الدین کے زمانے میں دہلی نے بڑا عروج حاصل کر لیا تھا جسے خسرو خاں کے ہنگامے اور لڑائی میں کافی صدمہ پہنچا۔

محمد تغلق کا باپ غیاث الدین بادشاہ ہوا تو اس نے تغلق آباد کا قلعہ بنوایا اور اسے اپنا دارالحکومت قرار دیا اور اس کی خوش انتظامی سے دہلی کی رونق بحال ہو گئی۔

محمد تغلق تغلق آباد میں تخت نشین ہوا لیکن اس نے چالیس دن بعد قدیم دہلی میں آ کر دولت خانے کے پرانے شاہی تخت پر جلوس کی رسم ادا کی۔

اس نے ایک نیا شہر بسانا چاہا اور سیری اور قدیم دہلی کے حصاروں کے بیچ میں جو وسیع رقبہ پڑا تھا گھیر کر جہاں پناہ نام رکھا اور اسی میں اپنے لئے شاہی محل بنوایا۔

الغرض تقریباً ڈیڑھ سو برس میں دہلی اتنی پھیلی کہ اس کے آغوش میں پانچ دارالسلطنت یعنی قدیم دہلی، کیلوکھری، سیری، تغلق آباد اور جہاں پناہ سمائے ہوئے تھے۔

ان میں سے ہر ایک شہر میں شاہی کوشک، عالیشان مساجد و مدارس اور سر بفلک عمارات جو دنیا میں اپنا نظیر نہ رکھتی تھیں موجود تھیں اور ہر ایک شہر علیحدہ حصاروں سے گھرا ہوا تھا۔

تاتاریوں کی یورشوں سے وسط ایشیا کے اسلامی ممالک جو شائستگی کے گہوارے بنے ہوئے تھے زیر و زبر ہو کر رہ گئے تھے، اور ہر طرح کے ہنر مند لوگ ان ملکوں سے جوق جوق دہلی میں آ بسے تھے اور ملکی و غیر ملکی باکمالوں سے ہندوستان کا دارالسلطنت بھرا پڑا تھا۔

محمد شاہ تغلق کے مزاج میں ضرور کچھ جنون کا شائبہ شامل تھا، اس کے دماغ کا توازن بہت کم صحیح رہتا تھا۔ اسے اکثر نئی نئی اور دور کی باتیں سوجھتی تھیں اور جو بات ایک دفعہ دھیان میں آ جاتی پھر ناممکن تھا کہ اس سے ہٹ جائے۔

جب وہ بادشاہ ہوا تو سلطنت علاء الدین خلجی کی فتوحات کے باعث اقصائے دکن تک پھیلی ہوئی تھی۔ دیوگیر کا شہر ان نو مفتوحہ علاقوں سے زیادہ قریب ہونے کے باعث انتظام کے لئے نہایت موزوں تھا۔

محمد تغلق اپنے باپ کے زمانے میں دکن کی مہموں پر جا چکا تھا اور دیوگیر اس کا دیکھا ہوا مقام تھا۔ بادشاہ ہوا تو اسے خیال آیا کہ دولت آباد کے نام سے دیوگیر کو اسلامی سلطنت کا دارالسلطنت بنائے۔

اس منصوبے کو پورا کرنے کے لئے اس نے دہلی کو اجاڑ ڈالا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دہلی کو کبھی وہ بات حاصل نہیں ہوئی جو ڈیڑھ سو برس کی مسلسل ترقیوں سے پیدا ہو گئی تھی۔ کچھ عرصے کے لئے دولت آباد ضرور دارالسلطنت اور ایک بڑا شہر بن گیا لیکن بہت جلد وہ دہلی کی سلطنت سے ایک نئی آزاد اسلامی حکومت یعنی دکن کے بہمن شاہیوں کا پایۂ تخت قرار پا گیا۔

دہلی کے اجاڑنے کے واقعات تین تاریخی ماخذوں میں، جو بنیادی حیثیت رکھتے اور ایک دوسرے سے جدا ہیں، پائے جاتے ہیں۔ تاریخ فیروز شاہی جس کا مصنف ضیائے برنی محمد تغلق کا مصاحب تھا۔ دوسرا ابن بطوطہ کا سفرنامہ جس کا مصنف اس ویرانی کے کچھ عرصے بعد ہی دہلی میں پہنچا تھا اور تیسرے تاریخ مبارک شاہی جو ۸۳۸ھ میں لکھی گئی تھی لیکن جس کی معلومات کچھ ایسی تاریخی کتابوں سے لی گئی ہیں جو اب مفقود و نامعلوم ہیں۔

ان تینوں ماخذوں پر غور کرنے سے صحیح حالات معلوم ہو جاتے ہیں جنھیں ہم تفصیل سے لکھنا چاہتے ہیں۔

صاحب تاریخ مبارک شاہی لکھتا ہے:-

"۷۲۷ھ میں سلطان محمد نے دیوگیر کا ارادہ کیا۔ دہلی سے دیوگیر تک ہر کوس پر ایک دھاوا آباد کیا اور دھاوے والوں کو وہیں زمینیں دے دیں کہ ان کے محصول سے تنخواہیں لیتے رہیں۔

شاہی ڈاک لانے والے کو کھاٹ پر بٹھا کر ایک دھاوے سے دوسرے دھاوے تک پہنچا دیا جاتا تھا۔ ہر منزل پر ایک کوٹھا "ڈکوشک"، اور ایک خانقاہ بنا دئے گئے تھے اور وہاں ایک شیخ رہتا تھا۔ ہر وقت کھانا موجود رہتا تھا۔ مسافر کو کھانا، شربت،

پان اور ٹھہرنے کو جگہ ملتی۔ راستے کے دونوں طرف پاس پاس پیڑ لگا دئے گئے تھے۔ دیوگیر کا دولت آباد نام رکھ کر دار الملک بنا دیا گیا۔

بادشاہ کی ماں مخدومۂ جہاں کے ساتھ تمام امرا ملوک اور سربرآوردہ اور مشہور لوگ مع بادشاہ کے خاص آدمیوں، غلاموں اور ان کے اہل و عیال، ہاتھی، گھوڑے، دفینے، خزانے سب دہلی سے دولت آباد پہنچ گئے۔

مخدومۂ جہاں کے پہنچ جانے پر سادات و مشائخ اور علما و اکابر دہلی کو بھی دولت آباد بلایا گیا۔ جب سب وہاں پہنچ کر زمیں بوس کی عزت سے مشرف ہوئے تو پہلے سے دو چند انعام اور وظیفے دئے گئے اور گھروں کی تعمیر کے لئے روپیہ الگ ملا۔ سب خوش ہو گئے۔ (صفحہ ۹۹)۔

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت بھی بعض لوگ دیوگیر جانے سے خوش نہ تھے چنانچہ ملک بہادر گرشاسپ بخشی فوج نے دوران سفر میں بغاوت کر دی اور اس کے استیصال کے لئے بادشاہ کے وزیر خواجہ جہاں کو آنا پڑا۔ اسی طرح بہرام ایبہ کو جو ملتان کا حاکم تھا دیوگیر بلایا گیا تو اس نے انکار کر دیا اور مقابلے کے لئے تیار ہو گیا۔ یہ وہی بہرام ایبہ تھا جس کی مدد سے محمد تغلق کے باپ نے خسرو خاں کو شکست دے کر تخت سلطنت پایا تھا اور جسے خود محمد تغلق چچا کہتا تھا۔

۷۲۷ھ میں بادشاہ نے حکم دیا کہ تمام ساکنان دہلی اور قصبات قرب و جوار کے لوگوں کے قافلے بنا کر دولت آباد بھیجے جائیں اور شہریوں کے مکانات خرید کر ان کی نقد قیمتیں خزانے سے ادا کر دی جائیں۔ اس حکم کی تعمیل میں تمام اہل دہلی و حوالی کو دولت آباد روانہ کر دیا گیا۔ شہر دہلی ایسا خالی ہوا کہ چند روز تو دروازے بند رہے، کتے بلی کی آواز بھی شہر میں سنائی نہ دیتی تھی۔ عوام و اوباش جو شہر میں رہ گئے تھے شہریوں کا مال و اسباب نکال کر تلف کرتے تھے۔ اس کے بعد بادشاہی حکم سے علما و مشائخ کو

بلا کر شہر کے اندر بسا دیا گیا اور انھیں انعامات و وظائف دیے گئے۔ اس طرح دولت آباد دہلی والوں سے آباد ہو گیا۔

ادھر بخششہائے کثیر کے باعث خزانے خالی ہو کر رہ گئے تو بادشاہ نے تانبے کا سکہ چلایا۔ (صفحہ ۱۰۲)

پھر کئی سال بعد بادشاہ نے سنام، سامانہ اور کیتھل کے مقدموں کو لے جا کر حوالی شہر میں آباد کیا اور انھیں گاؤں اور اقطاع دیے، زریں پٹیاں اور کامدار ٹوپیاں بخشیں اور وہیں آباد کر دیا۔ شہر والوں کو جو اس زمانے میں ایک سخت قحط میں مبتلا تھے، حکم دیا کہ ہندوستان کی طرف چلے جائیں۔

اسی زمانے میں بادشاہ کی فیاضیوں کے حال سن کر اہل خراسان بڑی کثرت سے آ گئے تھے اور دولت سرائے شاہی میں انھیں لوگوں کا ہجوم رہتا تھا۔ بادشاہ ان اجنبیوں پر بڑا مہربان تھا اور ہر شخص کے حسب حال اتنا سونا چاندی، موتی، گھوڑے، کپڑے، کمربند، ٹوپیاں، غلام اور تحفے دیتا تھا کہ ان میں سے کسی نے آنکھ کھول کر بھی نہ دیکھے تھے۔

ان لوگوں نے یہ غضب ڈھایا کہ ہر قسم کا مال متاع، سونا، چاندی، لونڈی غلام حتیٰ کہ کاغذ و کتاب جو ہاتھ لگا خرید خرید کر اپنے ملکوں کو بھیج دیا۔ اس طرح دہلی کی دولت اُڑ لٹی۔ (صفحہ ۱۰۰)

اس قحط سالی کی وجہ سے بادشاہ خود بھی دولت آباد چھوڑ کر ہندوستان کی طرف چلا آیا اور چاہا کہ عین الملک کو جو ان اطراف میں حاکم تھا مع اس کے اہل و عیال کے دولت آباد بھیج دے۔ لیکن وہ یہ حال سن کر مقابلے کو تیار ہو گیا اور بڑی مشکل سے بادشاہ نے اس پر فتح پائی۔"

مبارک شاہی اور فیروز شاہی کے علاوہ اس بغاوت کے بہترین اور چشم دید حالات

ابن بطوطہ نے لکھے ہیں۔

صاحب مبارک شاہی لکھتا ہے،۔

"محمد تغلق کی ناکامیوں کے اسباب میں ایک بڑا سبب دہلی کو اجاڑ دینا بھی تھا۔ پہلے انھیں ہے جا کر دولت آباد میں جا بسایا اور قصبات قرب وجوار کو دہلی میں آباد کیا۔ پھر جو رہ گئے تھے انھیں بھی دوبارہ دولت آباد روانہ کیا۔ جو اسباب دہلی والوں کو آباو اجداد سے پہنچا تھا وہ اس سب کو یونہی گھروں میں بھرا چھوڑ کر چل دئے۔ اس کے بعد نہ تو ان کا اسباب ہی ان تک پہنچ سکا نہ دوسرا سامان مہیا ہو سکا۔ غرض نہ شہر آباد ہوئے نہ قصبات۔" (صفحہ ۱۱۳-۱۱۴)

ضیائے برنی نے ان واقعات کو اس طرح لکھا ہے:۔

"سلطان محمد کا دوسرا خیال جو دارالملک دہلی کی خرابی اور خاص خاص لوگوں کی ابتری اور چیدہ اشخاص کی تباہی کا باعث بنا یہ تھا کہ اس کے دل میں یہ خیال آیا کہ دیوگیر کو دولت آباد نام رکھ کر دارالملک بنائے۔ وجہ یہ تھی کہ دوسرے ملکوں کے قرب و بعد کے لحاظ سے دیوگیر بیچ میں واقع ہے اور دہلی، گجرات ولکھنوتی (بنگال) و ست گاؤں اور سنار گاؤں اور تلنگ و معبر (کارنانک) اور دھور سمندر (میسور) اور کنپلہ سے دیوگیر تک برابر کا فاصلہ ہے یا بہت کم فرق ہے۔ بغیر اس کے کہ مشورہ لیں یا نفع نقصان پر ہر لحاظ سے غور کریں دارالملک دہلی کو جو ایک سو ساٹھ یا ایک سو ستر برس سے آباد ہوتا چلا آرہا تھا اور ایک بڑا بھاری شہر بغداد و مصر کا ہمسر بن گیا تھا اس کے تمام محلوں اور چار یا پانچ کوس کے قصبات وحوالی کو اجاڑ دیا گیا یہاں تک کہ ان محلوں اور آس پاس کے قصبوں میں کتے بلی بھی نہ چھوڑے اور سب باشندے مع بال بچوں، نوکروں چاکروں کے روانہ کر دئے گئے۔ ان دیار کے لوگ جو سالہا سال سے اپنے قدیم وطنوں اور باپ دادوں کے مکانوں سے وابستگی رکھتے تھے کچھ تو

مشقت راہ دراز سے راستے ہی میں مرکھپ گئے، اور بہت سے جو دیوگیر پہنچے تو وہ مسافرت کی تاب نہ لاکر ایسے غمزدہ ہوئے کہ زیادہ زندہ نہ رہ سکے۔

دیوگیر کے چاروں طرف مسلمانوں کی قبریں دکھائی دیتی تھیں۔ اگرچہ سلطان نے ان لوگوں کے حق میں چلتے وقت اور دیوگیر پہنچ کر بڑے بڑے انعامات دئے اور بہت کچھ مہربانیاں دکھائیں لیکن یہ لوگ نازک تھے، تاب غربت و مشقت نہ لا سکے اور ان بے شمار لوگوں میں سے بہت کم کو پھر اپنے گھروں کو لوٹنا نصیب ہوا۔

اس تاریخ سے ایسا شہر جو شہرہائے ربع مسکوں کے لئے باعث رشک تھا، خراب ہو کر رہ گیا اور اگرچہ سلطان محمد نے علما و اکابر و معارف کو اپنے بلاد و ممالک کے مشہور خطوں اور قصبوں سے بلا کر شہر میں بسا دیا لیکن ان 'آفاقیوں' کے آنے سے شہر آباد نہ ہو سکا بعض تو شہر میں مرکھپ گئے اور اکثر اپنے مقامات کو واپس چلے گئے، اور اپنے قدیم خان و مان میں جا رہے۔"

اس تحویل و تبدیل سے ملک میں بڑا فتور پیدا ہو گیا۔" (صفحہ ۲۴۶۔۲۴۸)

یہی مورخ آگے چل کر لکھتا ہے:۔

"ملتان کی مہم کے بعد یعنی بہرام ایبہ کی بغاوت کے بعد جب دو برس تک سلطان دہلی میں رہا تو امرا، ملوک و حشم تو سلطان کے ساتھ دہلی میں رہے لیکن ان کے بال بچے دیوگیر میں تھے۔ (صفحہ ۴۷۹)

پھر بعد میں جب بادشاہ دیوگیر پہنچا اور وہاں سے ملک تلنگ کی طرف گیا تو اس نے عام حکم دے دیا کہ باشندگان دہلی میں سے جو چاہے واپس جا سکتا ہے۔ چنانچہ دو تین قافلے دہلی کی طرف روانہ ہوئے مگر جو لوگ ولایت مرہٹ (مہاراشٹر) پسند کر چکے تھے، وہیں رہ گئے۔" (صفحہ ۴۸۱)

بادشاہ تلنگ کی مہم میں بیمار پڑ کر دیوگیر آیا، وہاں سے بیماری ہی میں دہلی کو لوٹا۔ تھا

میں ٹھہر کر دہلی کی جانب روانہ ہوا تو مالوہ میں قحط تھا۔ تمام راستے سے دھاوا اٹھ چکا تھا، قصبات و ولایت ہا سے سر راہ پریشان و ابتر ہو چکے تھے۔ دہلی پہنچا تو اسے ہزارواں حصہ بھی آباد نہ پایا۔ ولایتیں خراب پڑی تھیں، ملک میں قحط پھیلا ہوا تھا، زراعت کا نشان بھی نہ تھا۔ (صفحہ ۴۰۲)

سنام وسامانہ کے لوگوں نے سرتابی کر رکھی تھی، خراج نہیں دیتے تھے، فساد اور لوٹ مار کرتے تھے۔ بادشاہ نے لشکر کشی کر کے انھیں شکست دی اور ان کے مقدموں اور سرداروں کو شہر میں لاکر آباد کر دیا۔ ان میں بعض مسلمان ہو گئے، ان میں سے گروہا گروہ کو امرا بنا کر مع اہل وعیال شہر میں بسایا اور ان کی زمینداریاں ان سے چھڑوا دیں اور اس طرح ان کا اثر مٹایا۔ (صفحہ ۴۰۴)

روز بروز قحط بڑھتا جاتا تھا۔ دہلی والوں کی حالت بگڑ چلی تو حکم دیا کہ ہندوستان چلے جائیں اور بال بچوں کو بھی ساتھ لے جا سکتے ہیں تاکہ وہاں رہ کر قحط سے خلاصی پائیں۔ اکثر لوگ تنگی غلہ کی وجہ سے چلے گئے، اور بال بچوں کو بھی لے گئے، اور بادشاہ بھی شہر سے چلا گیا۔ (صفحہ ۴۰۵)

۷۴۵ھ کے بعد محمد تغلق کی خونریزیوں اور سختیوں سے تنگ آکر امرائے دیوگیر نے سازش کر کے بغاوت کر دی۔ بادشاہ نے لشکر کشی کر کے دیوگیر پر قبضہ پالیا اور کوشک خاص میں نزول کیا۔ تمام مسلمانوں کو جو دیوگیر میں رہ گئے تھے نوروز کرکن کی ہمراہ دہلی کی جانب روانہ کر دیا۔ (صفحہ ۵۱۵)

بادشاہ کی غیبت میں ملک کبیر و احمد ایاز (وزیر) اور فیروز شاہ دہلی کا انتظام کرتے رہے اور ان کے حسن انتظام سے دہلی والوں کی حالت سدھر گئی تھی۔ (صفحہ ۵۱۵)

محمد تغلق ابھی دیوگیر ہی میں تھا کہ گجرات میں طغی نے بغاوت کر دی۔ بادشاہ اس کے فرو کرنے میں لگا تھا کہ حسن کانگو نے ایک جداگانہ سلطنت کی بنیاد دیوگیر میں ڈال دی اور

دولت آباد پھر کئی صدی تک دہلی کے زیرنگیں نہ آیا۔

بادشاہ نے مرنے سے پہلے اپنی فوج میں سے احمد ایاز وزیر اور ملک مقبول نائب وزیر کو
(جو بعد میں سلطان فیروز شاہ کا وزیر ہوا) انتظام کے لئے دہلی بھیج دیا تھا اور وہاں سے خداوندزادہ
اور مخدوم زادہ اور بعض مشائخ و علما، اکابر و معارف اور ملوک و امرا کے حرم اور پیادے
اور سوار اپنے پاس بلائے تھے۔ ہنی کی سرکوبی کے لئے ٹھٹھہ کو روانہ ہوا تھا کہ راستے میں
بیمار ہو کر ۲۱ محرم ۷۵۲ھ میں اس کا انتقال ہو گیا۔

اخیر زمانے میں سات برس تک وہ دہلی نہ آسکا بلکہ ستائیس برس کی سلطنت میں اس کا
قیام دہلی میں بہت کم رہا۔"

الغرض اس عجیب و غریب بادشاہ کے ہاتھوں سے دہلی نے بھی عجیب و غریب حالات کا مشاہدہ
کیا۔ اس کا جانشین فیروز تغلق دوسرے مزاج کا بادشاہ تھا۔ وہ تقریباً چالیس برس تک دہلی کی
آبادانی میں مصروف رہا۔ اس نے فیروز آباد کا نیا شہر آباد کیا اور اس کے زمانے میں پرانے شہر بھی
آباد ہو گئے۔

اس کے بعد جب تیمور نے دہلی پر قبضہ کیا تو پھر اس پر ایسی تباہی آئی جس سے وہ زیر و زبر
ہو کر رہ گئی اور فیروز شاہ کی ساری محنتیں خاک میں مل کر رہ گئیں۔

شاہجہاں کے وقت تک دہلی کو وہ عروج کبھی نصیب نہیں ہوا جو ایل تمش علاء الدین اور
فیروز شاہ کے وقتوں میں حاصل ہوا تھا۔

۷۳۴ھ میں ابن بطوطہ دہلی پہنچا تو اس نے دیکھا کہ دہلی غیر آباد تھی اور کوئی کوئی مکان آباد
تھا۔ وہ لکھتا ہے:۔

"سب سے بڑی بات جس کے لئے بادشاہ کو ملامت کی جاتی ہے یہ ہے کہ اس نے
تمام دہلی کے باشندوں کو جلا وطن کر دیا اور اس کا سبب یہ تھا کہ وہ لوگ رقعے لکھ لکھ کر ان پہ
مہریں لگاتے تھے اور لفافے پر لکھ دیتے تھے کہ بادشاہ کے سر کی قسم ہے کہ سوائے بادشاہ کے

کوئی اور نہ کھولے۔ رات کو لوگ یہ رقعے دیوان خانے میں ڈال جاتے تھے۔ جب بادشاہ کھولتا تو گالیاں درج پاتا۔ بادشاہ نے دہلی کو اجاڑنے کا ارادہ کیا اور اس کے متوطنوں کے مکانات خرید لئے اور ان سب کو گھروں کی پوری قیمتیں دے دیں۔ یہ بھی حکم دیا کہ سب دولت آباد چلے جائیں۔ لوگوں نے انکار کیا تو منادی کر دی کہ تین دن بعد شہر میں کوئی نہ رہے۔ بہت سے چل پڑے، بعض گھروں میں چھپ کر بیٹھ رہے۔ بادشاہ نے غلاموں کو حکم دیا کہ شہر میں جا کر دیکھو کوئی باقی تو نہیں رہا۔ دو آدمیوں کو جن میں سے ایک لولا دوسرا اندھا تھا بادشاہ کے سامنے لایا گیا۔ بادشاہ نے لولے کو منجنیق سے اڑا دیا اور اندھے کو حکم دیا کہ اس کو دہلی سے دولت آباد تک جو چالیس دن کا راستہ ہے گھسیٹ کر لے جائیں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور اس کا ایک پیر دولت آباد پہنچا۔

جب لوگوں نے یہ حال دیکھا تو کل آدمی اپنے اپنے اسباب و اموال چھوڑ کر نکل گئے شہر سنسان ہو گیا۔ ایک معتبر آدمی نے مجھ سے ذکر کیا کہ بادشاہ ایک رات اپنے محل کی چھت پر چڑھا اور شہر کی طرف دیکھا تو اس کو آگ، دھواں اور چراغ کچھ نظر نہ آیا۔ بادشاہ نے کہا اب میرا دل ٹھنڈا ہوا اور پھر اور شہروں کے باشندوں کو حکم دیا کہ دہلی میں آ کر رہیں۔ چنانچہ اور شہر بھی خراب ہو گئے لیکن دہلی آباد نہیں ہوئی۔

جب ہم شہر میں داخل ہوئے تھے تو اس وقت تک دہلی بالکل غیر آباد تھی اور اس میں کوئی کوئی مکان آباد تھا۔" (صفحہ ۱۵۰ و ۱۵۱، ترجمہ جلد دوم ۱۸۹۸ء)

اسی سیاح نے دس برس بعد حسن کانگو کی بغاوت سے پہلے دولت آباد کو بہترین حالت میں دیکھا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ اس کے زمانے میں دولت آباد اتنا بڑا شہر تھا کہ دہلی کا مقابلہ کرتا تھا۔ اس میں کئی حصے تھے۔ جس حصے میں بادشاہ و لشکر رہتے تھے دولت آباد کہلاتا تھا۔ قلعے کا نام دیوگیر تھا جس میں بادشاہ کا استاد قتلو خاں رہتا تھا۔ (صفحہ ۲۶۷ - ۲۶۸)

یہ ہیں دار السلطنت کی تبدیلی کے واقعات اور وہ افسوسناک حالات جو اس تبدیلی سے

دہلی اور اس کے رہنے والوں پر گذرے۔

بعض مدعیان تحقیقات نے اس تبدیلی کو حق بجانب قرار دیتے ہوئے اس کی حمایت میں بہت کچھ زور قلم دکھایا ہے۔

انھیں اس میں کلام ہے کہ "دہلی بالکل ویران ہوگئی تھی اور اس میں ایک کتا بلی بھی باقی نہ رہے تھے"۔

وہ زیادہ تر اس دور کے دیانت دار مورخ ضیائے برنی پر بیجا طور پر الزام لگاتے ہیں کہ اس نے محمد تغلق کو بدنام کرنے کے لئے مبالغے سے کام لیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ صرف وہی لوگ جو دربار اور شاہی کارخانوں سے تعلق رکھتے تھے منتقل ہوئے تھے۔

لیکن تمام تاریخی شواہد اس میں متفق ہیں۔ ابن بطوطہ بہت قریبی زمانے میں آیا تھا۔ ضیائے برنی نے ان سب حالات کو بچشم خود دیکھا۔ مبارک شاہی نے دوسرے ماخذ سے ان واقعات کو نقل کیا ہے۔

ایسی حالت میں ان مختلف مورخوں کے متفقہ بیانات کو پیش نظر رکھ کر کوئی شبہ نہیں ہو سکتا کہ جو واقعات اس قدر عجیب و غریب معلوم ہوتے اور عقل سلیم پر گراں گذرتے ہیں وہ اس سفاک و نیم مجنوں تاجدار کے ہاتوں دہلی والوں پر گذرے تھے۔

محمد تغلق میں بہت سی خوبیاں مثلاً فیاضی، پابندی رسوم مذہبی اور علمیت موجود تھیں لیکن اس میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا کہ اس کی جفا کاریوں سے ملک میں ابتری پھیل گئی، دہلی برباد ہو گئی اور ہندوستان میں اسلامی سلطنت کے ٹکڑے ٹکرے ہوگئے۔ تبدیل دارالملک کا جو طریقہ اس نے اختیار کیا کسی طرح عاقلانہ نہ تھا بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ اس نے دہلی کیا اجاڑی اپنی ساری سلطنت ہی دہلی کی وجہ سے خراب کر ڈالی۔

جوابِ تنقید

رسالہ جامعہ کے گذشتہ پرچوں میں سیرۃ النبی پر میرے قلم سے جو تنقید شائع ہوئی مجھے یہ سن کر افسوس ہوا کہ دار المصنفین کے حلقے میں وہ مخالفت پر محمول کی گئی حالانکہ اس میں مخالفت کا مطلقاً کوئی شائبہ نہیں تھا بلکہ صرف اس اصول پر لکھی گئی تھی کہ جو کتاب شائع ہو چکی وہ جمہور کی ملکیت ہے جس کو اس کے اوپر ہر قسم کی علمی بحثیں کرنے کا حق حاصل ہے۔ ندوہ کے ایک فارغ التحصیل نے اس تنقید کا جواب ہمارے پاس رسالہ "جامعہ" میں اشاعت کی غرض سے بھیجا ہے۔ ناظرین اس جواب میں غیظ و غضب اور طنز وغیرہ جا بجا دیکھیں گے جو ہمارے رسالے کے اصول کے منافی ہے مگر ہم اس کو بجنسہٖ شائع کر دینا مناسب سمجھتے ہیں تاکہ جن حضرات نے وہ تنقید پڑھی ہے وہ اس جواب کو بھی دیکھ لیں۔

(ا۔ ج)

اکتوبر ۱۹۳۳ء کا "جامعہ" نظر سے گذرا۔ مولانا اسلم صاحب کی سیرت نبی جلد سوم پر تنقید بھی پڑھی۔ مولانا کی اس تنقید کے متعلق کچھ عرض کرنا ہے۔ مولانا موصوف کی ذات گرامی محتاج تعارف نہیں۔ "تاریخ الامت" جیسی گراں پایہ تصنیف (؟) کے بعد عموماً اور "انکار حدیث" جیسے بہترین مقالات کے بعد خصوصاً مولانا کی ذات گرامی علمی طبقہ میں کافی شہرت حاصل کر چکی ہے۔ اس لئے مولانا موصوف کا تعارف کرانا زیادہ مناسب نہیں۔ لہٰذا اصل مقصود کی طرف لوٹتا ہوں۔ مولانا عالم مثال کا انکار کرتے ہوئے فرماتے ہیں "کیا شاہ ولی اللہ صاحب جو قرآن کے مترجم بھی تھے اور ماہر بھی اس عالم پر ایک حرف بھی سند لا سکتے ہیں؟" مولانا سے درخواست ہے کہ کیا مولانا ہر چیز کو کلام پاک کی آیت سے ثابت کر سکتے ہیں؟ ایک خواب ہی کو لیجئے، انسان کی عقل حیران ہے کہ جن چیزوں کو انسان خواب میں دیکھتا ہے

ان کا وجود کہاں ہے۔ ان کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ غیر موجود کو دیکھ نہیں سکتے۔ اس دنیا میں جہاں ہم آپ ہیں وہاں موجود نہیں۔ اب لامحالہ کسی دوسرے عالم میں اس کا وجود ہے جس کو عالم خواب کہئے یا کسی اور عالم سے تعبیر کیجئے۔ اسی طرح عالم ارواح اور عالم اجساد کے مابین ایک عالم ہے جس سے دونوں عالموں کا تعلق ہے۔ اس تعلق و وابستگی کا مفصل بیان سیرت نبی اور مولانا شاہ ولی اللہ کی حجۃ اللہ کے باب عالم مثال میں دیکھ سکتے ہیں۔ شاہ صاحب نے نہایت شرح و بسط سے متعدد احادیث سے عالم ارواح اور عالم اجساد کے ماوراء ایک عالم ثابت کیا ہے جس کا نام عالم مثال رکھا ہے۔ اگر عالم مثال کے بجائے کوئی اور عالم اس کا نام رکھنا چاہیں تو کوئی مضائقہ نہیں مصطلحات میں نزاع نہیں ہو سکتی۔ البتہ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ لوگ نہ معلوم کتنے عالم کے قائل ہیں۔ عالم شباب، عالم خیال، عالم خواب کا انکار کون کر سکتا ہے۔ ان عالموں کے قائل ہونے کے بعد اگر ایک عالم مثال کا احادیث و واقعات سے اضافہ ہوتا ہے تو نہ معلوم کیوں لوگوں کی جبین متانت پر بل پڑ جاتے ہیں۔

اس کے بعد مولانا موصوف کا قلم گہر باریوں رقمطراز ہے "حقیقت یہ ہے کہ معجزہ اپنے امکان یا نفس وقوع میں فلسفۂ قدیم و جدید کے ان تمام دلائل کا جو اس کتاب کے دو سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں قطعاً محتاج نہیں، وہ جب واقع ہوتا ہے تو کٹر سے کٹر بھی اس کے ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ...... الخ"

نہ معلوم مولانا نے ان تمام دلائل کو جو دو سو صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں بیک جنبش قلم کیوں لغو و مہمل قرار دیا۔ یہ صحیح ہے کہ جب معجزہ واقع ہوتا ہے تو کٹر سے کٹر بھی اس کے ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے لیکن ظہور معجزہ کے صدیوں بعد ان لوگوں کو معجزہ کا کس طرح یقین دلایا جا سکتا ہے جو سرے سے امکان معجزہ ہی کے قائل نہ ہوں۔ کیا ایسی صورت میں معجزہ کے امکان سے فلسفۂ جدیدہ و قدیمہ کی روشنی میں اگر ایک مصنف بحث کرتا ہے تو اس کی ساری کوشش، اس کے سارے دلائل و براہین صرف اس لئے قابل قبول نہیں ہیں کہ مولانا اسلم صاحب نے کہیں ہیوم کا ایک قول پڑھ لیا ہے۔ مولانا معجزات نبوی کے انکار کے ثبوت میں ہیوم کا یہ قول نقل فرماتے ہیں "مذہب کے نام سے

لوگ ہمیشہ مضحک وخرافات افسانوں کے دام میں آجاتے ہیں"۔ مولانا تو بڑے روشن خیال ہیں صرف کلام پاک کی روشنی میں وحی الٰہی کی تعلیم سے مذہب کا مطالعہ کرتے ہیں۔ دنیا کا سب سے زیادہ قیمتی اور قابلِ فخر ذخیرۂ احادیث آپ کے نزدیک دفترِ پارینہ اساطیر الاولین سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ بایں "روشن خیالی" و "حریت ضمیر" مولانا نے ہیوم کے مذکورہ بالا قول کو انکارِ معجزات کی دلیل کی حیثیت سے پیش کرنے کی کس طرح جرأت کی؟ مولانا کو مصنف سیرت نبی کی قدامت پرستی اور تقلید سے شدید اختلاف ہے۔ لیکن ہیوم کا محض قول صرف استدلال میں پیش کر کے فاضل مضمون نگار نے بھی کسی آزادیٔ ضمیر کا ثبوت نہیں دیا، اسی تقلید اور اشخاص پرستی میں مولانا بھی مبتلا ہیں جس سے مولانا کو شدید اختلاف ہے۔ ہیوم کے مذکورہ بالا قول کے ساتھ اس جملہ کو بھی شامل کر لیا جائے تو قول مکمل ہو جائے گا یعنی "اور جس انکارِ معجزہ کی بنا کسی عقلی دلیل کے بجائے کسی کا بے دلیل قول ہو تو وہ بجائے استدلال وحجت کے محض تمسخر انگیزی نہیں بلکہ حماقتوں کا مجموعہ ہے"۔

مولانا کا خیال ہے کہ چونکہ ہیوم نے کہا ہے "مذہب کے نام سے لوگ ہمیشہ مضحک وخرافات افسانوں کے دام میں آجاتے ہیں اس لئے کسی معجزۂ نبوت کو تسلیم نہیں کرنا چاہئے"۔ "خرافات افسانوں" کی بھی ایک کہی۔ کیا حقیقت سے لبریز افسانے بھی ہوا کرتے ہیں یا افسانہ خرافات وغیر واقعی چیزوں کے مجموعہ کا نام ہے! خیر یہ تو ایک سخن گسترانہ بات تھی۔ مولانا موصوف جو بڑے روشن خیال، بلا کسی معقول وجہ کے کسی بات کو تسلیم نہیں کرتے۔ کیا صرف ہیوم کے کہنے سے مذہب کی طرف جس قدر حقائق و واقعات منسوب ہیں وہ تمام کے تمام مولانا کے نزدیک بھی خرافات و افسانے ہو جائیں گے یا کسی دلیل کی ضرورت ہوگی؟

"استفادات عالیہ" کے سلسلے کو دراز کرتے ہوئے مولانا روایت حدیث پر خامہ فرسائی کرتے ہیں۔ مولانا کی پندرہ بیس سطروں کا خلاصہ صرف اس قدر ہے کہ چونکہ احادیث ہم تک بذریعہ روایت در روایت پہنچی ہیں اور چونکہ وہ متواتر نہیں ہیں اس لئے ہمارے لئے وہ نہ قابلِ استدلال ہیں اور نہ قابلِ شہادت اس پر مولانا نے اس طرح دلیل قائم کی ہے "کیونکہ اگر آپ خود اپنا چشم دید واقعہ بیان کریں تو میرے پاس اس کے صدق و کذب جانچنے کا ایک معیار ہے۔ وہ یہ کہ میں آپ کو جانتا ہوں اور آپ کا اعتبار

میرے ذہن میں قائم ہے لیکن جب آپ نے اپنا چشم دید واقعہ مجھ سے نہیں بیان کیا بلکہ یہ فرمایا کہ میں نے زید سے سنا تو وہ معیار آپ نے مجھ سے چھین لیا۔ (جی نہیں معیار اب تک باقی ہے اگر آپ کو راوی یعنی زید کے متعلق کسی ایسے شخص سے معلوم ہو جس کی جانچ آپ کی جانچ سے زیادہ بلند اور قابل اعتماد ہے کہ زید سچا یا جھوٹا ہے تو معیار اب تک قائم ہے۔ ناظم) کیونکہ میں زید کو نہیں جانتا، (آپ کا زید کو نہ جاننا روایت کی صداقت میں مخل نہیں ہے جبکہ زید کے حالات تو زید کی صداقت آپ دوسروں سے اسی طرح معلوم کر سکتے ہیں جس طرح آپ اپنے ذاتی علم سے کیونکہ ائمہ جرح وتعدیل نے رواۃ کو صداقت کی کسوٹی پر اسی طرح کسا ہے جس طرح ہم یا آپ کسی کو آج جانچ سکتے ہیں بلکہ ہم سے بھی زیادہ کاوش و جستجو سے انھوں نے جانچا ہے۔ ناظم) اب اس قول کے صدق وکذب کا فیصلہ آپ کے اوپر رہا کہ آپ زید سے واقف ہیں۔ مگر جب آپ نے یہ کہا کہ زید نے اس کو عمر سے سنا تو آپ کے پاس بھی کوئی معیار نہ رہا لہٰذا جب روایت کا سلسلہ دو سے تین تک پہنچ گیا تو نہ متکلم کے لئے وہ حجت ہے نہ سامع کے لئے کیونکہ دونوں میں سے کسی کے پاس اس کے جانچنے کا معیار نہیں ہے۔"

مولانا کی اس مسلسل دلیل کی حقیقت صرف یہ ہے کہ مولانا کو رواۃ کے صادق و کاذب ہونے کا علم نہیں ہے اس لئے کسی حدیث کے صحیح ہونے کا یقین نہیں کر سکتے۔ مولانا کا یہ خیال حقیقت سے بہت دور ہے، مولانا نے مغالطہ دینے کی سعی ناکام کی ہے۔ اسماء الرجال کی کتابوں میں جن کا شاید مولانا نے بھی مطالعہ کیا ہوگا ہر راوی کے حالات نہایت شرح و بسط کے ساتھ مذکور ہیں۔ ان کتابوں میں رواۃ کی عدالت و صداقت ہی نہیں بیان کی گئی ہے بلکہ ہر ایک راوی کے حافظہ، سامعہ اور اس کے مذہبی میلان کے متعلق مفصل بحث ہے۔ راوی کے اساتذہ و شاگردوں کا کافی و افی ذکر ہے۔ کیا یہ تفصیلی جرح و تعدیل جس کو ائمہ سلف نے حدیث رسول اللہ کی خاطر جمع کیا ہے آج ہم اس کے مقابلہ میں کسی شخص کے متعلق اس شرح و بسط کے ساتھ کچھ کہہ سکتے ہیں۔ بلاشبہ ائمہ جرح و تعدیل کی جانچ اسی طرح قابل اعتبار ہے جس طرح آج ہماری جانچ کسی کے متعلق معتبر ہوتی ہے۔ دنیا کے اس قابل فخر ذخیرے کے ہوتے ہوئے بھی کوئی شخص صحیح حدیث کی صحت اس لئے نہیں تسلیم کرتا کہ

رواۃ کے حالات معلوم نہیں ہیں تو ناظرین سمجھ سکتے ہیں کہ منکرین حدیث، حقائق و واقعات کا بلا دلیل و حجت انکار کرتے ہیں۔

مذکورہ بالا انکار حدیث کی دلیل کے بعد مولانا کو فوراً خیال ہوا کہ کتب اسماء الرجال کے ہوتے ہوئے جن میں رواۃ کے مفصل حالات درج ہیں۔ رواۃ کے صادق و کاذب ہونے کے متعلق لاعلمی کا اظہار کس طرح کیا جا سکتا ہے چنانچہ مولانا نے فوراً منطق کی کسی شکل سے "دور" کے مہیب لفظ کو ثابت کر کے اسماء الرجال کے سارے ذخیرے کو بیک جنبش قلم ردی کر دیا، چنانچہ مولانا رقمطراز ہیں "جواب میں آپ کہیں گے کہ ان روایات کے سلسلہ اسناد میں جو رواۃ ہیں وہ سب کے سب جانچے ہوئے ثقہ اور معتبر ہیں لیکن وہ میرے اور آپ کے جانچے ہوئے نہیں ہیں کہ ہمارے لئے ان کا بیان حجت ہو بلکہ ان کی ثقاہت کی خبر بھی ہم تک بذریعہ روایت ہی کے پہنچی ہے لہذا ان کا اعتبار روایت پر موقوف ہے اور روایت کا اعتبار ان کے اوپر موقوف ہے اور یہ دور ہے"۔ مولانا کو منطق کا باب المغالطہ خوب یاد ہے۔ رواۃ کی ثقاہت بلاشبہ روایت پر موقوف ہے اور روایت کا اعتبار رواۃ کی ثقاہت پر موقوف ہے لیکن جس روایت کا اعتبار رواۃ کی ثقاہت پر موقوف ہے وہ روایت ثقاہت رواۃ کی روایت کی غیر ہے مثلاً ایک حدیث چند رواۃ کے ذریعہ سے ہم تک پہنچی اب اس روایت کا اعتبار موقوف ہے اس کے رواۃ کی ثقاہت پر اور روایت ثقاہت رواۃ موقوف ہے دوسری اس روایت پر جس کے ذریعہ سے ہمیں رواۃ کی ثقاہت کا علم ہوا مثلاً یحییٰ ابن معین نے جو ایک بلند پایہ امام جرح و تعدیل ہیں، ایک راوی کو ثقہ یا غیر ثقہ کہا اب ہمیں معلوم ہو گیا کہ فلاں راوی ثقہ یا غیر ثقہ ہے اب دو قسم کے سوالات پیدا ہوتے ہیں ایک یہ کہ خود یحییٰ ابن معین کیسے تھے دوسرے یحییٰ ابن معین نے فلاں راوی کی ثقاہت یا عدم ثقاہت کے متعلق کہا ہے یا نہیں۔ پہلے سوال کا جواب کھلا ہوا ہے وہ یہ کہ یحییٰ ابن معین کی فضیلت ان کے تبحر علمی خصوصاً جرح و تعدیل میں ان کی وسعت نظر اور ان کے حزم و احتیاط کو تمام محدثین نے تسلیم کیا ہے اس لئے ان کی جرح و تعدیل بلاشبہ معتبر ہے۔ دوسرے سوال کے متعلق یہ کہنا کافی ہے کہ یحییٰ ابن معین کی توثیق یا عدم توثیق کی روایت ہمیں دوسری روایتوں سے معلوم ہوتی ہے لہذا ایک روایت کا دوسری روایت

پر موقوف ہونا" دور" نہیں ثابت کرتا، دور کے ثبوت کے لئے اتحاد موقوف و موقوف علیہ ضروری ہے یہاں وہ اتحاد معدوم ہے۔ اس کے بعد مولانا فرماتے ہیں" علاوہ ازیں اس بات کا قطعی فتویٰ کہ فلاں ثقہ ہے یا صدوق ہے یا عدول ہے اصولاً اور دیانتاً صحیح نہیں ہے کیونکہ باطن کا علم اللہ کو ہے"۔ عقل ششدر ہے کہ محترم ناقد کے اس طرز استدلال کے متعلق کیا عرض کروں۔ مولانا کے اصول اور دین میں کسی کو ثقہ یا عدول کہنا اس لئے صحیح نہیں ہے کہ انسان کو کسی کے باطن کا حال معلوم نہیں ہے اور روزانہ زندگی میں کسی کے ظاہری اعمال، لوگوں کے ساتھ اس کا معاملہ ان امور سے کوئی فیصلہ کسی کے ثقہ یا غیر ثقہ ہونے کے متعلق نہیں کیا جاسکتا۔ اگر انسان اس حد تک مجبور محض ہے تو انسان کی عقل بیکار ہے۔ اللہ نے انسان کو عقل اسی لئے دی ہے کہ وہ اس کے ذریعہ سے خیر و شر میں، بھلے برے میں، جھوٹے اور سچے میں، عادل و ظالم میں، نیک و بد میں تمیز کرے۔ جھوٹے کو جھوٹا کہے اور سچے کو سچا، صدوق کو صدوق سمجھے اور کاذب کو کاذب، ورنہ مولانا ہی کے اصول اور دین کی رو سے مولانا کا مذکورہ بالا خیال بلا کسی مزید دلیل کے ناقابل سماعت ہے کیونکہ معلوم نہیں مولانا کا ضمیر اس کے متعلق کیا رائے رکھتا ہے۔ جو کچھ لکھا ہے وہ تو جنبش قلم اور عمل ظاہری کا نتیجہ ہے۔ اس عمل ظاہری کے ذریعہ سے مولانا کے باطن کے متعلق کوئی رائے قائم کرنا نہ اصولاً نہ دیانتاً صحیح ہوگا۔

مولانا کا طرز استدلال بھی عجیب و غریب ہوتا ہے۔ بات پر بات یاد آتی ہے۔ غالباً ۱۹۳۱ء کے رسالہ جامعہ کے کسی نمبر میں انکار حدیث کی سرخی کے ماتحت حدیث کے غیر معتبر اور ناقابل عمل ہونے پر مولانا کلام پاک کی اس آیت کریمہ " فبای حدیث بعدہ یومنون" (ترجمہ مولانا اس کے بعد کس "حدیث" پر وہ ایمان لائیں گے) سے کس بلا کی ناقابل تردید دلیل لائے تھے۔ یہ نہ بھولنے والا استدلال اہل علم حضرات کو اب تک یاد ہے۔

خبر احاد کو یک قلم ناقابل عمل قرار دینا کسی اصول کے ماتحت صحیح ہے؟ کسی خاص خبر کے متعلق اگر کسی کو شبہ ہو تو وہ اس کے متعلق کہہ سکتا ہے یہ حدیث فلاں وجہ سے ناقابل قبول ہے لیکن یہ کہ تمام خبر احاد ناقابل عمل، سارا ذخیرۂ حدیث لغو و مہمل ہے کس طرح تسلیم کیا جاسکتا ہے چنانچہ مصنف

سیرت نبی نے اس کے متعلق عملی دنیا کے نمونے پیش کر کے خبر احاد کے قابل اعتبار ہونے کو ثابت کیا ہے۔ سید صاحب لکھتے ہیں:۔

"متواتر، مشہور اور مستفیض خبروں کو چھوڑ کر خبر احاد تک تم روزانہ یقین کرتے ہو۔ خطوط، تار، اخبارات آج کل کی زندگی کا جزو ہیں اور ان میں سے ہر ایک پر تم کو کامل وثوق ہے۔ رائٹر ایجنسی کے تاروں اور سنجیدہ اخباروں کے کالموں میں عجیب سے عجیب حیرت افزا واقعات وایجادات وطبی علاجات عموماً بیان ہوتے رہتے ہیں اور لوگ ان کو تسلیم کرتے ہیں .... کبھی یہ عقلی مباحث اور شکوک نہیں پیش کرتا کہ ممکن ہے کسی نے غلط کہہ دیا ہو، ممکن ہے غلط لکھا گیا ہو، ممکن ہے نامہ نگار جھوٹ بولتا ہو، ممکن ہے کاتب نے خود گھڑ کر لکھ دیا ہو.........." اس پر مولانا فرماتے ہیں "ہر چند سید صاحب کے اس بیان میں مبالغہ ہے کیونکہ اخبارات اور روزانہ معاملات کے بارے میں بعض خبروں میں جو قرائن کے خلاف ہوتی ہیں ہم شک کرتے ہیں۔"

آپ ضرور شک کیجئے۔ آپ کو شک کرنے سے کون منع کرتا ہے۔ آپ اسی طرح کسی خاص حدیث کے متعلق یہ شک کر سکتے ہیں کہ ممکن ہے رسول اللہ نے نہیں فرمایا ہو یا نہیں کیا ہو، لیکن اس شک کے بعد آپ کا فرض ہے کہ آپ اس حدیث کو اصول حدیث پر جانچیں۔ اگر وہ حدیث جانچنے کے بعد صحیح ثابت ہو تو آپ اس کو صحیح تسلیم کیجئے، جس طرح آپ اپنی روزانہ زندگی میں کسی مشتبہ ومشکوک الوقوع چیز کے متعلق دریافت کرنے کے بعد اگر وہ مشتبہ ومشکوک شئی صحیح ثابت ہوتی ہے تو آپ اس کو صحیح تسلیم کرتے ہیں اور آپ کو اس کا یقین ہو جاتا ہے۔ اگر آپ کا دائرۂ انکار حدیث روزمرہ کے معاملات ہی کی طرح کسی خاص خبر احاد تک محدود ہوتا تو ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوتا لیکن آپ ستم تو یہ کرتے ہیں کہ بلا کسی دلیل کے تمام کی تمام خبر احاد وغیر احاد کو ناقابل عمل قرار دیتے ہیں۔

آگے چل کر چونکہ معجزات کے ظہور کے متعلق مولانا سے کچھ عرض کرنا ہے اور لفظ آیت کا بار بار استعمال ہوگا اس لئے مناسب ہے کہ لفظ آیت کی تشریح کر دوں۔ لفظ آیت کلام پاک میں تین معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ آیتؔ بمعنی آیت قرآن یعنی کلام پاک کا مختصر ٹکڑا۔ آیتؔ بمعنی علامت ونشانی۔

آیت بمعنی معجزہ لیکن یہ معلوم کرنا کہ لفظ آیت کس جگہ کس معنی میں استعمال ہوا ہے کلام پاک کے سیاق و سباق سے معلوم ہو سکتا ہے۔ زبان و لغت عربی جاننے سے زیادہ بصیرت و فہم قرآن کی ضرورت ہے۔

محترم نقاد چونکہ احادیث کو صحیح نہیں مانتے ہیں اس لئے جن معجزات کے ظہور کا ثبوت احادیث سے ہے ان کو تسلیم نہیں کرتے۔ مزید برآں محترم نقاد کا خیال ہے کہ قرآن مجید بھی پکار پکار کر یہی کہہ رہا ہے کہ رسول اللہ کو کوئی حسی معجزہ نہیں عطا کیا گیا۔ مندرجہ ذیل آیات قرآن کو مولانا نے استدلال میں پیش کیا ہے۔

ویقول الذین کفروا لولا انزل علیہ آیۃ من ربہ ۱۳/۷	اور کفار کہتے ہیں کہ اس پر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہ اتاری گئی۔
وقالوا لولا اوتی مثل ما اوتی موسیٰ۔ ۲۸/۴۸	کفار نے کہا کہ کیوں نہ اس کو کوئی ایسی نشانی دی گئی جیسی موسیٰ کو دی گئی تھی۔
وقالوا لولا یاتینا بایۃ من ربہ۔ ۲۰/۱۳۳	اور کافروں نے کہا کہ وہ اپنے رب کی طرف سے ہمارے پاس کوئی نشانی نہیں لاتا۔

مذکورہ بالا آیات کریمہ کے متعلق مولانا کا خیال ہے کہ اگر رسول کریم کا کوئی حسی معجزہ ہوتا تو کفار کا بار بار معجزہ طلب کرنے کے کیا معنی؟ اس کے بعد مولانا فرماتے ہیں کہ ان تمام سوالات کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "وما منعنا ان نرسل بالآیات الا ان کذب بہا الاولون" ترجمہ ہمیں معجزات بھیجنے سے کسی چیز نے باز نہیں رکھا سوائے اس کے کہ گذشتہ لوگوں نے ان کو جھٹلایا۔

معجزے جو نبی اور رسول کو عطا ہوتے ہیں وہ دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک معجزہ متحدیٰ بہا ہوتا ہے یعنی نبی یا رسول سے شہادت نبوت کے لئے کفار کسی خارق عادات کے طلبگار ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو ساکت و خاموش کرنے کے لئے اپنے نبی و رسول کو کوئی معجزہ عطا کرتا ہے۔ دوسرے وہ معجزے جو بلا کسی طلب کے وقتاً فوقتاً نبی و رسول سے بطور نصرت و تائید الٰہی کے صادر ہوتے رہتے ہیں۔ کلام پاک کی مذکورہ بالا آیتوں میں یا ان کے علاوہ جہاں بھی کفار کے طلب معجزہ کا ذکر ہے ان سے وہی معجزہ متحدیٰ بہا مراد ہے اور بلاشبہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معجزہ متحدیٰ بہا نہیں دیا گیا جس کی وجہ مولانا بھی جانتے ہیں کہ معجزہ متحدیٰ بہا

کے ظہور کے بعد اگر امت ایمان نہیں لاتی ہے تو چونکہ اتمام حجت ہو چکتا ہے اس لئے قوم کی ہلاکت لازمی ہوتی ہے لیکن معجزۂ متحدیٰ بہا کے عدم ظہور سے دوسرے ان غیر متحدیٰ بہا معجزات کے ظہور کی نفی نہیں ہوتی ہے جس کا ظہور وقتاً فوقتاً رسول کریم سے متواتر رہا ہے۔ شاید آپ کہیں گے کہ قرآن مجید میں اس قسم کی تفریق نہیں ہے لیکن قرآن مجید کا غور سے مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات صاف ظاہر ہو جاتی ہے۔ رسول کریمؐ کو صرف معجزہ متحدیٰ بہا عطا نہیں ہوا تھا نہ مصنف سیرت نبی ہی نے کہیں یہ لکھا ہے کہ رسول کریمؐ کو وہ معجزے عطا ہوئے تھے جن کے کفار طالب تھے۔

قالوا لولا اوتی مثل ما اوتی موسیٰ	کفار نے کہا کہ کیوں نہ اس کو کوئی ایسی نشانی دی گئی تھی جیسی موسیٰ کو دی گئی۔

اس آیت سے بھی صاف معلوم ہوتا ہے کہ کفار خاص قسم کے معجزے کے طالب تھے اور اسی معجزۂ متحدیٰ بہا کے ظہور کی نفی اللہ تعالیٰ نے "وما منعنا ان نرسل بالآیات الا ان کذب بہا الاولون" سے کی ہے۔

آپ کہیں گے کہ "آیات" تو یہاں پر مطلق ہے تخصیص کیوں کرتے ہیں۔ ہم کہیں گے کہ مطلق آیات کے نزول کی نفی نہیں کی جا سکتی کیونکہ اگر آیات کو عام معنی میں رکھا جائے تو معجزۂ قرآن بھی اس میں آجائے گا حالانکہ معجزۂ قرآن کے آپ بھی قائل ہیں۔ اس لئے لامحالہ آیات کی تخصیص کرنی پڑے گی۔ اس آیت کریمہ کے بعد والے ٹکڑے کو اگر ملا کر پڑھا جائے تو حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہو جائے گی۔

وما منعنا ان نرسل بالآیات الا ان کذب بہا الاولون وآتینا ثمود الناقۃ مبصرۃ فظلموا بہا وما نرسل بالآیات الا تخویفا۔

امام المفسرین علامہ ابن جریر طبری کی تفسیر بھی مزید تائید کے لئے نقل کرتا ہوں۔ امام المفسرین ابن جریر اس کی تفسیر اس طرح کرتے ہیں۔

وما منعنا[1] ان نرسل بالآیات التی سالھا قومک الا من کان قبلھم من الامم المکذبۃ سألوا ذالک

[1] تفسیر ابن جریر جلد ۱۵ سورۃ الاسراء

مثل سوالھم فلما اتاھم ماسألوا منہ کذبوا رسلھم فلم یصدقوا مع مجی الآیات ترجمہ تفسیر "اے محمد! ان نشانیوں کے بھیجنے سے ہمیں کسی چیز نے باز نہیں رکھا جن کو تیری قوم نے مانگا سوا اس بات کے کہ ان سے پہلے جھٹلانے والی قوموں نے اسی طرح کا سوال کیا تھا جب ان کی مطلوبہ نشانی ان کے پاس آگئی تو انھوں نے اپنے رسولوں کو جھٹلا دیا اور نشانیوں کے آنے کے باوجود انھوں نے تصدیق نہیں کی" اس کے بعد حضرت ابن عباس سے ایک حدیث نقل کی ہے۔ طوالت کے خوف سے اس کا خلاصہ نقل کرتا ہوں۔

اہل مکہ نے نبی کریمؐ سے کہا کہ آپ کوہ صفا کو سونا بنا دیں اور دوسرے پہاڑوں کو اپنی جگہ سے ہٹا دیں تاکہ وہ وہاں کھیتی کر سکیں۔ اس پر اللہ نے یہ آیت نازل کی چنانچہ اس تفسیر کی تصدیق خود کلام پاک کی آیت "وآتینا ثمود الناقۃ مبصرۃ فظلموا بہا" سے ہوتی ہے یعنی قوم ثمود نے بھی اسی طرح کا سوال کیا تھا جب ہم نے قوم ثمود کو اونٹنی کی کھلی ہوئی نشانی دی تو انھوں نے اس کے ساتھ ظلم کیا یعنی وہ ایمان نہیں لائے اور اونٹنی کی کوچیں کاٹ ڈالیں۔

وما منعنا ان نرسل الخ سے محترم نقاد کو جو غلط فہمی ہوئی ہے کہ یہ آیت کریمہ نص قطعی ہے کہ رسول اللہ کو کوئی حسی معجزہ نہیں دیا گیا۔ مجھے امید ہے کہ وہ غلط فہمی دور ہو جائے گی۔ اسی طرح " وان کان کبر علیک اعراضھم الخ میں اسی معجزۂ متحدیٰ بہا کے صدور کی نفی ہوتی ہے۔

مصنف سیرت نبی نے بخاری شریف کی مندرجہ ذیل حدیث سے معجزۂ نبی پر دلیل پیش کی ہے:-

مامن نبی من الانبیا الا اعطیٰ من الآیات ماشلہ امن علیہ البشر وانما کان الذی اوتیت وحیا اوحاہ اللہ الیّ

پیغمبروں میں سے ہر پیغمبر کو اللہ نے اس قدر معجزے دئے جن کو دیکھ کر لوگ ایمان لائے لیکن مجھے جو معجزہ دیا گیا وہ صرف وہی ہے جس کو اللہ تعالیٰ میری طرف بھیجتا ہے (صفحہ ۱۶۴)

سید صاحب نے اس حدیث کے چند نکات بیان کئے ہیں۔ ایک "نکتہ" کا محترم نقاد نے اضافہ کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے " مگر اس حدیث میں جو سب سے ضروری نکتہ تھا یعنی یہ کہ حضور اکرمؐ نے "انما" کے لفظ سے حصر فرما دیا کہ مجھے سوائے وحی کے اور کوئی معجزہ نہیں دیا گیا ہے" اسی کو چھوڑ دیا۔"

محترم "نقاد" نے شاید غور کرنے کے بعد اس نکتہ کا اضافہ نہیں کیا۔ میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا

کہ حدیث کو اس سے زیادہ معقولیت سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ حدیث میں ہے "من الآیات ما مثلہ امن علیہ البشر" یعنی اس قدر معجزے دیے گئے جن کو دیکھ کر لوگ ایمان لائے اور مجھے جو معجزہ دیا گیا یعنی جس کو دیکھ یا سن کر لوگ ایمان لائے وہ صرف وحی ہے جس کو اللہ میری طرف بھیجتا ہے۔ مقابلہ ان معجزات کا ہے جن کو دیکھ کر لوگ ایمان لائے مطلق معجزات کا ذکر نہیں ہے۔ ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ رسول کریمؐ کو سوائے وحی کے کوئی دوسرا ایسا معجزہ جس پر لوگوں کو ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہو نہیں دیا گیا لیکن اس سے یہ نہیں ثابت ہوتا کہ دوسرے حسی معجزے وقتاً فوقتاً صادر نہیں ہوئے جبکہ کتب تاریخ پکار پکار کر اس انکار کی تردید کر رہی ہیں۔ سید صاحب نے سیرت نبی میں لکھا ہے "اگر امور غیب کی قبل از وقت اطلاع نہیں دیتے تھے اور معجزات و خوارق عادت کا صدور آپ سے نہیں ہوتا تھا تو کفار آپ کو کاہن اور ساحر کے خطابات سے کیوں یاد کرتے تھے۔"

محترم نقاد کو حیرت ہے کہ سید صاحب نے کفار کے ساحر و کاہن کے الفاظ سے رسول اللہؐ کو صاحب معجزہ قرار دینے کی کیسے جرأت کی۔ چنانچہ مولانا فرماتے ہیں " علاوہ ازیں وہ آنحضرت کو ساحر، کاہن اور شاعر صرف قرآن ہی کی بنا پر کہتے تھے نہ کہ خوارق عادات کے صدور پر۔" کس "وحی" سے محترم نقاد کو معلوم ہوا کہ کفار آنحضرتؐ کو کاہن و ساحر صرف قرآن ہی کی بنا پر کہتے تھے نہ کہ خوارق عادات کے صدور پر۔ سحر کے معنی "دلکش" یا مزور کلام کس لغت میں ہے؟ کیا فاضل سند عربی شعر اس پر پیش کر سکتے ہیں!

اس کے بعد مولانا نے حسی معجزات یا خوارق عادات کے عدم ظہور پر ایک آیت پیش کی ہے جس کے متعلق انتہائی بلند آہنگی سے فرماتے ہیں " اب علاوہ ان آیات کے میں ایک ایسی آیت نقل کرتا ہوں جو اس بحث کا قطعی فیصلہ کر دیتی ہے اور جس کو سید صاحب نے اپنی آٹھ سو صفحات کی طویل و عریض کتاب میں کہیں نہیں نقل کیا وہ یہ ہے:"

واذا لم تأتہم بآیۃ قالوا لولا اجتبیتہا	اور جب تو ان کے پاس کوئی نشانی نہ لایا تو انھوں نے کہا کہ تو نے کوئی نشانی کیوں نہ چنی۔

میں پھر وہی عرض کروں گا کہ کلام پاک کو اس سے زیادہ بصیرت سے سمجھنے کی ضرورت ہے تاکہ معلوم ہو کہ لفظ آیت یہاں پر آیت قرآن یعنی کلام پاک کا چھوٹا ٹکڑا کے معنی میں ہے یا اس کے معنی نشانی یعنی معجزہ ہیں۔ اس آیت کے بعد والی آیت کو اگر ملا کر پڑھا جائے گا تو صاف معلوم ہو جائے گا کہ آیت یعنی آیت قرآن ہے یا مولانا کی "نشانی" کے معنی میں ہے۔ پوری آیت بھی ناظرین کرام کے لئے نقل کئے دیتا ہوں تاکہ اہل فہم حضرات خود فیصلہ کریں۔

واذا لم تاتہم بایۃ قالوا لولا اجتبیتہا قل انما اتبع ما یوحیٰ الی من ربی ھذا بصائر من ربکم وھدًی ورحمۃ لقوم یومنون۔

جب تو ان کے پاس کوئی آیت (قرآن) نہیں لایا تو کہا کہ تو اپنی طرف سے کوئی آیت کیوں نہیں گھڑ لیتا۔ اے محمدؐ! تو ان سے کہدے کہ میں اس کی اتباع کرتا ہوں جس کو میرا پروردگار میری طرف بذریعہ وحی بھیجتا ہے۔ یہ بصیرت اور ہدایت (کا سبب ہے) ان لوگوں کے لئے جو ایمان لاتے ہیں۔

تفسیر فتح البیان، تفسیر ابن جریر، تفسیر بیضاوی، تفسیر مدارک سب کا اتفاق ہے کہ آیت سے آیت قرآن مراد ہے۔ صورت حال اس طرح لکھی ہے کہ جب کبھی نزول وحی میں تاخیر ہوئی تو کفار کہتے تھے کہ اے محمدؐ! تم اپنی طرف سے آیت گھڑ کیوں نہیں لیتے۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آپ ان سے کہدیجئے کہ جو آیات قرآن میں تمہارے سامنے پیش کرتا ہوں اور جن کی میں اتباع کرتا ہوں انہیں پروردگار مجھ تک وحی کے ذریعہ بھیجتا ہے۔

مفسرین نے اجتبار کے معنی اختلاق وافترار وافتعال لکھے ہیں۔ "التقاط" یعنی چن لینا کسی نے نہیں لکھا ہے۔

مولانا کی ساری استدلالی بضاعت مذکورہ بالا آیت تھی جس کے متعلق مولانا کا خیال تھا کہ حسی معجزات کے عدم ظہور پر نص قطعی ہے اور اس کے ذکر سے آٹھ سو صفحات کی "طویل وعریض" کتاب کی کمی پوری ہو گئی۔

نسجت علیک العنکبوت بنسجہا　　　　وقضیٰ علیک بہا الکتاب منزلٌ

محترم نقاد سے گذارش ہے کہ آیا دوسرے انبیاء و رسل علیہم الصلوٰۃ والسلام کو حسی معجزے دیے گئے تھے یا نہیں؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو خاتم النبیین صلعم روحی فداہ کو جن کو تمام انبیاء پر فضیلت ہے کیا کوئی حسی معجزہ نہیں دیا گیا؟ کیا ہماری اور آپ کی عقل اس کو تسلیم کرنے کے لئے تیار ہے؟

اس کے بعد مولانا فرماتے ہیں "پھر وہ یعنی مصنف سیرت نبی آپ کی امیت کو معجزہ قرار دیتے ہیں لیکن یہ اگر معجزہ ہے تو جملہ عرب اس میں شریک تھے کیونکہ وہ سب امی تھے"۔

محترم نقاد کو غلط فہمی ہو گئی۔ آپ کی محض امیت معجزہ نہیں قرار دی گئی ہے بلکہ آپ کی امیت کے ساتھ آپ کا علم، آپ کے اخلاق حسنہ، آپ کے فضائل کا وجود معجزہ ہے۔ کیا ان میں تمام عرب شریک و سہیم تھے۔ مولانا فرماتے ہیں:۔

"ذات نبوی کی حفاظت کا وعدہ بھی معجزات ظاہری میں نہیں ہے بلکہ یہ اللہ کی مہربانیوں میں سے ایک مہربانی ہے"۔

صحیح ہے صالح علیہ السلام کو جو اونٹنی بطور معجزہ کے دی گئی تھی وہ بھی اللہ کی ایک مہربانی و تائید تھی۔ صالح علیہ السلام کا اس میں کیا معجزہ تھا۔ اس کے بعد مولانا فرماتے ہیں:۔

"غلبۂ روم کی پیشین گوئیاں یا اخبار بالغیب جو انھوں نے قرآن سے نقل کی ہیں وہ سب کی سب اگر وجہ اعجاز ہو سکتی ہیں تو قرآن کے لئے جس نے ان امور کو بیان کیا نہ کہ رسول کے لئے۔ اسی طرح ہجرت کا موقع دکھلانا، فرشتوں سے امداد کرنا، لڑائیوں میں فتوحات دینا، میدان جنگ میں پانی برسانا وغیرہ وغیرہ جملہ امور نصرت و تائید الٰہی ہیں۔ ان کا شمار معجزات میں نہیں ہو سکتا"۔

مولانا کا ارشاد بجا ہے۔ صرف اس فہرست میں چند چیزیں اور اضافہ کر دیتا ہوں اور موسیٰ علیہ السلام کا معجزۂ ید بیضا اور عصا، عیسیٰ علیہ السلام کا مریض کو شفا دینا، لوگوں کے گھر کی چیزوں کی خبر دینا کہ انھوں نے کیا کھایا ہے اور کیا جمع کیا ہے۔ اگر یہ امور وجہ اعجاز ہو سکتے ہیں تو ان معجزات کے لئے نہ کہ

موسیٰ و عیسیٰ علیہم السلام کے لئے ۔ ساحروں کے مقابلہ میں موسیٰ علیہ السلام اپنے عصا کو چھوڑ دیتے ہیں وہ اژدہا بن کر ساحروں کے تمام دام فریب کو نگل جاتا ہے اگر یہ وجہ اعجاز ہو سکتا ہے اعصائے موسیٰ علیہ السلام کے لئے نہ کہ موسیٰ علیہ السلام کے لئے، نیز ان کا شمار نصرت الٰہی اور تائید غیبی ہوگا نہ کہ معجزات میں ! کیا معجزہ نصرت الٰہی اور تائید غیبی کے سوا کوئی اور چیز ہے ؟

اس کے بعد مولانا فرماتے ہیں "مکہ سے بیت المقدس تک ایک رات میں سفر نہ کفار نے دیکھا نہ مسلمانوں نے بلکہ ابھی تک یہی بحث ہے کہ یہ خواب میں تھا یا بیداری میں" کیا مولانا قرآن کے علاوہ حدیث و تاریخ کو بھی وجہ استدلال سمجھتے ہیں ؟ یہ اختلاف تو کتب احادیث میں ہے قرآن تو اس سے بالکل خاموش ہے ۔ کلام پاک میں صاف لفظوں میں یہ بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو رات کے وقت مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ لے گیا ۔ یہ خواب و بیداری کا اختلاف مولانا نے کس قرآن کی روشنی میں پیدا کیا ؟

شق قمر کی آیت حسی معجزے کے ثبوت کے لئے کافی دلیل ہے لیکن مولانا فرماتے ہیں کہ اس کا ظہور قیامت کے قریب ہوگا ۔ اقتربت الساعۃ وانشق القمر میں انشق ماضی کا صیغہ ہے لیکن مولانا کا ارشاد ہے کہ اس کے معنی "چاند پھٹ گیا" صحیح نہیں ہے بلکہ "چاند پھٹ جائے گا" ۔ چونکہ محترم نقاد شق القمر کا معجزہ تسلیم نہیں کرتے اور صحیح روایات و مستند احادیث کی وقعت ان کے نزدیک پرکاہ کے برابر نہیں ہے اس لئے سیرت نبی کے مصنف کے اس استدلال سے ناراض ہیں جس میں شق القمر کے معجزے کے ظہور پر مزید دلیل صحیح روایات سے پیش کی گئی ہے چنانچہ مولانا فرماتے ہیں "بس اصلی وجہ یہی مستند اور صحیح روایات ہیں جو اس کھلی آیت کے سمجھنے سے مانع ہیں ۔ اس میں کیا قباحت ہے کہ قرآن جس معنی میں ہے اس کو اسی میں رہنے دیجئے اور صاف صاف کہہ دیجئے کہ شق القمر کا معجزہ قرآن سے ثابت نہیں ۔"

مولانا الٹا مصنف سیرت نبی کو الزام دیتے ہیں کہ وہ آیت کو اپنے اصلی معنی میں نہیں رکھتے حالانکہ اس جرم کے مرتکب خود مولانا ہیں ۔ کلام مجید میں انشق کا صیغہ استعمال ہوا ہے جس کے معنی

پھٹ گیا' ہیں لیکن مولانا ترجمہ کرتے ہیں "چاند پھٹ جائے گا" کیا خوب! قرآن کو اپنے املی میں رکھا۔ ہم الزام ان کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا۔ اس کے بعد مولانا نے شق قمر کی سورت کی دوسری آیات کا ترجمہ کیا ہے وہ بھی اہل علم حضرات کے لئے غور طلب ہے :۔

وان یروا آیۃ یعرضوا ویقولوا سحر مستمر	اگر وہ (قیامت کی) کوئی نشانی دیکھیں گے تو بھی منہ پھیر لیں گے اور کہیں گے کہ یہ جھوٹ ہے جو ہمیشہ سے چلا آرہا ہے۔

علامت قیامت کے دیکھنے کے بعد جھوٹ کہنے کے کیا معنی؟ جھوٹ تو واقعہ کے خلاف خبر کا نام ہے جس کو اپنی آنکھوں سے انسان دیکھ رہا ہو اسے جھوٹ کس طرح کہہ سکتا ہے۔ البتہ کسی علامت کو دیکھ کر انسان ہٹ دھرمی سے یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ جادو ہے سحر ہے نہ کہ جھوٹ اور کذب۔ سحر کے معنی جھوٹ کہاں اور کس لغت میں ہے؟ مولانا نے جس تلبیس وتدلیس سے کام لیا ہے اس کی مثال علمی دنیا میں مشکل سے مل سکتی ہے

بدر میں فرشتوں کا نزول اللہ کے افضال وعنایات میں سے یہ امر بھی تھا کہ اس نے بدر نیز دوسرے غزوات میں بھی اپنے نبی کی امداد کے لئے فرشتے اتارے۔ ان کے اتارنے کی حقیقت اور اس کی نوعیت اور اس کے متعلق سنت اللہ ان سب امور کی قرآن میں کئی جگہ تفصیل کی گئی ہے لیکن سید صاحب نے قطعاً اس کی طرف اعتنا نہ کی۔ کاش مولانا ہی اپنے "بحر تحقیق" کے ایک قطرہ کو لے کر قلم "حقیقت نگار" سے ہم لوگوں کی خاطر جامعہ کے صفحات پھیلا دیتے کہ ناظرین جامعہ کی بصیرت کا سبب ہوتا۔

مصنف سیرت نبی نے بدر میں فرشتوں کے نزول کے متعلق لکھا ہے "اس معرکے میں سن چکے ہو کہ کافروں کی تعداد مسلمانوں سے تگنی تھی۔ ایسی حالت میں مسلمانوں کا بددل ہونا لازمی تھا خدا نے اپنی قدرت کاملہ کا یہ تماشا دکھایا کہ مسلمانوں کی نگاہوں میں کچھ ایسا تغیر کر دیا کہ وہ مسلمانوں کو بہت تھوڑے نظر آنے لگے۔ ادھر کفار کو مسلمان تھوڑے نظر آتے تھے۔ مقصود یہ تھا کہ رؤسار کفار میدان سے بھاگ کر جانیں بچا کر نہ لے جانے پائیں۔ اس کی تدبیر یہ کی کہ مسلمان اپنی اصلی تعداد سے بھی ان کو کم نظر آنے لگے۔" صفحہ ۵۲۷۔

اس کے بعد صفحہ ۵۲۰ پر مصنف سیرت نبی نے یہ لکھا ہے "جب دونوں صفیں گتھ گئیں تو خدا کے حکم سے مسلمانوں کی تعداد دشمنوں کو ان کی اپنی تعداد سے دونی نظر آنے لگی۔ ..... یہ مسلمانوں کی تعداد بڑھ کیوں کر گئی تھی۔ کیا آسمان سے فرشتے اتر آئے تھے"۔ مولانا نے اس پر ایک حاشیہ تحریر فرمایا ہے وہ بھی ملاحظہ ہو۔

"یعنی ایک ہی حالت میں (یہ مولانا کی طرف سے ہے) جبکہ بدر میں دونوں فوجیں گتھی ہوئی تھیں کفار مسلمانوں کو اپنی تعداد سے دونا یعنی کم وبیش دو ہزار دیکھتے تھے اور پھر ان کو ان کی اصلی تعداد یعنی ۳۱۴ سے کم دیکھتے تھے۔ کیا ان دونوں سے ایک تیسرا معجزہ جمع بین الضدین کا نہیں پیدا ہوتا جس کو سید صاحب کی طرف منسوب کرنا چاہیئے"۔

ناظرین کرام سمجھ سکتے ہیں کہ یہ جمع بین الضدین کے ثابت کرنے کا معجزہ (اگر اس فعل کو معجزہ کہنا صحیح ہو) مولانا کی طرف منسوب کرنا چاہیئے۔ کہاں اور کس کتاب میں ہے کہ ایک ہی وقت میں کفار مسلمانوں کو اپنے سے دونا یعنی کم وبیش دو ہزار دیکھتے تھے اور اسی وقت میں ان کو ان کی اصلی تعداد یعنی ۳۱۴ سے کم دیکھتے تھے۔ مصنف سیرت نبی نے تعداد کی کمی و زیادتی کو بیان کرتے ہوئے یہ صاف لکھ دیا کہ ابتداءً کفار کی نگاہوں میں اللہ نے کچھ ایسا تغیر کر دیا کہ مسلمان ان کی نگاہوں میں تھوڑے نظر آنے لگے تاکہ وہ میدان سے نہ بھاگیں۔ ادھر مسلمانوں کی نگاہوں میں کچھ ایسا تغیر کیا کہ کفار ان کو کم نظر آنے لگے تاکہ دشمنوں کی گھنی تعداد دیکھ کر مسلمان بددل نہ ہوں۔ اس کے بعد جب صفیں گتھ گئیں تو خدا کے حکم سے مسلمانوں کی تعداد دشمنوں کی آنکھوں میں ان کی اپنی تعداد سے بھی دونی نظر آنے لگی۔ کفار کا مسلمانوں کو تھوڑا دیکھنا ایک وقت میں ہوا۔ پھر ان کو اپنی تعداد سے بھی زیادہ دیکھنا دوسرے وقت میں ہوا۔ یہ اجتماع ضدین کس طرح ہوا۔ مولانا! اجتماع بین الضدین کے لئے اتحاد وقت بھی ضروری ہے۔

"تسع آیات" کی تفسیر حدیثوں میں دونوں طرح سے مذکور ہے مصنف سیرت نبی نے ان دو روایتوں میں سے ایک کو اختیار کیا۔ اگر مولانا کے نزدیک دوسری روایت راجح ہے تو کوئی مضائقہ

نہیں۔ مولانا نے "تسع آیات" کی جو شرح کی ہے وہ کسی تحقیق امیق کا نتیجہ نہیں ہے۔ حدیث کی کتابوں میں دونوں روایتیں صحیح سند سے مذکور ہیں۔

سیرت نبی میں بلاشبہ بعض مضامین کا بار بار اعادہ ہوا ہے لیکن لوگوں کی طبیعتیں مختلف ہوتی ہیں بعض اشارے سے سمجھتے ہیں بعض تصریح کے بعد بھی نہیں سمجھتے بعض بار بار کہنے کے بعد بھی نہیں سمجھتے۔ خود قرآن مجید میں ایک ہی مضمون کو اللہ نے مکرر سہ کرر بیان کیا ہے۔ اس کا مقصود یہ ہے کہ ذکی و ذہین، غبی و بلید سب کے ذہن میں مضمون راسخ ہو جائے۔

اخیر میں میں یہ عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ سیرت نبی جلد سوم کو شائع ہوئے کئی سال گذر گئے۔ اس عرصہ میں مولانا اسلم صاحب نے بڑی کاوش و محنت سے "لخت جگر" پیش کئے ہیں جس کے لئے وہ مستحق داد ہیں لیکن مولانا کی اس "روشن خیالی" سے جس کی اشاعت کی وہ پیہم کوششیں کر رہے ہیں مجھے شدید اختلاف ہے کیونکہ اس سے سنت رسول کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔

محمد تغلق اور ضیاے برنی

جناب اکبر شاہ خاں صاحب نجیب آبادی کا مکتوب گرامی

مجھے اس ہفتے نجیب آباد سے بجنور جانا پڑا۔ سفر میں ایک عزیز محترم نے رخصت کرتے وقت جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے رسالہ "جامعہ" کا ماہ نومبر ۱۹۳۳ء کا پرچہ بلا طلب مرحمت فرمادیا اور میں نے شکریے کے ساتھ لے لیا۔ نگینہ اور نجیب آباد کے درمیان ریل میں اسے مطالعہ کیا۔ رسالے کا پہلا مضمون سیرۃ النبی جلد چہارم پر محترمی مولانا اسلم جیراجپوری کا ریویو تھا۔ اس میں ایک علمی بحث تھی اسے پڑھتے ہوئے میں نے سمجھا کہ اسی مضمون کی وجہ سے رسالہ مجھے دیا گیا ہے لیکن آگے بڑھ کر اس خیال کی اصلاح ہوئی: دوسرا مضمون "محمد تغلق اور ضیائے برنی" کے عنوان سے جناب مولانا سید حسن صاحب برنی ایڈووکیٹ کا لکھا ہوا تھا جس کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ اس حقیر پر تقصیر کی نالائقیوں پر زجر و توبیخ کی گئی ہے ؎

بر لوح ثبت بود کہ ملعون شود کسے   بردم گماں بہ ہر کس و بر خود گماں نبود

میں نے اس مضمون کو بڑی ہی دلچسپی اور مسرت کے ساتھ پڑھا۔ خدائے تعالیٰ کی جناب میں توبہ استغفار کی کہ الٰہی میرے گناہوں کو معاف فرما اور مجھے اپنی رضا کی راہوں پر چلا۔ نجیب آباد پہنچ کر حضرت سید حسن صاحب برنی کی خدمت میں شکریے کا ایک عریضہ لکھا کہ آپ نے میری اصلاح کے لئے جو کوشش فرمائی ہے میں بدل اس کا سپاس گزار اور منت پذیر ہوں۔ اگلے روز ایک محترم بزرگ کا دہلی سے بھیجا ہوا گرامی نامہ پہنچا کہ نومبر کے جامعہ میں تیری کتاب آئینہ حقیقت نما جلد دوم کے خلاف جو تلخ مضمون شائع ہوا ہے اس کا جواب لکھنا ضروری ہے۔ اس خط کو پڑھ کر مجھے آئینہ حقیقت نما جلد اول کے متعلق جامعہ کا وہ ریویو یاد آگیا جو غالباً ۱۹۲۶ء میں شائع ہوا تھا۔ محترمی مولانا سید حسن صاحب برنی کے اس ریویو میں تو مجھے کوئی تلخی محسوس نہیں ہوئی لیکن جلد اول کے اس ریویو میں جو ادارۂ جامعہ کی طرف سے شائع ہوا تھا ضرور تلخی موجود تھی اور وہ پرچہ دفتر رسالہ جامعہ سے میرے

نام بھجوایا گیا تھا۔ میں نے اس وقت بھی جامعہ کے اڈیٹر صاحب کو شکریے کا خط لکھا تھا اور علیم و خبیر خدا خوب جانتا ہے کہ جامعہ کے ساتھ اس تلخ ریویو کی بنا پر میری محبت میں اضافہ ہی ہوا تھا کہ داروئے تلخ است دفع مرض۔ اس وقت میرے کئی دوستوں نے جواب دینے اور جامعہ کے ساتھ بحث کجثی کا ارادہ کیا لیکن میں نے باصرار اور بالحاح ان کو باز رکھا اس لئے کہ تلخ گفتار نکتہ چینوں کو اپنا مخالف یقین کرنا اور ان کی تنقید سے نفع اٹھانے کی کوشش نہ کرنا انسان کی بدنصیبی ہے ؎

من آنکس نگویم کہ بدخواہ تست　　　　کہ گوید فلاں خار در راہ تست

آئینۂ حقیقت نما کی دونوں جلدیں ملک کے ہر حصے میں پہنچ چکی ہیں۔ پہلی جلد کے دو اڈیشن شائع ہو چکے دوسری جلد کا پہلا اڈیشن ختم ہونے کے بعد دوسرے اڈیشن کے لئے ہر طرف سے پیہم تقاضے ہو رہے ہیں۔ یہ دونوں جلدیں نفع رساں ہیں یا مضرت رساں ملک خوب محسوس کر چکا ہے۔ اب کسی کے برا یا بھلا کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ تاہم اگر ضرورت ہو تو مجھے آئندہ اڈیشنوں میں ترمیم و اصلاح سے انکار اور اپنی کسی غلط رائے پر کوئی اصرار نہیں۔ آئینۂ حقیقت نما، حجۃ الاسلام، قول حق، تاریخ اسلام اور دوسرے بہت سے رسائل میں نے ہرگز ہرگز اس لئے نہیں لکھے کہ لوگوں کے دلوں پر اپنے علم و واقفیت کی کوئی دھاک بٹھاؤں اور ملک میں اپنے لئے کوئی اونچی سی جگہ تلاش کرنے کی ملعون کوشش میں شیطان کا کھلونا بنوں۔ میں جاہ پسندی و خود پرستی کو الحمد للہ نہایت نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھتا ہوں۔ خدائے تعالیٰ بدگمانی کی پلیدی سے ہمیشہ مجھے بچائے۔ میرا خیال ہے کہ مسلمانوں میں دانش فروش اور شہرت پسند مصنفین کو اپنے علمی مرتبے کی حفاظت کے مقابلے میں اسلام اور مسلمانوں کے مفاد کا خیال بہت کم ہے۔ یہ بات کچھ عہد حاضر ہی سے مختص نہیں۔ عہد قدیم میں بھی اس کی مثالیں موجود ہیں۔ احیاء العلوم پر تنقید کرنے والوں میں بعض نے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کو مورد طعن و تشنیع بنانے میں کوتاہی نہیں کی لیکن ان ناقدین کی تصانیف نفع رسانی کے اعتبار سے احیاء العلوم کی گرد کو بھی نہ پہنچ سکیں۔

میں نہایت ادب کے ساتھ اپنے محترم بزرگ کی خدمت میں جنھوں نے دہلی سے خط بھیجا ہے گذارش پرداز ہوں کہ محترمی سید حسن صاحب برنی نے ضیائے برنی کی حمایت میں جو کوشش فرمائی ہے

یہ ان کا حق بلکہ فرض تھا اور ان کی یہ حب الوطنی میرے نزدیک ان کی شرافت کی دلیل ہے۔ اس معاملے میں ان سے رعایت کا برتاؤ نہ کرنا ایک عیب اور جرم قرار دیا جا سکتا ہے۔

ہاں! ذیل کے چند فقرات گذارش کرنے میں کوئی ہرج معلوم نہیں ہوتا۔

(۱) ضیائے برنی نے اپنی تاریخ میں ہر ایک بادشاہ کا حال ترتیب زمانی اور بے ساختگی کے ساتھ لکھا ہے اور یہی مناسب بھی تھا اور یہی قدیم زمانے کے ہر مورخ کا شیوہ رہا ہے لیکن تنہا سلطان محمد تغلق کے حالات لکھتے ہوئے ضیائے برنی نے ترتیب زمانی کو درہم برہم کر دیا ہے اور ظاہر ہے کہ اس طرح وہ تصور جو کسی بادشاہ کے حالات پڑھ کر ہر شخص آزادانہ قائم کرتا ہے سلطان محمد تغلق کے متعلق قائم نہیں کر سکتا بلکہ وہی تصور قائم ہوتا ہے جو ضیائے برنی نے قائم کرانا چاہا ہے۔ اس کے متعلق ضیائے برنی کی معذرت بھی نہایت رکیک ہے اور محترمی سید حسن صاحب برنی کو بھی کچھ نہیں فرمانا چاہئے تھا۔

(۲) محترمی مولانا سید حسن صاحب برنی کو اس تنگ خیالی کی حمایت نہیں کرنی چاہئے تھی کہ کسی شخص کی ایک برائی کو برا کہنے کے بعد ضروری ہے کہ اس کی خوبیوں کا اقرار نہ کیا جائے اور اس کے لئے دعا بھی نہ کی جائے۔

(۳) محترمی سید حسن صاحب برنی نے پروفیسر گارڈنر براؤن آنجہانی کے اتباع کا الزام دینے میں اپنی تنقید کے مرتبے کو ناحق نقصان پہنچایا اس لئے کہ میں نے تو پروفیسر مذکور کی کج نظری کو واشگاف کر کے اس کی مخالفت کی ہے نہ اس کی تقلید۔

(۴) سفرنامہ ابن بطوطہ اور تاریخ مبارک شاہی دونوں کو میں بالاستیعاب مطالعہ کر چکا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ دونوں کے ذریعے اپنے خیال کی تائید میں اور بھی بہت سے دلائل فراہم کر سکتا ہوں مگر اب اس کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔

(۵) ضیائے برنی کی حمایت میں جو کچھ فرمایا گیا ہے میرا خیال ہے کہ اس پر اور بھی اضافہ ممکن تھا لیکن سلطان محمد تغلق کے گناہوں کی فہرست کو طویل بنانے میں محترم ممدوح نے جو کوشش فرمائی

ہے مجھے اس سے انکار ہے۔ چھ سات برس تک بارش کا نہ ہونا اور بقول یحیٰی بن احمد سرہندی مصنف تاریخ مبارک شاہی آسمان سے سات برس تک ایک قطرۂ آب کا نہ گرنا یقیناً اس زمانے کی عام مخلوق کی بداعمالیوں اور سخت گناہوں کا نتیجہ تھا۔ یہ بے چارے محمد تغلق کی کرتوت نہ تھی۔ اگر اس زمانے میں بداعمالیاں حد سے بڑھ گئی تھیں (جس کا تاریخوں سے بھی ثبوت ملتا ہے) تو ایسے بداعمال لوگوں پر حکومت کرنے والے فرماں روا کا مجرموں کو سزا دینا اور لوگوں کا زیادہ زیرِ سیاست آنا کم از کم ایک مسلمان کے لئے تو تعجب کی بات نہیں ہونی چاہئے۔

(۶) محترم ممدوح کے مضمون میں اگر کوئی بات جواب طلب ہے تو اس کا جواب سوائے اس کے کچھ نہیں کہ آئینۂ حقیقت نما جلد دوم کو دوبارہ ملاحظہ فرمایا جائے۔

(۷) سنا ہے کہ ڈاکٹر ایشوری پرشاد صاحب لکچرر الہ آباد یونیورسٹی نے آئینۂ حقیقت نما جلد دوم کی اشاعت کے کئی سال بعد سلطان محمد تغلق پر مضمون لکھ کر ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کی ہے مگر اب تک کئی سال گزرنے پر بھی انھوں نے اپنا وہ مضمون ہندوستان میں غالباً شائع نہیں فرمایا۔ محترمی سید حسن صاحب برنی اگر ڈاکٹر ممدوح کے اس مضمون کو کسی طرح ملاحظہ فرما سکیں اور اس پر کوئی ریویو ارقام فرما دیں تو ممکن ہے کہ جواب دہی کا وہ بوجھ جو تنہا مجھ پر ڈالا گیا ہے اس کا ایک حصہ ڈاکٹر صاحب بھی اُٹھا سکیں۔

حضرت محترمی سید حسن صاحب برنی کے مضمون کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کا لہجۂ تخاطب نہایت ہی شریفانہ ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر قابلِ اطمینان اور قابلِ تعریف بات یہ ہے کہ انھوں نے کتاب کی اصل روح کو کوئی صدمہ نہیں پہنچانا چاہا بلکہ انھوں نے میری تحقیق اور تفتیش کے ناقص و کمزور ہونے ضیائے برنی کے بے گناہ اور میرے خطاکار ہونے پر ہی تمامتر زور صرف فرمایا ہے اس حقیقت کو جو اس کتاب کے مطالعے سے منکشف ہوتی اور قلب پر اثرانداز ہوتی ہے اس ریویو سے کوئی صدمہ نہیں پہنچا اور مجھے اپنی ذات سے زیادہ وہی محفوظ چیز عزیز ہے۔ میں ایک گنہگار

انسان ہوں۔ ہرگز اپنے آپ کو فرشتہ نہیں سمجھتا لیکن فرشتوں کی زبانی خدائے تعالیٰ کی جناب میں عاجزانہ اقرار کرتا ہوں کہ سبحانک لا علم لنا الا ما علمتنا انک انت العلیم الحکیم اور حضرت محترمی مولانا سید حسن صاحب برنی کی خدمت عالی میں مودبانہ عرض پرداز ہوں کہ ؎

نمی خواہم کہ در عالم دمے از من غمیں باشد ۔۔۔ ز فیض دوستی آگاہ گرداں دشمنانم را

تصحیح

رسالہ جامعہ ماہ نومبر ۳۳ء صفحہ ۷۰۴ سطر ۱۵ میں "بلکہ اس کی سرحدیں" کے بجائے "بلکہ موت کی سرحدیں" ہے۔ ناظرین تصحیح فرمالیں۔

فاہیان کی تیرتھ یاترا

باب (۱)

چھنگ آن سے روانگی۔ کوہستان لوانگ۔ مغربی تسین۔ جنوبی لی آن۔ شمالی لیان تھن ہوانگ۔

ریگستان

پہلے فاہیان جب چنگان میں تھا تو اسے یہ دیکھ کر کہ بدھ مت کے احکامات اور مذہبی تصانیف قریب قریب تلف ہو رہی ہیں اور بعض مسخ ہو گئی ہیں بڑی پریشانی ہوئی۔ چنانچہ ہوانگ شی کے دوسرے سال ۳۹۹ء میں وہ اصلیت کا پتہ لگانے کے لئے ہوئی گنگ، تاؤ چنگ، ہوئی ینگ، ہوئی وی اور بعض دوسرے اشخاص کے ساتھ ہندوستان کی طرف روانہ ہوا۔

چنگان سے روانہ ہو کر اور کوہستان لوانگ کو عبور کر کے وہ کھیان کوئی کی حکومت میں پہنچا اور یہاں گرمیاں گذارنے کے لئے ٹھہر گیا۔ گرمیاں ختم ہونے پر اور آگے بڑھا اور نیوتھان کی حکومت میں پہنچ گیا جہاں سے کوہستان یانگ لو کو پار کر کے وہ چنگ چی کے فوجی مقام پر آ گیا۔

اس وقت چنگ چی کے ملک میں بڑی ابتری پھیلی ہوئی تھی جس کی وجہ سے سفر کرنا دشوار ہو گیا تھا۔ چنگ چی کا حاکم مسافروں کے ساتھ دلچسپی اور محبت رکھتا تھا اور ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کرتا تھا۔ اسی زمانے میں اس کی ملاقات چیان، ہوئی کیان، سینگ شاؤ، پاؤ ین، سینگ کنگ اور دوسرے لوگوں سے ہوئی اور چونکہ وہ بھی ہم مقصد تھے اس لئے اس کے ساتھ مل جل کر رہے اور جب گرمیاں گذر گئیں تو ذرا اور آگے بڑھے اور تھن ہوانگ جا پہنچے جہاں فوجی استحکامات بڑے زوروں پر تھے۔ مشرق سے مغرب تک اسی میل اور شمال سے جنوب تک چالیس میل تک پھیلے ہوئے تھے۔ اس جگہ وہ ایک مہینے اور چند دن ٹھہرے۔ پھر فاہیان اور پانچ دوسرے آدمی ایک سفارت کی معیت میں پاؤ ین اور اس کے ساتھیوں سے جدا ہو کر روانہ ہوئے۔ تھن ہوانگ کے حاکم لی ہاؤ

نے ریگستان کو عبور کرنے کے لئے ان سب کے لئے بڑی سہولتیں مہیا کیں۔ اس دریائے ریگ میں ایسی چلنے والی آندھیاں چلتی ہیں کہ جس کے لگ جائیں وہ آناً فاناً مرجائے۔ نہ تو ہوا میں پرند نظر آتے ہیں اور نہ زمین پر دوسرے جانور۔ ہر طرف جہاں تک آنکھ کام کرتی ہے اگر عبور کرنے کا صحیح راستہ تلاش کیا جائے تو سوائے ان لوگوں کے ڈھانچ کے اور کچھ نظر نہیں آتا جنھوں اس کو پار کرنے کی کوشش میں اپنی جان دے دی اور انھیں سے راستے کا کچھ سراغ لگتا ہے۔

سترہ دن سفر کرنے اور پندرہ سو میل کی مسافت طے کرنے کے بعد وہ شین شین کے ملک میں آپہنچے۔

باب (۲)

شین شین کا ملک نہایت اونچا نیچا اور ناہموار ہے۔ اس کی زمین کمزور اور بنجر ہے۔ یہاں کے باشندوں کے اطوار ولباس ہان کے باشندوں کے اطوار ولباس کی طرح بھونڈے اور بھدے ہیں۔ فرق فقط نمدے اور کپڑے کے استعمال ہی میں ہے۔

اس ملک کا مالک بدھمت کا حامی ہے۔ اس کے راج میں کوئی چار ہزار رمنگ ہیں اور یہ سب کے سب سیاؤ چنگ کے اصول کے پیرو ہیں۔ ان ممالک کے سجن تو سجن سامن تک ہیان تومت کو کم وبیش کثافت و نفاست کے فرق سے مانتے ہیں۔

مغرب کی طرف سفر کرتے وقت جتنی حکومتوں سے آپ گذریں گے اس لحاظ سے کم و بیش سب کو ملتا ہوا پائیں گے۔ فرق صرف اتنا ہی ہوگا کہ ہر جگہ کی ایک خاص جنگلی زبان ہے لیکن تمام سجن اور سامن ہان[1] تو شاستر اور ہانتو زبان کے مطالعے میں لگے رہتے ہیں۔

فاہیان نے مع اپنے ساتھیوں کے یہاں ایک مہینہ اور کچھ دن گرمیوں کا زمانہ کاٹا۔ پھر چل کھڑا ہوا اور شمال و مغربی سمت پندرہ دن کے سفر کے بعد وہ اوئی کے ملک میں جا پہنچا۔

---

[1] ہندو زبان یعنی پالی، ماگھی یا سنسکرت۔

اوئی کے ملک کے سنگ بھی کوئی چار ہزار کے قریب ہیں اور سب کے سب سیاؤ چنگ اصول کو مانتے ہیں اور بڑے راسخ العقیدہ ہیں۔ تھیین کے ملک کے شامن جو اس ملک میں آنکلتے ہیں ان سنگوں کی رسوم پر چلنے کو تیار ہیں۔ فاہیان کو جب پروانۂ راہداری مل گیا تو وہ حاکم وقت کوانگ سن کی چھاؤنی کی طرف چل پڑا جس نے اسے کچھ دن اوپر دو مہینے روک رکھا۔ وہ پھر پاؤین اور باقیماندہ ساتھیوں کے پاس واپس چلا آیا۔ ان سب نے معلوم کیا کہ ملک اوئی کے باشندے اخلاق اور انصاف سے بے بہرہ ہیں اور مسافروں کے ساتھ بھی کچھ بھلا برتاؤ نہیں کرتے۔ اس لئے چیان، ہوئی کیان، اور ہوئی وی نے کاؤ چھنگ کے ملک کی سیدھی راہ لی تاکہ وہاں سے اپنے سفر کے لئے مدد حاصل کریں۔ فاہیان اور دیگر ہمراہیوں کو پروانہ مل گیا۔ کوانگ سن نے رسد کا انتظام کر دیا۔ اب وہ اس قابل ہو گئے کہ فوراً چل دیں۔ چنانچہ جنوب مغربی سمت کو روانہ ہوئے۔

جس ملک میں سے وہ گذر رہے تھے وہ صحرا اور غیر آباد تھا، دریا پار کرنا الگ مصیبت تھی۔ جو تکلیف انھوں نے اٹھائی دنیا میں اس کا ثانی نہیں۔ ایک مہینہ پانچ دن کے سفر کے بعد وہ کہیں یوتھیان جا کر پہنچے۔

باب (۳)

حکومت یوتھیان

یوتھیان کا ملک شاد و آباد ہے، باشندے خوش حال ہیں۔ سارے کے سارے بدھ مت کے پیرو ہیں اور یہی دھرم ہے جس کی بدولت انھیں فراغ اور اطمینان حاصل ہے۔ بیسیوں ہزار سنگ ان میں موجود ہیں جن میں سے بہت سے مہایان (تا چنگ) اصول پر کاربند ہیں۔ سب کے سب مل جل کر ساتھ ہی کھاتے ہیں۔ ملک کے باشندے تاروں کی طرح دور دور بکھرے ہوئے مکان بناتے ہیں اور دروازے کے سامنے ایک ستھوپا (ٹوپ؟) کھڑا کرتے ہیں۔ چھوٹے سے چھوٹا ستھوپا کوئی ساڑھے چھ ہاتھ کا ہوتا ہے۔ وہ مربع شکل کے وہارے بناتے ہیں جس میں مسافروں کو

ٹھہرایا جاتا ہے اور ان کی اچھی طرح خاطر و مدارات کی جاتی ہے۔

اس ملک کے حاکم نے فاہیان اور اس کے ساتھیوں کو سنگ کیالن (سنگ دھارا) میں ٹھہرایا۔ اس سنگ کیالن (دھرم شالہ، خانقاہ) کا نام گوماتی ہے۔ اس میں تین ہزار سنگ رہتے ہیں جو مہایان (تاچنگ) اصول پر چلتے ہیں۔ گھنٹے کی آواز پر سب جمع ہو کر ساتھ کھاتے ہیں۔ بھوجن کرنے کی جگہ پر جب وہ آتے ہیں تو ان کے چہرے متین اور سنجیدہ ہو جاتے ہیں۔ ہر ایک اپنے مرتبے کے مطابق ترتیب وار چپ چاپ بیٹھ جاتا ہے۔ کیا مجال جو ان کے کٹوروں یا تھالوں کی آواز تو آئے۔ یہ بھلے مانس کھانے میں ایک دوسرے سے بات نہیں کرتے، ہاں انگلیوں سے اشارے کر لیتے ہیں۔

ہوئی کنگ اور تاؤ چنگ اور ہوئی تھا پہلے ہی سے چل پڑے اور اپنے قدم کی چھا (کاشغر) کے ملک کی طرف بڑھائے۔ فاہیان اور اس کے دوسرے رفیق جو مورتیوں کے جلوس دیکھنے کو بے قرار تھے کچھ دن اور تین مہینے وہیں پیچھے رہ گئے۔ اس ملک میں چودہ بڑے بڑے سنگ کیالن ہیں اور چھوٹے کا شمار تو ناممکنات سے ہے۔ چوتھے مہینے کی پہلی تاریخ کو شہر کے تمام بازاروں میں جھاڑو دی جاتی اور چھڑکاؤ کیا جاتا ہے۔ سڑکوں اور چوکوں کی آئینہ بندی کی جاتی ہے۔ شہر کے دروازے کے سامنے شامیانے تان دیے جاتے اور پردے لٹکا دیے جاتے ہیں اور خوب شان کے ساتھ سجاوٹ کی جاتی ہے۔ راجہ، رانی اور دوسری ذی عزت عورتیں یہاں آکر ٹھہرتی ہیں۔ گوماتی دھارے کے شامن کی جو مہایان اصول پر چلتے ہیں راجہ بہت عزت کرتا ہے اور یہی مورتیوں کے جلوس میں نمایاں حصہ لیتے ہیں۔ شہر سے تین چار لی کے فاصلے پر مورتی کے لئے ایک چار پہیوں کا رتھ بنایا گیا ہے جو بیس اکیس ہاتھ اونچا ہے اور چلتی ہوئی تو لکڑی کی نو لکڑی ہے۔ سات بیش قیمت چیزوں، شامیانوں اور پردوں اور ریشمی غلافوں سے سجا ہوا ہے۔ بیچوں بیچ بدھ کی مورتی براجمان ہے۔ دونوں طرف دو فوسا ہیں اگرد اگرد اور عقب میں دوسرے دیوتاؤں کی مورتیاں ہیں۔ یہ سب کی سب سونے چاندی کی بنی ہیں اور جواہرات جڑے ہیں۔ جب مورتی شہر کے دروازے سے سو قدم پر آپہنچتی ہے تو راجہ اپنا راج مکٹ اتار کر، نیا جوڑا پہن کر ننگے

پاؤں آگے بڑھتا ہے اور اپنے ہاتھ میں "دھوپ" اور پھول لئے اپنے حشم وخدم کے ساتھ شہر کے باہر نکل کر مورتی کے سامنے ہو لیتا ہے۔ اپنے تئیں مورتی کے چرنوں میں گرا دیتا ہے، اس کی پوجا کرتا، دھوپ دیتا اور پھول چڑھاتا ہے۔ جوں ہی مورتی شہر کے دروازے میں داخل ہوتی ہے استریاں اور جوان بالیاں پھاٹک کے کوٹھوں سے ہر چہار طرف سے طرح طرح کے پھولوں کی بوچھار کر دیتی ہیں یہاں تک کہ سارا رتھ پھولوں سے ڈھک جاتا ہے۔ ہر رسم کے لئے قسم قسم کے رتھ میں اور ہر ایک سنگ کیالن کا مورتی کے جلوس کے لئے ایک خاص دن ہے۔ یہ رسم چوتھے مہینے کی پہلی تاریخ کو شروع ہوتی ہے اور مورتیوں کا جلوس چودھویں تاریخ کو ختم ہوتا ہے اور راجہ اور رانی رتواس کو رخصت ہوتے ہیں۔

شہر سے کوئی سات آٹھ لی کے فاصلے پر ایک سنگ کیالن ہے جو "راجہ کا نیا تسوالہ" کے نام سے مشہور ہے اس کے بننے میں اسی برس لگے اور تین راجہ یکے بعد دیگرے اس کے تمام کرنے میں تمام ہوئے۔ یہ کوئی تراسی چوراسی گز اونچا ہے، سونے چاندی کی گل کاریاں اور مورتیاں بنی ہوئی ہیں۔ ستھوپا بنانے کے لئے بہت بیش قیمت مسالہ مہیا کیا گیا ہے۔ فو (بدھ) کے لئے ایک گھوڑا بنایا گیا ہے اور اس کو بڑی خوبی سے آراستہ کیا ہے۔ کڑیاں، کھمبے، تہ ہونے والے کیواڑ، جالیاں سب کی سب سونے سے منڈھی ہیں۔ سنگوں کے لئے الگ الگ کوٹھریاں ہیں اور ایسی خوبصورتی سے اعلیٰ پیمانے پر آراستہ کی گئی ہیں کہ الفاظ اس کو ادا نہیں کر سکتے۔ چھ راجوں کے راجہ جن کی حکومتیں سلسلۂ کوہستان کے مشرق میں واقع ہیں ہر قیمتی چیز جو ان کے قبضے میں ہے بطور نذر یہاں بھیجتے ہیں اور ایسی دریا دلی سے دان دیتے ہیں کہ اپنے پاس نام ہی کو کچھ رہ جاتا ہے۔

باب (۴)

تسو ہو کا ملک۔ کوہستان۔ تسونگ لنگ۔ یو ہوئی کا ملک۔

چوتھے مہینے مورتیوں کے جلوس کی رسم ختم ہو گئی۔ سینگ شاؤ تنہا ایک تاؤجن کے ہمراہ

کیپن کو چلا۔ فاہیان بقیہ ہمراہیوں کے ساتھ تسوہو کے ملک کی جانب روانہ ہوا۔ وہ پچیس دن تک سفر کرتے رہے اور آخر کو اس ملک میں پہنچ گئے۔ بادشاہ عقیدے کا پکا ہے۔ اس ملک میں تقریباً ایک ہزار سنگ ہیں جو زیادہ تر مہایان کے پیرو ہیں۔ مسافروں نے وہاں پندرہ دن آرام لیا اور پھر جنوب کی طرف روانہ ہوئے۔ چار دن چلنے کے بعد تسونگ لنگ کے پہاڑوں میں داخل ہوئے اور یوہوئی کے ملک میں پہنچے۔ یہاں وہ ٹھہر گئے۔ ذرا تازہ دم ہو کر انھوں نے پھر چلنا شروع کیا اور پچیس دن میں کیچھا کے ملک میں پہنچ گئے۔ یہاں وہ ہوئی لنگ اور دوسرے لوگوں سے پھر آملے۔

باب (۵)

کیچھا کا ملک

کیچھا کا راجہ پنچی یوسی (پنچ ورش) منا رہا تھا۔ پنچی یوسی کے معنی چینی زبان میں پنچ سالہ مہاسبھا کے ہیں۔ اس سبھا کے زمانے میں شامن تمام اطراف واکناف سے مدعو کئے جاتے ہیں۔ وہ خوب دھوم دھام سے بادلوں کی طرح امنڈ کر آتے ہیں۔ شامن جہاں بیٹھتے ہیں وہاں پردے، جھنڈیاں اور شامیانے لگائے جاتے ہیں۔ ایک سنگھاسن تیار کیا جاتا ہے اور اس کو سونے چاندی کے کنول کے پھولوں سے سجایا جاتا ہے۔ اس کے نیچے شاندار نشستیں ترتیب دی جاتی ہیں۔ وہاں راجہ اور اس کے منتری بدھ دھرم کے مطابق پوجا کرتے جاتے ہیں۔ یہ تقریب دو تین مہینے تک رہتی ہے اور عام طور پر بہار کے موسم میں ہوا کرتی ہے۔ جب راجہ سبھا سے اٹھتا ہے تو اپنے منتریوں کو حکم دیتا ہے کہ اب پوجا کرنے کی ان کی باری ہے۔ ان میں سے بعض کو ایک دن لگتا ہے، بعض کو دو دن، بعض کو تین دن اور اکثر کو پانچ دن بھی لگتے ہیں۔ جب سب پوجا سے فارغ ہو جاتے ہیں تو راجہ اپنی سواری کا گھوڑا مع اس کی زین اور لگام کے اور اپنی ریاست کے سب بڑے بڑے کارباریوں اور دوسرے بڑے لوگوں کے گھوڑے، تمام قسم کا پشمینہ، بڑھیا چیزیں اور جو جو چیزیں شامنوں کو مطلوب ہوتی ہیں ان کے حوالے کرتا ہے۔ تمام منتری عہد کرتے ہیں اور دان دیتے ہیں۔ پھر سنگھوں سے وہ تمام چیزیں دام دے کر خرید لیتے ہیں۔

یہ ملک ٹھنڈا اور پہاڑی ہے۔ سوائے گیہوں کے دوسرے غلے پیدا نہیں ہوتے۔ جیسے ہی شامنوں کو ان کے سالانہ سنگ کا اناج مل جاتا ہے مطلع چاہے کیسا ہی صاف کیوں نہ ہو ابر آلود ہو جاتا ہے اس لئے راجہ ان سے التجا کرتا ہے کہ جب تک فصل پک کر تیار نہ ہو جائے وہ اپنا اناج کا سالانہ حق نہ لیں۔ اس ملک میں بدھ کا اگالدان ہے۔ یہ پتھر کا بنا ہے اور اسی رنگ کا ہے جس رنگ کا بدھ کا کمنڈل۔ یہاں بدھ کا دانت بھی ہے۔ اس ملک کے باشندوں نے اس کی تعظیم و حرمت کے لئے ایک ٹوپ بنوایا ہے۔ یہاں ایک ہزار سے زیادہ سنگ ہیں جو سب کے سب ہین یان اصول پر چلتے ہیں۔

ان پہاڑوں کے پورب میں لوگ موٹے جھوٹے کپڑے پہنتے ہیں جو چین کے باشندوں کی وضع کے ہوتے ہیں۔ فرق صرف نمدے اور اون کی بناوٹ کا ہوتا ہے۔ شامن دھرم کے مطابق دعا کے گردوں کا استعمال کرتے ہیں اور یہ گردے اتنی قسم کے ہوتے ہیں کہ ان کا بیان کرنا محال ہے۔

یہ ملک کوہستان تسونگ لنگ میں ہے۔ ان پہاڑوں سے جنوب کی طرف کے درخت اور میوے یہاں سے بالکل مختلف ہیں۔ بانس، انار اور گنا یہ تین ایسے پودے ہیں جو نسل چین کے پودوں کے ہوتے ہیں۔

باب (۶)

کوہستان تسونگ لنگ۔ دائمی برف۔ شمالی ہند۔ تھولی راج۔ می لی نو نا کا بت

کیچا سے مغرب کی طرف شمالی ہند ہے۔ کوہستان تسونگ لنگ پار کرنے میں ایک مہینہ لگتا ہے۔ ان پہاڑوں پر تمام سال برف پڑتی ہے اور یہاں الغتزہریلے اژدہے پائے جاتے ہیں کہ اگر ان کا شکار چھٹ جائے تو اس کو پھنکار سے فنا کر دیتے ہیں۔ ہوا، مینہ، برف، آندھی اور پہاڑ مسافروں کا راستہ روکتے ہیں۔ یہ ایسی دشواریاں ہیں کہ اگر دس ہزار مسافر ادھر آنے کی ہمت کریں تو مشکل سے ایک زندہ بچ سکتا ہے۔ اس ملک کے باشندے برفستانی کہلاتے ہیں۔

اس سلسلۂ کوہ کو عبور کرنے کے بعد شمالی ہند پہنچتے ہیں۔ اس ملک کی سرحد پر پہنچتے ہی تھولی راج
ملتا ہے جہاں کے تمام سنگ ہین یان کے اصول پر چلتے ہیں۔ اگلے زمانے میں یہاں ایک لوہان
(بزبان سنسکرت ارہان) رہتا تھا۔ وہ اپنے کشف و کرامات سے ایک صناع کو تیوشو (توشیتا) آسمان
پر لے گیا کہ وہاں جاکر (بدھی ستوامیتریا[1]) کا قد و قامت، ناک و نقشہ اچھی طرح دیکھے اور پھر واپس آکر
اس کا ہم شکل کاٹھ کا پتلا بنائے۔ صناع تین مرتبہ اس کا مطالعہ کرنے آسمان پر گیا اور پھر واپس آکر
اس نے چھبیس گز اونچا پتلا بنایا جس کا پاؤں چار مکعب گز تھا۔ تہوار کے دن اس پتلے میں سے
روشنی نمودار ہوتی ہے۔ اس ملک کے راجا اس کی سچے دل سے پرستش کرتے ہیں۔ یہ اس نواح
میں اب تک موجود ہے۔

باب (۷)

دریائے سن تھو (سندھ)

وہ اس سلسلۂ کوہ کے جنوب کی جانب پندرہ دن تک چلتے رہے۔ راستہ کٹھن ہے۔ جگہ
جگہ اوگھٹ گھاٹیاں ہیں۔ ان پہاڑوں میں سیدھی دیوار نما ڈھائی تین ہزار اونچی چٹانیں ہیں۔ ان
پر پہنچنے سے آنکھیں تیورا جاتی ہیں۔ ان پہاڑوں کو عبور کرنے میں اگر مسافر کا پاؤں پھسل جائے تو دنیا
میں اسے کوئی نہیں بچا سکتا۔

ان پہاڑوں کے دامن میں ایک دریا ہے جسے سن تھو (سندھ) کہتے ہیں۔ اگلے وقتوں
میں لوگوں نے ان چٹانوں کو کاٹ کر راستہ نکالا ہے اور سات سو سیڑھیوں کا ایک زینہ تراشا ہے۔
اس زینے سے اتر کر دریا کو رسّوں کے پل سے پار کرتے ہیں۔ اور دریا کی چوڑائی اسّی قدم ہے۔ ہن
خاندان کے زمانے میں اپنی سیاحت میں نہ تو چنگ کھیاں نہ کان ہنگ اس جگہ پہنچے جس کا حال
دفتر خارجہ کے مترجموں نے دیا ہے۔

---

[1] میتریا کے معنی ابن حسن۔

سنگوں نے فاہیان سے پوچھا کہ بدھ مت مشرق میں کب سے شروع ہوا۔ فاہیان نے جواب دیا کہ میں نے اس ملک کے باشندوں سے معلوم کیا ہے اور انھوں نے مجھے باور کرایا ہے کہ قدیم روایات کے بموجب می لی نوسا کا بت تیار کئے جانے کے بعد ہند کے شامنوں نے اس دریا کو عبور کیا اور اپنے ساتھ مقدس کتابوں اور جمیع احکامات کو لیتے گئے۔ یہ بت فو (بدھ) کے نی ہوان (نروان) کے تین سو برس بعد کھڑا کیا گیا تھا۔ اگر اس زمانے کا حساب لگایا جائے تو جیو خاندان کے فنگ ونگ کے عہد حکومت کے قریب ہوتا ہے۔ اس لئے ہم کو ماننا پڑتا ہے کہ بدھ دھرم کی تبلیغ اس بت کی تیاری کے وقت سے شروع ہوئی۔ اس مہاتما میتریا کی مدد کے بغیر کون شاکی کیا (ساکھیامنی) کی تپسیا کو سہل اور اس کے دھرم پر عمل کرا سکتا تھا اور تررتن کا گیان سنسار کے اس سرے تک کے باشندوں میں کون پھیلا سکتا تھا؟ اور کون ان کو بدھ مت صدق و یقین کے ساتھ بتلا سکتا تھا؟ یہ انسان کے بس کی بات نہ تھی اور ہن خاندان کے منگتی کا خواب ایسا نہ تھا۔

باب (۸)

داذیانا، اوچنگ راج۔ تو کا نشان قدم

اس دریا کو عبور کر کے اوچنگ راج میں داخل ہوتے ہیں۔ اوچنگ راج ہندوستان کا سب سے شمالی حصہ ہے۔ یہاں متوسط ہند کی بولی بولی جاتی ہے۔ متوسط ہند مدھ دیش رج کہلاتا ہے۔ یہاں لوگوں کے لباس اور طریقۂ زندگی مدھ دیش والوں کے سے ہیں۔ مدھ دیش رونق پر ہے۔ جہاں جہاں سنگ ٹھیرتے ہیں سنگ کیالن موجود ہیں۔ یہاں کوئی پانسو سنگ کیالن ہیں۔ سب کے سب ہین یان طریقے کے ماننے ماننے والے ہیں۔ اگر کوئی مسافر یا پی کیو (بھکشو) یہاں پہنچتا ہے تو اس کی بہت آؤ بھگت کرتے ہیں اور اس کو تین دن مہمان رکھتے ہیں اور تین دن بعد اس سے کہدیا جاتا ہے کہ کوئی اور ٹھکانا تلاش کرے۔ روایات جن میں فو کے شمالی ہند کے سفر کا حال مذکور ہے ان میں اسی حصۂ ملک کا ذکر کیا گیا ہے۔ بدھ نے اپنے قدم کا نشان یہیں چھوڑا ہے۔ اس نقش قدم کی لمبائی چوڑائی ان لوگوں کے خیال کی وسعت کے مطابق ہے جنھوں نے اس کے متعلق کچھ سوچا ہے اور یہ بات اب تک قائم ہے۔ وہ پتھر جس پر بدھ نے

اپنے کپڑے سکھائے تھے اور وہ جگہ جہاں اژدہوں کی صورت تبدیل کردی تھی اب تک موجود ہیں۔ یہ پتھر کوئی چار گز اونچا اور سات گز چوڑا ہے اور ایک طرف سے چکنا ہے۔ ہوئی کنگ، تاؤ چنگ اور ہوئی تعا یہ تینوں سنگ نامی ڈنگو، راج کی طرف جہاں بدھ کی پرچھائیں ہے پہلے سے روانہ ہوئے۔ فاہیان اور دوسرے ساتھی اس ریاست میں کچھ دنوں ٹھہرے اور جب ان کا زمانۂ قیام ختم ہوا تو وہ جنوب کی طرف سوہوتو کی جانب چل پڑے۔

باب (۹)

سوہوتو راج

سوہوتو راج میں بھی بدھ دھرم رونق پر ہے۔ قدیم زمانے میں آسمانی شہنشاہ شائی د اندر، نے نوسا دبدھ استوا) کا امتحان لیا۔ اپنے تئیں ایک باز اور فاختہ کے روپ میں ظاہر کیا۔ نوسا نے فاختہ کو چھڑانے کے لئے اپنا گوشت کاٹ کر حوالے کیا۔ جب بدھ نے دھرم کو کامل کرلیا وہ اپنے چیلوں کے ساتھ اس مقام سے گذرا اور ان سے کہا کہ اس جگہ کو دیکھ لو جہاں میں نے اپنا گوشت فاختہ کو چھڑانے کے لئے کاٹ کر دیا تھا۔ ملک کے باشندوں نے اس واقعے کو اس طرح جانا اور اس جگہ ایک ٹوپ تیار کیا اور اس کو سونے چاندی سے سجایا۔

باب (۱۰)

کھیان تو وی راج

سوہوتو سے پورب کی جانب چلے۔ پانچ دن تک رستہ چلتے رہے تب کھیان تو وی راج میں جا کر پہنچے۔ یہاں آیو داشوکا کا بیٹا فائی راج کرتا تھا۔ جب بدھ بدھستوا تھا تو اس نے اپنی آنکھیں اس جگہ دان میں دی تھیں۔ یہاں بھی لوگوں نے ایک ٹوپ بنا دیا ہے اور اس کو سونے چاندی سے آراستہ کیا ہے۔ اس ملک کے بہت سے باشندے ہین یان پر چلتے ہیں۔

باب (۱۱)

چوشاشی لوراج (ٹیکشاسلا ٹیکسلا راج) فاقہ زدہ شیر

کیان تھی لوراج سے مشرق کی طرف سات دن کے راستے پر چوشاشی لوراج ہے چینی زبان میں اس لفظ کے معنی سر بریدہ کے ہیں۔ بدھ جب بدھستوا تھا تو اس نے اس مقام پر اپنا سر کاٹ کر خیرات میں دیا تھا اس لئے اس ملک کا یہ نام پڑ گیا۔ ذرا اور پورب کی طرف چل کر ایک مقام ہے جہاں بدھ نے اپنا جسم ایک بھوکے شیر کے حوالے کر دیا تھا۔ ان دونوں جگہوں پر بڑے بڑے ٹوپ بنائے گئے ہیں اور ان کو بیش قیمت اشیاء سے سجایا گیا ہے۔ ان ریاستوں کے راجا، منتری اور دوسرے آدمی اس جگہ پر نذر و نیاز چڑھانے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ پھول چڑھانا اور خوشبوئیں جلانا کسی وقت بند نہیں ہوتا۔ اس ٹوپ اور دوسرے دو ٹوپوں کو جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے اس ملک کے باشندے چار مہاستھوپا کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

غزل

از مصورِ جذبات حضرت ثاقب لکھنوی مدظلہ

(بہ تقلید حضرت ذوق دہلوی)

اس کے در سے روک کر مجھ کو کوئی کیا پائے ہے
نامرادوں کو بھی اک دن مدعا مل جائے ہے

لاکھ میں اس کو سنبھالوں پھر بھی تڑپا جائے ہے
کیا کہوں اس سے دلِ مایوس کو کوئی بہلائے ہے

اک نہ اک دن آ ہی جائے گا ترس ظالم کو بھی
دل کی صورت اب تو آہن بھی پگھلتا جائے ہے

شوقِ دیدارِ تجلی دل سے دیکھیں کیا کرے
آنکھ یہ کھولے ہے اور واں دیکھ کر غش آئے ہے

دید کے قابل نہیں ہے صورتِ انجام کار
تم سے کیوں کر زخم میرے دل کا دیکھا جائے ہے

خاطرِ غم تا کجا یہ میہماں تو رات دن
یا لہو دل کا پیے ہے یا کلیجا کھائے ہے

وادیِ پرخارِ الفت سے گزرنا ہے محال
لاکھ ہمت باندھئے دل ہے کہ بیٹھا جائے ہے

میں نہ روؤں کس لئے اور وہ نہ تڑپے کس لئے
جتنی طاقت دل میں ہے اتنا مجھے بہلائے ہے

بزم کی راحت دہی ہیں شمع کی محنت کو دیکھ
کیا یونہی سر کا پسینا پاؤں تک آ جائے ہے

سب شریک دور ہیں ثاقب مگر تقدیر سے
ایک ساغر کے لئے ساقی مجھے ترسائے ہے

غزل

ہوئی صبح کیا شام غم کٹ گئی ہے
خلش درد دل کی بہت گھٹ گئی ہے

نظارہ دم ذبح کر لے تو مرنا
کہ زلف ان کے چہرے سے کچھ ہٹ گئی ہے

وہی رات میری وہی رات ان کی
کہیں بڑھ گئی ہے کہیں گھٹ گئی ہے

کدھر میں رہوں گا کدھر دل رہے گا
لحد ظلم احباب سے پٹ گئی ہے

جدائی میں جس کو ملاقی ہے فرقت
وہ عمر رواں پہلے ہی کٹ گئی ہے

میں بیدار ہوں سو رہا ہے مقدر
وہ نیند اب نہ آئے گی جو بٹ گئی ہے

غم دل کی روداد پوچھو نہ ثاقب
اسی حال میں زندگی کٹ گئی ہے

مسلمانوں کی علمی ترقی پر ایک نظر

خلیفہ ماموں رشید کا زمانہ اسلامی تاریخ میں سب سے زیادہ شان دار زمانہ مانا جاتا ہے اور ہر قسم کی علمی ترقیات کا گہوارہ سمجھا جاتا ہے خلیفہ ہارون الرشید کے زمانے میں جو بیت الحکمۃ قائم کیا گیا تھا وہ خلیفہ ماموں رشید کے زمانے میں علمی کمالات کا سرچشمہ بن گیا۔ اسی بیدار مغز خلیفہ کے زمانے میں محمد ابن موسیٰ نے زمین کی پیمائش کی، التعبدی نے یونانی فارسی اور سنسکرت کی فلسفہ طب اور ریاضی کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا اور ان پر حواشی لکھے۔ بغداد کی علمی تحقیقات کی یہ خصوصیت تھی کہ ابتدا ہی سے معقول کے اصول پر تنقید شروع کی گئی یعنی وہ کسی چیز کو بغیر مشاہدے اور تجربے کے صحیح تسلیم نہیں کرتے تھے اور کلام مجید کی اس تعلیم کی کہ مناظر فطرت اور مظاہر قدرت کی تحقیقات معرفت الٰہی کا وسیلہ ہے اور پیغمبر خدا صلعم کے اس ارشاد کی کہ خدا نے قوت ممیزہ سے بہتر کوئی چیز پیدا نہیں کی پورے طور پر تعمیل کرتے تھے چنانچہ انھوں نے کلام مجید کی تفاسیر بھی انھیں اصول پر تحریر کیں۔ علمی تحقیقات کا ایک علیحدہ محکمہ تھا جو "اخوان الصفا" کہلاتا تھا اور جس کے چالیس ممبر تھے۔ قانون کشش اجسام" جس کا سہرا "نیوٹن" کے سر پر باندھا گیا وہ بقول فاضل ڈیڑیسی عرب والے صدیوں پہلے دریافت کر چکے تھے مگر متاخرین کی تنگ نظری اور تعصب کی وجہ سے وہ اس قابل قدر دریافت کی عزت سے محروم ہو گئے۔ الفارابی اور ابوبکر الرازی فلسفے اور طب کے بڑے رکن ملنے جاتے ہیں اور حسن ابن حسین نے علم مساحت میں جو باتیں دریافت کیں وہ آج یورپ میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جا رہی ہیں مگر ہم مسلمانوں کو ان کے نام تک معلوم نہیں۔ علامہ ابن خلدون کے نام سے اکثر تعلیم یافتہ مسلمان واقف ہونگے۔ وہ لکھتے ہیں کہ فخر الدین الرازی اور الغزالی نے علم دینیات میں اول مرتبہ منطق کا استعمال کیا اور الغزالی نے مذاہب کی سائنس پر ایک بیش بہا کتاب لکھی جس کا مضمون حکیم ڈیکارٹ کی کتاب "ڈسکورس سولا میتھوڈے" سے جو کہ بعد میں لکھی گئی اس قدر ملتا جلتا ہے کہ حکیم موصوف کی

کتاب الغزالی کا ترجمہ معلوم ہوتی ہے. مسٹر اسکیلنگر کے خیال کے مطابق علم طب کے سیکھنے کے لئے ابن سینا
کی کتابوں کا مطالعہ کرنا لازمی ہے. حاجی خلیفہ نے مسلمانوں کی تاریخی تصانیف کے بارے میں لکھا ہے
کہ ان کی تعداد سو سے بھی زیادہ تھی. جغرافیے کے علم میں بھی مسلمانوں نے کمی نہیں کی. قدامہ نے علم جغرافیہ
پر اول اول کتابیں لکھیں. جرمن فاضل محقق وان کریمر کا بیان ہے کہ قدامہ کو زمین کے گول ہونے کا بھی
علم تھا اور قطبین کے لیل و نہار کی لمبائی بھی معلوم تھی. اسی فاضل محقق نے مقدسی کے بارے میں لکھا ہے
کہ وہ جغرافیے کے علم میں سب پر سبقت لے گیا تھا. خلفائے مصر و اندلس کے یہاں بھی علم و ہنر کا ایسا
ہی چرچا تھا اور خاص کر اندلس میں علم کی گرم بازاری بغداد سے کسی طرح کم نہ تھی. زہراوی نے جو
علم جراحی پر کتاب لکھی وہ اب تک موجود ہے اور یورپ کے طبیب اس سے بے شمار فائدے اٹھاتے ہیں
ہیں. علامہ ابن رشد کو طب فلسفہ اور فقہ میں ید طولیٰ حاصل تھا. جزیرۂ سسلی بھی مسلمانوں نے فتح کر لیا
تھا اور وہاں کے حاکم کے دربار میں ادریسی ایک بہت بڑا جغرافیہ داں تھا جس نے بادشاہ کے
استعمال کے لئے ایک چاندی کا کرہ بنایا تھا جس میں سونے کے حروف میں اس زمانے کے ممالک
کے نام درج کئے گئے تھے. اس زمانے کے علمی ذوق کا اندازہ محض اس بات سے ہو سکتا ہے کہ
صرف شہر بغداد میں تیس سے زیادہ کالج قائم تھے جن میں دار الاقامہ بنے ہوئے تھے اور متعلمین و معلمین
کو کالج ہی کی طرف سے علاوہ تنخواہ و وظائف کے کھانا اور کپڑا وغیرہ بھی ملتا تھا. اندلس میں
کم و بیش ستر کتب خانے اس وقت میں تھے جبکہ چھاپا ایجاد نہیں ہوا تھا اور زر کثیر صرف کر کے برسوں
کی محنت میں ایک کتاب تیار ہوتی تھی. خلیفہ الحاکم ثانی کے کتب خانے کی نامکمل فہرست چالیس جلدوں
میں تیار ہوئی تھی اور اکثر رؤسا کے کتب خانے ان کے مکانوں پر علیحدہ ہوتے تھے اور یہی نہیں کہ مسلمانوں
کی ان علمی سرگرمیوں سے صرف مسلمان ہی فائدہ اٹھاتے ہوں بلکہ ان کے چشمۂ فیض سے تمام دنیا کی
قومیں مستفیض ہوتی تھیں جن میں قوم یہود خاص طور پر قابل ذکر ہے کیونکہ اولاً مسلمانوں نے اس قوم کو
مسیحیت کے جور و تشدد سے رہائی دلائی اور ثانیاً مسلمانوں کے زوال کے بعد اسی قوم کے ذریعے سے
اسلامی تہذیب علوم اور فلسفہ یورپ کی مسیحی اقوام کو پہنچے. مسٹر ڈبلیو. جی. ڈے برگ نے اپنی کتاب

"دی لگیسی آف دی انشینٹ ورلڈ" کے صفحات ۳۷۶ پر لکھا ہے کہ "عربی فلسفے کی تخلیق خلفائے بغداد کے آغوش میں آٹھویں صدی میں ہوئی جو بارھویں صدی میں خلفائے قرطبہ کے زیر سایۂ عاطفت اپنے عہدِ شباب کو پہنچ گیا...... لیکن قرطبہ میں خلفائے بنی امیہ کے زوال کے بعد مسلمانوں کی تنگ خیال جماعت کی مخاصمت نے اس کو عین شباب میں زندہ درگور کر دیا، مگر پیشتر اس کے کہ اسلامی فلسفے کا لہلہاتا باغ باد سموم کے جھونکوں سے پنجۂ خزاں کا شکار ہو اس کے سرسبز اور شاداب پودے دوسری قوم کے ہاتھ لگ گئے۔ عربوں نے یہودیوں کو فلسفے کا سبق سکھایا جس کو وہ کبھی نہیں بھولے اور انھوں نے اسی اسلامی فلسفے کے نونہالان چمن کو نشو و نما دے کر ان کے خوشبودار پھولوں سے بہارستان مسیحیت کو مہکا دیا کیونکہ عہدِ وسطیٰ میں یہودی نہ صرف مالیات اور تجارت ہی میں وساطت کا کام کرتے تھے بلکہ انھوں نے علم و تہذیب کے توسل و انتقال کے کام میں بھی بہت بڑا حصہ لیا ہے۔"

مسٹر برکس ایڈم نے اپنی کتاب "دی لا آف سویلیزیشن اینڈ ڈیکے" کے باب سوم "پہلی صلیبی جنگ" میں تحریر کیا ہے کہ "گیارھویں صدی میں جبکہ پیرس دریائے سین کے جزیروں پر چند جھونپڑیوں کا مجموعہ تھا اور ڈیوک آف نارمنڈی اور شاہ انگلستان کا محل ایک ادنیٰ درجے کا سفید مینار تھا، قاہرہ ایسے اعجوبہ کمالات سے مزین کیا جا رہا تھا جن کو دنیا اب تک قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ جس وقت اسقف اعظم گربرٹ پر بسبب علم مساحت کے جاننے کے جو اس نے بارسلونا اور قرطبہ کے عربی مدرسوں میں حاصل کیا تھا، سحر و ساحری کا الزام لگایا جا رہا تھا، خلیفہ عزیز باللہ نے قاہرہ کی جامع قائم کی جو مسلمانوں کی سب سے بڑی درسگاہ تھی اور جو جامع پیرس کی تعمیر سے دو سو برس قبل جاری ہو چکی تھی اور جس میں بارہ ہزار طالب علم درس پاتے تھے۔ مسٹر منک کی یہ رائے ہے کہ ابن رشد نے عربی فلسفے میں چار چاند لگا دیے...... خلیفہ ہارون رشید کی عظمت و شان اس وقت تک ضرب المثل چلی آتی ہے..... اس کے زمانے میں بھی صنعت و حرفت میں اس قدر ترقی ہو گئی تھی کہ اس نے شارلین کو ایک گھڑی تحفے میں بھیجی تھی۔ ہمبالٹ نے موجودہ عملی علوم منحصر بہ تجربہ (ایکسپیری منٹل سائنس) کا بانی عرب والوں کو بتلایا ہے۔ وہ نہایت ہوشیار کیمیا داں تھے کیونکہ وہ پارے اور دوسری دھاتوں کی کیمیاوی

ترکیب کے علاوہ گندھک اور شورے کے تیزابوں کی کیمیاوی ترکیب سے بھی واقف تھے، بحیثیت طبیب ہونے کے وہ یورپ کے مقابلے میں بدرجہا ترقی یافتہ تھے۔ جبکہ کلیسا ئے روم تعویذ گنڈے سے علاج کر رہا تھا اور مجرب طریقوں کو خلاف مذہب سمجھتا تھا الرازی بغداد کے شفا خانوں کو چلا رہا تھا جس نے دسویں صدی میں دس جلدوں میں ایک کتاب لکھی جو وینس میں ۱۵۰۹ء میں شائع ہوئی اور تمام روئے زمین کے اطبا نے اس کی کتاب کا جو خسرا اور چیچک کے متعلق ہے استعمال کیا...... وہ نہایت مشہور ماہر تشریح تھا۔ جنگ صلیبیہ میں بہت سی مہلک متعدی بیماریاں پھیل گئی تھیں، لیکن جس وقت مسیحی سپاہی مصری طبی سررشتے کے حفظان صحت کے قوانین کے پابند ہو گئے تو بیماریاں دور ہو گئیں۔ عربوں کو علم ریاضی سے بہت زیادہ دلچسپی تھی اور بہت سی ان تحقیقات وایجادات سے بخوبی واقف تھے جو پندرھویں اور سولھویں صدی کے ماہر فلکیات سے منسوب کی جاتی ہیں۔

۱۰۰۰ء میں علم مثلث کروی (اسفیریکل ٹرگنامیٹری) کا استعمال ہوتا تھا اور ابوالحسن نے مخروطات (کانک سکشن) پر نہایت بیش قیمت کتاب لکھی ہے۔ ۸۳۳ء میں خلیفہ مامون رشید نے بغداد اور دمشق میں رصدگاہیں بنوا کر پلمیرا کے میدان میں ایک درجہ عرض البلد کو نپوایا تھا۔ تیرھویں صدی تک عربی آلات سائنس مقابلتاً مکمل ہو چکے تھے۔ ان کے پاس اصطرلاب (ایسٹرولیب) ؟ (زمانین) سدس (سیکسٹینٹ) اور قطب نما (میرینرس کمپاس) موجود تھے اور ابوالوفا نے تیسرا قمری اختلاف (تھرڈ لیونر ویریشن) ٹائیکوبراہے سے چھ سو برس قبل دریافت کر لیا تھا۔ ان تمام صنعتی اور زراعتی ترقیات کا مفصل حال بیان کرنے کے لئے جو عہد وسطیٰ کی صلیبی جنگوں کی وساطت سے حاصل ہوئیں ایک علیحدہ کتاب کی ضرورت ہے۔ مختصراً یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ مغرب نے جو کچھ علم وہنر میں سیکھا وہ روئے مسیح کی راہ میں سیکھا۔ دمشق کا فولاد ایک ضرب المثل تھا اور دمشق کے ظروف ساز فرانس کے ظروف سازوں کے استاد تھے۔ بارھویں صدی میں شام اور فارس کے پشینے، کمخواب اور قالین مغربی باشندوں کے لئے ویسے ہی باعث رشک ومایوسی تھے جیسے آج ہیں۔"

مسٹر آر بیوتھ ناٹ اپنی کتاب "اے مینوئل آف عریبک ہسٹری اینڈ لٹریچر" کے صفحات ۹ و ۱۰

پر لکھتے ہیں کہ " ہسپانوی عرب علوم وفنون کے بے حد شوقین تھے ۔ وحشی اقوام کے حملے کے بعد یورپ میں علم وسائنس کا قائم رہنا ایک بڑی حد تک انھیں کی بدولت ہے ۔ محض عربوں ہی کے باعث اس زمانے میں جو " عہد تاریک کے نام سے مشہور ہے روشنی قائم رہی ...... یورپ میں علوم وفنون کا دوبارہ زندہ ہونا عربی علما اور حکما کی تصانیف سے اور نیز ان مدرسوں سے جو انھوں نے ہسپانیہ اور اطالیہ کے مختلف حصوں میں قائم کئے خاص طور پر منسوب کیا جاتا ہے ۔ بارھویں صدی عیسوی میں یورپ کے مختلف مقامات سے ان بیوت العلوم میں طالب علم درس کی خاطر آتے اور اپنے مقامات پہ واپس جا کر ان علوم کو اپنے نیاں پھیلاتے تھے ۔ اس وقت میں بہت سی عربی کتابوں کا لاطینی زبان میں ترجمہ کیا گیا جس کے باعث سائنس کی ترقی میں آسانیاں پیدا ہوگئیں ۔ یورپ اور بہت سی سائنس کی شاخوں کے لئے بھی عربوں کا ممنون احسان ہے جس میں علم کیمیا (کیمسٹری)، خاص طور پر قابل ذکر ہے ۔ یورپ میں اول مرتبہ ان ہی نے کاغذ بنایا اور قالین اور فولادی وچرمی مصنوعات میں کوئی ان کا مد مقابل نہ تھا اور جبکہ قرطبہ کے عربی مدرسوں میں ریاضی، ہیئت، فلسفہ، علم النباتات اور طب نہایت کامیابی کے ساتھ سکھلائے جاتے تھے ۔"

مسٹر بریفالٹ اپنی کتاب " میکنگ آف ہیومنیٹی " کے صفحات ۱۹۰ تا ۲۰۲ پر یوں رقمطراز ہیں کہ " آکسفورڈ یونیورسٹی میں روجر بیکن نے عربی ادب اور عربی سائنس کی تعلیم انھیں لوگوں سے حاصل کی جو عربوں کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کر چکے تھے تجربی طریقوں (ایکسپیریمنٹل میتھڈس) کی ایجاد کا فخر نہ تو روجر بیکن کو حاصل ہے اور نہ اسکے بعد آنے والے ہمنام کو ۔ روجر بیکن کی شخصیت مسیحی یورپ کے لئے اسلامی سائنس اور طریق عمل کے ایک پیغامبر سے زیادہ نہیں اور اس نے ہمیشہ اس بات کا بانگ دہل اعلان کیا کہ عربی زبان اور عربی سائنس کی تعلیم ہی اس کے ہمعصروں کے واسطے حقیقی علم حاصل کرنے کا ذریعہ ہو سکتی ہے ۔ اس بات کی تحقیقات کے مباحثے کہ تجربی طریقوں کا موجد کون تھا ان معرکۃ الآرا غلط بیانیوں میں سے ایک غلط بیانی تھی جو یورپ کی تہذیب کے مبدا رکے متعلق کی گئیں ۔ عربوں کا ایجاد کردہ تجربی طریقہ بیکن کے زمانے سے پہلے ہی یورپ کے طول وعرض میں اپنا

سکہ جما چکا تھا جس کو لوگ انتہائی ذوق کے ساتھ سیکھتے تھے۔"

"اسلامی تہذیب کا سب سے زیادہ شاندار ترکہ جو دورِ حاضرہ کو ملا ہے وہ سائنس ہے مگر اس کے ثمرات دیر میں ظاہر ہوئے۔ موروں کی تہذیب کے قعرِ گمنامی میں پڑ جانے کے بہت عرصے بعد وہ نجمِ رشید تاباں جس نے ان کی شائستگی کو نشو و نما دی تھی اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ یورپ کی سرزمین پر شعاع بیز ہوا۔ یورپ کی مردہ رگوں میں جان ڈالنے والی صرف ایک اسلامی سائنس ہی نہیں تھی بلکہ اسلامی تہذیب کی اور دوسری لاتعداد خوبیوں نے یورپ کے جسم میں زندگی کے ابتدائی آثار پیدا کئے۔"

"یوں تو یورپ کی ترقی کا کوئی بھی ایسا پہلو نہیں جس میں اسلامی تہذیب کے آثار نہ پائے جاتے ہوں لیکن اس کا سب سے زیادہ بیّن اور شاندار اثر اس طاقت کی پیدائش میں نمایاں ہے جو دورِ حاضرہ کا مستقل طرۂ امتیاز ہے اور اس کی کامیابی کا اعلیٰ ترین ذریعہ ہے یعنی علوم فطرت اور جذبۂ تحقیق (نیچرل سائنس اینڈ سائنٹفک اسپرٹ)۔"

عربی سائنس کا ہماری سائنس پر محض یہی احسان نہیں ہے کہ اس کی بدولت انقلاب انگیز نظریات کی تعجب خیز ایجادیں ہوئیں بلکہ عربی تہذیب کا سائنس پر اس سے بدرجہا زیادہ یہ احسان ہے کہ سائنس کی ہستی ہی اس کی بدولت قائم ہے۔ زمانۂ قدیم کے لوگ سائنس سے قطعی نابلد تھے۔ یونانیوں نے علوم ہیئت و ہندسہ بیرونی اقوام سے حاصل کئے جو یونانی تہذیب کے ساتھ قطعی مطابقت پیدا نہ کرسکے۔ یونانیوں نے علوم کی تنظیم کی ان کو ترتیب دیا اور نظریات قائم کئے لیکن ان کی طبائع تفتیش کے متحملانہ طریقوں سے مفید علوم کی تحصیل سے طبیعیات کے ادق طریقوں اور تفصیلی اور طویل مشاہدات سے کلیتاً ناآشنا تھیں البتہ زمانۂ قدیم میں "یونانی اسکندریہ" میں جو تجربات ہوتے تھے وہ ضرور کسی قدر محققانہ ہوتے تھے جس کو ہم سائنس کہتے ہیں اس کا سرزمین یورپ میں بارآور ہونا مندرجہ ذیل باتوں کے متعلق نیا ذوق پیدا ہو جانے کا نتیجہ ہے یعنی تحقیقات تفتیش و تفحص کے نئے طریقے آزمائش و تجربات کے قاعدے اور مشاہدات پیمائش و ریاضیات کا وہ طریقہ جس سے یونانی قطعی ناواقف تھے۔ یہ نیا ذوق اور طریقے دنیائے یورپ میں عربوں نے جاری کئے۔" (ماخوذ از "لکچرز اون اسلام" مصنفہ ڈاکٹر سر اقبال)

بے شمار یورپین مستشرقین نے مسلمانوں کی علمی ترقی اور دنیا پر احسانات کے متعلق اپنی تحقیق و تفتیش کے نتائج شائع کئے ہیں جن میں سے مشتے از خروارے بطور نمونے کے اس مقام پر پیش کئے گئے ہیں اور جن کے مطالعے سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ یورپ کو آج جس ترقی پر ناز ہے اس کی بنیاد مسلمانوں ہی نے قائم کی تھی اگرچہ ان کے اصلی وارث اپنی تنگ خیالی کی وجہ سے اس گراں مایہ ترکے سے محروم ہو گئے۔ مسلمانوں کے یہ احسانات صرف یورپ ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہندوستان بھی اس فیض عام سے محروم نہیں رہا۔ مسٹر مُرے ٹی ٹائٹس۔ پی ایچ۔ ڈی، ڈی۔ڈی اپنی کتاب "انڈین اسلام" کے صفحہ ۶۰ پر لکھتے ہیں کہ "ڈاکٹر ٹی۔ این سرکار نے اپنے ایک لکچر کے دوران میں جو انھوں نے "اسلام اِن انڈیا" پر حال ہی میں دیا تھا ان فوائد کی حسب ذیل فہرست پیش کی جو ہندوستان کو اسلام اور اسلامی حکومت سے حاصل ہوئے:۔

۱۔ بیرونی ممالک سے باہمی تعلقات کا از سر نو قائم کیا جانا جس میں ہندوستانی بحری بیڑہ اور بحری تجارت بھی شامل ہیں جو چولا قوم کے زوال کے بعد سے قطعی تباہ ہو چکے تھے۔

۲۔ ملک کے بہت بڑے حصے میں خاص کر وندھیاچل پہاڑ سے شمال کی جانب اندرونی امن وسکون۔

۳۔ ایک مشترک حکومت کے باعث ملک میں یک رنگی اور ہم آہنگی کا پیدا ہونا۔

۴۔ عمائدین میں بلا امتیاز مشرب و ملت معاشرت، آداب و پوشاک میں مطابقت۔

۵۔ "ہندی۔ عربی" آرٹ کی تخلیق جس میں عہد وسطےٰ کے ہندی اور چینی وضع و طرز متصل ہو گئے۔ اس کے علاوہ فن تعمیر کی ایک نئی وضع ایجاد ہوئی اور صنعت و حرفت کے اقسام نفیسہ میں ترقی ہوئی مثلاً شال، ململ اور قالین بافی اور پچی کاری وغیرہ۔

۶۔ ایک مشترک زبان کی ترویج جس کو ہندوستانی یا "ریختہ" کہتے ہیں اور نثر لکھنے کا ایک سرکاری ضابطہ جو ہندو منشیوں کے فارسی لکھنے سے پیدا ہوا۔

۷۔ مذہب وحدانیت اور مشرب صوفی کا تعارف۔

۸ ۔ تاریخی کتابیں (ڈریپر)

۹ ۔ فنِ حرب اور عام تہذیب میں ترقی ۔

سواری اور سوار

صاحبِ عالم حضرت لبیب دہلوی ۔ حیدرآباد دکن

اشکِ مسلسل ہوں اور سوزِ نہاں پر سوار
خاک کا پتلا ہوں اور مرکبِ جاں پر سوار

جان گئی تو گئی آن نہ جائے کہیں
میتِ عاشق اٹھے تیغ و سناں پر سوار

اک طپشِ شوق ہوں باطنِ خاموش میں
اک خلشِ درد ہوں ذوقِ بیاں پر سوار

آتی ہے منزل نظر نام و نشاں سے پرے
اور بھٹکتا ہوں میں نام و نشاں پر سوار

دیکھا جہاں کو تو واں دل کے سوا کچھ نہیں
دل کو جو دیکھا تو ہے سارے جہاں پر سوار

ایک تماشا ہوں میں عبرتِ آئندگاں
ایک تصور ہوں میں وہم و گماں پر سوار

یوں تو جہاں کے تہاں ایک ہی گزنہ ہیں
دیکھیے جس کو وہ ہے عمرِ رواں پر سوار

غنچۂ نورس کو ہے اپنی جوانی پہ ناز
بلبلِ دیوانہ ہے آہ و فغاں پر سوار

ثبت ہے میری فنا ہستیٔ جاوید پر
اٹھتی ہیں موجیں مری بحرِ رواں پر سوار

لاکھ بھنور ہوں لبیب ڈوبنے والا نہیں
خس ہوں مگر بحر کی تاب و تواں پر سوار

حالی کے حال میں

۱۹۰۵ء کا ذکر ہے۔ اٹھائیس سال کا زمانہ بھی کچھ کم مدت نہیں ہے۔ صرف دو سال کی کسر باقی ہے ورنہ کہا جاتا کہ ایک نسل گذر گئی جب کہ پہلے پہل مجھے مولانا حالی مرحوم کی خدمت میں نیاز حاصل ہوا۔ میں اس وقت دسویں کلاس میں میرٹھ تعلیم پاتا تھا اور خواجہ غلام الثقلین مرحوم کے یہاں بھی آتا جاتا تھا۔ وہ خیر نگر دروازے رہتے تھے۔ ڈپٹی محمد صدیق کا مکان کرائے پر تھا جس کو کوٹھی کہتے تھے۔ مولانا حالی مرحوم خواجہ صاحب کے یہاں تشریف لائے اور اس کوٹھی میں فروکش ہوئے۔ شام ہونے والی تھی کہ میں اتفاقاً خواجہ صاحب مرحوم کے یہاں پہنچا۔ وہاں کیا دیکھتا ہوں کہ کوٹھی کے شرقی برآمدے میں کچھ اصحاب کرسیوں پر متمکن ہیں۔ ایک صاحب سفید پوش داڑھ سراپا درمیانی کرسی پر جلوہ افروز ہیں اور باقی اصحاب کرسیوں کی دو رویہ قطاروں پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ معمولی سلام کے بعد میں بھی ایک کرسی پر جا بیٹھا اور حاضرین میں سے سب کو پہچان لینے کے بعد ان سفید پوش صاحب پر بار بار نظر ڈالی لیکن سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کون بزرگ ہیں۔ طرز لباس سے مجھے اس وقت یہ خیال ہوا کہ یہ صاحب کوئی بڑے زمیندار ہیں اور اب تک ان کو زمانے کی ہوا نہیں لگی ورنہ لباس میں یہ سادگی نہ ہوتی اور تھوڑا بہت طمطراق ضرور ہوتا۔ میرے قریب مولانا گرامی میرٹھی کے چھوٹے بھائی پروفیسر محمد علی نامی (الہ آباد یونیورسٹی) تشریف رکھتے تھے جو اس زمانے میں بہت دبلے پتلے تھے اور جن سے مجھے اس وقت کوئی سروکار نہ تھا لیکن بعد ازاں ۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۱ء تک بی۔ اے کلاس میں فارسی انھیں سے پڑھنے کا شرف حاصل ہوا۔ میں نے نامی صاحب سے دریافت کیا کہ یہ کون صاحب ہیں؟

نامی صاحب۔ "مولانا حالی!"

میں۔ "کیا یہ مولانا حالی ہیں؟"

نامی صاحب: "جی ہاں!"

ہیں۔ "کیا واقعی یہ مولانا حالی ہیں؟"

نامی صاحب (بگڑ کر)۔ "جی ہاں یہ مولانا حالی ہیں۔ میں نے کہہ دیا۔ مجھے جھوٹ بولنے سے کیا حاصل؟"

نامی صاحب کی خفگی نے اس استعجاب کو دور کر دیا جو مولانا حالی کا نام سن کر میرے دل و دماغ پر سایہ افگن ہو گیا تھا اور مجھ کو یقین ہو گیا کہ وہی حالی جس کی نظمیں اردو کورس میں پڑھی تھیں اور جس کو میر و غالب سے کم نہ سمجھتے تھے اپنی نظر کے سامنے ہے۔ اب کیا تھا خاموش بیٹھے ہوئے ہیں اور منتظر ہیں کہ سب لوگ چلے جائیں تو مولانا حالی سے علیحدہ باتیں ہوں۔ تھوڑی دیر کے بعد سب صاحبان ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے اور مولانا حالی شرقی برآمدے سے اٹھ کر شمالی برآمدے میں ٹہلنے لگے میں بھی اٹھ کر پیچھے پیچھے ہو لیا اور مولانا حالی سے عرض کیا کہ مجھے ایک خبط ہے اور اسی بات کو اس قدر طول دیا کہ جب مولانا حالی مرحوم نے مجھ پر تعجب انگیز نگاہ ڈالی تو مجھے اپنی طول کلامی بلکہ فضول کلامی کا احساس ہوا اور میں نے فوراً کہا "مجھے شاعری کا خبط ہے اور میں شاعری ترک کرنا چاہتا ہوں لیکن یہ عادت نہیں جاتی۔"

مولانا حالی۔ "اچھا! آپ کو شاعری کا شوق ہے۔ آئیے ادھر روشنی میں بیٹھ کر باتیں کریں گے۔"

چنانچہ اب غربی برآمدے میں دو تین کرسیاں بچھوا کر بیٹھ گئے۔ اس زمانے میں فی الواقع مجھے شاعری کا بے حد شوق تھا اور مقدمۂ شعر و شاعری پڑھنے کے بعد تغزل سے نفرت شروع ہو گئی تھی لیکن کوئی نظم بھی نہ لکھی تھی۔ مجبوراً مولانا حالی کو اپنے ٹوٹے پھوٹے دو چار شعر غزل کے سنائے۔ وہ خاموش رہے اور میں نے سمجھ لیا کہ

صائب دو چیز می شکند قدر شعر را ۔۔۔ تحسین ناشناس و سکوت سخن شناس

پھر ایک قطعہ سنایا جس کی زبان کی تعریف مولانا حالی نے فرمائی اور میں نے یہ غنیمت سمجھ کر اردو غزل گوئی کو ختم کیا۔ بعد ازاں عرفی کے اس شعر پر

عرفی اگر بہ گریہ میسر شدے وصال ۔۔۔ صد سال می تواں بہ تمنا گریستن

جو چند شعر لکھے تھے اپنی فارسی دانی کے ثبوت میں سنائے۔ مولانا حالی نے فرمایا کہ اب فارسی کا زمانہ

نہیں رہا۔ جو کچھ لکھئے اردو ہی میں لکھئے۔ پھر فرمایا کہ میں نے سر سید احمد خاں مرحوم کی وفات پر ایک مرثیہ فارسی میں لکھا تھا وہ علیحدہ چھپ گیا ہے اس کے نکات کو نہیں سمجھا گیا مجھ کو ایک خط یاد دہانی کے طور پر بھیج دینا میں تم کو پانی پت سے بھیج دوں گا اور یہ نصیحت فرمائی کہ "اس وقت شاعری بالکل ترک کردو۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد شوق سے شاعری کرنا۔ میرے ایک دوست ہیں میں نے ان کو بھی یہی نصیحت کی تھی۔ چنانچہ انھوں نے زمانہ طالب علمی میں اس شوق کو چھوڑ دیا۔ اب بی۔ اے ہیں اور شاعری بھی کرتے ہیں۔ اس گفتگو کے بعد میں بھی رخصت ہو کر چلا آیا اور اگلے دن پھر پہنچا۔ اتفاق سے مولانا شوکت میرٹھی (مجدد السنۂ مشرقیہ) بھی تشریف لائے اور کچھ دیر تک مولانا حالی سے شعر و شاعری کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ میں بھی خاموش سنتا رہا۔ اس وقت مولانا شوکت مرحوم ایک رسالہ جس کا نام "پروانہ" تھا نکالتے تھے اور اس میں جہاں قصائد خاقانی کی شرح ہوتی تھی غالب و مومن کے مشکل اشعار کی بھی تشریح کی جاتی تھی۔ غالب و مومن کی جہاں تعریف ہوتی تھی وہاں ان کے اشعار پر اصلاح بھی دی جاتی تھی اور اس وجہ سے میں مولانا شوکت کا کچھ زیادہ قائل نہ تھا جب مولانا شوکت مرحوم تشریف لے گئے تو مولانا حالی نے ان کے علم کی وسعت کی تعریف فرمائی لیکن مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے عرض کیا کہ واقعی مولانا کی علمیت میں کسی کو کلام نہیں مگر مولانا بڑے بڑے شاعروں کے کلام پر اصلاح دیتے ہیں اور کسی کو اپنی برابر نہیں سمجھتے ہیں۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو فی الواقع مولانا شوکت زیادہ قابل قدر و احترام ہوتے۔ مولانا حالی نے میری اس رائے سے اتفاق کیا اور کہا کہ تم سچ کہتے ہو۔

اس کے بعد کچھ یاد نہیں کہ کب مولانا حالی میرٹھ سے تشریف لے گئے اور کب خواجہ غلام الثقلین مرحوم وکالت چھوڑ کر ریاست مالیر کوٹلہ کی ججی پر چلے گئے۔ میں خود انٹرنس کا امتحان پاس کرکے میرٹھ سے چلا گیا تھا اور دو سال تک اِدھر اُدھر پھرتا رہا یہاں تک کہ ۱۹۰۷ء میں علی گڑھ پہنچا اور ۱۹۰۹ء میں وہاں سے ایف۔ اے پاس کرنے کے بعد میرٹھ کالج میں داخل ہو گیا۔ خواجہ صاحب مرحوم بھی ریاست مالیر کوٹلہ کی ججی ترک کرنے کے بعد کچھ دنوں لکھنؤ میں وکالت کرتے رہے اور بعد ازاں

میرٹھ تشریف لے آئے۔

جب میں میرٹھ کالج میں داخل ہوا تو خواجہ صاحب مرحوم میرٹھ ہی میں وکالت کرتے تھے اور اندر کوٹ میں ایک مفتی صاحب کے مکان میں رہتے تھے۔ میری آمد و رفت خواجہ صاحب مرحوم کے یہاں پھر شروع ہو گئی تھی اور چونکہ میں بھی اندر کوٹ میں رہتا تھا اس لئے قرب کی وجہ سے ان کے یہاں روزانہ آنا جانا تھا۔ اب خواجہ صاحب اور مجھ میں ایک قسم کی بے تکلفی ہو گئی تھی۔ اکثر وقتی مسائل پر بحث و مباحثہ بھی ہوتا رہتا تھا۔ تین چار ماہ کے بعد خواجہ صاحب کی بیوی اور بچے بھی پانی پت سے میرٹھ چلے آئے تھے۔ میاں سیدین بہت چھوٹے تھے اور " ا۔ ب۔ ت " پڑھتے تھے۔ مولانا حالی مرحوم کو خواجہ صاحب کے بچوں سے بہت محبت تھی۔ کچھ دنوں کے بعد وہ ان بچوں کو دیکھنے کے لئے پانی پت سے میرٹھ تشریف لائے اور اس مرتبہ مولانا حالی سے زیادہ بہتر طور پر شناسائی ہوئی۔ کبھی کبھی شعر و سخن کا بھی ذکر آتا رہتا تھا۔ میں نے بھی اپنی دو چار رباعیاں اس دوران میں مولانا کو سنائی تھیں۔ از آں جملہ جب یہ رباعی سنائی

فریاد کو بیکس کی پہنچتا ہے تو تکلیف میں اک پوچھنے والا ہے تو
لے دے کے ہے تیرا ہی سہارا ہم کو دنیا میں جو کچھ ہے سو خدایا ہے تو

تو مولانا نے فرمایا کہ بجائے 'ہے تو' کے 'تو ہے' کر دو یعنی اس طرح پڑھو:۔

فریاد کو بیکس کی پہنچتا تو ہے تکلیف میں اک پوچھنے والا تو ہے
لے دے کے ہے تیرا ہی سہارا ہم کو دنیا میں جو کچھ ہے سو خدایا تو ہے

'ہے' اور 'تو' کی تقدیم و تاخیر سے کس قدر فرق ہو گیا اور زور پیدا ہو گیا۔ میری باقی رباعیاں سن کر فرمایا کہ تمھاری سب رباعیوں کا وزن درست ہے۔ رباعی کا وزن درست ہونا بھی ایک تعریف کی بات ہے۔ بڑے بڑے استاد دھوکا کھا جاتے ہیں۔ اور تو اور نواب مرزا خاں داغ کی ایک رباعی ہے جس کے تین مصرعے ایک وزن کے ہیں اور چوتھا مصرع دوسرے وزن میں ہے۔ غالباً وہ رباعی بھی پڑھی تھی لیکن مجھے وہ یاد نہیں رہی۔

ایک روز خواجہ صاحب مرحوم اور راقم وکالت کے کمرے میں بیٹھے ہوئے سرسید احمد خاں کے متعلق باتیں کر رہے تھے اور مولانا حالی اندر کے کمرے میں کوچ پر بیٹھے تھے۔ میں سرسید مرحوم کی تعریف کر رہا تھا اور ان کے کاموں کی عظمت ثابت کر رہا تھا۔ ادھر خواجہ صاحب مرحوم میری تردید کر رہے تھے اور سید کے کارناموں کو بالکل معمولی ظاہر کر رہے تھے کہ مولانا حالی نے فرمایا "میاں محمد یحییٰ! تم یہاں میرے پاس آجاؤ۔ غلام الثقلین کی تو عادت ہے کہ جب کسی شخص کی تعریف کرتا ہے تو اس کو آسمان پر چڑھا دیتا ہے اور جب کسی شخص کی مذمت کرتا ہے تو اسے تحت الثریٰ میں پہنچا دیتا ہے۔ اس کی گفتگو سے ظاہر ہوتا ہے کہ گویا سید سے بدتر کوئی آدمی ہی نہ تھا۔" میری تو کیا مجال تھی کہ یہ الفاظ سن کر مولانا حالی کے پاس نہ جا بیٹھتا لیکن خواجہ صاحب مرحوم کا چہرہ بھی شرمندگی سے سرخ ہو گیا تھا اور بحد خفیف معلوم ہوتے تھے چنانچہ وہ فوراً وہاں سے اٹھ کر زنانے مکان میں چلے گئے اور دو تین روز تک میں نے یہ کیفیت دیکھی کہ مولانا حالی زنانے مکان میں گئے تو خواجہ صاحب فوراً باہر چلے آئے اور اگر وہ باہر تشریف لائے تو خواجہ صاحب زنانے مکان میں داخل ہو گئے۔ میرا خیال ہے کہ مولانا حالی مرحوم بحد غصے کی حالت میں اس قسم کے الفاظ سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکتے تھے لیکن ان کے ان ملائم الفاظ ہی میں وہ اثر پنہاں ہوتا تھا کہ سننے والے کانپ جاتے تھے۔

ایک مرتبہ مولوی سید وحید الدین سلیم مرحوم فرماتے تھے کہ عبدالولی نے جو مولانا کا نواسا ہے اور مرض صرع میں مبتلا ہے ایک روز خدا جانے کس خیال میں پانی پت کے امام باڑے کے سامنے مولانا حالی کو زمین پر دے پٹکا اور چھاتی پر سوار ہو گیا۔ لوگوں نے دوڑ کر مولانا کو اس کے قبضے سے چھڑایا۔ مولانا کے چھوٹے صاحبزادے خواجہ سجاد حسین صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ بھی موجود تھے۔ انھوں نے عبدالولی کو خوب مارا۔ اب مولانا حالی ہیں کہ اپنے بیٹے سے سخت ناراض ہیں اور ان سے کلام نہیں کرتے۔ بحد خوشامد و لجاجت کے بعد اپنے بیٹے کا قصور معاف کیا اور کہا کہ عبدالولی کا کوئی قصور نہ تھا۔ وہ تو دیوانہ ہے۔ اگر وہ اپنے ہوش میں ہوتا تو مجھ سے ہرگز اس طرح پیش نہ آتا لیکن تم کو خدا نے عقل دی ہے۔ تم کیوں دیوانے بن گئے کہ اس کو بلا وجہ زدوکوب کیا۔

یہ تو میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ عبدالولی کو مولانا بہت عزیز رکھتے تھے اور وہ اکثر

ان کے پاس رہتا تھا۔ وہ ان سے لیے سوالات کرتا تھا اور بار بار پوچھتا تھا کہ مجھے بھی اکثر غصہ آیا لیکن مولانا کی وجہ سے میں کچھ نہ کہتا تھا۔ ایک مرتبہ فرہنگ آصفیہ کی ایک جلد مولانا حالی کے پاس بغرض ریویو آئی تھی۔ میاں عبدالولی اس کو پڑھتے تھے اور کہیں کہیں مولانا سے سوالات کرتے جاتے تھے اور ہندی کی چندی نکالتے تھے۔ مولانا نہایت تحمل سے جواب دیتے تھے اور نہایت عمدہ طریقے سے سمجھاتے تھے۔ ایک آدھ جگہ مولانا نے فرہنگ آصفیہ سے اختلاف بھی کیا اور مجھ سے کہنے لگے کہ مؤلف کا اصرار ہے کہ میں اس پر ریویو کروں۔ میں کیا لکھوں۔ اگر صحیح رائے ظاہر کروں تو مؤلف ناراض ہو جائیں گے اور تعریف ہی تعریف میرے بس کی چیز نہیں۔ مجبوراً یہ کروں گا کہ ان کے اخلاق و عادات اور ان کی ذاتی صفات کو پھیلا کر دو ایک سطر کتاب کی تعریف میں لکھ دوں گا۔

میں غالباً ۱۹۱۱ء میں میرٹھ سے مولانا حالی کی خدمت میں حاضر ہونے کے لئے غازی آباد جا رہا تھا کہ غازی آباد مولوی ظہور الحسن صاحب سے ملنے کے لئے اتر گیا۔ مولوی صاحب موصوف کی چھوٹی لڑکی سے میرا رشتہ ہو چکا تھا اور اسی وجہ سے مولوی صاحب کی خدمت میں ایک دو گھنٹے کے لئے حاضر ہونا ضروری سمجھا گیا تھا۔ مولوی صاحب پرانے خیال کے آدمی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ نہایت بزرگ، نہایت دیندار ہیں اور سب رجسٹراری کے زمانے میں نہایت متدین رہے اور حق العباد کا بیحد خیال رکھتے تھے لیکن وہ سرسید مرحوم کی وجہ سے مولانا حالی کو بھی نیچری کہتے تھے۔ مجھے یہ معلوم نہ تھا۔ ان کے استفسار پر میں نے صاف کہہ دیا کہ میں مولانا حالی سے ملنے کے لئے پانی پت جا رہا ہوں۔ مولوی صاحب نے فوراً کہا کہ میاں! کسی بزرگ کی خدمت میں جایا کرو۔ حالی تو نیچری ہیں۔ ان کی ملاقات سے کیا حاصل! میں اقرار کرتا ہوں کہ مولوی صاحب کے یہ الفاظ مجھے سخت ناگوار گذرے لیکن وہ موقع کچھ ایسا تھا کہ میں چوں نہیں کر سکتا تھا۔ مجبوراً میں نے خاموشی اختیار کی اور کچھ دیر توقف کرنے کے بعد میں مولوی صاحب سے رخصت ہو کر پانی پت چلا گیا۔ خدا کی شان دیکھئے کہ ہمارے مولوی صاحب ایک ہی سال بعد مولانا حالی کے قائل ہو گئے جبکہ آخر الذکر میری شادی میں شرکت کی غرض سے غازی آباد تشریف لائے۔ واقعہ یہ ہوا کہ بارات کے پہنچنے کے تین گھنٹے بعد مولانا حالی پانی پت سے پانچ

بجے شام کو غازی آباد پہنچے۔ اس روز اتفاق سے رام لیلا تھی۔ شہر کے ہندو اور مسلمان رؤسا کی تمام گاڑیاں رام لیلا میں چلی گئی تھیں اور اسٹیشن پر سوائے یکے کے اور کوئی سواری نہ تھی۔ سڑک کی ناہمواری اور یکے کی سواری دونوں ناقابل برداشت ثابت ہوئیں۔ اس لئے مولانا پاپیادہ روانہ ہوئے اور جوں توں جہاں بارات قیام پذیر تھی پہنچے۔ مولانا ہانپ رہے تھے اور سانس پیٹ میں نہیں سماتا تھا۔ لوگ تعظیم کے لئے کھڑے ہوگئے اور ہر چند کہا گیا کہ وہ مسند پر آرام سے بیٹھیں لیکن انھوں نے منظور نہ کیا اور اس خاکسار ہی کو مسند پر بٹھایا گیا۔ مشکل سے پانچ منٹ گذرے ہوں گے کہ مکان کے دروازے سے حضرات علما جو شادی میں شرکت کرنے کے لئے تشریف لائے تھے ایک ایک کرکے داخل ہونے لگے۔ ان حضرات میں جن کی تعداد بیس پچیس سے کم نہ ہوگی شیخ الہند مولوی محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری اور دیگر علمائے دیوبند بھی تھے۔ مولوی ظہور الحسن صاحب ان کا بیحد احترام کرتے ہوئے جہاں ہم لوگ بیٹھے تھے ان کو لے کر آتے تھے۔ مولانا حالی نے تعظیماً اٹھنا چاہا تو خواجہ غلام الثقلین صاحب نے کہا کہ آپ بیٹھے رہئے! آپ تھکے ہوئے ہیں لیکن مولانا حالی نے خواجہ صاحب کو جھڑک دیا اور ہر ایک کی کھڑے ہوکر تعظیم کی۔ یہ بات ہمارے مولوی صاحب دیکھ رہے تھے۔ شادی کے ایک دو ماہ بعد خود مولوی صاحب نے مجھ سے اعتراف کیا کہ مولانا حالی بہت بزرگ آدمی ہیں۔ وہ علمار کی قدر و منزلت سمجھتے ہیں اور ان کی عزت کرنا جانتے ہیں اور یہی واقعہ مجھ سے بیان کیا۔

ایک بار جو میں مولانا حالی کی خدمت میں پانی پت پہنچا تو مولانا مرحوم نے خاص طور پر ایک کنوئیں سے پانی منگوایا تھا جس کا مجھ کو علم نہ تھا۔ میں نے پانی پیا تو مولانا سے عرض کیا کہ یہ پانی تو کھاری ہے۔ مولانا ہنس پڑے اور فرمایا کہ ناحق آپ کو ایک گلاس پانی دے کر ضائع کیا۔ ہمارے نزدیک تو یہ شیریں اور عمدہ پانی ہے اور خاص طور پر ایک میل سے منگایا جاتا ہے۔ ہم نے ناحق تکلیف کی۔ قریب ہی کے کنوئیں سے پانی منگا کر پلا دیتے۔ آپ اسے بھی کھاری کہتے اور اسے بھی کھاری کہتے ہیں۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ مولانا حالی زنانخانے سے ایک بچے کو گود میں لئے ہوئے آئے جس کا نام اطہر عباس ہے اور مجھ سے کہا کہ بتلاؤ یہ کس کا بچہ ہے۔ میں نے بلا تامل کہا کہ خواجہ غلام الثقلین صاحب کا

ہے۔ فرمانے لگے تم نے کچھ بھی تامل نہ کیا اور فوراً بتلا دیا۔ یہاں سب لوگ کہتے ہیں کہ یہ بچہ اپنے باپ کی شکل و صورت پر نہیں ہے حالانکہ مجھے خود بھی غلام الثقلین کے مشابہ معلوم ہوتا ہے۔

مولانا حالی کا ایک پرانا ملازم تھا جو بہرا بھی تھا اور لنگڑا بھی اور بقول سلیم مرحوم مولانا حالی کے نقطۂ نظر سے اگر وہ اندھا بھی ہوتا تو ایک اور خوبی کا اضافہ ہو جاتا۔ مولانا حالی نے کبھی اس کو علیحدہ کرنا گوارا نہیں کیا حالانکہ ظاہر ہے کہ اس سے بہتر ملازم ان کو مل سکتا تھا اور وہ خدمت کے لائق بھی نہ تھا چنانچہ اکیلا نوکر رہتا بھی تھا۔ عجیب بات ہے کہ یہ بڈھا ملازم اور مولانا حالی کے پوتے اخلاق حسین اور گاگر مرحوم کچھ پیسے یا روپے جب مولانا سے مانگتے تھے تو زبان سے کچھ نہ کہتے تھے بلکہ مولانا کی صندوقچی جس میں روپے اور پیسے رہتے تھے لاکر مولانا کے سامنے رکھ دیتے تھے اور اس وقت اپنی ضرورت بیان کرتے تھے اور مولانا صندوقچی کھول کر کچھ نہ کچھ دے دیتے تھے۔

ایک مرتبہ مولانا حالی نے مجھ سے ایک کتاب کا ذکر کیا جو گم ہو گئی تھی اور اس کی نہایت تعریف کی۔ پھر یہ بھی فرمایا کہ وہ کتاب اب کمیاب بلکہ نایاب ہے۔ میں نے افسوس ظاہر کیا اور کہا کہ اس کتاب کے گم ہو جانے سے بے حد نقصان ہوا۔ فرمانے لگے کہ میں خود دماغ پر زور دوں گا تو وہ سب باتیں پیدا کر لوں گا جو اس کتاب کے مصنف نے تحریر کی تھیں اس لئے اس کے گم ہونے کا کچھ زیادہ غم بھی نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ مولانا نہایت طباع تھے لیکن افسوس ہے کہ ان کے خانگی امور نے اور ان کے اعزہ کی محبت نے انھیں تحریر و تصنیف کا اتنا کام نہ کرنے دیا جو وہ ان رکاوٹوں کے بغیر کر سکتے۔ ان کو عزلت نشینی کبھی نصیب نہ ہوئی اور وہ علیحدہ رہ کر کبھی تصنیف و تالیف نہ کر سکے۔ وہ ہمیشہ پانی پت سے دور رہنا چاہتے تھے اور پانی پت سے دور رہنا بھی ان کے لئے ممکن نہ تھا۔

مولانا حالی مجھ سے عزیزانہ اور بزرگانہ برتاؤ کرتے تھے۔ کبھی کبھی کسی کتاب یا کسی چیز کے بھیجنے کے لئے انھوں نے مجھے لکھا تو میں نے چاہا کہ ان سے قیمت نہ لوں لیکن وہ ناخوش ہوئے اور مجبوراً مجھ کو قیمت لینی پڑی۔ جب وہ میری شادی میں تشریف لائے تو میں نے ہر چند چاہا کہ کرایہ آمد و رفت قبول فرمالیں لیکن انھوں نے منظور نہ کیا۔

ایک بات مجھے ہمیشہ عجیب معلوم ہوئی کہ میں جب کبھی مولانا کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا، مجھے اطمینان قلب میسر ہو جاتا تھا اور میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتا تھا۔ غرض ایک عجیب سماں ہوتا تھا۔ یہ بات آج کل کے صوفی مشرب بزرگوں کے یہاں بھی دیکھنے میں نہیں آئی۔ میں جب ۱۹۲۵ء میں پانی پت گیا تو مولانا کی قبر پر جو قلندر صاحب کے احاطے میں ہے فاتحہ پڑھنے کی غرض سے پہنچا۔ سچ کہتا ہوں کہ مولانا کی قبر پر بھی وہی سکون قلب مجھے حاصل ہوا جو ان کی صحبت میں حاصل ہوتا تھا۔ مجھ کو مولانا کے انتقال کی خبر بذریعہ اخبارات ہوئی تھی جبکہ میں لکھنؤ میں تھا۔ بیحد رنج ہوا کہ آخری وقت میں زیارت سے محروم رہا۔ آہ! اب اس شعر کے پڑھنے میں کیا لطف ہے؟

بہت جی خوش ہوا حالی سے مل کر ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

شیر شاہ اور کسان

شیر شاہ سوری خداداد ذہانت، تدبر، اولوالعزمی، بہادری اور حکمرانی کی عجیب و غریب قوت لے کر اس عالم آب و گل میں آیا۔ ابتدائے عمر میں دنیا نے اس کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کیا اور وہ زمانہ جو آرزوؤں اور امنگوں کا زمانہ ہوتا ہے اس کے لئے رنج و مصیبت کا زمانہ ثابت ہوا لیکن باوجود اس کے شیر شاہ جیسے جواں مرد کے پائے استقلال کو ذرا بھی لغزش نہ ہوئی۔ دنیا نے دیکھ لیا کہ وہ نوجوان جسے اپنے باپ کے مکان کی دیواریں پناہ نہ دے سکی تھیں کس طرح ایک عظیم الشان سلطنت کی بنیادیں قائم کرنے میں کامیاب ہوا۔

ہمیں اس سے بحث نہیں کہ وقائع نویسوں نے اسے کس قسم کی حیثیت دی اور نہ ہمیں یہ گلہ ہے کہ اس سے بعد میں آنے والے حکمرانوں نے اس کے گراں بہا کارناموں کو کس قدر برا رنگ دے کر دنیا کے سامنے پیش کیا اس لئے کہ سچائی ایسی چیز ہے کہ وہ جتنی زیادہ دبائی جائے اتنی ہی زیادہ ابھرتی ہے۔ چنانچہ شیر شاہ کے صحیح کارناموں سے ارباب خبر ناواقف ہیں۔

شیر شاہ کی قابلیت اور خداداد استعداد میں کسے کلام ہو سکتا ہے۔ پانچ سال کے زمانۂ حکومت میں اس نے جو کارہائے نمایاں انجام دئے انھیں دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔

اس وقت اس کے نظام حکومت سے بحث کرنا مقصود نہیں بلکہ اس کی سوانح حیات کے ان چند اوراق کو الٹنا ہے جن میں وہ اپنے باپ کے نائب کی حیثیت سے ایک چھوٹی سی جاگیر میں کام کرتا نظر آتا ہے۔

چھوٹا کام اکثر پیش خیمہ ہوتا ہے کسی بڑے کام کا۔ اچھی زندگی کی ابتدا ہمیشہ چھوٹے چھوٹے کاموں کے کامیاب طریق پر انجام پانے سے ہوتی ہے۔ اگر ہم یہ کہیں کہ شیر شاہ کو آگے چل کر جو کامیابی نصیب ہوئی وہ محض اس چند سالہ سرگرمی کا نتیجہ تھی جو اس نے باپ کی جاگیر کے انتظام میں دکھائی تو کچھ

بے جا نہیں۔

شیر خاں کو جب اس کا باپ جلال خاں سے کہہ سن کر اپنے ساتھ گھر واپس لایا تو شیر خاں نے التجا کی کہ وہ اسے پرگنے کا منتظم بنا دے۔ اس کا خیال تھا کہ اسے اگر پورے اختیارات دے کر پرگنے کا منتظم بنا دیا جائے تو وہ نظم و نسق کی اصلاح اور ترقی میں ضرور کامیاب ہوگا۔ باپ نے اس درخواست کو قبول کر لیا اس لئے کہ وہ اپنے بیٹے کی ذہانت اور قابلیت سے بہت متاثر تھا۔

شیر خاں کے انتظام سے پہلے جاگیر کی حالت

حسن خاں (شیر خاں کا باپ) کی ریاست کا صحیح رقبہ معلوم نہیں۔ غالباً موجودہ ضلع شاہ آباد کے رقبے کے مساوی ہوگا۔ اس کے دو طرف پہاڑی علاقہ تھا جنوب میں رہتاس کی پہاڑیاں اور اس کے ساتھ ہی چند نیم آزاد باشندگان کی بستیاں تھیں۔ اس سے کچھ آگے ہندو راجہ رہتاس کی ریاست تھی مشرقی جانب دریائے سون اور مغرب میں چوند کا علاقہ جو محمد خاں سور کی ریاست تھا واقع تھا۔ اس علاقے کے باشندے بداخلاق، رہزن اور لٹیرے تھے۔ آپس میں بات بات پر لڑنا ان کا شیوہ تھا۔ اگر ایک کمزور ہوتا تو دوسرا اپنی طاقت سے اسے نیچا دکھانے کا آرزومند رہتا یہ حالت متوسط طبقے کی تھی۔ اچھے اچھے زمیندار بھی سفاک اور ظالم تھے۔ رحم دلی اور حسن اخلاق سے انھیں لگاؤ بھی نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ یہاں کے کسانوں کی جاعتی اور معاشی حالت بہت ہی خراب تھی۔

اس علاقے میں زیادہ تر سپاہی آباد تھے اور وہی با اقتدار بھی تھے۔ سپاہیوں کی فطرت میں درشتی ہوتی ہے۔ وہ نرمی سے کام نکالنا نہیں جانتے۔ اسی لئے وہ جب کسی پٹواری یا مقدم کو مجرم پاتے تو اسے بہت سخت سزائیں دیتے۔ انھیں ایسا کرنے کی جرات محض اس لئے ہوتی کہ جاگیردار حسن کی ملازمت میں یہ لوگ تھے ان کی اس روش کو برا نہیں سمجھتے تھے۔ انھیں تو مطلب لگان کے حصول سے تھا خواہ وہ نرمی سے حاصل کیا جائے یا سختی سے۔ کسانوں کی حالت بھیڑوں کے ایک ایسے گلے کی سی تھی جو بغیر کسی نگہبان کے درندوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا ہو۔

صرف یہی نہیں بلکہ کسانوں کے لئے ایک مصیبت اور تھی۔ وہ مقدموں اور پٹواریوں کا وجود

تھا جن کا کام زمینداروں اور کسانوں دونوں کو اپنی خباثتِ نفس سے دھوکا دینا تھا۔ زمینداروں کو اپنی نا اہلی کی وجہ سے یہ معلوم نہ تھا کہ ان کی جاگیر کی حقیقی آمدنی کیا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ مقدم زمینداروں کو لگان کا بہت کم حصہ دیتے اور کسانوں سے بہت زیادہ وصول کرتے۔ زمیندار سمجھتا کہ اسے اتنا ہی لگان ملنا چاہیئے تھا جتنا انھوں نے اسے دیا ہے اور کسان یہ سمجھتے کہ زمیندار نے ان پر بھاری لگان لگایا ہے جس کے ادا کرنے پر وہ مجبور ہیں۔

کسانوں کی جماعت ایک ایسی بدقسمت جماعت تھی جسے باوجود محنت و مشقت کے نہ پیٹ بھر کھانا نصیب ہوتا اور نہ تن ڈھکنے کو کپڑا ملتا۔ وہ سال بھر محنت کرتے، تپتی دھوپ اور تیز آندھیاں انھیں ان کے کام سے غافل نہ کرسکتیں۔ وہ محنت کرنا جانتے تھے اور بغیر کسی قسم کا آرام لئے اپنے اس کام میں محو رہتے اس لئے کہ ان کا ماحول ہی اس قسم کا تھا لیکن انھیں اس مشقت اور محنت کا صلہ جو ملتا وہ صرف یہ تھا کہ فصل جب تیار ہو جاتی تو مقدم آتا، اپنے سامنے کٹوا کر گٹھے بندھواتا اور انھیں کے سر پر لاد کر اپنے ہاں لے جاتا اور ان کے لئے صرف اتنا چھوڑتا جو بہ مشکل ان کا پیٹ بھرنے کو کافی ہوتا۔

نہ تو مقدم ان پر رحم کرتے اور نہ زمیندار اور سپاہی ان کی حفاظت کا کچھ سامان کرتے۔ بادشاہ تک فریاد لے کر پہنچنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ جو کسان ذرا سمجھ دار اور طاقتور ہوتے وہ دوسروں کو جو کمزور اور ناسمجھ تھے خوب لوٹتے اور اس طرح اپنی بسر اوقات کا سامان کرتے۔ غریب کسان تو کسی کام کے نہ تھے۔ مقدموں کی سختیاں، سپاہیوں کی ڈانٹ ڈپٹ اور اپنے طاقتور بھائیوں کے ظلم و ستم سہنے کے سوا انھیں کوئی چارۂ کار نہیں تھا۔

جب شیر خاں یہاں پہنچا تو کسانوں کو اس ابتر حالت میں پاکر بہت زیادہ متاثر ہوا۔ اس نے کسانوں کو اس بری حالت سے نکالنے کے لئے تدابیر سوچیں اور انھیں عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی۔ شیر خاں کا خیال تھا کہ دنیا کی معاشی حالت کا درست ہونا صرف کسانوں کی حالت کے بہتر ہونے پر منحصر ہے۔ دولت کا بیشتر حصہ انھیں لوگوں کی محنت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ یہ لوگ اگر محنت سے کام نہ لیں تو دنیا کی معاشی حالت درست نہیں رہ سکتی اور یہ اس وقت تک صحیح طور پر کام نہیں کرسکتے جب تک

ان کی حالت قابلِ اطمینان نہ ہو اور انھیں آسایش و آرام سے زندگی بسر کرنے کے مواقع ہاتھ نہ آئیں۔ اس کے خود اپنے الفاظ جو اس نے اس موقع پر استعمال کئے اس کے خیالات کی بہترین ترجمانی کرتے ہیں۔ اس نے کہا "میں کسان کو بہتر حالت میں دیکھنا چاہتا ہوں اور ایسا کرنے میں اگر میری زندگی کے تمام قیمتی لمحات بھی صرف ہو جائیں تو اس میں دریغ نہیں کروں گا اور اس وقت تک دم نہیں لوں گا جب تک ان کی حالت اس حد تک نہ سنبھل جائے کہ انھیں کوئی نقصان نہ پہنچا سکے۔" اس نے کہا کہ "وہ جاگیردار جو اپنے کسانوں کی حالت درست نہیں کر سکتا کیا حق رکھتا ہے کہ ان کی پیداوار میں سے حصہ لے۔ کیا محض اس لئے کہ وہ اس بیکار زمین کا مالک ہے جس کو کسان اپنی محنت سے قابلِ پیداوار بناتے ہیں۔"

عباس شروانی کا بیان ہے کہ جب شیر خاں اپنے پرگنے میں آیا تو اس نے مقدموں، سپاہیوں اور کسانوں کو جمع کر کے اپنے ارادوں سے مطلع کیا۔ سب سے پہلے اس نے سب سے زیادہ بدنظم اور ظالم سپاہیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "تمھیں معلوم ہونا چاہئے کہ میاں حسن (شیر خاں کے والد) نے مجھے یہ پرگنہ پورے اختیارات کے ساتھ سونپ دیا ہے، تمھارا عزل و نصب میرے ہاتھ میں ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ریاست کے نظام کو بہتر صورت میں لاؤں اور اگر تم میں سے کوئی شخص میرے ارادوں میں ذرا بھی حائل ہوا تو تمھارے لئے بہتر نہ ہوگا۔ تم نے آیندہ اگر کسی کسان کو تکلیف دی یا اس پر ظلم کیا تو میں تمھیں سخت سے سخت سزائیں دوں گا۔ جو لگان تم کسان سے کھیت بوتے وقت مقرر کر لو اس میں اضافے کا تمھیں کوئی حق نہ ہوگا۔ تمھاری سب پچھلی خطائیں معاف کی جاتی ہیں لیکن اگر آئندہ تم نے کسی کسان کو تکلیف دی تو اس کی پاداش میں تمھیں سخت سے سخت مصائب برداشت کرنا ہوں گے۔ اگر میرے کانوں تک یہ بات پہنچی کہ تم نے مقررہ لگان سے گھاس کا ایک تنکا بھی زیادہ وصول کیا ہے تو میں تمھیں ایسی سزا دوں گا جو دوسروں کے لئے باعثِ عبرت ہو۔ میرے احکام کی نافرمانی کا کسی کو حق نہ ہوگا۔ میں اپنے رشتے داروں اور سپاہیوں کو بھی ان کے جرموں پر ایسی ہی بلکہ ان سے زیادہ سزائیں دوں گا۔ اس معاملے میں میرے نزدیک کسی رشتے، علاقے،

مرتبے اور کارگذاری کی کوئی اہمیت نہیں۔ مجرم ہر حال میں مجرم ہے خواہ وہ میں ہوں یا کوئی اور۔ اس لئے رعیت کو چاہئے کہ وہ کھیتی باڑی کا کام پوری دلجمعی اور محنت سے کرے۔ ان سے مقررہ لگان سے ایک ٹکا بھی زیادہ وصول نہ کیا جائے گا اور سپاہیوں کو مطمئن رہنا چاہئے کہ ان سے صرف وہی رقم لی جائے گی جو انھوں نے لگان میں حاصل کی ہے۔"

سپاہیوں سے خطاب کرنے کے بعد اس نے کسانوں سے دریافت کیا کہ وہ کس قسم کا لگان پسند کرتے ہیں جنس کی صورت میں یا زر کی اور انھیں اختیار دیا کہ وہ جسے چاہیں پسند کرلیں اور یہ اسی وقت بتادیں تاکہ انتظام میں خرابی پیدا ہونے کا امکان نہ رہے۔ اس سے اس کا مقصد یہ تھا کہ رعیت سے بلاواسطہ معاملات طے کرے اور مقدموں کو ان پر ظلم کرنے کا کوئی موقع نہ مل سکے۔ یہ اس کی انتہائی دانشمندی اور معاملہ فہمی تھی۔ گو ابھی وہ جوان تھا لیکن اس کا دماغ بوڑھوں اور تجربہ کاروں کا سا تھا۔ آخر میں اس نے مقدموں سے خطاب کرتے ہوئے کہا جو کسانوں کے لئے سب سے زیادہ باعث تکلیف تھے کہ "میرے کان ظلم وستم کی ان داستانوں کو سن سن کر پک گئے ہیں جو تم نے اب تک غریب کسانوں پر کئے ہیں۔ میں اب ان داستانوں کو دہرانا نہیں چاہتا۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تم نے آیندہ مقررہ لگان سے اگر ایک دانہ بھی زیادہ وصول کرنے کی کوشش کی تو اس کا نتیجہ تمھاری تباہی ہوگی۔ تمھارا فرض ہے کہ تم لگان مقرر کرتے وقت نرمی سے کام لو اور وصول کرتے وقت تمھیں سختی کا اختیار ہے، زیادتی کا نہیں۔"

پھر اس نے دوبارہ کسانوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ اگر انھیں کسی قسم کی شکایت کرنا ہو تو ان کو چاہئے کہ وہ اس سے بذات خود آکر ملیں۔ وہ ان کی باتیں سنے گا اور کسی شخص کو ان پر ظلم نہ کرنے دے گا۔

یہ شیر خاں کی بہترین تدبیر تھی جسے اس نے کسانوں کی حالت درست کرنے کے لئے عملی جامہ پہنایا اور وہ اتنی کامیاب ہوئی کہ شاید ہی آجتک کوئی ایسی تدبیر کسانوں کی حالت درست کرنے کے لئے عمل میں لائی گئی ہو۔

شیر خاں صرف اسی سے مطمئن نہیں ہوا اس لئے کہ ابھی اسے ایک اور مصیبت سے دوچار ہونا تھا۔ یہ نافرمان اور باغی زمینداروں کا معاملہ تھا۔ سوال یہ تھا کہ وہ اتنی فوج کہاں سے لائے جو ان زمینداروں کا سر کچلنے کے لئے کافی ہو۔ اس کی ریاست کی تمام سپاہ اس کے باپ کے ساتھ کہیں باہر تھی۔ اس لئے شیر خاں کے باپ کے مشیروں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ اپنے باپ کے آنے تک اپنے اس ارادے کو ملتوی کر دے۔ لیکن شیر خاں جیسا باہمت نوجوان ان کے مشوروں پر کب کان دھرتا تھا۔ اس نے انھیں حکم دیا کہ تمام ان پٹھانوں کی تلاش کی جائے جو اس کے علاقے میں بے کار ہوں اور ان کی سواری کے لئے دو سو گھوڑے مع ضروری سامان کے بہت جلد فراہم کئے جائیں۔ اس طرح تھوڑی سی مدت میں اس کے گرد بہت سے پٹھان جمع ہو گئے جنھیں اس نے بہت کچھ فائدے کی امید دلا کر اپنے ساتھ شریک کر لیا۔

تمام ضروری سامان مہیا کرنے کے بعد شیر خاں ان پٹھانوں کی سپاہ کو ساتھ لے کر باغی زمینداروں اور مقدموں کی پناہ گاہوں کی طرف چلا۔ ان دیہاتوں پر چھاپے مارے جہاں یہ چھپے ہوئے تھے۔ انھیں اور ان کی عورتوں بچوں کو گرفتار کر لیا اور ان کا سامان ضبط کر لیا۔ عورتوں اور بچوں کے سوا تمام مال غنیمت سپاہیوں میں حسب وعدہ تقسیم کر دیا۔ شیر خاں نے ان باغی زمینداروں کو سخت سے سخت سزائیں دیں بعض کو قتل کروا دیا اور اکثر کو جو اطاعت قبول کر چکے تھے معمولی سی سزائیں دے کر چھوڑ دیا۔

اس میں شبہ نہیں کہ شیر خاں نے زمینداروں پر بہت سختی کی لیکن ہم اس سختی کو ظلم سے تعبیر نہیں کر سکتے اس لئے کہ شیر خاں کے دل میں غریب کسانوں پر ظلم ہوتے دیکھ کر بہت ناسور پڑ چکے تھے جن کا مرہم اس سختی کے سوا اور کوئی چیز نہ تھی۔ زمینداروں نے اس سے پہلے جو سختی غریب رعیت پر کی تھی اور ریاست میں جس بد نظمی کا باعث وہ بنے تھے اس کی وجہ سے شیر خاں مجبور تھا کہ ان کے ساتھ اسی قسم کی سختی کا سلوک کرتا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو کسانوں کی حالت جسے سدھارنے کا وہ قطعی ارادہ کر چکا تھا سدھر نہ سکتی۔ زمینداروں کی پچھلی تاریخ بتاتی ہے کہ انھوں نے کسانوں

پر رحم کرنا بھی نہیں سیکھا۔ وہ تو انھیں صرف گوشت و پوست کا ڈھانچا کہتے رہے ہیں جو صرف ان کی آسایش و آرام کی خاطر بنایا گیا ہے۔ اس لئے شیر خاں کو اچھی طرح معلوم تھا کہ جب تک یہ ظالم گروہ زیر نہ ہوگا اس وقت تک اس کی ریاست کی معاشی حالت اچھی نہ ہوگی اور نہ غریب کسان پنپنے پائیں گے

شیر خاں ایک حساس دل رکھتا تھا جس پر علم و عرفان نے جلا کر دی تھی۔ اسے یہ بھی گوارا نہ ہوا کہ وہ ایک ایسی جماعت اپنے سامنے دم توڑتے دیکھے جس کی محنت پر دنیا کی زندگی کی بقا کا انحصار ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ صرف کسان ہی حیات انسانی کی بقا کا اصلی باعث ہے۔ اگر یہ نہ ہوتا تو دنیا میں اس قدر دلچسپی اور حرارت نہ ہوتی جو اب اس کی موجودگی میں ہے گو خود اسے بھی اپنی اس ذات کی اہمیت کا احساس نہیں۔

شیر خاں نے کسانوں کی بہتری کے لئے وہ کچھ کیا جو اس سے پہلے کوئی نہ کر سکا۔ فیروز تغلق نے بھی کسانوں کی حالت درست کرنا چاہی تھی لیکن ساتھ ساتھ اس کا ایک مقصد اور بھی تھا اور وہ سرمایہ داری کی ذہنیت تھی جس کی وجہ سے وہ اتنا کامیاب نہ ہوا جتنا شیر خاں ایک معمولی جاگیر دار کی حیثیت سے۔

غزل

ہجر میں اب یہ حال ہے پیارے
زندگی اک وبال ہے پیارے

تم کو میرا خیال ہے پیارے
کیا یہ سچ ہے؟ یہ حال ہے پیارے

اس جہانِ خراب میں تجھ بن
زندگانی محال ہے پیارے

ہم سے تم سے تھی رسم و راہ کبھی
کچھ تمھیں بھی خیال ہے پیارے؟

تم نے میری وفا کی قدر نہ کی
سخت دل کو ملال ہے پیارے

مجھ سے اور خوف بے وفائی کا
یہ تمھارا خیال ہے پیارے

ساری دنیا کی فکر ہے تم کو
کچھ ہمارا خیال ہے پیارے؟

میں نظر بھر کے تم کو دیکھ سکوں
کب یہ میری مجال ہے پیارے

دیکھو چھیڑو نہ ہم کو تم اس وقت
کچھ طبیعت نڈھال ہے پیارے

نام سے ہو وفا کے تم بیزار
یہ وفا کا مآل ہے پیارے

امتحاں گاہِ دہر میں انساں
ہمہ تن اک سوال ہے پیارے

کاش کوئی بتا سکے کہ یہ زیست
اصل ہے یا خیال ہے پیارے؟

فرصتِ عیش ہے یہاں اک رات
یہ ہمارا خیال ہے پیارے

رات بھر جو گلے کا ہار رہا
صبح کو پائمال ہے پیارے

فیض ہے تیرے عشق کا کہ جلیلؔ
شاعرِ بے مثال ہے پیارے

غزل

تمام خلق سے دل بے نیاز ہو جائے | اگر تری نگہ دل نواز ہو جائے

طلب سے دل جو کہیں بے نیاز ہو جائے | جہاں کو ہستیِ انساں پہ ناز ہو جائے

ادھر بھی اک نگہ دل نواز ہو جائے | برائے خاطر اہلِ نیاز ہو جائے

قدم نہ راہ محبت میں پھر کوئی رکھے | اگر خیالِ نشیب و فراز ہو جائے

خیال کاکلِ مشکیں کا یہ تقاضا ہے | خدا کرے شبِ فرقت دراز ہو جائے

اثر طراز ہر اک بات ہو تری ناصح | مگر جو دل بھی ترا پاکباز ہو جائے

سمجھ رہے ہو جسے ایک بے حقیقت شے | اگر یہ نالۂ غم جاں گداز ہو جائے

نہ پوچھو حال تم اس خانماں خراب کا جو | فریب خوردۂ رنگ مجاز ہو جائے

خطا کسی سے نہ سرزد ہو پھر زمانے میں | برے بھلے کا اگر امتیاز ہو جائے

خیالِ زلفِ پریشاں میں اس قدر نہ الجھ | شبِ غم اور نہ اے دل دراز ہو جائے

پھر اس کو رنج و غم دہر سے تعلق کیا | کہ جس کا دل ہمہ تن سوز و ساز ہو جائے

جبینِ شوق کو تو سجدہ ریز رہنے دے | عجب نہیں ہے کہ یہ سرفراز ہو جائے

قصور اپنے ہی جذبات دل کا ہے ورنہ | قفس کا در ابھی صیاد باز ہو جائے

حمید گریہ و زاری نہ کیجئے اتنی
ان آنسوؤں سے نہ افشائے راز ہو جائے

تنقید و تبصرہ

شعرستان | از سید محمود اعظم صاحب فہمی ترمذی ۔ تقطیع $\frac{20 \times 30}{16}$ حجم ۱۲۰ صفحے ۔ چھپائی اچھی لکھائی اور کاغذ اوسط درجے کا ۔ قیمت عہ

ملنے کا پتہ :۔ مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ قرول باغ دہلی

یہ حضرت فہمی کے کلام کا پہلا مجموعہ ہے جو ۱۰ مسلسل نظموں اور ۴۰ غزلوں پر مشتمل ہے ۔ اس کے ساتھ ناصر اٹاوی کا مختصر اور جامع مقدمہ اور حضرت جگر مرادآبادی کے پرمعنی "اشارات" بھی ہیں ۔

حضرت فہمی اخباری شاعر نہیں ہیں ۔ اس لئے انھیں ابھی تک عام شہرت حاصل نہیں ہوئی مگر جن ارباب ذوق تک موصوف کا کلام پہنچا ہے وہ اس بات پر متفق ہیں کہ ان کا درجہ اردو کے جدید طرز کے شاعروں میں بہت اونچا ہے اور انھیں امید ہے کہ ابھی آپ ترقی کے بلند تر مدارج طے کر سکتے ہیں اور کریں گے ۔

حضرت فہمی کے کلام کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ آپ کا طائر فکر شاعری کی اس نئی ہوا میں جو مغرب کی طرف سے چلی ہے گرد راہ کی طرح بے بس ہو کر نہیں اڑتا ۔ بلکہ توازن کے ساتھ ۔ منزل مقصود کو نظر میں رکھ کر سمت کو دیکھ بھال کر آزادی کے شان سے محو پرواز ہے ۔ آپ نے پرانے طرز کے شعرا کی تنگ نظری کو چھوڑ کر شعر کو صرف چند انفرادی جذبات کے اظہار کا ذریعہ بنانے کی جگہ اس کے وسیع تر اور بلند تر مقصد کو اختیار کیا ہے یعنی اس سے حیات اجتماعی کی ترجمانی اور عالم فطرت کی تفسیر کا کام لیا ہے ۔ لیکن اس حقیقت کو یاد رکھا ہے کہ شاعری آرٹ ہے علم نہیں ہے اس کی جان احساس اور تخیل ہے ۔ اور اک اور استدلال نہیں ہے ، اس کی روح آب و رنگ صورت ہے معنی بے رنگ و بے صورت نہیں ۔

شاعر کا مفہوم اور شاعری کی ماہیت آپ کی کئی نظموں کا موضوع ہے اور ہمارے خیال میں یہ نظمیں اصابتِ فکر اور حسن بیان کے لحاظ سے آپ کے کلام میں خاص امتیاز رکھتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے آپ کی شاعری کا خاص پیام ہی یہی ہے کہ شاعر کو اس کی حقیقت سے آگاہ کرے۔ ہمیں اُمید ہے کہ اس مجموعے کو ادب و شعر کے خوش مذاق شائقین بہت قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے۔

گلبانگ | یہ اسی تقطیع کے ۷۰ صفحوں پر حضرت فہمی کی قومی اور وطنی نظموں کا مجموعہ ہے جس کی قیمت ۸؍ ہے۔ یہ بھی مکتبہ جامعہ ملیہ سے مل سکتی ہے۔ ابتدا میں تعارف کے طور پر مولینا سروش بھوپالی کا سنجیدہ تبصرہ ہے۔ اس میدان میں بھی حضرت فہمی کے مذاقِ سلیم نے انھیں عام روش کی پیروی سے الگ رکھا ہے اور ان کی نظموں میں ہنگامہ خیز سطحی جوش کی جگہ خاموش گہرے سچے جذبات کا رنگ نظر آتا ہے اور خطابت کی رو میں حقیقت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹنے پاتا۔ ہمارے خیال میں گلبانگ کی مقبولیت کا حلقہ بہت وسیع ہوگا۔ اس لئے کہ اس کی تاثیر ذوق شعر رکھنے والوں تک محدود نہیں بلکہ ہر شخص جس کے دل میں دردِ ملت اور حب وطن کا جذبہ ہے اس کے مطالعے سے لطف اور بصیرت حاصل کر سکتا ہے۔

مثنوی تغلق نامہ | شائع کردہ مجلس مخطوطات فارسیہ لال ٹیکری حیدرآباد دکن۔ بہ تہذیب و تحشیہ مولوی سید ہاشمی صاحب فرید آبادی۔ حجم ۱۵۱ صفحے دیباچہ و مقدمہ ۲۲ صفحے۔ تقطیع $\frac{۲۰\times۲۶}{۸}$۔ چھپائی ٹائپ کی۔ کاغذ چکنا نفیس۔ قیمت للعہ ر

سرکار نظام کے حکم سے ایک مجلس اس غرض سے قائم ہوئی ہے کہ فارسی کی مستند غیر مطبوعہ کتابوں کو فراہم کر کے صحت کے ساتھ چھپوائے۔ اس کے صدر سر اکبر حیدری اور معتمد اعزازی مولوی سید ہاشمی صاحب فرید آبادی ہیں۔ مثنوی تغلق نامہ کی اشاعت اس مجلس کا پہلا کارنامہ

ہے اور جس شان سے یہ کتاب چھپی ہے۔ اس سے امید ہوتی ہے کہ فارسی ادب کے بیش بہا خزانوں کو ڈھونڈھ کر نکالنے اور اہل ذوق سے روشناس کرانے میں یہ مجلس وہی قابل قدر خدمت انجام دے گی جو حیدر آباد کا مشہور و معروف دائرۃ المعارف، عربی مخطوطات کی اشاعت میں انجام دے رہا ہے۔

تغلق نامے کا نام امیر خسرو کی تصانیف کی ذیل میں سننے میں آتا تھا مگر کتاب کا کہیں پتہ نہیں چلتا تھا۔ جب نواب اسحٰق خاں صاحب مرحوم کی علم دوستی اور فیاضی کی بدولت امیر خسرو کی تصانیف بڑے اہتمام سے چھپنے لگیں تو یہ پتہ چلا کہ مولوی حبیب الرحمٰن خاں صاحب شیروانی کے کتب خانے میں ایک نسخہ جہانگیر نامے کے نام سے ہے جس کے متعلق موصوف کا خیال ہے کہ یہ امیر خسرو کا تغلق نامہ ہے مگر ان کو یقین نہیں ہے۔ مولوی رشید احمد صاحب انصاری مرحوم نے بڑی کاوش سے اس مسئلے کی تحقیق کی اور یہ ثابت کر دیا کہ شیروانی صاحب کا خیال بالکل صحیح ہے یہ کتاب تغلق نامہ ہی ہے۔ حیاتی نے اس میں کچھ تھوڑا سا اضافہ کیا اور محض اس بنا پر کتاب کا نام بدل دیا گیا اور وہ حیاتی کی طرف منسوب کر دی گئی۔

مولوی رشید احمد صاحب مرحوم نے مثنوی کا مقدمہ لکھنا شروع کیا تھا۔ جو افسوس ہے کہ ناتمام رہا۔ پھر بھی جو کچھ موصوف نے لکھا ہے اسے پڑھ کر یقین ہو جاتا ہے کہ یہ کتاب درحقیقت امیر خسرو کا تغلق نامہ ہے۔ مولوی سید ہاشمی صاحب نے اپنے دیباچے میں اس کی تائید میں مزید ثبوت پیش کیا ہے۔ ان دونوں حضرات کی بحث ادبی تحقیق کا نہایت عمدہ اور دلچسپ نمونہ ہے۔

سید ہاشمی صاحب نے اپنے دیباچے میں کتاب کی اصلیت کے علاوہ اس کے مضامین پر مختلف پہلوؤں سے ناقدانہ نظر ڈالی ہے اور ایک علیحدہ باب میں اس کا مکمل خلاصہ درج فرمایا ہے۔ مثنوی میں قطب الدین خلجی کے قتل سے لے کر غیاث الدین تغلق کی تخت نشینی تک کے واقعات صحت و ترتیب اور شاعرانہ فصاحت و بلاغت سے بیان کئے گئے ہیں۔ اس میں وہ رنگینی اور وہ زور نظر نہیں آتا جو امیر خسرو کی دوسری مثنویوں میں ہے۔ لیکن پختگی اور روانی، سادگی اور سلاست کا وہی لطف موجود ہے۔

تاریخی نظمیں ہر ملک میں اور ہر زبان میں عموماً مورخوں کے نزدیک پوری طرح اعتبار کے قابل

نہیں سمجھی جاتیں ۔ مگر امیر خسرو کی ان مثنویوں کی جس میں انھوں نے اپنے زمانے کا ذکر کیا ہے یہ خصوصیت ہے کہ وہ رنگ آمیزی اور مبالغے سے پاک ہیں اور واقعات کی سچی اور جیتی جاگتی تصویر دکھاتی ہیں ۔ اس لئے تعلق نامے کی اشاعت سے جو کھوئی ہوئی دولت ملی ہے اس سے ارباب ادب اور ارباب تاریخ دونوں کو بے حد مسرت ہوگی ۔ اور وہ مولوی رشید احمد صاحب مرحوم کے لئے دعائے مغفرت کریں گے ۔ اور سید ہاشمی صاحب کے شکر گذار ہوں گے ۔

نقد الادب از حامد اللہ صاحب افسر میرٹھی ۔ تقطیع $\frac{20 \times 30}{16}$ ۔ حجم ۲۰۲ صفحے ۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ ۔ قیمت عہ ۔ مطبع نولکشور لکھنؤ میں چھپی ہے ۔ ملنے کا پتہ درج نہیں ۔ غالباً مطبع سے یا خود مولف سے گورنمنٹ جوبلی کالج لکھنؤ کے پتے سے مل سکتی ہے ۔

اس کتاب میں حضرت افسر نے فنون لطیفہ خصوصاً ادب کی تنقید کے اصول جو قدیم زمانے میں اہل یوناں اور اہل ہند نے اور عہد جدید میں یورپ والوں نے قائم کئے سمجھائے ہیں ۔ اور انھیں معیار قرار دے کر اردو شاعری کی مختلف اصناف پر تبصرہ کیا ہے اور ممتاز شعرا کے کلام کی مجموعی قدر و قیمت مقرر کی ہے کتاب کے ابواب حسب ذیل ہیں ۔

باب ہفتم ۔ اصول تنقید کی تشکیل ۔

باب ہشتم ۔ تنقید کا مقصد اور عمل ۔

باب نہم ۔ ادب کا مطالعہ ۔

باب دہم ۔ اردو کی چند اصناف سخن ۔

ظاہر ہے کہ اتنے وسیع اور متنوع موضوع کا ایک مختصر سی کتاب پوری طرح احاطہ نہیں کر سکتی، اس لئے ہر چیز کی بحث سرسری اور نامکمل ہے اور مختلف ابواب میں باہمی ربط بھی بہت کم ہے۔ لیکن تنقید کے اہم ترین اصولوں کو مولف نے اچھی طرح سمجھا اور سمجھایا ہے اور اردو شاعری کے سرسری تبصرے میں ان سے دقت نظر اور حسن ذوق کے ساتھ کام لیا ہے ۔ یقین ہے کہ اردو ادب کے قدر دانوں کے لئے اس کتاب کا مطالعہ دلچسپ ہوگا اور اگر یہ کالجوں کے کورس میں داخل کردی جائے تو بہت مفید ثابت ہوگی ۔

تریاق مشرق | مجموعہ کلام حضرت سید احمد صاحب اُفق کاظمی امروہوی تقطیع خورد ضخامت ۲۳۲ صفحات ۔ قیمت درج نہیں ہے ۔ مصنف سے درگاہ حنفیہ محلہ کٹکوئی امروہہ کے پتے سے مل سکتی ہے ۔

اس مجموعہ میں افق صاحب کی قومی اور اسلامی نظمیں ۱۰۰ سے زائد ہیں ۔ پھر ارمغان ظرافت ہے ۔ جس میں ظریفانہ غزلیں اور نظمیں ۔ شروع میں ایک دیباچہ ہے جس میں اردو کی موجودہ شاعری سے بحث ہے اور اپنے لئے خاص راستہ نکالنے کے وجوہات ہیں ۔ پھر ایک مختصر سا مقدمہ ہے

ان تمام نظموں میں جو اس مجموعہ میں درج ہیں قوم کی بیداری اور ترقی کی تلقین ہے معنوی لحاظ سے کل نظمیں مسلمانوں کے لئے عمل کا پیغام ہیں ۔ شاعرانہ حیثیت سے بھی یہ نظمیں اچھی ہیں ۔ اشعار صاف اور بندشیں چست ہیں ۔ نمونتاً چند اشعار درج ہیں ۔

مسلماں مبتلائے خواب مستی ہوتے جاتے ہیں اسی باعث تو ننگ بزم ہستی ہوتے جاتے ہیں
بھرا ہے سر میں سودا سر بسر تقلید مغرب کا حریف بادۂ یورپ پرستی ہوتے جاتے ہیں
گریزاں ہیں جواں مردی و استقلال و ہمت سے مگر دن رات مائل سوئے پستی ہوتے جاتے ہیں
فلاح و عیش و خوش حالی تو رخصت ہو گئی ان سے شکار مفلسی و تنگ دستی ہوتے جاتے ہیں

قیامت ہے جگاتا ہوں تو میں جس قدر ان کو
یہ اسلئے اور محو خواب مستی ہوتے جاتے ہیں (ا - ج)

Ten gems From Ghalib از شہاب الدین رحمت اللہ صاحب۔

یہ کتاب بارہ اوراق کی ہے۔ ابتدائی دو اوراق میں غالب اور مولف کی تصاویر دی گئی ہیں۔ اس کے بعد غالب کے دس اشعار کا انگریزی نظم میں ترجمہ پیش کیا گیا ہے اور ہر شعر کے متعلق ایک تصویر بھی دی ہے۔

کسی زبان کے اشعار کا ترجمہ نظم میں کرنا ہی اصولی غلطی ہے۔ لیکن اگر یہ ضروری بھی تھا تو جناب مولف کاش لفظی ترجمے پر اکتفا کرتے۔ موجودہ حالت میں تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ صاحب موصوف یا تو ان اشعار کے سمجھنے ہی سے قاصر رہے یا ضروریات نظم سے مجبور ہو کر صحیح ترجمہ کرنے پر قادر نہ ہو سکے۔

مثلاً غالب کا شعر ہے۔

وہ چیز جس کے لئے ہم کو ہو بہشت عزیز
سوائے بادۂ گلفام مشک بو کیا ہے

ترجمہ کا مفہوم ملاحظہ ہو

وہ چیز جس کی ہمیں سخت تمنا ہے
یعنی بہشت۔ اے میرے دوست

اور جو ہمیں نہایت ہی عزیز ہے
بجز بادۂ گلفام مشک بو کچھ نہیں ہے۔

یعنی بادہ گلفام مشکبو خود بہشت ہے۔

غالب کا دوسرا شعر ہے۔

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

ترجمہ کا مفہوم یہ ہے

ہماری زندگی گویا ایک زنداں ہے
جہاں ہم مقید رہا کرتے ہیں
یہاں تک کہ مسرت کے ساتھ وہ آواز جرس سنیں
جو ہمیں اس کرب طویل سے نجات دیتا ہے۔

اس طرح ہر شعر کو مسخ کیا ہے اور مستزاد یہ کہ تصاویر بھی مفہوم شعر سے قطعی غیر متعلق ہیں اور ان میں بھی بدمذاقی کا ثبوت دیا ہے جس سے ہم یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ مولف نے اشعار مذکور سمجھنے میں واقعی غلطی کی ہے۔

یہ کتاب آرٹ پیپر پر چھپی ہے اور بجز کاغذ اور طباعت کے بظاہر اس میں کوئی خوبی نہیں ہے۔ قیمت عہ بہت زیادہ ہے۔ مولف سے یوسف روڈ فریزر بلڈنگ پٹنہ سے مل سکتی ہے۔

رسالہ حسب نسب | مرتبہ حکیم محمد عثمان صاحب ندوی۔ صفحات ۵۰۔ قیمت ۵ر

اس رسالے میں آیات قرانی اور احادیث سے حسب نسب کی فضیلت ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ نیز دلائل اور جدید تحقیقات کی بنا پر یہ بتلایا گیا ہے کہ جسم اور روح پر بھی حسب

نسب کا اثر ہوتا ہے۔ حسب نسب یعنی ماحول کا اثر جسم اور روح پر جو کچھ مرتب ہوتا ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن محض حسب نسب کو وجہ فضیلت قرار دینا اور اس پر فخر و مباہات جائز رکھنا قوموں کے لئے کچھ زیادہ مفید نتائج پیدا نہیں کرتا ہے۔ کیونکہ اس سے ان کی قوت عمل مضمحل ہو جاتی ہے۔

یہ رسالہ مصنف سے محلہ بیگہ شیخوپورہ ضلع مونگیر کے پتے سے مل سکتا ہے۔

بہاء اللہ اور میرزا | از مولینا ابو الوفا ثناء اللہ صاحب امرتسری۔ قیمت ۲ر صفحات ۷۶

مولینا موصوف نے اس رسالے میں شیخ بہاء اللہ ایرانی اور میرزا غلام احمد قادیانی کے دعاوی بالمقابل دے کر یہ ثابت کیا ہے کہ میرزا غلام احمد قادیانی نے کوئی نیا دعوی نہیں کیا۔ بلکہ شیخ بہاء اللہ ایرانی کی پیروی کی ہے رسالہ مذکور دفتر اہل حدیث امرتسر سے مل سکتا ہے۔

حیات بعد الممات | از حکیم نذیر احمد صاحب قیمت صرف ۲ر

اس مختصر سے رسالہ میں یہ امر ثابت کیا گیا ہے کہ انسان کے لئے موت کے بعد ایک اور حیات ابدی بھی ہے۔ اور وجہ تالیف یہ بیان کی گئی ہے کہ اس فتنہ و فساد کے زمانے اور اس مادیت کے دور میں مسلم قوم کے ادبار و انحطاط کے اسباب ایک دو نہیں بلکہ متعدد ہیں...... ان تمام چھوٹے مرضوں کی پیدائش ایک بڑے اور مہلک مرض سے ہے اور وہ حیات بعد الموت پر یقین کا نہ ہونا ہے۔"

کتاب میں اولاً قرآن کریم کی آیات حیات ابدی کے ثبوت میں درج کی گئی ہیں۔ اس کے بعد عقلی دلائل و براہین دی گئی ہیں۔ کتاب کے شروع میں علامہ سید سلیمان ندوی کا دیباچہ ہے۔

فطرت | راجگیر (پٹنہ) قیمت سالانہ عہ

یہ ماہانہ رسالہ جناب رشیدی بی اے کی زیر ادارت اکتوبر ۳۳ئ سنہ سے شائع ہونا شروع ہوا ہے ۔ اس وقت اس کا پہلا نمبر ہمارے پیش نظر ہے جس میں حسب دستور مقصد اشاعت ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے ۔ "فطرت کے سامنے صرف ایک ہی مقصد ہے اور وہی اس کا حاصل حیات ہے ۔ زبان کی خدمت اس کا مقصد ہے ۔ اسی لئے وہ معرض وجود میں آیا ۔ اسی لئے اور محض اسی لئے وہ زندہ رہنے کا آرزومند ہے "

اس ادعا کو ملحوظ رکھتے ہوئے اگر مضامین پر نظر ڈالی جائے تو سخت مایوسی ہوتی ہے ۔ خیال مدیر سے معلوم ہوتا ہے علامہ راشد الخیری کی اکثر کتابوں کا خاص طور پر مطالعہ کیا ہے اور ان پر علامہ موصوف کی طرز تحریر کا رنگ اتنا گہرا ہے کہ وہ ہر مضمون خواہ فلسفہ سے متعلق ہو یا تنقید شعری سے ۔ خواہ معاشرتی ہو یا ڈرامہ اسی انداز میں لکھنے کی ناکام کوشش فرماتے ہیں ۔

عام مضامین کا معیار بہت پست ہے ۔ اور زبان کے اکثر اسقام موجود ہیں ۔ بہار کے تاریخی مقامات کا سلسلہ نہایت دلچسپ ہے ۔

دلستاں | وزیر آباد ۔ قیمت سالانہ ے ر

اس وقت ہمارے سامنے اکتوبر کا رسالہ ہے اس نمبر سے رسالہ مذکور نے گویا اپنی زندگی کے دوسرے سال میں قدم رکھا ہے اور اس سلسلہ میں ادارتی عملے میں کافی تبدیلیاں بھی کی گئیں ہیں ۔ اور اب رسالہ غلام سرور صاحب فگار کی زیر ادارت میں شائع ہونا شروع ہوا ہے رسالے کے مضامین نہ بلحاظ ادب اور نہ بلحاظ تحقیق ہی بلند ہیں ۔

رسالے کے آخر میں چند صفحات بچوں کے لئے بھی مخصوص ہیں اور یہ شاید اس ضرورت سے بڑھائے گئے ہیں کہ رسالہ لاہور اور ملتان کے مدارس کے لئے بھی منظور کیا گیا ہے ۔ لیکن ایک ادبی رسالے میں بچوں کے لئے چند صفحات دینا اصولاً مناسب نہیں ہے ۔

بانو بھوپال | اڈیٹر خاتون ارشد تھانوی - قیمت سالانہ عہ

خواتین بھوپال کا یہ مقامی رسالہ ہے - پہلے دو پرچے اس وقت ہمارے سامنے ہیں بعض مضامین واقعی مفید ہیں لیکن طباعت و کتابت اچھی نہیں -

---

سندھ اخبار کراچی | اڈیٹر محمد مجتبیٰ جامعی - قیمت سالانہ للعہ

ہمیں افسوس ہے کہ یوم تاسیس کی مصروفیتوں کی وجہ سے ہم اخبارات پر بدیر ریویو شائع کر رہے ہیں - لیکن یہ واقعہ بھی ہے کہ جب تک اخبارات کے کافی پرچے نظر سے نہ گذر جائیں ان کے متعلق کوئی رائے قائم کرنا بھی مناسب نہیں ہوتا ہے -

یہ ہفتہ وار اخبار جامعہ کے سابق طالب علم محمد مجتبیٰ صاحب نے کراچی سے شائع کرنا شروع کیا ہے اور اس کی پالیسی مزدوروں اور کاشتکاروں کے مفاد کا تحفظ اور حمایت قرار دی گئی ہے اور اس کے دامن کو ذاتیات اور سیاسی و مذہبی تعصب سے پاک رکھنے کا اعلان کیا گیا ہے اگر جناب مدیر نے روایات جامعہ کو قائم رکھا اور استقلال سے کام لیا تو اخبار یقیناً کامیاب ہوگا -

---

جلیل دہلی | اڈیٹر منظور احمد صاحب عثمانی بی اے جامعہ - قیمت سالانہ عہ

یہ ہفت روزہ بھی حال ہی میں دہلی سے شائع ہوا ہے - سیاسی معاملات پر نہایت آزادی سے رائے زنی کرتا ہے - اور مفید معلومات سے پر ہے - پرچہ نہایت سلیقے سے ترتیب دیا جاتا ہے اس لئے امید ہے کہ مقبول ہوگا -

---

مجاہد - سہارنپور | اڈیٹر سید ابرار حسن - قیمت سالانہ عہ

اس ہفت روزہ کے نو پرچے اب تک نکلے ہیں - نواں پرچہ معراج نمبر ہے جو اس وقت پیش نظر ہے اس میں واقعہ معراج پر متعدد مضامین اور نظمیں درج ہیں - عقیدت مند مسلمانوں کے لئے ایک اچھا تحفہ ہے -

(م، ع، خ)

دنیا کی رفتار

ممالک غیر

روس | اس وقت جب کہ ہر ملک کو اپنی زرعی اور صنعتی پیداوار کے لئے منڈیوں کی تلاش ہے اور محاصل تامینی اور عام کساد بازاری نے ہر طرف تجارت کی راہیں بند کر رکھی ہیں۔ روس باوجود اپنی اندرونی مشکلات کے دنیا میں اکیلا ملک ہے جو سرمایہ داری نظام کے نہ ہونے کی وجہ سے کساد بازاری سے محفوظ ہے چنانچہ سب کی للچائی نظریں اس پر ہیں کہ اس سے تعلقات استوار ہو جائیں تو اپنے مال کی نکاسی کی شاید کوئی صورت نکلے چنانچہ دو مہینے کی روٹھا روٹھی کے بعد برطانیہ اور روس میں تجارتی تعلق قائم ہو ہی گئے اور کیوں نہ ہوتے کوئی ۴۰ کروڑ روپے سالانہ کی تجارت کا معاملہ تھا۔ محض جذباتی وجوہ سے اسے کوئی کس طرح چھوڑ دیتا۔

ادھر امریکہ جو ہر ممکن طریقے سے اپنی معاشی زندگی کو ابھارنے کی فکر میں ہے۔ باوجود سابقہ اعلانات کے اب روس کی انقلابی حکومت کو تسلیم کرنے پر آمادہ ہے۔ امریکن حکومت نے روس کو ۴۰ لاکھ ڈالر کا قرضہ بھی دیا۔ جس سے روس امریکہ سے کوئی ۸۰ ہزار روئی کے گٹھے خرید سکے گا اور اس سے بہت بڑے قرضے کی بات چیت ہو رہی ہے۔ روس کو اگر یہ قرضے مل جائیں تو وہ امریکا سے بہت بڑی مقدار گیہوں اور تانبے کی خریدنے کو تیار ہے۔ اور اس خریداری کی قیمت بالآخر ادا کرنے کے لئے اگر روس یہ ترکیب کرے کہ اپنا مال برطانیہ کو بھیجے تو امریکا اور بھی خوش ہوگا اس لئے کہ اس سے عہد نامہ اوٹاوا میں رخنہ پڑنے کی امید ہے اور یہ امریکا کا عین منشاء ہے۔

جب بڑے بڑے یوں جھک رہے ہیں تو پھر چھوٹوں کا کیا ذکر۔ چنانچہ روس نے اس

موافق فضا سے فائدہ اٹھاکر اپنے یورپی ہمسایوں سے معاہدے کرلیے ہیں پہلے جو معاہدے تھے ان میں یہ نقص تھا کہ رومانیا شریک نہ تھا اور اس کی شرکت ازبس ضروری تھی ایک تو اس لئے کہ اس کی سرحد دور تک روس سے ملی ہوئی ہے دوسرے اس لئے کہ یہ فرانس اور پولینڈ کا حلیف ہے۔

اب پولینڈ کی وساطت سے روس اور رومانیا میں بھی معاہدہ ہوگیا کہ ایک دوسرے پر حملہ آور نہ ہوں گے۔ اس معاہدے نے یورپ میں جنگ کے ایک امکان کو توکم کیا یعنی بسارابیا کے علاقے کا مسئلہ طے ہوگیا جو روس سے لے کر رومانیا کو دیا گیا تھا۔

اسی کے ساتھ روس نے ایران، افغانستان، ٹرکی، پولینڈ، رومانیا، لیٹویا، استھونیا سب سے یہ بات بھی صاف کرلی کہ حملہ آور ہونے سے کیا مراد ہے اور اس طرح سابقہ عہدناموں کو واضح اور پختہ کرلیا۔

لتھوینیا جو پولینڈ کی وجہ سے کچھ اکھڑا اکھڑا سا تھا وہ بھی اس معاہدے کے لئے آمادہ ہوگیا۔ اور خیال ہے کہ فن لینڈ اور چین بھی عنقریب روس سے اس مضمون کا معاہدہ کریں گے۔

لیکن ہم اس سے قبل بتا چکے ہیں کہ مشرقی یورپ کے ممالک میں فرانس اور اٹلی کے اثر کو بہت دخل ہے۔ چنانچہ اپنے قریبی ہمسایوں سے معاہدوں کے ساتھ ساتھ روس نے فرانس اور اٹلی سے بھی اپنے تعلقات استوار کئے کہ ان مذکورہ معاہدوں میں ان کے اثر سے کوئی رخنہ نہ پڑے اور ان دونوں دول سے بھی دوستی کے معاہدے ہوگئے۔

فرانس سے تو رفتہ رفتہ تعلقات بہت گہرے ہوتے جاتے ہیں اس لئے کہ جرمنی کے انقلاب نے صورت حال میں بڑا تغیر پیدا کردیا ہے۔ پہلے ۱۹۲۶ء میں روس اور جرمنی میں جو معاہدہ ہوا تھا اس کی رو سے روس برابر اپنا سیاسی اثر جرمنی کے ساتھ اس غرض سے استعمال کرتا تھا کہ یورپ کی موجودہ سیاسی حالت میں تغیر پیدا کرے اور صلح نامہ ورسائی کے قائم کردہ نظام کو جلد سے جلد بدلے۔ اس نظام کے قیام کے سب سے بڑے حامی فرانس اور پولینڈ

تھے ۔ اب روس نے رخ بدل دیا ہے اور کھلم کھلا فرانس کے ساتھ ہے ۔ اطلاعیں آئی ہیں کہ روس سے جرمن انجنیروں اور ماہرین فن کو علیحدہ کر دیا گیا ۔ اور ان کی جگہ فرانسیسی ماہر بلائے گئے ہیں ۔ اس طرح فرانس اور روس میں تعلقات سیاسی و تجارتی برابر ترقی کر رہے ہیں ۔ ان تمام معاہدوں سے روس کو سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ مشرق میں اس کے ہاتھ بالکل کھلے ہیں ۔ اگر کبھی مشرق میں جاپان سے ان بن ہو جائے تو روس المان کے ساتھ پوری قوت ادھر لگا سکتا ہے اور ظاہر ہے کہ مشرق میں روس کے لئے خاص مشکلات موجود ہیں ۔ اور کوئی نہیں جانتا کہ کس وقت جاپان سے تعلقات بگڑ جائیں ۔ چینی مشرقی ریلوے پر اس وقت بھی کافی بدمزگی موجود ہے جاپان کی پٹھو ریاست منچوکو برابر روسی آمد و رفت میں رکاوٹیں ڈال رہی ہے ۔ دونوں ملکوں کے اخبارات نے بھی باہمی منافرت پھیلانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا ہے، اس لئے یورپی اور ایشیائی سرحد کے سب پڑوسیوں سے معاہدہ روس کی مشرقی سیاست کے لئے بہت کار آمد ہے ۔

تخفیف اسلحہ | تخفیف اسلحہ کی جو کانفرنس مدتوں سے ہو رہی ہے اس کا کچھ عجب حال ہے نہ آگے بڑھتی ہے نہ ختم ہوتی ہے ۔ پچھلے دنوں اس کے کام کو ایک بڑا دھکا لگا ۔ یعنی جرمنی نے اپنے نمائندوں کو اس کانفرنس سے واپس بلا لیا اور اس کانفرنس ہی سے نہیں بلکہ جمعیتہ اقوام سے بھی قطع تعلق کر لیا ۔ یہ انقطاع تعلقات دراصل جرمنی کا اعلان ہے کہ جنگ کے بعد کا وہ عہد جس میں جرمنی مفتوح ملک کی حیثیت سے بین الاقوامی معاملات میں دب کر شریک ہونے پر مجبور تھا ختم ہو گیا ۔ وہ اب مفتوح ملک بن کر کسی مشورے میں شریک نہیں ہونا چاہتا ۔ بلکہ مساوات کا طالب ہے ۔ پچھلے پندرہ سال کی تمام جرمن سیاست اس اعلان کی تیاری تھی ۔

جرمن کے مخالف ممالک میں یہ شبہ بہت عام تھا کہ یہ قوم برابر آئندہ جنگ کی تیاری کر رہی ہے ۔ خود ملک کے اندر اور ادھر روس میں یہ برابر سامان جنگ کے ذخائر بڑھا رہی ہے تاکہ

جب وقت آئے تو بالکل بے بس تو نہ ہو۔ لیکن باوجود ان شبہات کے جمہوری اشتراکی جرمنی کو سمجھا بجھا کر اچھا ہمسایہ بنا لینے کی توقع تھی۔ اسی توقع کا نتیجہ تھا عہدنامہ لوکارنو۔ جرمنوں نے اس میں جو کچھ ہو سکا منوا لیا۔ پھر انگریزوں کی اس خواہش سے فائدہ اٹھایا کہ براعظم یورپ میں فرانس کا اقتدار کہیں اتنا نہ بڑھے کہ قابو سے باہر ہو جائے۔ چنانچہ انگریزوں کی مدد سے مساواتِ اسلحہ کے معاملے میں کچھ رعائتیں حاصل ہوئیں اور عہدنامہ ورسائی کی قطعیت میں کچھ امکاناتِ تغیر پیدا ہوئے، بے چارہ فرانس جو باوجود فتح کے جرمن انتقام کے ڈر سے لرزتا ہے یہ سمجھ کر یہ سب تلخ گھونٹ پیتا رہا کہ قوم پرستی کے اٹھتے ہوئے طوفان کو دبانے کی اگر کچھ توقع ہو سکتی تھی تو اس طرح۔ انگریزوں کے اس خیال سے کہ جرمنی کو اتنا نہ دباؤ کہ کھسیا کر لڑ پڑے بلکہ رعائتیں دے کر اسے ٹھنڈا کرو اٹلی بھی متفق تھا۔

چنانچہ جب کوئی سال بھر پہلے جرمنی تخفیفِ اسلحہ کی کانفرنس سے کنارہ کش ہوا تو اٹلی اور انگلستان اسے سمجھا بجھا کر واپس لائے کہ تمہارے مطالبات پر ہمدردانہ غور ہوگا۔ اتنی جلدی نہ کرو اس کا نتیجہ "معاہدہ دول اربعہ" کی شکل میں رونما ہوا۔ جس نے عہدنامہ ورسائی میں بنیادی تبدیلیوں کے امکانات کا راستہ کھولا۔ فرانس اس میں خوشی سے کیسے شریک ہوتا۔ لیکن مجبوری تھی انگلستان، اٹلی اور فرانس کو متحد کرنا اور خود اس سے الگ رہنا بھی دانش مندی نہ تھی، چار و ناچار فرانس شریک ہوا لیکن اس ساری کارروائی کو جمعیتہ اقوام کے زیرِ نگرانی لانے پر اصرار کے ساتھ۔

لیکن اس کے بعد حالات بدلے۔ جرمنی کے خلاف ساری دنیا میں ناراضی پھیلائی گئی۔ روس نے جرمنی کو چھوڑ کر فرانس سے دوستی کی، اپنے تمام ہمسایوں سے اپنے معاملات استوار کر لئے۔ لہٰذا کانفرنس کے سامنے یعنی انگریزوں کے سامنے اب یہ مسئلہ نہ تھا کہ رعائتیں دے کر جرمنی کو راضی رکھیں بلکہ ہو سکے تو اس کی گستاخ، قوم پرست اور یہودی دشمن حکومت کو ایسا سبق دیا جائے جو یہ آسانی سے نہ بھولے اور ممکن ہو تو اس ایک دھکے سے ہٹلر کی خطرناک

قیادت کے بت کو توڑ دیا جائے۔ اس فیصلے کی تہ میں یہودیوں کا بین الاقوامی اثر بھی تھا اور فرانس کا یہ مستقل خوف بھی کہ جرمن ہتوا اسے کسی نہ کسی دن آ دبوچے گا۔ اور انگلستان کا یہ مستقل اصول بھی کہ براعظم پر کسی کو فیصلہ کن قوت نہ حاصل ہو۔

فرانس یوں تو ہمیشہ سے اس خوف سے کانپتا رہا ہے۔ لیکن صلح نامہ ورسائی کے بعد لوگ سمجھتے تھے اب واقعی خوف کی کوئی معقول وجہ باقی نہیں بلکہ فرانس صرف جرمنی کو دبائے رکھنے کے لئے اس کا اظہار کرتا ہے۔ مگر اب کچھ عرصے سے اس خوف کے لئے بہت قوی وجوہ پیدا ہو چلے تھے۔ اگرچہ فرانس نے اپنی سرحد کو قلعوں سے بہت کچھ مضبوط کر لیا ہے لیکن یہ قلعے ہیں تو سکھوں کے ہاتھ میں اس کی فوج کی حیثیت ایک ملیشیا کی سی ہے۔ جسے کوئی چھ ہفتے فوجی تعلیم دی گئی ہو اور بس۔ برخلاف اس کے جرمنی کے پاس صلح نامہ ورسائی کی اس دفعہ کی وجہ سے کہ جرمنی فوجی خدمت سب شہریوں کے لئے لازمی نہیں کر سکتا، ایک لاکھ آدمیوں کی مقابلتہً چھوٹی مگر نہایت منظم پیشہ ور سپاہیوں کی فوج ہے۔ جس کی کمک کے لئے فوجی تعلیم پائی ہوئی پولیس بھی ہے اور قومی اشتراکی جماعت کی نیم فوجی تنظیم بھی۔ چھ مہینے کے اندر اندر جرمن اتنے آلات جنگ تیار کر سکتے ہیں کہ یہ فوجی قوت اس سامان کے ساتھ فرانس کی قوت کا مقابلہ کر سکے اور اگر پہلوؤں پر سے حملہ کرے تو شاید فرانس کو دبا بھی لے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ بلجیم کی حکومت نے یکایک فیصلہ کیا ہے کہ دریائے میوز کے ساتھ ساتھ قلعوں کا ایک سلسلہ بنائے جس پر خیال ہے کہ ۷ کروڑ فرانک خرچ ہوں گے۔ ادھر سوئیزرلینڈ میں سے جرمن فوجوں کے فرانس پر حملہ آور ہونے کے خوف نے اس ملک کی حکومت کو اس پر مجبور کیا ہے کہ کوئی دس کروڑ فرانک اسلحہ پر صرف کرے!

غرض صورت یہ ہے کہ جرمنی کے پاس پیشہ ور سپاہیوں کی عرصے تک سکھائی ہوئی فوج ہے۔ جو اگرچہ تعداد میں کم ہے مگر دوسری نیم فوجی جمعیتوں کے ساتھ مل کر بہت قوی ہو سکتی ہے، صرف اس وقت جنگ کے مہلک آلات جرمن کے پاس نہیں ہیں۔

فرانس کے پاس ان آلات تباہی کی کوئی کمی نہیں۔ فوج بھی بہت ہے۔ مگر تھوڑے

تھوڑے دن سیکھی ہوئی۔ برطانیہ، فرانس، اور امریکا کا خیال یہ ہے کہ جرمنی کی طاقت اور نہ بڑھنے پائے۔ اس کی تدبیر یہ نکالی گئی اور اس کے سوچ کر نکالنے کا سہرا برطانیہ کے سر ہے کہ جرمنی سے کہا جائے کہ تم بھی اپنی فوج کو ملیشیا بنا دو، یعنی مستقل رکھنے کی جگہ تھوڑے عرصے تک سپاہیوں سے فوجی خدمت لو، نیم فوجی جمعیتوں کو ختم کر دو تو ہم اجازت دیتے ہیں کہ فوج کی تعداد دوچند کر لو۔ لیکن نئے آلات اب نہ بنانا۔ ادھر فرانس کو بھی ہم راضی کئے لیتے ہیں کہ تم بھی فوج کی تعداد جرمنی کے برابر کر لو۔ سامان حرب تمھارا تمھارے پاس رہے!

اس طرح کچھ عرصہ گذر جائے اور جرمنی کا رویہ درست رہے، یہ چھپ کر آلات حرب نہ بنائے تو فرانس بھی اپنی توپوں، جنگی ہوائی جہازوں، اور دوسرے آلات حرب کو کم کر دے گا۔

اس میں چال یہ تھی کہ اگر جرمنی اس تجویز کو مان لے تو اس کی فوجی قوت باوجود تعداد کے اضافہ کے اس وقت کے مقابلے میں بھی کم ہو جائے گی، اور فرانس کی قوت میں کوئی معتد بہ کمی نہ ہو گی کہ اس کا انحصار آدمیوں سے زیادہ اسلحہ پر ہے۔ اگر جرمنی نہ مانے گا تو ساری دنیا کے سامنے پھر امن عالم کا دشمن قرار پائے گا۔ بساط سیاست پر دنیا کی رائے عامہ بھی ایک مہرہ ہے، لیکن جرمنی نے نہ مانا۔ وہ جانتا تھا کہ اس معاملے کو منوانے کے لئے اب انگلستان اور امریکا پھر جنگ کرنے پر تو آمادہ ہو نہ سکیں گے۔ اکیلا فرانس اس کا کچھ بگاڑ نہ سکے گا۔ چنانچہ اس نے تخفیف اسلحہ کی کانفرنس ہی کو نہیں چھوڑا بلکہ جمعیت اقوام کو بھی الوداع کہا۔ اور اس جدائی کے فوراً بعد دنیا کو جتا دیا کہ وہ اپنے اسلحہ میں کوئی اضافہ نہیں کرے گا اور نہ امن عالم کو کوئی نقصان پہنچائے گا۔ اس کا مطالبہ تو بس یہ ہے کہ اسے دوسری فاتح اقوام کے مساوی سمجھا جائے۔ اس نے نہ اپنی فوجی قوت کو کم ہونے دیا، نہ اسے دنیا کے سامنے امن کا مخالف ثابت کیا جائے گا۔ اور ابھی اس واقعہ کو بہت دن نہیں گذرے تھے کہ امریکا نے کہہ دیا کہ ہمارا کسی یورپی طاقت سے کوئی سیاسی ساز باز نہیں ہے اور ہم اس مسئلے میں مزید بحث و گفتگو میں شریک نہ ہوں گے۔ انگریزوں نے بھی کہہ دیا کہ ہم ہر ممکن کوشش کریں گے کہ جرمنی سے معاملہ صاف ہو جائے۔ ہٹلر کو اور اس کے پردے میں اٹلی کی سیاست

کو جو فرانس کو ذرا نیچا دکھانا چاہتا ہے یہ بڑی کامیابی ہوئی۔ لیکن اس کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا کہ تخفیف اسلحہ کے منصوبوں کا کیا حشر ہو گا۔ تخفیف ہو گی یا اسلحہ میں اضافہ کی ایک سرپٹ دوڑ جس میں ترقی کے ساتھ تباہی کی منزل قریب تر آتی جائے گی۔

ممالکِ اسلام

افغانستان | بعض ممالک اپنی فطری ساخت اور اپنے باشندوں کے طبائع کے لحاظ سے مرکزی حکومت کے لئے موزوں نہیں ہوتے۔ افغانستان کا شمار بھی غالباً انھیں میں ہے۔ اس ملک کی تاریخ میں بہت کم مدتیں ایسی گذری ہیں جن میں تمام قبائل نے ایک بادشاہ کو بطیب خاطر تسلیم کیا ہو۔ طاقت اور تدبر شاذونادر ایک انسان میں جمع ہوتے ہیں۔ سلاطین عموماً مدبر نہیں ہوتے۔ اگر کوئی بادشاہ بہ زور بازو تختِ سلطنت کو حاصل کرتا ہے تو وہ بجائے اس کے کہ لوگوں کے دلوں کو ہاتھ میں لے ان کے سروں کو خاک و خوں آلودہ اپنے سامنے دیکھنا چاہتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب تک اس کے ہاتھ میں طاقت رہتی ہے ملک میں امن رہتا ہے اور جہاں اس میں ضعف یا غفلت پیدا ہوئی مقتولین کے ہمدرد آمادہ بہ قصاص نظر آتے ہیں۔ پھر خوں ریزی شروع ہوتی ہے اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک کوئی طاقت ور انسان رونما ہو کر دوبارہ زور بازو سے تخت پر قبضہ نہیں کر لیتا۔ ملوک و سلاطین کی تاریخ میں اس قاعدۂ کلیہ سے بہت کم افراد مستثنیٰ کئے جا سکتے ہیں۔ عبدالرحمٰن خان غالباً ان مستثنیٰ افراد میں سے تھے۔ امان اللہ خان میں خلوص، جذبہ اصلاح اور اپنے قوم کا درد عام سلاطین سے بہت زیادہ ہے لیکن تدبر کی کمی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ عرصے تک حکومت نہ کر سکے اور تغیرات کی رو میں خود بھی بہ گئے۔

نادر شاہ سے جو ایک جہاں دیدہ آدمی تھے یہ توقع تھی کہ وہ افغانستان کے پریشان عناصر کو جمع کر کے اس کے جسم میں امن و امان کی روح پھونک سکیں گے لیکن غالباً واقعات نے انھیں کچھ اس طرح مجبور کیا کہ زمام تدبر ان کے ہاتھ سے بھی چھوٹ گئی اور بجز اپنے مخالفین کو قتل کرنے کے اور کوئی تدبیر انھوں نے بھی اختیار نہ کی۔ نتیجہ وہی ہوا جو ہونا تھا یعنی مقتولین کے طرفداروں میں سے ایک نے موقع پاکر ان کو قتل کر دیا۔ اب پھر افغانستان کی قسمت کا ستارہ گردش میں ہے، یوں تو نادر شاہ کے فرزند ظاہر شاہ تخت افغانستان پر متمکن ہیں۔ اور

خبریں یہی آرہی ہیں کہ لوگوں نے ان کو بادشاہ تسلیم کر لیا ہے لیکن جو لوگ افغانستان کی دیرینہ تاریخ سے واقف ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ ابھی حالت بالکل قابل اطمینان نہیں ہے۔ ایک طرف اگر اس کا امکان ہے کہ نوجوان ظاہر شاہ اپنے چچا ہاشم خان کی مدد سے فوری خطروں کا مقابلہ کر سکیں تو دوسری طرف یہ بھی بعید نہیں کہ امان اللہ کے طرفدار جو جنرل غلام نبی خان اور دیگر سرداران قبائل کے قتل کی وجہ سے نادر شاہ کے خاندان سے برہم ہیں اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیں اور سلطنت کی باگ کو ظاہر شاہ کے ہاتھ سے چھیننے کی کوشش کریں۔ اگر ایسا ہوا اور اس کے آثار ناپید نہیں ہیں، تو افغانستان کی بدقسمت زمین پھر خون سے رنگین ہوگی۔

ابھی افغانستان میں اتحاد قومی کا احساس پیدا نہیں ہوا ہے۔ وفاداری اور عصبیت کا جذبہ قبیلے تک محدود ہے۔ اگر کبھی کوئی بادشاہ ایسا پیدا ہو گیا جو قبائل کے نظام کو توڑ کر قوم کی عمارت کھڑی کر سکا تو شاید یہ خانہ جنگی کچھ عرصے کے لئے بند ہو جائے۔ ممکن ہے کہ قومیت کا پودا خون ہی کی آبیاری چاہتا ہو اور جب کافی خوں ریزی ہو چکے تو یک جہتی کا ثمر بار آور ہو۔ موجودہ سرداران قبائل اور امیدواران شاہی سے یہ توقع بے کار ہے۔ کاش نوجوانان افغانستان اس طرف توجہ کریں اور اپنی قوم کی قسمت کو خود پرست یا قبیلہ پرست افراد کے ہاتھوں سے نکال کر کسی قوم پرست مدبر کے ہاتھوں میں دیں۔

فلسطین | نومبر کے رسالے میں مسئلہ فلسطین پر اظہار خیال کرتے وقت جو اندیشہ تھا وہ بہت جلد پورا ہوا۔ جرمنی میں یہودیوں پر جو مظالم کئے گئے ہیں ان کی وجہ سے وہاں سے بہت سے یہودی ہجرت کر کے فلسطین میں آباد ہونا چاہتے ہیں۔ اگست میں جو صیہونی کانفرنس پراگ میں منعقد ہوئی تھی اس میں شدومد سے یہ تجویز منظور ہوئی تھی کہ حکومت برطانیہ سے یہودیوں کو فلسطین میں آباد ہونے کی اجازت کا مطالبہ کیا جائے۔ حکومت برطانیہ نے ایک محدود تعداد منظور کی۔ ایک طرف تو یہودی اس سے مطمئن نہ ہوئے اور دوسری طرف فلسطین کے عرب

اس نئی اجازت سے بہت ناراض ہوئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بیت المقدس میں عربوں نے حکومت کے خلاف ایک بہت بڑا مظاہرہ کیا۔ حکومت بھلا بغاوت کو کس طرح برداشت کر سکتی تھی پولیس اور فوج نے لوگوں پر مظالم شروع کئے۔ بے چینی میں اور اضافہ ہوا اور بالآخر فوج اور عرب مظاہرین کے درمیان سخت آویزش ہوئی جس میں عربوں کی کثیر تعداد مقتول اور زخمی ہوئی۔ اسی سلسلے میں غالباً کچھ یہودی بھی مارے گئے اور ایک غریب ہندوستانی طالب علم بھی جس کو شوق سیاحت اس بدقسمت ملک میں لے گیا تھا۔ اس خوں ریزی سے مظاہروں میں کمی نہ ہوئی بلکہ قرب و جوار میں بھی یہ آگ بھڑک اٹھی۔ یہی وہ زمانہ تھا جب بندرگاہ یافا کے افتتاح کی رسم دھوم سے ادا کی جانے والی تھی۔ وہاں بھی مظاہرے ہوئے اور یہ رسم ادا تو کی گئی مگر بہت بے رونقی سے اور چپکے چپکے۔

عربوں کا یہ مظاہرہ یہودیوں کے خلاف نہیں تھا بلکہ حکومت فلسطین کے خلاف تھا۔ اعلان بالفورسے جس مقصد کے حصول کی امید تھی اس کا پورا ہونا تو درکنار اب تو حکومت کو اپنی جان کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔ عربوں کا خون رنگ لائے بغیر نہیں رہ سکتا ایک طرف تو یہ حال ہے اور دوسری طرف دنیا بھر کے یہودیوں کا تقاضا ہے کہ فلسطین کا دروازہ یہودیوں کے لئے کھول دیا جائے اب حکومت برطانیہ دوگونہ رنج و عذاب میں مبتلا ہے نہ یہودیوں کو خوش کر سکتی ہے نہ عربوں کو۔

شذرات

ادارت رسالہ جامعہ نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ جنوری سنہ ۴۲ء سے رسالہ نئی ترتیب سے شائع ہوا کرے یعنی سال کے بارہ پرچوں میں سے چار چار پرچے اسلامیات ، اجتماعیات اور ادبیات کے لئے مخصوص کر دئے جائیں۔

اس کی تفصیل حسب ذیل ہے :-

جنوری ، اپریل ، جولائی اور اکتوبر کے پرچوں میں کل مضامین مذہب اسلام اور اسلامی تہذیب و تمدن کے متعلق ہوا کریں گے۔ "دنیا کی رفتار" کے عنوان سے جو تبصرہ واقعات حاضرہ کے متعلق ہوتا رہتا ہے وہ بھی ان پرچوں میں اسلامی ممالک اور ہندوستانی مسلمانوں کے مخصوص مسائل تک محدود رکھا جائے گا۔ تنقید بھی اسلامیات کی کتابوں پر ہوگی۔ ان پرچوں کی ترتیب میں مشورہ اور مدد دینے کے لئے ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب ہمارے ارکان ادارت میں شامل ہوں گے۔

فروری ، مئی ، اگست اور نومبر کے پرچوں میں تاریخ ، معاشیات ، سیاسیات عمرانیات کے مضامین شائع ہوں گے ، ان علوم کی کتابوں پر تنقید کی جائے گی۔ اور "دنیا کی رفتار" کے عنوان سے ہندوستان اور ممالک غیر کے اہم واقعات پر نظر ڈالی جائے گی۔ ان پرچوں کی ترتیب میں امداد دینے کے لئے جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب اور پروفیسر محمد مجیب صاحب شریک مجلس ادارت ہوں گے۔

مارچ ، جون ، ستمبر اور دسمبر کے پرچے ادب اور آرٹ کے مضامین ، افسانوں اور نظموں اور ادبی کتابوں کی تنقید پر مشتمل ہوں گے۔ فلسفہ اور تعلیم کے مضامین اور اس قسم کی کتابوں کی تنقید کو بھی انھیں پرچوں میں جگہ ملے گی۔

رسالے کا حجم بدستور ۹۶ صفحے اور سالانہ چندہ صہ رہے گا ، البتہ جو حضرات صرف

چار پرچے خریدیں گے ان سے عہ؍ ، اور جو آٹھ پرچے خریدیں گے ان سے للعہ؍ لئے جائیں گے۔ ایک پرچے کی قیمت ۱۰؍ ہوگی۔ قدیم خریداروں سے التجا ہے کہ اگر وہ اپنا چندہ ختم ہونے کے بعد بجائے بارہ پرچوں کے صرف آٹھ پرچے یا چار پرچے لینا چاہیں تو منیجر صاحب رسالہ جامعہ کو اطلاع دے دیں۔ اطلاع نہ آنے کی صورت میں یہ سمجھا جائے گا کہ انھیں بدستور کل پرچوں کی خریداری منظور ہے۔

جامعہ ملیہ کا تیرھواں یوم تاسیس ۲۹؍ اکتوبر سنہ ۳۳ء کو منایا گیا۔ اس سال نئی بات یہ ہوئی کہ اس جشن کے سلسلے میں کئی جلسے منعقد ہوئے جو تین دن تک جاری رہے اور ان میں شرکت کے لئے قدیم طلبہ اور ہمدردانِ جامعہ بڑی تعداد میں باہر سے تشریف لائے۔

پہلا جلسہ ۲۸؍ اکتوبر ۵½ بجے شام کو جناب آصف علی صاحب بیرسٹر کی صدارت میں ہوا۔ جناب صدر کی پرمغز تقریر کے بعد حامد علی صاحب ندوی طالب علم جامعہ نے اس کام کی رپورٹ سنائی جو جامعہ نے تعلیم بالغان کے متعلق ایک سال کے عرصے میں کیا۔ رپورٹ کا خلاصہ یہ تھا کہ قرول باغ کا ایک حصہ کام کرنے کے لئے منتخب کیا گیا اس کی مردم شماری کی گئی۔ مدرسہ شبینہ کے ذریعے سے کچھ لوگوں کو لکھنا پڑھنا اور حساب سکھایا گیا۔ ایک چھوٹا سا کتب خانہ اور دارالمطالعہ کھولا گیا جس سے بہت لوگوں نے فائدہ اٹھایا۔ اس حلقے کے باشندوں کو حفظانِ صحت اور صفائی کے متعلق ہدایتیں کی گئیں اور مریضوں کو دوا تقسیم ہوئی۔ ان کی تفریح اور ورزش کے لئے کشتی کبڈی وغیرہ کے مقابلے کئے گئے۔ غرض کارکنوں نے اپنی طرف سے ہر طرح کی کوشش کی لیکن اس سے جتنے لوگ متاثر ہوئے ان کی تعداد قابلِ اطمینان نہیں اور کام میں بہت سی دقتیں ہیں جنھیں دور کرنے کے لئے مزید اہتمام کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر ظفریاب حسین صاحب نے حفظانِ صحت کے اصولوں پر لکچر دیا اور ایک فلم ملیریا کے اسباب اور علاج کے متعلق دکھایا گیا۔

۲۹ر اکتوبر کی صبح کو یادگارِ تاسیس کا جلسہ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب شیخ الجامعہ کے زیرِ صدارت منعقد ہوا۔ پہلے جناب اسد ملتانی اور لسان القوم حضرت صفی لکھنوی نے اپنی نظموں سے حاضرین کو محظوظ اور مستفید فرمایا۔ اس کے بعد جناب شیخ الجامعہ نے ایک پرخلوص اور پرجوش تقریر میں جامعہ کے کام کی مختصر رپورٹ پیش کی جس کو ہم یہاں اس وجہ سے نقل نہیں کرتے کہ پچھلے مہینے کے شذرات میں اس قسم کا تبصرہ ہو چکا ہے پھر اسکول کے ایک چھوٹے سے بچے نے اسکول کے کام کی روداد پڑھ کر سنائی۔ آخر میں جناب شیخ الجامعہ نے کئی گراں قدر عطیوں کا اعلان کیا جن میں خاص طور پر قابلِ ذکر خواجہ عبدالحمید صاحب کا عطیہ ہے جس سے جامعہ کی مجوزہ بستی میں آب رسانی کے مصارف ادا کئے جائیں گے۔ سب سے بڑی خوش خبری جناب موصوف نے یہ سنائی کہ دولت آصفیہ کی ایک ہزار کی امداد جو کچھ دن سے بند تھی پھر جاری ہو گئی تعلیمی نمائش کا افتتاح کرنے کے بعد جناب صدر نے جلسے کو ختم کر دیا۔ اور حاضرین دو گھنٹے سے زیادہ نمائش کے دیکھنے میں مصروف رہے۔ اس میں جامعہ کے طلبہ کی صناعی اور دستکاری کے نمونے بہت سلیقے سے رکھے گئے تھے اور تعلیم اور حفظانِ صحت کے متعلق بہت سی مفید اور سبق آموز چیزیں جمع کی گئی تھیں۔

اسی روز شام کو اردو اکادمی کا عظیم الشان مشاعرہ منعقد ہوا جس میں حاضرین کی اس قدر کثرت تھی کہ اسکول کا حال اور گیلری کھچا کھچ بھر گئی اور دروازوں کے باہر لوگوں کے ٹھٹ لگے ہوئے تھے علاوہ دہلی کے شعرا کے جن میں اس مرتبہ حضرت بیخود دہلوی بھی تھے باہر سے حضرت صفی، حضرت ثاقب اور حضرت ظریف لکھنوی، مولانا حسرت موہانی، حضرت جگر مرادآبادی، حضرت بیدل بیکانیری اور حضرت فہمی بھوپالی تشریف لائے تھے۔ اتنے باکمال سخنوروں کا ایک جگہ جمع ہو جانا وہ نعمت ہے جو اب ہندوستان میں بہت کم میسر آتی ہے۔ کوئی چار ساڑھے چار گھنٹے یہ پاکیزہ صحبت رہی جس سے حاضرین نے بے اندازہ لطف اٹھایا۔

۳۰ر اکتوبر کی صبح کو جامعہ کے قدیم طلبہ کا جلسہ ہوا جس میں انھوں نے اپنی انجمن کے

استحکام اور فروغ کی تدابیر پر غور کیا۔ سہ پہر کو شہر کی خواتین جامعہ کی تعلیمی نمائش دیکھنے کے لئے تشریف لائیں اور ان کا ایک جلسہ بیگم انصاری صاحبہ کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں مسز آصف علی نے جامعہ کے مقاصد پر تقریر فرمائی اور ایک فلم بچوں کی پرورش کے متعلق دکھایا گیا۔ معلوم ہوا ہے کہ حاضرات کی تعداد چار پانچ سو کے درمیان تھی اور چوں کہ ان میں نوے فیصدی مسلم خواتین تھیں جو جلسوں میں بہت کم شریک ہوتی ہیں اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ اس پہلی کوشش میں حیرت انگیز کامیابی حاصل ہوئی۔

دوسری طرف اسی وقت اہل جامعہ اور ہمدردانِ جامعہ اوکھلے میں اس زمین پر جمع ہوئے جو جامعہ نے اپنی عمارات کے لئے خریدی ہے۔ جامعہ کے مہمانوں کے علاوہ شہر کے بہت سے معززین تشریف لائے تھے۔ پہلے جناب شیخ الجامعہ نے ان حضرات کو جنھوں نے اب تک زمین کا معائنہ نہیں کیا تھا اپنے ساتھ لے جا کر اس کی حدود دکھائیں۔ پھر چائے پینے کے بعد تھوڑی دیر شعر وسخن کی صحبت گرم رہی جس میں ڈاکٹر سعید صاحب، اور حضرت ظریف نے اپنے کلام سے محظوظ کیا اور حضرت صفی اور حضرت ثاقب نے وہ شعر سنائے جو خاص اس موقع کے لئے کہے تھے۔ جناب شیخ الجامعہ نے مہمانوں کا شکریہ ادا فرمایا، اور یہ اعلان کیا کہ جب جامعہ کی بستی اس جگہ بس جائے گی تو شہر سے طلبا کو لانے کے لئے لالہ نندن سرن صاحب ایک موٹر لاری اپنے کارخانے کی طرف سے عطا فرمائیں گے۔ نماز مغرب کے بعد لوگوں نے چاندنی رات میں نہر کی سیر کی اور سات بجے شہر کی طرف واپس آئے۔ ۱/۲ ۸ بجے رات کو جناب مولینا احمد سعید صاحب نے جامعہ میں اس موضوع پر تقریر فرمائی۔ "مسلمانوں کی دنیاوی فلاح وبہبود کا دارومدار مذہب کی پابندی پر ہے" اور اس پر یہ مبارک سلسلہ ختم ہوا۔

۱۳ر اکتوبر کو سودیشی نمائش دہلی کے منتظمین نے نمائش میں یوم جامعہ منایا اور اس روز کی کل آمدنی اپنا خرچ نکالنے کے بعد جامعہ کے نذر کی۔
